

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تفسیر طہری

جلد ششم

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن

ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ تفسیر

زیر اہتمام: ادارہ ضیاء المصنفین، بھیر شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور۔ کراچی۔ پاکستان

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

تفسیر مظہری (جلد ششم)	نام کتاب
حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ	تالیف
ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ	ترجمہ متن
الاستاذ مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ	مترجمین
مولانا محمد انور مگھا لوی	
فضلاء دارالعلوم محمدیہ نوشیہ، بھیرہ شریف	
ایک ہزار	تعداد
دسمبر 2002ء (رمضان المبارک 1323 ہجری)	اشاعت
1Z348	کمپیوٹر کوڈ

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلسٹی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 7221053

9۔ انکریم ہارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 7225085-7247350

ٹیکس:- 042-7238010

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:- 021-2210212-2212011-2630411

e-mail:- zquran@brain.net.pk

Website:- www.ziaulquran.com

فہرست

	سورۃ کہف		حدیث: قیامت کے دن لوگوں کی تین پیشیاں ہوں گی
	اصحابِ قریم کا قصہ (حدیث)	14	پہلی دو پیشیاں جھگڑے کیلئے ہوں گی جبکہ تیسری پیشی
53	اصحابِ کہف کا قصہ	15	پر اعمال نامے اڑ کر ہاتھوں میں پہنچ جائیں گے
53	حضرت معاویہ کا اصحابِ کہف کے عمار پر جانا	29	حدیث: تمام اعمال نامے عرش کے نیچے ہوں گے
	صوفی تمام میں موجود ہوتے ہوئے بھی ان سے الگ ہوتا ہے	31	حدیث: اطمینان کی اولاد اور وضو اور نماز میں بہکانے
	مسئلہ: اولیاء کے عزارات کے قریب مساجد بنانا جائز ہے	32	والے شیاطین کے نام
	مسئلہ: قبور کو پستہ کرنے کی ممانعت اور قبور پر چھینے اور	32	حدیث: نبی کریم ﷺ کا حضرت علی اور حضرت
61	ان کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کی ممانعت	32	فاطمہ سے فرمانا کہ تم تہجد کی نماز نہیں پڑھتے
66	ان شاء اللہ کے بغیر یہ کہنا کہ کل یہ کام کروں گا مناسب نہیں	34	حضرت موسیٰ کا حضرت خضر کی تلاش میں نکلنا (قصہ)
66	اگر شروع میں ان شاء اللہ کہنا یاد نہ رہا تو بعد میں ان شاء اللہ کہہ لینا چاہئے	35	مسئلہ: مفضول کو کبھی فاضل پر جزیئی فضیلت ہوتی ہے
	جہنم کے پردوں کا ذکر	40	مسئلہ: فاضل کو چاہئے کہ مفضول سے فضل کو حاصل
	ماء کا لہلہل کا بیان	40	کرے اور اس میں شرم محسوس نہ کرے
	حدیث: اہل جنت کے لباس اور زیورات کا بیان	41	حدیث: حکمت مومن کی گمشدہ میراث ہے جہاں
	حدیث: سبز رنگ حضور سید عالم ﷺ کا محبوب رنگ تھا	42	پائے حاصل کرے
	حدیث: اچھی چیز دیکھ کر (ماء شاء اللہ لا قوۃ الا باللہ) کہنے سے اسے نظر نہیں لگے گی	46	مسئلہ: استفادہ کیلئے ضروری ہے مسلک ایک ہو،
	حدیث: باقیات صالحات سے کیا مراد ہے؟	49	اطاعت کا ملکہ ہو نیز مرشد پر اعتراض نہ کیا جائے۔
	حدیث: حقیر گناہوں کو حقیر نہ سمجھنا چاہئے	52	مسئلہ: اگر کسی ولی سے امر غیر شرعی سرزد ہو تو اس کا رد کیا
76			جائے گا مگر ولی کا انکار نہ کیا جائے گا
			مسئلہ: جہاں تک ہو سکے اولیاء کے افعال کی شرعی
			تادیل کی جائے ورنہ اپنی ناقص فہم کا اعتراف کر لیا
			جائے
			مسئلہ: اشیاء کے وجود سایہ اور ظل ہیں ان اعیان کا بتہ کا
			جو اللہ تعالیٰ کی مرتبہ علم میں ہیں۔

- حضرت خضر کی حیات اور موت میں بحث 81 حدیث: علی کا ذکر اور ان کی محبت عبادت ہے 161
- یا جوج ماجوج کا بیان 87 حدیث: جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو
- یا جوج ماجوج کی اقسام 88 جبریل سے فرماتا ہے تو بھی اس سے محبت کر
- حدیث: یا جوج ماجوج کا خروج 91 سورہ طہ
- حدیث: دجال کا خروج 92 زمین چھٹی کی پشت پر ہے (تفصیل)
- حدیث: عقل مند وہ ہے جس نے اپنے نفس کو قابو میں 170 نماز کی فضیلت اور اہمیت
- کیا اور آخرت کیلئے توشہ تیار کیا اور بے وقوف ہے وہ 171 انا عند ظن عبدی ہی کی تشریح
- جو خواہشات نفسانیہ کے پیچھے پڑا رہا 96 وحی اور ربوبت تشریح انبیاء کے ساتھ خاص ہے اور
- قیامت کے دن کافروں کے اعمال ناموں کا وزن اور 97 اس نبوت کا خاتمہ خاتم النبیین پر ہو گیا
- ان کے متعلق علماء کے مختلف اقوال 97 کمالات نبوت اولیاء کو حاصل ہو سکتے ہیں
- حدیث: جنت فردوس کا بیان 97 اصالت طہیبت اور اصالت کبریٰ کا ذکر حضرت محمد نے
- حدیث: شرک اصغر یعنی ریا کا بیان 101 کس کا دعویٰ کیا تھا
- فصل: سورہ کہف کے فضائل 103 دعوت سے ولایت افضل ہے غلط ہے
- سورہ مریم 207 عروج و نزول کی تحقیق
- انبیاء کرام میراث میں مال نہیں چھوڑتے (حدیث) 107 قدر ضرورت سے زائد عمارت کا بوجھ انسان پر ہوگا
- صدیق کے مقام و مرتبہ کا بیان 127 حضرت آدم کا قصہ
- حدیث: قرآن پڑھتے ہوئے رویا کرو اور اگر روانہ 224 آئے تو رونے والوں کی طرح بن جاؤ۔
- حدیث: غنی، جنم کا ایک دریا ہے یا اس کی ایک وادی 137 حدیث: حضرت آدم اور حضرت موسیٰ کا مباحثہ
- حدیث: سب لوگ دوزخ میں آئیں گے پھر اللہ 138 متقیین کو نجات عطا فرمائے گا۔
- دوزخ میں وارد ہونے کی تشریح 148 مسئلہ: نماز میں سورہ فاتحہ کی قرأت
- حدیث: متقی قیامت کے دن سوار ہوں گے جبکہ 148 مسئلہ: سورہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں
- کافروں کو منہ کے بل پیدل چلایا جائے گا 155 اللہ کو ماننا ہر عقل مند پر واجب ہے اور انکار مستحق
- حدیث: میں جس کا مولیٰ ہوں، علی اس کا مولیٰ ہے 161 عذاب بنانا ہے

سورۃ انبیاء

- غزوہ بدر کے دن حضرت علی اور حضرت حمزہ رضی اللہ
331 عنہما کی مبارزت کا بیان 246
- میزان سے کیا مراد ہے؟ 333 260
- حضرت ابراہیم نے سوائے تین مقامات کے کبھی ظاہراً
336 اہل جنت کے زیورات اور لباس کا بیان 267
- بھی جھوٹ نہیں بولا (حدیث) 340 267
- حضرت ابراہیم کے آگ میں ڈالنے کا واقعہ 342 269
- شام کی فضیلت اور برکات 344 273
- حضرت داؤد اور سلیمان کا ایک کھیت کے بارے میں
347 فیصلہ 277
- پہتہ کیلئے دو ہرا اجر ہے 347 280
- حضرت سلیمان کا قصہ 348 282
- حضرت ایوب کا قصہ 348 284
- حضرت ایوب کتنی مدت دکھ میں رہے کب دعا کی اور
349 کیوں کی 290
- ذوالکفل پیغمبر تھے یا نہیں -- علماء کا اختلاف 349 296
- حضرت یونس کا قصہ 350 297
- یا جوج ماجوج کا ذکر 304 304
- تخلیق انسانی کی بحث 310 310
- کیا گناہ گار مومن جنت میں داخل نہ ہوں گے 311 311
- میں ہادی اور رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں عذاب بنا کر
312 نہیں (حدیث) 312 312
- فرقہ باطنیہ اور شیعہ کے قول تہیہ کی تردید 313 313
- سورۃ الحج 353 313
- زلزلہ قیامت کا بیان 355 315
- بعث النار کا بیان 358 317
- مسئلہ: کیا مکہ مکرمہ کی زمین کو بیچنا جائز ہے؟
- کیا سر زمین مکہ اپنے یا سبوں کی ملکیت ہے یا نہیں؟
- حرم پاک میں ظلم والحا کا حکم؟
- حضرت محمد الف ثانی نے فرمایا کعبہ معظمہ ایسی شئی
- کے مشابہ ہے جو بے کیف ہے
- حدیث طیبہ: اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا
- ہے لہذا تم حج کرو۔ الحدیث
- مسئلہ: پیدل چل کر حج کرنا افضل ہے
- حدیث طیبہ: جس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے حج کیا
- اسے جانے کہ وہ فرست نہ کرے
- مسئلہ: کیا نقلی یا نذرمانی ہوئی قربانی کا جانور یوم نحر اور
- ایام تشریق میں ذبح کرنا شرط ہے؟
- مسئلہ: قربانی یا نقلی قربانی کا گوشت کھانا جائز ہے لیکن
- ایسے جانور کا گوشت کھانا جائز نہیں جو شکار کی جزاء،
- جنایت کی جزاء یا حج اور نذر کو فاسد کرنے کے سبب
- ذبح کرنا لازم ہو۔ نقلی اور حج قرآن کے دم کے بارے
- میں علماء کا اختلاف ہے
- مسئلہ: رمی، حج قرآن کرنے والے کی قربانی، حلق اور
- طواف کے درمیان ترتیب واجب ہے۔
- حج اور عمرہ کے دوران حلق کرانے کے مسائل کا بیان
- نذری کی اقسام اور ان سے متعلق احادیث کا بیان

- طواف کی اقسام بشرائط اور اس کے ارکان سے متعلق
مسائل کا بیان 389
- حدیث طیبہ: جسوٹی شہادت اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو
432 جنت کے درجات متفرق ہوں گے۔
- حدیث طیبہ: نبی علیہ السلام کی طرف وحی کی گئی کہ آپ
اپنی امت کے اہل طاعت سے کہیں کہ وہ اپنے اعمال
444 پر بھروسہ نہ کریں اور تہی مایوس ہوں (الحدیث)
- حدیث طیبہ: ابن آدم کیلئے تین دواؤں نکالے جائیں
444 گے (الحدیث)
- مسئلہ: سورہ حج کے دوسرے جہدہ میں علماء کا اختلاف
444
- مسئلہ: جہاد اکبریٰ تحقیق اور اس سے متعلقہ بیان
446
- ریا اور سمعہ کا بیان
447
- نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کے تجزی ہونے
کا بیان 448
- مسئلہ: تکالیف کی کلفت کو دور کرنا اجتہاد کے لوازم میں
449 سے ہے
- اس کا بیان کہ لوگ قریش کے تابع ہیں اور حدیث طیبہ
449 میں تمہارے لئے والد کے قائم مقام ہوں
- اس کا بیان کہ حضور نبی کریم ﷺ کی امت قیامت
451 کے دن عام لوگوں کے خلاف شہادت دے گی
- کتاب وسنت کو مضبوطی سے تھامنے اور بدعت سے
451 اجتناب کرنے کا بیان
- سورۃ المؤمنون
425
- اس کا بیان کہ جنت نے کہا۔ قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ
454 نماز میں خشوع اختیار کرنے، اپنی نگاہ جمل بخود پر رکھنے
425 اور ادھر ادھر تو جنت کرنے کا بیان
- 427 انبیاء ورسول علیہم السلام کی تعداد کا بیان
- مسئلہ: ذبح کرنے کا وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر شرط ہے
408
- مسئلہ: گائے اور اونٹ میں سے بدنہ کا بیان
409
- مسئلہ: ذبح اور نحر کرتے وقت کیا کہا جائے گا؟
410
- مسئلہ: اہل حرب کی عورتوں، پوزھوں، راہوں،
اندھوں اور ذمیوں کو قتل کرنا جائز نہیں
414
- مسئلہ: مرتدہ عورت کو قتل کرنا جائز نہیں
414
- مسئلہ: اگر امام وقت نے کسی مصلحت کے تحت حربیہ یا
مرتدہ کو قتل کرنے کا حکم دیا تو اس میں کوئی حرج نہیں
416
- حدیث طیبہ: فقراء اغنیاء سے پانچ سو سال پہلے جنت
میں داخل ہوں گے
423
- حدیث طیبہ: میری اور اس دین کی مثال جس کے
ساتھ اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث فرمایا اس آدمی کی طرح
ہے جو کسی قوم کے پاس آیا اللہ ریت
424
- حدیث طیبہ: اسلام پہلے گناہوں کو مٹاتا ہے
425
- حدیث طیبہ: میری مثال اس آدمی کی طرح ہے جس
نے آگ روشن کر رکھی ہو۔
425

- 531 احسان کی شرائط کا بیان
امام کیلئے جائز ہے کہ زانی کو جلا وطن کرنے بلکہ ہر حاکم مصلحت کے پیش نظر کسی کو جلا وطن کر سکتا ہے
- 526 قید کرنا جلا وطن کرنے کی ایک صورت ہے
نفسانی قوت کے خاتمہ کیلئے مشائخ طریقت نے جلا وطن کو جائز قرار دیا ہے
- 537 زنا کے کتبے ہیں؟
ملکیت کے شبہ میں کیا زنا کا حکم لگایا جائے گا!
- 535 زنا شہادت یا اقرار سے ثابت ہوتا ہے
اقرار کرنے کے بعد رجوع کر لینے سے حد ساقط ہو جاتی ہے
- 540 مریض اور عورت کو حد کیسے لگائی جائے گی
کیا آقا اپنے غلام پر حد لگا سکتا ہے؟
- 542 حد قذف کے مسائل
لعان کے مسائل
- 553 واقعہ ایک
مسئلہ: موئین کے متعلق صحن ظن رکھنا چاہئے
- 570 کون سی چیز دخول جنت کی موجب ہے۔ ابواب خیر کون سے ہیں
- 573 دین کی چوٹی اور ستون کیا ہے؟ ان تمام امور کا مدار زبان کو روکنے پر ہے
- 575 حدیث: برابر کا بدلہ لینے والے کو صلہ رحم کرنے والا نہیں کہا جاسکتا
- 579 حدیث: قیامت کے دن جسم کے اعضاء شہادت دیں گے
- 528 حدیث طیبہ: قیامت کے دن سب سے پہلے نماز کے بارے حساب لیا جائے گا اگر نرہنض میں کمزوری ہوگی تو اسے نوافل کے سبب پورا کیا جائے گا پھر اسی طرح زکوٰۃ کا حساب لیا جائے گا۔ الحدیث
- 459 حدیث طیبہ: ہر انسان کیلئے ایک ٹھکانا جنت میں ہے اور ایک جہنم میں۔ جو جہنم میں داخل ہوگا تو اہل جنت کو اس کے گھر کا وارث بنا دیا جائے گا۔
- 460 حدیث طیبہ: جس نے اپنے وارث کو میراث سے محروم کیا اللہ تعالیٰ جنت سے اس کی میراث کو ختم کر دے گا
- 460 حدیث طیبہ: تم میں سے ہر ایک خلقت کے وقت چالیس دن تک ماں کے پیٹ میں نطفہ کی صورت میں رہتا ہے۔ الحدیث
- 463 حدیث طیبہ: اللہ تعالیٰ نے پانچ دریا جنت سے نازل فرمائے یعنی یحییٰ اور یونس۔ الحدیث
- 468 حدیث طیبہ: میرے نسب و صہر کے سوا تمام نسب و صہر کٹ جائیں گے
- 508 میزان کی تحقیق اور کیفیت وزن کا بیان
- 509 حدیث طیبہ: اہل جہنم کی پانچ دعائیں۔ الحدیث
- 514 سورہ نور
- 521 مسئلہ: حد شرعی ایسے کوڑے سے لگائی جائے جو درمیانے سائز کا اور بغیر گھنڈی کے ہو
- 522 مسائل: زنا کی سزا کوڑے لگانا، جلا وطن کرنا اور سنگسار کرنا ہے
- 522

- 599 عورت کی آواز شرمگاہ ہے
حدیث: اللہ نے نزع فرمایا ہے کہ اہل جنت کے سوا کسی سے نکاح کروں یا کرواؤں۔
- 583 مسئلہ: بعض حالات میں نکاح فرض یا واجب ہوتا ہے جبکہ بعض حالات میں حرام مکروہ ہوتا ہے اور اکثر
- 600 حالات میں مستحب اور سنت ہے
- 604 مسئلہ: اچھی نیت سے نکاح کرنا عبادت ہے
- 606 حدیث: نکاح سے رزق تلاش کرو
- 616 آیت نور کی تفسیر
- 619 زیت سے کیا مراد ہے
- 620 فصل: ان معجزات کا بیان جو بعثت سے قبل ظاہر ہوئے
- 623 آیت نور کی صوفیانہ تاویل
- 631 حدیث: نماز مومن کی معراج ہے
- 635 ہدایت امر وہی ہے
- 644 خلافت راشدہ پر استدلال
- 644 حدیث: خلافت 30 سال ہے
- 594 کھانا کھانے، مہلا مہلا کرنے، مریض کی عیادت اور نماز
- 651 جنازہ پڑھنے کا بیان
- 660 مسئلہ: مطلق امر، وجوب کیلئے ہے۔
- 583 حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے فضائل احادیث کی روشنی میں
- 583 کسی کے گھر اجازت لے کر جانے اور سلام کرنے کا حکم
- 589 نظر نیچی رکھنے اور سبز عورت کا بیان
- 591 کیا عورت اجنبی مرد کو دیکھ سکتی ہے؟
- 591 مرد، مرد کے کون سے اعضاء دیکھ سکتا ہے
- 591 ناف سے گھٹنوں تک نہ عورت، عورت کو اور نہ مرد، مرد کو دیکھ سکتا ہے
- 592 آزاد عورت کی شرمگاہ کا بیان
- 593 شہوت سے اسن کی صورت میں اجنبی مرد، عورت کے کن اعضاء کو دیکھ سکتا ہے
- 594 لونڈی کی شرمگاہ کا بیان
- 595 عورت اپنے محرم کے سامنے اپنے بدن کے کون سے حصے کھول سکتی ہے اور محرم مرد عورت کے بدن کے کسی حصے کو دیکھ یا چھو سکتا ہے بشرطیکہ شہوت نہ ہو

سورہ کہف

﴿سورة الكهف مكية 18﴾ ﴿سورة الكهف 18﴾ ﴿سورة الكهف 18﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهٖ الْكِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۝

”سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کیلئے ہیں۔ جس نے نازل فرمائی اپنے (محبوب) بندے پر یہ کتاب ہے اور نہیں پیدا ہونے دی اس میں ذرا کجی ہے۔“

ابن جریر نے اسحاق کے طریق سے اہل مصر کے ایک شیخ سے اور انہوں نے عکرمہ سے اور انہوں نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ قریش مکہ نے نضر بن الحارث اور عقبہ بن ابی معیط کو یہودی علماء کی طرف مدینہ طیبہ بھیجا تا کہ وہ علماء یہود سے محمد ﷺ کے متعلق دریافت کریں کہ اس کی نبوت و رسالت کی حقیقت کیا ہے۔ اور ان کے سامنے محمد ﷺ کی صفات عالیہ، خصائل جمیلہ اور عادات جمیلہ کو بھی بیان کریں۔ قریش نے یہود سے اس لئے محمد ﷺ کے متعلق پوچھا کیونکہ وہ پہلے اہل کتاب ہیں اور ان کے پاس انبیاء کرام کا علم ہے جس سے قریش مگر محروم ہیں۔ وہ دونوں اپنی قوم کے مشورہ کے مطابق مدینہ طیبہ پہنچے اور یہود سے محمد ﷺ کے حسن اخلاق اور دعوت وحید کے متعلق بیان کیا۔ یہودیوں نے کہا اس سے تم تین چیزوں کے متعلق سوال کرو۔ اگر وہ ان کے متعلق صحیح جواب دے تو وہ یقیناً نبی اور رسول ہے اور اگر وہ ان چیزوں کے متعلق نہ بتا سکے تو اس کا دعویٰ نبوت من گھڑت اور افتراء عظیم ہے۔ ایک تو اس سے ان جوانوں کے متعلق پوچھو جو پہلے زمانہ میں اپنی ہستی چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ان کا معاملہ کیا تھا کیونکہ عربوں کے نزدیک ان جوانوں کا قصہ بڑا عجیب و غریب تھا۔ دوسرا اس شخص کے متعلق پوچھو جس نے زمین کے مشرق و مغرب کا سفر کیا تھا، اس کا واقعہ کیا ہے۔ تیسرا اس سے روح کی حقیقت دریافت کرو۔

نضر بن حارث اور عقبہ بن معیط قریش کے پاس آئے تو انہیں بتایا کہ ہم ایسے تین سوال لائے ہیں جو محمد ﷺ اور ہمارے درمیان تنازعہ اور جھگڑے کو ختم کر دیں گے۔ قریش رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور یہ تین سوال پوچھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں تمہیں ان کے جوابات کل بتاؤں گا۔ آپ ﷺ نے ان شاء اللہ نہ کہا۔ وہ وہاں سے چلے گئے۔ لیکن قدرت کی حکمت کا تقاضا تھا کہ پندرہ روز تک وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا، نہ کوئی پیام اور نہ نبیاً ہر آیا۔ اہل مکہ کو زبان طعن و ردا کرنے کا موقع مل گیا۔ وحی کے انتطار سے آپ کو شدید پریشانی ہوئی اور اہل مکہ کی اذیت آمیز گفتگو سے آپ کا دل مضطرب مزید تکلیف میں مبتلا ہو گیا۔ پندرہ دن کے بعد جب ریل امین سورہ کہف کی پہلی آیات لے کر تشریف لائے۔ ان آیات میں ان کی تکلیف دہ باتوں پر پریشانی کا اظہار کرنے پر عتاب بھی تھا اور جوانوں نے تین سوالات پوچھے تھے ان کے جوابات بھی تھے (1)۔

ع۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی مخلوق پر جو سب سے بڑا انعام فرمایا ہے اس پر وہ اپنی تعریف خود فرما رہا ہے، وہ انعام عظیم قرآن حکیم ہے

جو اس نے ان میں سے ایک شخص کے قلب مظہر پر نازل فرمایا۔ اور قرآن نعمت عظمیٰ اسلئے ہے کیونکہ اس میں انسانیت کے کمال اور عروج تک پہنچنے والے راستوں کی راہنمائی کی گئی ہے۔ اور اس میں ان قوانین و فرامین کو بھی بیان کیا گیا ہے جن میں معاشرہ انسانی کی دنیا و آخرت کی خیر اور بھلائی ہے۔ نیز اس آیت کریمہ میں بندوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک بلکہ پوری کائنات کے خالق کی تعریف اور ثناء کیسے کریں۔

سچ شخص نے عوج جاکو وصل کی صورت میں الف پر آواز کو توڑے بغیر لطیف سا سکتہ کر کے پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء بغیر سکتہ کے وصل کرتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے، کہ یہ کتاب رشد و ہدایت ہے جو اس نے اپنے حبیب کے قلب اطہر پر نازل فرمائی ہے۔ اس کے نتو الفاظ و عبارات میں کمی ہے اور نہ اس کے معانی میں باہم اختلاف و منافات ہے اور اللہ تعالیٰ کی جناب سے جو اس میں دعوت آئی ہے اس میں کسی قسم کا انحراف اور تغیر نہیں اور نہ ہی اس کے ارشادات حکمت و موعظت سے خالی ہیں۔ عوج اگر عین کے کسرہ کے ساتھ ہو تو معانی مخفی کئی کیلئے استعمال ہوتا ہے اور عوج اگر فتح عین ہو تو ظاہری نیز سہے پن کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ عرب کہتے ہیں فی زایہ عوج و فی غصافہ عوج (یعنی اس کی نگر اور سوخ میں کمی ہے اور اس کی چھری میڑھی ہے) ابن عباس رضی اللہ عنہ سے عوج جاکو معنی غیر مخلوق مروی ہے۔ اسی وجہ سے بعض علماء نے اس کا معنی غیر مخلوق کیا ہے (۱)۔

قِيمًا لِيُنذِرَ بَأْسًا شَدِيدًا لِّمَنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا حَسَنًا ﴿۱﴾

” (اور معاش و معاواک) درست کرنے والی ہے۔ تاکہ ڈرا جائے سخت گرفت سے جو اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ اور یہ مژدہ سنائے ان اہل ایمان کو جو کرتے ہیں نیک اعمال کہ بیشک ان کے لئے بہت عمدہ جزا ہے۔“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ قیما کا یہ معنی فرماتے ہیں کہ یہ بالکل سچی اور نیر سے پک ہے، اس میں کسی قسم کی افراط و تفریط نہیں ہے۔ فراہ لکھتے ہیں یہ کتاب تمام الہامی کتابوں کی مجموعہ اور گواہ ہے اور ان کے بعض احکام کو منسوخ کرتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تکمیل انسانی کی صفت سے متصف ہے، بندوں کے مصابح و دست کرنے والی ہے، یعنی یہ نورانی صحیفہ جس طرح اپنی صفت کمال سے موصوف ہے اسی طرح دوسروں کی اصلاح اور ان کو کمال عروج تک پہنچانے کی صفت سے بھی مزین ہے۔ قیما پڑ نصب مضر فعل کی وجہ سے ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ أَنْزَلْنِي عَلَيَّ عَبْدِي الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهُ عِوَجًا وَلَكِنْ جَعَلَهُ قِيمًا يٰ لِكَيْ ضَمِيرُ الْكِتَابِ فِي حَالِ هَوْنِهِ وَجَدَ مَسْنُوبٌ فِيهِ اس صورت میں واؤ حالیہ ہوگی عاطفہ نہ ہوگی۔ اگر واو عاطفہ بنایا جائے تو معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان فاصلہ آ جائے گا۔ اسی وجہ سے بعض علماء نے تقدیرم و تاخیر کا قول کیا ہے۔ یعنی اگر واو عاطفہ ہو تو تقدیر عبارت اس طرح ہوگی۔ أَنْزَلْنِي عَلَيَّ عَبْدِي الْكِتَابَ قِيمًا وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهُ عِوَجًا۔

قرآن کی یہاں دو صفتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ اس میں کوئی خامی اور کچی نہیں ہے اور دوسرا یہ کہ یہ کتاب دوسروں کی خامیوں کی بھی اصلاح کرنیوالی ہے۔ ان دونوں وصفوں کا فائدہ کلام میں تاکید ہے کیونکہ کئی ایسی چیزیں ہوتی ہیں جن کی صفت

استقامت (اصلاح) بیان کی جاتی ہے لیکن باریکی اور لطیف انداز سے دیکھا جائے تو اس میں کچھ نہ کچھ خامی اور کئی بھی نظر آ جاتی ہے لیکن قرآن میں یہ دونوں اوصاف جمع فرما کر اس کی جامعیت کو واضح فرما دیا۔

ع۔ لینڈر کا قائل عبد ہے، یعنی اس کتاب حکمت و موعظت کے ساتھ میرا عبد کامل ان لوگوں کو ڈرائے جو شرک و کفر میں ملوث ہیں۔ قرینہ کی وجہ سے پہلے مفعول کو حذف کیا گیا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس غرض پر اکتفا کیا گیا ہے جس کے لئے کلام کو ذکر کرنا مقصود تھا۔ باسما کا معنی عذاب ہے، یعنی عبد کامل، کتاب کامل کے ذریعے کفار کو اس عذاب سے ڈرائے جو بے نیاز ذات کی طرف سے جہنم کی آگ کی صورت میں ان پر ڈالا جائے گا۔ ابوبکر نے من لدنہ کو دال کے سکون اور ہونٹوں کو ملانے کے ساتھ ضمہ کی طرف ایشام دیکر پڑھا ہے۔ نیز انہوں نے نون اور ہاکو کسرہ دیا ہے اور ہاکو یاء کے ساتھ ملا دیا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے وال کے ضمہ اور نون کے اسکان اور ہاکو کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے ابن کثیر نے ہاکو واو کے ساتھ ملا دیا ہے۔

ع۔ حمزہ، کسائی نے باب افعال سے پیشرو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے باب تفعیل سے شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہاں پیشرو کا مفعول اول ذکر فرمایا ہے تاکہ ایمان داروں کی عظمت کا اظہار ہو جائے۔ دوسرا یہ کہ ایمان اور اعمال صالحہ پر انہیں براخیبتہ کیا جائے۔ یعنی نیک اعمال کرنے والوں کو یہ کتاب لاریب جنت اور رضا و اطمینان کا مژدہ جانفزا سنانی ہے۔

مَا كَثَبْتَ فِيهِ أَبَدًا ۝

”وہ پھریں گے اس (جنت) میں تا ابد۔“

۱۔ یہ جو انہیں نیک اعمال کا اجر ان کی شایان شان ملے گا اس میں وہ ہمیشہ مسرور و خوش رہیں گے۔ اس اجر و انعام کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا یہ دائمی اور ابدی ہوگا۔

وَيُنَبِّئُ سَائِرَ النَّاسِ قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا ۝

”اور تا کو ڈرائے ان (نادانوں) کو جو یہ کہتے ہیں کہ بنایا ہے اللہ تعالیٰ نے (فلاں کو اپنا) بیٹا۔ ۱۔“

۱۔ یہاں ان لوگوں کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا جو اللہ کی اولاد کے قائل تھے۔ اور ڈرائے کو بھی ان کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا شرک اور کفر بہت گھناؤنا اور قبیح تھا اور بڑا عجیب و غریب تھا۔ اور جس چیز سے ڈرانا تھا یہاں اس کا ذکر نہیں فرمایا کیونکہ پہلے اس (عذاب) کا ذکر ہو چکا ہے۔

مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ وَلَا لِابْنِهِمْ كَبَّرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ ۝

يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا ۝

”نادانیں اللہ تعالیٰ (کی ذات و صفات) کا کچھ علم ہے اور ندان کے باپ دادا کو کتنی بڑی ہے وہ بات ع۔ جو نکلتی ہے

ان کے مونہوں سے ع۔ وہ نہیں کہتے ہیں مگر (سرتاسر) جھوٹ۔ ع۔“

۱۔ یہ کی ضمیر کا مرجع الولد، یا اتحاد یا القول ہے، یعنی ان احمقوں کو بیٹے کے متعلق، یا بیٹا بنانے یا ایسا قول کرنے کے (جرم) کے متعلق علم نہیں ہے، یہ سب کچھ اپنی انتہائی جہالت، باطل توہمات اور اندھی تقلید کی بناء پر کہتے ہیں (کہ اللہ نے فلاں کو اپنا بیٹا بنایا

ہے) جو کچھ اپنے بے عقل آباؤ اجداد سے سنا، بغیر سوچے سمجھے اس کی پیروی اور تقلید کر رہے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں اس کا بھی انہیں علم نہیں ہے۔ وہ اَب اور ابن کا اطلاق موثر اور اثر کے معنی میں کرتے تھے، جبکہ انہیں اس کا علم ہی نہیں ہے۔ یا یہ معنی کہ ان عقل کے دشمنوں کو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا علم و ادراک ہی نہیں ہے ورنہ یہ اللہ تعالیٰ کی اولاد کی طرف نسبت نہ کرتے۔ یا کہا جاتا ہے کہ کسی چیز کا علم نہ ہونا اس کے عدم انکشاف کی وجہ سے ہوتا ہے حالانکہ وہ چیز موجود ہوتی ہے اور کبھی لاعلمی اس چیز کے معدوم اور محال ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے اور یہاں یہی مفہوم مراد ہے۔ یہ موجودہ مشرک جس طرح بے علم تھے اس طرح ان کے پیشروان کے آباؤ اجداد بھی نادان اور نا سمجھ تھے کیونکہ وہ بھی خدا کی طرف بیٹے کی نسبت کرتے تھے۔

ع ان کا یہ کفر یہ نکلے کہ کتنا قبیح اور نامعقول ہے کیونکہ انہوں نے اس ذات حمدیت کو ایک مخلوق سے تشبیہ دی، پھر سے تراشے، بتوں کو اس کا شریک ٹھہرایا، انہوں نے ایسی بات کہی ہے جس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ اس ذات کو بیٹے اور خلیفے کی احتیاج ہے حالانکہ وہ ذات ہر قسم کے ایسے نقص اور عیب سے منزہ اور برتر ہے، کلمۃ پر نصب نہیں ہونے کی بنا پر ہے۔ اس قسم کا اسلوب یہاں عجب کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ کبروت میں فاعل ہی ضمیر مجہم ہے جس کی تفسیر کلمۃ بیان کر رہا ہے یا ضمیر کا مرجع انخذ اللہ ولدا کا قول ہے۔ کلمہ کا اطلاق مرکب کلام پر بھی ہوتا ہے کیونکہ عرب تصیدہ کو بھی کلمہ کہہ دیتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ اصل میں من کلمتہ تھا اور فاعل ہونے کی بناء پر محل رفع میں ہے اور کن زائدہ ہے پھر من کو حذف کیا گیا اور کلمتہ کو منصوب پڑھا گیا۔

ع یہ کلمتہ کی صفت ہے جو ان کے اپنے منہوں سے ایسی بات نکلنے کی نامعقولیت کو بیان کر رہی ہے۔ حالانکہ نکلنے والی تو وہ ہوا تھی جو ایسی بات کی حامل تھی۔ بعض علماء فرماتے یہ جملہ محذوف مخصوص بالذمہ کی صفت ہے کیونکہ کتبہ یہاں جس کے معنی میں ہے۔ تقدیر اس طرح ہے قولی یخروج۔

ع وہ سفید جھوٹ بکر رہے ہیں کذب یا مصدر محذوف کی صفت ہے، یعنی ان کی یہ بات (فلاں اللہ کا بیٹا ہے) کسی اعتبار سے بھی صداقت پر مبنی نہیں ہے۔

ابن مردود نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ عتبہ، شیبہ، ابو جہل بن ہشام، نضر بن الحارث، عاص بن وائل، اسود بن مطلب اور ابو البختری قریش کی ایک مجلس میں جمع تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے پوری دوسری اور خلوص کے ساتھ انکار کو دعوت تو یہودی تو انہوں نے اس پیکر خلوص کی دعوت حق کو قبول کرنے کی بجائے اس کا مذاق اڑانا شروع کر دیا، اور صبح و شام تنقید و طعن ان کا مشغلہ بن گیا۔ اس غیر شصافانہ طرز عمل پر آپ ﷺ کے شفیق و رحیم دل کو بہت تکلیف ہوتی، خلوص آمیز تبلیغ کی تضحیک و انکار آپ کیلئے نہایت پریشانی اور قلق کا باعث بنا تھا (1) تو اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب لیبیب ﷺ کو تسلی دینے کیلئے ذیل کی آیت نازل فرمائی۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ مُّقِرٌّ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِنْ لَمْ يُؤْمَرُوا بِهَذَا الْحَدِيثِ ۖ أَسَفًا ۝

”تو کیا آپ (فرط غم سے) تلمف کر دیں گے اپنی جان کو ان کے پیچھے۔ اگر وہ ایمان نہ لائے اس قرآن کریم پر افسوس کرتے ہوئے۔“

۱۔ اسے پیار سے حبیب ان ناہنجاروں اور ازلی بدبختوں کی ایمان سے بے رفتی کرنے پر آپ اپنے نفس کو ہلاک کر دیں گے۔ جب انہوں نے آپ ﷺ کی دعوت کو قبول نہ کیا اور شر بے مہار کی طرح منہ موڑ گئے، آپ کو ان کی اس بے توجہی پر شدید دکھ اور پریشانی ہوئی تو آپ کی اس کیفیت کو اس شخص سے تشبیہ دی گئی ہے جس کو اپنے دوست و احباب چھوڑ گئے ہوں اور وہ ہجر و فراق کی طویل رات میں گھائل ہو رہا ہو۔ گویا آپ ﷺ بھی در فراق میں جتنا شخص کی طرح ان کے ایمان نہلانے پر غم و اندوہ میں مبتلا ہیں۔

۲۔ هذا الحدیث سے قرآن حکیم مراد ہے۔ ان لم یثوموا شرط ہے اور سابقہ کلام کی وجہ سے جزاء سے مستغنی ہے۔ اسفا یا تو علت کی بناء پر منصوب ہے یا حال کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی ان پر افسوس کرتے ہوئے اپنے آپ کو مار ڈالیں گے یا ان کے ایمان کی آرزو میں اپنے آپ کو قتل کر دیں گے۔ اسفا کا معنی شدید غصہ اور انتہائی غم و اندوہ ہے۔

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لِّهَا لِيَبْهَتُوا بِهَا قُلُوبَهُمْ أَفَبُصُورَتِ الْبَشَرِ خَيْرٌ مِّنْ آيَاتِنَا

”بیکہ ہم نے بنایا ان چیزوں کو جو زمین پر ہیں اس کے لئے باعث زینت و آرائش تاکہ ہم انہیں آزما سکیں کہ ان میں سے کون عمل کے لحاظ سے بہتر ہے۔“

۱۔ یعنی ہم نے حیوانات، نباتات اور معادن کو زمین اور زمین کے باسیوں کیلئے زینت و زیبائش کا باعث بنایا۔ اگر کوئی یہ کہے کہ سانپ، بچھو اور شیاطین میں کیا حسن و زیبائش ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ساری چیزیں اس اعتبار سے زینت ہیں کہ یہ اپنے صنایع کی قدرت کاملہ، اس کی یکسانی اور اس کی صفات کمائیہ پر دلالت کرتی ہیں۔ حضرت ابن عباس فرماتے ماعلی الارض سے مراد صرف مرد ہیں اور یہی زمین کی زینت و جمال ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے مراد علماء اور صالحین ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں درختوں اور نہروں کی زینت مراد ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ سَخَّيْنَا إِذْ آتَيْنَا الْأَرْضَ الْمَرْصُورَةَ لِيُبْهَتُوا بِهَا قُلُوبَهُمْ أَفَبُصُورَتِ الْبَشَرِ خَيْرٌ مِّنْ آيَاتِنَا

زمین نے اپنا سنگار اور خوب آراستہ ہو گئی“

بعض علماء فرماتے ہیں ماعلی الارض سے مراد ہر وہ چیز ہے جو زمین کے حسن و خوبی کا باعث ہو سکتی ہے مثلاً دنیا کی ظاہری نعمتیں اشیاء میں کہتا ہوں دنیا کی تمام اشیاء بھی مراد سکتی ہیں جیسا کہ الفاظ کے عموم سے ظاہر ہے کیونکہ مجموعی نظام کے حسن پر سب چیزیں دلالت کرتی ہیں یا ہر چیز زینت میں داخل ہے کیونکہ جمیل و حسین صورتوں کا حسن ہمیشہ قبیح چیزوں کے ذریعہ سے ہی محسوس و معروف ہوتا ہے۔

۲۔ ہم ضمیر کا مرجع الناس ہے جو بئیسیر المؤمنین اور یذکر الذین قالوا اتَّخَذُوا اللَّهَ وَلَدًا کے ارشادات کے ضمن میں موجود و مفہوم ہے، یعنی اللہ تعالیٰ انہیں آزمائے کہ عمل کے لحاظ سے کون اچھا اور بہتر ہے، کون ان فانی اور عارضی رنگینوں سے عدم دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے خالق کی طرف متوجہ رہتا ہے اور کون اس دنیا کے ظاہری حسن و جمال کی دلفریبیوں میں گھس جاتا ہے۔ بہتر عمل والا وہ ہوگا جو کفایت کرنے والے ہال پر قناعت کرے اور پھر اس مال کو مناسب اور نیک جگہ پر صرف کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دنیا سوز و شاداب، بہت لذیذ اور مٹھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس میں پہلے لوگوں کا خلیفہ بنایا تاکہ وہ دیکھے کہ تم اس میں کیسے اعمال کرتے ہو۔

وَإِنَّا لَجَاعِلُونَ مَا عَلَيْهَا صَعِيدًا جُرُومًا

”اور ہم ہی بنانے والے ہیں ان چیزوں کو جو زمین پر ہیں (ویران کر کے) چٹیل میدان غیر آباد لے۔“

۱۔ یعنی جن چیزوں کو ہم نے اس زمین کی زیب و زینت کا باعث بنایا، ایک دن ہم ان سب کو خاکستر اور ریزہ ریزہ کر دیں گے۔

حیوانات و نباتات اور دوسری یہ حسین و جمیل اشیاء سب مٹی میں مل جائیں گی۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ أَصْحَابَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيمِ كَانُوا مِنْ آيَاتِنَا عَجَبًا ﴿١٠﴾

”کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ غار والے اور رقیم والے ہماری ان نشانیوں میں سے ہیں جو تعجب خیز ہیں۔“

۱۔ اس آیت میں استہمام تقریری ہے یعنی یہ لوگ ہماری تعجب خیز نشانیوں میں سے ہیں۔ ان کا وصف مبالغہ کیلئے مصدر سے بیان کیا گیا ہے یا عجباً مصدر فاعل کے معنی میں ہے یا ذرا عجب کے معنی میں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں استہمام انکاری ہے یعنی یہ لوگ ہماری تعجب خیز نشانیوں میں سے نہیں ہیں کیونکہ یہ بلند و بالا آسمان، یہ سرسبز و شاداب زمین اور پھر زمین کے دامن میں ان گنت دوسری مخلوق، ان لوگوں سے بھی حیرت انگیز ہے کیونکہ یہ سب اشیاء مختلف طبائع اور مختلف ہیئت پر پیدا کی گئی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ سب کو اپنی اصل یعنی مٹی کی طرف لوٹا دے گا۔ یہ گونا گوں کائنات کی اشیاء، اصحاب کہف اور رقیم سے زیادہ حیران کن اور تعجب خیز ہیں۔ کہف اصل میں کھلی غار کو کہتے ہیں جو پہاڑ کے اندر ہو۔ الرقیم کے متعلق علماء کا اختلاف ہے سعید بن جبیر فرماتے ہیں اس سے مراد وہ تختی ہے جس پر اصحاب کہف کے اسماء اور ان کا قصہ درج تھا (یہ قول تمام اقوال سے زیادہ ظاہر ہے) اس تختی کو لوگوں نے اس غار کے منہ پر رکھ دیا تھا اور وہ تختی تانبے کی تھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ چتر کی تھی۔ اس تاویل پر رقیم یعنی مرقوم ہوگا یعنی لکھا ہوا اور رقم کا معنی لکھنا ہے۔ ابن عباس سے حکایت ہے کہ رقیم ایک وادی کا نام ہے جس میں ان کی غار تھی۔ اس صورت میں رقیم رقبہ الوادی سے مشتق ہوگا جس کا معنی وادی کا کنارہ ہے۔ کعب الاحبار فرماتے ہیں یہ اس وادیات کا نام ہے جس سے اصحاب کہف نکلے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ پہاڑ کا نام ہے جس میں غار تھی۔ بعض علماء فرماتے اصحاب رقم کوئی دوسرے افراد تھے جو اصحاب کہف کے علاوہ تھے۔ عبد بن حمید، ابن السکندر، ابن ابی خاتم، طبرانی اور ابن مردودہ نے نعمان بن بشیر سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول ﷺ کو اصحاب رقیم کے متعلق بیان فرماتے ہوئے سنا کہ یہ تین افراد تھے جو غار میں داخل ہوئے تھے (۱)۔ اسی حدیث کو احمد اور ابن منذر نے حضرت انس کے واسطے سے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ یہ پہلے لوگوں میں سے تین افراد تھے جو اپنے گھروں کیلئے خوراک طلب کرتے تھے۔ ایک دفعہ وہ باہر تھے کہ بارش شروع ہو گئی۔ انہوں نے دو دو کر ایک غار میں پناہ لی، اچانک ایک چٹان گر گئی جس کے ساتھ غار کا منہ بند ہو گیا۔ ان میں سے ایک نے مشورہ دیا کہ اپنا اپنا نیک عمل یاد کرو (اور اس کے واسطے سے دعا کرو) ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ اس نیک عمل کی برکت سے ہماری حالت زار پر رحم فرمائے۔ ان میں سے ایک نے کہا ایک دن میں نے مختلف مزدوروں کو کام پر لگایا تھا پھر ایک شخص دو پیہر کو آیا اور بقیہ وقت اس نے ان کی طرح مزدوری کی، میں نے دوسرے مزدوروں کی طرح اس (نصف دن) کام کرنے والے کو بھی پورے دن کی مزدوری دے دی۔ ان مزدوروں میں سے ایک مزدور ناراض ہو گیا اور اپنی اجرت چھوڑ کر چلا گیا۔ میں نے اس کی اجرت کو گھر میں علیحدہ رکھ دیا پھر میرے پاس سے ایک گروہ گزارا تو میں نے اس سے اس مزدور کی اجرت کے بدلے ایک اونٹنی خرید لی۔ وہ اونٹنی مشیت الہی کے مطابق بڑھتی رہی۔ پھر وہی مزدور بیرانہ سالی کے عالم میں میرے پاس واپس آیا، میں تو اسے پہچان بھی نہ سکا۔ اس نے کہا میرا تیرے پاس کچھ تو باقی ہے۔ اس نے یاد دلا دیا تو مجھے یاد آیا۔ میں نے اس کو اونٹنی اور اس کی اولاد سب پیش کر دی، اس شخص نے دعا کی یا اللہ اگر میں نے یہ سب عمل تیری رضا کے لئے کیا تھا تو اس کے واسطے سے ہمیں اس غار سے باہر نکال دے، چنانچہ تھوڑی سی اپنی

جگہ سے ہٹ گئی تھی کہ انہیں کچھ روشنی نظر آنے لگی۔ دوسرے نے کہا میں ماند ارتھا، جبکہ لوگ قحط اور تنگی میں مبتلا تھے۔ میرے پاس ایک عورت آئی، اس نے مجھ سے نیکی کرنے کا سوال کیا تو میں نے اسے کہا تم اپنا آپ میرے حوالے کرو تو میں تجھ سے نیکی کروں گا۔ اس نے انکار کیا پھر وہ تین مرتبہ آئی (لیکن ایسا ہی مطالبہ ہوا لیکن اس نے انکار کیا) پھر اس نے اپنے خاوند سے اس بات کا تذکرہ کیا، خاوند نے کہا اس کی بات مان لے اور اپنے بچوں کے سلسلہ میں میری معاونت کر پھر وہ لوٹ کر آئی اور اس نے اپنا آپ میرے حوالے کر دیا۔ جب میں نے اس کا ستر گھولا اور اس سے بدکاری کا ارادہ کیا تو اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔ میں نے کہا تجھے کیا ہوا۔ اس عورت نے کہا مجھے اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے کچھ لائق ہو گئی ہے میں نے کہا تو اس بھوک اور شدت کے عالم میں اپنے پروردگار سے ڈر رہی ہے اور میں اس شوخالی کے حالات میں اس سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ میں نے اس عورت کو چھوڑ دیا اور خواہش کے مطابق مال بھی دیا، یا اللہ اگر میں نے یہ بدکاری تیری وجہ سے چھوڑی تھی تو ہماری یہ مشکل دور فرما دے چنانچہ تھوڑی سی اور اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھی کہ وہ ایک دوسرے کو پہچانتے لگے، میرے نے کہا، میرے بوڑھے والدین تھے اور میری بکریاں بھی تھیں میں پہلے اپنے والدین کو کھلاتا اور پلاتا تھا پھر اپنی بکریوں کے چارہ وغیرہ کا بندوبست کرتا تھا۔ ایک دن بکریوں کے سلسلہ میں میری اتنی مصروفیت ہوئی کہ میں شام کے وقت لوٹا، گھر پہنچا، دودھ دوہنے والا برتن لیا۔ پھر اس میں دودھ دوہا لیکن والدین کے پاس دودھ لے کر پہنچا تو وہ سوچکے تھے، میں نے انہیں بیدار کرنا آداب کے خلاف سمجھا، میں وہاں ہاتھ میں برتن لے کر بیٹھ گیا، حتیٰ کہ صبح کے وقت وہ بیدار ہوئے تو میں نے انہیں دودھ پیش کیا۔ یا اللہ اگر میں نے یہ عمل فقط تیری رضا کیلئے کیا تھا تو ہم سے یہ تکلیف دور فرما۔ اللہ تعالیٰ نے اس چٹان کو بنا دیا اور وہاں پر نکل آئے۔

إِذْ أَوْسَىٰ الْفُجَّيَّةَ إِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا مِن لَّدُنكَ رَحِمَةً وَهِيَ لَنَا مِن
أَمْرِنَا رَبَّنَا ۝۱۱

” (یاد کرو) جب پناہ لی ان جوانوں نے غار میں لے پھر انہوں نے دعا مانگی اے ہمارے رب ہمیں مرحمت فرما اپنی

جناب سے رحمت اور مہیا فرما ہمارے لیے اس کام میں ہدایت۔ ع۔“

۱۔ اوی کا معنی پناہ لینا ہے، یعنی انہوں نے ایک جگہ کو اپنی منزل بنایا۔ امام بغوی فرماتے ہیں بیخوشی پہاڑ میں غارتھی جس کا نام جرم تھا (۱)۔ اس میں یہ نوجوان داخل ہوئے تھے، اور دعا کی تھی کہ اے ہمارے پروردگار دین تینوں کی طرف ہمیں ہدایت عطا فرما، اور ہماری خفاؤں کو معاف فرما دے اور ہمیں رزق بھی عطا فرما اور دشمن کے ظلم سے ہمیں محفوظ فرما۔

۲۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں قبیضہ کا اصل معنی کسی چیز کو نئے سرے سے تیار کرنا ہے (۲) مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں جو تو نے اپنی جناب سے ایمان و اطاعت کا نور عطا فرمایا اور کفار سے علیحدگی اور نفرت کی توفیق بخشی ہے، اس میں ہمیں استقامت اور ثبات عطا فرما۔ یا یہ معنی کہ ہمارے امور کو باعث ہدایت بنا دے۔ جیسا کہ تیرا قول ہے راعت منک رشدا یعنی حق کے راستہ پر ہمیں چنگلی اور استقامت عطا فرما۔ قاموس میں بھی اسی طرح ہے۔ نیز قاموس میں ہے کہ رشدا اور شادا اب نصر اور فرخ میں استعمال ہوتا ہے اور اس کا معنی ہدایت پانا ہے۔ رشید جو اللہ تعالیٰ کا صفاتی اسم ہے اس کا معنی سیدہ راستہ کی طرف راہنمائی کرنے والا ہے اور جس کی ہر تقدیر اور انداز میں حسن و کمال ہو۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں کہ ان جوانوں کے غار میں جانے کے سبب میں اختلاف ہے۔ محمد بن اسحاق لکھتے ہیں کہ عیسائیوں سے اپنا دین خلط ملط ہو گیا۔ اور گناہوں میں ملوث ہو گئے اور ان میں بادشاہ سرکشی میں مبتلا ہو گئے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بتوں کی پوجا پالت کرتے اور بتوں کیلئے جانور ذبح کرتے۔ لیکن کچھ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر مضبوطی سے قائم تھے۔ اور اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ اس علاقہ کا بدکار و بت پرست روم کا بادشاہ دقیانوس بھی تھا۔ یہ بتوں کی عبادت کرتا اور بتوں کیلئے جانور ذبح کرتا اور اپنی اس غلط روش کا پرچار کرتا۔ جو اس کی مخالفت کرتا اسے قتل کر دیتا تھا۔ وہ روم کے جس شہر میں جاتا، وہ کسی عیسائی کو نہیں چھوڑتا تھا، وہ انہیں بتوں کی پرستش اور بتوں کیلئے جانور ذبح کرنے کا حکم دیتا۔ وہ مان جاتا تو فہما ورنہ اسے قتل کر دیتا۔ حتیٰ کہ بادشاہ روم اس شہر میں جا پہنچا جو اصحاب کبف کا شہر تھا۔ اس کا نام افسوس تھا جب دقیانوس کسی شہر میں آتا تو دین مسیح کے پیروکار بہت پریشان ہوتے، چھپ جاتے اور بھاگ جاتے۔ وہ دقیانوس اہل ایمان کو تلاش کرنے کا حکم دیتا۔ لوگ اہل ایمان کو پکڑ کر لاتے تو وہ انہیں قتل یا بت پرستی کا اختیار دیتا۔ کچھ لوگ عارضی زندگی کو ترجیح دیتے اور کچھ غیر کی عبادت سے انکار کر دیتے۔ جو انکار کرتے وہ انہیں قتل کر دیتا۔ جب اس ظالم بادشاہ اور اس کے جوانوں نے اہل ایمان کی چٹائی دکھی تو وہ اہل ایمان کو تکلیف دینے اور قتل کرنے کے درپے ہو گئے، وہ انہیں قتل کرتے اور پھر ان کے اعضا، ٹوکڑے، ٹکڑے کر دیتے۔ پھر ان کے کتے ہوئے اعضا، ٹوکڑے اور یاروں پر نفاذ دیتے۔ جب اس بادشاہ کا قتلہ روز بروز بڑھتا گیا تو یہ نوجوان بہت پریشان ہوئے اور اپنی نماز، روزہ، صدقہ، تسبیح اور دعائیں مشغول ہو گئے۔ یہ روم کے کئی سو اشرافاء کے بیٹے تھے۔ یہ آٹھ افراد تھے اس آرزو میں کہ اللہ کی بارگاہ میں لڑکر آئے۔

وَنَارًا رَبِّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَنْ نَدْعُو مِنْ دُونِهِ إِلَهًا لَقَدْ قُلْنَا إِذَا شَطَطْنَا إِنَّا عَبْدُنَا غَيْرُهُ

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار، آسمانوں اور زمین کے مالک ہم اللہ کو چھوڑ کر کسی اور خدا کو پکارتیں تو ہم حد سے تجاوز کرنے والے ہوں گے اگر ہم کسی غیر کی عبادت کریں، اپنے ایماندار بندوں سے یہ آرزو میں دو فرما دے اور اس مصیبت کو دفع فرما دے تاکہ تیرے بند سے اعلانیہ تیری عبادت کر سکیں۔ وہ اپنی عبادت گاہ میں یہ دعائیں مانگ رہے تھے کہ پولیس پہنچ گئی۔ انہوں نے انہیں مسجدوں کی حالت میں اللہ کی بارگاہ میں تضرع و زاری کرتے ہوئے پایا۔ سپاہیوں نے کہا تم نے بادشاہ کے حکم سے کیوں سرتابی کی ہے؟ بادشاہ کے پاس چلو؟ وہ انہیں دقیانوس کے پاس لے گئے اور کہا بادشاہ سلامت آپ لوگوں کو بت پرستی اور بتوں کی پوجا جو ذبح کرنے کیلئے جمع کرتے ہیں، جبکہ یہ نوجوان جو تمہارے خاندان سے ہیں، تیرے حکم کا مذاق اڑاتے ہیں اور تیرے فرمان کی نافرمانی کرتے ہیں۔ جب بادشاہ نے یہ سنا تو انہیں بلایا۔ وہ نوجوان آئے تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور چہروں پر گرد و غبار تھا۔ بادشاہ نے پوچھا تم ہمارے بتوں کیلئے جانور ذبح کیوں نہیں کرتے؟ جن بتوں کی سطح زمین پر پوجا کی جاتی ہے، تمہیں تو دوسرے لوگوں کیلئے نمونہ بننا چاہیے تھا۔ میں تمہیں اختیار دیتا ہوں یا تو تم ہمارے بتوں کیلئے جانور ذبح کرو یا میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ مکملیبتا جوان جوانوں نے بڑا تھا، اس نے کہا ہمارا ایک خدا ہے جس کی عظمت سے آسمان لبر لبر ہیں۔ ہم اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہیں کرتے۔ سب تعریفیں سب بڑائیاں اور سب عیوب و نقائص سے پاک ہونا ہی کو زیبا ہے۔ ہم صرف اسی کی عبادت کرتے ہیں، اسی سے نجات و کاسیالی کی سوال کرتے ہیں اور تمہارے یہ اثراتے ہوئے بت ہم تو ان کی عبادت نہیں کرتے۔ جو تیرے جی میں آئے کر (یہ وہ نظریہ تھی جسے ترشی اتار دے) مکملیبتا کے دوسرے ساتھیوں نے بھی اس کی طرح بادشاہ کو منہ پر کھری کھری سنا دیں۔ جب انہوں نے اپنے عزم و استقلال کا مظاہرہ کیا تو

پہلے بادشاہ نے ان کے شاہی لباس اترا دیے۔ پھر کہا میں دوسرے امور مملکت سے فارغ ہو کر تمہیں وہ سزا دوں گا جس کا میں نے تمہارے متعلق فیصلہ کیا ہے، مجھے اس وقت سزا دینے سے کوئی چیز مانع نہیں ہے لیکن میں صرف تمہارا عقوان شباب دیکھ کر تمہیں مہلت دے رہا ہوں۔ اس مہلت میں تم غور و فکر کرو اور اپنی ناقص عقلوں کو ہماری باتوں کی طرف متوجہ کر لو۔ پھر اس نے ان کے زیورات اتارنے کا حکم یا اور باہر لے جانے کا فرمان جاری کیا۔ دقیقاً نوں انہیں چھوڑ کر کسی کام کیلئے دوسرے شہر چلا گیا۔ ان نوجوانوں کو جب اس کے چلے جانے اور جلدی واپس آنے کا پتہ چلا تو انہیں خدشہ لاحق ہوا کہ وہ آئے گا تو ہمیں پھر بلا لے گا۔ نوجوانوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہم میں سے ہر ایک اپنے باپ کے گھر سے کچھ خرچ لے آئے، جس میں سے کچھ صدقہ کرے اور کچھ سے سامان خورد و نوش خریدے۔ ایسا کرنے کے بعد وہ شہر کے قریب ایک غار میں اس میں چلے جائیں گے جو بیخوس پہاڑ میں تھی، وہ اس میں رہیں گے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہیں گے نیز مشورہ یہ ہے کہ جب دقیقاً نوں واپس آئے گا تو ہم سب اس کے پاس جائیں گے اور اس کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے، وہ جو چاہے کرے (ہم عقائد حقہ سے روگردانی نہیں کریں گے)

یہ مشورہ طے ہو گیا تو سب اپنے اپنے باپ کے گھر گئے، خرچ لیا۔ کچھ صدقہ کیا اور باقی ساتھ لے کر غار کی طرف چل پڑے۔ ان کا ایک کتا تھا وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا حتیٰ کہ وہ غار میں پہنچ گئے اور اس میں ٹھہرنے لگے۔ کلاب اخبار کا بیان ہے وہ کتے کے قریب سے گذرے تو وہ ان کے پیچھے چل پڑا، انہوں نے اسے دھتکارا لیکن پھر وہ پیچھے مڑ آیا۔ کئی دفعہ انہوں نے اسے بھگایا لیکن وہ پھر واپس آ گیا (اللہ تعالیٰ نے کتے کو قوت کو پائی عطا فرمائی) اس نے کہا، اے لوگو! تم مجھ سے کیا جانتے ہو، میرے متعلق تم کچھ اندیشہ نہ کرو میں اللہ کے محبوب بندوں سے پیار کرتا ہوں۔ تم سو جاؤ، میں تمہاری حفاظت کروں گا۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ نوجوان رات کے اندھیرے میں دقیقاً نوں سے بھاگ گئے تھے اور ان کی تعداد سات تھی۔ یہ ایک چرواہے کے پاس سے گذرے جس کے ساتھ ایک کتا بھی تھا اس چرواہانے ان نوجوانوں کا دین قبول کر لیا اور ان کے ساتھ چل پڑا اور اس کا کتا بھی ان کے پیچھے ہو گیا۔ وہ شہر سے نکل کر غار کی طرف چلے گئے جو شہر کے قریب تھی۔

ابن عباس فرماتے ہیں وہ اس غار میں نماز، روزہ، تسبیح۔ تکبیر، تہجد میں بھی مصروف رہے۔ انہوں نے اپنا خرچ تمہلنے کے پاس جمع کر لیا۔ وہ ان کے لئے شہر سے خفیہ طور پر کھانا لاتا تھا۔ یہ سب سے خوبصورت اور مضبوط جسم والا تھا۔ جب وہ شہر میں جاتا تو اپنے عمدہ کپڑے اتار کر مساکین کا لباس پہن لیتا، جن میں مساکین کھانا طلب کرتے تھے۔ وہ ایک سگ لے کر شہر کو جاتا، کھانے، پینے کی چیزیں خریدتا اور لوگوں سے حالات معلوم کرتا کہ ان کا ذکر شہر میں کچھ ہوا ہے یا نہیں۔ پھر وہ اپنے اصحاب کی طرف لوٹ جاتا۔ وہ غار میں کچھ مدت ٹھہرے رہے۔ دقیقاً نوں شہر کو واپس آیا تو اس نے شہر کے سرداروں کو بلایا تو تمام نے بتوں کیلئے جانور ذبح کیے اہل ایمان بادشاہ کی آمد سے گھبرائے، تمہلنا جو شہر میں اپنے ساتھیوں کیلئے کھانے، پینے کا سامان لینے آیا تھا وہ اپنے ساتھیوں کے پاس لوٹ کر گیا تو رو رہا تھا اور ساتھ کھانا بھی قلیل مقدار میں لے گیا تھا تمہلنا نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ وہ ظالم بادشاہ شہر میں پہنچ چکا ہے اور وہ ہماری تلاش میں ہے۔ سب ساتھی غار میں ہی سر بسجود ہو گئے اور اللہ تعالیٰ سے آدو دفاع کرنے لگے اور تندرہ آزمائش سے پناہ طلب کرنے لگے۔ پھر تمہلنا نے کہا اے بھائیو! اپنے سر اٹھاؤ اور کھانا کھاؤ، اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل کرو۔ انہوں نے سجدوں سے سر اٹھائے، جبکہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، انہوں نے کھانا، کھایا تقریباً یہ غروب آفتاب کا وقت تھا پھر وہ گھنگو کرنے بیٹھ گئے اور

ایک دوسرے کو تعظیم دینے لگے اور نصیحت آمیز باتیں کرنے لگے۔ اسی اثناء میں اللہ تعالیٰ نے غار میں ان کے کانوں کو بند کر دیا۔ اور ان کا کتا ہاتھ پھیلائے غار کے دروازہ پر بیٹھ گیا۔ کتے پر بھی ایسی ہی غنوغی طاری ہو گئی تھی جیسے ان پر طاری ہوئی تھی، وہ سب ایمان و ایقان کی حالت میں سو گئے اور ان کا خرچ ان کے سروں کے قریب پڑا تھا۔ جب دوسرا دن ہوا تو دقیانوس نے انہیں تلاش کیا لیکن وہ نہ ملے۔ بادشاہ نے اپنے کسی ساتھی سے کہا ان جوانوں کے معاملہ نے تو مجھے پریشان کر رکھا ہے، جو یہاں سے بھاگ گئے ہیں۔ انہوں نے یہ خیال کیا کہ مجھے ان پر بہت غصہ ہے، یہ ان کی میرے معاملات سے ناشناسی کی وجہ سے ہوا ہے ورنہ اگر وہ میرے خدا کی عبادت کرتے اور اپنے دین سے توبہ کرتے تو میں انہیں چھوڑ دیتا۔ شہر کے سرداروں نے کہا جناب یہ لوگ رحم کے قابل نہیں جنہوں نے آپ کے حکم سے سرتابی کی بے اور فرامین شاہی کی نافرمانی کی ہے۔ جناب نے انہیں مہلت دی تھی اگر وہ چاہتے تو اس مہلت کو نعمت سمجھ کر لوٹ آتے۔ لیکن انہوں نے اپنے دین کو نہیں چھوڑا۔ جب سرداروں نے بادشاہ سے یہ بات کی تو وہ پھر غصہ میں لال پیلا ہو گیا۔ اس نے ان جوانوں کے والدین کو بلوایا اور ان سے ان جوانوں کے متعلق پوچھا، اور کہا مجھے ان نافرمان بیٹوں کے متعلق بتاؤ جنہوں نے میرے حکم کی سرتابی کی ہے۔ ان کے باپوں نے کہا ہم نے تو تیری نافرمانی نہیں کی ہمیں اس سرکش گروہ کی وجہ سے کیوں قتل کرتا ہے جو ہمارے مال بھی اٹھا کر لے گئے تھے اور پازاروں میں انہیں ہلاک کر دیا۔ اور پھر وہ نیکلوس پیمار کی طرف چلے گئے تھے۔ جب انہوں نے یہ گفتگو کی تو بادشاہ دقیانوس نے ان کو آزاد کر دیا۔ اب اسے کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ ان جوانوں کے ساتھ کیا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے بادشاہ کے دل میں یہ ڈال دیا کہ وہ غار کا منہ بند کر دے۔ حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ فرمایا تھا کہ ان جوانوں کو عزت و اکرام عطا فرمائے اور انہیں بعد میں آنے والے لوگوں کیلئے نشانی بنائے اور لوگوں پر ان کی زندگی اور موت سے یہ حقیقت کھل جائے کہ قیامت واقعی قائم ہوگی اور اللہ تعالیٰ قیامتوں سے مردوں کو اٹھائے گا۔ دقیانوس نے حکم دیا کہ غار کا منہ بند کر دیا جائے، اور کہا کہ اسی غار میں انہیں رہنے دو جو انہوں نے خود اپنے لئے پسند کی ہے، خود بخود اندر بھوکے اور پیاسے مر جائیں گے اور یہ غار جو انہوں نے پسند کی ہے ان کے لئے قبر بن جائے گی۔ بادشاہ کا خیال تھا کہ وہ بیدار ہیں اور جو کچھ ان کے ساتھ ہو رہا ہے وہ اس سے باخبر ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی روجوں کو اس طرح نکال لیا تھا جس طرح سونے والوں کی روجوں کو اپنے قبضہ میں لے لیتا ہے، اور ان کا کتا غار کے دہانے باز و پھیلائے بیٹھا تھا، اور اس پر بھی وہ غنوغی طاری ہو گئی تھی جو ان پر طاری تھی۔ وہ دائیں بائیں کمرہیں بدلتے رہے۔ بادشاہ، دقیانوس کے گھر دو آدمی ایسے تھے۔ جنہوں نے اپنا ایمان پوشیدہ رکھا ہوا تھا، ایک کا نام بندروس اور دوسرے کا نام ایماش تھا۔ انہوں نے مشورہ کیا کہ ان جوانوں کے حالات، ان کے نسب، ان کے اسما اور واقعات کو سکے کی تختیوں پر لکھ دیں اور پھر انہیں تانبے کے تابوت میں رکھ دیں اور تابوت کو پھر ایک عمارت میں نصب کر دیں۔ شاید اللہ تعالیٰ ان جوانوں پر کسی مومن قوم کو قیامت سے پہلے مطلع فرمادے اور جب یہ کتبہ پڑھے گا تو ان کی غار کو خود نے والا ان کے حالات سے باخبر ہو جائے گا۔ انہوں نے مشورہ کے مطابق تختیاں نصب کر دیں پھر دقیانوس اپنی عمر پوری کرنے کے بعد عمر گئے۔ زمانہ گذرتا رہا، بادشاہ کیے بعد دیگرے آتے رہے، عمید بن عمیر فرماتے ہیں اصحاب کہف ایسے نوجوان تھے جن کے گلوں میں طوق تھے اور ہاتھوں میں سنگن، ان کے ہال لیے لیے تھے اور ان کے ساتھ ایک شکاری کتا بھی تھا وہ اپنے زرق برق لباس پہن کر ایک میلہ کی طرف گئے تھے، ان کے ساتھ ان کے وہ بت بھی تھے جن کی وہ پوجا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان کا نور پیدا فرمادیا۔ ان میں سے ایک بادشاہ کا وزیر تھا، یہ لوگ سب مومن بن

گئے تھے لیکن ہر ایک اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھے ہوئے تھا۔ انہوں نے سوچا کہ ہم اس قوم کے درمیان سے کھل جائیں تاکہ ان کافروں پر نازل ہونے والا عذاب ہم پر نہ آجائے۔ ان میں سے ایک جوان نے پہل کی، وہ نکل کر ایک درخت کے نیچے ٹپکھہ جا بیٹھا پھر دوسرا نکلا، اس نے پہلے کو ٹپکھہ بیٹھے ہوئے دیکھا تو امید کی کہ شاید یہ بھی میری طرح ایمان قبول کر چکا ہو لیکن معاملہ کو ظاہر نہ کر رہا پھر تیسرا نکلا، وہ ایک جگہ اکٹھے ہو گئے، ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ تم کیوں جمع ہوئے ہو ہر ایک خوف کی وجہ سے اپنے ایمان کو دوسرے سے چھپائے ہوئے تھا پھر وہ دودھ بکر نکلے اور ہر ایک نے اپنے ایمان کو دوسرے پر ظاہر کر دیا، وہ سب کے سب مسلمان ہو چکے تھے، اور ایک غار جو پہاڑ میں تھی وہ ان کے قریب تھی ایک دوسرے کو کہنے لگے کہ اس غار میں پناہ لو تمہارا پروردگار تمہارے اوپر اپنی رحمت کی چادر پھیلا دے گا۔ وہ غار میں داخل ہوئے اور ان کے ساتھ ایک شکاری کتا بھی تھا، وہ تین سو نو (309) سال سوئے رہے۔ وہ اپنی قوم سے ان کے اسما، نسب اور تاریخ لکھی کہ فلان بن فلان اور فلان ہمارے بادشاہوں کے بیٹے تھے اور ہم نے انہیں فلاں بن فلاں بادشاہ کے دور میں تم کیا تھا۔ پھر انہوں نے یہ تختی بادشاہ کے فرزند میں رکھ دی تاکہ اس کی عظمت بڑھ جائے۔ وہ بادشاہ مر گیا، اور اس طرح زمانہ اپنی گردش میں رہا۔

وہ بن مند کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کا ایک حواری اصحاب کہف کے شہر میں آیا، وہ اندر داخل ہونا چاہتا تھا کہ اسے کہا گیا کہ اس شہر کے گیٹ پر ایک بت ہے، اسے تہہ کر کے داخل ہونا ضروری ہے۔ حواری نے بت کو تہہ کرنا نہ پسند کیا۔ وہ شہر کے قریب ایک حمام میں آیا اور وہاں مزدوری کرنے لگا، اس نے حمام میں کام شروع کیا تو حمام کے مالک کو بہت برکت ہوئی۔ اور اس حواری کے کچھ اور شہری تو جوان دوست بن گئے، حواری انہیں زمین و آسمان کی خبریں سناتا تھی کہ وہ بھی مومن بن گئے اور اس کی تصدیق کی، حواری نے حمام کے مالک سے یہ شرط لگائی تھی کہ رات کو میری اپنی مصروفیت ہوگی۔ رات کے وقت میرے اور میری نماز کے درمیان کوئی حائل نہ ہوگا۔ حالات اسی طرح گذرتے گئے، ایک دن بادشاہ کا بیٹا ایک عورت کو لے کر حمام میں آیا، حمامی نے اسے شرم دلائی اور کہا تو شہزادہ ہے اور اس عورت کے ساتھ حمام میں داخل ہو رہا ہے۔ شہزادہ کو شرم محسوس ہوئی تو وہ واپس لوٹ گیا۔ ایک مرتبہ پھر شہزادہ ایک عورت لے کر آیا۔ حمامی نے پھر اسی طرح کہا تو شہزادے نے اسے گالیاں دیں اور اسے ڈانٹ دیا۔ اور حمامی کی بات کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور اندر داخل ہو گیا۔ وہ شہزادہ اور عورت حمام کے اندر ہی مر گئے۔ بادشاہ آیا تو اسے خبر ہوئی کہ حمام والے نے تیرے بیٹے کو قتل کر دیا ہے۔ اس نے حمامی کو تلاش کیا لیکن وہ نڈل سکا، وہ کہیں بھاگ کر چلا گیا تھا۔ بادشاہ نے پوچھا اس کے ساتھ کون رہتے تھے، اسے نو جوانوں کے نام بتائے گئے، ان نو جوانوں کو تلاش کیا گیا لیکن وہ شہر سے باہر نکل گئے تھے، راستہ میں ایک شخص کے پاس سے گذرے جو ان کی طرح ایمان لایا تھا وہ بھی ان کے ساتھ چل پڑا، اس کے ساتھ ایک کتا تھا وہ بھی ساتھ چل نکلا رات کے وقت وہ سب غار میں داخل ہوئے۔ آپس میں کہنے لگے، ہم رات یہاں گزاریں گے، صبح ہوگی تو پھر آئندہ کا پروگرام سوچیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر شہزادگی طاری فرمادی۔ بادشاہ اپنے ساتھیوں کی مدد سے ان کی تلاش میں نکلا، اسے پتہ چلا کہ وہ اس غار میں داخل ہوئے ہیں۔ بادشاہ کے اہلکاروں میں سے ایک نے غار کے اندر داخل ہونے کا ارادہ کیا تو اس پر ایسی وحشت اور رعب طاری ہوا کہ اس کی حالت دیکھ کر کوئی دوسرا داخل نہ ہوا۔ بادشاہ کو ایک ساتھی نے کہا کہ آپ انہیں قتل ہی کرنا چاہتے ہیں؟ بادشاہ نے کہا ہاں۔ اس نے کہا پھر غار کے دروازے پر دیوار بنا دو اور انہیں یہیں چھوڑ دو، خود بخود دھوکے پیاسے مر جائیں گے۔ بادشاہ نے اس کی تجویز پر عمل کرتے

ہوئے غار کا منہ بند کروادیا۔ وہب فرماتے ہیں غار کا منہ بند ہوئے زمانہ بیت گیا۔ ایک دفعہ ایک چرواہا کو غار کے قریب بارش آگئی، اس نے سوچا اگر میں اس غار کا منہ کھول دوں اور اپنی بکریاں اس میں داخل کر دوں تو بارش سے بچ جائیں گی۔ اس نے کوشش سے غار کا منہ کھول دیا۔ اللہ تعالیٰ نے صبح کے وقت دوسرے دن اصحاب کہف کی روحیں ان کے جسموں میں لوٹا دیں۔

محمد بن اسحاق فرماتے ہیں پھر ان شہروں کا بادشاہ نیک نامی آدمی بنا جس کا نام بید و بس تھا، اس کی بادشاہی کو جب 68 سال گزر گئے تو لوگوں نے اس کے ملک میں تحریب کاری شروع کر دی۔ اور مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔ کچھ لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے تھے اور قیامت کو حق جانتے تھے اور کچھ اس کا انکار کرتے تھے، نیک صالح بادشاہ کے دل پر یہ چیز بہت گراں گذری۔ وہ رونے لگا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التضرع و زاری کرنے لگا۔ اور بہت زیادہ پریشان ہوا۔ جب اس نے دیکھا کہ باطل کے پرستار زیادہ ہو رہے ہیں اور اہل حق پر دن بدن غالب آ رہے ہیں۔ منکرین حق کہتے ہیں کہ صرف یہی دینیوی زندگی ہے اور اس کے بعد رواج کو اٹھایا جائے گا۔ اجسام کو دوبارہ نہیں اٹھایا جائے گا۔ بید و بس نے نیک اور حق کے علمبرداروں کو بلایا اور پوچھا تو وہ بھی قیامت کے منکر نکلے حتیٰ کہ وہ بھی لوگوں کو حق اور حوروں کی ملت سے برگشتہ کرنے والے تھے۔ بادشاہ نے جب نیکوں اور حق کے ٹھیکیداروں کی یہ کیفیت دیکھی تو وہ پریشان ہو کر اپنے گھر داخل ہو گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ فقیرانہ لباس پہن لیا اور رکھ بچھا کر بیٹھ گیا۔ اتنی آہ و فغان تضرع و زاری میں زمانہ بیت گیا، وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرتا سے میرے پروردگار تو ان لوگوں کا اختلاف دیکھ رہا ہے، ان پر کوئی ایسی نشانی نازل فرما جو اس کے عقیدہ کے بظان کو واضح کر دے۔ چنگ و جنم اور جسم اپنے بندوں کی ہلاکت کو پسند نہیں فرماتا۔ اس کی مراد یہ تھی کہ اصحاب کہف پر مطلع فرما دے اور لوگوں کے سامنے ان کی شان بیاں کر دے اور ان پر رحمت اور دلیل بنا دے کہ ان کو یقین ہو جائے کہ قیامت آنے والی ہے اور اس میں ذرا برابر شک نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندے بید و بس کی دعا قبول فرمائی تاکہ اس پر اپنی نعمتوں کی تکمیل فرما دے اور نکھرے ہوئے اور ترقہ میں مبتلا معیشتوں کو جمع فرما دے۔ اللہ تعالیٰ نے اس شہر کے اولیاس نامی شخص کے دل میں یہ ڈال دیا کہ وہ اس غار کے منہ پر کھڑی دیوار کو گرا دے اور اس غار میں بکریوں کا پاڑا بنا دے، اس نے دو غلام اجرت پر لیے جنہوں نے پتھر بنانے شروع کر دیے۔ انہوں نے غار کا منہ صاف کر دیا اور دروازہ کھول دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان غار میں سوئے ہوئے لوگوں کو رعب اور دہشت کی وجہ سے دوسرے لوگوں کی آنکھوں سے چھپا دیا تھا جب دونوں مزدوروں نے دروازہ کھولا تو اللہ جو ساری قدرتوں اور قوتوں کا مالک ہے اس نے مردہ جو جوانوں کو زندہ کر دیا اور وہ غار میں خوش و خرم نورانی چروں اور پاکیزہ نفوس کے ساتھ بیٹھ گئے اور ایک دوسرے پر سلام کرنے لگے، یوں لگتا تھا گویا ابھی رات کی نیند سے بیدار ہوئے ہیں۔ انہوں نے اٹھ کر نماز ادا کی جس طرح وہ پہلے اٹھ کر نماز ادا کرتے تھے۔ ان کے چہروں اور رکتوں میں کچھ فرق نہ آیا تھا بالکل اسی ہیئت پر تھے جس پر وہ سوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ دقیق نوس ہماری طلب اور تلاش میں ہوگا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو تمہیں سے کہا جو کھانے، پینے کا منتظم تھا کہ تم شہر جا کر خبر لے آؤ کہ لوگ بادشاہ کے پاس ہمارے متعلق کیا کہہ رہے ہیں؟ ان کا خیال یہ تھا کہ معمول کے مطابق سوئے ہیں۔ اور یہ ان کا خیال تھا کہ پہلے کی نسبت کچھ زیادہ سوئے ہیں حتیٰ کہ ایک دوسرے سے اپنے سونے کے وقت کے متعلق پوچھنے لگے۔ بعض نے کہا بھائی تم کتنا وقت سوئے؟ دوسروں نے کہا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ پھر کہنے لگے تمہارا پروردگار بہتر جانتا ہے کہ تم کتنا وقت سوئے۔ ان کے ذہنوں میں یہ سونے کا وقت کچھ زیادہ نہ تھا۔ تمہیں لگتا ہے کہ تمہیں بلایا جائے گا، تمہیں بتوں کیلئے

جانور ذبح کرنے ہوں گے یا تمہیں قتل کر دیا جائے گا۔ جو اللہ چاہے گا وہ ہو کر رہے گا۔ مکمل مسلمان نے کہا یہاں تو اجماع اقصیٰ و مدعا اللہ تعالیٰ کی ملاقات ہے تو اللہ کے دشمن کے کہنے پر ایمان کی روشنی حاصل کرنے کے بعد کفر کا اندھیرا قبول نہ کرنا۔ پھر انہوں نے تلمیحا کو کہا کہ شہر جاؤ اور جا کر سنو کہ لوگ ہمارے متعلق کیا کہہ رہے ہیں اور دقیانوس کے پاس ہمارے بارے میں کیا کہہ کرے اور بڑی ہوشیاری سے جانا تاکہ کسی کوتاہی نہ ہو۔ اور ہمارے لیے کھانا بھی لے آنا لیکن پہلے کی نسبت زیادہ لانا کیونکہ ہم صبح سے بھوکے ہیں۔ تلمیحا نے ویسائی کیا جیسا کہ پہلے کرتا تھا، یعنی اچھا لباس اتار دیا اور اجنبی کپڑے لیے۔ پھر اپنے خرچ کے پیسوں سے ایک سدا لیا جس پر دقیانوس کی مہر لگی ہوئی تھی۔ تلمیحا غار سے باہر آیا اور دروازے سے گذرا تو غار کے دروازے سے پتھر پھینکے ہوئے تھے، اسے بڑا تعجب ہوا۔ پھر وہ آگے گزر گیا اور کوئی خاص توجہ نہ دی جب چھتے چھپاتے شہر کے دروازہ پر پہنچا تاکہ کوئی اسے دیکھ کر پتہ نہ لے۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ دقیانوس اور اس کی آل اولاد تین سو سال پہلے مر چکے ہیں۔ تلمیحا گیٹ پر آیا تو دیکھا کہ اس پر ایسی علامات تھیں جو اہل ایمان کی ہوتی ہیں، جبکہ شہر میں اہل ایمان کا غلبہ ہو۔ وہ یہ سب کچھ دیکھ کر بہت حیران ہوا، وہ چھپ کر ادھر ادھر دیکھتا کبھی دائیں اور کبھی بائیں دیکھتا پھر اس نے یہ دروازہ چھوڑا اور دوسرے دروازے پر گیا وہاں بھی اسلامی علامات و نشانات پائے، وہ سوچتا شاید میں کسی دوسرے شہر میں آ گیا ہوں۔ اس نے کئی لوگوں کو دیکھا جو آپس میں جو گفتگو تھے لیکن یہ لوگ پہلے موجود نہ تھے۔ اب وہ حیران و مشدد راجل رہا ہے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ پھر وہ اسی دروازہ کی طرف لوٹ گیا جس سے داخل ہوا تھا، وہ سوچتا یہ کیا ہوا ہے؟ لیکن کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ کل شام تک مسلمان ان اسلامی شعائر کو پسند کرتے تھے لیکن انہیں ظاہر نہیں کرتے تھے لیکن آج یہ سب کچھ ظاہر ہے، میں خواب تو نہیں دیکھ رہا پھر کہتا خواب تو نہیں ہے۔ اس نے چاروں اور اپنے سر پر ڈال دی۔ وہ سن رہا تھا کہ لوگ عیسیٰ بن مریم کے نام کی تمہیں کھا رہے ہیں۔ اس کا خوف و ہراس بڑھ گیا، وہ حیران و پریشان شہر کی فیصل سے نیک لگا کر بیٹھ گیا، دل میں سوچا کہ کل تک تو عیسیٰ علیہ السلام کا سوائے چند افراد کے نام لینے والا کوئی نہیں تھا۔ آج میں سن رہا ہوں کہ ہر شخص بغیر کسی خوف و ہچکچاہٹ کے عیسیٰ علیہ السلام کا نام لے رہا ہے۔ کہنے لگا شاید کوئی دوسرا شہر ہے جس میں میں پہنچ چکا ہوں لیکن قسم بخدا مجھے تو اس شہر کے قریب کسی دوسرے شہر کا علم ہی نہیں، وہ حیران و پریشان کھڑا ہو گیا۔ پھر ایک نوجوان سے پوچھا اس شہر کا نام کیا ہے جو ان نے کہا اس کا نام افسوس ہے دل میں کہا شاید میرا دامخ اپنی جگہ پر نہیں ہے، مجھے اس شہر سے جلدی نکل جانا چاہئے کہیں ایسا نہ ہو کہ رسوائی ہو اور کسی مصیبت سے دوچار ہونا پڑے پھر کچھ ہوش سنبھالا اور کہنے لگا اس سے قتل کہ لوگ مجھے پیمان لیں میں اگر نکل جاؤں تو زیادہ بہتر ہے، پھر وہ کھانا فروخت کرنے والوں کے قریب گیا، وہ سکہ نکالا جو اسکے پاس تھا۔ دوکاندار کو دیکر کھانا طلب کیا۔ دوکاندار نے وہ سکہ اور اس کی مہر دیکھ کر تعجب کیا اور پھر اسے دوسرے ساتھی کی طرف پھینک دیا، اس نے بھی اسی طرح اسے غور سے دیکھا اور اگلے دوست کی طرف پھینک دیا، وہ ایک دوسرے کو کہنے لگے اس شخص کے ہاتھ پرانے زمانہ کا کوئی خزانہ لگا ہے۔ جب تلمیحا نے ان کی یہ باتیں سنی تو انتہائی خوفزدہ ہوا، جسم پر کچھ طاری ہو گئی، تلمیحا کا خیال تھا کہ یہ مجھے پیمان چکے ہیں اور مجھے بادشاہ دقیانوس کے پاس لے جانا چاہتے ہیں۔ لوگ اکٹھا ہونا شروع ہو گئے، وہ اسے پیمانے کی کوشش کرتے لیکن پیمان نہ سکتے۔ تلمیحا نے انتہائی پریشانی کی کیفیت میں کہا تم مجھ پر مہر ہانی کہہ دو تم نے میرے پیسے بھی لے لئے اور واپس نہیں کیے اور کھانا بھی تم رکھ لو مجھے ضرورت نہیں ہے۔ لوگوں نے پوچھا تو ہے کون اور تیرا کام اور معاملہ کیا ہے، قسم بخدا تجھے پہلے لوگوں کا کوئی خزانہ ملا ہے تو اسے ہم سے چھپانا چاہتا ہے۔ ہمارے ساتھ چلو اور ہمیں وہ خزانہ دکھاؤ اور ہمیں اس میں شریک

کرد۔ ہم تیرا از کسی کو نہیں بتائیں گے اگر تو نے ہمیں اپنا وہ خزانہ نہ دکھایا تو ہم تجھے بادشاہ کے پاس لے جائیں گے، ہم تجھے اس کے حوالہ کریں گے اور وہ تجھے قتل کرے گا۔ جب تمہیلنے نے ان کی یہ کراخت کلام سنی تو کہا جس بات کا مجھے خندہ تھا وہ تو ہو گئی۔ لوگوں نے کہا اسے جو ان تو ہم سے اس خزانہ کو چھپائیں سکتا تمہیلنے سوچ رہا تھا کہا اب نہیں کیا جواب دوں، خوف دہراں طاری تھا اور کچھ بول نہیں رہا تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ بولتا نہیں ہے تو انہوں نے اس کی چادر اتاری اور اسے اس کی گردن میں ڈال کر شہر کی گلیوں میں کھینچنے لگے، حتیٰ کہ سب لوگوں کو اس کی خبر ہو گئی۔ لوگوں نے پوچھا تو بتایا کہ اس شخص کے پاس خزانہ ہے۔ شہر کے بچے بوڑھے سب جمع ہو گئے، اسے گھور گھور کر دیکھنے لگے اور کہتے یہ اس شہر کا باشندہ نہیں ہے ہم نے تو اسے کبھی نہیں دیکھا ہے، تمہیلنے کو بھگت نہیں آ رہا تھا کہ انہیں کیا جواب دے، جب خوف زیادہ ہوا تو وہ ساکت و جامد کھڑا ہو گیا اسے یقین تھا کہ اس کا باپ اور اس کے بھائی اسی شہر میں ہیں اور اس کا تعلق شہر کے امراء سے ہے۔ جب وہ پیش گئے تو اسے چھڑا کر لے جائیں گے، وہ اسی انتظار میں تھا کہ ابھی میرے خاندان کا کوئی فرد آ جائے گا اور ان ظالم ہاتھوں سے مجھے رہائی دلائے گا۔ پھر انہوں نے اسے اٹھایا اور شہر کے ارباب ہست و کشاد کے پاس لے گئے۔ وہ شہر کے دونوں رئیس بہت نیک صلاح فطرت تھے۔ ایک کا نام اریوں اور دوسرے کا نام اٹھلیوں تھا۔ جب تمہیلنے کو ان سرداروں کے پاس لے جا رہے تھے تو وہ سوچ رہا تھا کہ اب یہ مجھے دو دنیاؤں کے پاس لے جا رہے ہیں، وہ بیچارہ کچھ بچی بچی ہوں سے دائیں بائیں دیکھتا اور لوگ اس سے اس طرح مذاق کرتے جیسے پاگل سے مذاق کیا جاتا ہے۔ تمہیلنے رونے لگا پھر اس نے آسمان کی طرف سراٹھا کر دعا کی اے اللہ اے آسمان اور زمین کے معبود آج مجھے میری دولت عطا فرما اور اپنی جناب سے روح کے ذریعے ظالم بادشاہ کے پاس میری مدد اور تائید فرما۔ دل میں سوچ رہا تھا کہ میری اور میرے بھائیوں کے درمیان اب جدائی ہو جائے گی، کاش انہیں معلوم ہوتا کہ میں کسی مصیبت میں گرفتار ہوں۔ اگر انہیں میری اس گرفتاری کا علم ہوتا تو ضرور میرے پاس پہنچتے اور ہم اکٹھے جا رہا بادشاہ کے سامنے جاتے اور ہم بھی زندگی اور موت میں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے۔ تمہیلنے یہ ساری باتیں اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ کاش وہ اپنی پر اپنے ساتھیوں کو یہ سب باتیں بتا سکتا۔ لوگ اسے دو نیک آدمیوں اریوں اور اٹھلیوں کے پاس لے گئے۔ تمہیلنے نے جب یہ دیکھا کہ اسے دو دنیاؤں کے پاس تو نہیں لے جایا گیا۔ اسے کچھ ہوش آیا، حواس درست ہو گئے اور رونانا بھی بند ہو گیا۔

اریوں اور اٹھلیوں سے نہ وہ سکا لیا، اسے غور سے دیکھا اور تعجب کا اظہار کیا پھر ایک نے تمہیلنے سے پوچھا یہ خزانہ کہاں کا ہے؟ جو تجھے ملا ہے تمہیلنے نے کہا مجھے کوئی خزانہ نہیں ملا بلکہ یہ تو وہ سکہ ہے جو مجھے اپنے آباء سے ملا ہے اور اس پر میری ہی شہر کی ہے لیکن قسم بخدا مجھے اپنے بارے میں بھی سمجھ نہیں آ رہی میں تمہیں کیا بتاؤں۔ ایک نے پوچھا تو کون ہے؟ اس نے کہا تمہیلنے میں اسی شہر کا رہنے والا ہوں۔ انہوں نے پوچھا تیرے باپ کا نام کیا ہے اور تجھے یہاں کوئی جانتا ہے۔ تمہیلنے نے اپنے باپ کا نام بتایا لیکن اس نام کا کوئی آدمی اسی شہر میں نہ تھا۔ اور کوئی آدمی ایسا نہ ملا جو اسے جانتا ہو۔ ایک سردار نے کہا تو جھوٹا ہے اور میں سچی بات نہیں بتا رہا۔ تمہیلنے کچھ سمجھ نہیں رہا تھا کہ انہیں کیا کیوں اور کیسے تسلی دوں، اس نے خاموشی سے آنکھیں زمین کی طرف جھکا لیں۔ قریب بیٹھے ایک شخص نے کہا یہ تو پاگل ہے۔ بعض نے کہا جنون نہیں ہے لیکن جان پوچھ کر پاگل بن رہا ہے تاکہ تم سے بھاگ جائے۔ ایک سردار نے کہا کیا تیرا یہ خیال ہے کہ تم تجھے آزاد کر دوں گے اور تیری یہ تصدیق کر دیں گے کہ یہ تمہیلنے باپ کی میراث میں ملا ہے۔ اس پر تو میرے تین سو سال پہلے کی ہے تو جو ان لڑکا ہو کر ہمیں بھنگا تا چاہتا ہے اور ہمارا مذاق اڑاتا ہے۔ ہمارے بال مفید ہیں اور تیرے ارد گرد شہر کے سردار اور نمبردار بیٹھے ہیں، اس شہر

کے خزانے ہمارے قبضہ میں ہیں، ہمارے پاس تو اس مہر کا کوئی درہم و دینار نہیں ہے، مجھے یہ خیال آ رہا ہے کہ تجھے قید کرنے کا حکم صادر کروں تاکہ تجھے سخت سزا دی جائے اور پھر تجھے اس وقت تک مجھوں رکھوں جب تک کہ تو خزانے کا اعتراف نہ کرے۔ جب حکام نے یہ دھمکی دی تو تمہیچا نے انہیں کہا تم پہلے مجھے ایک سوال کا جواب دو۔ اگر وہ تم سے صحیح جواب دے دیا تو میں بھی تمہیں وہ بتا دوں گا جو میرے پاس ہے، انہوں نے کہا پوچھو کیا پوچھتا ہے ہم تمہ سے کچھ نہ چھپائیں گے۔ اس نے پوچھا دقیانوس بادشاہ کا کیا ہوا؟ اسراروں نے کہا سچ زین پر اس نام کا بادشاہ ہم نہیں جانتے۔ یہ بادشاہ تو بہت زمانہ پہلے بلاک ہو چکا ہے، اس کے بعد کئی صدیاں بیت گئی ہیں۔ تمہیچا نے کہا میں سمجھتی ہوں کہ کوئی شخص بھی میری تصدیق نہیں کرے گا۔ ہم ایک جماعت تھے اور ایک دین کے پیروکار تھے اور وہ دین اسلام تھا۔ بادشاہ نے ہمیں بتوں کی عبادت اور ان کے لیے جانور ذبح کرنے پر مجبور کیا تو کل شام ہم اس سے بھاگ نکلے تھے۔ جب صبح ہم بیدار ہوئے تو میں اپنے ساتھیوں کیلئے کھانا لے لیتے اور حالات کا جائزہ لینے کیلئے نکلا۔ بالکل ہم اسی طرح تھے جیسا تم دیکھ رہے ہو۔ تم میرے ساتھ تھو جیلوس پہاڑی غار کی طرف چلو میں تمہیں اپنے ساتھیوں سے ملاقات کراتا ہوں۔

اریوں نے جب تمہیچا کی باتیں سنی تو کہا اسے میری قوم شاید یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہو جو تمہارے لیے اللہ تعالیٰ نے اس نوجوان کے ہاتھوں ظاہر فرمائی ہو، تم بھی ہمارے ساتھ چلو تاکہ یہ شخص ہمیں اپنے ساتھیوں سے ملائے۔ تمہیچا کے ساتھ اریوں، اٹھاپوس چل پڑے اور شہر کے بڑے چھوٹے سب لڑکے بڑے تاکہ اصحاب کہف کو دیکھیں۔ ادھر جب اصحاب کہف نے دیکھا کہ تمہیچا نے کھانا لانے میں دیر لگا دی ہے تو کہنے لگے گلتا ہے وہ پڑا گیا ہے اور اسے دقیانوس بادشاہ کے پاس بپنچا دیا گیا ہے۔ وہ یہی سوچ رہے تھے اور خوف کر رہے تھے کہ انہیں آوازیں اور ان کی طرف آتے ہوئے گھوڑوں کی ٹائیں سنائی دیں۔ ان کا خیال تھا کہ ظالم دقیانوس نے ہمیں پکڑنے کیلئے اپنے سپاہیوں اور کاندوہ کو بھیجا ہے۔ وہ نماز کیلئے کھڑے ہو گئے، ایک دوسرے پر سلام کہا اور وصیت فرمائی اور کہا ہم چلیں اور اپنے بھائی تمہیچا کو لے آئیں۔ وہ اب ظالم دقیانوس کے سامنے نظر ہو گا کہ ہم کب پہنچتے ہیں؟ یہ وہ ساری گفتگو غار کے اندر ہی کر رہے تھے، انہوں نے اندر سے اریوں اور اس کے ساتھیوں کو غار کے دروازہ پر کھڑے ہوئے دیکھا، تمہیچا اندر گیا تو دروازہ ہاتھوں نے اسے روتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی رونے لگے پھر انہوں نے اس کی تاشخری کی وجہ پوچھی تو اس نے پورا واقعہ تفصیل سے بیان کیا۔ اس وقت وہ سب جان گئے کہ وہ اللہ کے حکم سے اتنا طویل زمانہ غار میں سوئے رہے اور پھر بیدار ہوئے تاکہ لوگوں کیلئے آیت (نشانی) الہی اور قیامت کی تصدیق کا باعث بن جائیں اور لوگوں کو یقین ہو جائے کہ قیامت آنے والی ہے، اس کے وقوع میں ذرا شک نہیں ہے پھر تمہیچا کے پیچھے اریوں غار میں داخل ہوا تو اس نے (نحاس) تانبے کا صندوق دیکھا جس پر چاندی کی مہر لگائی تھی۔ وہ غار کے دروازہ پر رک گیا اور شہر کے ایک امیر کو بلا یا، اس نے ثابت کھولا تو اس میں رصاص کی دو تختیاں تھیں جن پر لکھا ہوا تھا کہ مکملینا، مخلصینا، تمہیچا، مرطونس، بشرطونس، میریوس، دیونس، مٹونونس نوجوان تھے جو دقیانوس بادشاہ سے بھاگ گئے تھے تاکہ وہ ظالم بادشاہ انہیں اپنے دین سے برگشتہ نہ کر دے اور وہ اس غار میں داخل ہوئے تھے۔ جب ان کے ٹھکانے کا پتہ چلا تھا تو پتھروں سے غار کا منہ بند کر دیا گیا تھا۔ اور ہم نے تحریر اس لیے لکھی ہے تاکہ بعد میں آنے والے ان لوگوں کو ان کی تاریخ و سیرت معلوم ہو جو انہیں پائیں۔ اور جب وہ اس تحریر کو پڑھیں تو توبہ کریں اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کریں۔

اس نعمت پر کہ اس نے اپنی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی دکھائی پھر ان نوجوانوں نے ان لوگوں کے بارے بتلایا جو

دقیقاً نوں بادشاہ کی قلم کی پتلی میں پس گئے تھے۔ پھر اریوس اور اس کے ساتھیوں نے ایک خط بیدوسیس بادشاہ کی طرف لکھا کہ وہ جلدی جلدی پہنچ جائے تاکہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی دکھ لے، جسے اللہ تعالیٰ نے تیرے دربار شاہی میں ظاہر فرمایا ہے اور اس نشانی کو تمام جانوں کیلئے نشانی بتایا ہے تاکہ ان کے لیے نور اور روشنی کا باعث بنے اور قیامت پر یقین کا سبب بنے، ان نوجوانوں کے پاس جلدی پہنچو جن کو اللہ تعالیٰ نے دوبارہ زندہ کیا ہے حالانکہ یہ تین سو سال قبل مر چکے تھے۔ بادشاہ کو جب یہ خبر پہنچی تو اس کے حواس درست ہو گئے اور طبیعت سنبھل گئی اور کہا اے آسمانوں اور زمین کے مالک میں تیری تعریف کرتا ہوں اور تیری بندگی کرتا ہوں اور تجھے ہر نقص اور عیب سے پاک جانتا ہوں، تو نے مجھ پر بڑا کرم فرمایا اور ہم فرمایا۔ تو نے اس نور کو نہیں بچھایا جو تو نے میرے آباء و اجداد کیلئے اور عبد صالح لوط علیہ السلام کو بادشاہ کیلئے روشن کیا تھا۔ جب ملک کے دوسرے باشندوں کو خبر ہوئی تو وہ بھی سوار ہو کر بادشاہ کے ساتھ نکل پڑے حتیٰ کہ انیسویں شہر میں پہنچے اور پھر غار کی طرف چڑھے۔ جب نوجوانوں نے بیدوسیس کو دیکھا تو خوش ہوئے اور جہ سے میں گر گئے۔ بیدوسیس ان کے سامنے کھڑا ہوا اور پھر دونوں ہو کر انہیں گلے لگایا۔ وہ بھی حمد و ثنا کرتے ہوئے اس کے سامنے بیٹھ گئے پھر نوجوانوں نے بیدوسیس سے کہا ہم تجھے اللہ کے سپرد کرتے ہیں، تجھ پر سلامتی اور اللہ کی رحمت ہو۔ اللہ تعالیٰ تیری اور تیرے ملک کی حفاظت فرمائے، اور ہم تجھے جن دنوں اس کے شر سے اللہ کی پناہ میں دیتے ہیں۔ بادشاہ ابھی وہیں کھڑا تھا کہ وہ اپنی خواب گاہوں کی طرف لوٹے اور سو گئے، اللہ تعالیٰ نے اسی وقت ان کی روحیں قبض فرمائیں۔ بادشاہ ان کی طرف گیا اور ان پر ان کے کپڑے ڈال دیے اور حکم دیا کہ ان میں سے ہر شخص کو سونے کے تابوت میں رکھا جائے، ہشام ہوئی تو بادشاہ سو گیا، خواب میں اسے اصحاب کوفہ کی زیارت ہوئی تو انہوں نے کہا ہم سونے اور چاندی سے پیدا نہیں کیے گئے ہم مٹی سے پیدا کیے گئے، ہیں اور مٹی کی طرف ہی جائیں گے۔ ہمیں غار کے اندر مٹی پر ہی چھوڑ دو، جس طرح ہم پہلے پڑے تھے حتیٰ کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ہمیں دوبارہ یہاں سے اٹھائے۔ بادشاہ نے اس وقت شیشم کی کڑی کے تابوت بنوانے کا حکم دیا۔ جب وہ ان کو چھوڑ کر چلے گئے تو اللہ تعالیٰ نے رعب و دہشت کے ذریعے ان لوگوں سے محبوب کر دیا۔ رعب و خوف کی وجہ سے کوئی شخص اندر داخل ہونے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ بادشاہ نے غار کے منہ پر مسجد بنانے کا حکم دیا جس میں لوگ نماز ادا کریں اور ان کی یادمانے کیلئے ایک اجتماع کیا اور پھر حکم دیا کہ ہر سال ان کی یاد میں ایک اجتماع کیا جائے۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ تمہیلنا کو جب نیک بادشاہ کے سامنے لایا گیا تو بادشاہ نے پوچھا تو کون ہے۔ تمہیلنا نے کہا میں اس شہر کا رہائشی ہوں اور اس نے بیان کیا کہ میں کل یا کچھ دنوں سے نکلا ہوں، اور بادشاہ نے پہلے نہ لکھا تھا کہ ایک نوجوان کا گروہ پہلے زمانہ میں آ گیا ہو گیا تھا اور ان کے اسٹارٹز میں سے ایک تختی کے اوپر لکھی ہوئی ہیں، اس نے وہ تختی منگوائی اور ان اسما کو دیکھا تو ان میں تمہیلنا کا نام بھی تھا پھر جب اس تختی سے دوسرے اسما بڑھے تو تمہیلنا نے کہا یہ میرے ساتھی ہیں، بادشاہ نے جب یہ سنا تو وہ اور اس کے ساتھ قوم کے چند افراد سوار ہوئے اور غار کے دروازے پر پہنچ گئے، اس تمہیلنا نے کہا مجھے چھوڑو تاکہ میں اپنے ساتھیوں کو خوشخبری سناؤں۔ کیونکہ اگر وہ تمہیں میرے ساتھ دیکھیں گے تو ذرا جا میں گے۔ تمہیلنا اندر داخل ہوا اور انہیں بشارت دی تو اللہ تعالیٰ نے اسی وقت ان کی روحیں قبض فرمائیں اور ان کے نشانات کو بھی مٹا دیا۔ باقی لوگ ان کو نہ دیکھ سکے (1)۔ ارشاد الہی اَوْ كَى الْفِتْيَةِ اِلَى الْكَهْفِ اِسْمِ اَوْتِدِكِ طَرَفِ اِشَارَةِ هِيَ۔

فَصَمَّ بِنَا عَلَى اَذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا ۝

”پس ہم نے بندہ کر دیئے ان کے کان (سننے سے) اس غار میں کئی سال تک جو گئے ہوئے تھے۔ لے۔“

یعنی ہم نے ان کے کانوں پر ایسے پردے ڈال دیئے جو آواز سننے سے مانع تھے یعنی ہم نے انہیں ایسی نیند سلا دیا کہ کوئی آواز انہیں بیدار نہیں کر سکتی تھی۔ یہاں مفعول کا حذف کیا گیا ہے جیسے بنی علیٰ لغز اقبہ کے جملہ میں مفعول حذف کیا گیا ہے۔ فی الکھف صر بنا کی طرف ہے اور سنین کی صفت عدداً اس لئے لگائی تاکہ کثرت پر دلالت کرے کیونکہ تھوڑی مقدار کو شمار نہیں کیا جاتا۔

ثُمَّ بَعَثْنَا لَهُمْ آيَاتٍ فَارْتَابُوا ۗ ﴿١٧﴾

”پھر ہم نے انہیں بیدار کر دیا تاکہ ہم دیکھیں کہ ان دو گروہوں میں سے کون صحیح شمار کر سکتا ہے اس مدت کا جو وہ (غار میں) ٹھہرے تھے۔ لے۔“

لے لتعلم کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو پہلے علم نہیں تھا اور اس واقعہ کے بعد علم ہو گا بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہمارا علم اولاً جس کا تعلق اس واقعہ سے استغناء تھا اب اس کا تعلق حالی بن جائے۔ اَفَلَا كَا مَعْنٰی غَايَةً ہے۔ ای مبتدا ہے اِحْصٰی فِعْلٌ مَّا ضِعْمٌ مَّفْعُولٌ اور لِمَالِئِہِوَا اس کا حال ہے اور ما مصدر یہ ہے۔ ای میں استفہام کا معنی پایا جاتا ہے اس لئے لتعلم میں تعلق کی صورت ہوگی۔ معنی یہ ہو گا کہ ان دو گروہوں میں سے کون زیادہ ان کے ٹھہرنے کے زمانہ کو صحیح ضبط میں لانے والا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں لام زائدہ ہے اور وما لئہو اِحْصٰی کا مفعول ہے۔ اور ما موصول ہے اور اَمَّا تَمْيِيزُ ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اِحْصٰی الاحْصَاءُ سے زائدہ حروف کے حذف کے ساتھ اسم تفصیل ہے جیسے عرب کہتے ہیں اِحْصٰی لِلْمَالِ۔ وَاَفْلَسَ مِنْ اِبْنِ الْعَدْلِفِ اور اَمَّا اُس فِعْلٌ کی وجہ سے

منسوب ہے جس پر یہ اسم خود دلالت کر رہا ہے۔ جیسا کہ کن کا قول ہے۔ وَاَضْرَبَ بِالسِّيُوفِ الْقَوَاسِمَا

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَأَهُم بِالْحَقِّ ۗ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَرَدُّنَاهُمْ وَهَدٰى ۗ ﴿١٨﴾

”اے حبیب) ہم بیان کرتے ہیں آپ سے ان کی خبر ٹھیک ٹھیک وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے ان کے (نور) ہدایت میں اضافہ کر دیا۔ لے۔“

لے نبیہم میں ہم ضمیر کا مرجع اصحاب کہف ہیں۔ فِتْنٰی کی جمع فتنیۃ ہے جیسے صبی کی جمع صبیۃ ہے اس کا معنی نوجوان ہے۔ یعنی جب وہ اپنے رب پر ایمان لائے تو ہم نے حقیقی ایمان عطا فرمایا جو نفس کی فناء کے بعد حاصل ہوتا ہے، اور اس ایمان کا مرتبہ اس ایمان مجازی سے کئی درجہ بلند ہوتا ہے جو اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب کے ساتھ ہوتا ہے۔ جس کے ہوتے ہوئے نفس سرکش اور کفرانِ نعمت کا ارتکاب کرنا ہوتا ہے۔

وَمَا يَسْطَآءُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا اَمْ يَبْكُرُ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَنْ لَّنْ يُّدْعُوْا
مِنْ دُوْبَةٍ اِلٰهًا تَقْدُوْنَا اِذَا سَطَطْنَا ۗ ﴿١٩﴾

”اور ہم نے مضمبوط کر دیا ان کے دلوں کو جب وہ راہ میں کھڑے ہو گئے لے تو انہوں نے (بر ملا) کہہ دیا ہمارا پروردگار وہ ہے جو پروردگار ہے آسمانوں اور زمین کا ہم ہرگز نہیں پکاریں گے اس کے سوا کسی معبود کو (اگر ہم ایسا کریں) تو گو یا ہم نے اسکی بات کئی جو حق سے دور ہے۔ لے۔“

یعنی ترک وطن، مال و اولاد کی جدائی پر ہم نے انہیں صبر کی دولت سے نوازا اور اظہار حق کی جرات کا جذبہ عطا فرمایا اور ظالم حکمران و قیانوس کے غلط عقائد اور فاسد نظریات کو برسرِ محفل رد کرنے کی ہمت عطا فرمائی اور ساری جراتیں، یہ ساری ہمتیں فنا، قلب کے بعد ہوتی ہیں۔ جس وقت دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت، اس کی خشیت و ہیبت کے سوا کسی کی محبت اور خوف نہیں ہوتا اور عاشق و دلگاہر کسی غیر کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا اور لوگ اس محبت صادق کی نظر میں بے وقت ہو جاتے ہیں۔

جب وہ دُقیانوس کی پکھری میں کھڑے تھے اور ظالم و جاہل دُقیانوس بتوں کی عبادت نہ کرنے پر عتاب کر رہا تھا تو انہوں نے دو نوک الفاظ میں فاتحانہ اور فاخرانہ لہجہ میں اعلان کیا (یہ بت جو تمہارے معماروں کے تراشے ہوئے ہیں ہماری تقدس مآب جبینوں کے سجدوں کے مستحق نہیں ہو سکتے) ہمارا پروردگار تو وہ ہے جو بلند و بالا آسمانوں اور گونا گوں نعمتوں سے مالا مال زمین کا پروردگار ہے۔ ہم اس کے سوا کسی کو معبود نہیں مانتے۔ اگر ہم اس قدر بتوں کے مالک کے علاوہ کسی غیر کو خدا مانیں تو ہم حق سے تجاوز کرنے والے اور حد و قدر سے دور بات کرنے والے ہونگے اور انتہائی ظالم ہونگے۔

هَلْ لَّا رَعَوْا مَّا آتَاهُم مِّن دُونِ آلِهَةٍ لَّوْلَا يَأْتِيُونَهُمْ بَسُطٌ مِّن سَمٰوٰتٍ
أَظْلَمُ مِمَّنْ افْتَرٰى عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۝

”یہ ہماری قوم ہے جنہوں نے بنا لیا ہے اس کے سوا غیروں کو (اپنے) خدا۔ کیوں نہیں پیش کرتے ان (کی خدائی) پر کوئی ایسی دلیل جو روشن ہو، ورنہ پھر اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان بنا رہا ہے۔“

۱۔ حولا و مبتداء ہے اور فو منا عطف بیان ہے ہولاء کا۔ دو نکل ضمیر کا مرجع اللہ ہے الہۃ سے مراد وہ بت اور صورتیاں ہیں جن کی وہ عبادت کرتے تھے۔ اتخذوا اکا جملہ ہولاء مبتداء کی خبر ہے۔ اور جملہ خبریہ انکار کے معنی میں ہے لولا بمعنی ہلا ہے۔ علیہم سے مراد علی عبادتہم ہے مضاف حذف کیا گیا ہے۔ سلطان بین، ظاہر دلیل یعنی یہ ہماری اسحق قوم جو بتوں کو خدا مانتی ہے کوئی واضح دلیل کیوں نہیں پیش کرتے کیونکہ عقیدہ ہمیشہ دلیل اور برحان پر مبنی ہوتا ہے، عقائد میں ظن اور تقلید کی اتباع جائز نہیں ہے۔ اس جملہ میں کثرتاً مند بند کرنا مقصود ہے کیونکہ بتوں کی عبادت پر دلیل قائم کرنا محال ہے۔

۲۔ اس سے زیادہ ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ کا کسی مخلوق کو شریک ٹھہراتا ہے اور اس کا بیٹا ہونے کا قول کرتا ہے۔ بہتان لگانا کسی پر بھی ایک ظلم اور ناقابل معافی جرم ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی ذات پر بہتان لگانے والا کتنا ظالم اور بڑا مجرم ہوگا۔

وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوهُمْ وَ صَابِعُودُنْ اِلَّا اللّٰهُ فَاَوَّلٰى اِلٰى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ
سَرْحٰنِهِۦ وَيُخْرِجْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مَرۡفُقًا ۝

”اور جب تم آگ ہو گئے ہو ان (کفار) سے اور ان معبودوں سے جن کی یہ پوجا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا۔ تو اب پناہ لو غار میں پھیلادے گا تمہارے لیے تمہارا رب اپنی رحمت (کا دامن) اور مہیا کر دے گا تمہارے لیے تمہارے اس کام میں آسائیاں۔“

۱۔ ہم ضمیر کا مرجع قوم ہے اور وَمَا يَعْبُدُونَ اِلَّا اللّٰهُ کا عطف ہم ضمیر منصوب پر ہے، یعنی جب قوم اور ان کے معبودوں سے تنہائی کر لی ہے تو غار کو اپنا مسکن اور رہائش گاہ بنا لیا تاکہ کفار تمہارے پڑوس میں بھی نہ ہوں۔ ان کی ساری قوم اللہ کی بھی عبادت کرتی تھی اور

بتوں کے سامنے بھی سر بخود ہوتی تھی جس طرح سارے مشرک کرتے ہیں۔ وہاں عیدوں میں ماصدر یہ بھی ہو سکتا ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ جب تم نے تو نماز اور اللہ کی عبادت کے سوا ان کی عبادت سے علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا کہ مانا فائدہ ہو اور یہ اللہ تبارک و تعالیٰ ان نو جوانوں کے توحید پر ثابت قدم رہنے کی خبر دے رہے ہوں اور معترض کلام ہو، جو اذکار اس کے جواب کے درمیان ان کے اعتزال اور جدائی کے تھکن پر دالالت کرنے کیلئے ذکر کی گئی ہو۔

علی کفار سے الگ غار کو اپنا مسکن بناؤ۔ اللہ تبارک و تعالیٰ تمہارے لیے اپنے فیئب کے خزانہ سے رزق کے دروازے کھول دے گا اور دنیا و آخرت میں تمہارے اس ایقان اور اطہار حق اور ترک وطن کے عمل کی بناء پر تم پر اپنی وسیع مہنایات فرمائے گا اور تمہارے لیے ہر قدم پر آسانیاں پیدا فرمائے گا، مرفقا مہم کے سرہ اور فناء کے فقر کے ساتھ آم آ کر ہے، یعنی جس چیز سے قطع اور فائدہ اٹھایا جائے، اللہ کے فضل پر کامل یقین کی بناء پر انہوں نے یہ پختہ ارادہ کیا۔ ابو جعفر، نافع اور ابن عامر نے مہم کے فقر اور فناء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے ان کے نزدیک یہ مصدر ہے اور نماز اور ان میں سے ہے جسے مرجع الخیض قیاس تو یہ تھا کہ الخیض عین ہوتا۔

وَتَسْرَى النَّسْرَى إِذَا طَلَعَتْ شُرُوسٌ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَإِذَا عَجَبْتَ
تَقْرُصُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِي فَجْوَةٍ مِنْهُ ذَلِكَ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ مَنْ يَهْدِ اللَّهُ
فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ يُضِلَّهُ فَلَئِنَّ تَجْدَلَهُ وَايَاتٍ مُرْسِدًا ۝۱۰

”اور تو دیکھے گا سورج کو جب وہ ابھرتا ہے تو وہ ہٹ کر گزرتا ہے ان کی غار سے دائیں جانب اور جب وہ ڈوبتا ہے تو بائیں طرف گزرتا ہے اور ڈوبتا ہے اور وہ (سورج) ہیں ایک کشادہ جگہ غار میں لے (سورج کا) یوں (طلوع و غروب) اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے لے (حقیقت یہ ہے) کہ جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دے وہی ہدایت یافتہ ہے لے اور جسے وہ گمراہ کر دے تو تو نہیں پالے گا اس کے لیے کوئی مددگار (اور) راہنما ہے۔“

لے و تَسْرَى میں خطاب رسول ﷺ کو ہے یا ہر شخص کو ہے۔ ابن عامر اور یعقوب نے نزووی یعنی زاء کے سکون اور راء کے تشدید کے ساتھ تصور کے وزن پر باب افعال سے پڑھا ہے اور کوفیوں نے تاء کے فقر۔ زاء مخفف اور اس کے بعد الف پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے زاء مشدود اور اس کے بعد الف پڑھا ہے، اصل میں تنزوا اور تھا۔ کوفیوں نے ایک تلو کو حذف کیا اور باقی قراء نے تاء کو زاء میں ادغام کر دیا اور یہ سارے صیغے زود سے مشتق ہیں جس کا معنی مائل ہوتا ہے۔ یعنی سورج ہٹ کر گزرتا ہے، ان پر اس کی شعاعیں نہیں پڑتیں۔ اور جب غروب ہوتا ہے تو بھی ان سے ہٹ کر گزرتا ہے اور ایک کھلی، وسیع غار کے وسط میں سوئے پڑے ہیں جہاں انہیں ہوا کی تازگی اور راحت تو پہنچتی ہے لیکن غار کی تکلیف یا سورج کی گرمی کا اثر وہاں نہیں پہنچتا۔

ابن تیمیہ فرماتے ہیں ان کی غارنات العینس کے سامنے تھی (۶) پس اس طرح ہے کہ غار کے سامنے قریب ترین مشرق و مغرب راس سرطان کا مشرق اور مغرب ہے، جب سورج کا مدار اور راس سرطان کا مدار ایک ہوتا ہے تو سورج راس سرطان کی دائیں جانب طلوع ہوتا ہے، یہ وہ جانب ہے جو مغرب سے متصل ہے اور بائیں جانب سرطان کے مقابل غروب ہوتا ہے۔ پس سورج کی شعاعیں غار کی دونوں طرفوں پر پڑتی تھیں جس کی وجہ سے محضت اور بدبو کم، دلی تھما، ہوا معتدل رہتی تھی اور ان پاکبازوں پر سورج کی شعاعیں

نہ پڑتی تھیں تاکہ ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو اور ان کی نیند میں خلل نہ آئے اور ان کے کپڑے بھی بوسیدہ نہ ہوں۔

بعض علماء فرماتے ہیں ابن تیمیہ کا یہ قول غلط ہے کیونکہ غارِ گربناتِ العنص کی طرف بھی ہوا اور اس وجہ سے ان پر دھوپ نہ بھی پڑتی ہو۔ تب بھی یہ درست نہیں ہے (1) کیونکہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کے ذریعے سے سورج کو ان سے پھیر دیا تھا اور سورج ان کے درمیان خود ہی بند بست فرمایا تھا کہ ان پر سورج کی کرنیں نہ پڑتی تھیں۔ آئندہ ارشاد بھی قدرت الہیہ ہونے کی دلیل ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی صنعت گرمی اور کرشمہ سازی ہے جس سے عبرت حاصل کی جاسکتی ہے، یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے، کہ ان کو توجید کے پرستاروں کی شان، ان کا غار کو پناہ بنانا اور آپ کا ان کے واقعہ کو بیان کرنا یہ سب اللہ تعالیٰ نشانوں میں سے ہیں۔

یہ نافع اور ابومعمرو نے وصل کی صورت میں المہندی یعنی یاء کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء وصل و وقف دونوں صورتوں میں یا کو حذف کرتے ہیں۔ مہندی سے مراد وہ ہے جسے دنیا و آخرت دونوں جہاں کی فلاح و کامیابی مل جائے۔ اور اس جملہ سے مراد یا تو اصحاب کعبہ کی تعریف و ثناء ہے یا ان بات پر تنبیہ مقصود ہے کہ اس قسم کی ان گنت آیات موجود ہیں لیکن ان سے فائدہ اور بصیرت اسے حاصل ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ ان آیات میں غور و فکر کی توفیق مرحمت فرماتا ہے اور ان سے عبرت حاصل کرنے کا ذوق بخشتا ہے۔

یہ اور جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کرتا ہے اور اس کی راہنمائی نہیں فرماتا اس کا کوئی مرشد و راہنما تجھے نہیں ملے گا۔

وَتَسْبِيحُهُمْ أَيْقَانًا وَهُمْ مُرْتَدُونَ وَلَقَدْ آتَيْنَاهُم بَابُورَ وَمَا عَرَفُوهُ وَقَدْ آتَيْنَاهُم مِّنْ قَبْلِهِ ذَاتَ الْبَيْتِ ذَاتَ الشِّمَالِ وَكَذَلِكَ هُم بَالِغٌ
ذُرَاغَيْنِ الْبَلْوَيْدِ لَوْ أَطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَيْتَ مِنْهُمُ قِرَارًا لَّوَكَيْتَ مِنْهُمْ مَّرْعًا ۝۱

”اور اگر تو دیکھے تو انہیں بیدار خیال کرے گا حالانکہ وہ سحر سے ہیں۔ اور ہم ان کی کروتہ بدلتے رہتے ہیں

(کبھی) دائیں جانب اور (کبھی) بائیں جانب۔ اور ان کا کتا پھیلانے بیٹھا ہے اپنے دونوں بازو ان کی دلیلیں پر ہے۔

اگر تو جھانک کر انہیں دیکھے تو ان سے منہ پھیر کر بھاگ کھڑا ہو اور تو بھر جائے ان کے (مخضر) کو دیکھ کر ہیبت سے ہے۔“

یہ ایضا صحیح ہے بقضی چونکہ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں یا کھرت سے کر وہیں بدلتے تھے اس لئے تو انہیں بیدار خیال کرنے گا

حالانکہ وہ سحر سے ہیں۔ رفود جمع ہے واقعہ کی جیسے قاعد کی جمع قعود آئی ہے۔

یعنی ہم ان کے ارادہ کے بغیر ان کے سونے کی حالت میں ان کی کروتیں بدلتے ہیں کبھی دائیں جانب اور کبھی بائیں جانب۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ سال میں ایک مرتبہ کروتہ بدلتے تھے تاکہ ان کے گوشت کو ٹی نہ کھا جائے۔ بعض علماء فرماتے ہیں دسویں محرم کا دن ان کی کروتہ بدلتے کا دن تھا۔ حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں ہر سال ایک کروتہ بدلتے تھے (2)۔

یہ حالت ماضیہ کی حکایت ہے، اسی وجہ سے اسم فاعل عامل بھی ہے لیکن کوئی علماء اسم فاعل کو مطلقاً عمل کراتے ہیں۔ مجاہد اور ضحاک فرماتے ہیں وصید کا معنی غار گھن ہے اور عطا فرماتے ہیں دلیر ہے۔ سدی فرماتے ہیں دروازہ ہے۔ ابن عباس سے عکرمہ نے ایک روایت یہی نقل کی ہے۔ اکرم مفسرین فرماتے ہیں وہ کتوں کی جنس سے ایک کتا تھا (3) ابن جریج سے مروی ہے کہ وہ شیر تھا، شیر کو بھی کتا

کہا جاتا ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے عقبہ بن ابی لہب کے حق میں بددعا فرمائی تو یہ الفاظ فرمائے اَللّٰهُمَّ مَسْبُطٌ عَلَيْهِ مَسْخَبًا مِّنْ كِتَابِكَ تَوْتَبِعُ كَوْشِيرَ نَعْمَارِ ذُو الْاَلْحَا۔ پہلا قول معروف ہے کہ وہ عام کتا ہی تھا۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ چنگلبر آکتا تھا۔ آپ سے

ایک قول یہ بھی مروی ہے کہ وہ قلطی سے بڑا اور کردی (کتے) سے چھوٹا تھا۔ مقاس کہتے ہیں وہ زرد رنگ کا تھا۔ قرطبی فرماتے ہیں وہ سرخی مائل شدید زرد رنگ کا تھا۔ کبھی کہتے ہیں اس کا رنگ، طلیح کی طرح تھا، بعض فرماتے ہیں۔ تھک کی طرح تھا۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس کا نام قظیر تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس کا نام زبان تھا۔ اور ازاعی نے اس کا نام تقوڑ، سعدی نے ثور، کعب نے صہبا ذکر کیا ہے، خالد بن معدان فرماتے ہیں جنت میں اصحاب کہف کے کتے اور بلاخام کے گدھے کے علاوہ کوئی جانور نہ ہوگا، سعدی فرماتے ہیں اصحاب کہف جب کروٹ بدلتے تو کتا بھی ان کے ساتھ کروٹ بدلتا، جب وہ دائیں جانب کروٹ بدلتے تو کتا پناہا یاں کان موڑ کر اس پر سوجاتا اور جب وہ بائیں جانب کروٹ بدلتے تو کتا پناہا یاں کان موڑ کر اس پر سوجاتا (1)۔

یہ اطلعت کا خطاب محمد ﷺ کو ہے فراراً لولیت کا مفعول مطلق ہے کیونکہ یہ اس کے مصدر کی ایک نوع ہے یا مفعول لہ کے اعتبار سے منصوب ہے یا حال کی بنا پر منصوب ہے ملامت کو نافع اور ابن کثیر نے لام کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ وعب کا معنی خوف ہے۔ کبھی لکھتے ہیں دل خوف ہے اس لئے بھرا جائے گا کیونکہ ان کی آنکھیں ہیں اور شخص کی طرح کھلی ہوتی ہیں جو بات کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور بعض نے خوف کی وجہ یہ لکھی ہے کہ ان کے بال لیے اور ناخن بہت طویل تھے اور بغیر کسی حس اور شعور کے پہلو بدل رہے تھے۔ بعض علماء نے رعب اور ہیبت کی وجہ یہ لکھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سارے ماحول کو اتنا بھیانک بنا دیا تھا کہ کوئی شخص اندر داخل ہونے کی برأت نہیں کرتا تھا۔ صحیح اور مختار وجہ یہی ہے۔ اس توجیہ پر سعید بن جبیر کی روایت دلالت کرتی ہے جو انہوں نے ابن عباس سے روایت کی ہے فرماتے ہیں ہم حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی معیت میں روم کی طرف غزوہ صفین پر گئے تو ہمارا گدراں غار سے ہوا جس میں اصحاب کہف تھے۔ امیر معاویہ نے فرمایا اگر ہمارے لیے ان لوگوں سے پردہ بنایا جاتا تو ہم انہیں دیکھ لیتے۔ ابن عباس نے فرمایا جب اسے دیکھنے سے روکا گیا جو آپ سے بہتر تھے (آپ کس باغ کی مولیٰ ہیں) انہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا لو اطلعت علیہم لو ائیت منہم لفراراً (اگر تو بھاگ کر انہیں دیکھتے تو ان سے منہ پھیر کر بھاگ کھڑا ہو)۔ حضرت امیر معاویہ نے ان کی بات نہ سنی اور کچھ افراد کو بھیجا کہ تم جا کر دیکھو۔ جب وہ غار میں داخل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ایسی ہوا چلائی جس نے انہیں جلادیا (2)۔ اس روایت کو ابن ابی شیبہ، ابن السنن اور ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے۔

وَكُنْ لَكَ بَعْثُهُمْ لِيَسْأَلُوا بَيْنَهُمْ ۖ قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِئْتُمْ ؕ قَالُوا لَبِئْنَا
يَوْمًا ۖ أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۖ قَالُوا رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا لَبِئْتُمْ ؕ فَابْعَثُوا أَحَدَكُمْ بِوِجْهِكُمْ
هَذِهِ إِلَى السَّيِّئَةِ فَمَنْ بَطَرَ أَصْفُؤُا فَهِيَ كَذِبَةٌ وَأَنَّ لَكُمْ يَوْمَئِذٍ فِتْنَةٌ ۚ وَاللَّهُ عَالِمُ
بِشَعْرَتِكُمْ ۖ أَحَدًا ۝

”اور اسی طرح ہم نے انہیں بیدار کر دیا تا کہ وہ ایک دوسرے سے آپس میں پوچھیں کہنے لگے گا ایک کہنے والا ان سے کہ تم یہاں کتنی مدت ٹھہرے ہو؟ بعض نے کہا ہم ٹھہرے ہو کتنے ایک دن یا دن کا کچھ حصہ دوسروں نے کہا تمہارا رب بہتر جانتا ہے کتنی مدت تم ٹھہرے ہو پس بیجو کسی کو اپنے ساتھیوں سے اپنے ایک سکہ کے ساتھ شہر کی طرف پس وہ دیکھ کر کسی کے ہاں عمدہ یا کیزہ کھانا ملتا ہے پس وہ نے آئے تمہارے پاس کھانا وہاں سے اسے چاہیے کہ وہ خوش خلقی سے پیام لے

اور کسی کو تہماری خبر نہ ہونے دے۔“

۱۔ ہم نے انہیں اتنا طویل زمانہ غار میں سلائے رکھا اور ان کے جسموں کو بوسیدہ ہونے سے بھی بچائے رکھا۔ یہ اتنی طویل نیند جو موت کے مشابہ تھی ہماری قدرت کی نشانیوں سے ایک نشانی تھی اور انہیں بیدار کرنے سے مقصود یہ تھا کہ وہ ایک دوسرے سے نیند کی مدت کا سوال کریں، اپنے احوال اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کا مکمل عرفان حاصل کریں پس اس طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت کا مکمل پر یقین بڑھ جائے گا اور وہ قیامت کے وقوع پر اسی منظر سے دلیل پکڑیں گے اور اللہ کے انعام پر شکر ادا کریں گے۔ اس صورت میں لام لام ملت ہوگا۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ لام عاقبت ہے کیونکہ سوال کرنے کی خاطر تو انہیں بیدار نہیں کیا گیا تھا (۱)۔ مکسلمینا نے پوچھا تم کتنی مدت سوئے رہے، چونکہ وہ معمول سے کچھ زیادہ سو گئے تھے اس لئے پوچھ رہے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کی نمازیں جو فوت ہو گئیں تھیں ان کی تعداد شمار کرنے کیلئے پوچھ رہے تھے۔ ہم جب غار میں داخل ہوئے تھے تو صبح کا وقت تھا اور جب بیدار ہوئے تو شام کا وقت تھا یہ مدت پورا ایک دن بنتی ہے۔ انہوں نے غور سے دیکھا تو سورج کا کچھ حصہ باقی تھا تو انہوں نے کہا دن کا کچھ حصہ ہم سوئے رہے۔ یہ جواب ظن غالب پر مبنی ہے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ ظن غالب کے مطابق بات کرنا جائز ہے اور پھر جب انہوں نے اپنے بالوں اور ناخنوں کو دیکھا تو سوچنے لگے کہ ہم تو طویل وقت سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان کے رئیس مکسلمینا نے جب یہ اختلاف سنا تو کہا اختلاف کو چھوڑو۔ تمہلیقا کو سمجھو جو یہ سکلے جائے اور شہر میں دیکھے گا پکیزہ کھانا کسی کے پاس ہے۔ العمدینہ سے مراد بعض کے نزدیک طوطوں کا شہر ہے اور زمانہ جاہلیت میں اس کا نام افسوس تھا پھر اسلام آیا تو اس کا نام طوطوں رکھا گیا۔ ان کا سکہ ساتھ لے جانا دلیل ہے کہ زور اور ساتھ لینا متوطلیقین کی رائے سے و در فکرم کو ابو عمر، حمزہ اور ابو بکر نے راء کے سکوں کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، معنی دونوں کا ایک ہی ہے، مراد چاندنی کا سکہ ہے جس پر مہر ہو یا نہ ہو، پکیزہ کھانے سے مراد پاک اور طلال کھانا ہے جو غصب یا حرام طریقہ سے حاصل نہ کیا گیا ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں تمہلیقا کو انہوں نے کہا کہ یہ تلاش کرنا کہ اللہ کا نام لے کر جس نے ذبح کیا ہو اس سے گوشت خریدنا۔ کیونکہ شہر میں ایما ندر لوگ موجود تھے جو اپنے ایمان کو مخفی رکھتے تھے۔ شحاک نے از سحی کا معنی اطمیب (پکیزہ) مقابل بن حبان نے اجدو، مکر مد نے اکثر (زیادہ) لکھا ہے، زکوٰۃ کا اصل معنی زیادتی ہے اور بعض علماء نے اس کا معنی سستا کھانا کیا ہے (۲) فرمایا ولینتلفط کا معنی یہ ہے کہ وہ معاملہ میں خوش خلقی کا مظاہرہ کرے تاکہ اسے دھوکا نہ دیا جائے یا اخصاف طریقہ اپنانے تاکہ پہچانا نہ جائے اور کوئی ایسا عمل نہ کرے جو ہماری پہچان کا باعث بنے۔ اشعار کے نقل سے تعبیر اس لئے فرمایا کیونکہ وہ عقل اشعار کا سبب بنے گا۔

إِنَّهُمْ إِنْ يَظُنُّوْا أَنَّكَ مَيِّتٌ رَبِّهِمْ لِيُبْغِلَنَّكَ فَيُقْبَلُوْا أَهْلًا بِأَبْنَاءِكَ ﴿١٠﴾

”وہ لوگ اگر آگاہ ہو گئے تم پر تو وہ تمہیں پتھر مار مار کر ہلاک کر دیں گے یا تمہیں (جبراً) لوٹا دیں گے اپنے (جسموں) مذہب میں اور (اگر تم نے ایسا کیا) تو تم کبھی بھی فلاح نہیں پاسکو گے۔“

۱۔ یہاں بعد و ابو عمرو سے مشتق ہے حیرت کے معنی میں ہے بعض علماء فرماتے ہیں یہ اپنے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَعْتَرٰنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْا اَنْ وَعَدَ اللّٰهُ حَقًّا وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَٰحِبَ فِيْهَا اِذْ يَنْتَازِعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرُهُمْ فَعَالُوْا اِيْمًا عَلَيْهِمْ بِبَيِّنٰتٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ اَعْلَمُ

بِهِمْ ط قَالَ الَّذِي بَيْنَ عَيْنَيْكَ عَلَيْهِمْ مَسْجِدًا ۝۱۱

”اور اسی طرح ہستی والوں کو ہم نے اچانک آگاہ کر دیا ان (صحاب کہف) پر تاکہ وہ جان لیں یا شہد اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے اور بلاشبہ قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ جب وہ ہستی والے جھگڑ رہے تھے آپس میں ان کے معاملہ میں تو بعض نے کہا کہ (بطور یادگار) تعمیر کرو ان کے غار پر کوئی عمارت ان کا رب ان کے احوال سے خوب واقف ہے کہنے لگے وہ لوگ جو غالب تھے اپنے کام پر کہ بخدا ہم تو ضرور ان پر ایک مسجد بنائیں گے۔“

یعنی جس طرح ہم نے ان کو اتنی طویل مدت سلایا بھی اور پھر بیدار کیا تاکہ بصیرت میں اضافہ ہو تو اسی طرح ہم نے لوگوں کو اسباب کہف پر مطلع کر دیا۔ عشر علی الشیخ کا معنی ہے کہ چیز کو اچانک پالینا۔ اس اطلاع کا مقصد یہ تھا کہ وہ لوگ جو ان کے حالات سے باخبر ہوں انہیں یقین ہو جائے کہ مرنے کے بعد اٹھنے کا وعدہ الہی حق ہے کیونکہ سونا اور جاگنا بالکل مرنے اور اٹھنے کی طرح ہے۔ اور وہ قیامت جس کا وعدہ کیا گیا ہے اس کے امکان میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کیونکہ جس نے ان کی رو میں نکالیں اور تین سو سال تک انہیں رو کر رکھا اور پھر جسموں کو پھینٹے اور نکھرنے سے محفوظ رکھا پھر تین سو سال بعد ان روحوں کو جسموں میں لوٹا دیا، ایسی ذات یقیناً اس بات پر بھی قادر ہے کہ تمام لوگوں کو مار ڈالے پھر ان کی روحوں کو جس وقت تک چاہے قبضہ میں رکھے اور پھر قیامت کے روز ان روحوں کو جسموں کی طرف لوٹا دے۔

۱۱۔ اذ یہ عشر نلی طرف ہے، یعنی جب لوگ جھگڑ رہے تھے تو اس وقت ہم نے مطلع کیا کہ وہ اپنے دین کے معاملہ میں جھگڑ رہے تھے۔ نکر مد فرماتے ہیں وہ دوبارہ اٹھنے کے بارے جھگڑ رہے تھے۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ اٹھنا صرف روحانی ہوگا، جسمانی نہ ہوگی۔ مسلمان کہتے روح اور بدن دونوں کو اٹھنا ہوگا پس اللہ تعالیٰ نے اسباب کہف کو بیدار کر کے انہیں دکھایا کہ جسم اور روح دونوں کیلئے اٹھنا ہوگا (۱)۔

یادہ نو جوانوں کے متعلق جھگڑ رہے تھے جب اللہ تعالیٰ نے دوبارہ طبی صوت عطا فرمائی تھی۔ بعض نے کہا اب بالکل مر چکے ہیں، بعض نے کہا پہلے کی طرح سوئے ہوئے ہیں۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ عمارت بنانے کے متعلق جھگڑ رہے تھے۔ مسلمان کہتے کہ ہم ان کے قریب مسجد بنائیں گے (۲) کیونکہ وہ ہمارے دین کے پیروکار تھے اور مسلمان ہو کر فوت ہوئے ہیں۔ مشرکوں نے کہا ہم ان پر ایک عمارت بنائیں گے جس میں لوگ رہیں گے اور اس کو ایک دیہات کی صورت بنالیں گے یا انہوں نے کہا کہ ہم غار کے دروازے پر ایک عمارت بنائیں گے تاکہ لوگ اندر نہ جائیں، ان کی مٹی کی حفاظت کا حق ہمیں حاصل ہے کیونکہ وہ ہمارے نسب سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن جن کو دولت و ثروت، حکومت و سیاست کی وجہ سے غلبہ تھا یعنی بیدویس اور اس کے ساتھیوں نے کہا ہم ان کے قریب مسجد تعمیر کریں گے جس میں مسلمان نماز پڑھیں گے اور ان بزرگوں کی برکت حاصل کریں گے و انہم اعلم بہم اللہ کی طرف سے جملہ معترضہ ہے اور اس معاملہ میں زیادہ غور و خوض کرنے والوں کا رد فرمایا جا رہا ہے کیونکہ دونوں فریق (مشرک اور مسلمان) اسباب کہف کو اپنی طرف منسوب کرتے تھے۔ حالانکہ وہ کفر اور کفار سے بری تھے اور وہ عام مؤمنین میں سے بھی نہ تھے (بلکہ اولیاء کاملین میں سے تھے) اگرچہ ایمانداروں میں سے تھے کیونکہ صوفی متصل بھی ہوتا ہے اور جدا بھی۔ اس کی مولانا روم نے کئی عمدہ تصویر کشی کی ہے۔

ہر کسے در ظن خود شد یار من و از درون من بخت اسرار من

بعض علماء فرماتے ہیں راہم اعلم بہم جھگڑنے والوں کا کلام ہے گویا انہوں نے ان کے معاملہ کا ذکر کیا، ان کے نسب پر کلام کیا، ان

کے احوال پر بحث کی اور ان کے ظہر نے کی موت پر گفتگو کی لیکن جب کوئی حقیقی اور حتمی رائے قائم نہ کر سکے تو کہنے لگے **وہم اعلم بہم**۔ یہ آیت کریمہ اولیاء کرام کے مزارات کے قریب ان سے متبرک حاصل کرنے کیلئے مسجد بنانے کے جواز پر دلیل ہے، جبکہ شیخ استاد محمد فاخر محدث رحمۃ اللہ علیہ مزارات کے قریب مسجد بنانے کو مکروہہ جانتے تھے اور کراہیت کی پہلی دلیل امام مسلم کی روایت کو بناتے تھے جو ابی الہیاج الاسدی سے مروی ہے، فرماتے ہیں مجھے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کیا میں تھے اس کام کیلئے نہ سمجھوں جس کیلئے مجھے رسول ﷺ نے بھیجا تھا کہ جو بھی بت دیکھو اسے مٹا دو اور جو قبر اٹھی ہوئی دیکھو اسے برابر کر دو۔ اسی طرح دوسری دلیل امام مسلم کی ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہی قبر بنانے اور اس پر عمارت بنانے اور قبر پر بیٹھنے سے منع فرمایا۔ شیخ کی تیسری دلیل شیخین کی روایت ہے جو حضرت عائشہ اور ابن عباس نے روایت کی ہے، فرماتے ہیں جب رسول ﷺ کو شہید مرض لاحق ہوئی تو آپ محمد ﷺ نے اپنے چہرے پر چادر ڈالی اور پھر جب تکٹھن محسوس ہوئی تو چادر چہرے سے ہٹا دی اور اس حالت میں یہ فرما رہے تھے معاملہ اسی طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بیود و نصاریٰ پر لعنت ہو کہ انہوں نے اپنے انبیاء کرام کی قبروں کو تجددہ گا ہیں بنایا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں آپ ﷺ نے یہود و نصاریٰ جیسا عمل کرنے سے ڈرایا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں یہ احادیث یہی قبر بنانے، قبر پر عمارت بنانے اور اونچی قبریں بنانے کی کراہت پر دلالت کرتی ہیں۔ مزارات کے قریب مسجد بنانے کی کراہیت پر دلالت نہیں کرتی ہیں اور اتحد و اقبور انبیاء ہم مساجد کا مفہوم یہ ہے کہ وہ قبروں کی طرف سجدے کرتے تھے۔ حضرت ابو مرثد الغنوی کی حدیث میں اس مفہوم کی صراحت ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نہ قبروں کے اوپر بیٹھو اور نہ ان کی طرف نماز پڑھو۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةً رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَ يَقُولُونَ خَمْسَةً سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَاجِعًا
بِالْغَيْبِ ۗ وَيَقُولُونَ سَبْعَةً وَثَامَهُمْ كَلْبُهُمْ قُلْ رَبِّي أَعْلَمُ بِعَدَاتِكُمْ مَّا يُعَلِّمُهُمُ
الْأَقْبِلُ ۗ فَلَا تَسْأَلُوهُمْ إِلَّا مِرًّا ظَاهِرًا ۚ وَلَا تَسْأَلُوهُمْ فِيهِمْ مِنْهُمْ أَحَدًا ۝

”کچھ لوگ کہیں گے کہ اصحاب کہف تین تھے جو تھا ان کا کتا تھا کچھ کہیں گے وہ پانچ تھے جھٹلان کا کتا تھا یہ سب ٹھنیے ہیں بن دیکھے۔ اور کچھ کہیں گے وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ آپ فرمائیے (اس بحث کو بند نہ) میرا رب بہتر جانتا ہے ان کی تعداد کو (اور) نہیں جانتے ان (کی صحیح تعداد) کو مگر چند آدمی سے سو بحث نہ کرو ان کے بارے میں بجز اس کے کہ سرسری ہی گفتگو ہو جائے اور نہ در یافت کرو ان کے متعلق (اہل کتاب) میں سے کسی اور سے۔“

ل نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں ان اصحاب کہف کے متعلق جھگڑنے والے بعض کہتے کہ وہ تین تھے اور کتا ان کو چار بنانا والا تھا۔ فلائق مہتہ احمد وہم کی خبر ہے اور اربعہم کلہم کا جملہ فلائق کی صفت ہے۔ بعد والی تراکیب بھی اسی طرح ہیں۔ یقولون سے پہلے سین ذکر نہیں فرمایا کیونکہ معطوف علیہ پر سن کا ذکر چکا ہو ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں جبران کے عیسائیوں میں سے سید اور عاقب اور ان کے ساتھی نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے تھے کہ اصحاب کہف کا ذکر چل پڑا۔ السید جس کا تعلق یقولونہ فریق سے تھا اس نے کہا تین تھے اور چوتھا کتا تھا۔ العاقب جس کا تعلق منظور فریق سے تھا اس نے کہا پانچ تھے اور جھٹلان کا کتا تھا (1)۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں

گردہوں کا رد کرتے ہوئے فرمایا یہ محض قیاس آرائیاں اور تخمینے ہیں بن دیکھے۔ رجما پر نصب فعل مقدر کے مصدر کی بناء پر ہے، یعنی جو جموں رجما یعنی ان کے پاس علی دلیل نہیں ہے۔ یہ فقط ظن و تخمین سے کام لے رہے ہیں، غیب کی خبر دے رہے ہیں یا رجما علت کی بناء منصوب ہے اور یقولون کے متعلق ہے اور رجما کا معنی ظنا ہے۔ ظن کی جگہ رجم اس لئے استعمال فرمایا کیونکہ عرب اکثر ظن کی جگہ رجم استعمال کرتے تھے حتیٰ کہ ان کے نزدیک رجم اور ظن میں کوئی فرق نہیں رہا تھا۔ تفسیر مدارک میں اسی طرح ہے، یعنی دونوں فریقوں کے پاس کوئی مستند علم نہیں ہے جو واقعہ کے مطابق ہو۔

۲۔ اور مسلمان حضور ﷺ کے بتانے سے کہتے کہ وہ سات تھے اور انھوں ان کا کرتا تھا۔ فاصہم کا جملہ سبعہ کی صفت ہے لیکن درمیان میں واو ذکر کی گئی ہے گو یا اسے اس جملہ سے تفسیر دی گئی ہے جو معرذ اسم سے حال واقع ہوتا ہے اور اس کی وجہ صفت سے موصوف کے تعلق کی تاکید اور موصوف کے صفت سے متصف ہونے پر دلالت کرنا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ آٹھویں چیز سے پہلے ذکر کی جانے والی واو ہے مثلاً عرب جب گفتی کرتے ہیں تو واحد الثمان ثلاثة اربعة خمسة ستة سبعہ وثمانیہ کیونکہ ان کے نزدیک آٹھ ایک عقد ہے جس طرح آج کل ہمارے نزدیک (10) ایک عقد ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں بھی آٹھویں صفت سے پہلے واو ذکر کی گئی ہے اَلْأَيُّوبُ مِنَ الْعَبِيدُونَ..... وَالْقَاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ اسی طرح ازواج مطہرات کے بارے فرمایا لَقَدْ كَلَّمْنَا بَنِي إِدْرِيسَ بِالنُّبُوَّةِ وَإِذْ أَخَذْنَا عَهْدَ عِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَسُوِّفِيَّةَ بِنْتِ قَيْسِ بْنِ مَدْيَنَةَ أَنْ تَسْلُبَنَّهُمْ نَفْسَهُمْ بِمَا كَفَرُوا (آٹھویں صفت سے پہلے یہاں بھی واو ذکر فرمائی ہے)۔

۳۔ قفل دہی میں نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے باہر نفع کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ۱۔ محبوب تم کہو کہ میرا رب ان اصحاب کہف کی تعداد کو خوب جانتا ہے، ان کی صحیح تعداد لوگوں میں سے بہت کم جانتے ہیں وہ قلیل یا تو انصاری میں سے تھے یا ان لوگوں میں سے تھے جو وہ مسلمان تھے۔ ابن عباس فرماتے ہیں۔ قلیل لوگوں میں سے بھی شامل ہوں وہ اصحاب کہف سات تھے (۱)۔ ابن جریر اور فریابی نے ابن عباس کا یہی قول نقل کیا ہے۔ ابن مسعود کا قول ابن ابی حاتم نے اسی طرح روایت کیا ہے کہ وہ سات تھے اور انھوں ان کا کرتا تھا۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں مذکورہ تین اقوال کے حصر کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک طائفہ کیلئے علم کو ثابت فرمایا ہے کیونکہ اس مقام پر جو تھے قول کو ذکر نہ کرنا اس کے عدم (نہ ہونے) کی دلیل ہے کیونکہ اصل نفی ہے (2) اور پہلے دو قولوں کو رجما بالغیب فرما کر رد کر دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حق اور صحیح تیسرا قول ہے (کیونکہ اس کے ساتھ ورجما بالغیب نہیں فرمایا) امام بغوی نے ابن عباس سے ان کے یہ نام روایت کیے ہیں مسلمینا، حنظلہ، مرطوس، سنوس، ساریونس، ذلوان۔ کسطنطینوس یہ آخری چرواہا تھا (3)۔ یہ نام بطرانی نے اعمام الاوسط میں صحیح سند کے ساتھ ابن عباس سے روایت کیے ہیں۔ علامہ ابن حجر شرح بخاری میں لکھتے ہیں کہ ان ناموں کے تلفظ میں بہت بڑا اختلاف ہے۔ وثوق اور اعتماد کسی تلفظ نہیں ہے۔

۴۔ پیارے صحابیہ جو انوں کی شان اور ان کی تعداد کے متعلق بحث نہ کرو مگر سرسری گفتگو کرو جیسا کہ ہم نے آپ کے سامنے بیان کی ہے۔ ان کے متعلق اتنی گہرائی اور تعمق سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور اہل کتاب سے بھی ان کے متعلق مت پوچھو جتنا ہم نے وحی کیا ہے وہ تیرے لیے کافی ہے۔ دوسرا یہ کہ ان اہل کتاب کے پاس اصحاب کہف کا علم ہے بھی نہیں۔ اس لیے ایک سوال کرنے والے کی طرح ان سے سوال نہ کرو۔ کیونکہ ان کے احوال کے متعلق علم کی زیادتی کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اور نہ تم ایک ہت دھرم کی طرح سوال کرو جس کا ارادہ مسئول عنک و سوا کرنا اور اس کے پاس جو علم ہے اسے حقیر ظاہر کرنا ہوتا ہے کیونکہ اس نیت سے کسی سے سوال کرنا

مکارم اخلاق کے مرنانی ہے۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَا كُنَّا عَمَلًا ۖ إِنِّي فَأَعَلْتُ ذَلِكَ عَدَا ۖ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۚ وَادْكُرْ رَبَّكَ
إِذَا نَسِيتَ وَقُلْ عَسَى أَنْ يَهْدِيَنَا رَبِّي لِقُرْبٍ مِنْ هَذَا ۖ آمَنَّا سَمِعْنَا ۖ

”ہرگز نہ کہنا کیا چیز کے متعلق کہ میں اسے کرنا والا ہوں کل ٹکڑے (یہ کہ ساتھ یہ بھی کہو) اگر چاہا اللہ تعالیٰ نے حج اور یاد کر اپنے رب کو جب تو بھول جائے حج (یہ بھی) کہو کہ مجھے امید ہے کہ دکھا دے گا مجھے میرا رب اس سے بھی قریب تر ہدایت کی راہ سے۔“

ابن مردودہ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کسی کام کے کرنے کی قسم اٹھائی لیکن چالیس دن گزر گئے (اور کام نہ کر سکے) تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے اس (کہف: 23-24) کا ارشاد نازل فرمایا (1)۔ ابن المنذر نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ یہود نے قریش سے کہا کہ محمد ﷺ سے روح۔ اصحاب کہف اور ذی القرنین کے متعلق پوچھو انہوں نے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا میں کل تمہیں بتاؤں گا لیکن آپ نے ان شاء اللہ ساتھ نہ کہا، وحی کا سلسلہ چند روز تک منقطع ہو گیا۔ حتیٰ کہ آپ پر یہ کیفیت بہت تکلیف دہ تھی۔ قریش کو بھی جھٹلانے کا موقع مل گیا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی، ابن جریر کے حوالہ سے سورت کے آغاز میں ایسی ہی حدیث نقل ہو چکی ہے اسی طرح ہم نے سورۃ بنی اسرائیل میں یسئلونک عن الروح کی تفسیر کے تحت بھی ذکر کیا ہے۔ یہ اشتہاء انہی سے اشتہاء ہے، یعنی کسی حال میں بھی مشیت الہی سے کام کو متعلق کیے بغیر کسی کام کا پختہ عزم نہ کر دیا کسی وقت میں کسی کام کے کرنے کے متعلق کچھ نہ کہو مگر ساتھ یہ کہو کہ اللہ تعالیٰ کا اذن ہوا تو ایسا کروں گا۔

اشتہاء کا تعلق قائل سے نہیں ہے کیونکہ اس کے متعلق ہوا تو معنی یہ ہوگا کہ میں ایسا کرنے والا ہوں مگر مشیت الہی میرے کام میں آڑے۔ اس معنی کی نبی کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں ہے اس آیت کریمہ میں اللہ نے اپنے محبوب نبی ﷺ کو یہ ادب سکھایا ہے (کہ جب تک کام اللہ تعالیٰ کی مشیت سے متعلق نہ کر لیں اس کام پر پختہ عزم نہ کریں)۔

علاج اور استغفار کے ساتھ اپنے پروردگار کو یاد کر جب تو بھول جائے۔ اس جملہ میں ہر عزم میں ان شاء اللہ کہنے کے اہتمام پر تاکید اور براہیختہ کرنا ہے یا یہ معنی کہ جب تجھ سے کوئی امر الہی رہ جائے تو اپنے رب کریم اور اس کے عقاب و عتاب کو یاد کرتا کہ تدارک پر یہ یادگیری معاون ثابت ہو یا یہ معنی کہ جب تجھے کوئی چیز بھول جائے تو اللہ تعالیٰ کو یاد کر، وہ تجھے بھولی ہوئی چیز یاد دلا دے گا۔ عکرمہ فرماتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے کہ جب تو غصہ میں ہو تو اللہ تعالیٰ کو یاد کر۔ وہب فرماتے ہیں انجیل میں ہے کہ اے ابن آدم غصہ کے وقت تو مجھے یاد کیا کر۔ میں جب غصہ میں ہوں گا تو تجھے یاد کروں گا۔ الشحاک اور سعدی فرماتے ہیں ہر نماز کے متعلق ہے، یعنی نماز قضاء ہو جائے تو اسے ادا کر (2) حضرت انس سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جسے نماز بھول جائے تو جب اسے یاد آئے، ادا کرے (3)۔ اس حدیث کو بغوی نے روایت کیا ہے۔ صحیحین، مسند امام احمد و ترمذی اور نسائی میں اس طرح ہے کہ جو نماز بھول جائے یا نماز کے وقت سو یا رہے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ جب اسے نماز یاد آئے تو فوراً ادا کرے۔ حضرت ابو سعید سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو نماز سے سو جائے یا بھول جائے تو جب اسے یاد آئے تو ادا کرے۔ اس حدیث کو احمد، حاکم نے

2- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 69-168 (انجاریہ)

1- الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 394 (العلیہ)

3- جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 25 (وزارت تعلیم)

روایت کیا اور حاکم نے اسے صحیح بھی کہا ہے۔ ابن عباس، مجاہد اور الحسن فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ جب تم ان شاء اللہ کہنا بھول جاؤ تو جب یاد آئے کہہ دیا کرو ان شاء اللہ۔ اس قول کی بناء پر بعض علماء استثناء کی تاخیر کے جواز کے قائل ہیں اگرچہ سال بعد بھی ہو بشرطیکہ وہ قسم سے حاشیہ نہ ہو (یعنی قسم توڑی نہ ہو) اس تاخیر کے جواز کے قول کو سعید بن منصور، ابن جریر، طبرانی اور حاکم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے اور اس قول کی تائید ابن مردودہ کی روایت سے ہوئی ہے کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا ان شاء اللہ لیکن عام فقہاء اسکی تاخیر کے قائل نہیں ہیں کیونکہ کلام غیر مستقل جب دوسری کلام کے معنی کو تبدیل کرنے والی ہو تو وہ شرط، استثناء غایت اور بدل بعض کی طرح ہوتی ہے، اس لئے اس کا متصل ہونا ضروری ہے۔ اگر استثناء منفصل بھی جائز ہو تو اقرار، طلاق، اعتناق کا ثبوت بھی کبھی نہ ہو اور نہ صدق و کذب معلوم ہو۔

حکایت۔ خلیفہ منصور کو یہ خبر پہنچی کہ امام ابوحنیفہ حضرت ابن عباس کی استثناء منفصل میں مخالفت کرتے ہیں۔ خلیفہ نے امام صاحب کو بلایا تاکہ ذراٹ ڈپٹ کرے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا یہ چیز تیرے خلاف جاتی ہے۔ کیا تو یہ پسند کرتا ہے کہ تو لوگوں سے طاعت کی بیعت لے پھر جب وہ باظہر ظہر تو ان شاء اللہ کہہ دیں اور وہ تیری اطاعت سے نکل جائیں۔ اس نے امام صاحب کی کلام کو داد تحسین دی اور جس نے امام صاحب پر طعن کیا تھا، اسے محفل سے نکال دیا۔ اور جو یہ روایت کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے آیت کے نزول کے وقت ان شاء اللہ کہا تھا، یہ استثناء اس پہلی کلام سے متعلق ہے جس میں آپ نے کہا تھا کہ کل آنا، میں تمہیں ان سوالوں کے جواب دوں گا بلکہ یہ استثناء مقدر کلام کے متعلق ہے جس کی تقدیر اس طرح ہے کہ آئندہ کبھی میں ان شاء اللہ کو ترک نہیں کروں گا جب تک کبھی کسی فعل کے کرنے کے متعلق ارادہ کروں گا۔

صوفیاء کرام فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ جب تو سب کچھ بھول جائے تو اس وقت اپنے پروردگار کو یاد کر۔ صوفیاء فرماتے ہیں دائمی ذکر اس وقت تک منصور ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ دل اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز کو بھول نہ جائے کیونکہ انسان کے دل کو ہر کام دوسرے کام سے غافل کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ایک سینہ میں دودل بنائے نہیں ہیں (کہ ایک اللہ کا ذکر کرے اور دوسرا دنیوی معاملات میں الجھارے) پس دائمی ذکر جس میں کبھی سستی اور کمزوری نہیں آتی وہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ دل ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دوسری چیزوں سے مستغنی نہ ہو جائے اور ان کا خیال دل سے بالکل مٹ نہ جائے۔ اسی کیفیت کو فنا، انقلاب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ ذکر جس کے پیچھے غفلت ہو اس کو صوفیاء شمار ہی نہیں کرتے جو دل کبھی اللہ تعالیٰ کو یاد کرے اور کبھی غیر کا تصور کرے اسے صوفیاء موصوف نہیں کہتے۔ صوفیاء کی یہ تاویل کتاب کے الفاظ کے زیادہ مناسب ہے، قواعد عربیہ کے بھی موافق ہے اور مجاز سے بھی بہت دور ہے کیونکہ اذا نسبت اذ کو کی ظرف ہے اور ظرفیت ہتھیار ہو سکتی ہے جب نسیان کے وقت ذکر کیا جائے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ذکر کا وقت سابقہ تمام تاویلات کے مطابق نسیان کے وقت کے معانی ہیں، یعنی وہ علیحدہ وقت ہیں پس سابقہ تاویلات کی صورت میں ظرفیت ہتھیار نہ ہوگی بلکہ مجاز ہی ہوگی اور حقیقت پر محمول کرنا اولیٰ ہوتا ہے۔

سے نافع اور ایام ورنے صرف وصل کی صورت میں یہ مدین کو یا ہ کے ساتھ پڑھا ہے اور ابن کثیر نے دونوں حالتوں میں یا ہ کے ساتھ پڑھا ہے، باقی قرآن نے دونوں حالتوں (وقف اور وصل) میں یا ہ کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے ہذا کا مشار الیہ بھولا ہوا ذکر یا حکم ہے، اس کا عطف اذ کو پر ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ جب تم استثناء (ان شاء اللہ) بھول جاؤ یا اس کام کا کرنا بھول جاؤ جس کا اللہ نے حکم دیا

ہے تو اللہ تعالیٰ کا استغفار۔ استغفار کے ساتھ ذکر کرو اور اس سے مدد طلب کرو اور یہ کہو کہ مجھے امید ہے کہ میرا رب مجھے اس بھولی ہوئی چیز سے قریب تر ہدایت کی راہ دکھائے گا۔ یا اس طرح ذکر کر کے کہ انسان کو احساسِ ندامت ہو۔ تو یہ واستغفار کرے اور فوت شدہ امر کی تلافی بھی کرے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ قریش نے جب عناد کی بناء پر اصحابِ کہف کے متعلق سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ آپ انہیں فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایسی جنتیں اور دلائل عطا فرمائے گا جو اصحابِ کہف کے واقعہ کی نسبت میری نبوت پر زیادہ والالت کرنے والے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے واقعی آپ کی نبوت پر بڑی دلیل پیش فرمائی کہ آپ ﷺ کو رسولوں کا علم غیب اور ماکان و ما کیوں (ماضی اور مستقبل) کا علم عطا فرمایا۔ یہ علم غیب کا ملنا اصحابِ کہف کی خبر سے کہیں زیادہ نبوت کی صداقت کی واضح دلیل ہے اور ہدایت کے زیادہ قریب ہے بعض علماء فرماتے ہیں یہ ایک حکم ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اکرم ﷺ کو دیا کہ ان شاء اللہ کے قول کے ساتھ وقل عسی ان یریدین الایکھبا کریں۔ میں انشاء اللہ کو بھی ترک نہیں کروں گا جب بھولنے کے بعد مجھے یاد آئے گا۔ یعنی جب کوئی انسان انشاء اللہ جموں کر چھوڑے اور پھر اسے یاد آئے تو اس کی توبہ یہ ہے کہ وہ کہے عسی ان یریدین زہنی لا فخرت من ہذا زشد۔ صوفیاء کی تاویل پر آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایسی چیز سے ملائے گا جو اس ذکر سے بھی زیادہ باعثِ ہدایت ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو شہرگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

وَلَيْسُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَارْدَا ذَاوُ الْأَسْعَا

”اور (اہل کتاب کہتے ہیں کہ) وہ ٹھہرے رہے اپنے غار میں ۱۔ تین سو سال اور زیادہ کیے انہوں نے (اس پر)

نو (9) سال۔“

یعنی اصحابِ کہف غار میں زندہ ٹھہرے رہے اور سوئے رہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے پہلے جمل کلام کا بیان ہے جس میں فرمایا **لَيَسُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ** اور **وَارْدَا ذَاوُ الْأَسْعَا** ہے۔ وہ کہتے تھے کہ اصحابِ کہف تین سو سال غار میں ٹھہرے رہے۔ اگر یہ مدت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی تو **قُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا لَيَسُوا** ذکر کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ یہ حضرت قتادہ کا قول ہے اور حضرت قتادہ کے اس قول کی تائید حضرت ابن مسعود کی قرأت سے بھی ہوتی ہے، **وَقَالُوا لَيَسُوا فِي كَهْفِهِمْ** (اس میں صراحت ہے کہ یہ مدت اہل کتاب کی بیان کردہ ہے قرآن کی نہیں) پھر اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کا رد فرماتے ہوئے فرمایا **قُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا لَيَسُوا** کا مطلب یہ ہے کہ ان کے غار میں ٹھہرنے کی مدت وہی ہے جو ہم نے بیان کی ہے۔ پس اب اگر یہ آپس میں اس کے متعلق جھگڑیں تو آپ فرمائیں تم سے اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنی مدت ٹھہرے اور اس نے تو تین سو سال مدت بیان نہیں فرمائی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اہل کتاب نے کہا کہ ان کے غار میں داخل ہونے کے وقت سے نبی کریم ﷺ کے زمانہ تک یہی مدت بنتی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا۔ **قُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا لَيَسُوا** یعنی ان کی روحوں کے قبض ہونے کے بعد آج تک ایک زمانہ گزر چکا ہے جسے اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

۱۔ جزوہ اور کسائی نے مائتہ کو سنین کی طرف مضاف کر کے بغیر تین کے بڑھا ہے کیونکہ یہاں تمیز مفرد کی جگہ جمع ذکر کی گئی ہے جیسا کہ **پَاذَا خُسْرَيْنِ أَعْتَا** میں ہے۔ فراء کہتے ہیں بعض عرب سنہ کی جگہ سنین استعمال کرتے ہیں۔ باقی قراء کے نزدیک بدل یا عطف بیان ہوگا۔ ابن مردیہ نے ابن عباس سے اور ابن جریر نے ضحاک سے روایت کیا ہے کہ جب **وَلَيَسُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ**

حاشیہ نازل ہوا تو عرض کی گئی یا رسول اللہ یہ تین سو سال ہیں یا سببے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے سینین نازل فرمایا (1)۔ کبھی لکھتے ہیں نجران کے نصاریٰ نے کہا تین سو تو ہم جانتے ہیں لیکن نوکا ہمیں علم نہیں ہے تو اسی وقت **قُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا لَبِئْتُوا** نازل ہوا۔

قُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا لَبِئْتُوا لَهُ غَيْبُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَأَنْبِئُ بِهِ وَأَسْمِعُ مَا لَمْ يَمُنْ مِنْ دُونِهِ مِنْ دُونِي وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِي أَحَدًا ۝۱

”آپ فرمائیے اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے جتنی مدت وہ ٹھہرے۔ اسی کیلئے (علم) غیب ہے آسمانوں اور زمین کا وہ بڑا دیکھنے والا ہے اور سب باتیں سننے والا ہے نہیں ان کا اس کے سوا کوئی دوست ہے اور وہ نہیں شریک کرتا اپنے حکم میں کسی کو سب سے“

۱۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے اہل کتاب کی مجلس میں فرمایا کہ اصحاب کہف تین سو ششاسی سال خاثر میں رہے اور اللہ تعالیٰ نے تین سو سال قمری کا ذکر فرمایا ہے اور ششاسی اور قمری سالوں کے درمیان فرق ہر سو سال میں تین سال کا ہوتا ہے۔ پس قمری سال تین سو نو ہو گئے اس لئے فرمایا واذا داد وتسعا (2)۔

۲۔ زمین و آسمان کا غالب اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے پھر کمال بصارت اور کمال سماعت پر دلالت کرنے کیلئے فعل تعجب کے صیغے ذکر فرمائے تاکہ اس بات پر دلالت ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے سننے اور دیکھنے کی کیفیت دوسرے سننے اور دیکھنے والوں کی کیفیت سے وراہ ہے کیونکہ اس ذات ہمہ میں اور ہمہ داں سے کوئی چیز چھپی نہیں ہے لطیف و تکلیف کا اس کے سامنے کوئی فرق نہیں ہے، چھوٹی بڑی، خفی اور جلی سب چیزیں اس کے اور اک کیلئے برابر ہیں۔

۳۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ ابن البیہر میں ابن عامر کا خلاف ذکر نہیں کیا۔ اور جمہور علماء نے لا یشرک یعنی یاہ کیساتھ پڑھا ہے (3) یعنی اللہ تعالیٰ اپنے فیصلہ یا اپنے امر و نہی میں کسی کو شریک نہیں کرتا، کسی کو اپنے فیصلہ میں دخل اندازی کا حق نہیں دیتا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں حکم معنی علم غیب ہے یعنی اپنے علم غیب میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

قرآن چونکہ اصحاب کہف کے واقعہ پر مشتمل ہے اور یہ نبی کریم ﷺ کیلئے ایک غیب کی خبر ہے تو یہ اللہ کی طرف سے اپنے نبی کریم ﷺ کی جانب وحی ہے اور بطور معجزہ عطا کیا گیا۔ اور پھر حکم دیا کہ ہمیشہ اس قرآن مجزئی تلاوت کرتے رہو اور قرآن پڑھنے والوں کی سنگت میں رہو۔ فرمایا

وَأْتِلْ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ لَا تُبَدِّلْ لِحُكْمِهِمْ ۖ وَكَانَ تَجِدَ مِنْ دُونِهِ مُنْتَحَدًا ۝۱

”اور پڑھا سنائیے (انہیں) جو وحی کیا جاتا ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی کتاب سے۔ کوئی بدلنے والا نہیں اس کے ارشادات کا۔ اور انہیں پائیں گے آپ اس کے سوا کوئی پناہ گاہ ہے۔“

۱۔ کتاب سے مراد قرآن حکیم ہے یعنی قرآن کی تلاوت کرو اور اس کے احکام کی اتباع کرو اور ان کے لایعنی سوالوں ”اس قرآن کے علاوہ قرآن لاؤ یا اس کو بدل دو“ کی طرف بھی توجہ نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اس میں تغیر و تبدل کرنے پر قادر نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل معصیت کو جن کلمات کے ساتھ اس نے وعید سنائی ہے انہیں کوئی بدلنے والا نہیں ہے۔

۱۰۔ اسے پیارے محمد ﷺ اگر آپ قرآن کی اتباع نہ کریں گے تو آپ اس کے سوا کوئی قرار گاہ نہیں پائیں گے۔ ابن عباس نے ملحد کا معنی حوزاً (حفاظت گاہ) کیا ہے۔ حسن نے مدحاً (داخل ہونے کی جگہ) کیا ہے۔ بعض فرماتے ہیں بھائے کی جگہ۔ التحد کا اصل معنی میلان ہے۔

وَأَصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْعَدْوَىٰ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَ
لَا تَعْدُ عَيْنُكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الدُّنْيَا وَلَا تَطْعَمَ مَنْ أَعْمَلْنَا قُلُوبَهُ
عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبِعْهُ هُوَةٌ وَكَانَ آمُرًا لَّفُرطًا ۝

”اور روک رکھئے اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ لے جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح وشام طلب گار ہیں اس کی رضا کے، اور نہ نہیں آپ کی نگاہیں ان سے ہٹ کر کیا آپ چاہتے ہیں دنیوی زندگی کی زینت اور نہ بیروی کیجئے اس (بد نصیب) کی غافل کر دیا ہے ہم نے جس کے دل کو اپنی یاد سے ہے اور وہ اتباع کرتا ہے اپنی خواہش کا ہے اور اس کا معاملہ حد سے گزر گیا ہے۔“

۱۱۔ اسے پیارے محمد آپ اپنے نفس کو ان اپنے عاشقان و لہکار کے ساتھ روک رکھیے جو صبح وشام اپنے پروردگار کی تسبیح و تہلیل میں مصروف رہتے ہیں، جن کی ساری ریاضتوں، مجہد و ریزیوں اور شب خیزیوں کا مقصد و صرف اور صرف رضاء الہی ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں یہ آیت کریم عینہ بن حصین الخزازی کے متعلق نازل ہوئی جو اسلام لانے سے پہلے نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا تھا۔ اس وقت آپ ﷺ کی مجلس میں فقراء صحابہ کی جماعت بیٹھی تھی جن میں سلمان فارسی بھی تھے۔ حضرت سلیمان فارسی نے ایک چادر اڑھی ہوئی تھی، جس میں آپ کو پسینہ آ رہا تھا اور ان کے ہاتھ میں مجھور کے پتے تھے جن کو چیر کر آپ کچھ من رہے تھے۔ عینہ کہنے لگا اے محمد ﷺ ان لوگوں کی بد بو آپ کو تکلیف نہیں دیتی، ہم مضر قبیلہ کے سردار ہیں اگر ہم اسلام قبول کریں گے تو سب لوگ اسلام قبول کر لیں گے۔ ہم ان بد بو دار اور فقراء لوگوں کی وجہ سے آپ کی اتباع نہیں کرتے۔ آپ ان کو مجلس سے اٹھا دیں تو ہم آپ کی اتباع کریں گے یا آپ اس طرح کریں کہ ان کیلئے ایک الگ مجلس کا اہتمام کریں اور ہمارے لیے علیحدہ محلہ کا انتظام کیا کریں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی و اصبر نفسک الایۃ۔

۱۲۔ ابن عاصم نے بالعدوۃ کو تین کے ضمردال، کے سکون اور دوا کے فہرے کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراءتین اور دال کے فتح اور اس کے بعد الف پڑھا ہے۔ غدوۃ اور عشی سے مراد یا تو تمام اوقات ہیں یا دن کی دو اطراف ہیں۔ وجہہ میں وجہ کا لفظ زائد ہے جیسا کہ ذہبی و حنفیہ و حنفیہ میں وجہ تہم ہے۔ مطلب یہ کہ یہ درویش صفت لوگ صرف اور صرف اللہ کیلئے عبادت کرتے ہیں، دنیا و آخرت کی کوئی چیز ان کے پیش نظر نہیں ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ اصحاب صفہ کے بارے نازل ہوئی، ان کی تعداد سات سو تھی جو نبی کریم ﷺ کی مسجد میں رہتے تھے، کھتی، مال مویشی، تجارت وغیرہ سے بالکل مستغنی تھے۔ فقط یہی کا تھا کہ ایک نماز محبوب کریم ﷺ کی معیت میں ادا کر لیتے تو دوسری نماز کے انتظار میں ہو جاتے۔ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ جَعَلَ فِیْ اُمَّتِیْ مِنْ اَصْبِرٍ مَعَهُمْ۔ سب تعریف اس ذات کیلئے جس نے میری امت میں ایسے پاکباز، رحیم سیرت لوگ پیدا فرمائے جن کی ہم نشینی کا میرے رب نے مجھے حکم فرمایا ہے۔ ہم نے سورۃ انعام میں وَلَا تَنْظُرُوا اِلٰی الَّذِیْنَ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا اٰيَاتِ الْفِتْنِۃِ الَّتِيْ هِيَ رُوَايَاتُ النَّفْلِ كِيْ هِيَ (وہاں سے ملاحظہ فرمائیں)
 سے آپ کی آنکھیں نہیں چھوڑ کر انبیاء و مالداروں کی مجلس کی طلبگاری نہ ہوں اور ظاہری ٹیپ ٹاپ والوں کی مصاحبت و محفل کی مستلاحی نہ
 ہوں۔ ترید زینۃ الدنیا الحیاۃ الدنیا کے غیر سے حال ہے۔

سے آپ ان کی پیروی نہ کریں جن کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا۔ امام بخاری فرماتے ہیں جن کی اتباع سے روکا گیا ہے عینہ
 بن حصین ہے۔ بعض فرماتے ہیں امیہ بن خلف مراد ہے۔ ابن مردویہ نے ابن عباس سے اس آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ یہ امیہ
 بن خلف اٹھی کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ اس نے نبی کریم ﷺ سے ایک ایسا مطالبہ کیا تھا جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند تھا۔ اس نے کہا
 تھا کہ آپ ان درویشوں کو اپنی مجلس سے اٹھا دیں اور اہل مکہ کے سرداروں کو اپنا ہم نشین بنا لیں۔ ابن ابی حاتم نے ربیع سے روایت کیا
 ہے کہ نبی کریم ﷺ کو امیہ بن خلف کی پیروی سے روکا گیا ہے کیونکہ امیہ بنی ہر اس بات سے غافل اور بھولنے والا تھا جو اسے کہی جاتی
 تھی۔ ابن برید نے ذکر کیا ہے کہ عینہ بن حصین نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں آیا اور وہاں سلمان فارسی بھی تشریف فرما تھے، عینہ نے
 کہا جب تم میرے پاس آئیں تو ان کو نکال دیا کرو تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی وَلَا تَطْعَمْنَ مِنْ اَعْفَلٰنَا قَلْبہ۔

یہ اس نے فقر اور محسوس سے نکالنے اور قریش کے سردار کو قریب بٹھانے کی استدعا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں کی تھی۔ اس جملہ میں اس
 بات پر تنبیہ کی گئی ہے کہ اس کی غیر اخلاقی بات کرنے پر برا بھلا کرنے والی چیز ذکر الہی سے محرومی ہے اور دنیا کی لذتوں میں شہمک ہونا ہے
 حتیٰ کہ دنیا کو غبار اس کے دل پر اس طرح چھا گیا ہے کہ نفس کی پاکیزگی، دل کی صفائی اور نور معرفت سے منور ہونے کا شرف اس کی
 مادیت آلودگانوں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ پس جو ایسے شخص کی پیروی کرے گا وہ غفلت اور عبادت میں اس جیسا ہوگا۔ معتزل چونکہ غافل
 کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے کو جائز قرار نہیں دیتے، اس لئے وہ اس کا یہ معنی کرتے ہیں کہ ہم نے اسے غافل پایا ہم نے
 اس کو غفلت کی طرف منسوب کیا یا یہ اعفل اہلہ کے قبیل سے ہے، یعنی اس نے اس کو بغیر نشانہ کے چھوڑ دیا اہل سنت و جماعت ان دونوں
 نسبتوں اعفلا اور واقع ہوا کو وہ اور مروں کی دلیل بناتے ہیں (1) انسان پر جبر نہیں ہے (2) اور انسان کلی طور پر بخیر نہیں ہے۔

۱۔ امام بخاری لکھتے ہیں حضرت قتادہ اور مجاہد نے فرط کا معنی صیبا کہا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اس نے اپنے معاملہ
 کو ضائع کر دیا اور کام کے دنوں کو معتزل کر دیا۔ بعض نے اس کا معنی شرمندگی کیا ہے۔ مقال بن حبان نے سہولاً (حد سے تجاوز) کیا ہے۔
 فرات نے متروک کا چھوڑا ہوا (حد سے تجاوز کرنے والا) معنی بیان کیا ہے (1) امام بیضاوی لکھتے ہیں جو جن کو پیچھے کے پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گیا
 ہو۔ عرب کہتے ہیں فرط فرس وہ گھوڑا جو بقیہ گھوڑوں سے آگے نکل جائے، اسی سے الفرط ہے جس کا معنی پیش رو ہے (2)۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَمْ فَمَنْ سَاءَ فَلْيَبْئُتْ مِنْ وَّ مَنْ سَاءَ فَلْيَقْبَرْ اِنَّآ اَعْتَدْنَا
 لِلظَّالِمِيْنَ نَارًا اَحَاطَ بِهٖمْ سُرَادِقُهَا وَاِنْ يَّسْتَعْثِبُوْا يَغَاثُوْا بِسَاءَ كَالْمُهْلِ
 يَّسْبُوْا اَلْوَجُوْهَ بِسُّسِّ الشَّرَابِ ۗ وَسَاعَتْ مُرْتَقَقًا ۝

”اور فرمائیے حق تمہارے رب کی طرف سے ہے۔ پس جس کا جی چاہے وہ ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کفر کرتا
 رہے۔ پس جنگ ہم نے تیار کر رکھی ہے ظالموں کے لیے آگ گھیر لیا ہے انہیں اس آگ کی دیوار سے۔ اور اگر فریاد کریں

گے تو ان کی فریاد سنی کی جائے گی ایسے پانی کے ساتھ جو پیپ کی طرح (غلیظ) ہے (اور اتنا گرم کہ) بھون ڈالتا ہے
چہرہ کو سوتے یہ مشروب بڑا ناگوار ہے اور یہ قراگاہ بڑی تکلیف دہ ہے ۴۴

۱۔ الحق مبتدا اور من ربکم خبر ہے یعنی حق وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ حق فرمائے، وہ حق نہیں جسے نفس کی خواہش اچھا کہے اور یہ بھی ہو سکتا
ہے کہ الحق مبتدا محذوف کی خبر ہو اور من ربکم حلال ہو یعنی اسلام یا قرآن حق ہے جو تمہارے رب کی طرف سے ہے۔

۲۔ یہ تخمیر کا صیغہ تہید اور وعید کیلئے استعمال کیا گیا ہے۔ گویا یہ جواب ہے جب عینہ نے نبی کریم ﷺ کو کہا تھا کہ تمہیں ان کی بد بو نکل
نہیں کرتی ہم تو قبیلہ مسز سے سردار اور معزز لوگ ہیں اگر ہم اسلام قبول کریں گے تو سب لوگ بھی اسلام قبول کر لیں گے اور ہمیں آپ
کی اتباع اور پیروی سے صرف یہی لوگ مانع ہیں۔ ان کو مجلس سے اٹھا دو تو ہم آپ کی اتباع کریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ حق تمہارے
رب کی طرف سے ہے اور اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ان مسکینوں و فقیروں کی مجلس وسنگت پر اپنے آپ کو روکے رکھو اور وہ تمہیں منع کرتا ہے
کہ کبھی ان پاکیزہ نفوس کو اپنی مجلس سے اٹھا دو چاہیں تو یہ کافر ایمان کی روشنی قبول کر لیں اگر چاہیں تو کفر کے اندر سے میں بھٹکتے
رہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں مجھے ایمان لانے والے کے ایمان کی اور کفر کرنے والے کے کفر کی کوئی پروا نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ایمان
قبول کرو گے تو اس کا نفع تمہاری طرف لوٹے گا اور اگر کفر کرو گے تو کفر کا وبال بھی تم پر ہی پڑے گا۔

۳۔ سورا و حمرہ جس کو قاتلوں کے ساتھ گھبرا گیا ہو نہ کہا یہ میں ہے ہر وہ چیز جو کسی دوسری چیز کو اپنے گھیرے میں لے لے خواہ وہ
دیوار ہو یا، خیمہ، علاء فرماتا ہے میں یہ لفظ مفرد ہے اور عربی نہیں، عربی میں داخل کیا گیا ہے کیونکہ عرب کلام میں کوئی مفرد لفظ ایسا نہیں
جس کا تیسرا لفظ الف ہو اور الف کے بعد و حرف ہوں۔ ہو سکتا ہے یہ سہرہ کی جمع ہو۔ امام احمد ترمذی اور حاکم نے حضرت ابوسعید
الخدیری سے روایت کیا ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا آگ کے سوا حق چار ہیں۔ یعنی دوزخ کی چار دیواریں ہیں۔ ہر دیواری کو موناٹی
اتنی ہے کہ اسے طے کرنے کے لیے چالیس سال درکار ہوں گے (۱)۔ حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ امام بخاری لکھتے ہیں ابن
عباس نے فرمایا سوادق سے مراد آگ کی دیواریں ہیں۔ کبھی کہتے ہیں یہ آگ کی لپیٹ ہے جو کفار کو بازار کی طرح گھیرے گی۔ بعض
فرماتے ہیں اس سے مراد دھواں ہے جو کفار کو گھیرے گا۔ اس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے ایک اور جگہ اس طرح فرمایا اِنظَلِفُوْا اِیْ ظِلِّ ذٰی شَلٰثٍ
شُحْبٍ۔ چلو اسے کی طرف جو تین شاخوں والا ہے (۲)۔

۴۔ امام احمد ترمذی، ابن ابی حاتم، ابن حبان، الحاکم اور بیہقی نے حضرت ابوسعید الخدیری سے نقل کیا ہے کہ مہل سے مراد وہ تلچھٹ ہے
جب وہ انسان کے قریب کیا جائے گا تو اس کے چہرے کی کھال (گل کر) اس میں گر جائے گی (۳)۔ امام احمد، نسائی، حاکم۔ ابن جریر،
ابن ابی حاتم، ابن المنذر، ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے ابی امام سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یسعی من ماء صدید
بتجر عہ کے متعلق فرمایا جب وہ پیپ والا پانی اس کو قریب کیا جائے گا تو وہ (کافر) اسے پانپند کرے گا اور جب زیادہ قریب کیا جائے
گا تو اس کا چہرہ جلادے گا اور اس کے سر کی کھال اس میں (سر کر) گر جائے گی اور جب وہ اس کو پیچے گا تو وہ اس کی استزیوں کو کاٹ دے
گا حتیٰ کہ وہ اس کی دیر سے نیچے بہ جائے گا۔ ابن ابی حاتم نے ابی علیہ کے واسطے سے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ المہل سے مراد
سیاہ تلچھٹ ہے۔ امام بخاری لکھتے ہیں ابن عباس نے فرمایا مہل سے مراد وہ غلیظ پانی ہے جو تیل کی تلچھٹ کی مانند ہوگا۔ مجاہد فرماتا ہے

پہنپ اور خون مراد ہے۔ ابن مسعود سے المہمل کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے سونا اور چاندی منگوائے پھر ان کو آگ پر گرم کیا جب وہ پگھل گئے تو فرمایا مہمل اس کے مشابہ چیز ہے۔ وہ پانی جو پہنپ جیسا غلیظ ہوگا جو بھی چہروں کے قریب ہوگا تو اس کی پیش سے چہرے جل جائیں گے۔ یہ جملہ ماء کی صفت ثانیہ ہے یا المہمل سے حال ہے یا کاف و تشبیہ جو ضمیر ہے اس سے حال ہے (1)۔

یہ جس کا مخصوص بالذم المہمل ہے اور ساءت کا مخصوص بالذم النار ہے۔ ابن عباس سے مروی ہے کہ معنی منزل، مجاہد نے مجمع، عطاء نے قرار گاہ اور قتیبی نے مجلس کیا ہے (2) ارتفاق کا اصل معنی رشار کے نیچے اپنی کبھی رکھتا ہے، معنی آرام کرنا اور سہارا لینا ہے یہ حسنیت مرفقا کے مقابلہ میں استعمال کیا گیا ہے ورنہ روز نبیوں کیلئے کب کوئی آرام اور سکون ہوگا۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ إِنَّا لَا نُضِيعُهُمْ أَجْرَهُمْ مِنْ أَحْسَنَ عَمَلًا ۖ

”جینک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے (تو ہمارا یہ دستور ہے کہ) ہم ضائع نہیں کرتے کسی کا اجر جو

عمدہ اور مفید) کام کرتا ہے۔“

پہلے ان کی خبر دوسرا ان اور اس کے اعزیز ہیں اور خبر میں ضمیر راجع محذوف ہے، تقدیر کلام اس طرح ہے مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا فَنُضِيعُهُمْ يَأْتِي أَحْسَنَ عَمَلًا کے عموم کی وجہ سے راجع ضمیر کی ضرورت ہی نہیں ہے جیسا کہ نعم الوجہ زیدش ضمیر کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی یا ضمیر کی تلک یہ اسم ظاہر ہے کیونکہ من احسن عملا کا اطلاق ہوتا ہی اللہین امنوا و عملوا الصالحات پر ہے۔

أُولَٰئِكَ لَهُمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ حُلُوفٌ بِهَا مِنْ أَسَاوٍ مِمَّنْ دَهَبٌ وَيَلْبَسُونَ ثِيَابًا خُضْرًا مِنْ سُدُسٍ ۖ وَاسْتَمْرَقَ فِيهَا عَلَى الْأَسْرَابِ نِعْمَ الثَّوَابُ ۗ وَحَسَنَتْ مَرْتَقًا ۖ

”یہی وہ (خوش نصیب) ہیں جن کے لیے بھنگی کے جنت ہیں وہاں ہیں جن کے نیچے ندیاں لے انہیں پہنائے جائیں گے ان جنتوں میں نلگن سونے کے لے اور پہنیں گے سبز رنگ کا لباس جو باریک ریشمی کپڑے اور مونے ریشمی کپڑے کا بنا ہوا ہوگا۔ تلک یہ لگائے بیٹھے ہونگے وہاں مرصع پتنگوں پر رہیں گے۔ لکنا اچھا ہے یہ اجر اور کتنی عمدہ ہے یہ آرام گاہ ہے۔“

لعدن کا معنی ٹھہرا ہے۔ عرب کہتے ہیں عدن الماء بالمشکان (پانی ٹھہرا گیا) عدن ایسے فرمایا ہے کہ اس میں مینوسن ہمیشہ ٹھہرے رہیں گے۔ اولنک کا جملہ اجر کے بیان کیلئے علیحدہ مستقل کلام کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ یہ جملہ (اولنک الحج) پہلے ان کی خبر ہو اور دوسرا ان اپنے اجر سے لکر جملہ مترضہ ہو یا یہ جملہ دوسری خبر بھی ہو سکتا ہے۔

ع اساور جمع ہے اسور فکی یا یہ اسواہکی جمع ہے (یعنی یہ جمع الجمع ہے) من ابتداء یہ ہے من ذهب اساور کی صفت ہے اور اس سے پہلے کن یا یہ ہے اساور اور ذهب پر ضمیر ان نلگنوں کے حسن و خوبصورتی کی بوائی کیلئے ہے، بطرانی نے الاوسط میں اور امام بخاری نے حسن سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا اے اہل جنت کے ادنیٰ زیور کا دنیا والوں کے تمام زیورات سے مقابلہ کیا جائے تو آخرت میں اللہ جو جنیوں کو زیور عطا فرمائیں گے وہ اہل دنیا کے تمام زیورات سے افضل اور بہتر ہو

گا (1)، ابوالفتح نے اعظمہ میں کعب الاحبار سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ پیدا فرمایا ہے جو پیدائش سے لے کر قیامت تک جنتیوں کے زیور تیار کرتا رہے گا۔ اگر جنتیوں کے زیوروں میں سے ایک زیور بھی (دنیا) میں لایا جائے تو سورج کی روشنی ختم ہو جائے۔

جنتیوں کے لباس سبز رنگ کے ہونگے۔ ابن السنی اور ابو نعیم نے طب النبی ﷺ میں حضرت انس روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا پسندیدہ رنگ سبز تھا (2)۔ سندس وہ کپڑا جو باریک ریشم سے بنا ہوا اور استبرق وہ کپڑا جو سونے ریشم سے بنا ہوا ہو۔ امام بغوی فرماتے ہیں جنتیوں کے کپڑوں میں سونائی سے مراد اس کی چمکی ہے (3) عمرالمحرابی سے مروی ہے کہ سندس وہ ریشم کا کپڑا ہے جو سونے سے بنا گیا ہو۔ نسائی، طیبی، بزاز اور بیہقی نے حسن سند سے حضرت عمر سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے عرض کی یا رسول ہمیں جنتیوں کے لباس کے متعلق بتائیے کیا بنے بنائے پیدا ہونگے یا ان بنے ہونے ہونگے جن کو بعد میں بنایا گیا ہوگا، ایک شخص یہ سوال سن کر ہنس پڑا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک ناواقف آدمی عالم سے سوال کرتا ہے تو تم ہنستے کیوں ہو۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا جنت کے پھل دومرتبہ ان کپڑوں سے پھینکے گئے (4)۔ (یعنی جنتیوں کے لباس درختوں کے پھولوں سے پیدا ہوں گے) بزاز، ابویعلیٰ اور طبرانی نے ابوالخیر مرثد بن عبداللہ سے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا جنت میں ایک درخت ہے جس سے ریشم پیدا ہوتا ہے جو اہل جنت کا لباس ہوگا (5)۔

جنتی جنت میں ایک لگا کر بیٹھے ہونگے۔ ایک لگا کر بیٹھے کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا کیونکہ یہ کیفیت خوشحال اور بادشاہوں کی ہوتی ہے جو صورتوں پر بیٹھے ہیں۔ وہ نشست گاہ جو بلند عروسی میں ہوتی ہے، اسے اریحہ کہتے ہیں۔ اس کی جمع اریحہ ہے۔ امام بیہقی نے ابن عباس سے اس آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا اریحہ وہ تخت ہوتا ہے جو بلند عروسی میں سجایا گیا ہوتا ہے اور تخت بغیر جلد کے ہوتا ہے اریحہ نہیں کہتے۔ اسی طرح جلد کو بغیر تخت کے اریحہ نہیں کہتے۔ جب جلد اور تخت دونوں ہوں تو اس مجموعہ کو اریحہ کہتے ہیں۔ بیہقی نے مجاہد سے روایت کیا ہے فرمایا اریحہ موتیوں اور یا قوت سے بنے ہونگے (6)۔

جنت کئی عمدہ جزا ہے اور کئی بہتر قرار گاہ اور عمدہ مجلس ہے یا یہ معنی کر مونی کتنے آرام دہ ہیں۔

وَأَضْرِبُ لَهُمْ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَحَفَفْنَاهُمَا بِنَخْلٍ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زُرْعًا ۝

”اور بیان فرمائیے ان کیلئے مثال دو آدمیوں کی ہم نے دیئے تھے ان دونوں میں سے ایک کو لہ دو ماغ انجوروں کے اور

ہم نے باز بنا دی ان دونوں کے ارد گرد بجزور (کے درختوں) کی لہ اور اگادی ان دونوں کے درمیان کھیتی لہ۔“

لہ علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ بعض علماء نے فرمایا یہ آیت دو بھائیوں کے بارے نازل ہوئی جو اہل مکہ میں سے تھے جنمزد سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک بھائی ابوسلمہ عبداللہ بن عبدالاسود بن عبدیلیل (یہ نبی کریم ﷺ کے نکاح سے پہلے ام سلمہ کے خاندان بنے تھے۔ بعد میں ام سلمہ حضور ﷺ کے عقد نکاح میں آئیں تھیں) ابوسلمہ مومن تھا اور دوسرا بھائی اسود بن عبدالاسود بن عبدیلیل کا فر تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ عیینہ اور اس کے ساتھیوں کا حضرت سلمان فارسی اور اپنے جیسے درویشوں کے ساتھ جو طرز عمل تھا اس کی مثال ہے، ان

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 401 (اعلیٰ)

2۔ کنز العمال، جلد 7، صفحہ 118 (اترث الاسلامی)

3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 565 (الکر)

4۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 401 (اعلیٰ)

5۔ ایضاً 6۔ ایضاً صفحہ 402

دونوں کو نبی اسرائیل کے دو شخصوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ جن میں سے ایک مومن تھا، جس کا نام یسود تھا، یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے اور بقول مقال اس کا نام تھلیجا تھا اور دوسرا کافر تھا جس کا نام قنڑوں تھا۔ وہب نے اس کا نام مظفر لکھا ہے۔ ان دونوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ الصافات میں فرمایا ہے۔ ان کا قصہ عبداللہ بن المبارک نے معمر کے حوالہ سے عطاء الغفرسانی سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں دو آدمی آپس میں شریک تھے، جن کے پاس آٹھ ہزار دینار تھے۔ بعض فرماتے ہیں یہ دونوں بھائی تھے، انہیں وراثت سے آٹھ ہزار دینار ملے تھے ان دونوں نے انہیں تقسیم کر لیا، ان میں ایک نے ہزار دینار سے زمین خریدی، دوسرے نے اللہ سے عرض کی فلاں نے ہزار دینار کے عوض زمین خریدی ہے میں تجھ سے جنت میں ہزار دینار کے بدلے زمین خریدتا ہوں، اس نے ہزار دینار صدقہ کر دیے پھر اس کے ساتھی نے ہزار دینار خرچ کر کے ایک گھر بنایا۔ مومن نے کہا یا اللہ فلاں نے ہزار دینار سے گھر بنایا ہے میں تجھ سے ہزار دینار کے عوض جنت میں گھر خریدتا ہوں اور ہزار صدقہ کر دیے پھر اس کے ساتھی نے ایک عورت سے شادی کی اور اس پر ہزار دینار خرچ کر دیے۔ مومن نے کہا اے اللہ میں تجھ سے جنت کی عورتوں سے نکاح کرنے کا سوال کرتا ہوں۔ ہزار دینار کے بدلے میں اس نے ہزار دینار صدقہ کر دیے پھر کافر نے ہزار کے بدلے میں غلام اور سامان خریدا۔ مومن نے کہا یا اللہ میں تجھ سے ہزار کے عوض غلام اور سامان خریدتا ہوں پھر اس نے ہزار صدقہ کر دیا۔ پھر مومن کو کسی ضرورت سے واسطہ پڑا تو وہ اپنے کافر ساتھی کے پاس آیا کہ شاید وہ مجھ سے نیکی کر دے، وہ اس کے راستہ پر بیٹھ گیا حتیٰ کہ کافر اس کے پاس خدام کی صحبت میں پورے کروڑ سے گزرا۔ کافر نے اسے پہچان لیا اور پوچھا تو فلاں ہے۔ مومن نے کہا ہاں فلاں ہوں۔ پوچھا کیا کام ہے؟ مومن نے اپنی تکلیف کا اظہار کیا اور کہا میں تیرے پاس آیا ہوں تاکہ تو میرے ساتھ نیکی کر دے۔ کافر نے پوچھا تیرے دو مال کہاں گیا جو ہم نے آپس میں تقسیم کیا تھا اور تجھے نصف حصہ ملا تھا۔ مومن نے اپنا سارا واقعہ بیان کر دیا (کہ وہ میں نے صدقہ کر دیا ہے) کافر نے کہا تو مال کو فقیروں، درویشوں پر صدقہ کر دیتا ہے کل نکل جا میں تجھے کچھ نہیں دے سکتا پس کافر نے مومن کو ترش لہجہ میں زبردستی کر کے نکال دیا پھر وہ دونوں مر گئے تو ان کے متعلق یہ آیات نازل ہوئیں **فَأُولَئِكَ يَتَصَّغَّمُ عَلَىٰ بَعْضِ مَسْئَلَتِهِمْ ۗ قَالَ عَلَيْهِمْ أَنَّهُمْ لَئِن كَانُوا لِي قَوْمًا لَّيُؤْتِيَهُمْ لِقْوَتَهُمْ وَأَنَّهُمْ لَيُؤْتِيَهُمْ لِقْوَتَهُمْ وَأَنَّهُمْ لَيُؤْتِيَهُمْ لِقْوَتَهُمْ وَأَنَّهُمْ لَيُؤْتِيَهُمْ لِقْوَتَهُمْ** اور) سوال جواب نہیں گئے کہے گا ان میں سے ایک کہ میرا ایک بھری دوست ہو کر آتا تھا (۱)۔

روایت ہے کہ جب مومن اس کے پاس آیا تو وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر گھومنے لگا اور اسے اپنا مال و متاع اسے دکھانے لگا۔ اس وقت ان کے متعلق یہ آیات نازل ہوئیں، یعنی کافروں اور مومنین کیلئے دو آدمیوں کی مثال بیان کر دینی مقدر یا نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں یا سابقہ زمانہ کے دو آدمیوں کی مثال بیان کر دے جو جلیں مضاف کے حذف کے ساتھ مثل کا بدل ہے اور اس کے بعد مثل کی تفسیر ہے۔ یعنی کافر کیلئے ان گوروں کے باغ اگانے یا جملہ تیشیل کا بیان یا جلیں کی مکت ہے۔ حنفی القوم کا معنی ہے قوم نے اسے گھر لیا اور محل سے پہلے باز آمدہ ہے جسے غشیت یا میں باز آمدہ ہے۔

ان دونوں باغات کے درمیان کوئی جگہ بنی خراب نہیں ہے بلکہ ان کے درمیان بھی ہم نے بھٹی اگادی ہے گویا وہ دونوں باغ ہر قسم کے اناج اور پھلوں کے جامع ہیں اور بہت خوبصورت ترتیب اور دلکش انداز میں وہ باغ لگائے گئے ہیں۔

يَكْتُمُ الْجَنَّةِينَ إِنَّهُمَا لَكُمْ لَعْنَةٌ وَأَنَّهُمْ لَيُؤْتِيَهُمْ لِقْوَتَهُمْ وَأَنَّهُمْ لَيُؤْتِيَهُمْ لِقْوَتَهُمْ وَأَنَّهُمْ لَيُؤْتِيَهُمْ لِقْوَتَهُمْ

”یہ دو دنوں باغ اپنے پھل لائے اور نہ کم ہوئی ان سے کوئی چیز اور ہم نے جاری کردیں ان کے درمیان نہریں لے۔“
 لہ باغ دو ہیں لیکن صیغہ اور ضمیر مفرد ذکر فرمائی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ کلنا مفرد ہے عام طور پر باغات کا پھل ایک سال اچھا ہوتا ہے دوسرے سال کم ہوجاتا ہے لیکن ان باغوں کے پھلوں میں کبھی کوئی کمی نہیں ہوئی فجواً کوئی یعقوب نے جنیم کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ دوسرے قراء نے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور ان باغوں کے درمیان نہریں جاری فرمائی ہیں تاکہ ان کو متواتر پانی ملتا رہے اور ان کی بہا رہتی رہے اور ہمیشہ سرسبز و شاداب رہیں۔

وَكَانَ لَهُ ثَمَرٌ فَقَالَ لِصَاحِبِهِ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَنَا أَكْثَرُ مِمَّا مَلَآ وَآعَزُّ نَفْرًا ۝۱۰

”اور (باغوں کے علاوہ) اور بھی اس کے اموال تھے۔ تو (ایک روز) اس نے اپنے ساتھی سے بحث مباحثہ کے دوران کہا کہ میں دولت کے لحاظ سے بھی تم سے زیادہ ہوں اور نفری کے لحاظ سے بھی تم سے طاقتور ہوں۔“

۱۔ ثمر کو عام نے ثاء اور میم کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عمرو نے ثاء کے ضمہ اور میم کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے دو دنوں کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ محیط ثمرہ فتح میں بھی اسی طرح مختلف قراءتیں ہیں۔ الا زہری فرماتے ہیں اثرہ کی جمع ثمر یعنی ثاء اور میم کے فتح کے ساتھ آتی ہے۔ قاموس میں ہے الثمرہ محرکة حمل الشجر و انواع العمال (۱) یعنی الثمرہ باغات اور باغات کے علاوہ مال کی اقسام کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے، واحد ثمرہ و ثمرہ ہے اور جمع ثمار ہے اور جمع ثمر اور جمع الثمر جمع ثمار اور ثمار کی جمع ثمر یعنی ثاء اور میم کے ضمہ کے ساتھ آتی ہے۔ قاموس میں ہے علماء فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ باغوں کے علاوہ اس کے پاس مال و دولت کے کئی ذخائر بھی تھے اور یہ ضمیر مبالغہ سے مشتق ہے جس کا معنی مال کا زیادہ ہونا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں یہاں ثمر سے مراد سونا اور چاندی ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں جنہوں نے ثمر کو ثاء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے ان کے نزدیک درختوں کے پھل مراد ہیں جو کھائے جاتے ہیں اور جنہوں نے ثاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے ان کے نزدیک اس سے مراد مال کثیر ہے (2)۔

۲۔ ثمر سے مراد خدام، نوکر چاکر اور معاون ہیں۔ بعض علماء نے اس کا معنی مذکور اولاد کیا ہے کیونکہ یہ اس کے ساتھ چلتے ہیں۔ اس معنی پر یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے ان ترون انا اقل منك مالا وولداً۔

وَدَخَلَ جَنَّتَهُ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ ۚ قَالَ مَا أَظُنُّ أَن تَبِيدَ هَذِهِ أَبَدًا ۝۱۱

”اور (ایک دن) وہ اپنے باغ میں گیا اور آنحضرتؐ کی وہ اپنی جان پر ظلم کرنے والا تھا کہنے لگا میں نہیں خیال کرتا کہ یہ (سرسبز

و شاداب) باغ کبھی برباد ہوگا۔“

۱۔ یہاں ایک باغ کا ذکر فرمایا کیونکہ وہ علیحدہ علیحدہ ہر باغ میں داخل ہوتا تھا یا اس لئے کہ دو دنوں باغ ایک دوسرے کے ساتھ متصل تھے اس لئے ایک باغ فرمایا یا باؤ اور چار دیواری کے ایک ہونے کی وجہ سے (جنت) ایک باغ فرمایا اور درمیان میں نہریں کی وجہ سے جنتیں (دو باغ) فرمایا یا باغ مراد ہے جس نے اسے دائمی باغ سے محروم کر دیا تھا، جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے متعین سے فرمایا ہے چونکہ کافر کی امیدیں بڑی طویل تھیں اور غفلت میں سرکش ہو چکا تھا اور مہلت کی وجہ سے بڑے گھمنڈ میں تھا، اس وجہ سے اس نے کہا

میں تو اس باغ کی فنا کا تصور بھی نہیں کرتا شاید یہ بھی مراد ہو کہ اس نے یہ گمان کیا کہ اس کی یہ خوشحالی، مال، دولت اور باغات ہمیشہ رہیں گے، جب تک اس کی زندگی کے سانس باقی ہیں کیونکہ کوئی مظلمند خواہ مومن ہو یا کافر وہ یہ تو جانتا ہے کہ ایک دن اس دنیا سے کوچ کرتا ہے اور ہمیشہ زندہ رہنا تو ممکن ہی نہیں ہے یا یہ مراد ہے کہ اس نے زبان حال سے یہ کہا تھا کیونکہ جو یاد الہی سے غافل ہوتے ہیں اور دنیا کی لذتوں اور آسائشوں میں منہمک ہوتے ہیں وہ بڑی طویل انگلیں رکھتے ہیں اور ایسے ایسے اعمال کرتے ہیں گویا انہوں نے کبھی مرنا ہی نہیں ہے۔ گو یادہ زبان حال سے کہتے ہیں کہ نہ ہمارے باغ تباہ ہوں گے اور نہ قیامت قائم ہوگی۔

وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَلَئِنْ رُجِدْتُ إِلَىٰ رَبِّي لَأَجِدَنَّ خَيْرًا مِنْهَا مُنْقَلَبًا ۝

”اور میں یہ خیال بھی نہیں کرتا کہ کبھی قیامت بھی برپا ہوگی اور بغرض محال اگر مجھے لوٹا گیا اپنے رب کی طرف تو یقیناً میں

پاؤں گا اس (زہت گاہ) سے بہتر پلٹنے کی جگہ لے“

۱۔ چونکہ وہ کافر تھا اور قیامت کے وقوع کا منکر تھا اس لئے اس نے کہا میں قیامت کا تصور کبھی نہیں سکتا۔ پھر اس نے کہا بغرض محال اگر مرنے کے بعد تمہارا گمان کے مطابق مجھے رب کے حضور لوٹا بھی گیا تو میں آخرت میں دنیا کی سعادت مند یوں سے زیادہ سعادت و آرام عطا فرمائے گا۔ اس نے یہ اس لئے کہا تھا کہ کیونکہ اس کا یہ اعتقاد تھا کہ دنیا میں جو مجھے اللہ تعالیٰ نے آرام و آسائش دی ہے، یہ اس وجہ سے ہے کہ میں اللہ کی بارگاہ میں معزز و محترم ہوں اور میرا یہ اللہ کے ہاں حق ہے، بھریوں اور کوفیوں نے منہا کو مفرد ضمیر کے ساتھ پڑھا ہے جس کا مرعج وہ باغ ہے جس میں وہ داخل ہوا تھا اور حجازیوں اور شامی قراء نے منہما ضمیر ضمیر کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان کے مصاحف میں بھی تنزیہ ضمیر کے ساتھ ہے اور مرعج جنتیں ہے۔ منقلباً کا معنی، مرعج اور انجام ہے۔

قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَكَفَرْتَ بِالَّذِي خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ
نُطْفَةٍ ثُمَّ سَوَّكَ لَرَجُلًا ۝

”اس کے ساتھی نے اس بحث مباحثہ کے درمیان کہا کیا تو انکار کرتا ہے اس ذات کا جس نے تجھے پیدا فرمایا مٹی سے پھر

نطفہ سے پھر بنا سنوار کر تجھے مرد بنا یا لے“

۱۔ یہ مومن کی گفتگو جو وہ اپنے ساتھی کافر سے کر رہا ہے۔ کیا تو اس کریم ذات کا انکار کرتا ہے جس نے تجھے مٹی سے پیدا فرمایا۔ تیرے مادہ کی اصل مٹی ہے یا تیرے اصل آدم علیہ السلام کا مادہ مٹی ہے اور پھر نور کر تیرا قرہی مادہ بھی اتنی عمدہ چیز نہیں وہ نطفہ ہے پھر اس نے تجھے اپنی کمال قدرت سے کامل انسان بنا دیا۔ اس آیت میں قیامت کے انکار کو اللہ تعالیٰ کے انکار سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ قیامت کا انکار اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت پر شک کی بنیاد پر ہے۔ اسی وجہ سے اس کی مٹی کی تخلیق پر ان کا قیامت کو مرتب فرمایا ہے کیونکہ جو ابتداء مٹی سے پیدا کرنے پر قادر ہے، وہ اس کے اعادہ پر بھی قادر ہے۔

لَكِنَّا هُوَ اللَّهُ رَبِّي وَلَا أُشْرِكُ بِرَبِّي أَحَدًا ۝

”لیکن میں (تو) وہ اللہ ہی میرا رب ہے اور میں شریک نہیں ٹھہراتا اپنے رب کے ساتھ کسی کو لے“

۱۔ لکننا کو جمہور قرار نے وہ وقف کی صورت میں خط کی اتباع کرتے ہوئے الف کے ساتھ پڑھا ہے اور وصل کی صورت میں بغیر الف کے پڑھا ہے کیونکہ اس کی اصل لکن انا ہے۔ تخفیف کیلئے ہمزہ کو حذف کیا گیا ہے اور اس کی حرکت لکن کے کون کو دی گئی ہے پس

دونوں جمع ہو گئے تو آپس میں مدغم ہو گئے اور الف خط میں باقی رہا، وقف کی صورت میں الف پڑھا جاتا ہے جیسے انا میں وقت کی صورت میں پڑھا جاتا ہے اور وصلا الف نہیں پڑھا جاتا جیسے انا میں وصلا الف نہیں پڑھا جاتا۔ ابن عامر، یعقوب نے وصل کی صورت میں بھی الف کیساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ ہمزہ کے عوض میں ہے یا وصل کو وقف کے قائم مقام کرتے ہوئے ایسا پڑھا ہے۔

ع۔ ہو ضمیر شان ہے اور جملہ اس کی خبر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ہوا اللہ کی ضمیر ہو اور اللہ اسم جلالہ اس کا بدل ہو اور وہی اس کی خبر ہو اور ہو اللہ وہی کا جملہ فعل محذوف کا مفعول ہو، تقدیر عبادت اس طرح ہوا قول ہو اللہ وہی اور اقوال کا جملہ انکی خبر ہو اور ضمیر عائدہ قول کی انا ضمیر ہو اور اس تقدیر کی دلیل ولا اشرك وہی کا عطف ہے۔ وہی کی یا کو نافع، ابن کثیر اور ابو عمر نے یا کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے ولا اشرك وہی اکفرت سے استدرک ہے گویا اس طرح کہا ہے تو اللہ کا منکر ہے لیکن میں مومن اور موصد ہوں جیسا کہ یہ جملہ ہے زید غائب لیکن عمرو حاضر امام بغوی فرماتے ہیں کسائی نے فرمایا اس آیت میں تقدیر انا خبر ہے اصل میں لیکن اللہ ہو وہی ہے (1) اس صورت میں لکنا میں خلاف قیاس رسم الخط میں الف زائد ہے۔

وَلَوْلَا اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتِكَ قُلْتَ مَا شَاءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ اِنْ تَرٰنَا اَقْلًا مِنْكَ مَا لَآ وَوَلَدًا ﴿۱﴾

”اور کیوں ایسا نہ ہوا کہ جب تو باغ میں داخل ہو تو تو کہتا ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ (وہی ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے اور

اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر کسی میں کوئی طاقت نہیں)۔ اگر تو نے مجھے دیکھا کہ میں کم ہوں تجھ سے مال اور اولاد میں ع۔“

ع۔ ماشاء اللہ سے پہلے ماموصولہ بھی ہو سکتا ہے اور ما شرطیہ بھی، بشرطیہ کی صورت میں جواب محذوف ہوگا۔ یہ اقرار ہے کہ یہ باغ اور جو کچھ اس میں ہے اللہ کی مشیت اور چاہت سے ہے۔ اگر چاہے تو وہ اس کو باقی رکھے چاہے تو اس کو تلف کر دے۔ یعنی تو نے باغ میں داخل ہوتے وقت اپنے بجز اور ناتوانی اور اللہ کی قدرت کا اعتراف کیوں نہ کیا کہ میں تو اس باغ کی حفاظت پر قدرت نہیں رکھتا مگر اللہ تعالیٰ کی مدد اور معونت سے۔ اس کی آبادی اور اس کی تدبیر کی جو توفیق ملی ہے، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی معونت اور تائید سے ہے۔

امام بخاری نے شعب الایمان میں حضرت انس کی حدیث روایت کی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا جو کسی چیز کو دیکھے اور وہ اس کو اچھی لگی تو کہے ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ یا کہنے سے اس کو نظر بند نہ لگے گی (2) ابن اسنی نے بھی اس طرح روایت کی ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ہشام بن عمرو نے ابیہ سے مروی ہے کہ جب بھی حضرت عمروہ اپنے مال میں سے کوئی اچھی چیز دیکھتے یا باغ میں داخل ہوتے تو یہ کہتے ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ (3)۔

ع۔ تون میں قالون اور ابو عمرو نے صرف وصل کی صورت میں یاہ کو قائم رکھا ہے۔ ابن کثیر نے دونوں حالتوں میں یلکو قائم رکھا ہے اور باقی قراء نے دونوں حالتوں میں یاہ کو محذوف کیا ہے۔ انما ضمیر فصل ہے یا مفعول اول کی تاکید ہے۔ اقل کو انکی خبر کے اعتبار سے مرفوع بھی پڑھا گیا ہے اور بجز جملہ تون کا مفعول ثانی ہے۔

فَعَسَىٰ سَآءَ اَنْ يُّؤْتِيَنَّ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلْ عَلَيْهَا حِسَابًا مِّنَ السَّمَآءِ
فَتُصْبِحُ صَعِيدًا زَلَقًا ﴿۲﴾

”پس عجب عجیب کی میرا رب مجھے عطا فرمادے کوئی بہتر چیز تیرے (اس) باغ سے اور اتارے اس باغ پر کوئی آسمانی عذاب تو ہو جائے یہ (سرسبز) باغ ایک چمنیل میدان ل۔“

ل۔ ایسی کی یا کوئی نفع، ابن کثیر اور ابو عمر نے یاء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان یقین میں ابن کثیر نے دونوں حالتوں میں یاء کو ثابت رکھا ہے اور نافع اور ابو عمرو نے صرف وصل میں یاء کو قائم رکھا ہے۔ باقی قراء نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کیا ہے۔ یہ جملہ ان نو رکع کا جواب ہے۔ قناده نے حسنا کا معنی عذابا کیا ہے۔ ابن عباس نے آگ فرمایا ہے۔ تمہی نے اس کا معنی پتھر یا طوفان فرمایا ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ حسبان کی جمع ہے اور اس کا معنی الصونع (کڑک) ہے بعض علماء فرماتے ہیں یہ حساب کا معنی میں صدر ہے اور اس سے مراد باغ کی تباہی کا اندازہ لگانا یا برے اعمال کا عذاب ان کے حساب سے دینا ہے۔ (1) صحیحاً و لقا یعنی وہ باغ اس طرح صاف ہو جائے کہ اس پر پاؤں چھلنے لگیں کیونکہ اس کے درختوں اور پودوں کا نام نشان ہی نہ ہوگا۔ حضرت مجاہد نے اس کا معنی خرفناک ریگستان کیا ہے۔

أَوْ يُصِيبُ مَا وَهَّغُوا فَلَئِنْ تَسْتَيْبِكُمْ لَ تَطْلُبُونَهَا

”یا ایوں جذب ہو جائے اس کا پانی زمین کی گہرائی میں کہ پھر تو اس کو تلاش کے باوجود نہ پاسکے۔“

ل۔ نور از زمین کے اندر چلا جاتا ہے صدر ہے اس کے ساتھ صفت نکالی گئی ہے جیسے زلعا مصدر کو بطور استعمال کیا گیا ہے۔

وَأُحِيطَ بِبِسْمِهِ فَأَصْحَابُ الْقُلُوبِ كَقَبِيهِ عَلَىٰ مَا أَنْفَقُوا فِيهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا
وَيَقُولُ يَا لَيْتَنِي لَمْ أُشْرِكْ بِرَبِّي أَحَدًا ۗ

”اور اس کے (باغ) کا پھل بردہ ہو گیا پس وہ کف آنسوؤں لئے گا اس مال کے نقصان پر جو اس نے باغ پر خرچ کیا تھا اور

(اب) وہ گرا پڑا تھا اپنے چیمپروں پر اور (بعد حسرت) کہنے لگا کاش! میں نے کسی کو اپنے رب کا شریک نہ بنایا ہوتا۔“

ل۔ اس کا مال اس طرح ہلاک ہوا جیسی اس کو نوقسے زخمی یہ احاطہ العدو سے متعلق ہے کیونکہ جب وہ گھیرے میں لے لیتا ہے تو وہ مخالف پر غالب آجاتا ہے اور اسے ہلاک کر دیتا ہے۔ قلب الکف شرمندگی اور ندامت سے کنایہ ہے۔ میں (مفسر) کہتا ہوں میرے نزدیک آیت کا مفہوم یہ ہے کہ کافر جب دنیا میں اپنے باغ کو گرا پڑا دیکھتا ہے تو کف آنسوؤں ملتا ہے اور قیامت کے دن یا قبر میں جنت میں اپنے مقام کو دیکھے گا جس کو دوزخ سے بدل دیا گیا ہوگا تو کہے گا کاش میں نے کسی کو دنیا میں اپنے رب کا شریک نہ ٹھہرایا ہوتا۔ ہر وہی کی یا کوئی نفع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے فتح کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَلَمْ يَكُنْ لَهُ فِئَةٌ يَمْسُورُهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَمَا كَانَ مُنتَصِراً ۗ

”اور نہ رہی تھی اس کے پاس کوئی جماعت جو اس کی مدد کرتی اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں اور نہ وہ بدلہ لینے کے قابل تھا۔“

ل۔ حمزہ اور کسائی نے لم یکن یعنی یاء کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ قائل معوض غیر حقیقی ہے اللہ کے سوا قیامت کے روز اس کے عذاب کو دور کرنے یا ہلاک شدہ باغ کو لوٹانے یا اس کی مثل لانے پر کوئی قادر نہیں ہے۔ صرف وہ ذات خود ہی کسی کی اعانت کرے تو کر سکتی ہے لیکن اس کے دستور میں کفار کی مدد کرنا نہیں ہے اور کافر اس مزہ پر انتقام بھی نہیں لے سکتا۔

هَذَاكَ الْوَلَايَةُ لِلَّهِ الْحَقِّ طُوحًا خَيْرًا تَوَابًا وَ خَيْرًا عَقِبًا ﴿٣٧﴾

”یہاں سے ثابت ہو گیا کہ سارا اختیار اللہ سچے کیلئے ہے۔ وہی بہتر ثواب دینے والا ہے اور اس کے ہاتھ میں بہتر انجام ہے۔“

یعنی جب قیامت قائم ہوگی تو واضح ہو جائے گا کہ اختیار کس کے ہاتھ میں ہے۔ حمزہ اور کسائی نے المولایہ کو واؤ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے جس کا معنی غلبہ ہے اور باقی قراء نے فتح کے ساتھ پڑھا ہے جس کا معنی دوست اور مدد کرتا ہے، جیسا کہ اس ارشاد الہی میں ہے اللہ ولی الذین آمنوا کہ اللہ ایمانداروں کا دوست اور مددگار ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں واؤ کے فتح کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ربوبیت ہے اور اگر واؤ کے کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی امارت ہے۔ ابو عمر و اور کسائی نے الحق کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ ولایت کی صفت ہے۔ حضرت ابی کی قرات اس کی تائید کرتی ہے هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلَّهِ الْحَقِّ لِلَّهِ۔

مبتدا محذوف محو کی خبر ہے۔ باقی قراء نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ اسم جلال کی صفت ہے جیسے اس ارشاد میں ہے مُبْتَدَأُ إِلَى اللَّهِ هُوَ لِلَّهِ الْحَقِّ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ علی بنی لم اشرك بوسى احداً کا جملہ کافر سے دینیاں شرمندگی اور شرک سے توبہ کے طور پر صادر ہوا ہو۔ یا جب اسے اپنی بھائی کی نصیحت یاد آئی ہو اور اس نے اضطرابی اور اضطراری حالت میں یہ کہا ہو اور اس نے گمان کیا ہو کہ یہ سارا نقصان مجھے شرک کی وجہ سے پہنچا ہے خواہ وہ ایمان لایا ہو یا نہ لایا ہو۔ یہ اس کا قول دوسرے کفار کے قول کی طرح ہوگا جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں اور وہ بھنڈوں میں پھنس جاتی ہے تو وہ اللہ کو پکارتے ہیں قَادِرًا كَيْفَ تَوَانِي الْغُلَابُ دَعَا اللَّهَ مُخْلِصِيْنًا لَهٗ الْيَتِيْمِيْنَ پھر جب سوار ہوتے ہیں کشتی میں تو دعائیں کہتے ہیں اللہ تعالیٰ سے خالص کرتے ہوئے اس کے لیے اپنے دین کو یعنی حالت اضطراب میں وہ کہے گا ولایت تو اللہ سچے کیلئے ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات اپنے اطاعت شعار بندوں کو بہتر جزاء عطا فرماتی ہے۔ انہیں دنیا میں اپنی حکمت کے تقاضے کے مطابق جزاء عطا فرماتا ہے اور آخرت میں بھی ان کو بہتر ثواب اور دائمی اجر عطا فرمائے گا، جبکہ دوسرے منکر لوگوں کو وہ اپنی مشاء کے مطابق حقیر اور فانی چیزیں عطا فرماتا ہے اور بس آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔ عقبا کو عاصم اور حمزہ نے تاقف کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ عقبا کا معنی جزاء ہے، جزاء کو عقبا اس لئے کہتے ہیں کیونکہ وہ طاعت کے پیچھے ہوتی ہے۔

وَ اَصْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَا نَزَّلْنٰهُ مِنَ السَّمٰوٰتِ اَنْزِلًا مَّا يَخْتَلِفُ فِيْهَا نَبَاتٌ
الْاَرْضِ فَاَنْصَبْ عَلَيْهِمْ مَّثَلًا تَرْوِيْهِمْ طُوْحًا وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿٣٨﴾

”یہاں فرمائیے ان سے دنیوی زندگی کی (ایک اور) مثال یہ پانی کی طرح ہے جسے ہم نے اتارا ہے آسمان سے پس گھٹیاں ہو کر گئی ہیں اس پانی سے زمین کی ان گوریاں پھر کچھ عرصہ کے بعد وہ خشک ہو سیدہ گھاس ہو جاتی ہے اڑانے پھرتی ہیں اسے ہوا میں۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔“

۱۔ اسے پیار سے اپنی قوم کے سامنے اس دنیا کی ظاہری چمک دمک، بہت جلدی نمایاں کی عجیب و غریب حالت کو بیان کر دیا ہے تو اس پانی کی طرح ہے جسے ہم اپنی قدرت سے اتارتے ہیں۔ کما ہوا جو کچھ خبر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ انصرب کا مفعول ثانی ہو اور ضرب کا معنی حصر ہو۔ اختلاط کا معنی مل جل جانا ہے، یعنی اس پانی کے سبب زمین کی فصل گھٹیاں ہو جاتی ہے یا یہ معنی کہ پانی نے اس گھٹیاں میں اثر دکھایا اور وہ بھتی

سر بزرگ و شاداب ہوگی۔ ابو سعید فرماتے ہیں تندر وہ کا معنی کھیرنا ہے۔ بلکہ مجموعی کیفیت مشابہہ ہے اور وہ یہ ہے پانی کے ذریعے پودوں کا پیدہ ہونا ان کا گنجان ہونا پھر ان کا بزرگ بزرگ ہونا پھر ان کو پلوؤں کا کھیرنا اور آخر میں اس طرح ہو جانا کہ گویا یہاں کھیتی تھی ہی نہیں۔ بح اللہ تعالیٰ کسی چیز کے پیدا کرنے اور فنا کرنے پر پوری طرح قادر ہے۔

أَمْثَالُ وَالْمُؤْنُ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالْبَقِيَّةُ الصَّالِحَةُ حَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَحَيْرٌ أَمْثَالًا ۝

”مال اور فرزند (تو صرف) دنیوی زندگی کی زیب و زینت ہیں۔ اور (درحقیقت) باقی رہنے والی نیکیاں بہتر ہیں

تیر سے رب کے ہاں ثواب کے اعتبار سے اور بہتر ہیں جن سے امید و اہستہ کی جاتی ہے۔“

یہ مال و اولاد جس کی کثرت پر عینہ اور اس جیسے مادیت پرست اترتے ہیں، دنیا میں انسان ان سے زیب و زینت حاصل کرتا ہے لیکن یہ بوجلدی فنا ہونے والی ہیں۔ یہ دنیا کا مال و اسباب آخرت کا زور اور نہیں ہے۔

ع اور ایک نیک اعمال جن کا اثر دائمی ہے وہ از روئے ثواب کے مال و فرزند سے اللہ کی بارگاہ میں ہزار درجہ بہتر ہیں۔ اور ہر اس چیز سے بہتر ہیں جن سے انسان امیدیں وابستہ کرتا ہے۔

علامہ بنوئی لکھتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا مال اور بیٹے دنیا کی کھیتی ہیں اور نیک اعمال آخرت کی کھیتی ہیں۔ کبھی اللہ تعالیٰ یہ دونوں چیزیں بعض افراد کو عطا فرمادیتا ہے (۱)۔ ابن عباس، عکرمہ اور مجاہد فرماتے ہیں الباقیات الصالحات سے مراد سبحان اللہ، الحمد للہ ولا الہ الا اللہ والا اکبر ہے۔ حضرت ابو سعید الخدری سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی تسبیح، تہلیل، تہلیل، تکبیر اور لا حول ولا قوۃ الا باللہ ہیں (۲) اس حدیث کو امام احمد، ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اس کی تصحیح بھی کی ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا لا حول ولا قوۃ الا باللہ کی کثرت کیا کرو کیونکہ یہ تکلیف کے ننانوے (99) روزے بند کرتا ہے اور کم از کم تکلیف جو اس سے دور ہوتی ہے وہ حزان و مال ہے اس حدیث کو العقلمی نے روایت کیا ہے۔

نعمان بن بشیر سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ سبحان اللہ الحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر یہ الباقیات الصالحات ہیں (3) طبرانی نے اسی کی مثل سعد بن عبادہ کی حدیث نقل کی ہے۔ ابن جریر نے حضرت ابو ہریرہ سے مرفوع حدیث اسی طرح نقل کی ہے، ایک صحابی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا افضل کلام یہ ہے۔ سبحان اللہ الحمد للہ لا الہ الا اللہ واللہ اکبر۔ اس کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سبحان اللہ الحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر میرے نزدیک ہر اس چیز سے زیادہ محبوب ہے جن پر سورج طلوع ہوتا ہے (4)۔ اس حدیث کو مسلم اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر، مسروق اور ابراہیم فرماتے ہیں الباقیات الصالحات، پانچ نمازیں ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہ قول مروی ہے۔ ابن عباس سے اس کا مفہوم اعمال صالحہ بھی

1- تفسیر بنوئی، جلد 3، صفحہ 571 (المنکر)
2- الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 408 (العلیہ) 3- ایضاً

4- صحیح مسلم، جلد 17، صفحہ 16، حدیث: 32 (العلیہ)

مردی ہے۔ حضرت قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔ (1)

وَيَوْمَ نَسِيتُ الْجِبَالُ مَا هِيَ إِلَّا أَرْضٌ يَأْتِيهَا رِزْقٌ وَأَحْشَرُ لَكُمْ فَمَا تَعْبُدُونَ مِنْهُمْ أَحَدًا ۝

”اور (خورد کرو) جس روز ہم بنادیں گے پہاڑوں کو (ان کی جگہ سے) لے اور تم دیکھو گے زمین کو کہ کھلا میدان ہے اور ہم جمع کریں گے انہیں پس نہیں پیچھے رہنے دیں گے ان میں سے کسی کو۔“

لے کوئیوں اور نافع نے جمع شکلم کا صیغہ نسیت پڑھا ہے اور جبال کو منصوب پڑھا ہے اور باقی قراء نے واحد مونث غائب کا صیغہ اور مجہول پڑھا ہے اور الجبال کو نائب الفاعل بنایا ہے، یعنی ہم پہاڑوں کو اپنی جگہ سے اکھیر دیں گے اور ریزہ ریزہ کریں گے۔ یوم اذ کفر فعلی کی وجہ سے منصوب ہے یا عند ربک پر اس کا عطف ہے اس لئے منصوب ہے تقدیریوں ہوگی التَّبَقِيَاثُ الصَّالِحَةُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ

ہے آپ کو زمین کھلا میدان نظر آئے گی، درخت، پہاڑ اور کوئی منزل دکھائی نہ دے گی۔ ابن ابی حاتم نے قتادہ سے ہار ذکا بھی مفہوم نقل کیا ہے۔ عطا فرماتے ہیں زمین میں جو مردے وغیرہ دفن ہیں وہ ظاہر ہو جائیں گے اور زمین کا باطن بھی ظاہر دکھائی دے گا پھر فرمایا ہم لوگوں کو تہروں سے اٹھائیں گے۔ نسیتو مضارع کا صیغہ استعمال فرمایا اور یہاں، حشر ناماضی کا صیغہ ذکر فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قیامت کا وقوع تحقیق اور یقینی ہے یا اس بات پر دلالت کرنے کیلئے کہ حشر پہاڑ کے ہٹانے سے پہلے ہوگا، اس صورت میں واؤ عالیہ ہوگی اور قد تقدیر ہوگا۔ غدرہ کا معنی کسی کو چھوڑ دینا ہے، وفاء نہ کرنے کو غدر کہتے ہیں۔ فلم نغادر کا معنی ہوگا کہ ہم نہیں چھوڑیں گے، یعنی زندہ کیے بغیر ہم کسی کو نہیں چھوڑیں گے۔

وَعُرْضُوا عَلَىٰ رَبِّكَ صَفًّا لَقَدْ جِئْتُمُونَا كَمَا خَلَقْتُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ بَلْ رَعَيْتُمُ
الَّذِينَ نَجَعَلْ لَكُمْ مَوْعِدًا ۝

”اور وہ پیش کیے جائیں گے آپ کے رب کی بارگاہ میں صفیں باندھے ہوئے لے (پھر ہم انہیں کہیں گے کہ) آج تم آگے ہو ہمارے پاس جیسے ہم نے پیدا کیا تھا تمہیں پہلی بار لے ہاں تم تو یہ خیال کیے ہوئے تھے کہ ہم نہیں مقرر کریں گے تمہارے لیے وعدہ کا وقت لے“

لے لوگوں کے بارگاہ الہی میں پیش ہونے کی حالت کو لشکر کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے جو بادشاہ کے سامنے تعارف کیلئے نہیں بلکہ اس لئے آتا ہے کہ وہ انہیں حکم دے اور سارے بندے صفوں میں ہونگے، کوئی کھٹی اور پوشیدہ نہیں ہوگا۔ لقد جئتمونا حال ہے عوضوا کی ضمیر سے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لقد جئتمونا یوم کا حال ہو۔

یعنی ہمیں تم کہیں گے تم آگے ہو جس طرح ہم نے تمہیں پیدا کیا تھا پہلی مرتبہ کہ تمہارے سر پر کپڑا تھا، نہ پاؤں میں جوتا تھا اور تمہارا تختہ بھی نہ کیا گیا تھا۔ تمہارے پاس کچھ بھی نہیں ہے جو ہم نے تمہیں بعد میں دنیا کے اندر عطا کیا تھا۔

بخاری، مسلم اور ترمذی نے اپنی سنن میں ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ رسول ﷺ کفرے ہوئے اور فرمایا اے لوگوں تم اللہ کی بارگاہ میں ننگے پاؤں پیدل چلتے ہوئے، ننگے بدن، غیر مخنن جمع ہو گے۔

پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی کہ لَبَّكُنَا اَكْبَرُ لَبَّكُنَا اَكْبَرُ (1) سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لباس پہنایا جائے گا۔ بخاری اور مسلم نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے، فرماتی ہیں رسول ﷺ نے فرمایا لوگوں کو قیامت کے روز ننگے پاؤں ننگے بدن اور بغیر ختنہ کے اٹھایا جائے گا۔ حضرت عائشہ نے عرض کی مرد، عورتیں ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہونگے۔ فرمایا اے عائشہ اس دن معاملہ بہت سخت ہوگا (2)۔ طبرانی نے اوسط میں صحیح سند کے ساتھ ام سلمہ سے اسی طرح روایت کی ہے۔ اس حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ نے عرض کی یہ تو بڑی بری حالت ہوگی۔ ایک دوسرے کی شرمگاہوں کو دیکھ رہے ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا لوگ مشغول ہوں گے۔ حضرت عائشہ نے عرض کی حضور ان لوگوں کی کیا مشغولیت ہوگی؟ فرمایا صحابہ کف کا گلہنا جس میں چینی اور رانی کے دانہ کے برابر نیکیاں اور گناہ لکھے ہوئے ہوں گے۔ امام بیہقی نے ابن عباس سے مرفوع حدیث نقل کی ہے، اس میں ہے کہ آپ کی زوجہ حضرت ریحہ رضی اللہ عنہا نے کہا لوگ ایک دوسرے کی شرمگاہ کو دیکھ رہے ہونگے؟ آپ ﷺ نے فرمایا اے فلاں ہر شخص کو اپنی پڑی ہوگی، وہ ہر چیز سے غافل ہوگا۔ طبرانی نے بہل بن سعد سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے بھی مرفوع حدیث اسی طرح مروی ہے، اس میں ہے کہ آپ ﷺ کی زوجہ حضرت ریحہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یا رسول ﷺ ایک دوسرے کو کیسے دیکھیں گے آپ ﷺ نے فرمایا آنکھیں پٹی ہوں گی اور حضور نے اپنی نظر اوپر اٹھائی، طبرانی اور بیہقی نے سودہ بنت زمعہ سے روایت کیا ہے، فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز لوگ ننگے پاؤں، ننگے بدن اور بغیر ختنہ ہوں گے۔ کسی کی منڈنیک پینہ ہوگا، کسی کے کانوں کی لالوں تک ہوگا۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ تو بڑی بری حالت ہوگی، لوگ ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں گے۔ فرمایا لوگ اس سے غافل ہوں گے (بخاری) اَمْشُرُوْهُمُ يَوْمَئِذٍ سَائِقٌ يَّتَمَتُّوْهُ (3) علامہ قرطبی فرماتے ہیں ان احادیث میں عرافہ (ننگے بدن) کا قول اس حدیث کے مخالف نہیں ہے جس میں ہے کہ ہر اپنی قبروں میں اپنے گنہگاروں کے ساتھ ایک دوسرے کی زیارت کرتے ہیں کیونکہ یہ حدیث بزرگ کے متعلق ہے۔ جب قبور سے نکلیں گے تو برسر بدن ہوں گے۔ لیکن یہ احادیث ان احادیث کے معارض ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔ ابوداؤد، حاکم، ابن حبان اور بیہقی نے حضرت ابوسعید الخدری سے روایت کی ہے۔ حاکم نے اسے صحیح بھی لکھا ہے۔ جب حضرت ابوسعید الخدری پر موت کا وقت قریب آیا تو نئے کپڑے منگوائے اور پہن لیے پھر فرمایا میں نے رسول ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ قیامت کے روز ان کپڑوں میں اٹھایا جائے گا جن میں وہ مرے گا (4)۔ ابن ابی الدنیا نے حسن سند کے ساتھ حضرت معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے اپنی ماں کو دفن کیا تو انہیں نئے کپڑوں میں کفن دیا گیا تھا۔ اور پھر حضرت معاذ نے فرمایا اپنے مردوں کو اٹھنے لباس میں نکلن دیا کرو کیونکہ وہ قیامت کے روز انہی کپڑوں میں اٹھائے جائیں گے۔

سعید بن منصور نے اپنی سنن میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا اپنے مردوں کو اٹھنے لباس میں کفن دیا کرو کیونکہ وہ قیامت کے روز ان کپڑوں میں اٹھائے جائیں گے۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں بعض علماء نے ان احادیث کے ظاہر کا اعتبار کیا ہے اور اکثر علماء نے ان احادیث کو شبہ پر محمول کیا ہے جسے ان کپڑوں میں ہی دفن کرنے کا حکم ہے جن میں وہ قتل ہوتا ہے اور اسی خون کے ساتھ دفن کرنے کا حکم ہے۔

حضرت ابوسعید نے یہ حدیث شریک کے متعلق سنی تھی لیکن انہوں نے اس کو عموم پر محمول کر دیا ہے۔ امام بیہقی فرماتے ہیں ان احادیث

2- ایضاً صفحہ 159، حدیث 56

1- صحیح مسلم، جلد 17، صفحہ 160، حدیث 58: (اعلیٰ)

4- ایضاً، جلد 15، صفحہ 578 (التراث الاسلامی)

3- کنز العمال، جلد 14، صفحہ 363 (التراث الاسلامی)

میں اس طرح تطبیق ہوگی کہ بعض لوگ برہنہ انھیں گے اور بعض کپڑوں کے ساتھ انھیں گے۔ میں کہتا ہوں یہ تطبیق تو فنی بہتر ہے اور یہ آیت کریمہ کفار کے متعلق ہے کیونکہ آج بھی کفار کے متعلق ارشاد ہے۔

جس تمہارا یہ خیال تھا کہ ہم نے دوبارہ اٹھنے کا وقت مقرر نہیں کیا اور انبیاء کرام نے تم سے غلط بیانی کی ہے۔ بل کا کلمہ یہاں ایک واقعہ سے دوسرے واقعہ کی طرف خروج کیلئے ہے اور یہ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ برہنہ جسم نیکو کاروں کے علاوہ کا ہوگا اور حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ آنکھیں پھٹی ہوگی اور قرآن کا ارشاد لَظَلَّ امْرِيًّا فَوَسَّوْهُمُ نِيْمًا يَوْمَئِذٍ يَخْتَلِفُونَ۔ یہ کفار کے حق میں ہے اور آنکھوں کا پھٹنا ہونا کفار کی صفت ہے۔ ہولنا کی کی وجہ سے ان کی آنکھیں پھٹی ہوگی۔ نیکو کاروں کی یہ کیفیت نہ ہوگی لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد کہ سب سے پہلے ابراہیم علیہ السلام کو لباس پہنایا جائے گا، اس سے اعتراض کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس حدیث سے ثابت ہے کہ ابتداء میں انبیاء برہنہ ہونگے۔ ہاں اس حدیث کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ صلحاء اور نیکو کاروں کو قبروں کے اندر نکلنے سے پہلے کرامت کے لباس عطا کیے جائیں گے اور حضرت ابراہیم کو قبر کے اندر سب سے پہلے لباس پہنایا جائے گا۔ بعض علماء اس حدیث کو اس پر محمول کرتے ہیں کہ کپڑوں سے مراد عمل صالح ہے جیسا کہ عمل صالح کو قرآن میں لباس سے تعبیر کیا گیا ہے فرمایا وَلِبَاسِ الشُّعْرَىٰ ذٰلِكَ خَيْرٌ۔

وَوَضِعَ الْكِتٰبَ فَتَرٰى الْمُجْرِمِيْنَ مُسْتَقْبِلِيْنَ وِمْا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَنَا
مَا لِهٰذَا الْكِتٰبِ لَا يَغَادِرُ صَحِيْفَةً وَّلَا كَيْمِيْرَةً اِلَّا اَحْصٰهَا وَاَوْجَدُوْا مَا
عَمِلُوْا اَحٰصِيْا وَّلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ۝۱۰

”اور رکھ دیا جائیگا (ان کے سامنے) نامہ عمل۔ پس تو دیکھے گا مجرموں کو کہ وہ زور ہے ہونگے اس سے جو اس میں ہے اور کہیں گے صد حیف! اس نوشتہ کو کیا ہو گیا ہے کہ نہیں چھوڑا اس نے کسی چھوٹے گناہ کو اور نہ کسی بڑے گناہ کو مگر اس نے اس کا شمار کر لیا ہے اور (اس دن) وہ ہائیں گے جو عمل انہوں نے کیے تھے اپنے سامنے۔ اور آپ کا رب تو (اے حبیب!) کسی پر زیادتی نہیں کرتا ہے۔“

۱۔ الکتاب پر الف لام جنس کا ہے۔ اس سے مراد بندوں کے اعمال کی کتابیں ہیں کیونکہ یہی نامہ اعمال بندوں کے دائیں اور بائیں ہاتھ میں رکھا جائے گا یا میزان میں رکھا جائے گا یا رحمن کے سامنے رکھا جائے گا۔ جن کو نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں ملے گا، اپنے گناہوں کو لکھا ہوا دیکھ کر ڈر رہے ہوں گے۔ اور اس وقت وہ اپنی ہلاکت کو لپکا دیں گے۔ یہاں نداء کا معنی جزع فزع کا اظہار کرنا ہے اور مخاطبین کو آگاہ کرنا ہے جن پر یہ کلام نازل ہوا ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں صحیفہ سے مراد پتھر کے مسکراتا ہے اور کبیرہ سے مراد تہبہ لگانا ہے۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں صحیفہ سے مراد چھوٹا، بوسہ لینا ہے اور کبیرہ سے مراد نانا ہے (۶) اور فرماتے ہیں یہ بطور حقیقت فرمایا ہے۔ ہم نے سورۃ نساء میں اِنْ تَجَسَّبُوْا اٰتٰیٰہُمْ مَّا شَهِدُوْنَ عَشۃَ الْاٰیۃِ کی تفسیر میں گناہ کبیرہ کا ذکر کیا ہے۔ الا احصاھا کل نصب میں ہے کیونکہ یہ لا یغادر کا مفعول ثانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر چھوٹا بڑا گناہ اس کتاب میں موجود اور شمار ہوگا۔

سہل بن سعد سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چھوٹے گناہوں سے بچو۔ چھوٹے گناہوں کی مثال اس

توم کی طرح ہے جو کسی وادی کے بطن میں اترے، ایک ایک لکڑی اٹھا کر لائیں اور ان پر روئیاں پکالیں (تو جس طرح چھوٹی ایک ایک لکڑی مل کر روئیاں پکانے کے قابل ہو گئیں) اس طرح چھوٹے گناہ بھی ہلاک کرنے والے ہیں۔ اس حدیث کو امام بغوی نے روایت کیا ہے (1) بطرانی نے حضرت سعد بن جنادہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں جب نبی کریم ﷺ حنین سے فارغ ہوئے تو ہم ایک چٹیل میدان میں اترے جہاں کچھ بھی نہ تھا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو کچھ کسی کے پاس ہووے لو آؤ۔ بڑا چھوٹا سب کچھ جمع کرو۔ راوی فرماتے ہیں چند منوں میں ہم نے مال کا ڈھیر لگا دیا۔ رسول ﷺ نے فرمایا کیا تم یہ ڈھیر دیکھ رہے ہو؟ اسی طرح گناہ تم میں سے ایک شخص کے جمع ہونے جیسے تم نے یہ ڈھیر جمع کیا ہے، بس ہر شخص کو اللہ سے ڈرنا چاہیے نہ چھوٹا گناہ کرے، نہ بڑا کیونکہ یہ سب شمار کیے جاتے ہیں (2)۔ نسائی، ابن ماجہ اور ابن حبان نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عائشہ چھوٹے گناہوں سے بچو کیونکہ اللہ کی طرف ان کا بھی مطالبہ کیا جائے گا (3)۔

امام بخاری نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرمایا تم ایسے اعمال کرتے ہو جو تمہاری نظر میں بال سے بھی زیادہ باریک ہوتے ہیں، جبکہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں انہیں ہلاک کرنے والا شمار کرتے تھے (4)۔ امام احمد نے اسی کی مثل صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوسعید سے روایت کی ہے۔

۱۔ وہ اپنے جھینوں میں ہر عمل کو مو جو د پائیں گے یا جو انہوں نے اعمال کیے، ان کی جزا کو مو جو د پائیں گے اور اللہ تعالیٰ کسی پر زیادتی نہیں فرماتا، وہ کسی بندے کے نامہ عمل میں کوئی ایسا گناہ نہیں لکھتا جو اس نے کیا نہ ہو اور نہ سزا سے زیادہ دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز بندوں کو تین پیشیاں ہوں گی۔ دو پیشیاں تو جھگڑنے اور عدد پیش کرنے کیلئے ہوں گی اور تیسری پیشی یہ ہوگی کہ جھینے (نامہ اعمال) آکر کروٹوں کے ہاتھوں میں کیلج جائیں گے۔ کوئی دائیں ہاتھ میں لے گا اور کوئی بائیں ہاتھ میں لے گا (5) اس حدیث کو ابن ماجہ نے ابوسعید الأشعری سے اور امام ترمذی نے ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے اور بیہقی نے ابن مسعود سے موقوف روایت کی ہے۔ حکیم ترمذی فرماتے ہیں جھگڑا دشمنوں کیلئے ہو گا وہ جھگڑیں گے کیونکہ وہ اپنے رب کو نہیں پہچانتے ہوں گے اور ان کا خیال ہو گا کہ ہم جھگڑیں گے تو جج جائیں گے اور ان کی صحبت قائم ہوگی۔ دوسری پیشی میں حضرت آدم تمام انبیاء کے سامنے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر پیش کریں گے۔ اور اللہ تعالیٰ انبیاء کرام کی موجودگی میں دشمنوں پر رحمت قائم فرمائے گا پھر انہیں دوزخ کی طرف بھیج دے گا اور تیسری پیشی مومنین کیلئے ہوگی اور یہ پیشی مغفرت کیلئے ہوگی۔ اللہ تعالیٰ مومنین کو خلوت میں محتاج فرمائے گا حتیٰ کہ وہ حیاء اور خجالت محسوس کریں گے لیکن اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے گا اور ان سے راضی ہو جائے گا۔ حضرت انس نے حضور ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا سارے نامہ اعمال عرش کے نیچے ہوں گے۔ جب اللہ کی بارگاہ میں حاضری کا وقت ہو گا تو اللہ تعالیٰ ایک ہوا چلائے گا جو دائیں اور بائیں ہاتھوں میں نامہ اعمال پہنچا دے گی اور ان کی ابتداء میں لکھا ہوگا اِنَّكَ اَبْلَيْتَ كَسْفِي وَنَطَقْتَ اَبْنِيَّةً عَلَيْكَ حَبِيْبًا۔

ابن جریر نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ آپ فرماتے تھے جو شخص دنیا میں ان پڑھ ہوگا، قیامت کے روز وہ بھی پڑھ لے گا

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْا اِلَّا اِبْلِیْسَ ۗ كَانَ مِنَ الْجٰنِ

1- تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 574 (القر)

2- الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 411 (العلیہ)

3- الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 411 (العلیہ)

4- مشکوٰۃ الصالح، جلد 3، صفحہ 145 (القر)

5- البیضا، صفحہ 205

ہو سکتی، یہ اس ارشاد سے مستفاد ہے اِنِّیْ یُکَلِّمُکَ لَمَّا تَدْعُوْکَ وَ لَمَّا تَسْتَعِیْذُ بِہٖ (اس کا بیٹا کہیے ہو سکتا ہے، جبکہ اس کی بیوی ہی نہیں ہے) فتاویٰ فرماتے ہیں شیطانوں کی بھی اسی طرح اولاد ہوتی ہے۔ جس طرح انسانوں کی اولاد ہوتی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ شیطان اپنی دیر میں اپنی دم داخل کرتا ہے پھر وہ اندر دیتا ہے پھر وہ اندر پھنستا ہے تو شیطانوں کی ایک جماعت پیدا ہو جاتی ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں شیطان کی اولاد سے لائقین اور ولہان ہے۔ (ولہان نماز اور وضو میں وسوسہ اندازی کرتا ہے)۔ الہشغاف، حوۃ (مرۃ کی وجہ سے شیطان کی کنیت ابو مرہ ہے) زلنہیو (یہ بازاروں میں گھومتا ہے غلو باتوں کو مہترن کرتا ہے جھوٹی قسمیں اٹھاتا ہے اور سامان کی تعریف کروا تا ہے) الاعود۔ یہ انسان کو زنا پر برا بھینٹہ کرتا ہے، مرد کے ذکر اور عورت کی شرمگاہ میں پھونک مارتا ہے۔ مطوس (یہ لوگوں کے مونہوں میں ایسی باتیں ڈالتا ہے جن کی کوئی اصل نہیں ہوتی۔ یعنی جھوٹی افواہیں پھیلاتا ہے) ہتر (یہ معصیت کے وقت چہرہ نوپنے، سینہ پینے اور گریبان چاق کرنے کا عمل کرتا ہے) داسم یا اس شخص کے ساتھ گھر میں داخل ہوتا ہے جو سلام نہیں کرتا اور اللہ کا ذکر نہیں کرتا، یہ شیطان اسے دکھاتا ہے کہ سامان نہیں اٹھایا گیا یا سامان کو حسن ترتیب سے نہیں رکھا گیا پھر جب وہ آدی کھانا کھاتا ہے اور اس پر اللہ کا ذکر نہیں کرتا تو وہ شیطان اس کے ساتھ کھانا کھاتا ہے۔ اعمش فرماتے ہیں ایک دفعہ میں گھر میں داخل ہوا اور میں نے اللہ کا ذکر نہ کیا اور نہ میں نے گھر والوں پر سلام کیا تو مجھے لونا دکھائی دیا میں نے گھر والوں سے کہا ہے اٹھاؤ اور میں ان سے بھگڑنے لگا۔ پھر مجھے یاد آیا تو میں نے کہا داسم داسم۔ (یعنی داسم نے مجھے دھوکا دیا) ابی بن کعب حضور ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا وضو کیلئے ایک شیطان ہے جسے ولہان کہا جاتا ہے، پس پانی کے دوسرے پچو (1) اس حدیث کو ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث غریب ہے، اہل حدیث کے نزدیک اس کی سند قوی نہیں ہے کیونکہ اس کا راوی خارجہ بن مصعب ہے۔

حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عثمان بن العاص نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور عرض کی یا رسول اللہ شیطان میرے اور میرے نماز اور میرے قرآن کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور مجھ پر نماز کو غلط ملط کر دیتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ شیطان ہے جس کا نام ہزب ہے، جب تم اس کے دوسرے کوشموس کرو تو اللہ سے اس کی پناہ مانگا کرو اور تین مرتبہ ہائیں طرف تھوک دیا کرو، عثمان بن ابی العاص فرماتے ہیں میں نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس شیطان کو مجھ سے دور کر دیا۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت ہے۔ حضرت جابر سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابلیس اپنا عرض چالی چو لگا تا ہے۔ پھر اپنے لشکر زمین میں بھیجتا ہے اور اس کا سب سے قریبی وہ ہوتا ہے جو بڑا فتنہ برپا کرتا ہے۔ ایک شیطان جیلہ آتا ہے، کہا ہے میں نے فلان کام کیا ہے، شیطان کہتا ہے تو نے کوئی اعلیٰ کام نہیں کیا پھر دوسرا جیلہ آتا ہے اور کہتا ہے میں نے میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈال دی ہے۔ شیطان اسے اس کے کام کی وجہ سے اپنا قریبی بنا لیتا ہے اور کہتا ہے ہاں تو نے عظیم کام کیا ہے۔ اعمش کہتے ہیں میرا خیال ہے راوی نے فرمایا اور وہ اس کو اپنے ہاتھ پر بنا لیتا ہے۔ اس کو مسلم نے نقل کیا ہے۔

مَا أَشْهَدْتُهُمْ خَلْقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَا خَلْقَ أَنْفُسِهِمْ وَمَا كُنْتُ مَخْلُوقًا مِّنْ مَّخْلُوقَاتِهِمْ ۝۱۰

”میں نے ان سے مدد نہیں لی تھی جب آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور نہ (اس وقت ان سے مدد لی) جب خود انہیں پیدا

کیا اور میں نہیں بنایا کرتا مگر اہل کرنے والوں کو پناہ دست و بازو لے۔“

۱۔ ابو جعفر نے جمع منکظم کا صیغہ ہونے اور جمع کا صیغہ تعظیم کیلئے ہوتا ہے، یعنی ہم نے ان اشیاء کی تخلیق میں ان شیطانوں سے کچھ مدد نہیں لی تاکہ یہ عبادت و طاعت کے مستحق قرار پائیں۔ کیونکہ عبادت کا استحقاق خالقیت (پیدا کرنے) کے توابع اور لوازم میں سے ہے۔ جو پیدا کرنے میں شریک ہو گا وہ عبادت میں بھی شریک ہوگا۔ جب اللہ تعالیٰ نے اشارۃً ان سے مدد لینے کی نفی فرمائی تو اب صراحتاً نفی فرمادی اور فرمایا میں گمراہ لوگوں کو کائنات کی تخلیق میں مددگار و انصار بنانے والا نہیں ہوں۔ ضمیر کی جگہ صراحتاً المضلین کا اسم ذکر فرمایا یا اس کی وجہ ان کی مذمت کرنا اور ان سے امداد لینے کو بہت بعید سمجھنا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ما شہدہم میں ہم ضمیر کا مرجع مشرکین ہیں، اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ ان مشرکوں کو اشیاء کی تخلیق کے وقت نہیں بلایا تھا اور نہ میں نے ان کو ایسے علوم کے ساتھ مخصوص کیا ہے جن کو کوئی دوسرا نہیں جانتا حتیٰ کہ یہ کہتے پھرتے ہیں کہ اگر ہم ایمان لائے تو سب لوگ ایمان لائیں گے۔ اسے ضعیف آپ نصرت دین کیلئے ان کی باتوں کی طرف توجہ نہ فرمائیں۔ میری یہ شان کے لائق ہی نہیں ہے کہ میں اپنے دین کیلئے گمراہوں سے مدد حاصل کروں اس توجیہ کی تائید ماہکت کی قرأت کرتی ہے۔ کہ یہ خطاب کا صیغہ ہے اور خطاب حضور ﷺ کیلئے ہے۔ کبھی کہتے ہیں الصمدہم میں ہم ضمیر کا مرجع ملائکہ ہیں۔ یعنی کائنات ارضی و سماوی کی تخلیق کے وقت فرشتوں کو میں نے نہیں حاضر کیا تھا تا کہ وہ عبادت کے مستحق ہوں اور انہیں اللہ کی بنیاد کہا جائے۔ اس توجیہ پر یہ وماکت متخذ المضلین مستقل کلام ہوگی۔ ضمیر کی جگہ اسم ظاہر رکھنے والی صورت نہ ہوگی۔ یعنی میں نے تو فرشتوں سے مدد لی ہے، نہ شیطانوں سے کہ یہ عبادت کے مستحق نہیں۔

وَيَوْمَ يَقُولُ نَادُوا شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كَفَرُوا فَمَا يَعْبُدُكُمْ فَادْعُوهُمْ قُلْ لَيْسَ بِشَيْءٍ اللَّهُمَّ وَ
جَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَا ۝۱۱

”اور اس روز اللہ تعالیٰ (کفار کو) فرمائے گا بلاؤ میرے شریکوں کو جنہیں تم (میرا شریک) خیال کیا کرتے تھے۔ تو وہ

انہیں پکاریں گے پس وہ انہیں کوئی جواب نہیں دیں گے اور ہم حائل کر دیں گے ان کے درمیان ایک آڑ لے۔“

۱۔ یہ قول کوثر نے نون کے ساتھ منکظم کا صیغہ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے یاہ کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے یعنی قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کافروں سے فرمائے گا کہ بلاؤ میرے شریکوں کو جن کو تم میرا شریک یا اپنے شفیق خیال کرتے تھے تا کہ وہ تمہیں میرے عذاب سے بچائیں۔ شرکاء کی یاہ منکظم کی طرف اضافت ان کے عقیدہ اور گمان کے مطابق ہے اور انہیں زجر و توبیح کرنے کیلئے بعض علماء فرماتے ہیں مشرکاء سے مراد ابلیس اور اس کی ذریت ہے۔

۲۔ وہ بتوں کے پجاری اپنے بتوں کو فریاد کریں گے لیکن وہ انہیں کوئی جواب نہیں دیں گے اور اس دن ہم کفار اور ان کے بتوں کے درمیان آڑ بنا دیں گے موقعا ہم طرف ہے جس کا معنی ہلاکت کی جگہ ہے اوبق کا معنی ہلاک کرنا ہے، عطاء اور رضا کے اس کا معنی ہلاکت کی جگہ کیا ہے۔ ان عباس فرماتے ہیں یہ جنہم کی ایک وادی کا نام ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں یہ جسم کی وادی ہے۔ مگر یہ کہتے ہیں یہ آگ کی ایک نہر ہے جس میں آگ بہتی ہے اور اس کے کناروں پر کالے گدھوں کی طرح بونے بونے ساپ ہیں۔ ابن الاعرابی

فرماتے ہیں ہر دو چیزوں کے درمیان جو آڑ اور رکات ہوتی ہے اسے موبق کہتے ہیں (1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ مصدر ہے۔ الفراء کہتا ہے البین کا معنی تعلق ہے معنی یہ ہے کہ ہم قیامت کے روز دنیا کے تعلقات کو ہلکا کر دیں گے، اس کی مثل قرآن میں ہے لَنْ نَقْطَعَنَّ بَيْنَكُمْ ان کے تعلقات کٹ جائیں گے) اس قرأت پر جنہوں نے نین کو مرفوع پڑھا ہے۔

وَمَا آ الْمُجْرِمُونَ النَّاسَ فَظَنُّوا أَنَّهُمْ مُوَاقِعُوهَا وَلَمْ يَجِدُوا عِنْدَهَا مَصْرَفًا ﴿٣٧﴾

”اور یہ بھی جسے مجرم (جنہم کی) آگ کو اور وہ خیال کریں گے کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں اور نہ پائیں گے اس کے نجات پانے کی کوئی جگہ۔“

۱۔ مجرموں سے مراد شرکین ہیں، یعنی شرکین دوزخ کی آگ کو دیکھیں گے تو انہیں یوں محسوس ہوگا کہ ابھی اس میں گرنے والے ہیں۔ امام احمد نے حضرت ابو سعید الخدری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وظنوا انہم مواقعوها کے ارشاد کے متعلق فرمایا کہ کافر کو پچاس ہزار سال کھرا کیا جائے گا جیسا کہ اس نے دنیا میں کوئی عمل نہیں کیا۔ کافر جنہم کو دیکھے گا تو پچاس سال کی مسافت سے بھی یوں محسوس کرے گا کہ وہ اس میں ابھی گرا (2)۔ مصرفاً یا تو مصدر ہے یا اسم ظرف ہے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَذَا الْقُرْآنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ وَكَانَ لِلْإِنْسَانِ أَكْثَرُ شَيْءٍ عَجَلًا ﴿٣٨﴾

”اور بیشک ہم نے اس طرح طرح سے بار بار بیان کی ہیں اس قرآن میں لوگوں کیلئے ہر قسم کی مثالیں ۱۔ اور انسان ہر چیز سے بڑھ کر بھڑکاوا ہے۔“

۱۔ یعنی ہم نے اس قرآن میں بار بار اور نئے نئے اسلوب میں ایسی عبادتیں پیش کی ہیں جن میں ہر عبادت غرابت میں ضرب المثل کی مانند ہے اور انداز اس لیے اختیار فرمایا تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں بعض علماء فرماتے ہیں من کل مثل محذوف کی صفت ہے جو صرف نام کا مفعول ہے، یعنی مثال من جنس کل مثل یعنی ہم نے ہر قسم کی مثالیں بیان کیں تاکہ نصیحت حاصل کریں۔

۲۔ ابن عباس فرماتے ہیں انسان سے مراد نصر بن الحارث ہے اور اس کا بھڑکا قرآن کے متعلق تھا۔ کبھی کہتے ہیں انسان سے مراد ابی بن خلف الجهمی ہے۔ بعض کہتے مطلق کفار مراد ہیں جیسا کہ ارشاد ہے وَيُجَادِلُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبَاطِلِ وَأُولَئِكَ هُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَسَىٰ أَن تَرْجِعَهُمْ إِلَىٰ رَبِّكَ عَسَىٰ أَن يَكُونَ لَكَ حُكْمٌ ۚ (3)۔ امام بخاری نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات کو میرے اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لائے اور فرمایا کیا تم نماز تہجد نہیں پڑھتے ہو۔ حضرت علی فرماتے ہیں میں نے عرض کی ہماری روحیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں اگر وہ ہمیں اٹھانا چاہتا ہے تو ہم اٹھ پڑتے ہیں۔ جب میں نے یہ جواب دیا تو آپ ﷺ کوئی جواب دیے بغیر واپس تشریف لے گئے پھر میں نے سنا کہ آپ واپس پلٹتے ہوئے اپنی ران پر ہاتھ مار کر یہ کہہ رہے تھے وکان للانسان اكثر شئ عجلًا (3)۔

جدلاً نسبت سے تیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، معنی یہ ہے کہ انسان کا بھڑکا سب چیزوں سے زیادہ ہے۔

وَمَا مَنَّكَ النَّاسُ أَنْ يُلَاقُواكَ إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ وَيَسْتَغْفِرُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ

تَأْتِيَهُمْ سُنَّةٌ أَلَا وَايَاتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿٣٩﴾

”اور کس چیز نے روکا ہے لوگوں کو اس بات سے کہ وہ ایمان لے آئیں جب آگئی ان کے پاس ہدایت (کی روشنی) اور مغفرت طلب کریں اپنے رب سے مگر یہ (کہ وہ منتظر ہیں) کہ آئے ان کے پاس انگوں کا دستور۔ یا آئے ان کے پاس طرح طرح کا عذاب۔“

۱۔ الہدای سے مراد قرآن، اسلام اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح احکام ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں ہدی سے مراد نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس و اطہر ہے، یعنی حق کے واضح ہونے بعد ایمان لانے اور اپنے رب کی بارگاہ میں کفر اور گناہوں کی معافی مانگنے سے کوئی چیز انہیں روکے ہوئے ہے۔ کیا یہ یہی چاہتے ہیں کہ پہلے لوگوں پر جس طرح ہمارا عذاب آیا اور ان کا نام و نشان مٹا دیا۔ ان پر بھی ایسا عذاب آئے اور انہیں جس جس کر دے، ان تائبہم سے پہلے مضاف مخذوف ہے، مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے، تقدیر عبادت اس طرح ہے **الْأَتَقْبَلُونَ أَنْ تَابِيَهُمْ سُنَّةَ الْأَوَّلِينَ**۔ بعض علماء نے یہ تقدیر ذکر کی ہے **الْأَقْبَلُ أَنْ تَابِيَهُمْ سُنَّةَ الْأَوَّلِينَ مِنْ مَعَانِيَةِ الْعَذَابِ وَالْإِنْتِظَارِ هُنَا ذَالِك**۔ یعنی وہ پہلے لوگوں کے طریقہ پر عذاب کو دیکھنا چاہتے ہیں ان کی طرح عذاب کے منتظر ہیں کیونکہ انہوں نے بھی دعا مانگی تھی **اللَّهُمَّ إِنَّكَ كَانْتَ هَذَا لَمْ يَكُنْ مَعَهُ الْعَقْبُ وَمِنْ عَذَابِكَ فَاْمُطِرْ عَلَيْنَا جَعَلْنَاكَ مِثْلَهُنَّ**۔

۲۔ ابن عباس نے قبلاً کا معنی عیانانا کیا ہے، یعنی آئے سامنے، رو برو، مجاہد نے اس کا معنی اچانک کیا ہے (۱) اہل کوفہ، ابو جعفر نے قبلاً کو قاف اور باء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، باقی قراء نے قاف کے کسرہ اور باء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے، یہ دونوں لغتیں ہم معنی ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں قبلاً جمع قبیلہ کی اور اس کا معنی مختلف قسم کا عذاب ہے اور اس پر نصب ضمیر سے یا العذاب سے حال ہونے کے اعتبار سے ہے۔

**وَمَا تُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَيَجَاوِلُ الَّذِينَ كَفَرُوا
بِالْبَاطِلِ لِيُبْدِ حُضُوبَهُمُ الْعَقْبُ وَالْحَدُّ الْيَتِي وَمَا أَنْزَلْنَا هَذَا ۝۱۱**

”اور ہم نہیں بھیجتے رسولوں کو مگر مژدہ سنانے والے اور ڈرانے والے اور جھگڑتے ہیں کافر بے سرو پادیلوں کی آڑ لے کر۔ تاکہ وہ منادیں اس سے حق کو سنے اور بنا لیا ہے انہوں نے میری آجوں کو اور جن سے وہ ڈرائے گئے ایک مذاق ہے۔“

۱۔ ہمارے رسولوں کی آمد کا مدعا مؤمنین کو ثواب اور جنت کی بشارت دینا اور کافروں کو عذاب اور جہنم سے ڈرانا ہے، یعنی ہم نے انہیں یہ قدرت دے کر نہیں بھیجا کہ یہ کفار کی جو بڑ کردہ آیات لے آئیں یا ساری مخلوق کو شاہراہ ہدایت پر گامزن کریں اور ان کو ہدایت دینے پر غالب ہوں۔

۲۔ کافر بے سرو پا، یعنی باتوں کے ساتھ جھگڑتے ہیں، کہتے ہیں کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟ کبھی کہتے ہیں **مَا أَنْزَلْنَا بَشِيرًا وَنَذِيرًا** تم ہماری طرح بشر ہو) کبھی کہتے ہیں **وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكَلِمَةَ** (اگر اللہ چاہتا تو فرشتوں کو نازل فرماتا سمجھی کہتے ہیں) لَوْ كَذَّبُوا لَهَذَا الْفُرْقَانِ عَلَى نَجْمٍ لَمْ يَلْبِثْ مِنَ الْقُرْآنِ ثَمَانِينَ عَشْرًا (کیوں نہ قرآن کو ان دو شہروں میں سے کسی عظیم آدمی پر اتارا گیا۔) کبھی کہتے ہیں کیا تم جو ذبح کرو وہ حلال ہے، جسے اللہ تعالیٰ مار دے وہ حرام ہے۔

۱۔ دحض کا اصل معنی بھلسنا ہے تو معنی یہ ہوگا کہ ان غیر معقول باتوں سے ان کا مقصود یہ ہے کہ حق کو اپنی جگہ سے پھلادیں۔
 ۲۔ انہوں نے قرآن اور جس عذاب سے انہیں ڈرایا گیا ہے اس کا مذاق اڑایا ہے۔ ما اندرو اسے پہلے ما مصدر یہ یا موصولہ ہے۔ وہ
 مشرک کہتے ہیں لَوْ كُنَّا نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي هَذَا أَمْرًا مُّجْتَمِعِينَ لَوْ كُنَّا نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي هَذَا أَمْرًا مُّجْتَمِعِينَ (یہ قرآن انہیں کوئی بشر سکھاتا
 ہے) اِنْ هَذَا اِلَّا آسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ (یہ قرآن تو پہلے لوگوں کے قصے ہیں) عذاب کا مذاق اس طرح اڑاتے ہیں کہ کہتے ہیں لَوْ كُنَّا
 نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي هَذَا مُّجْتَمِعِينَ (ہم جو کہتے ہیں اس کی وجہ سے اللہ میں عذاب کیوں نہیں دیتا)۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ فَأَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدْ مَتَّ يَدَاہُ اِنَّا
 جَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلٰى
 الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْا اِلَّا اِبْدًا ۝۱۰

”اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جسے نصیحت کی گئی اس کے رب کی آیتوں سے پس اس نے روگردانی کر لی ان
 سے اور فراموش کر دیا اس نے ان (اعمال بدوں) جو آئے جیسے تھے اس کے دلوں ہاتھوں نے انہم نے ذال دیے ان
 کے دلوں پر پردے تاکہ وہ قرآن کو نہ سمجھ سکیں اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی اور اگر تم بلاؤ انہیں ہدایت کی طرف
 تو جب بھی وہ ہدایت قبول نہیں کریں گے۔“

۱۔ یعنی اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جس کو اس قرآن سے نصیحت کی گئی جس کے الفاظ اور معانی سراپا اعجاز ہیں، اس نے نصیحت قبول
 کرنے کے بجائے اس میں غور و فکر کی رحمت بھی گوارا نہ کی اور اپنے اعمال خبیثہ، فخر، عقائد باطلہ کو فراموش کر دیا اور ان کے انجام کی
 طرف مڑ کر نہ دیکھا۔ اس امر اس اور فراموشی کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ان کے دل پر پردے ڈال دیے ہیں اور ان کے دل کفر کی تیرگیوں
 اور تاریکیوں سے ڈھک دیئے گئے ہیں تاکہ انجام کار قرآن حکیم کو سمجھنے کی نعمت حاصل نہ کریں۔ ان بفقہوہ سے پہلے لام مقدر ہے جو
 عاقبت کیلئے ہے۔ ان بفقہوہ میں وہ ضمیر مذکر اور مفرد ذکر کی ہے حالانکہ اس کا مرجع آیات ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ضمیر کو سنی
 کے اعتبار سے ذکر کیا گیا ہے اور آیات سے مراد قرآن ہی ہے۔ اور ہم نے ان کے کانوں میں گرانی ڈال دی ہے، ہم نے انہیں آیات
 قرآنیہ کو سننے کی صلاحیت ہی عطا نہیں فرمائی۔ علی آذانیہم کا عطف علی قلوبہم پر ہے، یعنی جعلنا علی آذانیہم وقرآ۔

۲۔ اسے میرے حبیب آپ ان کو کتنی پر غلوس دعوت توحید دیں پھر بھی یہ ہدایت نہ پائیں گے کیونکہ ان کے دلوں پر پردے پڑے
 ہیں اور کانوں میں گرانی ہے۔ ان میں ہدایت کی استعداد ہی نہیں ہے ان کے پاس ہدایت حاصل کرنے والے سب ذرائع مفقود
 ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اس قوم کے ساتھ معاملہ کیا جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کے علم ازیلی میں تھا کہ وہ کبھی ایمان نہ لائیں گے۔

وَسَابِقًا الْعُفُوْرُ ذُو الرِّحْوٰى لَوْ يُوْا اِخْدَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا الْعَجَلُ لَكُمْ الْعَذَابُ ط
 بَلْ لَّهْم مَوْعِدٌ لَّن يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهِمْ مَوْبِلًا ۝۱۱

”اور آپ کا پروردگار تو بہت بخشنے والا بڑا ہی رحمت والا ہے۔ اگر وہ پکڑ لیتا انہیں ان کے لئے پر تو جلد ان پر عذاب بھیجتا

(وہ ایسا نہیں کرتا) بلکہ ان کو سزا دینے کا ایک وقت مقرر ہے۔ نہیں پائیں گے اس وقت اس کے بغیر کوئی پناہ کی جگہ۔“

۱۔ اے پیارے! اے روح کائنات! تیری رب کی بخشش و مغفرت بہت وسیع ہے، وہ صفت رحمت سے موصوف ہے۔ اور اس کی مغفرت و رحمت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اس نے قریش کو کوفرا عذاب کی جگہ میں نہیں دیا حالانکہ انہوں نے اس کے نبی مکرم ﷺ سے دشمنی اور عداوت کی حد کردی ہے اس نے ان کے لئے بھی عذاب دینے کا وقت مقرر فرمایا ہے۔ موعدا سے مراد قیامت کا دن ہے یا جنگ بدر کا دن ہے۔ جب وہ وقت مقرر آ جائے گا تو یہ میرے نبی ﷺ کے گستاخ کوئی پناہ کاؤ نہیں پائیں گے۔ آل کا معنی نجات پانا ہے اور آل الیہ کا معنی کسی کے پاس نجات حاصل کرنا ہے۔

وَتِلْكَ الْقُرَىٰ أَهْلَكْتُمْ لَمَّا ظَلَمْتُمْ أَوْ جَعَلْنَا لِيَهْلِكْ كُمْ مَوْعِدًا ۝۱۱

”اور یہ بستیاں ہیں ہم نے تباہ کر دی ان کے باشندوں کو جب وہ ستم شعار بن گئے۔ اور ہم نے مقرر کر دی تھی ان کی ہلاکت کیلئے ایک موعدا۔“

۱۔ ان بستیوں سے مراد قوم نوح، عاد اور ثمود کی بستیاں ہیں اور ان لوگوں کی بستیاں ہیں جو ان کی صفت سے موصوف تھے۔ تلک القریٰ عیناً ہے اور اہلکنا ہم خبر ہے۔ یا تلک القریٰ فعل مضمر کا مفعول ہے جس کی تعبیر ما بعد فعل کر رہا ہے۔ موصوف یا صفت سے پہلے مضاف کا مقدر ماننا ضروری ہے۔ تاکہ تمہیر کا مرجع صحیح ہو جائے۔ یعنی اصحاب تلک القریٰ ہوگا یا تلک اصحاب القریٰ ہے۔ یعنی ہم نے ان بستیوں کے باشندوں کو ہلاک کر دیا جنہوں نے قریش مکہ کی طرح کفر اور گناہ کر کے اپنے اوپر ظلم کیا تھا۔ ۱۔ ابوبکر نے یہاں اور سورہ نمل میں ہم اور لام کے فقرہ کے ساتھ مہلککم پڑھا ہے اور حفص نے ہم سے فتح اور لام کے کسرہ کے ساتھ شاذ مصادر کے وزن پر پڑھا ہے۔ جیسے مرجع انجمن اور باقی قراء نے ہم سے ضم اور لام کے ساتھ اہلک سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔ موعدا سے مراد وقت معلوم ہے۔ یعنی جس طرح پہلی ظالم قوموں کی ہلاکت کا وقت مقرر تھا اور وہ اس وقت سے لہو بھر مقدم و مؤخر نہ ہوئے تو یہ کفار مکہ بھی اپنے مقررہ وقت سے ایک سینکڑی آگے پیچھے نہ ہوں گے۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّكُمْ مَعَكُمْ آلُ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَوْ أَهْمِي حَقًّا ۝۱۲

”اور یاد کرو جب کہا موسیٰ نے اپنے نوجوان (ساتھی) کو کہ میں چتا رہوں گا یہاں تک کہ تم بچوں جہاں دو دریا ملتے ہیں۔ یا (پلتے پلتے) گزراروں گا مدت دراز۔“

۱۔ آیت میں جس موسیٰ کا ذکر ہو رہا ہے وہ موسیٰ بن عمران ہیں جیسا کہ صحیح حدیث دلالت کرتی ہے اور نوجوان سے مراد یوش بن نون بن افراتیم بن یوسف علیہ السلام ہیں۔ میں (مفسر) کہتا ہوں شاید نون جو یوش کے باپ ذکر کئے گئے ہیں وہ آل افراتیم سے ہوں کیونکہ یوش اور نون کے درمیان بہت زیادہ زمانہ ہوا ہے، یعنی باپ نہیں ہیں، آل افراتیم کی نسل سے ہیں۔ لا ابرح کا معنی ہے کہ میں متواتر چتا رہوں گا۔ خبر کو حذف کیا گیا ہے کیونکہ ہر حالت خبر پر دلالت کر رہی ہے اور وہ سفر ہے اور حتی المبلغ کا قول بھی خبر پر دلالت کر رہا ہے۔ کیونکہ حتی المجمع البعورین یہ قایت ہے جو کسی چیز کی قایت ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ پس وہی لا ابرح کی خبر ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کی اصل لا یبرح مسبری حتی المبلغ ہو۔ اس صورت میں امم محذوف ہے اور مضاف الیہ کو اس کی جگہ رکھا گیا ہے (یعنی میسر کو حذف کر کے یاہ ضمیر کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے) پھر ضمیر اور فعل بدل گئے ہیں، یعنی یاہ ضمیر مرفوع مسر ضمیر میں ہے

بدل گئی (جبکہ پہلے مجرور اور بارز تھی) اور فصل غائب کے صیغہ لا ابرح سے شکلم کے صیغہ لا ابرج میں بدل گیا ہو۔ اور حتی ابلغ خبر ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ لا ابرح نامہ یعنی ہمیشہ اس حالت پر چلتا رہوں گا اور تلاش کرتا رہوں گا اور کبھی چراندہ نہ ہوں گا۔ جب نامہ ہوگا تو اسے خبر کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ مجمع البحرین: مشرق کی جانب سے فارس اور روم کے سمندروں کے ملنے کی جگہ مراد ہے قنادہ نے اس کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ محمد بن کعب فرماتے ہیں اس سے مراد طنجہ کا شہر ہے اور ابی بنی کعب کے نزدیک افریقہ مراد ہے۔

ع قاموس میں الحقیقۃ بالضمین ثمانون سنۃ او اکثر والدھر و السنۃ و السنون۔ یعنی چھ ماہ اور اوقاف کے ضمہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ مراد اسی سال یا اس سے زیادہ مدت ہوتی ہے اور زمانہ سال کی سال کے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ الحقب الدھر یعنی حقب سے مراد زمانہ ہے۔ عبد اللہ بن عمر نے فرمایا اکعب سے مراد اسی (80) سال ہیں بعض نے فرمایا ستر (70) سال ہیں۔ ابن ابی شیبہ ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے اس قول کو نقل کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں چہتر ہوں گا حتی کہ دونوں امروں میں سے ایک امر واقع ہو جائے یا تو میں مجمع البحرین تک پہنچ جاؤں گا یا چلتے چلتے زمانہ گزار دوں گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ادب یعنی الا ہو اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ میں چہتر ہوں گا حتی کہ میں مجمع البحرین کو پا لوں گا یا میں اتنا زمانہ گزار دوں گا کہ مجھے یقین ہو جائے گا کہ وہ صحیح مجھے نہیں مل سکتا۔

امام بخاری اور مسلم نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں نے ابن عباس سے کہا کہ نوف الرکالی کہتا ہے کہ خضر علیہ السلام کے ساتھی موسیٰ سے مراد موسیٰ بنی اسرائیل نہیں ہے، ابن عباس نے فرمایا اللہ کے دشمن نے جھوٹ بکا ہے، ہمیں ابی بن کعب نے بتایا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ایک دن موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو خطبہ دینے کیلئے کھڑے ہوئے تو آپ سے دریافت کیا گیا کہ تمام لوگوں سے زیادہ علم والا کون ہے؟ آپ نے جواب دیا میں سب سے بڑا عالم ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عتاب فرمایا کیونکہ آپ نے اللہ تعالیٰ کی طرف علم کو منسوب نہیں کیا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر دینی بھیجی کہ مجمع البحرین میں میرا ایک بندہ ہے جو تجھ سے زیادہ عالم ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی یا رب میں اس تک کیسے پہنچ سکتا ہوں اللہ تعالیٰ نے فرمایا اپنے ساتھ ایک چھلی نوکری میں رکھو، جہاں وہ چھلی تم سے گم ہو جائے وہی میرے بندے کی قیام گاہ ہے۔ موسیٰ علیہ السلام حکم الہی کے مطابق چھلی نوکری میں لیکر چل پڑے اور آپ کے ساتھ نوجوان یوشع بن نون بھی چل پڑا۔ چلتے چلتے دونوں ایک چٹان تک پہنچے، اس پر دونوں سر رکھ کر سو گئے۔ چھلی نے نوکری میں حرکت کی اور اس سے باہر نکلی پھر سمندر میں گر گئی اور درمیان میں سرگرم کی طرح راستہ بنا لیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر پانی کا چٹناروک لیا اور وہ اس پر حجاب کی طرح ہو گیا۔ جب دونوں بیدار ہوئے تو یوشع جو سب کچھ چھلی کا لٹنا اپنے آنکھوں سے دیکھ چکے تھے موسیٰ علیہ السلام کو اس کی خبر دینا بھول گئے۔ دن کا بقیہ حصہ بھی وہ چلتے رہے اور رات کو بھی سفر جاری رکھا حتیٰ کہ جب دوسرا دن آیا تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا صبح کا کھانا لادو، ہمیں اس سفر میں بہت بڑی مشقت برداشت کرنی پڑی ہے۔ فرمایا موسیٰ علیہ السلام کو تھکاوٹ محسوس نہ ہوئی حتیٰ کہ وہ اس جگہ سے آگے گزر گئے جہاں پہنچنے کا اللہ نے حکم دیا تھا۔ یوشع نے کہا ہے موسیٰ کلیم آپ نے ملاحظہ فرمایا جب ہم سستانے کیلئے اس کے پاس ٹھہرے تھے تو میں بھول گیا چھلی کو اور نہیں فراموش کرائی مجھے وہ چھلی سگر شیطان نے کہ میں اس کا ذکر کروں۔ اس نے سمندر میں اپنا راستہ بنا لیا تھا، بڑی تعجب کی بات ہے۔ فرمایا چھلی نوجوان کیلئے سرگرم کی صورت میں تھی اور موسیٰ کیلئے تعجب کی بات تھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا وہی تو جگہ تھی جس کی ہم تلاش میں تھے وہ ہماری منزل

ہر ادا تھی۔ وہ دونوں اپنے قدموں کے نشانات پر ادا ہو لوئے۔ حتیٰ کہ اسی چہان تک پہنچ گئے۔ وہاں ایک شخص کپڑا لپیٹے سویا ہوا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے سلام کیا تو خضر علیہ السلام نے فرمایا تمہاری زمین کا یہ سلام کہاں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا میں آپ کے پاس اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ مجھے رشد و ہدایت کے علم سے کچھ سکھا دیں جو آپ کو سکھایا گیا ہے۔ حضرت خضر نے فرمایا اے موسیٰ کلیم تم میرے ساتھ صبر کی طاقت نہیں رکھ سکو گے۔ مجھے اللہ نے ایسا علم عطا فرمایا ہے جو تم نہیں جانتے اور آپ کو ایسا علم عطا فرمایا ہے جس کو میں نہیں جانتا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا آپ مجھے ان شاء اللہ صابر پائیں گے اور میں تمہارا کسی امر کی نافرمانی نہیں کروں گا۔ حضرت خضر نے فرمایا اگر تم نے میرے ساتھ چلنا ہے تو مجھ سے کسی چیز کے متعلق سوال نہیں کرنا یہاں تک کہ میں خود تجھے اس کے متعلق بتاؤں۔ وہ دونوں ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ چل پڑے۔ ایک کشتی پاس سے گذری تو خضر علیہ السلام نے انہیں سوار کرنے کو کہا۔ انہوں نے حضرت خضر علیہ السلام کو پہچان لیا اور بغیر کرایہ کے سوار کر لیا۔ جب وہ دونوں سوار ہو گئے تو تھوڑی دیر بعد حضرت خضر ہتھوڑے کے ساتھ کشتی کا ایک بھٹہ اکھیرنے لگے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا جناب انہوں نے ہمیں بغیر کرایے کے کشتی پر سوار کیا ہے اور آپ ان کی کشتی کا تین دن کا مال رہے ہیں تاکہ سب فرق ہو جائیں، یہ آپ نے بڑا برا کام کیا ہے۔ حضرت خضر نے فرمایا میں نے تجھے کہا نہیں تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے۔ موسیٰ کلیم نے عرض کی حضور میری بھول پر میرا مواخذہ نہ فرمائیں اور میرے اس معاملہ میں مجھ سے سختی نہ کر دے (۱)۔ راوی فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا موسیٰ علیہ السلام سے پہلا سوال بھول کر ہوا تھا۔ دوسرا شرط کی بناء پر اور تیسرا جان بوجھ کر کیا تھا فرمایا ایک چڑیا آئی اور کشتی کی ایک طرف بیٹھ گئی پھر اس نے دریا سے پانی کی چوٹی بھری۔ خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا میرا اور تیرا علم اللہ کے علم کے مقابلہ میں ایسے ہیں جیسے سمندر سے چڑیا نے پانی لیا ہے۔ پھر وہ ساحل پر چل پڑے۔ راستہ میں حضرت خضر علیہ السلام نے بچوں میں کھیلتے ہوئے ایک بچہ دیکھا تو خضر علیہ السلام نے اسکو پکڑا اور ہاتھ سے ہی اس کا سرتن سے جدا کر کے قتل کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام (ترپ گئے) اور فرمایا بغیر کسی حق کے ایک معصوم نفس کو آپ نے قتل کر دیا، آپ نے بڑا نازیبا کام کیا ہے۔ حضرت خضر نے فرمایا میں نے تجھے کہا نہیں تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکو گے۔ فرمایا یہ پہلے سے زیادہ سخت کام کیا ہے۔ پھر کہا اگر میں آپ سے اس کے بعد کسی چیز کے متعلق سوال کروں تو مجھے آپ ساتھ نہ رکھیں اور آپ میری طرف سے معذور ہو گئے۔ پھر وہ چل پڑے حتیٰ کہ جب انکا گذر ایک گاؤں سے ہوا گاؤں والوں سے انہوں نے کہا مانا گاؤں تو انہوں نے ان کی میزبانی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اسی گاؤں میں دونوں نے ایک دیوار دیکھی جو گرنے کے قریب تھی تو خضر علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے اسے درست کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا اے بھائی یہ ایسی قوم تھی جنہوں نے ہمیں کھانا کھلانا اور میزبانی کرنے سے انکار کر دیا۔ اگر آپ چاہتے تو کم از کم ان سے مزدوری ہی لے لیتے۔ حضرت خضر نے فرمایا بس سنگت شتم، اب میرے اور تیرے درمیان جدائی کا وقت آ گیا ہے۔ ذالیک ذنوبیل مالم تفسطغ علیہ صبرا تک حضرت خضر علیہ السلام نے کلام فرمائی۔ راوی فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہماری خواہش ہے کہ موسیٰ کلیم صبر کرتے تاکہ ہم پر ان کے مزید واقعات بیان کئے جاتے (۲)۔

ابن جریر، ابن ابی عمیر، ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا تیرے بندوں میں سے محبوب ترین بندہ کونسا ہے۔ فرمایا جو مجھے یاد کرتا ہے اور کسی حالت میں مجھے نہیں بھولتا۔ پھر پوچھا کونسا بندہ عمدہ فیصلے

کرنے والا ہے؟ فرمایا جو حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے اور خواہش نفس کی پیروی نہیں کرتا۔ پھر پوچھا زیادہ عالم کون ہے؟ فرمایا جو اپنے علم کے باوجود لوگوں سے علم حاصل کرتا ہے اس خواہش ہے کہ ہو سکتا ہے کوئی نکلہ ایسا مل جائے جو ہدایت کی طرف راہنمائی کرے اور ہدایت سے لٹاؤ دے (1)۔ پھر موسیٰ کلیم علیہ السلام نے عرض کی اگر تیرے بندوں میں سے زیادہ علم والا کوئی موجود ہے تو میری اس کی طرف راہنمائی فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تجھ سے زیادہ علم والا حضرت ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا میں اسے کہاں تلاش کروں؟ فرمایا چنان کے قریب ساحل سمندر پر۔ عرض کی میں اس تک کیسے پہنچوں گا؟ فرمایا ایک پھلی ٹوکری میں لے لو جہاں وہ گم ہو جائے وہی میرے خضر کا مقام ہے۔ موسیٰ کلیم نے اپنے نوجوان ساتھی سے کہا جب پھلی گم ہو جائے تو مجھے بتانا۔

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنَهُمَا نِسِيَا حُورَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ۝۱۱

”پھر جب وہ دونوں پہنچے جہاں آپس میں دو دریا ملتے ہیں دونوں بھول گئے اپنی پھلی کو تو لے بنا لیا اس نے اپنا راستہ دیا میں سرنگ کی طرح۔“

۱۔ بَيْنَهُمَا طرف ہے مجمع کی اس کی طرف اضافت یا توسعت کی بناء پر ہے یا بین بھسی وصل ہے اس لئے اس کی طرف مجمع کو مضاف کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ دونوں اس چٹان کے پاس پہنچے جو دور دریاؤں کے سنگم کے پاس تھی، وہ بھولی ہوئی پھلی پھڑکی اور زندہ ہو کر سمندر میں چلی گئی۔ قدرت کی یہ کرشمہ سازی اسلئے ہوئی تاکہ موسیٰ علیہ السلام یا خضر علیہ السلام کیلئے معجزہ بن جائے۔ صحیحین میں ہے کہ حضرت سفیان نے فرمایا لوگ یہ خیال کرستے ہیں اس چٹان کے پاس آب حیات ہے، اس کا پانی جس چیز کو لگتا ہے وہ زندہ ہو جاتی ہے۔ اور سمندر میں جاگتی ہے۔ کبھی کہتے ہیں یوشیح بن نون نے آب حیات سے وضو کیا تھا اور اس کا پانی اس تکمین پھلی پر ٹوکری میں گھسکا تھا۔ اس پانی کی وجہ سے وہ پھلی زندہ ہو کر دریا میں کود پڑی تھی اور پانی میں دم مارتی ہوئی چلی گئی۔ جس پانی کے ساتھ اس کا جسم مس کرتا وہ خشک ہو جاتا اور وہ آگے چلی جاتی۔ موسیٰ علیہ السلام بعد ازاں نے تو اس پھلی کا حال پوچھا بھول گئے اور یوشیح بتاتا بھول گئے کہ پھلی زندہ ہو کر سمندر میں چلی گئی ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں پھلی یوشیح کے پاس تھی اور وہی بھولے تھے لیکن بھولنے کی نسبت دونوں کی طرف اس لئے فرمائی کیونکہ وہ دونوں کا زاد سفر تھی جیسے عرب کہتے ہیں قوم فلاں جگہ گئی اور وہاں بھی ساتھ لے گئی حالانکہ زاد راہ ایک شخص کے پاس ہوتا ہے۔ لیکن اٹھانے اور ساتھ لے جانے کی نسبت تمام کی طرف کرتے ہیں (2)۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے پھلی کیلئے سرنگ کی طرح راستہ بنا دیا تھا سرب کا معنی راستہ ہے، اس سے سارب بالہمار ہے (دن کے وقت راستہ پر چلنے والا) بعض علماء فرماتے ہیں سرب کا معنی طویل دراڑ ہے۔ صحیح حدیث کے حوالہ سے گذر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر پانی کے چلنے کو روک لیا تھا اور وہ پانی اس پر عراب کی شکل میں ہو گیا تھا۔ سربا پر نصب مفعول ثانی ہونے کی بناء پر ہے اور فی البحو یا توسرما سے یا سبیلہ سے حال ہے اور اتخذہ کے متعلق کرنا بھی جائز ہے۔

فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ يَضَتْهٖ اٰتٰنَا لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصِيَابًا ۝۱۲

”پس جب وہاں سے آگے بڑھ گئے آپ نے اپنے نوجوان ساتھی سے کہا لے آؤ ہمارا صبح کا کھانا بیچک ہمیں برداشت کرنی پڑی ہے اپنے اس سفر میں بڑی مشقت۔“

1۔ موسیٰ علیہ السلام اور یوشع جلتے جلتے مجمع سے گزر گئے حتیٰ کہ دوسرے دن صبح کے ناشتہ کا وقت ہوا موسیٰ علیہ السلام نے کہا صبح کا کھانا لے آؤ۔ خدائے اس کھانے کو کہتے ہیں جو صبح کے وقت کھانے کیلئے تیار کیا گیا ہو اور العشاء جو شام کے کھانے کیلئے تیار کیا گیا ہو۔ نصب کا معنی تمکاواٹ اور شدت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے چٹان سے گزرنے کے بعد بھوک اور تمکاواٹ طاری کی تاکہ چھجلی کی یاد آئے اور اپنی منزل مقصود کی طرف واپس لوٹیں۔ صحیح حدیث میں گزر چکا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو چٹان سے گزرنے سے پہلے کوئی تمکاواٹ محسوس نہ ہوئی۔

قَالَ أَسْرَعَيْتَ إِذْ أَوْيْتَنَا إِلَى الصَّخْرَةِ قَالِي نَسِيتُ الْحَوْتَ وَمَا أَسْنِينِيهِ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَدْرُسُكَ وَأَتَّخِذَ سَبِيلَكَ فِي الْبَحْرِ عَجَبًا ۝

”اس ساتھی نے کہا (اے کلیم) آپ نے ملا حظہ فرمایا جب ہم (ستارے کیلئے) اس چٹان کے پاس ٹھہرے تھے تو میں بھول گیا اور چھجلی کو وار نہیں فراموش کرائی مجھے وہ چھجلی عمر شیطان نے کہ میں اس کا ذکر کروں اور اس نے بتایا تھا اپنا راستہ دریا میں بڑے تعجب کی بات ہے۔ ل۔“

۱۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ عقل بن زیاد نے فرمایا یہ وہ چٹان ہے جو نضر الزیت کے قریب ہے (1)۔ امام بغوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ یوشع نے جب یہ چھجلی کا زندہ ہونا وغیرہ دیکھا تھا تو وہ موسیٰ علیہ السلام کو سارا واقعہ سنانے کیلئے کھڑے ہوئے تھے لیکن پھر بتانا بھول گئے تھے۔ حتیٰ کہ دوسرے دن ظہر کی نماز پڑھ کر بتایا (2) اور پھر اپنا عذر پیش کیا۔ افسینہ کو شخص نے وصل کی صورت میں ہا کے منہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح سورہ فتح میں علیہ اللہ میں حا کو منہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے دونوں حالتوں میں ہا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی شیطان نے مجھے آپ کے سامنے چھجلی کا امر بیان کرنا فراموش کرا دیا۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں شاید وہ اس نے چھجلی کے زندہ ہونے اور دریا میں گرنے کی وجہ سے قدرت کی نشانیوں کا مشاہدہ کیا تھا، ان کی وجہ سے وہ کلیتہً اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو گیا ہو اور عبرت میں مستغرق ہو گیا ہو۔ اس وجہ سے چھجلی کا ذکر بھول گیا ہو، لیکن شیطان کی طرف بھلانے کی نسبت اپنے نفس کو روندنے کیلئے کی ہو۔ یا اس لئے کہ دونوں اطراف کے برداشت کی طاقت نہ ہونا اور ایک طرف سے غافل ہو کر دوسری طرف کلیتہً متوجہ ہو جانا یقیناً ایسا کرنے والے کیلئے نقصان شمار ہوتا ہے (3)۔ واللہ اعلم۔ عجباً مفعول ثانی سیلاباً مخذوف کی صفت ہے۔ موصوف کو حذف کر کے صفت کو اس کے قائم مقام رکھا ہے اور ظرف ظرف لغو ہے۔ یا یہ اتخذ کے مصدر اتخذاذ کی صفت ہو کر مفعول مطلق ہے اور مفعول ثانی فی البحر ظرف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ مصدر ہے اور اس کا فاعل مفسر ہے۔ گویا نوح جو ان سے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کرتے ہوئے آخر میں فرمایا عجب عجباً۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ موسیٰ علیہ السلام کے کلام سے ہے کہ جب یوشع نے انہیں بتایا کہ چھجلی نے سمندر میں راستہ بتالیا تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا عجب عجباً۔ بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ اتخذ کی ضمیر کا مرجع موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام نے چھجلی کے سمندر میں راستہ بتانے کو تعجب جانا۔ اس صورت میں عجباً حال ہوگا۔

قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبِغُ قَالَتْ اِنَّكَ رَأٰىهَا قَصَصًا ۝

”آپ نے فرمایا یہی تو وہ ہے جس کی ہم جستجو کر رہے تھے پس وہ دونوں لوٹے اپنے قدموں کے نشان دیکھتے

ہوئے۔ ل۔“

لہ نبع کی یا کوہ ابن کثیر نے دونوں حالتوں میں قائم رکھا ہے جبکہ تابع ابو عمرو اور کساکی نے صرف وصل میں قائم رکھا ہے، باقی قراء نے دونوں حالتوں (وقت وصل) میں حذف کیا ہے۔ قصصاً یا تو فصل مقدر کے مصدر کی حیثیت سے منصوب ہے یا او قد کا مصدر ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے یا مصدر یعنی اسم فاعل ہے اور حال کی حیثیت سے منصوب ہے۔

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا آتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنَاهُ مِمَّا لَدُنَّا عِلْمًا ﴿۱۱﴾

”تو پایا انہوں نے ایک بندے کو ہمارے بندوں میں سے لہ جسے ہم نے عطا فرمائی تھی رحمت اپنی جناب سے اور ہم نے سکھایا تھا اسے اپنے پاس سے (خاص) علم۔“

لہ عبداً سے مراد جہور مفسرین کے نزدیک حضرت علیہ السلام ہیں حالانکہ صحیح حدیث میں وارد ہے آپ کا نام ہلیمان بن ماکان تھا۔ بعض نے شیخ اور بعض نے الیاس نام لکھا ہے اور حضرت آپ کا لقب تھا۔ امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ حماد بن منبہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آپ کو خضر اس لئے کہا جاتا کہ آپ خشک زمین اور خشک گھاس پر تشریف فرما ہوتے تو وہ (آپ کی برکت سے) سرسبز ہو کر ہلہلہا بن گئی (1)۔ مجاہد نے آپ کے خضر لقب کی یہ وجہ لکھی ہے کہ آپ جہاں نماز پڑھتے، ارد گرد کا علاقہ سرسبز و شاداب ہو جاتا۔ امام بغوی فرماتے ہیں، بعض علماء نے لکھا ہے کہ آپ بنی اسرائیل کی نسل سے تھے۔ بعض نے لکھا ہے کہ آپ بادشاہوں کے بیٹوں میں سے تھے جنہوں نے دنیا سے عدم دلچسپی کا مظاہرہ کیا تھا (2)۔ میرے نزدیک مختار یہ ہے کہ آپ بنی اسرائیل سے تھے نہ تھے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام تمام بنی اسرائیل کی طرف مبعوث کیے گئے تھے۔ اگر حضرت خضر علیہ السلام کا تعلق بنی اسرائیل سے ہوتا تو آپ موسیٰ علیہ السلام کے تبعین سے ہوتے۔ جبکہ ظاہر اس کے خلاف ہے۔ حدیث صحیح میں گزر چکا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے خضر علیہ السلام کو کپڑا لپیٹے ہوئے دیکھا تو ان پر سلام کیا خضر علیہ السلام نے کہا تمہاری زمین کا یہ سلام کہاں۔ فرمایا میں موسیٰ ہوں۔ خضر علیہ السلام نے کہا موسیٰ بنی اسرائیل فرمایا ہاں۔ میں جناب کے پاس آیا ہوں تاکہ آپ مجھے رشد و ہدایت کا وہ علم سکھائیں (جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے) آپ کو سکھایا گیا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ گدی کے بل چٹ لپیٹے ہوئے تھے اور کپڑا لپیٹے ہوئے تھے، کچھ کپڑا آپ کے سر کے نیچے تھا اور کچھ پاؤں کے نیچے تھا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اس وقت ملاقات ہوئی جب خضر علیہ السلام نماز پڑھ رہے تھے۔ یہ بھی روایت ہے کہ سبز چادر پر ملاقات ہوئی تھی سمندر کے کنارے پر۔

لہ رحمتہ سے مراد وحی اور نبوت ہے لہذا علمنا سے مراد مخصوص علم ہے جس کا حصول ذات الہی کی توفیق کے بغیر ممکن نہیں اور وہ علم ذات و صفات ہے امام بغوی فرماتے ہیں اکثر اہل علم کے نزدیک حضرت خضر علیہ السلام نبی نہیں تھے۔ میں (مفسر) کہتا ہوں میرے نزدیک یہ قول محل نظر ہے کیونکہ اولیاء کرام کو جو الہام وغیرہ سے علم حاصل ہوتا ہے وہ علم ظنی ہوتا ہے، اس میں خطا کا احتمال ہوتا ہے، اسی وجہ سے اولیاء کرام کے علوم میں تعارض پایا جاتا ہے۔ اگر خضر علیہ السلام نبی نہ ہوتے تو اس الہام کی بناء پر کہ یہ بچہ بڑا ہو کر والدین کو کفر پر مجبور کرے گا۔ معصوم بچے کو قتل کرنا آپ کیلئے کبھی جائز نہ ہوتا۔

قَالَ لَهُ مُوسَىٰ هَلْ آتَيْنَاكَ عَلَىٰ أَنْ تَعْلَمَ مِنَّا وَلَمْ نَكُن مِّنْ عِلْمِكَ شَائِدًا ﴿۱۱﴾

”کہا اس بندے کو موسیٰ نے کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں بشرطیکہ آپ سکھائیں مجھے رشد و ہدایت کا خصوصی علم جو

آپ کو کھلایا گیا ہے۔ لہٰذا

کلام کا حق تو یہ تھا کہ آپ اس طرح کہتے کہ میں آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ کی اتباع کروں اور آپ کی سنت اختیار کروں۔ لیکن آپ نے اتباع اور سنت کا اذن طلب کرنے کیلئے اسلوب بیان بدل دیا۔ تاملن میں ابن کثیر نے دونوں حالتوں میں یا ہ کو قائم رکھا ہے۔ نافع اور ابو عمرو نے صرف وصل میں قائم رکھا ہے، باقی قراء نے دونوں حالتوں میں یا ہ کو حذف کیا ہے، یعنی کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں بشرطیکہ آپ مجھے سکھائیں علی ان تاملن حال ہے ابیہک کی ضمیر مرفوع سے یا ضمیر منصوب سے۔ رشدا کو ابو عمرو نے راء اور شین کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے راء کے ضمہ اور شین کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، یہ دونوں لغتیں ہیں جیسے نخل اور نخل۔ رشدا کا معنی بھلائی اور خیر کا پہنچانا ہے یہ تعلیمی کا مفعول ہے اور علمت کا مفعول ہوتا ہے، یعنی عرف کے معنی میں ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رشدا ابیہک کی علت ہو۔ یا فعل مضمرا کا مصدر ہو یہ آیت کریمہ دلیل ہے کہ کبھی کبھی مفعول کو اپنے سے افضل پر کوئی جزوی فضیلت ہوتی ہے اور فاضل کو چاہئے کہ فضیلت کا وہ حصہ مفعول سے حاصل کرے اور اس کو عارت سمجھے جیسا کہ مذکورہ آیات کی تفسیر میں گذرا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے پوچھا کہ تیرا کونسا بندہ زیادہ عالم ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو اپنے علم کے ہوتے ہوئے لوگوں سے علم سیکھتا ہے، شاید کہ کوئی کلمہ ایسا مل جائے جو اس کی ہدایت کے راستہ کی طرف راہنمائی کرے اور اسے ہلاکت کے گڑھے سے بچالے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حکمت کا کلہ مومن کی گمشدہ چیز ہے جہاں سے ملے وہ اس کا زیادہ مہدار ہے۔ اس حدیث کو ترمذی اور ابن ماجہ نے حسن سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ سے اور ابن عساکر نے حضرت علی رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے۔ نبی کریم ﷺ سے منقول درود بھی اسی باب سے متعلق ہے۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰی اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰی آلِ اِبْرٰهِيْمَ (1)

امام بغوی فرماتے ہیں بعض روایات میں ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے خضر علیہ السلام سے تعلیم کا سوال کیا تو خضر علیہ السلام نے فرمایا تو رات علم کے لئے کافی ہے اور عمل کے لئے نبی اسرائیل کی راہنمائی کافی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا اللہ تعالیٰ نے مجھے آپ سے علم حاصل کرنے کا حکم دیا ہے (2)۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس کلام میں انتہائی ادب اور تواضع کا اظہار کیا اور اتباع کی اجازت طلب کی اور پھر اللہ تعالیٰ کے خصوصی علم سے کچھ سکھانے کی استدعا کی۔

قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَضِيْعَ مَعِيَ صَمِيْرًا (3)

”اس بندے نے کہا (اے موسیٰ) آپ میرے ساتھ مہر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ لہٰذا“

۱۔ حفص نے معنی کو یہ ہے کہ فتح کے ساتھ اور باقی قراء نے یا ہ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے ساتھ رہ کر مہر کرنے کی طاقت کی نفی ہوئی تاکیدی کلام کے ساتھ کی ہے۔ ایسی ہوئی نہیں چاہئے تھی، اس لئے پھر خود ہی علت بیان فرمائی اور خود ہی ساتھ نہ رہنے کا ان کی طرف سے عذر پیش کر دیا۔

وَ كَيْفَ تَصَدِرُ عَلٰی مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خَبِيْرًا (3)

”اور آپ صبر کبھی کیسے سکتے ہیں اس بات پر جس کی آپ کو پوری طرح خبر نہیں۔“

۱۔ خبرو کا معنی علم ہے اور ترکیب خموی کے اعتبار سے یا تمیز ہے یا مضمول مطلق ہے کیونکہ لم نعطہ یا معنی لم تحبرہ ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے ساتھ کہ صبر کبھی کبھی اس لئے فرمائی کیونکہ خضر علیہ السلام کو معلوم تھا کہ نئے ایسے امور صادر ہوں گے جو ظاہر اغیر شرعی ہوں گے اور انبیاء کرام غیر شرعی امور پر خاموش نہیں رہ سکتے جب تک کہ انکی وجہ و جواز ظاہر نہ ہو۔ میں کہتا ہوں اس میں راز یہ ہے کہ انبیاء کرام کی شریعتیں ایسے قواعد کلیہ پر مبنی ہوتی ہیں جو عام لوگوں کی نسبت سے عموماً اصلاح کا موجب ہوتے ہیں۔ پس ان کی اصلاح و جوہ بھی عام لوگوں کے لئے ظاہر ہونی چاہئیں۔ اور وہ احکام جو ان انبیاء کرام کی طرف وحی کئے جاتے ہیں وہ امتوں کی طرف مبعوث نہیں کئے جاتے بلکہ وہ انبیاء کرام کے اپنے نفوس کی اصلاح کے لئے وحی کئے جاتے ہیں یا ان امور کی اطاعت کے لئے ہوتے ہیں جو انبیاء کرام اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہوتے ہیں۔ پس ایسے احکامات ایسی حکمتوں پر مبنی ہوتے ہیں جن کی وجہ خیر عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتی۔ موی علیہ السلام کی خضر علیہ السلام کے فعل پر انکار کی وجہ بھی یہی تھی۔ ان میں سے ہر ایک کا شرب مختلف تھا۔ (جبکہ استفادہ (علم حاصل کرنا) کی شرائط میں سے ہے کہ عالم و معلم کا شرب ایک ہو۔ معلم استاد کی پیروی کرے اور اعتراض کی زبان نہ کھولے) حضرت خضر علیہ السلام نے صبر پر استطاعت نہ رکھنے کو عدم افادہ کی علت بنایا۔ علت کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا یوں فرمایا کہ میری معیت و صحبت تجھے فائدہ نہ دے گی کیونکہ تو میرے ساتھ صبر کرنے کی طاقت نہیں رکھ سکتا۔

اسی وجہ سے صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ صبر پر واجب ہے کہ وہ شیخ کی کسی بات پر اعتراض نہ کرے اگرچہ اس کے ہاتھ سے کوئی خیر شرعی فعل بھی ظاہر ہو بشرطیکہ صبر پر ثابت ہو چکا ہو۔ کہہ کر شدہ کریم اہل کمال اور اہل تکمیل افراد سے ہے اگر صبر پر مشرب کے اختلاف کی وجہ سے صبر کی طاقت نہ رکھتا ہوں تو اس پر واجب ہے کہ صبر شدہ کی مصاحبت ترک کر دے لیکن اس کے کمال کا منکر نہ ہو۔

اگر کوئی یہ کہے کہ شریعت محمدیہ عام اور دائمی ہے۔ اب اس میں نئے اور تجدیدی کا احتمال ممکن ہی نہیں ہے تو کوئی عارف اگر غیر شرعی کام کرے تو اس پر کیسے خاموش رہا جائے۔ تو ہم اس کے جواب میں یہ نہیں کہے کہ دین میں کسی حرام چیز کو کوئی بھی مباح تصور نہیں کرتا۔

پس جو مدعی ولایت ہے اس سے بھی یہ منظور نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی بچہ کو غسل کر دے اور یہ کہے کہ اللہ نے مجھے الھام کیا ہے کہ یہ بڑا ہو کر والدین کو کفر اور سرکشی پر مجبور کرے گا۔ لیکن کبھی ایک چیز کے متعلق علماء کے اقوال مختلف ہوتے ہیں اور ہر ایک قول کی بنیاد دلیل شرعی پر قائم ہوتی ہے جیسا کہ سماع ذکر بالجہر وغیرہ میں اولیاء کرام میں سے کوئی اگر ان افعال کو کرتا ہے اس پر اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ

جو کسی عالم کی تقلید کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے سلامتی کے ساتھ ملاقات کرے گا۔ کبھی ایک چیز ظاہر اغیر شرعی ہوتی ہے لیکن حقیقت میں ایسی نہیں ہوتی جیسے جو بعل میں پانی ڈال کر پیئے اور لوگوں کو دکھائے کہ یہ شراب ہے، اس سے اس کی غرض یہ ہو کہ حقوق کا نجوم کم ہو جائے اور اس کے معمولات میں خلل نہ آئے۔ اور کبھی اللہ والے سے گناہ صغیرہ سرزد ہوتا ہے اور اس کے گناہ ہونے کا وہ اعتراف بھی کرتا

ہے۔ (یعنی گناہ اولیاء سے سرزد ہو سکتا ہے) جبکہ علماء کا اجماع ہے کہ گناہ سے عصمت انبیاء کرام کا خاصہ ہے۔ معصیت کا صدور ولایت کے متناہی نہیں ہے۔ پس صبر پر مبنی ہونے کے لئے شیخ پر اعتراض جائز نہیں بلکہ اس فعل کو اچھا نہ سمجھے اور اس پر عمل نہ کرے اور اس شیخ کے کمال کا انکار بھی نہ کرے۔ ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ (افواہ) سنی تو گمان کیا ہوتا مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے بارے میں

نیک گمان۔ بعض اولیاء کرام کے مقالات کشف اور مشاہدات پر مبنی ہوتے ہیں۔ پس ان پر اعتراض نہیں کرنا چاہئے بلکہ جہاں تک ممکن ہو ان کی صحیح نقل پر تاویل کرنی چاہئے کیونکہ اللہ کا ارشاد ہے۔ لَوْلَا اِذْ سَمِعْتُمُوهُ فَطَنُ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ يَا قَوْمِ اِنَّكُمْ لَعَاوِدُ

اور اگر

ان کے اقوال کا کوئی صحیح نقل بیان نہ ہو سکے تو اسے سکر پر محمول کرنا چاہئے۔ کیونکہ فقہاء کا فتویٰ ہے کہ جب مباح چیز سے نشہ چڑھ جائے تو وہ بندہ معذور ہوگا اور اس کی طلاق واقع نہ ہوگی۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ سے محبت کے غلبہ کی وجہ سے کوئی مدہوش ہو جائے تو وہ کیسے اپنے کلام میں معذور نہ ہوگا۔ یا ان کی باتوں کو اس پر محمول کیا جائے کہ قائل کی مراد کو سامع سمجھنے سے قاصر ہے۔ یا اس پر محمول کیا جائے کہ کہنے والے کا وہ کلام اور معنی مراد ہے جو ظاہری معنی کے خلاف ہے کیونکہ عبارات محسوس معانی یا مستقولہ معانی پر منحصر ہوتی ہیں جو امور محسوس سے مستقلہ معانی ہوتے ہیں۔ لیکن جس کی کوئی مثال اور نظیر نہ ہو جیسے ذات و صفات کے خالق جب قلب سلیم پر تعقلی ہوتے ہیں اور وہ ان کو بیان کرنا چاہتا ہے، جبکہ ان کے بیان کے لئے کوئی الفاظ بھی لغت میں نہیں ہیں۔ تو قائل استعارات مجازات اور غیر تامہ تشبیہات کی طرف مجبور ہوتا ہے۔ پس سننے والے کیلئے جائز نہیں ہے کہ ان کے مقالات کو ظاہر معانی پر محمول کرے جو عقائد اہل سنت کے مخالف ہوں اور کہنے والے پر اعتراض کرے بلکہ ان اقوال کے ساتھ تشابہات کا معاملہ کرے جو کلام الہی اور کلام رسول ﷺ میں موجود ہیں۔ جو اس مسلک پر نہیں چلتا (اور اولیاء کرام کی گستاخیاں کرتا ہے) وہ خسارے اور گھٹائے میں ہوتا ہے جیسا کہ قرآن خالموں کے لئے خسارے کا اضافہ کرتا ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ جو اَللّٰهُمَّ عَلَيَّ الْعَرَشِ اَسْتَوِي۔ يٰ اَللّٰهُ فَوَقَّ اَيُّوْبِيْهِمْ سَنَةَ اور ان کے آیات قرآنیہ نے ان کا انکار کر دیا تو وہ کافر ہو جاتا ہے اور اگر اللہ کے جسم کا معتقد ہو تو کفر کے قریب ہو جائے گا۔ اسی طرح اولیاء کرام کا کلام جب ظاہر شریعت کے خلاف ہو تو اس پر انکار نہیں کرنا چاہئے اور اس کے ظاہر پر اعتقاد بھی نہیں رکھنا چاہئے۔ واللہ اعلم۔

جب موسیٰ علیہ السلام کو اپنے صبر پر یقین نہ تھا تو تعظیٰ طور پر یہ نہیں کہا کہ میں صبر کروں گا بلکہ ان شاء اللہ کہہ کر مشیت الہی کے ساتھ اپنے صابر ہونے کو حلق کر دیا۔

قَالَ سَجِدُنِيْ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّاَوْلَا اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا ۝۱

”آپ نے کہا آپ مجھے پائیں گے اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا صبر کرنے والا اور میں نا فرمانی نہیں کروں گا آپ کے کسی حکم کی۔“

۱۔ مستجدنی کو نافع نے نبیاء کے فتوح کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے یاہ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور ولا اعصی لک امرًا کلام صابر پر معطوف ہے اور محل نصب میں ہے۔ یعنی آپ مجھے ان شاء اللہ صبر کرنے والا اور نا فرمانی نہ کرنے والا پائیں گے۔ یا اس جملہ کا عطف مستجدنی پر ہے، اس وقت اعراب میں اس کا کوئی عمل نہ ہوگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے صبر کرنے پر معاہدہ کیا کیونکہ صحبت کے افادہ کے لئے صبر کرنا شرط ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو مصاحبت کا حکم فرمایا تھا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کو صبر کرنے میں شک تھا کیونکہ امتراض اور مخالفت مشرب کے مختلف ہونے کے لوازم میں سے ہے اور بغیر اختیار کے ان سے اس چیز کا صادر ہونا تھا اس لئے حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا اگر تم میرے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو مجھ سے کسی چیز کے متعلق سوال نہ کرنا حتیٰ کہ میں خود بیان کرو۔

قَالَ فَاِنْ اَبْتَعْتَنِيْ فَلَا تَسْغَنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ۝۲

”اس بندے نے کہا اگر آپ میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو مجھ سے کسی چیز کے بارے میں پوچھیے نہیں یہاں تک کہ

میں آپ سے اس کا خود ذکر کروں۔“

۲۔ قال کا فاعل خضر علیہ السلام ہیں۔ ابتعتی میں ابن ذکوان نے یاہ کو دونوں حالتوں میں حذف کیا ہے، جبکہ انفس سے اس کے خلاف مروی ہے۔ باقی قراء نے دونوں حالتوں میں یاہ کو قائم رکھا ہے۔ نافع ابن عامر اور ابو جعفر نے فلا تسئلی کو لام کے فتح اور

نون کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے لام کے سکون اور نون کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ کلام کو شرط و جزاء کی صورت میں ذکر کیا ہے کیونکہ صبر کرنے میں آپ کو شک تھا اور اسکے وقوع کو آپ نے بعید سمجھا تھا۔ (یعنی خضر علیہ السلام کو موسیٰ کلیم کے خاموش رہنے اور سوال نہ کرنے پر شک تھا اور آپ کو معلوم تھا کہ اختلاف مشرب کی بنا پر یہ خاموش نہیں رہ سکیں گے اس لئے یہ اسلوب اپنایا۔ سید حائے نہیں فرمایا کہ تم مجھ سے اس کام کے متعلق نہ پوچھنا جو میں کروں، جبکہ وہ تجھے پسند نہ ہو۔ کیونکہ سوال اعتراض کی مانند ہوتا ہے اور اعتراض استفادہ سے مانع ہے۔ پس میں خود اس معاملہ کو بیان کروں تو فیہما اور نہ تم استفادہ نہ کرنا۔

فَانطَلَقَا حَتَّىٰ اِذَا رَاكِبَانِ السَّفِينَةِ خَرَقَهَا قَالَا اٰخَرَتْهَا لِلسُّعْرِقِ اَهْلَهَا لَقَدْ
جِئْتُمْ سَيِّئًا مَّرْمُورًا ۝

”پس وہ دونوں چل پڑے یہاں تک کہ جب وہ سوار ہوئے کشتی میں تو اس بندے نے اس میں شکاف کر دیا موسیٰ بول

اٹھے کیا تم نے اس لئے شکاف کیا ہے کہ اس کی سوار یوں کو ڈبو دو۔ یعنی تم نے بہت برا کام کیا ہے۔“

۱۔ باہم معاہدہ کر کے دونوں ساحل سمندر پر چل پڑے۔ انہیں ایک کشتی کی تلاش تھی تاکہ اس پر سوار ہو جائیں۔ انہیں ایک کشتی ملی گئی اور اس پر سوار ہو گئے۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ سوار یوں نے کہا یہ چور ہیں۔ ان کو نکل جانے کا حکم دو۔ لیکن کشتی کے مالک نے کہا یہ چور نہیں ہیں، مجھے تو یہ انبیاء کے چہرے دکھائی دیتے ہیں (1)۔ بخاری مسلم کی حدیث میں ابی بنی کعب کے حوالہ سے گزر چکا ہے کہ اسکے پاس سے کشتی گذری تو انہوں نے سوار کرنے کے متعلق کہا تو وہ خضر علیہ السلام کو پہچان گئے اور انہوں نے بغیر کسی گمراہی کے انہیں سوار کر لیا (2)۔ جب سوار ہو گئے تو خضر علیہ السلام نے اسے توڑنا شروع کر دیا، جب کہ صحیحین کی حدیث میں گزر چکا ہے کہ خضر علیہ السلام نے کشتی کا ایک تختہ نکال لیا۔ موسیٰ علیہ السلام سے یارا نے ضبط نہ ہو۔ گا اور کہا تم بھی کمال کے بندے ہو۔ انہوں نے ہم پر احسان کیا کہ ہمیں بغیر گمراہی کے سوار کر لیا اور آپ شکاف کر کے سوار یوں کو ڈبو نا چاہتے ہو۔ آپ اس میں شکاف کریں گے تو پانی اندر داخل ہو جائے گا اور تیرے سب لوگوں کا غرق ہونا ہے۔ حمزہ اور کسایی نے لیغوق کو یاہ اور راء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے اور اہلہما کو مرفوع پڑھا ہے۔ جبکہ شینا پر مفعولیت کی بنا پر نصب پڑھا ہے۔

۲۔ امرایہ الامر اسے مشتق ہے جس کا معنی عظیم ہونا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں کلام عرب میں الامر کا معنی دایہ (معیب) ہے اور ہر چیز کی اصل شدید اور بڑی ہے (3)۔ قصص نے اس کا ترجمہ عجا کیا ہے (4)۔ امام بغوی لکھتے ہیں روایت ہے کہ خضر علیہ السلام نے ایک کاغذ کا پتہ لیا اور کشتی کے سوراخ پر رکھ دیا (5)۔ جلال الدین چلی فرماتے ہیں پانی اندر داخل نہ ہوا تھا۔ یعنی یہ خضر علیہ السلام کا معجزہ تھا۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَنْ نَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝

”اس بندے نے نہ کہا کیا میں نے کہا نہیں تھا کہ آپ میں یہ طاقت نہیں کہ میری نجات پر صبر کر سکیں۔“

۱۔ قال کا قائل خضر علیہ السلام ہیں۔ حفص نے معنی کو یاہ کے فتح کے ساتھ اور دوسرے قراء نے یاہ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ خضر علیہ السلام نے پہلی بات یاد کرانے کے لئے دوبارہ کہی۔

1- تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 585 (الفرق) 2- صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 482 (وزارت تعلیم) 3- تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 585

جب موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ تختہ نکلنے کے باوجود پانی کشتی میں داخل نہیں ہوا اور سوار یوں کو کچھ نقصان نہیں ہوا اور اپنا معابد بھی یاد آیا تو معذرت کرتے ہوئے کہا۔

قَالَ لَا تَوَاجِدُنِي بِهَاتَا نَيْبَيْتِ وَلَا تَرْهَقْنِي مِنْ اَمْرِي عَسْرًا ①

”آپ نے (معذروا ہی کرتے ہوئے) کہا کہ نہ گرفت کرو مجھ پر میری بھول کی وجہ سے۔ ۱۔ اور نہ تنگی کرو مجھ پر میرے

اس معاملہ میں بہت زیادہ۔ ۲۔“

۱۔ بے نسیت میں موصولہ بھی ہو سکتا ہے اور کشتی کے معنی میں موصوف بھی ہو سکتا ہے، یعنی اعتراض نہ کرنے کے معابد یا میرے اس کو بھولنے کی وجہ سے مؤاخذہ نہ فرمائیں۔ موسیٰ کلیم نے اپنی بھول پر معذرت طلب کی۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں نسیان بمعنی التزک ہے۔ یعنی آپ کی پہلی وصیت کو میں نے جو چھوڑا ہے اس پر مواخذہ نہ فرمائیں۔ حدیث صحیح میں ابی بنی کعب سے روایت ہو چکا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے پہلا سوال بھول کی وجہ سے، دوسرا شرط کی بناء پر، تیسرا سوال عمداً کیا تھا (۱)۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ ابن عباس نے فرمایا آپ بھولے نہیں تھے۔ بلکہ یہاں کلام میں تعریض ہے (تعریض کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ صراحتاً ایک چیز ذکر کی جاتی ہے لیکن مراد کچھ اور ہوتا ہے جس کا ذکر نہیں ہوتا جیسے کوئی کسی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے نخل کتنا برا ہے۔ اس کلام میں تعریض ہے کہ مخاطب نخل ہے۔) گویا آپ کوئی دوسری چیز بھول گئے تھے وصیت کو نہیں بھولے تھے (2)۔

۲۔ لا تو رھقی کا معنی لا نکلفنی ہے۔ یعنی مجھ پر تنگی اور گرفت کے مشقت نہ ڈالیے۔ عسراً کا معنی مشقت ہے۔ یعنی مجھ پر اس تنگی اور مؤاخذہ کی وجہ سے آپ کی متابعت مشکل ہو جائے گی۔ عسراً رھق کا مفعول ثانی ہے۔ یورھق کا معنی کسی چیز کو ڈھانپ لینا ہے۔ بعض علماء نے یہ معنی لکھا ہے کہ مجھ پر تنگی نہ کرو، اور آسانی کا معاملہ کر دینی کا معاملہ نہ کرو۔

فَاَصْلًا ۱۱۱ حَتَّىٰ اِذَا اَقْبَبَا عَلٰۤا فَنَقَلْتَهُ ۱۱۱ قَالَ اَقْتَلْتَنِيْ سَاۤا كِيۤۡةًۢ بَعِيۤرٌ نَّفْسِ ۱۱۱
لَقَدْ جِئْتَنِيْ سَبِيًۤۡا لَّكۡرًا ۱۱۱

”پھر دونوں چل پڑے حتیٰ کہ جب وہ لے ایک لڑکے کو تو اس نے اسے قتل کر ڈالا موسیٰ (غضب ناک ہو کر) کہنے لگے۔ ۱۔

کیا مارا الا آپ نے ایک معصوم جان کو کسی نفس کے بدلے کہ بغیر ہتک آپ نے ایسا کام کیا ہے جو بہت ہی ناز ناپا ہے۔ ۲۔“

۱۔ کشتی سے اتر کر کلیم و خضر چل پڑے۔ راستہ میں بچوں کے درمیان کھیلتے ہوئے ایک بچہ سے ملے جسے خضر علیہ السلام نے قتل کر دیا۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ وہ بچہ شیریں کلام اور خوش شکل تھا۔ ساری نے لکھا ہے کہ وہ بچہ تمام بچوں سے زیادہ حسین تھا، اس کا چہرہ حسن کی وجہ سے چمکتا تھا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ خضر علیہ السلام نے اسے لٹا کر چھری سے ذبح کیا تھا۔ حدیث صحیح میں ہے کہ آپ نے اسے سر سے پکڑا اور ہاتھ سے اس کی گردن اکھیری۔ عبدالرزاق نے یہی خبر روایت کی ہے کہ آپ نے انکو ٹھنڈے سہا بے اور وسطی تین انگلیوں کے ساتھ اشارہ فرمایا اور اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ یہ بھی روایت ہے کہ آپ نے پتھر سے اس کا سر پکڑ لیا تھا۔ بعض نے لکھا ہے کہ دیوار پر اس کا سر مار کر قتل کیا تھا۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ بچہ ابھی بالغ نہیں تھا۔ اکثر مفسرین کا یہی قول ہے (3) اور نص قرآن سے بھی یہی مستفاد ہے کیونکہ کلام کے لفظ کا اطلاق بلوغ کے بعد میں نہیں تھا۔ ابن عباس فرماتے ہیں موسیٰ کلیم کا نفساً زکیۃ کہنا ہی

دلیل ہے کہ وہ بچہ تھا، بالغ نہیں تھا۔ حضرت جن بھری فرماتے ہیں وہ پورا مرد تھا۔ بکلی کہتے ہیں وہ ڈاکڑنی کرتا تھا اور سامان بوت کر والدین کے پاس پناہ لیتا تھا۔ ضحاک فرماتے ہیں وہ بچہ تھا اور برسے افعال کرتا تھا، جس سے اس کے والدین کو تکلیف ہوتی تھی۔ مسلم نے ابی بن کعب کی حدیث میں نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس بچے کو خضر علیہ السلام نے قتل کیا تھا وہ طبعاً کافر تھا۔ اُردو زندہ رہتا تو والدین کو کفر اور تافرنی پر مجبور کرتا (1)۔ فضئلہ میں فاتحہ تعقیب کے لئے ہے اور یہ دلالت کرتی ہے کہ خضر علیہ السلام نے پہلی ملاقات میں بغیر تعقیب اور مہلت کے فوراً قتل کر دیا تھا۔

مع کوئیوں اور ابن عامر نے الف کے بغیر یا ء کی تشدید کے ساتھ ذکیۃ پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے الف کے ساتھ یا ء کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ کسائی اور فرما فرماتے ہیں کہ دونوں کا معنی ایک ہے جیسے قاسیہ اور قسیہ دونوں کا معنی ایک ہے۔ ابو عمرو بن العلاء کہتے ہیں الزاکیۃ وہ ہوتا ہے جس نے کبھی گناہ نہ کیا ہو اور الزکیۃ وہ لٹس ہوتا ہے جس نے گناہ کیا ہو اور پھر تو یہ کر لی ہو (2)۔ بغیر نفس یعنی قتل تو حد اور قصاص کی وجہ سے واجب ہوتا ہے۔ جبکہ اس پر نہ حد تھی نہ قصاص۔ آپ نے اسکو کیوں قتل کر دیا۔ کشتی کے مسئلہ میں خبر فقہا کو جزاء بنایا اور موسیٰ علیہ السلام کے اعتراض کو مستقل کلام ذکر فرمایا اور دوسرے فعل (قلۃ) میں موسیٰ علیہ السلام کے اعتراض کو ماقبل شرط کی جزاء بنایا۔ اس تغیر عبارت کی وجہ یہ ہے کہ قتل ایک فیج ترین فعل تھا، اس پر اعتراض کو زیادہ دخل تھا۔ یہ فعل اس قاتل تھا کہ اسے کلام کی بنیاد بنایا جائے۔ اسی وجہ سے آگے علیحدہ کلام ذکر فرمائی لفقہ جنت شہداء نکرو اس فعل کو کہتے ہیں جو غیر شرعی ہو۔ تابع یعقوب ابو بکر اور ابن ذکوان نے یہاں اور سورۃ الطلاق میں نکرو یعنی کاف کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ہاتی قراء نے کاف کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ النکر امر سے زیادہ فیج فعل پر دلالت کرتا ہے کیونکہ بچے کے قتل میں حدیث بلاکت پائی تھی جسی اس لئے نکرو فرمایا اور کشتی کے پھانسنے میں بلاکت کا اندیشہ تھا۔ اس لئے وہاں امر استعمال فرمایا۔ یہ قراءہ کا قول ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں امر نکرو سے زیادہ برے فعل پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ کشتی میں بہت سے لوگوں کا ہلاک ہوتا تھا اس لئے وہاں امر استعمال کیا، یہاں ایک شخص کی ہلاکت تھی اس لئے نکرو استعمال فرمایا (3)۔ واللہ اعلم۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٣٠﴾

”اس نے کہا (پہلے ہی) میں نے کہہ نہ دیا تھا آپ کو کہ آپ میری معیت میں صبر نہیں کر سکیں گے۔“

لہ معنی کو شخص نے یا ء کے فتح کے ساتھ اور باقی قراء نے یا ء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ دوسرے تہ عبد کو توڑنے پر یہاں عتاب کو زور دار لہجہ میں ذکر فرمایا۔

قَالَ اِنْ سَأَلْتَهُ عَنِ شَيْءٍ بَعْدَ هَا فَلَا تَصْحَبْنِيۤ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِن لَدُنِّيۤ عُذْرًا ﴿٣١﴾

”آپ نے کہا اگر میں پوچھوں آپ سے کسی چیز کے بارے میں اس کے بعد تو آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیں۔ لہ آپ میری طرف سے معذور ہوں گے۔“

لہ قال کا فاعل موسیٰ علیہ السلام ہیں، یعنی آپ نے کہا اگر اس مرتبہ کے بعد مجھ سے آپ پر کوئی سوال ہو تو آپ مجھے بیٹھک جدا کر دینا۔ یعقوب نے فلا تصحبنی یعنی بغیر الف کے الصحبہ سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔

ع۔ تابع اور ابو بعفر نے لندن کی کوال کے ضمن اور نون کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابو بکر نے وال کے سکون اور ضمہ کے اشام اور نون کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ لیکن دوسرے قراء نے وال کے ضمہ اور نون کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ لندن کا معنی عندی ہے۔ یعنی آپ میری طرف سے معذور ہوں گے کیونکہ تین مرتبہ میں آپ سے عہد توڑ چکا ہوں گا۔ مسلم نے ابی بن کعب سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وَحَمَةُ اللَّهِ عَلَيْنَا وَعَلَى مُوسَى لَوْلَا أَنَّهُ عَجَّلَ لِرَأْيِ الْعَجَبِ وَلَكِنَّهُ أَخَذَهُ مِنْ صَاحِبِهِ ذِمَامَةً فَقَالَ إِنَّ سَأَلْتَكَ بَعْدَهَا الْخ۔ یعنی اللہ ہم پر اور موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے۔ (آپ ﷺ کا معمول مبارک) تھا کہ جب کسی بھی نبی کا اس طرح ذکر فرماتے تو پہلے اپنا ذکر کرتے (اگر وہ جلدی نہ فرماتے تو بڑی بڑی عجیب چیزیں دیکھتے۔ لیکن انہوں نے خضر علیہ السلام سے حیا فرمایا اور ملامت و مذمت سے ڈر گئے اور یہ کہہ دیا اگر میں اس کے بعد آپ سے پوچھوں تو آپ میری طرف سے معذور ہوں گے (۱)۔ ابن مردود نے ان الفاظ میں یہی حدیث نقل کی ہے۔ اللہ تعالیٰ میرے بھائی موسیٰ پر رحم فرمائے کہ انہوں نے حیا فرمایا اور یہ کہہ دیا۔ اگر وہ اپنے ساتھی (خضر علیہ السلام) کے ساتھ ٹھہرے رہتے تو بڑی بڑی عجیب چیزیں دیکھتے۔

فَانْطَلَقَا حَتَّى إِذَا آتَيْتُمَا أَهْلَ قَرْيَةٍ اسْتَطَعَا أَهْلُهَا فَاكْبُؤَانِ يُصِفُوا لَهَا قَوْمًا جَدًّا
فِيهَا جَدًّا أَرْمِيئِدًا أَنْ يَقْتَصَّ فَأَقَامَهُ ط قَالَ لَوْ سَأَلْتُمْ لَتَنَحَدَّتْ عَلَيْكُمَا جَرًّا ۝

”پھر وہ چل پڑے یہاں تک کہ جب ان کا گزر ہوا گاؤں والوں کے پاس تو انہوں نے ان سے کھانا طلب کیا تو انہوں نے (صاف) انکار کر دیا گی میز بانی کرنے سے پھر ان دونوں نے اس گاؤں میں ایک دیوار دیکھی جو گرنے کے قریب تھی تو اس بندے نے اسے درست کر دیا۔ اسے موسیٰ کہنے لگے اگر آپ چاہتے تو اس محنت پر حردوری ہی لے لیتے۔“

۱۔ ابن عباس فرماتے ہیں قریہ سے مراد اظاکیہ ہے۔ ابن سیرین نے فرمایا وہ ایک ہے یہ آسمان سے بعید ترین جگہ ہے۔ بعض نے برقہ لکھا ہے (۲) علامہ بغوی نے حضرت ابو ہریرہ سے اس حدیث کی روایت کیا ہے (۳)۔ حکیم و خضر نے اس ہستی والوں سے کھانا طلب کیا تو انہوں نے مہمان نوازی سے صاف انکار کر دیا۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ ابی بن کعب نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ دونوں لہام کی ہستی میں آئے۔ مجالس کا چکر لگایا اور لوگوں سے کھانا طلب کیا لیکن انہوں نے کھانا نہ دیا۔ مہمان نوازی کی حالت میں انہوں نے اس کا انکار کر دیا۔ حضرت قتادہ نے فرمایا سب سے برا شہرہ ہے جس میں مہمان کی مہمان نوازی نہ کی جائے (۴)۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ مردود سے انہوں نے کھانا طلب کیا، انہوں نے نہ دیا لیکن اہل بربر کی ایک عورت نے ان کو کھانا پیش کیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام نے ان کی عورتوں کے لئے دعا کی اور ان کے مردود پر لعنت کی (۵)۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ ایک دیوار ہے جو بالکل گرنے کے قریب ہے۔ اس کلام میں مجاز سے کیونکہ دیوار کوئی ارادہ نہیں ہوتا، اس کا معنی یہ ہے کہ وہ گرنے کے قریب تھی۔ اسی طرح کہتے ہیں حدیثی تنظیر دار فلان۔ (میرا گھر فلان کے گھر کو دکھاتا ہے) یہ اس وقت کہتے ہیں جب گھر ایک دوسرے کے آسنے سامنے ہوں۔ حضرت خضر علیہ السلام نے گرتی ہوئی دیوار کھڑی کر دی۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ ابی بن کعب نے حضور ﷺ سے روایت فرمایا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے وہ دیوار ہاتھ کے اشارے سے کھڑی کر دی تھی۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں حضرت خضر نے دیوار کو ہاتھ سے چھوا تو وہ سیدھی ہو گئی۔ ابن عباس سے مروی ہے کہ پہلے آپ نے اس دیوار کو مکمل کر دیا

پھر اس کی بنیاد کھڑی کی۔ اسدی فرماتے ہیں مثنیٰ اور پھر دیوار بنائی (1)۔

۱۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہلہ آپ بھی عجیب آدمی ہیں مفت ومفت دیوار بنادی ان لوگوں کی جنہوں نے ایک وقت کا کھانا بھی نہیں دیا۔ اگر آپ چاہتے تو اس محنت پر مزدوری ہی لے لیتے۔ ابن کثیر، یعقوب اور ابو عمر نے لتخذت یعنی تاء کی تخفیف اور خاء کے کسرہ کے ساتھ بحر فصل سے تبع کے وزن پر پڑھا ہے۔ تلخذت بخذ بروزن سمع بسمع استعمال ہوتا ہے۔ باقی قراء نے تاء کی تشدید اور خاء کے فتح کے ساتھ باب افعال سے تبع کے وزن پر پڑھا ہے۔ فاعلمہ کی تاکو تاء افعال میں مدغم کیا گیا ہے۔ ان دونوں کا معنی ایک ہے۔ جیسے تبع اور تبع کا معنی ایک ہے۔ یہ بصریوں کے نزدیک اخذ سے مشتق نہیں ہے امام بیضاوی نے بھی بصریوں کی تائید کی ہے کیونکہ اس صورت میں فاعلمہ ہمزہ ہوگا اور ہمزہ تاء میں مدغم نہیں ہوتا۔ جو ہری فرماتے ہیں اتخاذا باب افعال کا مصدر ہے۔ الاخذ سے مشتق ہے لیکن ہمزہ کی تلمیح اور یاہ کوتا ہے بدلنے کے بعد ادغام کیا گیا ہے، یعنی پہلے ہمزہ کو ماقبل مسکور ہونے کی وجہ سے یاہ سے بدلایا گیا پھر یاہ کوتا سے بدلایا گیا کیونکہ باب افعال فاعلمہ میں واقع ہے۔ جس طرح اسر اسر سے ہے اسی طرح اتخاذا الاخذ سے ہے۔ پھر جب باب افعال میں کثرت سے استعمال ہونے لگا تو علماء کو یہ شبہ ہوا کہ تاء اصل ہے۔ پس انہوں نے اسی سے فعل یفعل بنا لیا۔ اور تلخذت بخذ کہنے لگے۔ اہل عرب کا قول علامہ جوہری کے قول کے خلاف ہے، اسی طرح الجزری نے نہایتی میں لکھا ہے۔

علیہ میں ضمیر کا مرجع ”بنانا“ ہے۔ یعنی آپ اس دیوار بنانے پر اجرت ہی طلب کر لیتے۔ اس جملہ میں عوض لینے پر براہین تھکتے کرتا ہے تاکہ وہ دونوں اس عوض سے خوراک لے کر قوت حاصل کرتے اور گزارا وقت کرتے۔ دوسرا اس جملہ میں اشارہ ہے کہ آپ نے بے مقصد کام کیا ہے۔ اس جملہ میں دلیل ہے کہ آپ نے دیوار محنت اور مشقت سے بنائی تھی اس لئے اجرت لینا جائز تھا۔ اگر مجزرہ سے کھڑی کی ہوتی تو اجرت لینا جائز نہ ہوتا۔

قَالَ هَذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ سَأُنَبِّئُكَ بِتَأْوِيلِ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَلَيْهِ حَسْرَةً ۝

”اس نے کہا (بس سنگت ختم) اب میرے اور آپ کے درمیان جدائی کا وقت آ گیا۔ لے میں آگاہ کرتا ہوں آپ کو ان باتوں کی حقیقت پر جن کے متعلق آپ صبر نہ کر سکے۔“

۱۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا یہ تیسرا اعتراض ہماری جدائی کا سبب ہے کیونکہ اس اعتراض میں ہمارے نفس کا دخل ہے، جبکہ پہلے دو اعتراض کی کیفیت اس سے مختلف تھی کیونکہ ان کی بنیاد خلاصہ دین اور دیانت پر تھی (۱) یا یہ معنی کہ یہ وقت ہماری جدائی کا وقت ہے کیونکہ آپ نے ایسا اعتراض کیا ہے جس میں خواہش نفس کا دخل ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ حد کا اشارہ اس فراق کی طرف ہو گا نصاحی کے قول سے جس کا ذکر کیا گیا تھا۔ فراق کی مہین کی طرف اضافت مظہر وف کی طرف کی طرف اضافت کی طرح ہے مجازاً ایسا ہوتا رہتا ہے۔ مفسر فرماتے ہیں میں کہتا ہوں یہ اضافت فیوی ہے۔

۱۔ حضرت خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا اب سنو جن باتوں کے ظاہر کو غیر مناسب سمجھ کر آپ خاموش نہیں رہ سکتے

۱۔ تفسیر بنوی، جلد 3 صفحہ 589 (القر)

(۱) بعض حالی سونپا نے یہ کہا ہے اور مفسر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کی اتباع میں یہ لکھ دیا ہے۔ حالانکہ ایسی بات درست نہیں کیونکہ نبی جو نبی اسرائیل کے انبیاء میں سے سب سے افضل ہیں صاحب کتاب ہیں اور انتہائی جلیل القدر ہیں ان کی شان میں یہ گستاخی ہے۔ بعض مفسرین سے ایسی غلطی ہوتی ہے جسے صاحب کشف معجزی نے بھی رد کیا ہے۔ صاحب روح المعانی نے بھی اسے بے بنیاد قرار دیا ہے۔

میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ان باتوں کا انجام خیر اور نیکی تھا۔

امام بغوی فرماتے ہیں بعض نقاسر میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام کا دامن پکڑا اور کہا قبلاً! جدا کرنے سے پہلے مجھے اپنے کاموں کی حقیقت تو بتا دو۔ تو خضر علیہ السلام نے فرمایا (1)۔

أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسْكِينٍ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَنْزَلْنَاهَا إِنْ أَعْيَبْنَا وَكَانَ
وَسَرَّ آعْنَهُمْ فَلْيَا حُدَّ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا ۝

”وہ جو کشتی تھی وہ چند غریبوں کی تھی جو (ملائی کا) کام کرتے تھے دریا میں سو میں نے ارادہ کیا کہ اسے عیب دار بنا

دوں۔ ۱۔ اور (اس کی وجہ یہ تھی کہ) ان کے آگے (جابر) بادشاہ تھا جو پکڑ لیا کرتا تھا ہر کشتی کو زبردستی سے۔ ع۔“

۱۔ حضرت کعب فرماتے ہیں کہ وہ کشتی دس بھائیوں کی تھی جن میں سے پانچ اپنا تھے اور پانچ سمندر میں کام کرتے تھے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ مسکین کا اطلاق اس پر ہوتا ہے جس کے پاس مال ہو لیکن نصاب کو نہ پہنچتا ہو (2)۔ اور اس کی کفایت بھی نہ کرتا ہوں یا اس کی حاجات اصلیہ سے فارغ نہ ہو۔ وہ بھائی مل کر اس کشتی کو اجرت پر چلاتے تھے اور اپنی معیشت کا بندوبست کرتے تھے۔

۲۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا میں نے اسے عیب دار اس لئے کیا تھا کیونکہ آگے ایک بادشاہ تھا جو صحیح سلامت کشتی زبردستی لے لیتا تھا۔ وراہ ہم کا معنی امامہم (سامنے آگے) ہے جیسے ارشاد ہے قُرْنٌ ذُرِّيَّةً بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (بچھے) ہے چونکہ لوٹنا اس کے راستہ پر تھا اس لئے فرمایا وراہ ہم (ان کے بچھے) پہلا قول صحیح ہے کیونکہ ابن عباس کی قرأت مکان امامہم اس پر دلالت کرتی ہے۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ ابن عباس اسی طرح پڑھتے تھے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کو اس لئے عیب دار کیا تھا کہ ظالم بادشاہ وہ جھین نہ لے۔ اس بادشاہ کا نام جلیدی بن کر رکھا۔ محمد بن اسحاق نے اس کا نام سولہ بن جلید الازدی لکھا ہے۔ شعیب الجبائی نے بدو بن بدو ذکر کیا ہے (3)۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں کلام کے نظم کا حق تو یہ تھا کہ وکان وراہ ہم ملک پہلے ہوتا اور فَانزَلْنَاهُ إِنْ أَعْيَبْنَا متاخر ہوتا۔ کیونکہ ہمیشہ مسبب۔ سبب پر مرتب ہوتا ہے اور مسبب سبب سے متاخر ہوتا ہے۔ لیکن یہاں تعیب کا ارادہ جو مسبب ہے وہ غصب کے خوف سبب سے مقدم ہے۔ اس اسلوب بیان کی دودھ جھیں ہیں۔ 1۔ اہتمام کی وجہ سے۔ (چونکہ موسیٰ علیہ السلام کے انکار کی بنیاد کشتی کے پھانسنے پر تھی اس لئے خضر علیہ السلام نے پہلے انکار کی وجہ کو دور کیا کہ میں نے عیب دار کرنے کے لئے اس میں شگاف کیا تھا۔ غرق کرنے کے لئے شگاف نہیں کیا تھا۔ تو اس اہیت کے پیش نظر خضر علیہ السلام نے امتداد بیان کو بدل دیا۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سبب صرف صحیح کشتی کے غصب ہونے کا خوف نہیں تھا بلکہ کشتی کا مساکین کے لئے ہونا بھی عیب دار کرنے کے سبب کا جزو تھا۔ خضر علیہ السلام نے پہلے دونوں جڑوں میں سے اتوی جزو پر حکم کو مرتب فرمایا اور اتوی کی رعایت فرمائی اور پھر بطور تقید و تعیم دوسرے جزو کو ذکر فرمایا۔

امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے قوم کے سامنے عیب دار کرنے کا نذر پیش کیا اور ظالم بادشاہ کے متعلق بتایا، جبکہ پہلے انہیں اس بادشاہ کے متعلق معلوم نہ تھا۔ فرمایا میں نے اس کو عیب دار کرنے کا اس لئے ارادہ کیا تھا کہ جب یہ اس ظالم بادشاہ کے پاس سے گزرے تو وہ اس کے عیب کی وجہ سے اسے چھوڑ دے اور جب وہ بادشاہ سے آگے گزرے تو انہوں نے کشتی کو

درست کر لیا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ انہوں نے ایک شیشی سے اس کا سوراخ بند کر دیا۔ بعض فرماتے ہیں تار کول سے بند کیا تھا (۱)۔ میں کہتا ہوں امام بخاری کی نقل کردہ روایت کی قرآن کا اسلوب بیان موافقت نہیں کرتا کیونکہ آیت قرآنیہ میں صراحت کے ساتھ ہے کہ خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام پر یہ حکمت کشی سے اتنے بچے کو قتل کرنے اور دیوار کو درست کرنے کے بعد طلحہ گدی کے وقت بتائی تھی۔ اگر خضر علیہ السلام نے کشی والوں کے سامنے پہلے ہی یہ عذر پیش کر دیا ہوتا اور حکمت بتا دی ہوتی تو موسیٰ علیہ السلام پر یہ حکمت سختی نہ ہوتی کیونکہ آپ بھی تو کشی میں ساتھ تھے اور دوبارہ اس حکمت کو موسیٰ علیہ السلام کے سامنے بیان کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

وَأَمَّا الْعِلْمُ فَكَانَ أَبَوَاكَ مُؤْمِنِينَ فَحَسِبْنَا أَنَّ نَبِيَّ رَبِّهِمَا طَاعِيَانَا وَنُفَرَانَا

”اور وہ جو لڑکا تھا تو (اس کی حقیقت یہ ہے کہ) اس کے والدین مومن تھے پس ہمیں اندیشہ ہوا کہ وہ (اگر زندہ رہا تو)

مجبور کر دے گا انہیں سرکشی اور کفر پر۔ ج۔“

یعنی بچے کے والدین ایسا علماء تھے، ہمیں اندیشہ ہوا کہ یہ بچہ اپنی نافرمانی اور بد کرداری سے ان پر سرکشی اور کفر کی بدنامی چادر نہ بچھا دے۔ اور ان کو شر اور مصیبت میں گرفتار نہ کر دے۔ یا یہ معنی کہ ان کے ایمان کے ساتھ اپنی سرکشی اور کفر کو مٹانے سے اور ایک ہی گھر میں دو مومن اور ایک کافر کو شریعت جمع نہ ہو جائیں۔ یا یہ معنی کہ ہمیں اندیشہ ہوا کہ غالب آ کر انہیں تکلیف دے گا اور اس کی گمراہی کی وجہ سے وہ مرتد ہو جائیں گے یا غلبہ محبت کی وجہ سے اس کی سرکشی اور کفر پر اس کی مدد کر کے مرتد ہو جائیں گے۔

سعید بن جبیر فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ ہمیں خوف ہوا کہ اس کی محبت والدین کو اس کافر کے دین کی پیروی پر برا ہیجتہ کرے گی (۲)۔ حضرت خضر علیہ السلام کو یہ اندیشہ وحی کے ذریعے سے معلوم ہوا تھا۔ ابن ابی شیبہ نے زید بن ہریر عن ابن عباس کی سند سے روایت کیا ہے کہ خیرہ الخردی نے حضرت ابن عباس کو خط لکھا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ایک بچہ کو کیسے قتل کیا تھا؟ حالانکہ نبی کریم ﷺ نے بچوں کے قتل سے منع فرمایا ہے۔ حضرت ابن عباس نے جواباً لکھا کہ اگر بچوں کا حال تمہیں بھی موسیٰ علیہ السلام کے عالم ساتھی کی طرح معلوم ہو جائے تو تیرے لئے قتل کرنا جائز ہوگا، یعنی حضور نبی کریم ﷺ کی نبی عام مسلمانوں کے لئے ہے جن کی طرف وحی نہیں کی جاتی۔ تاکہ ان کو بچوں کی حالت کا علم حاصل ہو۔ اور وحی کا سلسلہ اب نبی کریم ﷺ کے بعد ختم ہو چکا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی نبی خضر علیہ السلام اور ان جیسے دوسرے افراد کے لئے نہیں ہے جنہیں وحی کے ذریعے چیزوں کا علم عطا کیا جاتا ہے۔ بلکہ آپ کی نبی عام مؤمنین کے لئے ہے جن پر وحی نہیں آتی۔ واللہ اعلم۔

اگر یہ کہا جائے کہ اس کلام کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ جانتا تھا کہ اگر یہ بچہ زندہ رہا تو کافر اور سرکش ہوگا اور مفرض تحقیق غلامِ نذرندہ رہا، نہ اس نے کفر کیا اور نہ سرکشی کی کیونکہ خضر علیہ السلام نے اسے قتل کر دیا تھا۔ اور علم ہمیشہ معلوم کے تابع ہوتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ خارج میں علم کے مصداق کو معلوم پایا جائے۔ پس اس مسئلہ میں اس علم کی صحت کیسے منظور ہوگی۔ جبکہ معلوم پایا ہی نہیں گیا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے اسے پہلے ہی قتل کر دیا تھا۔ اس سوال کے جواب میں یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اشیاء کا وجود علم الہی کے تابع ہے، جبکہ بندوں کا علم اشیاء کے تابع ہوتا ہے۔ کیونکہ علم وہاں بھی معلوم کے تابع ہے اور اس سے مستفاد ہے۔ یہ جواب اس لئے نفع بخش نہیں کیونکہ علم خواہ معلوم کے تابع ہو یا معلوم کا متبوع ہو، علم و معلوم کی مطابقت ضروری ہوتی ہے اور ایک کا دوسرے سے تخلف نہ ہونا بھی ضروری

ہے، پس جب غلام ہی زندہ نہ رہا اور اس نے کفر کا ارتکاب ہی نہ کیا تو واقع میں تقضیہ کے تحقق کا نہ ہونا ظاہر ہو گیا۔ پس علم الہی کا تعلق تقضیہ کے ساتھ جائز نہیں ہے تاکہ واقع کے ساتھ علم کی مطابقت کا نہ ہونا لازم نہ آئے (یعنی ایسا معلوم جس کا خارج میں وجود ہی نہیں ہے اس کے ساتھ علم الہی کا صحیح تعلق کیسے ممکن و متصور ہوگا)۔ اس کا صحیح جواب وہ ہے جو شبہ کو جڑ سے ختم کر دیتا ہے کہ تقضیہ شرطیہ کا صدق اور اس کے ساتھ علم کا تعلق واقع میں مقدم کے لئے تالی کے لزوم کا تقاضا کرتا ہے (یعنی مقدم اور تالی میں علاقہ لزوم پایا جائے) تقضیہ شرطیہ کا وجود دونوں طرفوں (مقدم و تالی) کے پائے جانے کا مقتضی نہیں ہوتا (یعنی مقدم اور تالی کا پایا جانا ضروری نہیں۔ علاقہ لزوم ضروری ہے اگر وہ پایا جائے گا تو تقضیہ شرطیہ صحیح ہوگا) مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَوْ كَانَ فِيْهِمْ آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا۔ یہ تقضیہ شرطیہ ہے اور سچا ہے مقدم بہت سے خدا) کے نہ پائے جانے کے باوجود اس سے علم متحقق ہے۔ پس اس علم کا مقتضی بچہ کے باقی رہنے کی صورت میں بچہ کے کفر کا لزوم ہے۔ اس سے اس کے تعلق کا احتمال نہیں (یعنی بچہ کا نہ پایا جانا اس کا کفر نہ کرنا تقضیہ شرطیہ کی سچائی کے لئے مانع نہیں۔ کیونکہ مقدم اور تالی کے درمیان علاقہ لزوم پایا جاتا ہے)۔ ایک دوسری مثال سے سمجھئے ہم کہتے ہیں اگر سورج طلوع ہوگا تو دن موجود ہوگا۔ پس یہ تقضیہ شرطیہ سورج کے طلوع ہونے کی صورت میں دن کے وجود کے لزوم کا تقاضا کرتا ہے سورج کے طلوع ہونے یا دن کے وجود کا تقاضا نہیں کرتا۔ (اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ بچہ زندہ رہے گا تو کفر کرے گا تقضیہ شرطیہ صحیح ہے اور اس سے علم متحقق ہوتا ہے) اور اللہ اعلم۔

اگر یہ کہا جائے کہ ایک چیز کا دوسری چیز کے لئے لزوم اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ دونوں چیزوں میں سے ایک چیز دوسری کے لئے علت تامہ ہو۔ یا وہ دونوں چیزیں معلول ہوں اور ایک تیسری چیز دونوں کے لئے علت تامہ ہو۔ پس بچہ کے زندہ رہنے کی صورت میں اس کے کفر کے لزوم کی وجہ کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس لزوم کی وجہ ہے جو صوفیاء کرام نے بیان فرمائی ہے کہ خارج میں تمام اشیاء کے وجود ان اعیان ثابتہ کے عکس اور ظہل ہیں جو اللہ تعالیٰ کی صفات کے پرتو ہیں۔ جب اعیان ثابتہ علم کے مرئیہ ہیں تو اسی لئے صوفیاء فرماتے ہیں۔ معلوم علم کے تابع ہے۔ پھر صفات الہیہ اللہ تعالیٰ کے ہادی اور مفضل ہونے کی طرف رابع اور تقسیم ہوتی ہیں۔ پس وہ اشیاء جن کا مبداء تعین ہدایت ہے ان کے وجود کے لئے ہدایت کا ظہور لازم ہے۔ ان کا خاتمہ یقیناً سعادت پر ہوگا (یعنی جس شخص پر صفت الہیہ ہادی کا عکس پڑے گا تو یقیناً اس سے ہدایت نصیب ہوگی اور اس کا خاتمہ بالآخر ہوگا) اور وہ چیزیں جن کا مبداء تعین صفت ضلالت ہو تو ان کے وجود کے لئے شقاوت کا ظہور لازمی ہوگا۔ اور ان کا خاتمہ شقاوت پر ہوگا۔ ان چیزوں سے ہدایت متصور ہی نہیں ہو سکتی۔ (یعنی جس شخص پر اس کی صفت ضلالت کا سایہ عکس پڑے گا وہ یقیناً بد بخت ہوگا) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد مَحْلٌ مُّبْتَدِئٌ لِّمَا خُلِقَ لَدُوْهُ۔ (ہر ایک کے لئے وہ آسان کر دیا جاتا ہے جو اس کے لئے پیدا کیا گیا ہے) کا یہی مطلب ہے۔ پس جو اہل سعادت سے ہوگا اس کے لئے سعادت کے اعمال آسان کر دیئے جائیں گے اور جو اہل شقاوت سے ہوگا اس کے لئے اہل شقاوت کے اعمال آسان کر دیئے جائیں گے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حدیث مشفق علیہ ہے۔ اور حضرت علی سے مروی ہے۔ پس اس بچہ کی کفر پر پیدائش کا مطلب یہ ہے کہ اس کا مبداء تعین صفت ضلال تھی (اس لئے اس نے بڑا کور بھی گمراہ ہی رہنا تھا) پس اس میں گمراہی کے اثر کے ظہور سے پہلے بچپن میں اس کا وفات پا جانا اس کے لئے اور اس کے والدین کے لئے بہتر تھا۔ اور یہ اس کے والدین پر اللہ کی طرف سے مہربانی اور بندہ نوازی تھی۔ اس طرح نہیں جیسا کہ معتزلہ کہتے ہیں کہ جو کام بندے کی اصلاح کا باعث ہے اس کا کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے کیونکہ اگر اس طرح

معاہد ہوتا تو کوئی کافر بھی نہ پایا جاتا کیونکہ اس کا بچپن میں اللہ تعالیٰ پر ماننا واجب ہوتا۔ واللہ اعلم۔

فَأَسَدًا أَنْ يَبْدُلَهُمَا خَيْرًا مِنْهُمَا خَيْرٌ لَكُمْ وَأَقْرَبُ مَرَحًا ﴿٣﴾

”پس ہم نے چاہا کہ بدل دے انہیں ان کا رب (ایسا بنا) جو بہتر ہو اس سے پاکیزگی میں اور (ان پر) زیادہ مہربان ہو۔“

لہذا خدا کا معنی شاید یہ ہو کہ ہم نے خواہش کی اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ کیونکہ بندے کے ارادہ کا تعلق اللہ کے فعل سے ممکن نہیں ہے حضرت خضر علیہ السلام نے یہاں ارادہ کی نسبت اپنی طرف بھی کی ہے اور جمع کا صیغہ ذکر کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف بھی کی ہے کیونکہ تبدیلی غلام کے ہلاک کرنے اور اللہ تعالیٰ کے اس کا بدل عطا کرنے کے ساتھ ہوتی ہے۔ ہلاک کرنا خضر علیہ السلام کے کب سے پایا گیا اور ایجاد خاصہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا۔ پس دونوں نسبتیں صحیح ہیں۔ ابو جعفر نافع اور ابو عمرو نے باب تفصیل سے تشدید کے ساتھ تبدیل پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے باب افعال سے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ دونوں کا معنی ایک ہے۔ بعض علماء نے تبدیل اور ابدال کے معنی میں فرق کیا ہے۔ فرماتے ہیں تبدیل یہ ہے کہ کسی چیز کا مین قائم ہو اور اسکی حالت کو بدل دیا جائے اور ابدال یہ ہے کہ ایک چیز کو اٹھا دینا اور دوسری چیز کو اس کے قائم مقام رکھنا (1)۔ میں کہتا ہوں اس فرق کی کوئی حقیقت نہیں ہے کیونکہ اگر معاملہ اس طرح ہوتا تو دونوں قراءتوں کا جمع کرنا متصور نہ ہوتا، جبکہ دونوں قراءتیں متواتر بھی ہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس بیٹے کا بدل ایک بیٹا عطا فرمائے گا جو گناہوں کی غلامت سے پاک ہو اور برے اخلاق سے منزہ ہو۔ اور والدین پر زیادہ مہربان ہو۔ ابن عامر ابو جعفر اور یعقوب نے رحمنا کو عا کے ضمہ کے ساتھ، جبکہ دوسرے قراء نے عا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں رحمنا رحم اور قرابت سے ہے۔ قواد نے یہ معنی کیا ہے صلہ رحمی کرنے والا اور والدین سے حسن سلوک سے پیش آنے والا ہو۔ ذکوۃ اور رحمنا پر نصب تہیز ہونے کی بناء پر ہے اور ان کا عامل اسم تفضیل خیر اور اقرب ہیں۔ امام بغوی نے نکلی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بچے کے بدلہ میں انہیں ایک بیٹی عطا فرمائی جس سے ایک نبی نے شادی کی تھی پھر اس سے ایک نبی پیدا ہوا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ایک امت کو اس کے ذریعے ہدایت عطا فرمائی تھی (2)۔

حضرت جعفر بن محمد رحمۃ اللہ علیہما سے مروی ہے فرمایا اللہ نے انہیں ایک بیٹی عطا فرمائی تھی۔ جس سے ستر نبی پیدا ہوئے تھے۔ ابن جریر نے لکھا ہے کہ ایک مسلمان بچہ عطا فرمایا تھا (3)۔

ابن ابی شیبہ ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے عطیہ سے اس طرح نقل کیا ہے۔ ان کو بیٹی عطا کی گئی تھی جس نے نبی کو جنتا تھا (4)۔

ابن المنذر نے ابن عباس سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ ابن المنذر نے بطام بن جمیل عن یوسف بن عمر کے طریق سے اس طرح روایت کیا ہے کہ اللہ نے بیٹے کی جگہ بیٹی عطا فرمائی تھی جس نے کنی انبیاء کو جنم دیا تھا (4)۔ امام بخاری نے اپنی تاریخ میں ترمذی حاکم نے حضرت ابو درداء کے واسطے سے نبی کریم ﷺ سے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ مطرف فرماتے ہیں اس بچہ کی پیدائش پر والدین خوش ہوئے تھے اور اسکے قتل پر غمگین ہوئے تھے۔ اگر وہ بچہ زندہ رہتا تو اس کے ہاتھوں دونوں ماں باپ کی ہلاکت ہوتی۔ پس انسان کو راضی بقضاء الہی ہونا چاہئے کیونکہ ناپسندیدہ امر میں مومن کے لئے قضاء الہی بہتر ہوتی ہے نسبت

پسندیدہ امر کے (1)۔ میں کہتا ہوں پسندیدہ اور ناپسندیدہ ہر امر میں انسان کو اللہ تعالیٰ کی آزمائش سے ڈرنا چاہئے اور اس سے پناہ طلب کرے، اس کی رحمت کی امید رکھے۔ ہر صورت میں قضاء الہی سے خوش اور رضی رہے اعتراض کی زبان نہ کھولے۔

وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزٌ لَهُمَا وَكَانَ
أَبُوهُمَا صَالِحًا فَآذَرَ رَبَّهُمْ أَنْ يَتَّبِعَا أَهْلَهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا فَأَرْحَمَهُ
رَبُّهُمَا بِرَحْمَةٍ عَنَّا وَأَمْرِي ذَلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا ۝۱۰

”باقی رہی دیوار (تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ) وہ شہر کے دو یتیم بچوں کی تھی اور اس کے نیچے ان کا خزانہ (ذہن) تھا۔ اور ان کا باپ بڑا نیک شخص تھا۔ پس آپ کے رب نے ارادہ فرمایا کہ وہ دونوں بچے اپنی جوانی کو بچھیں اور نکال لیں اپنا وہ خزانہ۔ یہ (ان پر) ان کے رب کی خاص رحمت تھی۔ اور (جو کچھ میں نے کیا) میں نے اپنی مرضی سے نہیں کیا یہ حقیقت ہے ان امور کی جن پر آپ سے صبر نہ ہو سکا۔“

امام بخاری نے ان یتیم بچوں کے نام اصم اور صمیم لکھے ہیں (3) اور وہ خزانہ بقول مکررہ کوئی مال تھا۔ بخاری نے اپنی تاریخ میں اور ترمذی حاکم نے ابی الدرداء کے حوالے سے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ وہ مال سونا اور چاندی تھا (4)۔ طبرانی نے ابی الدرداء سے اس آیت کے تحت روایت کیا ہے کہ پہلے لوگوں کے لئے سونا چاندی حلال تھے اور مال نسیئت حرام تھا اور ہمارے لئے غنایم حلال ہیں اور سونا چاندی (مردوں کے لئے) حرام ہے۔ میں کہتا ہوں سونے چاندی کے ہم پر حرام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہم سونے چاندی کو خزانہ کریں اور ان کی زکوٰۃ ادا نہ کریں تو ہم پر حرام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَتَّبِعُونَ مَقَالِدَ اللَّهِ يُغَشَّوْهُمْ فِيهَا نَارُ اللَّهِ أَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدًا وَيَا بَأْسًا لِلَّذِينَ يُكْنِزُونَ وَاللَّهُ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ شَهِيدٌ انہیں خوشخبری سنا دیجئے درناک عذاب کی۔

حضرت ابن عباس اور ابن عمر نے فرمایا ہر وہ مال جس کی زکوٰۃ ادا کی گئی ہو وہ کنز کے زمرہ میں نہیں آتا اگرچہ وہ مدفون بھی ہو۔ اور ہر وہ مال جس کی زکوٰۃ ادا نہ کی گئی ہو وہ کنز ہے اگرچہ مدفون نہ بھی ہو۔ شاید اس وقت اس شہر والوں پر زکوٰۃ واجب نہ ہو اس وجہ سے فرمایا گیا اَجَلْتُ لَهُمُ الْكُفْرَ کہ ان کے لئے کنز حلال تھے۔ امام بخاری نے لکھا ہے کہ سعید بن جبیر سے مروی ہے، فرماتے ہیں کنز سے مراد ایک صحیفہ ہے جس میں علم (کا خزانہ) تھا (5)۔ حاکم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے اور اس اثر کو صحیح بھی کہا ہے کہ وہ خزانہ نہ سونا تھا، نہ چاندی تھا بلکہ علم کے صحائف (کتابیں) تھے۔ ابن ابی حاتم نے ربیع بن انس سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ امام بخاری نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابن عباس سے مروی ہے کہ وہ ایک سونے کی تختی تھی جس پر لکھا تھا کہ تعجب ہے اس شخص پر جو موت پر یقین بھی رکھتا ہے اور پھر وہ خوش رہتا ہے حیرت ہے اس شخص کے لئے جو تقدیر پر یقین بھی رکھتا ہے تو تمکانات کیسے برداشت کرتا ہے۔ تعجب ہے اس شخص کے لئے جو روزق کے ملنے کا یقین رکھتا ہے تو اپنے آپ کو مشقت میں کیسے ڈالتا ہے۔ تعجب ہے اس شخص کے لئے جو حساب کا یقین رکھتا ہے تو غافل کیسے ہوتا ہے۔ تعجب ہے اس پر جو دنیا کی زوال پذیری کا یقین رکھتا ہے تو دنیا پر مطمئن کیسے ہوتا ہے۔ لا الہ

1- الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 431 (اعلیٰ) 2- ایضاً صفحہ 430 3- تفسیر بخاری، جلد 3، صفحہ 591 (المنکر) 4- جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 591 (المنکر) 5- جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 144 (ذرات لتعلیم)

إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ - اور دوسری جانب یہ لکھا تھا اَنَا اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا وَخَدَيْتُ لَا شَرِيكَ لِي خَلَقْتُ اللَّخْمِيرَ وَالشَّرْفُ لِي لِمَنْ خَلَقْتُهُ لِلْخَبِيرِ وَأَجْرِيَتُهُ عَلَيَّ يَذِيهِ وَيَبَلِّغُنِي خَلَقْتُهُ لِلشَّرِّ وَأَجْرِيَتُهُ عَلَيَّ يَذِيهِ (1)

”میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی الٰہ نہیں میں وحدہ لا شریک ہوں میں نے ہی خیر و شر کو پیدا فرمایا مبارک ہوا ہے جسے میں نے خیر کے لئے پیدا فرمایا اور اس کے ہاتھوں خیر کو جاری فرمایا اور ہلاکت ہے اس کے لئے جسے میں نے برائی کیلئے پیدا فرمایا اور اس کے ہاتھوں برائی کو جاری کیا۔“

بزار نے بھی اسی طرح ضعیف سند کے ساتھ ابو ذر سے مرویاً نقل کی ہے لیکن مختصر ہے۔ انفرادی نے قبح الجرم میں ابن عباس سے متوفی نقل کی ہے۔ ابن مردودہ نے حضرت علی سے مرویاً نقل کی ہے۔ بزار نے ابی ذر سے مرویاً روایت کی ہے۔ زجاج کہتے ہیں کفر کا لفظ جب مطلق بولا جائے تو مال کا خزانہ مراد ہوتا ہے اور تھکید کی صورت میں یہ کہنا جائز ہے کہ اس کے پاس علم کا خزانہ ہے۔ وہ سختی ان دونوں چیزوں (مال اور علم) کی جامع تھی کیونکہ وہ خود سونے کی تھی اور اس پر علم کے شاہکار ہے (2)۔

2۔ اور ان تیسویں بچوں کا باپ ایک نیک آدمی تھا جس کا نام کااش تھا۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ ابن عباس نے فرمایا اپنے باپ کے تقویٰ اور صلاح کی وجہ سے ان تیسویں کے مال کی حفاظت کی گئی تھی (3) یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت علیہ السلام کو دیوار کی اصلاح کرنے کا حکم دیا تھا تاکہ بچوں کا خزانہ محفوظ رہے اور یہ بندہ نوازی اور شفقت و رحمت صرف ان کے باپ کے نیک اور صالح ہونے کی وجہ سے تھی۔ محمد بن المنکدر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندے کی صلاح اور تقویٰ کی وجہ سے اس کی اولاد اولاد کی اولاد اور اس کے خاندان کی حفاظت فرماتا ہے اور جب تک وہ نیک صالح بندہ کسی مقام پر حکومت پذیر رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے پڑوسیوں کی بھی حفاظت فرماتا ہے۔ سعید بن مسیب فرماتے ہیں میں نماز پڑھتا ہوں تو مجھے اپنے بچے یاد آجاتے ہیں اور میں اپنی نماز میں اضافہ کرتا ہوں (4)۔

بعض علماء فرماتے ہیں ان تیسویں بچوں اور ان کے نیک باپ کے درمیان برکت پشتوں کا واسطہ تھا۔ ابن ابی حاتم نے بقیۃ عن سلیمان بن علی ابی سلمہ کے طریق سے نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں تو رات میں لکھا ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی اپنے نیک بندے کی وجہ سے سات صدیوں (یعنی سات پشتوں) تک حفاظت فرماتا ہے اور کسی ایک کی تم شکاری اور کارستانی کی وجہ سے سات نسلوں کو ہلاک کرتا ہے (5)۔

اس آیت کریمہ میں دلیل ہے کہ مؤمنین پر حق ہے کہ وہ نیک لوگوں کی اولاد کی دیکھ بھال کریں جب تک کہ ان سے سرکشی اور کفر کا صدور نہ ہوگا اور ان سے دین سے انحراف اور کفر کا صدور ہو تو سزا کے بھی زیادہ مستحق ہیں جیسا کہ سابقہ آیت اس قول کی دلیل ہے اما الغلام فکان ابواہ مومنین الایہ۔ یعنی نیک والدین کا بیٹا مجرم اور طاشی تھا تو حضرت خضر علیہ السلام نے حکم الٰہی سے قتل کی سزا دی۔

سے یعنی رب کریم نے ان کے بلوغت اور جوانی کی عمر کو پہنچنے کا ارادہ فرمایا۔ رشک کی عمر سے مراد بقول بعض علماء اٹھارہ سال ہے اور میرے نزدیک چالیس سال ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے حَقِّيْ اِذَا يَدْبَعُ اَشْدُّ وَاَوْ يَدْبَعُكُمْ اَنْرَبِيْعِيْنَ سَنَةً۔ ترجمہ: یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری قوت کو پہنچا اور چالیس برس کا ہو گیا۔ ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا صحیح اور طابو ہر مذہب بچیس سال ہے کیونکہ جب بیوقوف کم عقل شخص بچیس سال کا ہو جائے تو امام صاحب سے نزدیک اس کا مال اس کے حوالہ کر دیا جائے گا۔ ارشاد ہے قَانَ اَنْسَلْمُ وَنَهْمُ رُشْدًا قَادَقَعُوْا اِلَيْهِمْ اَمَوْا اِلَيْهِمْ۔ پس اگر محسوس کرو تم ان میں دانائی تو لو نادوانہیں ان کے مال۔

سے درحمتہ پر نصب یبیلغا کے فاعل سے حال ہونے کی بنا پر ہے یا مصدر ہونے یا مفعول لہ ہونے کی بنا پر ہے کیونکہ خبر کا ارادہ رحمت

ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں رحمۃ کا تعلق فعل مذبذوف سے ہے جس کی تقدیر یہ ہے فَعَلْتُ مَا فَعَلْتُ رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اولاً ارادہ کی نسبت حضرت خضر علیہ السلام نے اپنی طرف کی اور فرمایا فاعل ان اعیبھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عیب کرنے کا عمل براہ راست آپ کے ساتھ تھا۔ اور دوسری صورت میں ارادہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بھی کی اور اپنی طرف بھی کی فرمایا فاعل ان یُؤیّبہم لہمنا مریضاً یخیر افضہ ذلک۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں تبدیلی غلام کے ہلاک کرنے اور اللہ تعالیٰ کے بدل پیدا کرنے کے ساتھ تھی۔ تیسری صورت میں ارادہ کی نسبت صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ فاراد ربک ان یبلغا۔ انکی وجہ یہ ہے بچوں کو حد بلوغ تک پہنچانے میں خضر علیہ السلام کا کوئی دخل نہیں تھا۔ یا ان تینوں توجیہات میں اسلوب بیان کے مختلف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ پہلا فعل چونکہ فی نفسہ شر اور مذموم تھا (کشتی توڑنا) اس لئے اس کی نسبت اپنی طرف کی اور تیسرا فعل (دیوار بنانا) سراپا خیر تھا اس لئے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کردی جبکہ دوسرا فعل غلام کو قتل کرنا اس کے دو پہلو تھے ایک کے اعتبار سے خیر تھا (والدین کو نیک اولاد ملنی تھی) اور ایک اعتبار سے شر تھا (معصوم بچے کو قتل کرنا) اس لئے جمع کا صیغہ ذکر فرما کر اللہ تعالیٰ اور اپنی طرف نسبت کر دی۔ (چرا کہ خیر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو اور شر کی نسبت اپنی طرف ہو) اہل ادب و عرفان ہمیشہ خیر و شر کے ذکر کے موقع پر ایسا ہی انداز ادب اپناتے ہیں (یا نسبتوں کے اختلاف کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ واسطوں کی طرف توجہ کرنے میں عارف کا حال مختلف ہوتا ہے) (۱) یعنی کبھی عارف کی توجہ سبب اور واسطوں کی طرف ہوتی ہے کبھی صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے جو اسباب و مسائل کو پیدا کرنے والا ہے اور کبھی واسطہ اور اللہ تعالیٰ دونوں کی طرف ہوتی ہے (واللہ اعلم۔

یہ جو کچھ تو نے مجھ سے افعال سرزد ہوتے دیکھے ہیں کشتی کا توڑنا بچہ کو قتل کرنا اور دیوار بنانا یہ سب میں نے اپنی فکر اور رائے کی بناء پر نہیں کئے بلکہ یہ سب کچھ میں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیا ہے۔ لہٰذا تسطیع اصل میں تسطیع تھا تخفیفاً تا استیعال کو حذف کیا گیا ہے۔ اس کا معنی طاقت نہ رکھنا ہے۔

علامہ بنو علی لکھتے ہیں روایت میں آیا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام سے علیحدہ ہونے لگے تو خضر علیہ السلام سے کہا جناب مجھے کوئی وصیت فرمائیے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا علم صرف لوگوں کے سامنے بیان کرنے کے لئے حاصل نہ کرو بلکہ اس پر عمل کرنے کیلئے حاصل کرو (۲)۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں خضر و کلیم علیہما السلام کے واقعہ سے چند فوائد ملتے ہیں۔

- 1۔ انسان کو اپنے علم پر غرور نہیں کرنا چاہئے۔ 2۔ اگر کوئی غیر پسندیدہ کام نظر آئے تو جھٹ سے اعتراض نہیں کر دینا چاہئے کیونکہ ہو سکتا ہے اس میں کوئی ایسی حقیقت پوشیدہ ہو جس کی اسے خبر نہ ہو۔ میں کہتا ہوں خصوصاً جب کسی عالم دین عارف کامل متقی پر پیر نگار سے کوئی غیر پسندیدہ امر نظر آئے تو اس کا فوراً انکار کرنا اور زیادہ غیر مناسب اور سوء ادب ہے جیسا کہ ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔ 3۔ ہمیشہ علم و عرفان کے موقی تلاش کرتے رہنا چاہئے (3)۔

- 4۔ استاد اور مرشد کے سامنے نہایت مجر و انکسار سے رہنا چاہئے۔ ان سے گفتگو اور بات کرتے وقت ادب کا دامن ہاتھ سے کبھی نہیں چھوٹنا چاہئے۔ 5۔ مجرم کو اپنے جرم پر توبہ کرنی چاہئے اور پھر غفور و کریم کر دینا چاہئے۔ لیکن جب مجرم سے بار بار اس فعل کا ارتکاب ہو تو

2۔ تفسیر بنو علی، جلد 3، صفحہ 592 (القر)

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کارزونی، جلد 3، صفحہ 518 (القر)

3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کارزونی، جلد 3، صفحہ 581 (القر)

اس سے علیحدگی اختیار کرنی چاہئے۔

امام بغوی فرماتے ہیں علماء کا اختلاف ہے کہ حضرت علیہ السلام بعید حیات ہیں یا موت کا ذائقہ چکھ چکے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں حضرت خضر اور الیاس علیہما السلام زندہ ہیں اور ہر سال حج کے موقع پر ملاقات کرتے ہیں اور حضرت علیہ السلام کی زندگی کا سبب یہ ہے کہ آپ نے آب حیات پی لیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ذوالقرنین بادشاہ آب حیات کی تلاش میں تاریکی کے اندر داخل ہوا تھا اور حضرت علیہ السلام ان کے آگے آگے تھے۔ حضرت علیہ السلام آب حیات کے چشمہ پر پہنچ گئے تھے، آپ نے اس سے غسل بھی کیا تھا۔ اسے نوش بھی فرمایا تھا اور اللہ تعالیٰ کے شکر کے لئے نوازل بھی پڑھے تھے۔ لیکن ذوالقرنین پیچھے سے راستہ بھول گیا تھا اور واپس لوٹ آیا تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ حضرت علیہ السلام کا وصال ہو گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَا جَعَلْنَا لِكُلِّ قَوْمٍ مِّثْرًا إِلَّا مِقْدَارًا۔

ایک دفعہ عشاء کی نماز کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے تمہاری یہ رات (ایلیہ القدر) دکھائی گئی ہے، آج جو لوگ سطح زمین پر زندہ ہیں سو سال بعد کوئی ایک بھی زندہ نہ رہے گا (۱)۔ میں کہتا ہوں صاحب الحسین نے اتقویٰ میں یہ ذکر کیا ہے، مستدرک للحاکم میں حضرت انس سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا تو ایک شخص آیا جس کی داڑھی سفید تھی۔ جسم صبیح (ریخ) تھا۔ وہ لوگوں کی گردنیں چھلانگ کر آگے آیا اور رونے لگا پھر صحابہ کرام کی طرف متوجہ ہو کر یوں خطاب فرمایا اللہ تعالیٰ ہر مصیبت پر تسلی دیتا ہے۔ ہر فوت شدہ کا نعم الہدیل عطا فرماتا ہے۔ اور ہر ہلاک ہونے والے کا جائزین بناتا ہے پس تم لوگ اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور اس کی طرف رغبت کرو، وہ تمہیں اس مصیبت میں گرفتار دیکھ رہا ہے۔ دیکھو وہ کہ اس شخص پر ہے جس کی کمی کو پورا نہیں کیا جاسکتا۔ یہ خطاب کرنے کے بعد وہ شخص واپس چلا گیا۔ حضرت ابو بکر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہ حضرت علیہ السلام تھے۔

اولیاء کرام کی حضرت علیہ السلام سے ملاقاتیں اور ان سے فیض یاب ہونے کی روایتیں مشہور ہیں۔ آپ کی زندگی پر یہ سب باتیں دلیل ہیں۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ اگر حضرت علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں زندہ ہوتے تو وہ آپ کی صحبت سے جدا نہ رہتے کیونکہ آپ ﷺ تمام لوگوں کی طرف مبعوث کئے گئے تھے۔ اسی وجہ سے حضور علیہ السلام نے فرمایا اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو میری اتباع کے سوا انہیں کوئی گنجائش نہ ہوتی۔ اس حدیث کو امام احمد اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت جابر سے روایت کیا ہے۔ فرمایا عیسیٰ بن مریم آسمان سے اتریں گے اور مسلمانوں کے ایک شخص (مہدی علیہ السلام) کی اقتداء کریں گے اسی طرح مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اور جابر سے روایت کی ہے۔

اس مسئلہ کا حل حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کے بغیر ممکن نہیں۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق پوچھا گیا کہ وہ زندہ ہیں یا وفات پا گئے ہیں تو وہ حقیقت حال کے انکشاف کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں متوجہ ہوئے۔ حضرت مجدد نے دیکھا کہ حضرت علیہ السلام ان کے سامنے کھڑے ہیں، آپ نے ان سے ان کی حقیقت حال دریافت کی تو آپ نے فرمایا میں اور الیاس زندوں میں سے نہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ہماری رجوں کو اسی قوت بخشی ہے جس سے ہم مجسم ہو جاتے ہیں اور زندہ لوگوں جیسے کام کرتے ہیں مثلاً جب اللہ تعالیٰ چاہے تو ہم گمراہوں کی راہنمائی کرتے ہیں، مصیبت زدوں کی مدد کرتے ہیں۔ علم لدنی کی تعلیم دیتے ہیں اور جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا جو ارادہ ہو وہ روحانی نسبت بھی عطا کرتے ہیں۔ اولیاء اللہ میں سے جو قطب مدار ہوتا ہے ہمیں اس کا معاون بنایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جسے مدار عالم بنایا ہے اس کی برکت سے عالم کی بقاء ہے۔ اس زمانہ میں یمن

کے ایک بزرگ قطب مدار ہیں جو مذہبِ شافعی ہیں۔ ہم ان کے ساتھ شافعی مذہب کے مطابق نماز ادا کرتے ہیں۔ اس کشف صحیح سے مختلف اقوال کا اختلاف اٹھ جاتا ہے اور اشکال ختم ہو جاتا ہے۔ سب تعریضیں اللہ کیلئے ہیں جو بلند والا ہے۔

وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ ذِي الْقُرْنَيْنِ قُلْ سَأَتْلُو عَلَيْكُمْ مِنْهُ ذِكْرًا ۝۱۱

”اور وہ دریافت کرتے ہیں آپ سے ذی القرنین کے متعلق۔ یہ فرمائیے میں ابھی بیان کرتا ہوں تمہارے سامنے اس

کا حال۔“

۱۔ یہودی یا مشرکین مکہ آپ سے آزمائش کی خاطر ذی القرنین کے متعلق پوچھتے ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں اسکے نام کے متعلق اختلاف ہے، بعض علماء نے فرمایا اس کا نام مرزبان بن مرزبادیثانی ہے جو یافث بن نوح علیہ السلام کی نسل سے تھا (1)۔ بعض نے اس کا نام اسکندر بن قیس بن بلیطیس الرومی ذکر کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ دوسرا قول اصح ہے کیونکہ ابن اسحاق ابن المہدی راہن ابی حاتم اور الشیرازی نے الاقصاب میں اور ابو یوسف نے وہب بن منبہ الہمدانی سے روایت کیا ہے اور وہب تاریخی باتوں کا بہت بڑا عالم تھا۔ انہوں نے فرمایا ذی القرنین روم کا ایک شخص تھا جو ایک بوڑھی عورت کا بیٹا تھا۔ جس کی ذوالقرنین کے علاوہ اور کوئی اولاد نہ تھی۔ اور اس کا نام اسکندر تھا۔ ابن منذر نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا اسکندر ہی ذوالقرنین ہے (2)۔

امام بغوی فرماتے ہیں اس کی نبوت میں بھی اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ نبی تھا۔ ابو الطفیل فرماتے ہیں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا گیا ذوالقرنین نبی تھا یا بادشاہ۔ آپ نے فرمایا وہ نبی تھا نہ بادشاہ لیکن وہ ایسا بندہ تھا جو اللہ سے محبت کرتا تھا اور اللہ اس سے محبت کرتا تھا۔ وہ اللہ کے لئے پر غلص تھا اور اللہ اس کے خلوص کی قدر دانی فرماتا تھا (3)۔ میں کہتا ہوں اسی طرح ابن مردود نے سالم بن ابی الجعد سے روایت کیا ہے کہ حضرت علی سے ذوالقرنین کے متعلق پوچھا گیا کہ کیا وہ نبی تھے تو آپ نے فرمایا میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا بندہ تھا جو پیکرِ اخلاص تھا اور اللہ تعالیٰ اس کے اخلاص کی قدر فرماتا تھا (4)۔

امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک شخص کو سنا کہ وہ دوسرے کو ذوالقرنین کے لقب سے پکار رہا تھا۔ آپ نے فرمایا پہلے تم نے انبیاء کرام کے اسماء کے ساتھ اپنے نام رکھے، اس پر بھی اکتفاء نہ کیا حتیٰ کہ تم نے فرشتوں کے اسماء کے ساتھ نام رکھنے شروع کر دیے ہیں (5)۔ اکثر علماء کا خیال ہے کہ وہ نیک عادل بادشاہ تھا۔

امام بغوی فرماتے ہیں ذوالقرنین نام رکھنے کے سبب میں بھی اختلاف ہے۔ زہری فرماتے ہیں وہ سورج کے دونوں کناروں مشرق و مغرب تک پہنچتا تھا اس لئے اسے ذوالقرنین کہا جاتا تھا۔ بعض فرماتے ہیں وہ روم اور فارس کا بادشاہ تھا اس لئے اس نام سے ملقب تھا۔ بعض فرماتے ہیں وہ نور اور تاریکی میں داخل ہوا اس لئے اسے ذوالقرنین کہا جاتا تھا۔ بعض فرماتے ہیں اس لئے کہ اس نے خواب میں سورج کے دونوں کناروں کو پکڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ بعض فرماتے ہیں اس کے سر پر خوبصورت مینڈھیاں تھیں۔ بعض فرماتے ہیں اس لئے کہ اس کے سر پر دو سینک تھے جنہوں کو گھڑی کے ذریعے چھپانے رکھتا تھا (6)۔ میں کہتا ہوں ابن عبدالحکیم نے یونس بن عبیدہ اور شیرازی نے القاب میں قتادہ سے اس طرح روایت کیا ہے۔ ابو الطفیل نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اس کو ذوالقرنین اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی قوم کو تقویٰ کا حکم دیا۔ قوم نے اس کے سر کے دائیں طرف چوٹ لگائی تو وہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 593 (القر) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 438 (العلویہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 593 (القر) 4۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 435 (العلویہ) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 593 (القر) 6۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 593 (القر)

مر گیا پھر اللہ تعالیٰ نے اسے زندہ کر دیا پھر اس نے قوم کو تقویٰ کا حکم دیا تو قوم نے اس کے سر پر بانسوں کی طرف ضرب لگائی جس کی وجہ سے وہ مر گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے پھر زندہ کر دیا۔

امام احمد نے الزہد میں ابن المنذر زاین ابی حاتم اور ابو اشیح نے العظمت میں ابو الورقاء سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا ذوالقرنین کے سیلنگ کس کے تھے۔ فرمایا شاید تمہارا خیال ہے کہ اس کے سیلنگ سونے اور چاندی کے تھے۔ وہ نبی تھے، اللہ نے انہیں لوگوں کی طرف مبعوث فرمایا تھا۔ انہوں نے قوم کو اللہ تعالیٰ کی توحید کی دعوت دی تو ایک شخص اٹھا اور اس نے انکے سر کی بانسوں کی جانب ضرب لگائی جس کی وجہ سے وہ مر گئے۔ اللہ نے پھر انہیں زندہ فرمایا پھر اللہ نے انہیں لوگوں کی طرف مبعوث کیا (انہوں نے دعوت توحید دی) ایک شخص اٹھا اور ان کی جانب چوٹ لگائی اور وہ فوت ہو گئے۔ پس اللہ نے ان کا نام ذوالقرنین رکھ دیا (1)۔

۲۔ علیکم کا خطا سائل یعنی سوال کرنے والوں کو ہے۔ معنہ ذی القربین سے حال ہے یا اللہ تعالیٰ سے حال ہے۔ اور ذکر کا معنی خبر ہے۔

إِنَّا كُنَّا لَفِي الْأَرْضِ وَأَنْبِيَانَهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبِيًّا ﴿٣١﴾

”ہم نے اقتدار بخشا تھا اسے زمین میں اور ہم نے دیا تھا اسے ہر چیز (تک رسائی حاصل کرنے) کا سارو سامان ۳۔“

۱۔ یعنی ہم نے اسے زمین میں تصرف کا اختیار بخشا۔ جیسے چاہے اس میں تصرف کرے۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا اللہ نے بادل کو اس کے لئے مسخر کر دیا تھا اور اس پر وہ سوار ہوتے تھے اور اس کو سارے اسباب عطا فرماتے تھے۔ اس کے لئے نور کو پھیلا دیا تھا اس لئے دن اور رات اس کے لئے برابر روشن ہوتے تھے۔ تمکون فی الارض کا یہی مطلب ہے اور زمین میں چلنا اس کے لئے آسان کر دیا تھا اور راستے اس کے لئے ہموار کر دیئے تھے (2)۔

۲۔ سب چیزیں ہم نے اسے عطا کی تھیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ مخلوق جس جس چیز کی محتاج ہوتی ہے ہم نے وہ سب اسے عطا کر دی تھیں۔ بعض علماء نے یہ معنی لکھا ہے کہ بادشاہوں کو شہروں کے فتح کرنے اور دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لئے جس جس ہتھیار کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہم نے اسے عطا کر دی تھی۔ سبباً سے مراد علم قدرت اور آلات ہیں جن کے ذریعے وہ ہر چیز تک رسائی حاصل کرتا تھا۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت اٰلِہن نے اس کا معنی بلاغاً الٰہی حیث اودا کیا ہے، یعنی جہاں وہ پہنچنے کا ارادہ کرتا تھا ہم اسے پہنچنے کے سارے اسباب مہیا کر دیتے تھے۔ بعض فرماتے ہیں یہ مطلب ہے کہ ہم نے زمین کے کناروں کو اس کے قریب کر دیا تھا (3)۔

فَأَنْبِئِكُمْ سَبِيًّا ﴿٣٢﴾

”پس وہ روانہ ہوا ایک راہ پر۔ ۱۔“

۱۔ اہل حجاز اور یسریوں نے فاتح پڑھا ہے، یعنی تینوں مقامات پر ہنزہ وصلی اور تشدید کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے باب افعال سے ہنزہ قطعی اور تاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں ان دونوں کا معنی ایک ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ ان کے معانی کے درمیان فرق ہے۔ ہمزہ قطعی کی صورت میں اس کا معنی پالینا اور لائق ہونا ہے اور باب افتعال سے تشدید کی صورت میں اس کا معنی سار یعنی چلانا ہے۔ عرب کہتے ہیں مَا زِلْتُ اَتْبَعُهُ حَتَّى اَتْبَعُهُ یعنی میں اس کے پیچھے چلتا رہتا ہوں کہ میں نے اسے پالیا (1)۔ اسمعی سے اسی طرح مروی ہے۔ سبباً کا معنی راستہ ہے۔ ابن عباس نے اس کا معنی منزل کیا ہے۔

حَتَّى اِذَا بَدَأْتُمْ مَعْرَبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَعْرَبُ فِي عَيْنِ حَمِيَّةٍ وَوَجَدَ عِنْدَهَا
قَوْمًا قُلُوبًا اَلْقَرْنَيْنِ اِمَّا اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّا اَنْ تَسْخَدَ فِيهِمْ حُسْنًا ۝

”یہاں تک کہ جب وہ غروب آفتاب کی جگہ پہنچا تو اس نے اسے یوں پایا گویا وہ ذوب رہا ہے ایک سیاہ کچھڑ کے چشمہ میں اور اس نے وہاں ایک قوم پائی جسے ہم نے کہا اسے ذوالقرنین! (تمہیں اختیار ہے) خواہ تم انہیں سزا دو خواہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔“

۱۔ مغرب الشمس سے مراد قابل رہائش زمین کی انتہا ہے جو مغرب کی جانب تھی۔ ابو حفص زین ماحر حمزہ کسانئ اور ابو بکر نے حمیة یعنی رامیہ کے وزن پر ہمزہ کے بغیر الف کے ساتھ پڑھا ہے جس کا معنی گرم ہے، باقی قراء نے بغیر الف کے ملایہ کے وزن پر ہمزہ پڑھا ہے۔ اور یہ حممت البئر سے مشتق ہے جب کنوئیں کی مٹی سیاہ ہو جائے۔ تو حمیة کا معنی سیاہ کچھڑ ہے۔ دونوں قراءتوں کے درمیان معنوی طور پر کوئی مخالفت نہیں ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ چشمہ دونوں وصفوں کا حامل ہو (گرم بھی ہو اور سیاہ بھی ہو) اور یہ بھی جائز ہے کہ حمیة کی یا ہمزہ سے بدل کر آئی ہو کیونکہ اس کا ما قبل کسرہ ہے۔ اس صورت میں دونوں قراءتیں متحد ہو جائیں گی یعنی سیاہ کچھڑ والا چشمہ مراد ہوگا۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کعب سے پوچھا تو رات میں کیا ہے کہ سورج کہاں غروب ہوتا ہے۔ انہوں نے فرمایا ہم تو رات میں پڑھتے ہیں کہ وہ پائی اور مٹی میں غروب ہوتا ہے (2)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں شاید ذوالقرنین بحر محیط کے ساحل پر پہنچا ہو اور اسے اسی طرح نظر آیا ہو کیونکہ حد نظر تک پانی کے سوا کچھ نظر نہیں آیا ہوگا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وجدها تعرب اس نے سورج کو غروب ہوتے پایا یہ نہیں فرمایا کہ واقعی سورج غروب ہو رہا تھا۔ تمہیں نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔ (3)

۲۔ ذوالقرنین نے اس چشمہ کے پاس ایک قوم کو پایا۔ امام بیضاوی نے بعض علماء کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس قوم کا لباس وحشی جانوروں کی کھالیں تھیں اور سمندر جو کچھ باہر پھینکتا تھا وہ ان کی خوراک تھی اور وہ عقیدہ کے اعتبار سے کافر تھے (4)۔
۳۔ ہم نے ذوالقرنین کو حکم کیا کہ اس قوم کو اسلام کی دعوت دو۔ اگر یہ کفر پر اصرار کریں تو پھر تم انہیں قتل کر دو اور اگر یہ توبہ کر لیں اور اسلام قبول کر لیں تو پھر انہیں اکرام و ارشاد اور شریعت کی تعلیم دو۔ انا کا کلمہ یہاں تقسیم کیلئے ہے جیسا کہ اس اور ارشاد میں تقسیم کے لئے ہے، اِنَّمَا جَزَاؤُ الْاٰلِیْنَ یَحْمِلُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ وَیَسْمَعُوْنَ فِی الْاٰتْرِیْضِ فَسَاۤءَ اَنْ یُّسْخَدُوْا اَوْ یُفْسَدُوْا اَوْ یُنْقَطِعَ اٰیٰتُہُمْ وَاَنْ یُّجَاهَلُوْہُمْ فِیْنِیْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفُوْا مِنْ الْاٰتْرِیْضِ۔ ترجمہ: بلاشبہ سزا ان لوگوں کی جو جنگ کرتے ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور کوشش کرتے ہیں

3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کا زرونی، جلد 3، صفحہ 520 (القر)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 594 (القر)

2۔ ایضاً

4۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کا زرونی، جلد 3، صفحہ 520 (القر)

زمین میں فساد برپا کرنے کی یہ ہے انہیں جنہیں قتل کیا جائے یا سولی دیا جائے یا کاٹے جائیں ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں مختلف طرفوں سے جلا وطن کر دیئے جائیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اما کاکلمہ یہاں تھیر کے لئے ہے، یعنی ان کے فکری وجہ سے انہیں قتل کر دو یا انہیں اسلام کی دعوت دو تمہیں اختیار ہے اور ان ینخذ فیہم حسنا سے مراد یہی دعوت اسلام ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اسے قتل کرنے اور قیدی بنانے کا اختیار دیا اور قیدی بنانے کو احسان اس لئے شمار کیا کیونکہ یہ قتل کے مقابلہ میں احسان ہی ہے۔ پہلے دو قتلوں کی تائید ذیل کے ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔

قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نَعْتَبُ بِهِ عَمَلًا ۗ ﴿۱۰﴾

”ذوالقرنین نے کہا جس نے ظلم (کفر و فسق) کیا تو ہم ضرور اسے سزا دیں گے پھر اسے لونا دیا جائے گا اس کے رب کی طرف تو وہ اس سے عذاب دے گا یا اسی سخت عذاب لے“

لے ذوالقرنین کے حکم الہی کی اتباع میں یا تھیر کے بعد اسلام کی طرف انہیں دعوت دینے کا اختیار کرتے ہوئے فرمایا۔ میری دعوت اسلام کے بعد جو کفر پر اصرار کرے گا اور اپنے شرکیہ عقائد پر قائم رہے گا تو میں اور میرے ساتھی دنیا میں اسے قتل کے عذاب میں مبتلا کریں گے پھر آخرت میں رب ذوالجلال جہنم کا سخت عذاب دیں گے جس کی مثل پہلے عذاب نہ جھیلنا ہوگا۔

وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جِزَاۗءٌ اَلْحَسَنُ ۗ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اٰمْرِہٖ اَلْیَسْرَآءُ ﴿۱۱﴾

”اور جو شخص ایمان لایا اور اچھے عمل کے تو اس کے لئے اچھا معاوضہ ہے اور ہم اسے حکم دیں گے ایسے احکام بجالانے کا جو آسان ہوں گے“

لے یعنی جو ایمان لائے گا اور ایمان کے تقاضا کے مطابق عمل کرے گا تو اس کے لئے اچھا بدلہ ہے۔ جزا کسائی، یعقوب اور حفص نے جزا کو منونا اور حال کی بناء پر منصوب پڑھا ہے۔ یعنی جزا کے طور پر اس کے لئے جنت ہے۔ یا اس کے لئے بطور جزا اچھا ثواب ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ فعل مقدر کا مصدر ہے اور پھر جملہ حال یا تہیز کی بناء پر منصوب ہے، جبکہ باقی قراء نے لغیر توین کے مضاف کر کے مرفوع پڑھا ہے۔ اس قرأت پر الحسنى سے مراد اعمال حسنة ہیں، یعنی اس کے لئے اچھے اعمال کی جزا ہے یا کہا جاتا ہے کہ الحسنى سے مراد جنت ہے یا اچھا بدلہ ہے اور جزا کی الحسنى کی طرف اضافت موصوف کی صفت کی طرف اضافت کی طرح ہے جیسے مسجد الجامع و جانب الغربی۔

۱۰۔ یسرو ذابسر کی تقدیر میں ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں یسرو کا معنی معروف ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ذوالقرنین کو خطاب دلیل ہے کہ وہ نبی تھے، ان کی طرف وحی کی جاتی تھی۔ امام بیہقی فرماتے ہیں اصح یہ ہے کہ وہ نبی نہیں تھے۔ اور اس خطاب سے مراد الہام ہے (۱) میں کہتا ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ انہیں یہ حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی نبی کے ذریعہ سے ملا ہو جو ان کی صحیح سمت راہنمائی کرتا رہتا ہو جیسے بنی اسرائیل میں بادشاہوں کے ساتھ انبیاء کرام ہو تے تھے جو ان کی راہنمائی کرتے تھے۔

حَسْمٌ اَنْبِیَآءٍ سَبِیۡلًا ﴿۱۱﴾

”پھر وہ روانہ ہوا دوسرے راستے پر لے“

۱ یعنی مشرق کی طرف پہنچانے والے راستہ پر چلا۔

حَتَّىٰ إِذَا بَكَعَتْكَ السَّمْسُ وَجَدَهَا تَصَدِّقُ قَوْمًا لَمْ يَجْعَلْ لَكُمْ مِنْ دُونِهَا سِتْرًا ﴿١١﴾

”یہاں تک کہ جب وہ پہنچا طلوع آفتاب کے مقام پر تو اس نے پایا سورج کو کہ وہ طلوع ہو رہا ہے ایسی قوم پر کہ نہیں بنائی

ہم نے ان کے لئے سورج (کی گرمی) سے بچنے کی آڑ۔“

۱ یعنی ذوالقرنین سورج کے طلوع کی جگہ پہنچا تو وہاں اس نے ایسی قوم کو پایا جن کا لباس نہ تھا یا کوئی مکان نہ تھا کیونکہ ان کی زمین گہرے مکان کو اٹھانے کی تحمل ہی نہ تھی یا انہوں نے مکانات کی جگہ بنائیں بنا رکھی تھیں جن میں وہ رہتے تھے۔

كُلُّ لَيْكٍ وَوَقَدْ أَحْضَنَّا بِمَا لَدَيْكَ حُبْرًا ﴿١٢﴾

”بات یونہی ہے۔ اور ہم نے احاطہ کر رکھا ہے ہر اس چیز کا جو اس کے پاس تھی اسے علم سے۔“

۱ یعنی ذوالقرنین بالکل اسی طرح تھا جس طرح ہم نے بیان کیا ہے کہ اس کا مرتبہ بلند تھا اور اس کی بادشاہی وسیع و عریض تھی یا یہ معنی کہ اس کا معاملہ اہل مشرق کے ساتھ بھی اہل مغرب کی طرح اختیار و تحجیر کا تھا۔ کذا لک یا یہ وجدھا کے مصدر مخذوف کی صفت ہے، یعنی اس نے سورج کو طلوع ہوتے دیکھا جیسا اس نے اسے غروب ہوتے دیکھا یا یہ لم نجعل کے مصدر کی صفت ہے، یعنی اہل مشرق کے لئے کوئی آڑ نہیں بنائی جس طرح اہل مغرب کے لئے نہیں بنائی تھی یا یہ قوم کی صفت ہے یعنی اس نے سورج کو ایک ایسی قوم پر طلوع ہوتے دیکھا جو کفر اور حکم میں اس قوم کی مثل تھی جن پر سورج کو غروب ہوتے دیکھا۔

۱ اس کے پاس جو فنکار آلات حرب تعداد اور اسباب ہیں ہم سب کو جانتے ہیں یعنی ہم اس کے نظروں پر یا من کو جانتے ہیں خبر اکا معنی علم ہے اور مصدر یہ کی بنا پر منصوب ہے کیونکہ احضنا میں خبر کا معنی موجود ہے۔ مقصود یہ ہے کہ اس کے پاس ہر چیز کی اتنی کثرت تھی جس کا احاطہ صرف لطیف و خمیر ذات کو ہی تھا۔

ثُمَّ اتَّبَعَتْ سَبَبًا ﴿١٣﴾

”پھر وہ روانہ ہوا ایک اور راہ پر۔“

۱ یعنی پھر اس نے تیسرا راستہ اختیار کیا جو مشرق و مغرب کے درمیان تھا، یعنی جنوب سے شمال کی طرف چلا۔

حَتَّىٰ إِذَا بَكَعَتْكَ بَيْنَ السَّادِّينِ وَجَدَ مِنْ دُونِهَا قَوْمًا لَّا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلًا ﴿١٤﴾

”یہاں تک کہ جب وہ پہنچا دو پہاڑوں کے درمیان۔ تو پایا اس نے ان پہاڑوں کے پیچھے ایک قوم کو جو نہیں سمجھ سکتے

تھے (ان کی) کوئی بات ہے۔“

۱ مسدین کو ابن کثیر ابو عمرو اور حفص سین کے فقہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے سین کے ضم کے ساتھ پڑھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ دونوں لغتیں ہیں اور دونوں کا معنی ایک ہے۔ نکر فرماتے ہیں جس رکاوٹ کو انسان نے بنایا ہو وہ سد (بشمق سین) ہے اور جو قدرت کی کرشمہ سازی سے ہو وہ سد (بضم سین) ہے۔ ابو عمرو کا بھی یہی قول ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں لیسد بفتح مصدر ہے اور بضم اسم ہے۔ اور یہاں لیسدین سے مراد دو پہاڑ ہیں جن کے درمیان ذوالقرنین نے یا چون ماجوج کے سامنے دیوار بنا دی تھی۔ یہ ارمینیا اور

آذربائیجان کے پہاڑ ہیں۔ ابن المہذ نے ابن عباس سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں شمال کے آخر میں جہاں ترکوں کی زمین کی حد ختم ہوتی ہے وہاں دو پہاڑ ہیں، ان کے پیچھے یا جوج، ماجوج رہتے ہیں۔ سعید بن منصور نے اپنی سنن میں ابن جریرؒ ابن المہذ اور ابن ابی حاتم نے اپنی اپنی تفاسیر میں اسی طرح نقل کیا ہے۔ یہاں تین مفعول ہے جو ظرف متصرف میں سے ہے۔

ع دونہما میں حاضریہ سے مراد دو پہاڑ ہیں، یعنی ان پہاڑوں کے سامنے۔ جزوہ کسائی نے یفقہون کو باب افعال سے یفقہون یا کے ضمہ اور قاف کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی وہ دوسروں کو اپنی بات نہیں سمجھا سکتے تھے۔ دوسرے قراء نے یفقہون، مجرد فعل سے پڑھا ہے جس کا معنی یہ ہے کہ وہ دوسروں کی کلام نہیں سمجھتے تھے۔ ابن عباس فرماتے وہ کسی کی کلام نہیں سمجھتے تھے اور نہ لوگ ان کی کلام سمجھتے تھے۔

قَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا تَقُولُونَ
لَكُمْ خَرَجًا عَلَىٰ أَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ۖ

”انہوں نے کہا، اے اللہ کے پیغمبر! تم نے بڑا فساد برپا کر رکھا ہے اس علاقہ میں جو تو کیا ہم مقرر کر دین
آپ کے لئے کچھ خراج ہے تاکہ آپ ہمارے درمیان اور ان کے درمیان ایک بلند دیوار بنے۔“

یعنی اس قوم نے کسی مترجم کے واسطے ذوالقرنین سے درخواست کی کہ یا جوج اور ماجوج نے بڑا فساد برپا کر رکھا ہے۔ قالوا کی جگہ ابن سعویٰ قرأت میں قَالَ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا تَقُولُونَ اور سورۃ انبیاء میں یا جوج اور ماجوج دونوں کو مہموز پڑھا ہے اور دوسرے قراء نے بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔ یہ دونوں معنی اسم ہیں اور دلیل ان کا غیر متصرف ہونا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ عربی ہیں اور ابن العلقم سے مشتق ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ اجماع النصار سے مشتق ہے (آگ کی نمودار اس کا شراہ) ان کی کثرت کی وجہ سے آگ کے شعلوں کے ساتھ انہیں تشبیہ دی گئی ہے اور ان کا غیر متصرف ہونا معروف اور تائید کی وجہ سے ہے (1)۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ یافث بن نوح کی اولاد سے ہیں۔ یافث کا فرماتے ہیں یہ ترکوں کی نسل ہے۔ سدی کہتے ہیں ترک یا جوج کا ایک لشکر تھا جو نکلا ہوا تھا۔ اور ذوالقرنین نے دیوار بنائی تو یہ باہر ہی رہ گیا۔ سب ترک ان کی اولاد ہیں۔ قتادہ سے مروی ہے کہ وہ بائیس قبیلے تھے۔ ذوالقرنین نے انہیں قبیلوں کے آگے دیوار بنائی تھی اور ایک قبیلہ باقی رہ گیا تھا۔ ترک وہی ہیں۔ ان کو ترک اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ باہر چھوڑ دیئے گئے تھے۔ اہل تاریخ کہتے ہیں نوح علیہ السلام کے تین فرزند تھے۔ سام، حام اور یافث۔ عرب، عجم اور رومی سام کی اولاد ہیں اور حبشہ، زنج اور نوبہ حام کی اولاد ہیں۔ اور ترک، خز، صغالیہ اور یا جوج، ماجوج یافث کی نسل ہیں ابن عباس نے عطا کی روایت میں فرمایا کہ یا جوج و ماجوج دس حصے ہیں اور سارے انسان ان کے مقابلہ میں ایک حصہ ہیں۔ حضرت حذیفہ سے مرفوع روایت مروی ہے کہ یا جوج ایک امت ہے اور ماجوج بھی ایک امت ہے اور ان میں سے ہر ایک امت کی تعداد چار لاکھ ہے ان میں سے کوئی شخص اس وقت تک نہیں مرتا جب تک کہ اپنی نسل سے ہزار آدمی ایسے نہ دیکھے جو ہتھیار اٹھالیں (یعنی جوان ہو جائیں) یہ سب آدم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں، بے آباد دنیا تک پھیلنے جائیں گے (2)۔

میں کہتا ہوں شاید حدیث کا مطلب یہ ہو کہ جب ذوالقرنین نے دیوار بنائی تھی اس وقت ان میں سے ہر امت کی تعداد چار لاکھ تھی لیکن اس کے بعد جب ان میں سے ہر شخص اپنے ہزار مسلح افراد کو کمر تاپے تو اللہ تعالیٰ کے سوا ان کی تعداد کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا اور یسینون الہی

خزrab اللذنیٰ کا معنی یہ ہو کہ جب قیامت کے قریب اس دیوار سے نکلیں گے تو بے آواز دنیا تک ملے جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

امام بغوی فرماتے ہیں یا جوج ماجوج کی جن تہمتیں تھیں کچھ ارذرا (شام کا ایک درخت ہے) کی مانند ہیں، ان کی لمبائی اوپر کی جانب ایک سو بیس ہاتھ ہے اور ایک قسم وہ ہے بڑکا عرض اور طول برابر ایک سو بیس ہاتھ ہے۔ ان کے سامنے نہ پہاڑ ٹھہر سکتا ہے نہ لوہا۔ ایک قسم وہ ہے جو ایک کان کو بچھونا بناتے ہیں اور دوسرے کو لاف گھوڑے و دشتی خنزیر جس کے قریب سے گزرتے ہیں اسے کھا جاتے ہیں۔ ان میں سے جو مرتا اسے بھی وہ کھا جاتے ہیں، ان کا آگے والا دستہ شام میں اور پیچھے والا دستہ خراسان میں ہے۔ مشرق اور بحیرہ طبرک کی نہریں ملی جاتے ہیں (1) میں کہتا ہوں یہ قرب قیامت میں اس دیوار سے نکل کر نکلیں گے اور ہر چیز کو کھائیں گے۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ان کا طول ایک باشت اور عرض ایک ہاتھ ہے اور کچھ ان میں بہت لمبے ہیں (2)۔

کعب فرماتے ہیں یہ آدم علیہ السلام کی اولاد سے عجیب لوگ ہیں۔ یہ اس طرح پیدا ہوئے کہ آدم علیہ السلام کو ایک دن احلام ہو اور ان کا لطفہ مٹی سے مل گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پانی سے یا جوج و ماجوج کو پیدا فرما دیا۔ وہ باپ کی طرف سے ہمارے علاقے بھائی ہیں لیکن ماں کی طرف سے کچھ نہیں گنتے (3)۔

امام بغوی فرماتے ہیں وہب بن منبہ نے ذکر کیا ہے کہ ذوالقرنین روی تھا اور ایک بوڑھی کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جب وہ بالغ ہوا تو ایک نیک آدمی بنا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے فرمایا میں تجھے مختلف زبانوں والی قوموں کی طرف بھیجے والا ہوں۔ ان میں سے دو اتنی ایسی ہیں جن کے درمیان زمین کے طول کی دوری ہے۔ ایک سورج کے غروب ہونے کی جگہ ہے اسے ناسک کہا جاتا ہے۔ دوسری سورج کے طلوع ہونے کی جگہ ہے، اسے منک کہا جاتا ہے۔ دو اتنی ہیں جن کے درمیان زمین کے عرض کی مسافت ہے۔ ایک دائیں قطر میں ہے، اسے حاویل کہا جاتا ہے۔ دوسری زمین کے بائیں قطر میں ہے، اسے قایل کہا جاتا ہے۔ ایک امت زمین کے وسط میں ہے جن میں جن اور انسان، یا جوج و ماجوج ہیں۔ ذوالقرنین نے عرض کی میں کس قوم کے ساتھ ان کا مقابلہ کروں گا اور کس لشکر کے ساتھ ان پر چڑھائی کروں گا اور کئی زبان سے ان کے ساتھ بات کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں تجھے سلط و عطا کروں گا تیری زبان کو پھیلا دوں گا، تیرے بازوؤں کو مضبوط کروں گا۔ تجھے کوئی چیز خوفزدہ نہیں کرے گی میں تجھے ہیبت کا لباس پہنائوں گا۔ تجھے کوئی چیز نہیں روکے گی تیرے لئے نور و عظمت کو سخر کروں گا، نور و عظمت تیرے لشکر بادوں گا۔ نور تیری آگے سے راہنمائی کرے گا عظمت تجھے پیچھے سے گھیرے میں لئے رکھے گی۔ ذوالقرنین پہلے سورج کے غروب ہونے کی طرف چلا۔ وہاں اس نے کافی لوگ پائے جن کی تعداد کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اس نے ان پر عظمت سے چڑھائی کی حتیٰ کہ انہیں ایک مکان میں جمع کر دیا پھر انہیں اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی عبادت کی طرف بلایا۔ ان میں سے کچھ ایمان لائے اور کچھ منکر ہو گئے۔ پھر اس نے مغربین کی طرف توجہ کی۔ ان پر عظمت کو داخل کیا جس سے ان کے پیٹوں اور گھروں میں داخل ہو گئی۔ پس وہ بھی اس کی دعوت میں داخل ہو گئے۔ پھر اس نے اہل مغرب سے بہت بڑا لشکر تیار کیا۔ وہ ان کو پیٹوں اور گھروں میں داخل ہو گئی۔ پس وہ بھی اس کی دعوت میں داخل ہو گئے۔ پھر اس نے اہل مغرب سے بہت بڑا لشکر تیار کیا۔ وہ ان کو لے کر چلائی کہ ہادیل قوم کے پاس پہنچان کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جو ناسک قوم کے ساتھ کیا تھا۔ پھر وہ سورج کے طلوع ہونے کی جگہ منک قوم کے پاس پہنچا، ان سے بھی وہ معاملہ کیا جو پہلی امتوں کے ساتھ کیا تھا پھر وہ قایل قوم کے پاس آیا۔ ان سے بھی پہلی امتوں جیسا سلوک کیا پھر وہ ان امتوں کی طرف متوجہ ہوا جو زمین کے وسط میں تھیں۔ جب وہ وہاں پہنچا جہاں مشرقی سمت ترکوں کا علاقہ ختم ہوتا ہے تو انسانوں میں سے ایک نیک گروہ اس کے پاس آیا اور کہا اے ذوالقرنین ان دو پہاڑوں کے درمیان ایک مخلوق ہے جو چوپایوں کی

مشل ہے، جانور اور اور چوپایوں کو چیرتے پھاڑتے ہیں۔ ان کے درندوں کی طرح لمبے لمبے دانت اور داڑھی ہیں، وہ سائب اور بچھو کھاتے ہیں اور ہر ذی روح جسے اللہ نے زمین پر پیدا کیا ہے اسے کھا جاتے ہیں۔ کوئی مخلوق ان کے بڑھنے کی طرح نہیں ہوتی۔ آسمان کوئی شک نہیں وہ زمین کے مالک بن جاتے ہیں، اس پر غلبہ پالیتے ہیں اور فساد برپا کرتے ہیں۔ کیا ہم تیرے لئے چندہ اکٹھا کریں اس شرط پر تو ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار بناوے۔ ذوالقرنین نے کہا میرے رب نے مجھے جو قوت عطا کی ہے وہ تمہاری ان کوزیوں سے کہیں بہتر ہے۔ فرمایا تم پتھر لہا اور تاننا اکٹھا کرو میں ان کی خبر لے کر آتا ہوں۔ ذوالقرنین چلا گیا حتیٰ کہ ان کے شہروں کے اندر داخل ہو گیا۔ اس نے اس قوم کو ایک ہی مقدر میں پایا، ہم میں سے ٹھکانا (پست قد) کے نصف قد کے برابر ان کا قد تھا۔ ہمارے ہاتھوں کے ناخنوں کی طرح ان کے پنے تھے اور دانت، کچلیاں درندوں کی طرح تھیں، ان کے جسموں پر سخت بال تھے جو انہیں سردی گرمی سے بچاتے تھے ان کے کان بڑے لمبے تھے۔ ایک کوچھوٹا اور ایک کواڑھنا بناتے تھے ایک میں موسم گرما گزارتے دوسرے میں موسم سرما۔ جہاں جمع ہونے جانوروں کی طرح جماع کرتے۔ جب ذوالقرنین نے ان کی عادات و اطوار کا جائزہ لے لیا تو دونوں پہاڑوں کی طرف واپس آیا۔ ان کے درمیان کی پائنس کی پھر پانی تک بنیاد کھدوائی، اس کے اندر پتھر ڈلوائے، تانبے سے مصالط تیار کیا اور اس کو ان پتھروں کے اوپر ڈال دیا پس وہ اس طرح ہو گیا گویا زمین کے نیچے سے پہاڑ نکل آیا ہے (1)۔

یعنی یا جوج و ماجوج ہماری زمین میں خلقِ مخرب کاری کھیتوں کی تباہی کر کے فساد پھیلاتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں وہ موسم ربیع میں زمینوں کی طرف نکلے اور ہر سبز چیز کو کھا جاتے ہیں اور ہر خشک چیز کو کھا کر ساتھ لے جاتے۔ اس سے لوگوں کو بہت تکلیف ہوتی۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ لوگوں کو بھی کھا جاتے تھے (2)۔

جہ جزہ اور کسانے نے یہاں اور سورۃ المؤمنون میں حوا جعاً الف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے بغیر الف کے پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں اور دونوں کا معنی ایک ہے، یعنی ہم اپنے اموال سے ایک حصہ نکالیں گے۔ ابو عمرو کہتے ہیں الخراج کا معنی جس کے ذریعہ سے رغبت دی جائے اور خراج جس کا ادا کرنا لازمی ہو اور الخرج افراد پر ہوتا ہے اور خراج زمینوں پر ہوتا ہے۔ عرب کہتے ہیں اپنے سر کا خراج ادا کرو اور اپنے شہر کا خراج ادا کرو۔ بعض علماء فرماتے ہیں الخراج زمین پر نہیں ہوتا ہے اور الخراج مصدر ہے۔ بنی نافع امین عامر اور ابو بکر نے سین کے ضمہ کے سدا اور باقی قراء نے سدا سین کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی ان کے سامنے کوئی بند باندھ دیجئے۔

قَالَ صَالِكِي فِيهِ رَأْيِي خَيْرٌ فَاعِينُونِي بِقَوْلٍ آجَعَلُ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مَادِمًا ۝

”وہ یولادہ دولت جس میں میرے رب نے مجھے اختیار دیا ہے وہ بہتر ہے پس تم میری مدد کرو جسmani مشقت سے میں بنا دوں گا تمہارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط آڑ لے۔“

لہذا کا فاضل ذوالقرنین ہے۔ معنی کو ان کثیر نے بغیر ارقام کے اصل پر دونوں کیساتھ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ پہلے نون کو مفتوح اور دوسرے کو کسود پڑھا ہے۔ جبکہ دوسرے قراء نے نون مشدود کسود کے ساتھ مدغم پڑھا ہے یعنی جو میرے رب نے مجھے مال اور ملک میں سے عطا فرمایا ہے وہ تمہارے خراج سے کہیں بہتر ہے تم کام کر کے یا جن آلات کی مجھے ضرورت ہے ان کے ذریعے میری مدد کرو۔ میں ایک مضبوط دیوار بنا دیتا ہوں، وہ دیوار دو پہاڑوں سے بلند ہے۔ عرب کہتے ہیں نوب مؤذم جب اس پر تہہ در تہہ ٹکوسے لگے ہوئے ہوں۔

اَتُوْنِيْ ذُبْرًا حَتَّىٰ اِذَا سَاوَىٰ بَيْنَ الصَّدَقَيْنِ قَالَ اُنْفُوْا حَتَّىٰ اِذَا
جَعَلَهُ نَامًا ۗ قَالَ اَتُوْنِيْ اَفْرِغْ عَلَيْكُمْ ۗ ﴿٥١﴾

”تم لے آؤ میرے پاس لوہے کی چادریں لے (چنانچہ کام شروع ہو گیا) یہاں تک کہ جب ہوا کر دیا گیا وہ غلا جو دو پہاڑوں کے درمیان تھا جسے تو اس نے حکم دیا دھو گویا یہاں تک کہ جب وہ لوہا آگ بنا دیا تو اس نے کہا لے آؤ میرے پاس پگھلا ہوا تانبا جس کے میں اسے اس پگھلے ہوئے لوہے پر انڈیلوں ہے“

لے اتونی کو جو ہر قراء نے ہمزہ قطعی کے ساتھ ابتداء سے مشتق کر کے پڑھا ہے جس کا معنی دینا اور عطا کرنا ہے۔ اس مطالبہ اور خیران کے واپس کرنے اور بدنی مشقت پر اکتفاء کے درمیان کوئی منافات نہیں ہے کیونکہ آلات مہیا کرنا اعانت ہے۔ عمل پر خیران نہیں۔ ورنہ نے اپنی اصل پر ہمزہ کی حرکت مانع تو ہیں کوڑے کر پڑھا ہے ابو بکر نے رد مان اتونی یعنی تو میں کے کسرہ اور اس کے بعد ہمزہ ساکنہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کا معنی جینوئی ہے۔ ابتداء ہمزہ پر کسرہ تھا پھر اجتماع ہمزین کی وجہ سے ہمزہ یاء سے بدل گیا جن میں پہلا کسرہ تھا اور دوسرا ساکن تھا۔ ہمزہ بڑے بڑے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ ابو بکر کی قراءت پر اس کی اصل بزرہ الحدید تھی کیونکہ اتیان مصدر لازم ہے۔ پھر باء کو حذف کیا گیا جیسے امر تک النخیر میں باء کو حذف کیا گیا ہے۔ وہ لوگ ذوالقرنین کے حکم کے مطابق لوہے کی چادریں نکڑی اور کوئلے لے آئے۔ اس نے انہیں ایک دوسرے پر جوڑ دیا۔ وہ متواتر لوہے کی چادریں نکڑی اور کوئلے پڑا تار باور اسی طرح نکڑی اور کوئلے پر لوہے کی چادریں ڈالتا رہا۔

مع ابن کثیر ابو بکر اور ابن عامر نے الصدقین کو صاد اور وال کے ضم کے ساتھ پڑھا ہے اور ابو بکر نے صاد کے ضم اور وال کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے صاد اور وال دونوں پر فتح پڑھا ہے۔ یہ تمام لغتیں موجود ہیں اور یہ الصدق سے ہے جس کا معنی اہل ہے کیونکہ ہر ایک پہاڑ دوسرے کی طرف مائل تھا۔ اسی سے اصطاف بمعنی السخاٹل ہے۔

مع ذوالقرنین نے مزدوروں کو کہا اس سارے لمبے میں آگ لگاؤ اور پھر اس کو دھوگو۔ یہ سلسلہ شروع رہا حتیٰ کہ وہ لمبہ بالکل آگ کی طرح بنا دیا گیا۔ بنانے کی نسبت ذوالقرنین کی طرف کی ہے حالانکہ بنانے والے تو مزدور تھے اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ کام ڈوا لقرنین کے حکم سے ہوا تھا۔

مع اتونی کو قراہ اور کسائی نے قال کی لام کے بعد ہمزہ ساکنہ کے ساتھ جہنی کے معنی میں پڑھا ہے اور جب ابتداء پڑھتے ہیں تو ہمزہ وصلیٰ کو کسرہ اور ہمزہ ساکنہ کو ما سے بدل کر پڑھتے ہیں۔ باقی قراء نے دونوں حالتوں میں اعطاء کے معنی میں ہمزہ قطعی آورد کے ساتھ پڑھا ہے۔

یہ افراغ کا معنی انڈیلنا ہے اور فطر ا پگھلا ہوا تانبا ہے، یعنی تم تانبا لے آؤ، میں اس پگھلے ہوئے تانبا کو لوہے پر ڈالوں گا پس آگ نکڑی اور کوئلے کو کھاؤ گی۔ اور پگھلا ہوا تانبا نکڑی کی جگہ ہو گیا حتیٰ کہ لوہا اور تانبا آپس میں چست گئے لوہا ہینٹ بن گیا اور تانبا شی کے قائم مقام ہو گیا پس وہ مشبوط پہاڑ بن گیا۔

امام بیہقی فرماتے ہیں اس دیوار کا عرض پچاس ہاتھ اونچائی دو سو ہاتھ اور لمبائی ایک فرسخ تھی (1)۔

قطر ا اسم ہے جس میں اتونی اور افراغ دونوں عمل کا تقاضا کرتے ہیں۔ بصری علماء دوسرے فعل کو عمل کرتے ہیں اور فرماتے ہیں پہلے فعل کا مفعول حذف ہوتا ہے جس پر دوسرے فعل کا مفعول دلالت کر رہا ہوتا ہے اور بصری علماء اپنے مذہب کے عقیدے کی دلیل

یہ دیتے ہیں کہ دوسرا فعل مفعول کے قریب ہوتا ہے اس لئے اس کو مل کر انا اولیٰ ہے اور اگر پہلے فعل (اتونی) کا فطر ا کو مفعول بنا یا جائے دوسرے فعل (افرع) کے مفعول کے لئے ضمیر نکالنی لازم ہوگی۔ اس التباس سے بچنے کے لئے دوسرے فعل کو مل کر انا ہی بجز ہے۔ کوئی ملنا فرماتے ہیں پہلا فعل مقدم ہوتا ہے اس کا تقدم عمل کا تقاضا کرتا ہے۔ اس لئے یہاں بھی فطر اتونی کا مفعول ہوگا اور افرع کا مفعول محذوف ہوگا۔ دونوں صورتوں میں کوئی التباس نہیں ہے۔

فَمَا اسْتَطَاعُوا أَنْ يَظْهَرُوا وَ مَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا ﴿١٥﴾

”سو یا جوں و ما جو بڑی کوشش کے باوجود اسے سر نہ کر سکے اور نہ ہی انہیں سوراخ کر سکے۔“

۱۔ استطاعوا اصل میں استطاعوا ہے مہجور نے دو قریب الخرج حروف کے اتصال سے بچنے کے لئے تاہ کو حذف کر کے پڑھا ہے۔ حمزہ نے تاہ کو طاء میں اوقاف کر کے مشدود اور اجتماع الساکنین علی غیر مدہ کر کے پڑھا ہے۔ یعنی وہ اس دیوار کی باندی اور ماتحت کی وجہ سے نہ اس کے اوپر چڑھ سکے اور اس کی شدت و صلابت کی وجہ سے نہ بچنے سے سوراخ کر سکے۔

قَالَ هَذَا رَحْمَةً مِنْ رَبِّي إِذْ أَجَاءَ وَعَدُ رَبِّي جَعَلَهُ دَكَّاءَ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّي حَقًّا ﴿١٦﴾

”ذوالقرنین نے کہا یہ میرے رب کی رحمت ہے (کہ اس نے مجھے یہ تو فیض بخشی) اور جب آجائے گا میرے رب کا وعدہ

تو وہ اسے زیزہ زیزہ کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ (ہمیشہ) سچا ہوا کرتا ہے۔“

۱۔ یعنی ذوالقرنین نے کہا۔ یہ دیوار یا یہ غلا یہ پر کرنے کی قدرت رب کی اپنے بندوں پر خاص رحمت ہے۔ لیکن جب یا جوں و ما جو بڑی کوشش کے نکلنے کا وقت میرے پروردگار کی طرف سے آجائے گا یا یہ معنی کہ قیامت جب قریب آجائے گی تو یہ دیوار زمین میں یوں ہوجائے گی۔ کوئیوں نے دکاء کو مد اور ہمزہ کے ساتھ بغیر تینوں کے پڑھا ہے اور باقی قراء نے بغیر ہمزہ اور مد کے تینوں کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ مصدر بمعنی مفعول ہے، یعنی وہ اسے کوئی ہوئی زیزہ زیزہ اور زمین کے برابر کر دے گا۔

ذوالقرنین کا قصہ یہاں ختم ہوا۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ ذوالقرنین ظلمت میں داخل ہوا پھر جب واپس آیا تو شہر زور میں اس کا وصال ہو گیا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس کی عمر تیس سال سے کچھ زیادہ تھی (۱)۔

امام بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت قتادہ نے عن ابی رافع عن ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ یا جوں و ما جو بڑی کوشش کے نکلنے کا وقت میرے پروردگار کو کھودتے ہیں حتیٰ کہ جب سورج کی شعاع نظر آتی ہے تو ان کا سر وار کہتا ہے اب واپس چلے جاؤ بقیہ کل کھودیں گے لیکن اللہ تعالیٰ اسے پھر مکمل فرماتا ہے۔ لیکن جب فیصلہ الہی کا وقت آجائے گا اور وہ اسی طرح کھودیں گے کہ سورج کی شعاعوں کا ظہور ہونے لگے گا تو ان کا سردار کہے گا اب واپس جاؤ بقیہ کل ان شاء اللہ کھودیں گے۔ ان شاء اللہ کہنے کے بعد دوسرے دن واپس آئیں گے تو ویسے ہی پائیں گے جیسے چھوڑ گئے تھے، پس وہ اس بقیہ حصہ کو کھودیں گے اور لوگوں پر نکل پڑیں گے۔ پہلے وہ پانیوں کا رخ کریں گے لوگ ان کے خوف سے قلعوں میں چھپ جائیں گے۔ وہ یا جوں و ما جو اپنے تیر آسمان کی طرف پھینکیں گے، وہ خون آلود ہو کر واپس آئیں گے۔ وہ کہیں گے ہم اہل زمین پر غالب آگئے اور اہل السماء پر بھی غالب آگئے۔ اللہ تعالیٰ انکی گردنوں میں ایک کیزا پیجا فرما دے گا جس کی وجہ سے وہ ہلاک ہوجائیں گے۔ زمین کے کیزے سے مومٹے ہوجائیں گے اور ان کے گوشت کھانے کی وجہ سے وہ

اللہ تعالیٰ کا خوب شکر ادا کریں گے (۱)۔

مسلم نے نواس بن سنعان سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ایک دن رسول اللہ ﷺ نے دجال کا ذکر کیا، دوران گفتگو آپ ﷺ کی آواز کبھی پست ہو جاتی۔ اور کبھی بلند ہو جاتی، ہمیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وعظ سے یوں محسوس ہونے لگا کہ دجال کھجوروں کے جھنڈ میں ہے۔ پھر جب ہم آپ ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ نے ہمارے چہروں سے دجال کا خوف بچان لیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا تمہارے چہروں پر یہ خوف و ہراس کے آثار کیوں ہیں۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ ﷺ نے دجال کا تذکرہ فرمایا۔ آپ ﷺ کی آواز کبھی پست ہو جاتی تھی اور کبھی بلند ہو جاتی تھی۔ ہم نے گمان کیا کہ وہ کھجوروں کے اس جھنڈ میں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا مجھے تم پر دجال سے زیادہ کسی اور چیز کا خوف ہے جو (قرب قیامت میں) ظاہر ہوگی۔ اگر دجال نکلے گا اور میں تمہارے درمیان موجود ہوں گا تو میں اس سے بچنے دوں گا۔ اور اگر میری عدم موجودگی میں نکلے گا تو ہر شخص خود اس سے مقابلہ کرے گا۔ اللہ کا کریم میری طرف سے اس کے ہر مسلمان کی حفاظت فرمائے گا۔ وہ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں والا جوان ہوگا، اس کی آنکھ کا ڈھیلا باہر نکلا ہوا ہوگا اور میں اسے عبدالعزی بن قحن کی طرح دیکھتا ہوں۔ جو تم میں سے دجال کو پاس دے وہ سورۃ کہف کی پہلی آیات کی تلاوت کرے، وہ شام اور عراق کے درمیان سے چھوٹے گا۔ وہ دائیں بائیں فساد پھیلانے گا۔ اسے اللہ کے ہندو اثبات قدم رہنا۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! وہ زمین میں کتنا عرصہ ٹھہرے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا چالیس دن۔ (اس وقت) ایک دن سال کی طرح ہوگا۔ ایک دن ایک مہینہ کی طرح ہوگا، ایک دن جمعہ کی طرح ہوگا، اس کے تمام دن تمہارے دنوں کی طرح ہوں گے۔ ہم نے عرض کی حضور ﷺ! ایک دن جو سال کا ہوگا کیا سمجھیں ہمارے لئے ایک دن نمازیں کافی ہوں گی۔ فرمایا نہیں بلکہ اندازہ سے نماز ادا کرنا۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! وہ زمین میں کتنا جلدی چلے گا؟ فرمایا وہ اس بال کی طرح تیز چلے گا جس کو پیچھے سے ہوا دکھل رہی ہوتی ہے۔ وہ دجال ایک قوم کے پاس آئے گا وہ انہیں اپنی طرف بلائے گا تو وہ اس پر ایمان لے آئیں گے اور اس کی بات کو قبول کر لیں گے۔ وہ آسان کو حکم دے گا تو وہ بارش برسا دے گا زمین کو حکم دے گا تو وہ اناج و سبزہ اگا دے گی۔ ان کے اونٹ شام کو واپس آئیں گے تو ان کی کوبائیں پہلے کی بنسبت لمبی ہوں گی۔ ان کی اذانیں کی کبیری مکمل بھری ہوتی ہوں گی اور ان کے پہلو لمبے ہو چکے ہوں گے۔ پھر وہ ایک قوم کے پاس آئے گا، انہیں اپنی اہلیت کی دعوت دے گا وہ اس کی بات کو رد کر دیں گے۔ فرمایا وہ ان سے مزے گا تو وہ سب قحط میں مبتلا ہو جائیں گے، ان کے مال میں سے کچھ بھی نہیں رہے گا۔ پھر وہ ایک خنجر زمین پر آئے گا، اسے کہے گا اپنے خزانے اٹھ دے، تو اس نے نکل کر شہر کی کھیموں کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چل پڑیں گے۔ پھر وہ ایک جوان آدمی کو بلائے گا اور اسے تلوار کے ساتھ مارے گا تو اسے دو ٹکڑے کر دے گا پھر وہ اس کو بلائے گا تو وہ قتل و غصہ بستا، مسکراتا اس کے پاس آ جائے گا۔

اسی اثناء میں اللہ تعالیٰ عینی علیہ السلام کو معجوب فرمائیں گے، وہ دمشق کی مشرقی جانب سفید مینارہ کے پاس فرشتوں کے پروں پر ہاتھ رکھے ہوئے اتریں گے۔ جب آپ سر جھکائیں گے تو بارش کی طرح قطرے گریں گے اور جب سر بلند کریں گے تو آپ سے موتیوں کی طرح قطرے نکلنے لگیں گے۔ اور آپ کی سانس کسی کافر کے لئے طلال نہ ہوگی۔ اس لئے جس کافر کو لگے گی وہ مر جائے گا اور آپ کی سانس کا اثر حد نظر تک ہوگا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کو تلاش کریں گے حتیٰ کہ لکڑے کے دروازے پر آئیں گے اور اسے قتل کر دیں گے۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام ایک قوم کے پاس آئیں گے جن کو اللہ تعالیٰ نے اس دجال کے شر سے محفوظ رکھا ہوگا۔ ان کے

چہروں پر ہاتھ پھیریں گے اور جنت میں ان کے درجات انہیں بتائیں گے۔ اسی اثناء میں اللہ تعالیٰ عسی علیہ السلام کی طرف وحی فرمائیں گے کہ میں نے کچھ ایسے بندے (یا جوج و ماجوج) نکالے ہیں جن سے کسی کو جنگ کرنے کی طاقت نہیں ہے، تم میرے بندوں کو طور کی طرف لے جاؤ۔ اللہ تعالیٰ یا جوج و ماجوج کو نکالے گا وہ ہر نیلے سے نکل پڑیں گے، انکا پہلا گروہ بھیرہ طبر یہ پر پہنچ جائے گا، وہ اس کا سارا پانی پی جائے گا۔ پھر آخری گروہ آئے گا وہ کہیں گے کبھی یہاں پانی تھا۔ عسی علیہ السلام اور آپ کے ساتھی (طور پر) محصور ہو جائیں گے، ہر چیز کا اتنا کال پڑے گا کہ ایک تیل کا سر کسی کے لئے اتنا عظیم ہوگا جیسے آج تمہارے لئے سو دینار ہیں۔ اللہ کے نبی عسی علیہ السلام اور آپ کے ساتھی سب اللہ کی بارگاہ میں گزر گزرتے رہیں گے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ یا جوج و ماجوج کی گردنوں میں ایک کیڑا پیدا فرمائے گا اس کی وجہ سے وہ ایک شخص کی موت کی طرح سب مرجائیں گے۔ پھر عسی علیہ السلام اور ان کے ساتھی زمین پر اتریں گے۔ زمین پر کوئی ایک باشت کے برابر جگہ بھی ان کی بدبو اور تعفن سے خالی نہیں پائیں گے۔ عسی علیہ السلام اور آپ کے ساتھی اللہ کریم کی بارگاہ میں اس مصیبت سے نجات کی التجا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی فریاد کو قبول فرمائیں گے اور جنتی اونٹوں کی گردنوں کی طرح پرندے سمجھیں گے، وہ پرندے یا جوج و ماجوج کے جسموں کو اٹھا کر وہاں پھینک آئیں گے جہاں اللہ چاہے گا۔ پھر اللہ کریم بارش برسائیں گے جس سے مٹی کا گھڑا ان سے بنا ہوا ٹیہہ کوئی بھی محروم نہیں رہے گا۔ زمین دھل جائے گی اور صاف و شفاف ہو جائے گی پھر زمین کو عکم ہوگا اپنی برکت اگا دے۔ اس وقت پھر اپنی برکت ہو جائے گی کہ ایک انار کو پوری ایک جماعت کھائے گی، اس کے تھلکے سے لوگ سایہ حاصل کریں گے۔ دودھ میں بڑی برکت ہوگی حتیٰ کہ دودھ دینے والی ایک اونٹنی لوگوں کے کئی گروہوں کے لئے کافی ہوگی اور ایک گائے ایک قبیلہ کے لئے کافی ہوگی، ایک بکری ایک خاندان کے لئے کافی ہوگی۔ اسی دوران اللہ تعالیٰ ایک پاکیزہ ہوا چلائیں گے۔ وہ ہوا ہر مومن و مسلمان کی بغل کے نیچے لگے گی تو اس کی روح پرواز کر جائے گی۔ صرف برس لوگ باقی رہ جائیں گے جو گدھوں کی طرح لڑتے ہوں گے۔ ان پر ہی قیامت قائم ہوگی (1)۔

مسلم کی ایک روایت میں ہے دوسرا یا جوج و ماجوج کا گروہ آئے گا تو وہ کہے گا یہاں کبھی پانی تھا پھر وہ چل کر جبل ثمرک پہنچیں گے۔ یہ بیت المقدس کا پہاڑ ہے اور کہیں گے ہم نے زمین والوں کو قتل کر دیا۔ آؤ اب ہم آسمان والوں کو قتل کریں، وہ اپنے تیر آسمان کی طرف پھینکیں گے، اللہ تعالیٰ انہیں خون آلود واپس لوٹائے گا۔

ترمذی کی روایت بھی اسی طرح ہے۔ اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ جنتی اونٹوں کی گردنوں کی طرح بڑے بڑے پرندے بھیجے گا جو انہیں (یا جوج و ماجوج) اٹھا کر لے جائیں گے اور گڑھے میں پھینک دیں گے اور مسلمان ان کے تیروں، کمانوں اور ترشوں کو سات سال تک جلاتے رہیں گے پھر اللہ تعالیٰ بارش برسائے گا۔ الخ۔ امام بغوی نے یہ حدیث ذکر کی ہے اور پھر لکھا ہے کہ حضرت وہب فرماتے ہیں پھر یا جوج و ماجوج سمندر پر آئیں گے اور اس کا سارا پانی پی جائیں گے اور اسکے جانور کھا جائیں گے پھر وہ لکڑیاں اور سخت اور لوگوں میں سے جو انہیں مل جائے گا اسے کھا جائیں گے لیکن وہ مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ اور بیت المقدس میں داخل نہ ہو سکیں گے (2)۔ امام بخاری نے ابو سعید الخدری کے حوالے سے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا یا جوج و ماجوج کے نکلنے کے بعد بھی حج اور عمرہ کیا جائے گا (3)۔

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجًا فِي بَعْضٍ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَجِئْتَهُمْ جُمُوعًا ۝۱۱

”اور ہم واگزا کر دیں گے بعض کو اس دن کہ وہ (تندموجوں کی طرح) دوسروں میں ٹھس جائیں گے اور صور پھونکا جائے گا تو ہم سب کو اکٹھا کر دیں گے۔ ل۔“

ل۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دیوار کے ریزہ ریزہ ہو جانے کے بعد یا جوج و ماجوج پانی کی موجوں کی طرح ایک دوسرے میں داخل ہوں گے اور کثرت اور دوڑنے میں سبقت لیجانے کی وجہ سے وہ ایک دوسرے میں خلط ملط ہوں گے اور بعض علماء فرماتے ہیں یہ قیامت کا منظر بیان ہو رہا ہے کہ جن و انس ایک دوسرے میں اس وقت حیران و پریشان داخل ہوں گے۔ اس آخری قول کی تائید نفع فی الصور کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے کہ ہم صور پھونکیں گے اور ساری مخلوق کو حساب و کتاب کی خاطر ایک ٹہنی میں جمع کر دیں گے۔

وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكَافِرِينَ عَرْضًا ۝۱

”اور ہم ظاہر کریں گے جہنم کو اس دن کفار کے لئے بالکل میاں۔ ل۔“

ل۔ یعنی کافر اپنی آنکھوں سے جہنم کا مشاہدہ کریں گے۔

الَّذِينَ كَانَتْ أَعْيُنُهُمْ فِي غَطَاةٍ عَن ذِكْرِنَا وَلَا آلَاءِ نَحْنُ يُصْبِحُونَ ۝۲

”وہ کافر جن کی آنکھوں پر پردے پڑے تھے مہری یاد سے اور جو (کلرتن) سن بھی نہیں سکتے تھے۔ ل۔“

ل۔ غطاء سے مراد ہر وہ چیز ہے جو کسی دوسری چیز کو ڈھانپ دے۔ ذکر سے مراد وجود باری تعالیٰ اور صفات باری تعالیٰ کے دلائل و آیات ہیں۔ یعنی حق کا مشاہدہ کرنے اور حق بات سننے سے محروم اس لئے تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں شقاوت لکھ دی ہے اور ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے بغض و عناد رکھتے ہیں اور جو اس کے ناسخین ہیں ان سے بھی عداوت رکھتے ہیں اور ان پر صفت اضلال کا عکس پڑا ہے اور ان کا مبداء تعین اسم مطلق ہے۔ اس لئے یہ حق کی نردوشنی دیکھ سکتے ہیں اور حق کی آواز سن سکتے ہیں۔

أَفَحَسِبَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ يَتَّخِذُوا عِبَادِي مِنْ دُونِ آلِيَاءِ إِنَّا

أَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِّلْكَافِرِينَ نَزُلًا ۝۳

”کیا گمان کرتے ہیں کفار کہ وہ بتائیں گے میرے بندوں کو لے میرے بغیر جاتی ہے (یہ ناممکن ہے) بیچک ہم نے تیار کر رکھا ہے جہنم کو کفار کی رہائش کے لئے۔“

ل۔ عبادی سے مراد ملائکہ، مسیح اور عزیر علیہم السلام ہیں۔ انہیں عباد فرماتے ہیں عبادی سے مراد شیاطین ہیں جن کی اتباع کافر کرتے تھے مقال فرماتے ہیں بت مراد ہیں اور یہاں جنوں کو عباد اسی طرح کہا گیا ہے جیسا کہ ذیل کی آیت میں ہے۔ إِنَّ الَّذِينَ تَتَّبِعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ عِبَادًا أُمَّثَلْتُمْ۔ ترجمہ: بیچک وہ جنہیں تم پوجتے ہو اللہ کے سوا بندے ہیں تمہاری طرح (۱)۔

ل۔ دونی کو تابع ابو عمرو نے یاہ کے فتح کے ساتھ اور باقی قراء نے یاہ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور ترکیب نحوی کے اعتبار سے سن دونی حال ہے اولیاء سے مراد رب یا شفیع ہیں۔ عبادی اور اولیاء لیتخذوا کے مفعول ہیں اور بھران موصول اپنے صلے سے مل کر حسب کے مفعولوں کے قائم مقام ہے اور یہاں استفہام انکاری ہے، یعنی معاملہ اس طرح نہیں ہے بلکہ میرے بندے ان کے

دوست نہیں دشمن ہیں، وہ ان کی نازیبا اور لائینی حرکتوں سے ہمیشہ براءت کا اظہار کرتے ہیں کیونکہ نیک بندے طبعاً کافروں شیطانوں اور بتوں سے نفرت کرتے ہیں اور ان سے دشمنی رکھتے ہیں۔ جب قیامت کا ہونا ک ہنگامہ برپا ہوگا، یہ کافر بت اور شیطان ایک دوسرے کا انکار کریں گے اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے اور اپنے عبادت گزاروں سے براءت کا اظہار کریں گے یا حسب کا دوسرا مفعول محذوف ہے اور قرینہ کی بناء پر خبر کی طرح اس کو بھی حذف کیا گیا ہے۔ یعنی کیا یہ کافر یہ خیال کرتے ہیں کہ میرے بندوں کو میرے بغیر حیات بنانا ان کے لئے نفع مند ہوگا (نہیں ہرگز نہیں) ابن عباس فرماتے ہیں اسکا یہ مفہوم ہے کہ کیا کافروں کا یہ گمان ہے کہ میرے بغیر حیات بنانے سے مجھے غم و غضب نہیں آئے گا اور میں ان کو سزاؤں میں دوں گا (1) (یہ ان کی سوچ کتنی حماقت اور غلط ہے) اس تاویل پر حسب کے دونوں مفعول محذوف ہوں گے، جو انی لا اعصب ہے اور یہ جملہ دونوں مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ اور ان سے بغض و اوجھڑا حرف جر مقدر کے ساتھ کھڑو کے متعلق ہے۔ یعنی جنہوں نے میرے بغیر ان کو حیات بنایا اس سبب سے انہوں نے کفر کیا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ تقدیر کلام ابن عباس کے قول پر ہو کہ میرے بغیر میرے بندوں کو ان کا حیات بنانا مجھے ناراض نہیں کرے گا۔ ہرگز نہیں میں ان کو اس پر سخت سزاؤں دوں گا۔ اس تقدیر پر دوسرا مفعول محذوف ہوگا۔

اس نزلہ سے مراد منزل ہے یا وہ جگہ جو مہمان کی آمد سے پہلے تیار کی جاتی ہے۔ اس ارشاد میں ان سے استعزاز اور انہیں تمہید ہے کہ جس عذاب کو وہ تہیہ کر چکے ہیں وہ ان کے لئے بالکل تیار ہے (ان کے وقت مقررہ آنے کی دیر سے پہنچتے ہیں جنہم کے بھڑکتے شعلوں سے ان کی تواضع کی جائے گی)

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝

”فرمائیے (اے لوگو) کیا ہم مظلوم کریں تمہیں ان لوگوں پر جو اعمال کے لحاظ سے گھمانے میں ہیں۔ ل۔“

ل۔ اعمالاً پر نصب تہیہ کی بناء پر اسے اور مفعول اس لئے کہ اسم جنس اگر ذکر کیا جاتا تو وہ قائل کے اختلاف یا اپنے مدلول کے متنوع ہونے پر دلالت نہ کرتا اگرچہ اپنے مدلول کی ہر اکالی پر دلالت کرتا، اس لئے عمل کو جمع (اعمال) ذکر فرمایا تاکہ مذکورہ دونوں امروں میں سے ایک پر دلالت کرے۔

الَّذِينَ ضَلَّ سَعِيَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صَعًا ۝

”یہ وہ لوگ ہیں جنکی ساری جدوجہد دنیوی زندگی کی آرائشی میں کھو کر رہ گئی ہے اور وہ یہ خیال کر رہے ہیں کہ وہ کوئی بڑا عمدہ کام کر رہے ہیں۔ ل۔“

ل۔ ضل کا معنی ضائع ہونا ہے۔ سعی کا معنی کوشش اور کاوش ہے فی الحیاة الدنیا، سعیہم کے متعلق ہے۔ صغاً کا معنی عمل اور کام ہے۔ الذین اسم موصول محل رفع میں ہے کیونکہ یہ مبتدا محذوف ہم کی خبر ہے، یہ سوال کا جواب ہے یا من الاخسرین سے بدل کی بناء پر مجرور ہے یا مذمت کی بناء پر منصوب ہے۔

ابن عباس سعید بن ابی وقاص فرماتے ہیں جن کی ساری کوششیں رائیگاں ہیں وہ یہود و نصاریٰ ہیں، وہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتے ہیں حالانکہ ان کے دین منسوخ ہو چکے ہیں۔ بعض فرماتے ہیں اس سے مراد وہ راہب ہیں جو اپنے گرجا گھروں میں رہتے ہیں (2) اور یہ خیال کرتے ہیں کہ انہوں نے آخرت کی نعمتوں کی امید پر دنیا کی ساری لذتوں کو چھوڑ رکھا ہے۔ لیکن ان کی یہ ساری جدوجہد رائیگاں

ہے کیونکہ وہ عقیدہ کفر پر ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن ابی طالب فرماتے ہیں اس سے مراد خارجی ہیں (۱) کیونکہ یہ پہلا فرقہ ہے جنہوں نے اہل سنت و جماعت، یعنی صحابہ کرام اور ان کے ساتھیوں سے بغاوت کی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول کا مفہوم یہ ہے کہ یہ وہ بدعتی ہیں جو نفس کے بیماری میں اور انہوں نے اہل سنت و جماعت کی مخالفت کی ہے۔ پس اس میں سب فرتے رافضی معتزلہ اور دوسرے تمام گروہ فرتے شامل ہیں۔ میں کہتا ہوں اس سے مراد کافر ہیں جو قیامت اور دوبارہ اٹھنے پر ایمان و یقین نہیں رکھتے اور صرف وہی اعمال کرتے رہے جو ان کے لئے دنیا میں نفع بخش ہوتے ہیں، انہیں آخرت کی کوئی فکری نہیں اور نہ وہ دنیا کے بعد کسی چیز کا عقیدہ و تصور رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں جو دنیا میں آخرت کے اعمال میں سے کوئی ایسا عمل کرتا ہے جو دنیا میں اسکے گھائے اور خسارے کا باعث ہے (جیسے صدقہ و خیرات سچ) تو وہ پاگل ہے۔ میری اس توجہ کی تائید آئندہ آیت بھی کرتی ہے۔

أُولَئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبَّطُوا أَعْمَالَهُمْ فَلَا يُقِيمُونَ
يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَرَأَىٰ

”یعنی وہ (بد نصیب) ہیں جنہوں نے انکار کیا اپنے رب کی آیتوں کا اور اس کی ملاقات کا تو ضائع ہو گئے ان کے اعمال جو توہم ان کے اعمال تو لے کے لئے روز قیامت کوئی ترازو نصب نہیں کریں گے“

۱۔ اس آیت کریمہ میں ان لوگوں کو سخت قسم کی تنبیہ کی گئی ہے جو قیامت کا عقیدہ بھی رکھتے ہیں اور پھر دنیا کے اعمال کو آخرت کے اعمال پر ترجیح دیتے ہیں اور صبح و شام دنیا کے لئے سرگرداں رہتے ہیں لیکن آخرت کو سنوارنے کے لئے کچھ نہیں کرتے۔ مغفرت الہی اور اس کے فضل و رحمت کے حصول کے لئے کبھی کوشش نہیں کرتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اشد ہونے سے اپنے نفس کو اپنا مطیع بنایا اور مرنے کے بعد کی زندگی کو سنوارنے کے لئے نیک عمل کئے اور عاجز (کم عقل) وہ ہے جس نے اپنے نفس کی پیروی کی اور اللہ پر (جھوٹی) امید لگائے (۲)۔ اس حدیث کو امام احمد ترمذی ابن ماجہ اور حاکم نے صحیح سند کے ساتھ حضرت انس سے روایت کیا ہے۔ اگر آیت میں مراد یہود و نصاریٰ ہوں تو معنی یہ ہوگا کہ وہ قیامت کا صحیح عقیدہ نہیں رکھتے اور اسکے عذاب کے ملنے کا نظریہ نہیں رکھتے۔

۲۔ ایسے بد عقیدہ اور کمزور عقیدہ لوگوں کے اعمال جو انہوں نے دنیا کی خاطر کئے یا ثواب کی امید سے کئے سب رایگاں ہو جائیں گے۔ ان کے کفر کی وجہ سے انہیں ان کا کوئی اجر و ثواب نہ ملے گا کیونکہ نیکوں کی قبولیت کے لئے ایمان کی نعمت کا ہونا شرط ہے۔

۳۔ ایسے بد مذہبوں کیلئے اللہ کی بارگاہ میں کوئی قدر و منزلت نہ ہوگی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی بارگاہ میں (قیامت کے روز) ایک مونا بھاری بھر کم آدمی آئے گا لیکن اللہ کی بارگاہ میں جھمکے پر کے برابر بھی اس کا وزن نہ ہوگا اور فرمایا یہ آیت پڑھو۔ فَلَا يُقِيمُونَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ذُنُوبًا (۳)۔ یہ حدیث بخاری و مسلم نے نقل کی ہے۔ ابو نعیم اور آل جری نے اس آیت کے تحت جو حدیث نقل کی ہے وہ اس طرح ہے کہ ایک طاقتور بہت زیادہ کھانے والے شخص میزبان میں رکھا جائے گا تو اس کا وزن ایک جو کے برابر بھی نہ ہوگا اور فرشتہ ایسے ستر آدمیوں کو ایک دھکا دے کر پھینک دے گا یا یہ معنی کہ ہم ایسے لوگوں کے لئے میزان قائم ہی نہیں کریں گے کہ ان کے اعمال کا وزن کیا جائے۔ کیونکہ ان کے سارے اعمال ضائع ہو چکے ہوں گے بلکہ بغیر وزن اور تول کے انہیں دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔ یا یہ معنی کہ جن اعمال کو وہ نیکیاں خیال کرتے ہیں ان کا میزان میں کوئی وزن نہ ہوگا۔ امام بغوی فرماتے ہیں

۲۔ جامع ترمذی، جلد 4، صفحہ 550 (اعلیٰ)

۱۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 191 (اتحاریہ)

۳۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 691 (وزارت تعلیم)

حضرت ابو سعید خدری نے فرمایا لوگ قیامت کے روز اپنے اعمال لے کر آئیں گے ان کے پاس اعمال تہامہ بہاڑی طرح بڑے بڑے ہوں گے، جب ان کا وزن کیا جائیگا تو انکا کچھ وزن نہ ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ فلا نقیم لہم یوم القیامۃ وزننا کیا میرا ہے (۱)۔

امام سیوطی فرماتے ہیں اہل علم کا اختلاف ہے کہ کیا متوسلین کے لئے میزان خاص ہے یا کفار کے اعمال کا بھی وزن کیا جائے گا۔ پہلے قول کے موید آیت کریمہ فلا نقیم لہم یوم القیامۃ وزننا کو دلیل بناتے ہیں اور دوسرے قول کے حمایتی یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ ارشاد ان کے اعمال کی کوئی حیثیت نہ ہونے سے مجاز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَصَنِّحَفَّتْ صَدْرُؤْمِئِنَّہُ فِی اُولَیْمَتِہُ الَّذِیْنِ خَبِرُوْا اَنْفُسُہُمْ فِی جَهَنَّمَ خَلِیْدًا اِلَّا بِہِ اِلٰی قَوْلِہٖ اَنْہُمْ یُنْکَرْنَ اِلٰیہِیْ شَتْلًا عَیْنُکُمْ فَانْتُمْ بِہَا تُشَکِّکُوْنَ۔ ترجمہ: اور جن کے پلڑے لٹکے ہوں گے تو وہ ہی لوگ ہیں جنہوں نے نقصان پہنچایا اپنے آپ کو وہ جہنم میں ہمیشہ (چلتے) رہیں گے۔

علامہ طبری فرماتے ہیں۔ ہر شخص کے اعمال کا میزان ہونا ضروری نہیں، وہ لوگ جو بغیر حساب و کتاب کے جنت میں داخل ہوں گے ان کے لئے میزان نصب نہ ہوگا۔ اسی طرح جہنمیں جلدی جلدی بغیر حساب و کتاب دوزخ میں ڈالا جائے گا ان کے لئے بھی میزان نہ ہوگا۔ اور ایسے لوگوں کا ذکر اس ارشاد میں ہے۔ یُضْرَفُ الْمُنْجَرُونَ بِمِيزَانٍ۔ علامہ قرطبی کا یہ قول دونوں قولوں اور آیتوں کو جمع کر دیتا ہے اور دوسری فریق جہنمیں جلدی بھیجا جائے گا ان کے لئے میزان نہ ہوگا اور بقیہ کفار کیلئے میزان ہوگا۔ امام سیوطی نے اسی طرح لکھا ہے۔ میں کہتا ہوں آیت میں مذکورہ کفار کو منافقین اور اہل کتاب کے ساتھ خاص کرنے کا بھی احتمال ہے کیونکہ منافقین ابتداءً مسلمانوں میں رہیں گے اور ہر قوم کے اپنے معبود کے پیچھے جانے کے بعد اہل کتاب میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

ذٰلِکَ جَزَاؤُہُمْ جَہَنَّمُ بِمَا کَفَرُوْا وَاَتَّخَذُوْا اٰیٰتِیْ وَرَسُوْلَیْہِمْ حُزُوًا ﴿۱۰﴾

”یہ ہے ان کی جزا جہنم اس وجہ سے کہ انہوں نے تمہارے کلام اور میری آیتوں اور رسولوں کو مذاق بنا لیا۔“

۱۔ ذالک کا مشارا لید۔ ان کے اعمال کا سقوط اور ان کا بے قدر ہونا ہے۔ یہ جملہ متافہ ہے (یعنی ذالک مبتدا محذوف کی خبر ہے) اور یہ بھی جائز ہے کہ ذالک مبتدا ہو اور جزاء ہم مبتدا ثانی ہو اور جہنم خبر ہو پھر جملہ اسید ذالک کی خبر ہو اور ضمیر عائد محذوف ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ ذالک مبتدا ہو اور جزاء ہم اس کا بدل ہو اور جہنم کی خبر ہو۔ یا جزاء ہم ذالک کی خبر ہو اور جہنم خبر کا عطف بیان ہو۔ ہذا کا معنی مذاق کرنا ہے اور یہاں مصدر اسم مفعول کے معنی میں ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَانَتْ لَہُمْ جَنَّٰتٌ اَلْفُردُوسِیْنَ نَزُوًا ﴿۱۱﴾

”یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل (بھی) کرتے رہے تو فردوس کے باغات ان کی رہائش گاہ ہوں گے۔“

۱۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو فردوس کا سوال کرو کیونکہ وہ بہتر جنت ہے، اور اہل جنت ہے، اس کے اوپر زمین کا عرش (عظیم) ہے، اسی سے جنت کی نہریں پھوٹی ہیں (متفق علیہ ۲) تمدنی اور حاکم نے عبادہ بن الصامت سے اور تیمی نے معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جنت کے سو درجے ہیں اور ہر درودرجوں کے درمیان زمین اور آسمان جیسا فاصلہ ہے۔ فردوس جنت کا اعلیٰ درجہ ہے اور اس کے اوپر عرش ہے اور اس سے جنت کی چار نہریں نکلتی ہیں جب تم اللہ سے سوال کرو تو اس سے فردوس کا سوال کرو۔

بزار نے عمر بن مساریہ سے، الطبرانی نے ابی امامہ سے اسی طرح روایت کی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

جب تم اللہ تعالیٰ سے مانگو تو فردوس مانگو کیونکہ وہ جنت کا اعلیٰ مقام ہے (1)۔ حضرت ابی امامہ کی حدیث میں یہ زیادہ ہے کہ اصل فردوس عرش کی چڑچڑاہٹ کو سنتے ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت کعب نے فرمایا جنتوں میں سے فردوس سے کوئی اعلیٰ جنت نہیں ہے، اس میں نیکی کا حکم کریں اور برائی سے روکنے والے داخل ہو۔ کعب سے مفاضل فرماتے ہیں فردوس جنت کا بلند ترین افضل اور نعمتوں سے لبریز مقام ہے (2)۔

احمد علیسی اور تہیقی نے ابو موسیٰ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت الفردوس چار ہیں، دوسونے کی جن جن کے زیور مکان اور ہر چیز سونے کی ہے اور دو چھتیس چاندی کی ہیں۔ الحدیث۔ یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ ہر جنت کو فردوس کہا جاتا ہے۔ لیکن پہلا قول صحیح ہے، اس حدیث میں راوی سے یہ سہو ہے یا یہاں فردوس کا لغوی معنی مراد ہے۔ کعب فرماتے ہیں فردوس ایک باغ ہے جس میں انگور ہیں۔ مجاہد فرماتے ہیں فردوس رومی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی باغ ہے۔ مگر یہ فرماتے ہیں یہ جنتی زبان میں باغ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ زجاج فرماتے ہیں یہ رومی لفظ ہے عربی کی طرف منتقل ہو کر آیا ہے۔ ضحاک فرماتے ہیں فردوس سے مراد ایسا باغ ہے جس کے درخت بہت گھٹتے ہوں۔ بعض فرماتے ہیں اس سے مراد خوبصورت باغ ہے۔ بعض فرماتے ہیں فردوس سے مراد وہ باغ ہے جس میں قسم قسم کے پودے ہوں اور مال کی جمع فراہم ہے (3)۔ تو ابو موسیٰ کی روایت میں فردوس کا لفظ لغوی معنی کے اعتبار سے مستعمل ہوا ہے لیکن معنی علمی کے اعتبار سے جنت کا اعلیٰ مقام ہے اگر آیت میں لغوی معنی مراد ہو تو اس موصول اپنے عموم پر ہوگا، یعنی عام مومنین مراد ہوں گے اور اگر معنی علمی مراد ہو تو اللہ تعالیٰ سے مراد وہ لوگ ہوں گے جن کے پاس ایمان کامل موجود ہے۔

تہیقی نے حضرت انس کے حوالہ سے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فردوس کو اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا ہے اور مشرک اور دوغلی شراب خور پر اس میں داخلہ ممنوع قرار دیا ہے۔ ابن ابی الدنیا نے صفحہ ۱۱۶ میں عبد اللہ بن الحارث بن نوفل سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تین چیزوں کو اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا ہے۔ آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا، تورات کو اپنے ہاتھ سے لکھا، فردوس کو اپنے ہاتھ سے لگایا۔ فرمایا اپنی عزت و جلال کی قسم فردوس میں ہمیشہ شراب پینے والا اور دیوث داخل نہ ہوں گے۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! دیوث کون ہے؟ فرمایا جو اپنی بیوی میں زنا کی برائی کو دیکھتا ہے اور پھر اس میں سستی کا مظاہرہ کرتا ہے (4)۔

خُلِّيَ يَنْ فِيهَا لَا يَبْعُونَ عَنْهَا جَوْلًا ۞

”وہ ہمیشہ رہیں گے ان میں (اور) انہیں چاہیں گے کہ وہ اس جگہ کو بدل لیں۔“

۱۔ خالدین فیہا حال مقدرہ ہے، وہ اس جگہ کو نہیں بدلیں گے کیونکہ جنت الفردوس سے زیادہ عمدہ جگہ ہے انہیں کہ وہ اس کا اشتیاق کریں۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس جملہ سے مراد ان کے جنت میں ہمیشہ رہنے کی تاکید ہو۔ حاکم وغیرہ نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ قریش نے یہود سے کہا تم ہمیں کوئی سوال بناؤ جو ہم اس شخص (محمد ﷺ) سے پوچھیں۔ تو یہود نے کہا تم اس سے روح کی حقیقت کے متعلق سوال کرو۔ انہوں نے سوال کیا تو یشئوونک عن الرؤح الخلی المؤمنون آمنو ربہ و ما اؤتیتہم بین العلمی اذ عینہا۔ کارشاد نازل ہوا۔ یہود نے کہا ہمیں علم کثیر عطا کیا گیا ہے، ہمیں تورات ملی ہے اور جسے تورات کا علم دیا گیا ہوا ہے خیر کثیر عطا کیا گیا ہوتا ہے۔

1۔ الدر المنور، جلد 4، صفحہ 457 (اعلیٰ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 192 (الطارق)

4۔ کنز العمال، جلد 6، صفحہ 31-130 (الترات الاسلامی)

3۔ ایضاً

اس وقت یہ ذیل کی آیت نازل ہوئی۔

قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مَدَادًا الْكَلِمَتِ سَأَبِي لَنَقِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَتَفَدَّ كَلِمَتُ سَأَبِي وَ
لَوْ جُئْنَا بِسَلْمَةٍ مَدَدًا ۝۱۱

”(اے حبیب) آپ فرمائیے کہ اگر ہو جائے سمندر و تھائی میرے سب کے کلمات (کلمتے) کے لئے تو ختم ہو جائے گا سمندر اس سے بیشتر کے ختم ہوں میرے سب کے کلمات اور اگر ہم لے آئیں اتنی اور تھائی اس کی مدد کو (تب بھی ختم ہوں گے)۔“

۱۔ مداد کا معنی ہر وہ چیز ہے جس کے ذریعہ سے دوسری شئی کی امداد کی جائے جیسے دوات کے لئے سیاہی اور چراغ کے لئے تیل۔ مداد کا اصل معنی زیادتی اور کسی چیز کا بے بعد و بیکرے آنا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں اگر سارے سمندر قلم کے لئے سیاہی بن جائیں اور قلم اللہ تعالیٰ کے علوم و حکمت کے کلمات کو لکھنا شروع کر دے (۱) تو سارے سمندروں کا پانی ختم ہو جائے گا لیکن اس کے کلمات علم و حکمت کی انتہا نہ ہوگی کیونکہ ہر چیز کی انتہا اور حد ہے لیکن اس کے کلمات علم و حکمت لامحدود اور لامتناہی ہیں، وہ کبھی ختم نہ ہوں گے۔ تنفد کو ختمہ اور کسائی لیاہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ فعل مقدم ہے اور قائل مؤنث غیر حقیقی ہے۔ فرمایا اگرچہ ہم اس سمندر کی مثل بطور روشنائی ایک اور سمندر بھی لے آئیں تو پھر بھی اس کی شان کو مکمل کرنے سے پہلے وہ ختم ہو جائیں کیونکہ تھائی (ختم ہونے والا) کا مجموعہ بھی تھائی ہوتا ہے۔ اسام میں سے جو چیز وجود میں داخل ہوتی ہے وہ تھائی ہوتی ہے اور تھائی لامحالہ غیر تھائی سے پہلے ختم ہو جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں اگر ہم سمندری ایسات سمندر اور اس کی مثل زائد سمندر فرض کریں اور اس کے ذریعہ سے علم الہی کے کلمات کو لکھا جائے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کلمات میں سے ہر جزء جو قلم کے ساتھ قائم ہوگا اس جزء پر گزشتہ زمانہ میں طاری ہونے والے احوال لکھنا قلم کے لئے ممکن نہ ہوگا۔ اگرچہ وہ احوال تھائی ہی ہوں۔ پس اللہ کی دوسری ممکنات کے متعلق معلومات کا احاطہ کیسے ممکن ہوگا۔ تھائی کے لئے غیر تھائی کا احاطہ کرنا بہت بعید ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس نے فرمایا کہ یہود نے کہا تم خود کہتے ہو کہ ہمیں حکمت عطا کی گئی ہے اور تمہاری کتاب قرآن حکیم میں ہے کہ جسے حکمت دی گئی اسے خیر کثیر دیا گیا۔ پھر آپ کہتے ہیں تمہیں تھوڑا علم دیا گیا ہے۔ اس وقت اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی (2) کہ وہ علم جو اس کتاب میں فی نفسہ خیر کثیر ہے کیونکہ ہمیں تمہاری معیشت و آخرت کی صلاح کے تمام احکام موجود ہیں لیکن یہ اللہ تعالیٰ کے کلمات کے سمندروں کا ایک قطرہ ہے۔

بمشلہ میں بالبعد یہ کے لئے ہے اور مشلہ جتنا کا مفعول ہے اور مداد تجیز ہے جیسا کہ علی النصر فہلہا بزدا ہے۔

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَهُمُ إِلَهٌ وَاحِدٌ ۚ فَمَن كَانَ يَرْجُوا
لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ ۚ أَحَدًا ۝۱۲

”(اے بیکر معنائی و زبانی!) آپ فرمائیے کہ میں بشر ہی ہوں تمہاری طرح وہی کہ جاتی ہے میری طرف کہ تمہارا خدا صرف اللہ وحدہ ہے۔ پس جو شخصن امید رکھتا ہے اپنے رب سے ملنے کی جے تو اسے چاہئے کہ وہ نیک عمل کرے اور نہ شریک کرے اپنے رب کی عبادت میں کسی کو جسے۔“

۱۔ ابن عباس فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم ﷺ کو اس آیت کریمہ میں اظہار تواضع کا درس دیا ہے تاکہ اس کی مخلوق پر اپنی بڑائی نہ کرتے رہیں۔ حکم دیا کہ خود ہی اقرار کرو کہ میں تمہاری مثل بشر ہوں لیکن مجھے وحی کے لئے مخصوص فرمایا گیا ہے اور مجھے وحی کی عزت عطا کی گئی ہے۔ میری طرف وحی کی گئی کہ تمہارا خدا ایک ہے جس کا ذات و صفات میں کوئی شریک نہیں ہے (۱)۔ میں کہتا ہوں اس آیت کریمہ میں اس فقہ کا سد باب کیا گیا ہے جس میں انصرافی بننا ہونے تھے، جبکہ انہوں نے مسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھے تھے کہ انھوں کو جینا کر دیتے ہیں۔ برص شدہ و مریضوں کو درست کر دیتے ہیں۔ مردوں کو زندہ کر دیتے ہیں۔ (تو انہوں نے آپ کو خدا کا بیٹا کہنا شروع کر دیا تھا) حضور نبی رحمت ﷺ کو مسیٰ علیہ السلام سے کسی گنا زیادہ معجزات عطا کئے گئے تھے۔ آپ کے معجزات کو دیکھ کر اس بد عقیدگی میں لوگوں کے ہمتا ہونے کا زیادہ امکان تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ تم اپنی ان ساری عظمتوں اور ان کثرت کمالات کے ہوتے ہوئے اعلان کرو کہ میں اللہ کا عبد ہوں۔ وہ میرا معبود ہے۔ اللہ ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک و ہمسر نہیں ہے۔

۲۔ امام ابوہریرہ فرماتے ہیں یہاں رجا کا لفظ خوف و امید کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ شاعر نے استعمال کیا ہے۔

فلا کل ما توجو من الخیر کان و کل ما توجو من الشر واقع

یعنی جس خیر کی تم امید کرتے ہو ضروری نہیں کہ تمہاری خواہش و امید پوری ہو جائے اور برائی جنکا تمہیں خوف ہے اس کا واقع ہونا بھی یقینی نہیں ہے (۲)۔

۳۔ جو سن ثواب اور اور دیت باری تعالیٰ کا متمنی ہے تو اسے چاہئے کہ وہ صرف اس کی رضا کے لئے اعمال صالحہ کرے، عمل میں ربا کاری، نمود و نمائش کا زہر بائبل نہ ہو اور اپنے عمل پر کسی نیر سے بڑا دھننا کا خواہش مند نہ ہو۔

۴۔ ابن ابی حاتم نے کتاب الاطعام میں طاؤس سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں موقف حج میں کھڑا ہوتا ہوں اور مقصود اللہ کی رضا ہوتی ہے اور میری یہ بھی خواہش ہوتی ہے کہ میرا یہاں کھڑا ہونا دیکھا جائے (یعنی لوگ مجھے دیکھ لیں) آپ ﷺ نے اس شخص کی بات سن کر کوئی جواب نہ دیا حتیٰ کہ یہ آیت فھن کان یوجو الایہ نازل ہوئی۔ یہ حدیث مرسل ہے۔ حاکم نے مستدرک میں متسلل عن طاؤس عن ابن عباس کے سلسلہ سے نقل کی ہے اور شیخین کی شرط پر اسے ضعیف کہا ہے۔

۵۔ ابن ابی حاتم نے مجاہد سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں مسلمانوں میں سے ایک شخص جہاد کرتا تھا اور وہ یہ بھی پسند کرتا تھا کہ اس کے جہاد کو دیکھا جائے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی من کان یوجو لقاء ربہ الایہ۔

۶۔ ابونعیم اور ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں سدی الصغیر عن الکلی عن ابی صالح عن ابن عباس کے طریق سے روایت کیا ہے کہ جناب بن زہیر جب نماز پڑھتے یا روزہ رکھتے یا صدقہ کرتے اور لوگوں میں اپنے عمل کا تذکرہ سننے تو خوش ہوتے تھے اور اس خوشی میں نیکی میں اور اضافہ کرتے اس پر یہ آیت فھن کان یوجو الخ نازل ہوئی (۳)۔ اگر یہ کہا جائے کہ ترمذی شریف کی روایت میں ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں اپنے گھر میں نماز پڑھتا ہوں میرے پاس ایک شخص آیا مجھے یہ بات بڑی اچھی لگی کہ اس نے مجھے نماز کی حالت میں دیکھا ہے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اے ابوہریرہ رضی اللہ

1- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 192 (انتہاریہ)

3- الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 458-69 (اعلیٰ)

2- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 193 (انتہاریہ)

تعالیٰ عنہ اللہ تعالیٰ پر رحم فرمائے تیرے لئے دو اجر ہیں ایک خفیہ عبادت کرنے کا اجر دوسرا علانیہ عبادت کا اجر۔
مسلم میں ابو ذر سے روایت ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا گیا حضور بتائیں کہ جو شخص نیک عمل کرتا ہے اور لوگ اس کی اس عمل پر تعریف کرتے ہیں (اس کو اجر ملے گا) فرمایا یہ مومن کو جلدی ملنے والی بشارت ہے (1)۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ دونوں احادیث آیت کے شان نزول میں ذکر کی گئی، احادیث کے منافی ہیں ان میں تطبیق کس طرح ہوگی۔

ہم کہتے ہیں ان دونوں قسم کے ارشادات میں کوئی تضاد اور مخالفت نہیں ہے کیونکہ آیت کے شان نزول میں جو احادیث نقل کی گئی ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ جو نیک عمل کرتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کے عمل کو دیکھیں اور اس کے عمل کی تعریف کریں یا وہ عمل میں زیادتی کرتا ہے جب اس کو لوگ دیکھیں تو یہ سب ریا کاری اور شرک خفی ہے۔ اور جو شخص نیک عمل کرتا ہے، لوگ اس کو دیکھ کر اس کی تعریف کرتے ہیں اور وہ اس پر خوش ہوتا ہے، جبکہ اس کا مقصود اس عمل سے لوگوں کی شام اور ان سے اجر لینا نہیں ہے اور ان کی خاطر وہ عمل میں زیادتی نہیں کرتا تو یہ اس کو جلدی ملنے والی بشارت ہے اور اس کو خفی اور علانیہ عبادت کا دوہرا اجر بھی ملے گا۔ واللہ اعلم۔

ہندب سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو لوگوں کو سنانے کے لئے عمل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو سنانے کی جزا دیتا ہے اور جو ریاہ کاری کا عمل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ریاہ کاری کی جزا دیتا ہے۔ (بخاری و مسلم) (2)

محمد بن لیبید سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا مجھے تم پر سب سے زیادہ خوف شرک اصغر کا ہے۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ شرک اصغر (چھوٹا) کیا ہے۔ فرمایا ریاہ کاری۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے بیہی نے شعب الایمان میں یہ مفہوم زائد لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو نیک اعمال کی جزا عطا فرمادے گا تو ریاہ کاروں سے فرمائے گا تم اپنے اعمال کا اجر طلب کرنے کے لئے ان لوگوں کے پاس جاؤ جن کو تم دکھانے کے لئے دنیا میں عمل کرتے تھے اور دیکھو کیا تم انکے پاس جزا اور خیر پاتے ہو (3)۔
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں شرک اصغر سے بچو یا چھو گیا شرک اصغر کیا ہے فرمایا ریاہ کاری۔ اس اثر کو ابن مردودہ نے اپنی تفسیر میں، اصہبانی نے ترتیب و ترغیب میں روایت کیا ہے۔

ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں شرکوں کے شرک سے مستغنی ہوں۔ جس نے کوئی عمل کیا اور اس میں میرے ساتھ غیر کو شریک کیا تو میں اسے اور اس کے شرک کو چھوڑ دیتا ہوں۔ ایک روایت میں ہے کہ میں اس سے بری ہوں، وہ اس کے لئے ہے جس کے لئے اس نے عمل کیا (4) اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابو سعید بن ابی فضاہ رسول اللہ ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن لوگوں کو جمع فرمائے گا جس دن کے آنے میں کوئی شک نہیں ہے تو ایک نمدارینے والا نمدارے گا جس نے کسی نیک عمل کسی غیر اللہ کو شریک کیا آج اسے چاہئے کہ غیر اللہ سے اپنا ثواب طلب کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں شرکاء اور شرک سے بے نیاز ہوں (5)۔ اس حدیث کو امام احمد ترمذی ابن ماجہ ابن حبان اور بیہی نے روایت کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرمایا کہ جو شخص نیک عمل لوگوں کو سنانے کے

3- شعب الایمان، جلد 5، صفحہ 333 (اعلیٰ)

2- ایضاً

5- ایضاً صفحہ 330

1- مشکاۃ المصابیح، صفحہ 454 (ترمذی)

4- ایضاً صفحہ 229

لئے کرے گا اللہ تعالیٰ اسے سنانے کی سزا دے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے حقیر فرمائے گا اور اسکو رسوا کرے گا (۱)۔ اس حدیث کو امام احمد اور ترمذی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔

حضرت شہداء بن اوس سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتا سنا ہے کہ جس نے ریاء کاری سے نماز پڑھی اس نے شرک کیا۔ جس نے ریاء کاری سے روزہ رکھا اس نے شرک کیا۔ جس نے ریاء کاری سے صدقہ دیا اس نے شرک کیا (۲)۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز سرسبز صحیفے لائے جائیں گے اللہ تعالیٰ فرمائے گا ان صحیفوں کو پھینک دو اور ان کو قبول کر لو، فرشتے عرض کریں کہ تیری عزت کی قسم ہم نے ان اعمال ناموں میں وہ کچھ لکھا ہے جو انہوں نے کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا یہ اعمال میری رضا کے لئے نہیں تھے اور نہ میں آج انہیں قبول کرتا ہوں اور نہ ان اعمال میں میری خوشنودی مطلوب تھی (۳)۔ اس حدیث کو بزاز، طبرانی نے الاوسط میں دارقطنی، اصہبانی نے التزیب میں روایت کیا ہے۔

شیر بن عطیہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں ایک شخص کو قیامت کے روز حساب کے لئے پیش کیا جائے گا، اس کے نامہ اعمال میں پہاڑوں کی مثل نیکیاں ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو نے فلاں دن اس لئے نماز پڑھی تھی کہ تجھے نمازی کہا جائے۔ میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، خالص دین میرے لئے ہے اور تو نے فلاں دن روزہ رکھا تھا کہ تجھے روزہ دار کہا جائے، میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور خالص دین میرے لئے ہے پھر یکے بعد دیگرے اس کے سارے ریاء کاری والے عمل منادیے جائیں گے۔ فرشتے اسے کہیں گے تو نے غیر اللہ کے لئے عمل کئے تھے۔

شہداء بن اوس سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ پہلے اور پچھلے تمام لوگوں کو حد نظر تک ایک جگہ جمع فرمائے گا۔ ایک پکارنے والا لوگوں کو یہ بات سنانے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں تمہیک سے بہتر ہوں بروہ عمل جو دنیا میں میرے لئے کیا گیا اور اس میں غیر کو بھی شریک کیا گیا، تو آج میں اپنے شریک کو ترک کرتا ہوں اور آج میں کوئی عمل قبول نہیں کرتا مگر وہ جو خاصاً میری رضا کے لئے کیا گیا تھا (۴)۔ اس حدیث کو اصہبانی نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ جس نے دوسروں کو دکھانے کے لئے کوئی عمل کیا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کا کام کو اسی کے سپرد کرے گا جس کے لئے اس نے عمل کیا تھا اور فرمائے گا دیکھ شریک تجھے کچھ نفع پہنچا سکتا ہے۔ صوفیاء کرام اس آیت کی تادیل اس طرح کرتے ہیں کہ جو نافرمانی، فحشاء اور فسق پر بلا کیف قرب الہی چاہتا ہے، اسے چاہئے کہ فناء نفس اور رد اہل نفس کے ازالہ کے بعد عمل صالح کرے کیونکہ نفس کے رد اہل عمل کو فاسد کر دیتے ہیں اور عمل کی اصلاح صرف فناء نفس کے بعد ہوتی ہے۔ ولا یشرک بعبادۃ ربہ احداً کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کا غیر اللہ کے ساتھ یہ قلبی تعلق ہونہ علی علاقہ ہو اور نہ محبت کا تعلق ہو کیونکہ دل کے علمی تعلق سے مراد ذکر ہے اور ذکر عبادت ہے۔ محبت عبادت کا تقاضا کرتی ہے اور محبوب وہ ہے جو موجود ہے کیونکہ عبادت اجتہاد رجب کی تواضع اور ذلت کو کہتے ہیں۔ انسان اپنے نفس کی تدلیل کرتا اور اپنے محبوب کی بارگاہ میں اجتہاد رجب کی تواضع کرتا ہے۔ اور یہ خیر فناء

2- الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 460 (ایضاً)

1- شعب الایمان، جلد 5، صفحہ 331 (اعلیہ)

3- الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 459 (اعلیہ)

2- تعجم اوسط از طبرانی، جلد 3، صفحہ 287 (المعارف)

قلب کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ غیر اللہ کے ساتھ علمی تعلق تو اولیاء کرام بلکہ انبیاء کو بھی ہوتا ہے تو ہم اس کے جواب میں یہ کہیں گے کہ علم جو فناء قلب کے بعد ہوتا ہے اس کا محل قلب نہیں ہوتا بلکہ اس کا دل تو اس مقام پر رحمن کی تجلیات کا مرکز ہوتا ہے۔ لیکن علم کا تعلق اس محل کے علاوہ ہوتا ہے کیونکہ حکمت کے تقاضا کے مطابق تکلیف احکام کا مادہ باقی ہوتا ہے۔

فصل

حضرت ابو الدرداءؓ نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ سورہ کہف کی پہلی دس آیتیں جسے یاد ہوں گی وہ دجال کے فتنے سے محفوظ رہے گا (1)۔ اس حدیث کو مسلم احمد ابو داؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے ابو الدرداء سے اس طرح روایت کی ہے کہ جو سورہ کہف کی پہلی تین آیات پڑھے گا وہ دجال کے فتنے سے بچ جائے گا۔ امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ حضرت ہبل بن معاذ حضرت انس سے ابو وہب حنظلہ سے روایت کرتے ہیں کہ جو سورہ کہف کا اول و آخر پڑھے گا وہ اکیلے پاؤں سے سر تک نور اور جو ساری سورت تلاوت کرے گا وہ اس کے لئے زمین سے آسمان تک نور ہوگی۔ امام احمد مسلم اور نسائی نے اس طرح روایت کی ہے جس نے سورہ کہف کی آخری دس آیات پڑھیں وہ دجال کے فتنے سے محفوظ ہوگا۔

نبی کریم ﷺ سے مروی ہے جس نے اپنے بستر پر سورہ کہف پڑھی تو اس کی سونے کی حالت میں ایک نور ہوگا جو اس کے لئے اس کے بستر سے مکہ تک جھلگے گا اور اس نور کے اندر فرشتے ہوں گے جو اس کے اٹھنے کے وقت تک اس کے لئے دعا مغفرت کرتے رہیں گے۔ اگر اس کا سونے کا مقام مکہ میں ہوگا تو اس کے لئے نور ہوگا جو اس کے بستر سے بیت المعمور تک چلے گا، اس میں فرشتے ہوں گے جو اس کے بیدار ہونے تک اس کے لئے دعا کرتے رہیں گے۔ اس حدیث کو ابن مردودہ نے نقل کیا ہے۔ حضرت ابو سعید سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو سورہ کہف جمعہ کے دن تلاوت کرے گا تو اس جمعہ اور آئندہ جمعہ کے درمیان اس کے لئے وہ نور روشنی کرے گا (2)۔ اس حدیث کو حاکم نے روایت کیا ہے اور صحیح کہا ہے اور بخاری نے دعوات کبیر میں نقل کی ہے۔

بخاری نے شعب الایمان میں اس طرح روایت کی ہے کہ جو جمعہ کے دن سورہ کہف کی تلاوت کرنے کا اس کے پاس سے کعبہ تک اس کے لئے نور چمکتا رہے گا۔ براء بن عازب سے مروی ہے فرماتے ہیں ایک شخص سورہ کہف کی تلاوت کر رہا تھا اور اسکے قریب ایک گھوڑا اور سیبوں سے باندھا ہوا تھا۔ پس ایک بادل اس پر چھانے لگا اور پھر لگانے لگا اور قریب آئے لگا۔ اور اس کے گھوڑے نے اس بادل کے قریب ہونے کی وجہ سے بدکننا شروع کر دیا۔ صبح وہ شخص نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا، اس نے رات کا ماجرا عرض کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ (بادل) وہ سکینت تھی جو تلاوت قرآن کے وقت نازل ہوتی ہے (2)۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص رات کو فھن کمان پر جو لقا رہہ الا یہ تلاوت کرے گا، اس کے لئے عدنان سے مکہ تک نور ہوگا جس میں فرشتے بھرے ہوں گے (ازلیہ الخفاء)

اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق سے سورہ کھف کا ترجمہ بروز اتوار دس بج کر بیس منٹ پر صبح ششم ہوا۔

الحمد لله رب العالمين الصلوة والسلام على سيد المرسلين

اللہم انی اعوذ بک من الہم والحزن واعوذ بک من العجز والکسل واعوذ
اے اللہ میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں حزن و غم سے تجھ سے پناہ مانگتا ہوں عجز اور سستی سے اور

بک من الجبن والبخل واعوذ بک من غلبة الدین وقهر الرجال
تجھ سے پناہ مانگتا ہوں بزدلی اور بخل سے اور تجھ سے پناہ مانگتا ہوں قرض کے غلبہ اور انسان کے قہر سے۔

اللہم انی اعوذ بک من ان اشرك بک وانا اعلم واستغفر لهما لا اعلم
اے اللہ میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں تیرے ساتھ دانستہ شرک کروں اور میں تجھ سے مغفرت طلب کرتا ہوں اس شرک سے
جو نادانستہ مجھ سے سرزد ہو۔

اللہم امین بجاه سيد الانبياء والمرسلين صلى الله عليه وآله واصحابه وازواجه وعلماء امته و اولياء ملته اجمعين۔

سورہ مریم

﴿سورہ مریم﴾ ﴿سورہ ۱۹﴾ ﴿سورہ ۹۸﴾ ﴿سورہ عاقلانہ﴾

سورہ مریم کی ہے، اس میں 6 رکوع اور 98 آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

﴿کھمبھ﴾

”کاف۔ با۔ یمن۔ میں۔ لے“

لے ابو بکر اور کسانکی نے حصار یاہ کے فتح کے انالہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن کثیر اور حفص نے دونوں کو فتح کے ساتھ، ابن عامر اور معمر نے حاکم کے فتح اور یاہ کے انالہ کے ساتھ، نافع نے حاکم کو انالہ کے ساتھ اور یاہ کو یمن میں پڑھا ہے۔

ذِكْرُ مَا حَمَّتِ رَبِّكَ عَبْدًا ذَكَرَ يُنِيَّا

”یہ ذکر ہے آپ کے رب کی رحمت کا جو اس نے اپنے بندے کے ذکر یا پڑھائی۔ لے“

لے حضرت نافع اور عامر ذکر سے پہلے صاف کو ظاہر کرتے ہیں اور باقی قرآن صاف کو نازل میں ادغام کرتے ہیں۔

اگر حروف مقطعات سے مراد سورت یا قرآن ہو تو ذکر رحمت ربک ان خبر جو گایا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: هذا المستلو ذکر رحمت ربک (یہ تلاوت کیا گیا ذکر ہے آپ کے رب کی رحمت کا) یاد ذکر و نعمت ربک (یعنی جو تجھ پر پڑھا گیا ہے تمہیں تیرے رب کی رحمت کا ذکر ہے) عبده، رحمت یاد ذکر کا مفعول ہے، اس تقدیر پر کہ رحمت ذکر کا نفعل ہو جیسا کہ اس جملہ میں ہے ذکر نبی جو ذمہ اور ذکر یا عبده سے بدل ہے یا عطف بیان ہے ذکر کو ترجمہ کسانکی اور حفص نے قصر کے ساتھ اور دوسرے قراء نے مد کے ساتھ پڑھا ہے۔

اِذْ نَادَى رَبَّهُ نِدًا خَفِيًّا

”جب اس نے پکارا اپنے رب کو چپکے چپکے۔ لے“

لے اذ طرف ہے جو رحمت یاد ذکر کے متعلق ہے۔ یعنی حضرت ذکر یا علیہ السلام نے اپنی عبادت گاہ میں آدھی رات کے وقت آہستہ آہستہ اپنے کریم رب کے حضور التجاہ کی۔ آہستہ اور خفیہ لہجہ میں اس لئے دعا کی کیونکہ سری اور خفی دعا میں اخلاص زیادہ ہوتا ہے۔ انشاء دعا کی سنت ہے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّي وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّي وَاسْتَعَلَ الرَّاسُ شَيْبًا لَّمْ اَكُنْ بِدَعْوَاكَ رَبِّتْ شَقِيًّا

”عرض کی اسے میرے رب لے میری حالت یہ ہے کہ کمرہ اور بوسیدہ ہوگئی ہیں میری ہڈیاں اور بالکل سفید ہوگیا ہے (میرا) سر بڑھاپے کی وجہ سے اور اب تک ایسا نہیں ہوا کہ میں نے تجھے پکارا ہوا ہے میرے رب اور میں ہمارا رہا

ہوں۔ ج۔

۱۔ یہاں سے حضرت زکریا علیہ السلام کی دردمندانہ التجاہ کا ذکر ہو رہا ہے۔ رب اصل میں یازہی تھا۔ حرف نداء اور مضاف الیکہ کو اختصار کی خاطر حذف کیا گیا ہے۔ وہن کا معنی کمزور اور نرم ہوتا ہے۔ وہن کی نسبت العظم (ہڈی) کی طرف کی گئی ہے کیونکہ ہڈیاں جسم کا سہارا اور بدن کی اصل ہیں یا اس لئے کہ بدن کے اعضاء میں سے ہڈیاں مضبوط ترین عضو ہیں جب ہڈیاں ناتواں اور کمزور ہو گئی ہیں تو بقیہ اعضاء زیادہ کمزور ہوں گے۔ اور العظم (ہڈی) کو مضروب ذکر فرمایا ہے لیکن مراد جنس ہے۔

۲۔ بڑھاپے کو آگ کے ساتھ تشبیہ دی ہے کیونکہ وہ بھی سفید ہوتا ہے اور آگ کے اشتعال کی طرح بالوں میں پھیل جاتا ہے۔ مبالغہ کے لئے اشتعال کی نسبت سر کی طرف فرمائی اور شیبہ کو بطور تمیز ذکر فرمایا اور اس جملہ میں اشارہ فرمایا کہ بڑھاپا پورے سر کو گھیر چکا ہے سب بال اولوں کی طرح سفید ہو چکے ہیں۔ الواس پر الف لام مضاف الیکہ کے محض میں ہے۔ الف ام پر اکتفا فرمایا اور مضاف الیکہ کو ذکر نہیں فرمایا کیونکہ مراد کا بطور تفسیر سے مستغنی کر دیتا ہے (مخاطب کا علم قید لگانے سے مستغنی کر دیتا ہے کیونکہ آپ اپنے سر کی حالت بیان فرما رہے تھے کسی غیر کے سر کی نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اسے میرے پروردگار میں بوڑھا ہو چکا ہوں (اس جملہ میں جو لفظ انہی میں ان کی وجہ سے بلاغت کے اعتبار سے انتہائی بلند درجے پر ہے)

۳۔ علماء کا اختلاف ہے کہ جب آپ نے یہ التجاہ کی تھی اس وقت آپ کی عمر کتنی تھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں آپ کی عمر مبارک ساٹھ سال تھی۔ ابن ابی حاتم نے ابن المبارک سے یہی قول روایت کیا ہے۔ بعض فرماتے ہیں ستر سال تھی۔ یہ قول عبد الرزاق اور ابن ابی حاتم نے ثوری سے نقل کیا ہے۔ اٹھلی فرماتے ہیں آپ کی عمر مبارک ایک سو میں سال تھی اور آپ کی المیہ محترمہ مدعا ہوائے سال کو پہنچ چکی تھی۔

۴۔ میرے کریم رب ماضی میں جب بھی میں نے تیری بارگاہے نیاز میں دست طلب دراز کیا تو تو نے ہمیشہ میری التجاہوں کو شرف قبولیت بخشا تو نے مجھے نامراد و اباؤں نہیں ٹھہرایا۔ میری آرزوں کی شاخ کو شرف بارگاہ ہمیشہ سے تیری سنت رہی ہے۔ آج بھی میں تجھ سے قبولیت کی امید لے کر آیا ہوں۔ کریم اپنے درگرم کے امیدواروں کو بھی نامراد نہیں ٹھہراتا۔ دعا مصدر ہے جو اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے تقدیر اس طرح ہے بدعہائی ایاک۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ فاعل کی طرف مضاف ہو۔ اس تاویل پر معنی یہ ہوگا کہ جب تو نے مجھے ایمان کے لئے دعوت دی تو میں تجھ پر ایمان لے آیا۔ ایمان کی روشنی کو ترک کر کے میں بد بخت و نامراد نہ ہوا۔ پس اس ایمان اور میرا تیری دعوت ایمان کو قبول کرنا ان کی برکت سے میری دعا کو شرف قبولیت عطا فرما۔ الم اکن کا جملہ پہلی کلام پر معطوف ہے یا ضمیر مشکم سے حال ہے کیونکہ معنی میں ضمیر مشکم فاعل ہے کیونکہ سابقہ جملوں کا معنی نسبت ہے (یعنی میں بوڑھا ہو چکا ہوں)

وَإِنِّي حَفِيفٌ الْمَوَالِي مِنْ وَمَرَأَى وَكَانَتْ أَمْرًا تِي عَاقِرًا أَهْبَبْتَنِي مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا ۝

”اور میں ذرا ہوں (اپنے بے دین) رشتہ داروں سے (کہ وہ) میرے بعد (دین ضائع نہ کر دیں)۔ اور میری

بانتھ ہے پس شخصہ سے مجھ اپنے پاس سے ایک وارث۔ ج۔“

۱۔ موالی سے مراد بچپا کے بیٹے ہیں۔ من و روانی یعنی میرے مرنے کے بعد یہ خذوف کے متعلق ہے۔ یعنی مجھے اپنے رشتہ داروں یا جو میرے بعد میرے جائشیں بننے والے ہیں ان سے اندیشہ ہے کہ میرے وصال کے بعد وہ میری جائشیں کا حق ادا نہیں کریں گے اور میری امت پر دین کو اپنی خواہشات کے مطابق بدل دیں گے۔ یہ جملہ یا تو پہلی کلام پر معطوف ہے یا الم اکن کے فاعل سے حال ہے۔

۱۰ اور میری بیوی ہانچے ہے۔ یعنی میں اور میری بیوی عمر کے اس حصہ میں پہنچ چکے ہیں جس میں عاۃً اولاد نہیں ہوتی۔ ایسی صورت میں تیرے فضل اور تیرے کمال قدرت سے امید کی جاسکتی ہے۔ اس لئے تیری بارگاہ سے عرض ہے کہ تو مجھے ایسا عطا فرما جو میرے وصال کے بعد اس منصب کی نازک ذمہ داریوں کو بخوش و خوبی سرانجام دے سکے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْ فِيْ يَدَيْكَ الْكَلِمَاتُ الْكُبْرٰى وَ اَجْعَلْهُ رَآبٍ رَّصِيْبًا ۝۱

”جو وارث بنے میرا اور وارث بنے یعقوب (علیہ السلام) کے خاندان کا لہ اور بنا دے اسے اے رب! پسندیدہ (سیرت والا) ۲۔“

۱۰ ابو عمرو اور کسائی نے یہ فرضی اور ہوت کو جزم کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ دعا کا جواب ہیں، جبکہ قراء نے ولیا کی صفت کے اعتبار سے مرفوع پڑھا ہے۔ یہاں میراث سے علم اور نبوت کی میراث ہے۔ مال کی میراث مراد نہیں ہے کیونکہ انبیاء کرام مال کا وارث نہیں بناتے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے علماء انبیاء کرام کے وارث ہیں اور انبیاء کرام کسی کو درمدم وینار کا وارث نہیں بناتے۔ وہ تو صرف علم کا وارث بناتے ہیں۔ جس نے ان کے علم سے کچھ حاصل کیا تو اس نے نبوت کی میراث کا بڑا حصہ لیا (۱)۔ اس حدیث کو امام احمد ابو داؤد ابن ماجہ اور دارمی نے کثیر بن قیس سے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے بھی یہ حدیث روایت کی ہے اور انہوں نے راوی کا نام قیس بن کثیر ذکر کیا ہے۔ مذکورہ بالا حدیث اور اس قسم کی دوسری احادیث کی وجہ سے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ان کے باپ محمد رسول اللہ ﷺ کی میراث سے حصہ نہیں عطا فرمایا تھا۔ جبکہ انہوں نے مائی میراث کا مطالبہ کیا تھا۔ اس پر سلف صالحین کا اجماع ہے۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سیدنا ابوبکر کے پاس آئے اور نبی کریم ﷺ کی طرف سے اپنی میراث کا مطالبہ کیا۔ سیدنا ابوبکر نے ان دونوں کو بتایا کہ میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ہم (انبیاء کرام) کسی کو وارث نہیں بناتے جو کچھ ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہے لا نورث ما نرکناہ صدقۃ (۲)۔

اس طرح امام بخاری نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے وصال کے وقت ازواج مطہرات نے اپنی میراث کے مطالبہ کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بھیجنے کا ارادہ کیا۔ حضرت عائشہ نے فرمایا کیا حضور ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم وارث نہیں بناتے جو کچھ ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہے (۳)۔ (پھر تم کیوں میراث کے مطالبہ کا مشورہ کر رہی ہو)۔ امام بخاری نے مالک بن ابی بن الحدیثان سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گیا تو ان کا پہرہ دار فرمایا اور پوچھا حضرت عثمان، حضرت عبدالرحمن، حضرت زبیر اور حضرت سعد آپ سے ملنا چاہتے ہیں، انہیں اندر آنے کی اجازت ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہاں۔ ان سب حضرات کو یہاں سے اندر آنے کی اجازت دی (تو وہ اندر تشریف لے آئے) پھر یہاں سے پوچھا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لائے ہیں، انہیں اجازت ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہاں اجازت ہے۔ حضرت عباس نے عرض کی اے امیر المؤمنین میرے اور ان کے درمیان فیصلہ فرمائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد فرمایا لوگو! میں تمہیں اس اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس کے حکم سے

یہ آسمان اور زمین قائم ہیں کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ ہم وارث نہیں بناتے جو ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہے۔ (ہم سے مراد حضور ﷺ کی اپنی ذات تھی) پوری مجلس نے کہا بیشک حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس تصدیق کے بعد حضرت علیؓ اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کیا تمہیں بھی علم ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایسا فرمایا تھا (1)۔

امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے در ثناء میرے وصال کے بعد دنیا (مال) تقسیم نہ کریں۔ جو کچھ میری ازواج مطہرات کے خرچ اور میرے خادموں کے خرچ سے بیچے وہ صدقہ ہے (2)۔ ابنی بنی احاد بیٹ حضرت حذیفہ بن الیمان زہیر بن العوام اور ابو ہریرہ سے مروی ہیں۔

شیمہ (رائسی) ان احادیث کا انکار کرتے ہیں اور سیدنا صدیق اکبر پر اعتراض کرتے ہیں حالانکہ ان کے اپنے مقتدا محمد بن یعقوب النکلتی نے اپنی جامع (الکافی) میں ابو عبد اللہ جعفر الصادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا اِنَّ الْاَنْبِيَاءَ لَمْ يُوْرَثُوْا جَزْءًا مِّمَّا وَاْرَثُوْا اَوْرَثًا اَوْ رَثُوْا اِحَادٍ نَّبِيْهِمْ۔ (ترجمہ) انبیاء کرام در ہم و دینار کا وارث نہیں بناتے بلکہ وہ اپنے ارشادات کا وارث بناتے ہیں۔

آیت کریمہ کا یہ بھی اسی بات کا مقتضی ہے کہ یہاں مال کی میراث کی بات نہیں کیونکہ آپ نے دعا فرمائی کہ وہ وارث سب سے میر اور یعقوب علیہ السلام کے خاندان کا۔ حالانکہ حضرت زکریا کے بیٹے کیلئے تمام آل یعقوب کی طرف سے اٹکے مال کا وارث بنا تو متسبی ہی نہیں تھا۔ نیز یہ مقام نبوت سے بہت بعید ہے کہ زکریا علیہ السلام ہر وقت اسی فکر و اندیشہ میں رہتے ہوں کہ میرے مال کا وارث میرے رشتہ دار اور چچا کے بیٹے بن جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

۱۔ اسے میرے پروردگار پھر میرے اس فرزندار جہند کو قول و عمل میں پسندیدہ بنا دے یا یہی معنی اس کو خوشی اور غم خیر اور مصیبت ہر حال میں اپنی رضا پر راضی رہنے والا بنا دے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ اٰتِيْكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ اَنَّكُمْ اَعْبَدُوْا اِلٰهًا غَيْرًا مِّمَّا عٰبَدْتُمْ ۗ لَكُمْ اَعْرَابٌ مِّنْ اٰمَنُوْا سَابِقُوْا فِيْ السَّبِيْلِ ۗ

”اے زکریا! ہم مزہ دیتے ہیں تجھے ایک بیٹے (کی ولادت) کا اس کا نام بھیجی ہوگا ہم نے نہیں بنایا اس کا کوئی نام ہم اس سے پہلے۔“

۱۔ اس کام میں اختصار ہے اللہ ہی اس طرح ہے کہ فاستجاب اللہ دعاءہ فقال زکریا یعنی حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کو اس قادر مطلق نے شرف قبولیت عطا فرمایا اور پھر یہ خوشخبری سنائی۔ سورۃ ال عمران میں زکریا کو وہ اور نصر کی صورت میں پڑھنے کے متعلق اختلاف گزر چکا ہے۔ فرمایا ہم تجھے ایک من مونے بیٹے کی خوشخبری دیتے ہیں جو تیرا صحیح جائشیں ہوگا، تیری مسند کا صحیح اہل ہوگا، اس کا نام بھی ہم خود رکھتے ہیں، اس کا نام بھیجی ہوگا۔ نام خود رکھ کر اللہ تعالیٰ نے بھیجی علیہ السلام کو شرف و عزت کے مقام بلند پر فائز فرمایا۔ اسمہ یحییٰ نام کی پہلی صفت ہے۔ اور لہم نجعل الخ یا تو حال ہے یا غلام کی دوسری صفت ہے۔ تم دادہ اور کبھی فرماتے ہیں اس سے پہلے بھیجی کسی کا نام نہ تھا (3)۔ اس میں دلیل ہے کہ قیصر معروف اسماء کے ساتھ کسی کا نام رکھنا کسی (اس ذات) کی تعظیم کے لئے ہوتا

ہے۔ سعید بن جبیر اور عطاء نے یہ معنی کیا ہے کہ ہم نے اس کی کوئی شبیہ اور مثل پیدا نہیں کی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اھل نعلم لہ منسجیاً۔ کیا تم جانتے ہو کہ اس کا کوئی ہم مثل ہے (1)۔ علامہ لغوی فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اس کی کوئی مثل نہیں بنائی جس نے نہ اللہ کی نافرمانی کی ہو اور نہ معصیت کا ارادہ کیا ہو (2)۔ میں کہتا ہوں اس سے یہ مراد ہے کہ آپ میں اکثر فضائل جمع تھے۔ اگرچہ بعض جزو کی فضیلت کا موجب تھے جیسے آپ کا عورتوں کی خواہش نہ کرنا وغیرہ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ پہلے انبیاء کرام سے افضل تھے کیونکہ حضرت طویل علیہ السلام اور کلیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر انبیاء پہلے نزرے ہیں اور وہ حضرت یحییٰ علیہ السلام سے فضائل و کمالات میں افضل تھے۔

علی بن ابی طلحہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت فرماتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مثل کسی بانجھ عورت نے بچہ نہیں جتا (3)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں ظاہر قول یہ ہے کہ یہ بھی ام ہے۔ اگر عربی ہے تو پھر فعل سے منقول ہے جیسے یعیش اور یعمر نام نعلال سے منقول ہیں۔ بعض علماء نے آپ کے اس اسم کی توجیہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آپ کی وجہ سے آپ کی والدہ کا رحم (جو بڑھاپے کی وجہ سے بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا تھا) زندہ ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے آپ کا نام یحییٰ رکھا گیا۔ یا اس وجہ سے کہ آپ کی دعوت تبلیغ کی وجہ سے اللہ کا دین زندہ ہوا تھا (4)۔

قَالَ رَبِّ اَنْتَ يَكُوْنُ لِي عَالِمًا وَاَنْتَ اَمْرًا لِي عَاقِرًا وَاَقْدَمَ بَلْعَتٌ مِّنَ الْكَبْرِ عَيْتًا ۝۱

”زکر یا نے عرض کی میرے رب! کیسے ہو سکتا ہے میرے ہاں بڑکا حال انکہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں خود بچنے لگتا ہوں بڑھاپے کی انتہا کو۔“

۱۔ رب اصل میں بنا رہی تھا۔ انہی معنی کیف ہے۔ و کانت امراتہ عاقراً یا حال ہے یا سابقہ کلام پر معطوف ہے۔ یہ زکر یا علیہ السلام کا کلام ایک سوال ہے اور حقیقت حال طلب کرنے کیلئے ہے۔ یعنی ہمارے ہاں کیسے بچہ ہوگا؟ ہم دو بارہ جوان ہو جائیں گے یا اس عیرانہ سالی میں ہمارا بچہ پیدا ہوگا۔ اس کلام میں اسباب کو دیکھتے ہوئے اولاد کو رنج کا اظہار ہے ورنہ آپ کو قدرت خداوندی پر کون تعجب نہ تھا۔

۲۔ عتیا اصل میں عنو تھا جیسے قعود ہے۔ عربوں نے دو متواتر ضموم اور دو واؤ کو نکل سمجھا اسلئے لکو کسر و دیا پھر پہلی واؤ کسر کے بعد یا محسے بدل گئی پھر دوسری واؤ یا ہ سے بدل کر وا قام ہو گئی۔ جمہور قرآن نے عتیا یعنی عین کے ضمور اور تا کے کسر و کے ساتھ پڑھا ہے۔ خفض اور کسائی نے مابعد کی اتباع کی وجہ سے عین کے کسر و کے ساتھ پڑھا ہے۔ العنو کا معنی اطاعت سے انکار کرنا ہے لیکن یہاں مراد انتہائی بوڑھا ہونا ہے کیونکہ ضعیف اپنے نفس کی اطاعت نہیں کرتا اور اپنی مراد حاصل کرنے کی استطاعت بھی نہیں رکھتا۔ قنود فرماتے ہیں یہاں مراد ہڈیوں کا خشک اور کمزور ہونا ہے۔ عرب کہتے ہیں عننا الشیخ یعنو عتیا و عسیا۔ جب کوئی شخص اپنی عمر کی انتہا کو پہنچ جائے اور بوڑھا ہو جائے۔ عات اور عاس اسے کہتے ہیں جس کا جسم اور ہڈیاں خشک ہو جائیں (5)۔

قَالَ كَذَلِكَ تَقَالَ رَبِّكَ هُوَ عَلٰی هٰٓئِیْنٍ وَّاقْدَحَلَمْتَكَ مِنْ قَبْلُ وَاَنْتَ كَشَيْتًا ۝۲

1- تفسیر لغوی، جلد 4، صفحہ 194 (انجاریہ) 2- ایضاً 3- ایضاً 4- تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زاوہ، جلد 5، صفحہ 530 (العلمیہ) 5- تفسیر لغوی، جلد 4، صفحہ 194 (انجاریہ)

”فرمایا یونہی ہوگا تیرے رب نے فرمایا ہے کہ اس کبرئی میں بچہ دینا میرے لئے آسان بات ہے اور (دیکھو!) میں نے تمہیں بھی تو پیدا کیا تھا اس سے پیشتر حالانکہ تم کچھ بھی نہ تھے۔“

۱۔ قال کا فاعل اللہ تعالیٰ یا وہ فرشتہ ہے جو بشارت دینے آیا تھا۔ حضرت زکریا کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا بات بالکل اسی طرح ہے جیسی آپ نے کی ہے، اسباب کے اعتبار سے بچے کا پیدا ہونا بہت عجیب اور حیران کن ہے لیکن تمہارا رب فرماتا ہے کہ مجھ پر یہ معاملہ آسان ہے، ایسا ہی ہوگا جیسا میں نے تم سے وعدہ کیا ہے۔ مجھے کسی سبب اور واسطے کی ضرورت نہیں (میں قادر مطلق ہوں) یہ بھی ہو سکتا ہے حضرت زکریا نے فرمایا ہو کہ بات اسی طرح ہے۔ (اس صورت میں کہ جو مثل کے معنی میں ہے، سابق کلام کی تاکید کے لئے زائد ہے اور سابق کلام سے مراد حضرت زکریا کا قول رب انی یکنون الخ ہے) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کذا لک منسوب ہو اس قال کی وجہ سے جو قال ربک میں ہے اور دونوں فعل معمول بنانے میں جھگڑا رہے ہیں۔ دوسرے کو مل کر آیا گیا اور پہلے فعل میں مضمر مانا گیا اور اس کا برعکس بھی جائز ہے، یعنی قال ربک کذا لک۔ یہ سابق کلام کی طرف اشارہ ہے یعنی بیشک بغلام الخ یعنی مجھ پر آسان ہے کہ میں تیری قوت جماع کو نادوں اور تیری بیوی کے دم کو علق کے لئے کھول دوں یا یہ مجھ کی طرف اشارہ ہے جس کی تفسیر ہو علیٰ ہین کا قول کر رہا ہے۔

۲۔ حمزہ اور کسائی نے حلقناک یعنی تعظیم کے طور پر نون اور الف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے مفرد کا صیغہ پڑھا ہے۔ یہ علیٰ میں جو ضمیر مجرد ہے اس سے حال ہے اور ہین کے متعلق ہے۔ ولم نک شبہنا۔ حلقناک کی تکمیل کے لئے ضمیر سے حال ہے یعنی میں نے اس سے پہلے تجھے پیدا کیا تھا حالانکہ تو بالکل معدوم تھا۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ معدوم شئی نہیں ہے (جیسا کہ اہلسنت اور بعض معتزلہ کا مسلک ہے، جبکہ بعض معتزلہ کہتے ہیں کہ معدوم شئی ہے۔ یعنی اہلسنت کے نزدیک معدوم پر شئی کا اطلاق نہیں ہوتا، جبکہ بعض معتزلہ کے نزدیک معدوم پر شئی کا اطلاق ہوتا ہے)

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً ۖ قَالَ آيَتُكَ أَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلَاثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ۝

”ذکر یا نے عرض کی اے میرے رب ظہراؤ میرے لئے کوئی علامت جو اب ملا تیری علامت یہ ہے کہ تو بات نہیں کر سکے گا لوگوں سے تین رات تک حالانکہ تو بالکل تندرست ہوگا۔“

۱۔ رب اصل میں یا ربی تھا۔ لی کو نافع اور ابو عمرو نے یا کے فتح کے ساتھ اور باقی قراء نے یا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی میرے الٰہی علامت ظہراؤ جو میری عورت کے حمل پر دلالت کرے۔ فلائث لیلال سے مراد تین دن ہیں جیسا کہ سورہ ال عمران کی آیت دلالت کرتی ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ ان تین دنوں اور تین راتوں میں لوگوں سے آپ کلام نہ کر سکے۔ جب اللہ کا ذکر کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کی زبان کو قوت گویائی عطا فرمادیتے۔ آپ ذکر و شکر کے لئے لوگوں سے تنہا ہو گئے تھے۔ سو یا تکلم کے فاعل سے حال ہے۔ یعنی آپ صحیح و سلامت ہونے کے باوجود بات نہیں کر سکیں گے۔ نہ آپ گوئیے اور بہرے ہوں گے بلکہ صرف بطور علامت آپ سے قوت گویائی سب کی جائیگی۔ مجاہد فرماتے ہیں کلام سے مانع کوئی مرض نہ ہوگی۔ بعض علماء نے سو یا کا معنی متباہات۔ یعنی متواتر کیا ہے لیکن پہلا معنی صحیح ہے (۱)۔

فَخَرَجَ عَلَى قَوْمِهِ مِنَ الْمِحْرَابِ فَأَوْحَىٰ إِلَيْهِمْ أَنْ سَبِّحُوا بِكَلِمَاتِ اللَّهِ تِسْعًا ۗ

”پھر آپ نکل کر آئے اپنی قوم کے پاس (اپنے) عبادت خانہ سے تو اشارہ سے انہیں سمجھایا کہ تم پاکی بیان کرو (اپنے) رب کی) صبح وشام۔ ل۔“

ل۔ فاء عاطفہ ہے اور یہ مقدم کلام ظہرت پر معطوف ہے۔ یعنی وہ نشانی ظاہر ہو گئی اور آپ کلام نہ کر سکے تو باہر تشریف لائے۔ محراب سے مراد مسجد ہے۔ اس کو محراب اس لئے فرمایا کیونکہ یہ شیطان سے حرب (جنگ) کرنے کی جگہ ہے۔ قاسموس میں محراب کے مختلف معانی ذکر ہیں۔ 1۔ کمرہ۔ 2۔ کمرے کا اگلا حصہ۔ 3۔ محترم جگہ۔ 4۔ مسجد میں امام کے کھڑے ہونے کی جگہ۔ 5۔ وہ جگہ جہاں بادشاہ علیحدہ کھڑا ہوتا ہے اور لوگوں سے دور ہوتا ہے۔ امام نبوی فرماتے ہیں لوگ محراب کے باہر منتظر تھے کہ آپ دروازہ کھولیں اور اندر داخل ہو کر نماز پڑھیں لیکن اچانک ذکر یا علیہ السلام باہر تشریف لائے تو رنگ اڑا ہوا تھا لوگوں نے وجہ پوچھی (1) تو آپ نے ان کو اشارہ سے صبح وشام ذکر الہی میں مشغول رہنے کا ارشاد فرمایا۔ مجاہد فرماتے ہیں آپ نے یہ حکم زمین پر نکلنا (2)۔ مسیحو 1 سے پہلے ان مفسرہ کیونکہ اوحی میں نول کا معنی پایا جاتا ہے یا ان مصدر یہ ہے۔

يٰۤاَيُّهَا حٰزِنَاۤلِكَيْسِبِ بَقُوٰةٍ ۙ وَالتَّيْنَةَ الْحَكْمَ صَبِيۡا ۙ

”اے بچی! کھڑا لو اس کتاب کو مضبوطی سے اور ہم نے عطا فرمادی انکو دانائی جبکہ وہ بچے تھے۔ ل۔“

ل۔ یہاں بھی کلام میں اختصار ہے۔ اصل میں اس طرح ہے کہ بچی کی والدہ حاملہ ہوئیں پھر انہوں نے بچی کو جنم دیا پھر جب وہ خطاب الہی سننے کے اہل ہو گئے تو ہم نے انہیں حکم دیا۔ اچھی فرماتے ہیں حضرت بچی دو سال کے تھے کہ یہ حکم ملا۔ الکتاب سے مراد نور است ہے اور بقوۃ سے مراد مضبوط اور کوشش اور توفیق طلب کرنے کے ساتھ۔ اور الحکم سے مراد حکمت اور کتاب کی سمجھ ہے۔ التیناد الحکم صبیحا کا عطف یا قلنا یا حبیبی پر ہے۔ صبیحا۔ تین سال کا بچہ۔ حضرت بچی علیہ السلام نے بچپن میں تورات پڑھی تھی۔ جو بغوت سے پہلے قرآن پڑھ لے اس کے متعلق کہتے ہیں فقد اوحی الحکم صبیحا۔ اس شخص کو بچپن میں حکمت عطا کی گئی ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ آپ کو بچپن میں بچوں نے کھیل کی دعوت دی تو آپ نے فرمایا یا ہمیں کھیل کھود کے لئے پیدا نہیں کیا گیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں الحکم سے مراد نبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بچپن میں بچی علیہ السلام کو تاج نبوت عطا فرمایا تھا۔

وَحٰۤاَلِیٰنَ لَدُنَّا وَرَكُوۡةٍ ۙ وَكَانَ تَقِيۡۡا ۙ

”نیز عطا فرمائی دل کی نرمی اپنی جناب سے اور قس کی پاکیزگی ل۔ اور وہ بڑے پرہیزگار تھے ل۔“

ل۔ حنانا کا عطف الحکم پر ہے یعنی اپنی جناب سے ہم نے ان پر رحمت فرمائی یا یہ معنی کہ ہم نے ان کے والدین اور دوسرے لوگوں کے لئے حضرت بچی کے دل میں نرمی پیدا فرمادی۔ یا احسانا کا معنی بیت اور وقار ہے۔ یا رزق یا برکت ہے۔ قاسموس میں حنان کا معنی رحمت رزق، بیت، وقار، دل کی نرمی ذکر ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا اسم الحنان ہے۔ جو کا معنی رحیم ہے۔ زکوۃ سے مراد گناہوں سے پاک ہونا ہے۔ بعض علماء نے زکوۃ کی طاعت و اخلاص سے۔ فتاویٰ فرماتے ہیں زکوۃ سے مراد عمل صالح ہے۔ ضحاک کا بھی یہی قول ہے۔ کہیں کہتے ہیں زکوۃ سے مراد وہ صدقہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے والدین کو آپ کی صورت میں عطا فرمایا تھا (3)۔

ع۔ آپ ایک شخص اور اطاعت شعار مسلمان تھے آپ نے کبھی نہ کوئی گناہ کیا تھا اور نہ گناہ کا ارادہ کیا تھا۔ اس جملہ کا عطف اتینا پر ہے۔

وَبَرَّ اَبُو الْاَيْدِيَةِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا اَعْيَابًا ⑤

”اور وہ خدمت گزار تھے اپنے والدین کے اور وہ جاہل (اور) سرکش نہ تھے۔“

یعنی اپنے والدین سے حسن سلوک سے پیش آنے والے اور ان کے ساتھ احسان کرنے والے تھے اور متکبر نہ تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں جبار وہ ہوتا ہے جو غصہ میں مارتا ہے اور قتل کرتا ہے عصباً معنی گنہگار ہے۔

وَسَلَّمَ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ⑥

”اور سلامتی ہو ان پر جس روز پیدا ہوئے اور جس روز وہ انتقال کریں گے اور جس روز انہیں اٹھایا جائے گا زندہ کر کے۔“

یہ جملہ مترصد ہے یعنی ہر اس چیز سے انہیں اللہ کی طرف سے سلامتی ہو جو تکلیف دیتی ہے۔ پیدا ہونے کے دن بھی علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے شیطان کے چھوٹنے کے محفوظ رکھا۔ حالانکہ ہر پیدا ہونے والے بچہ کو شیطان چوک دیکر رلا دیتا ہے۔ وصال کے بعد عذاب قبر سے سلامت ہوں اور یوم حشر و ذرغ کے عذاب اور قیامت کی ہولناکیوں سے محفوظ ہوں۔ سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں انسان ان تین حالتوں میں رہتا ہے۔ جس دن پیدا ہوتا ہے تو ایک عالم کو چھوڑ کر دوسرے عالم میں آتا ہے پھر مرتا ہے تو ایسے لوگوں کو دیکھتا ہے جنہیں اس نے پہلے نہیں دیکھا ہوتا ہے۔ پھر جس دن قبر سے زندہ کر کے اٹھایا جائے گا تو اپنے آپ کو ایسے حالات میں پائے گا جس کی مثل پہلے اس نے نہ دیکھی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے بھی علیہ السلام کو ان تینوں حالات میں حفاظت و سلامتی کا مژدہ عطا فرمایا (۱)۔

یوم و ولد اپنے معطوفات سے مل کر ظرف مستقر کے متعلق ہے۔ جو سلام علیہ میں علیہ ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ ظرف مستقر فعل استقر یا حاصل کے متعلق ہے جیسا کہ بصریوں کا مذہب ہے یا حاصل و مستقر (اسم فاعل) کے متعلق ہے۔ کہا جائے جیسا کہ کوئیوں کا مذہب ہے تو دونوں تقدیروں کی صورت میں ایک زمانہ پر دلالت کرے گی۔ یا زمانہ ماضی پر (جبکہ فعل حاصل کے متعلق کہا جائے) یا زمانہ حال پر (جب اسم فاعل کے متعلق کیا جائے) پس یوم و ولد کی ظرفیت دوسری تقدیر پر اور یوم يموت اور یوم بعث پہلی تقدیر پر کیسے درست ہوگی (کیونکہ اگر حال کا زمانہ مراد لیا جائے تو یوم و ولد ماضی ہے اس کے ساتھ مناسبت نہیں رہتی اور اگر ماضی کا زمانہ مراد لیا جائے یوم بعث اور یوم يموت کے ساتھ مناسبت نہیں رہتی۔ ماضی کی صورت میں یوم و ولد کے ساتھ معنی درست ہوگا کہ سلامتی قرار پذیر ہو جس دن پیدا ہوئے لیکن دوسرے صیغوں یوم يموت اور یوم بعث کے ساتھ معنی درست نہ ہوگا۔ پھر معنی ہوگا کہ سلامتی زمانہ ماضی میں قرار پذیر ہو جس دن آپ کا وصال ہوگا اور جس دن آپ کو اٹھایا جائے گا)

محققین اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ظرف کا عامل معنوی ہوتا ہے اور وہ مصدر حصول اور استقر ار ہے اور مصدر میں کسی زمانہ کا اعتبار نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے زید فی الدار قائماً میں حال کا عامل معنوی کہتے ہیں۔ اس کو جو حاصل یا حاصل سے تعبیر کرتے ہیں تو یہ جواز ہے جیسا کہ ہذا زید قائماً میں کہا جاتا ہے اشیر زید افاضاً اس میں زمانہ پر کوئی دلالت نہیں ہوتی۔ ظرف زمانہ کا تعلق تینوں زمانوں سے کرنا جائز ہوتا ہے کیونکہ ان میں فعل کے معنی کی بوجہ ہوتی ہے۔ اور اگر ہم تسلیم بھی کر لیں کہ یہ حاصل یا حاصل کے متعلق ہے تو پھر ظرف اس کے قائم ہو جائے گی تو ضمیر محذوف (فعل یا شیعہ فعل) سے منتقل ہو کر ظرف کی طرف منتقل ہو جائے گی پھر

ظرف زمانہ کے معنی سے خالی ہو جائے گی پس تینوں زمانوں کے ساتھ تعلق جائز ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرِيحًا ۝

”اور (اسے صیب!) بیان کیجئے کتاب میں مریم (کا حال) جب وہ الگ ہو گئی اپنے گھر والوں سے ایک مکان میں جو شرق کی جانب تھا۔“

لے واذا ذکر کا عطف کلام سابق کے مضمون پر ہے کیونکہ مذکور کو اس لئے ذکر کیا جاتا ہے تاکہ مخاطب اس کو جان لے اور اسکی حفاظت کرے گویا یہ اعلم کے قول کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے یعنی اس قصہ کو جان لے اور اسکو محفوظ کر لے۔ نقد پر اس طرح ہے اعلم ذکر رحمۃ ربک و ذکر یا واذ ذکر فی الکتاب مریم الخ۔

الکتاب سے مراد قرآن کریم ہے۔ مریم سے مراد مریم کا قصہ ہے۔ اذ انبذت یا تو مریم سے بدل اشتمال ہے کیونکہ جس کیفیت میں آپ تھیں اس پر وقت مشتعل تھا۔ یا بدل ہے کیونکہ مریم سے مراد مریم کا قصہ ہے اور ظرف سے مراد وہ واقعہ ہے جو اس وقت میں رو پذیر ہوا تھا۔ وہ دونوں ایک چیز ہیں یا مصاف مقدر کی طرف ہے۔

بعض علما فرماتے ہیں اذ معنی ان صدر یہ ہے جیسا کہ اس جملہ میں ہے اگر متک اذ لم تکر معنی اس صورت میں الاحمال بدل ہی ہوگا۔ انبذ کا معنی کسی چیز کو پھینک دینا ہے۔ جو بعد اور دوری کو لازم ہے۔ اسلئے اسکا معنی یہ کیا گیا ہے کہ وہ الگ ہو گئیں۔ دور ہو گئیں اپنے گھر والوں سے ایک ایسے مکان میں جو اسکی گھر میں شرقی جانب تھا۔ سخت سردی کا موسم تھا، آپ وجوب میں بیٹھ کر اپنے سر سے جو کپڑے نکال رہی تھیں۔ بعض فرماتے ہیں آپ اس وقت جنس سے پاک ہوئی تھیں اور غسل کرنے کے لئے گئی تھیں۔ بعض فرماتے ہیں عبادت کی خاطر طیبہ شرقی کمرے میں تشریف لے گئی تھیں۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں اسی وجہ سے نصرانیوں نے شرق کو اپنا قبیلہ بنا لیا۔ مکانا ظرف ہے یا مفعول۔ ہے کیونکہ انبذت یعنی اتت ہے۔ اسلئے حکمانا مفعول بہ ہو سکتا ہے۔

فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝

”پس بنا لیا اس نے لوگوں کی طرف سے ایک پردہ پھر ہم نے بھیجا اس کی طرف اپنے جبرئیل کو، پس وہ ظاہر ہوا اس کے سامنے ایک تندرست انسان کی صورت میں۔“

ل ابن عباس نے حجبا کا معنی استرا یعنی پردا بیان فرمایا ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ آپ و یوار کے بیچے بیٹھی تھیں۔ مقال فرماتے ہیں پہاڑ کے پیچھے بیٹھی تھیں۔ مکرہ فرماتے ہیں آپ مسجد میں تھیں تو آپ کو جنس شروع ہو گیا۔ آپ اپنی خالہ کے گھر واپس آ گئیں حتیٰ کہ جب خون ختم ہوا اور پاک ہو گئیں تو مسجد کی طرف پھر لوٹ آئیں۔ جب آپ جنس سے طہارت کے لئے غسل کر رہی تھیں اور آپ نے کپڑے اتارے ہوئے تھے تو ایک خوبصورت معتدل جسم اور گھٹھر یا لے بالوں والے نوجوان کی شکل میں جبرئیل ظاہر ہوئے۔ جیسا کہ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ ہم نے اس کی طرف اپنے جبرئیل کو بھیجا (۱)۔ جبرئیل کی اپنی طرف نسبت جبرئیل کو شرف عطا کرنے کے لئے کی۔ آپ کو روح اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ دین آپ کی وجہ سے اور آپ کی وحی کے ذریعے زندہ ہوتا ہے۔

یعنی جبرئیل آپ کے سامنے تندرست امر و جوان کی شکل میں نمودار ہوئے۔ بعض علماء فرماتے ہیں روح سے مراد یعنی علیہ السلام ہیں،

بشری صورت میں آپ کے پاس آئے تھے اور آپ اسکے ساتھ حاملہ ہو گئی تھیں۔ پہلا قول صحیح ہے۔

قَالَتْ اِنِّي اَمْرُؤٌ بِالرَّحْمٰنِ وَنِكَاحٌ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ۝۱۱

”مریم بولیں میں پناہ مانگتی ہوں رحمن کی تجھ سے اگر تو پرہیزگار ہے۔ ل۔“

۱۔ حضرت مریم علیہا السلام نے جبرئیل امین کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو دور سے یہ فرمایا۔ یہ ارشاد آپ کی انتہائی پاکدامنی اور عفت کی دلیل ہے۔

نافع ابن کثیر اور ابو عمرو نے انہی کو یاء کے فتح کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان کنت تقیاً۔ شرط ہے اور اس کا جواب محذوف ہے۔ یعنی اگر تو متقی ہے تو مجھے نہ چھیڑنا۔ یا مجھ سے دور ہو جا، انکی وجہ سے جس کی میں نے پناہ مانگی ہے۔ یہ اسی طرح کا قول ہے جیسے عرب کہتے ہیں ان کنت مومنا فلا تطلمی۔ یعنی مناسب یہ ہے کہ تیرا ایمان تجھے ظلم کرنے سے منع کرے۔ آیت کا معنی یہ ہو گا جیسا ہے یہ کہ تو اللہ سے ڈرے اور تیرا تقویٰ تجھے برائی سے روکے۔ بعض فرماتے ہیں یہ کلام مبالغہ پر مبنی ہے نقد پر اس طرح ہے اگر تو متقی ہے تو میں تجھ سے رخصت کی پناہ مانگتی ہوں۔ جب تو متقی نہ ہو گا تو میں کتنی زیادہ تجھ سے مانگتی ایہ بھی جائز ہے کہ ان نافیہ ہو۔

قَالَ اِنَّمَا اَنْتَا سَرَسٌ لَّا هَبَ لَكَ عَلِمًا ۝۱۲

”جبرئیل نے کہا میں تو تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں تاکہ میں عطا کروں تجھے ایک پاکیزہ فرزند۔ ل۔“

۱۔ جبرئیل نے کہا میں انسان نہیں کہ تم مجھ سے گھبرارہی ہو اور پناہ مانگ رہی ہو۔ میں فرشتوں میں سے تیرے رب کا فرستادہ ہوں۔ مجھے تیری طرف بھیجا گیا ہے تاکہ میں تجھے گناہوں سے پاک یا خیر پر پرورش پانے والا بنیں اور صلاح کے زینے پر چڑھنے والا فرزند عطا کروں۔

حضرت جبرئیل نے بچہ عطا کرنے کی نسبت اپنی طرف کی حالانکہ حقیقہ بچہ عطا کرنے والا اللہ ہے۔ تو یہ آپ کی نسبت مجازی ہے کیونکہ آپ ظاہری سبب تھے، آپ نے پھونک ماری تھی (اس لئے ظاہری سبب کی طرف نسبت سے انسان مشرک نہیں ہوتا، جبکہ عقیدہ یہ ہو کہ بر نعمت عطا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے) یہ بھی جائز ہے کہ (لا هب لك) اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکایت ہو۔ نقد پر اس طرح ہو کہ تیرے رب نے مجھے تیری طرف بھیجا ہے۔ (اور) وہ فرماتا ہے میں نے تیری طرف اپنا رسول بھیجا تاکہ میں تجھے اس رسول کے پھونک مارنے کے ذریعے بچہ عطا کروں۔ ورش ابو عمرو نے لیہب لک پڑھا ہے۔ اسی طرح طلوانی نے قالون سے لیہب لک نقل کیا ہے۔ یعنی تمہارا رب تمہیں عطا کرے۔ اسی نسبت مجازی کے اعتبار سے صوفیاء کرام کہتے ہیں جسکے دودن برابر ہوئے وہ خسارے میں ہے۔

قَالَتْ اِنِّي يَكُوْنُ لِيْ عَلْمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشْرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ۝۱۳

” (حیرت سے) بولیں (اے بندۂ خدا) کیونکر ہو سکتا ہے میرے ہاں بچہ حالانکہ نہیں چھوا مجھے کسی بشر نے ل۔ اور نہ میں بد

چلن ہو“

۱۔ حضرت مریم نے تعجب کرتے ہوئے فرمایا میرے ہاں بچہ کیسے ہو سکتا ہے حالانکہ کسی بشر نے مجھ سے نکاح بھی نہیں کیا۔ یہ اشارت

کناج کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ بدکاری کے لئے جُث اور فُجڑ جیسے لفظ استعمال ہوتے ہیں۔

ج میں بد چلن بھی نہیں ہوں۔ اس کا عطف سابق کلام پر ہے۔ بغیا مبرد کے نزدیک اصل میں بغوی بروزن فعل تھا۔ واؤ کو یا، سے بد لایا اور پجری کو یا، میں ادغام کیا گیا ہے۔ پجری یا، کی مناسبت سے عُین کو کسرہ دیا گیا۔ اس کے آخر میں تا، لاقن نہیں ہوتی کیونکہ فعل بمعنی فاعل ہو تو تہ کی نسبت کا فرق نہیں کیا جاتا۔ مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے فاعل ہی استعمال ہوتا ہے۔ مبرد کے علاوہ علماء کے نزدیک بغیا کا اصل وزن فعل ہے اور تا، اس کے آخر میں مبالغہ اور نسب کی وجہ سے لاقن نہیں ہوئی۔ (قاعدہ یہ ہے کہ اسم فاعل کو فعل پر محمول کیا جائے تو اس کے آخر میں تا، لاقن ہوتی ہے اور یہ فعل اس وقت ہوتا ہے، جبکہ اسم فاعل، فعل کے لفظاً اور معنی موافق ہو۔ یعنی اسم فاعل حال اور استقبال کے معنی میں ہو۔ اور وہ اسم فاعل جو مبالغہ اور نسبت کے لئے ہوتا ہے وہ دوام اور شہوت کے لئے ہوتا ہے، حال اور استقبال کے لئے نہیں ہوتا۔ پس جب لفظاً اسم فاعل مبالغہ اور نسب کی صورت میں فعل پر لفظاً اور معنی جاری نہیں ہوتا تو اس کے آخر میں تا، بھی لاقن نہیں ہوتی۔ اسی طرح نسبت کا صیغہ جب فاعل کے وزن پر ہو جیسے تا، مر لا، بن حائض وغیرہ تو ان کے آخر میں تا، لاقن نہیں ہوتی کیونکہ اس سے مراد ذات تمہر ذات لمن اور ذات حیض ہوتا ہے)

حضرت مریم نے فرمایا کہ بچہ کے پیدا ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو نکاح بواہو یا برائی کی گئی ہو لیکن مجھ میں جب یہ دونوں صورتیں نہیں ہیں تو بچہ کیسے پیدا ہوگا۔

قَالَ كَذَلِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَىٰ هَيْئَةٍ ۚ وَلِيَجْعَلَ آيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً لِّمَن تَبَّٰ

كَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا ۝۱۱

”جبرئیل نے کہا یہ درست ہے (لیکن) تیرے رب نے فرمایا یوں بچہ دینا میرے لئے معمولی بات ہے اور (مقصد یہ

ہے کہ) ہم بنائیں اسے اپنی (قدرت کی) نشانی لوگوں کے لئے اور سہارا رحمت اپنی طرف سے اور یہ ایسی بات ہے جس

کا فیصلہ ہو چکا ہے۔“

۱۔ جبرئیل نے کہا معاملہ اسی طرح ہے، یعنی اللہ تجھے بیٹا بغیر باپ کے عطا کرے گا اگرچہ تجھے کسی بشر نے نہیں چھوڑا اور تو بد چلن بھی نہیں

ہے۔ تیرا رب فرماتا ہے کہ بغیر باپ کے بیٹا پیدا کرنا میرے لئے کونسا مشکل ہے؟ میرے لئے تو یہ آسان سا معاملہ ہے۔ قال

ربک۔ یا تو محذوف جملہ کی علت ہے جس پر کذا لک دالات کر رہا ہے یا تقدیر قدر اس سے حال ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے

کذا لک۔ قال ربک کا مقولہ ہو تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ قال ربک کذا لک۔ اور ہو علیٰ ہین علت کے معنی میں ہو۔

ولنجعله یا تو علیٰ ہین پر معطوف ہے کیونکہ وہ علت کے معنی میں ہے۔ یعنی ہم ایسا کریں گے کیونکہ یہ آسان ہے ہمارے لئے اور ہم

اسے قدرت کی نشانی بنائیں گے۔ یا لنجعله کا عطف علت مقدر پر ہے جو جملہ محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ اھب لک

غلاما لنجتہ بو حینا ولنجعله آیۃ للناس۔ بعض علماء فرماتے ہیں غائب سے شکم کی طرف التفات کے طریقہ پر اس کا عطف

لہب پر ہے۔ رحمة منہا لہب لنجعله کے نکل پر معطوف ہے یعنی تاکہ اسے اپنی طرف سے بندوں پر اپنی قدرت کی نشانی بنائیں جو

اس سے ہدایت حاصل کریں یا اس کا عطف آیۃ پر ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ ہم اسے اپنی طرف سے رحمت بنائیں۔ اسے

مریم اس امر کا فیصلہ ازل سے ہو چکا ہے یا یہ معنی کہ لوح محفوظ پر مقدر ہو چکا ہے اور لکھا جا چکا ہے۔ یا امرأ مقضیا کا معنی اموراً حقیقاً

ہے یعنی یثیٰ نوا دایسا کرے گا کیونکہ اس نے اس کو آیت اور رحمت بنانا ہے۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَدَّتْ بِهِ مَكَانًا قَصِيًّا ۝۱۱

”پس وہ حاملہ ہو گئیں۔ اس (بچے) سے پھر وہ چلی گئیں اسے (شکم میں) لئے کسی دور جگہ۔“

۱۔ فحملته محذوف کلام پر معطوف ہے۔ تقدیر یہ ہے فاطمات بقول الملک ففتح الملک فی جیب درعہا فحملت حین لبست۔ یعنی حضرت مریم فرشتے کی بات سن کر مطمئن ہو گئیں۔ پھر فرشتے نے آپ کی قمیص کے گریبان پر پھونک ماری جب آپ نے وہ قمیص پہنی تو آپ حاملہ ہو گئیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں جبرئیل نے آپ کی قمیص کے گریبان کو اپنی انگلیوں سے کھینچا اور گریبان میں پھونک ماری۔ بعض فرماتے ہیں آپ کی قمیص کی آستین میں پھونک ماری تھی۔ بعض فرماتے ہیں آپ کے منہ میں پھونک ماری تھی۔ بعض فرماتے ہیں دور سے جبرئیل نے پھونک ماری تھی اور ہوا آپ تک پہنچی تھی اور آپ اسی وقت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حاملہ ہو گئی تھیں۔ آپ حمل کے ساتھ گھر سے دور چلی گئیں۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں آپ بیت المقدس کی ایک وادی میں چلی گئیں تاکہ لوگ بغیر نکاح کے حمل کی وجہ سے طعن و تشنیع نہ کریں۔ امام بغوی فرماتے ہیں آپ کی مدت حمل اور وضع حمل میں اختلاف ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں حمل اور ولادت دونوں ایک ہی گھڑی میں ہوئے تھے۔ بعض فرماتے ہیں دوسری عورتوں کی طرح نو ماہ حمل ظہر ا تھا۔ بعض نے آٹھ ماہ (۱۱) اور بعض نے چھ ماہ لکھے ہیں۔ مقاتل بن سلیمان فرماتے ہیں۔ ایک ساعت میں آپ حاملہ ہوئیں اور دوسری ساعت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صورت تیار ہو گئی۔ جب اسی دن سورج زائل ہوا تو وضع حمل ہو گیا اور حضرت مریم علیہا السلام کی عمر ابھی دس سال تھی اور عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حاملہ ہونے سے پہلے دو جنس گزارے تھے۔

فَاجَاءَهَا الْمَخَاضُ إِلَىٰ جِذْعِ النَّخْلَةِ قَالَتْ يَلَيْتُنِي مِثُّ قَبْلِ هَذَا وَكُنْتُ سَيِّئًا مِّنِّيًّا ۝۱۲

”پس لے آیا انہیں دردزہ ایک کھجور کے تنے کے پاس۔ (بعد حسرت دیا اس) کہنے لگیں کاش! میں مر گئی ہوتی اس سے پہلے اور بالکل فراموش کر دی گئی ہوتی۔“

۱۔ آجاء کو مزہ افعال کے ذریعے متعدی کیا گیا ہے۔ یہ جاء سے مشتق ہے جس طرح النیٰ بمعنی اعطی استعمال ہوتا ہے اس طرح آجاء مجبوراً آنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مخاض مصدر ہے جب عورت کے پیٹ میں بچہ باہر آنے کے لئے حرکت کرتا ہے تو اس وقت جو عورت کو تکلیف ہوتی ہے اسے مخاض کہتے ہیں۔ عرب کہتے ہیں مغضض المراءۃ جب عورت کو دردزہ شروع ہو جائے۔ مخاض کے کھجور کے تنے کی طرف لانے کی نسبت مجازی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دردزہ کے وقت اللہ تعالیٰ اسے لے آیا یہاں معنی کہ مخاض کے سبب وہ آئیں۔ پس مخاض آنے کا سبب تھا گویا وہ اسے لے کر آیا ہے۔ کھجور کے تنے کے پاس تاکہ اس کے ساتھ چھپ جائیں اور تکلیف کے وقت اس کو بچڑھیں۔ جذع جز اور ٹہنی کو کہتے ہیں اور اس کھجور کو بھی کہتے ہیں جو تخت سردی کی وجہ سے صحراء میں خشک ہو گئی ہو اور اس پر کوئی مزہ نہ ہو۔

ابن ابی حاتم نے ابی روق سے روایت کیا ہے حضرت مریم علیہا السلام اس کھجور کے تنے کے پاس پہنچیں جس پر کوئی ایک پتہ بھی نہ

تھا، اسے چھوڑا تو اس پر پتے، خوشے اور تر بھجوریں لگ گئیں۔ النخلۃ پر الف لام محض کا ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں شاید اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کے دل میں یہ الہام کیا تھا تا کہ وہ انہیں اس درخت کے پاس ایسی نشانیاں دکھائیں جس سے ان کا خوف و ہراس اور پریشانی جاتی رہے اور انہیں بھجوریں کھلائے کیونکہ یہ عورتوں کی مرغوب غذا ہیں (1)۔

آپ کو بغیر خداوند کے بچہ ہونے پر جو الزامات کاغذ تھا اور لوگوں کے طعن و تفتیح کا اندیشہ تھا اور معاشرہ کے سامنے شرم و حیا کا سامنا تھا تو آپ کہنے لگیں کاش میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی۔ یا لیتسی میں منادیٰ ممدوف ہے نقد پر اس طرح سے یا ایہا المخاطب لیتسی۔ شاید یہاں ان کا مخاطب نفس ہے یا جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں یا تنبیہ کے لئے اور جملہ نداءئے تمہنی کے استبعاد کے لئے ہے۔ ممت کو ابن کثیر ابو عمر و ابن عامر اور ابو بکر نے ہم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ان کے نزدیک یہ مات میات سے مشتق ہے، یعنی ماضی کا میں کلمہ مضموم ہے جیسے قال یخاف ہے۔ باقی قراء کے نزدیک یہ مات میات سے ہے یعنی ماضی کا میں کلمہ مفتوح اور مضارع کا میں کلمہ مضموم ہے جیسے قال یخاف ہے۔ ہذا کا مشار الیہ الامر ہے۔ نسیا کو بعض اور حزرہ نے نون کے فتح کے ساتھ اور دوسرے قراء نے نون کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ نسیان حفظ کی ضد ہے۔ یعنی جو کچھ انسان کو یاد ہوا سے بھول جائے۔ دل کے ضعف کی وجہ سے یا غفلت کی وجہ سے یا ارادۃ بھلا دیتا ہے تا کہ دل سے اس کا ذکر مت جائے۔ جس نسیان کی اللہ تعالیٰ نے مذمت فرمائی ہے وہ وہ ہے جس میں ذاتی ارادہ شامل ہو۔ ارشاد ہے قَدْ ذُوقُوا اَیْہَا النَّبِیُّمُ بَقَاءَ ۤیَہِ جَلْمَ ھٰذِہِ۔ (س اب جیکھو سز اس جرم کی کہ تم نے بھلا دیا تھا اپنے اس روز کی ملاقات کو۔ اسی طرح انسان جس میں معذور ہوا میں اس کا ارادہ نہ ہو وہ قابل مذمت نہیں ہے۔ جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے نسیان کا اطلاق کسی چیز کو بطور احسان ترک کرنے پر ہوتا ہے۔ اٹھایا گیا ہے، یعنی بھولنے کی وجہ سے مؤاخذہ نہیں کیا جاتا۔ کبھی کبھی نسیان کا اطلاق کسی چیز کو بطور احسان ترک کرنے پر ہوتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف نسیان کی نسبت ہو تو یہی معنی مراد ہوتا ہے جیسے ارشاد ہے نَسُوا اللہَ فَذَکَرْنَا ھُنَّمُ النِّسِی (بالکسر)۔ اس کا معنی وہ چیز جو فراموش کی گئی ہو۔ جس طرح انقیض (بالکسر) کا معنی وہ چیز جو تُوڑی گئی ہو پھر یہ عرف عام میں اس چیز کے لئے استعمال ہونے لگا جس کا کوئی اعتبار و شمار نہ ہو۔ عرب کہتے ہیں احفظوا انساکم۔ یعنی تم اپنی ایسی چیزوں کی حفاظت کرو جنہیں عام طور پر بھلایا جاتا ہے۔ النسی بالفصح بھی ہے۔ بعض فرماتے ہیں یہ بھی اس میں لنت ہے جیسے وَنَوَّرُوا اللِّجْنَیْنَ الْجَحِیْسَ۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ مصدر ہے اس کے ساتھ کسی چیز کا نام رکھا جاتا ہے یا یہ مفعول کے معنی میں ہے اور النسی سے مراد وہ چیز ہے جو بھلائی گئی ہو۔ جیسا کہ اس کا اصل معنی ہے، اسی وجہ سے اس کے بعد منسیا ذکر فرمایا تا کہ یہ وہ دم دور ہو جائے کہ وہ معنی مراد ہے جس کا اعتبار اور شمار کم ہو اگرچہ بالکل بھلائی نہ گئی ہو۔ امام بخاری فرماتے ہیں اسی جو چیز بھینکی گئی ہو فراموش کی گئی ہو اور فقارت کی وجہ سے ذکر نہ کی گئی ہو۔ اور منسیا کا معنی وہ چیز جو چھوڑی گئی ہو (2)۔ قنادر فرماتے ہیں اس سے مراد وہ چیز ہے جو غیر مذکور اور غیر معروف ہو۔ عکر مذخاک اور مجاہد فرماتے ہیں وہ مراد جو بھینک دیا گیا ہو، بعض نے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ کاش میں پیدا ہی نہ کی گئی ہوتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ کسی تکلیف اور پریشانی کے وقت موت کی تمنا کرنا جائز نہیں ہے جیسا کہ سورہ بقرہ میں قَسَمْنَا النُّوْتِ اِنْ لَّمْ نَلْمُکُمْ صِدْقَیْنِ کی تفسیر میں ذکر کیا گیا ہے۔ تو مریم علیہا السلام نے موت کی تمنا کیوں کی؟

جواب یہ ہے کہ شاید ان کی شریعت میں اس نبی کے وارد ہونے سے پہلے حضرت مریم نے یہ تمنا کی ہو یا بغیر ارادہ کے غلبہ حال کی وجہ

سے ایسا کیا ہو۔ یادین میں فتنہ کے خوف سے ایسا کہا ہو کیونکہ انسان رسوائی کے وقت کبھی جھوٹ بولتا ہے اور کبھی اپنے آپ کو ہلاک کر دیتا ہے تو آپ کو اندیشہ تھا کہ کہیں لوگوں کی رسوائی کی وجہ سے مجھ سے جھوٹ نہ نکل جائے اور خود کشتی نہ کر لوں تو ان دونوں صورتوں میں دین کی خرابی کا خدشہ تھا۔ اس لئے موت کی تمنا کی اور دین میں فتنہ کے وقت موت کی تمنا کرنا جائز ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے جیسا کہ تفصیل سے سورۃ بقرہ میں ذکر ہو چکا ہے۔

فَنَادَاهُمَا مِنْ تَحْتِهَا أَلَا تَحْزَنُ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ۝

”پس پکارا اسے ایک فرشتہ نے اس کے نیچے سے، (اے مریم) غمزہ نہ ہو، جارہی کر دی ہے تیرے رب نے

تیرے نیچے ایک بندھی ہے۔“

۱۔ ابو جعفر باغ 'عزہ' کسان اور شخص نے من کویم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ حرف چارہ سے ہے اور ابعد اس کا مجرور ہے اس صورت میں نادى کا فاعل محذوف ہے، یعنی ایک ندا کرنے والے نے ندا دی اور وہ ندا کرنے والے جبرئیل امین تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، السدی، قتادہ، سخاک اور ایک پوری علماء کی جماعت کا کہنا ہے کہ مریم علیہا السلام ایک نیلہ پر تھیں اور جبرئیل امین نیلہ کے نیچے سے نیچے تھے، انہوں نے حضرت مریم کو آواز دی، جب انہوں نے سنا کہ مریم علیہا السلام بہت گھبرا گئی ہیں۔ مجاہد اور حسن کہتے ہیں جب عیسیٰ علیہ السلام شکم مادر سے باہر آئے تو انہوں نے یہ آواز دی (۱)۔ اگر عیسیٰ علیہ السلام مراد ہوں تو یہ جملہ محذوف جملہ پر معطوف ہوگا۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی فوجت حملہا فناداھا۔ باقی قراء نے من کویم کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس بناء پر کہ یہ ام موصول ہے یہ اپنے صلہ سے مل کر نادى کا فاعل ہے، معنی یہ ہوگا کہ اس نے آپ کو ندا دی جو آپ کے نیچے تھا وہ جبرئیل تھے عیسیٰ علیہا السلام تھے۔ فتحہا کی ضمیر کا مرفوع مریم علیہا السلام ہیں۔ بعض فرماتے ہیں ضمیر کا مرفوع نحلہ ہے۔ ۲۔ ان مفسرہ ہے جو نادى کی تفسیر بیان کر رہا ہے، یعنی اس نے یہ آواز دی کہ تمہاری کھانے اور پینے کی اشیاء کے نہ ہونے اور لوگوں کی باتوں سے غمزہ نہ ہو۔

۳۔ مسوی سے مراد چھوٹی نہر ہے۔ طبرانی نے عجم صغیر میں حضرات براء کی مرفوع حدیث میں یہی معنی بیان کیا ہے لیکن ابوالخلیق سے مرفوع بیان نہیں کی لیکن ابونسان سے مرفوع بیان کی ہے۔ ابن عدی نے الاکمال میں ابوسفیان سے معطل روایت کی ہے۔ ابن معین نسائی ابن المدینی سے اس کا ضعف مروی ہے۔ بخاری نے براء سے تعلیقا ذکر کی ہے۔ عبدالرزاق ابن جریر اور ابن مردود نے اپنی اپنی تفاسیر میں حضرت براء سے موقوف روایت کی ہے۔ اسی طرح حاکم نے المستدرک میں روایت کی ہے حاکم فرماتے ہیں یہ مسلم کی شرط صحیح ہے۔ طبرانی اور ابونعیم نے الحلیہ میں ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ چھوٹی نہر اللہ تعالیٰ نے نکالی تھی تاکہ عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ اس سے پانی پیئے۔ اس حدیث کی سند میں ایوب بن نعیم ہیں جس کو ابو ذر عدو ابوحاتم نے ضعیف قرار دیا ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں فتحک کا معنی تحت امرک ہے (تیرے حکم کے تحت ہے) اگر تو حکم دے گی تو یہ نہر جاری ہو جائے گی، اگر تو رکسنے کا اشارہ کرے گی تو وہ رک جائے گی۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں جبرئیل نے پاؤں مارا۔ بعض فرماتے ہیں عیسیٰ علیہ السلام نے پاؤں مارا تو بیٹھا چشمہ جاری ہو گیا۔ بعض فرماتے ہیں وہاں ایک خشک نہر تھی، اللہ تعالیٰ نے اس میں پانی

جاری فرمادیا تھا۔ خشک کھجور پر پتے نکل آئے تھے اور اس پر پھل لگ کر پک گیا تھا (1)۔ بعض فرماتے ہیں المسوی کا معنی سردار ہے اور یہ مسو سے مشتق ہے اور مراد عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ اُن فرماتے ہیں قسم بخدا عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بلند عظمت اور بلند مقام بندے تھے (2)۔

وَهُذِي إِلَيْكَ بِحُجْرٍ الْعَلَّةِ تُسْقِطُ عَلَيْكَ مَطَابِعًا جَنِيًّا ﴿١٦﴾

”اور بلاؤا اپنی طرف کھجور کے تنے کو گرنے لگیں گی تم پر جی ہوئی کھجوریں۔ ل۔“

ل۔ جذع سے پہلے باہر تاکید کے لئے زائدہ ہے۔ علامہ ابنوی فرماتے ہیں عرب کہتے ہیں ہرزہ ہرزہ (3)۔ تساقط کو جمہور قرار دینے تاہم اور قاف کے فتح اور سین کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ حمزہ نے سین کے فتح اور تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ باب قافل سے مضارع کا صیغہ ہے، اصل میں تساقط تھا۔ حمزہ تاہ کو حذف کر دیتے ہیں اور دوسرے قراء تاہ کو سین میں ادغام کر دیتے ہیں۔ حفص نے تاہ کے ضمہ اور قاف کے کسرہ کے ساتھ باب مفاعلہ سے پڑھا ہے اس کا معنی گرانے اور موٹ کا صیغہ اس لئے ذکر فرمایا کیونکہ ضمیر نخل کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یعقوب نے یاہ کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے اور ضمیر جذع کی طرف لوٹ رہی ہے۔ ربطاً تیز ہے تساقط کی ضمیر سے۔ جمہور کی قرأت کے مطابق اور حفص اور یعقوب کی قرأت کے مطابق مفعول یہ ہے۔ جنیاً جو اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہو اور اسکے پھنے کا وقت آ گیا ہو۔ ربیع بن ایشم فرماتے ہیں نفاس والی عورت کے لئے میرے نزدیک تر کھجور سے زیادہ کوئی چیز مفید نہیں اور مریض کے لئے شہد سے بہتر کوئی چیز نہیں (4)۔

فَكُنِّي وَ اَشْرَبِي وَ قَوْمِي عَيْنًا فَا مَا كَرِيْبٍ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا فَقُوِي اِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اَكْلِمَ الْيَوْمَ اَنْسِيًّا ﴿١٧﴾

” (میںھے بیٹھے خرے) کھاؤ اور (شہنشاہ پانی) پیو ل اور (اپنے فرزند ولید کو کھو کر) آگے میں ٹھنڈی کرو پھر اگر تم دیکھو کسی آدمی کو تو (اشارہ سے اسے) کہو کہ میں نے نذرمانی ہوئی ہے رحمن کے لئے (خاموشی کے) روزہ کی میں اس آج کسی انسان سے گفتگو نہیں کروں گی۔ ج۔“

ل۔ عیناً۔ قومی کی نسبت سے تیز ہے۔ قوی، قرا سے مشتق ہے کیونکہ آکھ جب خوش کن منظر دیکھتی ہے تو وہ اس منظر کو ہی دیکھتی رہ جاتی ہے، کسی دوسری چیز کی طرف منتقل نہیں ہوتی بلکہ اسی منظر پر قرار پذیر رہتی ہے۔ عرب کہتے ہیں قو اللہ عینک یعنی اللہ تعالیٰ تجھے خوش کن اور دل پسند چیز دکھائے اور تیری نظر کو اس منظر پر ٹھہرا دے تاکہ تیری نظر ادھر ادھر نہ بھٹکے۔ اقر اللہ عیناک۔ اللہ تجھے سلا دے۔ اقر یقر استعمال ہوتا ہے جب کوئی سکون پذیر ہو جائے۔ یا یہ القری سے مشتق ہے جس کا معنی مضنک ہے کیونکہ خوشی کے آنسو ٹھنڈے ہوتے ہیں اور غم کے آنسو گرم ہوتے ہیں، اسی وجہ سے محبوب کو قرا العین اور ناپسند چیز کو خزہ العین کہتے ہیں۔

ج۔ اماصل میں ان ماہے بازائدہ ہے جو ان شریہ میں مدغم کیا گیا ہے۔ توین کے آخر میں نو ان تاکید ہے، یعنی اسے مریم الکر کوئی شخص تجھے نظر آئے اور تجھ سے اس شخص سے متعلق پوچھتے تو تم صرف اتنا کہنا کہ میں نے اپنے رب رحمن کی خاطر خاموشی کا روزہ رکھا ہوا ہے۔ ابن مسعود نے یہی مفہوم بیان فرمایا ہے۔ السدی فرماتے ہیں بنی اسرائیل میں جو مجاہدہ کرتا وہ جس طرح کھانے پینے کا روزہ رکھتا

اسی طرح شام تک بات کرنے کا بھی روزہ رکھتا (1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ بات اشارہ سے کہنے کو کہا تھا کیونکہ بات بھڑے سے کا باعث بنتی اور یہی علیہ السلام کی کلام پر اکتفا کا حکم فرمایا تھا کیونکہ یہی علیہ السلام کا بچپن میں کلام کرتا سب طعن تشنیع کی زبانوں کو بند کرنا تھا۔ بعض فرماتے ہیں اتنی مقدار آپ کو بات کرنے کی اجازت تھی۔ اس کے بعد کلام سے رک جانے کا حکم تھا۔ کہا جاتا ہے کہ آپ ملائکہ سے کلام فرماتی تھیں، انسانوں سے کلام نہیں کرتی تھیں۔

فَأْتَتْ بِهِ قَوْمَهَا تَحْمِلُهُ ۖ قَالُوا الْيَزِيدُ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا قَرِيبًا ﴿٤٠﴾

”اس کے بعد وہ لے آئیں بچہ کو اپنی قوم کے پاس (گود میں) اٹھائے ہوئے انہوں نے کہا اے مریم تم نے بہت ہی برا کام کیا ہے۔“

اس میں ضمیر کا مرجع یہی علیہ السلام ہیں۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ آپ کے ہاں جب بچہ کی ولادت ہوئی تو آپ فوراً اسے اٹھا کر قوم کے پاس لے آئیں۔ کبھی نے لکھا ہے کہ حضرت مریم اور آپ کے بچہ کو یوسف النجار ایک غار میں اٹھا کر لے آئے۔ آپ وہاں چالیس دن رہیں حتیٰ کہ نفاس سے پاک ہو گئیں۔ پھر حضرت مریم اپنا موصوم بچہ اٹھائے اپنی قوم کے پاس آئیں، راستہ میں یہی علیہ السلام نے اپنی والدہ سے کلام کی تھی۔ کہا اسے امی جان مبارک ہو، میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس کا مستحق ہوں۔ جب آپ گھر آئیں اور ساتھ بچہ بھی تھا چونکہ گھر والے سب نیکو کار لوگ تھے (2) آپ کو ایسی حالت میں دیکھ کر رونے لگے اور پریشان ہو گئے اور کہا اے مریم تو نے بہت برا کام کیا ہے، لقد جئت الخ محذوف قسم کا جواب ہے۔ فوراً ناپسندیدہ کام، یہ فری الجلد سے شفق ہے اور اس کا معنی المشق ہے اس معنی میں حضرت حسان کا قول ہے لا فریبہم فری الا دیم۔ میں چوکے کے نہیں چڑھے کے کاٹنے کی طرح کاٹ دوں گا۔ قرآن کریم میں اکثر جھوٹ، شرک اور ظلم کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَصَنِّ أَطْفَلًا مِّنْ أَفْتَرَىٰ عَنَىٰ اللّٰهُ الْكُذِبَ (اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جس نے بہتان لگایا اللہ پر جھوٹا۔ اسی طرح ارشاد ہے وَصَنِّ يَشْرِكُ بِاللّٰهِ فَكَيْفَ يُفْتَرَىٰ اِلٰهًا عَظِيمًا) (اور جو شریک ٹھہراتا ہے اللہ کے ساتھ وہ ارتکاب کرتا ہے گناہ عظیم کا) چونکہ شرک اور معاصی انسان کی عصمت اور صلاح کی چادر کو تار تار کر دیتے ہیں، اس لئے شرک اور معصیت کو فتنی کے الفاظ سے تعبیر کیا۔

بعض علماء نے اس کا معنی برا اور مجیب کیا ہے، یعنی ایسا کام جس نے عادت کو کاٹ دیا ہے اور اس میں شکاف کر دیا ہے۔ ابو عبیدہ فرماتے ہیں ہر برے امر کے لئے خواہ وہ قول ہو یا عمل اس کے لئے فری استعمال ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق فرمایا میں نے حضرت عمر جیسے عبقری اور تعجب انگیز کام کرنے والا شخص نہیں دیکھا (3)۔

يَا حَتَّ هُرُونَ مَا كَانَ اَبُوكَ اَمْرًا سَوْءًا وَمَا كَانَتْ اُمْلِكَ بَعِيًا ﴿٤١﴾

”اے ہارون کی بہن! نہ تیرا باپ برا آدمی تھا اور نہ ہی تیری ماں بد چلن تھی۔“

ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے کہ ہارون سے مراد وہی علیہ السلام کے بھائی ہارون نبی ہیں کیونکہ آپ ان کی نسل سے تھیں جس طرح تمہیں شخص کو اتومیم کہا جاتا ہے۔ (4) بعض فرماتے ہیں آپ ان لوگوں کی نسل سے تھیں جو ہارون نبی کے ساتھ بھائیوں کا رشتہ رکھتے تھے۔ ابن ابی حاتم نے علی بن طلحہ سے یہی قول روایت کیا ہے۔ کبھی فرماتے ہارون حضرت مریم کے علاتی بھائی تھے۔ بنی اسرائیل کے

ایک نیک صالح مرد تھے (۱)۔ بنوی نے مغیرہ بن شعبہ سے روایت کیا ہے کہ جب میں نجران گیا تو وہاں کے عیسائیوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم قرآن میں پڑھتے ہو یا بحث ہارون۔ حالانکہ وہ آپ سے صدیاں پہلے گزر چکے ہیں۔ فرماتے ہیں (میں انہیں کوئی جواب نہ دے سکا) لیکن جب میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں لوٹ کر آیا تو میں نے یہی سوال آپ ﷺ سے پوچھا آپ ﷺ نے فرمایا بنی اسرائیل کا معمول تھا کہ وہ اپنے بچوں کے نام انبیاء کرام اور پہلے بزرگوں کے ناموں پر رکھتے تھے (۲)۔ اس حدیث کو مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ امام بنوی لکھتے ہیں کہ قادمہ وغیرہ نے فرمایا ہارون بنی اسرائیل میں ایک نیک عابد شب بیدار تھا۔ روایت ہے کہ جب یہ ہارون فوت ہوئے تو ان کے جنازہ میں دوسرے لوگوں کے علاوہ چالیس ہزار ایسے افراد تھے جن کے نام ہارون تھے۔ لوگوں نے حضرت مریم کو ان سے تشبیہ دی کہ تو تو ہارون کی طرح نیک سیرت اور بلند کردار تھی۔ یہی بھائی مراد نہیں ہیں جیسا کہ قرآن نے فضول خرمی کرنے والوں کو شیطانوں کا بھائی کہا ہے إِنَّ النَّبِيِّمَيْنِ كَالنَّوْءِ الْخِطَابَيْنِ (بے شک فضول خرمی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں) اسی طرح عبد الرزاق اور عبد بن حمید نے قادمہ سے روایت کیا ہے کہ ممکن ہے انہوں نے استہزاء اور مزاحاً حضرت مریم کو حضرت ہارون سے تشبیہ دی ہو یا اس لئے تشبیہ دی ہو کہ پہلے انہوں نے حضرت مریم کی نیکی اور پاک سیرت کو دیکھا تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں ہارون بنی اسرائیل کا ناقص و فاجر شخص تھا۔ انہوں نے فسق کی وجہ سے اس کے ساتھ تشبیہ دی۔ ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے اس طرح روایت کیا ہے۔

حضرت مریم کے والد کا نام عمران تھا اور والدہ کا نام حنہ تھا۔ بغیا کا معنی زانیہ اور بدکارہ ہے۔ اس جملہ میں اس بات کا ثبوت ہے کہ ان سے یہ کام انتہائی قبیح ہے کیونکہ نیک لوگوں کی اولاد سے بڑا کام زیادہ برا اور عجیب سمجھا جاتا ہے۔

فَاسْأَرَتْ أَلَيْهِمْ قَالُوا كَيْفَ نَكَلِمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝

”اس پر مریم نے بچہ کی طرف اشارہ کیا لوگ کہنے لگے ہم کیسے بات کریں اس سے جو گوارہ میں (مہن) بچہ ہے۔“

حضرت مریم نے اشارہ فرمایا کہ اس بچہ سے بات کرو۔ حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں جب حضرت مریم کے پاس اعتراض کا کوئی جواب نہ تھا تو آپ نے اشارہ کیا تاکہ اس کا کلام آپ کی پاکدامنی کی بخت بن جائے۔ آپ کے واقعہ میں ہے جب آپ نے بچہ کی طرف اشارہ کیا تو قوم کو غصہ آ گیا اور کہنے لگے تو نے بہت برا کیا ہے تو ہم سے مزاح کرتی ہے (۴)۔

۱۔ کان زائدہ ہے جیسا کہ اس ارشاد میں زائدہ ہے هَلْ كُنْتُمْ إِذْ أَنْبِئْتُمْ بِرَأْسِكُمْ إِذْ رَأَوُا كُرْسِيًّا ۝ فَمَنْ كَانَ مِنَ الْمَهْدِ ظَرْفٍ مُسْتَقَرٍّ ۝ اور صبیبا طرف کی ضمیر سے حال ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کان تامہ یا وادام کے لئے جو جیسا کہ کان اللہ علیہما حکیمیا میں ہے یا بمعنی صادر ہو۔ یہاں مہد سے مراد ماں کی گود ہے۔ بعض فرماتے ہیں مہد سے مراد واقعی مہد (چنگھوڑا) ہے۔ ان کا مقصود یہ تھا کہ ہم نے تو کوئی عقلمند شخص ایسا نہیں دیکھا جو ناسمجھ اور کلام سے عاجز بچہ سے گفتگو کرے۔ سدی کہتے ہیں جب عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی کلام سنی تو آپ نے دودھ چننا چھوڑ دیا اور لوگوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ جب حضرت مریم نے اشارہ فرمایا تو آپ نے پستان چھوڑ دیا، بائیں طرف پر سہارا لیا اور ان کی طرف متوجہ ہوئے اور دائیں ہاتھ سے اشارہ کیا اور فرمایا (۵)۔

قَالَ اِنِّي عَبْدُ اللَّهِ ثَلَاثًا اَلْتَمِسُ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا ۝

'' (اچانک) وہ بچہ بول پڑا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب عطا کی ہے اور اس نے مجھے نبی

بنایا ہے۔ ۝

۱۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی ذات کی اسم جہالت (اللہ) کی طرف اضافت کر کے اشارہ فرمایا کہ میں اللہ کا عبد مکرم ہوں۔ چونکہ قوم منکر تھی اس لئے تاکید کے ساتھ آپ نے کلام کو ذکر فرمایا۔ وہب فرماتے ہیں جب بنی اسرائیل حضرت مریم سے مجاہد اور مناظرہ کر رہے تھے تو ذکر یا علیہ السلام تشریف لے آئے۔ آپ نے عیسیٰ علیہ السلام کو فرمایا اگر تجھے حکم دیا گیا ہے تو اپنی دلیل پیش کرو۔ عیسیٰ علیہ السلام نے اس وقت یہ ارشاد فرمایا۔ اس وقت آپ کی عمر چالیس دن تھی (۱)۔

مقابل فرماتے ہیں پیدائش کے دن ہی آپ نے انہی عبد اللہ فرمایا تھا۔ آپ نے اپنی عبودیت کا اقرار کیا تھا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اور آپ نے سب سے پہلے یہی کلام فرمائی تا کہ لوگ مجھے الہ (خدا) نہ بتائیں (۲)۔

۲۔ انا ہی کو حوزہ نے یاء کے سکون کے ساتھ اور باقی قراء نے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ الکتاب سے مراد تورات ہے۔ حضرت حسن فرماتے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابھی ماں کے پیٹ میں تھے کہ اللہ نے تورات آپ کو الہام فرمائی تھی (۳)۔ اکثر علماء فرماتے ہیں کہ کتاب سے انجیل مراد ہے اور آپ کو صغریٰ میں انجیل دی گئی تھی لیکن آپ اس وقت زیرک لوگوں جیسی عقل رکھتے تھے۔ بعض نے اس کا معنی یہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے کتاب (انجیل) عطا فرمائے گا اور مجھے نبی بنائے گا۔ اور ماضی کے الفاظ سے اس لئے تعبیر فرمایا کیونکہ ان امور کا وقوع یقینی تھا اور تحقیق تھا اور جس کا وقوع یقینی ہو وہ واقع کی طرح ہوتا ہے (یعنی گویا وہ ہرچکا ہے) بعض فرماتے ہیں یہ آپ نے وہ بات بتائی جو آپ کے بارے میں محفوظ میں لکھی تھی۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا مستی کنت نبیاً۔ آپ کب سے نبی ہیں فرمایا میں اس وقت سے نبی ہوں جبکہ آدم علیہ السلام روح اور جسم کے درمیان تھے۔ اس حدیث کو ابن سعد ابو نعیم نے اعلیٰ میں مسیرہ الفجر بن سعد بن ابی الجعد عاء کے سلسلہ سے روایت کیا ہے اور طبرانی نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔

وَجَعَلَنِي مُبْرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۝ وَاَوْصِنِي بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝

'' اور اسی نے مجھے بابرکت کیا ہے جہاں کہیں بھی میں ہوں، اور اسی نے مجھے حکم دیا ہے نماز ادا کرنے کا اور زکوٰۃ دینے

کا۔ جب تک میں زندہ رہوں ۝

۱۔ بابرکت کا معنی نیکی اور خیر کو ثابت کرنا ہے اور یہ بابرکت البعیر سے مشتق ہے جس کا معنی اونٹ کا بیٹھنا ہے یا بابرکت بمعنی عطا میں زیادتی اور اضافہ کرنا ہے۔ عرب کہتے ہیں اَللّٰهُمَّ بَارِكْ فِیْ عَطَايْكَ۔ اے اللہ اپنی عطا اور بخشش میں اضافہ فرما۔ یا بمعنی عظمت اور مکرم ہے۔ کہا جاتا ہے یہ فلان کی برکت کی وجہ سے ہے۔ بعض نے مبارک کا معنی یہاں نفعاً (بہت زیادہ نفع دینے والا) کیا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں اس کا معنی معلم خیر ہے، یعنی بھلائی کی تعلیم دینے والا۔ عطا فرماتے ہیں اس کا معنی اللہ تعالیٰ کی ذات اس کی توحید اور اس کی عبادت کی طرف دعوت دینے والا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ اللہ نے مجھے اپنے پیروکاروں کے لئے باعث برکت بنایا ہے (۴)۔ جہاں بھی میں ہوں خواہ زمین میں خواہ آسمان میں۔ خواہ کسی طرف بھی متوجہ ہوں۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ آپ

آسمان والوں کے لئے بھی نفع رساں ہیں کیونکہ فرشتے بھی آپ سے مستفید ہوتے ہیں۔

جس نے مجھے نماز پڑھنے اور زکوٰۃ ادا کر کے مال کو اور نفس کو ہر قسم کے ذرائع سے پاک کرنے کا حکم دیا ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں اگر یہ کہا جائے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے پاس تو مال تھا ہی نہیں انہیں کیسے زکوٰۃ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ بعض علماء نے اس سوال کے جواب میں لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے مجھے اس نے زکوٰۃ کا حکم دیا ہے اگر میرے پاس مال ہو۔ بعض فرماتے ہیں خبر کی کثرت طلب کرنے کے لئے یہ حکم دیا۔ بعض فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ میں تجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دوں گا اور اس سے مادمات حیا صلوات اور زکوٰۃ کی طرف ہے یعنی اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اپنی زندگی میں نماز اور زکوٰۃ ادا کرتا رہوں۔

وَبَرٍّ اِبْوَالِدَيْهِ وَسَوْمٍ يَجْعَلُنِي جَبَّارًا سَقِيًّا ۝

”اور مجھے خدمت گزار بنایا ہے اپنی والدہ کا اور اس نے نہیں بنایا مجھے جابر (اور) بد بخت لے۔“

لے برآ کا عطف مبارکنا پر ہے۔ یا اس فعل کی وجہ سے منصوب ہے جس پر اوصافی کافضل ولائت کر رہا ہے یعنی کلفنی برا۔ اس صورت میں برآ مصدر ہوگا۔ جبار کا معنی متکبر اور سرکش ہے۔ شقیاً اپنے رب کا نافرمان۔ بعض فرماتے ہیں شقی وہ ہوتا ہے جو گناہ کرے لیکن تو یہ نہ کرے۔

وَالسَّلَامُ عَلٰی يَوْمِ وُلِدْتُ وَيَوْمِ اَمُوتُ وَيَوْمِ اُبْعَثُ حَيًّا ۝

”اور سلامتی ہو مجھ پر جس روز میں پیدا ہوا اور جس دن میں مرے گا اور جس دن مجھے اٹھایا جائے گا زندہ کر کے لے۔“

لے والسلاام علی حقیقت میں جملہ فعلیہ ہے، اسی وجہ سے اس کا عطف جملہ فعلیہ پر کیا گیا ہے اور صورت جملہ اسمیہ اس لئے بنا تا کہ احترام اور ثبوت پر دلالت کرے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تینوں مختلف حالات میں سلامتی کا ارشاد فرمایا گیا ہے۔ یہ آیت کے وقت شیطان کے چوکے سے موت کے وقت عذاب قبر سے اور شکر کے روز قیامت کی ہولناکیوں اور دوزخ کے عذاب سے۔ السلام پر الف ام عہدی ہے، جنس کا ہے۔ اس کلام میں آپ کے دشمنوں پر لعنت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جب سلامتی جنس کو اپنے لئے اور اپنے پیغمبرین کے لئے بنایا تو اشارہ ہے کہ جو آپ کے مخالف ہے اس کا حکم بھی مخالف ہوگا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَالسَّلَامُ عَلٰی مَن سَلَطْنَا عَلٰیہِمْ (سلامتی ہو ان پر جو ہدایت کے پیرو کار ہیں) کیلئے اشارہ ہے کہ جو ہدایت کو چھٹا تا ہے اور پیٹھ پیچھرتا ہے اس پر عذاب ہے۔ علام بغوی فرماتے ہیں جب عیسیٰ علیہ السلام نے موثر اور بلخ کلام فرمائی تو انہیں حضرت مریم علیہا السلام کی پاکدامنی اور عصمت کا یقین ہو گیا۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام خاموش ہو گئے اور اس عمر تک پہنچنے سے پہلے کلام نہ فرمائی جس میں عام طور پر پہنچے بولنا شروع کرتے ہیں۔ (2)

ذٰلِكَ عِيسٰى ابْنُ مَرْيَمَ ۗ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيهِ يَسْتَرْوٰنَ ۝

”یہ ہے عیسیٰ بن مریم لے (اور یہ ہے وہ) سچی بات جس میں لوگ جھگڑے ہیں لے۔“

لے ذالک کا اشارہ الیہ سابقہ کلام ہے جس میں عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی عبودیت وغیرہ کا اظہار فرمایا۔ ذالک مبتدأ اور عیسیٰ خبر ہے، ابن مریم نعت یاد سری خبر ہے، یعنی اس طرح حقیقت نہیں ہے جیسا کہ عیسائی کہتے ہیں کہ آپ خدا ہیں، یہ اکامن گھڑت خیال ہے۔ اس جملہ میں نصرائیوں کے عقیدہ کی بڑے بلخ اور موثر انداز میں تردید و تکذیب کی جارہی ہے اور طریق برہانی سے ان کا رد کیا گیا

ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جسے علیہ السلام کو ایسی صفت سے موصوف فرمایا جو ان کے عقیدہ کی ضد ہے پھر حکم کا عکس بیان فرمایا (یعنی انہوں نے علم لگایا کہ جسے علیہ السلام اللہ ہے یا اللہ کا بیٹا ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا مَا كَانَ لِشَيْءٍ أَنْ يَتَّخِذَ مِنْ وَّلَدِي (یہ زبان ہی نہیں اللہ تعالیٰ کو کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے) کہ ارشاد اللہ کے بیٹے ہونے کی صراحت نفی ہے۔ یعنی یہ صحیح ہی نہیں بلکہ محال ہے کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے)۔

ابن عاصم اور یحییٰ نے قول الحق کو مصدر مٹو کہ کی حیثیت سے منصوب پڑھا ہے تقدیر اس طرح ہے اقول قول الحق یا مدح کی بناء پر منصوب ہے، باقی قراء نے مبتداء محذوف کی خبر کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگی۔ الکلام السابق قول الحق لا ریب فیہ۔ سابق کلام بھی کلام ہے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ قول کی حق کی طرف اضافت بیان ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں قول الحق یا تو عیسیٰ کی صفت ہے یا اس سے بدل ہے یا اس کی خبر ثانی ہے۔ اس کا معنی کلمۃ الحق ہے۔ یسئرون کا معنی شک کرنا اور ہٹنا کرتا ہے۔ یہودی کہتے آپ جاوے اور کذاب ہیں جبکہ نصاریٰ کہتے کہ آپ (نعمہ باللہ) اللہ کے بیٹے ہیں یا خود اللہ ہیں۔ اس آئندہ آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے بیٹا ہونے کی نفی فرمادی۔

مَا كَانَ لِشَيْءٍ أَنْ يَتَّخِذَ مِنْ وَّلَدِي ۗ لَٰكِنَّ سُبْحٰنَهُ ۗ إِذْ أَقْضٰیٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿۳۱﴾

”یہ زبان ہی نہیں اللہ تعالیٰ کو کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔ وہ پاک ہے جب وہ فیصلہ فرماتا ہے کسی کام کا تو بس صرف اتنا حکم دیتا ہے اس کے لئے کہ ہو جاوے وہ کام ہو جاتا ہے۔“

لے و ولد سے پہلے نفی کی تاکید کے لئے لایا گیا ہے۔ سبحانہ مصدر ہے فعل کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ اصل میں یہ اسبحہ سبحاناً تھا۔ یہ جملہ حاضر ہے، اللہ تعالیٰ کے کسی کو بیٹا بنانے سے پاک ہونے پر دلالت کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ وہ قادر مطلق ہے کہ کسی چیز کو پیدا کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو کن فرماتا ہے تو وہ ہو جاتی ہے تو جسے علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا بھی اس کے حکم اور اس کے پیدا کرنے کے ارادہ سے ہے۔ جو ذات ایسی عظیم قدرتوں کی مالک ہو وہ مخلوق کی مشابہت سے پاک ہوتی ہے۔ عورتوں کے حمل کے ذریعے بچہ پیدا کرنے کی اسے حاجت نہیں ہوتی اور وہ مخلوق کے ذریعے اجزا ادا نہ کرنے کی بھی محتاج نہیں ہوتی۔ جملہ شرطیہ۔ کسی کو بیٹا بنانے کی نفی کے لئے بطور تخیل ہے۔ ابن عاصم نے فیکون کو امر کے جواب کی بناء پر منصوب پڑھا ہے۔

وَإِنَّ اللّٰهَ رَبِّيَّ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۗ هٰذَا صِرٰطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۳۱﴾

”اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی سوا کسی کی عبادت کیا کرو یہی سیدھا راستہ ہے۔ لے“

لے کو فیوں ابن عاصم اور یحییٰ نے ان کو الف کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس بناء پر کہ یہ مستقل جملہ ہے اور اس کا عطف انہی عبد اللہ پر ہے۔ اہل حجاز اور ابو عمرو نے الصلوٰۃ والذکوٰۃ پر عطف کی بناء پر الف کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی اوصافی بان اللہ دہی یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ ثابت ان اللہ دہی و ربکم۔ اور جملہ انہی عبد اللہ پر عطف ہو کر قول کا مقولہ ہے۔ اس آیت میں توحید کے اعتقاد کے ساتھ قوت نظریہ کی تکمیل کی طرف اشارہ ہے اور فاعل وہ میں نامورات کے ادا کرنے اور منہیات سے رکنے کے ساتھ قوت عملیہ کی تکمیل مطلوب ہے۔ فاعل سبیہ ہے اور ہذا صراط مستقیم۔ فاعل وہ کی تعلیل ہے اور ما سبق کی تاکید ہے۔ صراط مستقیم سے مراد وہ راستہ ہے جس کے خیر ہونے کی شہادت دی گئی ہو۔

فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿٥٠﴾

”پھر کئی گروہ آپس میں اختلاف کرنے لگے۔ پس ہلاکت ہے کفار کے لئے اس دن کی حاضری سے جو بہت بڑا ہے۔“

۱۔ احزاب سے مراد یہود و نصاریٰ یا نصرانیوں کے مختلف گروہ ہیں۔ نصرانیوں کے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق تین گروہ تھے۔ نسطوریہ کہتے آپ اللہ کے بیٹے ہیں، یعقوبیہ کہتے خدا عیسیٰ علیہ السلام کی صورت میں زمین پر اترا تھا پھر آسمان پر واپس لوٹ گیا۔ عیسائیوں کا ایک گروہ مکاتیب تھا جو کہتے کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ بندے اور اس کے رسول تھے۔ فاختلاف کا عطف قال عیسیٰ پر ہے۔ من بینہم میں من زائدہ ہے اور ظرف اختلاف کے متعلق ہے مطلب یہ ہے کہ آپ کے اصحاب کے درمیان یا آپ کی قوم کے درمیان یا لوگوں کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا۔

۲۔ فویل میں فاعلیہ ہے ویل اصل میں مصدر منصوب ہے جس کا معنی ہلکوا ہلاکنا ہے پھر جملہ فعلیہ سے اسے جملہ اسمیہ کی طرف منتقل کیا گیا اور ابتداء کی بناء پر اسے رفع دیا گیا تاکہ استمرار پر دلالت کرے۔ جیسے سلام علیکم ہے۔ الدین کفروا اصل میں مصدر کے متعلق تھا۔ پھر اسے مبتدأ کی خبر کے طور پر ظرف مستقر بنا لیا گیا۔ من مشہد یوم عظیم اولیل کے متعلق ہے یعنی کفار کے لئے اس دن کی حاضری سے ہلاکت ہے جس کی ہولناکی جس میں حساب و جزاء کا سلسلہ بڑا عظیم ہوگا۔ مراد قیامت کا دن ہے یا مشہد کا معنی وقت اشہود ہے یا مکان اشہود ہے یعنی حاضری کے وقت یا حاضری کی جگہ کی وجہ سے کفار کے لئے ہلاکت ہے یا یہ معنی کہ اس دن کی ان کے خلاف گواہی کی وجہ سے ان کے لئے ہلاکت ہے۔ فرشتے انبیاء کرام اور امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔ ان کی زبانیں ان کے ہاتھ اور پاؤں ان کے کتوفسق کی گواہی دیں گے۔ یامن وقت الشہادۃ علیہم او من مکانہا مراد ہے یعنی ان کے خلاف شہادت کے وقت یا شہادت کی جگہ سے کفار کے لئے ہلاکت ہے۔ بعض فرماتے ہیں اس کا یہ معنی کہ جو انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق گواہی دی اس کی وجہ سے ان کے لئے ہلاکت ہے۔

أَسْمِعْ بِهِمْ وَأَبْصُرْ يَوْمَ يَأْتُ تَنَالِكِ الْظَلْمُونَ الْيَوْمَ مَرِّ فِي صَلْبٍ مَجِيدٍ ﴿٥١﴾

” (اس دن) یہ خوب سننے لگیں گے اور خوب دیکھنے لگیں گے جس دن آئیں گے ہمارے پاس۔ لیکن یہ ظالم آج تو کھلی گمراہی میں ہیں۔“

۱۔ اس آیت میں یوم سے مراد قیامت کا دن ہے۔ اسمع و ابصر تعجب کے صیغے ہیں، اللہ تعالیٰ تعجب کرنے سے پاک ہے۔ اس لئے جہود فرماتے ہیں اس کا یہ مطلب ہے کہ قیامت کے روز ان کے کان اور ان کی آنکھیں حق کو فوراً سننے اور دیکھنے کی وجہ سے قابل تعجب ہوں گی لیکن دنیا میں لوگ اور بہرہ بہنے رہنے کے بعد آج ان کا سننا اور دیکھنا کچھ نفع بخش نہیں دینا میں حق کو سننے اور حق کا مشاہدہ کرتے تو توبہ نفع بخش تھا۔ یا یہ دھمکی اور تہدید ہے کہ یہ لوگ قیامت کے روز ان ہماری دھمکیوں اور تہدید کو کانوں سے سنیں گے اور آنکھوں سے مشاہدہ کریں گے، جبکہ دنیا میں انہوں نے ہمارے ڈرانے اور خوف دلانے کی طرف کچھ توجہ نہ کی۔ ہم۔ جار مجرور صند تعجب کے فاعل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اسمع و ابصر امر کے صیغے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم فرمایا ہے کہ ان عقل کے انہوں کو اس عظیم دن کی ہولناکیوں کے بارے میں سناؤ اور دکھاؤ۔ اس تاویل پر جار مجرور محل نصب میں ہوں گے۔

سے الیوم سے مراد دنیا ہے اور یہ ظرف اس فعل یا شیعہ فعل کے متعلق ہے جس کے متعلق فی ضلل مبین ہے۔ ظمیر کی جگہ یہاں الظالمون استعمال فرمایا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ چل جائے کہ وہ ظالم تھے کیونکہ انہوں نے اس وقت اپنے کانون اور آنکھوں کو استعمال ہی نہ کیا، جبکہ ان کے لئے سننا اور دیکھنا مفید تھا اس وقت ان کی عقل پر پردے پر پردے رہے۔ اسی گمراہی کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے ان کی غفلت والا پرواہی پر مہر لگا دی۔

وَأَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ وَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٥٥﴾

”اور اسے نبی کریم آپ ذرا اپنے انہیں حسرت و ندامت کے دن سے جب ہر بات کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔ اور آج یہ لوگ غفلت میں ہیں اور یہ ایمان نہیں لاتے۔“

یوم الحسرة۔ اندو کا مفعول ثانی ہے۔ اندر ہم کا جملہ یا تو معترضہ ہے یا فاعل مختلف پر معطوف ہے قلنا کی تقدیر کے ساتھ۔ اذ قضی الامر یا الیوم سے بدل ہے یا حسرة کی ظرف ہے۔ یعنی جب حساب سے فراغت ہو جائے گی۔ جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں داخل کر دیے جائیں گے اور موت کو ذبح کر دیا جائے گا۔

حضرت ابو سعید الخدری سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا موت کو چنگبرے مینڈھے کی صورت میں لایا جائے گا اور ایک منادی کرنے والا نداء دے گا اے جنتیو! پس وہ اس کی طرف متوجہ ہوں گے اور دیکھیں گے وہ پوچھنے گا کیا تم اسے جانتے ہو وہ کہیں گے یہ موت ہے۔ وہ سب اسے دیکھ کر ہلکے ہوں گے پھر اسے ذبح کیا جائے گا پھر منادی کرنے والا کہے گا اے اصل جنت اب تم نے ہمیشہ زندہ رہنا ہے۔ اب کوئی موت نہیں آئے گی۔ اسے دوزخیو! تم نے دوزخ میں ہمیشہ رہنا ہے، تمہیں بھی موت نہیں آئے گی۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت کریمہ پڑھی واندذرهم یوم الحسرة اذ قضی الامر الایہ اس حدیث کو بغوی نے روایت کیا ہے (۱)۔ شیخین نے بھی اسی طرح روایت کی ہے اور شیخین نے موت کا ذبح کرنا ابن عمر کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ لیکن اس حدیث میں آیت کا پڑھنا نہیں ہے۔ اسی طرح ابولعلیٰ بزار اور طبرانی نے الاحاطہ میں صحیح سند کے ساتھ حضرت انس سے روایت کی ہے۔ حاکم اور ابن حبان نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے لیکن اس میں بھی قراءت آیت کا ذکر نہیں ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں قیامت کے دن کو یوم الحسرة اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ مجرم اپنے جرم پر اور نیکوکار اپنی نیکیوں کی قلت پر حسرت کریں گے (۲)۔

طبرانی اور ابویعلیٰ نے معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اہل جنت کو کوئی حسرت و ندامت نہ ہو گی لیکن اس وقت پر وہ حسرت کریں گے جو اللہ کے ذکر کے بغیر گزارا ہوگا۔

امام بغوی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص بھی مرتا ہے وہ حسرت کرتا ہے اور شرمندہ ہوتا ہے۔ صحابہ نے پوچھا ندامت کس پر ہوگی فرمایا اگر نیکوکار ہوگا تو یہ حسرت کرے گا کہ زیادہ نیکیاں نہ کر سکا۔ اگر مجرم ہوگا تو یہ حسرت کرے گا کہ وہ برائی سے کیوں نہ بچا (۳)۔

۱۔ ابھی وہ اپنی گمراہی سے غافل ہیں اور اس بات سے بھی بے خبر ہیں کہ آخرت میں ان سے کیسا سلوک ہوگا، اب تو وہ خبر صادق

تعمیر کی بات پر ایمان نہیں لاتے۔ یہ دونوں جملے ہی صلال مبین جس فعل یا شے فعل کے متعلق ہیں اس کی ضمیر سے حال ہیں اور درمیان میں کلام متعرض ہے یا یہ دونوں جملے اندر ہم کی ضمیر منصوب سے حال ہیں، یعنی ان کو ذرا ایسے درآن حالیکہ یہ عامل ہیں اور تصدیق نہیں کرتے ہیں۔ پس یہ حال ہے جو تعلیل کو مضمّن ہے۔

إِنَّمَا تَحْنُ كَرِيْهُتُ الْأَرْضِ وَمَنْ عَلَيْهَا وَإِنِّيَأَيُّ جَعُونَ ﴿٥﴾

”یقیناً ہم ہی وارث ہوں گے زمین کے اور جو کچھ اس کے اوپر ہے لے اور ہماری طرف ہی سب لوٹائے جائیں گے۔“

لہٰذا یعنی یہ زمین اور اس پر رہنے والی مخلوق سب ختم ہو جائیں گے اور صرف رب تعالیٰ کی ذات تہا باقی رہے گی۔ جس طرح مورث کی موت کے بعد وارث باقی رہتا ہے۔ من کا کلمہ عقلاً کو غلبہ دیتے ہوئے استعمال فرمایا۔ یا یہ معنی کہ اللہ تعالیٰ زمین پر اور زمین والوں پر سلطنت کرنے والوں کو ہلاک کر کے ہر شخص کی مالکیت کو ختم کر دے گا اور بادشاہی صرف اللہ وحدہ کے لئے ہوگی۔

یہ قیامت کے دن اٹھے کے بعد انہوں نے ہماری طرف لوٹنا ہے اور ہم انہیں ان کے اعمال کے مطابق جزاء و سزا دیں گے۔ یہ جملہ کلمہ مرفوع ہے کیونکہ یہ نوٹ پر مطلق ہو کر انفا کی خبر ہے۔

وَأَذْكُرُ فِي الْكِتَابِ الْبُرْهَانَ أَنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا ﴿٦﴾

”اور ذکر کیجئے آپ کتاب میں لہٰذا ابراہیم علیہ السلام کا وہ بڑا راست بازمی تمام“

لہٰذا صدیقاً کا معنی بعض علماء نے کثیر الصدق کیا ہے، یعنی بہت زیادہ سچ بولنے والا۔ بعض نے فرمایا جس نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو۔ بعض فرماتے ہیں صدیقاً سے مراد وہ شخص ہے جو صدق کا عادی ہونے کی وجہ سے کبھی جھوٹ نہ بولتا ہو۔ بعض فرماتے ہیں جو قول اور اعتقاد میں سچا اور اپنے فعل سے اس نے اپنے صدق کو ثابت کیا ہو۔ بعض فرماتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی غیب چیزوں میں تصدیق کرنے والا ہو جیسے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اس کی صفات اس کے انبیاء اور اس کی قیام قیامت وغیرہ اور جو ان امور کو بحسن و خوبی سرانجام دیتا ہو جن کا اس کو حکم دیا گیا ہے اور ان چیزوں کو قبیح جانتا ہو جن سے منع کیا گیا ہے اور اپنی تصدیق کو اپنے فعل سے ثابت بھی کر لیا ہو۔ پس وہ ادا امر کو بجالانے اور منہاجی سے اجتناب کرنے پر کمر بستہ ہو۔ میں کہتا ہوں کثرت تصدیق سے متعلقات کے اعتبار سے کثرت تصدیق مراد نہیں جیسے لغوی کی ظاہر عمارت والہ است کرتی ہے کیونکہ جو کچھ نبی کریم ﷺ نے لکرائے ہیں اس کی تصدیق تو ہر مومن کے دل میں پائی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ جو کسی ایک چیز کی بھی تصدیق نہیں کرتا وہ کافر ہے اور تمام امور شرعیہ پر عمل کرتا اور منہیات سے اجتناب کرنا صالحین اور نیکو کاروں کا حصہ ہے اور ہر نیک صالح شخص بھی صدیق نہیں ہوتا بلکہ کثرت تصدیق سے مراد تصدیق کی قوت اور شدت ہے۔ یہ چیز نبی کے ذریعے اصلاً یاورشہ ملتی ہے، یعنی انبیاء کرام کی ظاہر اور باطنی عمل اتباع کرنے اور کمالات نبوت اس استغراق اور ان حاصل تجلیات و اتیہ کی وجہ سے میسر آتی ہے جو بلا حجاب اس اسمی پر اتباع و پیروی کی وجہ سے اس پر منعکس ہوتی ہیں۔ (واللہ اعلم) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے چارہ قسم کا ذکر فرمایا جن پر اس کا انعام ہے اور وہ انبیاء کرام صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں اور دوسرے مومنین کو ان لوگوں کی محبت کی بشارت دی ہے۔ پس صدیقین، شہداء اور صالحین کے درجہ سے بلند ہیں۔ ہم نے سورہ نساء کی آیت کریمہ قَوْلِهِمْ مَعَنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّهُمْ لَأَنْفُسَهُمْ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالْحَقِّيقَاتِ وَاللَّهِمَّ آوِءَ الصَّالِحِينَ کے تحت تفصیل سے یہ مسئلہ ذکر کیا ہے۔ صدیقین

وہ ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا **لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا إِذْ يُبَدِّلُ مِنْ بَعْدِ صِرَافَتِهِمْ أَمْثَلًا وَأَنْ يَكُونَ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ**۔ اس کی تفسیر سورہ واقعہ میں ذکر کی ہے۔ انبیاء کرام کے بعد سب سے بڑے صدیق رسول اللہ ﷺ کے صحابہ ہیں۔ خصوصاً جو ان میں سے جلیل القدر اور رفیع المنصب ہیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میں صدیق اکبر ہوں جو میرے بعد صدیق اکبر ہونے کا دعویٰ کرے گا وہ جھوٹا ہوگا، میرے بعد سے مراد بعد رتبی ہے بعد زمانی نہیں ہے۔ سب صحابہ سے بڑے صدیق ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں صدیق فرمایا اور اسی پر علماء امت کا اجماع ہے۔

عربی نبوت سے مشتق ہے جس کا معنی زمین کی بلند جگہ ہے۔ نبی رتبہ میں بلند ہوتا ہے کیونکہ اللہ نے اسے مخلوق کی راہنمائی کیلئے بھیجا ہوتا ہے یا یہ النبا سے مشتق ہے جس کا معنی خبر ہے، یعنی اللہ کی طرف سے خبر دینے والا یا اللہ کی طرف سے خبر دیا گیا۔ (محموز اور تامل اصل میں اختلاف کی بناء پر دونوں معانی ہو سکتے ہیں)

إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْئًا ۗ

”جب انہوں نے کہا اپنے باپ سے کہ اے میرے باپ تو کیوں عبادت کرتا ہے اس کی چونکہ کچھ سنتا ہے اور نہ کچھ دیکھتا ہے اور نہ سمجھتا ہے کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے۔“

ابوہ سے مراد آذر ہے۔ سورہ انعام میں اسکی تحقیق گزر چکی ہے۔ مہربانی اور شفقت طلب کرنے کیلئے یہاں فرمایا ہے اے میرے باپ (حالانکہ وہ چچا تھا یا نہیں تھا۔ یسمع اور یبصر دونوں کے مقبول بالکل معدوم و منہی ہیں، یعنی ان کے پاس سننے کے لئے نہ کان ہیں نہ دیکھنے کیلئے آنکھیں ہیں (یہ تو تراشے ہوئے پتھر کے بت ہیں) یہ معنی بھی ہو سکتا ہے نہ یہ کچھ سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں تو پھر یہ صورتیں کیسے تمہارے حال سے باخبر ہیں، کیسے تمہارے ذکر کو سنتے ہیں اور تمہاری اس عجز و نیاز کو کیسے دیکھتے ہیں۔

مع تمہیں نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ تمہاری معصیت کو دور کر سکتے ہیں۔ شیناً مصدر بیت کی بناء پر منصوب ہے یا یہ معنی کہ تکلیف میں سے کچھ دور نہیں کر سکتے اس صورت میں معصیت کی بناء پر منصوب ہوگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ کے سامنے اس کی گمراہی کا تذکرہ کر رہے ہیں لیکن بڑے ادب و احترام سے۔ وہ انہیں ہدایت کی طرف بلارہے ہیں اور ادب و احترام کا دامن تھا سے ہوئے ان کی گمراہی پر ایک بڑی واضح اور کھلی دلیل پیش کر رہے ہیں۔ اسکی گمراہی کا کھلے اور صریح الفاظ میں تذکرہ نہیں کرتے بلکہ صرف پوچھتے ہیں کہ جناب کوئی ایسی چیز ہے جو تمہیں ان بتوں کی عبادت پر مجبور کرتی ہے یہ تراشے ہوئے ڈھانچے تو اس قابل بھی نہیں کہ کوئی دانشور اور عقلمند ان کے سامنے اپنی مقدس پیشانی رگڑے۔ عقلمند تو ہمیشہ کسی عام فعل کو بھی کسی صحیح غرض کے لئے ادا کرتا ہے۔ جبکہ عبادت جبکہ مفہوم حد درجہ کی تعظیم ہے اس کا مستحق صرف اور صرف وہ ذات ہو سکتی ہے جو ہر چیز سے مستغنی اور بے نیاز ہو، جو نیکی پر انعام اور جرم پر سزا دینے پر قادر ہو، کسی کو نفع پہنچانے یا کسی کی تکلیف دور کرنے پر قدرت تامہ رکھتی ہو، تاکہ اس سے اپنا دفاع طلب کیا جاسکے۔ عبادت کے لائق وہ ذات ہو سکتی ہے جو پیدا کرنے، رزق دینے، زندہ کرنے، مارنے، سزا دینے اور ثواب دینے جیسی صفات سے متصف ہو لیکن جو اپنے وجود میں دوسروں کا حتمی وجود دوسری مخلوق کی طرح ممکن ہو اگرچہ سننے اور دیکھنے، انعام دینے، تکلیف پہنچانے پر قادر بھی ہو بلکہ تمام مخلوق سے افضل بھی ہوں جیسا کہ انبیاء کرام اور ملائکہ ہیں، عقل سلیم تو انکی عبادت کو بھی عبادت سمجھتی ہے اور غیر کی عبادت کرنا تو ایسے ہے جیسے جو پہلے ہی دست طلب خود پھیلانے ہوئے ہو، اس سے کوئی دوسرا سوال کرے جو خود فقیر اور محتاج ہے اس

سے وہ اپنی حاجت طلب کرتا ہے۔ جب ذی روح اور اشرف المخلوق کی عبادت کی یہ کیفیت ہے تو پھر پتھر کی تراشی ہوئی صورتیاں جو نہ سنی ہیں، نہ دیکھتی ہیں، نہ کوئی نفع دے سکتی ہیں انکی عبادت کرنا اور ان کے سامنے زمین نیاز چھکانا کتنا قبیح اور کتنا بڑا جرم ہوگا۔ اور ان کی عبادت کیسے زیا اور مناسب ہوگی۔

يَا بَتِ اِنِّي قَدْ جَا عَرَفِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي اَهْدِكَ حَسْرًا اِطْلَسُوْا ۝۱

”اے میرے باپ بیشک آیا ہے میرے پاس وہ علم جو تیرے پاس نہیں آیا اس لئے تو میری پیروی کر میں دکھاؤں گا تجھے

سیدھا راستہ۔ ل۔“

۱۔ حضرت ابراہیم نے کہا اے میرے باپ اللہ نے جو مجھے اپنی ذات کا عرفان اور اپنے احکام کا علم یقینی عطا فرمایا ہے اس سے تمہارا واسن تکبر خالی ہے، تم میرے دین کی اتباع کرو، میں تمہاری بالکل سیدھے راستہ کی طرف راہنمائی کروں گا جو دنیا و آخرت کی کامیابی تک تمہیں پہنچا دے گا۔ حضرت ابراہیم کے خلق عظیم اور طبع کریم کا کمال ہے کہ باپ کو سزا دینا جاہل اور بے علم نہیں کہا اور نہ اپنے علمی شئی دکھائی بلکہ اپنے آپ کو ایک رفیق سفر کی طرح پیش کیا جو راستہ کے پیچ و خم سے زیادہ واقف ہے۔ پھر آپ نے یہ ذکر کرنے کے بعد کہ جس عقیدہ پر تم مطمئن جیسے ہو اسی میں ذرا برابر نفع نہیں۔ فرمایا دنیا و آخرت کی جانی اور نقصان کا راستہ تم نے اختیار کر رکھا ہے۔ کیونکہ اس میں حریفین شیطان کی عبادت ہے کیونکہ وہی اس بہت بڑے جرم (توں کی عبادت) کا حکم دینے والا تھا۔

يَا بَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ۝۲

”اے باپ شیطان کی پوجا نہ کیا کر بیشک شیطان تو دشمن کا نافرمان ہے۔ ل۔“

۱۔ فرمایا شیطان کے مزین کردہ افعال کفر و معاصی توں کی پوجا کو مست اہل و نہ کیونکہ وہ تو خود رب کریم کا نافرمان ہے۔ اس لیے وہ دوسروں کو بھی نافرمانی کا حکم دیتا ہے حالانکہ رب کریم کی وہ ذات ہے جو نعمتوں کے بیشمار دستہ نوزان بچھائے ہوئے ہے (جس سے اپنے بیٹے نے سب لطف اندوز ہو رہے ہیں) اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ مجرم و نافرمان کی پیروی کرنے والا بھی مجرم و گنہگار ہوتا ہے اور ہر مجرم و گنہگار اسی لائق ہے کہ اس سے نعمتوں کے خزانے واپس لے لئے جائیں اور نافرمانی کے جرم پر اس سے انتقام لیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے تبلیغ دین اور شیطان کی مکاریوں سے بچنے کی تلقین کرنے کے بعد ہرے انجام اور سزا و انتقام سے ڈرایا۔

يَا بَتِ اِنِّي اَخَافُ اَنْ يَسْسَلَكَ عَدَاۤءُ ابْنِ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ۝۳

”اے باپ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تجھے پہنچے عذاب (خدا سے) رحمن کی طرف سے تو تو میں جائے شیطان کا ساتھی۔ ل۔“

۱۔ انہی کو نافع اکثر ان کثیر اور ابو عمرو نے یا، کے نفع کے ساتھ، باقی قراء نے پہنچے کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ فرمایا ہے باپ اگر آپ کفر اور شیطان کی اطاعت کی روش پر چلے رہے تو مجھے تمہارے عذاب میں کچلے جانے کا اندیشہ ہے عذاب کے ذکر میں رحمن کی صفت کا تذکرہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نافرمانی ایسا قبیح جرم ہے کہ اس ذات سے عذاب ملنے کا باعث بنتا ہے جو سر پار رحمت ہے کیونکہ اطاعت شعراء پر کمال رحمت مجرموں اور سرکشوں پر کمال غضب کے منافی نہیں ہے۔ تم دنیا میں شیطان کے دوست بن جاؤ گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا میں لعنت کے مستحق ٹھہرو گے اور آخرت میں دردناک عذاب میں تم اس کے ساتھ رہو گے۔ دو تمہارے ساتھ رہے گا اور دونوں اسی لعنت و عذاب میں گرفتار ہو گے۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں (شیطان کی عبادت سے دو وجوہ سے روکا جاتا ہے۔ ایک اس کا آدم کو عہدہ نہ کر کے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنا اور دوسرا انسان سے دشمنی کرنا) لیکن یہاں اس کی جنابت میں سے صرف اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ذکر کیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے آدم سے انکی دشمنی کی طرف توجہ نہ فرمائی بلکہ اسے عارف باللہ ہونے کے باوجود رب کی نافرمانی کرنے کو ذکر فرمایا کیونکہ یہ چیز بہت بری ہے یا دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنا تمام برائیوں کی اصل ہے دوسری تمام برائیاں اور جرائم اس پر متفرع ہوتے ہیں یا تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی آدم اور اس کی اولاد کی دشمنی کا نتیجہ بھی (1)۔

قَالَ اَسَاغِبْ اَنْتَ عَنِ الصَّحَقِ يَا بَرِّهِمْ لَكِنَّ اَسْمٰتًا وَاَهْجَرِي مَلِيًّا ﴿٢٠﴾

”باپ نے کہا کیا روگردانی کرنے والا ہے تو میرے خداؤں سے اے ابراہیم؟! اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار

کردوں گا اور دور ہو جاؤ میرے سامنے سے کچھ عرصہ۔“

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے محبت بھرے اور خلوص آمیز اندازِ تعظیم کے مقابلہ میں درشتی اور سختی سے کلام کیا گیا ہے۔ اے بیٹے نہیں کہا بلکہ نام لے کر بات کی، نام بھی ابتدا کلام میں نہیں بلکہ آخر میں ذکر کیا اور خبر کو مبتدا پر مقدم کیا ہے پھر کلام کو ہمزا استفہامیہ سے شروع کیا تاکہ رغبتِ نفس کے انکار پر توجہ کا اظہار ہو جائے۔ گویا وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ بتوں کی عبادت سے انکار کوئی عقلمند تو کرتا نہیں۔ اس کے بعد دلیل سے بات کرنے کے بجائے دھمکی لینی شروع کر دی کہ اگر تم ہمارے بتوں کے متعلق بات کرنے سے باز نہ آئے یا ان کی عبادت سے اعتراف سے باز نہ آئے تو میں تمہیں پھر پھر ان کی بارش کروں گا۔ کبھی مقابل اور شاک سے لادرجہ منک کا معنی یہ کیا ہے کہ میں تمہیں گالیاں دوں گا اور تمہیں برا بھلا کہہ کر اپنے آپ سے دور کروں گا۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ معنی فرمایا کہ میں تمہیں ماروں گا۔ حسن نے لاقفلنک بالبحجارة معنی ذکر کیا ہے۔ یعنی میں تمہیں پھروں سے لٹل کروں گا (2)۔

۲۔ یہ لائن تنک کے مفہوم پر معطوف ہے۔ کبھی نے ملیا کا معنی طویلا (لبازمانہ) مجاہد اور کرمانہ صیحا (کچھ وقت) سعید بن جبیر نے دھوا (زمانہ) لکھا ہے المللی کا اصل معنی بھرتا ہے۔ عرب کہتے ہیں تمحلیت صیحا میں کچھ وقت ٹھہرا رہا۔ دن اور رات کو المملوان کہتے ہیں۔ قتادہ اور عطاء نے ملیا کا معنی مسالما کیا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ معنی بھی فرمایا ہے کہ تو مجھ سے سلامتی کے ساتھ دور ہو جاؤ نہ میری طرف سے تمہیں ایسی تکلیف پہنچے گی جو تیری برداشت سے وراہ ہوگی۔ عرب کہتے ہیں مللی بامر کذا جب کوئی کسی امر پر قادر ہو (3)۔

قَالَ سَلِّمْ عَلَيْكَ ۚ سَأَسْتَعْفِرُ لَكَ رَبِّي ۚ إِنَّهُ كَانَ بِي حَفِيًّا ﴿٢١﴾

”ابراہیم نے (جواب میں) کہا سلام ہو۔ تم پر میں مغفرت طلب کروں گا۔ تیرے لئے اپنے رب سے دعا پیشک وہ مجھ پر بھلا مہربان ہے۔“

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے الوداعی اور متارکت کا سلام کہا اور بد اخلاقی کا مقابلہ حسن اخلاق سے کرتے ہوئے فرماتے ہیں اچھا تم سلامت رہو۔ ہمیشہ علیم الطبع اور بلند اخلاق لوگوں کا نادانوں سے یہی طریقہ ہوتا ہے کہ وہ ترش کلام اور بد اخلاقی کے آگے پھرتے نہیں بلکہ حوصلہ اور بردباری کا اظہار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَذُرَّاخَالِدًا كَذٰبًا مِّنْ اٰلِهٰتِكُمْ اَلَّذِيْنَ قَالَوا لَا اِسْمَآءُ۔ اللہ کے مقرب بندوں سے

جب جاہل مغرب ہوتے ہیں تو وہ کہتے ہیں سلام ہو۔ یعنی میری طرف سے تمہیں سلامتی ہے میں تجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔
 لہذا یہی کیا کوئی نافع اور عمر و نئے نئے فتنے کے ساتھ بڑھا ہے اور بانی فرما نے بیاہ کے سکون کے ساتھ بڑھا ہے۔ اکثر مفسرین یہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ سے تیرے لئے عرض کروں گا کہ وہ تجھے توحید اور اسلام کی نعمت سے سرفراز فرمائے اور کفر و شرک سے تو بچی توفیق مرحمت فرمائے کیونکہ کافر کی مغفرت کا سوال کرنا جائز ہی نہیں ہے صرف اسکے لئے اس چیز کی توفیق طلب کی جاسکتی ہے جو مغفرت کا موجب ہو۔ میرے نزدیک مفسرین کی یہ توجیہ درست نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد **قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي**
إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ. أَلِي قَوْلِهِ إِلَّا الَّذِينَ ابْتغَوْا مِنَّا إِلَهَ سِوَا اللَّهِ لِيُؤْتِيَهُم مِّنْ لَّدُنَّا مَالًا وَكَانَ أُولَئِكَ صِرَاطًا مَّسْئُورًا کہتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے مشرک کے لئے جو استغفار کیا تھا اس میں حضرت ابراہیم کی اقتداء جائز نہیں ہے حالانکہ مشرک کے لئے توفیق کی دعا جائز ہے (اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول سے استغفار لک دیا جائے تو یہ مفہوم ہوتا جو مفسرین نے بیان فرمایا ہے تو صراحتاً قرآن میں منع نہ کیا جاتا۔) مناسب یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ آپ کہنا مشرک کے لئے استغفار کی نبی سے پہلے کا ہے رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا حضرت ابوطالب کو کہا تھا قسم بخدا میں آپ کے لئے استغفار کرتا رہوں گا جب تک کہ مجھے منع نہیں کیا جاتا۔ اس پر یہ آیت کہ یہ نازل ہوئی **مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ**
أَمَرُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلَّذِينَ كَفَرُوا بِمَا كَفَرُوا اس کی تفسیر سورہ توبہ میں گزر چکی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لئے اللہ تعالیٰ سے ان کے ایمان کی درخواست کی ہوتی تو اللہ تعالیٰ ضرور انہیں ایمان کی روشنی عطا فرمادیتا کیونکہ ہر نبی کی دعا قبول ہوتی ہے لیکن آذکر ایمان مقدر ہی نہ تھا اس لئے ابراہیم علیہ السلام نے انکے لئے دعایں نہیں کی تھی۔

سے میرا رب کریم مجھ پر بڑا مہربان اور بڑا نوازگار فرمائے والا ہے۔ انتہائی لطف اور بندہ نوازی فرمائے والا ہے۔ بکھسی نے یہ معنی لکھا ہے کہ وہ جانتا ہے جب بھی میں دعا کیلئے دست طلب پہنچاتا ہوں میری آرزوؤں اور دعاؤں کو شرف قبولیت بخشا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں وہ ہمیشہ میری دعاؤں کو قبول فرماتا ہے (2)۔

وَأَعْتَبْتُكُمْ مِمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَآدْعُوهُ رَبِّي عَسَىٰ أَلَا تَكُونُونَ مِنِّي شَقِيئًا

’اور میں ایک ہو جاؤں گا تم سے اور (ان سے بھی) جن کی تم عبادت کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اور میں اپنے رب کی

عبادت کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ میں اپنے رب کی عبادت کی برکت سے نامراد نہیں رہوں گا۔‘

۱۔ اعتزلکم کا عطف سا مستغفرو پر ہے اور وما تدعون کا عطف اعتزلکم کی ضمیر منصوب (کم) پر ہے مقابل فرماتے ہیں حضرت ابراہیم نے جب دیکھا کہ کچھ نصاب و کلام اور بڑی اثر نہیں ہو رہا تو آپ کوئی میں ان سے جدا ہو کر ارض مقدس کی طرف ہجرت کر گئے (3) اور نوم سے فرمایا میں اپنے رب کی عبادت کی برکت سے کبھی نامراد و خاک نہیں ہوں گا۔ جس طرح تم بتوں کی عبادت کر کے بدبختی اور نامرادی کو اپنی سمت بنا رہے ہو۔ آپ نے عسی کا کلمہ ذکر فرمایا جو امید اور توفیق پر دلالت کرتا ہے۔ اسکی وجہ آپ کی کفری اور توبہ سے ہے۔ اور یہ سبب یہ کہ تھا کہ دعاؤں کو شرف قبولیت عطا کرنا نیک اعمال پر ثواب دینا یہ میرے رب کریم کا فضل اور احسان ہے اس پر واجب نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان کی عبادت و رباہات کی قبولیت اور عدم قبولیت کا دار و مدار خاتمہ پر ہے اور وہ ایسی چیز ہے جو پوشیدہ ہے۔

فَلَمَّا اعْتَزَلْتَهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا هِنَاءَ لَهُمْ وَبِعَقَابٍ وَ
 كَلَّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ۝

”پس جب وہ جدا ہو گیا ان سے اور جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر تو عطا فرمایا ہم نے ابراہیم کو اسحق اور یعقوب اور سب کو ہم نے نبی بنایا۔“

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام وطن اور خاندان چھوڑ کر شام کی طرف ہجرت کر گئے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ہم نے انہیں شرک و کفر سے آلودہ قوم کے عوض اسحق و یعقوب جیسی بزرگزیادہ اولاد عطا فرمائی۔ لہذا طرف سے وہبنا کے متعلق ہے۔ وہبنا کا جملہ معذوف کلام پر معطوف ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہوگی قال سلام علیک الی آخرہ۔ فاعتزلہم فوہبنا لہ اسحق و یعقوب۔

وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِنْ شَرِّهِمْ آوَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ۝

”اور ہم نے عطا فرمائیں انہیں انہی رحمت سے (طرح طرح کی نعمتیں)۔ اور ہم نے ان کے لئے سچی اور دائمی تعریف کی آواز بلند کر دی۔“

۱۔ من رحمنا سے پہلے من بعضیہ ہے۔ کبھی کہتے ہیں رحمت سے مراد مال اولاد ہے۔ بعض فرماتے ہیں کتاب اور نبوت ہے (۱)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں حضرت اسحق اور حضرت یعقوب کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا کیونکہ یہ دونوں انبیاء کی اصل ہیں۔ یا اہل مہل علیہ السلام کا علیحدہ ان کے فضائل و کمالات کے ساتھ ذکر کرنا تھا۔ اس لئے یہاں ان کا ذکر نہیں کیا گیا (2)۔

۲۔ لسان سے مراد وہ الفاظ اور کلام ہے جو زبان سے نکلنے ہیں۔ اس لیے کہا جاتا ہے لسان العرب۔ یعنی عربوں کی لغت۔ لسان صدق سے مراد تعریفی کلمات ہیں۔ تمام قومیں (اختلاف مذاہب) کے باوجود حضرت ابراہیم اور آپ کی اولاد کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور ان کی دعا کی قبولیت پر فخر کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا مانگی تھی وَاجْعَلْ لِي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِينَ۔ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو شرف قبولیت عطا فرمایا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر قوم آپ کی تعریف و ثناء کرتی ہے۔ لسان کی صدق کی طرف اضافت اور پھر ملو کے ساتھ اس کی صفت لگانا یہ دلیل ہے کہ وہ لوگ ان تعریفی کلمات کے مستحق ہیں۔ جو کچھ لوگ ان کی تعریف و توصیف کرتے ہیں وہ ان کے واقعی حقدار ہیں اور ان کے حامد مرور زمانہ اور قوموں کی تبدیلی کے باوجود کسی گھٹن پر مٹتی نہیں ہیں۔ ہم ظرف مستقر ہے اور جعلنا کا مفعول ثانی ہے اور علیا ظرف میں پوشیدہ ضمیر مرفوع سے حال ہے۔

وَأَذْكُرُ فِي الْكِتَابِ مَوْلًى ۝ إِنَّهُ كَانَ مَخْلُصًا وَكَانَ رَسُولًا نَبِيًّا ۝

”اور ذکر فرمائے کتاب میں موی کا بیٹک وہ (اللہ کے چنے ہوئے) تھے۔ اور رسول و نبی تھے۔“

۱۔ کو موی نے مخلصا کلام کے فقرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں چن لیا ہے اور غیر کی طرف توجہ کی آلائش سے بھی انہیں پاک فرمایا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی موی علیہ السلام نے اللہ کے حضور باسرا غم کر دیا تھا اور اپنے نفس کی ہر ہر حرکت ہر برسائس اپنے رب کے لئے کر دیا تھا اور اپنے رب کریم کی عبادت کو شرک جلی اور شرک خفی سے بالکل پاک کیا تھا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں مخلوق کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا تو آپ بلند مقام پر فائز بھی ہو گئے تھے اللہ تعالیٰ کے احکام کی خبر دینے

والے بھی تھے۔ چونکہ انباء (نبی بنانا) وجود میں ارسال (رسول بنانا) پر متفرع ہوتا ہے اسلئے رسول کو مقدم فرمایا حالانکہ رسالت نبوت سے انھیں اور اعلیٰ ہے (کیونکہ ہر رسول نبی ہوتا ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں ہوتا اور رسول وہ ہوتا ہے جس پر وحی اور کتاب کا نزول ہوتا ہے)

وَوَدَّ يَتُّهُ مِنْ جَانِبِ الطُّورِ الْأَيْمَنِ وَقَرَّبَهُ نَجِيًّا ۝۱۱

”اور ہم نے انہیں پکارا طور کی دائیں جانب سے لے اور ہم نے انہیں قریب کیا راڑ کی بائیں کرنے کے لئے لے۔“

لے طور مصر اور مدین کے درمیان ایک پہاڑ ہے اس کو الزہیر بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ندا اس وقت کی گئی جب موسیٰ علیہ السلام مدین سے آ رہے تھے راستہ میں آپ نے آگ دیکھی تو دعا دی گئی اے موسیٰ اِنِّیْ اَنَا اَنْذَرُكَ الْعُقُبٰی مِیْنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہوں۔ الایمن سے مراد موسیٰ علیہ السلام کی دائیں جانب ہے کیونکہ پہاڑ کا کوئی دایاں (بایاں) نہیں ہوتا۔ اسکی طور کی طرف اشاعت قرابت کی وجہ سے کی گئی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام مدین سے مصر جا رہے تھے جب طور کے قریب پہنچے تو طور موسیٰ علیہ السلام کی دائیں جانب تھا اور مراد بابرکت جانب ہے کیونکہ یہ جہت بطور برکت استعمال ہوتی ہے۔

لے موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے ایسا قرب عطا فرمایا جو الفاظ اور تحریر کے احاطہ میں نہیں آسکتا۔ جسکو وہ نصیب نہیں ہوا وہ اسکی لذت کو کسی اور طریقہ سے محسوس نہیں کر سکتا۔ نجیاً قرینہ کی ضمیر فاعل اور مفعول دونوں سے حال ہے۔

وَوَهَبْنَا لَهُ مِنْ رَحْمَتِنَا اٰحَادَ هُرُوْنَ نَبِیًّا ۝۱۲

”اور ہم نے بخشا انہیں اپنی خاص رحمت سے ان کا بھائی ہارون جو نبی تھا۔ لے۔“

لے کی ضمیر کا مرجع موسیٰ علیہ السلام ہے۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی اِذْ جَعَلْتُمْ لِيْ وَوَدَّ يَتُّهُ مِنْ جَانِبِ الطُّورِ الْأَيْمَنِ (اور مقرر فرمایا میرا وزیر میرے خاندان سے یعنی ہارون کو جو میرا بھائی ہے) تو ہم نے اپنی رحمت سے ان کے بھائی ہارون کو نبوت عطا فرمایا کہ ان کا معاون بنایا۔ یہ مطلب نہیں کہ ان کی دعا کی وجہ سے ہم نے ہارون پیدا فرمایا کیونکہ حضرت ہارون عمر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے۔ من رحمتا سے پہلے من اجلیہ ہے۔ یا من بعضیہ ہے احواہ وہبنا کا مفعول ہوگا اگر من سمیت کے لئے ہو اور اگر من بعضیت کے لئے ہو تو پھر بدل ہوگا۔ ہارون احواہ سے عطف بیان ہے۔ اور نبیا وہبنا کے مفعول سے حال ہے۔

وَ اِذْ كُنَّا فِي الْكُتُبِ اِسْمٰعِیْلَ ۙ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِیًّا ۝۱۳

”اور ذکر کیجئے کتاب میں اسماعیل کو چونکہ وہ وعدہ کے سچے تھے لے اور رسول (اور) نبی تھے لے۔“

لے اسماعیل سے مراد اسماعیل بن ابراہیم ہیں جو نبی کریم محمد ﷺ کے جدا بھائی تھے۔ آپ کی صفت وعدہ کی سچائی کے ساتھ بیان فرمائی ہے۔ حضرت قارہ فرماتے ہیں آپ نے جو بھی وعدہ فرمایا اسے وفا کیا۔ مقاتل فرماتے ہیں آپ نے ایک شخص سے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ اس کی واپسی تک یہاں ٹھہرے رہیں گے۔ وہ شخص تین دن کے بعد واپس لوٹا تو حضرت اسماعیل علیہ السلام اسی جگہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ کبھی فرماتے ہیں آپ اس شخص کا ایک سال تک انتظار کرتے رہے (۱)۔ آپ کے وعدہ سچائی کے لئے وہ صبر کا وعدہ کافی ہے جو کہ آپ نے اپنے باپ کے ساتھ ذبح پر صبر کرنے کا کیا تھا تو آپ نے اسے دل و جان سے وفا کیا۔

لے حضرت اسماعیل علیہ السلام جرم قبیلہ کی طرف رسول اور نبی بنا کر بھیجے گئے تھے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ آیت

کریدہ دلیل ہے کہ رسول کے لئے صاحب شریعت ہونا ضروری نہیں ہے کیونکہ حضرت ابراہیم کی اولاد سے تمام انبیاء کرام آپ کی شریعت کے پیرو تھے (۱)۔

وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهِ مَرْضِيًّا ۝۳۰

”اور وہ حکم دیا کرتے تھے اپنے گھروالوں کو نماز پڑھنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا اور اپنے رب کے نزدیک بڑے پسندیدہ تھے۔“

۱۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ایک صفت یہ بھی تھی کہ آپ اپنے اہل و عیال کو اہمیت کے ساتھ نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے۔ آپ احکام الہیہ کی تبلیغ کا آغاز اپنے نفس اور اپنے قریبی رشتہ داروں سے فرماتے تھے کیونکہ ان کی تکمیل دوسری امت کی نسبت آپ کے نزدیک زیادہ اہمیت کی حامل تھی۔ (ہونا بھی ایسا ہی چاہیے کہ پہلے انسان اپنے اوپر احکام شریعت کا نفاذ کرے پھر اپنے اہل و عیال پر ان کو جاری فرمائے تاکہ یہ سب لوگ دوسروں کے لئے نمونہ اور اسوہ بن جائیں)

حضور نبی کریم ﷺ کو بھی اللہ تعالیٰ نے تبلیغ دین کا سلسلہ اپنے خاندان سے شروع فرمانے کا حکم دیا تھا اور فرمایا: **وَأَنْتُمْ عَشِيرَتُكَ الْأَخْفَرِيَّةِ**۔ اے محبوب پہلے اپنے رشتہ داروں کو عذاب الہی سے ڈرائیے۔ دوسری جگہ فرمایا: **فَوَأَنَّكَ مَكْرَمًا مِّنْكُمْ**۔ اے مسلمانو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل خانہ کو آتش جہنم سے بچاؤ۔ بعض علماء فرماتے ہیں اہل سے مراد آپ کی امت ہے کیونکہ انبیاء کرام اپنی امتوں کے باپ ہوتے ہیں۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں الصلوٰۃ اور الزکوٰۃ سے مراد مکمل شریعت ہے جو اللہ نے ان پر فرض کی تھی اور ان کی شریعت بھی وہی تھی جو اللہ نے ہم پر فرض کی ہے (۲) اور ان دو عبادتوں کا مخصوص ذکر اس لئے فرمایا کیونکہ نماز بدنی عبادت میں سے افضل ترین عبادت ہے اور زکوٰۃ مالی عبادت میں سے افضل ترین عبادت ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کو آپ کی نبوت و رسالت پسند تھی اور اللہ تعالیٰ آپ کی اعمال و افعال میں احتیاط اور طاعت الہی پر دوام کی وجہ سے راضی تھا۔

وَإِذْ كُنَّا فِي الْكِتَابِ إِذِ رَبُّنَا إِنَّهُ كَانَ صَدِيقًا نَّبِيًّا ۝۳۱ وَرَضِينَا مِنْكَ آدَمًا وَعَيْنًا ۝۳۲

”اور ذکر فرمائیے کتاب میں اور میں (علیہ السلام) کا بیشک وہ بڑے راستباز (اور) نبی تھے اور ہم نے بلند کیا تھا انہیں بڑے اونچے مقام تک۔“

۱۔ حضرت اور میں علیہ السلام حضرت شیخ علیہ السلام کی اسل سے تھے اور آپ نوح علیہ السلام کے پر دادا تھے۔ آپ کا نام اخنوخ تھا بعض علماء نے لکھا ہے کہ آپ کو اور میں اس لئے کہا جاتا تھا کہ آپ اکثر کتاب پڑھتے رہتے تھے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اس کا نیر منصرف ہونا اس کے مدرس سے مشتق ہونے کی تردید کرتا ہے۔ ہاں یہ کوئی بعید نہیں کہ اس کا معنی ان کی لغت میں اس کے قریب قریب ہو اور آپ کے کثرت درس کی وجہ سے اس نام سے آپ کو ملقب کیا گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے آپ برتس صحیفے نازل فرمائے تھے (۳)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں حضرت اور میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے علم کے ساتھ لکھا اور س سے پہلے آپ نے کپڑوں کی سلائی

2- تفسیر بنوی، جلد 4، صفحہ 202 (التجاریہ)

1- تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 558 (العلویہ)

3- تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 559 (العلویہ)

فرمانی اور سلاہوا کپڑا پہنا۔ آپ سے پہلے لوگ جانوروں کی کھالیں لباس کے طور پر استعمال فرماتے تھے۔ اور تھیلوں کے پہلے موجود بھی آپ ہیں اور کفار سے لڑائی بھی سب سے پہلے آپ نے کی۔ علم نجوم اور علم حساب کا آغاز بھی آپ نے ہی فرمایا (1)۔

بلند مقام سے مراد بعض علماء کے نزدیک نبوت کے شرف کے ساتھ بلند درجہ عطا فرمانا اور اللہ کی بارگاہ میں قرب ہے۔ بعض فرماتے ہیں اس سے مراد جنت ہے۔ بعض نے فرمایا چھٹا یا چھٹا آسمان ہے۔ انس بن مالک حضرت مالک بن خصوفہ سے روایت فرماتے ہیں کہ حضرت محمد کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے معراج کی رات حضرت اور ایں علیہ السلام کو چوتھے آسمان پر دیکھا (2)۔ یہ حدیث پاک تفصیل سے سورہ بنی اسرائیل اور سورہ الحجم میں مذکور ہے۔

حضرت اور ایں علیہ السلام کا بلند کیے جانے کا سبب

حضرت کعب وغیرہ کا بیان ہے کہ ایک دن آپ کسی کام کے لئے جا رہے تھے کہ آپ کو سخت گرمی محسوس ہوئی۔ آپ نے عرض کی اے میرے رب کریم میں آج صوب میں چلا ہوں اور مجھے سخت گرمی محسوس ہوئی ہے وہ فرشتے اس کی گرمی کیسے برداشت کرتا ہوگا جو ایک دن میں پانچ سو سال کی مسافت اسے (سورج) اٹھائے رکھتا ہے۔ یا اللہ اس فرشتے سے اس (سورج) کے بوجھ اور گرمی کو ہلکا کر کم فرما دے۔ صبح ہوئی تو فرشتے نے سورج کے بوجھ اور تپش کو کم پایا۔ فرشتے نے عرض کی یا رب یہ کیسے تو نے کی کا فیصلہ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا میرے مقرب بندے اور ایں علیہ السلام نے تجھ سے سورج کے بوجھ اور تپش کو کم کرنے کی سفارش کی ہے اور میں نے اس کی سفارش قبول فرمائی ہے۔ فرشتے نے عرض کی یا رب میرے اور اس بندے کے درمیان دوستی پیدا فرما دے۔ اللہ تعالیٰ نے اس فرشتے کو دوستی کی اجازت مرحمت فرمادی۔ وہ فرشتہ حضرت اور ایں علیہ السلام کے پاس پہنچا حضرت اور ایں علیہ السلام نے اسے فرمایا مجھے معلوم ہوا ہے کہ تو بڑا معزز فرشتہ اور ملک الموت کے پاس تیری بڑی قدر و منزلت ہے۔ آپ میری ان سے سفارش کریں کہ میری موت میں تھوڑی تاخیر کر دے تاکہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت اور نعمتوں پر شکر اور زیادہ کروں۔ فرشتے نے کہا قبلہ! اللہ تعالیٰ نے کسی نفس کی موت کے لئے جو وقت مقرر کیا ہے اس میں وہ تاخیر نہیں فرماتا۔ ہاں میں آپ کے کہنے کے مطابق بات کرتا ہوں۔ فرشتہ حضرت اور ایں علیہ السلام کو سورج کے طلوع ہونے کی جگہ کے قریب چھوڑ کر خود آسمان کی طرف چڑھ گیا، وہ فرشتہ ملک الموت کے پاس پہنچا اور کہا کہ جناب میرا انسانوں میں ایک دوست ہے۔ اس نے سفارش طلب کی ہے کہ آپ ان کی موت میں تاخیر کریں۔ ملک الموت نے کہا یہ کام تو میرے بس میں ہی نہیں ہے۔ لیکن میں اتنا کر سکتا ہوں کہ انہیں اپنی موت کا وقت بتا دیتا ہوں تاکہ وہ پہلے سے تیاری کر لیں۔ فرمایا تمہیک ہے یہ تو کر دو۔ حضرت ملک الموت نے اپنا جسر دیکھا اور فرمایا تم نے جس انسان کے متعلق مجھ سے بات کی ہے (وہ مر چکا ہے) اور آئندہ کبھی نہیں مرے گا۔ فرشتے نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں ابھی انہیں سورج کی طلوع ہونے کی جگہ کے پاس چھوڑ کر تمہارے پاس آیا ہوں۔ ملک الموت نے کہا تم جاؤ دیکھو وہ ہاں مر چکا ہے اور اور ایں علیہ السلام کی زندگی کا کوئی لمحہ اب باقی نہیں ہے۔ وہ سورج کا فرشتہ لوٹ کر آیا تو اور ایں علیہ السلام کو مرده پایا۔

وہب بن منہ فرماتے ہیں علماء اختلاف ہے کہ حضرت اور ایں علیہ السلام آسمان میں زندہ ہیں یا مر چکے ہیں۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ آپ زندہ ہیں اور وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ چار انبیاء کرام زندہ ہیں حضرت حضور اور ایں علیہ السلام زمین پر حضرت اور ایں

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ ہیں۔

وہب فرماتے ہیں حضرت ادریس علیہ السلام کی ہر روز اتنی عبادت بلند ہوتی تھی جتنی کہ تمام دوسرے لوگوں کی پہنچتی تھی۔ فرشتوں کو اس پر بڑا تعجب ہوا اور انہیں ان کی ملاقات کا شوق پیدا ہوا۔ ملک الموت نے اپنے رب سے حضرت ادریس علیہ السلام کی ملاقات کی اجازت طلب کی۔ اجازت ملی تو آپ انسانی شکل میں حضرت ادریس علیہ السلام کے پاس تشریف لائے۔ حضرت ادریس علیہ السلام ہمیشہ روزہ رکھتے تھے۔ جب افطار کا وقت ہوا تو آپ نے ملک الموت کو کھانے کی دعوت دی۔ انہوں نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ مسلسل تین راتیں ایسا ہی ہوتا رہا حضرت ادریس علیہ السلام نے ملک الموت کو کھانے کی دعوت دیتے لیکن ملک الموت جو انسانی شکل میں آئے ہوئے تھے کھانا کھانے سے انکار کر دیتے۔ تیسری رات حضرت ادریس علیہ السلام نے پوچھا جناب آپ ہیں کون؟ ملک الموت نے کہا میں ملک الموت ہوں، میں اپنے رب سے اجازت لے کر تمہاری ملاقات اور تجھ سے دوستی کرنے کیلئے آیا ہوں۔ حضرت ادریس علیہ السلام نے فرمایا۔ مجھے تجھ سے ایک کام ہے پوچھا کیا؟ فرمایا تم میری روح قبض کر لو۔ اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو حکم دیا کہ ان کی روح قبض کر لو اس نے روح قبض کر لی پھر اللہ تعالیٰ نے کچھ دیر کے بعد ان کی روح لوٹا دی۔ ملک الموت نے کہا آپ نے موت کا سوال کیوں کیا۔ فرمایا اس لئے تاکہ موت کی تکلیف اور اسکی گہرائی کا ذائقہ چکھ لوں تاکہ میں اس کے لئے زیادہ تیار ہو جاؤں پھر حضرت ادریس علیہ السلام نے فرمایا مجھے تجھ سے ایک اور کام بھی ہے ملک الموت نے پوچھا وہ کیا ہے؟ فرمایا تم مجھے آسمان پر لے جاؤ تاکہ میں آسمان جنت اور دوزخ دیکھ لوں۔ اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو انہیں آسمانوں پر لے جانے کی اجازت فرمادی۔ جب آپ دوزخ کی آگ کے قریب پہنچے تو فرمایا ملک الموت! مجھے ایک اور حاجت ہے۔ فرمایا وہ کیا ہے؟ فرمایا تم دوزخ کے داروغے مالک سے کہو کہ میرے لئے دوزخ کے دروازے کھول دو تاکہ میں اس میں داخل ہو کر سب کچھ دیکھ لوں آپ کی یہ خواہش بھی پوری کر دی گئی۔ پھر فرمایا جیسے تم نے مجھے دوزخ دکھائی ہے اب جنت بھی دکھا دو۔ آپ جنت کی طرف تشریف لے گئے۔ اس کے دروازے کھولنے کا مطالبہ کیا تو وہ کھول دیئے گئے اور آپ جنت میں داخل ہو گئے پھر میر جنت کے بعد ملک الموت نے کہا جناب آپ یہاں سے چلیے اور زمین میں اپنی جگہ تشریف لے جائیے۔ حضرت ادریس علیہ السلام جنت کے ایک درخت سے چمٹ گئے اور فرمایا میں تو یہاں سے کبھی نہیں نکلوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے ایک فرشتہ بھیجا۔ فرشتے نے پوچھا جناب آپ جنت سے باہر کیوں نہیں جاتے۔ آپ نے فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہر نفس موت کا ذائقہ چکھے گا۔ میں اس کا ذائقہ چکھ چکا ہوں اور فرمایا تم میں سے ہر شخص دوزخ میں وارد ہوگا، میں اس منزل سے بھی گزر چکا ہوں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے جنتی جنت سے باہر نہیں نکلیں گے۔ اس لئے اب میں باہر نہیں نکلوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کی طرف پیغام بھیجا کہ ادریس علیہ السلام میرے حکم سے جنت میں داخل ہوئے تھے اور میرے حکم سے ہی نکلیں گے (تم ان سے مکالمہ بند کرو) اسی وجہ سے حضرت ادریس جنت میں زندہ ہیں اور دفعہاً مکاناً علیاً کا یہی مطلب ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ مِنْ ذُرِّيَّتِهَا آدَمَ ۖ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ ۖ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهَا إِبْرَاهِيمَ وَإِسْرَائِيلَ ۚ وَمِمَّنْ هَدَيْنَاوَأَجْتَبَيْنَا ۚ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَنِ خَرُّوْا سُجَّدًا ۖ وَابْتِغَاءًا ۚ

”یہ وہ (مقدس ہستیاں) ہیں جن پر انعام فرمایا اللہ تعالیٰ نے انبیاء (کرام کے زمرہ) سے یہ آدم علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔ اور بعض ان کی اولاد جبکہ ہم نے سوار کیا تھا (کشتی میں) نوح کے ساتھ اور نوح اور یعقوب کی اولاد سے تھے اور ان میں سے جنہیں ہم نے ہدایت دی اور چن لیا۔ جب پڑھی جاتی ہیں ان کے سامنے رحمن کی آیتیں تو وہ گرو گرتے ہیں سجدہ کرتے ہوئے اور (زاروقطار) روتے ہوئے۔“

۱۔ اولئک کا اشارہ انبیاء کرام ہیں جن کا ذکر حضرت زکریا علیہ السلام سے شروع ہوا اور ادریس علیہ السلام پر ختم ہوا۔ انعام سے مراد ذبیحی اور ذبیحی تمام انبیاء کرام ہیں۔ یہ من النبیین کی ضمیر سے حال ہے اور اسم موصول کا بیان ہے۔ من ذریعہ ادم سے مراد ادریس علیہ السلام اور بقیہ تمام انبیاء کرام ہیں۔ یہ من النبیین سے بدل ہے یا صفت ہے یا حال ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ من ذریعہ آدم میں من بعضیہ ہو کیونکہ منعم علیہم انبیاء کرام سے اعم ہیں اور ذریعہ سے انھیں اور ذریعہ ابرہیم سے مراد حضرت اسمعیل اور اسحاق علیہم السلام وغیرہ ہیں۔ اسمائیل ابرہیم پر معطوف ہے اسمائیل کی اولاد ہے اور ان میں سے موسیٰ ہارون زکریا یحییٰ اور عیسیٰ علیہم السلام ہیں۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ نبیوں کی اولاد بھی ذریعہ سے تحت داخل ہے۔ جَمِنَ هٰذِیْنَ یَا قُوٰیہ پہلے من بیان ہے پر معطوف ہے یا دوسرے من پر معطوف ہے اس تقدیر پر کہ وہ من بعضیہ ہے اگر یہ من پہلے من پر معطوف ہوگا تو یہ حضرت مریم اور اسماعیل (نبیہا السلام) کی اولاد کو شامل ہوگا جن کا ذکر کان یا مراہلہ بالصلوٰۃ میں ذرا ہے۔ ان مقدس ہستیوں کو ہم نے شرف نبوت کے لئے چن لیا۔ انہیں کرامت و ہدایت کی عظمت سے نوازا۔

۲۔ مسجداً جمع ہے مساجدین کی۔ بکجا کو تخرہ اور کسائی نے ہاء کے کسرہ کے ساتھ اور جہور اور حفص نے ہاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ التیک کی جمع ہے۔ اذا ظرفیہ خوروا کے متعلق ہے اور پھر خسروا کا جملہ اولئک کی خبر ہوگا اگر اہم موصول کو اس کی صفت بنایا جائے۔ اور خوروا کا جملہ مستقل علیحدہ کلام ہوگا اگر اہم موصول کو اولئک کی خبر بنایا جائے اور اس مستقل کلام کا مقصود ان کی خشیت الہی کو بیان کرنا ہے کہ وہ بگڑنے والے لوگ کمال نفس شرف نسب اور اتنی بلند اور رفیع شان کے باوجود ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے ڈرتے رہتے ہیں۔

ان ابن ماجہ، تلمیح بن راویہ اور بزار نے اپنی اپنی مسند میں حضرت ابن ابی وقاص کی حدیث نقل فرمائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قرآن کی تلاوت کرو تو روتے کی کوشش کرو اور اگر رونانا آئے تو رونے والی شکل بناؤ (۱)۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهْوَاتِ فَسُوفَ يَلْقَوْنَ عَذَابًا ۝۱۱

”پس جانشین بنے ان کے بعد وہ خلف جنہوں نے ضائع کیا نمازوں کو اور پیروی کی خواہشات (نفسانی) کی پیروی کی۔ وہ وہ چارہوں گے اپنی نافرمانی (کی سزا سے)۔“

۱۔ خلف لام کے فتح کے ساتھ ہوتو اچھے جانشین اور لام کے سکون کے ساتھ ہوتو برے جانشین مراد ہوتے ہیں، یعنی ان انبیاء کرام کے پیچھے ایسے لوگ آئے جنہوں نے نماز کو ترک کر دیا۔ ابن مسعود اور ابراہیم فرماتے ہیں انہوں نے نماز کو اپنے اوقات سے مؤخر کیا تھا۔ سعید بن مسیب فرماتے ہیں نماز کے ضیاع کا مطلب یہ ہے کہ انسان ظہر کی نماز کو عصر کی نماز کے وقت تک مؤخر کر دے اور عصر کی نماز کو غروب شمس تک مؤخر کر دے (۲)۔ میں کہتا ہوں نماز کے ضیاع سے مراد غلط اور مکروہ انداز میں نماز ادا کرنا ہے یا نماز کی سنتوں اور

مستحبات کو ترک کرنا ہے۔

ع۔ برے جانشینوں میں دوسری برائی یہ تھی کہ وہ اطاعت الہی کو چھوڑ کر نفسانی خواہشات کے درپے ہو گئے تھے اور نافرمانی، عسکناہ اور بدکاریوں کو انہوں نے اختیار کر لیا تھا۔

ع۔ ایسے بدکاروں کو دوزخ کی وادی غی میں پھینک دیا جائے گا۔ امام بغوی نے سب کے قول کے مطابق لکھا ہے کہ غی جنم کی ایک سہر ہے جو اتہانی گہری اور اسکی طبع بہت خمیٹ ہے۔ لکھتے ہیں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا یہ جنم کی ایک وادی ہے اور جنم کی دوسری وادیاں اس سے پناہ مانگتی ہیں اور یہ زنا راہسرا کرنے والوں عادی شرابی ہمیشہ سو دکھانے والوں، والدین کے نامرمانوں اور جھوٹی قسمیں کھانے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے (1)۔ ابن مردودہ نے ابن عباس کی حدیث بالکل اسی طرح مرفوع ذکر کی ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں عطاء نے فرمایا غی جنم کی ایک وادی ہے جس میں پیپ اور حون بہتا ہے۔ فرماتے ہیں حضرت کعب نے فرمایا یہ جنم کی بہت گہری اور بہت گرم وادی ہے، اس میں ایک کنواں ہے جسے ہم کہا جاتا ہے۔ جب جنم جیسے گتے ہے تو اللہ تعالیٰ اس کنویں کو کھول دیتے ہیں جس کی وجہ سے جنم پھر بھڑک اٹھتی ہے (2)۔

امام بغوی نے زکریا بن ابی مریم الغزالی سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں میں نے حضرت ابی امامہ الباہلی کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جنم کے کنارے جنم کی گہرائی تک ایک پتھر کو گرنے میں ستر سال کی مدت لگتی ہے یا فرمایا اس پتھر کو جو دس مونی اونٹنیوں جیسا ہو اس کو اتنی مدت لگتی ہے۔ عبدالرحمن بن خالد بن الولید نے پوچھا پھر اس کے نیچے بھی کچھ ہے اے ابی امامہ! فرمایا اس کے نیچے غی ہے اور آخام کی وادیاں ہیں (3)۔

ابن جریر ابن ابی حاتم، سعید بن مسعود، ہناذ الغزالی، حاکم اور بیہقی نے ابن مسعود سے مختلف طرق سے اسی آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن مسعود نے فرمایا اسی جنم کی ایک وادی ہے ایک روایت میں ہے کہ جنم میں ایک گہری نہر ہے جس کا ذائقہ بہت برا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ دوزخ میں کھولتے ہوئے پانی کی ایک نہر ہے جس میں ان لوگوں کو پھینکا جائے گا جو خواہشات نفس کی پیروی کرتے ہیں (4)۔

بیہقی نے حضرت براہ بن عازب سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں غی جنم کی ایک وادی ہے جو بڑی گہری ہے اور بدبودار ہے۔

طبرانی اور بیہقی نے براہ بن عازب سے مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر ایک پتھر کا وزن دس اوقیہ ہو، اسے جنم کے کنارے سے پھینکا جائے تو وہ ستر سال تک اس کی گہرائی میں نہیں پہنچے گا۔ اس کے بعد وہ غی اور آخام تک پہنچے گا۔ براہ بن عازب فرماتے ہیں میں نے عرض کی حضور! غی اور آخام کیا ہیں؟ فرمایا یہ جنم کے نیچے دو نہریں ہیں جن میں دوزخیوں کی پیپ بہتی ہے۔ ان دو وادیوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں فرمایا ہے۔ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا. قَوْلًا لِّفَسْكَمُ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا (5)۔

بعض علماء فرماتے ہیں یہاں غی سے مراد گہرائی ہے جو ہدایت کی ضد ہے۔ وہ گہرائی کو پائیں گے اور جنت کے راستہ سے بہک جائیں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں عربوں کے نزدیک ہر برائی غی ہے اور ہر نیکی رسانا ہے۔ اسی وجہ سے ضحاک یہ معنی فرماتے ہیں کہ وہ گھانا پائیں گے۔ بعض نے غی کا معنی ہلاکت، بعض نے عذاب کیا ہے (6)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں مضاف کو حذف کر کے

1- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 204 (اتحاریہ)
2- ایضاً
3- ایضاً، صفحہ 205
4- الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 500 (اصحیہ)
5- ایضاً
6- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 204 (اتحاریہ)

مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ یہ اصل میں جزاؤں کا تھا، یعنی دنیا میں اختیار کئے گئے عقائد کا ملاحظہ اور اعمال کا سدھ کی سزا پائیں گے۔

إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَوَلَّىٰكَ يَدُ الْيُضَلِّينَ وَلَا يُضِلُّونَ شَيْئًا ۗ

”مگر جو تائب ہوئے اور ایمان لائے اور نیک عمل کئے، تو یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا ظلم نہیں کیا جائے گا۔“

یعنی جنہوں نے نفسانی خواہشات کی پیروی کی اور نمازوں کو ترک کیا اگر وہ سچے دل سے توبہ کر لیں اور جو کافر تھے مسلمان ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر مکمل ایمان لے آئیں اور پھر ایمان کے تقاضا کے مطابق عمل پیرا ہوں۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ دلیل ہے کہ یہ کفار کے متعلق ہے (۱)۔ یعنی مذکورہ وعید کفار کے ساتھ شخص سے نہیں کہتا ہوں من امن وعمل صالحاً متعلق ہے نہیں جو ایمان لایا لیکن نیک اعمال نہ کئے تو وہ فاسق بھی مذکورہ وعید میں داخل ہے جس طرح کہ سابقہ آیت کی تفسیر میں ابن عباس کی حدیث بھی دلالت کرتی ہے۔ نہ سزا ہی زانی وغیرہ جو گناہ کبیرہ کے مرتکب ہیں وہ شی میں جھینکے جائیں گے۔

۱۔ فالولک کا مضاف الیہ من تَاب و آمَن و عمل صالحاً ہے۔ ابن کثیر ابن عمر و یعقوب اور ابو بکر نے بدخلون کو ناب افعال سے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے فعل مجرد محل سے معروف کا صیغہ پڑھا ہے۔ ضیفاً مفعول ہونے کے اعتبار سے منصوب ہے۔ یعنی ان کے اعمال کی جزا میں کچھ کمی نہیں کی جائے گی یا ضیفاً مصدریت کی بناء پر منصوب ہے، یعنی ان پر کچھ ظلم و زیادتی نہ ہوگی۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ سابقہ کفر تو نہ کرنے والے کے لئے کچھ نقصان دہ نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسلام سابقہ تمام گناہوں اور جرموں کو مٹ کر دیتا ہے اس حدیث کو عمر بن عباس کے حوالہ سے مسلم نے روایت کیا ہے (۲)۔ یہ اولک کا جملہ استثناء کے مضمون پر تعلق کے مقام پر ہے۔

جَحَّتْ عَدْنُ النَّبِيِّ وَعَدَةُ الرَّحْمَنِ عِبَادَةَ الْعَلِيِّ ۗ إِنَّهُ كَانَ وَعْدُهُ مَأْتِيًا ۗ

”سدا بہار چمن جن کا وعدہ (خداوند) رحمن نے اپنے بندوں سے لے کر عیب میں کیا ہے یقیناً اس کا وعدہ پورا ہو کر رہنے والا ہے۔“

۱۔ یہ جنت عدن سابقہ الجنة سے بدل احتمال ہے۔ یا بطور مدح منصوب ہے یا فعل محذوف اعنی کی وجہ سے منصوب ہے عدن گرا قائمہ کے معنی میں ہو تو جو جنت اس کی طرف مضاف سے وہ نگرہ ہوگا، بعض فرماتے ہیں یہ یک معین جنت کا علم ہے۔ اور یہ اسم کی طرف اضافت ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ جنت کی زمین کا علم ہے۔ دونوں تفسیروں پر جنت عدن معرفہ ہوگا اور النبی کے ساتھ اس کا وصف بیان کیا گیا ہے۔ موصول کو نگرہ کی تاویل میں کہا جائے تو یہ النبی جنت کی صفت ہوگا یا جنت عدن سے بدل ہوگا۔ اور صلہ میں ضمیر عائد محذوف ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی النبی وعد الرحمن بہا عبادہ۔

۲۔ بالعیب حال ہے عبادہ سے، یعنی اللہ نے ان سے وعدہ فرمایا اور آں حالیکہ وہ جنت سے عاقب تھے۔ یا یہ جنت سے حال ہے، یعنی جنت ان سے عاقب ہے یا یہ مضاف کے حذف کے ساتھ وعد کے متعلق ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان سے ایمان اور غیب کی تصدیق

کے باعث یہ وعدہ فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو اپنے بندوں سے وعدہ فرمایا وہ یقیناً پورا ہوگا اور جنتی ضرور اس میں تشریف لائیں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں ماتیہ اسم مفعول لایا اسم فاعل کے معنی میں ہے کیونکہ جو چیز تیرے پاس آتی ہے تو تو بھی اس کے پاس آیا ہے۔ عرب اُفّی عَلَیْ خَمْسُونَ سَنَةً۔ (بچھ پر پچاس سال گزر گئے) اور اَنْتَ عَلَیْ خَمْسَیْنِ سَنَةً (میں پچاس سال سے گزرا) میں کچھ فرق نہیں کرتے کیونکہ دونوں کا معنی اور مفہوم ایک ہی ہے۔ اسی طرح وَضَلَّ إِلَیَّ الْمَخْبِرُ (مجھ تک خبر پہنچی) اور وَضَلْتُ إِلَی الْمَخْبِرِ (میں خبر تک پہنچ گیا) میں کوئی فرق نہیں کرتے۔

لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا إِلَّا سَلَامًا وَلَهُمْ فِيهَا بَكَرٌ تَلَوَّ عَشِيًّا ۝

”نہیں سنیں گے جنت میں کوئی لغو بات بجز سلامت رہو“ کی دعائیہ صدادہ اور انہیں ان کا رزق ملے گا وہاں ہر صبح و شام ہے۔“

۱۔ لغو۔ ایسی کلام جو فضول ہو یہ جملہ مستانہ ہے یا حال مقدرہ ہے عبادہ سے یا اللعنة سے یا صلحی ضمیر محذوف سے۔ سلاماً۔ مستثنیٰ منقطع ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی طرف سے یا ایک دوسرے کی طرف سے سلامت رہو کی صدائے دلنوا سنیں گے، کوئی لغو بات نہ سنیں گے۔ یا یہ معنی کہ وہ ایسی کلام سنیں گے جس میں عیب اور نقص سے سلامت ہوں گے۔
۲۔ ان کو جنت میں صبح و شام رزق ملے گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے مراد خوش و خرم زندگی اور رزق کی فراوانی ہے۔ حسن بصری فرماتے ہیں عرب صبح و شام ملنے والے رزق کے علاوہ کوئی زندگی تصور نہیں کرتے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے جنت کا ایسا وصف بیان فرمایا (۱)۔

سعید بن منصور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس آیت کے متعلق روایت فرمایا کہ جنتیوں کو آخرت میں اسی کی مقدار ملے گا جتنا انہیں دنیا میں ملتا تھا (۲)۔ ابن المبارک نے صحاح سے اس آیت کے تحت نقل کیا ہے کہ دن رات کی مقدار پر انہیں رزق ملے گا۔

ابن المنذر نے ولید بن مسلم سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں۔ میں نے زہیر بن محمد سے سنا کہ وَضَلْتُ إِلَی الْمَخْبِرِ کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا جنت میں کوئی رات نہیں ہے وہ ہمیشہ نور میں رہیں گے۔ جنابات کے اٹھانے کے ساتھ دن کی مقدار اور جنابات کے ڈالنے کے ساتھ رات کی مقدار کو پہچانا جائے گا۔ اکھیم ترمذی نے النوادر میں حسن اور ابی قلابہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا جنت میں رات ہے؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا لہم رزقہم فیہا بکرة و عشیة۔ صبح و شام ان کو رزق ملے گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا وہاں کوئی رات نہیں ہے۔ صرف نور کی روشنی ہوگی صبح اور شام کا ایک دوسرے پر ورود ہوگا اور جن اوقات میں وہ نمازیں پڑھتے تھے ان میں اللہ کی طرف سے ان کے پاس تجھے آئیں گے اور فرشتے ان پر سلام بھیجیں گے (۳)۔

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ۝

”یہ وہ جنت ہے جس کا ہم وارث بنائیں گے اپنے بندوں سے (صرف) اسکو جو تقی ہوگا۔“

یعنی ہم ان پر ان کے تقویٰ اور پرہیزگاری کو باقی رکھیں گے جس طرح وارث پر مورث کا مال باقی رہتا ہے۔ یہاں اللہ تبارک و تعالیٰ نے وارثت کا لفظ استعمال فرمایا ہے کیونکہ تم ایک اور استحقاق میں یہ قوی ترین سبب ہے کیونکہ اس کے بعد نوح ہے، نہ ایلانہا ہے اور نہ یہ رد اور اسقاط سے باطل ہوتا ہے۔ بعض ماہر فرماتے ہیں کہ تحقیق جنت میں ان محلات کے وارث نہیں گئے جو درویشوں کو ملنے سے اُردو اطاعت گزار ہوئے اور یہ مومنین کی عزت میں اضافہ کرنے کیلئے دیئے جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

ابن ماجہ شافعی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روایت کیا ہے۔ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے ہر ایک کے لئے دو منزلیں ہیں، ایک منزل جنت میں اور ایک دروزخ میں جب کوئی مرتا ہے اور دوزخ میں داخل ہوتا ہے تو اول جنت اس کی منزل کے وارث ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کے فرمان اُولَئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ یہی مطلب ہے (1)۔

ابن ماجہ نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص کسی وارث کو میراث دینے سے بھاگے گا اللہ تعالیٰ جنت میں اس کی میراث کو ختم فرما دے گا (2)۔ واللہ اعلم۔

امام بخاری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جبرئیل سے فرمایا اے جبرئیل تم جتنا میرے پاس آیا کرتے ہو، اس سے زیادہ کیوں نہیں آتے تو اس وقت یہ ذیل کی آیت نازل ہوئی (3)۔

وَمَا تَنْتَظِرُونَ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ لَكُمْ مَبَإِينَ آيَاتِنَا وَمَا حَافِظُونَ وَمَا بَيْنَ ذَلِكَ تَوَاصِيًا
مَا كَانَ رَبُّكَ لِيَسِيءَ

”اور (جبرائیل! میرے نبی سے کہو) ہم نہیں اترتے، مگر آپ کے رب کے حکم سے، اے اسی کا ہے جو ہمارے سامنے ہے“

جو ہمارے پیچھے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے، اور نہیں ہے آپ کا رب بھولنے والا۔“

ان نزول کا مطلب ہے آہستہ آہستہ اترنا کیونکہ یہ نزل باب تفعیل کا مطاوع ہے اور کبھی یہ مطلقاً نزول کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے نزل معنی انزل ہوتا ہے۔

ع۔ الا ہامو ربک۔ ظرفیت کی بنا پر یا مصدریہ کی بنا پر منصوب ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی، وما ننزل الا وقتا متلبسا ہامو ربک علی ما یقتضیہ حکمتہ او ننزل الا ننزل متلبسا ہامو ہ۔

ابن ابی حاتم نے مکرّم سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں جبرائیل نے چالیس دن نزول میں تاخیر کر دی آگے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کی طرح روایت کیا ہے۔ ابن مردویہ نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے پوچھا گیا حضور! کون سی جلد اللہ کو زیادہ محبوب ہے اور کونسی جلد زیادہ بیخوش اور ناپسند ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا میں نہیں جانتا پوچھ کر بتاؤں گا۔ جبرئیل شریف لائے، جبکہ بڑی دیر سے آئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا جبرئیل! دیر سے آئے ہو مجھے تو یہ خیال آنے لگا تھا کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ تو جبرئیل نے کہا وما ننزل الا ہامو ربک۔

ابو نعیم نے الدلائل میں اور ابن احنظلی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ قریش نے جب اصحاب کہف ذوالقرنین اور روح کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ کو ان کا جواب معلوم نہ تھا لیکن آپ کو امید تھی کہ وہی آجائے گی۔ پندرہ دن گزر گئے لیکن اللہ تعالیٰ نے

وہی نازل فرمائی جب جبرائیل بعد میں تشریف لائے تو آپ ﷺ نے فرمایا جبرائیل! تو نے دیر لگا دی۔

امام نبوی نے ضحاک، عکرمہ، مقاتل اور بلقیہ کو نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ سے آپ کی قوم نے اصحاب کہف ذی القرنین اور روح کے متعلق دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا تمہارے سوالوں کے کل جواب دوں گا۔ آپ ﷺ نے ان شاء اللہ نکہا۔ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل کو نہ بھیجا حتیٰ کہ نہ تاخیر رسول اللہ ﷺ پر ہی شاق گزری پھر پندرہ دن کے بعد جبرائیل تشریف لائے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جبرائیل! تو نے دیر لگا دی۔ اب میرا تو گمان بدل رہا تھا اور میں تو تیری آمد کے اشتیاق میں بے چین ہو رہا تھا۔ جبرائیل نے کہا مجھے بھی آپ سے ملاقات کا انتہائی شوق تھا لیکن میں عید مامور ہوں، حکم کا بندہ ہوں۔ جب مجھے حکم الہی ہوتا ہے تو آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں۔ جب روک دیا جاتا ہے تو رک جاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر یہ آیت اور ذالطیٰ و القلیٰ اذکتیٰ و ماؤذکرتک و صافلیٰ نازل فرمائی (۱)۔

۱۔ لہ ما بین ایدینا کا جملہ نزول میں تاخیر کی علت کی بناء پر نسل نصب میں ہے یا حال کی بناء پر منصوب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت کے بعد قیامت تک بلکہ اس کے بعد کے وقت اسی کے قبضہ قدرت میں ہے دنیا اور آخرت کے امور کا بھی وہی مالک ہے اور ثواب و عقاب کا معاملہ بھی اسی کے پاس ہے۔ اور جو کچھ اشیاء و احوال گزر چکے ہیں وہ ان کا بھی مالک ہے اور جو موجود وقت ہے اور جو کچھ اس میں موجود ہے سب اسی کا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ما بین ایدینا سے مراد زمین ہے جب ہم اس پر نزول کا ارادہ کریں اور ما خلفنا سے مراد آسمان ہے جب ہم اس سے اترنے کا ارادہ کریں۔ اور ما بین ذالک سے مراد ہوا ہے۔ یعنی ہم کسی زمانہ میں اذن الہی کے بغیر نہیں اترتے یا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہیں ہوتے مگر اللہ کے حکم سے۔

۲۔ اسے جان عالم آپ کے رب نے آپ کو چھوڑ نہیں ہے۔ میرا حاضر نہ ہونا اللہ تعالیٰ کی آپ سے ناراضگی اور چھوڑنے کی وجہ سے نہیں جیسا کہ یہ گندے ذہن والے کافر سوچتے ہیں بلکہ وحی کے نزول کی تاخیر میں اللہ تعالیٰ کی کوئی خاص حکمت کارفرما تھی جسے وہ خود ہی جانتا ہے۔

رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا ⑩

’وہ درودگار ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ سو اس کی عبادت کرو اور ثابت قدم رہو اس کی عبادت میں پر کیا تم جانتے ہو کہ اس کا کوئی نام معلوم ہے۔‘

۱۔ رب السموات والارض وما بینہما مبتدا محذوف ہوئی خبر ہے یا ربک سے بدل ہے۔ اور یہ اس کے تئیں کے استماع کا بیان ہے۔

۲۔ عبادت کے حکم کا خطاب رسول اللہ ﷺ سے ہو رہا ہے اور یہ سابقہ کلام پر مرتب ہے، یعنی جب آپ کو معلوم ہوا کہ رب کریم کا کچھ پر فصل واحسان اور رحمت ہے انتہا ہے اور اس کی یہ شان ہی نہیں کہ تجھے چھوڑ دے تو آپ اس نعمت و نسیان پہ بطور تکرہ مردم اس کی عبادت میں مصروف رہئے اور اس عبادت پر دوام اختیار فرمائیے آپ وحی کی تاخیر اور کفار کے استہزاء سے

رنجیدہ خاطر نہ ہوا کریں۔ برسا اصطلاح کو لام کے صلہ کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے حالانکہ کلام کا تقاضا یہ تھا کہ علی کے صلہ کے ساتھ متعدی کیا جاتا لیکن یہ انداز و اسلوب میں تبدیلی اس بات کا شعور دینے کے لئے ہے کہ عبادت میں لذت بھی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جَعَلْتُ قُوَّةَ عِبِّيْهِ فِي الصَّلٰوةِ (1) نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے یا یہ معنی کہ تکالیف و معاصب اور کفار کی ایذا رسانیوں پر اپنے رب کی عبادت کی خاطر صبر کیجئے تاکہ آپ اللہ تعالیٰ کی عبادت پر راض ہو جائیں اور خالصاً اللہ کے عبادت گزار ہو جائیں

۱۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں سمعیا کا معنی مثلاً کیا گیا ہے۔ یعنی آپ کوئی اس کی مثل جانتے ہیں جو عبادت کا مستحق ہو اور اللہ پہلوانے کا حقدار ہو۔ کبھی فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ کیا۔ یہ جانتے ہیں کوئی ایسا دوسرا جسے اللہ کہا جاتا ہو (2) کیونکہ مشرکین بتوں کو اللہ کہتے تھے لیکن کسی کو وہ اللہ نہیں کہتے تھے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ احدیت میں ظاہر ہے اور اس کی ذات مماثلت سے بلند و بالا ہے اور وہ اپنی ذات کے اعتبار سے التباس اور مماثلت کو قبول نہیں کرتا۔ یہ ارشاد عبادت کے حکم کا ثبوت اور تقریر ہے کیونکہ جب اس کی کوئی مثل ہی نہیں ہے اور کوئی دوسرا عبادت کا مستحق بھی نہیں ہے تو ضروری ہے کہ اس کے حکم کو ہی تسلیم کیا جائے اور اس کی عبادت میں صبح و شام مشغول رہا جائے اور اس کی عبادت کی شقتوں کو برداشت کیا جائے۔

وَيَقُولُ الْإِنْسَانُ إِذَا هَمَّ بِشَيْءٍ لَّسَوْفَ أُحْرَجُ حَيًّا ۝

”اور انسان (ازراہ انکار) کہتا ہے کہ کیا جب میں مرجاؤں گا تو مجھے پھر زندہ کر کے نکالا جائے گا۔“

۱۔ انسان سے مراد کوئی فرد واحد نہیں بلکہ جنس انسان مراد ہے کیونکہ بعض کا قول جنس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے یا مخصوص انسان مراد ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہاں انسان سے مراد ابی بن خلف انجمی سے وہ قیامت کا منکر تھا (3)۔ روایت ہے کہ اسے ایک بوسیدہ پرانی ہڈی ملی تو اس نے اسے پکڑ کر مشرکین سے کہا دیکھو محمد (ﷺ) کہتا ہے کہ اسے از سر نو زندہ کیا جائے گا اور میں مرنے کے بعد پھر اٹھایا جائے گا اللہ تعالیٰ نے اس کی بات کو یہاں حکایت فرمایا۔

۲۔ کیا میرے مرنے کے بعد زمین سے یا موت کی حالت سے زندہ کر کے نکالا جائے گا۔ یہاں طرف کو مقدم کرنا اور اس پر حرف اذکار کا داخل کرنا اس لئے ہے کہ منکر مطلقاً دوبارہ زندگی کا منکر نہیں تھا بلکہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے اور حیات طے کا منکر تھا۔ طرف اس فعل کے متعلق ہے جس پر اخراج و دالت کر رہا ہے۔ موجود اخراج فعل کے متعلق نہیں ہے کیونکہ لام کا بعد ما قبل میں عمل نہیں کرتا۔ اور سوف پر لام صرف تاکید کے لئے ہے حال کے معنی سے خالی ہے۔ ابن ذکوان نے ایک ہمزہ مکسور کے ساتھ پڑھا ہے اور ہمزہ استفہام کو حذف کیا ہے اور مراد انکار کا معنی ہے، جبکہ باقی قراء نے دو ہمزوں کے ساتھ پڑھا ہے۔

أَوْ لَا يَذْكُرُ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا نَسِيبًا ۝

”کیا یاد نہ رہا انسان کو کہ ہم نے ہی پیدا کیا اسے اس سے پہلے حالانکہ وہ کچھ بھی نہ تھا۔“

1۔ نافع، عاصم اور ابن عامر نے مذکور کو ذوال کے سکون اور کاف کے ضمہ کے ساتھ تخفیف کے ساتھ بصبصر کے وزن پر پڑھا ہے اور باقی قراء نے کاف کے فتح اور ذوال مستدد کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں اس کی اصل ی قدح ہوگی تاہم کو ذوال میں اوغام کہا گیا

تو یہ کب ہو گیا۔ اس کا معنی سوچنا اور فکر کرنا ہے اس کا عطف بقول پر ہے۔ معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان ہمزہ استفہام کو ذکر فرمایا تاکہ اس بات پر دلالت ہو جائے کہ منکر بالذات معطوف ہے اور معطوف علیہ کا انکار اس سے پیدا ہوا ہے۔ اصل تو یہ ہے کہ ہمزہ استفہام کو معطوف علیہ پر داخل کیا جاتا یعنی اگر یہ حضرت انسان اپنی عقل کو استعمال کرتا اور سوچ لیتا تو یہ ایسا نہ کہتا کیونکہ ہم نے اس کی اس وقت تخلیق کی تھی، جبکہ اس کا مادہ اور اصل بھی نہ تھا۔ حالانکہ محض عدم مادہ اور اصل کے نہ ہونے کی صورت میں بنانا زیادہ متعجب اور تیران کن ہے نسبت بکھرے ہوئے اجزاء اور اعراض کو اکٹھا کرنے کے (جو ذات بغیر مادہ اور اصل کے ایک نئی چیز تخلیق کر سکتی ہے تو مادہ اور اصل جو ہر اور اعراض کے موجود ہونے کے وقت اسے مجتمع کیوں نہیں کر سکتی۔

فَوَمَا يَنْبَغُ لَكَ حَسْرَتُهُمْ وَالشَّيْطَانِ لَمْ لَمْ حَضَرَتْهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ حِثْيَا ۝

”سو (اے محبوب) تیرے رب کی قسم! ہم جمع کریں گے انہیں بھی اور شیطانوں کو بھی! پھر حاضر کریں گے ان سب کو جہنم کے ارد گرد کہ وہ گھٹنوں کے بل گرے ہوں گے۔“

۱۔ نبی کریم ﷺ کی عظمت شان کے اظہار کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو آپ ﷺ کی طرف منصف کر کے قسم اٹھائی، فرمایا تیرے رب کی قسم (حالانکہ وہ سب کا رب ہے) ان نسبت اور اضافت میں جو لطف اور مزہ ہے وہ صرف اہل ذوق ہی محسوس کر سکتے ہیں) فاء نسبت کے لئے ہے کیونکہ انکا قیامت کا انکار کرنا جہنم کی طرف شیطانوں کے ساتھ حشر ہونے کا سبب تھا۔ الشیاطین مفعول مہم ہے اور یہ ہو سکتا ہے کہ اس سے پہلے واؤ معیت نہ ہو بلکہ واؤ عاطفہ ہو۔ تو اس صورت میں الشیاطین معطوف ہو کر مفعول پہ ہو گا۔ امام بخاری فرماتے ہیں ہر کافر شیطان کے ساتھ ایک زنجیر میں جکڑا ہوا ہو گا (۱)۔

۲۔ جفیا، ہم ضمیر منصوب سے حال ہے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کا معنی جماعت فرمایا ہے اور یہ جثوۃ کی جمع ہے۔ الحسن اور الرضخا کہ فرماتے ہیں یہ جاث کی جمع ہے۔ یعنی وہ گھٹنوں کے بل گرے ہوں گے۔ سدی فرماتے ہیں جکڑ کی ٹہلی کی وجہ سے وہ گھٹنوں کے بل کھڑے ہوں گے (۲)۔ میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ سعادت مندوں اور بد بختوں تمام کو جہنم کے ارد گرد جمع فرمائے گا۔ سعادت مند جب دوزخ کو دیکھیں گے جس سے اللہ نے انہیں نجات عطا فرمائی تو زیادہ خوش ہوں گے اور بد بخت لوگ سعادت مندوں کو جنت کی طرف جاتا دیکھ کر زیادہ غمگین ہوں گے اور حسرت کا اظہار کریں گے۔ اسی حکمت کے تحت اللہ تعالیٰ سب کو جہنم کے پاس جمع فرمائے گا۔ عبداللہ بن احمد نے زوائد البرہ میں تابعی نے عبداللہ بن ثابت سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تمہیں گویا جہنم سے دور انکم میں گھٹنوں کے بل دیکھ رہا ہوں (۳) پھر حدیث کے راوی سفیان نے یہ آیت پڑھی وَأَسْفَىٰ لَكُمْ أَصْفَىٰ جَانِيَةً۔ ابن جریر فرماتے ہیں انکم سے مراد وہ بلند مقام ہے جہاں امت محمد ﷺ موجود ہوگی۔ ثم کا کلمہ وہیل ہے کہ حشر کے بعد جہنم کے گرد جمع ہونے میں اچھا خاصا وقت ہو گا کیونکہ فیصلہ ہونے سے پہلے لوگ ایک طویل زمانہ موقف میں جھبوس ہوں گے۔

لَمْ لَمْ تَنْزَعَنَّ مِنْ كَلِّ شَيْعَةَ أَيُّهُمْ أَشَدُّ عَلَى الرَّحْمَنِ عِيًّا ۝

”پھر ہم (چنانچہ) الگ کر دیں گے ہر گروہ سے ان لوگوں کو کہ جو (خداوند) رحمن کے سخت نافرمان تھے۔“

۱۔ من کل شیعۃ سے مراد ہر امت اور اہل دین ہیں۔ شیعۃ شاع یشیع شیعاً و شیوعاً و مشاعاً شیوعۃ و شیعاناً۔

سے مشتق ہے اس کا معنی پھیلانا ہے۔ شیعہ اہلِ رجل کسی انسان کے تعین اور معاونین کو کہتے ہیں اور شیعہ طحطاح فرقہ کو بھی کہتے ہیں۔ اس لفظ کا اطلاق واحد متخیر جمع مذکر اور نونث پر ایک جیسا ہوتا ہے۔ قاموس میں بھی اسی طرح لکھا ہے میں کہتا ہوں شیعہ کا اطلاق انسان کے بیروکاروں اور مددگاروں پر اس لئے ہوتا ہے کہ شیوع اور انتشار (یعنی پھیلاؤ) تقویت کو مستلزم ہے۔ بیروکار اور مددگار پھیل جاتے ہیں اور شیوع (قائد) کی ترکیب ان کی وجہ سے تقویت پکڑتی ہے۔ جوہری کہتے ہیں اشیاع کا معنی پھیلاؤ اور تقویت ہے کہا جاتا ہے شاع الحدیث یعنی بات زیادہ ہوگئی اور طاقتور ہوگئی۔ شاع القوم قوم زیادہ ہوگئی اور پھیل گئی۔ شیعبت النار بالخطب آگ لکڑیوں کی وجہ بھڑک اٹھی۔ شیعہ ان لوگوں کو کہتے ہیں جن سے انسان تقویت حاصل کرتا ہے اور وہ پھیل جاتے ہیں۔ جب ہر امت کا طحطاح دین ہے اور اپنے دین کے ساتھ وہ پھیل گئے اور ان کا معاملہ ان کی وجہ سے مضبوط ہو گیا تو اس لئے ان پر اس لفظ کا اطلاق کیا گیا۔

ع اشہم اشہم اصل میں ہوا شد تھا۔ عتیا۔ کا معنی تکبر کرنا اور نافرمانی میں حد سے بڑھ جانا ہے (1)۔ قاموس میں اسی طرح ہے یا اس کا معنی طاعت سے ہٹ جانا ہے امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کا معنی جرأت کیا ہے اور حجاب نے اس کا معنی فحش کر لیا ہے (2)۔ عتیا کا کلمہ اشد کی نسبت سے تیز ہے اور احنی کا کلمہ سیوہ کے نزدیک لعن عن کے مفعول کے حیثیت سے منسوب ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں احنی تو یہ تھا کہ دوسرے اسماء موصولہ کی طرح جنی ہوتا کیونکہ اسماء موصولہ احتیاج میں حرف کے مشابہ ہوتے ہیں لیکن یہاں ای معرب ہے۔ لہذا اضافت کی وجہ سے کل اور بعض پر محمول ہے اور جب اس کے صلہ کا صدر حذف ہو گیا تو اس میں نقص اور زیادہ ہو گیا پس یہ اپنی اصل کی طرف لوٹ آیا یعنی معرب ہو گیا۔ اور خلیل غوی کے نزدیک یہ مرفوع ہے یا تو اس لئے کہ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر اشد ہے اور یہ جملہ اس قول کو بیان کر رہا ہے (جو حذف و موصول کا صلہ ہے جو اسم موصول لعن عن کا مفعول ہے اور ای یہاں اسم موصول نہیں بلکہ استفہامیہ ہے) اور فقہر عبارت اس طرح ہوگی لنن عن من کل شیعة الذین یقال فیہم ایہم اشد یا ایہم لنن عن سے مطلق ہے۔ (لیکن اس پر اعتراض یہ وارد ہوتا تھا کہ تعلق افعال قلوب کے ساتھ خاص ہے جبکہ لنن عن افعال قلوب سے نہیں ہے) اس کے جواب میں بیضاوی فرماتے ہیں لنن عن میں تیز کا معنی پایا جاتا ہے۔ (کیونکہ کسی چیز کا کسی دوسری چیز سے نکالنا اس کے جدا کرنے اور ممتاز کرنے کا تقاضا کرتا ہے) اور یہ تیز اور افراز ظلم کا سبب ہے (اس لئے تعلق ہو سکتی ہے) یا یہ جملہ مستانفہ ہے اور من بعضیہ ہے یا من زائدہ ہے اور لنن عن کا فعل من کے زائدہ ہونے کی صورت میں کلی شیعہ پر واقع ہے یا یہ معنی ہے لنن عن بعض کل شیعہ۔

یا ایہم یشیع فعل کے فاعل کی حیثیت سے مرفوع ہے کیونکہ شیعہ یشیع کے معنی میں ہے اور کلی بیان کے لئے ہے (3) یعنی جار مجرور فعل محذوف یا مصدر متین کے متعلق ہے) یا اشد کے متعلق ہے۔ آئندہ آیت میں الباء کی بھی یہی ترکیب ہے۔ (گویا یوں سوال کیا گیا کہ انہوں نے کسی ذات پر سرکشی کی تو کہا گیا۔ عتوا علی الرحمن۔ کہ انہوں نے الرحمن کی سرکشی کی) واللہ اعلم۔

﴿مَنْ كَفَرَ بِنُحْنٍ أَعْلَمَ بِالذِّينِ هُمْ أَوْ ذِي بَهَا صِلِيًّا﴾

”پھر ہم ہی خوب جانتے ہیں ان لوگوں کو جو زیادہ مستحق ہیں اس آگ میں تپانے جانے کے۔“

2- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 206 (اتحادیہ)

1- القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1716 (التراث العربی)

3- تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شاذ، جلد 5، صفحہ 573-74 (اعلیٰ)

لے آیت کا یہ معنی ہے کہ ہم خوب جانتے ہیں ان لوگوں کو جو آگ میں تپانے کے زیادہ مستحق ہیں یا یہ معنی کہ جن کا آگ میں تپایا جانا زیادہ بہتر ہے۔ تم کا کلمہ یہاں تاخیر زمانی کے لئے نہیں بلکہ تراثی ترتیب کے لئے ہے۔ جس طرح لَمْ يَكُنْ مِنَ الَّذِينَ أَفْسَلُوا میں تم تراثی ترتیب کے لئے ہے۔ یا یہ کہا جاتا ہے کہ یہ کلام کنایہ ہے تم لَعْنَتِهِمْ سے یعنی پھر ہم انہیں ضرور عذاب دیں گے۔ اس تاویل میں کوئی اشکال نہیں ہے کیونکہ عذاب دینا دوزخ پر پیشی سے متاخر فریبی ہوگا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں علم بمعنی العلیم ہے کیونکہ یہ علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور یہ کہنا بھی جائز ہے کہ کرنا ما کا تین اور دوسرے ملا کہ بھی جانتے ہیں کہ فاجر اور تقی کون ہیں سعادت مند اور بد بخت کون ہیں اور اللہ اس کو زیادہ جانتا ہے۔

حزہ کسان کی اور شخص نے جیسا عیناً اور صلیباً کو فاء کلمہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے جیسا کہ وَقَدْ بَنَفَثَ مِنَ الْكِبْرِ حَبِيبًا۔ اس میں کی تحقیق گزر چکی ہے اور جمہور علماء نے فاء کلمہ کے ضم کے ساتھ پڑھا ہے اور ان کے نزدیک اس کا اصل وزن فعل ہے جیسا کہ گزر چکا ہے۔ کل شیعہ اگر کفار اور نافرمان مسلمانوں تمام کو شامل ہو تو اشد کے ذکر میں اس بات پر تنبیہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نافرمانوں میں سے اکثر کو معاف فرمادے گا اور اگر کل شیعہ صرف کفار سے ساتھ خاص ہو جیسا کہ سیاق کلام کا تقاضا ہے اور امام بخاری اور دوسرے اکثر مفسرین کی رائے ہے تو اشد سے مراد یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان میں جو سب سے زیادہ سرکش ہوں گے پہلے ان کو جدا کر کے دوزخ میں ڈالے گا پھر جو ان سے کم ہوں گے یعنی ترتیب وار چن چن کر کافر سرکشوں کو دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ یا یہ معنی کہ ہر طبقہ کے سرکشوں کو اس آگ میں ڈالا جائے گا جو ان کے لئے تیار کی گئی ہوگی۔

ابن ابی حاتم اور ترمذی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ جب پہلے اور پچھلے سب جمع ہو جائیں گے حتیٰ کہ تعداد پوری ہو جائے گی۔ پہلے بڑے مجرموں کو چننا جائے گا اور پھر انہیں آگ میں ڈالا جائیگا پھر جو ان سے کم درجہ کافر ہوں گے انہیں ڈالا جائے گا (اسی ترتیب سے سلسلہ جاری رہے گا) پھر حضرت عبداللہ بن مسعود نے فوہمک لِحَسْرَتِهِمْ الْاَيَةَ تَلَاوت فرمائی۔ ہناد نے ابی الاحوص سے اسی طرح کا قول نقل فرمایا ہے بیہدء الا کابرا فالالا کابرا جرمًا (۱)۔

وَإِنْ تَسْتَكْبِرُوا إِلَىٰ آيَاتِنَا فَإِنَّ أُولَٰئِكَ مَكْرُومٌ ﴿١٠٠﴾

”اور تم سے کوئی ایسا نہیں مگر اس کا گزند دوزخ پر ہوگا۔ یہ آپ کے رب پر لازم ہے (اور اس کا) فیصلہ ہو چکا ہے۔“

ان تافہ ہے اور منکم واحد محمدی کی صفت ہے۔ وار دہا میں حاشیہ کا مرجع جنم ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں قسم منکر ہے اصل میں واللہ ما منکم الا وار دہا ہے اور اس تاویل کی دلیل الاتحلف القسم کے الفاظ ہیں جو احادیث میں وارد ہیں۔ (حدیث شریف اس طرح ہے لَا يَمُوتُ بِأَخْبِئِكُمْ فَلَا تَمُوتُ بَيْنَ الْوَالِدِ فَتَمُوتُهُ النَّارُ إِلَّا تَجْلُتُ الْقَسَمِ)

ع الحتم مصدر ہے حتم الامور کا جس کا معنی واجب ہونا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر اس کو واجب کر لیا ہے اور اس کا فیصلہ فرما دیا ہے اور اس نے ایسا وعدہ فرمایا ہے جس کا خلف ممکن نہیں ہے۔

لَمْ يَسْجُدْ لِكُلِّ شَيْءٍ سَاجِدٌ ﴿١٠١﴾

”پھر ہم نہایت دین کے پرہیزگاروں کو اور رہنے دین کے خالموں کو دوزخ میں کہ وہ گھنٹوں کے بل گرے ہوں

گے۔ ل۔

ل۔ ننجی۔ کا عطف سابق کلام کے مضمون پر ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی نوودکم جمعاً فی جہنم ثم ننجی۔ یعنی اہم تمام کو جہنم میں داخل کریں گے پھر متعین کو نکال لیں گے۔ کسائی نے ننجی کو باب افعال سے تخفیف کے ساتھ اور ہاتی قراء نے باب تفعیل سے تصدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی جو لوگ شرک سے بچنے رہے انہیں جنت کی طرف لے جایا جائے گا بغیر کسی عذاب کے یا نافرمانیوں کا عذاب جھیلنے کے بعد۔ لیکن کافروں کو دوزخ میں گھنٹوں پر رہنے دیا جائے گا۔ جلیا کا معنی بعض علماء نے جمعاً اور بعض نے گھنٹوں کے مل کیا ہے اور رود سے مراد دخول ہے اگرچہ وہ دخول میں بمراط کے اوپر سے گزرنے کے ساتھ ہو۔ مل بمراط جہنم کے اوپر ہے کچھ بدعتی لوگ کہتے ہیں کہ رود سے مراد دخول نہیں ہے کیونکہ جو ایک مرتبہ دوزخ میں داخل ہوگا وہ کبھی باہر نہیں نکلے گا اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مومن جہنم میں بھی داخل نہ ہوگا کیونکہ ارشاد رہا ہے۔ **إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنَىٰ أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُنْعَدُونَ لَّا يَخْسِفُونَ عَنِهَا شَيْئًا**۔ (بلاشبہ وہ لوگ جن کے لئے مقدر ہو چکی ہے ہماری طرف سے بھلائی تو وہی اس جہنم سے دور رکھے جائیں گے وہ اس کی آہٹ بھی نہ سنیں گے۔) بلکہ یہاں رود سے مراد حاضر ہونا اور دیکھنا ہے کیونکہ سب لوگ حساب کی جگہ جمع ہوں گے اور وہ جگہ جہنم کے قریب ہوگی۔ اور اسی حساب کی جگہ سے متعین کو جنت کی طرف جانے کا حکم ہوگا اور ظالموں کو دوزخ کی طرف جانے کا آرڈر ہوگا اور رود کا معنی قریب ہونا۔ قرآن میں اور جگہ بھی استعمال ہوا ہے، ارشاد ہے **لَنَسُوقُكَ إِلَىٰ مَا عَصَيْتَ وَأَنْتَ لَا تَكْفُرُ**۔ موسیٰ علیہ السلام پانی کے قریب تھے، اندر داخل نہیں ہوئے تھے لیکن پھر بھی ان کے لئے رود کا لفظ استعمال ہوا ہے اور رود بھی حضور اور رؤیت کی تائید وہ حد طیبہ بھی کہتی ہے جو احمد ابویعلیٰ اور طبرانی نے ایک ایسی سند سے روایت کی ہے جس میں کوئی حرج نہیں ہے حضرت معاذ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص خوشی سے کسی حاکم کے حکم سے نہیں مجاہدین کی جگہ بانی کرتا ہے، وہ دوزخ کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھے گا مگر تم پوری کرنے کے لئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں **وَإِنْ يَرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَاءِ سَاقِطًا أُولَٰئِكَ يَلْمِزُوكَ لِمَ أَجِئْتَ بِهَذَا** اور تم سے کوئی ایسا نہیں مگر اس کا گزر دوزخ پر ہوگا۔

ہم اہلسنت وجماعت کہتے ہیں کہ رود کا حضور قریب اور رؤیت کے معنی میں استعمال جائز ہے لیکن ضرورت کے وقت، جبکہ یہاں اصل معنی دخول کو چھوڑ کر ان معانی میں استعمال کرنے کی کوئی مجبوری نہیں ہے۔ بدعتیوں کی تاویل کا قرآنی ارشاد ثم ننجی الذین اتقوا اللع بھی تردید کرتا ہے کیونکہ مومنین کا نکالنا اور ظالموں کو اس میں رہنے دینا دخول کے بعد ہو سکتا ہے اور حدیث میں عدم دخول پر کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ حدیث قسم پوری کرنے کی مقدار رؤیت کو ثابت کرتی ہے۔ دخول کی کوئی گنجل کرتی ہاتی رہا **أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُنْعَدُونَ** تو اس کا معنی یہ ہے کہ داخل ہونے کے بعد وہ دوزخ سے دور رکھے جائیں گے اور وہ ہونے کی وجہ سے اس کی آواز کو نہ سنیں گے اور بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ وہ دوزخ میں داخل ہونے کے وقت بھی اس کی آہٹ کو نہیں سنیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ ان پر دوزخ کی آگ کو کھٹنڈا اور سلامتی دانی بنا دے گا۔

ہذا طبرانی اور بیہقی نے خالد بن معدان سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں جب جنتی جنت میں داخل ہوا جائیں گے تو عرض کریں گے اے ہمارے رب کیا تو نے ہم سے وعدہ نہیں کیا تھا کہ ہم آگ پر وارد ہوں گے اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کیوں نہیں لیکن تم اس میں سے گزرے، ہو جبکہ وہ جگہ چکی تھی۔

ابن عدی اور طبرانی نے یعنی ابن امیہ سے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے روز آگ مومن سے کہے گی اے مومن (جلدی سے) گزر جا تیرے نور نے تو میرے شعلوں کو کھسم کر دیا ہے۔ ورود معنی دخول (اگر چلی سبیل المروری ہوگی) کی ہماری ایک دلیل امام احمد حاکم بیہقی کی حدیث ہے جو انہوں نے ابی اسیمہ سے روایت کی ہے۔ فرماتے ہیں ہم ورود کے معنی میں جھکڑ ہے تھے، بعض کہتے ہیں کہ مومن دوزخ میں داخل نہ ہوگا، بعض کہتے ہیں کہ سب لوگ داخل ہوں گے پھر مستحقین کو نکال لیا جائے گا۔ میں جابر بن عبد اللہ سے ملا، یہ اختلاف ان کے سامنے بیان کیا تو آپ نے اپنے کانوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا میرے یہ کان بہرے ہو جائیں گے اگر میں نے حضور ﷺ سے یہ بات نہ سنی ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا سب نیک بدوزخ میں داخل ہوں گے لیکن آگ مومن پر پھنسی اور بے ضرر ہو جائے گی جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ہوئی تھی کہ آگ مومنین کی ٹھنڈک کی وجہ سے شور مچائے گی الٰہی ان لوگوں کی ٹھنڈک کی وجہ سے میری تلامذت ختم ہو رہی ہے پھر اللہ تعالیٰ مستحقین کو وہاں سے نکال لے گا اور کافر وہاں ٹھنڈوں کے بل پڑے رہیں گے (۱)۔

امام بغوی نے نقل کیا ہے کہ ابن عبینہ نے عمرو بن دینار سے روایت کیا ہے کہ نافع بن الارزق نے ابن عباس سے ورود کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ ابن عباس نے ورود کا معنی دخول کیا اور نافع نے کہا ورود کا معنی دخول نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انکُم و ما تعبدون میں ذون اللہ حصب جہنم انکم تھا اور ذون تلاوت فرمائی اور فرمایا کیا اس آیت میں سب کے دخول کا ذکر نہیں ہے پھر فرمایا اے نافع! ہم سب اس آگ پر وارد ہوں گے اور مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس آگ سے نکال لے گا اور میرا خیال ہے کہ تجھے نہیں نکالے گا کیونکہ تو اس کو جھٹلاتا ہے (۲)۔ سعید بن مسعود اور عبد الرزاق ابن جریر ابن ابی حاتم اور بیہقی نے مجاہد سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں حضرت ابن عباس نے انکُم و ما تعبدون میں ذون اللہ حصب جہنم انکم تھا اور ذون تلاوت فرمائی اور فرمایا کیا اس آیت کے مطابق سب داخل ہوں گے یا نہیں۔ پھر یہ آیت پڑھی بَقْدَمُ قَوْمِهِمُ الْقَوْمِ وَالْقَوْمِ فَأَوْذَاهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُوا اس آیت کے مطابق سب داخل ہوں گے یا نہیں۔ میں اور تم سب داخل ہوں گے پھر میں دیکھوں گا کہ تو نکلتا ہے یا نہیں۔

العوفی کے طریق سے ابن عباس سے مروی ہے کہ ذَوَانُ قِبْلَتِكُمْ اِلَّا ذَوَا اِرْدَاهَا سے مراد یہ ہے کہ فاسق و فاجر سب داخل ہوں گے۔ کیا تم نے یہ ارشاد الٰہی سماع نہیں فرمایا۔ فَأَوْذَاهُمْ الْقَوْمِ وَالْقَوْمِ وَالْقَوْمِ فَأَوْذَاهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُوا۔ ذَوَانُ قِبْلَتِكُمْ اِلَّا ذَوَا اِرْدَاهُمْ۔ یعنی ورود کا معنی دخول ہے۔ کیا تم نے عن عمر بن عبد الرحمن ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس آیت کے تحت فرمایا لا یبقی احد الا دخلہا۔ یعنی ہر شخص آگ میں داخل ہوگا۔ سابقہ آیات اور صحابہ اور مفسر تابعین کے ارشاد سے ثابت ہوتا ہے کہ ورود بمعنی دخول ہے۔ امام احمد ترمذی حاکم اور بیہقی نے ابن مسعود سے اس ارشاد ذَوَانُ قِبْلَتِكُمْ اِلَّا ذَوَا اِرْدَاهُمْ کے متعلق روایت فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمام لوگ آگ پر وارد ہوں گے پھر وہ اپنے اعمال کے مطابق اس سے گزر رہیں گے۔ پہلا طبقہ جہنم کی چمک کی طرح تیزی سے گزر جائیگا دوسرا ہوا کی طرح، تیسرا گھوڑے کی تیز رفتاری سے چوتھا اونٹ کی رفتار سے اور اس کے بعد والا تیز پیدل چلنے والے شخص کی تیزی سے گزر جائیگا۔ (۴)

2- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 206 (بخاریہ)

1- الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 505 (العنفیہ)

4- مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 494 (قدیمی)

3- الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 505 (العنفیہ)

ابن ابی حاتم نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں تمام لوگ آگ پر وارد ہوں گے اور ان کا درد آگ کے ارد گرد قیام ہے پھر وہ پل صراط سے اپنے اعمال کے مطابق تیزی سے گزریں گے، بعض بجلی کی مانند، بعض ہوا کی مانند، بعض پرندے کی مانند، بعض تیز گھوڑے کی مانند، بعض تیز اونٹ کی مانند، بعض تیز چلنے والے شخص کی مانند گزریں گے۔ حتیٰ کہ آخری شخص جو گزرے گا اس کا نور اسکی قدموں کے انگوٹھوں کی جگہ تک ہوگا اور وہ پل صراط سے ڈمگ کر گزرے گا۔ امام بخاری و مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس مسلمان کے تین بچے فوت ہو جاتے ہیں وہ قسم پوری کرنے کی مقدار دوزخ میں داخل ہوگا (1) پھر راوی حدیث حضرت سفیان نے بطور دلیل قرآن کا یہ ارشاد پڑھا

وَأَن تَبْتَئِكُمُ الْوَأْقَابُ بِرُدَّهَا۔

طبرانی نے محمد بن بشیر الانصاری سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کے تین بچے فوت ہو جاتے ہیں جو ابھی بالغ نہیں ہوئے تھے تو وہ شخص راہ گیر کی طرح دوزخ پر وارد ہوگا، یعنی پل صراط سے مسافر آدمی کی طرح گزر جائیگا ظہرے گا نہیں۔

ابن جریر نے غنیم بن قیس سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں لوگوں نے آگ پر وارد ہونے کا ذکر کیا تو حضرت کعب نے فرمایا آگ تمام لوگوں کو روک لے گی حتیٰ کہ سب فاسق و فاجر کے قدم اس پر برابر تک جائیں گے پھر ایک نعرہ کرنے والا ندا دے گا (اے آگ) اپنے ساتھیوں کو روک رکھ اور میرے ساتھیوں کو چھوڑ دے، ہر دوزخ کا دوست اس میں دھنس جائے گا اور دوزخ اپنے ساتھیوں کو اس طرح پہنچاتی ہوگی جیسے مرد اپنے بچے کو پھانسیا ہے۔ مومنین اپنے تئز کپڑوں کے ساتھ نکل آئیں گے۔ (یعنی مومنین کو آگ کی اتنی تپش بھی نہیں لگے گی کہ ان کے کپڑے خشک ہو جائیں)۔

امام سیوطی فرماتے ہیں بعض علماء اہلسنت نے درود کی تفسیر دخول سے کی ہے اور اس آیت کے حعلق مروی اقوال میں سے ایک یہ قول بھی ہے۔ اسی کو علامہ قرطبی نے ترجیح دی ہے اور حضرت جابر کی حدیث مذکور سے استشہاد کیا ہے۔ بعض مفسرین نے اس سے مراد پل صراط سے گزرتا لیا ہے۔ امام نووی نے اسی قول کو ترجیح دی ہے اور انہوں نے ابن مسعود کی روایت کو ترجیح دی ہے جس میں صراط پر گزرنے کا ذکر ہے۔ اسی طرح حضرت ابی ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کو بھی بطور دلیل پیش کیا ہے۔

میں کہتا ہوں جب پل صراط جنم کے اوپر ہے تو اس سے گزرتا دخول کو لازم ہے، دخول آگ میں یعنی قیوم کا تھا نہیں کرتا۔ اسی وجہ سے میں کہتا ہوں درود سے مراد دخول ہے اگرچہ بطریق مروی (گزرتا) ہو کیونکہ اس مفہوم کے اعتبار سے تمام احادیث کا معنی جمع ہو جاتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت حسن کا قول ہے کہ درود کا معنی داخل ہونے بغیر اس کے اوپر سے گزرتا ہے جیسا کہ بتکئی نے ان سے نقل کیا ہے تو میں اس کے جواب میں، میں کہوں گا کہ حضرت حسن کے قول میں دخول یعنی قیوم اور دوزخ میں ٹھہرنا ہے۔ مطلق دخول مراد نہیں ہے۔

حضرت ہناد نے حضرت حصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اسی طرح نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے امید ہے کہ جو افراد جنگ بدر اور یامدینہ میں شریک ہوئے ان میں سے کوئی دوزخ میں داخل نہ ہوگا۔ فرماتی ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کیا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں ہے وَأَن تَبْتَئِكُمُ الْوَأْقَابُ بِرُدَّهَا الخ۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا تو نے یہ ارشاد نہیں سنا ثُمَّ نَسِجِي الدِّبْنِيْنَ النَّقْوَا وَنَلْدُو الظَّالِمِيْنَ جَبِيْثًا (2) اس

میں عدم دخول سے مراد عدم وقوع اور عدم استقرار ہے کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا کیا تم نے یہ نہیں سنا تم ننجی الذین المع۔ یہ جواب صراحتاً دلالت کرتا ہے کہ عدم دخول سے مراد عدم استقرار ہے جو نجات کا مفاد ہے نام سیولٹی فرماتے ہیں۔ اکثر سلف صالحین ورود کی تحقیق اور صدور کے احتمال سے ڈرتے تھے (یعنی دوزخ میں ورود) (دخول) تو یقینی ہے لیکن نکلنا محتمل ہے۔ اس لئے وہ ہر وقت لڑاؤں وترساں رہتے تھے۔)

بناد اور احمد نے لڑ بہ میں سعید بن منصور، حاکم اور بیہقی نے حضرت حازم بن ابی حازم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روئے تھے۔ بیوی نے پوچھا میرے سر تاج کیوں ورود ہو۔ فرمایا مجھے یہ تو خبر دی گئی ہے کہ میں نے آگ پر وارد ہونا ہے لیکن مجھے یہ خبر نہیں ملی کہ میں نے وہاں سے نکلنا بھی ہے؟

بناد اور بیہقی نے ابو الخلیق سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ابو یوسرہ عمرو بن شریشل اپنے بستر کی طرف اٹھے اور فرمایا کاش میری ماں نے مجھے جنم نہ دیا ہوتا۔ ان کی بیوی نے کہا کیوں؟ فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آگ پر وارد ہونے کی خبر دی ہے لیکن یہ خبر نہیں دی کہ ہم اس سے نکلنے والے بھی ہیں (۱)۔

احمد نے لڑ بہ میں حضرت الحسن سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ایک شخص نے اپنے بھائی سے کہا کیا تیرے پاس یہ خبر پہنچی ہے کہ تو آگ پر وارد ہوگا۔ بھائی نے کہا ہاں۔ پھر پہلے بھائی نے پوچھا کیا تیرے پاس یہ خبر بھی آئی ہے کہ تو اس سے نکل بھی آئیگا۔ دوسرے بھائی نے کہا نہیں۔ پہلے بھائی نے کہا پھر تو بتاؤ اس لئے ہے اس کے بعد اس شخص کو مرتے وقت تک ہنستے ہوئے نہیں دیکھا گیا (۲)۔

وَ إِذَا تَشَلَّىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا يَتَّبِعْتِ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَسَىٰ
الْفَرِيقَيْنِ خَيْرٌ مِّمَّا مَاؤُا أَحْسَنُ نَدِيًّا ۝

”اور جب تلاوت کی جاتی ہیں ان کے سامنے ہماری آیتیں وضاحت سے لے تو کافر کہتے ہیں ایمان والوں سے ملے کہ (یہ تو بتاؤ) ہم دونوں گروہوں میں سے کسی کی رہائش گاہ آرام دہ ہے اور کسی کی نشت گاہ خوبصورت ہے۔“

۱۔ علیہم کا مرع کفار ہیں یہ جملہ فاعل من بعدہم پر یا بقول الانسان پر معطوف ہے۔ آیات جنات کا مضموم یہ ہے کہ یہ آیات خود بخود واضح ہیں یا رسول اللہ ﷺ کی طرف سے بیان اور تفسیر کی وجہ سے اپنے معانی پر واضح دلالت کرتی ہیں یا یہ معنی کہ اپنے اعجاز کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی صداقت پر واضح دلالت کرتی ہیں۔

علی الذین کفروا سے مراد ظہر بن حارث اور اس جیسے بہت دھرم دوسرے قریش ہیں، یعنی کفار کو آیت قرآنی کے ذریعے جب دعوت حق دی جاتی تو وہ غریب و نادار مسلمانوں سے کہتے ”ذرا دیکھو تو سبھی مومنین اور کافروں میں سے کن کی بودود باش اچھی ہے اور محفل کن کی پر رونق ہیں، غریب مسلمان سخت زندگی بسر کرتے تھے۔ کپڑے بھی پھٹے پرانے پہنتے تھے، جبکہ مشرکین اپنے ہالوں کو نکلتی کرتے، امر پر تیل لگاتے اور بہتر کپڑے پہنتے تھے تو وہ اس عیش و طرب کی زندگی پر فخر کرتے ہوئے مومنین سے یہ سوال کرتے تھے۔

۲۔ ابن کثیر نے مقاما کو میم کے ضم کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ ظرف ہے یا باب افعال سے مصدر ہے اور باقی قراء نے میم کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ قیام سے ظرف ہے۔ ندیا کا معنی محفل اور مجمعہ ہے۔ جب کفار نے واضح آیات سنیں اور پھر ان کا

جواب دینے اور چیخ قبول کرنے سے عاجز آگئے تو انہوں نے دنیا کی بیش و عشرت کو باعث افتخار قرار دیا اور کہتے کہ ہمارے پاس جو آرام و آرائش اور دولت و ثروت ہے یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بھی ہماری فضیلت ہے اور ہمارے لئے اس کی بارگاہ میں عمدہ ٹھکانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کفار کی ان ڈیگیوں کا رد کرتے ہوئے ذیل کا یہ ارشاد نازل فرمایا۔

وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ هُمْ أَحْسَنُ أَثَاكًا وَرِئَاءَ ۙ ﴿١٠﴾

”اور (ان امتوں نے یہ نہ سوچا) کہ کتنی قومیں ان سے پہلے تھیں جن کو ہم نے برباد کر دیا وہ ساز و سامان اور ظاہری جوج میں (ان سے) بہتر تھیں۔ ا“

لے کم فخر یہ ہے اور اہل کفکا کا مفعول ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے من قرن، کم کی تہز ہے۔ ہر زمانہ کے لوگوں کو قرن کہا جاتا ہے کیونکہ وہ زمانہ میں باہم ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ علامہ بغوی نے اثنا کا معنی ساز و سامان اور اموال کیا ہے۔ مقاتل نے کپڑے اور لباس کیا ہے (۱)۔ قاموس میں اثاث کا معنی متاع الہیت گھر کا سامان لکھا ہے اور فرمایا اس صورت میں یہ بغیر واحد کے ہوگا اور اس کا معنی مال ہوتو پھر یہ جمع ہوگا اور اس کا واحد اناثہ ہوگا (۲)۔ اثنا اور رینا دونوں احسن کی نسبت سے تہز ہیں اور ضمیر کا مرجع قرن ہے یعنی ان لوگوں کا مال و متاع ظاہری جوج بہتر تھی۔ دنیا کو قانون اور ابن ذکوان نے یاہ کی تشبیہ کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ ہمزہ یاہ سے بدلا گیا پھر یاہ کو یاہ میں ادغام کیا گیا ہے۔ یاہیری سے مشتق ہے۔ جو عطش (بیاس) کی ضد ہے اور اس کا معنی نعمت سے سیر ہونا ہے۔ جمہور نے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اس صورت میں اس کا معنی خوش منظر ہے۔ حمزہ نے حمزہ کے ابدال کے ساتھ وقف کیا ہے اور قانون کی موافقت کی ہے۔ ہم احسن کا جملہ قرن کی صفت ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلَالَةِ فَلْيَبْذُذْهُ الرِّحْلَ مِنْ مَدَائِنِ حَلْيَ إِذَا مَرَّ أَوْ أَمَّا يُعَدُّوْنَ
إِمَّا الْعَذَابَ وَإِمَّا السَّاعَةَ ۖ فَسَيَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَكَانًا وَأَضْعَفُ جُنْدًا ﴿١١﴾

”آپ فرمائیے جو گمراہی میں (گمن) ہو تو ڈھیل دینے رکھتا ہے اسے زمین بسی ڈھیل لے یہاں تک کہ جب دیکھیں گے وہ چیز جس کا وعدہ کیا گیا ہے یعنی عذاب یا قیامت تو اس وقت انہیں پتہ چلے گا کہ کون مکان کے لحاظ سے برا اور لشکر کے اعتبار سے کمزور ہے۔“

لے فلیبذد امر کا صیغہ ہے لیکن بمعنی خبر ہے۔ نیز امر کا صیغہ وارد کرنے میں اس بات کا شعور دلاتا ہے کہ مہلت ایسی چیز ہے جو زمین کو عطا کرنی چاہئے تاکہ کافروں کا کوئی عذر باقی نہ رہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَوَلَمْ نَعْبُدْكُمْ مَا يُشْرِكُكُمْ فِينَا مِنْ شَيْءٍ ۚ (کیا ہم نے تمہیں اتنی لمبی عمر نہیں دی تھی جس میں (بہسانی) فصیحت قبول کر سکتا جو فصیحت قبول کرنا چاہتا)

اھا العذاب اور اسکا معطوف ما یو عدون سے بدل ہیں اور جمال کی تفصیل میں عذاب سے مراد دنیا میں قیدی ہونا اور قتل ہونا ہے اور الساعۃ سے مراد آخرت کا عذاب ہے۔ یہ فلیبذد کی غایت ہے یا حال الذین کفرو واللذین امنوا ای الفریقین الخ کی غایت ہے۔

ج قیامت کے روز جب عذاب الہی کو دیکھیں گے یا دنیا میں قتل اور قید کو دیکھیں گے تو انہیں معلوم ہوگا کہ کون مکان کے لحاظ سے برا ہے اور کون لشکر کے لحاظ سے کمزور ہے۔ شیاطین کافروں کے لشکر ہیں اور موٹین کے معاون و لشکر فرشتے ہیں۔ فسعیلمون کا جملہ جواب

شرط ہے اور یہ کلام مشرکین کے قول کا رد ہے جو انہوں نے کہا تھا۔ اُمّی القریٰ نَعْنِ خَيْرٍ مَّفَامًا وَ اَحْسَنَ نَدِيًّا۔ اللہ تعالیٰ نے خیر مفاہم کے مقابلہ میں شرم مکان اور احسن ندیا کے مقابلہ میں اضعف جندہ فرما کر ان کا رد فرمایا۔ مجلس کا حسن اور رونق لوگوں کے اجتماع سے ہوتی ہے اور ان کی شان و شوکت کے اظہار سے ہوتی ہے لیکن جب معاونین کم ہوں گے تو رونق و محبت بھی کم ہوگی۔

وَيَزِيدُ اللَّهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى وَالْبَقِيَّةُ الصَّالِحَةُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ
ثَوَابًا وَخَيْرًا مَرَدًّا ۝

”اور زیادہ کرتا رہتا ہے اللہ تعالیٰ ہدایت یافتہ لوگوں (کے نور) ہدایت کو اور باقی رہنے والی نیکیاں بہتر ہیں آپ کے رب کے نزدیک ثواب کے اعتبار سے اور انہیں کا انجام اچھا ہے۔“

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے مخلص بندوں کے ایمان میں تقویت اور اضافہ فرماتا ہے اور انہیں ان کے مقاصد عالیہ تک پہنچا دیتا ہے اور ان نفوس قدسیہ کا طمع نظر (مال و جاہ کا حصول نہیں) بلکہ قرب الہی ہوتا ہے۔ اس جملہ کا عطف قل کے بعد والے جملہ شرطیہ من کان فی الضلالة النج کے مضمون پر ہے۔ یعنی کافروں کو ذمیل دینا اور دنیا کے سامان عیش و طرب سے انہیں لطف اندوز کرنا اللہ کی بارگاہ میں ان کی فضیلت کی وجہ سے نہیں ہے اور مومنین کے پاس دنیا کا مال و متاع کم ہونا اللہ کی بارگاہ میں ان کے مرتبہ کی کمی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا کا مال کم عطا فرمایا تاکہ ان کے ثواب میں اضافہ کرے ان کے درجات کو بلند فرمائے اور انہیں اپنے قرب کی نعمت عظمیٰ سے سرفراز فرمائے۔

بعض علماء فرماتے ہیں اس جملہ کا عطف فلیمدد پر ہے کیونکہ وہ خبر کے معنی میں ہے۔ تقدیر عبارت گویا اس طرح ہوگی جو گمراہ ہوتا ہے اللہ اس کی گمراہی میں اضافہ فرماتا ہے اور جن سے وہ گمراہ دشمنی رکھتا ہے (یعنی مومنین) ان کی ہدایت میں اضافہ فرماتا ہے۔ مع الباقیات الصالحات سے مراد اذکار اور اعمال صالحہ ہیں جن کا فائدہ ہمیشہ کیلئے کو ملتا رہتا ہے۔ فرمایا یہ فائدہ بہتر ہے اس دنیوی مال و متاع سے جس سے کافر متمتع ہوتے ہیں اور فخر سے چھوٹے نہیں ساتے اور انجام کے اعتبار سے بھی نیک اعمال بہتر ہیں۔ یہاں خیر کا لفظ صرف زیادتی کے معنی میں ہے یہ عربوں کے اس قول کے مطابق ہے۔ الصیف احمر من الشفاء یعنی گرمیوں میں گرمی سردیوں میں سردی کی نسبت زیادہ ہے۔

امام بخاری اور مسلم نے حضرت خباب بن الارت سے روایت فرمایا ہے، آپ فرماتے ہیں میں لوہاروں کا کام کیا کرتا تھا۔ عاص بن وائل کے ذمہ میری کچھ رقم تھی میں اس سے مانگنے کے لئے گیا تو اس نے کہا بخدا میں یہ رقم اس وقت ادا کروں گا جب تو محمد (ﷺ) کی نبوت کا انکار کرے گا۔ میں نے کہا بخدا میں ان کی نبوت کا انکار نہیں کروں گا یہاں تک کہ تو مر جائے پھر تجھے قیامت کے روز اٹھایا جائے۔ اس نے کہا مرنے کے بعد میں قبر سے اٹھایا جاؤں گا۔ میں نے کہا ہاں (تجھے اٹھایا جائے گا) وہ گستاخ کہنے لگا اس وقت میرے پاس مال اور اولاد کی فراوانی ہوگی، میں وہاں تیرا قرض ادا کروں گا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ذیل کی آیت نازل فرمائی (1)۔

أَفْرَعَرَيْتَ النَّبِيَّ كَفَرًا يَلْتَمِئْنَا وَقَالَ لَأَوْشَيْتَنِي صَالًا وَوَلَدًا ۝

”کیا آپ نے دیکھا اس کو جس نے انکار کیا ہماری آیتوں کا اور کہنے لگا کہ مجھے ضرور ضرور دیا جائے گا مال اور اولاد“

۱۔ چونکہ روایت (دیکھنا) کسی خبر کے لئے قوی ترین ذریعہ ہے اس لئے روایت کو اخیر نبی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے یا مخاطب غیر میں ہے۔ روایت کا کلمہ فاء کے ساتھ ذکر فرمایا ہے یہ محذوف کلام پر معطوف ہے۔ تقدیر عمارت اس طرح ہوگی واقعہ نظر ک فریات۔ الذی کفرو مراد العاص بن وائل ہے۔ قال کا عطف کفر پر ہے۔ حمزہ اور کسائی نے ولدا کو واؤ کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے دونوں کو فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ دونوں لغتیں ہیں جسے عرب عرب، عجم، عجم، بعض علماء فرماتے ہیں واؤ کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ ہو تو جمع ہے اور دونوں فتح کے ساتھ ہوں تو مفرد ہے۔ جیسے اسد اور اسد۔

أَطْلَعُ الْغَيْبَ أَوْ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَنِ عَهْدًا ﴿۱﴾

”(اس لاف زنی کی وجہ کیا ہے) کیا وہ آگاہ ہو گیا ہے غیب پر، یا لے لیا ہے اس نے (خداوند) رحمن سے کوئی وعدہ“۔

۱۔ یہ جملہ بتا و میل مفرد ہو کر روایت کا مفعول ثانی ہے اطلعه یہاں اطلع الجہل کے قبیل سے ہے جس کا معنی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جانا ہے یعنی کیا یہ اتنا بلند ہو گیا ہے کہ غیب پر مطلع ہو گیا ہے۔ ہمزہ استفہام ذکر کیا گیا ہے اور باب اجتماع کے ہمزہ وصلی کو حذف کیا گیا ہے (یعنی اطلع سے پہلے ہمزہ مفتوحہ ہمزہ استفہام سے) ابن عباس فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اس نے لوح محفوظ کو دیکھ لیا ہے مجاہد فرماتے ہیں کیا اس نے علم غیب جان لیا ہے (۱) کو وہ آخرت میں مال اور اولاد ملنے کا دعویٰ کرتا ہے۔

۲۔ یا اس نے خداوند رحمن سے کوئی عہد لیا ہے۔ یعنی کیا اس نے لا الہ الا اللہ کہا ہے۔ قنودہ فرماتے ہیں کوئی اس نے نیک عمل کیا ہے۔ کبھی کہتے ہیں کیا اللہ سے اس نے عہد لیا ہے کہ وہ اسے جنت میں داخل کرے گا (۲)۔

كَلَّا سَنَكْتُبُ مَا يَقُولُ وَنَمُدُّ لَهُ مِنَ الْعَذَابِ مَدَدًا ﴿۱﴾

”ہرگز ایسا نہیں۔ ہم لکھ لیں گے جو یہ کہہ رہا ہے، اور لمبا کر دیں گے اس کے عذاب کو خوب لمبا کرنا“۔

۱۔ سنکتاب کا معنی ہم محفوظ کر لیں گے یا ہم اس کی بات کو ظاہر کریں گے کہ ہم نے اس کی بات کو لکھا، ہوا ہے یا یہ معنی کہ ہم نے جو اس قول لکھا ہے اس سے اس کا انتقام لیں گے۔ یہ تاویلات کرنے کی وجہ یہ ہے کہ نفس کتابت قول (بات) سے متاخر نہیں ہوتا (بلکہ جو نبی وہ منہ سے بات کرتا ہے لکھ لی جاتی ہے) کیونکہ ارشاد ہے مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدُنَّا ذِكْرٌ مِمَّا قَالَتْ سَبَّحْتَہُمْ۔ (سین جو مستقبل میں کسی کام کے کرنے پر دلالت کرتا ہے اس کو کتابت پر داخل کرنے کی پہلی وجہ بیان فرمائی کہ سین صرف کتابت کے ظہور اور اس کی وضاحت کرنے کے لئے ہے اور دوسرا معنی کر کے بظاہر فرمایا کہ یہاں مجازی معنی کا استعمال ہوا ہے۔ سبب یوں کہ مراد لیا گیا ہے۔)

انسان کے اعمال کو کرنا کا تین لکھنے ہیں یہاں لکھنے کی نسبت اپنی طرف فرمائی اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتے اللہ کے حکم سے لکھتے ہیں۔ کفر کی وجہ سے جس عذاب کا مستحق تھا اب اس کو اس کی وجہ سے ہم اس کے عذاب میں مزید اضافہ کر دیں گے۔

وَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فَتَدَارَىٰ ﴿۱﴾

”اور ہم ہی وارث ہوں گے جو وہ کہتا ہے (یعنی اس کے مال اور اولاد کے) اور وہ ہمارے پاس تھا آئے گا۔“

لے یعنی ہم اس مستحق کو ہلاک کر دیں گے اور اس کی جمہوری ملکیت کو باطل کر دیں گے اور قیامت کے دن جب زنجیروں میں جکڑا ہوا ہمارے پاس آئے گا تو اس کے پاس نہ مال ہوگا، نہ اس کے ساتھ اولاد ہوگی تنہا ہوگا چچ جائیگا اسے وہاں مزید لگامسکتب اپنے معظوف سے مل کر ملت ہے اس زجر و توبیح کی جو کلا سے استفاد ہے۔

وَالْحَدُّ وَامِنْ دُونِ اللّٰهِ الْيَهُودُ لِيَكُوْنُوْا اِلَهُمْ عَزًّا ۗ

”اور انہوں نے بنائے ہیں اللہ کے سوا اور خدا کہ وہ ان کے لئے مددگار بنیں۔ ل۔“

۱۔ یعنی کفار قریش نے بتوں کو خدا بنا رکھا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کے مددگار بنیں وہ ان کو وسیلہ اور شفیع سمجھتے تھے۔

كَلَّاۤ اَسْمٰكُفْرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ فَضْدًا ۝۱۰

”ہرگز نہیں وہ جھوٹے خدا انکار کر دیں گے ان کی عبادت کا۔ اور وہ (اللہ کے دشمن ہو جائیں گے ج۔“

۱۔ کلا ان کی بات کو رد کرنے کے لئے آیا ہے کہ وہ قیامت کے روز ان کی کچھ معاونت نہ کریں گے، وہ بت اس مشکل گھڑی میں ان مشرکوں کی عبادت کا انکار کر دیں گے اور ان سے براہت کریں گے اور کہیں گے کَلَّا اَنَا اِلٰهِيْكَ فَكَا كَلَّا اِلٰهِيْنا اِيْهٰلُؤْن۔ (ہم ان سے) بیزار ہو کر تیری طرف متوجہ ہوتے ہیں اور وہ ہماری پوجائیں کیا کرتے تھے) یا یہ مطلب کہ کفار بتوں کی عبادت سے بالکل بکر جائیں گے اور کہیں گے وَاللّٰهِ رَبَّنَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ (اللہ کی قسم جو ہمارا رب ہے نہ تھے ہم مشرک کرنے والے)

ج۔ وہ بت کفار کی ذلت اور رسوائی کا باعث بنیں گے کیونکہ ذلت و رسوائی کی عزت کی ضد ہے، اس لئے یہاں عَزًّا کے مقابلہ میں فَضْدًا آیا ہے اس لئے یہاں اس کا معنی ذلت و رسوائی ہوگا۔ یہ تاویل پہلی تاویل کی تائید کرتی ہے یا یہ معنی کہ وہ بت ان کے مخالف ہو جائیں، یعنی وہ ان کے دشمن بن جائیں گے اور ان کی تکذیب کریں گے اور ان پر ملت سمجھیں گے یا کفار کو عذاب دلانے میں مددگار بنیں گے اس طرح کہ پتھر کے بنے ہوئے بتوں کو آگ میں ڈال کر بھڑکایا جائے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بھونوں میں ضمیر کفار کے لئے ہو اور علیہم کی ضمیر بتوں کے لئے ہو۔ مطلب یہ ہوگا کہ کفار اپنے بتوں کے منکر ہو جائیں گے اور دنیا میں ان کی عبادت کرتے رہنے کے بعد قیامت کے روز ان کی عبادت سے انکاری ہو جائیں گے۔

ضد کے لفظ کا واحد ہونا معنی کی وحدت کی وجہ سے ہے، یعنی وہ مخالفت میں ایک چیز ہوں گے۔ جس طرح حضور ﷺ نے فرمایا وَهَمْ يَنْدُ عَلٰی مَنْ سِوَاہُمْ۔ وہ مخالف کے سامنے ایک ہاتھ ہیں۔ اس حدیث کو ابو داؤد اور ابن ماجہ نے عمرو بن شیبہ عن ابیہ عن جہدہ کی سند سے روایت کیا ہے۔ ابو داؤد اور سنانی نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اور ابن ماجہ نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے۔ قاموس میں ہے کہ ضد جمع بھی استعمال ہوتا ہے (۱)۔ جیسے اس ارشاد میں ہے وَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ فَضْدًا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّا كَرَّمْنَا الشَّيْطٰنِيْنَ عَلٰی الْكٰفِرِيْنَ تَتَوَخَّوْهُمْ اَعْمٰۗا ۝۱۱

”کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ ہم نے مسلمانوں کو کفار پر لے کر شیطانون کو کفار پر لے کر (اسلام کے خلاف) ہر وقت

اکساتے رہتے ہیں۔“

۱۔ استفہام انکاری ہے اور لئی کا انکار ثابت ہوتا ہے تو معنی یہ ہوگا کہ ہم نے کافروں پر شیطانون کو مسلط کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد

ہے وَمَنْ يُغْلَبْ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمَنِ يَقْنُصْ لَدُنَّ شَيْطَانٍ لَغْوَهُ لَنْ يَذَّوُنَهُ۔ (اور جو شخص (داست) اندھا بنتا ہے رُحْمَنِ کے ذکر سے تو ہم مقرر کر دیتے ہیں اس کے لئے ایک شیطان پس وہ ہر وقت اس کا رُحْمَنِ رہتا ہے) امام بغوی فرماتے ہیں اس ارشاد سے اشارہ ہے اس آیت کی طرف جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاسْتَقْبَلُوهُمْ فِي زُجُرٍ اسْتَقْبَلَتْ مِنْهُمْ بِصُورَتِهِ۔ (اور گمراہ کرنے کی کوشش کر جن کو تو گمراہ کر سکتا ہے ان میں سے اپنی آواز (کی فوسن کاری) سے یا یہ معنی کہ ہم نے کافروں اور شیطانوں کو آزاد کر دیا ہے کہ وہ آپس میں یا راندنا گھنٹیں۔ اس صورت میں یہ ارسلت البعیر سے مشتق ہوگا جس کا معنی ہے میں نے اونٹ کو آزاد کر دیا۔

یعنی وہ شیطان انہیں گناہوں پر اور جمہوری امیدیں دلا کر بدکاریوں پر اکساتے رہتے ہیں اور نفسانی خواہشات کی بیروی پر برا بیخیز کرتے رہتے ہیں۔ الا از اور الہیز کا معنی حرکت دینا ہے۔ تواء زہم از اُپورا جملہ الشیاطین سے حال ہے۔ اس کلام میں حضور نبی کریم ﷺ کو توجہ دلا نا ہے کہ دیکھو آیات جینات کے ذریعے حق کے واضح ہونے کے بعد بھی یہ بد بخت کفر پر اڑے ہوئے ہیں اور گمراہی کی محنت وادی میں سر پہ دوڑے جا رہے ہیں اور کسی گستاخانہ باتیں کرتے ہیں۔

فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ^ط لَنْ نُنزِلَهُمْ عَذَابًا

”پس عجلت نہ کیجئے ان پر (نزل عذاب کے لئے) ہم تم رہے ہیں ان کے ایام زندگی کو اچھی طرح لے۔“

لے ان پر آپ نزول عذاب کی ہدعا کرنے میں جلدی نہ فرمائیں۔ ہم نے جو ان کی عمر متعین کی ہے اس کو ہم شمار کر رہے ہیں ایک ایک دن شمار ہو رہا ہے۔ ان کی زندگی کے ایام محدود ہیں (جو نبی وقت مقرر آ جائے گا تو اپنے انجام بد کو پہنچ جائیں گے) فلا تعجل پر فاء سبب ہے اور انما نعدلہم کا جملہ معللہ ہے یا جملہ مستفاد ہے اور جملہ الم تم انا ارسلنا الخ واتخذوا من دونہ الہة کی تائید اور تقریر ہے۔

يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمَنِ وَقَدْ

”وہ دن جب ہم انکھاکریں گے پر ہمیزگاروں کو رُحْمَنِ کے حضور میں (معزز و مکرم مہمان بنا کر) لے۔“

لے یوم نحشر المتقین اپنے معظوفات سے لے کر فعل محذوف بالفعل بالفريقين ما نفعل کی طرف سے یا اذکر کی وجہ سے منصوب ہے یا لا یملکون کے متعلق ہے۔ الی الرحمن سے مراد اللہ تعالیٰ کے عزت و کرامت عطا کرنے اور اس کی تجلیات کا کس پڑنے کی جگہ ہے۔ وقد المتقین سے حال ہے اور یہ وفد کی جمع ہے، یعنی جس طرح وفد بادشاہوں کے پاس پوری حج و حج کے ساتھ جاتے ہیں اور بادشاہوں سے عزت و کرامت کے منتظر ہوتے ہیں۔

حاکم التیجانی اور عبداللہ بن احمد نے زوائد المسند میں ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے یہ آیت کریمہ پڑھی اور پھر فرمایا قسم بخدا متقین اپنے قدموں پر نہیں جائیں گے اور نہ انہیں ہانک کر لے جایا جائے گا بلکہ جنت سے ایسی اونٹنیوں کے ذریعے ان کو لایا جائے گا جن کی شل مخلوق نے پہلے نہ دیکھی ہوں گی۔ ان اونٹنیوں پر کھادے سونے کے ہوں گے اور ان کی مہاریں زبردگی ہوگی، وہ تقویٰ کے پیکران پر سوار ہو کر آئیں گے اور جنت کے دروازے کھٹکتائیں گے (۱)۔ امام بغوی نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول اس طرح نقل کیا ہے کہ قسم بخدا متقین اپنے قدموں پر چل کر نہیں آئیں گے بلکہ ایسی

اونٹنیوں پر سوار ہو کر آئیں گے جن کے کجاوے سونے کے ہوں گے اور ان کی سوار یوں کی زمینیں یواقت کی ہوں گی۔ متقین انہیں چلانے کا ارادہ کریں گے تو وہ چل پڑیں گی، وہ بظہر انے کا ارادہ کریں گے تو ظہر جائیں گی (1)۔ امام بیہقی نے طلحہ بن ابی طلحہ عن ابن عباس کے طریق سے اس آیت یوم نحر النخ کا یہ مفہوم نقل کیا ہے کہ ہم متقین کو حرمین کے حضور میں سوار کر کے اکٹھا کریں گے (2) اور (ونسوق المجرمین النخ) کا یہ معنی بیان فرمایا ہے کہ ہم مجرموں کو بیابان تک کر لے جائیں گے۔

ابن جریر نے ابی طلحہ عن ابی ہریرہ کے طریق سے وفد کا یہ معنی نقل کیا ہے کہ ہم انہیں اونٹنیوں پر سوار کر کے لائیں گے۔ ابن ابی حاتم نے عمر بن قیس الملائی سے روایت کیا ہے کہ مومن جب قبر سے اٹھے گا تو اس کا عمل ایک خوبصورت شکل اور انتہائی خوشبو کے ساتھ اس کا استقبال کرے گا۔ وہ مومن سے پوچھے گا کیا تو مجھے پہچانتا ہے؟ مومن کہے گا نہیں صرف اتنا جانتا ہوں کہ تیری خوشبو بڑی پاکیزہ ہے اور تیری شکل بڑی دلکش ہے۔ وہ کہے گا میں تیرا عمل صالح ہوں۔ دنیا میں میں تجھ پر سوار رہا آج تو مجھ پر سوار ہوا۔ پھر یہ آیت یوم نحر المقتین الی الرحمن وفدًا تلاوت فرمائی۔ اور جب کا قبر سے اٹھے گا تو اس کا عمل انتہائی قبیح شکل میں اور انتہائی بری بدبو کے ساتھ اس کا استقبال کرے گا۔ وہ کافر سے پوچھے گا تو مجھے جانتا ہے۔ وہ کہے گا نہیں۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ تیری صورت بڑی بھدی اور بد شکل ہے اور بدبو بڑی گندی ہے وہ کہے گا اسی طرح بات ہے میں تیرا عمل ہوں دنیا میں تو مجھ پر سوار رہا، آج میں تجھ پر سوار ہونگا۔ اور پھر یہ آیت وَهُمْ يُحْمَلُونَ اَوْ اَرْحَمُهُمْ عَلٰی ظُهُورِهِمْ تلاوت فرمائی۔

وَلَسَوْفَ الْمُجْرِمُونَ اِلٰی جَهَنَّمَ وَاَسْمًا ﴿٥﴾

”اور اس روز ہا تک کر لائیں گے مجرموں کو جہنم کی طرف، پیا سے جانوروں کی طرح لے۔“

ل۔ علامہ بغوی نے ورد کا معنی پیدل چلنا کیا ہے۔ بعض نے پیا سا کیا ہے، یعنی مجرموں کو ہا تک کر جہنم کی طرف لایا جائے گا جبکہ پیا س کی وجہ سے ان کی گردن میں ٹوٹ رہی ہوں گی۔ اور اس جماعت کو کہتے ہیں جو پانی پر وارد ہوتی ہے اور پانی پر کوئی شخص اس وقت وارد ہوتا ہے جب پیا سا ہوتا ہے (3)۔ ابن عباس نے بھی اس کا معنی عطا شام (یعنی پیا سے) کیا ہے۔

میں کہتا ہوں اللہ تبارک و تعالیٰ نے دونوں فریقوں کا حال بیان فرمایا ہے ایک فریق کا ملین متقین اور انبیاء کرام کا ہے اور دوسرا فریق کفار کا ہے لیکن عام نیکو کاروں اور گنہگار مومنین کا ذکر نہیں فرمایا۔ ان کا ذکر حدیث میں ہے۔ لوگوں میں سے کچھ پیدل جائیں گے وہ عام مومنین ہیں۔ ہم نے تفصیل سے حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حدیث معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سورہ بنی اسرائیل میں وَنَحْمَلُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰی وُجُوْهِهِمْ حُمَاهِمَا وَنَحْمَا وَاَوْصِيٰمًا کے تحت ذکر کی ہے (4)۔

ابو ذر کی احادیث میں ہے کہ لوگ تمہیں کیفیتوں میں جمع کئے جائیں گے سوار پیدل اور مومنین کے مل۔

امام بخاری اور مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا لوگ تمہیں طریقوں پر جمع ہوں گے۔ راشدین (رضیت کرنے والے) کرامین (خوفزدہ) اور ایک اونٹ پر دو اور ایک اونٹ پر تین ایک اونٹ پر دس اور باقی لوگوں کو آگ ہا تک کر لے جائیں گی۔ جہاں وہ دو پہر کو ظہر میں گئے، آگ بھی ان کے ساتھ ظہر سے گئی اور جہاں وہ رات گزاریں گے، وہ آگ بھی ان کے ساتھ رات گزارے گی (5)۔

ابن حجر فرماتے ہیں راغبین اور راغبین سے عام موٹھیں مراد ہیں۔ اور جو ایک اونٹ پر دو دو تین تین کا ذکر فرمایا ہے لیکن ایک اونٹ پر ایک شخص کا ذکر نہیں فرمایا یہ اشارہ ہے کہ ایک اونٹ پر ایک سوار وہ ہوں گے جو ابرار ہیں۔ امام بیہقی فرماتے ہیں راغبین اشارہ ہے ابرار کی طرف اور راغبین اشارہ ہے ایسے لوگوں کی طرف جو خوف ورجاء کے درمیان ہیں اور جن کو آگ بانک کر لے جائے گی وہ کفار ہیں۔ لکنی نے بھی اسی کی مثل تشریح کی ہے لیکن یہ زائد لکھا ہے کہ ابرار سے مراد متقیین ہیں جنہیں جنت کی اونٹیوں پر لایا جائے گا اور وہ اونٹ جن پر خوف ورجاء والے سوار ہوں گے ہو سکتا ہے وہ اونٹ ہوں جن کو قیامت کے دن زندہ کیا جائے گا۔ امام سیوطی فرماتے ہیں چونکہ یہ لوگ خوف ورجاء کے بین بین ہوں گے اس لئے انہیں جنت کی اونٹیوں پر لونا ماننا مناسب نہیں ہے اور فرماتے ہیں یہ وہ لوگ ہوں گے حساب کے وقت جن کے گناہ بخش دیئے جائیں گے اور عذاب میں مبتلا نہ ہوں گے۔ لیکن وہ لوگ جن کو گناہوں کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا، وہ پیدل چلیں گے۔ احتمال ہے کہ وہ پیدل چلیں اور سوار نہ ہوں یا پہلے وہ سوار ہوں اور پھر جب محشر کے قریب پہنچیں تو پیدل چلیں۔ فرماتے ہیں کفار اپنے مومنوں کے بل چلیں گے۔

طبرانی نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز انبیاء کو ام کو جانوروں پر لایا جائے گا تاکہ وہ اسی حالت میں محشر میں پہنچیں۔ نیک آدمی کو اونٹی پر لایا جائے گا، مجھے براق پر لایا جائے گا، میرے شہزادوں حسن اور حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو جنت کی دو اونٹیوں پر لایا جائے گا۔ اور بلال کو بھی جنت کی اونٹیوں میں سے ایک اونٹی پر لایا جائے گا، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہادت کی اذان دینے کے حتیٰ کہ جب اشہد ان محمد رسول اللہ ﷺ کہیں گے تو اولین و آخرین میں سے سب مومنین شہادت دیں گے۔ پس جس کی شہادت قبول کی جائے گی اس کی شہادت قبول کی جائے گی جس کی رد ہوگی اس کی رد کی جائے گی۔

نوٹ: صلیبی اور غزالی نے لکھا ہے کہ وہ لوگ جو سوار کر کے لائے جائیں گے وہ اپنی قبور سے سوار ہو کر آئیں گے۔ اسامی کا میلان اس طرف ہے کہ وہ موقف کی طرف پیدل چل کر آئیں گے اور پھر وہاں سوار یوں پر سوار ہوں گے۔ وہ یہ تاویل اس لیے کرتے ہیں تاکہ دونوں قسم کی احادیث صحیح ہو جائیں۔ صحیحین اور ترمذی کی حدیث ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے اور فرمایا اے لوگو! تم اللہ کی بارگاہ میں ننگے پاؤں برہنہ بن کر غیر محتون اور پیادہ پا حاضر ہو گے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت کریمہ پڑھی کہ تَابِعُوا آؤلَآئِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَقْتَدُوْنَ۔ اور سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لباس پہنایا جائے گا۔

اسی طرح امام بخاری اور مسلم نے حضرت عائشہ سے طبرانی نے سودہ بنت زعمور اور سلمہ بن بسمل بن سعد حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے اور ابو اسد نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے۔ ان احادیث میں آیت کی قرأت اور ابراہیم علیہ السلام کو سب سے پہلے لباس پہنائے جانے کا ذکر نہیں ہے اور ان احادیث میں یہ زائد ہے کہ ازواج مطہرات میں سے کسی نے عرض کی حضور! کتنی بری بات ہوگی کہ ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا لوگ اس چیز سے غافل ہوں گے لَکُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ یَوْمَئِذٍ حَافِیٌّ۔ (ہر شخص کو ان میں سے اس دن ایسی ننگ لاتی ہوگی جو اسے (سب سے) بے پرواہ کر دے گی۔

لَا یَسْتَلْمُونَ النَّفَعَةَ إِلَّا مِنَ الْعَدَدِ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عٰہِدًا ﴿۱۰﴾

”انہیں کوئی اختیار نہیں ہوگا شفاعت کا بجز ان کے جنہوں نے (خداوند) رحمن سے کوئی وعدہ لے لیا ہے۔“

لا یملکون کی ضمیر عباد کے لئے ہے جن پر دونوں قسموں کا ذکر دلالت کر رہا ہے اور لا یملکون کا جملہ الممتقین اور المجرمین سے حال ہے یا جملہ مستانہ ہے، یعنی کوئی شفاعت کرنے کا مالک نہیں ہے مگر ایمان، عمل صالح اور جن کو اللہ تعالیٰ نے اس عظمت کے لئے تیار فرمایا ہے اور جن کو گنہگاروں کی سفارش کا شرف بخشا ہے وہ سفارش کریں گے اور اللہ تعالیٰ ان کی سفارش کو قبول فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے خود ہی ارشاد فرمایا اذْذُنُوْنِیْ اَنْشَجِبْ لَنْفِیْ۔ مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا (ایک اور مقام پر فرمایا وَیَسْجُدْ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحٰتِ وَیَزِیْنُ لَهُمْ قُلُوبُهُمْ)۔ اور وہی قبول کرتا ہے وہ عائن ان لوگوں کی جو ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے اور (ان کے حق سے بھی) انہیں زیادہ (اجر) دیتا ہے اپنی مہربانی سے)

ابن صالح حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت فرماتے ہیں اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمانداروں اور عمل صالح کرنے والوں کی ان کے بھائیوں کے حق میں شفاعت قبول فرمائے گا اور یزیدہم من فضلہ کا مطلب یہ ہے کہ ان پر مزید کرم نوازی ہوگی کہ بھائیوں کی بھی شفاعت قبول فرمائے گا۔ یا یہ معنی کہ وہ سفارش اور شفاعت فرمائیں گے جنہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اذن ہوگا جیسا کہ ارشاد ہے قَدْ اٰتٰیْنَا یٰسْحٰقَ عِصْمَةً اِلَّا بِرِاٰذِنٰہِ (کون ہے جو سفارش کر سکے اس کے پاس بغیر اس کی اجازت کے) عہد الٰہمِز الٰہِ فَلَانِ بِکَظٰہِ اس وقت کہا جاتا ہے جب امیر کسی کو کسی کام کا حکم دے۔ اور من موصول لایملکون کی ضمیر سے بدل ہونے کی بنا پر محل رفع میں ہے۔ یا استثناء کی بنا پر منصوب ہے اور جائز ہے کہ مستثنیٰ مفرغ ہو اور لایملکون میں واؤ علامت جمع ہو ضمیر نہ ہو جسے اَمَلُوْنِیْ اَنْشَجِبْ لَنْفِیْ میں سے تقدیر یوں ہوگی لا یملک الشفاعۃ احد الا من اتخذ۔ بعض علماء فرماتے ہیں من اتخذ عند الرحمن عہداً سے مراد وہ شخص ہے جس نے لا الہ الا اللہ کہا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کی مغفرت کا وعدہ فرمایا ہے فَمَا یَقْتُلُوْنَ یَسْئَلُ مِنْحٰلِہٖمْ وَیَسْئَلُہُمْ اَنْ یَّحْتَبِرُوْا۔ اور فرمایا اِنَّ اللّٰہَ یَعْبُدُ الذُّنُوْبَ حَبِیْبًا۔ اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اللہ پر بندوں کا حق ہے کہ انہیں عذاب نہ دے جو شرک نہیں کرتے (۱)۔

یہ حدیث امام بخاری اور مسلم نے حضرت معاذ سے روایت کی ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے اسم موصول عمل نصب میں ہوگا اور اس سے پہلے شفاعت مضاف مقدر ہوگا۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی لا یملکون الشفاعۃ الا شفاعۃ من اتخذ عند الرحمن عہداً۔ یعنی شفاعت مفعول کی طرف مضاف ہے۔ اس کی مثال یہ ارشاد ہے لَا یَسْئَلُوْنَ اِلَّا بِرِاٰذِنِیْ مِنْ اَعْمٰلِہُمْ بعض علماء فرماتے ہیں الضمیر مجرمین کے لئے ہے اور الشفاعۃ فعل مجہول کا مصدر ہے۔ اس صورت میں استثناء منقطع ہوگا۔ مطلب یہ ہوگا کہ مجرموں کے حق میں شفاعت قبول نہ ہوگی اور مومنین کے حق میں شفاعت قبول ہوگی۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۗ

”اور کفار کہتے ہیں بنایا ہے رحمن نے (فلاں کو اپنا) بیٹا۔“

۱۔ یہود نصاریٰ اور بعض عرب کہتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں قالوا کی ضمیر کا مرجع مذکور نہیں ہے لیکن (یہود نصاریٰ) کی طرف بغیر مرجع کی ضمیر لوٹانا جائز ہے کیونکہ ان سے یہ قول مشہور تھا گویا وہ معلوم اور معہود ہیں۔

حزہ اور کسائی نے اس صورت میں ہر مقام پر اور سورہ زخرف اور سورہ نوح میں وَلَدٌ كُوُوٰءٌ کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ پڑھا

ہے۔ ابن کثیر ابو عمرو اور یعقوب نے سورۃ نوح میں ان کی موافقت کی ہے، جبکہ باقی قراء نے دونوں کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔

لَقَدْ جِئْتُمْ سَيِّئًا اِذَا لَٰ

” (اے کافر!) یقیناً تم نے ایسی بات کی ہے جو سخت معیوب ہے۔ ل۔“

ل۔ جنم کے مخالفین یہ جموت دیکھتے دانتے ہیں جو اللہ کی اولاد بناتے ہیں۔ اس آیت میں ان کے قول کی برائی بیان کرنے کے لئے غیب سے خطاب کی طرف التفات کیا گیا ہے۔ ابن عباس نے ادا کا معنی منکر اور مجاہد نے مفہم لہی الانکار کیا ہے یعنی سخت معیوب اور قبیح چیز۔ عرب کہتے ہیں وادنی الامر وادنی۔ یعنی اس کام نے مجھ پر بوجھ ڈال دیا اور وہ کام مجھ پر بہت بھاری ہو گیا۔ امام ربیعوی فرماتے ہیں ادا کلام عرب میں بہت بڑی معیبت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے (۱)۔

تَكَادُ السَّمَوَاتُ يَسْقُطْنَ مِنْهُ وَتَنْشِقُ الْأَرْضُ وَتَحْرُ الْجِبَالُ هَذَا لَٰ

” قریب ہے آسمان ٹپک جائیں اس (خرفات) سے اور زمین پھٹ جائے اور پہاڑ گر پڑیں لرزتے ہوئے۔ ل۔“

ل۔ نافع اور کسائی نے یہاں اور سورۃ حم صسق میں تکاد کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ فعل مقدم ہے اور فاعل منون غیر حقیقی ہے جبکہ باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ فاعل منون ہے۔ یسقطون کو نافع ابن کثیر، مفضل کسائی اور ابو جعفر نے یاء اور تاء اور طاء مشدودہ کے ساتھ باب تفعیل سے پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے باب انفعال سے تاء کی جگہ نون اور طاء مکسورہ خلف کے ساتھ پڑھا ہے۔ انفعال کا معنی بھی پھنسا ہے لیکن باب تفعیل سے پڑھنا زیادہ بلیغ ہے کیونکہ یہ تفعیل کا مطاوع ہے (جس میں کثرت کا معنی پایا جاتا ہے)، بخلاف باب انفعال کے کہ وہ فعل مجرد کا مطاوع ہے اور دوسری وجہ بات تفعیل کے بلیغ ہونے کی یہ ہے کہ اس میں تکلیف کا خاصہ ہے۔ قاموس میں ھد کا معنی الھدیم المشدودہ والمکسورہ لکھا ہے، یعنی سختی سے گنا اور نون جانا (2)۔ بعض علماء نے یسقطون السمنوات کا معنی یسقطن علیہم (یعنی ان پر دھرتے ہیں) لکھا ہے اور تنشق الارض کا معنی تخسف بہم (یعنی زمین ان کے ساتھ دھستی ہے) لکھا ہے۔ و تحر الجبال کا معنی تنطبق علیہم (یعنی وہ پہاڑ ان پر مل جائیں) کیا ہے۔

اَنْ دَعُوْا الْمَرْحَمِيْنَ وَكَلِمًا

” کیونکہ وہ کہہ رہے ہیں کہ رحمن کا ایک بیٹا ہے۔ ل۔“

ل۔ ولداً میں قرأت کا وہی اختلاف ہے جو بیچھے دو مرتبہ گزر چکا ہے۔ ان موصول حرفی اپنے صلہ کے ساتھ کل مضاف کے حذف کے ساتھ مفعول لہ کی حیثیت سے محل نصب میں ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہوگی کہ مکر اھه ان دعوا یا ظرفیت کی بناء پر محل نصب میں ہوگا اور یسقطون، نشق اور نحو کے متعلق علی سبیل التنازع ہوگا۔ (یعنی ہر ایک فعل تقاضا کرتا ہے کہ یہ میرے متعلق ہو) یا لام کے اضمار کے ساتھ یا مہ کی ضمیر سے بدل ہونے کی وجہ سے محل جزیں ہوگا۔ یا مبتدا مضاف کی خبر ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی الموجب لذلک ان دعوا۔ یا ہذا کا فاعل ہونے کی حیثیت سے محل رفع میں ہے یعنی ہدھا دعاء الولد۔ اور یہ اس سے مشتق ہوگا جس کا معنی سقی (نام رکھنا) ہے اور سقی کے دو مفعول ہوتے ہیں لیکن یہاں ایک مفعول پر اکتفاء کیا گیا ہے

تاکہ جن کو بھی اللہ کا بیٹا کہا جاتا ہے سب کو شامل ہو جائے (جیسے عزیر علیہ السلام، یحییٰ علیہ السلام وغیرہما) یا یہ اس دعا سے مشتق ہے جس کا معنی نسب ہے جو دعا کا مطاوع ہے جو کوئی کسی کی طرف منسوب ہو تو داعی الہی فلان کہتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور کعب فرماتے ہیں جب یہود و نصاریٰ نے کہا کہ اللہ کا بیٹا ہے تو آسمان زمین اور پہاڑ بلکہ ساری مخلوق لرز گئی سوائے جن وانس کے۔ قریب تھا کہ ہر چیز اپنی جگہ سے ہٹ جاتی اور سارا نظام عالم درہم برہم ہو جاتا ان کے اس قول پر ملائکہ کو انتہائی غصہ آیا اور جنم بزرگ اٹھی (1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ یہ کلمہ اتنا ہولناک اور قبیح ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی ذات صفت علم سے متصف نہ ہوتی تو سارے عالم کو نیست و نابود کر دیتی اور جنہوں نے یہ قبیح کلام کی ان پر غصہ کی وجہ سے سارا جہاں گرا دیتا۔

وَمَا يَنْبَغِي لِلْمَرْحُومِ أَنْ يَشْخَذَ وَلَدًا ۝

”اور نہیں جائز رحمن کے لئے کہ وہ بتائے کسی کو (اپنا) فرزند۔ لہ“

لہ انبغیٰ ینبغی مطاوع ہے یعنی کا جس کا معنی طلب کرنا ہے (اور مطاوع کا مطلب ہوتا ہے کہ کسی نے کسی چیز کو طلب کیا اور وہ پائی گئی) مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کا بیٹا ہونے نہیں سکتا اگرچہ وہ بظرف مجال طلب بھی کرے، یعنی یہ اس کی قدرت کے تحت داخل ہی نہیں ہے کیونکہ یہ مجال اور غیر ممکن ہے۔ یا یہ معنی کہ اس کی شان اتنی بلند و بالا ہے کہ یہ بیٹا بنانا اس کے لائق ہی نہیں ہے کیونکہ یہ نقص ہے اور اللہ تعالیٰ تمام نقائص سے پاک ہے اور اس صفت سے بھی منزہ ہے جو اس کی شان کے لائق نہیں ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں شاید رحمانیت کی صفت پر حکم کو مرتب کرنا اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز یا نعمت ہے یا منعم علیہ ہے۔ تو جو نعمت ہے یا منعم علیہ وہ نعمتیں عطا کرنے والے اور چھوٹی بڑی نعمتیں بخشنے والے کی ہم جنس نہیں ہو سکتی ہیں اس کے لئے بیٹا بنانا ممکن ہی نہیں ہے (2)۔

إِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّا اَتٰی الرَّحْمٰنَ عِبْدًا ۝

”کوئی ایسی چیز نہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہے مگر وہ حاضر ہوگی رحمن کی بارگاہ میں بندہ بن کر۔“

لہ منن مکرہ ہے جس کی صفت طرف ہے۔ کلی مبتدا ہے اور مستثنیٰ مفرغ اس کی خبر ہے یعنی کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے مگر وہ اس کی مملوک اور مخلوق ہے، اس کی عبادت اور انقیاد کے ساتھ اس کی بارگاہ میں پناہ لیتی ہے اور قیامت کے روز عاجزی کرتے ہوئے آئینگی عودیت مجازی بھی بیٹا ہونے کے معناتی ہے، اس وجہ سے جو اپنے بیٹے کا مالک ہوتا ہے تو وہ بیٹا آزاد ہو جاتا ہے پھر عودیت حقیقیہ جو مخلوق کے مساوی ہے وہ بیٹے کے معناتی کیسے نہ ہوگی۔ (یعنی بیٹا ہونا اور عید ہونا دونوں ایک ذات میں جمع نہیں ہو سکتے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ساری مخلوق اس کی عید ہے تو ثابت ہو گیا کہ وہ اس کا بیٹا نہیں ہے) کل کے معنی کی مناسبت سے آتی اور عید جمع ہونے چاہئے تھے لیکن لفظ کل کا اعتبار کرتے ہوئے انہیں مفرد ذکر کیا گیا ہے۔

لَقَدْ اَخْطَاكُمْ وَعَدَّكُمْ عَدًّا ۝

”اللہ تعالیٰ نے ان سب کا شمار کر رکھا ہے اور انہیں گن لیا ہے اچھی طرح لہ“

لہ یعنی وہ سب اس کے شمارے میں ہیں، اس نے ان کا احاطہ کر رکھا ہے، اس کی قدرت کاملہ اور علم کامل سے کوئی بھی خارج نہیں ہے۔ اس نے ان کی ذوات نفوس اعمال احوال اور رزق کو شمار کر رکھا ہے کیونکہ ہر چیز کا اس کے پاس اندازہ ہے۔ کل یعنی گننا، عد یعنی گنا۔

وَكَلَّمَهُمْ آيَاتِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ قُرْآنًا ﴿٥١﴾

”اور وہ سب پیش ہوں گے اس کے سامنے قیامت کے دن تھا۔“

یعنی قیامت کے روز ان کے ساتھ دنیا کی کوئی چیز بھی نہ ہوگی، دنیا کے انھوں نے انصار سے جدا اللہ کی بارگاہ میں پیش ہوں گے۔ ابن جریر نے عبد الرحمن بن عوف سے روایت کیا ہے کہ جب عبد الرحمن بن عوف نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی تو مکہ کے دوستوں شیبہ بن ربیعہ، عقبہ بن ربیعہ اور امیہ بن خلف کی یا مجوس کرنے لگے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل ارشاد نازل فرمایا (1)۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَنُ وُدًّا ﴿٥١﴾

”بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے پیدا فرما دے گا خدائے مہربان ان کے لئے (دلوں میں)

محبت۔“

یعنی مومنین کے دلوں میں محبت پیدا فرمائے گا یا ان کے لئے ایسے محبت پیدا فرمائے گا جو ان سے محبت کریں گے۔ قاموس میں ہے کہ وُد کی واؤ پر تینوں حرکتیں پڑ سکتی ہیں اور ودا کا معنی محبت بھی ہے۔ بہت زیادہ محبت کرنے والا (2)۔ اس آیت کریمہ میں عبد الرحمن بن عوف کے لئے تسلی اور اطمینان ہے اور ان کے ساتھ وعدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے لئے کافروں کے بدلے میں مومنین محبت کرنے والے پیدا فرمائے گا۔

طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق نازل ہوئی۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان کی محبت کافروں کے علاوہ مومنین کے دلوں میں (3) اور ساری کائنات میں پیدا فرما دے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: كُنْتُ مَوْلَاةَ فُلَيْحَةَ مَوْلَاةَ (4)۔ میں جس کا مولا ہوں علی اس کا مولیٰ (دوست مددگار) ہے۔ اس حدیث کو امام احمد نے براہِ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے، امام احمد نے بریدہ سے، ترمذی اور نسائی نے زید بن ارقم سے روایت کیا ہے۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے علی کا ذکر عبادت ہے (3) کو علی عبادت) اس ارشاد کو صاحب سند القروں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے اور ایک روایت میں حب علی عبادت آیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: إِذَا أَحَبَّ اللَّهُ الْعَبْدَ قَالَ لِجِبْرِئِيلَ قَدْ أَحْبَبْتُ فُلَانًا فَاجِبُهُ فَيَجِبُهُ جِبْرِئِيلُ ثُمَّ يَنْدِي فَيَقُولُ أَهْلِي السَّمَاءُ إِنَّ اللَّهَ قَدْ أَحَبَّ فُلَانًا فَاجِبُوهُ فَيَجِبُوهُ أَهْلُ السَّمَاءِ ثُمَّ وَضِعَ لَهُ لَقَبُؤَلُ فِي الْأَرْضِ (5)۔ ترجمہ: جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے سے محبت کرنے لگتا ہے تو جبرئیل کو فرماتا ہے کہ میں فلاں شخص سے محبت کرتا ہوں تو تم بھی اس سے محبت کرو تو جبرئیل بھی اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ پھر آسمان والوں میں یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فلاں بندے سے محبت کرتا ہے۔ تم بھی اس سے محبت کرو پس تمام آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد زمین میں اس کی محبت ڈال دی جاتی ہے (یعنی زمین کی مخلوق بھی اس سے محبت کرتی ہے)

اس حدیث کو امام بخاری اور مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ میں کہتا ہوں اس آیت کریمہ کی یہ تاویل

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 511-12 (احمدیہ) 2۔ التاموس الحکیم، جلد 1، صفحہ 468 (الترات الاسلامیہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 512 (احمدیہ) 4۔ مجمع الزوائد: 14613 (المکر)
5۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 331 (ترمذی)

بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنی ذات کا محبت بنا دیتا ہے کیونکہ حدیث قدسی ہے لَا يُزَالُ عَبْدِي يُنْظَرُ إِلَيَّ بِاللَّوَابِلِ حَتَّىٰ أُخْبِتَهُ۔ بندہ لوائل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔

فَاَلْمَا يَسْرُؤُهُ بِلِسَانِكَ يَتَسَبَّرُ بِهِ السَّقَاتِينَ وَتَنْزِيلِهِ قَوْلًا مَّالِدًا ⑤

”صرف اس لئے ہم نے آسان کر دیا ہے قرآن کو آپ کی زبان میں اتار کر تاکہ آپ مزید سنا لیں اس سے پرہیزگاروں کو اور ذرا لیں اس کے ذریعے اس قوم کو جو بوی جھگڑا لو ہے۔“

۱۔ ہلسانک میں باہم معنی ملی ہے یا باء اپنے ہی اصل معنی میں ہے اور یسرناہ کو باء کے صلہ کے ساتھ متعری فرمایا کیونکہ اس کے ضمن میں انزالناہ کا معنی ہے۔ یعنی ہم نے اس قرآن کو آپ کی لغت پر اتارا۔ اس معنی کے اعتبار سے ہلسانک حال ہوگا۔ میں کہتا ہوں یہ کہنا بھی ممکن ہے۔ یسرناہ علیٰ امتک متلبسناہ بلغتک۔ یعنی ہم نے اس قرآن کو آپ کی لغت میں اتار کر آپ کی امت پر آسان کر دیا۔ یسرناہ کی ضمیر منصوب اور منفرد بہ میں مجرد ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔ قوماً لدآخت جھگڑا الو قوم جو حق کے واضح ہونے کے باوجود تعصب عناد اور خصومت کی بناء پر آگ کو اختیار کرتے ہیں۔ حضرت حسن نے لدا کا معنی حق سے بہرہ کیا ہے۔ مجاہد نے اس کا معنی یہ فرمایا ہے۔ الظالم الذى لا يستقيم، یعنی ایسا ظالم جو کبھی سیدھا نہ ہوتا ہو اور راہ راست پر نہ آتا ہو۔ ابو عبیدہ فرماتے ہیں جو حق کو قبول نہ کرتا ہو اور باطل کا مدعی ہو (۱)۔ اور یہاں صبر اشرافی ہے۔ یعنی ہم نے قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ ان کے ایمان لانے کی وجہ سے قتل و اضطراب میں مبتلا رہیں اور اپنے نفس کو مشقت میں ڈالنے رہیں ہم نے تو اس لئے نازل کیا ہے کہ آپ شرک سے بچنے والوں کو نیا دُخرت کی کامیابی کی بشارت دیں اور مجرموں اور منکروں کو خوف ناک انجام سے ڈرائیں۔

وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَدَرٍ ۗ هَلْ نَجِسُ مِنْهُمْ مِنْ أَحَدٍ أَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ جَوَارِحَ ⑥

”اور کتنی قومیں تھیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا ان سے پہلے کیا محسوس کرتے جو ان میں سے کسی کو یا سنتے جو ان کی کوئی آہٹ نہ۔“

۱۔ اس ارشاد میں کفار قریش کو ذرا نا اور نبی کریم ﷺ کو ان کو ڈرانے پر جرأت دلا تا ہے۔ فرمایا ان زشتہ قوموں میں سے کسی فرد کا جو اس غمہ میں سے کسی حاسد کے ذریعے کچھ پتہ محسوس کرتے ہو۔ بعض نے تحس کا معنی تروی (دیکھنا) بعض نے تعجد (پایا) اور بعض نے تشعر (محسوس کرنا) کیا ہے۔ الو کونھنی آواز کو کہتے ہیں۔ رکز کی ترکیب نغناء کے معنی کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ مثلاً رکن الو مع بولتے ہیں جب نیزہ کی ایک طرف زمین میں چھپ جائے۔ رکاز ذفن شدہ مال کو کہتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

اس سورہ پاک کی تفسیر بروز سوموار 5 صفر 1203ھ میں مکمل ہوئی۔ الحمد للہ رب العالمین والصلوة والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین سورہ مریم کا ترجمہ بروز سوموار 21 ربیع الثانی 1421ھ بمطابق 24 جولائی 2000ء بوقت پانچ بجے شام مکمل ہوا۔ اسے مالک الملک میری اس سنی تمام کو قبول فرما اور آخرت میں بغیر حساب اور مناقشہ کے سرخرو کی کا باعث بنا اور تادم آخر اپنے کلام مقدس اور سنت نبوی ﷺ کی خدمت میں مشغول فرما۔ آمین ثم آمین بجاہ سید المرسلین امام المتقین اختتام النبیین محمد المصطفى ﷺ۔ الحمد للہ رب العالمین۔

سورۃ طہ

﴿انہا ۱۳۵﴾ ﴿سُوْرَةُ طٰهٍ مَكِّيَّةٌ ۲۰﴾ ﴿مَرْكُوعًا ۸﴾

سورہ طہ مکہ ہے اس میں 8 رکوع اور 135 آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

آغاز ترجمہ سورہ طہ 22 ربیع الثانی 1421 بمطابق 25 جولائی 2000 بروز منگل۔

طہ

ابوبکرؓ حمزہ اور کسائی نے طہ اور حاء کے فتح کے امالہ کے ساتھ، ورش اور ابو عمر نے صرف ہا کے امالہ کے ساتھ اور باقی آراء نے دونوں کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں (طہا، حھا) حروف کے اسماء ہیں۔ ان پر تفسیر علیؓ مفسکو سورہ بقرہ کی ابتداء میں گذر چکی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ اللہ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ اور یہ قسم ہے جیسے حضور کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔ حم لا ینصرون (۱)۔

ابوداؤد ترمذی نسائی اور حاکم نے براہ بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خندق کی رات فرمایا حم لا ینصرون (حم بخند کا مہر بھی کامیاب نہ ہو گے) مقابلہ بن حنان فرماتے ہیں طہ کا معنی یہ ہے کہ اپنے دونوں قدموں کو زمین پر رکھو۔ آپ ﷺ نماز تہجد ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر ادا فرماتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس تکلیف میں مبتلا نہ ہونے کا ارشاد فرمایا (2)۔ براہ اور ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ پر نیتاً ہما اَلْمُرْتَبِلُ قَمِ اَنْبِلُ اَزْدًا قَبِيْلَةً کا ارشاد نازل ہوا تو آپ ساری رات قیام فرماتے تھی کہ آپ کے پاؤں مبارک سوج جاتے، آپ تھکاوٹ کی وجہ سے ایک پاؤں اٹھالیتے اور ایک پاؤں پر کھڑے ہوتے۔ جبرئیل نازل ہوئے اور کہا طہ علی الارض بقدمیک یا محمد اے پیارے محمد ﷺ اپنے دونوں پاؤں زمین پر رکھیں (3)۔ اس طرح بھی پڑھا گیا ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے اس کی اصل طہ ہو گئی اور یہ وطاء یطأ سے مشتق ہوگا۔ حمزہ حاء سے بدل گیا ہے اور یطأ میں حمزہ الف سے بدل گیا ہے پھر امر کا صیغہ بنایا گیا تو اس کے ساتھ حالسکت ملانی گئی۔ یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ الف حمزہ کا بدل ہو اور عا ضمیر ہو جس کا مرجع الارض ہو لیکن حرف کی صورت میں اس کا لکھا ہونا اس کی تائید نہیں کرتا۔ عجاہذ عطاء اور شحاک نے اس کا معنی یا جمل (اے شخص) کیا ہے اور قہادہ فرماتے ہیں یہ سریانی زبان میں یار جمل کے معنی میں ہے، کلبی کہتے ہیں قبیلہ عک کی لغت میں اس کا معنی یا انسان ہے (4)۔ اس معنی کے اعتبار سے خطاب نبی کریم ﷺ کو ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ طہ کو نبی کریم ﷺ کے اسماء میں شمار کیا گیا ہے کیونکہ یہ آپ کی ذات کی طرف

2- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 213 (اتحادیہ)

1- مشکوٰۃ الصالح، صفحہ 343 (قدیمی)

4- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 213 (اتحادیہ)

3- الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 516 (العلینیہ)

اشارہ ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں کبھی نہ لکھا ہے کہ جب مکہ میں رسول اللہ ﷺ پر وحی نازل ہوئی کہ آپ عبادت میں انتہائی کوشش فرمائیں تو آپ ﷺ قیام کے طویل ہونے کی وجہ سے کبھی ایک قدم پر کھڑے ہوتے اور کبھی دوسرے پر اور آپ ساری رات قیام میں گزار دیتے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور تھوڑی مشقت کرنے کا حکم فرمایا (1)۔

مَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَىٰ

”نہیں اتارا ہم نے آپ پر یہ قرآن کہ آپ مشقت میں پڑیں۔“

1۔ قاموس میں الشقاۃ کا معنی شدت اور تنگی لکھا ہے (2)۔ جوہری کہتے ہیں شقاۃ (بدبختی) سعادت کی ضد ہے جس طرح شقاۃ کی دو صورتیں ہیں دنیوی اور اخروی اسی طرح سعادت کی بھی دو صورتیں ہیں پھر سعادت دنیوی کی تین صورتیں ہیں۔ نفسیہ بدنیہ اور خارجیہ۔ اسی طرح شقاوت کی بھی یہ تین صورتیں بنی ہیں۔ اس آیت کریمہ میں شقاوت دنیوی بدنیہ مراد ہے یعنی تھکاوٹ۔ بعض علماء فرماتے ہیں الشقاۃ کا لفظ التوب (تھکاوٹ) کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً اَنْصَفِي مِنْ زَابِضِ الْمُهْمِرِ (یعنی گھوڑے کے سچے کسواری کے لئے تیار کرنے والے شخص سے بھی وہ زیادہ تھکا ہوا ہے) اسی طرح عرب کہتے ہیں۔ سَبَلْنَا الْقَوْمَ اَشْقَاهُمْ قوم کا سردار قوم سے زیادہ مشقت کرنے والا ہوتا ہے۔ کلام کو اس اسلوب میں بدل کر بیان کرنے میں یہ حکمت ہے کہ مراد کے خلاف مفہوم نہ سمجھا جائے اگر تعب استعمال ہوتا تو مراد کے خلاف کا وہم ہوتا اور مراد یہ ہے کہ ہم نے قرآن اس لئے اتارا ہے کہ آپ سعادت دارین حاصل کریں (3)۔ (اس لئے نہیں کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں) ابن مردودہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ پر وحی کا آغاز ہوا تو آپ ﷺ جب نازل اور فرماتے وقت قدموں کے اگلے حصہ پر ہمارا لے کر کھڑے ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کی یہ مشقت دیکھ کر ارشاد فرمایا۔ طَلَحَ مَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَىٰ (4) عبد بن حمید نے روایت ابن انس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب نماز اور فرماتے تو ایک پاؤں پر کھڑے ہوتے اور دوسرا پاؤں اٹھالیتے تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد طَلَحَ مَا أَنْزَلْنَا لِحْ نازل فرمایا (5)۔

بعض علماء فرماتے ہیں یہ آیت کفار کی (بد زبانی) کا رد ہے۔ انہوں نے جب آپ ﷺ کی عبادت میں اجتہاد اور کوشش دیکھی تو کہنے لگے کہ یہ قرآن آپ پر اس لئے نازل ہوا ہے تاکہ آپ تکلیف میں مبتلا ہوں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کفار نے ساری کائنات سے زیادہ سعادت مند اور اور جہنم کی طرف شقاوت کی نسبت کی ہو، اس وجہ سے کہ انہوں نے اپنے آباء و اجداد کا دین چھوڑ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے قول کا رد فرمایا اور اس پر گنہ گارہ ذات کی سعادت کو بیان فرمایا کہ اس پر تو قرآن نازل ہوا ہے اور وہ تو صفات کمالیہ سے متصف ہے واللہ اعلم۔ اسی مفہوم پر ابن مردودہ نے جو خوبی کے طریق سے ابن عباس سے روایت نقل کی ہے وہ بھی دلالت کرتی ہے۔ کفار نے کہا کہ یہ شخص (خاک بدین اشقیاء) بد بخت ہو گیا ہے تو اس وقت یہ ارشاد نازل ہوا مَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَىٰ اور یہ معنی بھی ہو سکتا ہے ہم نے قرآن اس لئے تو نازل نہیں کیا کہ اگر آپ کی قوم واضح اور روشن آیات کو سن کر ایمان نہ لائیں تو آپ ان کے غم میں بہتر قرار دے سچین نہ ہیں، یہ قرآن تو نصیحت ہے۔ اور آپ پر صرف اس کی تبلیغ لازم ہے اور بس اگر طہ کو سورت یا قرآن کی تاویل میں کر کے مبتدأ بنایا جائے تو ما انزلنا کا جملہ خبر ہوگا اور اسی جملہ میں لفظ

1 تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 213 (اتھارہ)

2۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1705 (اترات العربی)

3۔ تفسیر بیضاوی مع شامیہ شرح زادہ، جلد 5، صفحہ 595 (اعلیہ)

4۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 516 (اعلیہ)

5۔ ایضاً

القرآن ضمیر عائد کے قائم مقام ہوگا اور اگر ط کو قسم بنایا جائے تو یہ جواب قسم ہوگا۔ اور اگر ط کو منادى (یعنی یا رجل یا رجل) بنایا جائے تو یہ جملہ اس منادى لہ ہوگا۔ اگر اسے جملہ فعلیہ یا مبتدا کے احوال کے ساتھ جملہ اسمیہ بنایا جائے تو جملہ مستأنف ہوگا۔

إِلَّا تَذَكَّرُكَ لَأَيَّمَنَ يَخْشَى ۝

”بلکہ یہ نصیحت ہے۔ اے اس کے واسطے جو (اپنے رب سے) ڈرتا ہے۔“

۱۔ یہ مستثنیٰ منقطع ہے اور لخشعی کے فعل سے اسے بدل بنانا جائز نہیں ہے کیونکہ (حقاوت اور نصیحت) کی جنسیں مختلف ہیں (ایک جنس نہ دوسری کا عین ہے نہ بعض ہے اور نہ ایک دوسری پر مشتمل ہے اس لئے بدل بننے کی کوئی صورت بھی نہیں) اور نہ یہ انزلنا کا مفعول لہ ہے کیونکہ ایک فعل دو عملوں کی طرف متعدي نہیں ہوتا۔ اور یہ ہو سکتا ہے کہ مستثنیٰ مفرغ ہو اور فعل مخذوف کی علت کی بنا پر منصوب ہو۔ تقدیر عبارت اس طرح ہو ما انزلناہ الا تذکرۃ۔ بعض علماء فرماتے ہیں تذکرہ مصدر ہے اور ک ضمیر سے یا القرآن سے حال ہے۔ یا یہ انزلنا کا مفعول لہ ہے اس بنا پر کہ لخشعی اس مخذوف کے متعلق ہے جو القرآن کی صفت ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی ما انزلنا علیک القرآن المنزل لتعجب بتبلیغہ لغرض الا تذکرۃ۔

۲۔ لمن یخشى سے مراد وہ شخص ہے جس کے دل میں خشیت الہی اور نرمی ہے ڈرانے کے ساتھ نرم ہو جاتا ہے یا وہ شخص مراد ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ ڈرانے کے ساتھ ڈر جائے گا۔ کیونکہ خوف رکھنے والا ہی اس قرآن سے نفع حاصل کرتا ہے۔

تَنْزِيلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْأَرْضَ وَالسَّمَوَاتِ الْعُلَى ۝

”یا تا ارا گیا ہے اس ذات کی طرف سے جس نے پیدا فرمایا زمین کو اور بلند آسمانوں کو۔“

۱۔ تنزیلاً اپنے فعل کے احوال کے ساتھ یخشى کی وجہ سے یا بطور مدح یا تذکرۃ سے بدل ہونے کی بنا پر منصوب ہے بشرطیکہ تذکرہ کو حال بنایا جائے لفظ یا معنی مفعول لہ نہ بنایا جائے کیونکہ ایک چیز اپنی ہی ذات یا اپنی نوع کے لئے علت نہیں بن سکتی۔ ممن خلق الخ تنزیلاً کے متعلق ہے یا اس کی صفت ہے اس میں تفتش کلام کے لئے متکلم سے غیب کی طرف التفات کیا ہے اور دو وجہ سے منزل کی عظمت شان بیان کی گئی ہے۔ اس کے انزال کی نسبت اس ذات کی طرف ہے جس کی شان بلند و بالا ہے اور اس کی نسبت اس ذات کی طرف کی گئی جو صفات کمالیہ اور افعال عظیمہ کے لئے مختص ہے۔ پھر بالترتیب اس ذات بے ہمتا کے افعال اور صفات کا ذکر فرمایا جا رہا ہے اور ترتیب و احتیاطاً فرمائی ہے جو عقل کے زیادہ قریب ہے، پہلے زمین و آسمان کی تخلیق کا تذکرہ کیا جو عالم کی اصل ہیں۔ زمین کا ذکر پہلے فرمایا کیونکہ یہ جس کے زیادہ قریب ہے اور بلند و بالا آسمانوں سے زیادہ اس میں قدرت کی نشانیاں عیاں ہیں۔ العلیٰ جمع ہے علیٰ کی جو اعلیٰ کی موصت ہے۔

الَّذِينَ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى ۝ لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرَى ۝

”وہ ہے حد مہربان (کائنات کی فرمانروائی کے) تخت پر متمکن ہوا۔ اسی کے ملک میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور

جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اور جو کچھ گہلی مٹی کے نیچے ہے۔“

۱۔ اس کی تفسیر سورہ یونس میں گزر چکی ہے۔

عَلَىٰ لَدُنَّ عَالِي السَّمَوَاتِ سے مراد ملائکہ ستارے وغیرہ ہیں اور وہاں فی الارض سے مراد پہاڑ، انہماز، معادن، اشجار، حیوانات، جن و انس، شیطان اور ملائکہ وغیرہ ہیں۔ اور ماہینہما سے مراد ہوا، بادل، گرج، چمک وغیرہ ہیں اور اتر کی سے مراد گیلی ٹی ہے حدیث شریف میں ہے کہ کتا پیاس کی وجہ سے گیلی ٹی کھاتا ہے، عرب ثری الثراب بولتے ہیں جب مٹی پر پانی چھڑکا جائے امام بخاری نے لکھا ہے کہ خاک فرماتے ہیں وما تحت الثری سے مراد وہ ہے جو گیلی ٹی کے نیچے ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں زمینیں چھلی کی چینیہ پر ہیں اور چھلی سمندر پر ہے اور چھلی کا سر اور دم عرش کے نیچے ملے ہوئے ہیں اور سمندر ایک ہبز چٹان پر ہے اور آسمان کی ہبزی اس کی چٹان کی وجہ سے ہے۔ اور یہ وہ چٹان ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے لقمان کے قصہ میں بیان فرمایا ہے۔ (تفکیر فی سحرة) اور وہ چٹان تیل کے سینک پر ہے اور تیل گیلی ٹی پر ہے اور اس کے نیچے جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور وہ تیل اپنا منہ کھولے ہوئے ہے۔ جب اللہ تعالیٰ سب سمندروں کو ایک سمندر بنا دے گا تو وہ بہہ کر اس تیل کے پیٹ میں چلے جائیں گے اور وہاں خشک ہو جائیں گے (1)۔ (الرحمن مبتدا ہے اور ما بعد اس کی خبر ہے یا مدح کی بناء پر) خروج ہے اور ما بعد مبتدا مخدوف کی خبر ہے یا الرحمن مبتدا مخدوف ہو کی خبر ہے اور علی العرش استوی کا جملہ اور ماہ فی السموات الخ کا جملہ دونوں بغیر حرف عطف کے یکے بعد دیگرے خبریں ہیں۔ جیسے زید عالم عاقل میں عالم اور عاقل خبریں ہیں اور الرحمن اپنی اخبار سے لے کر جو جملہ بنا ہے یا تو یہ جملہ مستانہ ہے اور جو مسائل کا جواب ہے جو کہتا ہے کہ ہمارے سامنے اس قرآن نازل کرنے والے کی صفت بیان کرو۔ یا یہ جملہ کے جملہ کے مضمون کی تاکید ہے۔

وَ اِنْ تَنْهَضْهُ بِالْقَوْلِ فَلَا تَعْلَمُ السِّرَّ وَ اَخْفٰی ۝

”اور اگر تو بلند آواز سے بات کرے (تو تیری مرضی) وہ تو بلاشبہ جانتا ہے رازوں کو بھی اور دل کے عہدوں کو بھی لے۔“

۱۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اگر تم اللہ کا ذکر بلند آواز سے کرو اور اسے جبری جہ میں پکارو (تمہاری اپنی مرضی) (جان لو وہ تمہارے جہ سے مستغنی ہے کیونکہ وہ تو پوشیدہ اور پردے میں کبھی ہوئی بات کو بھی جانتا ہے اور جو بھی دل میں تصور اور خیال ہے اسے بھی جانتا ہے (2)۔ میرے نزدیک اس کا یہ مفہوم ہے کہ تم اللہ کا ذکر بلند آواز سے کرو یا آہستہ کرو اللہ تعالیٰ اسے جان لے گا اور اس کا اجر و ثواب دے گا۔ کیونکہ تو ہر امر کی باتوں اور دل کے تصورات کو بھی جانتا ہے چہ جائیکہ جبری آواز میں ذکر ہو۔ بسباق کلام کی وجہ سے اور تخافت حذف کیا گیا ہے جیسا کہ اس ارشاد میں البود مخدوف ہے۔ ستر ایہیٰ شوقکم الفخر۔ امام بخاری فرماتے ہیں حسن فرماتے ہیں السورہ راز کی بات جو کسی غیر کے سامنے بیان کی گئی ہو اور اخفی جو ابھی نہاں خانہ دل میں انگریزیاں لے رہی ہو ابھی اس کا اظہار زبان سے نہ ہوا ہوا بن عباس اور سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ سورہ بات ہے جو ابھی دل میں ہی ہے اور انھی وہ بات جو بعد میں اللہ تعالیٰ تیرے دل میں ڈالے گا اور تو ابھی تک خود اسے نہیں جانتا کرایا بھی ہوگا۔ کیونکہ تو فقط آج کی بات اور خیال کو جانتا ہے، کل جو تیرے دل میں آئے گا اس کی آج تجھے خبر نہیں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات جو تو آج دل میں آرزو میں اور انگلیں لیے بیٹھا ہے وہ انہیں بھی جانتا ہے اور جو تو کل سوچے گا اور خیال کرے گا وہ اسے بھی جانتا ہے۔ حضرت علی بن طلحہ، ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں السورہ بات جو ابھی ابن آدم کے دل میں ہوتی ہے اور اخفی وہ عمل جو ابھی تک کیا نہیں، بعد میں کرے گا۔ مجاہد فرماتے ہیں السورہ عمل ہے جو تم لوگوں سے پوشیدہ کرتے ہو اور انھی دل کا دوسرہ ہے۔ بعض فرماتے ہیں السورہ سے مراد عزیمت ہے، یعنی کسی کام کا پختہ

ارادہ کرنا۔ اور اخفی وہ بات جو دل میں کھلک تو رہی ہے لیکن اس پر عزم نہیں ہے۔ زید بن اسلم فرماتے ہیں وہ ذات جو ہمہ میں اور ہمہ دان ہے اپنے بندوں کے سرواٹھی کو جانتی ہے دوسرا کوئی نہیں جانتا (1)۔ صوفیاء رحمہم اللہ فرماتے ہیں سر اور انھی مجرداتِ ثمرہ میں سے ہیں جو عرش کے اوپر کشف کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور انسان کے بدن میں ان کے جلوے منعکس ہوتے ہیں اور وہ مجرداتِ ثمرہ (ایسی پانچ چیزیں جو مادہ سے خالی ہیں) یہ ہیں قلبِ روح، سرخنی، انھی قلب و لایاتِ انسانیہ کی تجلیات کا مہبط ہے اور روح و لایاتِ نوحیہ ابراہیمہ کے انوار کی جلوہ گاہ ہے اور سر و لایاتِ موسویہ کی تجلیات کا مہبط ہے اور انھی و لایاتِ محمدیہ کے انوار کی منزل ہے۔

اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى ①

”اللہ (وہ ہے کہ) کوئی عبادت کے لائق نہیں بغیر اس کے اسکے لئے بڑے خوبصورت نام ہیں۔“

لے اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ مُبْتَدِئُ خَلْقِهَا اور لہ الاسماء الحسنیٰ خبر جانی ہے اور جملہ کبریٰ لہ ما فی السموات بملہ کے مضمون کے لئے ہے۔ کیونکہ جو آسمانوں اور زمینوں کا مالک ہے اس کے لئے الوہیت میں یکتا ہونا اور ان تمام صفاتِ کمالیہ کے ساتھ متعفف ہونا ضروری ہے جن پر اس کے وہ خوبصورت اسماء و لایات کرتے ہیں جن کے ساتھ کسی غیر کو موسوم کرنا جائز ہی نہیں ہے۔ الحسنیٰ مومنٹ ہے الاحسن کی۔ اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء کو باقی تمام اسماء پر حسن و خوبصورتی میں اس لئے فضیلت ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اسماء ایسے معانی پر دلالت کرتے ہیں جو تمام معانی سے بلند اور افضل ہیں۔ ہم نے سورۃ اعراف میں اسماءِ حسیٰ کی بحث تفصیل سے ذیلوَالْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْهُ بِهَا کے تحت ذکر کر دی ہے۔

وَهَلْ أَتٰكَ حَدِيْثُ مُوسٰى ②

”اور (اے صبیحہ!) کیا تجھے ہے آپ کو اطلاع موسیٰ کے قصہ کی؟“

یہ استفہام تقریری ہے۔ یعنی تیرے پاس موسیٰ کی خبر یقیناً پہنچی چکی ہے۔ اور اس جملہ کا عطف سابقہ کلام کے مضمون پر ہے۔ یعنی اِنَّا نَذْكُرُكَ کے مضمون پر عطف ہے کیونکہ اس کا مفہوم یہ ہے ”لیکن ہم نے اسے بطور نصیحت اتارا ہے“۔ یاد رہے کہ اس کا عطف تنزیلاً کے مضمون پر ہے۔ یعنی تیرے پاس قرآن آیا، آپ کو عبادت کی تھکاؤٹ پہنچی، آپ نے سعادت کی سب منزلیں طے کیں اور آپ کے پاس موسیٰ کلیم کی خبر بھی پہنچی ہے جس میں ان کی منتقوت اور منازل عالیہ کا تذکرہ بھی ہے۔ آپ ﷺ کی نبوت کی تمہید کے بعد اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کا ذکر فرمایا تاکہ نبوت کے بارگراں کو اٹھانے پیغامِ ربانی کی مشکلات اور تکالیف پر صبر کرنے میں موسیٰ علیہ السلام کی اقتدار کریں۔ یہ سورت ان سورتوں میں سے ہے جو آواز نبوت میں نازل ہوئی تھیں۔

اِذْ رَاْنَا نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِيْهِ امْكُثُوْا اِنِّيْۤ اَنْتُمْ لَعَلِّيْۤ اَتِيْكُمْ مِنْهَا

بِقَمِيْسٍ اَوْ اَجْدُ عَلَيَّ النَّارِ هُدًى ③

”جب (مدین سے واپسی پر تاریک رات میں) آپ نے آگ دیکھی تو اپنے گھر والوں کو کہا تم (ذرا یہاں) ٹھہرو۔

میں نے آگ دیکھی ہے شاید میں لے آؤں تمہارے لئے اس سے کوئی چنگاری، یا مجھ مل جائے آگ کے پاس کوئی

راہ دکھانے والا ہے۔“

۱۔ اذ طرف سے حدیث موسیٰ کی، یعنی کیا تمہارے پاس موسیٰ علیہ السلام کی خبر پہنچی جب انہوں نے آگ کو دیکھا تھا۔ یا افضل مضمردی کی طرف ہے۔ یا اذ کھو مقدر کا مفعول فیہ ہے۔ امام بنو فرماتے ہیں موسیٰ علیہ السلام نے حضرت شعیب علیہ السلام سے اپنی والدہ اور ہمشیرہ کی زیارت کے لئے مصر واپس آنے کی اجازت مانگی تو انہوں نے اجازت دے دی۔ موسیٰ علیہ السلام اپنے اہل اور مال کو لے کر چل پڑے۔ سردیوں کا موسم تھا۔ آپ نے ظالم بادشاہوں کے خوف سے راستہ بھی غیر معروف اختیار فرمایا۔ آپ کی بیوی امید سے تھیں، معلوم نہیں دن میں بچہ کی پیدائش ہو جائے یا رات کو۔ آپ کسی راہنما کے بغیر صحرا میں چل پڑے۔ آپ کو مجبوراً تار یکب شمشدی اور برقی رات میں طوری مغربی جانب چلنا پڑا۔ راستہ میں بیوی کو درد زہ شروع ہو گیا آپ نے چنچاق گور گزائیکین وہ نہ چلی۔ کہا جاتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام بڑے غیرت مند شخص تھے۔ رات کے وقت اپنے رفقاء سفر کے ساتھ چلتے تھے اور دن کے وقت دوستوں سے علیحدہ ہو جاتے تھے تاکہ ان کی بیوی پر کسی کی نظر نہ پڑے۔ پس آپ چلتے ہوئے راستہ بھول گئے، رات بڑی اندھیری اور سرد تھی۔ انہوں نے چنچاق جالیگان لیکن وہ نہ جلا، آپ کو اس وقت طوری بائیں جانب دور آگ دکھائی دی (۱)۔ آپ نے اپنے گھروالوں سے کہا تم ٹھہرو۔ آپ کا یہ خطاب بیوی اور دوسرے ہمراہیوں سے ہے۔ بعض فرماتے ہیں یہ خطاب آپ کا اپنی بیوی کو تھا لیکن چونکہ وہ حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی تھیں اس لئے تعظیم کے لئے مع کا صیغہ استعمال فرمایا۔ حمزہ نے یہاں اور سورہ قصص میں لاهلہ کی ضمیر کو وصل کی صورت میں ضمہ کے ساتھ اور باقی قراء نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ انبی کو نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کے کفخہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ النس بمعنی ابصر ہے، یعنی اچھی طرح دیکھنا۔ بعض علماء فرماتے ہیں ایناس کا معنی مانوس چیز کو دیکھنا ہے۔ لغتی کو کوفیوں نے یاء کے سکون کے ساتھ باقی قراء نے یاء کے کفخہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ فس آگ کا شعلہ پڑگاری جسے بڑی آگ سے حاصل کیا جاتا ہے (۲)۔ قاموس میں اسی طرح لکھا ہے۔

۲۔ ہدی سے مراد بادی ہے، یعنی میں کوئی راہنما یا لوں جو صحیح راستہ پر میری راہنمائی کرے یا یہ معنی کہ دین کے ابواب کی طرف میری راہنمائی کرے۔ کیونکہ ابراہیم کو نیکو کار لوگ جس حالت میں بھی ہوں ان کا میلان دین کے ابواب کی طرف ہوتا ہے۔ جب آگ کا لانا اور راہنما کا ملنا متوقع تھا تو ان کو جا اور طبع کے سینہ (علی) کے ساتھ ذکر کیا۔ لیکن آگ کا دیکھنا یعنی تمہاں لئے اسلوب بیان یقین والا ذکر فرمایا۔ اور علمی السار میں استعلاء (غلبہ) کا معنی ہے کیونکہ آگ جلانے والے آگ کے اوپر ہوتے ہیں یا یہ معنی کہ وہ آگ قریبی مکان کے اوپر تھے (ان معانی کی خاطر علی استعمال فرمایا جو غلبہ اور استعلاء کے لئے آتا ہے) جیسا کہ مودت بندیلش باء اس مکان کے قریب سے گزرنے کے معنی میں ہے جو نزدیک کے قریب ہے۔

فَلَمَّا أَتَاهَا ذِي يَوْمٍ ۙ

”پس جب آپ وہاں پہنچے تو ندا کی گئی اے موسیٰ!“

۱۔ لَمَّا اتا ہا نو ذی کی طرف ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام وہاں پہنچے تو ایک سرسبز درخت دیکھا جس کے اوپر نیچے آگ ہی آگ ہے۔ طرف نماشا یہ کہ آگ اپنی جگہ میں روشن اور بڑی اپنی جگہ میں گہری اور شدید تھی۔ درخت کی بڑی آگ کی چمک میں محل نہ تھی اور

ند آگ کی چمک و درخت کی ہیزی میں کوئی تبدیلی کا باعث تھی۔ قنادہ، مقاتل اور کلبی کہتے ہیں وہ درخت موج کا تھا۔ وہب فرماتے ہیں علیق کا تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں مناب کا تھا۔ یہ آخری قول ابن عباس سے مروی ہے۔ اہل تفسیر فرماتے ہیں موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ دیکھا تھا وہ آگ نہیں نور تھا۔ اور تار (آگ) کے لفظ سے اس لئے ذکر فرمایا کیونکہ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کو تار (آگ) ٹھکانا کیا تھا۔ اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ وہ رب تعالیٰ کا نور تھا۔ یہ ابن عباس، عکرمہ وغیرہما کا قول ہے۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں وہ آگ ہی تھی اور آگ ہی اللہ کا حجاب ہے۔ اور اس کی دلیل ابوموسیٰ اشعری کی روایت ہے۔ کہ حضور ﷺ نے فرمایا اللہ کا حجاب تار (آگ) ہے اگر وہ اس حجاب کو اٹھا دے تو اس کے چہرے کی تجلیات حد نظر تک تمام مخلوق کو جلا دے (1)۔ امام بغوی نے یہ حدیث اسی طرح نقل کی ہے کہ صحیح مسلم اور سنن ابن ماجہ میں ناری جگہ نور ہے۔ میں کہتا ہوں نور وہ ہوتا ہے۔ جو آگ کا لطیف حصہ ہوتا ہے جو جلاتا نہیں ہے۔ نور اور آگ دونوں کا مال ایک ہی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ آپ نے خشک گھاس لی اور درخت کے قریب گئے جب وہ قریب ہوئے آگ دور ہو جاتی۔ آپ حیران و ششدر ہو گئے، آپ نے وہاں ملائکہ کی تسبیح سنی اور آپ پر سکینت طاری ہو گئی اور اس وقت آپ کو یہ تلائی تھی۔

إِنِّي أَنَا رَبُّكَ فَاحْتَمِكْ تَعَلِّيكَ ۚ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طَوْسِي ۖ

”بلاشبہ میں تیرا پروردگار ہوں، پس تو اتار دے اپنے جوتے، بے شک تو طوسی کی مقدس وادی میں ہے۔“

۱۔ انہی کو تابع، ابن کثیر اور ابو عمر نے یاء کے فتح کے ساتھ، باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن کثیر ابو عمر اور ابو جعفر نے انہی کے ہمزہ کو فح کے ساتھ پڑھا ہے، جب کہ باقی قراء نے انہی کے افعال یا ندا کو قول کے قائم مقام کرنے کی وجہ سے ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور حکم کی خمیر (ی اننا) کا تکرار تاکید اور تحقیق کے لئے ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت وہب نے فرمایا درخت سے آواز آئی اسے موسیٰؑ تو موسیٰ علیہ السلام نے فوراً جواب دیا لیکن آپ کو معلوم نہ تھا کہ کون مجھے بلا رہا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا مجھے بلانے والے میں تیری آواز سن رہا ہوں لیکن مجھے تیرے مکان کا علم نہیں ہے کہ کہاں ہے؟ ارشاد ہوا میں تیرے اوپر تیرے ساتھ تیرے آگے تیرے پیچھے اور تجھ سے زیادہ تیرے قریب ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام جان گئے کہ ایسی ذات اللہ تعالیٰ کی ہو سکتی ہے تو آپ کو یقین ہو گیا (2)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں بعض علماء فرماتے ہیں جب ندا آئی تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا کلام کرنے والا کون ہے۔ فرمایا میں اللہ ہوں۔ شیطان نے وسوسہ ڈالا کہ شاید تم شیطان کی کلام سن رہے ہو۔ یہاں پھر آپ نے فرمایا میں پہچان گیا ہوں کہ یہ اللہ کی کلام ہے کیونکہ میں اسے تمام جہات اور تمام اعضاء سے سن رہا ہوں۔ یہ اشارہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے کلام روحانی طور پر لیا پھر وہ کلام بدن کے لئے تشکیل بنا اور حس مشترک کی طرف منتقل ہوا پھر بغیر کسی عضو اور جہت کے اختصاص کے حس مشترک میں منتقل ہو گیا (3)۔

۲۔ آپ جب وادی مقدس پہنچے تو حکم ہوا کہ جوتے اتار دو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تواضع اور ادب و احترام کے تقاضے پورے کرنے کے لئے حکم دیا گیا۔ امام بغوی فرماتے ہیں جوتے اتارنے کے حکم کا سبب وہ ہے جو ابن مسعود سے مروی ہے کہ آپ کے جوتے مردار گدھے کی کھال کے بنے ہوئے تھے اور یہ بھی روایت ہے کہ وہ غیر مردہ بونچڑے کے تھے۔ تکرار اور تکرار نے یہ وجہ بیان

کی ہے کہ یہ وادی مقدس ہے، جو تے اتار دو تا کہ اس بابرکت وادی کی خاک تمہارے قدموں سے لگے اور تم اس سے برکت حاصل کرو۔ اس وادی کو دوسرے پاک کیا گیا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے حکم سنتے ہی جو تے اتار دیے اور وادی کے باہر پھینک دیے (۱)۔

عج طویٰ کو کوئی اور شاہی علماء نے یہاں بھی اور سورۃ النازعات میں بھی مکان کی تاویل میں توین کے ساتھ پڑھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ الطیٰ سے ٹنٹی کی طرح نوادی یا المقدس کا مصدر ہے یعنی دو دنائیں دی گئیں یا دوسرے پاک کیا گیا۔ میں کہتا ہوں الطیٰ کا اصل معنی ایک چیز کو دوسری چیز میں داخل کرنا ہے۔ اس مشابہت کی وجہ سے یہ تثنیہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے، باقی قراء نے علیت اور عدل کی وجہ سے بغیر توین کے پڑھا ہے۔ یعنی غیر منصرف بنایا ہے۔ اور یعنی اس میں غیر منصرف کے دو سبب علیت اور عدل پائے جاتے ہیں کیونکہ یہ وادی کا علم ہے اور یہ طاؤ سے معدول ہے۔ یا علیت کے ساتھ دوسرا سبب تانیث پایا جاتا ہے۔ جب کہ اسے بعد کی تاویل میں کیا جائے، طویٰ الوادی کا عطف بیان ہے۔ الضحاک فرماتے ہیں وادی طوی گول اور گہری تھی۔ گولائی میں طور کی مثل تھی (۲) بعض علماء فرماتے ہیں طوی توین کے ساتھ اپنے فعل کے قائم مقام مصدر ہے اور ظرف میں پوشیدہ غیر مرفوع سے حال ہے جو ضمیر موسیٰ کی طرف راجع ہے۔ یہ اشارہ ہے اس حالت کی طرف جو آپ کو بطریق اجتناب (بانتخاب الہی) حاصل ہوئی گویا آپ نے اللہ تعالیٰ کی دستگیری سے وہ وادی طے کی۔ یہ وادی آپ نے تھوڑے سے وقت میں طے فرمائی حالانکہ اگر اپنی کوشش سے اس مسافت کو (جو اللہ اور بندے کے درمیان ہے) طے فرماتے تو بڑی مشکل سے طے ہوتی۔

صوفیاء و جمہم اللہ فرماتے ہیں تلب کا اصلی مقام عرش پر ہے۔ اگر انسان عبادت و اجتناب سے اس تک پہنچنا چاہے تو اسے پچاس ہزار برس کی مدت درکار ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت چاہئے کیونکہ زمین اور عرش کے درمیان پچاس ہزار سال کی مسافت ہے۔ اسی کی طرف قرآن نے اشارہ فرمایا تَنْبُؤًا وَ كَانُ مَقْدَامًا خَسِيفًا أَلْفَ سَنَاتٍ لیکن اس عروج اور بلندی کو ایک سال تک شیخ کامل کے جذب کے ذریعے بطور اجتناب (چناؤ انتخاب) فوراً حاصل کر لیتا ہے۔ یعنی مرشد کامل کی توجہ سے اللہ تعالیٰ خود اس کا انتخاب فرما کر اسے اس منزل مقصود تک پہنچاتا ہے)

سیر زاد ہر شبے یک روزہ راہ سیر عارف ہر دے ماتحت شاہ

کہ زابد تو ایک رات میں ایک دن کی مسافت ہی طے کرتا ہے لیکن عارف کی سیر ہر لمحہ بادشاہ حقیقی کے تخت (عرش) تک ہوتی ہے۔

وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْمِعْ لِمَا يُوحَىٰ ۝

”اور میں نے پسند کر لیا ہے تجھے (رسالت کے لئے) سو خوب کان لگا کر سن جو وحی کیا جاتا ہے۔“

یعنی میں نے تجھے نبوت اور رسالت کے لئے منتخب فرمایا ہے۔ جزوہ نے انا کو اتا یعنی نون کی تشدید کے ساتھ اور اخترت کو اخترتنا (بطور تعظیم) جمع کا صیغہ پڑھا ہے۔ لہذا یوحی کا لام علی سبب التنازع استمع اور اخترت دونوں فعلوں کے متعلق ہے۔

إِنِّي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي ۝

”یقیناً میں ہی اللہ ہوں نہیں ہے کوئی معبود میرے سوا۔ میں تو میری عبادت کیا کرو اور انا کیا کر نماز مجھے یاد کرنے کے لئے۔“

۱۔ ایہی کو مانع ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کے فتح کے ساتھ اور ہائی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ جملہ مایو وحی سے

بدل ہے نیز اس میں توحید کا ذکر ہے جو علم کا کمال ہے۔ دوسرا اس میں عبادت کا حکم ہے جو عمل کا کمال ہے (یعنی علم و عمل کی معراج کا اس جملہ میں ذکر ہے)

۱۔ نماز چونکہ تمام عبادات سے افضل ترین عبادت ہے اس لئے اس کی اہمیت اور علو شان کے اظہار کے لئے دوبارہ علیحدہ ذکر فرمایا حالانکہ فاعبداللہی کے امر میں اس کا ذکر بھی ضمناً آچکا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نماز دین کا ستون ہے (1)۔ اس حدیث کو ابو نعیم اور بیہقی نے حضرت عمر سے روایت کیا ہے اور صاحب سند الفردوس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس طرح روایت کی ہے کہ نماز ایمان کا ستون ہے (2)۔ ابن عساکر نے حضرت انس سے یہ روایت کیا ہے کہ نماز ایمان کا نور ہے (3)۔ صحیحین میں حضرت ابن مسعود سے روایت ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا حضور ﷺ کون سا عمل اللہ کی بارگاہ میں محبوب ترین ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا نماز (4)۔ مسلم نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندے کو اکثر کئے درمیان (فاضل) نماز کا ترک ہے (5)۔ امام احمد اور اصحاب سنن نے حضرت بریدہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ امام احمد داری اور بیہقی نے عبداللہ ابن عمر بن العاص سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک دن نماز کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا جو نماز کی حفاظت کرے گا نماز قیامت کے روز اس کے لئے نور دلیل اور نجات ہوگی اور جو اس کی محافظت نہیں کرے گا اس کے لئے زبور ہوگا اور نجات اور وہ شخص قیامت کے روز قارون فرعون اور هامان اور ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا (6)۔

ترذی نے عبداللہ بن شقیق سے روایت کیا ہے کہ فرمایا صحابہ کرام اعمال میں سے کسی عمل کو چھوڑنے کو کفر نہیں سمجھتے تھے لیکن نماز کے ترک کو کفر سمجھتے تھے (7)۔ ان احادیث کے ظاہری مفہوم کی بناء پر امام احمد بن حنبل نے فرمایا من ترک الصلوۃ متعبداً فقد کفّر۔ جس نے جان بوجھ کر نماز کو ترک کیا اس نے کفر کیا۔ نماز کے تمام عبادات سے افضل ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی ذات میں حسن ہے، جب کہ دوسری عبادات میں حسن کسی واسطے سے ہے۔ مثلاً روزہ میں حسن ہے کیونکہ یہ نفس امارہ بالسوہ کی محبت کو ختم کرتا ہے۔ زکوٰۃ میں حسن ہے کہ یہ فقیر کی حاجت کو پورا کرتی ہے۔ حج میں حسن ہے کہ اس میں بیت اللہ شریف کی تعظیم ہے۔ اس نماز کے ذاتی حسن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی اقامت کے حکم کے لئے علت (لذکری) ذکر فرمائی لذلکوی کو نافع اور ابومر و نے یاہ کے فقہ کے ساتھ اور باقی فراء نے یدایہ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نماز قائم کرنا کہ مجھے اس میں یاد کرو۔ کیونکہ نماز اپنے تمام ارکان کے ساتھ ذکر الہی ہے۔ اس میں دل زبان اور جوارح کی عبادت ہے۔ بعض علماء لذلکوی کا معنی یہ فرماتے ہیں کہ میں نے نماز کا اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے اور ان میں میں نے نماز کا حکم دیا ہے۔ بعض نے یہ معنی فرمایا کہ تم نماز قائم کرو میں تمہارا رحمت اور ثناء کے ساتھ ذکر کروں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم میں اس لئے اپنے بندے کے ساتھ اس کے گمان کے مطابق سلوک کرتا ہوں اور جب وہ میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ اگر وہ میرا ذکر دل میں کرتا ہے تو میں بھی تمہارا ذکر کرتا ہوں۔ اگر وہ میرا ذکر کسی محفل میں کرتا ہے تو میں اس کی محفل سے بہتر محفل میں اس کا ذکر کرتا ہوں۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے (8)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ (لذلکوی) تہنید ہے۔ نماز کے قیام کے حکم کی تعلیل نہیں

1- کنز العمال، جلد 7 صفحہ 284، (الترات الاسلامی)

2- ایضاً، بلد 1، صفحہ 278

3- ایضاً، صفحہ 228

4- مشکوٰۃ الصواع، صفحہ 58 (قدیمی)

5- ایضاً

6- مشکوٰۃ الصواع، صفحہ 196 (قدیمی)

7- ایضاً، صفحہ 59

8- ایضاً، صفحہ 7

قیامت کی آمد کی خبر دے دی۔ اکثر مفسرین فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ میں قیامت کے وقت کو اپنے آپ سے پوشیدہ رکھتا ہوں تو پھر کوئی دوسرا کیسے پہچانے گا۔ اس تاویل کی تائید بعض قراء توں سے ہوتی ہے جن میں فَحِيفٌ اَعْظَمُوْهُمُ اَلْغَافِلُوْنَ جو ہیں۔ یہ کام عربوں کے عبادہ کی طرح ہے کہ جب وہ کسی چیز کے پوشیدہ کرنے میں مبالغہ کا اظہار کرتے ہیں تو کہتے ہیں میں نے تیرے راز کو اپنے سے چھپائے رکھا۔ یعنی میں نے اسے انتہائی پوشیدہ رکھا اور قیامت کے وقت کو بیان نہ کرنے میں حکمت یہ ہے کہ جب لوگوں کو اس کے آنے کے وقت کا علم نہیں ہوگا تو وہ بروقت خوفزدہ رہیں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں افعال کا ہمزہ سلب کے لئے ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ میں اس سے پردہ بنا دوں گا۔ اسے ظاہر کر دوں گا۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اظہار والے معنی کی تائید اخٹی کے ہمزہ کے فتح والی قرأت بھی کرتی ہے (1)۔ امام بغوی فرماتے ہیں اخٹی کو حمزہ کے فتح کے ساتھ پڑھا گیا ہے، جس کا معنی ہوگا، میں ظاہر کروں گا عرب کہتے ہیں خفیت الشمسی جب کوئی کسی چیز کو ظاہر کر دے اور اخیت اخٹی جب کوئی کسی چیز کو چھپا دے (2)۔ نہایہ للحدادی میں یہی تحقیق لکھی ہے اگر یہ کہا جائے کہ جب خفا (مجرد) کا معنی ظاہر کرنا ہے اور متوا (مخفی) کا معنی چھپانا ہے تو پھر قرأت متوا (مخفی) کا معنی ظاہر کرنا کیسے ہو سکتا ہے اور حضرت حسن بصری کی قرأت اس کی تائید کیسے کرتی ہے۔ میں کہتا ہوں خفا مجرد بھی ظاہر کرنے اور بھی چھپانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ قاموس میں ہے خفی 'مخفی' خفیانہ۔ بروزن رقی یوفی اظہارہ واستخوجہ (3) 'خفی کا معنی ظاہر کرنا ہے' خفی 'مخفی' بروزن رضی یوحی۔ خفا، فحو خاف و خفی اس کا معنی چھپانا اور ظاہر نہ ہونا ہے۔ پس جب ماش مجرد باب ضرب پر حمزہ زائدہ افغان زائدہ کیا جائے گا تو اس کا معنی چھپانا اور ظاہر نہ کرنا ہوگا۔ جیسا کہ مشہور معنی ہے اور جب باب سبغ پر حمزہ زائدہ افغان زائدہ کیا جائے گا تو معنی ظاہر کرنا اور نہ چھپانا ہوگا۔

اسی یہ آئیۃ یا اخفیہا کے متعلق ہے بشرطیکہ اخفیہا کا معنی ظاہر کرنا ہو۔ اگر یہ معنی ہو کہ میں اس کی آمد کے وقت کو چھپائے رکھتا اور یہ بھی نہ کہتا کہ یہ آنے والی ہے۔ تب بھی بما تسعی آئیۃ یا اخفیہا کے متعلق ہوگا۔ یعنی میں اس کے آنے کی خبر نہ دوں گا حتیٰ کہ ہر نفس کو بدل دیا جائے گا جو اس نے اللہ کی رضا کے لئے کیا، اس عمل میں نہ اسے جنت کا لالچ تھا اور نہ دوزخ کا خوف تھا اور پھر ایسے عمل کی جزاء اللہ کی ملاقات اور زیارت اور اس کے قرب کے مراتب ہیں۔

فَلَا يَصْدَأَنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَا يُؤْمِنُ بِهَا وَ اتَّبَعَهُ هَوَاهُ فَتَرَى ۝

”پس ہرگز نہ روکے تجھے اس (کو ماننے) سے کہ وہ شخص جو نہیں ایمان رکھتا اس پر اور پیروی کرتا ہے اپنی خواہش کی۔ اور نہ تم بھی ہلاک ہو جاؤ گے“

۱۔ عنہا کی ضمیر کا مرفوع لقاء اللہ یا قیامت کے آنے پر ایمان یا اقامۃ الصلوٰۃ ہے۔ ظاہر ایہاں کا مرفوع فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کو اس سے نہ روکے لیکن مراد موسیٰ علیہ السلام کو منع کرنا ہے کہ کافر کے کہنے اور روکنے پر آپ اس پر ایمان لانے سے نہ رکس۔ اس اسلوب سے اس بات پر تہنید ہے کہ فطرت سلب قیامت سے اعراض کرنے کا انکار کرتی ہے اور وہ دین میں رسوخ اور پختگی کا تقاضا کرتی ہے۔ اور کافر کا اس بات سے روکنا دین میں کبھی پیدا کرنے کے لئے ہے۔

2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 215 (تجاریہ)

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ، جلد 5، صفحہ 650 (احمدیہ)

3۔ قاموس الحدیث، جلد 2، صفحہ 1680 (التراث الاسلامی)

یعنی وہ نہ روکے جو اس پر خود ایمان نہیں رکھتا اور خواہش نفس کا بندہ ہے۔ مانی لذتوں کی طرف مائل ہے اور اس نے اس بات سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں کہ اس قیامت کے انکار میں گفتی برائی ہے اور اس پر کتنا عذاب ہے۔ واتبیع یا تو لایومن پر معطوف ہے۔ یا تکی تقدیر کے ساتھ لایومن کے فاعل سے حال ہے۔

یعنی قیامت پر ایمان لانے سے رکنے کی وجہ سے ہلاک ہو جاؤ گے۔ فناء کے بعد ان مقدر ہے، اس کے سبب فعل منسوب ہے۔

وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يُمُوسَىٰ ۝۱

”اور (نہا آئی) یہ آپ کے دائیں ہاتھ میں کیا ہے اے موسیٰ!“

یہ استہتمام اور سوال الاعلیٰ اور بے خبری کی وجہ سے نہیں بلکہ اس بات پر آگاہ کرنے کے لئے ہے، کہ یہ ڈنڈا ہے اس سے بڑے بڑے عجائب اور معجزات کا اظہار ہو گا۔ ماکا کلک ہوتا ہے۔ اور نلک خیر ہے بیمنیک مخدوف منصوب کے متعلق ہو کر حال ہے اور اس کا عامل اسم اشارہ کا معنی ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی قارۃ او ماخوذة بیمنیک۔ یا نلک (بقول علماء کوفہ) اسم موصول ہے اور بیمنیک اس کا صلہ ہے۔ یا موسیٰ کا نکرار مانوس کرنے اور تمجید کرنے کے لئے ہے۔

قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ أَتَوَكَّلُ عَلَيْهَا دَآءُهَا وَآهْشُ بِهَا عَلَىٰ عَمِيٍّ ۚ وَإِيَّآئِ ۝۲
مَا رَبُّ الْآخَرَىٰ ۝۳

”عرض کی (میرے رب) یہ میرا عصا ہے میں نیک لگاتا ہوں اس پر اور میں پتے جھاڑتا ہوں اس سے اپنی بکریوں کے لئے اور میرے لئے اس میں کئی اور فائدے بھی ہیں۔“

۱۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ کے عصا کی دو شاخیں تھیں اور نیچے نوک بنی ہوئی تھی اور اس پر شانچہ چڑھی ہوئی تھی۔ مقال فرماتے ہیں اس ڈنڈے کا نام جہر تھا (۱)۔ جب درخت سے پتے جھاڑنے کے لئے زور سے ڈنڈا مارا جاتا ہے تو اس کے لئے ہش الورق استعمال ہوتا ہے۔ قاموس میں اس کی سببی تشریح لکھی ہے (۲)۔ ولینی وروش اور حفص نے بیاء کے فقرے کے ساتھ اور باقی قراء نے بیاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ما رب کا معنی مقاصد اور آخری ما رب کی صفت ہے۔ قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ آخر ہوتا لیکن آیت کے سرے ملانے کے لئے آخری ذکر فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام دوسرے جو مقاصد اس ڈنڈے سے حاصل کرتے تھے وہ یہ تھے آپ جب چلنے تو اسے کندھے پر رکھ لیتے اور اس کے ساتھ اپنا لوٹا اور سامان لٹکا لیتے، اس کی شاخوں پر آگ جلانے والی ککڑیاں رکھنے جن کی وجہ سے آگ نکل پڑتی، اس کے اوپر کپڑا ڈال کر سایہ حاصل کرتے، کنویں سے پانی نکالنے والی رسی چھوٹی ہوتی تو ڈنڈا اس کے ساتھ باندھ کر اسے لہبا کر لیتے اور جب درندے آپ کی بکریوں پر حملہ کرتے تو آپ اس کے ساتھ ان کا دفاع کرتے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں موسیٰ علیہ السلام سوال کا مقصود سمجھ گئے تھے کہ اللہ تعالیٰ اس کی حقیقت اور اس کے منافع کا بیان چاہتے ہیں۔ پھر جب آپ نے اس حقیقت کے خلاف اس میں کچھ معجزات دیکھے اور اس کے دوسرے خصائص مشاہدہ فرمائے تو آپ کو یقین ہو گیا کہ یہ معجزہ ہے (۳) اسی وجہ سے اس کی حقیقت اور اس کے منافع کو مفصل اور جمل بیان فرمایا تاکہ جو اب اس غرض کے مطابق ہو جائے

2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 830 (الترت العربی)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 215 (الترت)

3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زہد، جلد 5، صفحہ 607 (العلیہ)

جو موسیٰ علیہ السلام نے کبھی تھی۔ کلام کا معنی یہ ہے کہ یہ ڈنڈا دوسرے ڈنڈوں کی جنس سے ہے، اس سے وہ منافع حاصل ہوتے ہیں جو دوسرے ڈنڈوں سے حاصل ہوتے ہیں۔

بعض اہل محبت و عشق فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے بقدر ضرورت جو اب سے زائد کلام اس لئے فرمائی تاکہ محبوب سے کلام کی لذت حاصل کریں پھر زیادہ تفصیل سے بھی جواب نہیں دیا تاکہ کلام کے طویل ہونے کی وجہ سے بے ادبی نہ ہو جائے، یعنی ادب و احترام کے تقاضا کی بناء پر کلام کو زیادہ طویل بھی نہیں کیا۔

قَالَ اَلْقَهَا يَمُوسَى ①

”حکم ہوا ڈال دے اسے زمین پر موسیٰ!“

یعنی اپنے عصا کو زمین پر ڈال دو اور اس کے دوسرے مقاصد کی حقیقت جان لو گے وہ ب فرماتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہ سمجھا کہ اللہ تعالیٰ مجھے اسے پھینکنے کا حکم فرما رہے ہیں (1)۔

قَالَهَا قَاذَا هِيَ حِيَّةٌ تَسْعَى ②

”تو آپ نے اسے زمین پر ڈال دیا پس اچانک وہ سانپ بن کر (اوپر ادھر) دوڑنے لگا۔“

ل۔ جو نبی موسیٰ علیہ السلام نے اس ڈنڈے کو پھینکا تو وہ سانپ بن کر تیزی سے پیٹ کے بل دوڑنے لگا۔ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر (حیة) کی جگہ جان فرمایا ہے۔ کٹانہا جانی۔ جان چھوٹے باہر ایک جسم والے سانپ کو کہتے ہیں۔ اور ایک مقام پر شعبان فرمایا فاذا ہی شعبان، شعبان تمام سانپوں سے بڑا ہوتا ہے حیة کا لفظ چھوٹے بڑے نڈکر اور مونث تمام قسم کے سانپوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ شعبان اور جان ایک سانپ کے لئے استعمال نہیں ہو سکتے تو اس کا جواب کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ہی سانپ کے لئے کبھی شعبان بھی جان اور کبھی حیة کا لفظ استعمال فرمایا۔ بعض علماء نے ان آیات میں تطبیق اس طرح کی ہے کہ اس کی ابتدائی حالت کے اعتبار سے اسے جان فرمایا۔ کیونکہ پہلے وہ ڈنڈے کی مقدار میں تھا۔ پھر وہ پھول گیا حتیٰ کہ شعبان بن گیا۔ یعنی اس کی انتہائی اور آخری حالت کے اعتبار سے شعبان فرمایا۔ بعض نے اس طرح مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ سانپ بڑائی میں شعبان تھا، تیزی میں جان تھا اس وجہ سے کٹانہا جان فرمایا (گویا وہ جان تھا) فاذا ہی جان نہیں فرمایا جس طرح کہ فرمایا قَاذَا هِيَ حِيَّةٌ تَسْعَى قَاذَا هِيَ حِيَّةٌ تَسْعَى قَاذَا هِيَ حِيَّةٌ تَسْعَى اور اس کی شانیں اس کے لئے باجیس بن گئی ہیں اور نوک (برجھی) گردن اور کٹنی ہو گئی ہے اور وہ حرکت کر رہی ہے اور اس کی آنکھیں آگ کی طرح چمک رہی ہیں۔ وہ جب بڑی بڑی چٹانوں کے پاس سے گذرتا جو اونٹوں کی مثل تھیں تو انہوں بھی گل لیتا، وہ درختوں کے نیچے آتا تو پتے خود بخود جھڑنے لگتے اور موسیٰ علیہ السلام نے اس کے دانتوں کے پینے کی آواز سنی۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے یہ ہیبت ناک منظر دیکھا تو آپ پیٹھ پھیر کر بھاگ پڑے۔ پھر اپنے رب کو یاد کیا اور ندامت آمیز کیفیت میں کہنے ہو گئے (2)۔

قَالَ خُذْهَا وَ لَا تَخَفْ ③ سَعِيْدٌهَا سَيَّرَتْهَا الْاَوْوَى ④

”حکم ہوا اسے پکڑ لو اور مت ڈرو ہم لو تادیس گے اسے اپنی جلی حالت پر ل۔“

اے کلیم واپس آؤ اور اسے پہلوا اور ڈریئے مت۔ اِنِّیْ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُنْکُفِرُوْنَ ﴿۱۰﴾ اِنَّا مِنْ قَلَمٍ لَّمْ یَبْدَلْ حُسْبًا یَعْدُو سُوءَ قَائِلٍ عَفْوَیْمٌ تَرْجِمٌ۔ میرے حضور ڈرا نہیں کرتے جنہیں رسول بنا یا جاتا ہے مگر وہ شخص جو زیادتی کرے (دو ڈرے) پھر (وہ غلام بھی اگر نیکی کرنے لگے برائی کرنے کے بعد تو میں بے شک غفور رحیم ہوں)

ہم اسے بالکل پہلی ہیئت پر لوٹا دیں گے۔ سیوہ فعلۃ کے وزن پر سیر سے مصدر ہے اس کا معنی طریقہ اور ہیئت ہے اور سیرۃ ترکیب نحو کی اعتبار سے سعیدھا کی ضمیر منصوب سے بدل اشتغال ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں حرف جر کے حذف کے ساتھ منصوب ہے اصل میں الی سیر تھا تاہم یہ کہا جائے گا کہ اعادۃ عاودہ سے منقول ہے اور عاد الیہ کے معنی میں ہے یا ظرف کی وجہ سے منصوب ہے۔ یعنی سعیدھا فی سیر تھا۔ یا فعل مقدر کے مصدر کی حیثیت سے منصوب ہے یا اس طریقہ پر منصوب ہے ضربۃ سوطاً۔ (یعنی مفعول مطلق کے قائم مقام اس کا آکر رکھا جائے) یا یہ مفعول ثانی کی حیثیت سے منصوب ہے کیونکہ تعید جعل کے معنی کی تفسیر کے ساتھ ہے۔ یعنی ہم الی عصا کو لوٹا دیں گے در اس حالیکہ ہم اس کو پہلی حالت پر بنا دیں گے پھر اس سے اسی طرح نفع اٹھائے گا جس طرح تو پہلے اٹھاتا تھا۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک اونٹنی قیص پستی ہوئی تھی، جب اللہ تعالیٰ نے سانپ کو پکڑنے کا حکم دیا تو آپ نے قیص کی ایک طرف اپنے ہاتھ پر لپٹ دی۔ اللہ تعالیٰ نے ہاتھ کھولنے کا حکم فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام نے ہاتھ کھول دیا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ جب آپ نے ہاتھ پر پکڑ لیا تو موسیٰ علیہ السلام نے ایک فرشتہ نے کہا جبنا جس مصیبت سے آپ بچنا چاہتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ اس کا حکم فرمادیں تو کیا یہ کپڑا تمہیں اس مصیبت سے بچا سکتا ہے؟ فرمایا نہیں لیکن میں خلیفہ ہوں اور میری تخلیق ہی کمزور کی گئی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے ہاتھ سے کپڑا اتار دیا اور (توکل بر خدا کر کے) اپنا ہاتھ سانپ کے منہ میں ڈال دیا۔ تو وہ فوراً پہلے کی طرح ڈنڈا بن گیا۔ اور آپ کے ہاتھ ان شاخوں پر تھے جہاں آپ سہارا لینے کے وقت ہاتھ رکھا کرتے تھے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ایسے معجزات دکھانے کا اس لئے ارادہ فرمایا تاکہ جب فرعون جیسے ظالم و جابر بادشاہ کے سامنے آپ اپنے ڈنڈے کو پھینکیں (اور یہ سانپ بن جائے) تو آپ ٹھہراتے جائیں (۱) امام بغوی نے لکھا ہے کہ ابن عباس سے مروی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اپنے عصا پر کھانا مشکیزہ ڈنڈا ڈالتے تھے اور وہ آپ کے ساتھ چلتے ہوئے کلام بھی کرتا تھا۔ آپ اسے زمین پر مارتے تو اس کا کھانا نکل آتا، آپ اسے زمین میں گاڑتے تو پانی نکل آتا، جب آپ اسے کھینچ لیتے تو پانی رک جاتا اور کبھی آپ کا دل پھل فروٹ کھانے کا ہوتا تو اسے گاڑ دیتے، اس پر پھنسیاں پتے اور پھل لگ جاتے اور جب کنویں سے پانی نکالنے کا ارادہ فرماتے تو وہی عصا کو لٹکانے کا ہوتا تو کنویں کی مقدار لسا ہو جاتا۔ اور اس کی شاخیں ڈول کی طرح ہو جاتیں۔ حتیٰ کہ آپ پانی نوش فرما لیتے۔ رات کو وہی عصا چراغ کا کام دیتا اور جب کوئی دشمن حملہ آور ہوتا تو آپ اسی ڈنڈے کے ساتھ جگ جگ کرتے اور اپنا دفاع کرتے (۲)۔

وَاصْبِرْ يَدَّكَ اِلَى جَنَاحِكَ تَخْرُجُ بَيِّضًا مِنْ عَدُوٍّ سَوَاءٍ اَيَّةُ الْاٰخِرَى ﴿۱۱﴾

”اور (حکم ملا) دبا لو اپنا ہاتھ اپنے بازو کے نیچے۔ یہ نکلے گا خوب سپید ہو کر بغیر کسی بیماری کے یہ دوسرا معجزہ (ہم نے

تمہیں دیا ہے۔“

۱۔ امام بغوی فرماتے ہیں جناح سے مراد بائیں نعل ہے۔ مجاہد نے اس کا معنی تحت لکھا ہے۔ جناح الانسان انسان کے بازو کو کہتے ہیں اور یہ نعل تک کو شامل ہے (1)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ پرندے کے پروں سے استعارہ ہے۔ ان کو جناح اس لئے کہتے ہیں کیونکہ وہ دونوں کو جھکا تا ہے (2)۔ قاموس میں ہے کہ جوارح سے مراد وہ پھلیاں ہیں جو سینے کے نیچے ہوتی ہیں اور سینے سے ملی ہوئی ہوتی ہیں اس کا واحد جانحہ (3)۔ جناح کا لفظ ید (ہاتھ) عضو مفرد (بازو) اور ابط (نعل) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

تخروج جواب امر کی وجہ سے مجزوم ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ اضمم یدک الی جناحک و اخرج فخرج۔ بیضاوی کا معنی چمک دار ہے۔ یہ تخروج کی ضمیر مستتر سے حال ہے۔ من غیر سوء یعنی بغیر کسی عیب اور حج کے یہ برسی کی بیماری سے کنایہ ہے کیونکہ طبیعت برسی کی بیماری (جس سے جسم پر سفید داغ بن جاتے ہیں) نفرت کرتی ہے۔ یہ بیضاء کے متعلق ہے کیونکہ یہ صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ گویا بیضت من غیر سوء ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس نے فرمایا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں ایسا نور تھا جو دن رات سورج اور چاند کی طرح چمکتا تھا (4)۔

۲۔ ایۃ اخروی یعنی تمہارے دعویٰ نبوت کی صداقت پر دوسری دلیل ہے اور یہ تخروج کی ضمیر مستتر سے یا بیضاء کی ضمیر سے دوسرا حال ہے۔ یاخذ مضمرا یا دونیک (یعنی خذ) مضمرا مفعول ہے۔

لِنُرِيكَ مِنْ آيَاتِنَا الْكُبْرَى ۝

”تا کہ ہم دکھائیں تمہیں اپنی بڑی بڑی نشانیوں کو“

۱۔ لنوریک خذیا دونک مضمرا کے متعلق ہے یا جس نعل پر آیت یا قاعدہ دلالت کر رہا ہے۔ یعنی ہم نے ایسا اس لئے کیا ہے تاکہ تمہیں اپنی بڑی بڑی نشانیوں دکھائیں۔ الکبریٰ یا تو ایاتنا کی صفت ہے۔ لنوریک کا دوسرا مفعول ہے اور من آياتنا اس سے حال ہے۔ الکبریٰ کی بجائے الکبریٰ فرمایا تاکہ آیات کے سر سے مل جائیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کلام میں اضمار ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے لنوریک الآیة الکبریٰ من آياتنا۔ ابن عباس فرماتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ مبارک اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے بڑی نشانی تھی (5)۔

إِذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ۝

”(اب) جاے فرعون کے پاس وہ سرکش بن گیا ہے“

1۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ اپنی صداقت کی دو نشانیوں لے کر فرعون کے پاس جاؤ اور اسے میری عبادت کی دعوت دو وہ حد سے بڑھ گیا ہے اور سرکشی اور نافرمانی میں انہما کو پہنچ چکا ہے۔ حتیٰ کہ اس نے مملکت اور اقتدار کے نشے میں بدست ہو کر الوہیت کا دعویٰ کر دیا ہے۔ انہ طغیٰ کا جملہ اذہب کی تعلیل بیان کر رہا ہے۔

قَالَ سَمِئْتُ لِیٰ صَدْرَمِی ۝

”آپ نے دعا مانگی اے میرے پروردگار کہ شادو فرما دے میرے لئے میرا سینہ۔“

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 216 (تجاریہ)

2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زاہد، جلد 5، صفحہ 609 (احمدیہ)

۱۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے التجا کی کہ میرا سینہ کشادہ فرمادے، اس میں وہ عرفان اور معارف ڈال دے جن کا اور اک عقل انسانی سے وراء ہے۔ اور ان اورا کات میں ایک درک یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی انسان کسی چیز کے نفع اور نقصان کے پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتا۔ عرض کی اے مولا ایسا یقین اور عرفان عطا فرما کہ دل سے فرعون کا اور اس کے لشکریوں کا خوف نکل جائے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں آپ کی مراد یہ تھی کہ میرا سینہ اس طرح منشرح فرمادے کہ میں تیرے سوا کسی سے نہ ڈروں۔ موسیٰ علیہ السلام فرعون کی سلطنت و شوکت سے اور اس کے لشکر کی ہیبت سے بہت خوفزدہ تھے اس لئے آپ نے اس خوف سے نجات کی التجا کی (1)۔

وَ يَسِّرْ لِي أَمْرِي ﴿١﴾

”اور آسان فرمادے میرے لئے میرا یہ (کٹھن) کام لے“

۱۔ نافع اور ابو عمرو نے لینی کو پلانا کے فتح کے ساتھ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی اے میرے پالنے والا تو نے تبلیغ رسالت کا کام میرے کندھوں پر ڈالا ہے۔ اس کو میرے لئے آسان فرمادے تاکہ مجھ سے کسی مشکل اور کٹھن کام کی تکلیف کا اندیشہ دور ہو جائے اور تکالیف کے کاتوں کو برداشت کر کے میرا نفس لذت محسوس کرے۔ لینی ذکر کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ پہلے اشرح لینی اور یسر لینی فرمایا تو مشروح اور مفہوم (جس کی شرح کرنی ہے اور جس کو آسان کرنا ہے) کا علم تو ہو گیا لیکن اس میں ابہام تھا۔ پھر مشروح اور میسر کو ذکر فرمایا کہ ابہام کو دور کر دیا اور وہ مشروح و میسر۔ سینہ اور امر ہیں۔ تو ابہام کے بعد ابہام کو دور کرنا۔ یہ تاکید اور مبالغہ کے لئے ہے (کیونکہ ابہام کے بعد ابہام کو دور کرنے میں اجمال اور تفصیل کے طریق سے ایک معنی کا تکرار ہوتا ہے)۔

وَ احْتَلُّ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِي ﴿٢﴾

”اور کھول دے گہ میری زبان کی لے“

۱۔ من لسانی یا عقدة کی صفت ہے یا حائل کے متعلق ہے۔

امام بخاری فرماتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام صغریٰ میں فرعون کی پردوش میں تھے تو ایک دن موسیٰ علیہ السلام نے اسے زور سے طمانچہ مارا اور اس کی داڑھی سے پکڑ لیا۔ فرعون نے اپنی بیوی آسیہ سے کہا یہ میرا دشمن ہے، فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ آسیہ نے کہا (تمہارا دامخ اپنی جگہ پر ہے؟) یہ مصوم بچہ ہے۔ بے کچھ ہے (اگر اس نے مجھے طمانچہ مار بھی دیا ہے تو کون سا آسان گزرا ہے) ایک روایت میں ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے جب آپ کا دودھ چھڑایا تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو آسیہ کے پاس پہنچا دیا۔ آپ فرعون اور آسیہ کی پردوش میں تھے۔ دونوں نے آپ کو بیٹا بنایا ہوا تھا۔ اسی صغریٰ کے دوران آپ ایک دن فرعون کے سامنے کھیل رہے تھے اور آپ کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی جس سے آپ کھیل رہے تھے۔ آپ نے اچانک چھڑی اٹھائی اور فرعون کے سر پر دے ماری۔ (فرعون کو غصہ آیا) اور اس نے آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ آسیہ نے کہا اے بادشاہ یہ مصوم بچہ ہے، اسے کوئی سمجھ نہیں ہے، اس کی بے کچھی کا تو اگر چاہتا ہے تو تجربہ کر لے۔ آسیہ دو تھال (ڈش) لے کر آئی جن میں سے ایک میں آگ کے انگارے تھے اور دوسری میں جواہر دھونی تھی۔ وہ دونوں تھال جب موسیٰ علیہ السلام کے سامنے رکھے گئے۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے جواہر اٹھانے کا ارادہ کیا لیکن جبرئیل نے موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر آپ نے اپنا ہاتھ آگ پر رکھ دیا اور ایک انگارہ اٹھا کر منہ

میں ڈال لیا۔ اس سے آپ کی زبان جل گئی اور اس پر ایک گروہ بن گئی (۱)۔

عبد بن حمید ابن المنذر راہب ابنی حاتم نے سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ فرعون ایک دن موسیٰ علیہ السلام کو اٹھائے ہوئے تھا تو آپ نے اس کی داڑھی سے پکڑا اور اسے زور سے کھینچا۔ وہ ظالم غصہ سے الال بیٹلا ہو گیا اور آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ آپ نے کہا۔ یہ چھوٹا بچہ ہے اسے تو انگاروں اور جوہر و یا قوت کے فرق کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ آپ کے سامنے یہ دونوں چیزیں لائی گئیں تو آپ نے جوہر کو اٹھانے کا ارادہ فرمایا لیکن جبیر نے آپ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر آپ نے زانپا ہاتھ انگارے پر رکھا اور انگارہ اٹھا کر منہ میں ڈال دیا جس کی وجہ سے آپ کی زبان جل گئی اور گروہ پڑ گئی۔

يَقْتُلُوا قَوْلِي ۝

”تا کہ اچھی طرح سمجھ سکیں وہ لوگ میری بات لے۔“

لے آپ کی زبان کی گروہ مکمل طور پر کھلنے میں اختلاف ہے۔

جو علماء فرماتے ہیں کہ آپ کی زبان کی گروہ مکمل طور پر ختم ہو گئی تھی ان کی دلیل یہ ارشاد ہے۔ قَدْ اُوْتِيْتُمْ سُوْلًا لَّكُم مِّنْ لَّدُنِّي لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (تو معلوم ہوا کہ آپ کی زبان کی گروہ بھی کھل گئی تھی اور جو کہتے ہیں کہ یہ گروہ نہیں کھلی تھی وہ اس ارشاد سے استدلال کرتے ہیں۔ هُوَ اَفْضَحٌ وَّيُنَى لِنَسَانَا دوسری دلیل یہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کی طرف سے حکایت کرتے ہوئے کہا ہے۔ اَمْ اَنْزَلْنَا لَكَ خَيْرًا مِّنْ هٰذَا الَّذِي نَبِيُّ هٰؤُلَاءِ يَكْفُرُوْنَ ترجمہ: کیا میں بہتر نہیں ہوں اس شخص سے جو دلیل ہے اور بات بھی صاف نہیں کر سکتا پہلے قول کا۔ دوسرے طبقہ کے علماء نے یہ جواب دیا ہے کہ آپ نے مطلقاً اپنی زبان کی گروہ کھولنے کا سوال نہیں کیا تھا بلکہ اتنی گروہ دور کرنے کا سوال کیا تھا جو دوسروں کو بات سمجھانے سے مانع ہو، اس وجہ سے اس کو گروہ ذکر فرمایا اور یفقهو کو امر کے جواب میں مجرم ذکر فرمایا ہے۔

وَ اجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اٰهْلِیْ ۝ هٰرُوْنَ اَخِيْ ۝

”اور تھر فرمایا میرا وزیر میرے خاندان سے یعنی ہارون کو جو میرا بھائی ہے لے۔“

لے وزیر، وزر سے مشتق ہے جس کا معنی جو بھ ہے۔ چونکہ وزیر امیر (بادشاہ) کا بوجھ اٹھاتا ہے اس لئے اسے وزیر کہتے ہیں یا یہ اس الزور سے مشتق ہے۔ جس کا معنی وہ پناہ گاہ ہے جو پہاڑ میں ہوتی ہے کیونکہ بادشاہ اس کی رائے اور مشورے کی وجہ سے محفوظ ہو جاتا ہے اور تمام امور میں اس کی طرف پناہ لیتا ہے اس لئے اسے وزیر کہتے ہیں۔ اسی سے الموازرة ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کی اصل ازیر ہے اور یہ الازر سے مشتق ہے۔ جس کا معنی قوت ہے، یہ فعل بمعنی مفاعل ہے جیسے عیبر بمعنی معاشر اور حلیم بمعنی مجالس ہے۔ چونکہ اوزار میں ہمزہ واؤ سے بدل جاتا ہے اس لئے ازیر میں بھی ہمزہ واؤ سے بدل جاتا ہے کیونکہ ان دونوں کا معنی ایک ہے۔ من اہلی یا تو وزیر کی صفت ہے یا اجعل کے متعلق ہے اور ہارون اجعل کا مفعول اول ہے اور وزیر مفعول ثانی ہے لیکن اہمیت کے پیش نظر اسے مقدم کیا گیا ہے۔ اور لی یا تو فعل کے متعلق ہے۔ یا مندوف کے متعلق ہو کہ وزیر اسے حال ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لی مفعول ثانی ہو اور وزیر مفعول اول ہو۔ اور ہارون وزیر کا عطف بیان ہو۔ یہ بھی ترکیب ہو سکتی ہے کہ وزیر مفعول اول ہو اور من

اہلی مفعول ثانی ہو اور لی تیسین ہو جیسے وَ لَمْ يَكُنْ لَدَٰهُ طَقُوۡا۟ اَحَدًاۙ میں ہے اسی کو ابن کثیر اور ابو عمرو نے باء فتح کے ساتھ اور باقی قراء نے یا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور افی ہارون سے بدل ہے یا مبتدا ہے اور ما بعد اس کی خبر ہے۔

اَشَدُّۙ بِهٖۙ اٰمِرِيۙ ﴿۱﴾

”مضبوط فرمادے اس سے میری کمر ل“

۱۔ تاسوس میں اللازر کا معنی احاطہ قوت، ضعف ضد التقویہ اور پیچھے لکھا ہے (1)۔ معنی یہ ہے کہ اس سے میری کمر مضبوط کر دے یا میری قوت مضبوط کر دے یا میرے ضعف کو قوت عطا فرمادے۔

وَ اَسْرٰٓئِۡلَہٗۙ فِیۙ اٰمِرِیۙ ﴿۲﴾

”اور شریک کر دے اسے میری (اس) ہم میں ل“

۱۔ اسے امر نبوت اور تبلیغ میں شریک بنا دے۔ ابن عامر نے اشد کو الف کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ہمزہ قطعی کے ساتھ پڑھا ہے اور اشوک کو مضارع کا صیغہ کر کے ہمزہ کو ضم کر کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے جواب امر کی بناء پر ہمزہ پڑھا ہے۔ جمہور علماء نے اشد کو ہمزہ وصلی مفہوم کے ساتھ اور اشوک کو ہمزہ قطعی مفتوح کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ اجعل سے بدل اشتغال ہے۔

کٰیۙ نَسِیۡحَکَ کَثِیۡرًا ﴿۱﴾ وَ نَذٰرَکَ کَثِیۡرًا ﴿۲﴾ اِنَّکَ کُنْتَ بِنَا۟ بِصِیۡرًا ﴿۳﴾

”تا کہ ہم دونوں کثرت سے تیری پاکی بیان کریں اور ہم کثرت سے تیرا ذکر کریں چنگ تو ہمارے (ظاہر باطن کو) خوب دیکھنے والا ہے ل“

۱۔ کلبی نے نسح کا معنی نصلی کیا ہے، یعنی ہم کثرت سے تیری نماز پڑھیں (2) آپ نے یہ درخواست اس لئے کی تھی کیونکہ تعاون و رغبت کو مزید بڑھاتا ہے اور زیادہ نیکیاں کرنے پر براہمخیز کرتا ہے تو ہمارے حال سے اچھی طرح باخبر ہے اور تو یہ بھی جانتا ہے کہ تعاون ہمارے لئے بہتر ہے اور تجھے یہ بھی علم ہے کہ میرے اس معاملہ میں جس کا تو نے مجھے حکم فرمایا ہے ہادوں بہتر مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

قَالَۙ قَدًاۙ اَوْۙ نَبِیۡتَۙ سُوۡلَکَۙ یٰۤاٰیۡتُوۡسٰی ﴿۱﴾

”جواب ملا منظور کر لی گئی ہے آپ کی درخواست اے موسیٰ ل“

۱۔ سنوٰی بروزن فعل ہے اور یہ مفعول کے معنی میں ہے جیسے خبر معنی مجبور اور اکل معنی ماکول ہوتا ہے۔

وَ لَقَدْۙ مَنَّۡنَاۙ عَلَیۡکَۙ مَرَّةًۙ اٰخَرٰیۙ ﴿۱﴾

”اور ہم نے اسان فرمایا تھا تم پر ایک بار پہلے بھی ل“

۱۔ یہ ضد و مفرد قسم کا جواب ہے، یعنی تم بخدا ہم نے تم پر انعام کیا تھا۔ اس سے پہلے بھی۔ مرۃً اٰخریٰ منننا کی طرف ہے۔ بعض نے مرۃً اٰخریٰ کا معنی اس مرتبہ کیا ہے۔

اِذْۙ اَوْحٰیۡنَاۙ اِلَیۡۙ اٰیۡتَکَۙ مَاۙ یُوۡحٰیۙ ﴿۱﴾

”جب ہم نے وہ بات الہام کی تھی تمہاری ماں کو۔ جو الہام ہی کے جانے کے قابل تھی۔“

۱۔ اذ التعلیل کے لئے ہے اور فسناً کی طرف بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں وحی سے مراد الہام ہے یا خواب میں بتانا ہے یا اس وقت جو نبی تھا اس کے ذریعے بتانا ہے یا فرشتے کے ذریعے بتانا ہے جیسے حضرت مریم کو فرشتے کے ذریعے پیغام بھیجا تھا لیکن یہ نبوت کے طریقہ پر نہ تھا۔
 نوٹ: وحی اور نبوت تشریحی انبیاء کرام کے ساتھ مختص ہے اور انبیاء کرام سب مرد تھے اور یہ سلسلہ نبوت محمد ﷺ پر ختم ہو گیا۔ لیکن وہ وحی جو تشریحی نہیں ہوتی خواہ وہ بطریق الہام ہو یا ملائکہ کی کام کے ذریعے ہو (جس طرح مریم علیہا السلام کے ساتھ ہوئی تھی) انبیاء کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ بلکہ یہ اولیاء کے لئے بھی ہو سکتی ہے اور یہ غیر تشریحی وحی کا سلسلہ نبی کریم ﷺ کے بعد بھی منقطع نہیں ہوا۔ اسی طرح بیرونی کی وجہ سے کمالات نبوت کا حصول بھی غیر انبیاء کے لئے ہوتا رہتا ہے۔ شیخ اکبر محمد بن عبد اللہ بن ابن عربی قدس سرہ الفوائد احاطت کے دو بہتر درجوں میں باب میں لکھتے ہیں کہ نبوت تشریح کے حکم کے اعتبار سے اس امت میں ختم ہو چکی ہے لیکن اس کی میراث ختم نہیں ہوئی۔ پس کچھ لوگ نبوت کے وارث ہوتے ہیں اور کچھ رسالت کے وارث ہوتے ہیں اور کچھ نبوت اور رسالت دونوں کے وارث ہوتے ہیں۔ علماء جو یہ فرماتے ہیں کہ نبوت اختصاص الہی ہے اس سے مراد نبوت تشریحی ہے، یعنی وحی الہی کے ذریعے احکام کا نزول انبیاء کرام پر ہوتا ہے اور یہی نبوت تشریحی ہے۔ جس کے متعلق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا نبوت و رسالت ختم ہو چکی ہے۔ میرے بعد نبوت نہیں ہے۔ شیخ صاحب نے فتوحات کے باب الصلوٰۃ میں بھی اس طرح لکھا ہے۔ فرماتے ہیں یہ مقررین لوگ ہیں جن کے متعلق فرمایا۔ عَدِيْنَا نَقِيْرُوْبُ يَهَيَا الْاَنْصَرُ يُؤْنُ۔ میں نے سورہ نساء اور سورہ واقعہ میں ذکر کیا ہے کہ مقررین سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو وارث کمالات نبوت حاصل ہوتے ہیں، وہ وحی جو تشریحی نہیں ہے انبیاء کرام کے ساتھ مختص نہیں ہے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی وحی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا لَقَدْ كَانَ فَرِيْضًا قَبْلَكُمْ مِنَ الْاٰمَمِ نَاسٌ مُّتَعِدِّيُوْنَ فَاِنْ يَكُنْ مِنْ اُمَّتِيْ مِنْهُمْ اَخَذَ فَرِيْضَةً عَمْرُوْا۔ تم سے پہلے امتوں میں کچھ لوگ محدث تھے میری امت میں سے اگر کوئی ایک محدث ہے تو وہ عمر ہے (۱)۔ بخاری مسلم نسائی اور ابو نعیم الموصلی نے اپنی مسند میں حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ سے یہ حدیث اس طرح مروی ہے۔ لَقَدْ كَانَ فَرِيْضًا قَبْلَكُمْ مِنَ نَبِيِّ اِسْرَائِيْلَ وَجَالٍ يَكْلَمُوْنَ مِنْ غَيْرَانِ يَكُوْنُوْنَ اَنْبِيَاۗءَ فَاِنْ يَكُنْ مِنْ اُمَّتِيْ اَخَذَ فَعَمْرُوْا۔ تم سے پہلے بنی اسرائیل میں ایسے کمال مرد تھے جن سے (وحی کے ذریعے) کلام کی جاتی تھی لیکن وہ انبیاء نہیں تھے پس اگر میری امت میں کوئی ایسا شخص ہے تو وہ عمر ہے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ لَوْ كَانَ الْعَدِيُّ نَبِيًّا لَكَانَ عَمْرُوْبُنِ الْخَطَّابِ (2) (اگر میرے بعد نبی ہوتا تو عمر بن الخطاب ہوتا۔ اس حدیث کو امام احمد ترمذی نے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے اسے حسن کہا ہے ابن حبان اور حاکم نے عقبہ بن عامر سے روایت کی ہے اور دونوں نے اسے صحیح کہا ہے طبرانی نے عمصر بن ماک سے روایت کی ہے۔ ابوسعید الخدری اور ابن عساکر نے ابن عمر سے روایت کیا ہے۔

شیخ شعر ادوی البواقیت والجاہر میں فرماتے ہیں کیا الہام بغیر واسطہ کے ہو سکتا ہے؟ پھر خود ہی جواب دیتے ہیں کہ ہاں ہو سکتا ہے، کبھی بندے کو اس خاص وجہ سے الہام ہوتا ہے جو ہر بندے اور اس کے رب کے درمیان ہوتی ہے اور اس وجہ کو فرشتے بھی نہیں جانتا۔ لیکن اس وجہ کے انکار کی طرف لوگ جلدی کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے موبی علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام پر انکار کیا تھا۔ اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ رسول اور نبی فرشتے کو آنکھوں سے دیکھتے ہیں لیکن غیر رسول اس کا اثر محسوس کرتا ہے لیکن اس کا مشاہدہ

نہیں کرتا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ غیر رسول کو کبھی فرشتہ کے ذریعے الہام فرماتا ہے۔ اور کبھی سارے واسطے ختم کر کے اس مخصوص تعلق اور وجہ کی بنا پر الہام فرماتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کو عظیم ترین القاء ہے۔ اور یہ القاء رسول اور ولی دونوں کو ہوتا ہے۔

شیخ عبدالوہاب الشترانی، شیخ ابوالموہب الشاذلی قدس اللہ سرہما سے روایت کر کے لکھتے ہیں کہ جب بعض لوگوں نے کسی کے اس قول پر اعتراض کیا کہ میرے دل نے مجھے اپنے رب کی طرف سے بات بتائی تو آپ نے فرمایا اس قول کے انکار کی کوئی وجہ نہیں، کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میرے دل نے مجھے اپنے رب کی طرف سے بطریق الہام بات بتائی۔ اور یہ الہام اولیاء کرام کی وحی ہے، یہ وہ انبیاء کرام والی وحی نہیں ہے۔ ان کا انکار صرف اس پر ہو سکتا ہے جو یہ کہے۔ کَلَّمَنِي رَبِّيَ كَمَا كَلَّمَهُ مُوسَىٰ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَمِيرَةٍ رَبِّ نَجَّىٰ عَنْهُ مِنْ مَرِيضَةٍ أَسْرَأَتْهُ (شیخ موصوف کا کلام ختم ہوا)

میں کہتا ہوں ولی بھی فرشتے کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے جیسے مریم نے جبرئیل امین کو دیکھا تھا جب وہ بشری لباس میں تشریف لائے تھے۔ فَتَنَّا لِيَسْبَغَنَّكَ مِنَ الْإِنسَانِ لِيَمْلِكَ لَكَ مِنَ الْكَلِمَاتِ مَا تَأْتِي بِهَا نَفْسٌ يَدْرِكُ الْبَصَرَ وَغَلَاقِبَ الْأُصْبُعِ لَمْ يَتَفَكَّرْ فِيهَا شَيْئًا بَلْ هِيَ كَلِمَاتٌ كُنَّتْ مِنْ قَبْلُ وَكَانَ آلِدُكُمْ مِنَ الْعَالَمِينَ (سورہ مریم)

۱۔ مایوحی سے مراد ایسی چیز ہے جو صرف وحی کے ذریعے ہی معلوم ہو سکتی ہے یا وہ اس لائق ہے کہ اسے وحی کیا جائے کیونکہ اس کی شان بہت بلند ہے اور اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

أَنْ أَقْبَلُ فِيهِ فِي الثَّابُوتِ فَأَقْبَلُ فِيهِ فِي الْبَيْتِ فَلْيُقِمْهُ الْيَمِّ بِالسَّاحِلِ يَأْخُذْهُ
عَدُوِّي وَعَدُوُّ لَهٗ ۖ وَالْقَلْبُ عَلَيْكَ مَجْبَةٌ مَبِيَّةٌ ۖ وَابْتِغَاءٌ عَلَىٰ عِبِيٍّ ۖ

”یہ کہہ دو اس معصوم بچے کو صندوق میں پھر ڈال دو اس صندوق کو دریا میں پھینک دے گا اسے دریا ساحل پر لے پکڑے گا اسے وہ شخص جو میرے دشمن ہے اور اس بچے کا بھی دشمن ہے۔ اور (اے موسیٰ) میں نے پروردگار کا تقاضا ہے کہ تم اپنی جناب سے (تا کہ جو دیکھے فریفت ہو جائے اور) اس تدبیر کا منشا یہ تھا کہ آپ کی پرورش کی جائے میری چشم (کرم) کے سامنے۔“

۱۔ اُن مفسرہ ہے کیونکہ وہی معنی قول ہے یا مصدر یہ ہے اور اس سے پہلے باء حرف جرمقدر ہے۔ اَلْيَمِّ سے مراد دریا کے نل ہے۔ الساحل سے مراد جانب ہے۔ جانب کو ساحل اس لئے کہتے ہیں کیونکہ پانی اس جانب (کنارہ) کو چھلتا ہے اور اتارنا ہے اس سے جو اس کے اوپر ہوتا ہے۔ یہاں فلیقہ امر کا صیغہ ذکر فرمایا تا کہ ما قبل کلام سے مناسبت رہے لیکن اس کا معنی خبر ہے، یعنی دریا سے ساحل پر ڈال دے گا۔ لفظی تناسب کے اعتبار سے عطف کیا گیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ امر کا صیغہ اپنے معنی پر ہے۔ دریا کو حکم ہو رہا ہے اور یہ اس امر پر معطوف ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ یہ اس طرح ہے جیسے کہا جاتا ہے۔ احسن الی زید ولحسن زید، الیک بعض علماء فرماتے ہیں اس کا عطف قلنا کی تقدیر کے ساتھ اور سینا پر ہے تقدیر ہمارے اس طرح ہوگی قلنا ليقفه اليم بالساحل۔ میں کہتا ہوں امر اگر خبر کے معنی میں ہے تو پھر وہ وحی میں داخل ہے۔ اور اگر امر حکم کے معنی میں ہو تو پھر قلنا کی تقدیر کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس صورت میں اس کا عطف الفذیہ فی الیم پر بھی جائز ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ دریا کو حکم کیسے ہو سکتا ہے، دریا تو عقل اور سمجھ رکھتا ہی نہیں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ امر کو معنی ہے، اس کے لئے تعقل (سمجھنا) ضروری نہیں ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں جب دریا کو موسیٰ علیہ السلام کو ساحل پر ڈالنا واجب تھا کیونکہ ارادہ الہی اس کے متعلق ہو چکا تھا تو

اللہ تعالیٰ نے دیا کو ایسے بنا دیا گویا وہ عقل مند ہے اور اللہ تعالیٰ کے امر پر مطلع ہے۔ پھر یا خدا کو امر کے جواب میں ہونے کی وجہ سے مجرم و مذکور فرمایا۔

ع عدو لی و عدولہ سے مراد فرعون ہے۔ صوفیاء میں نئے محققین فرماتے ہیں جمادات اگرچہ ہماری نسبت کے اعتبار سے سمجھ اور بے عقل ہیں اور ہمارے لئے ان سے خطاب کرنا بھی جائز نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے امر کے لئے یہ ذی شعور اور اطاعت گزار ہیں جیسا کہ قرآن فی نصوص دلالت کرتی ہیں۔ واذنت لوبہا و حقت (اور کان لگا کر سننے لگا گا اپنے رب کا فرمان اور اس پر فرض بھی سبکی ہے) قالنا اینسا طانعن (دونوں نے عرض کی ہم خوشی خوشی (دست بستہ) حاضر ہیں۔ اسی طرح حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا پہاڑ پہاڑ کو ندا دیتا ہے۔ کہ اے فلاں کیا تیرے سے کوئی اللہ کا ذکر کرتے ہوئے گذرا ہے (1)۔ مولانا روم نے فرمایا

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند پیش تو مردہ و برحق زندہ اند
مئی ہوا پانی آگ سب اللہ کے بندے ہیں اسے انسان تیرے سامنے یہ مردہ ہیں لیکن اللہ کے لئے زندہ ہیں
فرعون پر دشمن ہونے کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی نسبت سے حقیقت ہے کیونکہ وہ مشرک تھا (اور مشرک اللہ کے دشمن ہیں) لیکن موسیٰ علیہ السلام کی نسبت سے اس کا اطلاق مجاز ہے کیونکہ جب اس نے موسیٰ علیہ السلام کو اٹھایا تھا تو وہ اس وقت آپ کا دشمن نہ تھا۔ اسی وجہ سے عدو کا لفظ سزا دہ کر فرمایا کیونکہ حقیقت و مجاز کا ایک لفظ میں جمع کرنا ممنوع تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عدو کا نکر امبالغہ کے لئے ہو۔ اور دونوں لفظوں سے مراد مستقبل کی بات ہو یا موجود وقت مراد ہو کیونکہ فرعون کا بنوں کی خبروں کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے درپے تو تھا۔ کیونکہ فرعون کو کا بنوں نے کہا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہو گا جو تیری بادشاہی کو ختم کر دے گا۔ اسی وجہ اس نے بہت سی تعداد میں بنی اسرائیل کے بچے قتل کر دیا دیے تھے۔ اسے معلوم نہ ہو گا کہ موسیٰ وہ بچہ ہے در نہ وہ اسے بھی قتل کر دیتا۔ تمام ضمیریں موسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہیں۔ بعض کو موسیٰ کی طرف اور بعض کا تابوت کی طرف لفظ نون کلام میں متاخر یا باعث بننا ہے۔ مندر میں ذرا جانے والا اگرچہ بالذات تابوت تھا لیکن موسیٰ علیہ السلام بھی بالعرض ان صفات سے موصوف تھے کیونکہ آپ تابوت کے اندر تھے۔

امام بغوی نے لکھا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے تابوت بنایا اور اس میں دھنی ہوئی روٹی رکھی پھر اس میں موسیٰ علیہ السلام کو رکھ دیا۔ پھر تابوت میں جو کچھ شگاف اور دراڑیں تھیں ان کو بند کر کے دریا نے نیل میں ڈال دیا۔ دریا نے نیل سے ایک بڑی نہر نکل کر فرعون کے گھر کی طرف جاتی تھی۔ فرعون اپنی بیوی آسیہ کے ساتھ اسی نہر کے کنارے بیٹھا تھا کہ پانی اس تابوت کو پہنچا کر لے آیا۔ فرعون نے اپنے غلاموں اور لونڈیوں کو حکم دیا کہ اس تابوت کو نکال لاؤ۔ وہ تابوت نکال کر لے آئے اور اس کا دروازہ کھولا تو اس میں ایک بچہ تھا جو انتہائی خوش شکل اور نرہ صورت تھا۔ فرعون نے جب اسے دیکھا تو اس کی من بھائی صورت پر فریفت ہو گیا (2) اس چیز کا اظہار قرآن نے وَالْقَبْطِ عَلَیْکَ مَعْجَہُ عَنی کے الفاظ میں کیا ہے۔ منی کا لفظ طرف مستقر ہے اور محبت کی صفت ہے یا القبت کی ظرف انو ہے۔ مطلب یہ ہو گا کہ میں نے تجھ پر ایسی محبت کا پر تو ڈالا جو میری طرف سے ہے اور تجھے میں نے دلوں میں تخلیق کیا ہے۔ یا یہ معنی کہ میں نے اپنی طرف سے تجھ پر محبت ڈال دی یعنی میں نے تجھ سے محبت کی جب کسی سے اللہ تعالیٰ محبت فرماتا ہے تو کائنات کی ہر چیز اس سے محبت فرماتی ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ میں نے اس سے محبت کی اور اپنی مخلوق کے دلوں میں بھی اس کی محبت پیدا فرمادی۔ حضرت نکر مر فرماتے ہیں جو بھی آپ کو ایک نگاہ دیکھ لیتا دیوانہ ہو جاتا۔ حضرت قتادہ نے فرمایا موسیٰ علیہ السلام کی آنکھوں میں اتنی

ملاحظہ تھی کہ جو بھی آپ کے دیدار سے مشرف ہوتا ہے آپ سے عشق ہو جاتا (1)۔ یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ میں نے تیرے دل میں اپنی طرف سے محبت ڈالی اور وہ محبت تجھ پر غالب آگئی اور تو مجھ سے دل و جان سے محبت کرنے لگا اور تو نے اپنے دل کو میری محبت کے لئے خاص کر دیا اور کسی غیر کی طرف متوجہ نہ ہو اور تو محبت کرنے والوں کا سردار بن گیا۔ حضرت شیخ محمد دلف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں حضرت مولیٰ کلیم کے تعین کا مبداء، محبوبیت تھا اور تیارے محمد ﷺ کے تعین کا مبداء، محبوبیت تھی۔ اسی وجہ سے مولیٰ کلیم عاشقوں کے سردار ہیں اور محبوب کریم ﷺ جو یوں کے سردار ہیں۔

ایک صوتی کشف کی نظر سے محبت کے دائرہ میں ایک محیط دیکھنا ہے جو محبت ہے اور یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعین کا مبداء ہے۔ اور ایک اسے مرکز نظر آتا ہے جو محبت صرف ہے اور یہ حضرت مولیٰ علیہ السلام کے تعین کا مبداء ہے اور مرکز محیط سے افضل اعلیٰ اور وسیع ہوتا ہے، مرکز اور محیط کی نسبت ایسی ہے جیسے چاند کی نسبت بالہ سے ہے۔ پھر مزید بلندی کے وقت مرکز دائرہ محبت میں محیط نظر آتا ہے اور یہ مولیٰ علیہ السلام کے تعین کا مبداء ہے اور اس بلندی میں جہاں مرکز محیط بن گیا ہے وہ جو مرکز ہے وہ محبوب کریم ﷺ کا مبداء تعین ہے۔ جب محبوب کریم ﷺ جو بیت کے اس انتہائی مقام پر فائز ہیں تو آپ کا مبداء تعین دائرہ مجموعیہ صرف کا مرکز ہوا اور دائرہ مجموعیہ بیت کے محیط کو آپ ﷺ نے اپنی امت کے بعض افراد کے لئے چھوڑ دیا (یہاں محیط سے مراد مجموعیہ بیت مجزہ ہے) اور جس ذات کے لئے یہ مجموعیہ بیت مجزہ آپ ﷺ نے چھوڑی ہے وہ محمد دلف ثانی رضی اللہ عنہ کی ذات ہے۔ آیت کے الفاظ کا ظاہر اس بات کا مقتضی ہے کہ دریا نے آپ کو ساحل پر چیکھا تھا اور پھر آل فرعون نے آپ کو اٹھایا تھا تاکہ انجام کار وہ ان کا دشمن اور حزن کا باعث ہو جائے اگر صحیح ہو کہ آل فرعون نے انہیں دریا سے نکالا تھا (جیسا کہ ابھی گذر چکا ہے) تو تطبیق اس طرح ہوگی کہ دریا نے انہیں اس نہر کے منہ پر ڈال دیا۔ جو فرعون کے باغ کی طرف جاتی تھی۔ پھر اس نہر نے انہیں باغ کے تالاب میں پہنچا دیا تھا اور آل فرعون نے انہیں تالاب سے نکالا تھا۔ القیت کا عطف اوصیاء پر ہے۔

صنعع کا یہاں معنی ترویجی ہے۔ یعنی تیری تربیت کی جانے اور تجھ سے احسان کیا جائے۔ یہ صنعت فری سے مشتق ہے جس کا معنی کہ میں نے چھوڑے کی اچھی طرح دیکھ بھال کی اور جعفر نے اس کو جزم کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ جیسا ہے۔ عینی کو نافع اور ابو عمر نے بناء کے فتح کے ساتھ اور باقی قراء نے بناء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ علمی عینی لتضع کی ضمیر مرفوع سے حال ہے۔ جمہور کی قرأت کے مطابق ولتضع ایک علت مضمرہ پر معطوف ہے جس کی تدریس لبتعطف علیک ہے یا یہ فعل معلل کے انتہار کے ساتھ سابقہ جملہ پر معطوف ہے اس صورت میں تقدیر عبارت یہ ہے فعلت ذالک لتضع اور ابو جعفر کی قرأت پر یہ یا خذہ پر معطوف ہوگا۔

اِذْ تَسْمِعُ اٰصْحٰكَ فَمَقُوْلٌ هَلْ اَدْرٰكُمْ عَلٰی مَنْ يَّلْقٰهُ ۗ فَرَجَعْنَا اِلٰی اٰمٰنِكَ
كِي تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ۗ وَ قَتَلْتَنَفْسًا فَجَئِبَةً مِنَ النِّعَمِ ۗ وَ قَتَلْتَك
فُؤُوْدًا ۗ فَلَيْسَتْ بِسِنِيْنَ فِيْ اَهْلِ مَدْيَنَ ۗ لَمْ جِئْتِ عَلٰی قَدَرٍ يُّمُوْسٰى ۝

”یاد کرو جب چلے چلے آئی آپ کی بہن اور کہنے لگی (فرعون کے اہل خانہ سے) کیا میں بتاؤں تمہیں وہ آدمی جو اس کی پرورش کر سکے۔ پس (یوں) ہم نے آپ کو لوٹا دیا آپ کی ماں کی طرف سے تاکہ (آپ کو) دیکھ کر اپنی آنکھ ٹھنڈی

کرے اور ہم تاک نہ ہو اور (تمہیں یاد ہے جب) تو نے مارڈالا تھا ایک شخص کو پس ہم نے نجات دی تھی تمہیں غم و اندوہ سے اور ہم نے تمہیں اچھی طرح جانچ لیا تھا جس پھر تم ظہر سے رہے کئی سال اہل مدین میں پھر تم آگئے ایک مقررہ ۱۰۰۔۔۔ پر اے موسیٰ ہے۔“

۱۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہمشیرہ کا نام مریم تھا۔ یعنی یاد کرو جب تیری بہن مریم آئی تاکہ تیری خبر معلوم کرے انہوں نے بہت سے دودھ پلانے والی عورتوں پر تمہیں پیش کیا اور تو نے کسی ایک کے پستان کو مت لگا تا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ اذ طرف ہے القیت کی یا لتصنع کی یا یہ اذ وحینا سے بدل ہے اس بناء پر کہ اس سے مراد وسیع وقت ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں اذ تعلیل کے لئے ہے۔ آپ کی ہمشیرہ نے فرمایا کہ میں تمہیں ایک عورت بتاتی ہوں جو اسے دودھ پلانے لگی اور یہ اس کے سینے سے چٹ جائے گا۔ جب آپ کی ہمشیرہ نے یہ کہا تو وہ اس کی بات کے قائل ہو گئے۔ ہمشیرہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو لے آئی اس نے سینے سے لگایا تو آپ نے ان کا دودھ قبول فرمایا۔

۲۔ ہم نے جو آپ کی والدہ سے وعدہ کیا تھا انا رادھو الیک تو اس کو پورا کرتے ہوئے ہم نے تجھے تمہاری ماں کی طرف اپنی حسن تدبیر سے لوٹا دیا ہے تاکہ تیری ملاقات سے ان کی امانت کو بھنگ اور سکون نصیب ہو اور تیرے فریق میں پریشان نہ ہو یا تو ان کے فریق میں غمزدہ نہ ہو۔ ایک اور افعال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اے موسیٰ یاد کرو جب تم نے ایک قطبی ظالم شخص کو قتل کیا تھا جب کہ تجھ سے ایک اسرائیلی نے مدد طلب کی تھی۔ اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عمر بارہ سال تھی۔ کعب الاحبار نے اسی طرح فرمایا ہے (۱)۔ ہم نے تمہیں اس قتل پر مغفرت کا مشورہ سنا کہ تم سے غم و اندوہ کے گہرے بادل دور کر دیے اور فرعون کے قصاص لینے کے خوف سے مدین کی طرف ہجرت کے ذریعے امن دیا تھا۔

۳۔ فتونا مصدر ہے جیسے قعود مصدر ہے یا یہ جمع ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں کہ ابن عباس نے اس کا معنی اختیاب ناک اختیاب آگیا ہے۔ یعنی ہم نے تجھے اچھی طرح آزمایا۔ ضحاک نے یہ معنی لکھا ہے۔ ابن ابی ناسک ابتلاء غلبہ نے تمہیں خوب آزمائش میں مبتلا کیا (۲) یہ معنی فتونا کے مصدر ہونے کے اعتبار سے ہے۔ یہ معنی کہ ہم نے مختلف آزمائشوں کے ذریعے تمہیں آزمایا یا اس صورت میں فتونا جمع فتن ہے یا یہ فتنہ کے معنی میں ہے اور نساء کا اعتماد ترک کیا گیا ہے۔ حجرۃ اور بدرۃ میں تاکو ذکر نہ کر کے حج راوہ بدرۃ ذکر کیا جاتا ہے۔ مجاہد نے یہ معنی لکھا ہے اخلصاک اخلاصاً ہم نے تمہیں چن لیا ہے۔ سعید بن جبیر حضرت ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں کہ فتون سے مراد آپ کا آزمائشوں میں واقع ہونا ہے۔ جن سے پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو خلاص عطا فرمایا تھی۔ پہلی آزمائش یہ تھی کہ آپ کی والدہ آپ کے ساتھ اس سال حاملہ ہوئیں جس سال میں فرعون پیدا ہونے والے بچوں کو قتل کر دیتا تھا۔ آپ کو تابوت میں رکھ کر دریا میں بھینکنا، اپنی ماں کے علاوہ کسی دایہ کے دودھ پینے سے روک دینا، آپ کا فرعون کی داڑھی بھینچنا حتیٰ کہ اس نے آپ کو قتل کا ارادہ کر لیا تھا، آپ کا موتیوں کی بنائے آگ کا انگارہ اٹھالینا پھر آپ کا قطبی کو قتل کرنا۔ پھر آپ کا مدین کی طرف نکل جانا۔ میں کہتا ہوں پھر مدین کی طرف ہجرت کرتے وقت مختلف مشقتیں برداشت کرنا۔ مثلاً وطن کا چھوڑنا، اپنے رشتہ داروں کی جدائی اٹھانا، احتیاط کے ساتھ بیول چلنا، زرادراہ کا ساتھ نہ ہونا اسی طرح تکلیفیں اٹھانا وغیرہ۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے تجھے یکے بعد دیگرے مشقت کی بجٹی میں ڈال کر خوب صاف و شفاف کر لیا جس طرح سونے کو آگ میں ڈالا جاتا ہے اور اس کے خبث اور کھوٹ کو دور کر کے سونے کو خالص کر دیا جاتا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی سے نکاح کرنے کے بعد مہر کی ادائیگی کے لئے کئی سال حضرت شعیب علیہ السلام کی بکریاں چراتے رہے۔ مدین مصر سے آٹھ مراحل کے فاصلہ پر ہے۔ وہب فرماتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس اٹھائیس سال رہے۔ دس سال ان کی بیٹی کے مہر کے طور پر اور اٹھارہ سال ویسے بعد میں رہے (اس عمر کی تکمیل کے لئے جس میں انبیاء کو نبوت ملتی ہے یعنی چالیس سال) حتیٰ کہ آپ کی اولاد ہوگئی (1)۔

یہ پھر تم وادی مقدس میں آئے اس وقت پر جو میں نے تیرے آنے کے لئے مقرر کیا تھا محمد بن کعب نے یہی مفہوم لکھا ہے۔ یا اس مقدار میں جس میں انبیاء کی طرف وحی کی جاتی ہے (2)۔ یعنی جب تیری عمر چالیس سال ہوگئی، یہ عبد الرحمن بن کعبان کی توجیہ ہے اور اکثر مفسرین کا بھی یہی خیال ہے۔ یعنی وہ وقت جو اللہ تعالیٰ نے رسالت عطا کرنے کا مقرر فرمایا تھا اور وہ چالیس سال کی عمر کا وقت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے محبت اور انس کی وجہ سے موسیٰ کا حکم فرمایا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا من أحب شیئاً اکثر ذکوره (3) (جو کسی چیز سے محبت کرتا ہے وہ اکثر اس کا ذکر کرتا ہے) اس حدیث کو صاحب مسند الفردوس نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے۔

وَ اصْطَفَيْتَ لِنَفْسِكَ

”اور میں نے مخصوص کر لیا ہے تمہیں اپنی ذات کے لئے۔“

۱۔ یعنی میں نے میری تربیت کی اور خوب تربیت کی۔ نفسی کو کوفیوں اور ابن عامر نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور لفظاً یا کو وصل کی صورت میں انتقاء ساکنین کی وجہ سے ساتھ کر دیتے ہیں۔ جبکہ باقی قراء یاء کو فتح کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ یعنی میں نے تیری تربیت کی اور میں نے تجھے اپنے لئے منتخب فرمایا ہے تاکہ تو ظاہر و باطن میں کسی غیر کی طرف متوجہ نہ ہو میں کہتا ہوں اس کا یہ معنی بھی ممکن ہے میں نے تجھے بیکر اخلاق حسنة بنایا اور میں نے تیری اس طرح تربیت کی ہے کہ تو اب مجھ سے مناجات کرنے، میرا قرب حاصل کرنے اور میرے پیغام پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اِذْهَبْ اَنْتَ وَ اٰخُوكَ بِاَيْتِي وَ لَا تَبَيِّنَا فِي ذِكْرِي

”اب جائیے آپ اور آپ کا بھائی میری نشانیاں لے کر اور نہ سستی کرنا میری یاد میں۔“

۱۔ آیت سی سے مراد معجزات ہیں۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ نو نشانیاں مراد ہیں جو اللہ نے آپ کو عطا فرمائیں (4)۔ سدی نے ولاتنبا کا معنی لافسفا کیا ہے یعنی ذہیلانہ پڑانا۔ محمد بن کعب نے لاتفصوا معنی لکھا ہے۔ یعنی کوتاہی نہ کرنا۔ قاموس میں ونی کا معنی تھکاؤ، سستی اور کمزوری لکھا ہے (5)۔ ذکری کی یاء کو ابن عامر اور کوفیوں نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور وہ لفظاً یاء کو وصل کی صورت میں گرا دیتے ہیں اور باقی قراء یاء کے فتح کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ یہ حکم موسیٰ علیہ السلام کو وحی کیا گیا تھا کیونکہ ہارون علیہ السلام اس وقت مصر میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ ہارون علیہ السلام کو ساتھ لے جائیں اور ہارون علیہ السلام کو مصر میں وحی فرمائی کہ موسیٰ علیہ السلام سے ملو۔ پس موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کی ملاقات ہوئی، موسیٰ علیہ السلام نے وہ حکم سنایا جو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کیا تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں ہارون علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کے آنے کی خبر سنی تو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 218 (انجاریہ)

2۔ ایضاً۔ 3۔ کنز العمال: 1829 (التراث الاسلامی)

5۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1761 (التراث العربی)

4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 218 (انجاریہ)

انہوں نے راستہ میں ان کا استقبال کیا۔ پس اس وقت اللہ تعالیٰ نے دونوں کی طرف وحی فرمائی۔

إِذْهَبَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ كَفُرٌ ۖ

”آپ دونوں جائیں فرعون کے پاس وہ سرکش بنا بیٹھا ہے۔“

۱۔ اس کی سرکشی کا یہ عالم ہے کہ اس نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا ہوا ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے اسیلے موسیٰ علیہ السلام کو جانے کا حکم دیا پھر انہیں اور ان کے بھائی کو جانے کا حکم دیا، اس لئے کلام میں تکرار نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں پہلا جاننا مطلقاً ہے اور دوسرا جاننا امتیاد ہے، اس لئے تکرار نہیں ہے۔

فَقُولَا لَهُ تَوَلَّآ لَيْتِنَا لَعَلَّهٗ يَسْأَلُكُمْ أَوْ يَخْشَىٰ ۖ

”اور گفتگو کریں اس کے ساتھ نرم انداز سے ۱۔ شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا (میرے غضب سے) ڈرنے لگے۔“

۱۔ ابن عباس نے اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ تم کلام میں درشتی اور سختی نہ کرنا۔ مکرّم اور سدی فرماتے ہیں حضرت موسیٰ اور ہارون نے اس سے کلام کرتے ہوئے اسے کنیت سے پکارا۔ انہوں نے اسے ابو العباس کہہ کر پکارا۔ بعض نے لکھا ہے ابو الولید کہہ کر پکارا۔ مقاتل فرماتے ہیں نرم قول سے یہ مراد ہے کُلُّ لَكَ اِلٰی اَنْ تَكُوْنُ ﴿۱﴾ وَ اَهْوَيْكَ اِلٰی رَبِّكَ فَتُعْلَىٰ (کیا تیری خواہش ہے کہ تو پاک ہو جائے اور (کیا تو چاہتا ہے کہ) میں تیری رزبری کروں تیرے رب کی طرف تا کہ تو (اس سے) ڈرنے لگے (۱)۔ کیونکہ یہ انداز کلام ایسا ہے جس میں عرض اور مشورہ کی صورت میں دعوت ہے۔ یہ انداز اس لئے اپنایا تا کہ عارضی اقتدار کے نشتر میں بدست فرعون جہالت کی بنا، پران پر حملہ نہ کر دے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ان کو اس مفروضہ انسان سے بڑے لطیف اور شیریں لہجہ میں کلام کرنے کا حکم اس لئے دیا کیونکہ موسیٰ پر اس کا حق تربیت تھا، اس نے موسیٰ علیہ السلام کو پالا تو پوسا تھا اور آپ کی صغریٰ میں اس نے پرورش کی تھی۔ سدی کہتے ہیں قول لین سے مراد یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اس کے پاس آئے اور وعدہ کیا کہ اگر تو ایمان قبول کرے تو تجھے ایسی جوانی ملے گی جو کبھی زوال پذیر نہ ہوگی اور تجھے ایسی بادشاہی ملے گی جو تجھ سے مرے سے پہلے کبھی نہیں جائے گی اور کھانے پینے اور نکاح کی لذت مرنے کے وقت تک تجھ میں باقی رہے گی اور جب مرے گا تو جنت ملے گی۔

فرعون کو یہ بات اچھی لگی۔ لیکن ہمیشہ ہامان سے مشورہ کر کے کوئی حتمی فیصلہ کرتا تھا، ہامان اس وقت موجود نہ تھا۔ جب ہامان آیا اور فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا اس کے سامنے ذکر کیا اور کہا کہ میں تو چاہتا ہوں کہ موسیٰ علیہ السلام کی بات قبول کر لوں۔ ہامان نے اسے کہا میں تو تجھے دانشور اور صاحب رائے سمجھتا تھا (لیکن تو تو کودن ہے) تو رب ہے اور اب تو مربوط بننے کا راہ راہ کرتا ہے۔ اب تک تیری عبادت ہوتی رہی اب تو غیر کی عبادت کرنا چاہتا ہے۔ فرعون کی رائے کو ہامان نے بدل دیا اور وہ ایمان قبول کرنے سے محروم رہا۔

۱۔ شاید اس کے دل میں تمہاری صداقت متحقق ہو جائے یا اگر تمہاری صداقت اس پر متحقق نہ ہو اور نصیحت قبول نہ بھی کرے تو کم از کم اس کے دل میں خوف خدا کی چنگاری سلگ جائے۔ لعل کے معنی میں جور جا اور امید ہے اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے نہیں بلکہ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے علم سے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو تو علم تھا کہ یہ فرور و تکبیر کی جس گہری وادی میں بھٹک رہا ہے کبھی واپس نہیں آئے گا۔

یہ جملہ قولاً کے قائل ہے حال ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہے۔ یعنی اس سے نرم انداز میں گفتگو کرو، جب کہ فرعون کے نصیحت قبول کرنے اور اس کے ڈرنے کا وقت ہو یا قولاً کی علت کی بناء پر منصوب ہے۔ حسن بن فضل فرماتے ہیں یہ حکم فرعون کے علاوہ کسی طرف پھیرا جائے تو یہ معنی ہوگا کہ شاید نصیحت قبول کرنے والا نصیحت قبول کرے اور ڈرنے والا ڈر جائے (1)۔

قَالَ رَبَّنَا إِنَّا نَخَافُ أَنْ يُفْرِطَ عَلَيْكَ أَوْ أَنْ يَطْغَى ۝

”دونوں نے عرض کی اے ہمارے رب ہمیں یہ خوف ہے کہ وہ دست درازی کرے گا ہم پر یا سرکش سے پیش آئے گا۔“
 ۱۔ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام نے عرض کی ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ قتل کرنے اور مارنے میں جلدی کرے گا اور دعوت کی تکمیل اور معجزات کے اظہار سے پہلے ہمارا کام تمام کر دے گا۔ ابن عباس نے اس کی یہی تفسیر کی ہے۔ فرط علیہ فلان عرب اس وقت کہتے ہیں جب کوئی تکلیف پہنچانے میں جلدی کرے (2)۔ فرط سے مشتق ہے جس کا معنی بڑھنا ہے۔ اسی سے الفراط (آگے بڑھنے والا) ہے یا کہیں ایسا نہ ہو تیری ذات کے متعلق کوئی ایسا بھوس کرے جس سے تیری ذات منزہ دہرا ہے کیونکہ اس کا دل پتھری طرح سخت ہے اندیشہ ہے کہ تیری عبادت کی ہا فرمانی میں کہیں اور زیادہ نہ ہو جائے۔

قَالَ لَا تَخَافَا إِنِّي مَعَكُمَا أَسْمَاءُ وَأَسْمَى ۝

”ارشاد ہوا ڈرو نہیں میں یقیناً تمہارے ساتھ ہوں (ہر بات) سن رہا ہوں اور (ہر چیز) دکھ رہا ہوں۔“
 ۱۔ انسی لا تخافا کی تعلیل ہے۔ یعنی ڈرو نہیں کیونکہ میں حفاظت اور مدد کرنے کے لئے تمہارے ساتھ ہوں۔ میں تمہاری پکار سنوں گا اور جو کچھ وہ تمہارے ساتھ کرے گا میں اس کو دکھ رہا ہوں گا۔ میں اس سے تمہارا دفاع کروں گا، میں تم سے بے خبر نہیں ہوں تم پریشان نہ ہو یا یہ معنی کہ تمہارے اور فرعون کے درمیان جو بات ہوگی اور معاملہ ہوگا میں اسے دیکھوں گا اور سنوں گا اور ہر حال میں میں تمہاری مدد کروں گا اور تم سے تکلیف کو دور کروں گا۔ یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی چیز پر قادر نہیں ہوگا کیونکہ میں تمہارا محافظ ہوں دوران حالیکہ میں سننے والا اور دیکھنے والا ہوں۔ جب محافظ قادر سننے والا اور دیکھنے والا ہو تو حفاظت عمل ہوتی ہے۔

قَاتِلِيهِمْ فَقَوْلًا إِنَّا سَرُّوْنَا رَبِّكَ فَأَرْسَلْنَا مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ وَ لَا

تُعَذِّبُهُمْ قَدْ جِئْنَاكَ بِآيَاتٍ مِنْ رَبِّكَ ۝ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ اتَّبَعَ الْهُدٰی ۝

”پس (بے خوف و خطر) اس کے پاس جاؤ اور اسے بتاؤ ہم دونوں تیرے رب کے فرستادہ ہیں پس بھیج دے ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو اور انہیں (اب مزید) عذاب نہ دے ہم لے آئے ہیں تیرے پاس ایک نشانی تیرے رب کے پاس سے۔ اور سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔“

۱۔ فارسل پر فاء سببیہ ہے۔ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو شام کی طرف بھیج دے یا یہ معنی کہ انہیں اپنی بیگاری اور کاموں سے آزاد کر اور انہیں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے دے۔ ہم تیرے پاس اپنی رسالت و نبوت کی صداقت پر ایک نشانی لائے ہیں۔ یہاں موسیٰ علیہ السلام نے آیت (ایک نشانی) کا ذکر فرمایا۔ حالانکہ آپ کے پاس دو نشانیاں تھیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ دلیل سے بات ثابت کرنا چاہتے تھے۔ نشانوں کی وحدت اور تعدد کی طرف اشارہ مقصود نہ تھا۔ اسی طرح قَدْ جِئْنَاكَ بِآيَاتٍ مِنْ رَبِّكَ میں اور فاء بایۃ میں مفرد لفظ ذکر

فرمایا ہے۔

۱۔ یہ جملہ مقررہ ہے، مطلب یہ ہے کہ میرا اسلام، لاکھ لاکھ سالوں کا اسلام اور جنت کے فرشتوں کا اسلام ہدایت یافتہ لوگوں پر ہے یا یہ معنی کہ ہدایت کے پیروکاروں کے لئے دنیا میں مصیبت اور آخرت میں عذاب سے سلامتی ہے۔

إِنَّا قَدْ أُوحِيَ إِلَيْنَا أَنَّ الْعَذَابَ عَلَىٰ مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ۝

”بے شک وحی کی گئی ہے ہماری طرف کہ عذاب (خداوندی) اس پر آئیگا جو جھٹلاتا ہے (کلام الہی کو) اور روگردانی کرتا ہے۔“

۱۔ یعنی دنیا و آخرت کا عذاب تو اسے ملے گا جو رسولوں کو جھٹلاتا ہے، اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی عبادت سے روگردانی کرتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں۔ یہ جملہ تہلیل ہے یا آپ کے رسول ہونے کی تعلیل ہے۔ میں کہتا ہوں یہ انافہ رسول لا ربک سے بدل ہے۔ اس کلام میں حذف ہے۔ اصل میں اس طرح ہے کہ مویٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام اس کے پاس آئے اور یہ پیغام خداوندی سنایا اور حذف کا فائدہ کلام میں اختصار سے اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ یہ دلالت کر رہا ہے کہ اطاعت شعرا کو جب کسی کام کے کرنے کا حکم دیا جاتا ہے تو وہ ضرور کرتا ہے۔

قَالَ فَمَنْ رَأَيْتُمَا يَمُوسَىٰ ۝

”فرعون نے پوچھا مویٰ! تم دونوں کو اب کون ہے؟“

۱۔ فرعون نے مویٰ علیہ السلام کے جواب میں کہا تمہارا وہ رب کون ہے جس نے تم دونوں کو بھیجا ہے۔ اس نے خطاب دونوں سے کیا تھا لیکن نداء کے ساتھ مویٰ علیہ السلام کو خاص فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے مویٰ علیہ السلام اصل تھے اور ہارون علیہ السلام آپ کے وزیر اور تابع تھے یا اس سابقہ تعلق تربیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مویٰ علیہ السلام کو خطاب کیا یا وہ گفتگو سے سمجھ گیا تھا کہ مرتبہ تبلیغ آپ کو حاصل ہے اور آپ کے بھائی صرف نصاحت و وضاحت کے لئے ساتھ ہیں۔

قَالَ رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ حَلْقَهُ ۖ هُمْ هَدَىٰ ۝

”فرمایا ہمارا رب وہ ہے جس نے عطا کی ہر چیز کو (موزوں) صورت پھر (مقصود تخلیق کی طرف) ہر چیز کی رہنمائی کی۔“

۱۔ حسن اور قدادہ فرماتے ہیں ہر چیز کو صلاحیت عطا فرمائی اور پھر اس کی اس طرف رہنمائی کی جو اس کے لئے باعث اصلاح ہے مجاہد فرماتے ہیں ہر چیز کو وہ صورت عطا فرمائی جس پر وہ ہے اور اس نے حضرت انسان کی تخلیق چو پاؤں اور دھڑورنگروں کی طرح نہیں فرمائی اور جانور کو انسانی تخلیق کے مطابق پیدا نہیں فرمایا پھر ہر چیز کو اس کے کھانے پینے اور نکاح کے جو منافع ہیں ان کی طرف رہنمائی فرمائی (1)۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں ہر چیز کو اس کی اپنی جنس سے مادہ عطا فرمائی۔ مرد کو عورت اور اونٹ کو اونٹنی۔ گدھے کو گدھی، گھوڑے کو گھوڑی پھر اس کی رہنمائی فرمائی کہ خلقی اور جماع کیسے کرنا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ معنی ہے کہ ہر چیز جس جس چیز کی محتاج ہے اور اسے جس چیز کی ضرورت ہے وہ عطا فرمادی، مفعول ثانی کو مقدم فرمایا کیونکہ مقصود اس کا بیان ہے پھر ہر چیز کو یہ بھی سکھادیا کہ ان اعضاء اور قوتوں سے کس طرح کام لے اور اپنی بقاء اور اپنے کمال کو کیسے حاصل کرے۔ خود وہ کمال طبعی ہے یا اختیار۔ امام

بیضادی فرماتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس جملہ میں انتہائی بااغت ہے کیونکہ کل موجودات کی ان کے مراتب کے ساتھ خبر دی گئی ہے اور اس جملہ میں اس چیز کا بھی بیان ہے غنی قادر اور منع علی الاطلاق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور باقی کائنات کی ہر چیز اپنی ذات صفات اور افعال میں اپنی تخلیق اور اپنی بقا میں اس کی محتاج ہے۔ اسی جامع جواب کی وجہ سے کافر بہوت ہو گیا تھا اور فرعون نے جینئر ابدال اور کلام کارخ دوسری باتوں کی طرف موڑ دیا (1)۔

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُونِ الْأُولَىٰ ۖ

”اس نے کہا (اچھا یہ بتاؤ) کیا حال ہوا پہلی قوموں کا؟“

۱۔ پہلی قوموں سے مراد قوم نوح عاد اور ثمود ہیں جنہوں نے بتوں کی پوجا کی اور قیامت کا انکار کیا۔ فرعون پوچھنے لگا ذرا بتاؤ تو کسی پہلی قوموں کے مرنے کے بعد ان کو کیا ہوا تھا۔

قَالَ عَلَيْهَا عُنْدَ رَبِّي فِي كِتَابٍ لَّا يَبْصُرُ رَأْيِي وَلَا يَخْفَىٰ عَلَيَّ ۚ

”فرمایا ان کا علم میرے رب کے پاس ہے جو کتاب میں (مرقوم) ہے ۱۔ نہ بھٹکتا ہے میرا رب اور نہ (کسی چیز کو) بھولتا ہے۔“

۱۔ موسیٰ علیہ السلام نے پھر بڑا اچھا جواب دیا ان کے اعمال میرے پروردگار کے پاس محفوظ ہیں۔ لوح محفوظ میں سب کچھ مرقوم ہے۔ ۱۔ اور میرے رب کی شان ہے کہ نہ وہ بھٹکتا ہے اور نہ وہ بھولتا ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے یا کتاب کی صفت ہے۔ یعنی سب کچھ اس کتاب میں محفوظ ہے جسے اللہ تعالیٰ نہ گم کرتا ہے اور نہ اسے بھولتا ہے۔ الضلال کا معنی کسی چیز کی ٹھیک ٹھاکہ بھول جانا ہے اور اس تک رہنمائی حاصل نہ ہونا ہے اور نسیان کا معنی یہ ہے کہ کوئی چیز اس طرح تھمے سے ٹھو ہو جائے کہ اس کا خیال بھی تیرے دل میں نہ کھٹکے اور یہ دونوں چیزیں اس ذات کے لئے محال ہیں جو عالم بالذات ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں لا یبصر یعنی کا معنی یہ ہے کہ نہ تو اس سے کوئی چیز غائب ہوتی ہے اور نہ وہ کسی چیز سے غائب ہوتا ہے اور لا یخفی کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنی مخلوق کے معاملات کو بھولتا نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ گزشتہ قوموں کو ان کے ہر نیک و بد عمل کی جزا و سزا دے گا۔

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا وَ سَلَّكَ لَكُمُ فِيهَا سُبُلًا وَ أَوْتَرَل مِنَ السَّمَاءِ مَاءً ۖ فَآخَرَ جَنَاتٍ ۖ أَرْوَاجًا مِّنْ تَحْتِهَا نَسْتِي ۖ

”وہ ذات جس نے تمہارے لئے زمین کو چمکھونا بنایا ۱۔ اور بنا دئے تمہارے فائدہ کے لئے اس میں راستے اور اتارا

آسمان سے پانی ۱۔ پھر ہم نے نکالے پانی کے ذریعے ۱۔ (شکم زمین سے) جوڑے گونا گوں جنات کے ۱۔“

۱۔ الذی اسم موصول ربی کی صفت یا محذوف مبتدا کی خبر ہونے کی بناء پر کل رفع میں ہے یا مدح کے طور پر منصوب ہے۔ کوئیوں نے یہاں اور سورہ زخرف میں مہدًا پڑھا ہے اور سورہ نبا میں بھی ان کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ مصدر ہے اور اس کے ساتھ نام رکھا گیا ہے۔ باقی قراء نے مہادًا پڑھا ہے۔ مہادًا اس چیز کا اسم ہے جو چمکائی جائے مثلاً ہستیا مہد کی جمع ہے یعنی زمین کو اس نے تمہارے لئے چمکھونا بنایا۔

۱۔ سلوک کا معنی راستہ میں چلنا ہے۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَتَسْلُكُوْا مِنْهَا سَبِيْلًا فِیْحَاجِبًا۔ سبک کا لفظ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ قاموس میں ہے۔ سَبَلٌ الْمَفْجَانُ سَلُوْكًَا وَسَلْكُهُ عَزِيْرٌ (1)۔ یعنی پہلی صورت میں لازم ہے اور مکان ظرف ہے اور دوسری صورت میں متعدی ہے۔ آیت میں متعدی استعمال ہوا ہے اور السبیل کو مجازاً مفعول بہ بنایا گیا ہے۔ حالانکہ یہ ظرف ہے۔ یہ ایسے جیسے مجازاً جاری ہونے کی نسبت نہر کی طرف کی جاتی ہے۔ حالانکہ نہر جاری نہیں ہوتی، پانی جاری ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ اس کی بندہ نوازی دیکھو کہ اس نے اس زمین میں تمہارے لئے بندہ والا پہاڑوں، وادیوں اور صحراؤں کے درمیان راستے بنا دیئے ہیں جن پر تم باسانی سفر کرتے ہو۔ اس نے اس لئے یہ راستے بنائے ہیں تاکہ ایک جگہ سے دوسری جگہ تم سفر کر کے زمین میں چھپے خزانے اور منفعت بخش اشیاء حاصل کر سکو۔ حضرت ابن عباس نے جو اس آیت کے تحت سَهْلٌ لَّكُمْ فِیْهَا طَرَفًا فرمایا ہے اس کا بھی یہی مفہوم ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں السبک کا معنی ایک چیز کو دوسری چیز میں داخل کرنا ہے۔ معنی یہ ہے کہ اس نے تمہاری خاطر زمین میں راستے داخل کر دیئے (2)۔ اسی معنی میں یہ ارشاد ہے مَا سَأَلْتُمْ فِي سَفَرٍ۔ یعنی اس صبح نے تمہیں ستر میں داخل کیا۔ و انزل من السماء ماءً سے مراد بارش ہے۔

۲۔ ہم اس بانی کے ذریعے گونا گوں نباتات کے جوڑے نکالتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں انزل من السماء ماءً پھر موی علیہ السلام کا خطبہ مکمل ہوتا ہے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ اہل ملک کو خطاب کرتے ہوئے اپنی قدرت کی نشانیوں کو بیان فرما رہے ہیں جن کے ساتھ موی علیہ السلام اپنے رب کا تعارف کر رہے تھے۔ ظاہر کا مقصد یہ ہے کہ یہ موی علیہ السلام کا کلام ہے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکایت فرمایا ہے۔ تقدیر عمارت اس طرح ہو گی کہ اس نے تم پر بارش برسانی اور تم پر احسان جلتا ہے ہوئے فرمایا اخر جنا بہ تاکہ تم شکر سے سجدہ کر رہو جاؤ۔ یا یہ موی علیہ السلام کا ہی کلام ہے اور معنی یہ ہے کہ اس نے انسانوں سے ہماری جنس کے بیٹے پیدا فرمائے۔

۳۔ ازواج کا مطلب اصناف ہے، یعنی مختلف اقسام اصناف کو ازواج اس لئے کہتے ہیں کیونکہ وہ ایک دوسرے کے قریب قریب ہوتی ہیں۔ من نبات ازواج کی صفت اور بیان ہے۔ شعی ازواج کی صفت ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ نبات کی صفت ہو کیونکہ یہ اصل میں مصدر ہے جس میں واحد جمع برابر ہوتے ہیں۔ شعی جمع ہے شعیب کی۔ جیسے مریض کی جمع مرضی ہے اور یہ شت الامور سے مشتق ہے جس کا معنی جدا جدا ہونا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین سے اگنے والی نباتات کی صورتیں اغراض اور منافع بالکل الگ الگ کر دیئے ہیں، ان میں بعض انسان کے لئے مفید ہیں اور بعض حیوانات کی اصلاح کے لئے ہیں۔

كُلُوْا وَاْرْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآٰیٰتٍ لِّاُولِيْ النَّهْلِ ﴿۶﴾

”خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو بھی چراؤ۔ بیشک اس میں (ہماری قدرت و حکمت کی) نشانیاں ہیں دانشوروں کے لئے“

۱۔ دعویٰ کا لفظ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے عرب کہتے ہیں رعیت القوم فرعت۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے جانوروں کو چراؤ۔ یہ امر اباحت کے لئے اور نعمت یاد دلانے کے لئے ہیں۔ یہ جملہ قول کے ارادہ پر اخر جنا کی ضمیر سے حال ہے، یعنی

ہم نے کلو ا و ارجوا کہتے ہوئے مختلف نباتات پیدا فرمائے۔ تمہارے کھانے اور جانوروں کے چارہ کی منفعت کے لئے ہم نے نباتات تیار کئے ہیں اور ان میں تصرف کی تمہیں اجازت بھی مرحمت فرمائی ہے۔

ع۔ الذلک کامشار الیہ زمین کو بچھونا بنانا آسمان سے بارش نازل کرنا اور زمین کے بطن سے انشعاع کے لئے نباتات پیدا کرنا ہے۔ فرمایا یہ سب چیزیں اور یہ سب افعال خالق کے وجود اس کے واجب الوجود اس کے احاطہ علم اس کی قدرت کاملہ اس کی تخلیق اس کے کمال سے متصف ہونے اور نقائص سے پاک ہونے کی بین دلیل ہیں۔ اولی النہی سے مراد ذوی العقول اور دانشمند ہیں نہی جمع ہے نہیہ کی عقل کو ناہیہ اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ برائیوں اور کوتاہیوں سے روکتی ہے۔

وَمِنْهَا حَلَقْتُمْ لَهَا وَ فِيهَا نُعِيدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَى ﴿۳۰﴾

”اسی زمین سے ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے اور اسی میں ہم تمہیں لوٹائیں گے اور (روزِ حشر) اسی سے ہم تمہیں نکالیں گے ایک بار پھر۔“

ل۔ منہا میں حاضر ہونے کا مرجع الارض ہے۔ یعنی ہم نے زمین کی مٹی سے تمہارے باپ آدم اور تمہارے بدلوں کا مواد تیار کیا کیونکہ نطفہ انسانی نفاذ اس سے پیدا ہوتا ہے اور نفاذ مٹی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے فرمایا ہم نے تمہیں زمین سے پیدا فرمایا۔ امام بغوی نے عطاء انفرسانی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ فرشتہ اس مکان سے مٹی اٹھاتا ہے جہاں انسان نے دفن ہونا ہوتا ہے اور اس مٹی کو نطفہ میں ڈال دیتا ہے پس مٹی اور نطفہ سے انسان کی تخلیق ہوئی ہے (1)۔

عطاء کے قول کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے۔ جو بچہ پیدا ہوتا ہے اس کی ناف میں مٹی ضرور ہوتی ہے جس سے اس کی تخلیق ہوتی ہے پھر جب بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جاتا ہے تو اس مٹی کی طرف اسے لوٹا دیا جاتا ہے جس سے اس کی تخلیق ہوتی تھی اور اسی مٹی میں اسے دفن کر دیا جاتا ہے۔ میں ابوبکر اور عمر ایک مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں اور اسی ایک مٹی میں دفن ہوں گے (2)۔ اس حدیث کو خطیب نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے اور فرمایا یہ حدیث غریب ہے۔ ابن الجوزی نے اس حدیث کو موضوعات میں نقل کیا ہے۔ شیخ محدث مرزا محمد الحارثی بدخشی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ اس حدیث کے شواہد ابن عمر ابن عباس ابوسعید ابو ہریرہ سے مروی ہیں۔ یہ تمام احادیث ایک دوسرے کو تقویت دیتی ہیں اس لئے یہ حدیث کثرت طرق کی بناء پر حسن ہے اور اس حدیث کی تائید اس اثر سے بھی ہوتی ہے جو علامہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے شرح بخاری کتاب الجنائز میں محمد بن سیرین سے روایت کیا ہے، فرماتا ہے میں اگر میں قسم اٹھاؤں تو میں اپنی قسم میں بالکل سچا ہوں گا اور مجھے کچھ تردد نہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ ابوبکر اور عمر کی تخلیق ایک مٹی سے فرمائی ہے (3) اسی طرح ابن عساکر نے عبداللہ بن جعفر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عبداللہ تجھے مبارک ہو تو میری مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اور تیرا باپ (جعفر) ملائکہ کے ساتھ آسمان میں اڑتا ہے (4) اسی طرح ولیمی نے مسند الفردوس میں اور ابن بخاری نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے فرمایا آ زاد کرنے والے کا خیر میری مٹی سے ہے (5) شاید یہ رسول اللہ ﷺ نے کسی غلام کو آ زاد کرنے والے شخص سے فرمایا ہو۔

2- کنز العمال، جلد 11، صفحہ 565 (التراث الاسلامی)

4- تاریخ ابن عساکر، جلد 27، صفحہ 281 (المنکر)

1- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 220 (التحاریہ)

3- عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری، جلد 7، صفحہ 150 (ابن تیمیہ)

5- کنز العمال، جلد 10، صفحہ 317 (التراث الاسلامی)

ان مذکورہ بالا احادیث اقول سلف صالحین اور حضرت عطاء کی تاویل سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض لوگ کسی نبی کی مٹی سے پیدا ہوئے ہیں۔ صوفیاء کی اصطلاح میں اسے اصالة الطینہ کہتے ہیں۔ بلکہ بعض لوگ حضرت محمد ﷺ کی مٹی سے تخلیق ہوئے ہیں، اسے اصطلاح صوفیاء میں اصالة الکبریٰ کہتے ہیں۔

میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ نے جس روز آسمانوں اور زمین کو تخلیق فرمایا تو زمین کے بعض اجزا کو بعض افراد کی تخلیق کے لئے تیار فرمایا اور بعض دوسرے اجزا کو دوسرے لوگوں کی تخلیق کے لئے تیار فرمایا۔ زمین کا وہ ٹکڑا جو اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کی تخلیق کے لئے تیار فرمایا تھا، اس پر انوار و تجلیات اور برکات الہیہ کا نزول ہمیشہ سے ہوتا رہا جو تجلیات اس نبی کے ساتھ شخص جس کی وہ مٹی اس قابل ہو گئی کہ اس سے نبی کے بدن مبارک کو تیار کیا جائے پھر وہ مٹی جو نبی کی تخلیق کے لئے تیار کی گئی تھی اس سے تخلیق نبی کا جسم مقدس تیار کرنے کے بعد ممکن ہے کچھ مٹی بچ گئی ہو اور وہ مٹی پھر دوسرے لوگوں کے لئے مادہ بن گئی ہو اور وہ غیر نبی اس سے شرف ہو جیسا کہ حدیث میں وارد ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی پھوپھی کھجور کے درخت کی عزت کرو (1) کیونکہ یہ تمہارے باپ آدم کی اہلیہ مٹی سے پیدا کی گئی ہے اور اللہ کے نزدیک کوئی درخت اس درخت سے افضل نہیں ہے جس کے نیچے حضرت مریم بنت عمران نے یحییٰ علیہ السلام کو جنم دیا تھا۔ اپنی عورتوں اور اپنے بچوں کا تازہ کھجوریں کھلاؤ اور اگر یہ نہ ہوں تو چھوڑے کھلاؤ۔ اس حدیث کو ابو یعلیٰ الموصلی نے اپنی مسند میں بخاری نے اپنی تاریخ میں اور ابن حاتم العقیلی، ابن عدی، ابن اسنی اور ابو نعیم نے الطب میں اور ابن مردود نے حضرت علی علیہ السلام سے روایت کیا ہے، ابن عساکر نے حضرت ابوسعید الخدری سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کھجور انا اور اہمور آدم علیہ السلام کی مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں (2)۔ شیخ احمد مجد الف ثانی نے اپنے مکتوب نمبر 99 جلد ثالث میں اصالة الکبریٰ کا دعویٰ کیا ہے۔ بعض لوگوں نے جہالت یا عناد کی وجہ سے حضرت کے اس دعویٰ کا انکار کیا ہے۔ بلا تکلف ہے اس شخص کے لئے جو اولیاء اللہ سے عناد اور دشمنی رکھتا ہے اور ان کے متعلق حسن ظن نہیں رکھتا۔

بلکہ مرنے کے بعد تمہارے اجزا کو نکھیرنے اور منتظر کرنے کے ساتھ ہم تمہیں لوٹائیں گے اور پھر قیامت کے روز تمہیں مرکب کر کے سابقہ صورتوں پر اٹھائیں گے اور تمہارے ان ڈھانچوں میں پھر سے روح لوٹا دیں گے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَأَبَىٰ ⑤

”اور ہم نے دکھلا دیں فرعون کو اپنی ساری نشانیاں پھر بھی اس نے جھٹلایا اور ماننے سے انکار کر دیا۔“

یعنی موسیٰ علیہ السلام نے انہیں معجزات دکھائے لیکن اس کے باوجود وہ بد بخت انکار اور تکذیب پر مصر رہا۔ کلہا کی تاکید یا تو تمام اقسام کو شامل کرنے کے لئے یا ہر فرد کو شامل کرنے کے لئے ہے کیونکہ یہاں اضافت عہد کے لئے ہے اور آیات سے مراد وہ نو نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائی تھیں۔

قَالَ أَجَسْتَنَا لِنُخْرِجَنَا مِنْ أَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يَا مُوسَىٰ ⑥

”کہنے لگا موسیٰ! کیا تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ نکال دو ہمیں اپنے ملک سے اپنے جاو کی طاقت سے۔“

یہ قول کا فاعل فرعون ہے اور یہ کذب و ابی سے بدل اشمال ہے یا تاکید ہے اور استفہام تقریری ہے۔ ارضنا سے مصر کی زمین

مراد ہے۔ اسے سوئی آپ یہی چاہتے ہیں کہ تو ہمارے ملک پر غالب آ کر خود اقتدار سنبھالے۔

فَلَمَّا تَبَيَّنَكَ لِإِسْحَارِ مِثْلِهِ فَأَجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَا نُخْلَفُهُ
نَحْنُ وَلَا أَنْتَ مَكَانًا سُوًى ⑤

”سو ہم بھی لائیں گے تیرے مقابلہ میں جادو ویسا ہی ہیں (اب) مقرر کرو ہمارے اور اپنے درمیان مقابلے کا دن نہ ہم پھریں اس سے اور نہ ہی تو پھر سے جمع ہونے کی جگہ ہموار اور کھلی ہو۔“

۱۔ ابو جعفر نے لا نخلفہ کو جواب امر کی بنا پر جزم پڑھا ہے کیونکہ اخلاف وعدہ میں ہوتا ہے، زمان اور مکان میں نہیں ہوتا اور یہاں مضاف مضاف سے تقدیر اس طرح ہے مکان موعده۔ مکانا مضاف مضاف سے بدل ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مضاف موعده سے پہلے مقدر نہ ہو اور مکانا مصدر یا اس فعل کی وجہ سے مضموب ہو جس پر مصدر ولالت کر رہا ہے۔ سوئی کو ابن عامر حمزہ عام اور یثقب نے سین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے سین کے کسروہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں جیسا کہ عدی و غدی اور طوی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ جگہ ایسی ہو جو مسافت کے اعتبار سے ہمارے اور تمہارے درمیان برابر برابر ہو۔ سوئی کی یہ تشریح قنابہ نے فرمائی ہے۔ اور ابن عباس کے بھی یہی مروی ہے۔ کبھی کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ زمین ہموار ہو (1)۔ ابو بکر حمزہ اور کسائی نے اسے امد کے ساتھ پڑھا ہے اور ورش اور ابو عمرو نے اپنی اصل پر بین بین پڑھا ہے اور باقی قراء نے اپنے اصول پر فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔

قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمَ الزَّيْتَةِ وَأَنَّ يُحْضِرَ النَّاسَ ضَمِّي ⑥

”آپ نے فرمایا (تمہارا پہنچنا منظور ہے) جشن کا دن تمہارے لئے مقرر کرتا ہوں۔ اور یہ خیال رہے کہ سارے لوگ چاشت کے وقت جمع ہو جائیں۔“

۱۔ موعده سے پہلے مکان مضر ہے، یعنی تمہارے لئے وعدہ کا وقت تمہارے میلہ اور جشن کا دن ہے یا یوم سے پہلے موعده مضر ہے، یعنی موعده کم موعده یوم الزیتہ یا یہ معنوی حیثیت سے فرعون کے سوال کا جواب ہے کیونکہ جشن کا دن مشہور مکان پر دلالت کرتا ہے جہاں لوگ اس روز جمع ہوتے ہیں۔ مجاہد قنابہ و مقاتل اور سدی فرماتے ہیں ان کی امید کا ایک دن تین تین تھانوں میں وہ زیت و زیت کرتے تھے اور ہر سال اس میں اجتماع کرتے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ نیر و زکاد تھا۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں یہ عاشرہ کا دن تھا (2)۔ سوئی علیہ السلام نے مشہور میلہ کے دن کا تعین اس لئے فرمایا تاکہ حق کا علم بلند ہو اور باطل ساری دنیا کے سامنے رسوا اور ذلیل ہو۔ ضحیٰ سے مراد چاشت کا وقت ہے۔ یہ اس لئے فرمایا تاکہ کسی قسم کا کوئی شبہ نہ رہے۔ وَأَنَّ يُحْضِرَ النَّاسَ کا عطف یوم پر ہے یا زیتہ پر ہے۔

فَسَوِّىْ فِرْعَوْنَ فَجَعَمَ كَيْدَهُ ثُمَّ آتَى ⑦

”پھر فرعون واپس مزا اور اکٹھا کیا اپنی فریب کاریوں کو پھر خود آیا۔“

۱۔ یعنی فرعون نے اپنے جادو گروں کو جمع کیا تاکہ سوئی علیہ السلام پر غلبہ حاصل کرے اور پھر وقت مقرر پر مقابلہ کی جگہ پہنچ گیا۔

قَالَ لَهُمْ مُوسَى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوا عَلَيَّ اللَّهُ كَذِبًا فَيَسْحَبَكُمْ بِعَذَابٍ تَوَدَّ خَابَ مِنْ أَفْتَرِي ①

”فرمایا ان فرعونوں کو موسیٰ نے کہ بھنٹو! نہ بہتان بانڈو اللہ تعالیٰ پر جھوٹے لے اور نہ وہ تمہارا نام و نشان منادے گا کسی

عذاب سے۔ اور (اس کا یہ اہل قانون ہے) کہ ہمیشہ نامراد رہتا ہے جو افتراء بازی کرتا ہے۔“

۱۔ امام بغوی فرماتے ہیں کہ ہم کی ضمیر ان جادوگروں کے لئے ہے جنہیں فرعون نے مقابلہ کے لئے بلایا تھا اور ان کی تعداد بہتر 72 تھی اور ہر جادوگر کے ساتھ ایک رسی اور عصا تھی۔ حضرت کعب فرماتے ہیں چار سو تھے۔ بعض علماء نے ان کی تعداد 12000 بارہ ہزار لکھی ہے۔ بعض نے فرمایا اس سے بھی زیادہ تھے (1)۔ ویلکم بلاکت کے معنی میں الزم کا مفعول بہ ہے، یعنی الزمکم اللہ الویل ای الہلاک یا فیصل مہذوف کا مصدر ہے۔ ای الہلاکم ہلاکا کا یا یہ حرف نداء کے ساتھ منادی ہے ای ویلکم۔ یہ دعائیہ یا نداء ہے جملہ ہے اور کلام میں شروع ہونے سے پہلے منہی عند کے ارتکاب کی وجہ سے بری حالت کے اظہار کے لئے نبی کے مقدمہ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ کذباً لا یفتروا کا مفعول مطلق ہے کیونکہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ کا شریک بنا کر اللہ پر کوئی جھوٹ نہ بولے۔

۲۔ فیسحبکم کو مفعول متحرک اور کسائی نے یاہ کے ضمیر اور حواء کے کسرہ کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے یاہ اور حواء کے فتح کے ساتھ فعل مجرور سے پڑھا ہے۔ معنی دونوں کا ایک ہی ہے۔ اسحات نجا اور تمیم کی لغت ہے اور السحت حجازی لغت ہے۔ مقاتل اور کلبی فرماتے ہیں اس کا معنی فیہلکمکم (وہ تمہیں ہلاک کر دے گا) ہے۔ قتادہ نے اس کا معنی فیستاصلکم کیا ہے یعنی وہ تمہیں جز سے اکھیر دے گا (2)۔

۳۔ یقیناً نامراد ہوا وہ شخص جس نے بھی اللہ پر افتراء بانڈھا۔ واقعی اسی طرح ہے کہ فرعون نے اللہ پر افتراء بانڈھا اور فریب کیا تاکہ اس کا اقتدار اور سیاست کا سکہ ہمیشہ چلتا رہے اور اس کی باطل خدائی کا ڈنکا بجا رہے لیکن اس کی ہزار جیلہ ساز یوں کے باوجود اس کو کچھ فائدہ نہ ہوا (انجام کار رسواؤ ذلیل ہو کر اس دنیا سے دفع ہو گیا)

فَتَنَّاكَ عَوَا أَسْرَهُمْ بِيئِهِمْ ② وَ أَسْرُوا النُّجُومِي ③

”پس وہ جھگڑنے لگے اس کام کے متعلق آپس میں اور چھپ چھپ کر مشورے کرنے لگے۔“

۱۔ فرعون اور اس کے بلانے ہوئے جادوگر موسیٰ علیہ السلام کی بھرے مجمع میں آمد اور جرأت و بے باکی دیکھ کر سرگوشی کرنے لگے اور جھگڑنے لگے کہ ان کا پہاڑوں کے ساتھ مقابلہ کرنا ٹھیک بھی ہے یا نہیں (کہیں ایسا نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں) محمد بن اسحاق نے لکھا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی گردن آواز میں پوری جرأت اور استقامت سے یہ فرمایا ویلکم لا تفتروا علی اللہ کذباً تو وہ ایک دوسرے کو کہنے لگے یہ کسی جادوگر کا قول و کلام نہیں ہے (3) النجوى اسم ہے یا مصدر ہے۔ اس کا معنی سرگوشی کرنا ہے۔ اس کا اصل معنی کسی بلند جگہ پر علیحدہ ہونا ہے۔ زمین کے اونچے اور بلند حصے کو اس کی بلندی کی وجہ سے مجہولہ کہتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کی اصل النجاة ہے جس کا معنی الخلاص ہے، یعنی ایسا مشورہ اور معاونت جس میں نجات اور خلاصی ہو۔ کلبی کہتے ہیں انہوں نے آپس میں سرگوشی کی کہ موسیٰ علیہ السلام ہم پر غالب آگئے تو ہم اس کی اتباع کریں گے (4)۔

قَالُوا إِنَّ هَذَا مِنْ لَسَانِ الْيَرِيدِ أَنْ يُخْرِجَكُمْ مِنْ أَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا
وَيَذْهَبًا بِطَرِيقَتِكُمُ الْمَثَلِ ۝

”وہ ایک دوسرے کو کہنے لگے بلاشبہ یہ دو جادوگر ہیں یہ چاہتے ہیں کہ نکال دیں تمہیں اے تمہارے ملک سے اپنے جادو کے زور سے اور مٹادیں تمہاری (تہذیب و ثقافت کے) مثالی طریقوں کو۔“

اے باہمی تنازع اور جھگڑا کے بعد ان کا مشورہ اس بات تک پہنچا کہ جادوگر ہیں اور ان میں اپنے ملک سے دس نکال دے کر خود مستدار اقتدار پر براجمان ہونا چاہتے ہیں اور ہماری ساری تہذیب و ثقافت کو ختم کر کے نئے طور طریقے نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ حقیقتاً یہ قول فرعون کا ہے باقی سب چاروں جادوگروں کے ساتھ اس بات پر متفق ہو گئے تھے۔ پہلے بھی گزر چکا ہے کہ اس نے موسیٰ علیہ السلام کو گفتگو کے دوران یہ بھی کہا تھا کہ اچھٹا ایشور جنبا یعنی آرتھشا ایشورک لینڈس (اے موسیٰ تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ ہمیں ہمارے ملک سے اپنے جادو کے ذریعے ملک بدر کرو) اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کے تنازع کا سورہ مؤمن میں بھی تذکرہ کیا ہے۔ وَقَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَاتٍ مِثْلَ آيَاتِ هَٰؤُلَاءِ لَعَلَّيْ أَتَّقُونَ لِيُؤْمِنُوا بِآيَاتِي ۖ إِنَّكَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ تک اسی تنازع کا تذکرہ ہے۔

ابن کثیر اور حفص نے ہذان سے پہلے ان کو نون تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ نون مخفف من مشدہ ہے اور لساحران پر لام بفرق تانے کے لئے ہے کہ یہ ان نایب ہے اور لام بمعنی الا ہے (یعنی یہ دونوں نہیں ہیں مگر جادوگر) ابن کثیر نے ہذان کے نون کو بھی مشدہ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے ان کو مشدہ پڑھا ہے ابو عمر نے ہذان کو ان کے اسم کی حیثیت سے اصل کے مطابق ہذین پڑھا ہے، باقی قراء نے ہذان پڑھا ہے۔ ان (مشدہ) کے بعد ہذان کو خلاف اصل پڑھنے کی توجیہات میں علماء کا اختلاف ہے۔ ہشام بن عروہ ابن ابی عن عاشق بن سندی سے مروی ہے کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں یہ کاتب کی غلطی ہے لیکن یہ قول درست نہیں ہے اور اجماع کے مخالف ہے (اس لئے قابل غور یہ نہیں ہے) بعض علماء فرماتے ہیں ابوالجاریث بن کعب نخعم اور کسانہ قبائل کی لغت پر ہے کیونکہ وہ مشنیہ کو حالت نفی بصحی اور جرری میں الف کے ساتھ پڑھتے ہیں، وہ الف کو علامت مشنیہ بناتے ہیں اور مشنیہ کا اعراب تقدیری کہتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں اتانی الزیدان، رایت الزیدان، مردت بالزیدان اسی طرح یہ مذکورہ قبائل نام ساکن ناقبل مفتوح کو مشنیہ میں الف کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کسورت یداہ و رکبت علاہ اصل میں یدیہ اور علیہ تھا اسی طرح اسماء مکبرہ جب ی مشکم کے علاوہ کسی دوسرے اسم کی طرف مضاف ہوں تو ان کو الف کے ساتھ پڑھتے ہیں مثلاً شاعر کہتا ہے۔

إِنَّ أَبَاهَا وَأَبَا أَبَاهَا قَدْ بَلَّغَا فِي الْمَجْدِ غَايَاتَهَا

بعض علماء فرماتے ہیں ان کا اسم ضمیر شان محذوف ہے اور ہذان لساحران ان کی خبر ہیں۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی انہ ہذان لساحران۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ ان بمعنی نعم (ہاں) ہے اور اس کا ما بعد مبتدا اور خبر ہیں۔

روایت ہے کہ ایک بدو انھی پر جو مجھے سوار کر کے تیرے دروازے پر لے آئی ہے۔ آپ نے جواب فرمایا ان و صاحبہا (با کہنے لگا اللہ لعنت کرے اس اونھی پر جو مجھے سوار کر کے تیرے دروازے پر لے آئی ہے) آپ نے جواب فرمایا ان و صاحبہا (با کہنے لگا اللہ لعنت فرمائے) تو یہاں آپ نے ان بمعنی نعم استعمال فرمایا ہے (۱) امام بیضاوی فرماتے ہیں لیکن ان آخری

دوسو توں میں مبتدا کی خبر پر لام کا دخول لازم آئے گا حالانکہ یہ بغیر ضرورت کے خبر پر لام داخل نہیں کیا جاتا (بلکہ یہ لام مبتدا کی موصوفیت کی تاکید کے لئے وضع کیا گیا ہے) بعض علماء خبر پر لام کے دخول کے اعتراض کے جواب میں فرماتے ہیں کہ یہ اصل میں ان ہذان لہما ساحران ہے یا (ان بمعنی نعم) کی صورت میں نعم ہذان لہما ساحران ہے، یعنی اصل میں خبر پر لام داخل نہیں ہے بلکہ مبتدا مقدر پر لام داخل ہے۔ اس میں ضمیر شان کو حذف کیا گیا ہے اور ہما کو بھی حذف کیا گیا ہے۔ لیکن امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ جواب درست نہیں ہے کیونکہ جو ام لام ابتداء سے منوکہ ہوا سے حذف کرنا مناسب نہیں ہے (1) (کیونکہ حذف تاکید سے جو عرض مقصود ہے اس کے منافی ہے)

۱۱ من ارضکم سے مراد مصر ہے۔ مٹلی، ایش کی تانیث ہے اس کا معنی افضل ہے۔ ابن عباس نے طریقتکم المٹلی کا معنی قوم کے اشراف اور سرکردہ لوگ کیا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے۔ ہوا لاء طریقتہ قومہم یعنی وہ لوگ قوم کے سردار ہیں شامی نے حضرت علی سے یہ معنی نقل کیا ہے کہ یہ دونوں شخص لوگوں کی توجہ اپنی طرف کرنا چاہتے ہیں۔ قتادہ فرماتے ہیں۔ اس زمانہ میں بنو اسرائیل نفری اور مال کے اعتبار سے زیادہ تھے۔ تو اللہ کے دشمن فرعون نے (بنو اسرائیل کو بھڑکانے کے لئے) کہا کہ یہ دونوں حضرات سب لوگوں کو اپنا قبیح اور بچر و کار بنانا چاہتے ہیں (2) فرعون نے یہ بات موسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد کے بعد کی تھی جب آپ نے اسے کہا کہ ارسل معی بنی اسرائیل (یعنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے) بعض علماء فرماتے ہیں طریقتکم المٹلی سے مراد ہے اس نے طریقتہ اور دین بنا لیا، یعنی اس نے قوم کے دلوں میں نفرت پیدا کرنے کے لئے یہ کہا کہ یہ دونوں تمہاری معاشرتی قدروں اور تمہارے دین کو مٹانا چاہتے ہیں جس پر تم عرصہ دراز سے کار بند ہو۔ اس مفہوم کی تائید اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے فرعون کی طرف سے حکایت فرمایا ہے۔ **إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُبَدِّلَ دِينَكُمْ** (مجھے اندیشہ ہے کہ تمہارے دین کو بدل دے گا) یویدان کا جملہ ہذان کی دوسری خبر ہے یا ساحران کی ضمیر سے حال ہے یا جملہ ساتھ ہے۔

فَأَجْمَعُوا كَيْدَكُمْ لَكُمْ لَمْ تَشَاءُوا صَفَاتٍ وَقَدْ أَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلَمَ

”پس یکجا کر لو اپنی جیلہ سازیوں کو، پھر آؤ پرے باندھے ہوئے اور کامیاب ہو گا آج وہ گروہ جو (اس مقابلہ میں) غالب رہا۔“

۱۲ ابو عمرو نے اجمعوا کو حمزہ وصلی اور ميم متووع کے ساتھ مجر فاعل سے پڑھا ہے یہ قرأت فصیح کھذہ کے مطابق ہے، جب کہ باقی قراء نے ہمزہ قطعی اور ميم مسکور کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں جمع اور اجمع دونوں کا معنی ایک ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اس کا معنی ہے تم اتفاق رائے کر لو۔ پختہ عزم کر لو اور اختلاف نہ کرو تا کہ تمہارے معاملہ میں گڑبڑ نہ ہو۔

۱۳ صف مصدر ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ کسی چیز کو خط مستوی پر بنانا جیسے لوگ یا درخت لائن میں سیدھے کھڑے کئے جاتے ہیں۔ یہاں مصدر بمعنی اسم فاعل ہے۔ یعنی صف بست ہو کر آؤ، اکٹھے ہو کر ہمارے مقابلہ میں آؤ کیونکہ یک زبان اور اتفاق رائے سے آنا دیکھنے والوں کے دلوں میں زیادہ ہیبت ڈالتا ہے۔ مقال اور کلبی نے یہی تفسیر لکھی ہے۔ اس کی نظیر قرآن میں بھی ہے فرمایا **إِنَّ اللَّهَ يُجِيبُ الَّذِينَ يُنَادُونَ فِي سُبُوٰلِهِمْ صَفَاً كَأَنَّهُمْ مَبْنِيَانٌ مَّرْصُوعُونَ** (پیک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے ان (عجاہدوں) سے جو اس کی راہ میں جنگ

کرتے ہیں پر ابانہہ کرگو یا وہ سیدہ پلائی دیوار ہیں۔ صفا ترکیب نحوی کے اعتبار سے اور اس معنی کے اعتبار سے ایسا کے قائل سے حال ہوگا۔ ابو عبیدہ جو لغت کے امام ہے وہ فرماتے ہیں الف کا معنی الخ ہے۔ جائے نماز کو الف ایسی معنی کے اعتبار سے کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ متعین جگہ پر آ جاؤ (1)۔

آج وہی کامیاب ہوگا اور مطلوب پالے گا۔ جو غالب آئے گا۔ جملہ مترضہ ہے، یعنی ماقبل اور مابعد کلام سے لفظی یا معنوی کوئی تعلق نہیں ہے۔

قَالُوا لِيَوْمَئِذٍ إِمَّا أَنْ تُلْقَىٰ وَإِمَّا أَنْ نُلْقَىٰ ۖ

”جادوگر بولے اے موسیٰ! کیا پہلے آپ پھینکیں گے یا ہم ہو جائیں پہلے پھینکنے والے لے۔“

1۔ جادوگر جب مقررہ جگہ پہنچے تو نبی کا پاس ادب کرتے ہوئے یا اپنے فریب و جمل کی بڑائی کا اظہار کرتے ہوئے اور اپنی کامیابی پر وثوق اور اعتماد کی بناء پر کہا اے موسیٰ (علیہ السلام) کیا تم اپنا عصا پہلے ڈالو گے یا ہم پہلے رسیاں ڈالیں۔ ان موصول حرفی دونوں مقامات پر اپنے سلسلے سے مل کر مضمون فعل کی وجہ سے جمل نسب میں ہے یا متبادر محذوف کی خبر ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔ پہلی صورت میں تقدیر عبارت اس طرح ہوگی۔ إختیاراً اما القانک اولاً و اما کوننا اول من القی اور دوسری ترکیب کے اعتبار سے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی الا مر الذی حان حینہ اما القانک اولاً و اما کوننا اول الملقین۔

قَالَ بَلْ أُلْقُوا ۚ فَإِذَا حَبَالُهُمْ وَعَصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا

تَسْعَى ۖ

”آپ نے فرمایا نہیں تم ہی (پہلے) پھینکو! پھر کیا تھا یکا یک ان کی رسیاں اور ان کی لٹھیاں آپ کو یوں دکھائی دینے لگیں ان کے جادو کے اثر سے جیسے وہ دوڑ رہی ہوں۔“

۱۔ موسیٰ علیہ السلام نے ادب کے مقابلہ میں ادب پیش کرتے ہوئے فرمایا پہلے تم اپنے جادو کا مظاہرہ کرو یا اس لئے آپ نے انہیں پہلے اپنی رسیاں اور لٹھیاں ڈالنے کو کہا کیونکہ آپ کو ان کے جادو کی کوئی پروا نہیں تھی اور چونکہ انہوں نے اپنی کامیابی میں پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف میلان کا اظہار کیا تھا، اس لئے آپ نے ان کو مزید مائل و قائل کرنے کے لئے انہیں ایسا پہلے کرنے کو کہا اور ان کی کلام میں زیادہ بلاغت ہے نسبت اس کلام کے جو موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے بیان کی گئی ہے۔ آپ نے انہیں فرمایا جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ظاہر کرو اور اپنی کوشش سے جادو کو مضبوط کر لو کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ باطل کے مغرور سر پر حق کا ایک ہی کو زابر سے گا اور اس کا سارا انشا اور تکبر کا نور ہو جائے گا اور حق کا علم اپنی پوری بلندی پر لہرائے گا۔

۲۔ عصی اصل میں عصو و تھا، دونوں واؤ یا سے بدل کر ادغام ہو گئیں اور پھر صاد کو بیاہ کی مناسبت سے سرودے دیا گیا۔ اس کلام میں حذف ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے فالقوا حبالہم و عصیہم فاذا حبالہم الخ یعنی انہوں نے اپنی رسیاں اور لٹھیاں پھینکیں تو ان کی رسیاں دوڑتے ہوئے سانپ نظر آنے لگیں۔ اذ اطرف زمان ہے اور مفا جا کے فعل کے ساتھ منصوب ہے اور جملہ اسمیہ کی طرف منضاف ہے۔ حبالہم و عصیہم مبتداء سے اور مابعد خبر سے اور ضمیر عائد یا تو یخیل کی ضمیر ہے یا انہا کی

ضمیر ہے اور یہ جملہ ابتدائیہ ہے۔ یخیل کو ابن ذکو ان نے قاء کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ اس میں ضمیر مرفوع جبالا اور عصبی کی طرف راجع ہے۔ انہا تسعی یخیل کی ضمیر سے بدل اشتغال ہے۔ باقی قراء نے باء کے ساتھ یخیل پڑھا ہے۔ اور اس قرأت پر انہا تسعی لیخیل کا نائب الفاعل ہوگا۔ اس واقعہ میں ہے کہ جب انہوں نے اپنی رسیاں پھینکیں تو لوگوں کی نظر بندی کر لی۔ موسیٰ علیہ السلام اور لوگوں کو یوں محسوس ہونے لگا کہ زمین سانپوں سے بھر گئی ہیں جو ادھر ادھر دوڑ رہے ہیں۔

فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً مُّوسَىٰ ۝۱۷

”موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دل میں کچھ خوف محسوس کیا۔“

۱۔ خیفۃ میں تنخیر تعیل کے لئے ہے، یعنی آپ کے دل میں کچھ وحشت ہی آئی۔ الوجس کا اصل معنی آہستہ آواز ہے۔ قاموس میں ہے الوجس الفزع يقع فی القلب او السمع من صوت او غیرہ (1) یعنی وجس کا معنی وہ گھبراہٹ ہے جو دل میں واقع ہوتی ہے یا اس کا معنی آواز وغیرہ کا سنا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں بشری قفاضا پر آپ نے یہ گمان کیا شاید یہ پھنکارنے اور دوڑنے والے سانپ ان کی طرف آرہے ہیں۔ مقاتل فرماتے ہیں موسیٰ علیہ السلام کو اپنا کچھ خوف نہ تھا، صرف آپ کو اپنی قوم کا خوف تھا کہ کہیں معاملہ ان پر غلط ملط نہ ہو جائے اور کہیں یہ میرے بارے میں شک میں نہ پڑ جائیں اور اجابح سے گریز کریں (2) اس جملہ کا عطف فاذا حیالہم پر ہے۔

قُلْنَا لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنْتَ الْكَافِرُ ۝۱۸

”ہم نے فرمایا (اے کلیم!) مت ڈرو یقیناً تم ہی غالب رہو گے۔“

۱۔ یہ جملہ خوف سے نبی کی علت اور غلبہ کے ثبوت کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ استیعاب حرف تحقیق اور ضمیر فعل خبر کی تعریف اور لفظ علو (جو ظاہری غلبہ پر دلالت کرتا ہے) اور پھر صیغہ اسم تفصیل لگا کر جملہ کو مؤکد کیا گیا ہے۔

وَأَلْقَ مَا فِي يَمِينِكَ تَلْقَفَ مَا صَنَعُوا ۗ إِنَّمَا صَنَعُوا كَيْدُ سَاجِدٍ ۗ وَلَا يُفْلِحُ السَّاجِدُ حَيْثُ أَتَىٰ ۝۱۹

”اور زمین پر پھینک دو جو (عصا) تمہارے داہنے ہاتھ میں ہے یہ نکل جائے گا جو انہوں نے کاربگاری کی ہے۔ انہوں نے جو کاربگاری کی ہے وہ تو فقط جادو کا فریب ہے۔ اور تمہیں فلاح یا تاجادوگر جہاں بھی وہ جائے۔“

۱۔ الق کا عطف لا تخف پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صراحتاً یہ نہیں فرمایا کہ ڈنڈا زمین پر پھینکو، ہم فرمایا جو کچھ تیرے ہاتھ میں ہے زمین پر پھینکو۔ اس کی وجہ یا تو ان جادوگروں کی رسیوں اور لاشیوں کی تحقیر کرنے کے لئے ہے، یعنی آپ ان کی رسیوں اور لاشیوں کی پرواہ نہ کریں اور اپنے ہاتھ کی چھتری پھینکیں یا ان کی بڑائی کی وجہ سے ایسا ابہام فرمایا، یعنی تم ان جسموں کی کثرت اور بڑائی کو خاطر میں نہ لاؤ کیونکہ جو آپ کے ہاتھ میں ہے اس کا اثر ان سب سے زیادہ ہے۔

تلقف کو حفض نے لام کے سکون سے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، جب کہ دوسرے قراء نے لام کو فتحہ اور ق کو مشدّد پڑھا ہے۔ اصل میں یہ تعلق باب تفعّل تھا، ایک قاء کو حذف کیا گیا ہے۔ قاء مضارع تلمّض اور خطاب دونوں کا احتمال رکھتی ہے۔ قانیث کی

صورت میں ضمیر کا مرجع عصا ہوگا اور خطاب کی صورت میں فعل کی نسبت سب کی طرف ہوگی۔ ابن ذکوان نے حال یا استئناف کی بناء پر مرفوع پڑھا ہے، جب کہ دوسرے قراء نے جواب امر کی بناء پر مجزوم پڑھا ہے۔

یعنی ان کے بعد ما یا تو موصول ہے یا مصدر یہ ہے ساحر قائل کے وزن پر ہے۔ یہ جمہوری قرات ہے حمزہ اور کسائی نے مخز سین کے کسرہ اور بغیر الف کے مصدر کے طور پر پڑھا ہے۔ کید سحر میں اضافت بیان یہ ہے یا تقدیر عبارت اس طرح ہے کید ذی سحر مضاف کو حذف کیا گیا ہے یا ساحر کو سحر مباحثہ کے لئے کہا گیا ہے۔ ساحر سے مراد بعض ساحر ہے۔

ساحر کبھی کامیاب نہیں ہوتا جہاں بھی جائے۔ ابن عباس فرماتے ہیں جادو زمین کے کسی خطہ میں سعادت مند نہیں ہوتا۔ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ وہ جب بھی جیلد سازی کرتا ہے کامیاب نہیں ہوتا (1)۔ ابن ابی حاتم اور ترمذی نے جندب بن عبد اللہ الجعفی سے روایت فرمایا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم جادو گر کو پاؤ تو اسے قتل کر دو پھر آپ ﷺ نے آیت لَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَىٰ تلاوت فرمائی فرمایا جہاں بھی ہوا میں نہیں ہوتا (2)۔ اِنَّمَا ضَعُفُوا كَا جِلْدٍ تَلْفُفٍ كِي تَعْلِيلٍ كِي كَحْلٍ مِيں هِي۔

فَالْقُلُوبُ السَّخِرَاءُ سَجْدًا قَالُوا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰذُوْنَ وَ مَوْسٰى ۝

”پس گرا دیئے گئے جادو گر سجدہ کرتے ہوئے انہوں نے (بر ملا) کہہ دیا (اے لوگو! سن لو) ہم ایمان لے آئے ہیں ہارون اور موسیٰ کے رب پر۔“

اس کلام میں اختصار ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ فالقہی موسیٰ عصا فصارت شعباناً یعنی موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا ڈالا تو وہ بڑا اسان بن گیا اور کچھ جادو گروں نے اپنی مہارت سے جادوگری کی تھی، اس کو گل گیا۔ جادو گر پہچان گئے کہ یہ جادو کی کرشمہ سازی نہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ پس اس معرفت و عرفان نے انہیں اللہ کے حضور سر بسجود ہونے پر مجبور کر دیا۔ وہ اپنی جادوگری سے توبہ کرتے ہوئے یا آیات الہیہ کو دیکھ کر ان کی عظمت کا اظہار کرتے ہوئے سجدہ پر یز ہو گئے اور برسر محفل کبیرہ یا ہم تو موسیٰ اور ہارون کے رب پر صدق دل سے ایمان لے آئے ہیں۔ ہارون اور موسیٰ کے درمیان داؤ مطلق جمع کے لئے ہے۔ ہارون کو پہلے ذکر کرنے میں سورۃ اعراف اور شعراء کی آیات کے ساتھ تعارض کی کوئی دلیل نہیں ہے جہاں موسیٰ علیہ السلام کا ذکر پہلے ہارون کا ذکر بعد میں ہے۔ یہاں ہارون کی تقدیم آیت کے سرے ملانے کے لئے ہے۔ قالوا اٰمنا کا جملہ اَلْقِي السَّحْرَةُ سَجْدًا سے بدل اشتمال ہے یا اس کی تاکید ہے۔

قَالَ اٰمَنَّا لَهُ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ اِنَّهُ لَكَبِيْرٌ مِّنَ الَّذِيْنَ عَلٰمِكُمْ
السَّحْرَةَ فَلَا قِطْعَنَ اٰيٰدِيْكُمْ وَ اَسْرَجْتُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَ لَآ وَصِيْلَتُمْ فِيْ
جُدُوْعِ النَّخْلِ وَ لَتَعْلَمُنَّ اٰيٰتَنَا اَشَدُّ عَذَابًا وَ اَبْلٰغًا ۝

”فرعون (کو یارائے ضبط نہ رہا) بولا تم تو ایمان لا چکے تھے اس پر اس سے پہلے کہ میں نے تمہیں (مقابلہ کی) اجازت دی وہ تو تمہارا بڑا (گرو) ہے جس نے تمہیں سکھایا ہے جادو (کافرن)۔ تو میں قسم کھاتا ہوں کہ میں کاٹ ڈالوں گا تمہارے ہاتھ پاؤں یعنی ایک طرف کا ہاتھ ایک طرف کا پاؤں اور سولی چڑھاؤں گا تمہیں کھجور کے تنوں پر۔ اور تم

خوب جان لو گے کہ ہم میں سے کس کا عذاب شدید اور دیر پا ہے۔“

۱۔ قال کا فاعل فرعون ہے۔ امنت کو محض نے خبر کے طور پر اور باقی قراء نے استفہام انکاری کے طور پر پڑھا ہے۔ اور امان کا صلہ اور اس لئے استعمال فرمایا کیونکہ اس میں اتباع کا معنی پایا جاتا ہے (ایسی صورت کو علماء تقصین کہتے ہیں) موسیٰ حکیم تمہارا استاد ہے اور تم سب اس کے شاگرد ہو، ایمان تو تم میرے کہنے سے پہلے بھی لایچکے تھے۔ اس کا غلبہ ایک استاد اور لیڈر کی حیثیت سے ہوا ہے، نبوت کی وجہ سے یہ نقل نہیں ہے، اس نے خود تمہیں یہ یاد دکھایا اور تم نے جو کچھ کیا اس کی موافقت میں کیا یہ جملہ معترضہ ہے۔

۲۔ اس نے کہا تمہیں تمہارا دایاں ہاتھ اور بائیں پاؤں کاٹ دوں گا۔ من ابتدائی ہے اور لا قطع کے متعلق ہے۔ یا یہ طرف مستقر ہے اور مصدر محذوف قطعاً کی صفت ہے۔ یعنی کاٹنا ایسا ہوگا کہ ہر عضو دوسرے عضو کے مخالف ہوگا۔ یعنی دائیں بائیں میں اختلاف ہوگا، دایاں ہاتھ اور بائیں پاؤں ہوگا۔ یا من ایڈیکم وارجلکم سے حال ہے۔ فی جذوع النخل فرمایا ہے حالانکہ مقام کے تقاضا کے مطابق علی ہونا چاہئے تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں مصلوب کے صلیب میں پوری طرح فٹ آنے کو تشبیہ دی گئی ہے اس چیز سے جو کسی برتن میں فٹ آتی ہے، یہاں اس نے مجھوں سے سولی دینے کا ذکر کیا کیونکہ وہ لمبی ہوتی ہیں اور ان پر لٹکایا ہوا بندہ دور سے نظر آتا ہے۔

۳۔ اس وقت تمہاری آنکھیں کھلیں گی کہ رب موسیٰ پر ایمان لانے پر مشرخت اور دائمی عذاب دیتا ہوں یا موسیٰ کا رب ایمان نہ لانے پر زیادہ سخت عذاب دیتا ہے۔

قَالُوا لَنْ نُؤْمِنَكَ عَلَىٰ مَا جَاءَنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالَّذِي فَطَرَنَا فَاقْضِ
مَا أَنْتَ قَاضٍ ۗ إِنَّمَا تَتَّبِعُنِي هَذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا ۗ

”انہوں نے کہا (اے فرعون) ہمیں اس کی قسم جس نے ہمیں پیدا کیا ہم ہرگز ترجیح نہیں دیں گے۔ تجھے ان روشن دلیلوں پر جو ہمارے پاس آئی ہیں۔ پس (ہمارے بارے میں) جو فیصلہ تو کرنا چاہتا ہے کر دے (ہمیں ذرا پروا نہیں)۔“

صرف اس (فانی)؛ یعنی زندگی کے بارے میں ہی فیصلہ کر سکتا ہے۔“

۱۔ البینت سے مراد واضح معجزات ہیں مثلاً یہ بیضا اور عصار اور بعض علماء فرماتے ہیں البینت سے مراد دلائل ہیں، ان کی دلائل میں سے یہ تھا کہ انہوں نے کہا اگر موسیٰ جاؤ گے تو میں پھر ہماری رسیاں اور لٹھیاں کیا ہیں۔ بعض فرماتے ہیں البینت سے مراد تمہیں اور علم ہے۔ امام بنوئی نے قاسم بن ابی بردہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں جب وہ جاؤ گے تو یہ کرنے کے لئے بندہ میں گئے تو اس وقت تک سر نہ اٹھایا۔ جب تک کہ جنت اور دوزخ کو دیکھ نہ لیا۔ یا جنتیوں کے ثواب اور ان کی رفیع منازل کو دیکھ نہ لیا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر انہوں نے فرعون کو کہا ہم تجھے ترجیح نہیں دیں گے (۱) الخ۔

۲۔ الذی سے پہلے واؤ عاطفہ ہے۔ اور اس کا عطف ماجہ تا پر ہے یا واؤ تسمیہ ہے اور ما موصولہ اپنے صلہ کے ساتھ فاقض کا مفعول بہ ہے۔ یا یہ معنی کہ تو حکم دے تو حکم دینے والا ہے اس صورت میں اسم موصول مفعول مطلق ہوگا۔ اس معنی کے اعتبار سے مفعول یہ بنانا جائز نہیں ہے کیونکہ قضا، بمعنی حکم بناؤ کے ساتھ متعدی ہوتا ہے اور یہاں بحد کا حذف کرنا جائز نہیں ہے۔

۳۔ هذه الحیة الدنیا مضاف کے حذف کے ساتھ ظرف زمان ہے، یعنی تو نے جو کچھ کرنا ہے اس فانی اور عارضی زندگی میں کرنا ہے

تیرا حکم اور تیری سلطانی مغرب ختم ہو جائے گی۔ جو تیرے جی میں آتا ہے تو اسے کر گزرد۔ اب ہم نے جو شراب حق کا جام اللہ فام نوش کیا ہے اسے تیری ان دھمکیوں کی ترشی کبھی نہیں اتار سکتی۔ بعض علماء فرماتے ہیں فرعون نے جو سولی چڑھانے اور ہاتھ پاؤں کانٹے کی دھمکی دی تھی وہ اس نے پوری کی تھی اور سب سے پہلے انکی سزا کا آغاز اس نے کیا تھا۔ یہ قول ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے نقل کیا ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے وہ اس کی دھمکی کو پورا نہ کر کا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَشْتَمَلُوا عَنِ السَّحْرِ وَالْمَوْلَانِ۔

إِنَّا أَمْنَا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطِيئَاتِنَا وَمَا أَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ۗ
اللَّهُ حَيٌُّّ وَابْلَغِي ۝

”یقیناً ہم ایمان لائے ہیں اپنے رب پر تاکہ وہ بخش دے ہمارے لئے ہماری خطاؤں کو اور اس قصور کو بھی جس پر تم نے مجبور کیا ہے یعنی فن سحر اور اللہ تعالیٰ ہی سب سے بہتر ہے اور ہمیشہ رہنے والا ہے۔“

۱۔ شراب حق سے مست ہو کر انہوں نے فرعون کی دھمکیاں سن کر کہا ہم تو اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے ہیں تاکہ وہ ہمارے کفر و معاصی کو معاف فرمادے اور جس جادو پر تو ہمیں مجبور کرتا رہا اس کے گناہ پر بھی قلم غلطو چھیر دے۔ یہ جملہ فن فونٹک کے معنی کو پختہ کرنے کے لئے ہے۔ من السحر ما کا بیان ہے اور ضمیر مجرور سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ انہوں نے کیسے کہا ہے و ما کھرہنا علیہ (جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا) حالانکہ وہ خود اپنی مرضی سے آئے تھے اور فرعون کی عزت کی قسم کھا کر انہوں نے کہا تھا کہ غلبہ ہمارا ہوگا۔ فرعون نے انہیں جادو دیکھنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ امام بغوی نے حضرت حسن سے روایت کیا ہے کہ فرعون لوگوں کو جادو دیکھنے پر مجبور کرتا تھا۔ تاکہ جادو کی اصل باقی رہے، و دنیا سے شتم نہ ہو جائے، اس نے ان لوگوں کو بھی ابتدا میں مجبور کیا تھا۔ مقاتل کہتے ہیں جادو پر بہتر تھے۔ دو قبلی تھے اور سز بنی اسرائیل سے تھے۔ فرعون بنی اسرائیل کو مجبور کیا کرتا تھا کہ وہ جادو سیکھیں۔ تو ان کے قول ما اکھرہنا کا یہی مطلب ہے۔

عبد العزیز بن ابان کہتے ہیں کہ جادو گرنے فرعون سے کہا ہمیں پہلے موسیٰ کی زیارت کرا، جب وہ سویا ہوا ہو تو اس نے ان کو بلایا۔ موسیٰ علیہ السلام سو رہے تھے اور آپ کا ڈنڈا آپ کی حفاظت کر رہا تھا جادو گروں نے دیکھ کر کہا یہ جادو نہیں ہے کیونکہ جادو گر جب سوتا ہے تو اس کا جادو باطل ہو جاتا ہے لیکن فرعون نے انہیں مقابلہ پر مجبور کیا تو وہاں اکھرہنا کا یہی مفہوم ہے (۱)۔

۲۔ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ تجھ سے بلکہ ساری مخلوق سے بہتر ثواب دینے والا ہے اسے جو ایمان لاتا ہے اور نیک اعمال کرتا ہے اور وہ تجھ سے اور ساری مخلوق سے دائمی عذاب دینے والا ہے اسے جو مجرم بن کر اس کی بارگاہ میں پیش ہوتا ہے۔ محمد بن اسحاق فرماتے ہیں یہ فرعون کے قول اَیْنَا شَدَّ عَنَّا اَبَاؤُنَا اَبْلَغِي کا جواب ہے۔

إِنَّهُ مَن يَأْتِ رَبَّهُ مُجْرِمًا فَإِنَّ لَهُ جَهَنَّمَ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ ۝

”جینک جو مجرم بن کر آئے تو اس کے لئے جہنم کا (شعلہ زار) ہے نہ وہ مری سکے گا اس میں اور نہ وہ

زندہ ہوگا۔“

۱۔ یعنی جو کفر اور خداوند ذوالجلال کی نافرمانی کرتے ہوئے مرے گا تو اسے جہنم میں ڈالا جائے گا، جہاں نہ اسے موت آئے گی نہ وہ

عذاب سے چمکارا پالے اور نہ اس میں اس کے لئے کچھ خوشگوار زندگی ہوگی۔

وَمَنْ يَأْتِهِ مَوْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصَّالِحَاتِ فَأُولَٰئِكَ لَهُمُ الدَّرَجَاتُ الْعُلَىٰ ﴿٥٠﴾
 ”اور جو شخص حاضر ہوگا بارگاہ الہی میں مومن بن کر اس حال میں کہ اس نے عمل بھی نیک کئے ہوں تو یہ وہ (سعادت مند) ہیں جن کے لئے بلند درجات ہیں۔“

لا قالون، ابو جعفر اور یعقوب نے باتہ کو وصل میں حمزہ کے کسرہ کو اختلاس کے ساتھ پڑھا ہے اور ابو شیبہ نے سکون کے ساتھ اور باقی قراء نے اشباع کے ساتھ پڑھا ہے۔

قد عمل الصالحات: مومن کی ضمیر سے حال ہے۔ العلیٰ جمع ہے علیا کی۔

جَنَّتْ عَدْنٌ نَجْرِيٍّ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ مَنْ تَرَكَنِي ﴿٥١﴾
 ”یعنی سدا بہار باغات رواں ہیں جن کے نیچے نہریں وہ (خوش نصیب) ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ ہے جزاء ان کی جنہوں نے (اپنا دامن ہر آلائش سے) پاک رکھا۔“

۱۔ جنت عدن: الدرجات سے بدل ہے یا عطف بیان ہے خالدين فيها لهم میں ضمیر مجرور سے حال ہے اور اس میں عامل اسم اشارہ کا سنی ہے یا الاستقرار ہے۔ مَنْ تَرَكَنِي سے مراد وہ نفوس ہیں جو گناہ اور کفر کی آلودگی سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں کبھی کہتے جو اپنے نفس کی زکوٰۃ دیتے ہیں اور کلہ طیبہ لا الہ الا اللہ پڑھتے ہیں (1)۔ امام احمد ترمذی ابن ماجہ اور ابن حبان نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوسعید الخدری سے اور طبرانی نے جابر بن سمرہ سے اور ابن عساکر نے ابن عمر اور حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ تمام صحابہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بلند درجات پر فائز اہل جنت کو نیچے والے ایسے دیکھیں گے جیسے تم آسمان کے افق پر چمکنے والے ستارے کو دیکھتے ہو ابو بکر اور عمران بلند درجات والوں میں سے ہیں (2) امام احمد اور بخاری و مسلم نے حضرت ابوسعید سے اور ترمذی نے ابو ہریرہ سے مرفوعاً نقل کی ہے کہ اہل جنت بلند درجات اور کمالات والوں کو اس طرح دیکھیں گے جیسے تم مشرق و مغرب کے افق پر غروب ہونے والے ستارے کو دیکھتے ہو اور یہ اتنی دوری اور بلندی ان کے مراتب میں فرق کی وجہ سے ہوگی۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ بھرا نبیاء کی منازل کو تو کوئی دوسرا نہیں پاسکتا گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے وہ وہ لوگ جو اللہ پر صدق دل سے ایمان لائے اور اس کے رسولوں کی تصدیق کی (3) (وہ انبیاء کے ساتھ ہوں گے) یہ تینوں آیات جاوید گروں کے کلام ہونے کا بھی احتمال رکھتی ہیں کہ یہ ان کے قول **وَاللَّهُ حَيُّ ذُو الْعَرْشِ الْكَبِيرُ** کی علت ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابتدائی کلام بھی ہو سکتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی تصدیق فرما رہا ہے۔

وَلَقَدْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي فَاصْرَبْ لَهُمْ مَطْرِبًا فِي
 الْبَحْرِ يَبَسًا لَا تَخَفْ دَرَكًا وَلَا تَحْشَىٰ ﴿٥٢﴾

”اور ہم نے وحی بھیجی موسیٰ (علیہ السلام) کی طرف کہ راتوں رات لے چلے میرے بندوں کو (مصر سے) (راہ میں سمندر حائل ہو) تو عصا کی ضرب سے ان کے لئے سمندر میں خشک راستہ بنا لیجئے نہ تمہیں پیچھے سے پکڑے جانے کا ڈر

ہوگا اور نہ کوئی اور اندیشہ۔“

۱۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کو بلاک کرنے اور بنی اسرائیل کو اس کی قید سے آزاد کرنے کا ارادہ فرمایا تو موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا کہ بنی اسرائیل کو راتوں رات مصر سے لے چلے۔ اس جملہ کا عطف وَتَقَدَّمَ مَسْنَأَ عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَى پر ہے۔ اس میں خطاب سے غیب کی طرف التفات ہے۔ ما ضروب کا معنی یہاں اجعل ہے اور یہ عربوں کے اس قول سے ہے ضرب لہ من ما لہ سہماً اس لئے فلاں کے لئے اپنے مال سے حصہ مقرر کیا) یا یہ فاتخذ من ضرب اللہین سے ہے۔ (جب کوئی ایشیں بنانے کا کام کرے) میں کہتا ہوں تقدیر کلام اس طرح بھی ممکن ہے فاضرب بعضاک البحر یکن طریفاً (یعنی اپنا عصا سمندر پر مارو تو راستہ ہو جائے گا) (پہلی دونوں صورتوں میں جب کہ فاضرب 'اجعل' اتخذ کے معنی میں ہو تو طریفاً مفعول بہ بنے گا اور مفسر کی تقدیر پر یکن خدوف کی خبر بنے گا) ایسا مصدر ہے اور طریفاً کی صفت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ جمہور قرآن نے لا تخاف کو مرفوع پڑھا ہے۔ اور یہ جملہ اضرب کے فاعل سے حال یا طریفاً کی صفت ثانی کی حیثیت سے منسوب ہے۔ معنی یہ ہوگا تم سمندر پر ڈنڈا مارو اور اس حالانکہ تم دشمن کے پکڑے جانے سے امن میں ہو اور سمندر میں ڈنڈا مار کر ایسا خشک راستہ بناؤ جو دشمن کے پکڑنے سے محفوظ ہے۔ حمزہ نے لا تخف یعنی جزم سے ساتھ نبی کا سینہ پڑھا ہے یا جواب امر کی بناء پر مجزوم پڑھا ہے۔ لا تخشی مستقبل کلام ہے۔ اور اس کا عطف لا تخاف پر ہے اور اس کے آخر میں الف حمزہ کی قرأت پر اطلاق کے لئے ہے جیسے تظنون بالله الظنوناً میں ہے یا یہ لا تخف کے فاعل سے حال ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے حکم الہی کے مطابق سمندر پر عصا مارا تو وہ چٹ گیا اور اللہ تعالیٰ نے زمین کو بالکل خشک کر دیا اور وہ سب اس میں سے صحیح و سلامت گذر گئے۔

فَاتَّبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُودِهِ فَغَشِيَهُمْ مِنَ السَّمَاءِ غَاشِيَهُمْ ۝

”پھر فرعون نے ان کا تعاقب کیا اپنے لشکر و سمیت پس چھا گئیں فرعونوں پر سمندر کی (تند موجیں) جیسا کہ چھا گئیں

ان پر۔“

۱۔ فاتبعہم خدوف کلام پر معطوف ہے۔ یعنی فاسری موسیٰ بقومہ فاتبعہم بجنودہ میں بناء یعنی مع ہے۔ یعنی جب فرعون کو خبر ہوئی کہ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو رات کو لے کر نکل گئے ہیں تو اس نے اپنے لشکر کے ساتھ ان کا پیچھا کیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں التبع باب افعال ہے۔ لیکن بعضی افعال ہے اور بلا تعدیہ کے لئے ہے۔ بعض علماء نے باء کو زائد رکھا ہے یعنی اس کے لشکر نے پیچھا کیا اس آخری تاویل کی بناء پر فرعون کی اپنی ذات کے لشکر پر کوئی دلیل نہ ہوگی حالانکہ وہ خود بھی نکلا تھا۔ الیم کا معنی سمندر ہے۔ اور اس سے پہلے من بیناہ یا تبعیہ ہے یہ ما غشیہم سے حال ہے۔ اس کلام میں مبالغہ ہے کہ ان پر سمندر کی موجیں اس طرح چھا گئیں کہ جن کی کیفیت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ غشیہم میں ضمیر منسوب فرعون اور اس کے لشکریوں کے لئے ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں پہلی ضمیر فرعون اور اس کے لشکر کے لئے ہے اور دوسری موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کے لئے ہے۔ یعنی فرعون اور اس کے لشکر پر وہ سمندری موجیں چھا گئیں اور وہ سب کے سب غرق ہو گئے اور موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم پر نہ چھا گئیں پس وہ نجات پا گئے۔

وَاصَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهُ وَ مَا هَدَى ۝

”اور گمراہ کر دیا فرعون نے اپنی قوم کو اور نہ دکھائی انہیں سیدھی راہ۔“

اس آیت کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ فرعون نے دین میں اپنی قوم کو گمراہ کیا اور انہیں سیدھی راہ نہ دکھائی، اس صورت میں اس کے قول **وَمَا أَهْدِيكُمْ إِلَّا سَبِيلَ الرَّجْسِ** کی تفسیر اور اس کا استہزاء ہے۔ یا یہ معنی کہ سمندر میں اس نے ان کو گم کر دیا اور خود بھی نجات نہ پاسکا۔

**يٰۤاَيُّهَا اِسْرٰٓءِيْلُ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَ وُعِدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّورِ
الْاَيْمَنِ وَ نَزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّٰ وَ السَّلْوٰى ۝۱۰**

”اے بنی اسرائیل (دیکھو!) ہم نے پچالیا تمہیں تمہارے دشمن سے اور ہم نے تم سے وعدہ کیا (کوہ) طور کی دائیں جانب کا اور ہم نے اتار اتم پر من و سلویٰ“

۱۔ یا تو یہ خطاب ان بنی اسرائیل کو ہے جو عہد نبوی ﷺ میں موجود تھے اور ان کے آباء پر کئے جانے والے احسان کا تذکرہ کیا گیا ہے لیکن یہ صورت سنی ہے اور کہ میں خطاب بنی اسرائیل سے نہیں قریش سے تھا۔ یا یہ خطاب ان سے ہے جن کو اللہ نے فرعون کو بلاک کرنے کے بعد نجات عطا فرمائی تھی۔ اس صورت میں قلنا مقدر ہوگا اور یہ ایک سائل کے جواب میں ہے جو کہتا ہے کہ نجات کے بعد ان کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ تو فرمایا ہم نے کہا اے بنی اسرائیل الخ۔ پہلی قدر کے اعتبار سے کم ضمیر سے پہلے مضاف مضاف ہوگا، یعنی ہم نے تمہارے آباء کو نجات دی۔ عدو سے مراد فرعون ہے جانب الطور ظرفیت کی بناء پر منصوب ہے۔ الا بمن جانب الطور کی صفت ہے اس کی وجہ ادنیٰ مناسبت ہے۔ کیونکہ وہ پہاڑ موسیٰ علیہ السلام کی دائیں جانب تھا اور نہ پہاڑ کی تو کوئی دائیں یا بائیں جانب نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلام ہوئے، تو رات عطا کرنے کا وعدہ کیا تھا اور فرمایا اپنی قوم کے چیدہ چیدہ ستر دی ساتھ لے آؤ ملاہست اور قریش تعالیٰ کی بناء پر وعدہ کی نسبت لوگوں کی طرف کی گئی ہے حالانکہ وعدہ صرف موسیٰ علیہ السلام سے ہوا تھا۔

**كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا سَرَقْنٰكُمْ وَ لَا تَطْعَمُوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَ
مَنْ يَّحِلَّ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ۝۱۱**

”کھاؤ ان پاک چیزوں سے جو ہم نے تم کو عطا کی ہیں اور اس میں حد سے تجاوز نہ کرنا اور نہ کھاؤ ان کے جو تم پر میرا غضب اور وہ بد نصیب اترتا ہے جس پر میرا غضب تو یقیناً وہ گزر کر رہتا ہے۔“

۱۔ قول ان کی تقدیر کے ساتھ **كلوا** نزلنا کے فاعل سے حال ہے۔ یا یہ جملہ مستفاد ہے طیبات سے مراد لذائذ یا حلال چیزیں ہیں۔ من بیانیہ یا تبعیضیہ ہے۔ حمزہ اور کسائی نے انجینکم و واعدتکم اور ما رزقکم، یعنی واحد کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے بطور تعظیم نون اور الف کے ساتھ پڑھا ہے اور نزلنا میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ وہ الف کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔ **لا تطعموا** کا مفہوم یہ ہے۔ کہ جو میں نے تمہیں مال و دولت عطا کیا ہے اس کو استعمال کر کے شکر میں کوتاہی نہ کرنا اور اسراف، کجی، تکبر اور حق دار کو حق عطا نہ کر کے حد سے تجاوز نہ کرنا کسائی اور امش نے یحل کو حملہ کے ضمہ کے ساتھ اور من یحل کو لام کے ضمہ کے ساتھ باب نصر ینصر طولوں سے مشتق کر کے پڑھا ہے جس کا معنی نزول ہے۔ باقی قراء نے یحل کی حاملہ کو اور یحلل میں لام کو سرہ کے ساتھ باب ضرب یضرب سے پڑھا ہے۔ اس صورت میں یہ یحل الدین سے مشتق ہوگا۔ جس کا معنی قرض کی ادائیگی کا واجب ہونا ہے۔ یعنی جس پر غضب الہی کا کوڑا برسے گا وہ آگ کے گڑھے میں گرے گا۔

وَ اِنِّي لَنَعْقَابُ لِيَمَن تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴿٣٠﴾

”اور میں بلاشبہ بہت سختی والا ہوں اسے جو توبہ کرتا ہے اور ایمان لاتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے بھلائیوں ہدایت پر مستحکم رہتا ہے۔“

۱۔ فرمایا جو شرک سے توبہ کرے، اللہ اور اس کے رسول جو کچھ لے کر آئے اس پر ایمان لائے اور اللہ کریم نے جو احکام دیئے ہیں ان پر عمل پیرا ہو اور پھر ہدایت پر قائم و دائم رہے تو میں اللہ اس کے پہلے سارے گناہوں کو بخشے والا ہوں۔ ہم اہتدی کے معنی میں اختلاف ہے، عطاء نے ابن عباس سے یہ نقل کیا ہے کہ وہ ایمان لانے اور نیک عمل کی توفیق اللہ کریم کی طرف سے سمجھے۔ قتادہ اور سفیان الثوری فرماتے اسلام کو لازم پکڑے رکھے اور اس پر ہی اسے موت آئے۔ الشعیبى مقاتل اور کلبی کہتے ہیں اس نے جان لیا کہ اس عمل کا مجھے ثواب ملے گا۔ زید بن اسلم فرماتے ہیں اس نے علم سیکھا تاکہ اسے یہ معلوم ہو جائے کہ کیسے عمل کرتا ہے۔ الضحاک فرماتے ہیں۔ وہ ہدایت مذکورہ پر مستحکم رہا۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں پھر وہ سنت اور جماعت پر قائم رہا (1) میرے نزدیک اس کا یہ معنی کہ پھر اسے اللہ کے قرب کی راہ ملی جو بلا کیف ہے اور قرب کے بلند مدارج تک پہنچنے کا راستہ ملا۔

وَ مَا اَعْجَلَكْ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوسٰى ﴿٣١﴾

”اور کس وجہ سے تم جلدی آگئے اپنی قوم سے اے موسیٰ!“

۱۔ یہ موسیٰ علیہ السلام کو خطاب ہے اور بنی اسرائیل کے خطاب النجینا حکم پر معطوف ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے سزا فرما دینا منتخب فرمائے تاکہ وہ آپ کے ساتھ طور پر چلیں اور تورات لے آئیں۔ موسیٰ علیہ السلام رب کریم کے شوق و محبت میں ان کو چھوڑ کر پہلے طور پر پہنچ گئے اور انہیں فرمایا کہ تم میرے پیچھے پہاڑ پر آ جاؤ۔ موسیٰ علیہ السلام کے جلدی پہنچنے پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ سے پوچھا کہ جلدی کیسے آگئے (2)۔ میں کہتا ہوں یہ سوال بطور تقریر ہے جیسے محبوب محبت کو انتہائی جذب و شوق کی کیفیت میں دیکھ کر پوچھتا ہے آپ کیسے آئے اور محبوب کی غرض یہ ہوتی ہے کہ محبت اپنے عشق و شوق کا اظہار کرے۔ لیکن ساتھیوں کو چھوڑ کر آنے کی وجہ سے کچھ انکار بھی فرمایا۔ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دو امروں کی طرف سے جواب دیا اور انکار کے جواب کو مقدم فرمایا کیونکہ وہ اہم تھا۔

قَالَ هُمْ اَوْلَادٌ عَلٰى اَشْرٰى وَّ اَعْجَلْتُ اِلَيْكَ سَرًّا لِّيَتْرَضٰى ﴿٣٢﴾

”عرض کی وہ یہ ہیں میرے پیچھے اور میں جلدی جلدی تیری بارگاہ میں اس لئے حاضر ہو گیا ہوں میرے رب کو تو راضی ہو جائے۔“

۱۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار وہ مجھ سے چند ہی قدم پیچھے ہیں۔ میرے اور ان کے درمیان کچھ زیادہ مسافت نہیں ہے، وہی تھوڑا سا فاصلہ جو عام طور پر قافلہ کے افراد میں ہوتا ہے۔ عجلت کا عطف ہُمْ اَوْلَادٌ پر ہے۔ یا قدمقدر کے ساتھ حال ہے۔ الیک سے مراد وہ مکان ہے۔ جس پر اللہ نے ان پر تجلیات ڈالے اور کلام کا شرف بخشے کا وعدہ فرمایا تھا رب اصل میں یاری تھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں لوضی کا مطلب یہ ہے کہ تیرے حکم کو جلدی پورا کرنا اور تیرے عبد کو جھٹانا تیری رضا کے حصول کا باعث بنتا ہے، اسی لئے میں نے جلدی کی۔ میں کہتا ہوں لوضی کا مطلب یہ ہے کہ تیری غایت محبت اور ملاقات کے اشتیاق اور

تیری کلام کو سننے کے ذوق کی وجہ سے میں نے جلدی کی جیسا کہ محبوب کی ملاقات کے وقت کی قربت کا تقاضا ہے اور یہ محبت و شوق تیری رضا کا مقتضی ہے۔

وعدہ وصل چوں شود نزدیک آتش عشق تیز گردد

جب وصل وصال کا وعدہ نزدیک آتا جاتا ہے، عشق کی آگ مزید تیز ہوتی جاتی ہے۔

قَالَ فَإِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْ بَعْدِكَ وَأَصْلَهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿٥٠﴾

”اگر شاد ہوا کہ ہم نے تو آ زما نیش میں جتلا کر دیا تمہاری قوم کو تمہارے (چلے آنے کے) بعد اہل اور گمراہ کر دیا ہے انہیں

سامری نے۔“

۱۔ فتن سے مراد آ زما نیش میں ڈالنا یا گمراہ کرنا ہے، یعنی ہم نے چھڑے کے اظہار کے ساتھ انہیں آزما یا کہ یہ اس کی عبادت کرتے ہیں یا نہیں۔ یا یہ معنی کہ ہم نے انہیں چھڑے کی عبادت کی وجہ سے گمراہ کر دیا۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ فانا قدا فتننا عجلت الیک پر مرتب ہے۔ تو ظاہر کلام کا تقاضا یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا جلدی آنا فتنہ کا سبب بنا کیونکہ فناء سبب ہے۔ تو اس میں سمیت کی وجہ کیا ہے؟ میں کہتا ہوں شاید یہ وجہ ہو کہ انبیاء علیہم السلام کو مخلوق خدا کی دو طرح سے ہدایت کرنے کے لئے بھیجا جاتا ہے، ایک ظاہر اور دوسرا انہیں اسلام کی دعوت دیں اور اسلامی احکام سے انہیں آگاہی بخشیں۔ دوسرا باطن کا مخلوق کو اللہ کی طرف اس طرح بھیجتا کہ وہ باقی سب مخلوق سے کٹ جائیں اور ان کے دلوں پر ایمان اور معرفت کے نور کا فیضان فرمائیں تاکہ ایمان کے لئے ان کے سینے کھل جائیں اور حق کو حق اور باطل کو باطل دیکھیں اور یہ کام اس وقت تک عمل نہیں ہوتا جب تک کہ انبیاء کرام پوری توجہ مخلوق خدا کی طرف نہ فرمائیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام شوق و یدار الہی میں طور پر جلدی آگئے تو ان کی باطنی توجہ امت سے کٹ گئی جس کی وجہ سے امت فتنہ اور ضلال میں مبتلا ہو گئی (اس لئے فناء ناکي فاء کو سبب بنا تا درست ہے اور اس کلام کو جلت پر مرتب کرنا بھی صحیح ہے)

اسی وجہ سے بعض صوفیا فرماتے ہیں الولایة افضل من النبوة۔ بعض علماء نے صوفیاء کے اس قول کی یہ تفسیر کی ہے کہ نبی کی ولایت نبی کی نبوت سے افضل ہے۔ فرمایا ولایت کے نبوت سے افضل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ولایت کا مقتضی ہر وقت یاد الہی میں مستغرق رہنا اور ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ رہنا ہے جب کہ نبوت کا مقتضی یہ ہے کہ وہ مخلوق کی طرف متوجہ رہے (یعنی ان کی ظاہری و باطنی صفائی میں مصروف رہے) لیکن تحقیق وہ ہے جو حضرت شیخ محمد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی ہے، وہ فرماتے ہیں نبوت مطلقاً ولایت سے افضل ہے کیونکہ ولایت تجلیات صفا تیہ سے عبارت ہے، جب کہ نبوت تجلیات ذاتیہ سے معنون ہے، اس لئے کہاں ذات اور کہاں صفات ان کا مقابلہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ حضرت شیخ محمد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں نبوت اور ولایت ہر ایک کے لئے عروج اور نزول ہے۔ صوفی مرتبہ عروج میں اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تاکہ کمال حاصل کرے اور مرتبہ نزول میں مخلوق کی طرف متوجہ ہوتا ہے تاکہ مخلوق کی تکمیل کرے (یعنی وہ انہوں کو کامل بنائے اور کاملوں کو رہنا بنائے) لیکن ولایت کی نسبت میں ولی کا عروج صفات کی طرف ہوتا ہے ذات کی طرف نہیں ہوتا (یعنی وہ صرف صفات کی سیر کرتا ہے ذات تک اس کی رسائی نہیں ہوتی) جب کہ نبی کا عروج ذات کی طرف ہوتا ہے) اور ولی نزول کے وقت مبداء فیض کی طرف متوجہ ہوتا ہے مخلوق کی طرف کلایہ متوجہ نہیں ہوتا۔ اور نبوت نزول کے وقت بالکلایہ مخلوق کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ اس حالت میں وہ ظاہر اللہ تعالیٰ سے اپنے آپ کو منقطع

دیکھتا ہے اور یہ کیفیت اس کے لئے انتہائی شاق اور گراں ہوتی ہے، انتہائی مشقت اور تنگی میں ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ اس کیفیت میں اللہ سے منقطع نہیں ہوتا بلکہ اللہ کی طرف بھی متوجہ ہوتا ہے۔ اس کا سیدہ گنجینہ زان دونوں جہتوں کا جامع ہوتا ہے بلکہ جب وہ اللہ تعالیٰ کے اذن اور اس کے حکم سے ہی مخلوق کی طرف متوجہ ہے تو حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہے۔ اسی وجہ سے اس سیر کو سیر اُمن اللہ باللہ کہا جاتا ہے۔ فانی فی الوصال عبید نفسی و فی الہجران مولیٰ للموالی۔ میں وصال میں اپنے نفس کا ایک ادنیٰ غلام ہوتا ہوں اور ہجر میں سرداروں کا سردار ہوتا ہوں۔ ہم نے سورۃ اَلَمْ نَشْرُبْ مِنْ قَبْلِ عَمِّ الْعُسْرِ نَبْرًا اِنْ عَمِّ الْعُسْرِ لَبِئْسَ اٰكِن تفسیر کے تحت اس مسئلہ کو پوری شرح و بسط سے لکھا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو اترات عطاء کرنے اور وعدہ پورا کرنے کے بعد فرمایا ہو کہ اپنی قوم کے پاس جاؤ۔ ہم نے اسے آزمائش میں ڈال دیا ہے۔

ج۔ اللہ تعالیٰ نے فتنہ اور ضلال کی نسبت اپنی طرف کی کیونکہ ضلالت خود ہی اس نے ان میں پیدا فرمائی تھی اور سامری میں اضلال کا فعل بھی خود اس نے پیدا فرمایا تھا۔ اور سامری کی طرف اضلال کی نسبت فرمائی کیونکہ اضلال کا کسب اس نے کیا تھا اور اس نے لوگوں کو چھڑے کی پوجا کی طرف بلایا تھا۔ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ چھوٹا اکھ افراد چھڑے کی عبادت میں مبتلا ہوئے تھے، صرف بارہ ہزار افراد اس گمراہی سے بچے تھے (1)۔ قاسموس میں ہے کہ سامری یہ کرمان کا کافر تھا یا بنی اسرائیل کا سردار تھا اور سامر جگہ کی طرف منسوب ہے (2) امام بیضاوی فرماتے ہیں بنی اسرائیل کے ایک قبیلہ کی طرف منسوب ہے جسے سامرہ کہا جاتا تھا۔ اس سامری کا اصل نام موسیٰ بن طغر تھا اور یہ منافق تھا (3)۔

فَرَجَعَ مُوسَىٰ اِلَىٰ قَوْمِهِ غَضْبَانَ اَسْفَاًاۙ قَالَ لِقَوْمِ اَلَمْ يَبْعَدُكُمْ رَبُّكُمْۙ وَعَدَاۙ حَسْبًاۙ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُۙ اَمْ اَمَدْتُمْۙ اَنْ يَّجِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌۙ مِنْ رَبِّكُمْۙ فَاخْلَقْتُمْ مَوٰجِدًاۙ ﴿٥١﴾

” (یہ سنتے ہی) لوٹے موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف غضبناک اور افسردہ خاطر ہو کر فرمایا اے میری قوم! کیا وعدہ نہیں کیا تھا تم سے تمہارے رب نے بہت عمدہ وعدہ کیا تو کیا طویل مدت گذر گئی ہے اس وعدہ پر (اور تم اس کے ایفاء سے مایوس ہو گئے) یا تم یہ چاہتے ہو کہ اترے تم پر غضب تمہارے رب کی طرف سے اس لئے تم نے تو ڈڈا ڈال میرے ساتھ کیا ہوا وعدہ ج۔“

۱۔ چالیس دن پورے کرنے اور تورات لینے کے بعد موسیٰ علیہ السلام قوم کے فعل پر بڑے غصہ اور اضطراب میں واپس چلے۔ وعدا مصدر کی بناء پر منصوب ہے یا معنویت کی بناء پر منصوب ہے اس بناء پر کہ وعدہ بمعنی الموعود ہے۔
 ۲۔ افظال میں استفہام انکاری ہے۔ اور فناء عاطفہ ہے۔ اور عطف محذوف کلام پر ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے انانوم بمصاحبتی ایاکم فاستم باللہ وحده وعدتمونی ان تکونوا بعدی علی ذالک فطال علیکم العهد۔ تمام قراء نے یحل کو باب ضرب بوضوب سے جاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تمہاری حماقت کی بھی کوئی حد ہے

2۔ القاسموس الحیجیہ، جلد 1، صفحہ 577 (الترات العربی)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 224 (انجاریہ)

3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ زادہ، جلد 5، صفحہ 648 (العلمیہ)

کہ تم نے ایسے کام کا ارادہ کیا ہے جو غضب الہی کا موجب ہے اور میرے ساتھ جو تم نے ایمان پر ثابت قدم رہنے اور میرے احکام کی بجا آوری کا وعدہ کیا تھا، تم نے پس پشت ڈال دیا۔

قَالُوا مَا أَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلِكِنَا وَلَكِنَّا حَمِينًا ۖ أَوْذَرْنَا أَمْ يَتَذَكَّرُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ أَفَلَا يَتَذَكَّرُ ۗ أَلَمْ يَكُنْ مِنْكُمْ نَبِيٌّ خَلَّىٰ عَلَيْهِمُ الْغُفْرَانَ ۗ وَأَوْرَثَهُمُ الْمُلُوكَ ۗ وَجَاءَهُمْ مِنْكُمْ بَنَاتُهُمْ فَانكِحَتْهُنَّ ۚ فَلِيَبْئُوتَهُنَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حِمْلًا ۗ لَعَلَّهُمْ يُعْذَرُونَ ۗ

”کہنے لگے تم نے تو زرا ہم نے آپ سے کیا ہوا وعدہ اپنے اختیار سے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہم پر لا دو دیئے گئے تھے جو بھوکوم (فرعون) کے زیورات سے ہیں سو ہم نے (سامری کے کہنے پر) انہیں پھینک دیا۔ اسی طرح سامری نے بھی (اپنے حصد کے زیور) پھینک دیئے ہیں۔“

۱۔ ملکنا کو نافع ابو جعفر اور عاصم نے میم کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے، حمزہ اور کسائی نے میم کے ضمہ کے ساتھ اور باقی قراء نے میم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ملکیت المشی کے مصدر میں یہ ساری لغتیں موجود ہیں، یعنی جب انسان اللہ کی طرف کسی مصیبت یا فتنہ میں مبتلا ہوتا ہے، اپنے آپ کا کچھ مالک و مختار نہیں ہوتا۔ قاموس میں بھی یہی معنی لکھا ہے۔

۲۔ حملنا کو نافع ابن کثیر اور حفص نے حاء کے ضمہ اور میم کے کسرہ اور تشدید کے ساتھ جمول کا صیغہ پڑھا ہے۔ ابو عمر حمزہ کسائی یکتوب اور ابو بکر نے حاء کے فتح اور میم کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اوزاراً سے مراد بوجھ ہیں۔ من زينة القوم اوزار کی صفت ہے۔ یہ وہ زیورات تھے جو شادی کے بہانے فرعونوں سے بنی اسرائیل نے عاریتہ لینے تھے اور یہ اس رات لئے تھے جس رات مصر سے کوچ کرنے کا ارادہ تھا۔ عبد بن حمید ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ امام بخاری فرماتے ہیں ان زیورات کو انہوں نے اوزار (بوجھ) اس لئے کہا تھا کیونکہ وہ انہوں نے عاریتہ لئے تھے اور پھر واپس نہیں کئے تھے (۱)۔ بعض علماء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے جب فرعونوں کو فریق کیا تو سمندر نے ان کے زیورات باہر پھینک دیئے تھے اور بنی اسرائیل نے اٹھا لینے تھے اور یہ مال غنیمت تھے اور اس زمانہ میں مال غنیمت کا استعمال حلال نہیں تھا، اس وجہ سے انہوں نے ان زیورات کو اوزار کہا۔

۳۔ امام بخاری فرماتے ہیں انہوں نے اپنے زیورات ایک گڑھے میں پھینکے تھے، یہ مشورہ انہیں سامری نے دیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی واپسی تک ان زیورات کو اس گڑھے میں پھینک دو۔ سدی فرماتے ہیں یہ بات انہیں حضرت ہارون نے فرمائی تھی کہ مال غنیمت حلال نہیں اس لئے ایک گڑھا حاکم دو اور اس میں تمام زیورات پھینک دو۔ موسیٰ علیہ السلام واپس تشریف لائیں گئے جو چاہیں گے حکم فرمائیں گے (۲)۔

۴۔ سامری کے پاس جو زیورات تھے وہ اس نے بھی پھینک دیئے۔ سعید بن جبیر نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ہارون علیہ السلام نے آگ جلائی اور فرمایا جو کچھ تمہارے پاس فرعونوں کے زیورات ہیں اس میں پھینک دو تو تمام نے پھینک دیئے۔ پھر سامری کے پاس جو جبرئیل امین کے گھوڑے کے پاؤں کی مٹی تھی وہ اس نے پھینکی۔ قتادہ فرماتے ہیں کچھ مٹی اس نے اپنے عمامہ میں رکھ لی تھی (۳)۔

فَأَخْرَجَ لَهُمْ عَجَلًا جَسَدًا لَهُ خُورًا ۗ فَقَالُوا هَذَا إِلَهُهُمْ وَإِلَهُ

مُوسَىٰ ۗ فَكَيْسَىٰ ۗ

”پھر سامری نے بنا کالائان کے لئے چمڑے کا ڈھانچہ جو گائے کی طرح ڈکارتا تھا پھر سامری اور اس کے چیلوں نے

کہا (اے فرزندان یعقوب) یہ ہے تمہارا خدا اور موسیٰ کا خدا پس موسیٰ بھول گئے۔^۱

۱۔ اخراج کا قائل سامری ہے۔ لہم ضمیر کا مرجع بنی اسرائیل ہیں۔ جسداً عجلداً سے بدل ہے۔ خوار عجلانگی صفت ہے سامری اور اس کے پیلوں نے کہا موسیٰ السلام اس خدا کو یہاں چھوڑ کر طور پر تلاش کرنے گئے ہیں یا یہ معنی کہ موسیٰ علیہ السلام پہلے جس ایمان پر قائم تھے وہ انہوں نے ترک کر دیا ہے اور اللہ کا انکار کر دیا ہے۔

أَفَلَا يَرَوْنَ أَلَّا يَرْجِعُ إِلَيْهِمْ قَوْلًا ۚ وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ صَرًّا وَلَا نَفْعًا ۝

”کیا انہوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ یہ بھڑا ان کی کسی بات کا جواب بھی نہیں دے سکتا اور نہ اختیار رکھتا ہے ان کے لئے کسی ضرر کا اور نفع کا۔“

۱۔ استفہام انکاری ہے اور جملہ محذوف کلام پر معطوف ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہوگی الا یبظرون فلا یرون یا تقدیر عبارت اس طرح ہوگی افرو یا مالوہینہا فلا یعلمون هذا الحمقاء (یعنی کیا انہوں نے اس بھڑے کی الوہیت کا اقرار کیا یہ احمق انتخابھی نہیں جانتے) ان لا یرجع میں ان یفقد من منقلہ ہے، اس کا اسم ضمیر شان محذوف ہے۔ یعنی اللہ لا یرجع ذالک العجل یعنی وہ تو ان کی بات کا جواب ہی نہیں دیتا اور نہ ان سے ابتداء کلام کرتا ہے۔ پس جب وہ ان سے کم درجہ بنے تو انہوں نے اسے کیسے اپنا معبود بنالیا؟ نہ تو وہ انہیں کچھ نفع دے سکتا ہے اور نہ نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ نفع و نقصان ان سے روک سکتا ہے پھر یہ عبادت کا مستحق کیسے بن گیا ہے؟ امام ابنوی نے لکھا ہے کہ بعض علماء فرماتے ہیں حضرت ہارون علیہ السلام سامری کے پاس سے گذرے، وہ بھڑے کا ڈھانچہ تراش رہا تھا۔ آپ نے پوچھا یہ کیا ہے؟ سامری نے کہا میں ایک ایسی چیز بنا رہا ہوں جو نفع دے گی، نقصان نہ دے گی، آپ میرے لئے دعا فرمائیں۔ حضرت ہارون نے دعا فرمائی اے اللہ اسے اپنی خواہش کے مطابق وہ عطا فرما۔ پس سامری نے بھڑے کے منہ میں جرنیل کے گھوڑے کے پاؤں سے لگی مٹی ڈالی تو وہ تیل کی طرح ڈکارنے لگا۔ یہ حضرت ہارون کی دعا سے سب کچھ ہوا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک آزمائش تھی جس سے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو آزمایا تھا (۱)۔

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هَارُونُ مِنْ قَبْلُ يُقَوْمِ رَبِّكُمْ إِنَّهَا قَوْمٌ مُّبِينٌ ۚ وَإِنَّ رَبَّكُمْ
الرَّحْمَنُ فَاتَّبِعُونِي وَأَطِيعُوا أَمْرِي ۝

”اور بے شک کہا تھا انہیں ہارون نے (موسیٰ کی واپسی سے پہلے) اے میری قوم تم تو قوت مند قوم تھے مگر تمہارا رب تمہارا رب تو اللہ تعالیٰ ہے اور یہ جملہ وہ ہے جو بے شک مہربان ہے پس تم میری پیروی کرو اور میرا حکم مانو۔“

۱۔ لقد انج محذوف قسم کا جواب ہے اور یہ جملہ وہ لَقَدْ وَ اَوْحَيْنَا اِنَّا مُؤْتَسُونَ اُنْ اَسُو بَعِیْا وِیٰی پر معطوف ہے۔ حضرت ہارون نے فرمایا اے میری قوم تمہیں بھڑے کے ذریعے آزمائش میں ڈالا گیا ہے کہ تم کو حید پر ثابت قدم رہتے ہو یا گمراہ ہو جاتے ہو۔ تمہارا پروردگار رحمن ہے، تمہارا اپنا وجود اور اس کی نشوونما کے لئے یہ رنگارنگ کائنات اس کی رحمت بے پایاں کا اثر ہے، اسی پر ثابت قدم رہو اور بھڑے کی عبادت سے انکار میں میرے حکم کی اطاعت کرو۔ فاتبعونی پر فاء سبب ہے۔ کیونکہ اس کا ماقبل ما بعد کا سبب ہے۔

قَالُوا لَنْ نَبْرَحَ عَلَيْكَ عَاقِبِينَ حَتَّىٰ يَرْجِعَ إِلَيْنَا مُوسَىٰ ۝

”قوم نے کہا ہم تو اسی کی عبادت پر جتھے رہیں گے یہاں تک کہ لوٹ آئیں ہماری طرف مویٰ علیہ السلام۔“

لے حضرت ہارون علیہ السلام کی تبلیغ کا انہوں نے کچھ اشر قبول نہ کیا اور اس بے بس گنگے بہرے پھڑسے کی عبادت پر ڈٹے رہنے کا عزم کیا تو حضرت ہارون علیہ السلام بارہ ہزار لوگوں کے ساتھ ہو گئے جنہوں نے پھڑسے کی عبادت نہیں کی تھی اور توحید پر قائم و مضبوط رہے تھے۔ جب مویٰ علیہ السلام واپس پلٹے تو قوم میں شور وغل سا اور دیکھا کہ قوم کے افراتفری کے اسرار درگاہ راج رہے ہیں۔ وہ ستر آدمی جو آپ کے ساتھ تھے انہوں نے کہا یہ فتنہ کی آواز ہے۔ مویٰ علیہ السلام نے قوم کی یہ بدلی ہوئی حالت دیکھ کر حضرت ہارون کو پکڑ لیا دیکھتا ہوں کہ ان کا سر اور ہاتھ سے ان کی داڑھی بکڑنی اور غصناک لہجہ میں کہنے لگے۔

قَالَ لِيَهْرُونَ مَا مَعَكُمْ إِذْ مَا يَأْتِيَهُمْ صَلَاتُكُمْ إِلَّا تَتَّبِعِينَ أَفَعَصَيْتُمْ أَمْرِي ۖ

”مویٰ نے (آ کر غصے سے) کہا اے ہارون کس چیز نے تجھے روکا کہ جب تو نے انہیں گمراہ ہوتے دیکھا تو (انہیں چھوڑ

کر) میرے پیچھے نہ چلا آیا۔ کیا تو نے بھی میری حکم عدولی کی ہے۔“

لے بعض علماء فرماتے ہیں یہاں مجازاً دعا کی جگہ منع ذکر کیا گیا ہے کیونکہ کسی چیز سے بھرنے والے اور کسی چیز کے ترک کی طرف دعوت دینے والے کے درمیان تعلق پایا جاتا ہے۔ جمہور علماء فرماتے ہیں ان لا تتبعن میں لا زائد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کس چیز نے تجھے روکا تھا میری بیروی سے اور اس وصیت کو پورا کرنے سے جو میں نے تجھے کی تھی کہ مخلوق خدا کو توحید کی دعوت دیتے رہنا اور انہیں (شمشیر و) سناں اور (دست و) زبان کے ذریعے شریک سے منع کرتے رہنا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ معنی کہ تو میرے پیچھے کیوں نہ چلا آیا تاکہ مجھے قوم کے کرتوتوں کی خبر دیتا۔ اور تمہارا ان کو چھوڑنا ان کے اس فعل بد پر جبر و توجیح جاتا۔ تبصیح میں ابن کثیر نے دونوں صورتوں میں یا ہر ساکن کو قائم رکھا ہے، جب کہ نافع اور ابو عمر نے صرف وصل کی صورت میں قائم رکھا ہے اور دوسرے قراء نے دونوں حالتوں میں یا ہ کو حذف کیا ہے۔

لے افصیت امری میں استفہام انکاری ہے اور یہ جملہ محذوف کلام پر مطلق ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اور صیت بما فعلوا والامت فیہم و ففصیت۔ کیا تو ان کے فعل سے راضی تھا اور تو ان میں ٹھہرا اور ہا اور تو نے بھی میری حکم عدولی کی ہے۔

قَالَ يَبْنَؤُمْ لَا تَأْخُذْ بِالْحَقِيقِ وَلَا بِرَأْسِي ۚ إِنِّي خَشِيتُ أَنْ تَقُولَ

فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَكَمْ تَتَرْقُبُ قَوْلِي ۝

”ہارون نے کہا اے میرے ماں جانے (بھائی) لے نہ پکڑو میری داڑھی کو اور نہ میرے سر (کے بالوں) کو۔ میں نے

اس خوف سے (ان پر سختی نہ کی) کہ کہیں آپ یہ نہ کہیں کہ تو نے چوٹ ڈال دی بنی اسرائیل کے درمیان اور میرے حکم کا

انتظار نہ کیا ہے۔“

لے حضرت ہارون نے يَبْنَؤُمْ فرمایا۔ تاکہ حضرت مویٰ کے دل میں رحمت اور نرمی کا جذبہ پیدا ہو۔ اور بعض فرماتے ہیں کہ واقعی حضرت مویٰ ان کے اخلاقی بھائی تھے۔ لیکن جمہور علماء فرماتے ہیں کہ حضرت مویٰ اور ہارون ماں باپ دونوں کی طرف سے بھائی تھے۔ لے نافع اور ابو عمر نے داسی کو یا ہ کے فتنے کے ساتھ اور باقی قراء نے یا ہ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ فرمایا میرے سر کے بال نہ کھینچنے حضرت مویٰ علیہ السلام نے بہت سختی سے اور غصے میں آپ کے بال کھینچتے تھے۔ اسی خشیت نبی کی علت ہے، یعنی اگر میں ان

کے ساتھ قاتل کرتا تو بنی اسرائیل کی گروہوں میں بٹ جاتے اور ایک دوسرے کے گلے کاٹتے رہتے۔
 آپ نے فرمایا کہ کہیں آپ یہ نہ کہیں کہ میں نے جو تمہیں وصیت کی تھی اَخْلَفْتُمْ فِي تَوْبَتِي وَ اَصْبَحْتُمْ قَوْمٌ جَهْلُونَ اے تم نے
 اس کی مخالفت نہیں کی۔ آپ کی ہر وصیت نری کرنے پر اور سختی نہ کرنے پر دلالت کرتی تھی اور اصلاح خون ریزی کے منافی ہے اس
 لئے میں نے جنگ وجدل سے گریز کیا۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يَا سَامِرِيُّ ۝۱۱

”آپ نے پوچھا اے سامری (اس فقہ انگیزی) سے تیری غرض کیا تھی ل۔“
 امام بیہاوی فرماتے ہیں خطبہ مصدر ہے خطبہ الہی کا جس کا معنی کسی چیز کو طلب کرنا ہے معنی یہ ہے کہ اے سامری تیرا اس فعل
 سے مطلوب کیا تھا کس وجہ سے تو نے یہ کہیل کیا۔ کس چیز نے تجھے اس کام پر ابھارا۔ نہایہ میں ہے۔ ماخطبک ای ماشانک
 وحالک کیا حال ہے تیری شان کیا ہے اور خطب اس کام کو کہتے ہیں جس کے متعلق خطاب کیا جائے۔ اس کا معنی شان اور حال بھی
 ہے۔ تاموس میں الخطب الشان والا مرعظم اوصغر (۱)۔ خطب شان اور کام کو کہتے ہیں خواہ وہ کام عظیم ہو یا حقیر ہو۔

قَالَ بَصْرَتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُولِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذَلِكَ سَوَّلْتُ لِي نَفْسِي ۝۱۲

”اس نے کہا میں نے دیکھی ایسی چیز جو لوگوں نے نہ دیکھی تھی میں نے منہی بھری رسول کی سواری کے نشان قدم کی
 خاک سے پھراسے ڈال دیا (اس ڈھانچہ میں) اور اس طرح آراستہ کر دی میرے لئے میرے نفس نے یہ بات ل۔“
 لہ نماز اور کستانی نے لم بصروا کوناء کے ساتھ خطب کا صینہ پڑھا ہے، جب کہ دوسرے علماء نے یہاں کے ساتھ غائب کا صینہ پڑھا
 ہے۔ قبضۃ مصدر ہے تعداد بیان کرنے کے لئے اور یہ قبض سے مشتق ہے اور قبض کے معنی میں ہے۔ رسول سے مراد جبرئیل علیہ
 السلام ہے، یعنی میں نے جبرئیل کے گھوڑے کے نشان قدم سے منہی بھری پھر میں نے اسے اس پھڑے کے منہ میں ڈال دیا۔
 بعض علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ زیورات سے بنا ہوا پھڑا اس منی کی وجہ سے ڈکارنے لگا تھا جو جبرئیل کے نشان قدم سے لی
 گئی تھی اور سامری جبرئیل کو پہچانتا تھا کیونکہ جس سال سامری کو مان نے جنم دیا تھا اس سال فرعون بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کیا کرتا
 تھا۔ اس کی ماں نے فرعون کے خوف سے اسے ایک عار میں رکھ دیا تھا اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو بھیجا تا کہ اس کی نشوونما کا ہتمام کرے۔
 کیونکہ اللہ نے اس کے ہاتھوں بنی اسرائیل کو آزمائش میں ڈالنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جبرئیل امین اس کی پرورش کرتے رہے یہاں تک کہ
 وہ اپنے بیروں پر کھڑا ہو گیا۔

سامری نے کہا میرے نفس نے ہی مجھے ترغیب دی کہ میں ایسا کروں۔

قَالَ فَلْتَمِبْ فَإِنَّكَ فِي الْحَيَاةِ أَنْ تَقُولَ لَا مِسَاسَ وَإِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ
 تُخْلَقَهُ وَانظُرْ إِلَى إِلَهِكَ الَّذِي ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا لَّنُحَرِّقَنَّهُ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهُ فِي

الْيَمِّ سَقَا ۝

”آپ نے (غصہ سے) فرمایا جا چلا جا۔ جس تیرے لئے اس زندگی میں تو یہ (سزا) ہے کہ تو کہتا پھرے گا کہ مجھے کوئی ہاتھ نہ لگائے اور پینک تیرے لئے ایک اور وعدہ (عذاب) بھی ہے جس کی خلاف ورزی نہیں ہوگی اور (ذرا) دکھ اپنے اس خدا کی طرف جس پر تو ہم کرمیٹھا رہا (اس کا کیا حشر ہوتا ہے) ہم اسے جلا ڈالیں گے۔ پھر ہم کبھی کبھادیں گے اس سمندر میں اس کی (راکھ) کو بے۔“

۱۔ سامری کو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی مجلس سے نکل جانے کا حکم دے دیا اور فغان پر فاء سویہ ہے، یعنی آپ نے فرمایا دفع ہو جا، وہ دنیا میں تیرے لئے یہ سزا اور عقوبت ہے کہ تو جب کسی کو دیکھے گا تو کہے گا مجھے ہاتھ نہ لگاؤ، میرے قریب نہ آؤ۔ میں کہتا ہوں شاید یہ اس وجہ سے وہ کہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں وحشت ڈال دی تھی، وہ کسی سے مانوس نہیں ہوتا تھا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اگر اتفاقاً وہ کسی کو چھو لیتا یا اسے کوئی دوسرا چھو لیتا تو دونوں کو بخار چڑھ جاتا۔ اسی خوف کی وجہ سے وہ یہ کہتا تھا کہ مجھے کوئی نہ چھوے۔ وہ جنگل میں تنہا رہا اور پھر مد کے ہوئے وحشی کی طرح گھومتا پھرتا مریا۔ امام بخاری نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو حکم دیا تھا کہ اس کے ساتھ میل جول اور تعلق ختم کر دو۔ ابن عباس نے فرمایا تھے اور تیرے بیٹے کو نہ چھونا ہے (۱)۔ موعداً سے مراد آخرت کا عذاب ہے۔ لن تخلفہ کو ابن کثیر ابو عمر اور یعقوب نے لام کے سر کے ساتھ معروف کا صیغہ پڑھا ہے۔ یعنی تو عذاب الہی سے غائب نہ ہوگا اور نہ تیرے لئے کوئی فرار کی جگہ ہوگی بلکہ قیامت کے روز تجھے عذاب ملے گا اور یہ بھی جائز ہے کہ اسحلفت الموعدا سے مشتق ہو، یعنی یہ ہوگا کہ تو وعدہ کی خلاف ورزی نہ پائے گا۔ دوسرے قراء نے لام کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اس کو عذاب دینے کے وعدہ میں خلاف ورزی نہیں فرمائے گا۔ ظلت اصل میں ظلمت تھا تخفیفاً پہلے لام کو حذف کیا گیا ہے۔ یعنی تو جس باطل خدا کی عبادت پر ہزار ہا زاد دیکھ ہم کیسے اس کی اور گت بناتے ہیں ہم اسے آگ کے ساتھ جلا دیں گے یا ریت کے ساتھ اس کو ریزہ ریزہ کر دیں گے۔ حرق کا معنی ریتی کے ساتھ کسی چیز کو رگڑنا ہے۔ مبالذ کے لئے باب تفعیل بنایا گیا ہے اور جعفر نے باب افعال سے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲۔ پھر ہم اس کی راکھ کو یا اس کے رگڑے ہوئے چورے کو دریا میں ڈال دیں گے، اس کا ایک ذرہ بھی تمہیں نہیں ملے گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان کی پوجا کرنے والوں کی حماقت کے اظہار کے لئے ایسا کیا۔ تاکہ جس میں کچھ بھی عقل ہوگی تو سمجھ جائے گا کہ جس کے سامنے ہم اپنی جہتیں خم کرتے رہے اس میں تو اتنی بھی طاقت نہیں کہ اپنا آپ بچا سکے۔

إِنَّمَا إِلَهُكُمُ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۖ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۝

”تمہارا معبود تو صرف اللہ تعالیٰ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ گھیر رکھا ہے اس نے ہر چیز کو (اپنے) علم سے۔“

۱۔ یعنی عبادت کا مستحق تو صرف اللہ ہے کیونکہ کمال علم اور کمال قدرت میں اس کا کوئی ہمسرا اور مثل نہیں ہے اور اس کے علم و محیط نے ہر چیز کو اپنے احاطہ میں لے رکھا ہے، وہ ذات ہمہ میں اور ہمہ دان ہے۔ یہ پچھڑا جواز یورات کو کٹ کر تیار کیا گیا ہے اور پھر آگ کے شعلوں کے سپرد کیا گیا ہے، وہ نہ تمہارا معبود تھا اور نہ وہ کچھ دیکھتا اور جانتا تھا۔ وہ اگر زندہ بھی ہوتا تو غنمات و حماقت کی ایک مثال ہوتا (اے بے بس اور بے زبان کی عبادت اور اس کے سامنے جنہیں فرسائی سے تمہیں شرم آتی چاہئے تھی، بڑا حیف ہے تمہاری عقل پر)

علمائے نسبت سے تیز ہے۔

كذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْبَاءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۗ وَ قَدْ اَنْبَاَيْكَ مِنْ لَدُنَّا ذِكْرًا ﴿١٠﴾

”یوں ہم بیان کرتے ہیں آپ سے خبریں ان لوگوں کی جو پہلے گزر چکے اور ہم نے مرحمت فرمایا آپ کو اپنی جناب سے ایک پند نامہ۔“

۱۰۔ کذا الذک صدر محذوف اخصاصاً کی صفت ہے اور ہم نے تجھ پر پہلی امتوں کے واقعات بیان فرمائے تاکہ تیرے علم میں اضافہ ہو تیرے معجزات میں زیادتی ہو اور آپ ان میں غور و فکر کریں۔ نیز تیری امت کے صاحب فرست اور صاحب بعیرت لوگوں کو تنبیہ ہو جائے۔ قد آتینک نقص کے فاعل سے حال ہے۔ ذکراً سے مراد قرآن ہے۔ یعنی ہم نے آپ کو قرآن جیسی مقدس کتاب عطا فرمائی جو ان قصص و واقعات پر مشتمل ہے اور اس لائق ہے کہ اس میں غور و فکر کیا جائے۔ ذکراً پر تو تین تعظیم کے لئے ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ ہم نے آپ کو اپنی جناب سے ذکر جمیل اور لوگوں کے درمیان عظیم شہرت عطا فرمائی۔ یا یہ معنی کہ ہم نے آپ کے ذکر کو اپنے ذکر کے ساتھ اذان آقا صلی اللہ علیہ وسلم اور شہد و غیرہ میں ملا دیا ہے۔

مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهُ يَخُصِلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وُجْرًا ﴿١١﴾

”جو شخص روگردانی کرے گا اس سے وہ اٹھائے گا قیامت کے دن ایک بوجھ ل۔“

۱۱۔ مَنْ اعرض عنه یا تو ذکراً کی صفت ہے یا ساتھ جملہ ہے، یعنی جو قرآن سے مندرجہ آگے اور اس پر ایمان نہیں لائے گا اور اس کے احکام پر عمل پیرا نہیں ہوگا یا یہ معنی کہ انے محبوب جو تیرے ذکر سے اعراض کرے گا اور بعض علماء نے عنہ کی ضمیر کا مرجع اللہ کو بنایا ہے، اس وقت یہ معنی ہوگا جو اللہ سے اعراض کرے گا۔ وُجْرًا کا معنی بوجھ ہے اور یہاں لگنا ہوں کا بوجھ مراد ہے۔ سورہ مریم میں یَوْمَ نَخْشَى الْمُنَافِقِينَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَ ذُنُوْبِهِمْ اَمَّا ابْنِ حَتْمٍ اَبْنِ اَبِي حَتْمٍ كِي رَجُلِيْ هُوَ جَوَانِبُوْنَ لِيْ عَمْرُوْا قِيْسِ الْمَلْلَانِيْ رُوَايَتُ كِي هُوَ، اس حدیث میں ہے کہ کافر کا عمل انتہائی قبیح شکل اور بد بوی کے ساتھ آئے گا اور اسے کہے گا کیا تو مجھے نہیں جانتا؟ وہ کہے گا نہیں، صرف اتنا نظر آ رہا ہے کہ اللہ نے تیری شکل بڑی قبیح بنائی ہے اور تیری بد بوی بڑی خبیث ہے۔ وہ کہے گا تو دنیا میں اسی طرح رہا، میں تیرا برا عمل ہوں۔ وہاں تو جھ پر لسا عرصہ سوار رہا، آج میں تجھ پر سوار ہوں گا اور پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَ قَدْ مَنَّ اللهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ اَوْفَىٰ اٰمُرَهُمْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (وہ اپنی چیخوں پر اپنے بوجھ اٹھائے ہوں گے) یا یہ معنی کہ وہ بڑی بھاری سزا برداشت کریں گے۔ سزا کو دوزخ سے تعبیر کیا ہے گویا اسے تنبیہ دی گئی ہے بوجھ اٹھانے کی مشقت سے۔ وہ بوجھ جس کو اٹھانا مشکل ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے کمر دوہری ہو جاتی ہے۔

حٰلِيْنَ فِيْهِ ۗ وَ سَاءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ جِمْلًا ﴿١٢﴾

”یہ لوگ ہمیشہ اس بوجھ تلے دے رہیں گے اور بہت تکلیف دہ ہوگا ان کے لئے روز قیامت یہ بوجھ ل۔“

۱۲۔ فیہ میں ضمیر کا مرجع جزاء الوزر یعنی اس گناہ کی جزاء میں ہمیشہ رہیں گے یا یہ معنی کہ وہ اس بوجھ کو ہمیشہ اٹھائے رہیں گے۔ خالید بن ذہب نے یخجل کے فاعل سے حال ہے۔ من کے لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے یخجل مفرد کا صیغہ ذکر فرمایا اور معنی کا اعتبار کرتے ہوئے (خالید بن ذہب) کا صیغہ جمع فرمایا۔

۱۳۔ جملہ ساء میں بہم ضمیر کی تیز ہے اور خصوصاً بالذم (وزر ہم) محذوف ہے اور ہم میں لام بیان کے لئے ہے۔

یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ جو کسی انسان نے ناحق دنیا کا مال لیا ہو گا وہ قیامت کے دن اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص ناحق کسی کا مال نہ لے ورنہ قیامت کے روز اللہ کے حضور وہ اسے اٹھائے ہوئے جائے گا۔ میں تم میں سے کسی کو ایسی حالت میں نہ پاؤں کہ وہ اللہ کے حضور حاضر ہو اور اس پر اونٹ بلبلا رہا ہو اور گائے ڈکار رہی ہو اور بکری میسنار رہی ہو (1)۔ یہی حدیث امام بخاری اور مسلم نے حضرت ابو حمید الساعدی سے صدقات میں سے کوئی چیز ناحق لینے والے عامل کے بارے میں نقل کی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو ایک باشت زمین ظلم سے لے لگا، قیامت کے روز سات زمینوں میں سے اتنی زمین کا طوق اس کے گلے میں ہوگا (2)۔ طبرانی نے الکلم بن الحارث السلمی سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو مسلمانوں کے راستے سے ایک باشت غصب کر لے گا، قیامت کے روز وہ سات زمینوں سے اتنی مقدار اٹھائے ہوئے ہوگا (3)۔ امام احمد اور طبرانی نے یحییٰ بن مرہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو شخص ظلماً ایک باشت زمین کسی کی لے گا تو اللہ تعالیٰ اسے سات زمینوں تک گڑھا کھودنے کا مکلف بنائے گا۔ پھر قیامت کے روز اسے ان زمینوں کا طوق پہنا دیا جائے گا اور لوگوں کے فیصلہ تک وہ زمین اس کے گلے میں رہے گی (4)۔

طبرانی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو زمین کی ایک باشت ظلماً لے گا قیامت کے روز سات زمینوں میں سے اتنی مقدار اس کے گلے میں ڈالی جائے گی (5)۔ اسی طرح طبرانی نے ابن مالک اشعری سے روایت کی ہے۔ امام احمد اور شیخین نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے مال غنیمت میں خیانت کی برائی بیان کی اور اس کا حکم بیان فرمایا پھر فرمایا میں تم میں سے کسی کو اس حالت میں نہ پاؤں کہ وہ قیامت کے روز آئے تو اس کی گردن پر اونٹ بلبلا رہا ہو اور بچرہ بچرہ سے عرض کرے یا رسول اللہ! میری مدد فرمائیے۔ میں اسے کہوں اللہ کے مقابلہ میں کسی چیز کا مالک نہیں ہوں، میں نے تمہیں پیغام الہی پہنچا دیا تھا (6)۔ اسی حدیث میں فرمایا وہ آئے اور اس کی گردن پر گھوڑا چہنار رہا ہو اور بکری میسنار رہی ہو۔ ابویعلیٰ اور بزار نے عمر بن خطاب سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ صدقہ اکٹھا کرنے والوں کے متعلق بھی اسی طرح کا ارشاد وارد ہے جب وہ خیانت کریں۔ حضرت سعد بن عبادہ اور بلب کی حدیث امام احمد نے اسی طرح روایت کی ہے۔ اسی طرح حضرت ابن عمر اور حضرت عائشہ کی حدیث بزار نے ابن عباس، عبادہ بن الصامت اور ابن مسعود کی حدیث طبرانی نے نقل کی ہے۔ طبرانی اور ابو نعیم نے اٹھلیہ میں ضعیف سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے ضرورت سے زائد مکان بنا یا وہ اسے کندھے پر اٹھائے کا مکلف کیا جائے گا (7)۔ ابوداؤد ابن ماجہ اور طبرانی نے جید سند کے ساتھ حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک انصاری کے قبے سے گزرے تو آپ نے اپنے ہاتھ سے سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جو قبیرہ اس سے زیادہ ہوگی وہ قیامت کے روز مالک پر وہاں ہوگی۔ جب اس قبے کا مالک کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ بات پہنچی تو اس نے اس قبو کو گرا دیا (8)۔

طبرانی نے حضرت واسلہ بن الاشعث کی حدیث اسی طرح روایت کی ہے۔ منذری کہتے ہیں اس حدیث کے بہت سے شواہد

- 1- مشکوٰۃ الصالح صفحہ 156 (قدیمی)
 2- صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 332 (وزارت تعلیم)
 3- معجم کبیر، جلد 3 صفحہ 215 (اعلوم و احکام)
 4- معجم کبیر، جلد 22 صفحہ 270 (اعلوم و احکام)
 5- ایضاً صفحہ 292
 6- صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 122 (قدیمی)
 7- معجم کبیر، جلد 10 صفحہ 152 (اعلوم و احکام)
 8- سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 711 (نورحی)

ہیں۔ طبرانی نے الاوسط میں ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک کنوئیں سے گزرے جس کا پانی کھینچا جا رہا تھا، فرمایا اگراں کنوئیں کا مالک اس کنوئیں کا حق ادا نہیں کرے گا تو قیامت کے دن وہ اسے اٹھائے ہوئے ہوگا۔

يَوْمَ يَنْفَعُ فِي الصُّومِ وَ نَحْسُ الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا ۝

”جس روز پھونکا جائے گا صور میں لے اور ہم جمع کریں گے مجرموں کو اس دن اس حال میں کہ ان کی آنکھیں نیلی ہوں گی۔“

۱۔ ابو عمرو نے ینفع کو نفع یعنی نون مفتوحہ اور فاء کے ضمہ کے ساتھ جمع مشکلم معروف کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے واحد غائب مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔

ابن عمر سے مروی ہے کہ ایک اعرابی نے صور کے متعلق نبی کریم ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ ایک سیٹک ہے جس میں پھونکا جائے گا (۱)۔ اس حدیث کو ابو داؤد اور ترمذی نسائی ابن حبان حاکم بیہقی اور ابن مبارک نے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے اسے حسن اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔ مسدد نے ابن مسعود سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

۲۔ زرقاً الجرمین میں سے حال ہے۔ الزرقۃ آنکھ کی سیاہی میں سبزی کو کہتے ہیں۔ مجرموں کا یہ وصف اس لئے بیان فرمایا کیونکہ عربوں کے نزدیک یہ برا ترین رنگ ہے اور عرب ابھی آنکھ کو ناپسند کرتے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ رومی مسلمانوں کے دشمنوں کے دشمن تھے اور وہ نیلی آنکھوں والے تھے۔ قیامت کے روز وہ فریبوں سے انھیں گمراہی کی آنکھیں نیلی اور چہرے کا لے سیاہ ہوں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں زرقا سے مراد اندھا ہونا ہے۔ کیونکہ ناپسندیدگی کی آنکھ کی تپنی نیلی ہوتی ہے۔ یہ تاویل اس ارشاد کے موافق ہے وَ نَحْسُ الْمُجْرِمِينَ الْقَيْمَةِ آغْلَى۔ بعض علماء فرماتے ہیں زرقا سے مراد عطا شنا ہے (یعنی پیاسے ہونے کے)

يَتَخَفَتُونَ بَيْنَهُمْ إِنْ لَبِثْتُمْ إِلَّا عَشْرًا ۝

”چکے چکے آپس میں کہیں گے کہ نہیں رہے تم دنیا میں مگر صرف دس دن لے۔“

۱۔ یتخافتون یا تو المجرمین سے حال ہے یا جملہ مستانہ ہے چونکہ خوف و ہراس ان کے دل پر چھایا ہوگا اس لئے آہستہ آہستہ باتیں کریں گے۔ ان لبثتم الا عسرا یتخافتون کا مفعول ہے۔ وہ دنیا کے زوال یا آخرت کی مدت کے طویل ہونے یا آخرت کی تکالیف کا مشاہدہ کرنے اور یہ جاننے کے بعد کہ ہم نے دنیا کی زندگی کو خواہشات نفس کی پیروی میں برباد کیا اس لئے ہم ان تکالیف کے مستحق ہوئے ہیں۔ دنیا کے ضیاع پر انہوں کا اظہار کرتے ہوئے اپنی دنیا کی عمر کو قلیل تصور کریں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ کہیں گے ہم توور میں دس دن ٹھہرے۔ بعض فرماتے ہیں وہ کہیں گے دونوں صورتوں کے پھونکنے کے درمیان دس دن ہم ٹھہرے حالانکہ ان کے درمیان چالیس سال مدت ہوگی کیونکہ دونوں صورتوں کے درمیان ان سے عذاب اٹھایا جائے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان لبثتم کا جملہ بقولن کی تقدیر کے ساتھ یتخافتون سے عطف بیان یا بدل ہو یا اس کے فاعل سے حال ہو۔

تَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَقُولُونَ إِذْ يَقُولُ أَمْ لَهُمْ طَرِيقَةٌ إِنْ لَبِثْتُمْ إِلَّا يَوْمًا ۝

”ہم خوب جانتے ہیں جو وہ کہیں گے جبکہ ان میں سب سے زیادہ زیرک کہے گا کہ نہیں ٹھہرے ہو تم مگر صرف ایک

”دن ل۔“

ل۔ نحن اعلم اور يتخافتون الخ ان دونوں جملوں کے درمیان ایک جملہ مترقہ ہے، یعنی جس طرح انہوں نے کہا ہے معاملہ ایسا نہیں ہے۔

امضلم سے مراد وہ جوان سے زیادہ عقلمند اور قول عمل کے اعتبار سے معتدل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے اس قول کے قائل کو ترجیح دی ہے کیونکہ دنیا کی مدت آخرت کی طوالت کی نسبت سے ایک دن کی مانند ہے یا کئی دوسری وجوہ کے اعتبار سے اس کو پسند فرمایا۔

امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس نے فرمایا کہ نبی ثقیف کے ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ قیامت کے دن پہاڑ

کیسے ہوں گے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے ذیل کی آیت نازل فرمائی (1)۔

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا

”اور وہ آپ سے پہاڑوں کے انہدام کے متعلق پوچھتے ہیں آپ فرمائیے میرا رب انہیں جڑوں سے اکھڑ کر پھینک دے گا۔“

ل۔ ابن المذہب نے ابن جریر سے روایت کیا ہے کہ قریش نے پوچھا تھا کہ تمہارا رب قیامت کے دن ان پہاڑوں سے کیا کرے گا۔ تو

اس وقت اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیت نازل فرمائی۔ بعض علماء فرماتے ہیں پوچھا نہیں گیا تھا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”اور وہ آپ سے

پہاڑوں کے متعلق پوچھیں تو یہ جواب دینا۔ اس وجہ سے جواب کو یہاں فاء سے شروع کیا گیا ہے، جبکہ باقی تمام جواب فاء کے بغیر

ہیں۔ مثلاً ارشاد ہے يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَجِيزِ فَقُلْ هُوَ أَذَىٰ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْغُبَرِ وَالْأَيْبِ فَقُلْ فِيهَا إِمٌّ يَسْأَلُونَكَ عَنِ

الْأَنْعَالِ فَقُلْ إِنَّهَا تُغَالِبُهُ

النفس کا معنی اکھیرنا ہے، یعنی جڑوں سے اکھڑ کر ریت کی طرح نہیں دسے گا پھر ان پر ہواؤں کو بھیجے گا جو انہیں اڑا کر لے جائیں گی۔

فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا

”پس بنا چھوڑے گا اس پہاڑی علاقہ کو کھلا ہوا زمین ل۔“

ل۔ قاموس میں قاعاً کا معنی نرم زمیں لکھا ہے (2) اور صفصفاً کا معنی مستویاً (برابر) لکھا ہے (3)۔

لَا تَرَىٰ فِيهَا عِوَجًا وَلَا أَمْتًا

”نظر آنے کا تجھے اس میں کوئی موڑ اور نہ کوئی ٹیلہ۔“

ل۔ عوجا کا معنی کچی موڑ ہے اور امنا کا معنی چھوٹا ٹیلہ ہے۔ اگر تم ہندی مٹیاس سے پہاڑوں میں غور کرو گے تو تمہیں ان کے تین اجواں

نظر آئیں گے۔ پہلے دو اجواں احساس کے اعتبار سے اور تیسرا حال مٹیاس کے اعتبار سے۔ بعض علماء فرماتے ہیں دونوں حالتوں کا کوئی

علیحدہ واضح فرق نظر نہ آئے گا۔ مجاہد فرماتے ہیں ان میں کوئی پستی اور بلندی نظر نہ آئے گی۔ حسن فرماتے ہیں عوج کا معنی انشیب ہے

اور امت سے مراد فراز ہے۔

يَوْمَ مِيقَاتِ يَسْأَلُونَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهُ وَخَشَعَتِ الْأَصْوَاتُ لِلرَّحْمَنِ

2۔ قاموس الجلیط، جلد 2، صفحہ 1014 (التراث العربی)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 227 (التجاریہ)

3۔ قاموس الجلیط، صفحہ 1103 (التراث العربی)

فَلَا تَسْمَعُ إِلَّا هَمْسًا ﴿٥١﴾

”اس روز سب لوگ بیروی کریں گے پکارنے والے کی۔ کوئی روگردانی نہیں کر سکے گا اس سے اور خاموش ہو جائیں گی سب آوازیں رجنن کے خوف سے پس تو نہ سنے گا (اس روز) مگر مدہم ہی آہٹ ہے۔“

۱۔ یبصعون الداعی جملہ مستانہ ہے یا یوم القیامۃ سے بدل ہے۔ داعی سے مراد حضرت اسرافیل علیہ السلام ہیں۔ آپ بیت المقدس کی چٹان پر کھڑے ہو کر لوگوں کو محشر کی طرف بلائیں گے۔ آپ اعلان فرمائیں گے اے بوسیدہ ہڈیاں! چھٹی ہوئی کھالیں اور ٹوٹے ہوئے بال اللہ تمہیں فیصلہ کے لئے جمع ہونے کا حکم دیتا ہے۔ ابن عباس نے زید بن جابر الشافعی سے اسی طرح نقل کی ہے۔
۲۔ لا عوج کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو انحراف اور عدول کی محبت نہ ہوگی، کوئی اس سے ادھر ادھر کھٹکنے کی طاقت نہ رکھتا ہوگا۔ خشعت الاصوات یبصعون کے قائل سے تقدیر کے ساتھ حال ہے یا یبصعون پر معطوف ہے اور خشعت بمعنی تخشع ہے، یعنی رجنن کی بیت سے آوازیں خاموش ہو جائیں گی۔ فلا تسمع پر فاء سببیہ ہے اور خطاب غیر معین مخاطب کو ہے۔ همس اس خفیف آواز کو کہتے ہیں جو اونٹوں کے چلنے کے وقت سنانی دیتی ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں پست آواز اور پست کلام کو همس کہتے ہیں۔ سعید بن جبیر حضرت ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں بغیر آواز کے ہونٹوں کے حرکت دینے کو همس کہتے ہیں (1)۔ ابن ابی حاتم نے ابی طلحہ کے طریق سے ابن عباس سے مذکورہ بالا آیت کی یہ تفسیر روایت کی ہے۔

فَاعَا مَعْنَى هَوَّارٍ صَفْصَفًا أَيْ سَادًا جَسَاسًا فِي كَوْنِهَا كَوْنًا هَوَّارًا وَوَادِيًّا أَيْ نَيْلًا (2) 'خشعت الاصوات آوازیں خاموش ہوں گی۔ همس ہلکی آواز۔

اور ایک دوسرے طریقے سے یہ تفسیر بھی مروی ہے فاعا صَفْصَفًا بِالْكَفِّ هَوَّارٌ رَجْنَنٌ جَسَاسٌ كَوْنِهَا كَوْنًا هَوَّارًا وَوَادِيًّا أَيْ نَيْلًا (2) اور سند سے همس کا معنی پاؤں کے چلنے کی آواز منقول ہے، یعنی لوگوں کے محشر کی طرف تھل تھل ہوتے وقت ان کے قدموں کی آواز۔

يَوْمَئِذٍ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ وَرَفِضَى لَهُ قَوْلًا ﴿٥٢﴾

”اس دن نہیں نفع دے گی کوئی سفارش۔ سوائے اس شخص کی شفاعت کے جسے رجنن نے اجازت دی اور پسند فرمایا ہو

اس کے قول کوئل۔“

۱۔ لا تنفع الشفاعۃ جملہ مستانہ ہے۔ استثناء شفاعت سے ہے، مطلب یہ ہوگا کہ کسی کی شفاعت کسی کو کوئی فائدہ نہ دے گی مگر جس کو شفاعت کا اللہ تعالیٰ اذن عطا فرمائے گا یا یہ استثناء عام الفاعل سے ہے، یعنی کسی کو شفاعت فائدہ نہ دے گی مگر جس کی سفارش کے لئے اللہ تعالیٰ اجازت مرحمت فرمائے گا کہ اس کے لئے شفاعت کی جائے پس شفاعت اس کے لئے نفع بخش ہوگی۔

پہلے معنی کے اعتبار سے من بدل ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہوگا اور دوسرے معنی کے اعتبار سے مفعول کی حیثیت سے منصوب ہوگا۔
۲۔ شفیع کا اللہ کی بارگاہ میں بلند مرتبہ ہے، اس لئے اس کی سفارش اسے پسند ہے یا یہ معنی کی شفاعت کرنے والے کا قول اسے مشغوع کے بارے پسند ہے یا شافع کا قول مشغوع کی وجہ سے پسند ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں یعنی مشغوع نے لا الہ الا اللہ کہا اس لئے اس کے حق میں سفارش قبول ہے (3) میں کہتا ہوں یہ تفسیر اس کے لئے ہے جسے شفاعت کرنے والوں کی شفاعت نفع دے گی۔

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ لَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا ۝

”وہ جانتا ہے لوگوں کے آنے والے حالات کو اور ان کے گزرے ہوئے واقعات کو اور لوگ نہیں احاطہ کر سکتے اس کا اپنے علم سے۔“

۱۔ يعلم کا فاعل الرحمن ہے۔ ایدیم کی ضمیر سے مراد شفاعت کرنے والے اور جن کی سفارش کی جائے گی۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے دنیا کے حالات اور قبور کے حالات اور آخرت کے حالات سب کو جانتا ہے۔ یہ جملہ الرحمن سے حال ہے۔ علماً نسبت سے تیز ہے، مطلب یہ کہ انسانوں کا علم اللہ تعالیٰ کی معلومات کو محیط نہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں ان کا علم اس کی ذات کو محیط نہیں اور بعض علماء فرماتے ہیں ضمیر ایک اسم موصول کے لئے ہے یا دونوں کے مجموعے کے لئے ہے کیونکہ مخلوق کو اللہ کی تمام معلومات کا علم نہیں ہے۔

وَ عَسَىٰ أَنْ يَؤُوجُوهُ لِیَحْيَى الْقَبُورَ ۖ وَ قَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ۝

”اور (فرط نیاز سے) جبکہ جائیں گے سب (لوگوں کے) چہرے ہی و قیوم کے سامنے ۱۔ اور نامراد ہوا جس نے لاداً اپنے (سر) پر ظلم (کا بار لیا)۔“

۱۔ یعنی قیدی جس طرح اپنے چہرے جاہر یا پوشا کے سامنے جھکائے ہوئے ہوتے ہیں اسی طرح روز قیامت اللہ کی بارگاہ میں لوگ اپنے چہرے جھکائے ہوئے ہوں گے۔ عسی یعنی عشاء تک جانا اور انتہائی تکلیف اٹھانا۔ امام بغوی فرماتے ہیں اسی ذلت اور خضوع کے معنی کی وجہ سے قیدی کو عانی کہتے ہیں (۱)۔ العسی وہ ذات جس پر موت طاری نہ ہو اور اس کے لئے موت ممکن بھی نہ ہو۔ کیونکہ جس کی حیات زوال پزیر ہو وہ اپنی حقیقت میں مردہ ہے (اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر موت کا تصور بھی نہیں ہو سکتا اور نہ اس کی حیات جائز الزوال ہے) القیوم وہ ذات جس نے ہر نفس کے سب کو قائم رکھا ہوا ہے اور ساری مخلوق کے امور کی تدبیر فرماتا ہے۔ الوجوہ سے مراد اصحاب الوجوہ ہیں۔ ظاہر کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس سے تمام لوگوں کے چہرے مراد ہوں لیکن صرف مجرمین کے چہرے بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں الوجوہ پر الف لام عوضی ہوگا۔ اس مفہوم کی تائید ما بعد کلام بھی کرتی ہے۔

۱۔ ظلماً سے مراد شرک ہے۔ ابن عباس نے یہ معنی فرمایا کہ جس نے اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرایا وہ خسارے میں ہے (۲)۔ یہ جملہ معترضہ ہے یا اس چیز کے بیان کے لئے جملہ مستفاد ہے جس کی وجہ سے ان کے چہرے جھکے ہوئے ہوں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ جملہ الوجوہ سے حال ہو۔ طلق بن حبيب فرماتے ہیں یہاں العنا کا معنی قیوم کو سجدہ کرنا ہے۔ میں کہتا ہوں ان مفہوم کے اعتبار سے معنی یہ ہوگا کہ قیوم کے لئے لوگوں نے سجدہ کیا اور گھانے میں سے جس نے شرک کیا اور اس کی بارگاہ میں سجدہ نہ کیا۔ اور عسّ الوجوہ کا جملہ خشمیت پر معطوف ہے یا خشمیت کے فاعل سے فدی کی تقدیر کے ساتھ حال ہے۔

وَ مَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخْفُ ظُلْمًا وَ لَا هَضْمًا ۝

”اور جو شخص کرتا ہے نیک اعمال اور وہ ایماندار بھی ہو تو اسے اندیشہ نہ ہوگا کسی ظلم کا یا حق تلفی کا۔“

۱۔ من شرطیہ ہے اور من الصالحات میں من، بضمیہ ہے، یعنی جو فرائض پورے کرتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ من ابتداء یہ ہو اور تقدیر اس طرح ہو ومن يعمل عملاً کائناتاً من النیات الصالحات ہے، یعنی جو کوئی نیک نیتی سے عمل کرتا ہے۔ وهو مؤمن

بعمل کی ضمیر مرفوع ہے، حال ہے، یعنی ایمان طاعات کی صحت اور نیکیوں کی قبولیت کے لئے شرط ہے۔ فلا یخاف شرط کی جزاء ہے۔ ابن کثیر نے فلا یخاف جزم کے ساتھ پڑھا ہے۔ ظاہر کا تقاضا یہ ہے کہ یہ مجہذوم ہو کیونکہ یہ شرط کی جزاء ہے۔ امام بیضاوی وغیرہ فرماتے ہیں یہ نہیں کا صیغہ ہوئے کی بناء پر مجہذوم ہے (۱)۔ جمہور علماء نے یا تو مخذوف جزاء کی تعلیل کی بناء پر مرفوع پڑھا ہے اور فاء سببیہ ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے من یعمل من الصالحات وهو مومن یفلح لانه لا یخاف یا اسے مبتدا مخذوف کی خبر کی بناء پر مرفوع پڑھا ہے اور جملہ اسمیہ شرط کی جزاء ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہوگی فہو لا یخاف، یعنی اسے گناہوں پر زیادتی کا اندیشہ نہ ہوگا اور نہ اسے اپنی نیکیوں کے ثواب میں کمی کا خطرہ ہوگا۔ ابن عباس نے اس آیت کی یہی تفسیر فرمائی ہے۔ حضرت انس فرماتے ہیں نہ اس کی نیکیوں کے ثواب میں کمی ہوگی اور نہ اس پر کسی اور مجرم کا گناہ لاوا جائے گا۔ ضحاک فرماتے ہیں اس کو ناکردہ گناہ پر پکڑ نہ ہوگی یا اس کی نیکی کا حسن ضائع نہ ہوگا۔ ہضم کا اصل معنی توڑ پھوڑ ہے، اسی سے ہضم الطعام ہے (۲)۔ اور جملہ شرطیہ تحت الوجوہ پر معطوف ہے۔

وَكَلِمَاتٍ أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا وَ وَاَصْرَفْنَا فِيهِ مِنَ الْوَعِيدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ أَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ۝

”اور ان طرح ہم نے اتارا اس قرآن عربی زبان میں اور طرح طرح سے بیان کیس اس میں گناہوں کی سزا میں تاکہ وہ پرہیزگار بن جائیں یا پیدا کر دے یہ قرآن ان کے دلوں میں یہ سمجھ لے۔“

۱۔ اس کا عطف و كذلك نقص علیک پر ہے۔ اور كذلك مصدر مخذوف کی صفت ہے اور انزالہ کی وجہ سے منصوب ہے۔ انزالہ میں ضمیر منصوب قرآن کی طرف راجع ہے، یعنی جس طرح ہم نے آپ پر گزشتہ قوموں کے حالات بیان کئے اسی طرح ہم نے آپ پر قرآن نازل کیا جس کا انوال آسمانوں اور زمین کے خالق کی طرف سے ہونے میں اس انزال جیسا ہے اور وعدہ وعید سے لبریز ہونے میں بھی اس قوم کے حالات کے انزال جیسا ہے۔ یہ قرآن عربی زبان میں ہے، اس کا اسلوب بیان اور طرز ادا ایک ہے اور اس کا ہر لفظ معجزہ ہے۔ ہم نے اس میں وعیدیں بیان کیں تاکہ لوگ شرک اور گناہ سے اجتناب کریں اور ان میں تقویٰ کا ملکہ پیدا ہو جائے یا قرآن ان کے لئے نصیحت اور اعتبار پیدا کر دے۔ جب وہ اس کو نہیں گے تو وہ انہیں گناہوں سے روکے گا۔ اگرچہ وہ کلیتہاً گناہوں سے مجتنب نہ ہوں گے تو بھی کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوگا۔ اس نکتہ کی بناء پر تقویٰ کی نسبت ان کی طرف کی کیونکہ تقویٰ ان کے لئے ملکہ ہے۔ اور احداث کی نسبت قرآن کی طرف کی اور احداث کی قرآن کی طرف نسبت مجازی ہے۔ یعنی سبب کی طرف سے قبول ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن کے سبب ان کے لئے نصیحت و موعظت پیدا فرمادے گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں او یعنی واؤ ہے۔

فَتَعَلَى اللَّهِ الْمَلِئِكَةُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يُقْضَىٰ إِلَيْكَ وَحْيُهُ ۗ وَقُل رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا ۝

”پس اعلیٰ درجہ ہے جو اللہ سچا بادشاہ ہے، اور نہ جگت کیجئے قرآن کے پڑھنے میں اس سے پہلے کہ پوری ہو جائے آپ کی طرف آنکھ دہی ہے، اور دواما لگا کیجئے میرے رب! اور زیادہ کر میرے علم کو“

۱۔ اس ارشاد میں تقلم سے غیبت کی طرف التفات ہے اور فاسیت کے لئے ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا کلام مخلوق کے کلام سے بالا ہے، جس طرح اس کی ذات ہر ذات سے اعلیٰ اور بے مثال ہے اور وہ اپنی صفات میں بھی مخلوق کی صفات سے بلند ہے۔ مشرکین جو اس کے متعلق یا وہ گویاں کرتے ہیں، وہ اس سے منزه اور مبرا ہے۔ اور وہ اس سے بھی کہیں بلند ہے جو کامل لوگ اس کی صفات بیان کرتے ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کی تھی اَللّٰهُمَّ لَا اُخْصِيْ فَنَاءَ عَلَيْكَ اَنْتَ كَمَا اَنْتَ عَلَيَّ عَلِيٌّ مَا اُرْذُتْ۔ وہ وہ ذات ہے جس کا حکم بھی نافذ ہے، جس کی بادشاہی قدیم ہے اور جس کا قبرمان عام ہے، اس کا وجود اس کی کامل صفات اور اس کی شاہی اس کی ذات کے تقاضا کے ساتھ قائم ہے۔ اس کی سلطنت میں فساد اور زوال کا کوئی احتمال نہیں ہے۔

۲۔ یعقوب نے ان بقضی کونوں کے فتنہ اور ضاء کے کسرہ اور یاء کے فتح کے ساتھ بطور تقظیم جمع منظم معروف کا صیغہ پڑھا ہے اور وحید پر مقبولیت کی بناء پر نصب پڑھی ہے، جب کہ باقی قراء نے باء کے ضم اور ضاد کے فتح کے ساتھ غائب مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور وحید کو نائب قاعلی کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے۔ جبرئیل کے وہی پہنچانے سے پہلے قرأت قرآن میں جلدی کرنے سے نبی کی گئی ہے جیسا کہ اس ارشاد میں ہے لَا تَنْحَوْنَهُمْ لِلسَّانِكِ لِتَسْجَلْ بِهِ (اے صبیح) آپ حرکت نہ دیں اپنی زبان کو اس کے ساتھ تاکہ آپ جلدی یا دگریں) مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اپنے اصحاب پر نہ قرآن کو پڑھیے اور نہ انہیں لکھوائیے حتیٰ کہ اس کے معانی تیرے لئے واضح ہو جائیں (۱۱) پس یہ جمل کا بیان آنے سے پہلے اس کی تبلیغ کرنے سے نبی ہے۔

۳۔ یعنی آپ استیصال (جلدی پڑھنے) کی بجائے علمی کی زیادتی کا سوال کرو کیونکہ جو آپ کو دینی جانی ہے وہ یقیناً آپ کو از بر ہو جائے گی (آپ کے سینہ گنجینہ میں وحی کو محفوظ کرنا ہماری ذمہ داری ہے)

وَلَقَدْ عٰهَدْنَا اِلٰی اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا ۝۱۰

”اور ہم نے حکم دیا تھا آدم کو اس سے پہلے (کہ وہ اس درخت کے قریب نہ جائے) سو وہ بھول گیا اور نہ پایا ہم نے (اس لغزش میں) اس کا کوئی قصد۔“

۱۔ قد پر لام جواب قسم مقدر کے لئے ہے، یعنی قسم بخدا ہم نے آدم کو تاکید کی کہ وہ اس درخت سے نہ کھائے۔ قاسوس میں عہد الیہ کا معنی اوصاف (میں نے اسے تاکید کی کہ وہ) لیکن وہ عہد کو بھول گئے اور جو انہیں درخت سے دور بننے کا حکم دیا گیا تھا وہ اسے چھوڑ بیٹھے اور ہم نے مامور کی حفاظت میں زیادہ سختی نہ پایا۔ یا عہدی عنہ سے زیادہ صبر کرنے والا نہ پایا۔ علام کا لغوی معنی دل میں کسی کام کے کرنے کا پختہ ارادہ کرنا ہے، اسی معنی میں یہ ارشادات ہیں۔ فَاِذْ اَعَزَمْتُ فَتَوَخَّلَّ عَلٰی النَّوْءِ (اور جب آپ ارادہ کر لیں (کسی بات کا) تو پھر توکل کرو اللہ پر)۔ وَلَا تَعَزَمُوا عَقْمًا (الکاح)۔ وَ اِنْ عَزَمُوا الصَّلٰقِ (قاسوس میں ہے عزم علیہ ارادہ فعلہ و قطع علیہ)۔ ۲۔ اس نے کسی کام کے کرنے کا تہیہ کر لیا۔ یا جدھی الامر۔ کام کے کرنے میں وہ کوشاں ہے اور تنجیدہ ہے نہا یہ میں عزم کا معنی الجہد اور الصبر لکھا ہے۔ میں کہتا ہوں کسی کام کے کرنے کا پختہ عزم کرنا اس کام کے کرنے میں تنجیدہ اور کوشاں ہونے اور اس کام کی مشقتوں پر صبر کرنے کو لازم ہے، بعض علماء فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ ہم نے درخت کا پھل کھانے پر اس کا ارادہ نہیں پایا بلکہ انہوں نے بھول کر کھایا تھا۔ یعنی گناہ اور مصیبت پر ان کا کوئی دلی ارادہ نہ تھا۔ ولہم نجدت اگر معنی علم افعال قلوب سے ہو تو قفلہ

عزماً اس کے دو مفعول ہوں گے اور اگر عدم کی ضد وجود سے ہو تو عزماً مفعول ہوگا اور لہ حال ہوگا یا لم نجد کے متعلق ہوگا اور عہدنا کا جملہ بقول صاحب کشف اور امام بیضاوی ضَرْفْنَا فِيهِ مِنَ الْوَعِيدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ پر معطوف ہے۔ یعنی لگتا ہوں کی سزاؤں کے سننے کے بعد عہد تو ناناں کا کوئی نیا کام نہیں ہے بلکہ نبی آدم کی بناء پر عصیان پر ہے اور نسیان ان کی سرشت میں ہے (1) عہدنا الی آدم مِنْ قَبْلِ قَلْبِي اس سے پہلے ہم نے آدم کو درخت سے دور رہنے کا ناکیدی حکم دیا تھا لیکن وہ بھول گیا۔ ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب آدم علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا تو ان کی پیٹھ پر اپنا دست قدرت پھیرا تو آپ کی پیٹھ سے آپ کی ساری اولاد نکل آئی جنہیں اللہ تعالیٰ نے قیامت تک پیدا فرمایا تھا اور انہیں سے ہر انسان کی آنکھوں کے درمیان نور کی چمک رکھ دی۔ پھر ان تمام کو آدم علیہ السلام پر پیش کیا گیا۔ آدم علیہ السلام نے پوچھا یا رب یہ کون ہیں فرمایا یہ تیری اولاد ہے۔ ایک شخص کو آدم علیہ السلام نے دیکھا تو وہ آپ کو بہت اچھا لگا اور اس کے آنکھوں کے درمیان کی چمک بھی بہت بھلی معلوم ہوئی۔ پوچھا یا رب یہ کون ہے۔ اللہ نے فرمایا یہ داؤد ہے۔ پوچھا یا رب اس کی عمر تو کنسی مقرر فرمائی ہے فرمایا ساٹھ سال حضرت آدم نے عرض کی یا رب اسے میری عمر کے چالیس سال عطا فرما دے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب آدم کی عمر سے صرف چالیس سال باقی رہ گئے تو ملک الموت ان کے پاس آئے۔ آدم علیہ السلام نے کہا ابھی میری عمر کے چالیس سال باقی نہیں ہیں؟ ملک الموت نے کہا جنت اب کیا آپ نے اپنے بیٹے داؤد کو عطا نہیں کئے تھے۔ آدم علیہ السلام نے انکار کیا۔ پس آپ کی اولاد نے بھی انکار کیا۔ آدم علیہ السلام بھول گئے اور درخت کھا لیا تو آپ کی اولاد بھی بھول گئی، حضرت آدم سے خطا ہوئی تو آپ کی اولاد سے بھی خطا ہوئی (2)۔ بعض محققین فرماتے ہیں کہ صاحب کشف اور بیضاوی نے اس جملہ کا جو عطف بیان کیا ہے وہ درست نہیں ہے کیونکہ صرفنا کا تعلق کذا الیک سے ہے۔ اور کذا الیک معطوف ہے و کذا الیک نقص علیک پر اور یہ اشارہ ہے موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کی طرف جب کہ آدم علیہ السلام کا واقعہ نسیان اور مخالفت امر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کے مشابہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ هل اتاک حدیث موسیٰ پر معطوف ہے کیونکہ یہ قد اتاک کے معنی میں ہے اور آدم علیہ السلام کا واقعہ گذشتہ واقعات میں سے ہے۔ واللہ اعلم۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّا اِبْلِیْسَۙ اَبٰی ﴿ۛ﴾

”اور جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب نے سجدہ کیا (سوائے ابلیس کے)۔ اس نے (حکم بجالا نے سے) انکار کر دیا۔“

لہ اس وقت اس کی حالت کو یاد کرو تا کہ تم پر عیاں ہو جائے کہ وہ بھول گئے تھے۔ یہ جملہ معطوف ہے لقد عہدنا الی آدم پر۔ لیکن اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اذ کو کی تقدیر پر یہ جملہ انشاء ہے جو جائے گا اور لقد عہدنا جملہ خبریہ ہے جملہ انشاء ہے کا جملہ خبریہ پر عطف درست نہیں ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ یہ کہا جائے کہ اذ کو سے پہلے بقول مقدر ہے۔ تو پھر موافقت و مناسبت پیدا ہو جائے گی اور عطف درست ہوگا۔

اسی کا جملہ سابقہ حکام کی تاکید ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ جملہ انشاء کی علت ہو۔ اس صورت میں اس مفعول مقدر ماننا جائز نہ ہو

گا اور نہ کسی چیز کا اپنے لئے غلب بننا لازم آئے گا بلکہ اہل باطن لازم کے قائم مقام ہے۔ معنی یہ ہے کہ اس نے طاعت اور حکم ماننے سے انکار ظاہر کیا۔

فَقُلْنَا يَا دَمْرُ إِنَّ هَذَا عَدُوُّكَ وَ لِرَوْحِكَ فَلَا يُخْرِجُ جَنَّتَنَا مِنَ الْجَنَّةِ
فَسَقِطِي ﴿١٥﴾

”اور ہم نے فرمایا اے آدم بے شک ہے تیرا بھی دشمن ہے اور تیری زوجہ کا بھی سو (ایسا نہ ہو) کہ وہ نکال دے لہٰذا تمہیں جنت سے اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔“

۱۔ یہ جملہ مقدرہ پر معطوف ہے، یعنی فادخلنا آدم الجنة فقلنا له الخ (ہم نے آدم کو جنت میں داخل کیا اور ہم نے کہا) ہذا کا مشاڑ الیہ الیہ الیس ہے۔ لفظ آدم علیہ السلام کو شیطان کی اتباع سے منع کیا گیا ہے لیکن معنی دونوں مایاں بیوی کو منع کیا جا رہا ہے کہ اس کی بیروی نہ کریں ورنہ یہ بد بخت تمہارے جنت سے اخراج کا سبب بنے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ جنت سے تمہیں اس کی اتباع اور رب کی حکم عدولی کے سبب نکال دے گا۔ فاء سعیدہ ہے۔ کیونکہ عداوت عدم اتباع کا سبب ہے، جس سے معنی آدم و حوا کو روکا گیا ہے۔

۲۔ فسقیتی نمی کے جواب میں فاء کے بعد ان مضمرة کے ساتھ منصوب ہے، یعنی اس کی بیروی نہ کرنا اور جنت سے نکلنے کے اسباب کے قریب نہ جانا ورنہ مشقت میں پڑ جاؤ گے زندگی بچران ہو جائے گی۔ بھتیجی باڑی کرنا، فصل کاٹنا، اسے پینا، روٹی تیار کرنا ان سب معاملات کی مشقت تمہیں کرنا ہوگی۔ امام بغوی فرماتے ہیں سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ آدم علیہ السلام کے پاس ایک سرخ تیل آیا تھا۔ جس سے آپ مل چلا تھے اور اپنی بیوٹائی سے پینے پوچھتے تھے، یہی وہ مشقت ہے جس کا قرآن نے ذکر فرمایا ہے (۱)۔ حضرت حوا علیہا السلام بھی جنت سے خروج میں شریک تھیں لیکن آیات کے سروں کی محافظت کے لئے خطاب آدم علیہ السلام کو فرمایا اور یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ آدم علیہ السلام حضرت حوا کے تمہیان اور سربراہ تھے۔ اس لئے ان کی صرف مشقت ذکر کی گئی جو بیوی کی مشقت کو بھی لازم ہے۔ (خاندان بے چین اور مشکل میں ہو تو بیوی کا مشقت اور تکلیف میں ہونا قدرتی امر ہے) یا شقاء سے مراد طلب معاش کی مشقت ہے اور یہ مردوں کا کام ہے اور ان کی ذمہ داری ہے، اس لئے مفر و ضمیر ذکر فرمایا کہ آدم کو خطاب فرمایا۔

إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ﴿١٥﴾ وَ أَنَّكَ لَا تَطْمَؤُنُ فِيهَا وَلَا تَسْقِيٰ ﴿١٦﴾

”بے شک تمہارے لئے یہ ہے کہ تمہیں نہ بھوک لگے گی یہاں اور نہ تم ننگے ہو گے اور تمہیں نہ پیاس لگے گی یہاں اور نہ دھوپ ستائے گی۔“

۱۔ عکرہ فرماتے ہیں سورج کی تپش نہ پہنچے گی کیونکہ جنت میں دھوپ ہے ہی نہیں، چشتی لیے لیے سایوں میں ہوں گے۔ یہ ارشاد جنت میں اسباب کفایت کا بیان ہے کہ اس میں سیر ہو کر کھانا پینا، زرق برق لباس اور عمدہ رہائش ممکن اور مشقت برداشت کے بغیر تمہیں میسر ہیں۔ یہاں محنت اور کمائے کی کوئی ضرورت نہیں۔ نافع اور ابوعمر نے انک کو ان لک پر عطف کی بنا پر ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقی قرآن نے ان لا تجوع پر عطف کی بنا پر ہمزہ کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔

وانک میں وا حرف عطف ان کے قائم مقام ہے (اس پر سوال وارد ہوتا ہے ان کسورہ ان مفتوحہ پر داخل نہیں ہوتا کیونکہ

اس طرح دو حرفوں کا اجتماع لازماً آتا ہے جو ہم معنی ہیں (لیکن یہاں واو حرف عامل کی حیثیت سے ان کے قائم مقام ہے، حرف تحقیق کی حیثیت سے نہیں اس لئے واو کا ان پر دخول ممتنع نہیں ہوگا جیسا کہ ان مکسورہ کا ان مفتوحہ پر دخول ممتنع ہوتا ہے نہ یا یہ کہا جائے گا کہ ان پر دخول بغیر فاصلہ کے جائز نہیں ہوتا لیکن فاصلہ کے ساتھ جائز ہوتا ہے جس طرح کہ اس آیت میں فاصلہ کے ساتھ ہے پس یہ کہنا جائز ہوتا ہے ان فی علمی انک قائم ان اعظامک علی واجب۔

قَوَسُوْسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يَا اٰدَمُ هَلْ اَدْرٰكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَا
مُلْكٍ لَا يَبِيْلُ ﴿۱۰﴾

”پس شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا اس نے کہا اے آدم کیا میں آگاہ کروں تمہیں بھیجی کے درخت پر اور ایسی بادشاہی پر جو کبھی زائل نہ ہو۔“

۱۔ شیطان نے وسوسہ ڈالا آدم علیہ السلام کے دل میں۔ قال یادم سے وسوسہ کا بیان شروع ہو رہا ہے یعنی اس نے آدم سے کہا میں تمہیں ایک ایسا درخت بتاتا ہوں۔ جس کا پھل انسان کھالے تو ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور کبھی موت کی کلفت سے دوچار نہیں ہوتا۔

فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَّتْ لَهَا سَوَاتِهُمَا وَ طَفِقَا يَخْصِفْنَ عَلَيْهِمَا مِنْ ذُرْمٰقِ
الْجَنَّةِ وَ عَصٰى اٰدَمُ رَبَّاهُ فَعَوٰى ﴿۱۱﴾

”سو (اس کے پھلانے سے) دونوں نے کھا لیا اس درخت سے تو (فورا) برہنہ ہو گئیں ان پر ان کی شرمگاہیں اور وہ چپکانے لگ گئے اپنے (جسم) پر جنت (کے درختوں) کے پتے اور حکم عدولی ہو گئی آدم سے اپنے رب کی سوہو ہمارا نہ ہوا۔“

۱۔ درخت کا پھل کھانے سے جب جنسی لباس اتر گیا تو آدم و حوا اپنے جسم پر آنچھ کے درخت کے پتے چھنانے لگے۔ عوی کا معنی مطلوب و مقصود سے ہٹ جانا اور حق کی شاہراہ سے چوک جانا اور ہمارا نہ ہونا ہے۔ کیونکہ انہوں نے درخت کا پھل ہمیشہ زندہ رہنے کے لئے کھا یا کھا لکے وہ اخراج جنت اور فنا کا سبب تھا۔ یا یہ مطلب کہ اللہ نے جو حکم دیا تھا اس کو چھوڑ دینے یا جو صواب اور رشد کا راستہ تھا اس سے ہٹ گئے کیونکہ دشمن کے دھوکا میں آ گئے تھے۔ ابن الاعرابی نے اس کا معنی یہ کیا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کا آرام و سکون خود ختم کیا تھا اور عزت و کرامت کا مقام چھوڑ کر عجز اور ذلت کے مقام پر اترے تھے اور راحت کی زندگی چھوڑ کر تکلیف اور تحسک کی زندگی اختیار کی تھی (۱)۔ ابن قتیبہ کہتے ہیں یہ کہنا تو جائز ہے کہ آدم علیہ السلام نے اپنے رب کی نافرمانی کی لیکن آدم کو عاصی (گنہگار) کہنا جائز نہیں کیونکہ عاصی وہ ہوتا ہے جو نافرمانی کے فعل کا عادی ہو جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں کہ جو ایک مرتبہ کپڑا اپنے اس کے لئے کہتے ہیں عاصط فال ملان نے کپڑا سیاہی سے خیاط نہیں کہتے جب تک کہ کوئی شخص کپڑے سے اپنے عادی نہ ہو (۲)۔ حضرت امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حضرت آدم اور موسیٰ علیہ السلام کا اپنے رب کے حضور میں نگر ہوا، آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا تو آدم ہے، تجھے اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا ہے۔ تجھ میں اپنی خاص روح چھوٹی ہے، تجھے اس نے سمجھ دیا کہ بنایا، تجھے اس نے جنت کے بلند و بالا مقامات میں رہائش عطا فرمائی ہے۔

پھر تو نے اپنی خطا کی وجہ سے سب انسانوں کو زمین پر اتارا۔ حضرت آدم نے فرمایا تو موسیٰ ہے، تجھے رشد و ہدایت کی تختیاں عطا فرمائیں جس میں ہر چیز کا بیان تھا۔ شرف کلام بخشے کے لئے اس نے تمہیں اپنا قرب حاصل کیا۔ بتاؤ میری تخلیق سے کتنی مدت پہلے اللہ تعالیٰ نے تورات نکھی تھی؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا چالیس سال۔ حضرت آدم نے فرمایا کہ تورات کی تختیوں میں کیا یہ لکھا ہوا ہے۔ و غصی آدم زبہ ففویحی (آدم نے اپنے زب کی سو وہ بامراد نہ ہوا) موسیٰ علیہ السلام نے کہا ہاں (یہ تو لکھا ہوا ہے) آدم علیہ السلام نے فرمایا کیا پھر تم مجھے اس عمل پر ملاتے کرتے ہو جو اللہ نے میری تخلیق سے چالیس سال قبل لکھ دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آدم علیہ السلام اس جواب سے موسیٰ علیہ السلام پر غالب آگئے (1)۔ اس حدیث کو بنوئی نے روایت کیا ہے۔ لیکن اس کے الفاظ کا مفہوم اس طرح ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے کہا ہے آدم تو ہمارا باپ ہے اور تو نے ہمیں جنت سے نکالا۔ آدم علیہ السلام نے فرمایا موسیٰ اللہ نے تجھے شرف کلام بخشا۔ تجھے اپنے دست قدرت سے تورات عطا فرمائی تو مجھے اس کام پر ملاتے کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے میری تخلیق سے چالیس سال قبل میری تقدیر میں لکھ دیا تھا۔ پس آدم علیہ السلام موسیٰ پر غالب آگئے (2) (آپ نے آخری جملہ تین مرتبہ فرمایا)

اگر یہ کہا جائے کہ یسنی سے مراد نسی العہد ہے (یعنی آدم علیہ السلام کو بھول گئے) تو پھر آپ کے حق میں غصی آدم زبہ کیوں فرمایا گیا (یعنی آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی) حالانکہ بھول کر کسی فعل کو کرنا معاف ہے۔ اس کو نافرمانی سے کیوں تعبیر کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بھول پر نواغذہ اور گرفت نہ ہوتا۔ اس امت مرحومہ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کے ساتھ متفق ہے جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔ رُفِعَ عَنِ اُمَّتِي النُّخْطُ وَالْبَسِيَّاتُ وَفَا اسْتَعْرَجَ هُوَا عَلِيَّ (3) یعنی میری امت سے خطا و نسیان کا مواخذہ نہیں ہے اور جس کام پر انہیں مجبور کیا جائے اور وہ کر نہیں تو اس پر بھی ان کی گرفت اور پکڑ نہیں ہے۔ اس حدیث کو طبرانی نے ثوبان اور ابن عمر سے روایت کیا ہے۔ آپ ﷺ نے اپنی امت کی قید سے یہ ارشاد فرمایا۔ مطلقاً نہیں فرمایا جیسا کہ مجنون سونے والا اور بچے کا حکم مطلقاً بیان فرمایا ہے۔ مجنون کو کوئی خطا نہیں لگتی جاتی حتیٰ کہ وہ ہوش مند ہو جائے۔ سونے والے سے بھی قلم اٹھایا گیا ہے حتیٰ کہ بیدار ہو جائے اور بچے سے بھی مواخذہ نہیں ہے حتیٰ کہ وہ بالغ ہو جائے۔ جیسا کہ ہم نے یہی مسئلہ تفصیل سے سورہ بقرہ میں رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَسِينَا اَوْ نَسَاكَ اَوْ نَسَاكَ اَوْ نَسَاكَ اَوْ نَسَاكَ اَوْ نَسَاكَ کے تحت بیان کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ خطا و نسیان پر مواخذہ پر دلالت کرتی ہے اور یہ عقلاً متعین بھی نہیں ہے کیونکہ گناہ زہری مانند ہیں جس طرح جان بوجھ کر یا بھول کر زہر کا کھانا بلا کت کا باعث بنتا ہے اسی طرح گناہ بھی سزا کا موجب ہوتے ہیں بشرطیکہ اللہ کریم معاف نہ فرمائے اگرچہ وہ گناہ بغیر ارادہ اور قصد کے بھی ہوں۔ کبھی کہتے ہیں بنو اسرائیل جب کسی حکم الہی کو بھول جاتے یا غلطی کرتے تو فوراً ان پر سزا مسلط کی جاتی، ان پر گناہ کے مطابق کھانے پینے کی چیزیں حرام کر دی جاتی تھیں۔ میں کہتا ہوں اسی وجہ سے آدم علیہ السلام پر بھی جنت کا کھانا اور شروبات حرام کئے گئے تھے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ نیک لوگوں کی نیکیاں مقربین بارگاہ الہی کے لئے سینات (گناہ) شمار ہوتی ہیں۔ خطا و نسیان کا اگرچہ عام انسان سے آخرت میں مواخذہ نہ ہوگا اور آگ کے ذریعے عذاب نہ ہوگا لیکن خواص کے بلند مرتبہ کی وجہ سے خطا و نسیان پر اور خلاف اولیٰ پر بھی مواخذہ ہوگا اور یہ مواخذہ اور گرفت آخرت میں آگ کے عذاب سے نہ ہوگی بلکہ دنیا میں ان کے دلوں پر کچھ تاریکی چھا جاتی ہے اور محرومی کے معاملات اور آفتس جبر و فراق سے دوچار ہوتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے دل پر بھی غبار آتا ہے اور میں ایک دن میں سو مرتبہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتا ہوں (4) اس حدیث کو مسلم احمد ابوداؤد اور نسائی نے الاعرابی نے سے

1- تفسیر بنوئی، جلد 4، صفحہ 229 (تجاریہ)

1- مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 20-19 (قدیمی)

4- صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 346 (قدیمی)

3- کنز العمال، جلد 4، صفحہ 233، حدیث: 10307 (التراث الاسلامی)

روایت کیا ہے۔ صاحب مدارک فرماتے ہیں انبیاء کرام سے اس نسیان کا مواخذہ ہوتا ہے جس سے اگر وہ محفوظ رہنے کی کوشش کرتے تو محفوظ رہ سکتے تھے۔ اسی وجہ سے بعض علماء فرماتے ہیں نبوت سے پہلے انبیاء سے گناہ وغیرہ کا صدور جائز ہے۔

ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَ هَدَىٰ ۝۱۰

”پھر (اپنے قرب کے لئے) چن لیا انہیں اپنے رب نے اور (مغفور رحمت سے) توجہ فرمائی ان پر اور ہدایت بخشی ل۔“ یعنی پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے قرب کے لئے چن لیا اور توبہ کی ترغیب اور توبہ کے لئے انہیں اپنا قرب بخشا جیسا کہ مادہ اصل میں جمع کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ مثلاً عرب کہتے ہیں جسی المخر اج اس نے ٹیکس جمع کیا۔ اجنباء باب احتمال ہے اور اس کا معنی قریب کرنا ہے جس کا اصطفا لازم ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے مغفور رحمت سے آپ کی طرف توجہ فرمائی اور آپ کو توبہ کی توفیق بخشی۔ حتیٰ کہ آدم علیہ السلام نے ان الفاظ میں دعا مانگی۔ رَبَّنَا تَلَكُنَّا اَنْفُسًا۔ یہ معنی کہ مراتب قرب کی طرف ہدایت فرمائی۔

قَالَ اَهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاَمَّا يَاتِيْبِكُمْ مِنِّي

هُدًىٰ ۙ فَمَنْ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰ ۝۱۱

”کہم ملا دونوں اتر جاؤ یہاں سے اکٹھے تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے ل۔ پس اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت تو جس نے میری ہدایت کی تو وہ وہ بھٹکے گا اور نہ بد نصیب ہوگا۔“

ل۔ منہا کی تفسیر کا مریخ جنت ہے اور یہ خطاب آدم وحووا کو ہے چونکہ ان کا اترنا ان کی اولاد کے اترنے کو لازم ہے اس لئے یہ خطاب تبعاً آپ کی اولاد کو بھی ہے اس لئے تاکیدی ذکر فرمائی اور بعض کم میں ضمیر بھی جمع ذکر فرمائی۔ تمہاری آپس میں دینی اور دنی عداوت ہوگی۔ علیٰ نقاب میں ہا زائدہ ہے اور تاکید کے لئے ہے، اس میں ان شرطیہ کے نون کو مدغم کیا گیا ہے۔ ہدی سے مراد کتاب اور رسول ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت سعید بن جبیر حضرت ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں کہ جو شخص قرآن پڑھے گا اور اس کے احکام کی اتباع کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے دنیا میں گمراہی سے بچالے گا اور روز قیامت برے انجام سے محفوظ فرمائے گا (1)۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا ہے۔ فَهَنِي اتَّبَعْتُ هُدًىٰ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰ۔ امام شمس فرماتے ہیں قرآن کی اتباع کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں گمراہ ہونے اور آخرت میں عذاب الیم میں مبتلا ہونے سے بچالیا ہے۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَاِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

اَعْلٰی ۝۱۲

”اور جس نے منہ پھیرا میری یاد سے تو اس کے لئے زندگی (کا جامہ) تنگ کر دیا جائے گا ل۔ اور ہم اسے اٹھا دیں گے قیامت کے دن اندھا کر کے ل۔“

ل ذکر کی سے مراد وہ ہدایت ہے جو میری یاد دلاتی ہے اور وہ شخص جو میری عبادت کی طرف بلاتا ہے۔ یعنی جو میری ہدایت (کتاب) سے روگردانی کرے گا اور جو میری عبادت کی طرف بلانے والے (رسول) سے منہ موڑے گا (دنیا اس کی اجیران بنا دی جائے گی اور اس کا دل ہر وقت تنگ اور گھٹن محسوس کرے گا) جس کا مصدر ہے اور معیشتہ کی صفت واقع ہو رہا ہے، جب مصدر کو صفت بنایا جائے تو

وہ مباحہ پر دلالت کرتا ہے اس لئے مذکورہ روایت دونوں کی صفت واقع ہو سکتا ہے۔ امام بغوی حضرت عبداللہ بن مسعود ابو ہریرہ اور ابو سعید الخدری سے روایت فرماتے ہیں کہ معیشتہٴ حنکاً سے مراد عذاب قبر ہے (1)۔ البزازی نے حیدر مند کے ساتھ ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا فان لم معیشتہٴ حنکاً سے مراد قبر ہے۔ ابو سعید فرماتے ہیں قبر ماتے ہیں قبر ماتے گی کہ اس کی پسلیاں ادھر ادھر ہو جائیں گی۔ بعض مسانید میں مرفوعاً مروی ہے کہ قبر آدمی پر یوں مل جائے گی کہ اس کی پسلیاں ادھر ادھر ہو جائیں گی (دائیں پسلیاں بائیں طرف اور بائیں پسلیاں دائیں طرف ہو جائیں گی) اور قیامت تک اسی عذاب میں مبتلا رہے گا (2)۔ سنن ترمذی میں یہ ارشاد حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے۔ الحسن فرماتے ہیں اس سے مراد قوم (م) کا عذاب (ن) کی خوار داری (ی) کھانا اور روزنہ میں پیپ پلانا مراد ہے۔ مگر فرماتے ہیں اس سے مراد حرام مال ہے۔ ضحاک فرماتے ہیں غنیمت کمانی ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس سے مراد شقاوت اور بدبختی ہے (3)۔ میں کہتا ہوں حنک کا اطلاق حرام کسب غنیمت اور شقاوت سب پر ہوتا ہے کیونکہ یہ سب چیزیں قبر یا آگ میں نکل مقام پر پہنچانے والی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **إِذَا أُلْقُوا مِنْهَا لَمْ يَدْهُقْ وَيُذِئْنَ**۔ (اور جب انہیں پھینکا جائے گا اس آگ میں کسی نکل جگہ سے زنجیروں میں جکڑ کر) ابن عباس سے مروی ہے کہ ہر وہ مال جو انسان کو ملے خواہ وہ کم ہو یا زیادہ اور وہ اس میں تقویٰ اختیار نہ کرے تو اس میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔ پس معیشتہٴ حنکاً سے یہی مراد ہے، جس قوم نے حق سے اعراض کیا اور اس جالانگہ و خوشحال ہوتے ہیں اور مزید کی خواہش میں غرق ہوتے ہیں۔ تو ان کی زندگی بھی نکل ہوتی ہے (کیونکہ وہ ہر وقت مال و دولت اور رحمت و شہادت کی تلاش میں بے چین و بے سکون رہتے ہیں) وہ اللہ تعالیٰ کے بارے سے سوائے نعمت رکھتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مال کے فریج پر انہیں اس کا نعم البدل عطا نہیں فرمائے گا۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں اس کا معنی قناعت کا چھین لینا ہے حتیٰ کہ مال و دولت کے انبار موجود ہونے کے باوجود ان کی آنکھیں سیر نہیں ہوتیں (4) ان دونوں اقوال کا حاصل اور خلاصہ یہ ہے کہ جو ذکر الہی سے منہ موڑتا ہے تو اس کا معنی نظر اور مقصود دل دنیا کا مال و متاع ہو جاتا ہے اور اسی مال و متاع کی زیادتی کے لئے صبح و شام ہلاک ہوتا رہتا ہے اور اس کی کمی کے خوف سے ہر وقت بے چین اور بالکان رہتا ہے۔ جب کہ مومن کی کیفیت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے، وہ آخرت کا طلبگار اور عطاء الہی پر قانع اور شاکر ہوتا ہے، ہر کام میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے پس اس کی زندگی شہم کی طرح پاکیزہ اور ہر آلائش سے پاک ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں اس تاویل کے مطابق میں اعراض عن ذکوٰۃ سے مراد وہ کافر نہیں ہوگا جو ایمان کی دولت سے منہ موڑے ہوئے ہے بلکہ وہ شخص مراد ہوگا جو کثرت مال کے لالچ میں ڈکرائی سے اعراض کئے ہوئے ہے۔ کیونکہ عام لوگ دنیا کی طلب اور تلاش میں مستغرق ہوتے ہیں۔ اور اس کی کمی کا نہیں ہر وقت خدشاگر رہتا ہے پس جو مال کی زیادتی کی خاطر ذکر الہی سے اعراض کرتا ہے اور دنیا کے مال و متاع کی فکر میں ہر لمحہ مصروف رہتا ہے تو ایسے شخص کی زندگی تاریک کر دی جاتی ہے اور اس پر اس کے رزق کے معاملات خلط ملط کر دیئے جاتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ معیشتہٴ حنکاً سے مراد دنیا اور مصیبت ہے تو پھر یہ کناف اور فسق سے متعلق نہیں ہے بلکہ انبیاء و صلحاء پر بھی دنیا کے اندر کجالیف آتی رہتی ہیں (مثلاً) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے زیادہ مصائب میں مبتلا انبیاء کرام ہوتے ہیں پھر جو دوسرے لوگوں سے افضل ہوتے ہیں پھر جو ان کے بعد دوسرے لوگوں سے افضل ہوتے ہیں، ہر شخص کو اس کے دین کے مطابق آزمائشوں میں ڈالا جاتا ہے۔ کوئی شخص دین میں مبتلا مضبوط

1- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 231 (اتحادیہ)

2- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 231 (اتحادیہ)

3- ایضاً 4- ایضاً

ہوگا تو اس کی آزمائش بھی اتنی ہی سخت ہوگی۔ جو دین میں نرم ہوگا تو اسے بھی اپنے دین کی مقدار آزمایا جائے گا۔ بندہ آزمائش میں مبتلا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ آزمائش اسے گناہوں سے اس طرح پاک کر دیتی ہے کہ وہ زمین پر چل رہا ہوتا ہے لیکن اس کے دامن پر کسی خطا کا داغ نہیں ہوتا (1) اس حدیث کو امام احمد اور بخاری نے ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت سعد سے اور طبرانی نے حضرت حذیفہ کی ہمیشہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ اور بخاری نے تاریخ میں نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات سے حسن سند کے ساتھ اس طرح نقل کیا ہے دنیا میں سب سے زیادہ مصائب میں مبتلا نبی ہوتا ہے یا معنی ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں میرے نزدیک اس سوال کا جواب دو طرح سے ہے۔

1- آیت میں معیشتہ صحنًا (تھک زندگی) کفار کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ یہ آیت اس ارشاد کی مثل ہے۔ فَأَمَّا جُنُودًا فَمَا وَجَدْتُمْ أَنَّهُمْ فِي أَضْطْرَّةٍ أَوْ فِي مَكَامٍ الْعَارِضِينَ بِكُمْ۔ مطلب یہ ہے کہ جو ہمارے ذکر سے اعراض کرے گا ہم اسے دنیا میں قلیل معیشت عطا کریں گے چونکہ دنیا کا سب مال و متاع قلیل ہے۔ ہم اسے گنے پنے ایام زریست غلگی کی صورت میں عطا کریں گے پھر اسے قیامت کے روز اماندھا کر کے اٹھائیں گے۔

2- دوسرا جواب یہ ہے کہ دنیا کی زندگی محض اور مصیبت سے خالی نہیں ہے خواہ کوئی مومن ہو یا کافر، ہر شخص کو مصائب و شدائد سے واسطہ پڑتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّكَ كُلٌّ مِّنْ غَدَاةٍ رَبِّكَ۔ (اے انسان تو سخت سے کوشاں رہتا ہے اپنے رب کے پاس پہنچنے تک) لیکن انسان کے لئے یہ مصائب و تکالیف گناہوں کے منانے اور درجات کی بلندی کا باعث بنتی ہیں جیسا کہ حدیث پاک میں ہے۔ ظاہر اگرچہ مومن غلگی میں بھی ہوتا ہے تو معنی وہ کشادگی میں ہوتا ہے اور باطنی مشکلات و مصائب اس کے اخروی عذاب کے لئے نمونہ ہوتی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ مومن کو اپنے رب سے پیار ہے پس محبوب کی طرف سے جو کچھ ملتا ہے وہ اس میں لذت اور فرحت محسوس کرتا ہے کیونکہ ضرب الحبيب (محبوب کی سزا میں بھی شفا ہے) ابن ماجہ عبد الرزاق اور حاکم نے ابوسعید الخدری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے زیادہ مصائب میں مبتلا انبیاء پھر صحابہ ہوتے ہیں، ان میں کوئی فقر (غربت) کی تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے حتیٰ کہ پہننے اور لینے کے لئے اس کے پاس ایک عشاء ہوتی ہے۔ اور اس میں جو یوسج پڑ جاتی ہیں وہ ان کو مارتا ہے۔ لیکن جتنا تم میں سے کوئی عطاء پر خوش ہوتا ہے وہ اس سے زیادہ مصیبت پر شاداں و فرحاں ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

ع ابن عباس نے اعمیٰ کا معنی بیانی سے محروم فرمایا ہے اور مجاہد فرماتے ہیں اعمیٰ سے مراد حجت سے محروم شخص ہے (2) ابن عباس کے قول کی تائید آئندہ آیت سے ہوتی ہے۔

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْ اَعْمٰی وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿۳۰﴾

”وہ کہے گا میرے رب کیوں اٹھایا ہے تو نے مجھے نابینا کر کے میں تو (پہلے بالکل) بینا تھا۔“

1- حشر تنی کی بناء کو نافع نے فتح کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ہاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اعمیٰ کا معنی آخرت میں محبت سے محروم درست نہیں کیونکہ پھر وفد کنت بصیرا کا معنی یہ ہوگا کہ دنیا میں میرے پاس محبت تھی۔ حالانکہ ایسے شخص کے چاہئے تو دنیا میں بھی کوئی محبت تھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَصَنِّ يُّذْمُ مَعَ اللّٰهِ الْهٰجِرَ لَا يُزْهٰنَ لَدَيْهِ۔ (اور جو پوجتا ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو جس کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں) اور اسی طرح ارشاد۔ وَصَنِّ كَانَ فِيْ طَلْحَةَ اَعْمٰی فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی (اور

جو شخص بنا رہا اس دین میں اندھا وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا) ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر عن ابن عباس کے طریق سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے ابن عباس سے پوچھا کہ کہیں قرآن نے مجرموں کی آنکھوں کے نیلا ہونے کا ذکر فرمایا ہے؟ وَتَحْسُرُ النَّجْرِيَّةُ يَوْمَئِذٍ بِرِيقِهَا اور کہیں اندھا ہونے کا ذکر فرمایا ہے؟ وَتَحْسُرُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَعْمَى ان میں تطہین کیسے ہے حضرت ابن عباس نے فرمایا قیامت کے روز مجرم ایک حال میں نبلی آنکھوں کے ساتھ ہوں گے اور دوسرے حال میں اندھے ہوں گے۔

قَالَ كَذَلِكَ اَتَتْكَ اَيْتَانَا فَتَسِيْبَهُمَا وَ كَذَلِكَ الْيَوْمَ تُنْشَى ۝

”اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اسی طرح آئی تمہیں تیرے پاس ہماری آیتیں سو تو نے انہیں بھلا دیا۔ اسی طرح آج تجھے فراموش کر دیا جائے گا۔“

۱۔ کذالک فعل مضارع کے متعلق ہے، یعنی تو نے ایسا ہی کیا۔ ذالک کا مشار الیہ مبہم ہے جس کی تفسیر اَتَتْكَ اِيتَانَا الخ کا ارشاد کر رہا ہے۔ آیات سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی وحدت پر دلالت کرتی ہیں یا آیات سے مراد انبیاء کرام پر نازل ہونے والی آیات ہیں۔ ارشاد ہے اے انسان تو نے ہماری آیات کی طرف التفات نہ کیا اور تو نے انہیں اندھے شخص کی طرح دیکھا تک نہیں جیسے تو نے ہماری آیات کو چھوڑا تھا، آج تمہیں بھی آگ میں ڈال کر چھوڑ دیا جائے گا (تیری آہ و دغاں کی طرف رحمت الہی قطعاً متوجہ نہ ہوگی) بعض علماء فرماتے ہیں تقدیر عبارت اس طرح ہے الامور کذالک (معاملہ اسی طرح ہے) اور اتک کا جملہ مقام تعقل میں ہے۔

وَ كَذَلِكَ نَجْزِي مَنْ اَسْرَفَ وَ لَمْ يُؤْمَرْ بِاٰلِيَّتٍ سَابِقَةٍ ۝ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَ اَبْقٰی ۝

”اور یونہی ہم بدلہ دیں گے ہر اس شخص کو جس نے حد سے تجاوز کیا اور ایمان نہ لایا۔ اپنے رب کی آیتوں پر اور (سن لو)

آخرت کا عذاب بڑا سخت اور بہت دیر پا ہے۔ ۱۔“

۱۔ یعنی جو خواہشات نفس میں منہمک رہے گا اور ہماری آیات سے روگردانی کرے گا اور اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلائے گا اور اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہوگا تو ہم ایسے ناپسند اور بدکردار کو ایسی ہی سزا دیں گے اور آخرت کا عذاب تو اس تک زندگن اور اندھے پن سے بھی زیادہ سخت اور کرخت ہے۔ یہ جملہ من اعرض عن ذکر الخ پر معطوف ہے۔

اَقْلَمَ يَهْدِيْلَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنَ الْقُرُوْنِ يَسْتَوْنَ فِي مَسٰكِنِهِمْ ۝ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّوْلِ ۝

”کیا (یہ بات) انہیں راہ راست نہ دکھائی کہ کتنی قومیں تمہیں جن کو ہم نے (بد اعمالیوں کے باعث) ان سے پہلے برباد کر دیا جلتے پھرتے ہیں یہ لوگ جن کے (اجزے ہوئے) مکانوں میں اس میں (ہماری قدرت کی) نشانیاں ہیں دانشمندانوں کے لئے۔“

۱۔ العلم بھد کی ضمیر کا مرجع الہدی ہے۔ اور اس سے مراد کتاب یا رسول ہے۔ یا ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے جس کا ذکر کذالک لَخَجْرِي مِنْ اَسْرَفٍ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِاٰيٰتٍ رَبِّهِ مِمْ ہے۔ اس صورت میں کلام کے اندر تکلم سے غائب کی طرف التفات ہوگا۔ اس

تائیل کی تائید الفلم ہند (جمع مشکلم) کی قرأت بھی کرتی ہے، مطلب یہ ہے کہ کیا اللہ نے قرآن نے یارسلو نے کفار مکہ کو ہدایت نہیں کی۔ یہ اس مفہام انکاری ہے، یعنی انہیں صراط مستقیم دکھایا گیا لیکن انہوں نے خود ہدایت پر گمراہی کو پسند کیا۔ فلہذا تعقیب کے لئے ہے۔ اور مخدوف کلام معطوف ہے، تقدیر عبادت اس طرح ہے۔ الم بین لهم فلم یهد لهم لفظاً بیان کے بعد عدم ہدایت کا انکار ہے اور معنی ہدایت کے بعد ان کے ہدایت حاصل نہ کرنے کا انکار ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں الفلم یهد لهم کلام سابق کے مفہوم پر معطوف ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کا ذکر اس ارشاد میں فرمایا۔ فَصْنِ اَنْبِیْہِمْ هٰذِیْنَ فَلَا یَضِلُّوْا وَلَا یَشْغٰیوْا اور کفار کا حال اس ارشاد میں فرمایا۔ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیْشَةً ضَنْکًا۔ پھر فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے جو فریقین کا حال بیان فرمایا ہے اس سے کیا ان کے لئے معاملہ واضح نہیں ہوا اور ان کو راہنمائی نہیں ملی؟ بعض علماء فرماتے ہیں الفلم یهد کم اھلکنا الخ کے بدلہ اولیٰ طرف منسوب ہے، کم خیر یہ ہے اور قرون سے مراد سابقہ قرون ہیں یا الم یهد جملہ کے مضمون کی طرف منسوب ہے، یعنی کیا ہمارا قوموں کو ہلاک کرنا بھی ان کی ہدایت کا باعث نہ بنا۔ یمشون فی مساکنہم، القرون سے حال ہے۔ یا لھم کی ضمیر مجرور سے حال ہے اس تقدیر پر جب کہ فعل الم یهد کی نسبت کم اھلکنا کے جملہ کے مضمون کی طرف ہو، یعنی کفار مکہ کو راہ ہدایت نہ ملی حالانکہ وہ گذشتہ قوموں کے اجزائے دیار میں چلتے پھرتے ہیں۔ اولیٰ الہی سے مراد ذوی العقول (صاحب عقل) لوگ ہیں۔ عقل کا نواہیہ اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ غفلت اور آنکھ بند کر کے چلنے سے روکتی ہے۔

وَلَوْ لَا کَلِمَۃٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّکَ لَکَانَ لِزَآمًا وَّ اَجَلٌ مُّسَمًّیٌ ۝۲

”اور اگر ان کے انجام کے متعلق آپ کے رب کا فیصلہ پہلے نہ ہو چکا ہوتا، اور ان کے لئے ایک وقت مقرر نہ کر دیا گیا ہوتا بھی ان پر عذاب نازل ہو جاتا۔“

۱ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب نبی کریم ﷺ کو رحمت للعالمین بنا کر بھیجا ہے۔ اس لئے اس کی رحمت کے طفیل ان کافروں کو نیست و نابود نہیں کیا جاتا اور قیامت تک کفار کو عذاب دینے میں تاخیر کا وعدہ دیا ہے۔ سبقت کا جملہ کلمۃ کی صفت ہے اور مبتدا کی خبر مخدوف ہے یعنی لو لا کلمۃ سبقت حاصلۃ یعنی اگر ہمارا یہ فیصلہ نہ ہو چکا ہوتا تو جس طرح قوم عاد فرود اور جس دوسری نافرمان اور سرکش قوموں پر عذاب نازل ہوا اس طرح ان کو بھی ہم عذاب کی چکی میں پیس دیتے، ان کا بھی نام نشان مٹا دیتے۔ لزاماً مصدر ہے باب مفاعلہ کا مبالغہ کے لئے بطور صفت استعمال ہوا ہے یا یہ اسم فاعل یا اسم آلہ کے معنی میں ہے۔ لزوم کی زیادتی کی وجہ سے لزوم کے آلہ کے ساتھ تشبیہ دیتے ہوئے اسے لازم کیا گیا ہے (کیونکہ لازم لزوم سے جدا نہیں ہوتا جس طرح کہ آلہ اس چیز سے جدا نہیں ہوتا جس کے لئے وہ آلہ ہوتا ہے) خلاصہ یہ ہے کہ ان کا تقاضا تو ہے کہ ان پر عذاب کا کوڑا برسا جائے لیکن ہماری حکمت کا فیصلہ ہو چکا ہے، اس لئے ان پر عذاب نہیں ہوتا۔

۲ اجل مسمیٰ کا عطف کلمتہ پر ہے۔ یعنی اگر دنیا میں ان کی بقاء متعین نہ ہوتی یا قیامت کا وقت متعین نہ ہوتا یا ان کے عذاب کا وقت متعین نہ ہوتا (تو ان کی ایئت سے ایئت بجا دی جاتی) کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ ولو لا کلمۃ سبقت من ربک واجل مسمیٰ لکان لزوماً۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اجل مسمیٰ اس ضمیر پر معطوف ہو جو کان میں پوشیدہ ہے۔ اور کان کے ام اور کان کے درمیان خبر کے ساتھ فاصلہ میں کوئی حرج نہیں ہے۔ معنی یہ ہو گا کہ اگر تیرے رب کا فیصلہ نہ ہو چکا ہوتا تو فری

عذاب اور وہ عذاب جس کا وقت متعین ہے دونوں ان کو لازم ہوتے اور جملہ شرطیہ یعنی لو لا کلمۃ الی الخ اس جملہ مخدوف پر معذوف ہے جو کم اہلکنا کے ارشاد سے مفہوم ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ کم اہلکنا قبلہم من القرون یمشون فی مساکنہم وھولاء لکفار منہم فی استحقاق نزول العذاب ولو لا کلمۃ سبقت من ربک لکان لزاما و اجل مسمیٰ۔

فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ
غُرُوبِهَا وَمِنْ أَنَايِ النَّيْلِ فَسَبِّحْ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضَىٰ ﴿۱۶﴾

”پس (اے حبیب) صبر فرمائیے ان کی (دل دکھانوالی) باتوں پر۔ اور پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی حمد کے ساتھ سورج کے طلوع ہونے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اور رات کے لمحوں میں اس کی پاکی بیان کرو اور دن کے اطراف میں بھی تاکہ آپ خوش رہیں۔“

۱۔ اے پیارے حبیب آپ کو معلوم ہو گیا ہے کہ ان کافروں کا عذاب ایک مدت تک متاخر ہے تو آپ ان کی دل آزار باتوں پر صبر کیجئے جو یہ آپ کے متعلق کرتے ہیں، آپ کو جو اللہ تعالیٰ نے نماز اور تسبیح کی توفیق دی ہے اس پر اس کی حمد و شکر کرتے ہوئے اس کی پاکی بیان کریں۔ یہ گویا اشارہ ہے کہ اگر کسی بندے سے عبادت و ریاضت کا فعل صادر ہو تو اسے اس پر اترا نا نہیں چاہئے بلکہ اس عبادت اور جہد و یز کی توفیق اور کم نوازی پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے جیسا کہ ابابک نعد کے بعد و ابابک نستعین کا قول اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتا ہے، یعنی ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی تیری عبادت پر مدد مانگتے ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ اس آیت سے ہر نماز میں سورہ فاتحہ کی قرأت کے وجوب کو مستنبط کیا جائے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے بھی صراحت فرمایا ہے لا صلوة الا بفتحۃ الکتاب (1) ایک روایت میں ہے۔ لا صلوة لمن لم یفہق بفتحۃ الکتاب (یعنی جس نے سورہ فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں) اس حدیث کو امام بخاری اور مسلم نے صحیحین میں اور امام احمد نے روایت کیا ہے۔ یہ استنباط اس طرح ہے کہ آیت کریمہ تقاضا کرتی ہے کہ نماز ادا کرو اللہ کے اتصال کے ساتھ لیکن اتصال اور تلبیس جمل ہے۔ پس رسول اللہ ﷺ کا ارشاد اس کا بیان ہے اور ظاہر ہے کہ تلبیس بالحمد سے مراد سورہ فاتحہ الحمد لله رب العالمین الی آخرہ کا پڑھنا ہے۔

قبل طلوع الشمس سے مراد صبح کی نماز اور قبل غروبھا سے مراد نماز عصر ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں قبل غروبھا سے مراد نصف النہار کے بعد کا وقت ہے اور اس سے ظہر اور عصر کی دونوں نمازیں مراد ہیں۔ اور من اثناء اللیل سے مراد مغرب اور عشاء کی نماز کا وقت ہے۔ اناء جمع ہے انی کی۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس سے رات کا پہلا وقت مراد ہے (2) میں کہتا ہوں اس سے نماز تہجد بھی مراد لینا ممکن ہے کیونکہ وہ نبی کریم ﷺ پر واجب تھی اور طرف فسیح کے متعلق ہے۔ فسیح یعنی رات کی خاموش گھڑیوں میں خصوصی طور پر نماز ادا کرو کیونکہ اس وقت دل کسی دوسری چیز سے مشغول ہونے سے محفوظ ہوتا ہے اور نفس اس وقت آرام اور سکون کی طرف مائل ہوتا ہے تو اس وقت کی عبادت میں مشقت زیادہ ہوگی اور جتنی مشقت میں عبادت کی جائے۔ وہ عبادت افضل اور احسن ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ إِنَّ أَوْلَىٰ لِغَايَةِ النَّيْلِ هُوَ أَشَدُّ وَظَلَمًا وَقَوْمٌ قَلِيلًا (بلاشبہ رات کا قیام (نفس کو) تپتی سے روندتا ہے اور بات کو درست کرتا ہے) اطراف النہار کا عطف قبل طلوع الشمس پر ہے یا من انای اللیل کے نکل پر ہے۔ خصوصیت اور مزید

تاکید کے ارادہ سے شاید فجر اور عصر کی نمازوں کا دوبارہ ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ فجر نیند کا وقت ہے اور عصر دنیا کے امور میں مصروفیت اور مشغولیت کا وقت ہے۔ یہ آیت اس ارشاد کی مثل ہے۔ حَفِظُوا عَلَيَّ الصَّلَاةَ وَالصَّلَاةَ الْكُلِّيَّةَ۔ (پابندی کرو سب نمازوں کی اور خصوصاً) درمیانی نماز کی) اور لفظ جمع (اطراف) کے ساتھ ان دو نماز کا ذکر اس لئے ہے کہ یہاں التباس کا کوئی اندیشہ نہیں ہے (بر محض جانتا ہے کہ دن کے اطراف دو ہی ہوتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ دوسری آیت میں مراد مقصود پرنس ذکر کی گئی ہے۔ فرمایا: اَقِمِ الصَّلَاةَ كُلَّهَا (اس لئے تثنیہ کی جگہ جمع کا استعمال جائز ہے) یا اطراف النہار سے مراد صرف ظہر کی نماز ہے کیونکہ اس کا وقت دن کے نصف اول کا اختتام اور نصف آخر کی ابتداء ہے۔ تو اس کو جمع ذکر کرنا ان دو حصوں کے اعتبار سے ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں آناء اللیل سے مراد عشاء اور اطراف النہار سے مراد ظہر اور مغرب ہیں کیونکہ ظہر دن کے پہلے طرف کے آخر میں اور دوسرے طرف کی ابتداء میں ہوتی ہے پس یہ دو طرفیں ہیں اور تیسری طرف غروب شمس ہے۔ اور اس وقت مغرب کی نماز ادا کی جاتی ہے (اس لئے اطراف کا جمع ذکر ہو گا درست ہے) یا اطراف النہار سے مراد دن کے اوقات میں نوافل ہیں۔

یعنی ان اوقات میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تجھے ایسا اجر ملے گا جس سے آپ خوش ہو جائیں گے۔ کسائی اور ابو بکر نے توحی کو بھول کا سینہ پڑھا ہے، یعنی تاکہ تیرا رب تجھے خوش کرے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تجھ سے راضی ہو گا جیسے ارشاد ہے: وَكَانَ عِشْرَتَهُ مَرْغُوبًا (وہ اپنے رب کی بارگاہ میں پسندیدہ ہے) بعض علماء فرماتے ہیں آیت کا یہ معنی ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ مقام شفاعت پر فائز فرمائے گا حتیٰ کہ آپ خوش ہو جائیں گے جیسے ارشاد فرمایا: وَتَسْتَوِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَى۔ امام بخاری، مسلم، امام احمد اور صحابہ سنن نے جریر بن عبد اللہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں ہم رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر تھے۔ آپ ﷺ نے چودھویں کے چاند کو دیکھا اور فرمایا تم اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جیسے تم اس چاند کو دیکھو رہے ہو اور اس روایت میں تمہاری آنکھیں خیرہ نہ ہوں گی۔ اگر تمہیں طاقت ہے کہ تم صبح اور عصر کی نماز سے مغلوب نہ ہو تو ایسا ضرور کرو (1) پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَلِيلًا مُّكْثِرًا وَقَبَلُ غُرُوبِهَا۔ ابن ابی شیبہ ابن مردودہ نے بزار اور ابو یعلیٰ نے اور نافع سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک مہمان آیا تو آپ ﷺ نے مجھے ایک بیہودہ سے آنا دھار لینے کے لئے بھیجا۔ دوسری روایت میں ہے کہ اتنا اتنا آنا یا یہ فرمایا کہ مجھ سے جب کا چاند (نظر آئے) تک آنا دھار دو بیہودہ نے کہا کوئی چیز رہن رکھے بغیر نہ دوں گا۔ میں حضور نبی کریم ﷺ کے پاس واپس آیا اور بیہودہ کا بیان سنایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا قسم بخدا اگر وہ مجھے پیچھے یا مجھے ادھار دے تو میں اسے ضرور واپس کروں گا، میں آسمان اور زمین میں امین ہوں۔ فرمایا میری یہ لوہے کی زرہ اس کے پاس لے جاؤ۔ میں ابھی لے کر گیا تھا کہ یہ آیت نازل ہوئی (2)۔

وَلَا تَسُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْتَهُمْ آذْوَانًا وَمِنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ
الدُّنْيَا لِنَفْسِهِمْ فِيهِ ۗ وَرِزْقُ رَبِّكَ حَيِيرٌ ۗ وَأَبْلَغِي ۝

”اور آپ مشتاق لگا ہوں سے نہ دیکھئے ان چیزوں کی طرف جن سے ہم نے لطف اندوز کیا ہے۔ کافروں کے چند گروہوں کو یہ کھس زریب و زینت ہیں دنیوی زندگی کی (اور انہیں اس لئے دی ہیں) تاکہ ہم آزمائش انہیں ان سے

ع اور آپ کے رب کی عطا بہتر اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔“

۱۔ اس کا عطف فاصیو پر ہے۔ جب ولولہ کلمۃ سبقت کا ارشاد کفار سے فوری عذاب کے انقضاء اور مؤخر عذاب کے ثبوت پر دلالت کرتا ہے تو اس پر فاء سببیہ کے ذریعے ان دو جملوں کو مرتب فرمایا ہے جن میں سے ایک فوری عذاب کے انقضاء پر صبر کے حکم پر دلالت کرتا ہے اور دوسرا جملہ اس بات کو بیان کر رہا ہے کہ آپ ان کے مال و دولت کو لچائی ہوئی نظروں سے نہ دیکھیں کیونکہ آخرت میں ان پر عذاب کا مسلط ہونا یقینی ہے۔

ازواجاً، متعناً کا مفعول ہے اور منہم، ازواجاً کی صفت ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ازواجاً، بہ کی ضمیر مجرور سے حال ہو اور متعماً مفعول بہ ہو اور منہم میں من بعضیہ ہے۔ زہرۃ الحیاة الدنیا اس فعل مضروف کی وجہ سے منسوب ہے جس پر متعناً دلالت کر رہا ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اعطینا ہم زہرہ الحیاة الدنیا یا یہ متعناً کے ساتھ ہی منسوب ہے۔ اس بنا پر کہ اس کے ضمن میں اعطینا کا معنی موجود ہے۔ یا یہ کہ عمل سے بدلت کی بناء پر منسوب ہے یا مضاف کی تقدیر کے ساتھ ازواجاً سے بدل ہونے کی بناء پر منسوب ہے، اگر ازواجاً سے مراد اہتاف الکفرہ ہو۔ اور مضاف کی تقدیر کے بغیر ہوگا اگر ازواج سے مراد اصناف الممال ہو۔ یعقوب نے زہرہ کو ہواء کے نفخ کے ساتھ پڑھا ہے، یہ بھی ایک لغت ہے۔ جیسے جھوٹے میں جھوٹا ایک لغت ہے۔ یا یہ زاہر کی جمع ہے اور کفار کی صفت کے طور پر ذکر کی گئی ہے کیونکہ وہ اس کی حفاظت کرتے تھے اور اس کی نعمتوں سے بہت خوش ہوتے تھے۔ قاموس میں ازواج کا معنی احتفاظ اور خوش ہونا لکھا ہے (1)۔

۲۔ یعنی ہم انہیں آزمائیں گے یا یہ معنی کہ ہم کفر و گمراہی میں پھونک دیں گے کہ وہ دنیا میں سرکش ہو کر گھومتے پھریں یا یہ معنی کہ ہم انہیں آخرت میں عذاب دیں گے اس لئے کہ ہم نے انہیں دنیا کی نعمتوں سے لطف اندوز کیا تھا۔

۳۔ آپ کو جو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہدایت اور نبوت کا منصب رفیع عطا فرمایا ہے یا حلال روزی اللہ نے آپ کو عطا کی ہے یا آخرت میں جنت اور مراتب قرب عطا فرمائے گا۔ کفار کے مال و متاع سے ہزار درجہ بہتر ہے کیونکہ آپ کو جو کچھ ملا ہے دائمی اور سرمدی ہے، جب کہ کفار کا ساز و سامان فانی اور عارضی ہے۔ رزق ربک خمیر و ابقی کا جملہ لا تمسکن کے فاعل سے حال ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو اللہ کی عزت (ہدایت ایمان) کو عزت نہیں سمجھتے اس کی روح حسرتوں اور آرزوں میں ہی نکل جاتی ہے۔ جو شخص لوگوں کے مال و متاع کو لچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے وہ ہمیشہ پریشان اور غمگین رہتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ اللہ کی نعمتیں صرف کھانے پینے اور پہننے میں ہیں تو اس کا عمل کم ہوتا ہے اور عذاب الہی سامنے ہوتا ہے (2)۔

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا تَسْتَكْبِرُ رِزْقًا نَحْنُ

نَزَرْنَاكَ ۖ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَى ۝۱۱

”اور حکم دیجئے اپنے گھر والوں کو نماز کا اور خود بھی پابند رہنے اس پر نہیں سوال کرتے ہم آپ سے روزی کا (بلکہ)

ہم ہی روزی دیتے ہیں آپ کو۔ اور اچھا انجام پر ہمیز گاری کا ہی ہوتا ہے۔“

۱۔ اہل سے مراد قوم اور آپ ﷺ کے سارے امتی ہیں، اس کا عطف لا تمسکن پر ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو نماز کا حکم دیا

اب ارشاد: ہور ہائے کہ اپنے متعلقین اور اپنے جانشینوں کو نماز کا حکم دو، جب کہ اس سے پہلے انہیں حکم دیا تھا کہ وہ بھوک اور قدر پر ایک دوسرے کی معاونت کریں، صبح و شام اپنی معیشت کی فکر میں نہ لگے رہیں اور رات بابت ثروت کی طرف لپٹائی ہوئی نظروں سے نہ دیکھیں۔ (بلکہ نماز کے ذریعے اپنے رب کریم کے در رحمت پر ہر لمحہ دستک دیتے رہیں، وہی رازق ہے اور وہی ہر چیز کا حقیقی مالک ہے) پھر فرمایا نماز پر خود بھی حسب معمول مداومت اختیار کیجئے۔

یہ ہم آپ کو یہ تکلیف نہیں دیتے کہ تم ہماری مخلوق کے کسی فرد واحد کو روزی عطاء کرو، ہم رزق رسائی کی ذمہ داری آپ پر نہیں ڈالتے، ہم تو آپ سے حسن عمل کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہ جملہ نماز پر صبر کرنے کی تعلیم کے مقام پر ہے۔

یہ آپ کو بھی رزق ہم دیتے ہیں، آپ امور آخرت کو سنوارنے کی فکر کریں معیشت کی فکر کرنے کی آپ کو قطعاً ضرورت نہیں، یہ جملہ رزق کا سوال نہ کرنے کی علت ہے۔

یہ عاقبہ سے مراد اہل صالح کے بعد کا ثواب اور جزاء ہے جیسا کہ بے عمل کے بعد کی سزا کو عقاب کہا جاتا ہے۔ انبوی سے مراد اہل تقویٰ ہیں۔ ابن عباس اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں اور لوگ جنہوں نے آپ ﷺ کی تصدیق کی، آپ ﷺ کی اتباع کی اور مجھ سے ڈرتے رہے ان کے لئے اچھا انجام ہے (1) سعید بن منصور نے اپنی سنن میں بطورانی نے الاوسط میں، ابو نعیم نے ائحلیہ میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کے اہل کو کوئی تکلیف لاحق ہوتی تو آپ انہیں نماز کا حکم دیتے (2) اور یہ آیت تلاوت فرماتے۔

وَقَالُوا لَوْلَا يُنَزِّلُ آيَاتٍ مِن سَمَوَاتِهِ ۗ أَوَلَمْ يَأْتِهِم بَيِّنَاتٌ مِّنَ الْبُحُرِ الْاُولٰٓئِكَ

”اور انکار فرماتے ہیں کہ (نبی) کیوں نہیں لے آتا ہمارے پاس کوئی نشانی اپنے رب کے پاس سے (ان سے پوچھو) کیا

نہیں آگیا ان کے پاس واضح بیان جو پہلی نازل شدہ کتابوں میں ہے۔“

یہ مشرکین مکہ ہر قدرت پر پرت لگے رکھتے کہ محمد ﷺ اپنی نبوت کی صداقت پر اپنے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں لے آئے۔ اس جملہ کا عطف بقولوں پر ہے۔ یعنی وانصر علی ما بقولوں و علی ما قالوا انہوں نے ان آیات کا جو حضور لے کر آئے تھے بہت دھرمی کی بناء پر انکار کیا اور اپنی طرف سے تجویز کردہ نشانیوں کا مطالبہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن جیسے ابدی اور سرمدی معجزہ کو اتار کر ان کا منہ بند کر دیا کیونکہ معجزہ کی حقیقت یہ ہے کہ نبوت کا اعلان کرنے والا خارق للعادة کے طور پر علم و عمل کے ساتھ محسوس ہو، یعنی اس کے پاس علمی یا عملی ایسی خصوصیت ہو جو کسی دوسرے کے پاس نہ ہو۔ اور یہ ایک حقیقت مسلمہ ہے کہ علم کی اصل ہے اور علم عمل سے قدر و منزلت میں بلند ہے اور اثر میں دیر پا ہے۔ تو جو معجزہ علمی ہوگا وہ یقینی علمی معجزات سے افضل اعلیٰ ہوگا پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں وجود اعجاز میں سے ایک واضح وجہ کے ساتھ تنبیہ فرمائی اور فرمایا کیا نہیں آگیا ان کے پاس واضح بیان جو پہلی سماوی کتب میں ہے۔ الم یہد میں استفہام انکاری ہے اور واو عاطفہ ہے، تقدیر کلام اس طرح ہے۔

الم يعرفوا صدقک فی ادعاء النبوة ولم تاتهم بیان ما فی الصحف الاولی

یعنی کیا ان عقل کے اندھوں کو آپ کی نبوت کے دعویٰ کی سچائی معلوم نہیں ہوئی اور پہلی کتب سماویہ تو رات، انجیل اور دوسرے صحیفوں کا

بیان ان کے پاس نہیں آیا۔ قرآن حکیم سابقہ کتب کے عقائد و احکام کا خلاصہ ہے، جب کہ اس کو لے کر آنے والا ای ہے۔ جس نے کسی کے سامنے بھی زانوئے تلمذت نہیں کیا کہ اسے کسی نے ایسا معجز کلام سکھایا ہو (کیا یہ قرآن میرے محبوب کی نبوت کی صداقت کی بین دلیل نہیں ہے) اور قرآن جس طرح آپ ﷺ کی نبوت کا واضح ثبوت اور ناقابل تردید دلیل ہے اسی طرح یہ سابقہ کتب کی صحت پر بھی شاہد عادل ہے۔ اس حیثیت سے یہ معجزہ ہے (کیونکہ ایک ای نے اس میں سابقہ کتب کے احکام بیان کئے ہیں جب کہ اس نے کسی سے تعلیم حاصل نہیں کی) جب کہ دوسری کتب ساویہ ایسی نہیں ہیں، ان کو ایک ایسے شاہد کی ضرورت تھی جو ان کی صداقت کی گواہی دے۔ واللہ اعلم۔ مابغ ابو عمر وادرجض نے فاتھم کو تانیف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے بلکہ ساتھ پڑھا ہے کیونکہ فعل مقدم ہے اور فاعل مؤنث غیر حقیقی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کیا ان لوگوں کے پاس پہلی امتوں کے حالات نہیں چھپے جو پہلی کتب میں موجود تھے کہ انہوں نے بھی اپنی من پسند دلیلوں کا مطالبہ کیا تھا۔ پھر جب ان کے پاس ان کی تجویز کردہ دلیلیں اور نشانیاں آئیں تو انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ پھر کیسے ہم نے فوراً عذاب کی بجلی ان پر برسائی تھی اور ان کا نشانہ مٹا دیا تھا۔ پس اگر یہ بھی ایمان نہ لائے اپنی تجویز کردہ دلیل پر بھی عذاب کا کوڑا برسے گا۔ اور ان کا حال بھی ان سے کچھ مختلف نہ ہوگا۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَكْنٰهُمْ بَعْدَ اِيْتِئِنا
رَسُوْلًا فَتَنَّبٰهُ الْيَتِيْمَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّذَلَّ وَ نَحْوٰى ۝۱۱۱

”اور اگر ہم انہیں ہلاک کر دیتے کسی عذاب سے ان سے پہلے تو کہتے ہمارے رب کیوں نہ بھیجا تو نے ہماری طرف کوئی

رسول تاکہ ہم بیروی کرتے تیری آجوں کی اس سے پہلے کہ ہم ذلیل اور رسوا ہوں۔“

۱۔ اهلکنا ہم میں ہم ضمیر سے مراد کفار قریش ہیں۔ بعدذاب اهلکنا کے متعلق ہے من قبلہ یعنی بعثت محمد ﷺ سے پہلے یا بیان اور نصیحت سے پہلے کیونکہ تہ کیروینہ بھی دلیل کے معنی میں ہے۔ فتنع میں فناء کے بعد ان مضمردہ ہے کیونکہ یہ حرف تنقیض لو لا کے جواب میں ہے اور وہ معنی استفہام ہے۔ آیات سے مراد رسول پر نازل ہونے والی آیات ہیں۔ من قبل نبع کے متعلق ہے۔ ذلیل ہونے سے مراد اذل ہونا، قیدی ہونا ہے۔ اور رسوائی سے مراد جنہم میں داخل ہونے کے ساتھ رسوائی ہے۔

مطلبہ یہ آیت کریمہ دلیل ہے کہ رسولوں کی بعثت سے پہلے بھی عقلاء پر اللہ کی ذات اور اس کی توحید پر ایمان مانا واجب تھا اور رسولوں کی بعثت سے پہلے بھی کفر عذاب کے استحقاق کا سبب تھا۔ رسولوں کی بعثت تو فقط اتمام حجت اور عذر کو ختم کرنے کے لئے ہے۔ نیز یہ اس کریم کا مزید فضل و احسان ہے یہ امام ضیفہ کا قول ہے جب کہ امام شافعی رحمت اللہ علیہ کا قول اس کے خلاف ہے۔

قُلْ كُلٌّ مِّنْ رَّيْضٍ وَكِرْبَصُوۡا۟ ۙ فَسْتَعْلَمُوۡنَ۟ مِّنْ اَصْحٰبِ الصِّمْرِاطِ السُّوۡیٰ وَ

مِّنْ اِهْتِلٰى ۝۱۱۲

”اے صیب! آپ انہیں فرمائیے برخص (انجام کا) منتظر ہے سو تم بھی انتظار کرو تم غریب جان لوگے کون ہیں سیدی

راہ (پر چلنے) والے اور کون ہدایت یافتہ ہیں۔“

۱۔ مشرکین ہر وقت اس انتظار میں رہتے کہ جو احداث زمانہ کے طوفان آئیں گے اور محمد ﷺ کے چراغ زہرت کو بجھا دیں گے۔

جب ان کا گلشن ہستی مٹ جائے گا تو ہماری ساری بیقراریاں اور بے چینیاں ختم ہو جائیں گی تو فرمایا انتظار کرو قیامت کے روز حقیقت حال نکل جائے گی، تمہیں پتہ چل جائے گا کہ جنت کے راستہ پر کون گاڑن تھا اور کون ہدایت یافتہ تھا یا داغی نعمتوں کی طرف کون راہنمائی حاصل کر چکا تھا۔ من دونوں جگہ استفہام کے لئے ہے اور مبتدا کی حیثیت سے محل رفع میں ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوسرا من موصولہ ہو۔ لیکن پہلا موصولہ نہیں کیونکہ اس کے لئے ضمیر عائد نہیں ہے پس دوسرا من جملہ استفہامیہ پر معطوف ہوگا۔ اور فستعلمون کا فعل حلق ہوگا اس بناء پر کہ علم بمعنی معرفت ہے یا من کا عطف اصحاب المصراط پر ہے یا صرف المصراط پر ہے اس بنا پر کہ مصراط سے مراد نبی کریم ﷺ کی ذات القدس و اطہر ہو۔ حمزہ اور کسائیٰ تشقی سے من اھتدی تک امالہ کرتے ہیں اور بوعمر و صرف وہاں امالہ کرتے ہیں جہاں آراء یا ہے جیسے الشری من الفسری ولا نعری اور ان کے علاوہ میں بین بین کرتے ہیں اور درس تمام میں بین بین پڑھتے ہیں اور باقی قراءت کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

حاکم نے المستدرک میں اور بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ معطل بن یسار سے اور بغوی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے سورہ بقرہ ذکر اول سے عطا کی گئی اور سورہ کا ط اور حم والی سورتیں اور حم والی سورتیں الواح موسیٰ سے عطا کی گئیں۔ اور فاتحہ الكتاب سورہ بقرہ کی آخری آیات عرش کے نیچے سے عطا کی گئیں اور مفصل مجھے زائد عطا ہوئیں۔ حاکم نے مستدرک میں الطمرانی اور ابن ماجہ نے حضرت امامہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کا اسم اعظم جس کے ساتھ دعا کی جائے تو اللہ تعالیٰ دعا قبول فرماتا ہے، وہ تین سورتوں میں ہے، سورہ بقرہ، سورہ آل عمران اور سورہ ط (۱)۔

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين شفيع المذنبين. سورة ط کا ترجمہ بتوفیق الہی 1421 بمطابق 2 اگست بروز بدھ صبح پونے آٹھ بجے اختتام پذیر ہوا۔

یا مالک الملک یا حی یا قیوم میری اس کاوش کو اپنی بارگاہ عالی میں قبول فرما اور اسے میرے لئے بروز قیامت باعث نجات بنا اور اس کے ظہل میری اولاد کو دین متین کی خدمت کے لئے قبول فرما۔ ایاک نعبد و ایاک نستعین یا ارحم الراحمین امین بجاہ سید المرسلین محمد ﷺ واصحابہ وازواجہ وسلم۔

سورة الانبياء

﴿انبياء ۱۱۲﴾ ﴿سورة الاحقاف ۲۱﴾ ﴿مكة عاقبا ۷﴾

سورة انبياء کی ہے، اس میں سات رکوع اور ایک سو بارہ آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے
آغاز ترجمہ: بروز بدھ صبح آٹھ بجے 2 اگست 2000ء۔ یہ سورت کی ہے، اس میں سات رکوع 112 آیتیں ہیں۔

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ ﴿۱﴾

”قریب آ گیا ہے لوگوں کے لئے ان کے (اعمال کے) حساب کا وقت اور وہ غفلت میں منہ پھیرے ہوئے ہیں۔“

۱۔ جو زمانہ بیت گیا ہے اس کی نسبت سے زندگی کے باقی ایام کم ہیں، اس لئے فرمایا ان کے حساب کی گھڑی قریب ہے۔ للناس پر لام بعض علماء کے نزدیک بمعنی من ہے اور اقتراب کے متعلق ہے اور بعض علماء کے نزدیک اضافت کی تاکید کے لئے ہے۔ اصل میں اس طرح ہوگا اقتراب حساب الناس۔ الناس پر الف لام بعض کے لئے ہے اور بعض کے نزدیک عہدی ہے اور مراد کفار ہیں۔ اس قول کی تائید وہم فی غفلة کا ارشاد بھی کرتا ہے۔

۲۔ دنیا کی لذتوں اور نفسانی خواہشات میں یوں کھوئے ہوئے ہیں کہ اپنی زندگی کے اعمال کے حساب سے غافل ہیں اور بد اعمالیوں پر جو انہیں سزا ملنے والی ہے اس سے بالکل بے خبر ہیں اور حساب کے متعلق سوچنے اور حساب و کتاب کے لئے تیار ہونے سے نرے غافل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے غفلت کے بعد اعراض کی صفت بیان فرمائی تاکہ وہ شخص خارج ہو جائے جو ذکر الہی میں استغراق کی وجہ سے کائنات کی ہر چیز سے مستغنی ہے۔ الناس پر اگر الف لام استغراقی ہو تو ضمیر منفصل کا مرنع عام کے بعض افراد ہوں گے جیسا کہ وَ اَلْمَلٰٓئِكَةُ يَنْتَظِرُوْنَ بِاَلْقَابِہِمْ شٰلٰٓسَةَ اَیَّٰتٍ وَّ اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ اَحْسٰی یُؤَدُّہِمْ اَمَّا الَّذِیْنَ کٰفَرُوْا فَاُوْلٰٓئِکَ اَعْدٰٓؤُاۤیْہِمْ یَوْمَئِذٍ وَّ اَلَّذِیْنَ کٰفَرُوْا فَاُوْلٰٓئِکَ اَعْدٰٓؤُاۤیْہِمْ یَوْمَئِذٍ وَّ اَلَّذِیْنَ کٰفَرُوْا فَاُوْلٰٓئِکَ اَعْدٰٓؤُاۤیْہِمْ یَوْمَئِذٍ (یعنی عام کے بعض افراد مراد ہیں کیونکہ جن عورتوں کو طلاق مغلظ دی گئی ہو ان کو ان کے خاندانوں کا حق نہیں رکھتے) معوضون ضمیر کی خبر ہے اور وہی غفلة خبر کی ضمیر مستتر سے حال ہے یا فی غفلة اور معوضون دونوں ضمیر کی خبریں ہیں اور پھر جملہ الناس سے یا حسابہم سے رابطہ کے حذف کے ساتھ حال ہے حساب سے مراد بندوں نے جو کچھ کیا اور اپنے اعمال کے مطابق جس کے مستحق ہیں اس کا اظہار ہے اور اقترابہ سے مراد قیامت کا قریب ہونا ہے۔

صٰیٰٓاۤیْہِمْ مِّنْ ذٰکُمْ مِّنْ سَآءِیٰتِہُمْ مُّحَدَّثٰتٍ اِلَّا اَسْتَعُوْا وَّہُمْ یَلْعَبُوْنَ ﴿۲﴾

”نہیں آتی ان کے پاس کوئی تازہ نصیحت ان کے رب کی طرف سے، مگر یہ کہ وہ سنتے ہیں اسے اس حال میں کہ وہ

(لہو) لہب میں (گن) ہوتے ہیں۔“

لہٰذا من زائدہ ہے اور ذکر 'یاتی' کے فاعل کی حیثیت سے محل رفع میں ہے اور من زہیم ذکر کی صفت ہے یا یا تہیم کے متعلق ہے۔
محدث بھی ذکر کی صفت ہے۔

ذکر محدث سے مراد کلام اللہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفت قدیمہ ہے لیکن اس کا نزول بندوں کی مصلحتوں کے مطابق مختلف اوقات میں ہوتا رہا ہے تاکہ بندوں کو بار بار متنبہ کیا جائے اور وہ اس نعت عظمیٰ سے نصیحت حاصل کریں تو اس کا نزول حادث ہے اور نزول کا حادث ہونا ذات منزل کے قدیم ہونے کے منافی نہیں ہے (خلاصہ یہ ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی صفت قدیمہ ہے لیکن اس کا نزول حادث ہے پس معزز اس آیت سے قرآن کے حدوث کو ثابت نہیں کر سکتے)

یعنی جب کسی نئی آیت کا نزول ہوتا ہے تو یہ ہدایت حاصل کرنے کی بجائے مذاق اڑاتے ہیں 'سجیدگی سے غور و فکر کی رحمت گوارا ہی نہیں کرتے۔ اپنے انجام بد سے بے فکر ہونے' غفلت اور عدم توجہ کی انتہا کو پہنچنے کی وجہ سے قرآن کا استہزاء کرتے ہیں۔ وہم بلعبون' استمعوہ کے فاعل سے حال ہے۔

لَا هَيْبَةَ قُلُوبِهِمْ ۚ وَاسْرُوا النَّجْوَى ۚ الَّذِينَ ظَلَمُوا ۗ هَلْ هَذَا إِلَّا بَشَرٌ
مِّثْلُكُمْ أَفَتَأْتُونَ السَّحَرَةَ وَأَنْتُمْ تُبْصِرُونَ ۝

"فاعل ہوتے ہیں ان کے دل اور (آپ کے خلاف) سرگوشیاں کرتے ہیں جنہوں نے ظالم (وہ کہتے ہیں) کیا ہے یہ مگر ایک
بشر تمہاری مانند جس کو کیا تم پیروی کرنے لگے ہو جاؤ گی، حالانکہ تم دیکھ رہے ہو (کہ یہ ہماری طرح بشر ہے)۔"

لا ہیبۃ قلوبہم' بلعبون کے فاعل سے یا استمعوہ کے فاعل سے حال ہے اور متشقی مایا تہیم کی ضمیر منصوب سے حال ہے یا
مایا تہیم کے مصدر محذوف کی صفت ہے۔ یعنی کسی حال میں ان کے پاس کوئی ذکر نہیں آتا مگر وہ سننے کے وقت قرآن کے استہزاء اور
انجام کی بے فکری کے جامع ہوتے ہیں۔ متشقی کے مصدر کی صفت کی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ کوئی نیا ذکر ان کے پاس نہیں آتا مگر اس کو
سننے میں غفلت اور لہو لعلب میں لگن ہو کر۔

ابو بکر الوراق فرماتے ہیں القلب اللہی وہ ہے جو دنیا کی زیب و زینت اور بہرہ چمت میں کھویا ہوا ہو اور آخرت کی
ہولناکیوں سے غافل ہو۔ مایا تہیم کا جملہ ہم فی غفلۃ کی علت ہے۔

یعنی وہ انتہائی خفیہ طریقہ سے سازشیں کرتے ہیں یا یہ معنی کہ وہ اس طرح سازشیں کرتے ہیں کہ کوئی ان کی سرگوشی کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔
الذین ظلموا' اسروا کا فاعل ہے اور اسروا میں دوا زائدہ ہے اور یہ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ آئے والا فاعل جمع
ہے یا اس کا فاعل ضمیر ہی ہے اور الذین ظلموا ضمیر سے بدل ہے اور اس اسلوب کا مقصود یہ ہے کہ وہ ظلم میں حد سے تجاوز کرنے
والے ہیں یا اسم موصول مبتدا ہے اور اس سے پہلا جملہ اس کی خبر ہے اور اس کی اصل ہوا لاء اسروا والنجوی ہے۔ ان کے ظلم پر ہم
حبت کرنے کے لئے ہوا لاء کی جگہ اسم موصول ذکر فرمایا۔ یا اسم موصول (الذین) مبتدا محذوف کی خبر ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی
ہم الذین ظلموا یا اسم موصول اعنی کی تقدیر کے ساتھ منصوب ہے یا بطور مضمون منصوب ہے اور اسروا والنجوی کا جملہ بلعبون پر
معطوف ہے یا بلعبون کے فاعل سے حال ہے یا استمعوہ پر معطوف ہے یا مایا تہیم پر معطوف ہے یا یہ جملہ معترضہ ہے۔

یعنی وہ رسول اللہ ﷺ کو جھٹلانے کے لئے یہ دلیل دیتے کہ یہ ہماری طرح بشر ہے، وہ یہ گمان کرتے تھے کہ رسول کے لئے فرشتہ ہونا

ضروری ہے گویا ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ رسولؐ بھیجنے والے کی جنس سے ہونا ضروری ہے اور وہ ملائکہ کو الملک الفہار کی جنس سے سمجھتے تھے، اسی وجہ سے انہیں اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے۔ ان کے یہ سب نظریات باطل اور غلط ہیں۔

حق یہ ہے کہ رسول کے لئے ان کی جنس سے ہونا ضروری ہے جن کی طرف اس کو مبعوث کیا گیا ہے کہ وہ اس سے آکتاب فیض کر سکیں اور الملک الفہار کی ذات لَمْ يَدْعُنْ لَهُ الْكُفُؤًا أَحَدًا ہے، اس کا کوئی ہم پلہ اور ہم جنس نہیں ہے۔ منلکم بشر کی صفت مؤکدہ ہے۔ پھر جب انہیں کہا جاتا کہ اگر واقعی یہ نبی نہیں ہے تو آئے دن اس سے معجزات کا ظہور کیوں ہوتا ہے؟ تو وہ رسالت و نبوت پر دلالت کرنے والے معجزات کا رد یہ کہہ کر کرتے کہ یہ جادو ہے جس کی تم پیروی کرتے ہو۔ یعنی یہ رسول نہیں ہے کیونکہ یہ بشر ہے اور جو اس سے خوارق العادات افعال کا اظہار ہوتا ہے یہ جادو کا کرشمہ ہے۔ استفہام انکاری ہے، فاء عاطفہ ہے اس کا عطف محذوف کلام پر ہے۔ السحر مفعولیت یا علیت کی بناء پر منصوب ہے اور مفعول محذوف ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے تصدقونہ فی دعوی الرسالۃ فتاتون السحر یعنی تم اس دعوی رسالت میں تصدیق کرتے ہو اور تم جادو کی اتباع کرتے ہو یا یہ معنی کہ تم محمد ﷺ کی اس جادو کی وجہ سے پیروی کرتے ہو جو وہ لے کر آئے ہیں۔ جب معجزات کے جادو ہونے پر کوئی دلیل نہ پاتے کیونکہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے تو ہٹ دھرمی کی بناء پر بغیر کسی دلیل کے اس کے جادو ہونے کا دعویٰ کرتے اور کہتے تم دیکھ رہے ہو کہ یہ جادو ہے، اس میں غور و فکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

یہ جملہ تاتون کے فاعل سے حال ہے اور افتاتون السحر کا جملہ اھل هذا الا بشر سے بدل اشتمال ہے اور اھل هذا الا بشر کا جملہ النجوی سے بدل ہونے کی بنا پر منصوب ہے یا قالوا کا مفعول ہے اور قالوا کا جملہ اسرو النجوی کے جملہ کا بیان ہے یا اس کا بدل ہے یا ماذا قالوا کا جواب جملہ متاخذ ہے۔ اس خفیہ سوچ و پیمانہ سے ان کا تصور آ پس میں مشورہ کرنا تھا تا کہ ہم کسی ایسی متفقہ بات پر پہنچ جائیں جو حقیر نبوت میں شکاف ڈال دے اور ان کی ابھرتی ہوئی تحریک میں فساد و انتشار پیدا کر دے اور ہماری اس بات کو سننے والا ابتداءً رو نہ کر سکے لیکن ان نادانوں کو یہ معلوم نہ تھا جس نور کی حفاظت اللہ تعالیٰ فرما رہا ہو اس کو چھوکنوں سے بچانا ناممکن ہے۔ یُنَادُونَ لِيُظْهِرُوا لَنَا نُورًا وَلَهُمْ آيَاتُ اللَّهِ مُصَدِّقَاتُ لِمَا نَكْفُرُونَ۔ یہ (نادان) چاہتے ہیں کہ بھجادیں اللہ کے نور کو اپنی چھوکنوں سے لیکن اللہ اپنے نور کو کمال تک پہنچا کر رہے گا خواہ نا پسند کریں اسے کوئی کافر۔

قَدْ رَأَىٰ يَٰعِلْمُ الْقَوْلِ فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۖ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٥٠﴾

” (نبی کریم نے) فرمایا میرا رب جانتا ہے جو بات کہی جاتی ہے آسمان اور زمین میں اور وہی ہر بات سننے والا سب کچھ

جاننے والا ہے۔“

۱۔ حمزہ کسائی اور حفص نے رسول اللہ ﷺ کی طرف اخبار کی بنا، پر قال پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے امر کے صیغہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ فی السماء والارض، القول سے حال ہے، یعنی میرا پروردگار ہر اس بات کو جانتا ہے جو زمین کی پستیوں یا آسمان کی بلندیوں میں کی جاتی ہے خواہ کہنے والا بلند آواز سے کہے یا آہستہ آواز سے، وہ خفیہ رازوں (بلکہ نہاں خانہ دل میں اٹھنے والی خواہشوں) کو بھی جانتا ہے وہ ان کی ہر بات کو سننے والا ہے اور ان کے ظاہر و باطن کو جاننے والا ہے۔

بَلْ قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ بَلْ افْتَرَاهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۗ فَلْيَأْتِنَا بِآيَاتٍ كَمَا

اُمْرَسِيلَ الْاَوْلَادِ ۝

”وہ کہتے ہیں بلکہ یہ پریشان خواب ہیں (نہیں) بلکہ اس نے خود گھڑا ہے اسے (نہیں) بلکہ وہ شاعر ہے۔ (اگر وہ سچا نبی ہے) تو لے آئے ہمارے پاس کوئی نشانی جس طرح بھیجے گئے تھے پہلے انبیاء۔“

۱۔ شان رسالت میں جو انہوں نے کہا تھا کہ یہ بشر ہے اور بشر اللہ کا رسول نہیں ہو سکتا۔ اب اس کلام سے اعتراض کر کے قرآن کے متعلق جو انہوں نے بک بک کی تھی اس کو دکاتے کیا جا رہے وہ کہتے یہ قرآن اللہ کی طرف نازل شدہ نہیں ہے بلکہ پریشان خواب ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ کفار کے قول افتانوں السعور سے اضراب ہے اور معنی یہ کہ وہ کہتے ہیں یہ جاوہ ہے بلکہ پریشان خواب ہیں اور قالو اکلمہ اس مقدر قالو کی لفظی تاکید ہے جو سابق کلام سے مضموم ہے۔ کبھی کہتے نہیں بلکہ یہ اس نے خود گھڑا ہے، خواب میں بھی اسے یہ دکھائی نہیں دیا۔ یہ کفار کے اس قول اضغاث احلام سے اضراب ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ خود تراشیدہ ہے۔ بعض کہتے ہیں محمد ﷺ شاعر ہیں اور جو انہوں نے کلام پیش کیا ہے وہ شعر ہے (۱)۔ مغزنی (گھڑا ہوا) اور شعر میں فرق یہ ہے کہ مغزنی وہ جھوٹی کلام ہوتی ہے جس سے منکلم سامع سے واقع کے غیر مطابق ہونے کے باوجود تصدیق چاہتا ہے اور شعر مقدمات سے مرکب کلام ہوتا ہے جو سامع کے ذہن میں ترغیب ترہیب، خوف، شوق، سرور، غم، تعظیم، تحقیر کا اثر پیدا کرتا ہے اور اس سے مقصود تصدیق نہیں ہوتی بلکہ نفوس میں تاثیر پیدا کرنا منظور ہوتا ہے گویا یہ انشاء کے قبیل سے ہے۔ کبھی کبھی مقدمات شعر یہ موثرہ کے ساتھ جھوٹی یا سچی بات جمع ہوتی ہے اور یہ مشویات اور غزلیات میں پائی جاتی ہے۔ یہ سب کفار کی لائیں یا تیں تھیں اور سب غلط اور فاسد ہیں کیونکہ یہ سب باتیں انہوں نے بغیر کسی جرم کے اپنے منہ سے بنا لیں، ان کے پیچھے کوئی دلیل نہیں ہے۔

۲۔ کہتے ہیں محمد ﷺ اگر دعویٰ نبوت میں سچے ہیں تو کوئی دلیل لائیں جیسا کہ پہلے رسول اپنی صداقت پر دلیل لائے تھے کھنسا ازمیل الاَوْلَادِ آیت کی صفت ہے۔ یہاں تشبیہ صحیح ہے کیونکہ ارسال آیت کے لانے کے معنی کو مضمون ہے۔ ”کما“ میں ماموصولہ ہے یا موصولہ ہے اور پھر یہ مجدد موصوف کی صفت ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہوئی فلباتنا بایۃ کائنۃ کالایۃ النبی ارسل بھا الاَوْلَادِ من الرسل۔ یعنی محمد ﷺ اپنی صداقت کے لئے کوئی نشانی لائیں جو پہلے رسولوں کی نشانیوں کے مشابہ ہو۔ جیسا صالح علیہ السلام کی اونٹنی، عیسا موسویؑ پید ہیشا موسیٰ علیہ السلام کے معجزات تھے اور مردوں کو زندہ کرنا، پیادوں کو شفا بخشنا، عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات تھے۔

ابن جریر نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں اہل مکہ نے نبی کریم ﷺ سے کہا جو کچھ آپ کہتے ہیں اگر یہ حق ہے تو اس صفائی پہاڑی کو ہمارے لئے سونا بنا دو۔ اسی انشاء میں جبریل امین تشریف لائے اور کہا اگر آپ چاہیں تو دی ہو جائے گا جو آپ کی قوم آپ سے مطالبہ کرتی ہے لیکن اگر ان کی تجویز کے مطابق پہاڑ سونا بن گیا اور پھر بھی یہ ایمان نہ لائے تو انہیں مہلت نہیں دی جائے گی اور اگر آپ چاہیں تو میں آپ کی قوم کو مہلت دوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں اپنی قوم کے لئے مہلت کا متمنی ہوں (۲)۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ذیل کا ارشاد نازل فرمایا۔

مَا اَمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِنْ قَدَرٍ وَاَهْلَكْنَاهَا اَقْتَمُوا بُيُوتَهُمْ ۝

”نہیں ایمان لائی ان سے پہلے کوئی ہستی جسے ہم نے تباہ کیا تھا تو کیا اب یہ لوگ ایمان لے آئیں گے۔“

۱۔ قبلہم میں ضمیر سے مراد مشرکین مکہ ہیں۔ من قریۃ سے مراد من اہل قریۃ ہے اور من زائدہ ہے اور قریۃ فاعل ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے۔ اهلکنا قریۃ کی صفت ہے، یعنی جب ان کی مجوزہ آیات اور نشانیاں ان کے پاس آگئیں اور وہ ایمان نہ لائے تو ہم نے انہیں نیست و نابود کر دیا۔ اھم یومنون استفہام انکاری ہے اور فاء ما آمنت پر عطف کے لئے ہے۔ اہل مکہ پہلے لوگوں سے عناد اور ہت بھری میں زیادہ سخت ہیں جب پہلے لوگ مجوزہ نشانیاں دیکھنے کے بعد ایمان نہیں لائے تو یہ بد بخت یقیناً ایمان نہیں لائیں گے لیکن اس آیت میں اشارہ ہے کہ ان کی مجوزہ نشانیاں نہ لانا بھی ان کی بقاء کی خاطر ہے۔ اگر وہ نشانیاں پیش کر دی جاتیں اور یہ ایمان نہ لاتے تو یہ بھی اسی عذاب کے مستحق ہوتے جس کے پہلے منکر لوگ ہوئے تھے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِمْ فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۰﴾

”اور نہیں رسول بنا کر بھیجا ہم نے (اے حبیب) آپ سے پہلے مگر مردوں کو ہم نے وہی بھیجی ان کی طرف ۱۔ پس (اے

منکر!) پوچھو اہل علم سے ۱۰ اگر تم (خود حقیقت حال کو) نہیں جانتے ۱۰“

۱۔ فو حی کو حفص نے بطور تعظیم جمع متکلم معروف کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے واحد غائب مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ یہ جملہ معترضہ ہے اور کافروں کے قول اهل هذا الا بشر مملکم کا رد ہے۔

۱۰۔ اگر تم خود اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے تو اہل کتاب کے علماء سے پوچھو کہ پہلے انبیاء درسل بشر تھے یا ملائکہ تھے تاکہ تمہارا شب اور خلش ختم ہو جائے۔

۱۱۔ ان کستم لا تعلمون شرط ہے اور سابقہ کلام کی دلالت کی وجہ سے جزاء سے مستغنی ہے۔ اور کفار مکہ کو اہل کتاب سے پوچھنے اور ان کی طرف رجوع کرنے کو کیوں کہا گیا حالانکہ وہ بھی شان مصطفیٰ کے منکر تھے تو فرماتے تھے اس کی دودھ میں ہیں یا تو اس لئے کہ مشرکین مکہ نبی کریم ﷺ کے متعلق ان سے مشاورت کرتے تھے اور ان کی بات پر یقین کرتے تھے یا اس لئے کہ اصل تو اتر کی اخبار علم کا فائدہ دیتی ہیں اگر چہ وہ کفار ہی ہوں۔

وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا إِلَّا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوا خَالِدِينَ ﴿۱۱﴾

”اور نہیں بنائے ہم نے ان انبیاء کے (ایسے) جسم ۱۔ کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ ہی وہ (اس دنیا میں) ہمیشہ رہنے

والے تھے ۱۱“

۱۔ جعلہم میں ضمیر منصوب سے مراد پہلے رسل ہیں۔ جسد کو آیت کے الفاظ کے تقاضا کے مطابق اجساداً ہونا چاہئے تھا (کیونکہ جعل بمعنی بصر ہے اور ہم ضمیر اس کا مفعول اول اور جسد مفعول ثانی ہے مفعول اول جمع ہے تو پھر جمع کی خبر مفرد کیسے ہو سکتی ہے نیز لا یا کلون، جسد کی صفت ہے تو جمع کی ضمیر مفرد کی طرح لوناتی کیسے جائز ہے) لیکن جسد افرمانے کی وجہ ہو سکتی ہے کہ یا تو یا ہم جنس ہے یا یہ اصل میں مصدر ہے یا اس سے پہلے مضارع مؤنث ہے یا ضمیر کل واحد کی تاویل میں ہے۔ جسد وہ جسم ہوتا ہے جو ذی لون یعنی رنگ والا ہو۔ اسی وجہ سے جسد کا اطلاق پانی اور ہوا پر نہیں ہوتا۔ بعض علماء فرماتے ہیں جسد وہ جسم ہوتا ہے جو مرکب ہو کیونکہ

اس کی اصل کسی شے کو جمع کرنا اور اس کو خٹ بنانا ہے۔

ع یا کلون الطعام کا جملہ جسدا کی صفت ہے اور ماجعلنا کا جملہ مستانف ہے جو کفار کے قول قابل طرد التَّوَسُّلُ يَا طَهْنَ الْكَلَامَةَ (کیا ہے اس رسول کو کھانا کھاتا ہے) کے جواب میں ہے وما كانوا احاديثين سابق کام کی تاکید اور شوت ہے کیونکہ کمانے کے ساتھ زندہ رہنا تکلیل کے لوازم میں سے ہے جو تکلیل فناء اور عدم دوام کا باعث ہے۔

لَمْ يَصِدْقْتُهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَبْتُهُمْ وَمَنْ يَشَاءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِينَ ①

”پھر ہم نے سچا کر دکھایا انہیں (جو) وعدہ (ہم نے ان سے کیا تھا) پس ہم نے نجات دی انہیں اور ان لوگوں کو جن کو ہم

نے (بچانا) چاہا اور ہم نے ہلاک کر دیا حد سے بڑھنے والوں کو ہے۔“

۱۔ وعدہ سے مراد دشمنوں پر لگے ہوئے ہے۔ یہ جملہ ایک محذوف جملہ پر معطوف ہے پھر وہ محذوف جملہ وما ارسلنا قبلك الا رجاالاخ پر معطوف ہے۔

پہلے مشرکین نے پہلے انبیاء پر بھی لایعنی اعتراض کئے تھے اور بھونڈے قسم کے اشکال اٹھائے تھے جیسا کہ یہ بد بخت تمہارے اوپر طعن و اعتراض کرتے ہیں۔ لیکن ہم نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ ہم ان ناشجاریوں اور بد کرداروں پر انہیں فتح و نصرت بخشیں گے تو ہم نے ان سے یہ کیا ہوا وعدہ سچ کر دکھایا، ہم نے رسولوں کو عذاب کفار کی دلا زار و دلخراش باتوں سے نجات دی اور ان لوگوں کو بھی نجات دی جو ان انبیاء پر ایمان لائے تھے اور انہیں بھی بچالیا جن کے بچانے میں ہماری کوئی نکتہ تھی جیسا کہ ہمیں معلوم تھا کہ ظالم یا اس کی اولاد سے کوئی مومن ہوگا۔ مشرکین عرب بھی ایسا بناؤ پر عذاب سے محفوظ رکھے گئے تھے (کہ ان کی اولاد اور نسل سے مومن و موجد پیدا ہونے والے تھے)

۲۔ ہم نے کفر و معاصی میں حد سے تجاوز کرنے والوں پر عذاب نازل کر کے انہیں نیست و نابود کر دیا۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيهِ ذِكْرُكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُونَ ②

”بے شک ہم نے اتاری تمہاری طرف ایک کتاب جس میں تمہارے لئے نصیحت ہے کہ کیا تم (اتنا بھی) نہیں

سمجھتے۔“

۱۔ یہ خطاب قریش کو ہے اور کتاب سے مراد قرآن ہے، یعنی اے قریش مکہ یہ جو کتاب ہم نے تمہیں عطا فرمائی ہے اگر تم اس کا علم حاصل کرو تو تمہارے لئے اس میں شرف اور عظمت ہے یا اس لئے اس میں تمہارے لئے شرف ہے کہ یہ تمہاری زبان میں ہے اور تم میں سے ایک ذی شان شخص پر اتری ہے یا یہ معنی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب میں تمہارا اور تمہارے تمام دینی امور کا ذکر فرمایا ہے۔ امام بیضاوی نے ذکر کا معنی شہرت کیا ہے۔ یا ذکر کا معنی نصیحت ہے، یعنی اس میں تمہارے لئے نصیحت ہے یا ذکر سے مراد کام اخلاق ہیں، یعنی اس کتاب میں ایسے حکام اخلاق ہیں جن سے تم اپنا ذکر جمیل منٹا چاہتے ہو (۱)۔ مجاہد نے ذکر کا معنی حدیثکم کیا ہے، یعنی جس میں تمہارا تذکرہ ہے، اس کا معنی زبان پر جاری کرنا شہرت، تعریف، نماز و دعا اور کتاب ہے جس میں دین کی تفصیل اور قوموں کے حالات

ہوں (۲)۔

۱۱ افلا تعقلون کا مطلب انزلنا پر ہے اور فاقہ تعقیب کے لئے ہے اور مزہو استغما یہ انکار کے لئے ہے کیا تمہارے پاس اتنی بھی عقل و سمجھ نہیں ہے کہ تم یہ سوچ سکو کہ اس کتاب میں ہماری اصلاح کے قوانین ہیں اور ہماری عظمت و شہرت کا سامان ہے۔

وَكَمْ تَصْنَعُوا مِنْ قَدِيحَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَأَنْشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا آخَرِينَ ﴿۱۱﴾

”اور کتنی بدستیاں ہم نے برپا کر دیں (کیونکہ) وہ ظالم تھیں اور ہم نے پیدا فرمادی ان کی (برپادی) کے بعد ایک دوسری قوم ل۔“

۱۲ یعنی ہم نے بہت سی بدستیاں میں رہنے والوں کو ہلاک اور تباہ و برباد کر دیا اس لئے کہ انہوں نے کفر و معاصی کے سبب اپنے نفسوں پر ظلم کیا اور انہیں ہلاک کرنے کے بعد ان کی جگہ دوسری قوموں کو ہم نے ان کا وارث بنا دیا۔

فَلَمَّا آخِصُوا بِأَنْسَاءِ أَزْوَاجِهِمْ مِنْهَا يُرْكَبُونَ ﴿۱۲﴾

”پس جب انہوں نے محسوس کیا ہمارا عذاب تو فوراً انہوں نے وہاں سے بھاگنا شروع کر دیا۔“

۱۳ احسوا کی ضمیر کا سرخ الہی ہے جو قریہ کی طرف مضاف ہے۔ لہذا ظرف ہے اور مقابلات کے معنی میں ہے اور یہ جملہ ایک مقدر جملہ پر معطوف ہے اور پھر یہ دونوں جملے ان کو ہلاک کرنے کا بیان ہیں، یعنی جب ہم نے ان کو ہلاک کرنے کا ارادہ کیا تو ہم نے ان پر اپنا عذاب نازل کیا پھر جب انہوں نے ہمارے عذاب کو محسوس کیا تو اس سے فوراً بھاگنے لگے۔

لَا تَلْتَمِزُوا أَمْرًا جَعَلْنَا إِلَىٰ مَا أَنْشَأْنَا لَكُمْ فِيهِ مَسَكِينًا لَعَلَّكُمْ تَسْتَلُونَ ﴿۱۳﴾

”اب مت بھاگو! اور دلائل لوٹوان آجائے ان کی طرف جو تمہیں دی گئی تھیں اور (لوٹو) اپنے مکانوں کی طرف ل۔ تاکہ تم سے باز پرس کی جائے ل۔“

۱۴ اس کلام سے پہلے کلام مقدر ہے اور پھر اس سوال کے جواب میں مشافہہ ہے کہ ان کے بھاگنے کے وقت انہیں کہا گیا، یعنی زبان حال یا زبان قال سے بطور استہزاء انہیں یہ کہا گیا۔ یہ بات کہنے والا فرشتہ تھا یا ایسی ہیستی کے مؤمنین تھے۔ اتراف کا معنی نفرت پر گھمنڈ کرنا اترانا ہے۔ لکھیل فرماتے ہیں مترف وہ ہوتا ہے جس کی زندگی خوشحال ہو اور اس کی زندگی میں غم اور پریشانی کم ہو۔

۱۵ تاکہ کل تم سے پوچھا جائے کہ تم پر اور تمہارے اموال پر کیا گزری اور تم علم اور مشاہدہ سے مسائل کا جواب دو یا یہ معنی کہ لوٹو اور اپنی عیش و طرب کی مجال اس اپنے خدمت گزاروں اور غلاموں کے ساتھ سجاؤ اور وہ تم سے پوچھیں کہ حضور! اب ہمارے لئے کیا ارشاد ہے؟ یا یہ مطلب کہ تم واپس آؤ تاکہ لوگ تم سے تمہاری مجلسوں میں مصائب و تکالیف کے بارے میں پوچھیں یا یہ معنی کہ کل تم سے تمہارے اعمال کے متعلق پوچھا جائے یا تمہیں عذاب دیا جائے، سوال کرنا عذاب کے مقدمات میں سے ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں واپس پلٹو تاکہ تم سے تمہارے نبی کے نقل کے متعلق پوچھا جائے (۱)۔ امام بخاری لکھتے ہیں یہ آیت کریمہ حضور سستی والوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ یمن کا دیہات تھا اور اس کے باشندے عرب تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لئے ان کی طرف اپنا ایک نبی مبعوث فرمایا۔ اس نے انہیں توحید کی دعوت دی، احکام الہیہ سے آگاہ کیا لیکن ان بد بختوں نے نبی کو جھٹلایا، اس کی تکذیب کی اور پھر اسے قتل کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر بخت نصر کو مسلط کر دیا حتیٰ کہ اس نے بعض کو قیدی بنا لیا اور بعض کو قتل کر دیا جب ان کو قتل کیا جا رہا تھا تو بہت

شرمندہ ہونے اور بھاگ نکلنے فرشتوں نے انہیں بطور استہزاء کہا اب بھاگومت اور اپنے مالِ مملکت اور مائیں کی طرف لوٹو تاکہ تم سے سوال کیا جائے (1)۔ قادرہ فرماتے ہیں تاکہ تم سے دنیا کا مال و اسباب مانگا جائے پھر جسے تم چاہو عطا کر دو، جسے چاہو رد کر دو تم اہل ثروت و وحشت ہو۔ بخت نصر نے ان کا پیچھا کیا تھا اور لوٹو اور انہیں اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ آسمان سے آواز آئی۔ انبیاء کا اتمام! جب انہوں نے یہ خوفناک منظر دیکھا تو اپنے جرموں کا اعتراف کیا لیکن اس وقت اعتراف بے سود تھا (2)۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کلام انہوں نے ایک دوسرے سے کی ہو کہ بھاگو نہیں، اپنے گھروں کی طرف لوٹو اور اپنے اموال کی طرف پلٹو تاکہ تم سے بطور (دیت) مال مانگا جائے اور تم مال دے کر قتل سے بچ جاؤ۔ آسمان سے ندا آئی نبیوں کا بدلہ لکو اور انہیں اپنی گرفت میں لے لیا اور پھر انہوں نے اپنے جرم کا اقرار کیا۔

قَالُوا يَا وَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿٥٠﴾

”کہتے گئے وہ شومنی قسمت ہم بھی ظالم تھے۔“

1۔ یہ جملہ مستانہ ہے۔ (جملہ مستانہ سابقہ کلام پر سوال کا جواب ہوتا ہے)

فَمَا زِلْتَ تِلْكَ دَعْوَاهُمْ حَتَّىٰ جَعَلْتَهُمْ حَصِيدًا خُودِيَيْنَ ﴿٥١﴾

”پس وہ یونہی شور پکارتے رہے یہاں تک کہ ہم نے انہیں کئے ہوئے کھیت اور بچھے ہوئے (انگوروں) کی طرح کر دیا۔“

1۔ ان کے باویلنا کے قول کو دعویٰ سے تعبیر کیا ہے گویا کہ یہ کہتا ہے اسے دلیل (ملاکت) آ جا سکی تیرا وقت ہے۔ تلک یا تو ما زالت کا اسم اور دو اعوام خبر ہے۔ یا تلک خبر ہونے کے اعتبار سے محل نصب میں ہے اور دو اعوام، ما زالت کا اسم ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ (یہ دونوں تراکیب درست ہیں کیونکہ مبتدا اور خبر دونوں معرفہ ہیں) یہاں حصید بمعنی مٹھوڑے (درختی سے کاٹی ہوئی فصل) اسی وجہ سے اس کو جمع ذکر نہیں کیا گیا۔ خامدین عمدت النار سے مشتق ہے۔ حصید کے ساتھ اس کا ذکر ایک اسم کی طرح ہے (کیونکہ جعل تین مفعولوں کی طرف متعدی نہیں ہوتا اس کا پہلا مفعول ضمیر ہے اور حصیداً خامدین ایک مفعول کی حیثیت سے دوسرا مفعول ہے) جس طرح کہ جعلتہ حلوا خامصا (یعنی میں نے اسے دونوں ذائقوں کا جامع بنا دیا) اس جملہ میں حلوا خامصاً ایک مفعول کے قائم مقام ہے۔ آیت کا معنی یہ ہوگا کہ ہم نے انہیں کٹی ہوئی کھیتی اور بچھے ہوئے آگ کے انگاروں کا مجموعہ بنا دیا۔ یا خامدین 'صفت ہے حصیداً کی۔ یا حمیداً کی ضمیر سے حال ہے (حصیداً چونکہ فعل بمعنی مفعول ہے اس لئے یہ واحد شئیہ جمع مذکر مؤنث کے لئے کیسا استعمال ہوتا ہے اس لئے خامدین جمع اس کی ضمیر سے حال بن سکتا ہے)

وَمَا حَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَمِينَ ﴿٥٢﴾

”اور نہیں پیدا فرمایا ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے دل گلی کرتے ہوئے۔“

1۔ یعنی ہم نے اس عالم رنگ بونگیاں تماشہ کے لئے پیدا نہیں فرمایا بلکہ اس رنگارنگ جہان میں کئی حکمتیں مضمحل ہیں یہ نگاہ ہوش رکھنے والوں کے لئے قابل دید ہے اور صاحب بصیرت لوگوں کے لئے نصیحت ہے لوگوں کی معیشت و آخرت کے امور کا سبب ہے اس لئے

اس نظام عالم کو دیکھ کر اپنے علم (عقیدہ توحید) اور عمل (احکام شریعت کی پابندی) کی تکمیل کر ڈاس کی رنگینیوں میں کھو کر نہ رہ جاؤ، چشم ہوش کھولو! یہ دنیا تو بہت جلد فنا ہونے والی ہے۔

لَوْ اَرَادْنَا اَنْ نَّتَّخِذَ لَهٗمُ الْاَوْلَادَ لَتَّخِذْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا اِنْ كُنَّا فَاعِلِينَ ﴿۱۰﴾

”اگر ہمیں یہی منظور ہوتا کہ ہم (اس کائنات کو) کھیل تماشا بنا دیتے تو ہم بنائے اسے خود بخود (ہمیں کون روک سکتا تھا)۔ مگر ہم ایسا کرنے والے نہیں ہیں۔“

ابن عباس فرماتے ہیں لہو سے مراد عورت ہے۔ حسن اور قزاقہ کا بھی یہی قول ہے۔ اس قول کی دلیل یہ ہے کہ وٹلی کو لغت میں لہو کہا جاتا ہے اور عورت لہو (وٹلی) کا ٹکڑا ہے۔ کبھی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ لہو سے مراد اولاد ہے۔ سدی کا بھی یہی قول ہے (۱) کیونکہ انسان اپنے چھوٹے بچوں سے کہلاتا ہے، اس لئے لہو سے مراد اولاد ہے۔ یعنی اگر ہماری شان کے یہ لائق ہوتا تو ہم ایسا کر دیتے لیکن بیوی اور ولد ہم ایک اپنی جنس سے ہوتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات بے مثل اور بے مثال ہے، نہ اس کا کوئی ہم جنس ہے اور نہ ہم پلہ۔ پس ثابت ہوا کہ اس کے لئے بیوی یا بچہ ہونا محال ہے۔ محال چیز کے ساتھ ارادہ الہیہ کا تعلق محال ہے۔ پس جب محال چیز کے ساتھ ارادہ الہیہ کا تعلق ہونا محال ہے تو بیوی اور بیٹا بنانے سے اس کے ارادہ کا تعلق ہونا بھی محال ہے۔

اب ان کسا فاعلین شرط ہے لیکن سابق کلام کی دلالت کی وجہ سے اس کی جزاء محذوف ہے، یعنی اگر ہم بیوی اور فرزند بناتے یا کائنات ارضی و سماوی کو فقط کھیل تماشا بناتے تو ہمیں کون روک سکتا تھا لیکن ہم ایسا کرتے نہیں کیونکہ یہ ہماری شان الوہیت کے منافی ہے۔ قزاقہ، ابن جریج اور مقاتل فرماتے ہیں ان ٹکڑی کے لئے ہے اور یہ جملہ سابقہ شرط کے لئے تیسری کی مانند ہے (2)۔

بَلْ تَقْدِرُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَذَرُهَا قَدْ اَهْوٰ زَاهِقٌ ۗ وَ لَكُمْ الْوَيْلُ مِمَّا
تَصِفُوْنَ ﴿۱۱﴾

”بلکہ تم تو چرت لگاتے ہو جن سے باطل پر پس وہ چل دیتا ہے اور وہ کچھ ایک ٹاپید ہو جاتا ہے اور (اے باطل پرستو!)

تمہارے لئے ہلاکت ہے ان (نازیبا) باتوں کے باعث جو تم بیان کرتے ہو۔“

اب سابق کلام کے مضمون پر اس کا عطف ہے۔ یعنی ہمارا تخلیق ارض و سما سے مقصود وہو و لعب نہیں بلکہ ہم جن کے ذریعے باطل کا سرکھلتے ہیں۔ جن سے مراد اللہ کی ذات سے بیوی اور فرزند سے منزه ہونے پر دلالت کرنے والی آیات ہیں اور باطل سے مراد کفر اور کذب ہے جو کافر کہتے تھے کہ اللہ نے بیٹا بنایا ہے۔ دفع ایسی ضرب جس سے سر اور دماغ پھٹ جائے اور روح نکلنے کا باعث بن جائے۔ اللہ تعالیٰ نے جن کے ذریعے باطل کو کھیلنے اور احراق جن اور ابطال باطل کے لئے استعارہ یہ لفظ استعمال فرمایا ہے۔ قذف کا معنی دور بھینکنا ہے جو جھینکی ہوئی چیز کی صلابت کو مستزوم ہے۔ مقصود یہ ہے کہ جن کا پھر ریا رفتوں کے ساتویں آسمان پر پھرائے اور باطل کا منہ کالا ہو اور بے نام و نشان ہو جائے اس کا کچھ بھی باقی نہ رہے۔

زہق کا معنی ہلاک ہونا اور باطل، ہونا ہے۔ قاموس میں بھی زہق کا معنی ضل (یعنی کمزور اور ہلاک ہونا) درج ہے (3)۔ بعض علماء فرماتے ہیں زہوق کا مطلب روح کا نکلنا ہے۔ استعارہ مرثیہ بنانے کے لئے اس کو ذکر فرمایا ہے۔ اے باطل کے پرستارو!

تمہارے لئے بلاکت ہے ان ناروا باتوں کی وجہ سے جو تم اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق کہتے ہو۔ مامصدر یہ موصولہ اور موصولہ تینوں احتمال رکھتا ہے۔ ولکن الویل الخ کا جملہ فاذا ہو زاقق پر معطوف ہے یا حال ہے یا جملہ معترضہ ہے۔

وَلَكِنَّ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَوْ مَنْ عُنْدَكَ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِكَ وَلَا
يَسْتَحْسِرُونَ ﴿٦٤﴾

”اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو (فرشتے) اس کے نزدیک ہیں وہ ذرا سرکشی نہیں کرتے اس کی عبادت سے اور نہ ہی وہ ٹھکتے ہیں۔“

اس عالم بالا پرست میں جو کچھ ہے تخلیق بھی اس کی ہے اور ملکیت بھی اسی کی ہے کوئی چیز اس کی اہل اولاد اور ہم پلہ ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ ومن عنده ہے اس قربت کا اظہار ہے جو الفاظ اور تحریر کے احاطے سے وراہ ہے، اس کی کیفیت محسوس تو کی جاسکتی ہے لیکن بیان نہیں ہو سکتی اور اس سے مراد فرشتے انبیاء اور ان کے پیروکار ہیں من عنده کا مطلق من فی السموات والارض پر ہے اور ان کا علیحدہ ذکر تعظیم کے لئے ہے۔ دوسری وجہ ہے کہ سن اس سے اعم بھی ہے کیونکہ بعض فرشتے جیسے حاملین عرش وغیرہم اور انبیاء ملائکہ اور اکرۃ الظلال آسمان اور زمین میں ہونے سے بلند ہیں یا سن عنده مبتدا ہے اور لا يستکبرون الخ خبر ہے۔ استحسر کا معنی ٹھک جانا اور عاجز آجانا ہے استحسار حوسر سے بلیغ ہے۔ یہ اشارہ ہے کہ ان کی عبادت بڑی مشکل اور داغی ہے، اس سے ٹھک جانا یا عاجز آجانا بھی ایک حقیقت ہے لیکن مقررین بارگاہ الہی اس سے ٹھکتے نہیں بلکہ اس میں لذت اور سکون محسوس کرتے ہیں اور وہ ہمیشہ اس عبادت میں مصروف رہتے ہیں کیونکہ اس کا چھوڑنا اپنے لئے بلاکت ٹھکتے ہیں۔

يَسْبَحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ ﴿٦٥﴾

”وہ (اس کی) پانچ بیان کرتے رہتے ہیں رات اور دن اور وہ اکتاتے نہیں۔“

یہ کعبہ الاخبار فرماتے ہیں۔ مقررین بارگاہ الہی کے لئے تسبیح ایسے ہے جیسے انسان کے لئے روح ہے۔ لا یفترون‘ یسبحون کی ضمیر سے حال ہے۔ یا لا یستکبرون ولا یستحسرون کی ضمیر سے حال ہے اور لا یستکبرون کا جملہ اپنے معطوف سے مل کر من عنده سے حال ہے۔ اس تقدیر پر کہ من عنده معطوف ہے من فی السموات پر اور عبارت سے مراد یہ ہے کہ ان مقررین سے دوام حضور اور ذکر کفرنی کا انقطاع ناممکن ہے (خواہ وہ مقررین انسانوں میں سے ہیں یا فرشتوں میں سے) جس طرح حیوان کے لئے ہوا میں سانس کا انقطاع ممکن نہیں اور سمندری حیوان کے لئے پانی سے انقطاع ممکن نہیں ہے اور جب اسے دوام حضور حاصل ہوتا ہے تو جب بھی وہ کوئی کام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کرتا ہے، وہ خود راک کھاتا ہے پانی پیتا ہے اور آرام کرتا ہے (تو اس سے اس کا مقدس وطن پروری اور جان کا کٹھن نہیں ہوتا) بلکہ یہ سب امور وہ اطاعت الہی پر حزیہ قوت کے ساتھ کار بند رہنے کے لئے کرتا ہے۔ وہ نکاح کرتا ہے تو اس غرض سے کہ نبی کریم ﷺ کی سنت ادا کرے آپ کی امت میں اضافہ کرے اور آپ ﷺ کے حکم تنا کھوے فَاِنِّي مُبَاهِجِي بِكُمْ الْاَمَمَ (نکاح کرو کیونکہ تمہاری کثرت کی وجہ سے دوسری امتوں پر فخر کروں گا) کی بیروی میں حقوق زوجیت ادا کرتا ہے ایسے شخص سے کبھی معصیت سرزد نہیں ہوتی کیونکہ معصیت کا صدور عموماً غفلت کی بناء پر ہوتا ہے اور اگر بتدیر الہی اس سے معصیت صادر بھی ہو جائے تو وہ شرمندہ ہوتا ہے اور توبہ کرتا ہے اور پھر یُبَيِّنُ لِلَّهِ سِيَرَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ اِنَّ كِيۡنًا يَّوۡنُ كُوۡنِيۡوۡنَ مِ

تہذیب فرماتا ہے۔ اسی وجہ سے علماء فرماتے ہیں تَوْحُّدِ الْعَالَمِ عِبَادَةُ عَالِمٍ كَمَا سَوَّاهُ عِبَادَةُ رَبِّهِ۔ جو شخص دوام حضورِ نبی کے مرتبہ پر قائم ہو جاتا ہے اس پر واقعی یہ شراد صادق آتا ہے لا یستحسرون یسبحون اللیل والنهار لا یفترون۔

أَجْرًا يَحْتَدُّ إِلَهِتَهُمْ مِنَ الْأَرْضِ هُمْ يَنْشُرُونَ ۝

”کیا بتائے ہیں انہوں نے خدا (اہل زمین) سے جو مردوں کو زندہ کر سکتے ہیں۔“

اسم منقطع بمعنی بل ہے اور استہفام انکار کے لئے ہے، یہ سابق کلام کے نشیون سے اعراب ہے، کیونکہ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَعْلَمُونَ قُلْ لَا يَعْلَمُونَ عِلْمَ الْغَيْبِ إِلَّا اللَّهُ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا يُنذِرُكُمْ أَنَّكُمْ إِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَوْلَىٰ سَابِقٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ كَالْعَابِدِينَ قُلْ لَا يَعْلَمُونَ عِلْمَ الْغَيْبِ إِلَّا اللَّهُ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا يُنذِرُكُمْ أَنَّكُمْ إِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَوْلَىٰ سَابِقٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ كَالْعَابِدِينَ انہوں نے بہت سے خدا بنا لئے ہیں۔ من الارض۔ الہیہ کی صفت ہے یا فعل کے متعلق ہے خواہ من بظنی ہو یا ابتدائی ہو، یعنی انہوں نے جو اعراب مشابہ پتھر ہوئے، چاندی یا کسی اور چیز سے خدا گھڑ لئے ہیں۔ من الارض ذکر کرنے سے مقصود ان ترائے ہوئے بتوں کی تعمیر ہے، تخصیص مقصود نہیں ہے۔ ہم بنشرون۔ یہ بھی الہیہ کی صفت ہے، یعنی جو مردوں کو زندہ کرتے ہیں۔ اس سے مقصود کفار کی جہالت کا اظہار اور ان سے استہزاء ہے کیونکہ عبادت کا مستحق وہ ہو سکتا ہے جو مردوں کو زندہ کرنے زندوں کو مارنے اور اپنے اطاعت شعار بندوں کو انعام و اکرام سے نوازنے پر قادر ہو۔ پس جب بتوں کو الوہیت میں شریک ٹھہراتے تھے تو گویا وہ ان کے زندہ کرنے کی قدرت کا دعویٰ کرتے تھے اور یہ چیز بدانتہا باطل ہے۔ استہزاء میں مبالغہ کرنے کے لئے ضمیر زائد ذکر کی گئی ہے جو ان کے ساتھ مردوں کو زندہ کرنے کی صفت کے انحصار کا شعور رکھتی ہے۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلَٰهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝

”اگر ہوتے زمین و آسمان میں کوئی اور خدا سوائے اللہ تعالیٰ کے تو یہ دونوں برباد ہو جاتے۔ پس پاک ہے اللہ تعالیٰ جو

عرش کا رب ہے ان تمام نازیبا باتوں سے جو وہ کرتے ہیں۔“

۱۔ فیہما کی ضمیر سے مراد آسمان اور زمین ہیں اور یہاں الایمینی غیر الہیہ کی صفت سے یہاں استثناء نہیں ہے کیونکہ یہاں استثناء متصل اور استثناء منفصل دونوں مشکل ہیں کیونکہ مستثنیٰ منہ قطعاً مستثنیٰ کوشامل نہیں ہے (کیونکہ مستثنیٰ منہ سے اور کمرہ ہے اور جمع جب تکمرہ ہو تو محققین کے نزدیک اس سے استثناء نہیں ہوتی کیونکہ اس میں ایسا عموم نہیں ہوتا کہ اگر استثناء نہ ہوتا تو مستثنیٰ اس میں داخل ہوتا) (یہاں اگر الا کو حرف استثناء قرار دیا جائے تو معنی مراد کے خلاف ہو جائے گا اس لئے یہاں الا کو غیر کے معنی میں صفت قرار دیا گیا ہے) اور الا کے مالم کو وہی اعراب دیا گیا ہے جو غیر کو دیا جاتا ہے جب وہ بطور استثناء استعمال ہو۔

یعنی اگر اس زمین و آسمان میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ خدا ہوتے تو یہ زمین و آسمان برباد ہو جاتے۔ کیونکہ اگر مقصود (زمین و آسمان کے بنانے اور قائم رکھنے میں) موافقت کرتے تو تمام خداؤں کی قدرت کا تصادم لازم آتا اور اگر ایک دوسرے کی مخالفت کرتے تو یقیناً رکاوٹ پیدا ہو جاتی۔ یہ جملہ اسم منقطع کے مفہوم کی توضیح کے لئے علت ہے۔

۲۔ مسبحان مصدر ہے اور اس کا فعل ہمیشہ محذوف ہوتا ہے، یعنی اسبح اللہ سبحاناً میں اللہ کی عربیہ و نقص سے پاک بیان کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ عرشِ عظیم کا مالک ہے جو عرشِ تمام اجسام کو محیط ہے اور کائنات کی تدبیر کا عمل اور تقادیر عالم کا منشا اور سرچشمہ ہے اور اس

کی حیثیت عالم کبیر میں ایسی ہے جیسے انسان کے جسم میں دماغ کی ہے۔ یعنی میں اللہ تعالیٰ کو پاک اور مبرا بیان کرتا ہوں ان خرافات سے جو شرک کہتے ہیں کہ اس کا کوئی شریک ہے، اس کی بیوی اور فرزند ہے (لاحول ولا قوۃ الا باللہ)

لَا يَسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ ﴿٣١﴾

”نہیں پرسش کی جا سکتی اس کام کے متعلق جو وہ کرتا ہے اور ان (تمام سے) باز پرس ہوگی نہ۔“

اس کی عظمت اور شان و شوکت اتنی بلند ہے کہ اس سے کسی کام پر پرسش نہیں ہو سکتی وہ الوہیت میں منفرد ہے اور اس کی بادشاہی اور اقتدار ذاتی ہے۔ جب بھی وہ کوئی کام کرتا ہے تو اپنی ملک میں ہی اس کا تصرف ہوتا ہے اور مالک اپنی ملک میں جیسے چاہے تصرف کرے، اس پر عقل و نقل و امتزاج کی اجازت نہیں دیتے۔ باقی جو بھی آسمانوں اور زمینوں میں ہیں ان سے ان کے افعال پر باز پرس ہو گی کیونکہ وہ جو بھی کریں گے اللہ تعالیٰ کی ملک میں تصرف ہوگا اور مالک کی اجازت اور ابحاث کے بغیر تصرف جائز نہیں ہوتا۔ اس لئے ان تمام سے پوچھ گچھ ہوگی۔ ہم مسئلون کا جملہ حال ہے یا سابق کلام پر معطوف ہے اور لا یسئل کا جملہ اپنے معطوف سے مل کر سابق کلام کی علت ہے کیونکہ جو رسول ہے وہ اس کا شریک نہیں ہو سکتا جس سے کوئی پرسش نہ ہو۔

أَمِ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ قُلُوبًا مِثْلَ قُلُوبِنَا أَمْ لَا تَأْتِيكُمُ الْبُرُوقُ أَفَ تَنْظُرُونَ ﴿٣٢﴾

مَنْ قَبْلِي طِبْلٌ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ الْحَقُّ قَدْ مَعْرُوضُونَ ﴿٣٣﴾

”کیا انہوں نے بنا لئے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا اور معبود لہ (اے حبیب) آپ (انہیں) فرمائیے پیش کرو اپنی دلیل سے۔“

یہ قرآن جو نصیحت ہے میرے ساتھ والوں کے لئے اور دوسری سب جو نصیحت ہیں میرے پیشروؤں کے لئے (سب موجود ہیں ان کا کوئی حوالہ دو)۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر حق کو نہیں جانتے تھے اس لئے وہ (اس سے) منہ پھیرے ہوئے ہیں۔“

اس مشرکین کے کفر کی انتہا کو بیان کرنے اور ان کا منہ بند کرنے اور ان کی نادانی اور جہالت کے اظہار کے لئے انکار و توجیح کو دوبارہ ذکر فرمایا، یا نیز جروتوج اور انکار دوبارہ اس لئے ذکر فرمایا تاکہ ان کی عقلی دلیل کے انکار کو عقلی دلیل کے انکار کے ساتھ ملایا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا وہ ایسے خدا پاتے ہیں جو مردوں کو زندگی کی نعمت عطا کرتے ہوں کہ انہوں نے ان میں خاص الوہیت دیکھ کر انہیں خدا بنا لیا ہے یا سابق کتب میں اس کے شریک بنانے کا حکم پایا ہے کہ انہوں نے حکم کی پیروی میں اللہ بنائے ہیں۔ اس تاویل کی یہ بات تائید کرتی ہے کہ پہلی کلام پر اس حکم کو مرتب فرمایا جو عقلاء ان کے قول کے فساد پر دلالت کرتا ہے اور دوسری کلام پر اس حکم میں مرتب فرمایا جو عقلاء ان کے قول کے فساد پر دلالت کرتا ہے۔

اس کے شریک ٹھہرانے پر کوئی عقلی یا نقلی دلیل پیش کرو کیونکہ کوئی قول اور دعویٰ بغیر دلیل کے قابل قبول نہیں ہوتا۔ دلیل وہ کیسے پیش کر سکتے ہیں جبکہ ان کے قول کے فساد پر تمام عقلی اور نقلی دلائل متفق ہیں۔

اس معنی کو محض سے یاء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا، یعنی قرآن تو رات اور انجیل جو تمہارے ہاتھوں میں موجود ہیں، قیامت تک میری امت کے لئے نصیحت ہیں۔ ذِكْرُ مَنْ قَبْلِي سے مراد سابق امتوں کی نصیحت

ہے۔ عطاء، ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں۔ ذکر من معی سے مراد تورات اور انجیل ہیں، یعنی اسے عقل کے دشمنوں کتب سادہ قرآن تورات اور انجیل کی طرف رجوع کرو، کیا ان میں کہیں لکھا ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو شریک بنایا ہے یا بیٹا بنایا ہے (۱) یا اس نے کسی غیر کی عبادت کا حکم دیا ہے۔ توحید رسول کی بعثت اور کتابوں کے نزول کی صحت پر موقوف نہیں ہے۔ اس لئے نقل کے ساتھ اس کا استدلال صحیح ہے، اگر یہ کہا جائے کہ مشرکین مکہ تو کتب سادہ پر ایمان رکھتے ہی نہیں تھے خصوصاً قرآن کی تو ہر جگہ وہ مخالفت کرتے تھے تو پھر ان کے خلاف ایسی جت کو پیش کرنا کیسے صحیح ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب کتب سادہ خصوصاً قرآن کی صحت اس کے آغاز کی وجہ سے بالکل واضح ہو چکی تھی تو ان کا انکار عناد اور ہٹ دھرمی کی بناء پر تھا۔ پس ان کے انکار کا کوئی اعتبار نہیں۔ اس کو ایک مسلمہ دستاویز بنا کر پیش کیا کیونکہ نظر انصاف میں یہ مسلمہ حقیقت تھی۔

یہ ایسے آقا ہیں کہ حق و باطل میں تمیز نہیں کر سکتے حالانکہ حق کا نور ہر سو پھیلنا ہوا ہے لیکن ان دل کے اندھوں کو اس کا ٹکڑا ہوا رخ تاہاں نظری نہیں آتا۔ یہ اس نصیحت سے انصاف ہے جو ذکر من معی کی اضافت سے مفہوم ہے۔

یہ اسی وجہ سے توحید اور اتباع رسول سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِيَ إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ ۝

”اور نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول مگر یہ کہ ہم نے وہی بھیجی اس کی طرف کہ بلاشبہ نہیں ہے کوئی خدا جز میرے پس میری عبادت کیا کرو۔“

۱۔ حنفی اور حزر نے نو حسی کوئی اور حواہ کے کسرہ کے ساتھ جمع حکم کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے واحد غائب مجہول (یوحی) کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی توحید کا امر قرآن تورات اور توحید جو ان کے ہاں موجود ہیں ان میں ہی منحصر نہیں ہے بلکہ ہم نے جو بھی رسول مبعوث کیا اسے توحید کی دعوت کی وہی کی۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهُ ۗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ ۝

”وہ کہتے ہیں: بنایا ہے رحمن نے (اپنے لئے) بیٹا، سبحان اللہ (یہ کیونکر ہو سکتا ہے) بلکہ وہ تو (اس کے) معزز بندے ہیں۔“

۱۔ اس کا عطف ام اتخذوا الہیۃ من الارض کے مضمون پر ہے۔ یعنی انہوں نے اللہ کے شریک بنا لئے اور کہا کہ اللہ نے بیٹا بنایا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں۔ یہ آیت بخیر اہل کے بارے نازل ہوئی ہے کیونکہ وہ فرشتوں کو اللہ کی بنیادیں کہتے تھے (۲)۔ فرمایا اللہ تعالیٰ اولاد سے پاک ہے فرشتے تو اس کے مقربین ہیں اور اس کی مخلوق ہیں۔

لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِأَمْرِ رَبِّهِمْ لَاعْمُونَ ۝

”نہیں سبقت کرتے اس سے بات کرنے میں اور وہ اسی کے حکم پر کار بند ہیں۔“

۱۔ یعنی وہ اس کی اجازت کے بغیر بات بھی نہیں کرتے۔ اصل میں یہ لایسبق قولہم قولہ واذنہ تھا، یعنی ان کی بات اللہ کی بات سے سبقت نہیں کرتی۔ لیکن سبق کو ان کی ذوات اور اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور قول کو کمال اور آلہ بنایا ہے اس بات کا شعور دلانے کے لئے کہ سبقت جس کا یہاں ثبوت ہو رہا ہے اگر چہ وہ ان کی بات کا اللہ تعالیٰ کی بات سے سبقت لے جاتا ہے لیکن قیامت

اور شفاعت میں ان کی قوتوں کا اللہ تعالیٰ کی ذات سے سبقت لے جانے کے قائم مقام ہے اور اقتصاراً و ضمیر کے تکرار سے نپٹے کے لئے اہم کو اضافت کے قائم مقام رکھا۔

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنْ أَمَرَ تَضَىٰ وَهُمْ مِنْ
حَشِيَّتِهِمْ مُشْفِقُونَ ﴿٥٠﴾

”اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے نذر چکا ہے اور وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر اس کے لئے جسے وہ پسند فرمائے اور وہ (اس کی بے نیازی کے باعث) اس کے خوف سے ڈر ہے ہیں۔“

۱۔ جو کچھ یہ کرتے ہیں یا نہیں گئے وہ جہودان اور ہمہ میں جانتا ہے۔ یہ جملہ سابق کلام کی علت اور مابعد کے لئے جمید ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کامل کے ذریعے ان کا احاطہ کیا ہے، اس لئے اپنے انصاف کو ضبط میں رکھتے ہیں اور اپنے حالات کی تازگی کرتے ہیں۔ اس کی ہیبت کی وجہ سے وہ کسی کی سفارش نہیں کریں گے مگر جس کی سفارش وہ خود پسند فرمائے گا۔ من عباد فرماتے ہیں لمن ار ترضیٰ سے مراد لا اله الا الله کہنے والا ہے اور چاہو فرماتے ہیں جس سے اللہ راضی ہے (۱)۔

حشیتہ اس خوف کو کہتے ہیں جس میں تعظیم بھی ہو۔ اس وجہ سے شہیت کو علماء سے خاص کیا گیا ہے اور اشفاق وہ خوف ہے جس نے ساتھ اعتناء ہوتا ہے (یعنی خائف خیال کرتا ہے کہ کہیں مجھے تکلیف نہ پہنچ جائے)

وَمَنْ يَشْفُلْ مِنْهُمْ ابْنِيَّ اللَّهُ مِنْ دُونِهِ عَذَابٌ لَنْ يَصِيَّبَهُمْ كَذَلِكَ يَجْزِي الظَّالِمِينَ ﴿٥١﴾

”اور جو ان میں سے یہ کہے کہ میں خدا ہوں اللہ تعالیٰ کے سوا تو اسے ہم سزا دیں گے جنہم کی پونہی ہم سزا دیا کرتے ہیں
بظالموں کو۔“

۱۔ اگر مخلوق میں سے کوئی فرد یا فرض محال ملائکہ میں سے کوئی یہ کہے کہ میں خدا ہوں اللہ کے سوا تو ہم اسے جہنم کا بندھن بنا لیں گے اس آیت سے مقصود کسی غیر کے رب ہونے اور فرشتوں کے رب ہونے کے دعویٰ کرنے کی نفی کرنا ہے اور جس کے متعلق شرکین نے الوہیت کا دعویٰ کر رکھا تھا ان کو جہنمی اور وعیدنا کر شرکین کو جہنمی دینا ہے۔ یہ آیت کریمہ بالکل اس آیت کریمہ کی طرح ہے۔

تَنْ يَسْتَكْفِرُ التَّيْمِينَ أَنْ يَكُونَ عِبَادَ اللَّهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ الْفَرِيقُونَ ۗ وَ مَنْ يَسْتَكْفِرْ عَنْ بَيْنَاهُمْ وَ يَسْتَكْفِرْ فَمِنْهُمْ
يُنَادُوا جَبِينًا

ترجمہ: ہرگز عار نہ سمجھے گامیج (علیہ السلام) کو وہ بندہ ہو اللہ کا اور نہ ہی مقرب فرشتے (اس کو عار سمجھیں گے) اور جسے عار ہو اس کی بندگی سے اور وہ تکبر کرے تو اللہ جلد ہی جمع کرے گا ان سب کو اپنے ہاں۔

تو اللہ فرماتے ہیں اس آیت سے مراد ابلیس سے کیونکہ اس نے اپنی عبادت کی دعوت دی تھی اور اپنی اطاعت کا حکم دیا تھا (۲) وہ یا تو حقیقتاً ملائکہ سے تھا یا ان سے الحاق کی وجہ سے حکماً فرشتوں سے تھا، اس لئے فرشتوں کے ضمن میں اس کا ذکر ہوا ہے ورنہ فرشتوں میں سے اور کون نے بھی ایسی بات نہیں کی تھی۔ انہی کو نافع اور ابو عمرو نے یاء کے فتح کے ساتھ اور دوسرے قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

أُولَئِكَ يَدْعُ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا ۗ وَ

جَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ ﴿٢٠﴾

”کیا کبھی غور نہیں کیا کہ خداوند کا کرنے والوں نے کہ آسمان اور زمین آپس میں ملے ہوئے تھے پھر ہم نے الگ الگ کر دیا انہیں، اور ہم نے پیدا فرمائی پانی سے ہر زندہ چیز، کیا وہ اب بھی ایمان نہیں لاتے۔“

بلکہ ابن کثیر نے واؤ عطف کے بغیر الم پر پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے واؤ کے ساتھ پڑھا ہے۔ کائنات نہیں فرمایا کیونکہ آسمانوں کی جماعت اور زمین کی جماعت مراد ہے۔ ردفا کا معنی ابن عباس، ضحاک، عطاء اور قتادہ نے ایک چیز کا دوسری چیز سے ملا ہوا ہونا چھنا ہوا ہونا کیا ہے۔ (1)۔ الرق کا لغوی معنی بند کرنا اور ملانا ہے اور التقق کا معنی پھنسا اور کھولنا ہے۔

حضرت کعب فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تو وہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے، پھر ہوا کو پیدا فرمایا۔ اسے ان کے درمیان سے گزرا اور اس کے ذریعے انہیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا اور کھول دیا۔ مجاہد اور سدیی فرماتے ہیں۔ آسمان تمام ایک طبقہ میں جڑے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جدا جدا کر کے سات آسمان بنا دیے اور اسی طرح زمین بھی ایک طبقہ میں جڑی ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ نے کھول کر سات زمینیں بنا دیں۔ عکرمہ اور عقیقہ فرماتے ہیں۔ آسمان کا منہ بند تھا، زمین پر کوئی بارش نہیں ہوتی تھی اور نہ زمین پر کوئی چیز پیدا ہوتی تھی اللہ تعالیٰ نے آسمان کا منہ کھولا تو بارش برسنے لگی اور زمین کا منہ کھولا تو اس سے ہر قسم کی بوئیاں اور پودے اُگنے لگے۔ (2)۔ اس تاویل اور معنی کے اعتبار سے السموات سے مراد آسمان دیا ہوا گا اور پھر اس کا جمع ہونا اس کے مختلف آفاق کے اعتبار سے ہے۔ یا تمام آسمان مراد ہیں اس نظر پر کہ بارش میں تمام آسمانوں کا دخل ہے اور یہ قول اظہر ہے کیونکہ کافر اور برحق مندوب دیکھتا اور جانتا ہے کہ پہلے بارش نہیں ہوتی تھی پھر ہونے لگی پہلے زمین پر نباتات نہ تھیں پھر اُگنے لگیں تو گویا یہ ایک حادث امر ہے اور ہر حادث کے لئے ایک واجب الوجود محدث کا ہونا ضروری ہے۔ اس تاویل کے اعتبار سے رقیق اور فنیق کا معنی ظاہر ہے لیکن یہ مفہوم کہ پہلے جڑے ہوئے تھے پھر ہوا کے ذریعے ان کو علیحدہ علیحدہ کیا گیا یہ معنی کفار پر ظاہر نہیں ہے لیکن علماء سے استفسار اور کتب ہادیہ کے مطالعہ سے حاصل کر سکتے ہیں۔

جَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ اور وہ پانی، جس کو ہم نے آسمان سے اتارا تھا اس سے ہم نے زندہ چیز پیدا فرمائی اور فففسا ہما، کائنات پر معطوف ہے اور یہ آسمانوں اور زمین پر محمول ہے اس بناء پر کہا جاتا ہے کہ الرباط محذوف ہے، تقدیر عبارت یوں ہوگی وجعلنا من الماء کل شیء حی بنہما یا یہ جملہ کلام سابق کے مضمون پر معطوف ہے کیونکہ استفہام روایت کنی کے انکار کے لئے ہے جو ثبوت روایت کو مستلزم ہے اور یہ رقیق اور فنیق کے حصول کو مستلزم ہے۔ پس تقدیر یوں ہوگی حصل فنیق السموات والارض بعد رقیقہما وجعلنا من الماء کل شیء حی، یعنی آسمانوں اور زمین کے جڑے ہوئے کے بعد جدا کی اذن سے ہوئی اور ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا فرمایا۔

اگر جعل بمعنی خلق ہو (جعل بسبب) تو ظرف اس کے متعلق ہوگی اور اگر جعل بمعنی صیر ہو (یعنی جعل مرکب ہو) تو ظرف متصرف مفعول جانی ہوگی۔

اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے بہت سے ایسے پودے پیدا فرمائے ہیں جن میں زندگی پانی کی وجہ سے ہے اور ان کا پانی سے ہونا بالکل ظاہر ہے کیونکہ وہ پانی حیوان کے نطفہ کے قائم مقام ہے۔ اسی طرح بعض حیوانات جیسے کبڑے کوڑے ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے رطوبات سے پیدا کیا لیکن اکثر حیوانات جن کو اللہ تعالیٰ نے نطفہ سے پیدا فرمایا ہے۔ ان کے متعلق یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بارش کے پانی سے پیدا فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب پانی حیوان کی بقاء کے لئے ایک عظیم عنصر اور مواد ہے اور اس کی ہر حیوان کو شدید ضرورت ہے اور ہر حیوان اس سے نفع اٹھاتا ہے تو گویا اس کی تخلیق بھی اسی سے ہوئی ہے پس مجازاً یہ کہنا صحیح ہے کہ خلقنا من الماء کل شئی صحی اور صبرنا منہ یعنی ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے تخلیق کیا ہے جیسے کہا گیا ہے خلق الانسان من عجل (چونکہ انسان ہر کام کی طرف جلدی کرتا ہے) اس لئے مجازاً کہا گیا ہے کہ انسان جلدی اور عجلت کے غیر سے پیدا کیا گیا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں مضاف مقدر ہو اور تقدیر عبارت اس طرح ہو وجعلنا من الماء بقاء کل شئی صحی یعنی ہر زندہ کی بقاء ہم نے پانی کے ساتھ کر دی ہے، یعنی ہر زندہ چیز بغیر پانی کے زندہ نہیں رہ سکتی۔ اکثر مفسرین اور ابو العالیہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ ہر زندہ چیز پانی سے پیدا کی گئی ہے (1)۔ امام احمد نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر چیز پانی سے پیدا کی گئی ہے (2) میں کہتا ہوں اس کا مطلب یہ ہے کہ نطفہ سے پیدا کی گئی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاللَّهُ خَلَقَ كُلَّ دَابَّةٍ مِّن مَّاءٍ (اور اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے ہر جانور کو پانی سے) اور یہاں اس تاویل پر شی سے مراد حیوان ہے اور گل سے مراد اکثر ہے جیسا کہ اس ارشاد نبوی میں ہے كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِمْ میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے پاز پرس ہوگی اور یہ بھی جائز ہے کہ الماء سے مراد مطلق پانی ہو۔ جو حیوان کے نطفہ اور رطوبات جس سے حشرات و نباتات پیدا ہوتے ہیں سب کو شامل ہو۔ واللہ اعلم۔

مع استہام انکاری ہے اور فاعل تعجب کے لئے ہے۔ یعنی ان قطعی دلائل کو دیکھنے کے بعد بھی ایمان نہیں لاتے جو صانع کے واجب الوجود ہونے صفات کا مادہ سے متصف ہونے اور ذات و صفات میں یکتا ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ مِزَاجًا مَّوْاسِيًا أَنْ تَبْيَضَ بَهِيمٌ
يَهْتَدُونَ ①

”اور ہم نے نادریے زمین میں بڑے بڑے پہاڑ تاکہ زمین لرزتی نہ رہے ان کے ساتھ اور بنا دیں ہم نے ان پہاڑوں میں کشادہ راہیں تاکہ وہ (اپنی منزل مقصود کا) راستہ پائیں۔“

اور اسی کا مطلب ثوابت ہے اور یہ ماسا سے مشتق ہے جس کا معنی ثابت ہوتا ہے اور مراد پہاڑ ہیں (کیونکہ وہ بھی اپنی جگہ پر ثابت ہوتے ہیں) ان تمہیدہم مضاف کی تقدیر کے ساتھ یا لام علت اور لا نافیہ کے ساتھ مفعول لہ ہے اور التماس سے ان کی وجہ سے لام علت اور لا نافیہ کو حذف کیا گیا ہے۔ فیما کی ضمیر کا مرجع الارض ہے یا و اسی ہے فجاء جمع ہے فجع کی اور اس سے مراد وہ پہاڑوں کے درمیان کشادہ راستہ ہے۔ قاسوس میں اسی طرح اس کا معنی لکھا ہے (3)۔ سبلا سبیل کی جمع ہے جس کا معنی واضح راستہ ہے (4)۔

2۔ منہ اندر جلد 2 صفحہ 323 (سار)

1۔ تفسیر بخاری، جلد 4 صفحہ 237 (التاریخ)

4۔ القاسوس المخطی، جلد 2 صفحہ 1338 (الترتات العربی)

3۔ القاسوس المخطی، جلد 1 صفحہ 310 (الترتات العربی)

فجاجاً کو مقدم کیا گیا ہے حالانکہ وہ سبیل کی صفت ہے تاکہ وہ سبلا سے حال بن سکے اور اس بات پر دلالت کرے کہ جب سے اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا فرمایا ہے وہ اسی طرح کشادہ ہیں یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فجاجاً مفعول ہو اور سبلا اس سے بدل ہوتا کہ ضدنا دلالت کرے کہ اس نے انہیں تخلیق کیا اور مسافروں کے لئے کشادہ تخلیق کیا ہے، بدل کی صورت میں اس میں تاکید بھی ہوگی۔ لعلمہم یہتدون یعنی اپنے مقاصد و مصالح کو پالیں۔

وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَحْفُوظًا ۗ وَهُمْ عَنْ آيَاتِهَا مُعْوَدُونَ ﴿۳۱﴾

”اور ہم نے بنایا آسمان کو ایک چھت جو (فلکست وریخت) سے محفوظ ہے اور وہ لوگ (اب بھی) اس کی نشانیوں سے روگردانی کئے ہوئے ہیں۔“

1۔ یعنی آسمان کو ایسی چھت بنایا جو اس کی قدرت کاملہ سے بغیر ستونوں کے محفوظ ہے یا اس کی مشیت سے وقت معلوم تک گرنے اور فساد سے محفوظ ہے یا شہابوں کی وجہ سے شیطانوں کے چوری چھپے آسانی گفتگو سننے سے محفوظ ہے لیکن یہ لوگ آسمان کے احوال اور اس میں جو چاند سورج اور ستارے جو اللہ کی وحدت کمال قدرت اور حکمت بالغہ کی بین دلائل ہیں ان میں غور و فکر نہیں کرتے۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ النَّبْلَ وَاللِّهَامَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۗ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ﴿۳۲﴾

”اور وہی ہے جس نے پیدا فرمایا بیل و نہار کو اور نہر و ماہ کو سب (اپنے اپنے) مدار میں تیر رہے ہیں۔“

2۔ اس آیت میں قدرت کی بعض نشانیوں کا بیان ہے۔ فلک سے مراد ستاروں کا مدار ہے (1) اور کلام عرب میں ہر گولائی مائل چیز کو فلک کہتے ہیں، اس کی جمع افلاک ہے اسی سے فلک المعزول ہے (چرخہ کا دھڑک) حضرت حسن فرماتے ہیں فلک چرخہ کے دھڑک کی طرح ایک جگہ ہے، یعنی جس فلک میں ستارے چلتے ہیں وہ جگہ کی پڑی طرح گول ہے (2) بعض علماء فرماتے ہیں فلک سے مراد وہ آسمان ہے جس میں ستارے جڑے ہوئے ہیں اور ہر ستارہ اس آسمان میں چلتا ہے جو اس کے لئے مقرر فرمایا گیا ہے۔ یہ قیادہ کا قول ہے۔ کلمبی فرماتے ہیں الفلک سے مراد آسمان کی گولائی ہے۔ دوسرے علماء فرماتے ہیں فلک ایک موج کا نام ہے جسے اس کے طبقہ میں روک دیا گیا ہے اور وہ آسمان کے نیچے ہے، شمس و قمر اور ستارے اس میں چلتے ہیں (3) میں کہتا ہوں۔ صحیح یہ ہے کہ فلک سے مراد آسمان ہے اور اس پر تین اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک افلاک میں سے ایک فلک میں ہے اور وہ آسمان دینا ہے اگرچہ کواکب کا مدار مختلف افلاک پر ہے۔ الفلک سے مراد جس ہے جیسے عرب کہتے ہیں کسماہم الامیر حلة (بادشاہ نے سب کو ایک ایک جوڑا پہنایا) تو اسی طرح فلک سے مراد بھی یہ ہے کہ ہر ایک سیارہ اپنے اپنے فلک میں گھومتا ہے۔ یسبحون کی تفسیر کا مرجع شمس و قمر ہیں لیکن ان کے مطالع کے اعتبار سے جمع کا صیغہ استعمال فرمایا اور ایسا صیغہ استعمال فرمایا جو عقلاء کے لئے استعمال ہوتا ہے کیونکہ سباحت حقیقت میں عقلاء کا فعل ہے واللہ اعلم۔

ابن المنذر نے ابن جریج سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو اپنے وصال کی خبر دی گئی تو آپ نے عرض کی یا رَبِّ مَنْ لِأَهْتَبِي يَارَبِّ مِثْرِي امت کے لئے اب کون ہوگا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا (4)۔

2۔ تفسیر بلغوی، جلد 4، صفحہ 238 (انجاریہ)

4۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 572 (احمدیہ)

1۔ القاسمونی، الجلید، جلد 2، صفحہ 1259 (التراث العربی)

3۔ ابنیہ،

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّنْ هُمْ أَخْلَدُونَ ﴿٥٠﴾

”اور نہیں مقدر کیا ہم نے کسی انسان کے لئے جو آپ سے پہلے گزرا (اس دنیا میں) ہمیشہ رہنا تو اگر آپ انتقال فرما جائیں تو کیا یہ لوگ (بیباں) ہمیشہ رہنے والے ہیں!۔“

۱۔ خلد کا معنی بچکنی اور دنیا میں بقاء ہے دوام ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب کفار نے کہا ہم محمد (ﷺ) پر گردشِ زمانہ کا انتظار کرتے ہیں، ایک نیا مک دن ان کی زندگی کا چراغ گل ہوئی جائے گا (۱)۔ فاما قبل کے ساتھ شرط کا تعلق جوڑنے کے لئے ہے اور ہمزہ انکار کے لئے ہے اس معنی کے ثبوت کے بعد (کہ اگر آپ انتقال فرما جائیں گے تو کیا یہ ہمیشہ رہیں گے) اور یہ جملہ یعنی افان مت الخ ما جعلنا لبشر الخ کے جملہ کے مضمون پر معطوف ہے، یعنی یہ حقیقت ہے کہ آپ ہمیشہ رہنے والے نہیں ہیں پس اگر آپ کا وصال ہوگا تو کیا یہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَنَبِئْتُكُمْ بِالْآخِرِ وَآخِرُ قَسْمَةٍ وَاٰيٰتُنَا تُجَعْلُوْنَ ﴿٥١﴾

”ہر نفس موت (کا مزہ) چکھنے والا ہے اور ہم خوب آزماتے ہیں تمہیں برے اور اچھے حالات سے دوچار کر کے لے اور (آخر کار) تم سب کو ہماری طرف ہی لوٹ آنا ہے۔“

۱۔ یعنی بدن سے روح کی جدائی کا کڑوا ذائقہ ہر ذی روح نے چکھتا ہے۔ یہ جملہ و ما جعلنا لبشر من قبلک الخلد کے جملہ کے ثبوت کے لئے ہے۔ شر اور خیر سے مراد سختی، نرمی، صحت، بیماری، غمی، فقر اور ہر وہ چیز جسے انسان پسند کرتا ہے یا ناپسند کرتا ہے۔ قتل کا معنی آزمائش ہے اور یہ نبیلو کہہ کا مفعول مطلق ہے، یعنی ہم تمہیں آزمائش میں ڈالیں گے خوشحالی اور تنگ دستی کے ساتھ تاکہ ظاہر ہو جائے کہ نعمتوں کے ملنے کے بعد تم شکر کرتے ہو یا نافرمانی کرتے ہو اور خیر پسندیدہ حالات پر تم غبر کرتے ہو یا شکوئی کی زبان کھولتے ہو۔ یعنی ہم تمہارے ساتھ آزمائش کرنے والے کی طرح کامیاب کریں گے (کیونکہ اللہ تعالیٰ کو علم تو پہلے ہی ہے کہ انسان نے کیا کرتا ہے)۔ علیٰ غرہ تم نے ہماری بارگاہ میں حاضر ہونا ہے اور ہم تمہیں اپنے اعمال کے مطابق جزا اور سزا دیں گے۔ اس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ یہ قیامت کا برپا کرنا اظہار اور ثواب و عقاب عطا کرنے کے لئے ہے۔

ابن ابی حاتم نے سدی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ابو جہل اور ابوسفیان کے پاس سے گزرے، جبکہ وہ باہم محو گفتگو تھے۔ جب ابو جہل نے آپ ﷺ کو دیکھا تو جس پر اور ابوسفیان کہنے لگا۔ دیکھو یہ نبی عبد مناف سے نبی ہے ابوسفیان کو غصہ آ گیا اور کہا تم نبی عبد مناف کا نبی ہونے کو ناپسند کرتے ہو۔ نبی کریم ﷺ نے یہ ساری گفتگو سنی اور ابو جہل کی طرف متوجہ ہوئے تو اس پر خوف طاری ہو گیا اور آپ ﷺ نے فرمایا شاید تو اپنی بدزبانی سے نہیں رکے گا یہاں تک کہ تم پر بھی ایسی ہی آفت آن پڑے جو تیرے بچپا پر پڑی تھی، اس وقت یہ ذیل کی آیت نازل ہوئی (2)۔

وَ اِذَا مَرَّكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِنْ يَّتَّخِذُوْكَ اِلَّا هُزُوًا اِهْدَا الَّذِيْنَ

يَذْكُرُ الْهٰتِكُمْ ؕ وَ هُمْ يَذْكُرُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿٥١﴾

”اور جب دیکھتے ہیں آپ کو وہ جنہوں نے کفر اختیار کیا ہے تو آپ سے بس تمسخر کرنے لگتے ہیں (کہتے ہیں) کیا یہی وہ

صاحب ہیں جو (برائی سے) ذکر کیا کرتے ہیں تمہارے خداؤں کا۔ حالانکہ وہ (کفار) رحمن کے ذمے سے خود (بکسر) انکاری ہیں۔“

۱۔ ہزوا مصدر ہے اور یہ مہزوا بد کے معنی میں ہے۔ اھذا یذکر الھتکم ان یخذونک الازھوا کا بیان ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح بنے گی بقولون اھذا الذی یذکر الھتکم بسوء۔ قرآن میں مطلق ذکر کرنے کو بیان فرمایا بسوء ذکر نہیں کیا کیونکہ دلائل حال سے یہ چیز عیاں ہے کیونکہ دشمن کا ذکر خیر سے نہیں، برائی سے ہی کیا جاتا ہے اور محبوب کا ذکر ہمیشہ خیر سے کیا جاتا ہے۔

۲۔ ذکر الرحمن سے مراد تو حیدر باری تعالیٰ یا تعظیم الہی ہے یا رسول مبعوث فرما کر مخلوق کو رہنمائی کرنا ہے عبادتوں کا نازل کرنا ہے یا قرآن تکمیل ہے۔ یعنی وہ بد بخت اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور توحید کے منکر ہیں یا جو اس کریم نے اپنی رحمت و کرم فواری سے مخلوق کی رہنمائی کے لئے رسولوں کا سلسلہ شروع فرمایا یا کتابوں کو نازل فرمایا یا قرآن جیسی پاکیزہ کتاب عطا فرمائی۔ ان تمام نعمتوں کے وہ منکر ہیں۔ وہ نادان کہتے ہیں لا رحمن الا رحمن الیھمامہ یعنی رحمن پروردگار کے سوا کوئی رحمن نہیں ہے اس سے ان کی مراد سید کذاب ہوتا تھا۔ پس یہ زیادہ حق دار ہیں کہ ان کا استہزاء کیا جائے جو اپنے مالک و خالق کی نعمتوں کو بھی نہیں پہچانتے۔ ہم شہیر کا حکم رات کیہ یا تمہیں کے لئے ہے یا مبتدا اور خبر کے درمیان خبر کے معمول کے فاصلہ کے وقوع کی وجہ سے ہے۔

حُفِّقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ۗ سَأُورِيكُمُ الْآيَاتِ ۚ فَلَا تَسْتَعْجِلُونِ ﴿۳۰﴾

”انسان کی سرشت میں ہی جلد بازی ہے۔ اس میں ظفریب تمہیں (خود ہی) اپنی نشانیاں دکھاؤں گا جو تم مجھ سے جلدی کا مطالبہ نہ کرو۔“

۱۔ جب کسی شخص میں کثرت سے کوئی وصف پایا جائے تو عرب کہتے ہیں خلق منہ۔ وہ اس سے پیدا کیا گیا ہے۔ اسی طرح کہتے ہیں خلقت من تعب۔ خلقت من غضب و خلق غلان من الکوم (یعنی تیری طبیعت میں آکتابت ہے؟ تیری سرشت میں غصہ ہے، کرم و سخاوت اس کی فطرت ہے) مبالغہ کے لئے طبع کو مطبوع کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔

سعید بن جبیر اور سعدی کہتے ہیں جب آدم علیہ السلام کے سر اور آنکھوں میں روح داخل ہوئی تو آپ نے جنت کے پھلوں کی طرف دیکھا پھر جب روح بیٹھ میں پہنچی تو آپ کو کھانے کا شوق ہوا۔ آپ نے جنت کے پھلوں کی طرف جلدی کی حالانکہ ابھی تک روح ناگوں میں داخل بھی نہیں ہوئی تھی، اسی وجہ سے گر گئے۔ اسی وجہ سے کہا گیا خلق الانسان من عجل۔ یہاں انسان سے مراد آدم علیہ السلام ہیں۔ آپ کی اولاد میں جلت موروثی ہے جو آپ کی طرف سے ورثہ میں ملی ہے (۱)۔ انسان اسی وجہ سے کفر کی طرف لپکتا ہے اور جلدی عذاب کا مطالبہ کرتا ہے۔ میں کہتا ہوں صوفیاء کے قول کے مطابق تعمیر ہو سکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ تمام عالم اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات کا پرتو اور عکس ہے اور تمام مخلوقات کے تعینات کا مبداء اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات مختلف ہیں۔ جیسا کہ الصبور (بہت زیادہ صبر کرنے والے) اس کے اسماء حسنی سے ہے۔ اسی طرح سرب الخسب (جلدی حساب لینے والا ہے) بھی اس کے اسماء حسنی میں سے ہے۔ پس استحقاق جو اللہ تعالیٰ کی صفات سے ہے اور یہ انسان کی صفت جلت کا بھی مبداء تعین ہے۔ اس وجہ سے انسان کی سرشت اور فطرت میں جلت ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ جلد بازی اللہ کی صفات سے ہے تو پھر یہ محمود اور اچھی چیز ہوگی لیکن آیت کریمہ کا سابق اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ مذموم چیز ہے۔ دوسرا یہ کہ جب غلت انسان کی فطرت کا حصہ ہے تو پھر اسے اس سے روکا کیوں جاتا ہے کیونکہ نجر اور فطرت کا ترک انسان کی قدرت میں ہی نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نفس کی غلت کوئی مذموم اور قبیح چیز نہیں ہے بلکہ اس میں افراط اور بے موقع غلت ناپسندیدہ اور مذموم ہے جیسا کہ قرآن نے انبیاء کرامؑ کی اسی صفت پر مدحت و تعریف کی ہے کہ یُسَبِّحُونَ بِهَا اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ وَ هُمْ لَهَا سَمِعُونَ اور اس کا منوع پھلو افراط ہے اور بے موقع غلت ہے اور اس کو ترک کرنا انسان کے بس میں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جلدی سے تخلیق کیا کیونکہ اس کی تخلیق جمعہ کے دن ہر چیز کے بعد فرمائی اور سورج کے غروب ہونے سے پہلے اس کی تخلیق کو جلدی جلدی مکمل فرمایا۔ مجاہد فرماتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے روح کو اس کے سر میں پھونکا تو آدم علیہ السلام نے عرض کی یارب سورج کے غروب ہونے سے پہلے میری تخلیق جلدی جلدی مکمل فرما دے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو جلدی میں پیدا کیا گیا۔ ایسا نہیں کہ دوسرے انسانوں کی طرح ترتیب وار پہلے نطفہ پھر علقہ پھر مضغ بنا کر پیدا کیا گیا ہو۔ ایک قوم کا خیال ہے کہ عقل کا معنی مٹی ہے یعنی انسان کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے (1) جیسا کہ ایک شاعر نے عقل بمعنی گیلی مٹی استعمال کیا ہے۔

وَالنَّبْعُ فِي الشَّجَرَةِ الصَّمَاءِ مُنْقَطَةٌ وَالنَّعْلُ تَنْبُثُ مِنَ الْمَاءِ وَالغَجَلُ (2)

نبخ چٹانوں اور پتھروں میں اگتا ہے جبکہ کھجور پانی اور مٹی سے اگتی ہے
قاموس میں بھی العجل کا معنی مٹی لکھا ہوا ہے (3)۔ یہ جملہ ان کے قول معنی هذا الوعد (قیامت کب آئے گی) پر اعتراض اور طعن کی تمہید ہے۔

۱۔ میں بدر کے موقع پر اپنی قدرت کی نشانیاں (انتقامی کارروائی) دکھاؤں گا اور آخرت میں دوزخ کے عذاب کا مشاہدہ کراؤں گا مقررہ وقت سے پہلے اس کے آنے کا مطالبہ نہ کرو۔ فلا تستعجلون پر فاء سببیہ ہے اور ساوریکم پر معطوف ہے۔ یہ دوسرا جملہ مترضہ ہے جو ان شریکین کے عذاب کو بعید سمجھنے اور مدعا جلدی طلب کرنے کے رد میں ذکر کیا گیا ہے۔ وہ بد بخت کہتے فَاظْطُرُّ عَلَيْنَا جَعَلْنَا لِقَوْمِ الشَّاكِرِہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسائے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں یہ نظر بن الحارث کے حق میں نازل ہوئی جب اس نے جلدی عذاب کو طلب کیا تھا۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٣٠﴾

”اور وہ کہتے ہیں کب پورا ہوگا یہ (قیامت کا) وعدہ؟ (بتاؤ نا) اگر تم سچے ہو۔“

۱۔ یہ جملہ اذراک الذین تکفروا الخ کے جملہ شرطیہ پر معطوف ہے یا يقولون پر معطوف ہے جو اھذا الذی یدکر الھتکم سے پہلے مقدر ہے۔ ان کتم صادقین شرط ہے اور اس کی جزا سابقہ کلام کی دلالت کی وجہ سے ذکر نہیں کی گئی۔

لَوْ يَعْلَمُ الَّذِينَ كَفَرُوا حِينًا لَا يَكْفُونُ عَنْ وُجُوهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُورِهِمْ وَلَا هُمْ يُبْصَرُونَ ﴿٣١﴾

”کاش جانتے کفار (اس وقت کو) جب وہ نہروک تکیں گے اپنے چہروں سے آگ (کے شعاعوں) کو اور ناپنی ہشٹوں سے اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔“

۱۔ لو کا جواب محذوف ہے اور حین 'یعلم' کا مفعول یہ ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ کاش کافر اس وقت کو جانتے جب آگ کا عذاب ہر طرف سے انہیں گھیر لے گا اور وہ اس سے دفاع کرنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں گے اور کوئی دوسرا بھی ان کو اس عذاب سے بچانے کے لئے مدد نہیں کرے گا کیونکہ وہ فخر پر اڑے رہے تھے اور بعض علماء فرماتے ہیں۔ 'یعلم' کا مفعول متردک ہے اور حین فعل مقدر کی طرف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی 'لو کان لہم علم لما استعجلوا یعلمون ما ہم علیہ حین لا یکفون۔' اُمران (نادانوں کو) علم ہوتا تو عذاب کا جلدی مطالبہ نہ کرتے اور اپنے عقیدہ کے بظان کو جان لیں گے جب نہروک تکیں گے آگ کے عذاب کو۔ اس صورت میں یہ دو جملے ہوں گے۔ میں کہتا ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ 'یعلم' کا مفعول مقدر ہو یا حین فعل مقدر کی طرف ہو اور تقدیر عبارت اس طرح ہو 'لو یعلم الذین کفروا ما یبزل بہم حین لا یکفون عن وجوہہم النار' یعنی اگر کافر جان لینے کہ ان پر عذاب نازل ہوگا اور یہ اس سے اپنا دفاع بھی نہ کر سکیں گے تو یہ عذاب کی جلدی نہ بچاتے اور یہ نہ کہتے کہ قیامت کب آئے گی۔

بَلْ تَأْتِيهِمْ بَعَثَةٌ فَبُذِرُوا فَلَا يَسْتَظِئُونَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿۱۰﴾

”بلکہ وہ آئے گی ان کے پاس تا کہاں بڑھو اس کر سے گی پھر وہ نہ اسے رد کر سکیں گے اور نہ ہی انہیں مزید مہلت دی جائے گی۔“

۱۔ قاتی میں ضمیر کا مرجع آگ یا وعدہ یا الحین ہے۔ مؤنث کا سینہ اس لئے ذکر فرمایا کہ الوعد بمعنی العدة ہے اور الحین بمعنی السانہ ہے اور یہ جملہ معنی هذا الوعد کے جملہ کے ضمن میں جو استجاز ہے اس سے اضراب ہے یا لویعلم الذین کفروا کے جملہ کے مضمون سے اضراب ہے۔ بعثۃ کا معنی فجئۃ (اچانک) ہے اور یہ مصدر بیت یا حال کی بناء پر مفعول ہے یعنی دنیا میں انہیں مہلت دی گئی ہے لیکن آخرت میں انہیں کوئی مہلت نہیں دی جائے گی۔ ولاہم یبصرون اور ولاہم یبظرون میں مستدال کو مستند پر مقدم کیا گیا ہے تاکہ اس حکم کے کفار کے ساتھ خاص ہونے پر دلیل ہو جائے اور یہ بھی اس میں شور مچاتا ہے کہ گناہگار مومنین کی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ملائکہ اور نیک صالح لوگ شفیع بن کر مدد کریں گے ان کو مہلت بھی ہوگی اور ان کی بخشش بھی ہو جائے گی۔

وَلَقَدْ اسْتَهْرَبُوا بِرُسُلِهِمْ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴿۱۱﴾

”اور جب تک مذاق اڑایا گیا ان رسولوں کا بھی جو آپ سے پہلے تشریف لائے تھے پس نازل ہوا ان لوگوں پر جو تمسخر کیا کرتے تھے ان میں سے وہ عذاب جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔“

۱۔ اس کلام کا عطف و اذراک الذین کفروا الخ پر ہے اور لام محذوف قسم کا جواب ہے نیز اس ارشاد میں نبی کریم ﷺ کو تسلیم دی گئی ہے اور دین اور داعی دین سے تمسخر کرنے والوں کو وہ عید سنائی گئی ہے۔ جو لوگ استهزء کرتے ہیں انہیں اس استهزاء کی جزاء ضرور ملے گی۔

قُلْ مَنْ يَكْفُرْكُمْ بِأَيْدِيهِمْ وَاللِّهَامِ مِنَ الرَّحْمَنِ ۗ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ
رَبِّهِمْ مُعْرِضُونَ ﴿٦١﴾

”آپ پوچھئے (اے مکروہ!) کون ہے جو تمہاری رات بھر اور دن بھر خدا کے رحمن سے (اگر وہ تمہیں عذاب دینا چاہے) مگر (ان سے کیا پوچھنا) یہ تو اپنے رب کے ذکر سے ہی روگرداں ہیں۔“

اس ارشاد میں سوال کے حکم سے اضطراب ہے، یعنی اے پیارے حبیب انہیں رحمن کی یاد دلائیے اور اس کے عذاب سے انہیں ڈرائیے پھر فرمایا ان سے سوال کیا کرتا ہے؟ یہ تو قرآن کی اثر آفریں آیات اور اللہ تعالیٰ کے مواعظ و نصائح سے بالکل غافل ہیں، انہیں تمہارا وعظ و نصیحت کرنا کچھ مفید نہیں ہوگا یا یہ معنی کہ یہ عقل کے بیماری بلکہ عقل کے دشمن رحمن کو خاطر میں ہی نہیں لاتے چہ جائیکہ یہ اس کے عذاب سے ڈریں۔

أَمْ لَهُمُ الْهَيْهَاتَ سَمْعُهُمْ مِمَّنْ دُونِنَا ۗ لَا يَسْتَعِيبُونَ نَصْرَ أَنفُسِهِمْ وَلَا هُمْ
مَتَّاعًا يُصْحَبُونَ ﴿٦٢﴾

”کیا ان کے اور خدا میں جو بچا سکتے ہیں انہیں (عذاب سے) ہمارے سوا وہ جھوٹے معبود تو خود اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے اور نہ انہیں ہماری تائید میسر ہوگی۔“

تمتعہم الہیہ کی صفت اول ہے اور من دوننا صفت ثانی ہے، یہ بھی سوال کے امر سے اضطراب ہے کیونکہ اعراض کرنے والے سے سوال بعید ہے اور اس کے غلط عقیدہ کی وجہ سے سوال کرتا مزید عجیب ہے۔ استنبہام یہاں ان کے عقائد کے انکار کے لئے ہے۔ یعنی جس طرح یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ بت عذاب سے بچائیں گے یہ درست نہیں ہے یہ تو اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے، ان سے اگر ایک ٹھہسی بھی کوئی چیز چھین کر لے جائے تو اس سے وہ حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ لا یستعیبون کا جملہ انکار کی تعلیل ہے۔ ولا ہم منا یصحبون کا عطف لا یستعیبون پر ہے، یعنی ان کافروں کے تراشے ہوئے بتوں کو ہماری کوئی تائید اور نصرت حاصل نہ ہوگی جیسا کہ انبیاء مٹا کر اور اولیاء کرام جو گنہگار مومنین کی شفاعت کریں گے انہیں تائید الہی اور نصرت بانی حاصل ہوگی۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ وہ ہم سے محفوظ نہ ہوں گے (1)۔ مطلب یہ ہے کہ عذاب ان کے جھوٹے خداؤں پر ہی ہوگا۔ اسی طرح قرآن حکیم کی دوسری آیت ہے إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ۗ عَظِيمٌ فرماتے ہیں یصحبون کا معنی یہ ہے کہ وہ ہمارے پڑوس میں نہ ہوگا۔ مجاہد فرماتے ہیں ان کی مدد نہ کی جائے گی۔ تمنا وہ فرماتے ہیں انہیں شفاعت اور کسی کو مدد کرنے کی اجازت کے ساتھ تائید نہیں ملے گی (2)۔ یہ معنی پہلے معنی کے مطابق ہے اور تیسرا اور چوتھا معنی دوسرے معنی کے مطابق ہے۔

بَلْ مَتَّعْنَا هَؤُلَاءِ وَآبَاءَهُمْ حَتَّىٰ طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۗ أَفَلَا يَرَوْنَ أَنَّ
نَاتِي الْأَرْضَ نَقُصًّا مِنْ أَمْرِهَا ۗ فَتُفْجَرُ السُّيُوفُ ۗ فَتَكُونُ أَقْلًا ﴿٦٣﴾

”بلکہ ہم نے (عیش و آرام کا) سامان دیا انہیں اور ان کے آباؤ اجداد کو حتیٰ کہ (اسی عیش و آرام میں) ان پر لمبا عرصہ گزر

گیا (اور وہ سرکش ہو گئے)۔ کیا ہے وہ ملاحظہ نہیں کر رہے کہ ہم زمین (کی وسعتوں) کو گھٹاتے چلے جا رہے ہیں اس کی (چاروں) سمتوں سے کیا وہ (ہماری تقدیر پر) غالب آ سکتے ہیں۔“

اس آیت کریمہ میں ان کے اس غلط نظریہ سے اضطراب ہے کہ ہمارے بت ہمارے محافظ ہیں اور ان کو اس اپنی حفاظت کا تصور اس بناء پر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے عذاب الیم تک آہستہ آہستہ پہنچانے کے لئے انہیں مہلت دی تھی اور ان کو عمر کے ایک مخصوص وقت میں نعمتوں سے لطف اندوز کیا تھا۔ نیز یہ اعراض ہے ان کے اس عقیدہ کے بطان سے کہ ہمیں جو اللہ تعالیٰ نے یہ عزت و ناموسری عطا فرمائی ہے یہ ہمارے ذاتی کمال کی بناء پر ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عذاب میں غرق کرنے کے لئے مہلت دی تھی لیکن وہ یہ خیال کرنے لگے کہ یہ نعمتیں اور سکون ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گے حالانکہ ایسا نہیں ہے آیت کا آئندہ حصہ اس کی تائید کرتا ہے کہ یہ ان کی جھوٹی امیدیں ہیں۔

یہ ہمزہ انکاری ہے اور فاعل مخدوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی الا یظنرون فلا یرون بالابصار۔ یا یہ تقدیر ہوگی الا یظنکون فلا یعلمون۔

یہ الا درض سے مراد کفار کی زمین ہے، یعنی ہم ان کی زمین پر مسلمانوں کو تسلط اور غلبہ دے رہے ہیں، کیا اب بھی یہ لوگ اللہ کے رسول اور مومنین پر غالب آئیں گے افہم میں بھی ہمزہ انکار کے لئے ہے اور فاعل قاتی پر عطف کے لئے ہے، یعنی یہ ہوی نہیں سکتا کہ یہ مشرک رسول اللہ اور مومنین پر غالب آجائیں۔

قُلْ إِنَّمَا أُنذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۗ وَلَا يَسْمَعُ الدُّعَاءَ إِذَا مَا يُنَادُونَ ﴿٣٠﴾

”آپ فرمائیے میں تمہیں ڈراتا ہوں صرف وحی سے، اور تمہیں سنا کرتے بہرے پکارنے کو، جب انہیں (عذاب الیم سے) ڈرایا جاتا ہے۔“

یہ جملہ ان کو جلدی عذاب طلب کرنے کی نبی اور اس کو بعید نہ سمجھنے کے ثبوت کے لئے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ عذاب کی دھمکی میں تمہیں اپنی طرف سے نہیں دے رہا بلکہ یہ ظہیم و خبیر ذات کی طرف سے ہے جو مجھ پر وہی نازل ہوتی ہے وہی تمہیں سنا تا ہوں اور یہ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کی اخبار میں تخلف اور کذب کا احتمال نہیں ہے، اس لئے اس عذاب کو بعید نہ سمجھو اور اس کے لئے جلدی نہ چاؤ۔

ابن عامر نے باب افعال سے لا تسمع مخاطب معروف کا صیغہ پڑھا ہے اور الیم کو منصوب پڑھا ہے اور یہ خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے، جبکہ باقی قراء نے فعل مجرد سے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور الیم کو نائب فاعل کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے۔ یہ جملہ فعل کے فاعل سے یا مخدوف سے حال ہے۔ الیم پر لام عہدی ہے، یعنی آپ استہزا کرنے والے اور جلدی عذاب طلب کرنے والے کفار سے کہہ دیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے عمیر کی جگہ الیم استعمال فرمایا ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ وہ لوگ حق کی آواز سننے اور اس سے نفع حاصل کرنے میں بالکل بہرے ہیں۔

ح اذا ما الخ صحیح کی ظرف ہے یا الدعاء کی ظرف ہے اور یہ قید اس لئے لگائی ہے کیونکہ کلام اس انداز میں ہو رہی تھی۔ دوسری وجہ اس تھلید کی ان کے بہرے پن اور ان کے اکثرین میں مبالغہ کا اظہار ہے۔

وَلَئِنْ مَسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيُقُولنَّ يَأْتِينَنَا إِنَّا كُنَّا

ظَلَمِيْنَ ۝

”اور اگر (صرف) چھو جائے انہیں ایک جھونکا تیرے رب کے عذاب کا تو (سارا نشہ ہرن ہو جائے) یوں کہتے ہیں لیکن صد حیف! بیگ بہم ہی ظالم تھے۔“

۱۔ یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ حضرت ابن عباس نے نفعۃ کا معنی طرف فرمایا ہے، یعنی پلک جھپکنے کی دیر۔ اور بعض فرماتے ہیں قلیل ابن جریج نے اس کا معنی نصیب کیا ہے جیسا کہ عرب کہتے ہیں نفع فلان لفلان من مالہ یعنی فلاں نے فلاں کو اپنے مال سے حصہ عطا کیا۔ بعض نے نفعۃ کا معنی ضربہ کیا ہے اور اس صورت میں یہ نفعۃ الدبابة ہو چلا (۱) (چوپائے نے پاؤں مارا) الخ کا اصل معنی پاکیزہ خوشبو کا مہکتا ہے۔ اس میں کئی اعتبار سے مبالغہ ہے۔ جس کا ذکر فرمایا اور پھر نفعۃ ذکر فرمایا جس میں قلت کا معنی ہے اور فعل کا وزن استعمال فرمایا جو وحدت پر دلالت کرتا ہے۔

یعنی اگر ایک لمحہ کے لئے بھی اللہ کا ان پر عذاب آ جائے تو یہ خود ہی اپنی زبانوں سے اعتراف جرم کرنے لگیں اور اپنے شرکیہ کرتو کوئی پر اظہار ندامت کرنے لگیں لیکن جب ایسا ہوگا تو اس وقت ندامت سے کف انہوں ملنا اور آسو بہانا کچھ مفید نہ ہوگا۔

و نَصَّ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَمُوزَ الْقَبِيْلَةَ فَلَا تَظْلَمُ نَفْسٌ سِنِيًّا وَاِنْ

كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَاِنْ كُنَّا حَسِيْبِيْنَ ۝

”اور ہم رکھ دیں صحیح تولنے والے ترازو قیامت کے دن ۱۔ پس ظلم نہ کیا جائے گا کسی پر ذرہ بھر اور اگر (کسی کا کوئی عمل) رائی کے دانہ کے برابر بھی ہوگا تو ہم اسے بھی لا حاضر کریں گے ۲۔ اور ہم کافی ہیں حساب کرنے والے ۳۔“

۱۔ قسط یا تو ذوات القسط کے مفہوم میں ہو کر صفت ہے یا مصدر ہے اور مبالغہ کے لئے بطور صفت استعمال ہوا ہے اور موصوف کے جمع اور صفت کے مفرد ہونے کا اشکال پیش نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ مصدر ہے اور مصدر جب صفت واقع ہو تو واحد جمع سب کے لئے استعمال ہوتا ہے، یعنی ہم میزان رکھیں گے قیامت کے روز جزا دینے کے لئے یا قیامت کے دن حاضر لوگوں کے لئے یا لام اس میں فی کے معنی میں تو قیامت کے لئے ہے جیسے اس مثال میں ہے جَنَّتْ لِبَعْضٍ مِّنْ خَلْقٍ مِّنَ الشُّعُوْبِ (اس مثال میں لام وقت کے لئے استعمال ہوا ہے) اور معنی کے اعتبار سے تفسیل کے لئے ہے اور مضاف محذوف ہے۔ بعض مبالغہ فرماتے ہیں یہ میزان رکھنا بطور تشبہ استعمال ہوا ہے، چھینتا کوئی ترازو اور میزان نہ ہوگا یہ صرف حساب کے درست ہونے اور اعمال کے مطابق جزا ملنے کے لئے مجاز استعمال ہوا ہے۔ اہل سنت و جماعت کے علماء کے نزدیک یہ تاویل قابل قبول نہیں ہے۔ یہ بدعتی لوگوں کا قول ہے۔ صحیح ہے کہ میزان اور حق تعالیٰ میں ہوگا۔

ابن المبارک نے الزہد میں، الاجری نے الشریعہ میں حضرت سلمان سے موقوفہ اور ابوالشیخ ابن حبان نے اپنی تفسیر میں کبھی کے طریق سے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ میزان کی ایک زبان (سوئی) اور دو چلڑے ہیں۔ ابن مردودہ نے اپنی تفسیر میں حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے، فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین کی مثل میزان کے دو چلڑے بنائے ہیں۔ یہ سنی ہے ابن عمر بن عمر بن خطاب کے سلسلہ سے حدیث جبریل نقل کی ہے کہ جبریل نے ایمان کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا ایمان یہ ہے کہ تو اللہ ﷻ کا کلمہ رسل پر ایمان لائے اور جنت اور جہنم اور میزان پر ایمان لائے اور مرنے کے بعد

انھنے اور خیر و شر کی تقذیر پر ایمان لائے۔ پوچھا حضور اگر میں ایسا کروں تو میں مؤمن ہوں گا۔ فرمایا ہاں۔ پھر جبریل نے خود ہی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ آپ نے سچ فرمایا (1)۔

حاکم نے المہر رک میں مسلم کی شرط پر مسلمان سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز میزان رکھا جائے گا اور اگر اس میں آسمانوں اور زمینوں کا وزن کیا جائے تو بھی اس میں گنجائش ہے (2)۔ امام ترمذی اور بیہقی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی حضور! قیامت کے دن میری شفاعت فرماتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں شفاعت کروں گا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں آپ کو کہاں تلاش کروں؟ فرمایا سب سے پہلے تو مجھے بل صراط پر تلاش کرنا۔ میں نے عرض کی حضور! اگر آپ وہاں نہ ملے تو پھر۔ فرمایا اگر میں بل صراط پر نہ ملوں تو پھر مجھے میزان کے پاس تلاش کرنا۔ میں نے عرض کی حضور! اگر آپ وہاں بھی نہ ملیں تو پھر۔ فرمایا پھر مجھے حوض کوثر پر تلاش کرنا۔ میں ان تین مقامات میں سے کسی ایک پر ضرور ہوں گا (3)۔

الحاکم بیہقی اور اچری نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے، فرماتی ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ! تم لوگ قیامت کے روز اپنے اہل کو یاد کرو گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا تین مقامات پر کوئی کسی کو یاد نہیں کرے گا (4)۔

(i) جہاں میزان رکھا ہوگا حتیٰ کہ انسان اپنے میزان کا بھاری ہونا یا ہلکا ہونا یاد کیے نہ لے۔

(ii) جہاں نامہ اعمال اڑ رہے ہوں گے حتیٰ کہ انسان جان لے کہ اس کا نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں آتا ہے یا بائیں ہاتھ میں یا پیٹھ کے پیچھے۔

(iii) جہاں بل صراط ہوگا حتیٰ کہ انسان جان لے گا کہ کامیاب ہوتا ہے یا نہیں۔ میزان کے متعلق بہت سی احادیث وارد ہیں بعض ہم نے سورۃ القارعہ میں ضمن نقلت کی تفسیر میں ذکر کی ہیں۔ امام لغوی فرماتے ہیں داؤد علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے میزان دکھانے کے متعلق سوال کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر پلڑا مشرق و مغرب کے درمیان دکھایا تو داؤد علیہ السلام پر غشی طاری ہوگئی۔ پھر جب افاقہ ہوا تو عرض کی اے اللہ! کون اس ترازو کو نیکیوں سے بھرے گا۔ فرمایا اسے داؤد جب تک اپنے کسی بندے پر راضی ہوں گا تو میں اسے ایک چھوڑے سے بھر دوں گا۔ (5)

یہاں موازین ذکر فرمایا ہے۔ علامہ نسفی بحر الکلام میں اس کی وجوہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ 1۔ ہر انسان کے لئے علیحدہ میزان ہوگا۔ 2۔ جامع ذکر فرمایا ہے لیکن مراد واحد ہے اور یہ میزان کی عظمت اور بڑائی پر دلالت کرنے کے لئے ایسا کیا گیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَتَأْتِيهِمُ الْمَوَالِكُ حَمْدًا لِّمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ۔ اسی طرح فرمایا يَا أَيُّهَا الْمُسْلِمُونَ كَلِمَاتٍ أَوْ بَشِيرٍ أَوْ نَذِيرٍ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میزان کے ہر جز کو میزان شمار کرتے ہوئے مجموعہ پر جمع کا اطلاق فرمایا۔ جیسے سراویل (سلوار) سرولہ کی جمع ہے، اس میں بھی ہر جز کا اعتبار کر کے مجموعہ پر جمع کا اطلاق کیا گیا ہے۔

یعنی بغیر کسی سبب کے نیکیوں میں کمی نہیں کی جائے گی اور بغیر کسی سبب برائیوں میں اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ متقال مصدر سہمی ہے۔ نافع نے متقال کوکان کا فاعل بناتے ہوئے مرفوع پڑھا ہے اور کان کو تامہ بنایا ہے اور باقی قراء نے کان کو ناقصہ بناتے ہوئے متقال کو خبر کی حیثیت سے منصوب پڑھا ہے اور کان کا اسم ضمیر کو بنایا ہے جو اس عمل کی طرف راجع ہے جو موازین سے مفہوم ہے۔ ان کان

1۔ شعب الایمان، جلد 1، صفحہ 257 (المعلی) 2۔ مستدرک حاکم، 6739: (المعلی) 3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 66 (مذارت تعلیم) 4۔ مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 486 (قدیمی) 5۔ تفسیر لغوی، جلد 4، صفحہ 240 (التجاریہ)

مشتاق حبة من خرد دل شرط ہے اور معطوف مخذوف ہے اور آئینا بھاڑا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی۔ ان کان العمل مشتاق حبة من خرد دل یعنی اصغر صغیراً و کبیراً آئینا بھا (یعنی چھوٹے سے چھوٹے یا بڑے سے بڑے عمل کو ہم لے آئیں گے) یہ بھی ہو سکتا ہے ان متصل ہو۔ مطلب یہ ہوگا کہ کسی کا کچھ حق ضائع نہ کیا جائے گا اگر چہ وہ حق رائی کے دانہ کے برابر بھی ہوگا۔ اس صورت میں آئینا بھا کا جملہ ظلم کی نفی کے بیان کے لئے مستانہ ہوگا اور ضمیر کا مرجع مشتاق ہوگا اور اس کے مؤنث ہونے کی وجہ حبة کی طرف اضافت ہے۔

ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے روایت فرمایا ہے کہ قیامت کے روز لوگوں کا حساب ہوگا جس کی نیکیوں اور برائیوں کے موازنہ کے وقت ایک نیکی بھی زیادہ ہوگی تو وہ جنت میں جائے گا اور جس کی ایک برائی بھی نیکیوں سے زیادہ ہوگی تو وہ دوزخ میں جائے گا اور فرمایا ایک رائی کے دانہ کے برابر نیکی کے ساتھ میزان ہلکا اور بھاری ہوگا اور جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں گی وہ اعراف میں ہوں گے اور وہ پل صراط پر کھڑے ہوں گے۔

اس کلمہ بنا میں باء زائدہ ہے اور ضمیر شکم فاعل ہے اور فاعل صلی وجہ سے ایسا جائز ہے حسابین تیسرا یا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ حسابین کا معنی سدنی نے محصین لیا ہے، یعنی شمار کرنے والے اور حسب کا معنی القدر ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں عالمین کا ظنن (ہم جاننے والے اور یاد کرنے والے ہیں) کیونکہ جو کسی چیز کا حساب کرتا ہے وہ اس کو جانتا بھی ہے اور اس کو یاد بھی کرتا ہے (۱)۔ اللہ تعالیٰ کافی ہے حساب کرنے والا کیونکہ اس کے علم اور عدل سے کسی کو علم و عدل زیادہ نہیں۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ وَ هَارُونَ الْفُرْقَانَ وَ ضِيَاءً وَ ذِكْرًا لِّلْمُتَّقِينَ ﴿۱۰﴾

”اور یقیناً ہم نے عطا فرمایا موسیٰ اور ہارون (سبھا السلام) کو فرقان اور روشنی اور ذکر پر ہیزگاروں کے لئے۔“

۱۰ فرقان سے مراد وہ کتاب ہے جس نے حق و باطل کے درمیان خط امتیاز کھینچ دیا یعنی نورانیت۔ اور ضیاء پر توین تقسیم کے لئے ہے اور اس سے مراد وہ چیز ہے جس کے ذریعے جہالت اور تہمت کی تیرگیوں میں روشنی حاصل کی جائے۔ ذکراً للمتقین یعنی اس سے متقین نصیحت حاصل کرتے ہیں یا یہ معنی کہ اس میں متقین کے لئے ضرورت کے تمام شرعی احکام ہیں۔

ابن زید فرماتے ہیں فرقان سے مراد روشنیوں پر نصرت و فتح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یوم بدر کو یوم فرقان فرمایا۔ بعض علماء فرماتے ہیں فرقان سے مراد سند کا پھینکا اور ارضیاء اور ذکر سے مراد تورات ہے یا ذکر سے مراد وحی غیر متلو ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوتی تھی اور اس کے ذریعے آپ بنی اسرائیل کو چند نصائح فرماتے تھے۔

الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ وَ هُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُونَ ﴿۱۱﴾

”جو ڈرتے رہتے ہیں اپنے رب سے بن دیکھے نیز وہ قیامت سے بھی ترسا رہتے ہیں۔“

۱۱۔ اسم موصول متقین کی صفت ہے یا مدح کی وجہ سے منصوب ہے یا مرفوع ہے بالغیب فاعل یا مفعول سے حال ہے۔ وہم من الساعة مشفقون میں ضمیر کا ذکر کرنا اور اس پر حکم کو مرتب کرنا مبالغہ اور تعریض کے لئے ہے اور یہ پورا جملہ صلہ پر عطف یا حال ہے۔

وَ هَذَا ذِكْرٌ مُّبْرَكٌ أَنزَلْنَاهُ أَقَاتْنِم لَهٗ مُنْكَرُونَ ﴿۱۲﴾

”اور یہ قرآن فصیح ہے بڑی بابرکت ہم نے (ہی) اسے اتارا ہے۔ تو کیا تم اس کو ماننے سے انکار کرتے ہو۔“
 لہذا کا مشار الیہ قرآن ہے اور ترکیب کلام میں ہذا مبتدا ہے اور اس کی خبر ذکر مبارک ہے۔ مبارک، ذکر کی صفت ہے اور اس پر تعین تعلیم کے لئے ہے، یعنی یہ ذکر عظیم ہے جس میں خیر کثیر ہے۔ انولناہ، ذکر کی دوسری صفت ہے۔
 علی خطاب اہل مکہ کو ہے اور اس چیز کے ثبوت کے بعد کہ یہ منزل من اللہ ہے اور اس میں بہت بڑی برکتیں ہیں، ان کے انکار پر جبر و
 توحیح کے لئے استفہام انکاری ذکر فرمایا ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدًا مِن قَبْلُ وَكُنَّا بِهِ عَالِمِينَ ﴿۵۶﴾

”اور یقیناً ہم نے مرحمت فرمائی تھی ابراہیم کو ان کی دانائی اس سے پہلے اور ہم ان کو خوب جانتے تھے۔“

یہ جواب ہے کہ عذوف قسم کا۔ یعنی ہم نے ابراہیم کو بتوں کی عبادت سے اعتبار کی صلاحیت عطا فرمائی اور رشد کی و ہمیر کی طرف
 اضافت اس بات پر دلالت کرنے کے لئے ہے۔ اس دانائی اور بصیرت میں آپ کا بلند عظیم اور منفرد مقام تھا۔ من قبل یعنی موبی
 بارون اور محمد ﷺ سے پہلے۔ یعنی محمد ﷺ کی طرف جو ہم نے وحی کی ہے یہ کوئی نیا امتحان اور انوکھا عمل نہیں ہے بلکہ حقوق کی اصلاح
 توسل الہیہ ہے، یہ سلسلہ تو متواتر اور ہم چل رہا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں من قبل سے مراد یہ ہے کہ بلوغت سے پہلے جب ایک
 سرنگ سے نکلے تھے حالانکہ اس وقت آپ کم سن تھے تو آپ نے کہا ائی و صحت للہ الخ مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے انہیں بچپن میں
 ہی نبوت کے منصب عظیم پر فائز فرمادیا تھا جیسا کہ وحی علیہ السلام کے متعلق فرمایا۔ إِنِّي نَزَّاهُكَ صَبِيًّا يَدْعُنِي أَنِّي نَزَّاهُكَ
 نے انہیں دانائی اور فراست عطا فرمائی تھی اور ہم خوب جانتے تھے کہ ابراہیم ہدایت نبوت کے اہل تھے کیونکہ اس کے تعین کا مبداء
 اللہ کی صفت علم اور صفت ہدایت ہے۔

إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا هَذِهِ الشَّيْئُ الْمَلِيٍّ الَّتِي أَنْتُمْ لَهَا عُكُوفٌ ﴿۵۷﴾

”یاد کرو جب آپ نے کہا اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہ یہ کیا موریتیاں ہیں جن کی پوجا پاپا پرتے بیٹھے ہو۔“

لہ طرف آئینا یاد شدہ کے متعلق ہے یا عذوف اذ کر کے متعلق ہے۔ بتوں کی تحقیر اور ان کے احترام پر جبر و توحیح کے لئے آپ
 نے انہیں موریتیاں (الشائیل) فرمایا کیونکہ شمال وہ صورت ہوتی ہے جس میں نہ روح ہوتی ہے اور نہ نفع و نقصان دیتی ہے۔ لام
 اختصاص کے لئے ہے، تقدیر کے لئے نہیں ہے کیونکہ عکوف کا تقدیر علی سے ہوتا ہے یا لام بمعنی علی ہوگا یا عکوف کا ضمن میں عبادت کا
 معنی ہے، اس لئے صلا لام ذکر فرمایا۔

قَالُوا وَجَدْنَا آبَاءَنَا لَهَا عُبِدِينَ ﴿۵۸﴾

”وہ بولے پاپا ہے ہم نے اپنے باپ (دادوں) کو کو وہ ان کے پجاری تھے۔“

یعنی ہمارے اس عقیدے پر کوئی علمی، عقلی یا نقلی دلیل نہیں ہے بلکہ ہم نے اپنے آباء کو ان مجسموں کے سامنے جہیں فرسائی کرتے
 دیکھا تھا۔ پس ہم بھی ان کی تقلید میں آجکلیں ہند کے ایسا کر رہے ہیں۔ یہ جواب ہے اس مفہوم کا جو سوالیہ انداز میں آپ نے ان سے
 بتوں کی عبادت کے بارے میں ضمن کیا تھا۔

قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿۵۹﴾

”آپ نے فرمایا بلاشبہ بتا رہے ہو تم بھی اور تمہارے باپ دادا بھی کھلی ہوئی گمراہی میں لے“
 حضرت ابراہیم نے جرأت مندانہ لہجہ میں فرمایا ان پتھروں کی بے سود اور بے ضرر صورتوں کی پوجا کرنے میں تم کھلی گمراہی میں ہو
 اور پھر جو گمراہ تھے ان کی تقلید کرنا گمراہی ہی گمراہی ہے۔

قَالُوا اَجْتَنَّا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ التَّوْبِیِّنِ ۝۵۰

”انہوں نے پوچھا کیا تم ہمارے پاس کوئی سچی بات لے کر آئے ہو یا (صرف) دل لگی کر رہے ہو۔“
 لہ وہ چونکہ اپنے آباؤ کو جا وہ حق پر سمجھتے تھے اس لئے حضرت ابراہیم کا یہ جملہ سن کر چونک گئے اور ان کی گمراہی کو بعید سمجھتے ہوئے کہا کہ یہ
 تم ہمیں مذاق کے طور پر کہہ رہے ہو یا تمہارے پاس کوئی علمی قطعی دلیل بھی ہے، اپنے آباؤ کے عقیدہ کو گمراہی سے بعید سمجھتے ہوئے انہوں
 نے استفہام انکاری استعمال کیا۔

قَالَ بَلْ سَأَلْتُكُمْ عَرَبُ السَّمَوَاتِ وَ الْأَرْضِ الَّذِي فَطَرَهُنَّ ۚ وَاَنَا عَلَىٰ
 ذَلِكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ ۝۵۱

”آپ نے فرمایا (دل لگی نہیں کر رہا) بلکہ تمہارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے جس نے ان سب کو پیدا
 فرمایا ہے۔ اور میں اس (صدقات) پر گواہی دینے والوں سے ہوں لے“

لہ آپ نے فرمایا نادانوں! تمہارا رب وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ رب السموات والارض سے وصف بیان فرمایا
 تاکہ ان جہلاء کا قول رد ہو جائے جو یہ کہتے ہیں کہ رب کا اطلاق سلطان اور بادشاہ پر ہوتا ہے۔ یہ اضطراب ہے اس قول سے کہ میں دل
 لگی کر رہا ہوں۔ فرمایا میری بات کی دلیل یہ نیلگوں آسمان اور گونا گوں صفات کی حامل زمین ہے، یہ زبان حال سے گواہی دے رہے
 ہیں کہ ان کا کوئی خالق ہے اور ان کا حادث اور ممکن ہونا ان کے خالق ہونے کی بین دلیل ہے اور ممکنات کے خالق کے لئے واجب
 الوجود اور صفات سے متصف ہونا اور ایکتا ہونا ضروری ہے اور ایسی صفات سے متصف ذات ہی عبادت کی مستحق ہو سکتی ہے۔ اس کے
 علاوہ کوئی اس قابل نہیں کہ اشرف المخلوق حضرت انسان اس کے سامنے اپنی خلعت زیا کو جھکانے۔

لہ ذالکم کا مشارالہ مذکور توحید ہے، یعنی جو چیزیں قدرت خداوندی کی محترف ہیں اور زبان حال سے یا زبان قال سے اس کی
 عظمت و کبریائی کی گواہی دے رہی ہیں، میں بھی ان سے ہوں جیسے زمین و آسمان اور ساری کائنات زبان حال سے اس کی ربوبیت پر
 شاہد عادل ہے۔

وَسَأَلُوهُ لَآكِيَدَنَّ اَصْصَاكُمْ بَعْدَ اَنْ تَوَلَّوْا مُدْبِرِينَ ۝۵۲

”اور پتھر! میں بندوبست کروں گا تمہارے ہونے کا جب تم چلے جاؤ گے پیٹھ پھیرتے ہوئے لے“

لہ کید کا لفظی معنی نکر و میلہ ہے اور یہاں مراد یہ ہے کہ میں تمہارے ان بتوں کی درست بناؤں گا یا اس کو توڑنے کا ہر جیلہ اپناؤں گا۔
 امام بیضاوی فرماتے ہیں تاہم یہی واو کا بدل ہے جو باء کا بدل ہے اور اس میں توجہ ہے۔ لفظ کید اور تاہم استعمال جس میں توجہ کا معنی
 ہے۔ اس لئے فرمایا کہ معاملہ بڑا مشکل اور ٹکٹھن تھا اور بڑی تدبیر اور منصوبہ سازی کا حامل تھا (۱) کیونکہ نمرود اور ساری مخلوق خدا ایسا نہ

چاہتی تھی اور نردو کو ظاہری جاہ و جلال بھی حاصل تھا (تو ایسے ماحول میں عقائد پر حملہ بلکہ ان کے معبودوں پر حملہ واقعی بڑا ہی مشکل امر تھا) اس کلام کا عطف فال کی تائید کے ساتھ سابقہ فال پر ہے۔ حضرت امام نبوی نے لکھا ہے کہ قتادہ اور مجاہد نے فرمایا کہ آپ نے یہ ارشاد تو مے سے خفیہ فرمایا تھا، اس وقت صرف ایک شخص موجود تھا لیکن اسی شخص نے آپ کا یہ راز فاش کر دیا تھا اور اس شخص نے کہا ہم ایک جوان کو سنتے رہتے ہیں کہ وہ بتوں کا برائی سے تذکرہ کرتا ہے اور اس کا نام ابراہیم ہے (۱)۔

سدی فرماتے ہیں مشرک سال میں ایک عید مناتا تھے اور جب اس عید کی محفل سے واپس آتے تھے تو بتوں کے پاس جا کر جیسے فرسائی کرتے اور اپنی نیاز مندیاں پیش کرتے، اس کے بعد اپنے گھروں کو پھلتے تھے۔ اس سال جب عید کا دن آیا تو ابراہیم کو باپ نے کہا اے ابراہیم آج اگر تو ہمارے ساتھ ہماری عید کی اس پر رونق محفل میں آجائے تو ہمارا دین تجھے بڑا بھلا معلوم ہوگا۔ اس مشورہ پر ابراہیم ان کے ساتھ چل پڑے لیکن راستہ پر آپ کے اور فرمایا میں بیمار ہوں۔ میرے پاؤں میں درد ہے۔ جب سب لوگ چلے گئے اور صرف کنزور لوگ باقی تھے تو آپ نے فرمایا تم بخدا میں تمہارے ان بے جان مجسموں کو تو زنا دلوں گا۔ تو بعض لوگوں نے آپ کی یہ کلام سن لی۔ پھر حضرت ابراہیم ان کے بت خانہ میں آئے۔ اس بت خانہ میں ایک بڑا بت رکھا تھا جس کے ارد گرد چھوٹے بت پڑے تھے۔ مشرک محفل عید میں جانے سے پہلے اپنے بتوں کے سامنے کھانا رکھتے تھے اور یہ سوچ کر گئے تھے کہ جب ہم واپس آئیں گے تو ہمارے اس کھانے میں ہمارے معبود برکت ڈال چکے ہوں گے اور واپسی پر ہم یہ برکت آمیز کھانا کھائیں گے۔ جب حضرت ابراہیم نے بتوں کے سامنے کھانا دیکھا تو بطور استہزاء فرمایا تم کھاتے کیوں نہیں۔ جب کسی نے جواب نہ دیا (اور انہیں جواب کی طاقت ہی نہ تھی) تو فرمایا بولتے کیوں نہیں۔ پھر آپ ہتھوڑا لے کر دائیں ہاتھ سے بتوں کو تو زنا شروع فرمایا (۲)۔ دائیں ہاتھ کا ذکر فرمایا کیونکہ یہ بائیں سے زیادہ قوی ہوتا ہے یا بئین بمعنی قسم ہے، یعنی اس قسم کی وجہ سے آپ نے انہیں تو زنا شروع کر دیا۔

فَجَعَلَهُمْ جُذُاۓ اِلَّا كَيْبَرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اَلَيْبِيۓ يَرْجِعُوۓ ﴿۳۰﴾

”پس آپ نے انہیں ریزہ ریزہ کر ڈالا مگر ان کے بڑے بت کو کچھ نہ کہا تا کہ وہ لوگ (اس افتاد کے بارے میں) اس کی طرف رجوع کریں۔“

۱۔ جعلہم میں ضمیر منصوب کا مرجع بت ہیں۔ جلاذا کو جمہور علماء نے جیم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے فعال بمعنی مفعول ہے جیسے حلام ہے اور یہ حمد سے مشتق ہے جس کا معنی کاٹنا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ جمع ہے لیکن اس کا لفظ واحد نہیں ہے۔ کسائی نے جیم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ بھی ایک لغت ہے، اس صورت میں بھی بمعنی مفعول ہوگا یا یہ جلدی کی جمع ہے جیسے خفیف کی جمع خفاف ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تمام بت خانہ میں رکھے ہوئے بتوں کا حلیہ بگاڑ دیا لیکن آپ نے بڑے بت کو نہ تو زنا، آپ نے کلبا زنا آخر میں اس بڑے بت کی گردن میں لٹکادیا۔ اللہ تعالیٰ نے بے جان و بے عقل بتوں کے لئے ضمیر جمع نہ کر ڈکر فرمائی ہے حالانکہ یہ اس اہل بت تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرک انہیں اپنا خدا گمان کرتے تھے، اس لئے ان کے عقیدہ کے مطابق ضمیر استعمال فرمائی۔ الیہ کی ضمیر کا مرجع یا تو ابراہیم علیہ السلام ہیں، یعنی وہ ابراہیم علیہ السلام کی طرف لوٹیں اور پوچھیں کہ ہمارے بتوں کی یہ درست کس نے بنائی ہے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بتوں کی مخالفت اور دشمنی میں پورے معاشرہ کے اندر مشہور تھے۔ پس جب وہ آپ کے پاس آ کر

بھڑکیں گے تو آپ ان پر ان باطل خداؤں کی بے بسی پر حجت قائم کریں گے کہ تمہارے یہ خدا اتنے بے چارے اور کمزور ہیں کہ اپنی الوہیت کو پہچاننے کے لئے ایک آدمی کا مقابلہ بھی نہ کر سکے (بلکہ تم ہو کہ صبح و شام دست بستہ ان کی عبادت میں مصروف ہو) یا الہیہ کی ضمیر کا مرجع ان کا بڑا بت ہے کہ وہ اس سے حقیقت حال دریافت کرنے کے لئے رجوع کریں اور پھر جب وہ بے جان بت انہیں کوئی جواب نہیں دے گا تو رسوا اور شرمندہ ہوں گے کیونکہ معبود تو اس شان کا مالک ہوتا ہے کہ اسے ہر چیز کا علم بھی ہوتا ہے اور اپنے وفا شعاروں اور اطاعت گزاروں کی فریاد کو بھی سنتا ہے۔ جب یہ جواب نہ دے گا تو خود بخود ذلیل ہو کر واپس آ جائیں گے۔

یا الہیہ کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، یعنی جب اس بے بسی اور لا چاری کی حالت میں اپنے بتوں کو دیکھیں گے تو رب حقیقی کی طرف رجوع کریں گے۔

قَالُوا مَنْ فَعَلَ هَذَا بِآلِهَتِنَا إِنَّهُ لَمِنَ الظَّالِمِينَ ۝

”وہ بولے کس نے یہ حال کیا ہے ہمارے بتوں کا بیٹھک وہ ظالموں میں سے ہے۔“

۱۔ من استغفامیہ ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ معذولہ ہو اور پھر اپنے صلہ سے لڑ کر مبتدا ہو اور انہ لمن الظالمین ضمیر ہو۔ یعنی جس نے ہمارے خداؤں کا یہ ہوش ربا ہشر کیا ہے یقیناً اس نے خداؤں پر یہ جرأت کر کے بڑا ظلم کیا ہے یا تو زلے میں اتنی زیادتی کر کے ظلم کیا ہے یا اپنے آپ کو بلاست میں ڈال کر اپنے اور ظلم کیا ہے یہ جملہ مستانفہ ہے، اس تقدیر پر کہ پہلا جملہ استغفامیہ ہو۔

قَالُوا سَبَعًا مَّا قَتَلْنَا لَهُمْ يُقَالُ لَهٗ اِبْرٰهِيْمُ ۝

” (چند آدمیوں نے) کہا ہم نے ایک نوجوان کو سنا ہے کہ وہ ان کا ذکر (برائی سے) کیا کرتا ہے اے ابراہیم کہا جاتا

ہے۔“

۱۔ یذکرہم فہی کی صفت ہے اور پھر اس کے ذریعے یذکرہ کا سمعنا کے ساتھ تعلق ہے اور یہ ترکیب مبلغ ہے کیونکہ اس میں ذکر کی نسبت آپ کی طرف حقیقتاً ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یذکرہ سمعنا کا مفعول ثانی ہو کیونکہ سمعنا میں ضمناً علم کا معنی پایا جاتا ہے۔ یقال لہ یہ فہی کی دوسری صفت ہے اور ابراہیم صومبتدا مخذوف کی خبر ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ فعل کی وجہ سے مرفوع ہو کیونکہ ابراہیم سے مراد (مسی ٹین) اسم ہے۔

جب نمرود اور قوم کے دوسرے سرداروں کو اپنے بتوں کے ابراہیم کے ہاتھوں اس ہشر شکر کا علم ہوا تو یہ کہا

قَالُوا قَاتِلُوا بِهِ عَلَىٰ اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَرْسُدُوْنَ ۝

” کہنے لگے تو پھر (پکڑ کر) لاؤ اسے سب لوگوں کے رو برو لے شاید وہ اس کے متعلق کوئی شہادت دیں۔“

۱۔ بعض علماء فرماتے ہیں اعین الناس سے مراد قوم کے رؤسا اور وزیرے ہیں اور علی ہاتوا کے متعلق ہے۔ جیسا کہ اتیت علی القاضی میں علی اتیت کے متعلق ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں علی اعین الناس بہہ کی ضمیر سے حال ہے، یعنی لوگوں کے سامنے لے آؤ اس طرح کہ لوگوں کی نظر میں اس کی صورت میں یوں بھی ہوئی ہوں جیسے سوار ساری پر جما ہوا ہوتا ہے۔

۲۔ تاکہ لوگ آپ کے اس فعل پر گواہی دیں (کیونکہ ویسے وہ بغیر کسی وجہ کے آپ کو گرفتار کرنا نہیں چاہتے تھے) یا یہ معنی کہ لوگ موجود ہوں اور دیکھیں کہ ہم اپنے خداؤں کے مجرم کو کسی عبرت ناک سزا دیتے ہیں۔ یہ معنی محمد بن اسحاق نے بیان کیا ہے اور پہلا معنی افسن

قائدہ اور سدسی نے بیان کیا ہے (1)۔

قَالُوا ءَ اَنْتَ فَعَلْتَ هَذَا بِالْهَيْتَا يٰ اَبْرٰهِيْمُ ۗ قَالَ بَلْ فَعَلَهُ ۗ
كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسَكُّوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْظُرُوْنَ ۝۱۶

” (ابراہیم بڑھ کر لائے گئے تو) لوگوں نے پوچھا اے ابراہیم! کیا تو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟ فرمایا بلکہ ان کے اس بڑے نے حرکت کی ہوگی سو ان سے پوچھو! اگر یہ گفتگو کی سکت رکھتے ہوں۔“

۱۔ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فعل کی نسبت ان کے بڑے بت کی طرف کی ہے (حالانکہ یہ سب آپ نے خود کیا تھا) تو اس کی تین وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ اس فعل کا سبب ان کا بڑا بت تھا اس لئے آپ نے فعل کی نسبت اس کی طرف کر دی (کیونکہ آپ نے دیکھا کہ لوگ دوسرے بتوں کے سامنے بھی اپنے تحائف و نذرانے رکھتے تھے لیکن اس بڑے بت کی بہت زیادہ تعظیم اور توقیر کرتے تھے تو آپ کے غصہ اور غیظ کا سبب یہی بڑا بت بنا تھا) دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ نے تعریضی اسلوب پر ان کو خاموش کرنے اور بڑے بت کا مذاق اڑانے کے ساتھ اپنے فعل کا ثبوت دیا ہے۔ جیسے کوئی شخص بہت گندہ لکھتا ہو، جبکہ آپ بہت اچھا لکھتے ہوں آپ نے کوئی تحریر لکھی ہو اور وہ شخص آپ سے پوچھے یہ تحریر آپ نے لکھی ہے تو آپ کہیں نہیں بلکہ آپ نے لکھی ہے (چونکہ وہ ایسا عمدہ لکھ نہیں سکتا اس لئے یہ آپ کا اپنا ثبوت ہے اور دوسرے کے ساتھ اس کا بھی ہے) یا تیسری وجہ یہ ہے کہ آپ نے ان کے اعتقاد کے لزوم کے مطابق کہا ہے کہ بڑے بت کو غصہ آتا ہے کہ میرے ساتھ دوسروں کی عبادت کیوں کی جائے۔ قسمی کہتے ہیں فعلہ کبیرہم کا تعلق مونا ان کا نوا ینظفون کے ساتھ ہے۔ یعنی ان کا نوا ینظفون اس فعل کے لئے شرط ہے، یعنی اگر بولے پر بت قادر ہیں تو اس فعل پر بھی قادر ہوں گے تو آپ نے انہیں دکھا دیا کہ تمہارے بت بولنے سے بھی عاجز ہیں اور کلام کے ضمن میں ہے کہ یہ میں نے خود کیا ہے (یہ تو بولنے سے عاجز ہیں اتنے بڑے فعل کے ہر درجہ اولیٰ عاجز ہیں)

کسانی سے روایت ہے کہ وہ بل فعلہ پر وقف کرتے تھے۔ یعنی سائل کی کلام میں جو ابراہیم مذکور ہے اس نے کیا ہے۔ پس فعل ضمیر کی طرف منسوب ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے فعلہ من فعلہ (یہ سب اس نے کیا جس نے کیا) اس کا فعل حذف ہے لیکن یہ جائز نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کسانی سے جو روایت کیا گیا ہے۔ بل کا کلمہ اس معنی کی تائید نہیں کرتا کیونکہ فعل کی اپنی ذات کی طرف نسبت سے اعراض اس فعل کے نہ کرنے پر دلالت کرتا ہے ورنہ یہ معنی ہوگا میں نے نہیں کیا بلکہ میں نے کیا۔ اسی طرح حضرت ابو ہریرہ کی حدیث بھی بل فعلہ پر وقف کی مخالفت کرتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حضرت ابراہیم نے سوائے تین مقامات کے کسی ظاہراً بھی جھوٹ نہیں بولا۔ دوسرے اللہ تعالیٰ کے بارے میں (1) انہی مقیم (میں پتہ ہوں) (2) بل فعلہ کبیرہم (ان کے بڑے نے یہ کیا ہوگا) اور تیسری مرتبہ اس وقت جب ایک دن آپ حضرت سارہ کے ساتھ جا رہے تھے کہ ایک جابر بادشاہ کے پاس سے گزرے تو لوگوں نے بتایا کہ ایک شخص نے یہاں پڑاؤ کیا ہے جس کے ساتھ ایک حسین و جمیل عورت ہے۔ بادشاہ نے آپ کو بلا بھیجا اور حضرت سارہ کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا یہ میری بہن ہے پھر آپ حضرت سارہ کے پاس واپس آئے (2) تو انہیں فرمایا کہ ظالم

بادشاہ نے اگر جان لیا کہ تو میری بیوی ہے تو وہ مجھ سے تجھے چھین لے گا اس لئے اگر وہ تجھ سے پوچھے تو اسے کہنا کہ میں اس کی بہن ہوں کیونکہ اسلام میں تو میری بہن ہے۔ سچ زمین پر میرے اور تیرے سوا کوئی مومن نہیں ہے۔ پھر خالم بادشاہ نے حضرت سارہ کو بلا بھیجا۔ حضرت سارہ کو اس کے پاس لے جایا گیا تو حضرت ابراہیم نے نماز پڑھنا شروع کر دی۔ جب حضرت سارہ اس کے کمرہ میں داخل ہوئیں تو اس نے بری نیت سے آپ کو پکڑنا چاہا لیکن کسی دست نشینی نے اس کو پکڑ لیا اور زور سے دبوچا حتیٰ کہ وہ تکلیف کی وجہ سے پاؤں زمین پر مارنے لگا اور کہا تو میرے لئے اللہ سے دعا کر میں تجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچائوں گا۔ حضرت سارہ نے دعا کی تو وہ ٹھیک ہو گیا لیکن پھر اس نے دو بارہ آپ کو پکڑنے کا ارادہ کیا۔ پھر کسی شبی طاقت نے اسے دبوچ لیا، پیلے کی طرح پکڑا یا اس سے بھی زیادہ۔ پھر اس نے کہا آپ میرے لئے دعا کریں میں تجھے اب کچھ تکلیف نہیں پہنچائوں گا۔ آپ نے دعا فرمائی تو پھر وہ تکلیف سے آزاد ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے دربان کو بلایا اور کہا تو میرے پاس کسی انسان کو نہیں کسی جن کو لایا ہے۔ پھر اس نے حضرت سارہ کو خدمت کے لئے حاجرہ (لوٹھی) عطاء کی۔ حضرت سارہ وہاں آئیں اور ابراہیم کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت ابراہیم نے اشارہ سے پوچھا کیا ہوا۔ حضرت سارہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے کافر کا نکر اس کے سینہ میں ٹوٹا دیا اور اس نے خدمت کے لئے حاجرہ دی ہے۔ ابو ہریرہ فرماتے ہیں یہی تمہاری ماں ہے۔ اسے خالص نسب والو! اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے نماز اذان تقریباً ہی باتوں کو کنڈہات سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ ظاہر اور صورتاً یہ باتیں کذب کے مشابہتیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے برائی کی سزا کو نماز اذنا سے تعبیر فرمایا ہے۔ جَعَزُوا سَبِيحًا وَسَبِيحًا وَمِنْهَا لَعْنَةٌ اِبْرَاهِيمَ نے صراحت فرمایا ہے کہ تو میری اسلام میں بہن ہے تو گویا آپ نے تعریض فرمائی جھوٹ کا ارادہ نہیں کیا تھا اور آپ کی شان اس سے بہت بلند والہا ہے۔ (تعریض کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ذمہ کو کام کرنا مخاطب جس سے کچھ اور مفہوم سمجھ رہا ہو اور منظم کچھ اور مراد لے رہا ہو)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تمام بتوں سے سوال کرنے کو کہا حالانکہ بات بڑے بہت کی چل رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام بت وہاں موجود تھے (اگرچہ کسی کا کان نہیں تھا اور کسی کی ناک نہیں تھی)

فَرَجَعُوا اِلَى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوا اِنَّكُمْ اَنْتُمْ الظَّالِمُونَ ﴿۱۰﴾

” (لا جواب ہو کر) اپنے دلوں میں غور کرنے لگے پھر بولے بلاشبہ تم ہی زیاں کار ستگار ہو۔“

یعنی وہ حضرت ابراہیم کے چونکا دینے والے برجستہ جینے سن کر غور و فکر کرنے لگے اور سمجھ گئے کہ ابراہیم علیہ السلام جو ان تراشیدہ مورخوں کی الوہیت کی نفی کرتا ہے وہ حق ہے اور جو ہم اندھی تقلید میں ان کی پوجا پاٹ کرتے ہیں یہ بالکل غلط اور ناروا ہے۔ پھر اپنے دلوں میں یا ایک دوسرے کو کہنے لگے بے نفع ہے ضرر اور گلے مہروں کی عبادت کے تم اپنے آپ پر بہت ظلم کرتے رہے ہو یا یہ جتنی اس شخص سے سوال کرنا تمہارا ظلم ہے (اپنے مجبوروں سے پوچھو کہ ان کو زیور برکس نے کیا) یا تمہارا اس کو خالم کہنا بہت بڑا ظلم ہے۔ (اس نے حقیقت کو بے نقاب کیا ہے)

لَمْ يَرْسُوْا عَلٰی رُءُوْسِهِمْ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا هٰؤُلَاءِ يَبْتَغُوْنَ ﴿۱۱﴾

” پھر وہ اندھے ہو کر (اپنی سابقہ گمراہی کی طرف) پلٹ گئے اور کہنے لگے تم خوب جانتے ہو کہ یہ بولنے نہیں لے۔“

یعنی عقول کی طرف رجوع کرنے کے بعد پھر وہ اپنے کفر اور ہٹ دھرمی کی طرف لوٹ گئے، ان کے باطل کی طرف لوٹنے کو کسی چیز

کے لئے ہو جانے سے تشبیہ دئی گئی ہے۔ کہنے لگے آپ ہمیں ان سے پوچھنے کے متعلق کہتے ہیں حالانکہ قسم بخدا آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ بولنے سے عاجز ہیں۔

قَالَ أَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَلَا يَضُرُّكُمْ ۗ

”آپ نے فرمایا (نادانوں!) کیا تم عبادت کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان (بے بس بتوں) کی جو نہ تمہیں کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور نہ تمہیں ضرر پہنچا سکتے ہیں۔“

۱۔ اس کا عطف محذوف کلام پر ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے، اتعترفون بان هؤلاء لا ينطقون ولا نفعكم شيئاً ولا يضررون وانكم انتم الظالمون في عبادتها الضالعين بعد ذلك۔ یعنی تم جانتے بھی ہو کہ یہ نہ کچھ بولتے ہیں اور نہ کچھ نفع و نقصان کے مالک ہیں اور ان کی عبادت کر کے اپنے اوپر تم ظلم کرتے ہو پھر بھی تم ان کی عبادت کرتے ہو حالانکہ اگر تم ان کی عبادت کرتے بھی رہو تو بھی تمہیں کچھ نفع نہیں دے سکتے اور اگر تم ان کی عبادت چھوڑ دو تو تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ یہ ان کی عبادت پر انکار اور انہیں توحیح کی جا رہی ہے کہ بڑے نادان ہو کہ تم خود اعتراف بھی کرتے ہو کہ یہ پتھر کی بنی ہوئی صورتیاں ہیں، نفع و نقصان سے انہیں کوئی تعلق نہیں پھر تم ان کی عبادت کیوں کرتے ہو۔ یہ چیزیں تو الٰہیت کے سناہنی ہیں۔

أَفْ لَكُمْ وَ لِمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۙ

”تف ہے تم پر نیز ان بتوں پر جن کو تم پوجتے ہو اللہ تعالیٰ کے سوا۔ کیا تم اتنا بھی سمجھتے ہو۔“

۲۔ اف کو ان کثیر اور بن عامر نے بغیر تونین کے فاء کے فقرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے فاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے نافع اور رخص نے تونین کے ساتھ اور باقی قراء نے بغیر تونین کے پڑھا ہے جیسا کہ سورہ اسراء میں گزر چکا ہے۔ یہ جمل رفع نہیں ہے کیونکہ یہ وعل لہ کے طریقہ پر کسرہ مبتدا ہے اور ما بعد اس کی خبر ہے یا یا اسم فعل ہے جس کا معنی تعجب ہے۔ یعنی بہت افسوس ہے کہ عقیدہ کفر یہ کے بظان کے باوجود تم باطل پر ڈٹے ہوئے ہو اور افسوس ہے تمہارے ان من گھڑت معبودوں کی معبودیت پر حالانکہ تمہیں معلوم ہے کہ انسان کی عبادت کے یہ مستحق نہیں ہے، اف وہ آواز ہے جو کسی چیز کو ناپسند کرتے ہوئے یا کسی چیز سے بیزار ہونے کے وقت انسان منہ سے نکالتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی تعجب اور برا سمجھنا ہے۔ حدیث شریف میں ہے آپ ﷺ نے ایک دفعہ بد بو محسوس کی تو انہما نفرت کرتے ہوئے کپڑا اپنے ناک پر رکھا اور فرمایا اف۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی تعجب اور برا سمجھنا ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اس کا معنی برا اور بد بودار ہے (۱)۔

۳۔ استفہام برائے توحیح ہے اور اس کا عطف محذوف کلام پر ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے، اتنظرون فلا تعقلون کیا تم آنکھوں سے ان کے بے حس و بے حرکت ہونے کو دیکھتے ہو اور پھر سمجھتے نہیں ہو کہ یہ بت عبادت کے مستحق نہیں ہیں۔ عبادت کا مستحق تو صرف اللہ ہے۔ جب دلائل سے ابراہیم علیہ السلام غالب آگئے اور وہ کوئی جواب دینے سے عاجز ہو گئے تو آپ کو وہ تکلیف پہنچانے کے درپے ہو گئے۔

قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانصُرُوا آلِهَتَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ ۙ

”(سب ایک زبان ہو کر) بولے جلاؤ اور لو اس کو اور مدد کرو اپنے خداؤں کی اگر تم کچھ کرنا چاہتے ہو۔“

ان کے کتبہ فاعلین شرط ہے لیکن سابق کلام کی دلالت کی وجہ سے جزاؤ کر نہیں کی گئی۔ یہ بات جس شخص نے کہی تھی اس کا تعلق اگر اورو قبیلہ سے تھا اور بعض علماء نے اس کا نام ہون لکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو زمین میں دھنسا دیا تھا اور وہ قیامت تک نیچے دھنسا ہی جائے گا۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس مزا کا مشورہ مروند نے دیا تھا۔ جب ابراہیم کو جلا دینے پر اتفاق رائے ہو گیا تو انہوں نے آپ کو ایک کمرے میں بند کر دیا اور اس کے ارد گرد ایک چار دیواری بنادی۔ بعض علماء فرماتے ہیں انہوں نے آپ کو قید کرنے کے لئے شہر میں ایک تنور یا بجھی نما کوئی جگہ بنائی پھر وہ ایک مدت تک مختلف قسم کی لکڑیاں اکٹھی کرتے رہے۔ حتیٰ کہ مذہبی جوش اٹھا تھا کہ جو شخص مر بیض ہوتا وہ کہتا اگر اللہ نے مجھے شفا دی تو میں ابراہیم کو جلا نے کے لئے لکڑیاں جمع کروں گا۔ عورتوں کو کوئی حاجت ہوتی تو وہ کہتیں اگر میرا یہ کام ہو گیا تو میں ابراہیم کو جلا نے کے لئے لکڑیاں لاؤں گی۔ لوگ مرتے وقت وصیت کرتے کہ میرے مرنے کے بعد لکڑیاں خرید کر اس ایندھن میں ڈالنا۔ عورتیں چرخکات کر اس کی مزدوری سے لکڑیاں خریدتیں اور ثواب کی نیت سے ان لکڑیوں میں اضافہ کرتیں۔

ابن اسحاق لکھتے ہیں انہوں نے ایک مہینہ لکڑیاں جمع کیں، جب جمع کر چکے تو آگ جلائی گئی پھر آگ بھڑک اٹھی اور اس کے شعلے اتنے بلند تھے کہ اگر کوئی پرندہ اس کے پاس سے بھی گزرتا تو اس کی گرمی کی وجہ سے مر جاتا۔ انھوں نے سات روز ان لکڑیوں کو جلتے رہنے دیا۔ روایت ہے کہ اب انہیں یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ اس بھڑکتی آگ میں ابراہیم کو ڈالیں اس طرح (انسان کا ازلی دشمن) شیطان آ گیا، اس نے انہیں جنتیق کا علم دیا پس انہوں نے جنتیق کے ذریعے پھینکنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ حضرت ابراہیم کو ایک بلند منزل پر لے گئے آپ کے ہاتھ پاؤں باندھ کر جنتیق میں ڈال دیا۔ اس منظر کو دیکھ کر جن و انس کے سوا سب زمین پر کوئی بھی تیرا عبادت گزار نہیں ہے تو اے ہمارے پروردگار ابراہیم تیرا غلیل ہے اور اے آگ میں ڈالا جا رہا ہے، اس کے سوا سب زمین پر کوئی بھی تیرا عبادت گزار نہیں ہے تو اجازت فرما کہ ہم اس کی مدد کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وہ واقعی میرا غلیل ہے اس کے سوا میرا کوئی غلیل نہیں ہے، میں اس کا معبود ہوں میرے سوا اس کا کوئی معبود نہیں ہے۔ اگر وہ تم سے مدد یا دعا چاہتا ہے تو تمہیں اس کی امداد کی اجازت ہے اور اگر وہ توحید کا مظلوم وار میرے سوا کسی کو اپنا حاجت روا نہیں مانتا اور کسی غیر سے کچھ نہیں مانگتا (اور میں جانتا ہوں کہ وہ ایسا ہی ہے) اور میں اس کا ولی ہوں تم میرے اور اس کے درمیان سے ہٹ جاؤ (وہ جانے اور اس کا رب جانے) جب انہوں نے آپ کو آگ میں ڈالنے کا ارادہ کیا تو پانی کا فرشتہ حاضر ہوا اور عرض کی ابراہیم! اگر تم جاؤ تو میں اس آگ کو یکدم بجھا دوں ہوا کا فرشتہ آیا عرض کی قبلہ! اگر آپ چاہیں تو میں اس آگ کو ہوا سے اڑا دوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کمال استغناء کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا مجھے تمہاری مدد کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ حَسْبِيَ اللَّهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيلُ (میرے لئے اللہ کافی ہے اور وہ بہتر کارساز ہے) (۱۱) ابی بن کعب سے مروی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالنے کے لئے جب انہوں نے باندھا تو آپ نے پڑھا لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ مُبْخَاثَكَ لَكَ الْغَضَدُ وَ لَكَ الْمُلْكُ لَا شَرِيكَ لَكَ پھر انہوں نے آپ کو جب جنتیق میں بٹھا دیا تو جبریل امین حاضر ہوئے عرض کی اے ابراہیم کوئی میرے لائق خدمت ہو (تو حاضر ہوں) حضرت ابراہیم نے فرمایا۔ اے جبریل مجھے تیری اعانت کی کوئی ضرورت نہیں۔ جبریل نے عرض کی اپنے رب سے ہی ہاتھ اٹھا کر التجا کر لو۔ فرمایا حَسْبِيَ مِنْ سُؤَالِي عَلِمَهُ بِعَالِي وَ میرے حال سے خوب واقف ہے مجھے عرض کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

کعب الاحبار فرماتے ہیں کائنات کی ہر چیز اس آگ کو ابراہیم کی خاطر بھجاری تھی لیکن گرگٹ آگ کو بھڑکانے کے لئے چھو نہیں مار رہی تھی (1)۔

امام بنوئی نے سعید بن مسیب سے اور انہوں نے ام شریک سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گرگٹ کو قتل کرنے کا حکم دیا اور فرمایا یہ حضرت ابراہیم پر آگ کو بھڑکا رہی تھی (2)۔

امام بخاری اور مسلم نے صحیحین میں اور طبرانی نے ابن عباس سے مروی روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا گرگٹ کو قتل کر دو اگرچہ وہ کعبہ کے اندر بھی ہو (3)۔ حضرت سعد بن ابی وقاص سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گرگٹ کو قتل کرنے کا حکم فرمایا اور اس کو فوسق (فاق کا پتھر) فرمایا۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے (4)۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے گرگٹ کو پہلے بریتھے کے ساتھ قتل کر دیا اس کے (نامہ اعمال میں) سو نیکیاں لکھی جائیں گی اور جس نے دوسرے بریتھے کے ساتھ قتل کیا اسے اس سے کم نیکیاں ملیں گی اور جس نے تیسرے بریتھے کے ساتھ قتل کیا اس سے کم نیکیاں ملیں گی۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے (5)۔

قُلْنَا يَا سَارِغُونِي بَرِّدَا وَ سَلِّمَا عَلَيَّ اِبْرَاهِيمَ ۝

”جب آپ کو آتھلہ میں پھینکا گیا تو ہم نے حکم دیا اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی کا باعث بن جا ابراہیم کے لئے۔“

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ سلاماً ارشاد نہ فرماتے تو حضرت ابراہیم آگ کی ٹھنڈک کی وجہ سے فوت ہو جاتے (6)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اس کلام میں کسی اعتبار سے مبالغہ ہے۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آگ کو قدرت الہی کے تابع ظاہر فرمایا ہے کہ اس کے حکم سے کسی چیز کو جلاتی ہے، اس کے حکم سے کسی کو راجت پہنچاتی ہے نیز آدمی کی جلد کوئی ہو ذر فرمایا ہے اصل میں ذات برد تھا مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام کر دیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں سلاماً اپنے فعل کی وجہ سے منصوب ہے، یعنی سلماً سلاماً علیہ (7)۔ امام بنوئی فرماتے ہیں آثار میں معروف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب یہ ارشاد فرمایا تو اس دن سطح زمین پر کوئی آگ نہ رہی سب بجھ گئیں اور دنیا میں کسی شخص نے اس دن آگ سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ پھر اللہ تعالیٰ ”علی ابراہیم“ نہ فرماتے تو آگ ہمیشہ کے لئے ٹھنڈی ہو جاتی (8)۔ میں کہتا ہوں آگ پہلے کی طرح جلاتی کی صفت سے متصف تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کے لئے اسے اذیت اور تکلیف سے خالی کر دیا جیسا کہ علی ابراہیم کے الفاظ دلالت کرتے ہیں۔ سدی کہتے ہیں فرشتوں نے حضرت ابراہیم کو پہلوؤں سے پکڑا اور بڑے آرام سے زمین پر بٹھادیا۔ جب آپ آتھلہ میں اترے تو وہاں ٹھنڈے پانی کا چشمہ تھا اور سرخ رنگ کے گلاب کے خوبصورت پھول تھے۔ کعب فرماتے ہیں آگ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بال بھی بیک نہ کیا لیکن جن ریہوں سے آپ کو باندھا گیا تھا انہیں جلا دیا۔ علماء فرماتے ہیں حضرت ابراہیم آگ میں سات دن رہے تھے۔ منہال بن عمرو فرماتے ہیں حضرت ابراہیم نے فرمایا جو دن میں نے آگ میں گزارے وہی دن میری زندگی کے عمدہ ترین دن

- 1- تفسیر بنوئی، جلد 4، صفحہ 243 (اتھاریہ)
 2- ایضاً
 3- صحیح بخاری، جلد 6، صفحہ 247 (وزارت تعلیم)
 4- صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 236 (قدیمی)
 5- ایضاً
 6- تفسیر بنوئی، جلد 4، صفحہ 244 (اتھاریہ)
 7- تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شرح زادہ، جلد 6، صفحہ 46 (اعلیٰ)
 8- تفسیر بنوئی، جلد 4، صفحہ 244 (اتھاریہ)

تھے، اللہ تعالیٰ نے ان ایام میں خصوصی انعامات سے نوازا (تلا ۱)۔ ابن یسار فرماتے ہیں سائے کے فرشتے کو ابراہیم کی صورت میں بھیجا، وہ حضرت ابراہیم کے پہلو میں بیٹھ کر اُس وجہت کی باتیں کرتا تھا۔ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو جنت سے رشتہ کی قمیص اور چاندی نماز دے کر بھیجا۔ جبریل نے قمیص آپ کو پہنا دی اور چاندی نماز پر بیٹھا دیا اور پھر جبریل قریب بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ جبریل نے کہا اے ابراہیم! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کیا تجھے معلوم نہیں کہ آگ ہمارے احباب کو کوئی گزند نہیں پہنچاتی۔ پھر نمرود نے اپنے محل کی بالکونی سے حضرت ابراہیم کو دیکھا تو عجب نظارہ دیکھا کہ ابراہیم ایک ہاتھیچے میں بیٹھے ہوئے ہیں اور فرشتہ آپ کے پہلو میں بیٹھ کر سونگٹنگو ہے۔ جبکہ آپ کے ارد گرد آگ لگزیوں کو جلا رہی ہے۔ نمرود نے اپنے محل کے اوپر سے آواز دی۔ ابراہیم! تیرے خداوند عظیم کی قدرت کا یہ کرشمہ ہے کہ وہ تیرے درمیان اور جو کچھ میں (آگ) دیکھ رہا ہوں اس کے درمیان حائل ہو چکا ہے۔ اسے ابراہیم کیا تو اس آگ سے نکل بھی سکتا ہے فرمایا ہاں۔ پھر نمرود نے پوچھا کیا تجھے کوئی خدا ہے کہ اگر تو اس میں ٹھہرا رہا تو یہ آگ تجھے جلا دے گی فرمایا نہیں۔ نمرود نے کہا پھر کھڑے ہو جاؤ اور باہر نکل آؤ۔ حضرت ابراہیم آگ کے شعلوں کے درمیان سے چلتے ہوئے باہر تشریف لائے۔ جب آپ باہر آگئے تو نمرود نے پوچھا جناب آگ میں آپ کے ساتھ کون تھا وہ تو بالکل آپ کی تصویر تھا اور آپ کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا وہ ساریے کا فرشتہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے میری طرف بھیجا تھا تاکہ میری تمہائی کی آکھاہت کو دور کرے۔ نمرود نے کہا میں تیرے خداوند عظیم کے لئے قربانی دینا چاہتا ہوں کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ جب تو نے سارے خداؤں کی عبادت سے منہ موڑ کر اس کی عبادت اور توحید کو اپنایا تو اس نے جو تمہارے ساتھ حسن سلوک کرنے میں اپنی عزت و قدرت کا کرشمہ دکھایا ہے اس سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ میں اس کی رضا کے لئے چار گائے ذبح کروں گا۔ حضرت ابراہیم نے فرمایا جب تک تو مشرکانہ عقائد اور اس غلط دین کا پیرو ہے اللہ تعالیٰ تیری قربانی قبول نہیں فرمائے گا۔ تو اپنا یہ غلط مذہب چھوڑے گا تب تیری کوئی قربانی قبول ہوگی۔ نمرود نے کہا میں اپنی سلطنت تو چھوڑ نہیں سکتا۔ آپ کا یہ دین اپنانے میں مجھے اپنی بادشاہی سے ہاتھ دھونے پڑیں گے لیکن میں اس کے لئے گائے ذبح کروں گا۔ تو نمرود نے گائیں ذبح کیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کوئی زک پہنچانے سے باز آ گیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے یہ منظر دکھا کر حضرت ابراہیم کو اس کی آزادیوں اور پابندیوں سے بچالیا۔

شعیب ابراہیم فرماتے ہیں جب حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈالا گیا تو اس وقت آپ کی عمر سولہ سال تھی (2)۔

وَ اٰمٰرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمْ الْاٰخِصْرِيْنَ ﴿۱﴾

”انہوں نے تو ابراہیم کو گزند پہنچانے کا ارادہ کیا لیکن ہم نے ان کو ناکام بنا دیا۔“

۱۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس طرح نامرادوں کا کام کیا کہ قیمتوں میں اور خرچ میں خسارہ ہو گیا اور وہ اپنی مراد کو نہ پاسکے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے شمارہ کی یہ تدبیر فرمائی کہ اس نے نمرود پر چھروں کو مسلط کر دیا جنہوں نے اس کا گوشت توج لیا اور اس کا خون چوس لیا اور ایک چھمچ اس کے دماغ میں داخل ہو گیا جس نے اسے ڈنگ مار مار کر ہلاک کر دیا۔ محمد بن اسحاق فرماتے ہیں بعض لوگ نمرود اور اس کے چیلوں کے خوف کے باوجود حضرت ابراہیم پر ایمان لے آئے تھے جب انہوں نے دیکھا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم پر آگ کو ٹھنڈا اور باعث راحت بنا دیا ہے۔

حضرت لوط جو آپ کے بھتیجے تھے وہ بھی آپ پر ایمان لے آئے تھے۔ حضرت لوط ہاران کے بیٹے تھے اور ہاران تاریخ کے بیٹے تھے اور حضرت ابراہیم بھی تاریخ کے بیٹے تھے اور تاریخ 'ثالثت' کے بیٹے تھے جن کو ناخوڑ بھی کہا جاتا تھا۔ حضرت ابراہیم پر حضرت سارہ جو آپ کے چچا کی بیٹی تھی وہ بھی ایمان لے آئی تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ اور لوط کی معیت میں عراق کے شہر کوٹہ سے ہجرت کی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: **لَوْ لَوْ كُنَّا**۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے دین کی حفاظت اور سکون سے اپنے رب کی عبادت کرنے کی خاطر ہجرت فرمائی کیونکہ آپ نے فرمایا اسی مہاجر الی ربی۔ میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں۔ آپ سفر کرتے کرتے حران میں اترے پھر کچھ وقت وہاں ٹھہرے رہے پھر سفر شروع کر دیا حتیٰ کہ مہر پہنچ گئے پھر مصر سے شام تشریف لے گئے۔ فلسطین کے مقام سحج ہراترے جو شام سے بارہ میل کی مسافت پر ہے۔ حضرت لوط ان بستیوں میں تشریف لے گئے جن کو بعد میں نافرمانی کی وجہ سے الٹ دیا گیا تھا۔ یہ بستیاں فلسطین کے مقام سج سے ایک دن اور ایک رات کی مسافت پر ہیں یا اس سے بھی قریب میں اللہ تعالیٰ نے لوط علیہ السلام کو ان بستیوں کے باشندوں کے لئے نبی بنا کر بھیجا تھا (1)۔

وَ تَجِيئُهُمْ لَوْطًا إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَرَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ ﴿١٠﴾

”اور ہم نے نجات دی آپ کو اور لوط کو۔ اس سر زمین کی طرف (ہجرت کا حکم دیا) جسے ہم نے ناپاکت بنایا تھا تمام جہاں والوں کے لئے۔“

۱۔ الی الارض 'فجینا کے متعلق ہے کیونکہ اس کے ضمن میں سب نفاہ کا معنی موجود ہے۔ برکت سے مراد شادابی اور خوشی کی کثرت، نہروں اور پھلوں کی فراوانی ہے اور عمومی برکات میں سے ایک بڑی برکت یہ بھی ہے کہ اس زمین (شام) میں اللہ نے زیادہ انبیاء مبعوث فرمائے۔ ابلی ابن کعب فرماتے ہیں اس زمین کو برکت والی زمین اس لئے فرمایا کیونکہ اس میں بیٹھا پانی ہے جس کی اصل بیت المقدس کے صحرہ کے نیچے ہیں (2) (یعنی یہ چشمہ شیریں بیت المقدس سے نکلتا ہے اور پھر اس کا پانی اس بارکت زمین میں پہنچتا ہے) نبوی نے قنادہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب نے حضرت کعب سے فرمایا کہ تم مدینہ طیبہ کیوں نہیں جاتے حالانکہ وہ آپ ﷺ کی ہجرت گاہ ہے، وہاں آپ کی قبر انور ہے۔ حضرت کعب نے فرمایا اے امیر المؤمنین میں نے اللہ کی کتاب (تورات) میں یہ پڑھا ہے کہ شام کی زمین اللہ کا فرزند ہے اور اس کے بندوں میں سے برگزیدہ بندوں کا خزانہ ہے (3)۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے۔ ہجرت کے بعد ہجرت ہوگی بہتر لوگ حضرت ابراہیم کی ہجرت گاہ کی طرف ہجرت کریں گے۔ ایک دوسری روایت میں ہے زمین میں سے بہتر لوگ حضرت ابراہیم کی ہجرت گاہ کو لازم چلائیں گے اور زمین پر شریر لوگ رہ جائیں گے، ان کی زمینیں ان کو باہر پھینک دیں گی اور اللہ تعالیٰ بھی ان کو ناپسند فرمائے گا آگ انہیں بندروں اور خزیروں کے ساتھ ہانک کر جمع کرے گی۔ جہاں وہ رات گزاریں گے آگ بھی ان کے ساتھ رات گزارے گی۔ جب وہ قتلہ کریں گے تو آگ بھی ان کے ساتھ وہاں ٹھہرے گی۔ اس حدیث کو ابو داؤد نے روایت کیا ہے (4)۔

زید بن ثابت سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شام کو مبارک ہو۔ ہم نے عرض کی حضور اس وجہ سے؟ فرمایا

ملائکہ رحمت اس کے اوپر اپنے پر پھیلائے ہوئے ہیں (1)۔ اس حدیث کو امام احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حضرت موت کی طرف سے یا فرمایا حضرت موت سے ایک آگ نکلے گی جو لوگوں کو جمع کرے گی۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ پھر آپ ایسے حالات میں ہمیں کیا حکم فرماتے ہیں؟ فرمایا تم شام کو لازم پکڑنا۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے (2)۔

ابو جوالہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لشکر ہوں گے، ایک لشکر شام کا ہوگا، ایک لشکر یمن کا ہوگا اور ایک لشکر عراق کا ہوگا۔ ابن جوالہ نے عرض کی یا رسول اللہ اگر میں ایسے حالات کو پاؤں تو میں کیا کروں۔ فرمایا علیک بالشام تم پر شام کو پکڑنا لازم ہے کیونکہ اللہ کی زمین سے بہتر زمین ہے، اللہ کے بہتر بندے اس کی طرف کھینچے چلے آتے ہیں اور اگر یہ نہ ہو سکتے تو یمن کو لازم پکڑنا اور اپنے آپ کو فخر سے مہر کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ میرے لئے شام اور شام والوں کا وکیل و ذمہ دار ہے (3)۔ اس حدیث کو احمد اور ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ شرح ابن عساکر سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں حضرت علی کی مجلس میں اہل شام کا ذکر ہوا اور کہا گیا کہ جناب آپ ان پر لعنت کریں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا نہیں۔ میں ایسا نہیں کروں گا کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ ابدال شام میں ہوں گے اور ابدال چالیس مرد ہیں جب ان میں سے ایک مر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسرا پیدا فرماتا ہے، ان کی وجہ سے بارش نازل ہوتی ہے اور مسلمانوں کو ان کی وجہ سے فتح نصیب ہوتی ہے اور ان کی وجہ سے شامیوں پر عذاب نہیں آتا۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے ایک نور کا ستون دیکھا ہے جو میرے سر کے نیچے سے پھیلتا ہوا نکلا ہے حتیٰ کہ شام میں جا کر ٹھہرا ہے۔ اس حدیث کو ترمذی نے دلائل میں روایت کیا ہے (4)۔

وَهَيَّمَا لَكَ إِسْحَاقُ وَيَعْقُوبُ نَافِلَةٌ وَكَلَّا جَعَلْنَا صُلَيْبِينَ ۝

”اور ہم نے عطا فرمایا اِسْحَاقُ (جیسا فرزند) اور یَعْقُوبُ (جیسا) پوتالہ اور سب کو ہم نے صالح بنایا۔“

۱۔ نافلة یعنی فضل کے لفظ کے بغیر مصدر مفعول مطلق ہے جیسا کہ عافیہ مصدر ہے، مجاہد اور عطاء نے نافلة کا معنی عطیہ کیا ہے اور فرماتے ہیں یہ اِسْحَاقُ اور یَعْقُوبُ سے حال ہے کیونکہ وہ دونوں اللہ کی عطاء سے تھے۔ حسن اور ضحاک فرماتے ہیں اس کا معنی فضل اور مریانی ہے اور یہ علت کی بناء پر منصوب ہے۔ ابن عباس، ابی بن کعب ابن زید اور قتادہ فرماتے ہیں نافلة سے مراد یَعْقُوبُ علیہ السلام ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اِسْحَاقُ علیہ السلام حضرت ابراہیم کو آپ کی اس دعا کی وجہ سے عطا فرمائے تھے (رب هب لی من الصالحین) لیکن یَعْقُوبُ علیہ السلام آپ کو اضافی اور زائد طلب عطا فرمائے تھے اور النافلة کا معنی زائد اور اضافی ہے (5) اور یہ یَعْقُوبُ سے حال ہے اور قرینہ کی وجہ سے اس ترکیب میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔

۲۔ ان چاروں حضرات ابراہیم کو طوطی اور یَعْقُوبُ کو ہم نے نیک صالح بنایا تھا، یعنی ان کے دل غیر خدا کی محبت اور توجہ سے کھینچے پاک تھے، ان کے نفس اوصاف کمالیہ سے متصف تھے اور برے اخلاق سے بالکل منزہ و صاف تھے اور ان کے بدن گناہوں کی آلائشوں سے بالکل پاکیزہ تھے۔ ہر لحد اطاعت الہی میں مشغول رہتے تھے چونکہ صلاح و فساد کی ضد ہے خواہ وہ دل میں ہو یا قلب میں ہو یا نفس

3۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 336 (نورمہ)

2۔ ایضاً

1۔ مشکوٰۃ الصالحین، صفحہ 582 (نورمہ)

5۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 245 (الصحاریہ)

4۔ دلائل البیہود از ترمذی، جلد 6، صفحہ 449 (احمدیہ)

میں ہو۔ یعنی ہم نے انہیں دل بردن اور نفس ہرانتبار سے پاک صاف کر دیا تھا۔

وَجَعَلْنَاهُمْ أُمَّةً يَهْتَدُونَ بِأَمْرِنَا وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءَ الزَّكَاةِ وَكَانُوا لَنَا غُلَامِينَ ﴿٦٠﴾

”اور ہم نے بنادیا انہیں پیشوا (لوگوں کے لئے) وہ راہ دکھاتے تھے ہمارے حکم سے اور ہم نے وہی بھیجی ان کی طرف کہ وہ

نیک کام کریں اور نماز ادا کریں اور زکوٰۃ دیا کریں اور وہ سب ہمارے عبادت گزار تھے۔“

۱۔ یعنی یہ مقدس ہستیاں لوگوں کی احکام الہیہ کی طرف رہنمائی کرتی تھیں کیونکہ ہم نے انہیں تکمیلِ خلاقیت کے لئے بھیجا تھا اور ہم نے انہیں نیک کام بنائے، جن میں ذاتی حسن ہے اور شرع نے ان میں حسن پیدا کیا ہے۔ اقامہ اصل میں اقامت تھا، مضاف الیہ کو تاہ کے قائم مقام رکھا اور تاہ کو حذف کر دیا۔ اقامہ الصلوٰۃ و ایفاء الزکوٰۃ کا عطف فعل الخیرات پر ہے اور یہاں عام پر خاص کو اہتمام کی زیادتی کی خاطر عطف کیا گیا ہے۔ اصل کلام اس طرح ہوگی اوحینا الیہم ان یفعلوا الخیرات و یقیموا الصلوٰۃ اقامتہ و یوتوا الزکوٰۃ ایفاء۔ یعنی مصدر بھی ساتھ ذکر تھے پھر افعال کو حذف کر کے مصادر کو مضاف کی طرف مضاف کر دیا گیا۔

وَلَوْ طَآئِبَةُ الْاٰیۡتِیۡنَہٗ حٰکِمًا وَّ عٰلَمًا وَّ نَجِیۡنَہٗ مِنَ الْقَرِیۡۃِ الَّتِیۡ کَانَتَ تَعْمَلُ الْخَبِیۡثَۃَ ۗ اِنَّہُمْ کَانَوۡا قَوْمًا سَوِیۡۃً فٰسِقِیۡنَ ﴿٦١﴾

”اور لو طائیبہ نے حکومت اور علم عطا فرمایا اور نجات دی اسے اس گاؤں سے جس کے باشندے بہت زویل کام کیا کرتے

تھے۔ بے شک وہ لوگ بڑے ناانچار اور نافرمان تھے۔“

۱۔ لو طائِبُ فعل مضمّر کی وجہ سے منصوب ہے جس کی تفسیر آئینہ کر رہا ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں اذکور فعل کی وجہ سے منصوب ہے اور آئینہ اسی سے بدل اشتغال ہے۔

حکما سے مراد یا تو حکمت ہے یا نبوت یا جھگڑوں میں فیصلہ کرنے کی قوت ہے۔ علماً سے مراد ذات الہی اور صفات الہی کی معرفت اور وہ تمام علوم ہیں جو شان انبیاء کے لائق ہوتے ہیں۔ قریہ سے مراد مردم کی ہستی ہے اس ہستی کے لوگ لڑکوں سے برائی کرتے، بغلیوں کے ساتھ ڈھیلے پھینکتے اور پرنوں کے ساتھ کھیلتے تھے۔ یہاں فعل کی نسبت قریہ کی طرف کی گئی ہے۔ مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے (یعنی اصل میں اہل القریہ تھا) اس کی دلیل آیت کے آئندہ الفاظ بھی ہیں اِنَّہُمْ کَانَوۡا قَوْمًا سَوِیۡۃً فٰسِقِیۡنَ۔ انہم کانوا کا جملہ کانت تعمل الخبیثات کی تعلیل ہے۔

وَاَدْخَلْنٰہُ فِیۡ رَاحَتِنَا ۗ اِنَّہٗ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿٦٢﴾

”اور ہم نے اسے داخل کر لیا ہے اپنے (رحیم) رحمت میں بیشک وہ نیکو کاروں میں سے تھا۔“

۱۔ فی رحمتنا کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے اسے اپنی رحمت کے مستحق بندوں میں داخل کر دیا یا اپنی جنت میں داخل کر دیا۔ میں کہتا ہوں یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات عالم مثال میں کشف کی نظر سے دائرہ کی ہیئت پر دکھائی دیتی ہیں اور صوفی ان میں داخل دکھائی دیتا ہے اس حال میں کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے فانی اور صفات الہیہ کے اعتبار سے باقی ہوتا ہے اور یہ فی رحمتنا اسی

کینیت سے کنایہ ہو۔

وَنُوحًا إِذْ نَادَىٰ مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَنَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيمِ ﴿٦١﴾

”اور یاد کرو نوح کو جب انہوں نے (ہمیں) پکارا پیش ازیں تو ہم نے قبول فرمایا ان کی دعا کو اور بچایا انہیں اور ان کے گھر والوں کو سخت مصیبت سے ل۔“

ل۔ نوحاً کا عطف لوطاً پر ہے، یعنی ہم نے نوح کو بھی حکمت و علم عطا فرمایا۔ اذ نادى، اذ کو فعل محذوف کے ساتھ منسوب ہے یہ جملہ مقررہ ہے یا تقدیر عبارت اس طرح ہے اذ کو لوطاً و نوحاً اس صورت میں اذ نادى؛ لوطاً کے مضاف محذوف سے بدل اشتغال ہوگا۔ من قبل نادى کی طرف ہے، یعنی اس نے مذکور افراد سے پہلے ہمیں پکارا۔ الکرّب العظیم سے مراد شدید غم ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں کرب عظیم سے مراد غرق ہونا اور قوم کی تکذیب کی مصیبت اور تکلیف ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی عمر تمام انبیاء کرام سے زیادہ تھی اور مصائب اور اذیتیں بھی آپ نے سب سے زیادہ برداشت کیں (1)۔ ضحاک نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ نوح علیہ السلام کی قوم آپ کو اتنا سخت بھینتی تھی کہ آپ زمین پر (بے ہوش ہو کر) گر پڑتے تھے اور آپ کو ایک چمڑے میں لپیٹ کر پھینک دیتے تھے اس گمان سے کہ آپ مر چکے ہیں۔ آپ دوسرے دن پھر تشریف لاتے اور انہیں پوری دردمندی اور سوز کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتے۔ محمد بن اسحاق نے عبید بن عمیر اللیثی سے روایت کیا ہے کہ انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ قوم نوح حضرت نوح علیہ السلام کو پکڑ لیتی ہے اور ان کا گھر گھونٹ دیتی تھی کہ آپ بے ہوش ہو جاتے لیکن پھر جس اب پیکر صبر و رضا کی طبیعت سنبھلتی تو یہ دعا مانگتے رَبِّ اغْفِرْ لِقَوْمِي فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ اے میرے پروردگار میری قوم کو معاف فرما دے۔ یہ میری عظمت کو نہیں پہچانتی۔

وَ نَصْرَانُهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا سَوْفًا
فَاعْرَفْتَهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٦٢﴾

”اور ہم نے ان کی حمایت کی اس قوم کے مقابلہ میں جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا بیچک وہ بڑے ناسخار لوگ تھے پس ہم نے غرق کر دیا ان سب کو ل۔“

ل۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے قوم نوح کو ان دو برائیوں کی وجہ سے ہلاک کیا تھا جو جس قوم میں بھی جمع ہوتی ہیں تو اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کر دیتا ہے وہ دو برائیاں یہ ہیں۔ 1۔ حق کو جھٹلانا۔ 2۔ اور برائی میں منہبک ہونا (2)۔

وَ دَاوُدَ وَ سُلَيْمَانَ إِذْ يَحْكُمْنَ فِي الْحَرْثِ إِذْ نَفَسَتْ فِيهِ عَمَمٌ
الْقَوْمِ ۗ وَ كُنَّا لِحَكْمِهِمْ شَاهِدِينَ ﴿٦٣﴾

”اور یاد کرو داؤد و سلیمان (علیہما السلام) کو جب وہ فیصلہ کر رہے تھے ایک بھتی کے جھگڑے کا جب رات کے وقت چھوٹ گئیں اس میں ایک قوم کی بکریاں اور ہم ان کے فیصلہ کا مشاہدہ کر رہے تھے۔“

ل۔ ابن مسعود، ابن عباس اور اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ وہ بھتی ان گوروں کی تھی جس پر ان گوروں کے سچے لگ چکے تھے۔ قتادہ فرماتے ہیں

1۔ تفسیر ربیع، جلد 4، صفحہ 246 (الطہاریہ)

2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ زاد، جلد 6، صفحہ 50 (احمدیہ)

وہ کوئی دوسری کھتی تھی (1)۔ اذنفشت، یحکمان کی طرف ہے۔ رات کو بغیر چرواہے کے جانوروں کے چرنے کے لئے نفشت استعمال ہوتا ہے (2) اور دن کو بغیر چرواہے کے جانوروں کے چرنے کے لئے ہلمت استعمال ہوتا ہے۔ اس کا اصل معنی بکھرتا اور منتشر ہونا ہے جیسا ارشاد ہے کَالْبُهَيْنِ الْمَنْفُوشِ۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان و داؤد کے لئے لحکمہم میں ضمیر جمع استعمال فرمائی ہے لیکن مراد وہی ہیں کیونکہ جمع کا اطلاق دو پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ اس ارشاد میں استعمال ہوا ہے۔ فَإِن كَانَ لَهٗ إِخْوَةٌ فَلِأَيِّهِ السُّدُسُ۔ آیت کریمہ میں اخوة سے مراد بالا جماع اخویں ہے (3)۔

فَقَهَّمَهَا سُلَيْمَانَ ۚ وَكَلَّمَآ اٰتَيْنَا حٰكِمًا وَّعِلْمًا ۗ وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوُدَ الْجِبَالِ
يُسَبِّحُنَ وَالظَّيْرُطَ وَكُنَّا فَعِلِيْنَ ۙ

”سو ہم نے سجدہ فرمایا اور معاملہ سلیمان کو حل اور ان سب کو ہم نے بخشا تھا حکم اور علم سے اور ہم نے فرمانبردار بنا دیا داؤد کا پہاڑوں اور پرندوں کو وہ سب ان کے ساتھ مل کر توجع کہا کرتے تھے اور (یہ شان) ہم دینے والے تھے جے“

لہٰذا فقہمنا میں ضمیر منصوب کا مرجع فیصلہ یا فتویٰ ہے، یعنی سلیمان کو ہم نے الہام کر دیا وہ فیصلہ جو ہمیں پسند تھا، اس کلام میں کئی جملے حذف ہیں۔ اصل مفہوم اس طرح ہے کہ سلیمان نے اس کے مطابق فیصلہ سنایا جیسے ہم نے اسے سمجھایا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے فیصلہ اور فتویٰ سے رجوع فرمایا اور سلیمان کے فیصلہ پر تصدیقی دستخط فرمادئے۔

امام بخاری نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ حضرت داؤد پر قرآن پڑھنا بڑا آسان کر دیا گیا تھا۔ آپ سوار یوں پر نہیں ڈالنے کا حکم دیتے۔ پھر سوار یوں پر نہیں ڈالنے سے پہلے ہی قرآن ختم کر لیتے تھے اور آپ اپنے ہاتھ کی کمانی سے کھاتے تھے (4)۔

میں کہتا ہوں حدیث شریف میں قرآن سے مراد زبور ہے۔ امام بخاری فرماتے ہیں ابن عباس اور قتادہ نے بھی یہی فرمایا ہے کہ قرآن سے مراد زبور ہے۔ اس آیت سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے کہ حاکم جب کسی مسئلہ میں اجتہاد کرے اور فیصلہ صادر فرمانے سے پہلے اس کی رائے بدل جائے تو اس کے لئے اپنے فیصلہ سے رجوع کرنا جائز ہے جیسا کہ داؤد علیہ السلام نے کیا تھا۔

دو شخص حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس حاضر ہوئے۔ ایک بکریوں کا مالک تھا اور دوسرا کھیتی کا مالک تھا۔ کھیتی والے نے کہا کہ اس شخص کی بکریاں رات کو میری فصل میں چھوٹ گئیں اور سارا کھیت چٹ کر گئیں اور کھیت میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہا (آپ ہمارے درمیان فیصلہ فرمائیں) حضرت داؤد علیہ السلام نے کھیتی کے بدلے بکریاں اسے دے دیں۔ وہ دونوں یہ فیصلہ سن کر سلیمان علیہ السلام کے پاس سے گزرے۔ حضرت سلیمان نے پوچھا تمہارا فیصلہ کیسے ہوا۔ انہوں نے فیصلہ سے آگاہ کیا تو آپ نے فرمایا اگر ان کا فیصلہ میرے سپرد کر دیا جاتا تو میں کچھ اور فیصلہ کرتا۔ ایک روایت میں ہے کہ میں ایسا فیصلہ کرتا جو دونوں کے لئے زیادہ بہتر ہوتا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو حضرت سلیمان کی اس بات کی خبر پہنچی تو آپ نے انہیں بلا بھیجا اور فرمایا تم فیصلہ کرو۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت داؤد

2- القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 827 (الترغیب العربی)

4- صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 485 (دزارت تعمیم)

1- تفسیر بخاری، جلد 4، صفحہ 246 (الطہاری)

3- تفسیر بخاری، جلد 4، صفحہ 246 (الطہاری)

علیہ السلام نے انہیں نبوت اور والد ہونے کا واسطہ دے کر فرمایا تم مجھے اس فیصلہ کے متعلق بتاؤ جو دونوں فریقوں کے لئے زیادہ بہتر ہے۔ حضرت سلیمان نے فرمایا بکریاں کھیتی والے کو دے دو، وہ ان کے دو دو ہاؤں صوف اور دوسرے منافع حاصل کرے اور بکریوں والا کھیتی والے کے لئے زمین میں بیج ڈالے اور ان کی دیکھ بھال کرے۔ جب کھیتی اتنی مقدار کو پہنچ جائے جیسی کہ بکریوں نے کھائی تھی تو کھیتی کھیتی والے کے حوالے کی جائے اور بکریاں بکریوں والے کو دی جائیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا تمہارا فیصلہ درست ہے۔ پھر آپ نے اسی فیصلہ کے مطابق حکم سنایا۔ بعض علماء فرماتے ہیں جس روز سلیمان علیہ السلام نے یہ فیصلہ کیا تھا اس وقت آپ کی عمر گیارہ سال تھی (۱)۔

ابن ابی شیبہ نے المصنف میں ابن المنذر اور ابن مردودہ نے ابن عباس سے اسی طرح یہ واقعہ روایت کیا ہے جیسا کہ علامہ بغوی نے نقل کیا ہے۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں حضرت داؤد علیہ السلام کا فتویٰ حضرت امام ابو حنیفہ کے قول کی نقل ہے جو آپ جتایت کرنے والے غلام کے متعلق فرماتے ہیں کہ جتایت کرنے والا غلام اس شخص کو دے دیا جائے جس کا اس نے نقصان کیا ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا فتویٰ امام شافعی کے فتویٰ کی طرح ہے کہ آپ فرماتے ہیں اگر کوئی غلام بھاگ جائے اور کسی کا نقصان کر دے تو تاوان غلام کی کمائی سے پورا کیا جائے گا اور پھر غلام مالک کو واپس کر دیا جائے گا (۲)۔

میں کہتا ہوں امام ابو حنیفہ کا قول جو امام بیضاوی نے نقل کیا ہے یہ مطلق نہیں ہے بلکہ آپ غلام کے مالک کو اختیار دیتے ہیں کہ اگر چاہے تو غلام نقصان والے کے حوالے کر دے یا جتایت کا نقصان خود ادا کرے۔ علامہ بھصا فرماتے ہیں ان سے ضمانت اس لئے لی گئی تھی کیونکہ انہوں نے بکریوں کو چھوڑ رکھا تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ حکم اسلام میں منسوخ ہو چکا ہے۔ امام مالک امام شافعی اور امام احمد فرماتے ہیں اگر رات کو جانور چھوٹ کر کسی کا کھیت ضائع کر دیں تو جانوروں کے مالک پر تلف شدہ کھیت کی ضمانت ہوگی۔

(میں کہتا ہوں حضرت داؤد کے دور میں ان بکریوں کی قیمت اس کھیتی کے برابر تھی جو انہوں نے ضائع کی تھی، اسی وجہ سے آپ نے بکریاں کھیتی کے مالک کو دینے کا فیصلہ فرمایا تھا واللہ اعلم) اور دن کے وقت اگر جانور چھوٹ کر کھیتی کو اجاڑ دین تو ان کے مالک پر ضمان نہیں ہے کیونکہ معاشرہ کا عرف یہ ہے کہ کھیتی کے مالک دن کے وقت کھیتی کی خود حفاظت کرتے ہیں اور جانوروں کے وقت چرنے کے لئے چھوڑے جاتے ہیں اور رات کو اپنے پاؤں میں باندھ لیتے ہیں اور امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں دن یا رات کو اگر جانور چھوڑ کر کسی کی کھیتی اجاڑ دین تو کوئی ضمانت نہیں ہے کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے العجماء جو مہا جبار (۳) (جانور کسی کو زخم لگا دے تو اس کا تاوان نہیں ہے) اس حدیث کو شیخین نے صحیحین میں اور امام احمد اور اصحاب سنن نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں امام محمد نے فرمایا العجماء سے مراد چھوڑے ہوئے جانور ہیں۔ ائمہ ثلاثہ کی دلیل حرام بن سعد بن جبیر کی حدیث ہے کہ براء بن عازب کی اونٹنی چھوٹ گئی اور کسی کے باغ میں داخل ہو گئی اور اسے اجاڑ دیا تو رسول اللہ ﷺ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ دن کے وقت باغ والوں پر باغ کی حفاظت لازم ہے اور رات کے وقت اگر جانور چھوٹ کر ضائع کر دیں تو جانوروں والوں پر (باغ کھیتی) کی ضمانت ہوگی۔

اس حدیث کو امام مالک نے مطوٰء میں اور امام شافعی نے امام مالک سے اور اصحاب سنن ابو داؤد اقطنی ابن حبان حاکم اور بیہقی نے

روایت کیا ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں ہم نے اپنے مسئلہ میں اسی حدیث سے استدلال کیا ہے کیونکہ اس کی سند متصل ہے اور اس کے راوی معروف ہیں۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں اس حدیث کا مدار زہری پر ہے اور اس میں اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ مؤطا کی روایت ہے اور الیث نے زہری سے اور زہری نے ابو یوسف سے روایت کی ہے لیکن اس میں اتنی کا ذکر نہیں ہے۔ معن بن یسلی نے مالک سے روایت کی ہے اس میں عن جده یوسف کی زیادتی ہے۔ عمر نے زہری سے اور انہوں حرام سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے۔ اس کی مستابع نہیں ہے۔ ابوداؤد اور ابن حبان نے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ اور اعیان المعیلمین ابن امیہ اور عبداللہ بن یسلی تمام نے زہری سے اور زہری نے حرام سے اور انہوں نے البراء سے روایت کی ہے۔ میں کہتا ہوں ابن جوزی نے احمد کے طریقے سے تحقیق التعلیق میں اسی طرح روایت کی ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں حرام نے براء سے نہیں سنا ہے۔ عبد اللہ نے ابن حزم کی تصحیح میں اسی طرح لکھا ہے۔ نسائی نے محمد بن ابی حفصہ کے طریق سے زہری سے روایت کیا ہے کہ مجھے ابواسامہ بن ہبل نے بتایا کہ براء کی اونٹنی ابن ابی ذئب نے زہری سے روایت کیا ہے کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے ان ناقة البراء الخ ائمہ ثلاثہ نے العجماء جو مہاجر جبار کی حدیث کون کے وقت کے نقصان کے ساتھ خاص کیا ہے۔ ہم کہتے ہیں حکم کی قطعیت میں عام بھی خاص کی طرح ہوتا ہے۔ تخصیص کا حکم اس وقت تک نہیں لگایا جاسکتا جب تک کہ دونوں حکم متصل نہ ہوں اور نسخ کا حکم لگایا جاسکتا ہے جب تک کہ ایک حکم دوسرے حکم سے متاخر نہ ہو۔ پس جب یہ دونوں حکم (تخصیص و نسخ) ثابت نہیں ہیں تو تعارض باقی رہے گا۔ اس لئے تک کی وجہ سے ضامن لازم نہ ہوگی۔ جب دونوں حدیثوں کے درمیان تعارض ہے تو قیاس کی طرف رجوع کرنا واجب ہوگا اور قیاس عدم ضمان کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ جانوروں کا فعل مالک کی طرف منسوب نہیں ہے۔ کیونکہ نہ اس نے چھوڑا ہے نہ اس نے انہیں ہانکا ہے اور نہ وہ انہیں آگے سے پکڑے ہوئے تھا۔ اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ جس شخص نے مسلمانوں کے راستہ پر جانور کو چھوڑ دیا اور انہوں نے منہ کے ساتھ کسی کو نقصان پہنچایا تو وہ ضامن ہوگا کیونکہ جب تک وہ جانور راستہ پر سیدھا چلتا جائے گا تو اس کا چلنا مالک کی طرف منسوب ہو گا اور جب مڑ جائے گا یا دھرا دھر چل پڑے گا تو اس کے ارسال کا حکم منقطع نہیں ہوگا۔

مسئلہ: اگر سواری کے ساتھ اس کا مالک سوار ہو یا آگے سے اٹھنے لگا رہا ہو یا پیچھے سے ہانک رہا ہو اور سواری کسی کو روند ڈالے یا لگا پاؤں یا پھینکا پاؤں یا سمر مارے یا کات دے یا کسی چیز سے ٹکرا جائے خواہ کھڑی ہو یا چل رہی ہو اور وہ جگہ اس کی ملکیت ہو یا اجارہ یا اعارہ اس کی ملکیت میں ہو تو سواری کے مالک پر تاوان نہ ہوگا مگر پہلی صورت میں جب سوار ہو اور سواری کسی کو روند ڈالے تو اس پر ضمان ہوگی کیونکہ اس صورت میں مالک ہی براہ راست تلف کرنے والا ہے۔ کیونکہ سواری اور مالک دونوں کا بوجھ تلف ہونے والی چیز پر پڑا ہے گویا دونوں نے مل کر اسے ضائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ باقی صورتوں میں وہ براہ راست تلف کرنے میں ملوث نہیں ہے بلکہ وہ سب بنا ہے اور مسبب پر اس وقت تاوان ہوتا ہے، جبکہ اس کی طرف سے تعدی پائی جائے لیکن یہاں چلانے اور ٹھہرانے میں اس کی کوئی تعدی اور زیادتی نہیں ہے (یعنی اس میں اس کا ارادہ شامل نہیں ہے) لیکن اگر وہ ایسی جگہ پر ہو جو اس کی ملکیت نہ ہو لیکن اس کو اس پر چلنے کی اجازت ہو جیسے شارع عام ہوتی ہے لیکن ٹھہرانے کی اجازت نہیں ہوتی اور صحرا میں چلانے اور ٹھہرانے دونوں طرح کی اجازت ہوتی ہے اس صورت میں سوار پیچھے سے ہانکنے والا اور آگے سے چلانے والا تمام سابقہ صورتوں میں ضامن ہوگا لیکن اگر سواری نے پیچھے پاؤں یا دم کے ساتھ کسی کو نقصان پہنچایا تو مالک ضامن نہ ہوگا کیونکہ مسلمانوں کے راستہ میں چلنا سلامتی کی شرط کے

ساتھ مباح ہے کیونکہ وہ من و اچھے حق میں تصرف کر رہا ہے اور جن غیر کے حق میں تصرف کر رہا ہے کیونکہ وہ راستہ تمام لوگوں میں مشترک ہے۔ ہم ابحاث کو سلامتی کی شرط کے ساتھ مقید کرتے ہیں تاکہ دونوں فریقوں کا بھلا ہو۔ پھر سلامتی کی شرط کے ساتھ ان صورتوں کو مقید کرتے ہیں جن سے احراز (بچنا) ممکن ہے اور جن صورتوں میں بچنا ممکن نہیں ہے ان کو اس شرط سے مقید نہیں کرتے کیونکہ اس طرح تصرف سے روکنا لازم آتا ہے۔ روندنے سے احراز ممکن ہے کیونکہ یہ چلانے کی ضروریات سے نہیں ہے اور پچھلے پاؤں کے مارنے اور دم سے نقصان پہنچانے سے بچاؤ ممکن نہیں ہے، جبکہ سواری چل رہی ہو پس ایسی صورتیں سلامتی کی شرط کے ساتھ مقید نہیں ہیں۔ اگر سوار نے سواری کو راستہ پر روک لیا تو اس نے پاؤں یا دم کے ساتھ کسی کو نقصان پہنچایا تو سوار ضامن ہوگا۔ امام مالک فرماتے ہیں ایسی صورتوں میں بھی اس پر کچھ واجب نہ ہوگا جب تک کہ سوار کی طرف سے سواری کو مارنا یا ہانکنا نہ پایا جائے کیونکہ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے العجماء جبار (جانور کا نقصان پہنچانا رائیگاں ہے) امام شافعی فرماتے ہیں اگر مالک نے سواری کو ہانکا یا مارا یا اس نے کوئی ایسا فعل نہیں کیا اور پھر جانور نے اپنے منہ یا ہاتھ یا پاؤں یا دم کے ساتھ کسی کو نقصان پہنچایا تو ضامن ہوگا۔ امام احمد فرماتے ہیں جانور نے منہ کے ساتھ یا اگلے پاؤں کے ساتھ جنابت کی، جبکہ مالک جانور پر سوار تھا تو اس پر ضمان واجب ہوگی اور جو پچھلے پاؤں سے نقصان کرے اس کی ضمان نہیں ہے کیونکہ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے الرجل جبار (ٹانگہ کا نقصان رائیگاں ہے) اس حدیث کو دارقطنی نے سعید بن مسیب سے مرسل روایت کیا ہے۔

فائدہ: مجاہد فرماتے ہیں سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ صلح تھا اور حضرت داؤد کا فیصلہ حکم تھا اور الصلح خیر (صلح بہتر ہے) بعض علماء فرماتے ہیں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان دونوں کا فیصلہ وحی کے مطابق تھا اور سلیمان کا حکم داؤد علیہ السلام کے حکم کے لئے ناسخ تھا۔ یہ ان علماء کا قول ہے جو یہ فرماتے ہیں کہ انبیاء کرام کے لئے اجتہاد کے ساتھ فیصلہ کرنا جائز ہی نہیں کیونکہ وحی کی وجہ سے وہ اجتہاد سے مستغنی ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں انبیاء سے اجتہاد کی خطا بھی جائز نہیں ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ دونوں کا فیصلہ اپنے اپنے اجتہاد پر مبنی تھا مگر داؤد علیہ السلام کا اجتہاد درست فیصلہ تک نہ پہنچا، جبکہ سلیمان علیہ السلام کا اجتہاد درست تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے فیصلے کی تعریف فرمائی ہے۔ انبیاء کے اجتہاد میں خطا جائز ہے لیکن وہ اس خطا پر برقرار نہیں رہتے۔

علیٰ حضرت حسن فرماتے ہیں اگر و کُلُّا ایضا حکماً و علماً کا ارشاد نہ ہوتا تو حکام بلاک ہو جاتے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اجتہاد کی تعریف فرمائی ہے اور جو علماء یہ فرماتے ہیں کہ ہر مجتہد صواب کو پہنچنے والا ہوتا ہے وہ اسی آیت سے حجت پکارتے ہیں۔ لیکن اس میں ان کی دلیل نہیں ہے بلکہ فقہناہا سلیمان تو اس بات کی دلیل ہے کہ سلیمان کا فیصلہ درست تھا نہ کہ داؤد علیہ السلام کا۔ اسی طرح حضور علیہ السلام کی حدیث بھی اسی پر دلالت کرتی ہے کہ ہر مجتہد مصیب نہیں ہوتا حضرت عمرو بن العاص فرماتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ جب کوئی حاکم فیصلہ کرے اور اجتہاد کرے پھر صحیح فیصلہ کرے تو اسے دو ہزار اجر ملے گا اور اگر فیصلہ درست نہ ہو تو مجتہد کو ایک اجر ملے گا (۱)۔ اس حدیث کو بخاری، مسلم، احمد، اصحاب سنن اربعہ نے ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے یہ حدیث ہماری حجت ہے، ہمارے خلاف حجت نہیں ہے کیونکہ یہ صراحتہ دلالت کر رہی ہے کہ مجتہد کبھی غلطی کرتا ہے اور کبھی صحیح فیصلہ پہنچاتا ہے اور مجتہد غلطی پر بھی ماجور ہوتا ہے۔ یہ ارشاد مجتہد کے ہمیشہ مصیب ہونے پر دلالت نہیں کرتا کیونکہ خطا اور صواب دو متضاد

چیزیں ہیں اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے خطا (ظلمی کرنے) پر اجرتا ہے بلکہ حق کی تلاش میں جو وہ محنت اور کوشش کرتا ہے اس پر اسے اجرتا ہے کیونکہ تلاش حق میں محنت کرنا عبادت ہے اور اس سلسلہ میں خطا، معاف ہے، جبکہ وہ صحیح فیصلہ پر نہ پہنچے اور صحیح فیصلہ پر پہنچنے کی صورت میں اس کو دوا اور جلیس گے، ایک کوشش کا اجر اور دوسرا صحیح فیصلہ تک پہنچنے کا اجر۔

شیخین نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ دو عورتیں تھیں، جن کے پاس اپنا اپنا بچہ تھا، اچانک ایک بھیریا آیا اور ایک کا بچہ اٹھا کر لے گیا۔ ہر عورت دوسری کو کہتی کہ وہ تمہارا بچہ لے گیا ہے۔ وہ دونوں فیصلہ کرانے کے لئے حضرت داؤد کے پاس آئیں، آپ نے فیصلہ بڑی عورت کے حق میں کر دیا۔ وہ یہ فیصلہ نہ کر حضرت سلیمان کے پاس آئیں اور اپنا جائز بنایا۔ آپ نے فرمایا پھری لے آؤ میں اس بچہ کے دو ٹکڑے کر کے دونوں کو ایک ایک ٹکڑا دے دوں گا۔ چھوٹی عورت نے کہا حضرت! اللہ آپ پر رحم کرے آپ ایسا نہ فرمائیں یہ بچہ اس عورت کا ہے (تو آپ نے اس چھوٹی عورت کی شفقت دیکھ کر) فیصلہ چھوٹی کے حق میں فرمایا (1)۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے ذکر الہی میں جب سستی آ جاتی تو پہاڑ اور پرندے ذکر کرتے تاکہ آپ ان کا ذکر نہ کریں کہ دوبارہ جست و چوبند ہو جائیں۔ معاکا تعلق مسخر ناما یسبحن کے ساتھ ہے۔ لفظ کے اعتبار سے پہلی ترکیب بہتر ہے اور معنی کے اعتبار سے دوسری ترکیب افضل ہے۔ یسبحن کا جملہ جبال سے حال ہے اور تغیر کی وجہ بیان کرنے کے لئے جملہ مستفاد ہے۔ الطیر کا عطف الجبال پر ہے یا مفعول معہ۔ جبال کو طیر پر مقدم کیا گیا ہے کیونکہ پہاڑوں کا تسبیح کرنا اور ان کا سحر ہونا زیادہ توجہ خیز ہے۔ وہ ب فرماتے ہیں پہاڑ حضرت داؤد علیہ السلام کے جواب میں تسبیح بیان کرتے تھے اور اسی طرح پرندے بھی آپ کی تسبیح کے جواب میں تسبیح کرتے تھے۔ قنادہ فرماتے ہیں تسبیح کا مطلب نماز پڑھنا ہے، یعنی جب داؤد علیہ السلام نماز پڑھتے تو پہاڑ اور پرندے بھی نماز پڑھتے تھے۔ ابن عباس فرماتے ہیں حضرت داؤد علیہ السلام پتھروں اور درختوں کی تسبیح کو سمجھتے تھے بعض علماء فرماتے ہیں جب داؤد علیہ السلام تسبیح میں ست پڑ جاتے تو اللہ تعالیٰ انہیں پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح سنانا تاکہ وہ تسبیح کرنے میں دوبارہ شوق کرنے لگیں (2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یسبحن، مسباحہ سے مشتق ہے۔ جس کا معنی چلنا ہے یعنی جب داؤد علیہ السلام چلے تو پہاڑ اور پرندے بھی آپ کے ساتھ چلے۔ ابن اور ہم ہی سلیمان کو فیصلہ سمجھانے والے اور ہم ہی ہر ایک کو علم و حکمت عطا فرمانے والے اور پہاڑوں اور پرندوں کو داؤد کے لئے مسخر کرنے والے تھے۔

وَعَلَيْهِ صَعَةٌ لَّبُؤِينَ لَكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِنْ بَأْسِكُمْ فَهَلْ أَنْتُمْ
شُكْرُونَ (3)

”اور ہم نے سکھا دیا انہیں زرہ بنانے کا ہنر تمہارے فائدہ کے لئے تاکہ وہ زرہ بچائے تمہیں تمہاری زد سے لے تو کیا تم
(اس احسان کا) شکر یہ ادا کرنے والے ہو۔“

۱۔ لبوس ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو پہنی جاتی ہے اور مجازاً ہر اسلحہ کے لئے استعمال ہوتا ہے اور یہاں مراد لبو ہے کی زر ہیں ہیں۔ قنادہ فرماتے ہیں طلقوں اور کڑیوں والی زرہ سب سے پہلے حضرت داؤد علیہ السلام نے بنائی تھی، جبکہ پہلے زرہ بالکل سیدھی ہوتی تھی (3)۔

حدیث پاک میں گزر چکا ہے کہ داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے۔ ابو جعفر ابن عامر، حفص اور یعقوب نے تاء کے ساتھ تحصنکم پڑھا ہے اور ضمیر کا مرجع صنعة ہے یا دروغ کی تاویل پر یوں ہے اور ابو بکر نے حکم کا صیغہ تحصنکم پڑھا ہے، باقی قراء نے یاء کے ساتھ یحصنکم پڑھا ہے اور ضمیر داؤد علیہ السلام کے لئے ہے یا اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اس صورت میں تکلم سے غائب کی طرف التفات ہوگا۔ باس سے مراد حرب (جنگ) ہے۔ لکم، علمناہ کے متعلق ہے اور تحصنکم اس کا حرف جر کے اعادہ کے ساتھ بدل اشتمال ہے۔

۱۰. فہل انتم شاکرون میں خطاب اہل مکہ کو ہے مبالغہ اور توخ کے لئے شکر کے امر کو استفہام کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے۔

وَالسُّيْمِیْنَ الرِّیْحِ عَاصِفَةً تَجْرِي بِأَمْرِ إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَرَكْنَا فِيهَا
وَكُنَّا بِحَلِّ شَيْءٍ عَلِيمِينَ ۝

”اور ہم نے سلیمان کے لئے لے کر تندر تیز ہوا کو فرمایا اور ہمارا بنادیا جسے چلتی تھی وہ ہوا ان کے حکم سے اس سرزمین کی طرف جسے ہم نے بابرکت بنادیا تھا اور ہم ہر چیز کو جاننے والے تھے سو“

۱۱. سلیمان کا عطف مع داؤد پر ہے اور الریح کا عطف (ایک حرف عطف کے ساتھ) الجبال پر ہے کیونکہ یہ دونوں ایک عامل کے دو مفعول ہیں۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے مع اشتمال فرمایا جبکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے لام استعمال فرمایا (حالانکہ ہاتھ میں لوہے کا نرم ہونا اور اس سے زبردیں بنانا اور اسی طرح ہوا کا سلیمان علیہ السلام کے تخت کو اڑانا ہر ایک چیز ہر نبی کے لئے معجزہ ہے اس فرق کی وجہ کیا ہے) اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام اپنے معجزہ سے اس طرح خدمت لیتے تھے جس طرح مالک اپنی مخلوق سے خدمت لیتا ہے، اس ملکیت کے اظہار کے لئے لام استعمال فرمایا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی تسبیح کے وقت پہاڑوں اور پرندوں کا تسبیح میں موافقت کرنا معجزہ ہے لیکن ان کے معجزہ کی یہ کیفیت نہیں ہے جیسی مملوک کی نسبت مالک کی طرف ہوتی ہے (۱) بعض محققین علماء فرماتے ہیں پہاڑوں اور پرندوں کا حضرت داؤد کے ساتھ تسبیح کرنا حضرت داؤد کے حکم کے بغیر ہوتا تھا اس لئے ان کے ساتھ مع کلمہ ذکر فرمایا اور ہوا کا چلنا حضرت سلیمان کے حکم سے تھا اس لئے ان کے ساتھ لام کا کلمہ ذکر فرمایا۔

۱۲. عاصفۃ الریح سے حال ہے۔ اس سے مراد تیز ہوا ہے۔ وہ ہوا آپ کے تخت کو تھوڑی سی مدت میں بہت دور لے جاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی سرعت رفتار کو بیان کرتے ہوئے فرمایا عُدُّهَا شُهُورٌ وَرُجُومُهَا شَهْرٌ اس کی صبح کی منزل ایک ماہ کی اور شام کی منزل ایک ماہ کی ہوتی (اور وہ ہوا ہی نفسہا بڑی نرم اور پیاری ہوتی تھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں حضرت سلیمان کے ارادہ کے مطابق ہوا کبھی نرم ہوتی تھی اور کبھی تندر تیز ہوتی تھی۔

۱۳. تجری باموہ دوسرا حال ہے یا پہلے حال سے بدل ہے یا پہلے حال کی ضمیر سے حال ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں الی الارض میں الی بمعنی من ہے کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی منزل شام تھی جو انبیا کا وطن ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں الی اپنے معنی میں ہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ صبح سویرے آپ یہاں سے جاتے تھے اور شام کے وقت اپنی منزل کی طرف واپس آتے تھے اور ہمازل سے ہر چیز کو جانتے تھے اس لئے ہمارا ہر کام اور ہر فصلہ حکمت پر مبنی ہوتا ہے، ہم نے سلیمان علیہ السلام کو تسخیر ہوا وغیرہ کی جو سر فرمایاں

عطا کی تھیں ان چیزوں نے (حضرت سلیمان علیہ السلام) کو اپنے رب کریم کے حضور خشوع و خضوع کرنے کا باعث بنایا۔

حضرت دہب بن منبہ فرماتے ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام جب اپنی مجلس سے باہر تشریف لاتے تو پرندے آپ پر اپنے پروں سے سایہ کرتے تھے اور جن آپ کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو جاتے۔ حتیٰ کہ آپ اپنے تخت پر تشریف فرما ہو جاتے۔ آپ بہت زیادہ جنگجو تھے، ہر وقت کسی نہ کسی مہم پر رہتے تھے۔ بہت کم ہی گھر بیٹھتے تھے، جب بھی کسی جگہ پر کسی بادشاہ کی خبر پہنچتی تو آپ اس کو بلا لیتے اور اسے دعوتِ حق دیتے تھے۔ جب آپ کسی مہم کو سر کرنے کا ارادہ فرماتے تو اپنے لشکر کو تیاری کا حکم دیتے پھر ایک تخت تیار کیا جاتا اور اس کے اوپر حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے مخصوصی کلزی کی مسند لگائی جاتی پھر اس تخت پر لوگوں جو پایوں اور آلاتِ حرب کو سوار کیا جاتا۔ جس کو آپ نے ساتھ لے جانا ہوتا، جب وہ سارے سوار ہو جاتے تو آپ ہوا کو حکم دیتے، ہوا اس تخت کے نیچے سے گزرتی اور اسے اٹھالیتی اور جب اوپر جاتی تو آپ اسے نرم ہونے کا حکم دیتے، تیز رفتار تھی کہ ایک ماہ کی مسافت صبح کو اور ایک ماہ کی مسافت شام کو طے کر لیتی تھی۔ لشکر کو کھانے ہوئے وہ ہوا اتنی نرم ہوتی کہ کسی سختی سے گزرتی تو وہ کھیتی یا کھل حرکت بھی نہ کرتی اور نہ کسی پرندے کو نقصان پہنچاتی اور نہ مٹی اُڑاتی تھی۔ وہ بیان فرماتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ جگہ کے کنارے ایک جگہ پر لکھا ہوا تھا اور یہ تحریر حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھیوں میں سے کسی نے لکھی تھی وہ لکھنے والا جن تھا یا انسان (تحریر یہ تھی) ہم اس جگہ اترے لیکن ہم نے یہاں رات نہ گزاری، صبح ہم اصطخر سے چلے تھے اور ہم نے یہاں قیلولہ کیا تھا، ہم پچھلے پہر یہاں سے انشاء اللہ رخصت ہوئے گئے اور رات شام میں گزریں گے (1)۔

مقابل فرماتے ہیں جنہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے ریشم اور سونے کی تاروں سے ایک قالین بنایا تھا جس کی لمبائی اور چوڑائی ایک فرسخ تھی۔ اس قالین کے درمیان حضرت سلیمان کے لئے سونے کا منبر رکھا جاتا تھا، آپ اس پر تشریف فرما ہوتے اور آپ کے ارد گرد تین ہزار سونے اور چاندی کی کرسیاں لگی ہوتی تھیں۔ انبیاء کرام سونے کی کرسیوں پر بیٹھتے اور علماء چاندی کی کرسیوں پر بیٹھتے، ان کے ارد گرد لوگ ہوتے اور لوگوں کے ارد گرد جن اور شیطان ہوتے پرندے حضرت سلیمان علیہ السلام پر سایہ کرتے تھے، اس لئے آپ کو دھوپ نہ لگتی تھی۔ صبح کی ہوا اس قالین کو صبح سے دو پہر تک ایک مہینہ کی مسافت طے کراتی اور دو پہر سے شام تک ایک مہینہ کی مسافت طے کراتی (2)۔

سعید بن جبیر سے مروی ہے، فرماتے ہیں حضرت سلیمان کے ساتھ چھ لاکھ کرسیاں ہوتی تھیں۔ آپ کے قریب انسان بیٹھتے اور ان کے پیچھے جن بیٹھتے۔ پرندے آپ کے اوپر سایہ کرتے پھر اس پورے مجمع کو تخت سمیت ہوا اٹھا لیتی تھی۔

حسن فرماتے ہیں ایک دن حضرت سلیمان علیہ السلام گھوڑوں میں مشغول ہوئے تو آپ کی نماز عصر فوت ہو گئی۔ آپ کو فہم آیا تو آپ نے گھوڑوں کی کونچیں کاٹ دیں تو اللہ تعالیٰ نے گھوڑوں کی جگہ اس سے بہتر چیز (ہوا) کی سواری عطا فرمادی۔ ہوا آپ کے حکم سے چلتی تھی جیسے آپ چاہتے تھے۔ ایلیا سے صبح چلنے، اصطخر میں قیلولہ کرتے پھر یہاں سے چلنے اور شام کو بائیں پہنچ جاتے۔

ابن زید فرماتے ہیں آپ کی کلزی کی ایک سواری تھی، اس میں ہزار حصے تھے اور ہر حصہ میں ہزار کمرے تھے۔ اس سواری پر آپ کے ساتھ انسان اور جن سوار ہوتے، ہر حصہ کے نیچے ہزار جن ہوتے۔ وہ اس طرح کلزی کے مرکب کو اٹھاتے تھے۔ جب وہ سواری اوپر ہو جاتی تو نرم نرم ہوا آتی پھر وہ اس سواری کو لے کر اڑاتی۔ آپ ایک ایسی قوم کے پاس قیلولہ فرماتے جو آپ سے ایک ماہ کی

مسافت پر ہوتی اور شام بھرا کسی قوم کے پاس کرتے جو ایک مہینہ کی مسافت پر ہوتی۔ قوم کو پتہ ہی نہ ہوتا کہ لشکر سمیت ان کے پاس پہنچ جاتے۔

روایت ہے کہ سلیمان علیہ السلام اہل عراق سے صبح کے وقت روانہ ہوئے پھر مرو میں قیلولہ فرمایا پھر نماز عصر پلخ کے شہر میں پڑھی۔ اس دوران آپ کو اور آپ کے لشکر کو ہوا اٹھانے ہوئے تھے اور پرندے آپ پر سایہ لگن تھے۔ پھر آپ پلخ سے ترکستان پہنچے پھر چین کی زمین پر قدم نہ چوڑھا ہوئے۔ صبح ایک مہینہ کی مسافت طے فرماتے اور شام سے پہلے بھی ایک مہینہ کی مسافت طے فرماتے۔ پھر آپ کا لشکر مشرق کی طرف ساحل سمندر کی طرف مزاحمتی کہ قدحاری زمین پر پہنچ گیا۔ پھر یہاں سے مکران کرمان پہنچے پھر یہاں سے ہوتے ہوئے فارس کی زمین پر پہنچے، یہاں کئی روز قیام فرمایا۔ یہاں سے صبح چلے تو دو پہر کسکر میں گزرا پھر شام پہنچے، آپ کا پایہ تخت تدمر کا شہر تھا۔ شام سے عراق جانے سے پہلے آپ نے جنوں کو حکم دیا کہ وہ آپ کے لئے سفید سنگ مرمر اور زرد پتھروں سے ایک عمارت تعمیر کریں۔ نابغے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے۔ سلیمان کو جب اس کے مالک حقیقی نے حکم دیا کہ انصواور کائنات ارضی کی تقدیر کر اور جنوں کے لشکر کو میں نے حکم دیا ہے کہ وہ پتھر اور چٹانیں گھر کر تعمیر کریں (۱)۔

وَمِنَ الشَّيْطَانِ مَن يَعْصُونَ لَهُ وَيَعْمَلُونَ عَمَلًا دُونَ ذَلِكَ وَكُنَّا لَهُمْ حَافِظِينَ ﴿۱﴾

”اور ہم نے مسخر کر دیئے شیطانوں میں سے جو (سمندروں میں) غوطہ زنی کرتے ان کے لئے اور کیا کرتے طرح طرح کے لے اور کام اور ہم ہی ان کے نگہبان تھے لے۔“

لے من نکرہ موصوفہ ہے یا موصولہ ہے اور الوریع پر معطوف ہے اور من الشیاطین حال مقدم ہے یا من مبتدأ ہے اور ظرف خبر ہے۔ یعملون کا عطف یغصون پر ہے۔ جنات سمندروں میں غوطہ زن ہو کر موتی اور جواہر نکال کر لاتے تھے اور اس کے علاوہ وہ دوسرے مشقت کے کام کرتے مثلاً بلند و بالا عمارتیں بناتے، بجستے اور بڑے بڑے حوض اور ایک جگہ پر قائم رہنے والی دیکھیں شہروں اور محلات کی تعمیر اور دوسری عجیب وغریب صنعتیں وغیرہ۔

عہ ہم جنات کی نگرانی کرتے تھے تاکہ حضرت سلیمان حکم کی نافرمانی نہ کریں زجاج فرماتے ہیں اور نگہبانی کرتے تھے تاکہ جو کچھ انہوں نے حضرت کے حکم سے بنایا ہے اسے دوبارہ توڑ نہ دیں۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام جب کسی جن کو انسان کے ساتھ کسی کام کے لئے بھیجے تو آپ انسان کو فرماتے کہ جب یہ کام سے فارغ ہو جائے تو اسے دوسرے کام پر لگا دینا کیونکہ جنوں کی یہ عادت ہے کہ جب کسی کام سے فارغ ہو جاتا ہے اور کوئی دوسرا کام نہیں ہوتا تو وہ پہلے کے ہوئے کام کو ہی توڑ دیتے ہیں (۲)۔

وَ اَيُّوبَ اِذْ نَادَى رَبَّهُ اَنْى مَسْنَى الطَّمْرُ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرَّحِیْمِ ﴿۱﴾

”اور یاد کرو ایوب کو جب پکارا انہوں نے اپنے رب کو لے کہ مجھے بچھی ہے سخت تکلیف لے اور تو ارحم الراحمین ہے (میرے حال زار پر رحم فرما) لے۔“

۱۔ نادى کا معنی دعا کرنا ہے اور ایوب اذ نادى اعراب میں نوحاً اذ نجیباً کی طرح ہے۔ وہب بن منبہ فرماتے ہیں ایوب علیہ السلام کا تعلق روم سے تھا اور آپ کا سلسلہ نسب اس طرح ہے ایوب بن احرص بن رازح بن روم بن حیس بن املح بن ابراہیم علیہما السلام اور آپ کی والدہ لوط بن ہارن کی اولاد سے تھی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو چن لیا تھا اور مرتبہ نبوت پر فائز فرمایا تھا۔ نیز آپ کے لئے اللہ تعالیٰ نے دنیا کو وسیع فرمادیا تھا۔ شام کے علاقہ میں آپ کی ملکیت میں ایک اداوی تھی جس میں ہموار اور پہاڑی ہر قسم کی زمین تھی۔ آپ کے پاس ہر قسم کا مال تھا اونٹ، گائیں، بکریاں، گھوڑے اور گدھے سب موجود تھے۔ مال کی کثرت اور زیادتی میں کوئی شخص آپ سے افضل نہ تھا، آپ کے پاس پانچ سو جوڑیاں تھیں۔ جن کو پانچ سو غلام جوتے تھے اور ہر غلام کے لئے ایک بیوی اولاد اور مال تھا۔ ہر جوڑی کے سامان کو اٹھانے کے لئے ایک گدھی تھی اور ہر گدھی کے تین چار اور پانچ یا اس سے بھی زیادہ بچے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کو بچے اور بچیاں بھی کثرت سے عطا فرمائی تھیں۔ آپ ایک نیکو کار، پرہیزگار، مسکینوں پر رحم فرمانے والے شخص تھے۔ آپ مسکینوں کو کھانا کھلاتے، بیوہ، یتیموں اور یتیموں کی کفالت فرماتے، مسلمانوں کی عزت کرتے اور مسافروں کو منزل مقصود تک پہنچانے کا اہتمام فرماتے تھے۔ آپ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ہر لمحہ شکر ادا فرماتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے حقوق پورے فرماتے تھے۔ ایلیس لعین کے ادا سے آپ محفوظ تھے۔ عام طور پر اہل ثروت، جس طرح ذکر الہی اور یاد الہی سے غافل ہوتے تھے آپ ایسی کیفیت سے بالکل مبرا تھے۔ آپ کے تین اصحاب تھے جو آپ پر ایمان لائے تھے اور آپ کی تصدیق کرتے تھے۔ ان میں سے ایک کا تعلق یمن سے تھا جس کا نام ایلیس تھا اور دو کا تعلق حضرت ایوب کے شہر سے تھا۔ ایک کا نام یلد اور دوسرے کا نام صاف تھا۔ یہ تینوں جوان تھے۔ یہ وہ دور تھا کہ شیطان پر آسمانوں پر جانے کی پابندی نہ تھی وہ آسمانوں میں جہاں جانا چاہتا تھا جاسکتا تھا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے یسعی علیہ السلام کو اٹھایا تو ایلیس کو چار آسمانوں سے روک دیا گیا پھر جب محمد ﷺ تشریف لائے تو باقی آسمانوں سے بھی اسے روک دیا گیا۔ جب حضرت ایوب ذکر الہی اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا میں مصروف تھے تو فرشتوں نے حضرت ایوب کے لئے نل کر دیا۔ بغاوت اور حسد کی آگ میں ایلیس جل گیا۔ وہ فوراً آسمان کی اس جگہ پہنچا جہاں وہ رہا کرتا تھا۔ شیطان نے کہا یا اللہ میں نے میرے بندے ایوب کو دیکھا ہے تو نے چونکہ اس پر انعام کیا ہے اس لئے وہ تیرا شکر ادا کرتا ہے تو نے اسے عافیت دی ہے اس لئے وہ تیری حمد و ثنا میں رطب اللسان رہتا ہے اگر تو اس سے یہ ساری نعمتیں چھین لے تو پھر یہ تیرا شکر و اطاعت نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے شیطان میں نے تجھے اس کے مال پر تسلط عطا کیا ہے۔ ایلیس دور تا ہوا زمین پر آیا اور اپنے تمام جیلوں کو جمع کیا اور انہیں کہا کس کو یہ طاقت ہے مجھے ایوب کے مال پر تسلط عطا کیا گیا ہے مال کا خسارہ ایسا خسارہ ہے جس پر بڑے بڑے دل گردے والے بھی پریشان ہو جاتے ہیں۔ ایک شیطان نے کہا مجھے یہ قوت ہے تو کیا چاہتا ہے۔ میں آگ کا گولہ این کر اس کی ہر چیز جلا دوں گا۔ ایلیس نے اسے کہا جا اور جب اس کے اونٹ چراگاہ میں چر رہے ہوں تو انہیں جلا دے وہ شیطان زمین کے نیچے سے آگ کا شعلہ بن کر نکلا جو چیز اس کے قریب آئی جل جاتی۔ اس نے حضرت ایوب کے سب اونٹوں کو جلا دیا۔ پھر شیطان اونٹوں کے سنگران کی شکل میں ایوب کے پاس آیا، جبکہ آپ کھڑے ہو کر نماز ادا کر رہے تھے۔ شیطان جو انسانی شکل میں آیا ہوا تھا حضرت ایوب سے کہنے لگا ایوب تو نے دیکھا کہ آگ آئی اور اس نے تیرے اونٹ ہی جلا دیے اور دوسرے کے اونٹ بھی راکھ کر دیئے۔ حضرت ایوب نے فرمایا سب تفریقیں اس ذات کے لئے ہیں جس نے وہ اونٹ عطا فرمائے تھے، اسی نے لے لئے ہیں۔ میں اپنے مال اور جان کو فدا ہونے والا جانتا ہوں۔ ایلیس نے کہا تیرے رب نے آسمان سے آگ برسائی جس نے سب اونٹ جلا

دیئے۔ لوگ حیران اور متعجب تھے۔ بعض کہتے ایوب کسی کی عبادت نہیں کرتا یہ کسی دھوکا میں ہے۔ بعض کہتے اگر ایوب کا کوئی خدا ہوتا تو ان کے اونٹ ضائع نہ ہوتے۔ بعض کہتے اللہ تعالیٰ نے اس لئے ان کے ساتھ ایسا کیا ہے تاکہ ان کے دشمن خوش ہوں اور دوست پریشان ہوں۔ حضرت ایوب نے کہا اَللّٰھُمَّ اللّٰھُ جب میں دنیا میں آیا تھا تو برہنہ تھا اور پھر جب واپس جاؤں گا تو بھی برہنہ ہوں گا۔ پھر قیامت کے دن جب اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گا تو تب بھی برہنہ ہوں گا۔ تیرے لئے یہ مناسب نہیں کہ جب تجھے کوئی چیز عاریتاً ملے تو تو پھولے نہ سائے اور جب وہ عاریتاً چیز واپس لے لے تو تو آدھے فغان شروع کر دے۔ تیرا اور تیرے مال کا اللہ تعالیٰ زیادہ مستحق ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ تجھ میں بھلائی دیکھتا تو تیری روح کو ان رحوں کے ساتھ نکل کرتا اور تو شہید ہو جاتا لیکن اس نے تجھ میں برائی دیکھی ہے اس لئے اس نے تمہیں ان شہداء سے نکال دیا ہے۔ ابلیس اپنے چیلوں کی طرف ذلیل و رسوا ہو کر لوٹا اور نہیں کہا تمہارے پاس کیا طاقت ہے میں تو ایوب کو ذمہ نہیں کر سکا۔ ایک شیطان نے کہا میرے پاس یہ طاقت ہے اگر تو چاہے تو میں ایک بیچ ماروں جسے کوئی بھی ذی روح سنے گا تو اس کی روح نکل جائے گی۔ شیطان نے اسے کہا ان کی بکریاں جہاں چر رہی ہیں وہاں جاؤ اور ان کے درمیان بیچ مارو۔ اس نے ابلیس کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے بکریوں کے ریوڑ میں جا کر بیچ ماری تو وہ سب مر گئیں پھر وہ چرواہے کی شکل میں ایوب کے پاس آیا، حضرت ایوب کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے۔ ابلیس نے پہلے کی طرح گفتگو کی تو حضرت ایوب نے بھی پہلے کی طرح جواب دیا۔ پھر ابلیس اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا اور کہا تمہارے پاس کون سی طاقت ہے میں تو ایوب کے دل کو ذمہ نہیں کر سکا۔ ایک جن نے کہا میرے پاس طاقت ہے، میں تند و تیز ہواؤں کو ہر چیز کو اڑالے جاؤں گا۔ ابلیس نے اسے کہا تم جاؤ اور ان کی کھیتوں پر حملہ کرو وہ شیطان چلا گیا لوگوں کو محسوس نہ ہوا حتیٰ کہ ایک تیز آنکھی چلی جو ہر چیز کو اڑا کر لے گئی۔ یوں محسوس ہوتا گویا یہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ پھر ابلیس ایک کسان کی صورت میں ایوب کے پاس آیا۔ آپ نماز پڑھ رہے تھے۔ اس نے پہلے کی طرح گفتگو کی حضرت ایوب نے بھی پہلے کی طرح جواب دیا۔ جب حضرت ایوب کا تمام مال ضائع ہو گیا تو آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی اور راضی بقضائے ما لہمی ہوئے اور صبر کا دامن مضبوطی سے پکڑے رکھا۔ جب ابلیس نے حضرت ایوب کا سارا مال ضائع کر دیا تو پھر اوپر چڑھ گیا اور کہا الہی ایوب کو تو نے جو اولاد عطا کی ہے اور تو نے مال عطا کیا ہے اسی وجہ سے وہ تیرا شکر کرتا ہے۔ کیا تو مجھے اس کی اولاد پر تسلط دیتا ہے۔ کیونکہ یہ اولاد کی تکلیف ایسی تکلیف ہے جس سے بڑے بڑے مردوں کے کلیجے کھل جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جا میں نے تجھے اس کی اولاد پر بھی تسلط عطا کیا ہے۔ دشمن خدا چلا گیا۔ حضرت ایوب کی اولاد کے پاس آیا جبکہ وہ اپنے محل میں تھے۔ اس نے محل کو بلایا اور دیواروں کو آپس میں کرایا پھر لکڑیاں اور پتھر ان کے اوپر پھینکتے حتیٰ کہ سب جب زخمی ہو گئے تو ابلیس نے محل کو اٹھا کر الٹا کر کے پھینک دیا، وہ ایوب کے پاس معلوم بن کر آیا جو ان کو حکمت سکھایا کرتا تھا۔ زخمی حالت میں آیا، جبکہ اس کا خون اور دماغ بہ رہا تھا۔ کہنے لگا ایوب اگر آپ اپنے بیٹوں کو دیکھتے کیسے غدا پ دیا گیا اور کیسے انہیں الٹا گرایا گیا، جبکہ اس کے خون اور دماغ بہ رہے تھے اگر آپ دیکھتے کہ ان کے پیٹ کیسے پھٹے تھے اور ان کی استریاں کیسے بکھری پڑی تھیں اور ان کے دل کیسے نکلے نکلے ہوئے تھے۔ وہ اس طرح حضرت ایوب علیہ السلام کو اولاد کا دم اور تکلیف یاد دلانا رہا حتیٰ کہ آپ کا دل بیچ گیا اور آپ رونے لگے پھر آپ نے مٹی کی مٹی بھر کر اپنے سر پر ڈالی اور کہا کاش مجھے میری ماں ختم ہی نہ دیتی۔ ابلیس نے اس موقع کو قیمت سمجھا اور فوراً اوپر گیا اور اس وقت وہ ایوب کی جڑ فرخ پر خوش تھا۔ اتنے میں ایوب واپس پلٹے اور توبہ و استغفار کیا۔ فرشتے حضرت ایوب کی توبہ لے کر اوپر چڑھے اور ابلیس سے پہلے اللہ کی بارگاہ میں پہنچ گئے۔ ابلیس ذلیل و رسوا ہو کر ظہر

گیا اور کہا یا اے ایوب! وہ مال اور اولاد کا نعم تو آسان تھا کیونکہ انہیں تو نے نفس کی صحت سے نوازا تھا اور اسے یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ مال اور اولاد پر عطا فرمائے گا کیا تو مجھے ان کے جسم پر تسلط عطا فرمائے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جانتے میں نے اس کے جسم پر بھی تسلط عطا کیا لیکن اس کی زبان اور اس کے دل پر تجھے تسلط نہ ہوگا اللہ تعالیٰ جانتا تھا اور ان چیزوں پر تسلط اپنی رحمت کی بناء پر عطا نہ فرمایا تاکہ ایوب کے اجر میں اضافہ ہو اور صبر کرنے والوں کے لئے نمونہ بن جائیں اور ہر ابتلاء میں عبادت گزاروں کے لئے نصیحت بن جائیں تاکہ دنیا والے صبر اور ثواب کی امید میں آپ سے مانوس ہوں۔ انہیں جلدی سے حضرت ایوب کے پاس پہنچا تو اس نے آپ کو نجدہ میں پایا۔ آپ کے سر اٹھانے سے پہلے وہ آپ کے سامنے سے آیا اور آپ کے ناک میں پھونک ماری جس کی وجہ سے آپ کا سارا جسم پھول گیا اور سر سے پاؤں تک پورے جسم پر پھنسیاں نکل آئیں۔ وہ پھنسیاں بکریوں کے جگر جتنی بڑی بڑی تھیں۔ آپ کے جسم میں خارش شروع ہو گئی۔ پہلے آپ اپنے ناخنوں سے کھجاتے رہے حتیٰ کہ ناخن گر گئے پھر کھرہ روئے ناٹ سے کھلایا حتیٰ کہ ناٹ بھی نکلے نکلے ہو گیا پھر ٹھنکریوں اور پتھروں سے کھلایا آپ متواتر اسی طرح کھجاتے رہے حتیٰ کہ گوشت گرنے لگا اور جسم میں بد بو پیدا ہو گئی۔ شہر والوں نے بد بو کی وجہ سے شہر سے نکال دیا اور انہیں ایک اردوڑی پر ڈال دیا اور اوپر ایک چھپرہ بنا دیا۔ سب لوگ آپ کو چھوڑ گئے لیکن آپ کی وفادار بیوی رحمت بنت افراتیم بن یوسف بن یعقوب بن اے سے نہ چھوڑا۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ آپ کی بیوی یوسف علیہ السلام کی بیٹی تھی۔ جیسا کہ ہم نے سورۃ یوسف میں بیان کیا ہے۔ وہ آپ کے پاس آتی رہتی تھی اور جس چیز کی آپ کو ضرورت ہوتی وہ بھی مہیا کرتی تھی، جب تینوں ساتھیوں نے یقین یلبد اور صافرنے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو آزمائش میں مبتلا کر رکھا ہے تو انہوں نے بہتان طرازی شروع کر دی، وہ آپ کو چھوڑ کر چلے گئے لیکن انہوں نے آپ کے دین کو نہ چھوڑا۔ جب آزمائش ختم ہو گئی تو وہ تینوں آپ کے پاس گئے اور آپ سے ناز پیدا گفتگو کرنے لگے اور کہنے لگے جس گناہ کی وجہ سے تم سزا میں مبتلا ہو اس سے توبہ کرو۔

راوی کہتے ہیں ان تینوں کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا، جو عنقوان شباب پر تھا، وہ بھی ایمان لے آیا تھا، اس نے تینوں افراد کو کہا اے عمر رسیدہ لوگو! آپ لوگ اپنی بزرگی کی وجہ سے بات کرنے کے زیادہ مستحق ہو لیکن آپ لوگوں نے جو بات کی ہے اس سے بہتر بات بھی کر سکتے تھے اور جو تم نے اسے ردی ہے اس سے بہتر رائے دے سکتے تھے۔ حضرت ایوب کا تم پر حق ہے اور تم پر ان کی ذمہ داری ہے۔ اے لوگو! تمہیں معلوم ہے تم نے کس شخص کی توبین کی ہے اور کس شخص کی نافرمانی کی ہے اور مرد کمال ہے جس کی تم نے عیب جوئی کی ہے اور اس پر بہتان باندھا ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ایوب علیہ السلام اللہ کے نبی اس کے چہرہ اور اہل زمین میں سے برگزیدہ ہیں۔ پھر تمہیں یہ بھی معلوم نہیں اور نہ تمہیں اللہ نے مطلع کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب سے انہیں مقام نبوت پر فائز فرمایا ہے کبھی وہ اس سے ناراض نہیں ہوا ہے اور جو کرامت و عزت اللہ نے انہیں عطا فرمائی ہے وہ اللہ نے واپس نہیں لی ہے اور تم اتنا عرضہ ان کی معیت میں رہے ہو کیا کبھی ایوب نے اللہ تعالیٰ کے متعلق کبھی کوئی غلط بات کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ اپنے برگزیدہ بندوں انبیاء و صالحین کو آزمائش میں ڈالا ہے اور یہ مصائب و آلام ضروری نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی وجہ سے ہوں بلکہ یہ آزمائش تو ان کی مراتب کی بلندی کے لئے ہوتی ہیں۔ اگر آپ لوگ ایوب کو اس مرتبہ پر فائز نہیں سمجھتے تو کم از کم تمہارے بھائی تو ہیں اور کسی عقلمند کے لئے یہ مناسب نہیں کہ تکلیف کے وقت اپنے بھائی کو چھوڑ جائے اور معصیت میں اتلاء کے وقت اس کو عار دلانے اور اس کی عیب جوئی کر کے ایسی باتوں کے

ساتھ جن کی حقیقت کا اسے علم ہی نہیں ہے حالانکہ اس کا بھائی پہلے ہی تمکین و حزمین ہو بلکہ مروت کا تقاضا تو یہ ہے کہ بھائی اپنے مصیبت زدہ بھائی پر رحم کرے اور اس کے ساتھ غم میں شریک ہو اور اس کے لئے مغفرت کی دعا کرے اور اس کی صحیح کام کی طرف رہنمائی کرے۔ وہ شخص قطعاً دانشمند اور عقلمند نہیں جو ان باتوں سے جاہل ہو۔ اسے عمر رسیدہ لوگو! اللہ کی عظمت و جلال کی قسم موت کا ذکر تمہاری زبانوں کو کھاتا ہے اور تمہارے دلوں کو توڑتا ہے، کیا تم بے خبر ہو کر اللہ کے کچھ بزرگزیہ بندے ایسے ہوتے ہیں جو خشیت الہی کی وجہ سے خاموش ہوتے ہیں حالانکہ نہ وہ عاجز ہوتے ہیں اور نہ ٹنگے ہوتے ہیں بلکہ وہ بڑے فصیح و بلیغ ذکی ہوتے ہیں۔ معرفت الہی کی شراب ظہور سے مست ہوئے ہیں لیکن عظمت الہی کی وجہ سے ان کی زبانیں بولنے سے عاجز ہوتی ہیں۔ ان کے جسموں پر لرزہ طاری ہوتا ہے اور دل ٹکڑے ٹکڑے ہوتے ہیں اور ان کی عقول حیران و ششدر ہوتی ہیں، ہر وقت ان پر جلال الہی اور عظمت کا رعب چھا ہوا رہتا ہے۔ لیکن جب اس کیفیت سے باہر آتے ہیں اور بوش و حواس قائم رکھتے ہیں تو پھر نیک اعمال کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں، اپنے آپ کو ظالموں اور گنہگاروں میں شمار کرتے ہیں حالانکہ وہ ابرار اور نیکوکار ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اپنی جانوں پر ظلم کرنے والا اور اپنے آپ کو کوتاہی کرنے والا شمار کرتے ہیں حالانکہ وہ بڑے دانشمند اور طاقتور ہوتے ہیں۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے فرمایا اللہ تعالیٰ چھوٹے اور بڑے کے دل میں اپنی رحمت کے طفیل حکمت کے انمول موتی ڈالتا ہے۔ پھر جب دل میں حکمت پیدا ہو جاتی ہے تو اللہ اس کو بندے کی زبان پر ظاہر فرماتا ہے، حکمت کا تعلق عمر بڑھاپے اور تجربے سے نہیں ہے، جب اللہ تعالیٰ بچپن میں ہی کسی شخص کو حکمت سے نوازتا ہے تو حکماء کی مجلس میں اس کا مرتبہ کم نہیں ہوتا (گرچہ وہ عمر میں چھوٹا ہوتا ہے) اور حکمت کے حامل لوگ جانتے ہیں کہ عزت کا نور دین خداوندی ہے۔

پھر حضرت ایوب علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے ان سے اعراض فرمایا اور آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تضرع و زاری کرنے لگے۔ عرض کی اسے میرے پروردگار تو نے مجھے کس لئے پیدا فرمایا؟ کاش تو میری تخلیق ہی نہ کرتا کاش مجھے اپنے جرم کا علم ہو جاتا اور اپنے اس فعل کا پتہ چل جاتا جس کی وجہ سے تو نے مجھ سے اعراض فرمایا ہے۔ اگر میں نے کوئی گناہ کیا تھا تو مجھے موت دے دیتا اور مجھے اپنے آبا، کے ساتھ ملا دیتا۔ میرے لئے اس کیفیت سے موت بہتر تھی۔ کیا میں مسافروں کے لئے پناہ گاہ اور مسکینوں کے لئے قراگاہ نہ تھا اور یتیموں بیواؤں کا نگران و خیر خواہ نہ تھا۔ الہی! میں تیرا بندہ ہوں اگر تو مجھ پر احسان فرمائے تو یہ تیرا کرم ہے اور اگر تو مجھے تکلیف پہنچانے تو تجھے اختیار ہے تو نے مجھے مصیبتوں کا نشانہ اور آزمائش کی آماجگاہ بنا دیا۔ مجھ پر ایسی مصیبت آچری ہے کہ اگر تو اس کو پہاڑ پر مسلط کرتا تو وہ بھی برداشت نہ کر سکتا۔ پھر میرے جیسا ناتواں کیسے برداشت کرے گا۔ تیرے فیصلہ اور فقہانے مجھے پست کر دیا ہے اور تیری سلطنت اور غلبہ نے بد حال کر دیا ہے اور میرے جسم کو تحیف و کمزور کر دیا ہے۔ اگر میرا رب اپنی ہیبت کو میرے سینہ سے نکال دے اور میری زبان کو آزاد کر دے تاکہ میں دل کھول کر اپنے دکھوں کا اظہار کر سکوں پھر بندے کو اپنے نفس پر جت قائم کرنے کی اجازت بھی ہوتی تھی یقین ہے کہ وہ کریم ذات مجھے اس تکلیف سے نجات عطا فرمادے گی۔ لیکن وہ ذات مجھ سے بہت بلند و بالا ہے، وہ مجھے دیکھتا ہے لیکن میں اسے نہیں دیکھتا۔ وہ میری بات سنتا ہے لیکن میں اسے نہیں سنتا۔ وہ میری طرف نظر عنایت نہیں کرتا ہے اور نہ مجھ پر رحم فرماتا ہے اور نہ وہ میرے قریب ہے اور نہ مجھے قریب کرتا ہے کہ میں اپنی گزارش کر سکوں اور اپنی برأت کا اظہار کر سکوں اور اپنی طرف سے خاصہ کر سکوں۔ حضرت ایوب نے جب یہ کہا تو آپ کے اصحاب آپ کے پاس بیٹھے تھے، فوراً ایک ہادل چھا گیا، آپ کے

اصحاب نے اسے عذاب الہی گمان کیا۔ پھر اس بادل سے آواز آئی اسے ایوب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں تیرے قریب ہوں اور ہمیشہ تیرے قریب رہا ہوں اٹھو اور اپنا بندہ پیش کر اور اپنی برأت کا اظہار کرو اور اپنا دفاع کرو۔ اپنا کمر بند مضبوطی سے باندھا دو اگر تجھے طاقت ہے تو اس جابر کے مقام پر کھڑا ہو جو کسی جابر سے مقابلہ کے لئے کھڑا ہوتا ہے۔ تیرے نفس نے تجھے اس مقام پر پہنچایا یا ہے جو تو اپنی طاقت کے ساتھ اپنے مقصد کو پاسکتا ہے (لیکن ایسا ہرگز نہیں) تو اس دن کہاں تھا جس دن میں نے زمین کو تخلیق کیا تھا اور اس کو اس کی بنیادوں پر رکھا تھا کیا تو اس کی اطراف پھیلانے کے وقت میرے ساتھ تھا؟ کیا تجھے علم ہے کہ میں نے اسے کس مقدار میں بنایا ہے اور کس چیز پر اس کو رکھا ہے؟ کیا تیرے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے پانی نے زمین کو اٹھایا ہوا ہے؟ یا کیا تیری حکمت سے زمین کو ڈھانپنے ہوئے ہے۔ تو اس وقت کہاں تھا جب میں نے آسمان کو ہوا میں چھت کی صورت میں بنایا؟ نہ تو وہ اوپر سے کسی ری سے باندھا ہوا ہے اور نہ نیچے سے کوئی اس کا ستون ہے کیا تیری حکمت سے اس کا نور جاری ہے یا اس کے ستارے اپنے اپنے مدار میں رواں دواں ہیں یا گردش لیل و نہار کیا تیرے حکم سے ہے۔ تو اس وقت کہاں تھا جب میں نے نہریں جاری فرمائیں اور دریاؤں سمندروں کو پانی سے بھر دیا۔ کیا تیرے حکم سے پانی کی موجیں اپنی حدود سے تجاوز کرتی ہیں یا کیا تیری قدرت سے رحم کے صدف کا منہ کھلتا ہے۔ جب مدت حمل پوری ہو جاتی ہے۔ تو اس وقت کہاں تھا جب میں نے پانی کو مٹی پر روکا اور میں نے بلند و بالا پہاڑ قائم کر دیئے۔ کیا تو جانتا ہے کہ کس چیز پر میں نے ان کو گاڑ دیا ہے اور یہ کتنے روزوں میں نے بنائے ہیں۔ کیا تیرے پاس ایسی طاقت ہے کہ تو ان کو اٹھا سکے۔ کیا تو جانتا ہے کہ پانی آسمان کی کس جگہ سے نازل ہوتا ہے؟ کیا تو جانتا ہے کہ بادل کس سے بنتا ہے؟ کیا تو جانتا ہے کہ اونوں اور برف کا خزانہ کہاں ہے۔ کیا تو جانتا ہے کہ دن کے وقت رات کا خزانہ کہاں ہوتا ہے اور رات کے وقت دن کا خزانہ کہاں ہوتا ہے، ہوا کا خزانہ کہاں ہوتا ہے۔ کیا تجھے معلوم ہے درخت کس زبان میں کلام کرتے ہیں اور کس ذات نے مردوں کے اندر عقل کی دولت رکھی ہے، کانوں اور آنکھوں کے سوراخ کس نے بنائے۔ فرشتے کس کی حکومت کے سامنے سرنگوں ہیں اور جابر لوگ کس کی طاقت کے سامنے مغلوب ہیں اور کس نے خاص اپنی حکمت سے رزق کو تقسیم فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام کے سامنے اپنی قدرت کی نشانیوں کا کثرت سے ذکر فرمایا۔

حضرت ایوب علیہ السلام نے عرض کیا (اے ساری قدرتوں کے مالک!) جو کچھ تو نے ارشاد فرمایا اس کے جواب سے میری ذات بہت حقیر ہے۔ میری زبان گنگ ہے اور میری عقل بہت پیچھے ہے اور میری قوت بہت کمزور ہے۔ اے میرے معبود! مجھے معلوم ہے کہ جو کچھ تو نے اپنی قدرت کی نشانی بیان فرمائی ہیں وہ سب تیری قدرت کی کرشمہ سازی ہے اور تیری حسن تدبیر کی مرہون منت ہے بلکہ تیری قدرت اس سے بھی کہیں بلند و بالا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اگر تو کوئی کام کرنا چاہے تو کوئی طاقت تجھے عاجز نہیں کر سکتی اور تیری نظر سے کچھ مخفی نہیں ہے۔

اے میرے اللہ! جب مجھے مصیبت نے چاروں طرف سے گھیر لیا تو میری زبان سے بے ساختہ یہ جملہ نکل پڑے، میں ضبط نفس نہ کر سکا۔ مصیبت نے مجھے بھی بولنے پر اور شکایت کی زبان کھولنے پر مجبور کیا۔ کاش زمین پھٹ جاتی اور میں اس میں دھنس جاتا اور میں ایسی کام نہ کرتا جو میرے رب کریم کی ناراضگی کا باعث بنتی تھی۔ کاش میں اس سے پہلے ہی مر جاتا، میں نے اپنے عذر کو پیش کرنے کے لئے زبان کھولی کاش میں خاموش رہتا تاکہ تو مجھ پر اپنی رحمت کا یمنہ برساتا۔ مجھ سے شکایت کا کلمہ صادر ہوا لیکن آئندہ کبھی ایسا نہ ہوگا۔

میں نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا ہے اور اپنی زبان کو دانتوں کے نیچے دبا دیا ہے اور اپنے چہرے پر برائے ندامت و افسوس میں مل لی ہے۔ میں آج تجھ سے پناہ طلب کرتا ہوں، اس مصیبت میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں مجھے اس مصیبت سے بچالے۔ میں تیرے عذاب سے بچنے کے لئے تیری بارگاہ میں فریاد نکالتا ہوں تو میری مدد فرما، میں تجھ سے مدد کا طلبگار ہوں تو میری اعانت فرما۔ میں تجھ پر بھروسہ کرتا ہوں تو ہی میری کفالت فرما۔ میں تجھ سے حفاظت چاہتا ہوں مجھے ہر موذی چیز سے محفوظ فرما، میں تجھ سے مغفرت طلب کرتا ہوں میرے عیبوں پر پردہ ڈال دے۔ آئندہ میں کوئی ایسا قول و فعل نہیں کروں گا جو تجھے ناپسند ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کی اخلاص میں ڈوبی ہوئی دعا کو قبول فرمایا اور ارشاد فرمایا۔ میرا علم تجھ میں نافذ ہے اور میری رحمت میرے غضب سے سبقت لگتی ہے، میں نے تجھے معاف کر دیا اور تیرے اہل اور مال تجھ پر لوٹا دیا اور ان کی مثل تجھے اور بھی عطا فرما دیا تاکہ تیری ذات جہد میں آنے والوں کے لئے نشانی بن جائے اور تو مصیبت زدوں کے لئے عبرت ہو اور صبر کرنے والوں کے لئے تسلی کا باعث ہو۔ اپنا پاؤں (رضمن پر) مارو۔ یہ نہانے اور پینے کے لئے ٹھنڈا پشمہ ہے اور اس میں تیرے لئے شفا ہے اور اپنے اصحاب کے لئے قربانی دو اور ان کے لئے مغفرت طلب کرو۔ انہوں نے تیرے بارے میں میری نافرمانی کی ہے۔ حضرت ایوب نے اپنا پاؤں زمین پر مارا تو ایک چشمہ پھوٹ پڑا۔ آپ اس میں داخل ہوئے اور غسل فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی تمام بیماریاں اس پانی سے دور فرمادیں۔ پھر آپ باہر تشریف لائے اور بیٹھ گئے۔ آپ کی زوجہ محترمہ آئی، انہوں نے آپ کو اپنی جگہ پر تلاش کیا تو آپ وہاں نہ ملے۔ حیران و ششدر ہو کر کھڑی ہو گئی (کہ ایوب جو اپنی جگہ سے اٹھ کر حرکت نہ کر سکتے تھے کہاں چلے گئے) پھر حضرت ایوب سے پوچھنے لگی اللہ کے بندے کیا تجھے اس شخص کے متعلق کچھ علم ہے جو یہاں مصیبت و بیماری میں پڑا ہوتا تھا۔ حضرت ایوب نے فرمایا میں مجھے علم ہے۔ مجھے کیوں نہ علم ہو۔ یہ جملہ کہہ کر مسکرانے اور پھر فرمایا وہ میں ہی تو ہوں۔ آپ کے پسنے سے بیوی پہچان گئی اور ان کے گلے لگ گئی (1)۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں عبد اللہ کی جان ہے بیوی آپ کے گلے سے چمٹی رہی حتیٰ کہ ہلاک شدہ مال اور اولاد ان کے سامنے سے اللہ تعالیٰ نے گزار دیا۔ اس کا ذکر آیت کریمہ میں ہے (2)۔
یعنی کوثر نے ہاء کے سکون کے ساتھ اور دوسرے قراء نے ہاء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ الضور بری حالت کو کہتے ہیں خواہ وہ نفس میں ہو یا بدن میں یا مال میں یا عزت میں ہو۔ قاموس میں ہے۔ الضور بالفصح اور بالضم کا معنی ضد النفع ہے یا بالفصح مصدر ہے اور بالضم اسم ہے (3)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں بالفصح ہر ضرر کے لئے ہے اور بالضم نفس کی بری حالت کے ساتھ خاص ہے جیسے مرض اور بدنی کمزوری وغیرہ (4)۔

حضرت ایوب علیہ السلام کی دعا کے وقت اور اس سبب کے بارے میں اختلاف ہے جس کی وجہ سے آپ نے انہی مسنی الضور کہا تھا اور اسی طرح آپ کی مصیبت کی مدت کے متعلق بھی اختلاف ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں ابن شہاب نے حضرت انس سے حدیث نقل کی ہے کہ ایوب علیہ السلام اٹھارہ سال مصیبت میں مبتلا رہے۔ وہ ب کہتے ہیں ایوب علیہ السلام پورے تین سال مصیبت میں گرفتار رہے، ایک دن بھی زائد نہیں تھا۔ کعب فرماتے ہیں ایوب

1- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 74 (المنکر)
2- ایضاً
3- التاموس المخبی، جلد 1، صفحہ 601 (التراث العربی)
4- تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 465 (اعلیٰ)

علیہ السلام سات سال مصیبت میں مبتلا رہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ سات سال، سات ماہ اور سات دن مبتلا رہے۔ حسن فرماتے ہیں حضرت ایوب علیہ السلام سات سال اور کچھ مہینے بنی اسرائیل کی اردوڑی پر پڑے رہے اور کبڑے آپ کے اوپر گھومتے رہے۔ آپ کی بیوی رحمت کے سوا کوئی آپ کے قریب نہیں آتا تھا۔ وہ آپ کی خدمت پر لگی رہی اور آپ کے لئے کھانے لاتی تھی۔ جب حضرت ایوب علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے تو وہ بھی آپ کے ساتھ حمد کرتی تھی۔ حضرت ایوب علیہ السلام اس کیفیت میں ذکر الہی کرتے رہے اور مصیبت پر صبر کرتے رہے (۱)۔

ابلیس حضرت ایوب کا یہ صبر اور ایسی حالت میں بھی ذکر الہی دیکھ کر چیخ پڑا اور روئے زمین پر پڑنے والے اپنے لشکروں کو جمع کیا۔ جب وہ جمع ہو گئے تو انہوں نے پوچھا اتنی جرز فروغ کیوں کر رہے ہو؟ ابلیس نے کہا مجھے تو اس بندے نے عاجز کر دیا ہے جس کا نہ میں نے مال چھوڑا ہے، نہ اولاد دیکھن بر تکلیف پر اس کے صبر میں اضافہ ہوتا گیا ہے پھر مجھے اس کے جسم پر تسلط دیا گیا، میں نے اپنی سازش سے اسے اردوڑی پر ڈال دیا جہاں اس کی بیوی کے سوا کوئی اس کے قریب نہ آتا تھا۔ اب میں نے تمہیں بلایا ہے کہ اسے بھڑکانے کے لئے تم میری مدد کرو۔ چیلوں کے کہا تم وہ سارے جرنے استعمال کر چکا ہوں، اب تم کوئی اور تدبیر سوچو اور مجھے بتاؤ۔ چیلوں نے کہا جس حیلے سے تو نے آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالا تھا وہ کیا تھا؟ اس نے کہا میں نے عورت کے ذریعے ان کو جنت سے نکالا تھا۔ انہوں نے کہا ایوب پر بھی عورت کے ذریعے وار کرو۔ ایوب اپنی بیوی کی بات نہ موڑے گا۔ کیونکہ وہی ان کی خدمت گزار ہے اور دوسرا کوئی ان کے پاس نہیں آتا ہے ابلیس نے کہا تم نے ٹھیک کہا ہے۔ ابلیس چلا گیا اور ان کی بیوی کے پاس انسانی شکل میں پہنچ گیا۔ پوچھا تمہارا خاوند کہاں ہے۔ اسے اللہ کی بندی! بیوی نے کہا یہی تو ہے جو اپنے چھوڑوں کو کھلارہا ہے اور کبڑے جس کے جسم پر گھوم رہے ہیں۔ شیطان نے ان کی یہ بات سنی تو اسے کچھ امید لگتی ہی بکھٹا وہ ہے صبری کی وجہ سے کہہ رہی ہے۔ اس لعین نے بیوی کے دل میں وسوسہ ڈالا اور اسے گزشتہ زندگی کی نعمتیں اور مال و متاع کی یاد دلائی اور حضرت ایوب کے جمال و جوانی کا زمانہ یاد دلا یا اور اب وہ جس کرب میں مبتلا تھے اس کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ یہ مصیبت تو کبھی اب دور نہ ہوگی۔ حضرت حسن فرماتے ہیں بیوی کو جب خوشحالی کا زمانہ یاد آیا تو اس کی چیخ نکل گئی۔ ابلیس جان گیا کہ اب اس کے صبر کا پیمانہ بربز ہو گیا ہے۔ وہ ایک بکری کا بچے لے کر آیا اور کہا کہ ایوب غیر اللہ کے نام پر یہ بکر اذبح کریں تو اس مصیبت سے بچ جائیں گے۔ بیوی چیختی چلائی ہوئی آئی اور کہا اے ایوب کب تک اس عذاب میں مبتلا ہو گئے تمہارا مال کہاں گیا تمہاری اولاد اور دوست احباب کہاں گئے۔ وہ تمہارا جمال اور حسین جسم کہاں گیا۔ یہ بکری کا بچہ ذبح کرو اور آرام حاصل کرو۔ حضرت ایوب نے فرمایا اللہ کا دشمن (ابلیس) تیرے پاس پہنچ گیا ہے اور تجھ میں پھونک ماردی ہے۔ تو مال اولاد وصحت پر کیوں رو رہی ہے۔ وہ مجھے عطاء کس نے کئے تھے۔ بیوی نے کہا اللہ نے۔ پھر پوچھا اس نے ہمیں ان نعمتوں سے کتنا عرصہ لطف اندوز کیا۔ بیوی نے کہا ایسی 80 سال۔ اور اب کتنا عرصہ اس نے مجھے تکلیف میں مبتلا رکھا ہے۔ عرض کی سات سال اور کچھ مہینے۔ پھر انصاف تو یہ ہے کہ اسی 80 سال میں مصیبت پر صبر کروں جیسا کہ ہم اسی 80 سال خوشحالی میں رہے۔ قسم بخدا اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے شفا دی تو میں تجھے سوکڑے ماروں گا کیونکہ تو نے مجھے غیر اللہ کے نام پر بکر اذبح کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ جو کچھ تو کھانا پینا لاتی ہے وہ مجھ پر حرام ہے اور جو

کچھ تو لے کر آتی ہے تیرے اس مشورہ کے بعد کوئی چیز چنگھوں تو مجھ پر حرام ہے تو مجھ سے جدا ہو جاؤ آئندہ میں تجھے یہاں نہ دیکھوں۔ حضرت ایوب نے اسے دور کر دیا اور وہ چلی گئی۔ جب حضرت ایوب نے دیکھا کہ اب نہ کھانا ہے، نہ پینے کی کوئی چیز ہے اور نہ کوئی دوست ہے تو آپ رب کے حضور توجہ میں گر گئے اور عرض کی ذَبْ اِنِّیْ مُسْبِیْ الصُّوْرِ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ (۱)۔

یع اس جملہ کا عطف سابقہ جملہ پر ہے۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے اپنی تکلیف کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ کی غایت رحمت کا ذکر فرمایا ہے۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے مطلوب ذکر نہیں کیا بلکہ اپنی تکلیف کا ذکر فرمایا اور اس اسلوب کی وجہ سوال میں ایک مخصوص لطف ہے۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَكَفْنَا مَا بِيْهِ مِنْ صُرٍّ وَ اَتَيْنَاهُ اَهْلَهُ وَ مَثَلَهُمْ مَّعَهُمْ
رَاحَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ ذِكْرًا لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۱﴾

”تو ہم نے قبول فرمایا اس کی دعا اور وہ ہم نے دور فرما دی جو تکلیف آپ پر پہنچ رہی تھی اور ہم نے عطا کئے اسے اس کے گھر والے نیز اتنے اور ان کے ساتھ اپنی رحمت خاص سے اور یہ نصیحت ہے عبادت گزاروں کے لئے مع“

۱۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے صابر و شاکر بندے کی دعا کو شرف قبول عطا فرمایا اور فرمایا اپنا پاؤں زمین پر مارا پاؤں مارا تو چشمہ جاری ہو گیا۔ فرمایا اس میں غسل کرو غسل کیا تو ہر بیماری اور تکلیف دور ہو گئی اور آپ کا حسن و شباب پہلے سے کہیں زیادہ ظاہر ہو گیا۔ پھر آپ چالیس قدم چلے تو دوبارہ حکم ہوا کہ ایک مرتبہ پھر زمین پر پاؤں مارو۔ آپ نے پاؤں مارا تو ایک اور عینہ سے پانی کا چشمہ رواں ہو گیا، آپ نے اس کا پانی پیا تو باطنی بیماریاں دور ہو گئیں۔ آپ تمام مردوں سے زیادہ صحت مند اور حسین و جمیل ہو گئے۔ آپ نے ایک قیمتی جوڑا زیب تن فرمایا اور اپنے مال و اہل کو دیکھا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں دو گنا کر دیا تھا۔ قسم بخدا یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ پانی جس سے آپ نے غسل فرمایا تھا اس کے چھینٹوں سے سینے پر سونے کی کڑیاں اڑنے لگیں اور ابوب علیہ السلام ان پر ہاتھ مارنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے وہی چھینٹی اسے ایوب کیا میں نے تجھے غنی نہیں کر دیا۔ حضرت ایوب نے کہا کیوں نہیں لیکن یہ تیری برکت ہے اور تیری برکت سے کون سیر ہوتا ہے۔

امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ابوب علیہ السلام برہنہ غسل فرما رہے تھے تو آپ کے اوپر سونے کی کڑیاں گرنے لگیں۔ حضرت ابوب علیہ السلام ان کی مٹھیاں بھر بھر کے کپڑے میں ڈالنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے ندا دی اے ایوب کیا میں نے تجھے غنی نہیں کر دیا۔ عرض کی تیری عزت کی قسم یقیناً تو نے مجھے غنی فرما دیا ہے لیکن تیری برکت سے میں مستغنی نہیں ہو سکتا (۲)۔ حسن فرماتے ہیں حضرت ایوب غسل کر کے باہر تشریف لائے تو ایک بلند مقام پر تشریف فرما ہو گئے (۳)۔ آپ کی بیوی نے سوچا کہ اگر ایوب نے مجھے نکال دیا ہے تو میں اسے کس کے سپرد کر سکتی ہوں کیا میں اسے چھوڑ دوں، وہ جزع فزع کرتے ہوئے اس دار فانی سے چل بسے اور صالح ہو جائے اور اس کو روندنے لکھا جائے۔ (نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوگا) میں ضرور اس کی طرف لوٹ کر جاؤں گی آپ کی بیوی رحمت لوٹ کر آئی تو وہاں نہ کوئی اور ڈیڑھی تھی اور نہ وہاں پہلے کا سا منظر تھا ساری صورت حال بدل چکی تھی۔ جہاں وہ کوڑے کرکٹ کا ڈھیر تھا وہاں بیوی چمک کاٹنے لگی اور ایوب کی تلاش میں رو رہی تھی۔ حضرت ایوب ان کی تلاش کا منظر دیکھ رہے تھے۔ ایوب علیہ السلام چونکہ نابالیاں زب تن رب کئے ہوئے تھے اس لئے بیوی ان سے پوچھنے سے تھجک رہی تھی۔ حضرت ایوب نے اسے خود

بلایا اور پوچھا اسے اللہ کی بندگی تو کسی کی تلاش میں ہے؟ بیوی رحمت رونے لگی اور کہا میں اس شخص کی تلاش کر رہی ہوں جو یہاں اردوڑی پر مصیبت میں مبتلا پڑا ہوا تھا۔ اب مجھے معلوم نہیں ہو رہا کہ وہ ضائع ہو گیا ہے یا اس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہے۔ حضرت ایوب نے پوچھا وہ تیرا کیا لگتا؟ تھاروتے ہوئے کہا وہ میرا سرتاج تھا۔ حضرت ایوب نے پوچھا کیا تو اسے دیکھے تو پہچان لے گی، بیوی نے کہا جس نے بھی اس کو دیکھا ہے وہ اس سے مخفی نہیں ہو سکتا۔ بیوی خوف کی حالت میں غور سے حضرت ایوب کو دیکھنے لگی اور پھر کہا جب وہ صبح اور تندرست تھا تو کچھ تیرے مشابہ تھا۔ حضرت ایوب نے فرمایا میں ہی وہ ایوب ہوں جس کو ابلیس کے لئے بکرا ذبح کرنے کا مشورہ دیا جی جی۔ میں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور شیطان کی نافرمانی کی۔ اللہ تعالیٰ ہی سے میں نے دعا کی تو اس نے اپنی بندہ نو ازری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھ پر یہ کرم فرمایا جو تیرے سامنے ہے۔

وہب کہتے ہیں حضرت ایوب کی سال تکلیف میں جتلا رہنے کے بعد جب ابلیس پر غالب آگئے اور وہ آپ کے قدم ڈگمگانے لگا نہ کہ تو ابلیس آپ کی بیوی کے سامنے ایسی خوبصورت ہیبت میں آیا کہ نبی آدم میں جسم جہاں اور مضبوط بندوں کے اعتبار سے کوئی ایسا سواری پر سوار نہ ہوگا اور اس کی سواری بھی رقی کمال اور بڈیوں کی مضبوطی میں لا جواب تھی۔ شیطان نے آپ کی زوجہ محترمہ کو کہا تو مجھے جانتی ہے۔ بیوی نے کہا نہیں۔ ابلیس نے کہا میں زمین کا خدا ہوں اور میں وہ ذات ہوں جس نے تیرے خاندان کو اس تکلیف میں مبتلا کیا ہے کیونکہ اس نے آسمان کے خدا کی عبادت کی ہے اور مجھے چھوڑ دیا ہے۔ اس لئے میں اس سے ناراض ہو گیا ہوں۔ اگر وہ مجھے ایک سجدہ کر دے تو میں اس کو اور تجھے سارا مال و متاع اور اولاد واپس کر دوں گا کیونکہ وہ سب کچھ میرے پاس ہے اور شیطان نے وہ سب کچھ اس وادی میں دکھا بھی دیا جس وادی میں وہ ضائع ہوا تھا۔ وہب کہتے ہیں میں نے یہ بھی سنا ہے کہ شیطان نے بیوی سے کہا اگر تیرا خاندان کھانا کھائے اور ہم اللہ شریف نہ پڑھے تو اسے اس تکلیف سے نجات مل جائے گی۔ واللہ اعلم (۱)۔

بعض کتب میں ہے کہ ابلیس نے بیوی کو کہا کہ تو مجھے سجدہ کرنا کہ میں تجھے مال اور اولاد واپس کر دوں اور تیرے خاندان کو بھی عافیت دے دوں۔ بیوی حضرت ایوب کے پاس آئی اور ابلیس کی ساری گفتگو سے آگاہ کیا۔ حضرت ایوب نے فرمایا اللہ کا دشمن تیرے پاس پہنچ گیا ہے تاکہ وہ تجھے تیرے دین سے برگشتہ کر دے۔ پھر حضرت ایوب نے قسم اٹھائی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے شفا عطا فرمائی تو وہ انہیں سوکڑے ماریں گے۔ ابلیس نے جب آپ کو اور آپ کی بیوی کو کفر کی دعوت دی تو آپ نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی انہی معنی الضور۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت ایوب کی بیوی رحمت پر بھی رحم فرمایا کیونکہ انہوں نے تکلیف کے وقت ایوب علیہ السلام کے ساتھ صبر کیا تھا اور اس کے لئے حکم میں تخفیف فرمادی اور ایوب کو قسم پوری کرنے کی یہ تدبیر بتائی کہ اپنے ہاتھ میں چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کا گٹھا لوالو اور اسے مارو اور اپنی قسم کو نہ توڑو۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے چھوٹی چھوٹی سوکڑیوں میں مشتمل ایک مٹی لے کر اپنی بیوی کو مارا۔

ایک روایت میں ہے کہ ابلیس نے ایک تابوت بنایا اور اس میں دو انہیں رکھ کر حضرت ایوب کی بیوی کے راستہ پر بیٹھ کر لوگوں کا علاج کرنے لگے۔ آپ کی بیوی گزری تو کہا میرا ایک مریض ہے کیا تو اس کا علاج کرے گا۔ ابلیس نے کہا ہاں ضرور علاج کروں گا قسم بخدا میں اور کچھ مال و متاع نہیں چاہتا علاج کا صرف یہ صلہ چاہتا ہوں کہ جب میں اسے شفا دوں تو وہ کہے کہ تو نے مجھے شفا دی۔ بیوی نے ایوب کے پاس ابلیس کا یہ مکالمہ ذکر کیا تو آپ نے فرمایا وہ ابلیس ہے، اس نے تجھے دھوکا دیا ہے اور آپ نے قسم اٹھائی کہ اگر

اللہ نے شفا دی تو اسے سوکڑے ماریں گے۔ وہ بفرماتے ہیں حضرت ایوب علیہ السلام کی بیوی لوگوں کا گھر بیوکام کاج کر کے حضرت ایوب علیہ السلام کے لئے خوراک لاتی تھی۔ جب تکلیف کا سلسلہ طویل ہو گیا تو لوگوں نے بیوی کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا، سلسلہ یہاں تک پہنچ گیا کہ کوئی شخص انہیں کام پر نہیں لگاتا تھا۔ ایک دن خوراک کی تلاش میں پھرتی رہی لیکن کوئی چیز نہ مل سکی۔ آخر کار اس نے اپنے سر کے بال کاٹ کر ایک روٹی کے بدلے فروخت کئے اور وہ روٹی ایوب کو پیش کر دی۔ ایوب علیہ السلام نے پوچھا تیرے بال کہاں ہیں، تو اس نے بتایا کہ میں نے روٹی کے بدلے فروخت کر دیے ہیں۔ اس وقت حضرت ایوب علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی: **يَا رَبِّ اَنْتَ مَسْنِي الضَّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ**۔

ایک قوم کا خیال ہے کہ یہ جملہ اس وقت آپ کی زبان پر آیا جب کبڑے آپ کے دل اور زبان کی طرف جانے لگے۔ آپ کو اندیشہ لاحق ہوا کہ اگر یہ زبان اور دل کو کاٹ کر کھا گئے تو ڈر و فکرت نہ ہو سکے گا (1)۔

حبیب بن ثابت نے لکھا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے تکلیف کا اظہار اس وقت کیا جب تین باتوں کا ظہور ہوا۔ 1۔ جب آپ کے اصحاب آپ کی خبر سن کر آپ کے پاس آئے اور دیکھا کہ آپ کی آنکھیں زائل ہو چکی ہیں اور نہایت برا حال ہے تو انہوں نے کہا کہ اگر اللہ کی بارگاہ میں تمہارا کوئی مرتبہ ہوتا تو تجھے یہ تکلیف نہ پہنچتی۔ 2۔ آپ کی بیوی نے جب خوراک کی خاطر اپنی مینڈھیاں فروخت کر دی تھیں اور ان کے عوض کھانا لے کر آپ کو پہنچایا تھا۔ 3۔ جب انہیں نے کہا تھا کہ میں اس شرط پر تمہارا علاج کرتا ہوں جب تم کہو کہ میں نے تجھے شفا دی۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ انہیں نے حضرت ایوب کے دل میں دوسرا ڈالا کہ تمہاری بیوی نے بے حیائی کا ارتکاب کیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی مینڈھیاں کاٹی گئی ہیں۔ اس دوسرے کے پیدا ہونے پر آپ کے لئے مبرک کرنا مشکل ہو گیا اور بیوی کو بلا کر کہا میں تجھے سو کڑے لگاؤں گا۔

بعض علماء نے مسنی الضر کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ مجھے دشمنوں کے خوش ہونے کے دکھنے آئیے ہے، بعض روایات میں ہے کہ آپ سے شفا ملنے کے بعد پوچھا گیا کہ آپ کے لئے سب سے تکلیف دہ امر کیا تھا۔ فرمایا میری تکلیف پر میرے دشمنوں کا خوش ہونا۔

بعض علماء فرماتے ہیں یہ جملہ آپ نے اس وقت کہا تھا جب ایک کبڑا آپ کی ران سے گر گیا تو آپ نے اسے اٹھا کر اپنی ران پر رکھ دیا اور فرمایا کہ اللہ نے مجھے تیری خوراک بنایا ہے۔ اس کبڑے نے ایسا کاٹا کہ سب کبڑوں کے کاٹنے کی تکلیف سے اس کی تکلیف زیادہ ہوئی۔ اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کو صابر کہا ہے حالانکہ انہوں نے انہی مسنی الضر۔ **وَمَسْنِي الضَّرِّطُنْ** پڑھنا دعا ہے اس کا کلام کے ساتھ شکوہ کیا تھا اور جرز و فرج کا اظہار کیا تھا۔

بعض علماء نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ شکوہ و شکایت نہیں تھا بلکہ یہ حقیقت میں دعا تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جواب فرمایا **فَاَسْتَجِبْنَاهُ** ہم نے اس کی دعا قبول فرمائی۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ جرز اس کو کہتے ہیں جب مخلوق کے پاس شکایت کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے دکھوں اور تکلیف کا اظہار کرنا نہ تو جرز ہے اور نہ صبر کا ترک ہے۔ جیسا کہ یعقوب علیہ السلام نے کہا تھا **اَشْكُوْا بِيَقِيْ وَخُشِّيْ اِلَى اللّٰهِ** (میں تو شکوہ کر رہا ہوں اپنی مصیبت اور اپنے دکھوں کا خدا کی بارگاہ میں) (2)

سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں جس نے لوگوں کے سامنے تکلیف کا اظہار کیا، جبکہ دو قضاء الہی پر راضی تھا تو یہ جرم نہیں ہے۔ جیسا کہ روایت ہے کہ جبریل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے پاس حالت مرض میں پہنچے تو پوچھا کیا حال ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ مغموم ہوں اور مصیبت میں گرفتار ہوں۔ میں کہتا ہوں حضرت ابو ہریرہ کی حدیث میں ہے جو ابن الجوزی نے نقل کی ہے کہ جبریل نے کہا اللہ تعالیٰ تجھے سلام فرماتے ہیں اور تیرا حال پوچھتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا تھا ہائے میرا سر۔ یہ آپ ﷺ نے اس وقت کہا تھا جب حضرت عائشہ نے سر درد کی تکلیف میں کہا تھا ہائے میرا سر (۱)۔

میں کہتا ہوں ابن اسحاق اور احمد نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ جنت البقیع سے واپس تشریف لائے اور میرے پاس آئے درآٹھا ایک آپ کے سر میں درد تھا اور میں بھی سر درد کی شکایت کر رہی تھی۔ میں نے کہا وارا سہا (ہائے سر) تو آپ ﷺ نے فرمایا نَبَلُ اَنَا وَاللَّهِ وَاَزْوَاجُهُ (بلکہ میں بھی کہتا ہوں قسم بندہ ہائے میرا سر)

۱۔ حضرت ابن مسعود ابن عباسؓ قادیان اور اکرم مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی پہلی اولاد کو ہی زندہ فرما دیا تھا اور ان کے مثل اور بھی عطا فرمائے تھے۔ قرآن کے الفاظ کا ظاہر تو اسی کا مقتضی ہے۔

حسن فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی مثل اس مال سے عطا فرمائے تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے پہلے زندہ کر دیا تھا (۲)۔ اس کی دلیل ضحاک کی روایت ہے جو انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی بیوی کو شباب عطا فرمایا تھا، اس سے چھبیس لڑکے پیدا ہوئے تھے۔

دہب کہتے ہیں آپ کی سات لڑکیاں اور تین لڑکے پیدا ہوئے تھے۔
ابن یسار کہتے ہیں آپ کے سات بیٹے اور سات بیٹیاں تھیں۔ حضرت انس سے مرفوع روایت ہے کہ حضرت ایوب کے دو کھیت تھے ایک گندم کا اور دوسرا جو کا۔ اللہ تعالیٰ نے دو بادل بھیجے ایک بادل نے گندم کے کھیت پر سونا ٹپا دیا اور دوسرے بادل نے جو کے کھیت پر چاندی اٹپائی۔

روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ بھیجا جو یہ پیغام لے کر آیا کہ اللہ تعالیٰ آپ کے مہر کی وجہ سے آپ پر سلام بھیجتے ہیں اور فرماتے ہیں تم اپنے کھلیان کی طرف جاؤ۔ آپ اس کی طرف گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس کھلیان پر سونے کی ٹنڈیاں بیج دیں۔ ایک ٹنڈی اڑی تو ایوب علیہ السلام اس کے پیچھے گئے اور اسے اپنے کھلیان کی طرف واپس لے آئے۔ فرشتہ نے کہا کیا جو کچھ تیرے کھلیان کے اندر ہے وہ کافی نہیں ہے (کہ تم اڑنے والی ٹنڈی کے پیچھے دوڑ گئے ہو) حضرت ایوب نے کہا یہ میرے رب کی برکات میں سے ہے اور میں اس کی برکت سے کبھی سیر نہیں ہوں گا (۳)۔

علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایوب کو دنیا میں ان کے اہل کی مثل عطا کئے تھے جو بلاک ہو چکے تھے۔ وہ مرنے والے دو بارہ زندہ نہیں کئے گئے تھے۔ تکرار فرماتے ہیں۔ حضرت ایوب سے کہا گیا کہ تیری اولاد آخرت میں تجھے ملے گی اگر تم چاہتے تو ہم دنیا میں تجھے وہ عطا فرمادیں اور اگر تو چاہے تو وہ آخرت میں تجھے ملیں اور ہم ان کی مثل دنیا میں اور عطا فرمادیں۔

حضرت ایوب علیہ السلام نے کہا وہ مجھے آخرت میں ملیں اور ان کی مثل دنیا میں عطا کئے جائیں۔ اس صورت میں آیت کا معنی

یہ ہوگا کہ ہم نے آخرت میں ان کے اہل نہیں عطا کئے اور ان کی مثل دنیا میں عطا کئے۔ اہل سے مراد اولاد ہے۔
 سے رحمۃً فعل محذوف کا مفعول بہ ہے یعنی وہبنا رحمۃً (ہم نے اسے رحمت عطا کی) یا مفعول مطلق ہے فعل آتینا کا اور یہ
 ضابطہ سے مطلق ہے (یعنی مصدر کی جگہ آ لیکر رکھا گیا ہے)

ذکر کی کا عطف رحمۃً پر ہے یعنی صبر ایوب عبادت گزاروں کے لئے ایک نصیحت ہے تاکہ وہ بھی مشکل وقت میں ایوب علیہ السلام
 کی طرح صبر کریں تاکہ انہیں بھی ثواب اور اجر ملے جس طرح ایوب کو ملتا تھا۔ یہ ترکیب بھی ہو سکتی ہے کہ رحمۃً اور ذکر کی آتینا
 فعل کے مفعول لہوں، یعنی ہم نے ایوب کو اہل عطا فرمائے اور ان کی مثل بھی عطا فرمائے اپنی رحمت کی وجہ سے اور عبادت گزاروں
 کو یاد دلانے کے لئے کہ ہم ان پر بھی رحم فرمائیں گے اور احسان کے ساتھ انہیں یاد کریں گے اور ان کو فراموش نہیں کریں گے۔

وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِدْرِيسَ وَ ذَا الْكِفْلِ كُلًّا مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۱﴾

”اور یاد کرو اسماعیل اور یونس اور ذوالکفل (علیم السلام) کو۔ یہ سب صابروں کے گروہ سے تھے۔“

یہ سب اسامہ ترکیب میں نو حاکم کی طرح ہیں۔ ذی الکفل کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ عطا فرمائے ہیں وہ بنی اسرائیل کے
 انبیاء میں سے ایک نبی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی بھی بھیجی تھی کہ میں تیری روح قبض کرنا چاہتا ہوں، ہم اپنی بادشاہی بنی اسرائیل
 پر پیش کر دو جنھیں اس عظیم منصب کو قبول کرے وہ رات کو نماز ادا کرے گا، کسی سستی اور کاہلی کا مظاہرہ نہیں کرے گا، دن کے وقت روزہ
 رکھے گا اور کسی کمزوری کا اظہار نہیں کرے گا، لوگوں کے درمیان انصاف سے فیصلہ کرے گا اور غصہ نہیں کرے گا۔ اسے یہ حکومت دے
 دو۔ اس نبی نے یہ لوگوں کے سامنے منصب رفیع رکھا تو ایک نوجوان اٹھا اور کہا میں یہ ذمہ داری قبول کرتا ہوں اس نے یہ ذمہ داری
 قبول کی اور اس کا پورا پورا حق ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی قدر دانی فرماتے ہوئے اسے نبی بنا دیا، اس نوجوان کا نام ذوالکفل تھا (۱۱)۔ مجاہد
 فرماتے ہیں جب المسیح علیہ السلام بوڑھے ہو گئے تو انہوں نے کسی کو اپنا خلیفہ مقرر کرنا چاہا تاکہ وہ ان کی زندگی میں لوگوں کے امور
 سنبھالے اور وہ خود اپنی نظر سے دیکھ لیں کہ یہ کیسے کام کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا جو میری تین باتوں کو قبول کرے گا میں اسے خلیفہ
 بناؤں گا۔ دن کو روزہ رکھے رات کو قیام کرے اور غصہ نہ کرے۔ ایک آدمی اٹھا جو ظاہراً حقیر نظر آتا تھا۔ اس شخص نے کہا یہ ذمہ داری
 میں قبول کرتا ہوں۔ حضرت المسیح نے اس دن اس کو روزہ فرمایا۔ آپ نے دوسرے دن یہی اعلان فرمایا سب لوگ خاموش رہے صرف
 اسی شخص نے کہا میں اس ذمہ داری کو قبول کرتا ہوں۔ حضرت المسیح نے اسے خلیفہ بنا دیا۔ ایک دن انہیں اس خلیفہ کے پاس ایک
 بوڑھے انسان کی شکل میں آیا، جبکہ خلیفہ کے قبول اور آرام کا وقت تھا۔ خلیفہ دن کے وقت سوتا تھا اور نرات کے وقت آرام کرتا تھا،
 صرف دوپہر کے وقت تھوڑا سا آرام کرتا تھا۔ انہیں نے انسانی شکل میں آ کر دروازہ کھٹکھٹایا پوچھا کون ہے۔ اس نے کہا میں ایک
 بوڑھا مظلوم شخص ہوں، خلیفہ اٹھا اور دروازہ کھولا۔ انہیں نے کہا میرا اور میری قوم کا جھگڑا ہے انہوں نے مجھ پر ظلم کیا ہے اور ایسی ایسی
 مجھ سے زیادتی کی ہے، وہ بات کو طول دینا رہا حتیٰ کہ خلیفہ کے آرام کا وقت نکل گیا۔ خلیفہ نے کہا شام کو میں تیرا حق دلا دوں گا۔ پچھلے
 نام اس نے مجلس لگائی تو اس نے بوڑھے کو ادرہ دیکھا لیکن وہ نظر نہ آیا۔ دوسرے دن عدالت لگائی تو پھر بوڑھا (انہیں) نظر نہ آیا۔
 جو نبی قبول کرنے کے لئے پہنچا تو انہیں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ پوچھا کون؟ اس نے کہا بوڑھا مظلوم۔ خلیفہ نے پھر دروازہ کھول دیا اور

کہا گیا میں نے تجھے کہا نہیں تھا کہ جب میں مجلس عدل قائم کروں تو تم آ جانا۔ بوڑھے نے کہا وہ بڑی بری قوم ہے کہ جب دیکھتے ہیں کہ تیری مجلس لگی ہوئی ہے تو کہتے ہیں ہم تیرا حق ادا کر دیں گے اور جب مجلس برخواست ہوتی ہے تو منکر بن جاتے ہیں۔ خلیفہ نے کہا اب تم جاؤ شام کے وقت جب مجلس عدل قائم ہو تو اس وقت آ جانا اس دن بھی اس بوڑھے نے خلیفہ کی نیند حرام کر دی شام کو جب مجلس عدل شروع ہوئی تو وہ بوڑھا نظر بند آیا۔ خلیفہ پر نیند غالب آ رہی تھی اس نے اپنے دو بان کو کہا کہ کسی کو دروازہ کے قریب نہ آنے دینا تاکہ میں کچھ آرام کروں، مجھے نیند بہت سخت آئی ہوئی ہے۔ جب خلیفہ کے قبولہ کا وقت تھا تو بوڑھا پھر آ گیا۔ محافظ نے اسے اجازت نہ دی۔ جب بوڑھا عاجز ہو گیا تو اس نے روشندان دیکھا اس نے دیوار پھلانگی اور روشندان سے اندر داخل ہو کر اندر سے دروازہ کھٹکنا شروع کر دیا۔ خلیفہ بیدار ہوا تو اس نے محافظ کو آواز دی اسے فلاں میں نے تجھے کہا نہیں تھا کہ کسی کو اندر نہ آنے دینا۔ محافظ نے کہا جناب اوھر سے کوئی داخل نہیں ہوا۔ دیکھو وہ کہاں سے آیا ہے؟ خلیفہ نے دروازہ دیکھا تو وہ واقعی بند تھا۔ اس شخص نے کہا لوگ تمہارے دروازے پر گھنٹے لے آئے ہیں اور تم سوئے ہوئے ہو۔ خلیفہ نے اس شخص کو پوچھا کیا اور کہا تو اللہ کا دشمن (ابلیس) ہے۔ بوڑھے نے کہا ہاں۔ تو نے مجھے عاجز کر دیا ہے اور میں نے یہ سب کچھ اس لئے کیا تھا تاکہ تجھے خسرہ آئے لیکن اللہ تعالیٰ نے تجھے بچا لیا ہے۔ اس خلیفہ کو ذرا لکھلکھلا گیا کیونکہ اس نے جو مذہب داری قبول کی تھی اس کو اسن طریقے سے نبھایا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ ابلیس اس خلیفہ کے پاس آیا اور کہا میرا ایک مقروض ہے جو رقم کی ادائیگی میں نال مثل کر رہا ہے آپ میرے ساتھ پٹیس اور میرا قرض وصول کروادیں، خلیفہ اس کے ساتھ چل پڑا۔ جب بازار میں پہنچا تو ابلیس پیچھے سے کھسک گیا۔ یہ بھی روایت ہے کہ اس نے خلیفہ سے معذرت کرنی کہ میرا مقروض بھاگ گیا ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ ذرا لکھلکھل وہ شخص تھا جس نے عہد کیا تھا کہ مرتے دم تک ہر رات سو رکعت ادا کروں گا۔ اس نے اپنے اس عہد کو پورا کیا تھا۔

علماء کا اختلاف ہے کہ کیا ذرا لکھلکھلی تھا یا (دلی تھا) بعض مفسرین فرماتے ہیں وہ نبی تھا جیسا کہ سیاق کلام دلالت کر رہا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ذرا لکھلکھل سے مراد زکریا علیہ السلام ہیں (1)۔ ابو موسیٰ فرماتے ہیں وہ نبی نہیں تھا بلکہ ایک نیک آدمی تھا (2)۔ جن نفوس قدسیہ کا اوپر تہ کرہ ہوا ہے وہ سب مشکلات و مصائب پر صبر کرنے والے تھے اور شہوات اور معاصی سے اجتناب کرنے والے تھے۔

وَأَدْحَلْتُهُمْ فِي سَاحَتِنَا ۖ إِنَّهُمْ مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿۱۱﴾

”اور ہم نے داخل فرمایا انہیں اپنی خاص رحمت میں یقیناً وہ نیک بندوں میں سے تھے۔“

لہ رحمت سے مراد نبوت درجات قرب اور جنت ہے۔ اس جملہ کا عطف کل من الصابرين پر ہے۔ قد کی تقدیر کے ساتھ الصابرين کی ضمیر سے حال ہے یعنی یہ یہشتیاں ہر قسم کے فساد سے مبرا تھیں۔

وَذَا التَّوْنِ إِذْ ذَهَبَ مُغَاضِبًا وَقَنَّ أَنْ لَنْ نُقْدِرَ عَلَيْهِ مَقَادِي فِي الظُّلُمَاتِ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ ۗ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ ﴿۱۲﴾

”اور یاد کرو تو انہوں کو جب وہ چل دیا غضبناک ہو کر۔ اور یہ خیال کیا کہ ہم اس پر کوئی گرفت نہیں کریں گے۔ پھر اس

نے پکارا (تدریجاً) اندھیروں میں کہ کوئی معبود نہیں سوا تیرے پاک ہے تو پینک میں ہی قصور داروں سے ہوں س۔“
 ذی النون سے مراد حضرت یونس علیہ السلام ہیں۔ ذی النون کے اعراب کی وہی صورتیں ہیں جو ہم نے نوحاً اور نادی کے تحت ذکر کی ہیں۔ معاصیاً کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے۔ الشکاک فرماتے ہیں وہ اپنی قوم پر ناراض اور غضبناک تھے۔ العوفی اور دوسرے علماء نے ابن عباس سے یہی قول روایت فرمایا ہے (1)۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں یونس علیہ السلام اور اس کی قوم فلسطین میں رہتے تھے۔ ایک بادشاہ نے ان پر حملہ کیا اور اسے سزا دے کر قبیلے قیدی بنا کر لے گئے اور دو قبیلے باقی بچ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے شعیا نبی کی طرف وحی بھیجی کہ تم حرقیا بادشاہ کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ کسی طاقتور نبی کو بھیجو، میں ان لوگوں کے دلوں میں یہ ڈال دوں گا کہ وہ نبی اسرائیل کو اس طاقتور نبی کے ساتھ آزاد کر کے بھیج دیں۔ حرقیا بادشاہ نے حضرت شعیا سے پوچھا تمہارا کیا خیال ہے میں کسی نبی کو بھیجوں (بادشاہ کی مملکت میں پانچ انبیاء مبعوث تھے) شعیا نے مشورہ دیا کہ یونس علیہ السلام کو بھیجو، وہ طاقتور اور امین ہے۔ بادشاہ نے یونس علیہ السلام کو بلایا اور کہا تم جاؤ اور بنی اسرائیل کو چمکراؤ۔ حضرت یونس علیہ السلام نے پوچھا کیا اللہ تعالیٰ نے تجھے مجھے بھیجے کا حکم دیا ہے حرقیا بادشاہ نے کہا نہیں۔ کیا اس نے تجھے میرا نام بتایا ہے؟ فرمایا نہیں۔ حضرت یونس علیہ السلام نے فرمایا میرے علاوہ دوسرے انبیاء زیادہ طاقتور ہیں۔ انہوں نے جب حضرت یونس علیہ السلام پر اصرار کیا تو آپ نبی بادشاہ اور قوم سے ناراض ہو کر نکل پڑے اور بحر روم پر پہنچے اور کشتی پر سوار ہو گئے (2)۔

عروہ بن زبیر، سعید بن جبیر اور چند دوسرے علماء کا خیال ہے کہ آپ اپنے رب کی خاطر قوم سے ناراض ہو کر بھاگ گئے تھے کیونکہ آپ نے قوم کو کہا تھا کہ عذاب آئے گا لیکن عذاب نہ آیا۔ آپ نے اپنی قوم میں رہنا پسند نہ فرمایا کیونکہ معاملہ آپ کی وعید کے خلاف ظاہر ہو چکا تھا اور آپ کو معلوم نہ ہوا کہ قوم سے عذاب کسی سبب سے دور ہو گیا ہے تو آپ کا وعید وعید کے خلف کی وجہ سے تھا کہ لوگ انہیں کذاب کہیں گے۔ حکم الہی کو پسند کرنے کی وجہ سے نہ تھا۔

بعض روایات میں ہے کہ قوم کی عادت تھی کہ وہ جموںے شخص کو قتل کر دیتے تھے، اس لئے آپ کو اندیشہ لاحق ہوا کہ قوم مجھے قتل کر دے گی کیونکہ جب مقررہ مدت میں عذاب نہ آیا تو آپ کو غضب آ گیا۔

معاصیاً باب مفاصلہ ہے لیکن یہاں اشتراک کے معنی میں نہیں ہے بلکہ مسافرہ اور معاقبہ کی طرح ایک طرف سے فعل کے پائے جانے پر دلالت کرتا ہے پس معاصیاً کا معنی غضبان ہوگا (3)۔

اسن فرماتے ہیں آپ اپنے رب سے ناراض ہو کر نکلے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی قوم کی طرف نکلنے کا حکم فرمایا تھا نہ کہ وہ انہیں عذاب الہی سے ڈرائیں اور انہیں دعوت توحید دیں۔ حضرت یونس علیہ السلام نے قوم کی طرف جانے سے پہلے تیار کرنے کی مہلت مانگی تو ارشاد ہوا یہ کام بہت جلدی کرنا ہے۔ آپ نے عرض کی مجھے جو تا پینے کی اجازت دی جائے تو یہ مہلت بھی نہ ملی۔ آپ کی طبیعت میں تنگی تھی، اس لئے آپ ناراض ہو کر نکل پڑے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرماتے ہیں جبریل علیہ السلام یونس علیہ السلام کے پاس آئے اور کہا کما اهل نبوی کے پاس جاؤ اور انہیں عذاب الہی سے ڈراؤ۔ حضرت یونس علیہ السلام نے کہا میں کوئی سواری تلاش کرتا ہوں۔ جبریل نے کہا اس معاملہ میں تاخیر نہیں، بہت جلدی چاہئے۔ آپ ناراض ہو کر کشتی میں سوار ہو گئے (4) وہب کہتے

ہیں یونس بن یحییٰ ایک نیک شخص تھے اور آپ کی طبیعت میں بخشنی تھی، جب ان پر نبوت کا بوجھ ڈال گیا تو آپ اس بوجھ کے نیچے دب گئے اور پھر بھاگ نکلے۔ اسی وجہ سے اولوالعزم پیغمبروں میں سے آپ کا نام اللہ تعالیٰ نے نکال دیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم ﷺ کو اولوالعزم نبیوں کے سہر کرنے کی طرح سہر کرنے کا حکم فرمایا۔ **فَأَصْبَحَ كَمَا صَبَّحَ أُدُلُوهُمُ الْعُزْرُ مِنْ الرُّسُلِ** اور ارشاد فرمایا **وَرَدَّ مَنِّي مَهْجَابِ الْعُنُوتِ** (پس (اے محبوب) آپ صبر کیجیے جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا تھا) (اور نہ ہو جائے پھیلی والے کی مانند) (1)

ع ی یعقوب نے یاء کے ضد اور دال کے فتح کے ساتھ جمہول پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے فتح اور دال کے کسرہ کے ساتھ معروف پڑھا ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے ہم ان پر بھی نہیں کریں گے۔ قدر کا لفظ اسی معنی میں قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے۔ **أَنْتُمْ يٰٓأَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَنِ عَلَيْكُمْ قُدْرَةٌ وَأَنْتُمْ يٰٓأَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَنِ عَلَيْكُمْ قُدْرَةٌ** (پس تم پر سزا کا فیصلہ نہیں فرمائیں گے۔ مجاہد، ضحاک اور کلبی کہتے ہیں القدر کا معنی قضاء ہے۔ حضرت ابن عباس سے العوفی نے روایت کیا ہے۔ کہا جاتا ہے قدر اللہ تقدیر اور قدر قدراً ہم معنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **يُخْرِجُهُمْ مِّنْ أَرْضِنَا بِإِذْنِكَ الْعُنُوتِ**۔

ابن کثیر نے دال کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے دال کی تہدید کے ساتھ پڑھا ہے اور دونوں قراءوں کا معنی ایک ہے۔ اس تاویل کی تائید عمر بن عبد العزیز اور زہری کی قراءت کرتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یونس نے یہ خیال کیا کہ ہم اس کے معاملہ میں اپنی قدرت کو مل نہیں لائیں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں حضرت یونس علیہ السلام کی حالت کو اس شخص کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو ہمارے حکم کا انتظار رکھے بغیر اپنی قوم کو ذلت میں پھونک کر چلا گیا اور یہ گمان کیا کہ ہم اس پر قدرت نہیں رکھتے (2)۔ ابن زبیر کہتے ہیں یہ توحیح اور اذکار کے لئے استفہام ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ کیا اس نے گمان کیا ہے کہ ہم اس پر قدرت نہیں رکھتے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یونس شیطانِ خضر تھا جو آپ کے وہم تک پہنچ گیا تھا پس مباحثہ کے لئے اس کو بھولنے سے تعبیر کیا گیا۔

انہیں فرماتے ہیں مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ جب یونس علیہ السلام سے گناہ سرزد ہوا تو آپ اللہ تعالیٰ سے ناراض ہو کر چل پڑے۔ شیطان نے آپ کو راہ راست سے بھٹکانا چاہا تھا کہ انہوں نے گمان کیا کہ ہم اس پر قادر نہ ہوں گے۔ آپ چونکہ اللہ تعالیٰ کے عبادت گزار بندہ تھے اس لئے غیرت الہی نے یہ پند ہی نہیں کیا کہ انہیں شیطان کے حوالے کر دیں۔ اللہ نے انہیں جھپٹی کے پیٹ میں ڈال دیا۔ آپ وہاں چالیس دن رہے۔ عطا فرماتے ہیں آپ جھپٹی کے پیٹ میں سات دن رہے۔ بعض فرماتے ہیں تین دن رہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جھپٹی انہیں چھ ہزار سال کی مسافت پر لے گئی اور بعض علماء فرماتے ہیں ساتویں زمین کی حد تک لے گئی۔ پھر وہاں جھپٹی کے پیٹ میں آپ نے توبہ کی اور وہاں پس پلئے (3)۔

سے ظلمات سے مراد یا تو سخت تاریکی ہے یا تاریکی یا سمندر کی تاریکی اور جھپٹی کے پیٹ کی تاریکی ہے۔ یہ جملہ صروف جنلوں پر معطوف ہے جو ایک دوسرے پر معطوف ہیں۔ تقدیر عمارت اس طرح ہوگی کہ حضرت یونس علیہ السلام غصہ کی حالت میں نکلے پس انہوں نے یہ گمان کیا کہ ہم اس پر قادر نہیں ہیں۔ پھر وہ سمندر پر پہنچے پھر کشتی میں سوار ہوئے تو کشتی رک گئی، قرعہ اندازی کی گئی تو آپ کا نام نکلا۔ آپ نے اپنے آپ کو دریا میں ڈال دیا پھر جھپٹی نے انہیں نگل لیا پھر آپ نے تاریکیوں میں یوں پکارا کہ کوئی معبود نہیں سوا

تیرے، پاک ہے تو بیٹک میں ہی تصور داروں سے ہوں۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابو ہریرہ سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پھلی کو جی فرمائی کہ اسے پکڑ لے لیکن زندان کے گوشت کو خراش آئے اور زندان کی کوئی بڑی ٹوٹے۔ پھلی نے آپ کو پکڑ لیا اور سمندر کی تہ میں لگئی۔ جب وہ سمندر کے نیچے پہنچی تو یونس علیہ السلام نے تسبیح سنی تو سوچا یہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی کہ یہ سمندر کے جانوروں کی تسبیح ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام نے پھلی کے پیٹ میں تسبیح کی تو ملائکہ نے آپ کی تسبیح سنی۔ فرشتوں نے عرض کی اے ہمارے رب ہم ایک اجنبی زمین میں ایک خفیف سی آواز سن رہے ہیں۔ دوسری روایت میں ہے ایک مجہول مکان میں معروف آواز سن رہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ ہمارا بندہ یونس ہے جس نے میری نافرمانی کی تھی اور میں نے پھلی کے پیٹ میں اسے محصور کر دیا تھا۔ فرشتوں نے عرض کی کیا وہ نیک آدمی جس کا نیک عمل ہر روز تیری بارگاہ میں پہنچتا ہے۔ فرمایا ہاں۔ اس وقت فرشتوں نے حضرت یونس علیہ السلام کی تفلتہ نڈہ بالعمز آوہو سقیہم (پھر ہم نے ڈال دیا انہیں کھلے میدان میں اس حال میں کہ وہ بیمار تھے) (1)

فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَنَجَّيْنَاهُ مِنَ الْعَمِّ ۗ وَكَذَلِكَ نُصَيِّحُ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۰﴾

”پس ہم نے ان کی پکار کو قبول فرمایا اور نجات بخش دی انہیں غم (واعمز) سے اور یونہی ہم نجات دیا کرتے ہیں مومنوں کو۔“

۱۔ یعنی ہم نے ان کلمات کی وجہ سے خطا، غم، پھلی کے نکلنے کا غم یا تاریکیوں کے غم سے نجات دی۔ بالکل اسی طرح جب بھی کوئی مومن اخلاص کے ساتھ ہمیں پکارتا ہے اور ہماری بارگاہ سے استعاذہ کرتا ہے تو ہم اسے نجات دیتے ہیں۔
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حضرت یونس علیہ السلام نے پھلی کے پیٹ میں جود دعا مانگی تھی (لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ) جو مسلمان ان کلمات کے ساتھ دعا مانگتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول فرماتا ہے (2)۔

اس حدیث کو امام احمد ترمذی اور حاکم نے سعد بن ابی وقاص سے روایت کیا ہے۔ حاکم کی حدیث اس طرح ہے کیا میں تمہیں ایسی دعا نہ بتاؤں کہ جب تم میں سے کوئی شخص کسی تکلیف یا مصیبت میں گرفتار ہو اور وہ یہ دعا مانگے تو اللہ تعالیٰ اس کی اس تکلیف کو دور فرما دے گا۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ضرور ارشاد فرمائیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا وہی النون (حضرت یونس علیہ السلام) کی دعا ہے لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ

ابن جریر نے اس طرح روایت کی ہے کہ اللہ کا اسم جس کے ساتھ دعا مانگی جائے تو اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے اور اس کے ساتھ سوال کیا جائے تو عطا فرماتا ہے۔ وہ اسم یہ ہے لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ
ہم نے سورہ آل عمران کی ابتدا میں ذکر کیا تھا کہ اسم اعظم نومی اور اثبات ہے اور لا الہ الا هو اور لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ کا درجہ لا الہ الا اللہ سے بلند ہے کیونکہ ضائر خاص ذات پر دلالت کرتی ہے۔ میں کہتا ہوں لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ کا مرتبہ لا الہ الا هو سے بلند ہے کیونکہ خطاب کی ضمیر حضور کے کمال پر دلالت کرتی ہے۔ واللہ اعلم۔

ابن عامر اور ابو بکر نے نسحی کوچیم کی شد اور یا و کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ اس کی اصل باب تفعیل کا مضارع ہے پھر اجتماع متغلیں کی وجہ سے دوسرے نون کو حذف کیا گیا جیسا کہ تنظاہر میں تاہ کو حذف کیا جاتا ہے۔ یہ اگرچہ فاکہ ہے تو اس کا حذف

کرنا علامت مضارع کے خلاف سے اولیٰ ہے کیونکہ علامت مضارع ایک مخصوص معنی کے لئے ہوتی ہے اور دونوں نونوں کی حرکتوں کا اختلاف اعراض کا باعث نہیں ہو سکتا کیونکہ حذف کا باعث ہم مثل لفظوں کا اجتماع ہے اور ادغام معتذر ہے اور تنجافی میں حذف ممتنع ہے کیونکہ التباس کا اندیشہ ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں یہ اصل میں نجی ماضی مجہول کا صیغہ ہے جو مصدر کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ قول مردود ہے کیونکہ فعل مصدر کی طرف منسوب نہیں کیا جاتا، جب فعل کا مفعول صراحتاً مذکور ہو نیز ماضی کا آخر ساکن بھی نہیں ہوتا (۱)۔ بعض علماء نے امام بیضاوی کے اعتراض کا یہ جواب دیا ہے کہ مفعول کی موجودگی میں فعل کو مصدر کی طرف منسوب کرنا شاذ ہے اور شاذ کا وقوع قرآن میں اس کی فصاحت کی وجہ سے ممتنع نہیں ہے اور کبھی کبھی یا ہ مفتوحہ کو عرب ساکن کر دیتے ہیں جیسے بھی میں کرتے ہیں وہ بھی کو بھی پڑھتے ہیں۔ جمہور اہل علم نے باب افعال سے دونوں کے ساتھ پڑھا ہے اور لکھنے میں ایک نون اس لئے ہے کیونکہ دوسرا نون ساکن ہے اور ساکن زبان پر ظاہر نہیں ہوتا، اس لئے لکھنے میں اس کو حذف کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ الا میں نون کو حذف کر دیتے ہیں کیونکہ الا اصل میں ان لا تھا۔

علامہ بیہقی فرماتے ہیں حضرت یونس علیہ السلام کو رسالت کب ملی۔ اس کے متعلق علماء کے مختلف اقوال ہیں۔

سعید بن جبیر حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھلی کے پیٹ سے نکلنے کے بعد آپ کو رسالت عطا فرمائی کیونکہ سورہ صافات میں ہے قَبِّلْنَاهُ بِالْعَرَاوِذِ وَهُوَ سَقِيمٌ اس کے بعد فرمایا وَارْسَلْنَاهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَبْرُؤُنَ (۲)۔ بعض دوسرے علماء فرماتے ہیں اس سے پہلے آپ کو رسالت ملی تھی اس کی دلیل یہ ارشاد ہے۔ وَ اِنۡ يُّؤْتِسَّرَ لَیْمُنَ الْمُؤْمِنُوْنَ سَرَّ اِنۡ اٰتٰی اِلٰی الْفُلْکِ الْکَافِرِیْنَ۔

میں کہتا ہوں فہنذہانہ کے بعد وارسلناہ الی مائة الف اور یزیدوں سے استلال ضعیف ہے کیونکہ واو مطلقاً جمع کے لئے آتی ہے، یہ ترتیب پر دلالت نہیں کرتی۔

وَرَكُوبًا اِذْ نَادٰی رَبَّهُ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرَدًا وَّ اَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِيْنَ ۝۱۰

”اور یاد کرو کہ نوحؑ نے کہا اور اپنے رب کو کہ اے میرے پروردگار مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو سب وارثوں سے بہتر ہے۔“

۱۔ ذکر کو اذ نادای کا اعراب بالکل نوحاً اذ نادای جیسا ہے۔ و انت خیر الوارثین لا تذرنی کے فاعل سے حال ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی تعریف ہے کہ مخلوق کے خناء ہونے کے بعد بھی وہ باقی رہنے والا ہے اور ہر ظیفہ سے وہ بہتر ہے۔

فَلَسَجَبْنَا لَهُ وَّوَهَبْنَا لَهُ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَاهُ وَّوَجَّهُ اِلَيْهِمْ كَانُوْا يُسْرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَآرْعَابًا وَّرَهْبًا ۝۱۱

”تو ہم نے اس کی دعا کو قبول فرمایا اور اسے یحییٰ (جیسا فرزند) عطا فرمایا اور ہم نے تندرست کر دیا ان کی خاطر ان کی اہلیہ کو۔ بیشک وہ بہت سبک رو تھے نیکیاں کرنے میں اور پکارا کرتے تھے ہمیں بڑی امید اور خوف سے اور وہ ہمارے

سامنے بڑا بجزوہ نیاز کیا کرتے تھے۔“

ل حضرت زکریا کی زوجہ محترمہ ہاتھ تھیں لیکن ہم نے اسے قابل ولادت بنا دیا۔ وغیباً یا تو مفعول لہ ہے یا حال ہے، یعنی ان کی رغبت کی وجہ سے یا وہ ہماری ملاقات اور ہمارے قرب میں رغبت رکھتے تھے اور دعاؤں کی قبولیت کی امید رکھتے تھے اور ثواب میں رغبت رکھتے تھے یا طاعت میں رغبت رکھتے تھے۔

امیرنسانی حاکم اور بخاری نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلَاةِ (1) (نماز میں میری آنکھوں کی خشک رکھی گئی ہے) وغیباً بھی مفعول لہ یا حال ہے، یعنی خوف کی وجہ سے ہمیں پکارتے ہیں یا محرومی یا معصیت یا عذاب سے ڈرتے ہوئے ہمیں پکارتے تھے۔ مجاہد فرماتے ہیں خشوع وہ خوف ہے جو دل کو لاحق ہوتا ہے۔ جب کمال طور پر عقلت الہی کا انسان کو فرمان نصیب ہوتا ہے تو دل میں خشوع پیدا ہوتا ہے۔ قوادہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے بجز وانکساری کرنا خشوع ہے (2)۔ انہم كانوا يسارعون

مذکورہ لغوی تفسیر کی مدح ہے اور گزشتہ کلام کی تعلیل ہے، یعنی ہم نے انہیں نبوت اور علم عطا فرمایا کیونکہ وہ نیکیوں میں جلدی کرنے والے تھے یا یہ مطلب کہ ان معزز افراد کو یاد کرو کیونکہ وہ نیکیاں کرنے میں سب رو تھے حتیٰ کہ لوگوں نے ان کی اقتداء کی انہیں جو کچھ بارگاہ الہی سے عطاء ہوا وہ سب کچھ انہیں حاصل حمیدہ کی وجہ سے ملا۔

وَالَّتِي أَحْصَيْتُ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهَا مِنْ رُوحِنَا وَجَعَلْنَاهَا وَابِنَهَا
آيَةً لِلْعَالَمِينَ ①

”اور یاد کرو اس خاتون کو جس نے محفوظ رکھا اپنی عصمت کو پس ہم نے پھونک دیا اس میں اپنی روح سے ل اور ہم نے بنا دیا اسے اور اس کے بیٹے کو (اپنی قدرت کی) نشانی سارے جہان والوں کے لئے ل۔“

ل النبی احصنت فرجہا سے مراد مریم بنت عمران ہیں جنہوں نے حلال اور حرام سے اپنی عصمت کو محفوظ رکھا۔ اور یہ اذکور کی تقدیر کے ساتھ منسوب ہے۔ جبریل نے آپ کی قمیص کے گریبان میں پھونک ماری تو وہ پھونک آپ کے پیٹ تک پہنچی۔ اللہ تعالیٰ نے اس پھونک کے ساتھ بیٹی بن مریم کو پیدا فرمایا۔ دو حنا سے مراد وہ روح ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے جبریل نے پھونکی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی اپنی طرف نسبت اظہار شرف کے لئے فرمائی ہے یا روح سے مراد بیٹی علیہ السلام ہیں اور سن زائدہ ہے یا روح سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔

ل ہم نے مریمؑ ظہیرا السلام اور ان کے بیٹے کے قصہ یا حالت کو بغیر باپ کے بچے پیدا کرنے پر اپنے کمال قدرت پر دلیل بنایا ہے۔
إِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ ②

”اے ان انبیاء کو ماننے والو! یہی (تو حید) تمہارا دین ہے جو ایک دین ہے ل اور میں تمہارا پروردگار ہوں پس میری بندگی کیا کرو ل۔“

ل یعنی تمہاری ملت تو حید اور تمام انبیاء پر ایمان لانے والی ہے۔ لَا تَقْفُوقَ بَيْنَ أَحِبِّ قَوْمٍ كَاقْتِرَارِ كَرْنِ وَالِي بِنِ عِلْمِ اَللّٰهِ كُوْدَلِ كِ

کانوں سے سننے اور احکام الہی کی اتباع کرنے والی ہے اور اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو جو اوامر و نواہی عطا فرمائے ان تمام کو برحق تسلیم کرنے والی ہے۔ یہ تمام ملحقہ کی طرف اشارہ ہے یا ملت اسلام مراد ہے، یعنی اے لوگو! تم پر واجب ہے کہ تم اسی ملت پر قائم رہو۔ اہل حال کی بناء پر منصوب ہے اور اس میں عامل اشارہ کا معنی ہے۔ تمہاری ملت ایک ہے۔ انبیاء کی ملل میں کوئی اختلاف نہیں۔ دوسری ملتیں صحت اتباع میں اس کی شریک نہیں۔ ارشاد فرمایا وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ آلِ مُحَمَّدٍ فَقَدْ أَهْرَاجَ نَفْسِهِ (اور جو تلاش کر گیا اسلام کے بغیر کوئی (اور) دین تو وہ ہرزہ قبول نہ کیا جائے گا اس سے) کلمۃ مشتق ہے ام یام سے جس کا معنی قصد کرنا ہے پھر اس کا اطلاق اس جماعت پر بھی ہونے لگا جو ایک مقصد پر متفق ہوا، یک دین کی پیروی کا رہا اور ایک طریقہ اور راستہ پر گامزن ہو۔ چونکہ دین و سنت دونوں مقصود ہوتے ہیں، اس لئے ان کے اتباع کرنے والوں کو امت کہا جاتا ہے (۱)۔

میرے سوا تمہارا کوئی رب نہیں ہے اس لئے تم میرے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

وَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ۗ كُلٌّ لِّمَا كَانُوا يَٰرْجِعُونَ ﴿۱۶﴾

”عمر لوگوں نے پارہ پارہ کر ڈالا اپنے دین کو آپس میں (آخر کار) سب ہماری طرف ہی لوٹنے والے ہیں۔“

۱۔ کلام میں خطاب سے غائب کی طرف التفات کیا گیا ہے اور تفعل بمعنی تفعلیل ہے، یعنی لوگوں نے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور مختلف ٹکڑوں میں بٹ گئے اور ایک دوسرے پر حثت کرنے لگے، ان کو ایسا کرنا مناسب نہیں تھا۔ ہر فرقہ اور گروہ نے ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے اور ہم انہیں ان کے عقائد و اعمال کے مطابق جزاء و سزا دیں گے۔

فَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهِ ۗ وَإِنَّا لَهُ كَافٍ بَرُونَ ﴿۱۷﴾

”پس جو شخص کرتا رہا کوئی نیک کام بشرطیکہ وہ مومن ہو تو رائیگاں نہیں جائے دیا جائے گا اس کی کوشش کو اور ہم اس کے لئے (اس کے عملوں کو) کفیلے والے ہیں۔“

۱۔ یعنی جو رائی کے دانہ کے برابر بھی نیک عمل کرے گا، جبکہ وہ اللہ اور اس کے رسولوں کی شریعت پر ایمان لائے والا ہو تو اس کی کوشش کو ثواب سے محروم نہیں رکھا جائے گا۔ ثواب کو ایمان کی شرط کے ساتھ مستفید فرمایا کیونکہ تمام اعمال کا اعتبار دولت ایمان کی موجودگی پر ہے۔ یہاں کفر کو استعارۃ ثواب سے روکنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے جیسے شکر کو ثواب کے عطا کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں جنس کی نفی مبالغہ کے لئے ہے۔ ہر انسان کی کوشش اور عمل کو فرشتے لکھ رہے ہیں۔

وَحَرَامٌ عَلَىٰ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَن يَذُكُرُوا ﴿۱۸﴾

”اور ناممکن ہے اس ہستی کے لئے جس کو ہم نے برباد کر دیا کہ اس کے باشندے پھر لوٹ کر آئیں۔“

۱۔ ابو بکر اور حمزہ نے حرام کو حواء کے کسرۃ راء کے سکون اور الف کے بغیر پڑا ہے، جبکہ باقی قراء نے حواء اور راء کے فتح اور ان کے درمیان الف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں جیسے حل و حلال اور اس کا معنی ہے متنع اور جس کا وجود متصور نہ ہو۔ و حوام علی قریۃ اھلکھا تریب حموی کے اعتبار سے مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ یعنی سابقہ آیت کا حکم جو نیکو کاری کی نئی کے ضائع نہ کرنے کا بیان

کیا گیا ہے اس ہستی کے باشندوں کے لئے نہیں ہے جو کفر پر ہلاک ہوئے کیونکہ ان کے اعمال تو ہم راہیگان کر دیں گے یا یہ معنی کرایے لوگوں کا تو یہ یا زندگی کی طرف لوٹنا ممنوع ہے، یہ معنی اس صورت میں ہوگا جب لایہ جمعوں حرام کے حقیق ہو یا یہ معنی کسزاکے لئے ان کو زندہ کر کے نہ اٹھانا ناممکن ہے، اس معنی کے اعتبار سے انہم لایہ جمعوں کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ تو بہ و اخلاص کے ساتھ ہماری طرف نہیں آئیں گے یا یہ معنی کہ وہ دنیا کی طرف نہیں لوٹیں گے تاکہ وہ سابقہ کفر سے توبہ کر کے اور ایمان قبول کر کے تلافی کر سکیں اور یہ ترکیب بھی ہو سکتی ہے کہ ان اپنے اسم اور خبر سے مل کر مبتدا ہو اور حرام اس کی خبر ہو۔ یعنی حساب و جزاء کے مقام کی طرف ان کا نہ لوٹنا ممنوع ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے کہ ایسی ہستی کے باشندوں کا دوبارہ دنیا کی طرف لوٹنا ممنوع ہے (1)۔ اس صورت میں یہ مبتدا خبر ہوں گے اور لایہ جمعوں میں لا زندہ ہوگا۔ ان تمام تاویلات پر یہ آیت کافروں کے لئے وعید ہے جیسا کہ سابقہ آیت مؤمنین کے لئے وعید تھی۔

حَتَّىٰ إِذَا فُجِّعَتْ يَأْجُوجُ وَمَأْجُوجُ وَهُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُونَ ﴿٥١﴾

”یہاں تک کہ جب کھول دیئے جائیں گے یا جوج اور ماجوج اور وہ ہر بلندی سے بڑی تیزی کے ساتھ نیچے اترنے لگیں گے۔“

۱۔ ابن عامر ابو جعفر اور یعقوب نے فصحت کو فاء کی جگہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یا جوج اور ماجوج دو قبیلوں کے نام ہیں۔ ان سے پہلے مضاف محذوف ہے، یعنی ان کے بند کھول دیئے جائیں گے اور بھیڑیے کی تیزی کی طرح تیز دوڑیں گے۔ حدب کا معنی اونچائی، ٹیلہ اور بلندی ہے۔ ہم نے سورہ کہف میں قَدْ أَتَيْنَاهُم بِالْحَقِّ لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا حضرت لؤس بن سمان کی حدیث ذکر کی تھی جس میں یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ یا جوج و ماجوج کو بھیجے گا اور ہر اونچی جگہ سے نیچے اتریں گے۔ میں کہتا ہوں اونچی جگہ سے نیچے اترنے کا ذکر اس لئے فرمایا کیونکہ یا جوج و ماجوج کی قرار گاہ پہاڑوں کے پیچھے ہے۔ اس لئے وہ پہاڑوں کے اوپر سے آئیں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ضمیر کا مرجع تمام لوگ ہیں۔ مجاہد نے اسے کحل حدث پڑھا ہے جس کا معنی قبر ہے اور ضمیر کا مرجع لوگ ہیں تو معنی یہ ہوگا کہ لوگ اپنی قبور سے جلدی جلدی نکلیں گے جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے قَدْ أَهْمُ قَبْرُ الْأَجْدَاثِ إِذِي رَأَيْتَهُمْ يَنْسِلُونَ (تو فورا وہ اپنی قبروں سے نکل نکل کر اپنے پروردگار کی طرف تیزی سے چلے جائیں گے)

حضرت صدیقہ بن اسد الغفاری سے مروی ہے فرماتے ہیں ہم آپس میں گفتگو کر رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ آپ ﷺ نے پوچھا کس چیز پر بحث کر رہے ہو۔ صحابہ کرام نے عرض کی حضور ہم قیامت کا ذکر کر رہے ہیں۔ فرمایا دس نشانوں کے ظہور سے پہلے قیامت قائم نہ ہوگی۔ پھر آپ نے یہ دس نشانیاں بیان فرمائیں۔ 1۔ دھواں۔ 2۔ دجال۔ 3۔ دابہ۔ 4۔ سورج کا مغرب سے طلوع ہونا۔ 5۔ عیسیٰ بن مریم کا نزول۔ 6۔ یا جوج و ماجوج۔ (تین مرتبہ دھنسا)۔ 7۔ مشرق میں زمین کا دھنسا۔ 8۔ مغرب میں زمین کا دھنسا۔ 9۔ جزیرہ عرب میں زمین کا دھنسا۔ 10۔ آخر میں یمن سے آگ کا ٹکنا جو لوگوں کو میدان حشر کی طرف ہانک کر لے آئے گی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آگ قعر عدنان سے اٹھے گی جو لوگوں کو حشر کی طرف ہانک کر لے جائے گی۔ ایک دوسری روایت میں دسویں نشانی اس کو ہوا فرمایا جو لوگوں کو سمندر میں ڈال دے گی۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے (2)۔

حتیٰ ابتدائی ہے جو اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ اس کا ماقبل اس کے مابعد کا سبب ہے جیسے عرب کہتے ہیں مرض فلان حتیٰ لا یروحونہ یہ حرام کے متعلق ہے یا مخدوف کلام کے متعلق ہے جس پر موجود کلام دلالت کر رہی ہے یا یہ لا یروحون کے متعلق ہے، یعنی ان کے اعمال کا اخطا جاری رہے گا یا ان کو توبہ کی نامتبولیت جاری رہے گی یا دنیا کی طرف ان کا لونا متنفر رہے گا یا جزاء کے لئے ان کا زندہ نہ کرنے کا امتناع جاری رہے گا حتیٰ کہ ان کی آنکھیں پٹی ہوں گی یا یہ معنی کوہ کفر پر ہلاک ہوں گے حتیٰ کہ ان کے ساتھ ایسا معاملہ پیش آ جائے گا یا یہ معنی کوہ توبہ کی طرف یا دنیا کی طرف نہیں لوٹیں گے حتیٰ کہ ایسا ہو جائے گا۔ حتیٰ کہ بعد اولا جملہ شرطیہ ہے۔ اذا فتحت یا جوج و ماجوج شرط ہے اور وہم من کل حدب ینسلون یا جوج و ماجوج سے حال ہے اور اگر ضمیر کا مرجع لوگ ہوں تو یہ شرط پر معطوف ہوگا۔

وَ اقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
يُؤَيِّنٰتُ قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۰﴾

” (تب معلوم ہوگا کہ) قریب آ گیا ہے سچا وعدہ۔ تو اس وقت تاڑے لگ جائیں گی نظریں ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا تھا۔ (کہیں گے) صد خیف سے ہم تو غافل رہے اس امر سے بلکہ ہم تو ظالم تھے۔“

۱۔ اقتراب کا عطف فتحت پر ہے۔ فرما اور شامی کی ایک جماعت کا قول ہے کہ یہ دوواژ آمدہ ہے اور جملہ شرط کی جزاء ہے جیسا کہ اس ارشاد میں ہے فَذٰلِكَ اَسْمَاؤُكَ لِنَجْوٰنِ ﴿۱۰﴾ وَ ذٰلِكَ يٰٓاٰمِنٌ۔ اس کا معنی یہ ہے کہ جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا تو ہم نے ان کو ندا دی۔ اس قول کے قائلین نے حضرت حذیفہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا اگر ایک شخص نے یا جوج و ماجوج کے خردنگ کے بعد بکھیرا پالا ہوگا ابھی سوار نہ ہوا ہوگا کہ قیامت قائم ہو جائے گی (۱)۔ اس قول کا رد اس طرح کیا گیا ہے کہ دوواژ آمدہ نہیں ہے اور شرط کی جزاء فاذا ہی شاخصہ ہے۔

۲۔ اذا مفاجاتیہ ہے جو جزاۃ کے قائم مقام ہے جیسا کہ اس ارشاد میں ہے۔ اِذَا هُمْ يَفْطَنُوْنَ۔ جب یہ اذفاء کے ساتھ مل کر آتا ہے تو شرط کے جزاء کے ساتھ اتصال پر دلالت کرتا ہے اور تاکید پیدا کرتا ہے اور ہی غیر قصہ ہے یا ضمیر مبہم ہے اور الا ابصار اس کی تفسیر بیان کر رہا ہے۔ شاخصہ مبتدأ ہے، صفت کو اپنے فاعل کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ الا ابصار ان کا فاعل ہے یا الا ابصار مبتدأ ہے اور شاخصہ خبر ہے۔ عرب کہتے ہیں شخص بصورہ یعنی اس کی آنکھ کھلی اور تیرانی اور ہولنا کی کی وجہ سے ہند نہیں ہوتی۔ بعض علماء فرماتے ہیں ہی مبتدأ ہے اور اس کی خبر مخدوف ہے، یعنی قیامت اتنی قریب ہے گویا بالکل آچکی ہے اور شاخصہ ابصار الذین کفروا جملہ مستأنف ہے۔

۳۔ یا ویلنا اس سے پہلے بقولون مصدر ہے اور یہ اسم موصول سے حال ہے۔ یہ ترکیب بھی ہو سکتی ہے کہ فاذا ہی شاخصہ شرط پر معطوف ہو اور جزاء بقولون یا ویلنا ہو۔

۴۔ قد کا جملہ یا ویلنا کے قول کی تعلیل ہے۔ یعنی ہم اس دن سے بے خبر رہے اور قدرت کی نشانیوں میں غور و فکر نہ کرنے کی وجہ سے ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا یا غیر کی عبادت کر کے ہم اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔

إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ أَنتُمْ لَهَا وَارِدُونَ ﴿۱۸﴾

”(اے مشرک!) تم اور جن بتوں کی تم عبادت کیا کرتے ہو اللہ کو چھوڑ کر۔ سب جہنم کا ایندھن ہوں گے۔ تم اس میں داخل ہونے والے ہو۔“

۱۔ عاصی اور غیر ذی العقول بت اور سامری کا بنایا ہوا ٹھنڈا ہے۔ کفار کو رسوا کرنے کے لئے ان کو جلایا جانے کا کہ جن کی تم عبادت کرتے تھے وہ خود آگ کا ایندھن ہیں اور مایں وہ ذوالعقول بھی شامل ہیں جو یہ پسند کرتے ہیں کہ ان کی عبادت کی جائے جیسے شیطانوں میں سے جنہوں نے جھوٹی خدا کی دعویٰ کیا اور انسانوں میں سے جیسے فرعون، نمرود اور ان جیسے دوسرے خدا ہونے کا دعویٰ کرنے والے لیکن وہ ذوالعقول جن کی پوجا کی جانی ہے لیکن وہ اس کو پسند نہیں کرتے بلکہ وہ اس سے منع کرتے ہیں (جیسے مٹی علیہ السلام وغیرہ) کہ وہ اس مائے موم میں داخل نہیں ہیں کیونکہ عقل و نقل اس کے خلاف ہے ارشاد ہے وَلَا تَنْتَهِزُوا زُرَّاتٍ مَّا عَلَيْهَا حَمَلٌ مِّنْ أَثَرِ الرَّسُلِ يَلْمِزُكَ أَمْثَلُهُ

یہ مفہوم اس فقہ پر ہو گا جب ماذی العقول اور غیر ذوی العقول کے لئے عام ہو جیسا کہ اکثر محققین کا معتقد مذہب ہے اور اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو ابن زبیری نے روایت کی ہے کہ اس نے حضور ﷺ سے پوچھا کیا یہ وعید ہمارے معبودوں کے ساتھ خاص ہے یا ہر معبود کے لئے ہے جو اللہ کے سوا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہر اس شخص کے لئے ہے جس کی بھی اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کی جاتی ہے (اور وہ اس کو پسند کرتا ہے) اس حدیث کو امام بیضاوی نے نقل کیا ہے (۱) اور اسے ابوداؤد ابن المنذر راہین مردویہ اور طبرانی نے ابن عباس سے ایک اور سند سے نقل کیا ہے۔ اور اگر ماذی العقول کے لئے تسلیم کیا جائے تو کسی شخص کو اس کی ضرورت نہیں۔ جو ذوی العقول معبود ہونے کو پسند نہیں کرتے وہ اس میں داخل ہی نہ ہوں گے۔

۲۔ وہ چیز جس کے ذریعے آگ کو بھڑکایا جاتا ہے اسے حصب کہتے ہیں۔ یہ شہاک کا قول ہے اور یہ حصہ، حصہ، بھصہ سے مشتق ہے جس کا معنی کنکر یا چمکانا ہے۔ مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں اہل یمن کی لغت میں حصب کا معنی حطب یعنی لکڑیاں ہے۔ تکریم فرماتے ہیں حشبہ کی لغت میں اس کا معنی حطب ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں۔ حضرت علی بن ابی طالب نے اسے حطب جہنم پڑھا ہے یعنی جہنم کا ایندھن (۲)۔

۳۔ اے مشرک! تم اپنے معبودوں کے ساتھ دوزخ میں اترو گے۔ انتم لہا واردون۔ جملہ متانہ ہے یا حصب و جہنم سے بدل ہے اور لہا میں لام طی کے عوض ہے اور یہ اختصاص اس بات پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ ان کا درد اور اترنا اس کی وجہ سے ہے اس سے پہلے مشرکین سے کلام غائب کے سینوں میں تھی لیکن اب غائب کے سینے ذکر فرمائے۔

لَوْ كَانَ هَؤُلَاءِ إِلَهًا مَا وَرَدَوْهَا وَكُلٌّ فِيهَا خُلُدُونَ ﴿۱۹﴾

”(سوچو!) اگر یہ خدا ہوتے تو نہ داخل ہوتے جہنم میں اور (جھوٹے خدا اور ان کے پجاری) سب اس میں ہمیشہ رہیں گے۔“

۱۔ یہ جملہ مضرہ ہے اور اس سے پہلے قول مقدر ہے کفار کے آگ میں داخل ہونے اور ان کے معبودوں کے داخل ہونے کے بعد کفار

کو ذلیل و رسوا کرنے کے لئے ایسا کہا جائے گا۔ یہ جھوٹے معبود اور ان کے پیاری سب اس آگ میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور کبھی ان کو خلاصی نہ ہوگی و کل فیہا خالدون کا عطف انتم لہا وار دون پر ہے۔

لَهُمْ فِيهَا زُفِيرٌ وَ هُمْ فِيهَا لَا يَسْمَعُونَ ﴿۱۰﴾

”وہ جہنم میں (شدت عذاب سے) سچھیں گے۔ اور وہ اس میں اور کچھ نہ سن سکیں گے۔“

لہ زفیر کا معنی سخت آواز اور زور سے سانس لینا ہے۔ یہاں بعض فعل کو کل کی طرف مضاف کیا گیا ہے اور یہ جملہ خالدون کی ضمیر سے حال ہے۔

یہ جملہ ظریف پر معطوف ہے یا حال ہے۔ ابن جریر ابن ابی حاتم، ابن ابی الدنیا اور ربیع نے حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے کہ جب دوزخ میں صرف ہمیشہ رہنے والے باقی رہ جائیں گے تو ان کو لوہے کے تابوتوں میں رکھا جائے گا جن میں کیل بھی لوہے کے ہوں گے پھر ان تابوتوں کو دوسرے لوہے کے تابوتوں میں رکھا جائے گا پھر انہیں جہنم کے نیچے والے درجہ میں پھینک دیا جائے گا ان میں سے ہر ایک یہی خیال کر رہا ہوگا کہ میرے سوا کسی دوسرے کو عذاب نہیں ہو رہا ہے (1) پھر عبد اللہ بن مسعود نے یہ آیت تلاوت فرمائی لَهِمْ فِيهَا زُفِيرٌ وَ هُمْ فِيهَا لَا يَسْمَعُونَ

امام بغوی نے جو حدیث بیان فرمائی ہے اس میں ہے کہ ان کو آگ کے تابوتوں میں ڈالا جائے گا پھر ان تابوتوں کو دوسرے تابوتوں میں رکھا جائے گا پھر ان تابوتوں کو ایسے تابوتوں میں رکھا جائے گا جن میں آگ کے کیل ہوں گے وہ ان تابوتوں میں کچھ نہیں سن سکیں گے اور ان میں سے ہر شخص یہی خیال کرے گا کہ میرے سوا کسی دوسرے کو عذاب نہیں ہو رہا ہے (2)۔

حاکم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ جب انکم و ما تعبدون من دون اللہ حصب جہنم کا ارشاد نازل ہوا تو مشرک کہنے لگے۔ ملائکہ! حسنی اور عزیر علیہم السلام کی بھی پوجا کی جاتی ہے (تو پھر ان کا کیا ہوگا) اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنَىٰ أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ ﴿۱۱﴾

”بلاشبہ وہ لوگ جن کے لئے مقدر ہو چکی ہے ہماری طرف سے بھلائی تو وہی اس جہنم سے دور رکھے جائیں گے۔“

لہ الحسنی سے مراد منزلت القرب ہے یا اچھی خصلت ہے اور وہ سعادت ہے یا اطاعت کی توفیق ہے یا خیریت کی شہادت ہے۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن خوش نصیبوں کو ہماری طرف سے حمایت کی عنایت ہوئی آخر کار انہیں ولایت بھی نصیب ہوگی۔ ابن مردودہ اور الضیاء نے المختار میں ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ عبد اللہ بن الزبیری نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں آیا تو کہنے لگے اے محمد آپ کہتے ہیں کہ اللہ نے تجھ پر یہ ارشاد نازل فرمایا ہے إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ أَنْتُمْ لَهَا وَارِدُونَ۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں اللہ نے یہ نازل فرمایا ہے۔ عبد اللہ بن زبیری نے کہا پھر تو سورج چاند ملائکہ عزیر علیہم السلام کی بھی پوجا کی جاتی ہے۔ کیا یہ سب ہمارے خداؤں کے ساتھ آگ میں ہوں گے۔ اس وقت یہ ارشاد نازل ہوا ان الذين سبقتم لهم منا الحسنی اور وَ لَسْنَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُزَيِّمَ لَنَا مِن دُونِهَا مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ

امام بغوی نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور سرداران قریش عظیم کعبہ میں تھے (اور اس وقت کعبہ کے ارد گرد تین سو ساٹھ بت

نصب تھے) نضر بن حارث آپ ﷺ سے مناظرہ کرنے لگا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے مسکت جواب دیا اور پھر یہ آیات تلاوت فرمائی اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ الْخَبْرُ اَبْحَرُ آپ کھڑے ہوئے تو عبد اللہ بن الزبیری لوگوں کے پاس پہنچ گیا۔ ولید بن مغیرہ نے عبد اللہ بن زبیری کو جو کچھ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا وہ بتا دیا۔ عبد اللہ بن زبیری نے کہا تم کہتے ہو کہ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں نے یہ کہا ہے۔ عبد اللہ بن زبیری نے کہا کیا یہود و عزر علیہ السلام کی اور نصاریٰ مسیح علیہ السلام کی اور بنو امیہ کی پوجا نہیں کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا (یہود و نصاریٰ عزیرو مسیح کی نہیں) بلکہ شیطانوں کی پوجا کرتے ہیں (۱)۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ ان الذین سبقت لهم منا الحسنى اور ابن الزبیری کے متعلق یہ ارشاد نازل فرمایا مَا صَرَّفْتُ لَكَ اِلَّا جَدًّا لَا يَبْلُغُ فَمَنْ قَوْمٌ حَصْبُونَ (وہ نہیں بیان کرتے یہ مثال آپ سے مگر کج بحثی کے لئے اور حقیقت یہ لوگ بڑے بھٹلا لو ہیں)

الواحد نے ابن عباس سے امام بخاری کی روایت کی طرح روایت کیا ہے۔ اصول فقہ کی بعض کتب میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابن زبیری کو فرمایا۔ تو اپنی قوم کی زبان سے بھی خبر ہے۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ ما فیر ذوی العقول کے لئے آتا ہے۔ یہ جو اب کتب حدیث میں موجود نہیں ہے۔ بعض اہل علم فرماتے ہیں اس آیت میں ان کا کلمہ الا کے معنی میں ہے۔ لیکن یہ قول دو وجہ کے اعتبار سے غیر پسندیدہ ہے۔ 1۔ ان کا کلمہ الا کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔ 2۔ استثناء کے لئے اتصال ضروری ہے اگرچہ بعض علماء کے نزدیک استثناء منفصل بھی جائز ہے اور ہم نے جو آیت کے نزول کا سبب ذکر کیا ہے وہ کلام کے انفصال پر دلالت کرتا ہے۔

اکثر علماء کے نزدیک یہ آیت سابقہ آیت کی تخصیص ہے کیونکہ ان کے نزدیک تخصیص اس کلام کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے جو مستقل ہو اور بعد میں اس کا نزول ہو اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بعد میں نازل ہونے والی آیت ناسخ ہوگی تخصیص نہ ہوگی اور یہاں نسخ متصور نہیں ہو سکتا کیونکہ نسخ امر میں ہوتا ہے اخبار میں نسخ نہیں ہوتا۔ جس یہ علیحدہ مستقل کلام ہے اور سابقہ کلام سے مجازی معنی کے مراد پر دلیل ہے۔ ابوداؤد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اسی طرح ابن ابی حاتم اٹھلی اور ابن مردویہ نے اپنی اپنی تفاسیر میں نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خطبہ ارشاد فرمایا اور یہ آیت تلاوت فرمائی اور فرمایا۔ جنہم سے دور رکھے جانے والوں سے میں ابوبکر عمر عثمان طلحہ زبیر سعید سعد عبدالرحمن بن عوف ابو سعیدہ بن ابی جراح ہیں۔ پھر نماز کے لئے اقامت کہی گئی تو آپ اپنی چادر کھینچتے ہوئے کھڑے ہوئے اور ذیل کا ارشاد تلاوت فرمایا۔

لَا يَسْمَعُونَ حَسِيصَهَا ۗ وَ هُمْ فِي مَا اسْتَبْتَّ اَنْفُسَهُمْ خُلْدُونَ ﴿٦﴾

”وہ اس کی آہٹ بھی نہیں سنے اور وہ ان (نعتوں) میں جن کی خواہش انہوں نے کی تھی ہمیشہ رہیں گے۔“

یہ مبعدوں سے بدل ہے یا اس کی ضمیر سے حال ہے۔ دوزخ سے ان کے دور ہونے میں ممانعت کرنے کے لئے یہ کام ذکر کی گئی ہے۔ حسیس اس آواز کو کہتے ہیں جو محسوس ہو۔ یہاں طرف (لفظہ) کو انحصار اور اہتمام کے لئے مقدم کیا گیا ہے۔ اس ارشاد میں دلیل ہے کہ صوفیاء کرام جن کے دل اللہ تعالیٰ کے سوا کسی چیز کی طرف رغبت نہیں رکھتے وہ بلا کیف وصل کی لذت میں ہمیشہ رہیں گے۔

لَا يَحْرُومُهُمُ الْقَدْرُ اَلَا كَبُرَ وَتَلَقَّوْهُمْ الْمَلٰٓئِكَةُ هٰذَا يَوْمُكُمْ اَلَّذِي

لَسْتُمْ تُوْعَدُونَ ﴿۲۱﴾

”یہ نہ عنقا کرے گی انہیں بڑی گھبراہٹ لے اور فرشتے ان کا استقبال کریں گے (انہیں بتائیں گے) یہی وہ تمہارا دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔“

۱۔ یہ جملہ ان الذین بقیقت کے ان کی دوسری خبر ہے۔ امام بخاری فرماتے ہیں الفزع الاکبر سے مراد نفعہ اخیرہ ہے کیونکہ ارشاد ہے وَ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي السُّمُورِ فَيَقْرَعُونَ فِي السَّنُوتِ وَ هُنَّ فِي الْأَرْضِ (اور جس دن پھونکا جائے گا صورتو گھبرا جائے گا ہر کوئی جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے) میں کہتا ہوں نفعہ اخیرہ سے مراد وہ فتح ہے جو امسور دنیا میں سے آخری ہوگا۔ ورنہ فزع کا فتح تو پہلا فتح ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے فتح اصعق مراد ہے اور یہ دونوں امر متلازم ہیں کیونکہ لوگ فتح اولیٰ کے وقت گھبرا نہیں گئے اور اس کی وجہ سے مر جائیں گے۔ قرطبی نے اسی قول کو صحیح کہا ہے۔ کیونکہ اکثر احادیث میں صرف دو فتحوں کا ذکر ہے۔ 1۔ فتح اصعق۔ 2۔ فتح البعث۔ ابن عربی نے تین فتحات کا ذکر کیا ہے۔ پہلا فتح الفزع دوسرا فتح اصعق تیسرا فتح البعث۔ میرے نزدیک بھی یہی بخاری ہے۔

ابن جریر نے اپنی تفسیر میں الطبرانی نے المطولات میں ابو یعلیٰ نے اپنی مسند میں البیہقی نے البعث میں ابو موسیٰ المدینی نے المطولات میں علی بن معبد نے کتاب الطلح والعیصان میں عبد بن حمید نے اور ابو اسحاق نے کتاب العظمت میں حضرت ابو ہریرہ سے ایک طویل مرفوع حدیث روایت کی ہے جس میں ہے کہ تین صورتوں میں جائیں گے۔ پہلا فتح الفزع دوسرا فتح اصعق تیسرا فتح البعث الی رب العالمین۔ مزید تفصیل فزع کے متعلق احادیث میں وارد ہے۔ وہ ہم سورہ نمل میں مذکورہ آیت کے تحت نقل کریں گے۔

حضرت الحسن فرماتے ہیں بڑی گھبراہٹ اس وقت ہوگی جب بندے کو آگ کی طرف لے جانے کا حکم ہوگا۔ ابن جریر فرماتے ہیں جب موت کو ذبح کیا جائے گا اور ندا دی جائے گی اے دوزخو! تم نے ہمیشہ یہاں رہنا ہے اور اب کوئی موت نہیں ہے۔ سعید بن جبیر اور الشماک فرماتے ہیں بڑی گھبراہٹ اس وقت ہوگی جب جہنم کو اوپر بند کر دیا جائے گا اور دوزخ کو اوپر سے اس وقت بند کر دیا جائے گا جب اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو دوزخ سے نکال دے گا جن کو نکالنے کا اس نے ارادہ فرمایا ہوگا (2)۔

۲۔ یہ خوش نصیب جب اپنی قبروں سے باہر آئیں گے تو فرشتے ان کا استقبال کریں گے اور جنت کے دروازوں پر انہیں خوش آمدید کہیں گے اور یہ بتائیں گے یہ تمہارا ثواب و اجر کا دن ہے، جن کا کتب سادہ کے ذریعے تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ہذا یوم مکم کا جملہ قول کی تقدیر کے ساتھ ملائکہ سے حال ہے۔

يَوْمَ تَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السَّجْلِ لِلْكَتُبِ ۖ كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ
لُعَيْدًا ۖ وَعَدَّا عَلَيْنَا ۖ إِنَّا كُنَّا فَعْلِينَ ﴿۲۱﴾

”یاد کرو (جس دن ہم لپیٹ دیں گے آسمان کو جیسے لپیٹ دیے جاتے ہیں طومار میں کاغذات لے جیسے ہم نے آغاز کیا تھا) بندے! فریش کا اسی طرح ہم اسے لوٹائیں گے۔ یہ وعدہ (پورا کرنا) ہم پر لازم ہے یقیناً ہم (ایسا) کرنے والے ہیں۔“

۱۔ البصیر نے تطویٰ کو مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور السماء کو نائب الفاعل کی حیثیت سے رفع دیا ہے اور جمہور قراء نے جمع تکمیل کا صیغہ پڑھا ہے اور السماء کو نصب دی ہے۔ یہ اذکر فعل مقدر کی وجہ سے منصوب ہے یا لا یجز نہیم یا تلتقامہ کی نظر ہے یا حال مقدر ہے۔ طی بشر کی ضد ہے اور اس کا معنی پیشنا ہے۔ السجل کا معنی الصعیدہ ہے اور یہ مساجلہ سے مشتق ہے جس کا معنی لکھنا ہے۔ للکتب کا مخزفہ کسائی اور حفص نے جمع پڑھا ہے اور باقی قراء نے مفرد "للکتاب" پڑھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لکھنے کے لئے جس طرح کا نقد کو پیشنا جاتا ہے یا جو لکھا جاتا ہے یا جس میں لکھا جاتا ہے اور اس کو پیشنا جاتا ہے اسی طرح ہم آسمانوں کو لپیٹ دوں گے۔

جمع "للکتب" کے صیغہ کی قرأت اس مفہوم پر دلالت کرتی ہے۔ ابن عباسؓ نے عباد اور اکثر مفسرین کا یہی قول ہے۔ اسدی کہتے ہیں السجل ایک فرشتے ہے جو لوگوں کے اعمال کو لکھتا ہے اور لام زائدہ ہے۔ جیسا کہ رد فل لکھم میں لام زائدہ ہے (۱)۔ بعض علماء فرماتے ہیں السجل رسول اللہ ﷺ کا کتاب تھا۔ قاموس میں ہے کہ کتب معاہدہ وغیرہ کی کتاب کو کہتے ہیں، اس کی جمع سجات ہے، اس کا معنی حبشہ کی نیت میں کتاب اور مرد ہے۔ ضوضوی کریم ﷺ کے کتاب کا نام بھی السجل ہے۔ ایک فرشتہ کا نام بھی ہے۔ السجل بالکسر مراد کتاب ہے (۲)۔ بعض علماء فرماتے ہیں السجل ایک پتھر تھا جس پر لکھا جاتا تھا پھر اس چیز کو کھل گیا جس پر لکھا جاتا تھا۔

۲۔ کما میں ما کا فہ یا مصدر یہ ہے اور اول بداننا کا مفعول ہے، یعنی ہم نے جس طرح ابتداء عدم سے اس کو جو دو بخشا اسی طرح ہم دوبارہ اسے لوٹائیں گے یا اس کے متفرق اجزا کو جمع کریں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اول مضمحل مفعول ہو جس کی تفسیر نعیبہ کر رہا ہے دونوں تریکب کے اعتبار سے معنی ایک ہی ہے۔ اس آیت سے مقصود ابتدائے آفریش کے ذریعے دوبارہ زندہ کرنے کی صحت کو بیان کرنا ہے۔ کیونکہ امکان ذاتی ہماری قدرت کے تحت داخل ہے اور ہماری قدرت قدیمہ کا ملکہ پہلی تخلیق اور دوسری تخلیق دونوں کو برابر شامل ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کما میں ما موصول ہے اور بداننا اس کا صلہ ہے اور ضمیر عائد محذوف ہے اور کاف فعل محذوف کے متعلق ہے جس کی تفسیر نعیبہ کر رہا ہے اور اول خلق بداننا کی ظرف ہے یا ضمیر عائد محذوف سے حال ہے اس ترکیب کے اعتبار سے دوسری تخلیق پہلی تخلیق کی طرح ہوگی لیکن مخلوق جدا جدا ہوگی، یعنی پہلی اور دوسری تخلیق ایک دوسرے کے شش ہوں گی۔ حق یہ ہے کہ دوسری تخلیق یعنی پہلی تخلیق ہوگی ہمیشہ صرف دونوں تخلیقوں میں ہے یا احوال و اوصاف میں ہے۔

امام بخاری، مسلم اور ترمذی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے اور فرمایا اے لوگو! تمہیں اللہ کی بارگاہ میں نئے پاؤں پیدل نئے بدن غیر مختون جمع کیا جائے گا پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی کَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ (پھر فرمایا) سب سے پہلے ابراہیم علیہ السلام کو لباس پہنایا جائے گا (۳)۔

۳۔ وعداً فعل مقدر کی وجہ سے منصوب ہے اور یہ نعیبہ کی تاکید ہے یا نعیبہ کی وجہ سے منصوب ہے کیونکہ اس نے ہمارے اعادہ کا وعدہ فرمایا ہے، یعنی جو بھی ہم نے وعدہ کیا ہے ہم پر اس کا پورا کرنا لازم ہے۔ تاکید بالانے تاکید کے لئے فرمایا انا کما فاعلین۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ﴿۵۰﴾

”اور بیشک ہم نے لکھ دیا ہے زبور میں چند موعظت کے (بیان کے) بعد کہ بلاشبہ زمین کے وارث تو میرے نیک

بندے ہوں گے۔“

۱۔ یہ معذوف قسم کا جواب ہے۔ سعید بن جبیر اور مجاہد فرماتے ہیں زبور سے مراد تمام کتاب سواہی ہیں اور ذکو سے مراد لوح محفوظ ہے۔ اٹھویں فرماتے ہیں زبور سے مراد وہ کتاب ہے جو داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی اور ذکر سے مراد تورات ہے۔ ابن عباس اور الضحاک فرماتے ہیں زبور سے مراد تورات اور ذکر سے مراد تورات کے بعد نازل ہونے والی کتب ہیں (۱)۔ بعض علماء فرماتے ہیں زبور سے داؤد علیہ السلام کی کتاب مراد ہے اور ذکر سے قرآن مراد ہے۔ ان دونوں تاویلوں کی صورت میں بعد بمعنی قبل ہوگا۔

۲۔ ارض سے مراد جنت ہے۔ حزرہ نے عبادی کو یاہ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاہ کے فقرہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ آیت کریمہ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ کے ارشاد کی طرح ہے۔ فاسق لوگ جنت میں یا تو عذاب اور تلخیص کے بعد داخل ہوں گے یا مغفرت اور بخشش کے بعد داخل ہوں گے اور وہ اس وقت صالحین کے ساتھ مل جائیں گے اور ان کے زمرہ میں شامل ہو جائیں گے۔ مجاہد فرماتے ہیں الصالحون سے مراد محمد ﷺ کی امت ہے اور اس کی دلیل یہ ارشاد ہے وَقَالُوا الْحَسَنُ الَّذِي أُنزِلَتْ آيَاتُهُ عَلَيْنَا وَإِنْ كُنَّا مِنْكُمْ لَمِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ اور وہ (خوش بخت) کہیں گے ساری تعریفیں اس اللہ کریم کے لئے جس نے پورا فرمایا ہمارے ساتھ اپنا وعدہ اور وارث بنا دیا ہمیں اس (پاک) زمین کا اب ہم ظہریں گے جنت میں جہاں چاہیں گے (۲) بعض علماء فرماتے ہیں ارض سے مراد ارض مقدس ہے اور عبادی الصالحون سے مراد کمزور و ناتواں لوگ ہیں جو زمین کے مشارق و مغارب میں رہتے ہیں۔ ابن عباس فرماتے ہیں ارض سے مراد کفار کی زمین ہے جسے مسلمان فتح کریں گے۔ یہ ارشاد دین الہی کے غلبہ اور مسلمانوں کو اعزاز بخشنے کے لئے ہے (۳) میں کہتا ہوں ارض سے مراد تمام زمین ہے۔ امام احمد نے حضرت مقداد سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں، انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ سطح زمین پر کوئی مٹی کا گھرا اور ان کا خیمہ نہیں رہے گا مگر اللہ تعالیٰ اسلام کے کلے کو اس میں داخل فرمائے گا عزت والے کی عزت کے ساتھ اور ذلیل کو ذلیل کرنے کے ساتھ یا تو اللہ تعالیٰ ان کو اسلام کی عزت عطا کرے گا اور انہیں عزت والے لوگوں سے کر دے گا یا ان کو ذلیل کرے گا اور وہ ظلم اسلام کو مجبوراً قبول کریں گے۔ مقداد فرماتے ہیں میں نے کہا پھر تو دین سارے کا سارا اللہ کے لئے ہوگا۔

إِنَّ فِي هَذَا لَلْبَلَاغَ لِقَوْمٍ عَلِيمِينَ ﴿۱۷﴾

”یقیناً اس قرآن میں کفایت ہے اس قوم کی (فلاح دارین) کے لئے جو عبادت گزار ہے۔“

۱۔ یعنی اس قرآن حکیم میں جو چند نصاب اخبار و مواعد ہیں وہ انسان کو جنت میں داخل کرنے کے لئے کافی ہیں کیونکہ یہ سب احکام جنت کا زادراہ ہیں۔ جیسے مسافر کے زادراہ کو بلاغ کہتے ہیں یا یہ معنی کہ مقصود و مطلوب تک پہنچنے کے یہ احکام سبب ہیں۔ یعنی جو ان احکام قرآنی سے فصیحت حاصل کرتا ہے وہ اپنے مطلوب ثواب کو پہنچ جاتا ہے۔ لقوم عابدين یا تو بلاغ کا کیفیت ہے یا اس کے متعلق ہے اور اس سے مراد وہ مومنین ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس سے مراد تمام عالم ہیں۔ کعب الاحبار فرماتے ہیں اس سے مراد امت محمدیہ ہے جو نماز و حج کا نادا کرتے ہیں اور رمضان کے روزے رکھتے ہیں (۴)۔

وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ﴿۱۸﴾

”اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر سراپا رحمت بنا کر سارے جہانوں کے لئے۔“

لہذا رحمۃ یا تو مفعول لہ کے اعتبار سے منسوب ہے یا مگر ضمیر خطاب سے حال ہونے کی وجہ سے منسوب ہے، یعنی جن وانس پر یہ ہماری رحمت ہے کہ ہم نے آپ کو مبعوث فرمایا تاکہ وہ آپ سے ہدایت حاصل کریں یا یہ معنی ہے کہ ہم نے آپ کو مبعوث فرمایا حالانکہ آپ سراپا رحمت ہیں یعنی رحمت الہی کا سبب ہیں۔

حاکم نے حضرت ابو ہریرہ سے اور ابن سعد اور حکیم نے ابی صالح سے سراسر روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اِنَّمَا اَنَا رَحْمَةٌ مَّهْدَاةٌ یعنی میں وہ رحمت ہوں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو بطور تحفہ عطا فرمائی (۱)۔

امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ سے تاریخ میں روایت کیا ہے اِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَةً وَ لَمْ اُبْعَثْ عَذَابًا یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے سراپا رحمت بنا کر بھیجا ہے عذاب بنا کر نہیں بھیجا۔

یہ جملہ ان فی ہذا لبلغا پر محظوف ہے اور معنی اس کی تاکید ہے کیونکہ قرآن جب بلاغا اور جنت کا زاد ہے تو اس رسول کا مبعوث کرنا جس پر قرآن نازل ہوا وہ یقیناً رحمت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو مجھے احکام اور پند و نصائح دئے گئے ہیں وہ لوگوں کی سعادت کا سبب ہیں اور ان کی معاش و معاد کی صلاح کا موجب ہیں۔ پس جو اس سراپا رحمت سے فیض حاصل نہ کریں اور اس رحمت سے محروم ہیں تو وہ اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں، حضور کے رحمت ہونے کے یہ منافی نہیں ہے۔

ابن عباس فرماتے ہیں دنیا میں کفار کے لئے بھی رحمت ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی وجہ سے عذاب کو مؤخر کر دیا ان کی شکلیں نہیں بگڑتی اور زمین میں دھنس نہیں جاتے اور ان کا نام و نشان نہیں مٹایا گیا (۲)۔

قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰى اِلٰىَّ اَلْمَا اِلٰهِيْكُمْ اِلٰهٌ وَّ اٰجِدُكُمْ مَّسْلُوْمًا ۝۱۰

”فرمادیتے ہیں کہ میرے پاس تو صرف وحی آئی ہے کہ تمہارا خدا (وہی ہے جو) ایک خدا ہے۔ پس کیا تم اسلام لانے کے لئے تیار ہو گے۔“

یہ جملہ مستفاد ہے، اس سوال کے جواب میں کہ میں جب رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں تو میں کیا کہتا ہوں؟ انما یوحیٰ میں ما کاذب ہے اور اس سے جو صبر مستفاد ہے وہ مبالغہ پر مبنی ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ وہی کا مقصود اصل تو حید ہے گویا صرف یہی تو حید کا حکم ہی میری طرف بھیجا گیا ہے کوئی دوسرا نہیں۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے معاملہ میں جو میری طرف وحی کی گئی ہے وہ صرف تو حید ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ما موصول ہو اور ان کا نام ہو اور انما الہکم خبر کی مثبتیت سے محل رفع میں ہو اور تو حید کا اثبات دلیل سعی کے ساتھ بھی درست ہے کیونکہ رسالت مرحل پر موقوف ہے پس یہاں کوئی دور لازم نہیں آتا۔

یعنی سر تسلیم خم کر دو اور خالصتاً اللہ کی عبادت کرو جیسا کہ وہی کا تقاضا ہے، جس کی حجت کے ساتھ تصدیق کی گئی ہے اور رحمت الہی کے حصول کی استعداد پیدا کرو۔

فَاَنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اَدْبُرْتُمْ عَلٰی سَوَآءٍ ۙ وَاِنْ اَدْبُرْتُمْ اَقْرَبُ اَمْرٍ بَعِيْدٌ
مَا تَوَعَّدُوْنَ ۝۱۱

”اگر وہ پھر بھی روگردانی کریں تو آپ فرما دیجئے کہ میں نے آگاہ کر دیا ہے تمہیں پوری طرح اے اور میں نہیں سمجھتا کہ قریب ہے یا بعید جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔“

۱۔ اتمام حجت کے بعد بھی اگر وہ اسلام کی قبولیت سے منہ موڑیں اور رحمت الہیہ سے انکار کریں تو اے محبوب! آپ انہیں فرمادیں کہ مجھے جو احکامات دیئے گئے تھے وہ سب میں نے تمہیں پہنچا دیئے ہیں یا یہ معنی کہ میں تم سے جنگ کا اعلان کرتا ہوں۔ تمہارے اور ہمارے درمیان کوئی صلح نہیں اور اسلام کے احکام کی اطلاع یا اعلان جنگ میں نے کسی سے نہیں چھپایا۔ تم میں سے ہر ایک کو اطلاع ہو چکی ہے۔ اس ارشاد میں فرق باطنیہ اور رافضیوں کا رد ہے جو تفتیہ کا عقیدہ رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ائمہ کرام اپنے اصحاب کو احکام شریعت پوشیدہ طور پر بتاتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ پوراوں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ یا یہ معنی کہ اسلام کے احکام سے جو میں نے تمہیں بتائے ہیں یا جنگ کی اطلاع دی ہے اور اسلام اور کفر کی دشمنی کی اطلاع دی ہے اس کے علم میں میں اور تم برابر ہیں۔ یعنی کوئی دھوکا نہیں ہے جنگ کی تیاری کرو۔ میں تمہیں برملا جنگ کی خبر دیتا ہوں، تمہاری اور ہماری جنگ کوئی پوشیدہ نہیں ہے۔ بعض علماء نے یہ معنی کیا ہے کہ میں نے تمہیں خبر دی ہے کہ میں عدل اور استقامت رائے پر ہوں۔ میری رائے حجت اور دلیل سے آراستہ ہے۔ یعنی مسلمانوں کے تم پر غالب آنے یا سحر کے قائم ہونے کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ ضرور پورا ہوگا۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ وہ قریب پورا ہوگا یا دیر سے پورا ہوگا۔

إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُونَ ﴿۱۰﴾

”جیسا کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو بات تم بلند آواز سے کہتے ہو اور جانتا ہے جو تم (اپنے دل میں) چھپاتے ہو۔“
۱۔ یعنی تم جو اعلانیہ اسلام پر طعن کرتے ہو اور خفیہ طور پر دلوں میں جو بغض اور کین رکھتے ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کی تمہیں جزا دے گا۔ نفاق پر توجہ اور اخلاص پر تجرہ لیں گے لے یہ جملہ مترضہ ہے۔

وَإِنْ أَدْرَأَيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَ مَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ﴿۱۱﴾

”اور میں کیا جانوں (اس ذمیل سے) شاید تمہارا امتحان لینا اے اور ایک وقت تک تمہیں لطف امدوز کرنا مطلوب ہو۔“

۱۔ ادوی کا مفعول محذوف ہے، یعنی میں نہیں جانتا کہ کس سبب سے تمہارے عذاب میں تاخیر ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ تمہارے ظاہر و باطن کو برابر جانتا ہے۔ جب اس جملہ میں کفار سے عذاب کو مؤخر کرنے کے سبب سے آپ ﷺ کی نفی کی گئی ہے تو یہ چیز ظن کی نفی کا وہم دلاتی ہے اور یہ وہم لعلہ الخ کے ارشاد میں واقع ہے۔ لعلہ کی تفسیر سابق مہموب محذوف کی طرف راجع ہے۔ یعنی تاخیر شاید تمہارے لئے اس قدر استدراج اور تمہاری آزمائش میں زیادتی کی خاطر ہو یا تمہارا امتحان لینے کی خاطر ہوتا کہ وہ دیکھے تم کفر کو چھوڑ کر نصیحت حاصل کرتے ہو یا نہیں۔

۲۔ متاع پر تنوین تحقیر کے لئے ہے۔ اسی طرح حین کی تنوین بھی تحقیر کے لئے ہے۔ اللہ کی طرف سے تمہیں بالکل قلیل طور پر لطف امدوز ہونا ہے جتنا کہ اس نے فیصلہ کر رکھا ہے۔ جلال الدین اٹھلی فرماتے ہیں یہ فتنہ کے مقابلہ میں ہے جس کی لعل کے ساتھ امید کی گئی ہے اور یہ تری کا لکل نہیں ہے۔

فَلَسَبَّ أَحْكَمُ بِالْحَقِّ ۗ وَسَأَبْنَا الرَّحْمَنَ السُّتْعَانَ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ﴿۱۲﴾

”آپ نے عرض کی میرے رب فیصلہ فرما دے (ہمارے درمیان) حق کے ساتھ لے اور (اے کفار!) ہمارا رب وہ ہے جو رحمن ہے اسی سے مدد طلب کی جاتی ہے ان باتوں پر جو تم کرتے ہو۔“

۱۔ حفص نے قال ماضی کا صیغہ پڑھا ہے یہ خطاب سے غائب کی طرف التفات ہے اور جمہور قراء نے امر کا صیغہ پڑھا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے دعا کی اے میرے پروردگار ہمارے اور اہل مکہ کے درمیان ایسے عدل کے ساتھ فیصلہ فرما دے جو کفار کی تعذیب اور مسلمانوں کی نجات کا تقاضا کرتا ہے۔

۲۔ ربنا الرحمن مبتدا ہے اور خبر ہیں۔ المستعان الرحمن کی صفت ہے یا ربنا کی دوسری خبر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنا مقصود ہے ان باتوں پر جو وہ کہتے تھے۔ وہ غلط بیانی کرتے باطل اقوا ہیں پھیلاتے نیز طاقت اور شوکت بھی ان کے پاس تھی۔ وہ کہتے اسلام کا پھر پراچند دین بلکہ رہے گا پھر سرگمں ہو جائے گا کبھی کہتے اگر اسلام کی مخالفت اور داعی اسلام کی دشمنی پر جو عذاب کا وعدہ کیا گیا ہے اگر یہ سچ ہوتا تو عذاب اتڑ چکا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب مکرم ﷺ کی اس دعا کو شرف قبولیت عطا فرمایا۔ بدر کی جنگ میں موٹین کی مدد فرمائی اور کفار کو شکست فاش دی یا یہ معنی کہ جو تم یہ کہتے ہو کہ اللہ کا بیٹا ہے اور محمد ﷺ کو جادوگر کہتے ہو اور قرآن کو شعر کہتے ہو۔ ان تمام الزامات کی تردید کے لئے اللہ تعالیٰ سے مدد و معونت طلب کی جاتی ہے۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى سَيِّدِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ اللَّهُ تَعَالَىٰ كِي تَوْفِيقٍ أَوْ حُضُورِ نَبِيِّ رَحْمَتِ ﷺ كِي نَظَرِ عَنَانَيْتِ سَے سُوْرَةُ الْأَنْبِيَاءِ كَا تَرْجَمَ بِرُوْزِ سَوْمَاوَا 28 اگست 2000ء بِرِطَانِيَا 27 بِمَادِي الْأُوْلَىٰ 1421 هُو بَقُوْت 8:50 اِنْخْتَامِ پَذِيْرَ هُوَا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی نِعْمَاتِہِ وَآلَاہِہِ۔ یَا حٰی یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِکَ اَسْتَعِيْثُ لَا تَکْلِیْنِ اِلٰی نَفْسِیْ طَرَفَةً عَیْنٍ وَ اَصْلِحْ لِیْ شَأْنِیْ کُلُّہٗ۔ آمِیْنُ۔

و صَلَّى اللَّهُ عَلَى حَبِيبِهِ مُحَمَّدٍ وَآلِهِ وَأَصْحَابِهِ وَذُرِّيَّتِهِ وَأَزْوَاجِهِ أَجْمَعِينَ۔ آمِينَ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ۔

سورة الحج

﴿سورة الحج مكيه 22﴾ ﴿سورة اعلاها ٢٨﴾

سورة حج کے 10 رکوع اور 78 آیات ہیں ان میں سے بعض مدنی ہیں اور اکثر کی ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمائے والا ہے

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمۡ ۚ اِنۡ زُلۡزِلۡتُم مِّنۡ اَیۡۤامِ اللّٰهِ سَاعَةًۭ مَّا تَدۡرِیۡۤنَ ۝۱

”اے لوگو! ذرا اپنے پروردگار (کی ناراضگی) سے یکساں قیامت کا زلزلہ، بڑی سخت چیز ہے۔“

اے لوگو! اپنے پروردگار کی ناراضگی اور سزا سے ڈرتے رہو اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری اختیار کرو۔ زلزلۃ الساعۃ کا معنی ہے قیامت قائم ہونے کیلئے زلزلہ کا تمام چیزوں کو حرکت دینا اور ہلا دینا۔ اس صورت میں اساد مجازی ہے۔ (یعنی زلزلہ کی نسبت قیامت کی طرف مجازی ہے) یا قیامت میں تمام چیزوں کا حرکت کرنا اور ہل جانا۔ پس زلزلۃ کی الساعۃ کی طرف اضافت معنوی ہے اور اس میں فی مقدر ہے۔ یا اس میں مصدر کی اضافت ظرف کی طرف ہے اور الساعۃ کو قائم مقام مفعول کے رکھا گیا ہے۔

۱۔ شیعہ عظیم سے مراد انتہائی خوفناک اور ڈراؤنی چیز ہے۔ چونکہ آیت کے پہلے حصہ میں قیامت کی گھبراہٹ اور سختی سے ڈرنے کا حکم دیا گیا ہے اس لئے اس آیت کے ساتھ ملکر اس حکم کی علت بیان کر رہا ہے۔ کہ وہ اپنی عقلوں سے قیامت کا تصور کریں اور یہ جان لیں کہ تقویٰ کا لباس پہننے کے بغیر کوئی شی نہیں اس کی سختی سے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔

اس زلزلہ کے بارے علماء کے مابین اختلاف ہے۔ علقمہ اور شعی نے کہا ہے کہ یہ زلزلہ قیامت کی نشانیوں میں سے ہے اور قیامت قائم ہونے سے پہلے وقوع پذیر ہوگا (۱)۔ اور علامہ جلال الدین خلی نے یہ کہا ہے کہ یہ زلزلہ مغرب کی جانب سے سورج طلوع ہونے سے پہلے آئے گا (۲)۔ اسی قول کو علامہ ابن عربی اور علامہ قرطبی نے اختیار کیا ہے اور اس کا قرینہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔

یَوْمَ تَرَوْنَهَا تَدٰهَلُ ۚ كُلُّ مَرۡضِعٍ مَّوۡءَدَةٍ عَمۡا ۚ اٰمۡرُ صَعَتٍ وَتَصۡعَقُ كُلُّ ذَا نَبۡۡۤیۡ ۝۱

وَتَسۡرِیۡ النَّاسُ سُرۡجٰۤی وَاھٰہُمۡ سُرۡجٰۤی وَلَیۡكِنۡ عَدۡاۤبُ اللّٰهِ شَدِیۡدٌ ۝۲

”جس روز تم اس (کی ہولناکیوں) کو دیکھو گے تو غافل ہو جائے گی ہر دودھ پانے والی (مان) اس (لخت جگر) سے

جس کو اس نے دودھ پلایا ہے، اور گرا دے گی ہر حاملہ اپنے حمل کو اسے اور تجھے نظر آئیں گے لوگ جیسے وہ نشہ مست ہوں

حالانکہ وہ نشہ میں مست نہیں ہوئے تھے، بلکہ عذاب الہی بڑا سخت ہوگا (وہ اس کی بہت سے حواس باختہ ہوں گے)۔“

۱۔ جس روز تم قیامت یا زلزلہ کی ہولناکیوں کو دیکھو گے۔ یوم ترونها، تَدْہَلُ فعل کی طرف ہے۔ مَرَضِعٌ وہ عورت جو اپنے بچے کو

دودھ پلاری ہو۔ اور کہا جاتا ہے اہراقہ ہو ضعیف یعنی اسکی عورت جس میں دودھ پلانے کا وصف موجود ہو۔ (چاہے اس وقت نہ بھی پلا رہی ہو) جیسا کہ لفظ غافل اور حاملہ کا اطلاق اسی عورت پر ہوتا ہے جو حیض اور حمل والی ہو مگر چاروں وقت اسے حیض نہ آ رہا ہو اور وہ حاملہ نہ ہو (جبکہ حاملہ وہ عورت جسے حیض آ رہا ہو اور حاملہ وہ عورت جس کا حمل موجود ہو۔) یعنی ہر دودھ پلانے والی اس ہولناکی کے سبب اپنے بچے سے غافل ہو جائے گی۔

۱۔ عمامہ ار ضعت میں ماموصولہ ہے یا مصدر یہ ہے۔ یعنی وہ عورت اس زلزلہ کے خوف سے دہشت زدہ ہو جائے گی اور وہ اس سے غافل ہو جائے گی جسے وہ دودھ پلا رہی تھی اور اس بچے کے منہ سے اپنا پستان نکال لے گی۔ یا وہ عورت دودھ پلانے سے غافل ہو جائے گی۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ ان کی آدوسری خبر ہے۔ اور اس میں رابطہ نرو نہما کی ضمیر ہے یا یہ جملہ اس کی عظمت شان اور شدت کی علت بیان کر رہا ہے۔

۲۔ اور ہر حاملہ عورت اس زلزلہ کے خوف سے اپنا عھنبرن گرا دے گی۔ توضع کا عطف تھهل پر ہے۔ حسن نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ دودھ پلانے والی اپنے بچے کو دودھ چھڑانے سے غافل ہو جائے گی اور حاملہ عورت کے پیٹ سے ناکمل بچہ گر جائے گا۔

۳۔ حسن نے کہا ہے کہ خوف کے سبب لوگ تجھے نشہ میں مست نظر آئیں گے (1) حالانکہ وہ شراب کے نشہ میں مست نہیں ہوں گے۔ حمزہ اور کسائی نے۔ کاری کو سکری و ماہم بسکری پڑھا ہے۔ علامہ بنوئی نے کہا ہے کہ اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں اور یہ سکرا کی جمع ہے (2)۔ علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ سکر کو علت کے قائم مقام رکھتے ہوئے اسے سکری پڑھا گیا ہے جیسا کہ عطشی ہے (3)۔ مزید فرمایا کہ توی الناس میں ضمیر واحد ہے۔ جب کہ اس سے قبل نرو نہما میں جمع ذکر کیا گیا ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ قیامت کو تو سب ہی دیکھیں گے جب کہ سکر (نشہ) کا اثر ہر ایک کو دوسرے پر دیکھائی دے گا۔ (اور اپنی حالت سکر سے نظر نہیں آئے گی اسلئے قیامت کے ذکر کے وقت صیغہ جمع ذکر کیا اور حالت نشہ کے ذکر میں صیغہ واحد ذکر فرمایا)

۴۔ بلکہ عذاب الہی بڑا سخت ہوگا پس اس کا خوف اور دہشت ان پر اتنی چھا جائے گی کہ ان کی عقلیں از جائیں گی، وہ حواس باختہ ہو جائیں گے اور ان سے تیز کی صلاحیت اٹھ جائے گی۔ یہ جملہ نفی سکر سے زلزلہ کے خفیف ہونے کے پیدا ہونے والے وہم کو ختم کرنے کیلئے ہے۔ (کہ وہ خفیف نہیں ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ کا عذاب تو انتہائی شدید ہوگا)

۵۔ علامہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ یہ زلزلہ دنیا میں وقوع پذیر ہوگا (اور یہ قیامت کی علامات میں سے ہے) کیونکہ مردوں کے دوبارہ زندہ ہونے کے بعد تو حمل اور رضاع کا کوئی تصور نہیں ہوگا۔ (یعنی کوئی عورت حاملہ نہیں ہوگی کہ اس کا حمل ساقط ہو۔ اور نہ کوئی دودھ پینے والا بچہ اور نہ ہی کوئی دودھ پلانے والی عورت ہوگی)۔ اس نظریہ کی تردید اس طرح ہوتی ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ یا ایہا الناس اتقوا میں یا تو خطاب عام لوگوں کو ہے یا پھر ان خاص لوگوں کو جو کہ نزول آیت کے وقت موجود تھے۔ دونوں صورتوں میں وہ زلزلہ قیامت جس کی شرائط میں سے انتہائی خوفناک اور سخت ہوتا ہے وہ مخاطبین کے حق میں امر بالتقویٰ کی علت بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ اس کی شدت اور دہشت صرف ان لوگوں پر طاری ہوگی جو اس زلزلہ کے وقت موجود ہو گئے۔ لہذا اس کی شدت نہ تو تمام لوگوں کو محسوس ہوگی اور نہ ہی ان لوگوں کو جو حضور نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں موجود تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ

عہما نے فرمایا کہ ذلولة الساعة فخذ بعثت اور لوگوں کے قبروں سے اٹھنے کے بعد ہوگا (1)۔ جلیبی وغیرہ نے اس موقف کو اختیار کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اس آیت میں جو یہ کہا گیا ہے کہ دودھ پلانے والے سچے سے غافل ہو جائیگی اور حاملہ کا حمل ساقط ہو جائے گا یہ شدت خوف اور انتہائی زیادہ گھبراہٹ کو بیان کرنے کیلئے بطور مجاز و تمثیل بیان کیا گیا ہے۔ ورنہ حقیقت ایسا نہیں ہوگا۔ اس کی مثل یہ ارشاد باری تعالیٰ بھی ہے **يَوْمَ مَا يَلْعَلُونَ الْوَلْدَانَ حِينَمَا** (دودھ نہ بچوں کو بوڑھا کر دے گا حالانکہ چھینٹا اس دن کوئی بچہ بوڑھا نہیں ہوگا۔ بلکہ اس طرح مجاز اس دن کی دہشت اور ہولناکی کو بیان کرنا مقصود ہے۔ اور اس موقف کی تائید اس حدیث طیبہ سے بھی ہوتی ہے جسے امام احمد اور ترمذی نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ وہ روایت فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے کہ آیت کریمہ **يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ إِنَّ ذُلُّونَةَ السَّاعَةِ لَسَاءٌ لِّمَنْ يَخَذَلُهَا** نازل ہوئی (2)۔

حضور ﷺ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو وہ دن کونسا ہے؟ تو صحابہ نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام سے فرمائے گا (اپنی اولاد میں سے) **ادوزخ** کیلئے کھینچو۔ اللہ بیٹ۔ علامہ بغوی نے کہا ہے کہ حضرت عمران بن حصین اور حضرت ابوسعید خدری وغیرہ سے روایت ہے کہ یہ دونوں آیتیں غزوہ بنی مصلط کے دوران رات کے وقت نازل ہوئیں۔ رسول اللہ ﷺ نے (صحابہ کرام کو) بلایا اور انہیں یہ آیتیں پڑھ کر سنائیں۔ (انہیں سن کر وہ اتارے) کہ اس رات سے بڑھ کر کبھی جس اتنے زیادہ رونے والے لوگ نہیں دیکھے گئے۔ پس جب صبح ہوئی تو لوگوں نے اپنے گھوڑوں سے زینیں نہیں اتاریں۔ خیمے نہیں لگائے اور باغیاں تک نہیں پکائیں بلکہ کچھ لوگ روتے رہے اور کچھ غزوہ متشکرہ حالت میں بیٹھے رہے۔ تو پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم اس دن کو جانتے ہو؟ انہوں نے عرض کی اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول کرم ہی بہتر جانتے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا یہ وہ دن ہے جس دن اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام سے فرمائے گا اشوا اور اپنی اولاد میں سے **ادوزخ** کا حصہ کھینچو۔ تو آدم علیہ السلام عرض کریں گے کیا تمام سے؟ کتنا کتنا؟ تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا ہر ہزار میں سے نو سو نانوے جنم کیلئے اور ایک جنت کیلئے۔ یہ بات مسلمانوں پر انتہائی گراں ثابت ہوئی۔ انہیں شدید شرب لگی اور وہ رونے لگے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ تو نجات کون پائے گا؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم خوش رہو، صراط مستقیم پر چلے رہو اور قریب ہوتے جاؤ۔ کیونکہ تمہارے ساتھ دو دلو قیاس اور بھی ہوگی جو ہر قوم سے زیادہ ہوگی اور وہ یا جوج ماجوج ہیں۔ پھر ارشاد فرمایا مجھے امید ہے کہ اہل جنت کا تیسرا حصہ تم ہوگے۔ پس یہ سن کر انہوں نے اللہ کی عظمت و کبریائی بیان کی اور اس کی حمد و ثنا کی۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھے امید ہے کہ اہل جنت کا نصف تم ہوگے۔ یہ سن کر انہوں نے اللہ اکبر کہا اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنائیاں کی۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا مجھے امید ہے کہ اہل جنت کا وہ تہائی تم ہوگے۔ بیشک اہل جنت کی ایک سو بیس صفیں ہوگی، ان میں سے اسی ۸۰ صفیں میری امت کی ہوگی اور مسلمان (تعداد کے اعتبار سے) کفار کے مقابلے میں اتنے کم دکھائی دیں گے جیسے اونٹ کے پہلو میں تل کا نشان اور گھوڑے کے پاؤں میں دوسرے رنگ کا کوئی نشان۔ بلکہ اس طرح جیسے سفید رنگ کے نیل کی پشت پر سیاہ رنگ کا بال اور سیاہ نیل پر سفید رنگ کا بال۔ پھر حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا میری امت میں سے ستر ہزار افراد بغیر حساب کے جنت میں داخل ہو سکتے۔ حضرت عمر نے

عرض کی کیا ستر ہزار؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں ستر ہزار اور ہر ایک کے ساتھ ستر ہزار۔ یہ سن کر حضرت عکاشہ بن محسنؓ بکھڑے ہوئے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ (دعا فرمائیے کہ) اللہ تعالیٰ مجھے بھی ان میں سے کر دے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا تو بھی ان میں سے ہے۔ پھر انصار میں سے ایک آدمی اٹھا اور عرض کی اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیے کہ وہ مجھے بھی ان میں سے ایک کر دے تو حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا سبقک بھا عکاشہ اس بارے میں عکاشہ سے سبقت لے گئے ہیں (1)۔

پہلے نظریے کے قائل (یعنی کہ زلزلہ ساعت فتح اول سے پہلے ہے) اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ حدیث قطعاً اس پر دلالت نہیں کرتی کہ زلزلہ اس وقت ہوگا، جبکہ آدم علیہ السلام کو دوزخ کیلئے اپنی اولاد میں حصہ نکالنے کا حکم ہوگا (یعنی ان دونوں کا وقوع ایک ہی وقت میں ہوگا) بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس دن زلزلہ آئیگا اس کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کو دوزخ کیلئے اولاد میں سے حصہ نکالنے کا حکم ہوگا۔ گویا جب حضور نبی کریم ﷺ نے اس زلزلہ کے بارے خبر دی جو خود وادنی سے پہلے ہوگا، تو ساتھ ہی دیگر خوفناک اور دہشت زدہ کر دینے والے امور کا بھی تذکرہ فرمایا۔ اور انہی میں سے آپ ﷺ کا یہ ارشاد بھی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا حکم ہوگا کہ دوزخ کیلئے اپنی اولاد میں سے حصہ نکالنے لیں یہ حکم بھی اسی دن ہوگا۔ لیکن یہ اس کا تقاضا نہیں کرتا کہ یہ فتح اولیٰ کے ساتھ متصل بھی ہو۔

میں کہتا ہوں یہ جواب ضعیف ہے کیونکہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث جسے شخصین نے صحیحین میں آپ کے واسطے سے حضور نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے اس کے الفاظ اس طرح ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے آدم! تو حضرت آدم علیہ السلام عرض کریں گے تَبَّكَ وَ سَعْدَيْكَ وَ الْخَيْرُ هُنَّ لَيْلِيكَ میں حاضر میں حاضر تمام بھلائیاں ترے ہی قبضہ قدرت میں ہیں تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا (اپنی اولاد میں سے) جنہم کیلئے حصہ نکالے۔ وہ عرض کریں گے جنہم کیلئے کتنا حصہ ہے؟ تو ب کہہ کریم فرمائے گا ہر ہزار میں سے نو سو نانوے۔ تو اس وقت سچے پورے ہو جائیں گے، حاملہ عورتیں اپنے حمل گرا دیں گی اور لوگ نشے میں مست دکھائی دیں گے حالانکہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے بلکہ اللہ تعالیٰ کا عذاب انتہائی سخت ہوگا۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ! (اس ہزار میں) ہم میں سے وہ ایک کون ہوگا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا تمہیں بشارت ہو چیکر تم میں سے ایک آدمی اور یا جوج ماجوج میں سے ہزار (جنہم میں) ہوگا۔ پھر ارشاد فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے مجھے امید ہے کہ اہل جنت کا چوتھائی حصہ تم ہو گے پس ہم نے اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی بیان کی۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا مجھے امید ہے اہل جنت میں سے ایک تہائی حصہ تم ہو گے۔ ہم نے پھر اللہ اکبر کہا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا مجھے امید ہے اہل جنت کا نصف تم ہو گے تو ہم نے اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کا تذکرہ کیا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا (تعداد کے اعتبار سے) تم لوگوں میں ایسے ہی نظر آؤ گے جیسے سفید رنگ کے بتل کی جلد میں سیاہ بال یا سیاہ رنگ کے بتل کی جلد میں سفید بال (2)۔ یہ حدیث صراحتاً اس پر دلالت کر رہی ہے کہ بچوں کا بوزھا ہونا اور حاملہ کے حمل کا ساقہ ہونا دوزخ کی طرف بھیجے کے حکم کے ساتھ متصل ہے (یعنی ان تمام کا وقت ایک ہے) بلکہ لوگوں کا قبروں سے اٹھایا جانا بھی زلزلہ سے مقدم ہوگا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّبِعُ مَثَلًا سَدِيقًا قَرِيبًا ۗ كُتِبَ عَلَيْهٖ
 اَنَّهُ مِّنْ تَوَلَّاهُ فَانَّهُ يَضِلُّهُ وَيَهْدِيهِ اِلَىٰ عَذَابِ السَّعِيرِ ۝

”اور بعض ایسے لوگ ہیں جو جھگڑتے ہیں اللہ تعالیٰ کے بارے میں علم کے بغیر اور بیروی کرتے ہیں ہر سرکش شیطان کی۔ جس کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے کہ جو اس کو دوست بنائے گا تو وہ اسے گمراہ کرے گا اور راہ دکھائے گا اسے بھڑکتی ہوئی آگ کے عذاب کی طرف سے۔“

۱۔ اور بعض ایسے لوگ ہیں جو بغیر علم کے اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور اسکے احکام کے بارے میں جھگڑتے ہیں۔ یہ آیت نصر میں حارث کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ وہ زیادہ جھگڑا ہوا تھا اور یہ کہا کرتا تھا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں اور قرآن پہلے لوگوں کے افسانے اور قصے ہے۔ وہ بعث بعد الموت کا بھی انکار کرتا تھا۔ کہتا تھا وہ شے جو ایک بار خاک ہو جائے اسے دوبارہ زندہ کرنا محال ہے۔ ابن ابی حاتم نے ایسا مالک سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

۲۔ اور جھگڑا کرنے میں یا عام حالات میں ہر سرکش شیطان کی بیروی کرتے ہیں جو بھی انہیں جنوں اور انسانوں میں سے پیش آئے۔ ہرید مرد سے ہے اس کا معنی ہے خالی ہونا، بے لگا ہونا۔ اس لئے وہ آدمی جس کی داڑھی اور مونچھوں وغیرہ کے بال بند ہوں وہ مرد کہلاتا ہے۔ اور ہرید اور ہارو کا معنی ہے جو خیر سے خالی ہو اور شر اور برائی میں مسلسل مصروف ہو۔ قاموس میں ہے کہ مرد باب نصر اور کرم ہے مصدر مروء اور مراد آتا ہے صفت کے معنی بارود (اسم فاعل)، مرید اور متحد ہیں۔ اس کا معنی ہے آگے بڑھنا، سرکش ہونا یا اس حد اور رعایت سے آگے بڑھ جانا جس کی پابندی اس پر لازم تھی۔ مردہ کا معنی ہے اس نے اسے کاٹ دیا۔ اس نے اس کی عزت کو خاک میں ملادیا مرد علی الشی کا معنی ہے وہ اس شی کا مشتاق ہو گیا (۱)۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کے بارے میں فیصلہ کر دیا ہے کہ جو اس کی اتباع اور بیروی کرے گا وہ اسے گمراہ کرے گا۔ فانیہ بصلۃ میں ان مفتوحہ اپنے جملہ کے ساتھ ملکر مبتدأ محذوف کی خبر ہے۔ اور فاء کا مابعد حملہ اگر من شرطیہ ہو تو اس کی جزاء ہے اور اگر موصول ہو تو اس کا جواب ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ جو شیطان کی بیروی کرے گا تو شیطان ضرور اسے سیدھے راستے سے بھٹکا دے گا اور اسے جہنم کی راہ دکھائے گا یا اسے ایسی راہ پر گامزن کر دے گا جو اسے جہنم کے عذاب تک لے جائے گی۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اندکی ضمیر شیطان کی طرف راجع ہے اور من موصول اپنے صلہ کے ساتھ یا من موصوفہ اپنی صفت کے ساتھ ملکر ان کی خبر ہے اور تولاہ میں الضمیر منصوب شیطان کی بیروی کرنے والے کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور فانیہ بصلۃ میں فاء عاطفہ ہے اور اس کا عطف من تولاہ پر ہے۔ معنی یہ ہے کہ شیطان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ شیطان کی فطرت میں داخل ہے کہ جس سے وہ محبت اور دوستی کرتا ہے یا جس پر تسلط جمالیتا ہے اسے ضرور گمراہ کر دیتا ہے، بھٹکا دیتا ہے۔ زجاج نے اسی طرح کہا ہے۔

اور جملہ ومن الناس من یجادل فی اللہ اتقوا کے فاعل سے حال ہے، تقدیر عبادت اس طرح ہے۔ یأینہا الناس اتقوا ومنکم من یجادل ولکم یتق۔ (اے لوگوں اللہ تعالیٰ سے ڈرو حالانکہ تم میں سے بعض وہ ہیں جو جھگڑتے ہیں اور ڈرتے نہیں) تو اس میں خطاب سے غیب کی طرف التفات کیا گیا ہے۔ یا پھر یہ جملہ معترضہ ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّن تُّرَابٍ ثُمَّ مِّنْ
أُظْفُقِهِمْ مِّنْ عِلْقَةٍ ثُمَّ مِّنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُّخَلَّقَةٍ لَّيْبٌ لَّكُمْ وَ

نُفِّرْ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَسَّأَ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى لَّيْسَ لَكُمْ فِيهِ مَبْرَأٌ كَمَا يَبْغُونَ
 أَشَدُّكُمْ وَ مِنْكُمْ مَنْ يُتَوَفَّىٰ وَ مِنْكُمْ مَنْ يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُصْرِ لِيَسْتَأْذِنَ بَعْلَمَ
 مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا وَ تَرَىٰ الْأَرْضَ هَامِدَةً فَاذْأَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَ
 رَابَتْ وَ أَثْبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيمٍ ﴿٥﴾

”اے لوگو! اگر تمہیں کچھ شک ہو (روزِ محشر) جی اٹھنے میں تو ذرا اس امر میں غور کرو کہ ہم نے ہی پیدا کیا تھا تمہیں مٹی سے پھر نطفہ سے پھر خون کے ٹھوسے سے پھر گوشت کے ٹکڑے سے لے کر بعض کی تخلیق مکمل ہوئی ہے اور بعض کی نامکمل ہے تاکہ ہم ظاہر فرما دیں تمہارے لئے (اپنی قدرت کا کمال) ہے اور ہم قرار دیتے ہیں رحموں میں جسے ہم چاہتے ہیں ایک مقررہ میعاد تک پھر ہم نکالتے ہیں تمہیں بچہ بنا کر پھر (پرورش کرتے ہیں تمہاری) تاکہ تم پہنچ جاؤ اپنے شباب کو اور تم میں سے کچھ (پہلے) فوت ہو جاتے ہیں اور تم میں سے بعض کو پہنچایا جاتا ہے کئی عمر تک تاکہ وہ کچھ نہ جانے ہر چیز کو جاننے کے بعد ہی اور تو دیکھتا ہے کہ زمین خشک پڑی ہے پھر جب ہم اتارتے ہیں اس پر (بارش کا) پانی تو وہ تر و تازہ ہو جاتی ہے اور پھولتی ہے اور اگاتی ہے ہر خوشنما جوڑے کو۔“

۱۔ اے لوگو! اگر تمہیں (روزِ محشر) جی اٹھنے کے امکان میں اور اس پر ہماری قدرت کے ہونے کے بارے میں شک ہو تو ذرا اس امر میں غور کرو کہ ہم نے ہی تمہاری جنس کو پیدا کیا تھا۔ کم ضمیر صحیح سالم پیدا ہونے والے بچے کو بھی شامل ہے اور اس کو بھی جو قبل از وقت ساقط ہو جاتا ہے کیونکہ اس میں بھی انسان بننے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ یعنی تم اپنی تخلیق کی ابتداء میں غور و فکر کرو، وہ تمہارے شک کا ازالہ کر دے گی۔ بیشک ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، یعنی تمہارے باپ آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا۔ یا معنی یہ ہے کہ ہم نے تمہیں ان مادہ منویہ سے پیدا کیا ہے جو تمہاری کھائی ہوئی ان غذاؤں سے پیدا ہوتا ہے جو مٹی سے آئی ہیں۔ نطفہ سے مراد مٹی ہے یہ لفظ نطفہ سے مشتق ہے، اس کا معنی انڈیا، بڑھانا ہے۔ غلظہ کا معنی بے جھجے ہوئے خون کا ٹکڑا اور مضطرب کا معنی بے گوشت کا ٹکڑا، اصل میں اسے مراد گوشت کی اتنی مقدار ہے جسے چھپایا جاسکتا ہے۔

۲۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ مخلقت سے مراد وہ بچہ ہے جس کی خلقت مکمل ہو چکی ہو اور غیر مخلقت سے مراد وہ بچہ ہے جس کی خلقت مکمل نہ ہوئی ہو۔ مجاہد نے کہا ہے کہ مخلقت سے مراد وہ ہے جس کی صورت و شکل بنادی گئی ہو اور غیر مخلقت سے مراد وہ ہے جس کی صورت و شکل نہ بنائی گئی ہو (۱)۔ بعض نے کہا ہے کہ مخلقت سے مراد وہ بچہ ہے جسے عورت صحیح وقت پر جنم دیتی ہے۔ اور غیر مخلقت سے مراد قبل از وقت ساقط ہونے والا بچہ ہے۔ پس مذکورہ اقوال کے مطابق غیر مخلقت سے مراد ساقط ہونے والا بچہ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مخلقت سے مراد وہ صحیح سالم تندرست بچہ ہے جس میں کوئی نقص اور عیب نہ ہو۔ اور غیر مخلقت سے مراد وہ ہے جس میں کوئی نقص اور عیب ہو۔ گویا اللہ تعالیٰ گوشت کے ٹوٹنے کے کوشاں پیدا کرتا ہے۔ اس میں سے کوئی کامل اقلقت اور عیوب و نقائص سے مبرا ہوتا ہے اور کچھ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ پس گوشت کا یہ تفاوت لوگوں کی خلقت اشکال، قد و قامت کے لحاظ

سے لبا ہونا اور چھوٹا ہونا اور اعضاء کے اعتبار سے کامل و ناقص ہونے کے تفاوت میں باقی رہتا ہے۔ اس تفصیل کے مطابق غیر مخلوق سے مراد ساقط ہونے والا بچہ نہیں اور اس صورت میں ہمیں یہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں کہ ساقط ہونے والا بھی انسان کی جنس سے ہے کیونکہ یہ بھی انسان بننے کی استعداد رکھتا ہے۔ لیکن صحیح پہلا قول ہی ہے اور غیر مخلوق سے مراد ساقط ہونے والا بچہ ہی ہے۔ علامہ بنوئی نے لکھا ہے کہ علماء نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان نقل کیا ہے کہ جب نطفہ رحم میں قرار پذیر ہو جاتا ہے تو فرشتہ اسے ہاتھ میں لیکر کہتا ہے اے پروردگار! یہ مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ اگر رب کریم فرمادے کہ یہ غیر مخلوق ہے تو رحم اسے خون کی صورت میں پھینک دیتی ہے اور اس میں جان نہیں پڑتی۔ اور اگر رب کریم مخلوق فرمادے تو پھر فرشتہ عرض کرتا ہے کیا یہ مذکر ہے یا مؤنث، یہ شقی ہے یا سعید، اس کی عمر کتنی ہوگی، اس کا عمل کیا ہوگا اور اس کا رزق کیسا ہوگا؟ تو اسے جواب دیا جاتا ہے لوح محفوظ کی طرف جاؤ۔ اس کے بارے میں ہر چیز تجھے وہاں مل جائے گی چنانچہ وہ فرشتہ لوح محفوظ کی طرف جاتا ہے اور اس میں سب کچھ لکھا ہوا پایا جاتا ہے۔ وہاں سے اسے نقل کر لیتا ہے اور آخری مرحلے تک اسے اپنے پاس رکھتا ہے (۱)۔

یعنی لکم کا تعلق خلقنا حکم کے ساتھ ہے اور اسے مذکورہ تمام بیان کی قید کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی تاکہ اس قدر بھی مراحل سے گزرا کر ہم تمہارے سامنے اپنی قدرت کا اظہار رکھتے ہو اور حکمت بالغہ کا اظہار کریں۔ تاکہ تم اس سے بعثت بعد الموت پر استدلال کر سکو۔ کہ وہ شئی جو پہلی بار تخلیق کرنے میں تعمیر و فساد کو قبول کرتی ہے وہ دوبارہ تخلیق کے دوران بھی اس تعمیر و فساد کو قبول کر سکتی ہے۔ اور وہ ذات جو پہلی بار میں تہلیل کرنے اور اس کی تصویر کشی پر قادر ہے وہ دوسری بار بھی اس کی قدرت رکھتی ہے۔ لیسین فعل کا مفعول محذوف ہے اور یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ افعال جن سے اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کا اظہار ہوتا ہے اس کا احاطہ ممکن نہیں۔

بعض نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے تاکہ ہم تمہارے لئے وہ کچھ بیان کر دیں جو تم نے کرنا ہے اور جو تم نے چھوڑنا ہے۔ اور جن چیزوں کی تمہیں عبادت و بندگی میں ضرورت ہوتی ہے، یعنی ہم نے تمہیں ان کا تکلیف بنا کر پابند بنا کر پیدا کیا ہے۔

و نفی الارجام ترکیب کلام میں حال ہے اور تقدیر کلام و سخن نفی ہے یا داؤد اعطاف ہے اور یہ انا خلقناکم پر معطوف ہے۔ معنی یہ ہے کہ ہم نطفہ کو رحموں میں قرار اور ثبات دیتے ہیں، پس نہ تو رحم اسے باہر بھیجتی ہے اور نہ اسے ساقط کرتی ہے۔ جتنی مدت ہم اسے قرار دیتا چاہیں ایک مقررہ عبادت جس کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ اور اس سے مراد رحم سے ولادت کے وقت بیچ کے خارج ہونے کا وقت ہے۔ پھر ہم تمہیں اپنی ماؤں کے پیٹوں سے نکالتے ہیں اس حال میں کہ تم چھوٹے بچے ہوتے ہو۔ ترکیب کلام میں طفلا کا لفظ نحر حکم کی کم ضمیر منسوب سے حال ہے۔ اور اسے یا تو کل واحد کے معنی کی تاویل میں حال بنایا گیا ہے یا جنس پر دلالت کرنے کی وجہ سے یا پھر اس لئے کہ یہ اصل میں مصدر ہے۔ لیسوا یہ فعل محذوف کے متعلق ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے تم نزدیکم لیسوا پھر ہم تمہاری پرورش کرتے ہیں تاکہ تم اپنے شباب کو پہنچ جاؤ۔ اور اشد شدۃ کی جمع ہے۔ جیسے انعم نعمتی جمع ہے۔ یعنی تاکہ جو قوت و عقل کی صلاحیتیں تمہارے لئے تقدیر کی گئی ہیں تم ان کے کمال اور انتہا تک پہنچ جاؤ۔ علماء نے کہا ہے کہ اس قوت و طاقت کا کمال تیس سے چالیس سال کی عمر کے درمیان حاصل ہو جاتا ہے۔

یہ تم میں سے بعض شباب کی عمر کو پہنچ کر یا اسے سے پہلے ہی فوت ہو جاتے ہیں۔ ترکیب کلام میں و عنکم میں یعنی جملہ مضر ضہ ہے

یا حال ہے یا سابقہ جملے پر معطوف ہے۔

اور تم میں سے بعض کو انتہائی بڑھا چاہے اور کئی عمر تک پہنچا دیا جاتا ہے تاکہ وہ ہر چیز کو جاننے کے بعد کچھ نہ جانے۔ لکھیلا معلوم یہ بود کے متعلق ہے اور اس پر لام عاقبت کیلئے ہے۔ یعنی یہاں تک کہ وہ اس پہلی حالت کی طرف لوٹ جاتا ہے جس پر وہ عقل و فہم کی قلت اور کمزوری کے سبب عہد طفولیت میں تھا جس کو وہ بچپن میں بھول جاتا ہے اور جسے پہچانتا تھا اس کا انکار کر دیتا ہے۔

عکس نے کہا ہے جو قرآن کریم پڑھتا ہے وہ اس حالت سے دو چار نہیں ہوتا۔ یہ آیت بعث بعد الموت کے ممکن ہونے پر ردی دیکھ لیں۔ اس طرح کہ وہ مختلف امور اور متضاد احوال جو انسان پر زندگی کے مختلف مراحل میں طاری ہوتے ہیں (یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں) تو وہ ذات جو اس تغیر و تبدل پر قادر ہے وہ انہی کی مشن دوبارہ تغیر و تبدل کرنے کی قدرت بھی رکھتی ہے۔

اور تو زمین کو دیکھتا ہے کہ مردہ خشک پڑی ہے۔ حامدۃ حمدت الناس سے مشتق ہے۔ اور یہ تب بولا جاتا ہے جب آگ بجھ کر راکھ ہو جائے۔ پھر جب ہم اس کا اثر لاش کا پانی بڑھاتا ہے تو وہاں نباتات لہلہانے لگتی ہیں۔ اور وہ پھولتی اور بڑھ جاتی ہیں۔ ریت کو ابو جعفر نے ہمزہ کے ساتھ رجات پڑھا ہے، سورہ حم السجدہ میں بھی اسی طرح کیا ہے۔ ریت کا معنی ہے بلند ہونا، پروان چڑھنا۔ مرد نے کہا ہے (کہ زمین کی طرف لہلہانے کی نسبت بظہور مجاز ہے) اور نہ مقصود یہ ہے کہ زمین کی نباتات لہلہانے لگتی ہیں اور خوب پھولتی بڑھتی ہیں۔ پس یہاں مصافحہ مذکور ہے۔ کیونکہ نباتات میں لہلہانے کا عمل بالکل اظہر ہے۔

(اور ہر خوشنما جوڑے کو گاتی ہے) کمن کل زوج میں من زائد ہے۔ کل زوج سے مراد ہر صنف اور قسم ہے۔ اور بھیج کا معنی ہے خوشنما اور خوبصورت ہونا۔ قاموں میں ہے کہ بھیجہ کا معنی ہے سرد اور خوشی۔ بھیج باب گرم اس سے صفت کا صیغہ بھیج اور صبحا ہے۔ اور نفل کی طرف اس سے باب فرح بھی آتا ہے، اس سے صفت کے صیغہ بھیج اور بھیج ہیں۔ (ان دونوں صورتوں میں اس کا معنی ہے خوش ہوا) اس سے منع کی طرف باب فرح بھی آتا ہے اور اس سے باب افعال بھیج آتا ہے، اس صورت میں معنی ہے خوش کرنا۔ ابھاج کا معنی سرد اور خوشی ہے (۱)۔ ترکیب کلام میں توی الاوض کمل جملہ ان حلقا کم پر معطوف ہے۔ یہاں جملہ اسمیہ کی بجائے جملہ فعلیہ ذکر کیا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ان صفات کا ظہور تسلسل کے ساتھ کیے بعد دیگرے ہوتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مذکورہ موضوع پر تیسری دلیل بیان فرمائی ہے جو بالکل ظاہر اور عام شاہدہ میں ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّكَ يُحْيِي الْمَوْتٰى وَاَنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٠﴾ وَاَنَّ السَّاعَةَ اَتِيَةٌ لَا رَيْبَ فِيْهَا وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿١١﴾

”یہ (رنگارنگیوں اس کی دلیل ہیں) کہ اللہ تعالیٰ ہی برحق ہے اور وہی زندہ کرتا ہے مردوں کو اور بلاشبہ وہی ہر چیز پر قادر ہے۔ اور یقیناً قیامت آنے والی ہے اس میں ذرا شک نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ زندہ کر کے اٹھائے گا ان (مردوں) کو جو قبروں میں ہیں۔“

لے ذلک اسم اشارہ ہے اس کا اشارہ الیہ مذکورہ بالا تفصیل ہے۔ یعنی انسان کے مختلف حلقائی مراحل، اس پر متضاد احوال کا طاری ہونا اور زمین کا مردہ ہونے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا وغیرہ۔ ترکیب کلام میں ذلک مبتدا ہے۔ اس کی خبر مابعد کلام ہے۔

مذکورہ رنگینیاں اور تعمیر و تبدیلی اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ ثابت اور برحق ہے، وہ فی ذاتہ متحقق ہے اور واجب الوجود ہے۔ اسی کے سبب تمام اشیاء معرض وجود میں آتی ہیں۔ اگر وہ نہ ہوتا تو کسی ممکن کا پردہ عدم سے ظاہر ہونا محال اور ناممکن ہوتا۔ وہی بے جان نطفہ اور مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے۔ بلاشبہ وہی ہر چیز پر قادر ہے۔ کیونکہ اس کی یہ قدرت ذاتی ہے۔ اور اس کی ذات کی نسبت تمام چیزوں کی طرف مساوی ہے۔ (لہذا ہر شئی اس کی قدرت میں ہے) تو جب مشاہدہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ بعض مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے تو بالیقین وہ تمام مردوں کو زندہ کرنے پر بھی قدرت رکھتا ہے اگرچہ وہ ریزہ ریزہ ہونے والی بوسیدہ ہڈی ہی کیوں نہ ہو۔

یہ یقیناً وہ ساعت آنے والی ہے جس میں دنیا کا نظام دوہم برہم ہو جائیگا اور عمل طور پر ختم ہو جائیگا۔ اور یہ آئے دن کا تعمیر و تبدیلی اس کے مقدمات میں سے ہے۔ اس میں ذرہ بھر شک نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے مطابق ان مردوں کو زندہ کر کے ضرور اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں۔ اس کی جانب سے وعدہ خلافی کا قطعاً کوئی احتمال و امکان نہیں مذکورہ تین جملوں میں سے پہلا انسان کی تخلیق مختلف مراحل میں کرنے، اسے متضاد احوال کی طرف پھیرنے اور زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کرنے کی علت کا طالع بیان کرنے کیلئے ہے۔ اور آخری دونوں جملے علت غائیہ اور نتیجہ کے بیان کیلئے ہیں۔ کیونکہ انسان وغیرہ کی تخلیق کا مقصد مدعی معرفت الہی اور حسن عبادت ہے۔ ورنہ تو اس کی ایجاد عبث اور بے مقصد ہو جائے گی حالانکہ ساری کائنات کو اسی لئے پیدا کیا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور پہچان پر دلیل ہو جائے۔ اور وہ جو بے معرفت پر درجہ بے عبادت مرتب ہوتا ہے اور وہ جو بے عبادت پر جزا و سزا کا قانون مرتب ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر مردے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے اور جزا و سزا کا کوئی تصور نہ ہو تو اس سے دین اسلام کو ماننے والوں، رب کریم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والوں اور انکار کر نیوالے مجرموں کے درمیان مساوات لازم آتی ہے۔ جس سے قانون عدل تحمل اور بے معنی ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ **أَفَعَسَىٰ السُّؤْلِيُّونَ كَآلِفِيْنَ رِضْوَانٍ ۗ عَلَانِيَةً سَأَلُوكَ الرَّسُوْلَ بِطُوْغُوْبٍ كَثِيْرَةٍ مِّنْكَ لِيُؤْتِيَهُمْ مِّنْكَ حِزْبًا مِّنْكَ لِيُجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَفِيْ حُدُوْدِ اللّٰهِ ۗ سَأَلُوْا لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَيْهِمْ ۗ سَبِيْۤهًا مَّا يَكْفُرُوْنَ**۔ (کیا ہم اطاعت کرنے والوں کو مجرموں کی طرح کر دیں گے تمہیں کیا ہے تم کیسے فیصلہ کرتے ہو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے۔)

وَمِنَ النَّاسِ مَن يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِعَدْوٍ عَرْمٍ وَلَا هُمْ يَسْمَعُونَ وَلَا يَشْعُرُونَ وَلَا يَأْتِيهِمْ مِّنْ اللَّهِ خَبْرٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ۗ
وَمِنَ النَّاسِ مَن يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِعَدْوٍ عَرْمٍ وَلَا هُمْ يَسْمَعُونَ وَلَا يَشْعُرُونَ وَلَا يَأْتِيهِمْ مِّنْ اللَّهِ خَبْرٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ۗ
الْحَرِيْقِي ۗ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمْت يَدَكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَكِيْسٌ بِظَلٰمٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ ۝۱۰

”اور انسانوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو جھگڑا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے بارے میں بغیر علم کے اور بغیر کسی دلیل کے اور بغیر کسی روشن کتاب کے۔ (نکبر سے) گردن مروڑے ہوئے۔ تاکہ یہ بکا دے (دوسروں کو بھی) اللہ تعالیٰ کی راہ سے اس کے لئے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور ہم چکھائیں گے اسے قیامت کے دن جلانے والی آگ کا عذاب۔ (اس روز اسے بتایا جائیگا کہ) یہ سزا ہے اس کی جو تیرے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کر نیوالا نہیں ہے۔“

لہ علم سے مراد علم ضروری اور بدینی ہے (یعنی ایسا علم جو نظر و فکر کے بغیر حاصل ہوتا ہے) اور حدی سے مراد علم استدلالی اور نظری ہے جو معرفت الہی کی جانب راہنمائی کرتا ہے۔ (علم نظری سے مراد وہ علم ہے جو نظر و فکر کے ساتھ حاصل ہوتا ہے) اور کتاب منیر سے مراد وہ روشن کتاب ہے جو حق کا مظہر ہو اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی انسان پر نازل ہو۔ پس انسان کیلئے یہی اسباب علم ہیں جن میں سے کسی ایک کے ساتھ اسے کسی شئی کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ ایک علم بدینی دوسرا علم نظری اور تیسرا نقلی علم۔ (لیکن بعض لوگ ایسے بھی

ہیں جن کے پاس ان میں سے ایک بھی نہیں ہوتا مگر اللہ تعالیٰ کے بارے جھگڑتے ہیں)

ع عطف کا معنی ہے جانب، پہلو۔ عطفان دایاں اور بائیں دونوں پہلو۔ اور اس سے مراد بدن کا وہ حصہ ہے جسے آدمی اعراض کرتے وقت موڑ لیتا ہے اور پھیر لیتا ہے۔ مجاہد نے کہا ہے اس سے مراد ہے لاوی عقبہ۔ اس نے اپنی گردن کو موڑ لیا۔ حاصل معنی یہ ہے کہ جب اسے حق کی طرف بلایا جاتا ہے تو وہ تکبر کرتے ہوئے اگڑتے ہوئے اپنی گردن موڑتے ہوئے اعراض کر لیتا ہے۔ ابن عطیہ۔ ابن زبیر اور ابن جریر نے اسی طرح کہا ہے (1)۔

ع لبطل عن مسبل اللہ، بجدال کے متعلق ہے۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے بطل کو یا مفتوح کے ساتھ مجر دابواب سے پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے باب افعال سے یاہ کو مضموم پڑھا ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ جھگڑتا رہتا ہے یہاں تک کہ دوسرے کو گمراہ کر دیتا ہے۔ اس کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے۔ یہاں عزیٰ سے مراد اقل اور قید ہے۔ چنانچہ نصر بن حارث اور عقب بن ابی معیط بدر کے دن مارے گئے، ان کے ساتھ مزید ستر کا فر مارے گئے اور ستر قید ہو گئے۔

علامہ جلال الدین خلکانی نے کہا ہے کہ یہ آیت ابوجہل کے بارے نازل ہوئی اور وہ بدر کے دن قتل ہوا۔ ہم اسے قیامت کے دن جانے والی آگ کا عذاب چکھائیں گے۔

یع اس میں ثیب سے خطاب کی طرف التفات ہے، اللہ پر کلام یہ ہے کہ قیامت کے دن جب انہیں عذاب دیا جائیگا تو انہیں یہ کہا جائیگا کہ اس عذاب کا سبب تمہارا وہ کفر اور گناہ ہیں جو تم کرتے رہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔ یہاں بندوں کی کثرت تعداد کے سبب ظلم مبالغہ کا صیغہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ ما قعدت یواک پر معطوف ہے۔ ظلم کی لئی سے مراد ان کا یہ عدل ہے جیسا کہ ارشاد خداوندی لا یجذب اللہ الذین ظلموا من حیث یتنبض من لئی بغض سے کنایہ ہے۔ اور عدل لفظ اور گناہوں کے بدلے عذاب دینے کا سبب ہے۔ بخاری، ابن ابی حاتم اور ابن مردود نے حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ کچھ لوگ مدینہ طیبہ میں آئے اور اسلام قبول کر لیتے۔ پھر اگر انکی عورتیں بچوں (لڑکوں) کو جنم دیتیں اور انکی گھوڑیاں بچے جنمتی تو وہ کہتے یہ دن بڑا صالح اور اچھا ہے۔ اور اگر عورتوں کے ہاں اولاد نہ ہوتی اور گھوڑیاں بچے نہ جنمتیں تو کہتے یہ دن بڑا برا ہے (2)۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَعْبُدُ اللَّهَ عَلَى حَرْفٍ فَإِنْ أَصَابَهُ خَيْرٌ اطْمَأَنَّ بِهِ وَإِنْ أَصَابَهُ فِتْنَةٌ أَلْقَىٰ عَلَىٰ وَجْهِهِ خَيْرٌ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ذَلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ ۝

”اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو عبادت کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی کنارہ پر (کھڑے کھڑے) پھر اگر پہنچے اسے بھلائی (اس عبادت سے) تو مطمئن ہو جاتا ہے اس سے اور اگر پہنچے کوئی آزمائش تو فوراً (دین سے) منہ موڑ لیتا ہے۔ اس شخص نے برباد کر دی اپنی دنیا اور آخرت یہی تو کھلا ہوا خسارہ ہے۔“

۱۔ مفسرین کرام نے لکھا ہے کہ حرف کا معنی کنارہ ہے۔ حرف الشیعہ طرف شیعہ کو کہتے ہیں۔ اس سے مراد شک ہے۔ پس شک کرنے والا اور منافق ہونے میں اور کفار دونوں فریقوں کے کنارہ اور طرف میں ہی ہوتا ہے۔ کبھی وہ ایک فریق کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور کبھی دوسرے فریق کی طرف۔ یا پھر یہ لشکر کے ایک کنارے اور ایک طرف میں کھڑے ہونے والے کی مثل ہے کہ اگر وہ یہ محسوس

کرے کہ کامیابی اور فتح کے آثار نمایاں ہیں تو وہ شہر اور جہتا ہے اور اگر صورت حال اس کے برعکس ظاہر ہو تو پھر وہ بھاگ نکلتا ہے۔

ابن ابی حاتم اور علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت ان امراہوں کے بارے میں نازل ہوئی جو اپنے صحراؤں کو چھوڑ کر مدینہ طیبہ ہجرت کر کے آتے تھے۔ جب ان میں سے کوئی مدینہ طیبہ پہنچ جاتا۔ اگر وہ جسمانی اعتبار سے پہلے کی نسبت صحت مند ہو جاتا، اس کی گھوڑی خوبصورت پگھلا جنتی، اس کی بیوی بچے کو جنم دیتی اور اس کا مال پہلے سے بڑھ جاتا تو وہ کہتا یہ دین بڑا اچھا ہے، میں نے اس میں خیر اور بھلائی کو پایا ہے جس کے سبب مجھے راحت اور اطمینان حاصل ہوا ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی عبادت اور دین اسلامی کی برکت سے ہوا ہے (۱)۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد فان اصابہ خبزٌ اطمانٌ بہ کا یہی معنی ہے۔ اور اگر وہ کسی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے، اسکی بیوی بچی کو جنم دیتی، اس کی گھوڑی یا گھوہ ہو جاتی اور مال میں کمی واقع ہو جاتی تو وہ کہتا جب سے میں اس دین میں داخل ہوا ہوں میں نے اس میں شر اور دکھ ہی پایا ہے۔ پس وہ اپنے دین سے پلٹ جاتا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وان اصابہ فتنة انقلب علی وجہہ کا یہی معنی ہے۔ یعنی اگر وہ کسی بلا اور سختی میں مبتلا ہوتا تو وہ اپنے دین کو چھوڑ دیتا اور وہ اپنی اہلیاؤں کے بل اپنے کفر کی طرف واپس لوٹ جاتا۔

ابن مردود نے عطیہ کی سنت سے ابوسعید سے نقل کیا ہے کہ یہودیوں میں سے ایک آدمی نے اسلام قبول کیا تو اس کی بیٹائی جاتی رہی، مال ختم ہو گیا اور اولاد فوت ہوئی تو اس نے بدشگونی کرتے ہوئے اس کا سبب اسلام کو قرار دیا۔ اور حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کی میری بیعت واپس کر دیجئے۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا اسلام سے رجوع نہیں کرنا چاہیے۔ تو اس نے عرض کی میں نے اس دین میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں پائی۔ میری بصرات ختم ہوگی، مال جاتا رہا اور اولاد فوت ہوگی۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ پس رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے یہودی اسلام لوگوں سے میل جھیل کو اسطر ح صاف کرتا ہے جیسے آگ لوہے ہونے اور چاندی کی میل کو صاف کرتی ہے (۲)۔

۱۔ اس شخص نے اپنی دنیا اور آخرت برباد کر دی، یعنی وہ آدمی جو دنیوی اہل ایمان اور آزمائش کی وجہ سے دین سے مرتد ہو گیا اس کی دنیا بھی برباد ہوگی کہ اس کا مال ضائع ہو گیا، اولاد فوت ہوگی۔ جو آرزوئیں وابستہ کر رکھی تھیں وہ پوری نہ ہوئیں اور اس کے ساتھ اسکی عزت و آبرو بھی جاتی رہی۔ اور اس کی آخرت بھی تباہ ہوگی کہ اس کے اعمال ضائع ہو گئے اور وہ ہمیشہ کیلئے عذاب جہنم کا مستحق ہو گیا۔ اور یہ ایسا کھلا اور واضح خسارہ اور نقصان ہے جس کی مثل اور کوئی نہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَآ يَصْرُوْا وَمَا لَآ يَنْفَعُهُمْ ۗ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ۝۶

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَآ يَصْرُوْا وَمَا لَآ يَنْفَعُهُمْ ۗ لَيْسَ الْمَوْتٰى وَلَا يَسُّ الْعَشِيْرُ ۝۶

”وہ عبادت کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے سوا اس کی جو نہ ضرر پہنچا سکتا ہے اسے اور نہ نفع پہنچا سکتا ہے۔ یہی تو انتہائی گمراہی ہے۔ وہ پوچھتا ہے اس جس کی ضرر رسانی زیادہ قریب ہے اس کی نفع رسانی سے۔ یہ بہت بڑا دست ہے اور بہت برا ساتھی ہے۔“

۱۔ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا اس کی عبادت کرتا ہے کہ یہ اس کی عبادت نہ کرے تو وہ اسے کوئی ضرر اور تکلیف نہیں پہنچا سکتا اور اگر یہ اس کی عبادت کرتا رہے تو وہ اسے کوئی نفع نہیں دے سکتا۔ یہی عبادت انتہائی گمراہی اور حق سے دوری ہے۔ جب کوئی جنگل بیابان میں راستہ

بٹک جائے تو کہا جاتا ہے ضل فی النبیہ، یعنی جب کوئی صراط مستقیم سے بہت دور ہو جائے تو اس کے لئے ضلال بعید کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں)

عَلَى لَعْنٍ ضَرُوءٍ مِّنْ لَّا زَمَّةَ لَهُ۔ معنی یہ ہے کہ وہ اس کی پوجا اور عبادت کرتا ہے جس کی پوجا کا ضرر اور نقصان اس موصوہ نفع کی نسبت زیادہ قریب ہے جس کی توقع کا فراس کی پوجا کے سبب رکھتا ہے اور نفع سے مراد شفاعت اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اسے بطور وسیلہ پیش کرنا ہے۔ اور عربوں کی یہ عادت اور محاورہ ہے کہ جو چیز بالکل موجود نہ ہو اس کے بارے کہتے ہیں لهذا شیء بعید۔ (یہ چیز بہت بعید ہے) اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے ذَلِكُمْ رَجْعٌ لَّعِينٍ یعنی یہ رجوع بالکل نہیں ہے۔ اور جب بتوں کا نفع بعید ہے تو اس کا معنی یہ ہے کہ ان میں نفع بالکل نہیں ہے اور یہ کہا گیا کہ ان کا نقصان نفع کی نسبت زیادہ قریب ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نقصان اور ضرر بالیقین ہوگا۔

بعض نے کہا ہے کہ اس آیت میں تاکید لفظی کے لئے دو بار ینذعوا کا لفظ ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد کلام متاثرہ ہے۔ اور لَعْنٌ ضَرُوءٌ مِّنْ لَّا مَحْذُوفٍ حَمٍّ کے جواب کے لئے ہے۔ اور مِّنْ موصول اپنے صلہ کے ساتھ ملکر مبتدا ہے اور اس کی خبر لَيْسَ الْمُؤْمِنُ وَلَيْسَ الْعَشِيرُ ہے۔

اس مولیٰ کا معنی معان اور مددگار ہے۔ اور بعض نے کہا ہے یہاں اس کا معنی معبود ہے اور عشیرہ کا معنی ساتھی اور ساتھ رہنے والا ہے۔ یہاں مراد بت ہیں۔ خاوند چونکہ ہر وقت بیوی کے ساتھ ملکر رہتا ہے، اسی وجہ سے عرب اسے عشیر کہا کرتے ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قرأت کے مطابق یہ دونوں جملے الزامی اور متاثرہ ہیں۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ لَعْنٌ ضَرُوءٌ مِّنْ لَّا مَحْذُوفٍ کے متعلق ہے اور یدعوا کا معنی ہے وہ گمان رکھتا ہے۔ اور زم سے مراد ایسا قول ہے جو اعتقاد کے ساتھ ہو۔ یا پھر یہ کہا جاتا ہے کہ ینذعوا قول کے قائم مقام بن کر جملہ متوکلہ بردا مثل ہے۔ ان دونوں تقدیروں کے مطابق لام محذوف حَمٍّ کے جواب پر واقع ہے اور مِّنْ اپنے صلہ کے ساتھ ملکر مبتدا ہے اور اس کی خبر لَيْسَ الْمُؤْمِنُ وَلَيْسَ الْعَشِيرُ ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ جب قیامت کے دن کا فراس کے ضرر اور نقصان کو دیکھے گا تو یہ کہے گا کہ یہ بہت بردوست ہے اور بہت برساتھی ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ تقدیر کلام اس طرح ہے یدعوا لمن ضره اقرب من نعه یدعوا۔ ابتداء کلام میں ینذعوا کے موجود ہونے کی وجہ سے اخیر کلام سے اسے حذف کر دیا گیا۔ اور پہلے ینذعوا کا مفعول محذوف ہے اور مِّنْ موصول کا تعلق دوسرے ینذعوا سے ہے اور لَعْنٌ ضَرُوءٌ مِّنْ لَّا مَحْذُوفٍ حَمٍّ کے جواب میں ہے اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ لام معنی ان ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ
إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ ﴿٥٠﴾ مَنْ كَانَ يَظُنُّ أَنْ لَّنْ يَنصُرَهُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ
فَلْيَسُدَّ رِيسَهُ إِلَى السَّمَاءِ لِمَا يَلْقَاهُ مِنْ عَذَابٍ إِنَّهُ يَكْفُرُ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ﴿٥١﴾

”بیشک اللہ تعالیٰ داخل کرے گا انہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے باغات میں رواں ہیں جن کے نیچے نہریں۔ بیشک اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے، اور جو شخص یہ خیال کئے بیٹھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کی مدد نہیں کرے گا نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں تو اسے چاہئے کہ لنگ جائے ایک رسی کے ذریعے چھت سے پھر (گلے میں پھندا

ڈال کر) اسے کاٹ دے۔ پھر دیکھے آیا دور کر دیا ہے اس کی (خودکشی کی) تدبیر نے اس کے غم و غصہ کو سبب
یعنی بلاشبہ اللہ تعالیٰ جب بیک اور صالح بندۂ مومن کو ثواب اور شرک کو سزا دینے کا ارادہ کرتا ہے تو کوئی اسے اپنے ارادہ کو عملی جامہ
پہنانے سے روکنے والا نہیں اور نہ ہی کوئی اس کے فیصلے کا انکار کرنے والا ہے (یعنی وہ جو چاہتا ہے ہرگز رتا ہے کسی کو مجال انکار اور نہیں)
۱۷۔ (اور جو شخص یہ خیال کے بیٹھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب محمد مصطفیٰ ﷺ کی دنیا اور آخرت میں ہرگز مدد نہیں کرے گا) اس کلام میں
ظن بمعنی وہم ہے اور یہ ایک ہی مفعول کا تقاضا کرتا ہے لہذا انہی اپنے جملہ سمیت اس کا مفعول ہے۔ اور اگر ظن اپنے معنی میں ہو تو پھر یہی
جملہ قائم مقام دو مفعولوں کے ہے۔

اس کلام میں اختصار بھی ہے۔ کلمہ کلام کا مفہوم اس طرح ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اپنے نبی کریم ﷺ کی مدد فرمائے
گا۔ پس جو شخص اس کے خلاف گمان رکھتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بغض و حسد رکھنے کی وجہ سے اس کے برعکس توقع رکھتا ہے تو
اسے چاہئے کہ ایک رسی کے ذریعے اپنے گھر کی چھت سے لٹک جائے۔ یعنی اسے چاہئے کہ اپنے گھر کی چھت سے ایک رسی باندھے
اور پھر اپنے گلے میں پھندا ڈال کر گھاگھونٹ لے کیونکہ گھاگھونٹنے والا اپنی سانس کی آمد و رفت کو روک کر اپنے آپ کو مار ڈالتا ہے۔ مقصود یہ
ہے کہ وہ غیظ و غضب میں اپنے ذہانت و پیار سے بے گاور غصے سے بھر کر جو چاہے ہرگز رے حتیٰ کہ مر جائے۔ یا ہر چیز کے لئے ہے۔ (یعنی
اس کا یہ وہم و گمان کبھی بھی حقیقت نہیں بن سکتا) ماسد کو یہ کہا جاتا ہے کہ اگر تو راضی نہیں تو غصے سے اپنا گھاگھونٹ لے اور مر جا۔
ابن زید نے کہا ہے کہ السماء سے مراد آسمان دنیائے۔ معنی یہ ہے کہ جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کریم ﷺ کی
ہرگز مدد نہیں فرمائے گا اور اس بارے میں وہ آپ سے دھوکہ کرے گا تو اسے چاہئے کہ وہ اس سلسلہ کو جڑ سے ہی کاٹ دے (۱) یہاں
تک کہ اسی کے ذریعہ آسمان دنیا تک رسی باندھ لے اور آسمان تک چاٹنے اور آسمان سے جو جی آپ ﷺ کی طرف آتی ہے اس کو ہی
بند کر دے۔

علامہ ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ آیت قبیلہ اسد اور غطفان کے بارے میں نازل ہوئی۔ جب رسول اللہ ﷺ نے انہیں دعوت
اسلام دی تو اس وقت یہود اور ان کے درمیان (باہمی تعاون کا) معاہدہ ہو چکا تھا۔ انہوں نے یہ کہا کہ اب ہمارے لئے اسلام قبول کرنا
ممکن نہیں۔ کیونکہ ہمیں یہ خوف ہے کہ اللہ تعالیٰ محمد (ﷺ) کی مدد نہیں کرے گا اور ان کے دین کو ثواب نہیں کرے گا۔ اور اتنے میں
ہمارے اور یہود کے درمیان معاہدہ بھی ٹوٹ جائے گا پس پھر نہ تو وہ ہمیں غلہ مہیا کریں گے اور نہ ہمیں رے کی جگہ دیں گے۔ تو اس
وقت یہ آیت نازل ہوئی (۲)۔ مجاہد نے کہا ہے کہ نصر بمعنی رزق ہے۔ عرب کہتے ہیں من نصرنی مصروہ اللہ یعنی جو مجھے عطا کرے گا
اللہ تعالیٰ اسے دے گا۔ اور ابو سعید نے کہا ہے کہ عرب کہتے ہیں ارض منصورۃ یعنی ایسی زمین جس میں بارش کے ذریعے خوب فصل
ہو (۳)۔ اس صورت میں بنصرہ کی ضمیر منصوب منن موصول کی طرف راجع ہوگی۔ گویا آیت ایسے آدمی کے بارے میں نازل ہوئی جو
اللہ تعالیٰ کے بارے میں برا گمان رکھتا ہے اور یہ خوف رکھتا ہے کہ وہ اسے رزق نہیں دے گا۔ مفہوم یہ ہے کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ کے بارے
یہ خیال رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ہرگز رزق نہیں دے گا تو اسے چاہئے اپنے گھر کی چھت سے رسی باندھ لے اور پھر پھندا گلے میں
ڈال کر اپنا گھاگھونٹ لے اور رزق نہ دینے کے غصے میں چلتے ہوئے مر جائے۔ یا پھر ایک رسی آسمان دنیا تک پھیلا لے پھر اس کے

سب مسافت طے کرے یہاں تک کہ آسمان تک پہنچ جائے اور وہاں سے اپنا رزق لے آئے۔

ورش ابو عمر اور ابن عامر نے مُنَّم لِقَطْع کی لام کو لام امر ہونے کے سبب مکسور پڑھا ہے، جبکہ باقوں نے اسے مجزوم پڑھا ہے۔
اس میں رہی پھیلائے اور قطع مسافت کے ارادہ کے بعد یا گنا گھونٹنے کے ارادہ کے بعد وہ اپنے دل میں سوچے اور تصور کرے کہ کیا اس کی اس تدبیر نے اس کے غم و غصہ کو دور کر دیا ہے۔ یا اللہ تعالیٰ کی جانب سے وہ مدد جو رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہے اور اس (حاسد) کے غمے اور تاراضگی کا سبب بنی ہے، کیا یہاں سے روک سکتا ہے۔ حاسد کے اس عمل کو کید (تدبیر) کہا گیا ہے کیونکہ یہی فعل اس کی سعی و کوشش کی اجنباء ہے۔ یہ استغفہام انکاری ہے اور من کنان یظن سے لیکر آخر تک جملہ ان اللہ یفعل ما یرید کی تاکید ہے۔ یعنی جس طرح حاسد کا غصہ اللہ تعالیٰ کو اپنے رسول مکرم ﷺ اور مومنین کی دنیا اور آخرت میں مدد و نصرت کے ارادے سے نہیں روک سکتا اسی طرح کوئی بھی اس کے گنہگار نہیں روک سکتا جس کا ارادہ اللہ تعالیٰ فرمائے۔

وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَاهُ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ ۚ وَأَنَّ اللَّهَ يَهْدِيَ مَنِ يَشَاءُ ۝۱۱

”اور اسی طرح ہم نے اتارا ہے اس کتاب کو روشنی و دلیلوں کے ساتھ لے اور جیکو اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔“

۱۔ جس طرح ہم نے قرآن کریم میں موت کے بعد دو بارہ ذمہ کئے جانے تو حید باری تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کی صداقت اور آپ کی مدد و نصرت کے وعدے کے بارے میں واضح آیات و دلائل نازل کئے ہیں اسی طرح ہم نے رسول اللہ ﷺ اور قرآن کریم کی صداقت کے بارے میں واضح دلائل اور آیات نازل کی ہیں۔ ایضاً بئینت سے یہ چہ چہا ہے کہ قرآن کریم کی تمام آیات میں اور واضح ہیں حالانکہ یہ ارشاد بھی ہے وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَثِيرًا وَأَنَّهُمْ لَنُؤْتِيَنَّاهُمْ أَجْرَهُمْ فَذَرْهُمْ حَتَّىٰ يَأْتِيَ صَبْرَهُم ۖ وَإِن يَؤْتِيَنَّاهُمْ أَجْرَهُمْ فَذَرْهُمْ حَتَّىٰ يَأْتِيَ صَبْرَهُم ۖ وَإِن يَؤْتِيَنَّاهُمْ أَجْرَهُمْ فَذَرْهُمْ حَتَّىٰ يَأْتِيَ صَبْرَهُم ۖ وَإِن يَؤْتِيَنَّاهُمْ أَجْرَهُمْ فَذَرْهُمْ حَتَّىٰ يَأْتِيَ صَبْرَهُم ۖ

پوشیدہ ہے تو اس طرح تو ان دونوں آیتوں میں تضاد اور منافات محسوس ہوتی ہے۔ لیکن فی الحقیقت ان کے مابین کوئی منافات نہیں کیونکہ تشابہ آیت کا معنی مراد یہ اگر چھٹی ہوتا ہے مگر اس کا مجزوم ہونا اور صداقت رسول کی دلیل ہونا تو بالکل واضح اور بین ہوتا ہے۔
ع۔ وَأَنَّ اللَّهَ يَهْدِيَ مَنِ يَشَاءُ ۝۱۱
یعنی ہم نے قرآن کریم کو (لوگوں کے) مصارع کے لئے نازل کیا اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اس کے سبب جسے ہدایت دینا چاہے وہ ہدایت پا جائے یا جسے ہدایت نہ رکھنا چاہے وہ ہدایت نہ رکھتا ہے۔ اور اس جملے کا عمل نصب میں ہونا بھی جائز ہے۔ اس کا عطف ان لوہاء کی ضمیر منصوب پر ہے۔ یعنی ہم نے یہ بھی نازل کیا کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے ہدایت فرمادیتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّالِحِينَ وَالنَّصْرَىٰ وَالجُوسَ وَالذَّبَابَ
أَشْرَكُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ يُفَصِّلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ عَشِيمٌ ۝۱۲

”جیکو اہل ایمان، یہودی، پست، عیسائی، آتش پرست اور مشرک۔ ضرور فیصلہ فرمائے گا اللہ تعالیٰ ان سب (گروہوں) کے درمیان قیامت کے دن لے۔ جیکو اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مشاہدہ فرما رہا ہے۔“

۱۔ اَلَّذِينَ آمَنُوا سے مراد بتوں کی پوجا اور عبادت کرنے والے ہیں اور فیصل بئینہم کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان سب کے درمیان ضرور فیصلہ فرمائے گا اور حق کے پرستاروں کو باطل کے پرستاروں سے الگ کر دے گا۔ اور (دونوں فریقوں کی)

حق پرستی اور باطل پرستی کو ظاہر فرمادے گا۔ یا یہ معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو ایسی جزاء عطا فرمائے گا جو اس کے مناسب اور لائق ہوگی لہذا وہ ایک فریق کو جنت میں داخل کر دے گا اور دوسرے کو دوزخ کے حوالے کر دے گا۔ مذکورہ تمام گروہوں پر حملے کی ابتداء میں حرف اَنّ مزید تاکید کے لئے داخل کیا گیا ہے۔ پھر اسے اِنَّ اللّٰهَ عَلٰمٌ لِّمَنْ يَّشٰهَدُ اَنْ ارشاد سے مزید پختہ اور سکو کو کہہ دیا ہے۔

یعنی بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر شئی کے احوال کا مشاہدہ کرنے کے سبب اسے جاننے والا ہے اور یہ ممکن نہیں کہ وہ مسلمانوں اور اطاعت شعاروں سے مجرموں جیسا سلوک کرے اور نہ یہ ممکن ہے کہ وہ اہل حق کو اہل باطل کی مثل قرار دے۔ کیونکہ وہ ہر شئی کے ظاہری اور باطنی احوال سے مکمل طور پر واقف و آگاہ ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ
وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ۗ وَكَثِيْرٌ حَتّٰى عَلَيْهِ
الْعَدَابُ ۗ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرٍ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَفِعْلٌ مَا يَشَاءُ ﴿٤١﴾

”کیا تم ملاحظہ نہیں کر رہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہی سجدہ کر رہی ہے ہر چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے نیز آفتاب، مہتاب، ستارے، پہاڑ، درخت اور چوپائے، لے اور بہت سے انسان بھی (اسی کو سجدہ کرتے ہیں) اور بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جن پر عذاب مقرر ہو چکا ہے۔ اور (دیکھو) جس کو ذلیل کر دے اللہ تعالیٰ تو کوئی اسے عزت دینے والا نہیں ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔“

۱۔ کیا تم جاننے نہیں کہ آسمانوں میں فرشتے اور زمین میں انسانوں اور جنات میں سے مومن اللہ تعالیٰ کو ہی سجدہ کر رہے ہیں۔ لفظ مَنْ اگرچہ عام ہے، مومن، ملوک، فر دونوں کو شامل ہے مگر چونکہ کفار کا ذکر مستقل کلام و تَجِيْزٌ حَقٌّ عَلَيْهِمُ الْعَذَابُ کے ذریعے الگ کر دیا گیا ہے اس لئے یہاں مَنْ سے مراد صرف مومن ہی ہوں گے۔ مَنْ (اپنی عمومیت کے سبب کبھی ذوی العقول اور غیر ذوی العقول دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے) مگر یہاں چونکہ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ اَنْ كَا عَطْفٌ مِّنْ فِئِي الْاَرْضِ پر کیا گیا ہے۔ عطف میں اصل یہ ہے کہ معطوف اور معطوف علیہ کے مابین مغائرت پائی جاتی ہے۔ لہذا یہاں مَنْ صرف ذوی العقول کے لئے ہی ہے۔

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے لفظ مَنْ کو اپنے عموم پر ہی محمول کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ ذوی العقول اور غیر ذوی العقول دونوں کو شامل ہے یا یہ ذوی العقول اور غیر ذوی العقول پر غالب قرار دیکر ان کے لئے استعمال ہوا ہے۔

اکثر محققین کا قول یہ ہے کہ کسی غیر مطلق کو کلمہ مَنْ سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا مگر جہاں کہیں مطلق اور غیر مطلق جمع ہو جائیں تو پھر ان کے لئے کلمہ مَنْ استعمال کیا جاسکتا ہے۔

اگر مَنْ سے عمومی معنی مراد لیا جائے تو بھر وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ کا اس پر عطف خاص کا عطف عام پر کرنے کے قبیلے سے ہے اور ان کی شہرت کے سبب ان کا ذکر علیحدہ کر دیا گیا ہے لیکن سجدہ کرنا تو ان سے بعید ہے۔

محدثین اور علماء متقدمین کے نزدیک سجود سے مراد اطاعت اختیار یہ ہے۔ کیونکہ جمادات اگرچہ ہمارے نزدیک مردہ ہیں لیکن انہیں بھی کچھ نہ کچھ حیات حاصل ہے۔ اور وہ بھی اطاعت اختیار کے سبب اللہ تعالیٰ کے مطیع و فرمانبردار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے (زمین و

آسمان کے متعلق) فرمایا قَالَتْ اَنْبِيَاكَ مَا جَاءَ بِعِبْرَةٍ تَعْرِفُهَا كَمَا وَصَفَ بِيَانٍ كَرْتِمْ هُوَ فَرَمَا يَا كَرْتِمْ وَ اِنَّ مِنْهَا لَكَا يَنْبَغُ طَوْرٌ حَسْبِيَةَ اللّٰهِ اَوْ حَرِيْدِ اِرْشَادٍ فَرَمَا وَ اِنَّ قَرِيْبٌ مِّنْهُ اَلْاَنْبِيَاكُ بِحَسْبِ وَ لَكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ كَيْفَ يُحْتَمَبُ اَوْرَسُولُ اللّٰهِ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک پہاڑ دوسرے پہاڑ کو پکار کر کہتا ہے اے فلاں! کیا تجھ سے کوئی ایسا گزارا ہے جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہا ہو۔ اے طبرانی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے (1)۔ علامہ مغربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے یہ مذہب اچھا ہے اور اہل السنّت کے قول کے موافق ہے (2)۔

عَنْ وَ كَيْفَ قَرِيْبٌ اَلْاَنْبِيَاكُ مَبْتَدَاً هُوَ۔ اَوْر دوسرا انبیوں پہلے کی تاکید کے لئے مکرر ذکر کیا گیا ہے یا پھر کثرت میں اظہار مبالغہ کے لئے اسے لایا گیا ہے اَوْ حَقٌّ مِّنْ عِبَادِ اللّٰهِ اَبٌ مَّبْتَدَاً كَيْ خَيْرٌ هُوَ۔

بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جن کے لئے عذاب مقرر ہو چکا ہے کیونکہ وہ عہدہ کرنے والوں میں شامل نہیں۔ ان سے مراد نکاح ہیں۔ پس یہ جملہ مَنْ هِيَ الْاَرْضُ كِي عُمُوْمِيَّةٍ كِي لِيْ خَصَّصُ هُوَ كِي نَكْحٌ يَهِيَ كَفَا رُوْمِنِ كِي عُمُوْمٍ سِي خَارِجٌ كَر رَاهِي۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ مَنْ هِيَ الْاَرْضُ فِيْ مَنْ مَعْنَى كَامُوْمٍ كِي لِيْ هُوَ۔ اَوْر جُوْدٌ سِي مَرَادِيْ هُوَ كِي كَرَامَتُ كِنَا تِ اللّٰهِ تَعَالَى كِي قُدْرَتِ كِي سَا نِيْ مَخْرُجِيْ۔ اللّٰهِ تَعَالَى كِي تَدْبِيْرٍ اَوْر حَكْمٍ سِي كِي كُوْجَالِ اِنْكَارِ نِيْ اَوْر ہر ایک كِي ذَاتِ عَظْمَتِ تَدْبِيْرٍ اَوْر شَانِ قُدْرَتِ پَر دِلَالَتِ كَر رِي سِي ہُوَ۔ قول باری تعالیٰ وَ كَيْفَ قَرِيْبٌ مِّنْ اَلْاَنْبِيَاكُ مَبْتَدَاً ہُوَ اَوْر اس كِي خَيْرٌ مَخْرُوْفٌ ہُوَ۔ جس پراس كِي حَسْمِ كِي خَيْرِ دِلَالَتِ كَر رِي ہُوَ اَوْر وہ ہُوَ حَقٌّ لِيْھِمُ اَلْوَابِ (یعنی بہت سے لوگ ہیں جن کے لئے ثواب ثابت ہو چکا ہے) یا پھر وَ كَيْفَ قَرِيْبٌ مِّنْ اَلْاَنْبِيَاكُ مَبْتَدَاً كِي مَخْلُوْفٌ كَا قَا طِلُ ہُوَ۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگا کہ بہت سے لوگ زمین پر پیشانی رکھ کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عہدہ اطاعت و فرمانبرداری کرتے ہیں۔ مذکورہ دونوں تقدیروں کے مطابق وَ كَيْفَ قَرِيْبٌ مِّنْ اَلْاَنْبِيَاكُ مَبْتَدَاً ہُوَ اَوْر كَيْفَ حَقٌّ عَلَيْهِمْ اَلْعَذَابُ دوسرا جملہ مستند ہُوَ۔

بعض علماء فقہ کے نزدیک عموم مشترک جائز ہے۔ یعنی ایسا ایک لفظ جو دو معنوں میں مشترک ہو اس کا ایک ہی وقت میں دو معنوں میں سے ہر ایک میں استعمال جائز ہے۔ ایک معنی کے اعتبار سے اس كِي نسبت دوسرے امر كِي طرف ہوتی ہے لہذا انہوں نے یہ کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ وَ كَيْفَ قَرِيْبٌ مِّنْ اَلْاَنْبِيَاكُ مَبْتَدَاً ہُوَ اَوْر یہ کلام سابق پر معطوف ہے۔ معنی یہ ہے کہ عہدہ نبیگری اللہ تعالیٰ کو تمام کائنات كِي ہے۔ اَوْر عہدہ اطاعت و فرمانبرداری کثیر لوگ کرتے ہیں۔ (تو یہاں خود کال لفظ دو معنوں میں مشترک ہے۔ ایک زمین پر پیشانی رکھنا اَوْر دوسرا حکم کی تعمیل کرنا اَوْر اس کا انکار نہ کرنا۔ لہذا جب عہدہ كِي نسبت وَ كَيْفَ قَرِيْبٌ مِّنْ اَلْاَنْبِيَاكُ كِي طرف كِي گئی تو عہدہ سے مراد زمین پر پیشانی رکھنا ہوگا۔ اَوْر جب اس كِي نسبت دیگر ممکنات كِي طرف كِي گئی تو اس سے مراد حکم كِي تعمیل کرنا ہوگا) اَوْر كَيْفَ حَقٌّ عَلَيْهِمْ اَلْعَذَابُ مستقل جملہ مستند ہے، یعنی بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جن کے لئے عہدہ اطاعت و فرمانبرداری سے انکار کرنے كِي سبب عذاب ثابت اَوْر مقرر ہو چکا ہے۔ اَوْر یہ بھی جائز ہے کہ کثیر مفرد ہواور معنی اعم کے اعتبار سے اس کا عطف (ساجدین) عہدہ کرنے والوں پر ہواور حَقٌّ عَلَيْهِمْ اَلْعَذَابُ اس كِي صفت ہو۔

سَا وَ مَنْ يُّھِنُ اللّٰہُ۔ مبتدأ ہے جس میں شرط کے معنی پائے جا رہے ہیں۔ اَوْر اس كِي خبر جزاء کے معنی کو متضمن ہے۔ اَوْر وہ ہے فَعَا لَةُ مِّنْ مُّكْرَمٍ۔ معنی یہ ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ شقاوت و بدبختی كِي سبب ذلیل اَوْر سوا کرتا ہے تو کوئی بھی اسے سعادت اَوْر خوش بختی كے ساتھ عزت نہیں دے سکتا۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ سابقہ جملہ اسمیہ پر معطوف ہے یا اس سے حال ہے۔ پس عزت و ذلت اَوْر سعادت و

شقاوت دونوں امر اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ مختص ہیں۔ وہ جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے۔

هٰذِهِنَّ حَصْنَمِنْ اَخْتَصَمُوا فِي رَايِهِمْ قَالَتِيْنَ كَفَرُوْا فَاَقْبَلَتْ لَهُمْ شِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ اَطْيَسُ مِنْ قُوقٍ مَّرْعُوْسِهِمُ الْحَيِّمِ ﴿٣١﴾

”یہ دو فریق ہیں جو جھگڑ رہے ہیں اپنے رب کے بارے میں۔ تو وہ لوگ جنہوں نے نہ کفر اختیار کیا تیار کر دیئے گئے ہیں ان کے لئے کپڑے آتش (جہنم) سے لے کر اٹھایا جائے گا ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی سے“

یہ دو فریق ہیں جو ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک فریق مومنین کا ہے اور ایک فریق مذکورہ بالا پانچ اقسام کے کفار کا۔ لفظ خصم کا اطلاق واحد اور جمع دونوں پر ہوتا ہے اور پھر معنی کا اعتبار کرتے ہوئے اخصصموا جمع ذکر کیا گیا ہے۔ مذکورہ دونوں فریق اللہ تعالیٰ کے دین کے بارے میں جھگڑ رہے ہیں یا پھر وہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور احکام کے بارے میں اختلاف کر رہے ہیں۔ (یعنی تبہم سے پہلے دین ذات صفات اور امر میں سے کوئی لفظ محذوف ہے جو کہ مضاف ہے)

شیخین نے صحیحین میں حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ هٰذِهِنَّ حَصْنَمِنْ اَخْتَصَمُوا فِي رَايِهِمْ حضرت حمزہؓ حضرت عبیدہؓ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم عقبہؓ شیبہؓ اور ولید بن عقبہؓ کے بارے میں نازل ہوا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت غزوہ بدر کے دن ہمارے مقابلے اور مبارزت کے بارے میں نازل ہوئی۔ حاکم نے ایک دوسری سند سے اس طرح نقل کیا ہے کہ یہ آیت غزوہ بدر کے دن ہمارے مقابلے اور دعوت مبارزت دینے اور مقابلہ کرنے والوں کے بارے میں نازل ہوئی اور وہ حضرت علیؓ حضرت حمزہؓ حضرت عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم شیبہ بن ربیعہؓ عقبہ بن ربیعہؓ اور ولید بن عقبہؓ ہیں (1)۔

علامہ بخاری نے قبس بن عباد سے نقل کیا ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا (کفار) سے جھگڑا کرنے کے سبب قیامت کے دن رحمت (الچی) کے سامنے سب سے پہلے دوڑاؤ بیٹھنے والا میں ہی ہوں گا (2)۔

قبس کہتے ہیں کہ انہی لوگوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی جنہوں نے غزوہ بدر کے دن ہمارے مقابلے میں ایک دوسرے کو دعوت مبارزت دی اور مقابلہ کیا اور وہ حضرت حمزہؓ حضرت علیؓ حضرت عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم شیبہ بن ربیعہؓ عقبہ بن ربیعہؓ اور ولید بن عقبہؓ ہیں (3)۔

محمد بن اسحاق نے کہا ہے کہ غزوہ بدر کے دن عقبہ بن ربیعہ اپنے بھائی شیبہ بن ربیعہ اور اپنے بیٹے ولید بن عقبہ کے ساتھ نکلا اور مسلمانوں کی صفوں کے قریب پہنچ کر دعوت دی تو ان کے مقابلے کے لئے تین انصاری نوجوان عوف حارث کے دونوں بیٹے معاذ اور معوذان کی ماں کا نام عفرات تھا۔ اور حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم صفوں سے باہر آئے شترکین نے انہیں دیکھ کر پوچھا تم کون ہو؟ انہوں نے جواب دیا ہم گروہ انصار میں سے ہیں اور نسا تمہارے ہمسر اور حرفاء ہیں۔ پھر ان میں سے کسی نے پکار کر کہا اے محمد (ﷺ) ہمارے مقابلے کے لئے ہماری قوم کے افراد باہر نکالے گئے جو ہمارے ہمسر ہیں اور برابر ہیں۔ تو یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عبیدہ بن حارث تم اٹھو۔ اے حمزہ بن عبد المطلب تم باہر آؤ اور اے علی بن ابی طالب تم مقابلے کے لئے اٹھو۔ چنانچہ جب یہ لوگ صفوں سے نکل کر ان کے قریب پہنچے تو انہوں نے پوچھا تم کون ہو؟ تو انہوں نے اپنے بارے میں بتایا۔ تو ان کے نام سن کر انہوں

نے کہا ہاں یہ لوگ ہمارے ہم کفو اور شرفاء ہیں۔ چونکہ حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ عمر کے اعتبار سے بڑے تھے اس لئے ان کا مقابلہ عقبہ سے ہوا پس حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقابلہ شیبہ سے اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ولید بن عقبہ سے ہوا۔ پس حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو دیکھتے ہی دیکھتے ہاتھ خیر شیبہ کو قتل کر دیا اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ولید کو جنم رسید کر دیا۔ لیکن حضرت عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عقبہ کے مابین چند ضربوں کا تبادلہ ہوا دونوں ایک دوسرے کے مقابلے میں ڈٹے رہے اور پھر حضرت حمزہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما اپنی تلواروں کے ساتھ عقبہ پر ٹوٹ پڑے اور اسے کفر کر دار تک پہنچا دیا اور حضرت عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اٹھا کر ان کے ساتھیوں کے پاس لے آئے۔ آپ کی ٹانگ کٹ چکی تھی اور اس سے گودا ہا ہر بہہ رہا تھا۔ جب وہ حضرت عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لے کر رسول کریم ﷺ کے پاس پہنچے تو حضرت عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی کیا میں شہید نہیں ہوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں۔ پھر حضرت عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ حضرت ابوطالب زندہ ہوتے تو وہ یقیناً (1) جان لیتے کہ ان کے ان اشعار کا سب سے زیادہ مستحق میں ہی ہوں۔ آپ فرماتے ہیں۔

كَلْبَتُمْ وَ نَبَيْتَ اللّٰهَ نُبُوٰى مُحَمَّدًا
وَلَمَّا نَطَعْنُ ذُوْنَهُ وَ نُنَاصِلُ
وَنُسَلِّمُهُ حَتّٰى نَضْرِعَ خَوْلَهُ
نُذْهِلْ عَنَّا اَبْنَانَنَا وَ الْخَلَجَلُ

بیت اللہ کی قسم! تم اس قول میں جھوٹے ہو کہ محمد (ﷺ) پر غلبہ پالیا جائیگا (یہ تب تک ممکن نہیں) جب تک کہ ہم آپ ﷺ کی جانب سے کامل طور پر نیزہ زنی اور تیر اندازی نہیں کر لیں گے۔

اور ہم آپ کو اس وقت تک تمہارے حوالے نہیں کریں گے جب تک کہ ہم اپنی اولادوں اور بیویوں سے غافل ہو کر آپ کے گرد بچھاڑ نہیں دیئے جائیں گے۔ (یعنی جب تک ہم زندہ ہیں آپ ﷺ پر غلبے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا)

ابن جریر سے عوفی کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے عبید بن حمید ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے قتادہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت مسلمانوں اور اہل کتاب کے بارے نازل ہوئی۔ اہل کتاب نے کہا ہم تمہاری نسبت اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہیں ہماری کتاب تمہاری کتاب سے مقدم ہے اور ہمارے نبی تمہارے نبی سے پہلے مبعوث ہوئے۔ ان کے جواب میں اہل ایمان نے کہا ہم اللہ تعالیٰ کے قرب کا زیادہ حق رکھتے ہیں کیونکہ ہم اپنے نبی ﷺ پر اود تمہارے نبی پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے کتاب میں نازل فرمایا ہے اس کے سبب تم ہمارے نبی اور ہماری کتاب کو پھینکتے ہو اور صرف حسد کی بناء پر اس کا انکار کرتے ہو۔ پس میں ان دونوں گروہوں کا اپنے رب کے بارے میں جھگڑا اور فساد تھا (2)۔

عابد اور عطاء بن رباح کلبی نے کہا ہے کہ وہ گروہوں سے مراد موسیٰ اور کسی بھی ملت سے تعلق رکھنے والے کافر ہیں اور بعض نے یہ کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا اِلٰلٰهِيْهِمْ مَّوَدِّعًا وَاُولٰٓئِكَ يَتَرَتَّبُوْنَ اُولٰٓئِكَ يَتَرَتَّبُوْنَ اُولٰٓئِكَ يَتَرَتَّبُوْنَ اُولٰٓئِكَ يَتَرَتَّبُوْنَ اور ایک جنتی ہے۔ پس ارشاد باری تعالیٰ هٰذٰلِكَ خُصْمُكَ اِنَّ نَبِيَّكَ لَمِنَ الْغٰلِبِيْنَ اور جو کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے سبب تم ہمارے نبی اور ہماری کتاب کو پھینکتے ہو اور صرف حسد کی بناء پر اس کا انکار کرتے ہو۔ گروہ ہے (3) کیونکہ کفر کسی بھی نوع کا ہو وہ تمام کا تمام ملکہ واحدہ ہے۔

ان دونوں قولوں کا انحصار عموم الفاظ اور سیاق قصہ پر ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تفسیر میں عموم الفاظ کا اعتبار ہوتا ہے خصوصیت کے

سب کا اعتبار نہیں ہوتا۔

عکرمہ نے کہا ہے کہ یہ دونوں جھگڑا کرنے والے فریق جنت اور دوزخ ہیں (1)۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جنت اور دوزخ ہانہم جھگڑ پڑے۔ دوزخ نے کہا مجھے ترجیح حاصل ہے کیونکہ مجھ میں تکبر کرنے والے اور فخر کرنے والے داخل ہوں گے اور جنت نے کہا میرے لئے تو کچھ نہیں بچھ میں تو صرف کمزور ضعیف اور فقیر قسم کے لوگ ہی داخل ہوں گے تو اللہ تعالیٰ نے جنت کو فرمایا تو میری رحمت ہے میں تیرے سب اپنے بندوں میں سے جس پر چاہوں گا رحم فرماؤں گا۔ اور دوزخ کو فرمایا تو میرا عذاب ہے میں تیرے سب جسے چاہوں گا عذاب دوں گا تم دونوں میں سے ہر ایک کو بھرتا ہے۔ پس جنہم تو تب بھرے گی جب رب کریم اپنا قدم قدرت اس میں رکھیں گے تو اس وقت وہ بھر جائیگی اور پکاراٹھے گی بس بس اور اس کے بعض حصے آپس میں مل جائیں گے (2) اور اللہ تعالیٰ مخلوق میں سے کسی پر بھی زیادتی نہیں کرے گا (کہ جنہم کو بھرنے کے لئے اسے بلا دیا جس میں ڈال دے) اور جنت کو بھرنے کے لئے اللہ تعالیٰ اور مخلوق پیدا فرمادے گا۔

پس وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا، ان کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنے کیلئے آتش جنہم سے ان کے لئے کپڑے تیار کر دیئے گئے جو ان کی حدیثوں اور درجوں کے اندازوں پر بنائے گئے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصَلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْ اٰیٰی فِصْلٰہِ کَاذِبٌ۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں یہ کھٹے ہوئے تانبے کے کپڑے ہوں گے اور کوئی رعایت بھی گرم کے جانے کے بعد اس سے زیادہ سخت گرم نہیں ہوتی۔ چونکہ یہ کفار کے بدلوں کو کپڑوں کی طرح ہی محیط ہو گا اس لئے اسے لفظ شایب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ اہل جنہم کو آگ کے ٹکڑے (بلور باس) پہنائے جائیں گے (3)۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے سند حسن کے ساتھ حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کسی نے دنیا میں ریشم کا لباس پہنا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے آگ کا لباس پہنائے گا۔ براہین اہلی حاتم اور ترمذی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جسے سب سے پہلے آگ کا حلد (پرہن) پہنایا جائے گا وہ اٹلیس ہے، وہ اسے اپنے بھنوں پر رکھے گا اور اسے اپنے پیچھے گھسیٹتا جائے گا اور اس کے پیچھے اس کی ذریت (اولاد) بھی آگ کے لباس کھینچتی جائے گی۔ اس وقت وہ پکار رہا ہوگا ہائے ہلاکت اور اس کی اولاد بھی پکار رہی ہوگی ہائے ہلاکت و بربادی۔ یہاں تک کہ یہ سب دوزخ پر کھڑے ہوں گے تو اس وقت انہیں کہا جائے گا تم ایک ہلاکت اور موت کو نہ پکارو بلکہ کثیر ہلاکتوں کو آواز دو (4)۔

ابو نعیم نے وہب بن منہ سے روایت نقل کی ہے اہل ناکر کو لباس پہنائے جائیگا حالانکہ (اس کی نسبت) ان کے لئے ننگ رہنا بہتر ہوگا۔ انہیں زندگی دی جائے گی حالانکہ ان کے لئے موت بہتر ہوگی (5)۔

ابو مالک اشعری نے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایسی نوحہ کرنے والی عورت جس نے موت سے قبل توبہ نہ کی تو قیامت کے دن اسے تارکول کی قمیص اور جرب (تکواریک زنگ) کا کرت پہنائے جائیگا۔

- 1- تعبیر بنوی، جلد 4، صفحہ 105 (الکر)
- 2- صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 381 (قدیمی)
- 3- تعبیر بنوی، جلد 4، صفحہ 106 (الکر)
- 4- مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 719 (الکر)
- 5- الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 629 (اعلیٰ)

ابن ماجہ نے اسے اس طرح بیان کیا ہے کہ نوح کرنے والی جب اس حال میں مریگی کہ اس نے توبہ نہ کی تو اس کے لئے تارکول کا لباس اور آگ کے شعلوں کا کرتہ تیار کر دیا گیا ہے (1) (جو اسے پہنایا جائیگا)
 عَلَّيْضَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوسِهِمُ الْحَمِيمُ عمل جملہ لہم کی ضمیر سے حال ہے یا یہ دوسری خبر ہے اور ضمیر سے مراد ایسا گرم پانی ہے جو اپنی حرارت اور گرمی کی انتہا کو پہنچا ہوا ہو۔

يُصْهَرُ بِهَا مَا فِي بُطُونِهِمْ وَالْجُلُودُ ۖ وَلَهُمْ مَقَامُهُمْ مِنْ حَدِيدٍ ۖ كَلَّمَآ آسَاءُ ذَوَا

أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا مِنْ عَمٍ أُعِيدُوا فِيهَا وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ۖ

”گل جائے گا اس کھولتے پانی سے جو کچھ ان کے ہلکوں میں ہے اور ان کی چیزیاں بھی گل جائیں گی۔ اور ان (کو مارنے) کے لئے گرز ہوں گے لوہے کے۔ جب بھی ارادہ کریں گے اس سے نکلے گا فرط غم و الم کے باعث تو انہیں لوٹا دیا جائے گا اس میں سے اور (کہا جائے گا) کہ کھمبو چلتی ہوئی آگ کا عذاب۔“

لہ وہ کھولتا ہوا گرم پانی جو ان کے سروں پر اڑ پڑا جائے گا اس کے سبب جو کچھ ان کے پیٹوں میں چربی اور اتتریاں وغیرہ ہیں سب پتیل جلی جائیں گی اور ظاہری جلد بھی گل جائے گی۔ یعنی اس پانی کی حرارت ان کے اندرونی اعضاء پر بھی ظاہری جسم کی طرح ہی اثر انداز ہوگی۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ انجم سے یا ضمیر سے حال ہے۔

ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کھولنا ہوا گرم پانی اہل دوزخ کے سروں پر اڑ پڑا جائے گا یہاں تک کہ یہ ان کے ہلکوں کے اندر تک پہنچ جائے گا اور پھر جو کچھ ان کے پیٹ میں ہے وہ ان کے قدموں کے درمیان سے بہ کر نکل جائیگا۔ اسی کا نام صبر ہے۔ پھر یہی گل بار بار کیا جائے گا۔ اور ہر بار وہ پھر پہلے کی طرح ہو جائیگا (2)۔
 علی اور ان کو مارنے کے لئے لوہے کے گرز ہوں گے۔ مَفْصَعَةٌ مَفْصَعَةٌ کی جمع ہے۔ درحقیقت اس سے مراد وہ آلہ ہے جس کی سخت ضرب کے سبب کسی شئی کو روکا جا سکتا ہو۔ ایسے نے کہا ہے کہ مَفْصَعَةٌ کا معنی گرز ہے (3)۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ لفظ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے قمعت راسہ۔ اس کا معنی ہے میں نے اس کے سر پر سخت ترین ضرب لگائی (4)۔ ترکیب کلام میں وَ لَهُمْ مَقَامُهُمْ مِنْ حَدِيدٍ کا جملہ قَبْلُ لَمْ يَكُنْ لَمْ يَكُنْ کی ضمیر مجرد سے حال ہے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس آیت کے بارے میں یہ قول نقل کیا ہے کہ انہیں گرزوں کے ساتھ مارا جائے گا۔ ہر عضو پر گرز کی ضرب جا کر لگے گی اور وہ ہر ضرب کے ساتھ موت اور ہلاکت کو پکارتے ہوئے (5)۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ ابو یعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ حاکم رحمۃ اللہ علیہ اور ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر لوہے کا وہ گرز زمین پر رکھ دیا جائے اور اسے اٹھانے کے لئے تمام جن و انس اکٹھے ہو جائیں تو وہ اسے زمین سے نہ اٹھا سکیں گے اور اگر لوہے کے اس گرز کی ایک ضرب پہاڑ پر لگائی جائے تو

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2، صفحہ 271 (اعلمیہ)

2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 82 (فاروقی کتاب خانہ)

3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 629 (اعلمیہ)

3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 107 (الفرک)

4۔ ایضاً

وہ ریزہ ریزہ ہو جائے۔ (ایسے بھاری اور وزنی گرز کے ساتھ اہل دوزخ کو مارا جائے گا) یہ شدید ضرب لگنے کے بعد وہ پھر پہلے کی طرح ہوجائے گا اور یہی عمل اس پر بار بار دہرایا جائے گا۔ حاکم نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے (1)۔

جسے جب بھی وہ اس غم و اندوہ اور رنج و الم کے باعث دوزخ سے نکلنے کا ارادہ کریں گے جو جہنم میں ان کی جانوں کو لاحق ہوگا تو انہیں پھر اسی میں لوٹا دیا جائے گا۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ حرف جار کے اعادہ کے سبب ضمیر مجرور سے بدل اشتغال ہے۔ یہاں تقدیر عبارت اس طرح ہے **كُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا** (کہ جب بھی وہ اس سے نکلنے کا ارادہ کریں گے کہ اس سے نکل جائیں تو وہ اس میں لوٹا دیئے جائیں گے) کیونکہ اعادہ تو ایک بار باہر نکلنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ مگر چونکہ اہل جہنم کا اس سے باہر نکلنا ممکن نہیں اس لئے یہاں اعادہ کو ارادہ پر مرتب کیا گیا ہے)

ترکیب کلام میں مکمل جملہ شرطیہ **كُلَّمَا أَرَادُوا** سے آخر تک مقایع کی صفت ہے اور اس میں رابطہ محذوف ہے۔ اصل کلام اس طرح ہے **أُعِيدُوا بِهَا فِيهَا**۔

ابن ابی حاتم نے اس آیت کی وضاحت میں حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا قسم بخدا! انہیں باہر نکلنے کی امید تک نہیں ہوگی کیونکہ ان کی ناکھیں مضبوطی کے ساتھ بندھی ہوں گی۔ البتہ آگ کے شعلے اپنے جوش کے ساتھ انہیں اوپر اٹھائیں گے اور اوپر سے گرزوں (کی ضربیں) انہیں پھر واپس لوٹا دیں گی (2)۔

میں کہتا ہوں کہ ارشاد باری تعالیٰ **أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا** سے مراد یہ ہے کہ جب آگ کے شعلے انہیں اوپر اٹھائیں گے تو وہ گمان یہ کریں گے کہ وہ دوزخ سے باہر جا کر گریں گے۔ لیکن ایسے نہیں ہوگا بلکہ اوپر سے (فرشتوں) کے گرز انہیں پھر واپس لوٹا دیں گے۔

علامہ تہذیبی رحمۃ اللہ علیہ نے البصائر سے یہ قول نقل کیا ہے کہ جب بھی آدمی کو دوزخ میں پھینکا جائے گا تو وہ اس کی تہہ میں ہی پہنچ کر جا رہے گا۔ اس کے سبب جہنم کھولنے اور جوش مارنے لگے گی اور اسے اٹھا کر اوپر والے کنارے تک لے آئے گی۔ اس وقت اس کی جسمانی ہڈیوں پر گوشت کا نام و نشان تک نہ ہوگا (آگ اسے کھا چکی ہوگی فقط ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوگا) پھر ملائکہ اسے گرزوں کے ساتھ اوپر سے ماریں گے۔ نتیجتاً وہ دوزخ کی تہہ تک پھر پہنچے گا۔ پس مسلسل یہی عمل ہوتا رہے گا۔

علامہ لغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں یہ ذکر فرمایا ہے کہ جہنمیوں کے سبب جہنم جوش مارنے لگے گی اور انہیں نیچے سے اوپر والے کنارے تک لے آئے گی چنانچہ وہ اس سے باہر نکلنے کا ارادہ کریں گے لیکن جہنم پر مقرر فرشتے لوہے کے گرزوں سے انہیں ماریں گے اور پھر نیچے گرائیں گے اور وہ ستر برس تک نیچے کی جانب لڑھکتا ہی جائے گا (3)۔

یہ اور (انہیں کہا جائے گا) کہ طبعی ہوئی آگ کا عذاب چکھو۔ **وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ** کا جملہ اعیاد اوپر معطوف ہے۔ اور تقدیر عبارت اس طرح ہے **وَقِيلَ لَهُمْ ذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ** سے مراد شدید ترین جلا دینے والی آگ ہے۔ حریق (صفت مشبہ کا صیغہ ہے) یہ فعلیل کے وزن پر بمعنی فاعل ہے (یعنی حریق بمعنی منحرق ہے) جیسے الیم بمعنی موم اور ذجاج بمعنی مومج ہے۔

زجاج نے کہا ہے کہ جن لوگوں کا مذکورہ بالا آیات طیبات میں ذکر کیا گیا ہے وہ دو گروہوں میں سے ایک سے تعلق رکھتے ہیں اور دوسرے گروہ کا ذکر آنے والی آیات میں آ رہا ہے (4)۔

۱۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 629 (اصحیہ)

4۔ ایضاً

3۔ تفسیر بنو، جلد 4، صفحہ 107 (القر)

2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 630 (اصحیہ)

إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا
الْأَنْهَارُ يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ ﴿١٧﴾
وَهُدُوءٌ إِلَى الظِّلِّ مِنَ الْقَوْلِ ۗ وَهُدُوءٌ إِلَى صِرَاطٍ الْحَيْدِ ﴿١٨﴾

”یقیناً اللہ تعالیٰ داخل کرے گا ان لوگوں کو جو ایمان بھی لائے اور عمل بھی نیک کرتے رہے جنّتوں میں بہتی ہیں جن کے نیچے نہریاں لے انہیں پہنائے جائیں گے جنت میں سونے کے نگینے اور موتیوں کے ہارے اور ان کی پوشاک وہاں رہی ہو گی ہے اور ان کی رہنمائی کی گئی تھی پاکیزہ قول کی طرف اور دکھایا گیا تھا انہیں راستہ اللہ تعالیٰ کا جو تعریف کیا گیا ہے۔“

اس آیت طیبہ میں اسلوب بیان تبدیل کر دیا گیا ہے اور جنت میں داخل کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے۔ اور ساتھ ہی کلام کو ان کے ساتھ مؤکد ذکر فرمایا ہے تاکہ اس سے اہل ایمان کی حالت کی قدر افزائی ہو اور ان کی عظمت شان بیان ہو۔

یہ یُحَلَّوْنَ حلیت العراۃ سے ماخوذ ہے، یہ جملہ تب بولا جاتا ہے جب کوئی کسی عورت کو زیور پہنائے۔ ترکیب کلام میں یہ لفظ اسم موصول سے حال ہے۔ اسواویر، اسورۃ کی جمع ہے اور اسورۃ میواری کی جمع ہے۔ ترکیب کلام میں یہ لفظ مفعول محذوف کی صفت ہے۔ عبارت اس طرح بن جائے گی ”یُحَلَّوْنَ حلیتاً کانتا من اسواویر“ من ذہب اس کا بیان ہے اور لؤلؤا اسواویر پر معطوف ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ انہیں جنت میں سونے کے نگینے اور موتیوں کے ہار پہنائے جائیں گے۔

نافع اور عامر کی قرأت کے مطابق لؤلؤا کو یہاں اور سورۃ فاطر میں اسواویر کے محل پر محمول کرتے ہوئے منصوب پڑھا گیا ہے یا پھر اسے نصب دینے والا فعل مضمر ہے اور اصل عبارت یؤتون لؤلؤا ہے جبکہ باقی قرآن نے اسواویر کے لفظ پر محمول کرتے ہوئے یا عن ذہب پر معطوف کرتے ہوئے لؤلؤا کو مجرور پڑھا ہے۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ مفسرین نے کہا ہے کہ اہل جنت میں سے ہر فرد کے ہاتھ میں تین نگینے پہنائے جائیں گے، ان میں سے ایک سونے کا ہوگا ایک چاندی کا اور ایک موتیوں کا ہوگا۔

میں کہتا ہوں کہ لؤلؤا میں واؤ کے بعد الف لکھا جانا اس کے منصوب ہونے کی تائید کرتا ہے۔

ابو عمرو نے کہا ہے کہ قرآن نے اس میں الف کو ایسے ہی ثابت لکھا ہے جیسے قالوا اور کانا میں الف کو ثابت لکھا ہے۔ کسائی نے کہا ہے کہ یہ ہمز الف کی صورت میں لکھا گیا ہے۔

ابو بکر اور ابو عمرو نے تمام قرآن کریم میں لؤلؤا اور اللؤلؤا سے دوسرے ہمزہ کی تخفیف کے وقت چھوڑ دیا ہے۔ ہمزہ نے حالت وقف میں دونوں ہمزوں کو اپنے اصل پر رکھتے ہوئے تسہیل کے ساتھ پڑھا ہے۔ ہشام نے دوسرے ہمزہ کو اپنے اصل پر رکھتے ہوئے تسہیل کے ساتھ پڑھا ہے بشرطیکہ اس کی حالت صحیح نہ ہو اور بقیہ قرآنیوں ہمزوں کو ثابت رکھتے ہیں۔

ترمذی حاکم اور ترمذی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ نقل کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کا ارشاد تلاوت فرماتے جَنَّتِ عِلْدَنٌ یُدْخَلُونَہَا یُحَلَّوْنَ فِیہَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا وَلِبَاسُهُمْ فِیہَا حَرِیرٌ اور پھر ارشاد فرماتے کہ ان پر ایسے تاج ہوں گے جن کا اونٹنی موتی مشرق و مغرب کے مابین کو منور روشن کرے گا۔ اس روایت کو حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔ (۱)۔

طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے الاوسط میں اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے سنن حسن کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر اہل جنت میں سے ادنیٰ فرد کے زیور کا مقابلہ تمام اہل دنیا کے زیورات سے کیا جائے تو اللہ تعالیٰ آخرت میں جو زیور سے پہنائے گا وہ تمام اہل دنیا کے زیورات سے افضل و اعلیٰ ہوگا (1)۔

ابو اسحاق نے العظمہ میں کعب الاحبار سے یہ قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک فرشتہ اپنا پیش اہل دنیا کے دن سے اہل جنت کے لئے زیور بنا رہا ہے اور یوم قیامت تک اس میں مصروف رہے گا۔ اگر اہل جنت کے زیورات میں سے کوئی ایک بھی برآمد ہو جائے تو اس کے سامنے سورج کی روشنی بھی ماند پڑ جائے۔

شیخین نے صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندہ مومن کا زیور (اس کے ہاتھ اور پاؤں میں) وہاں تک پہنچے گا جہاں تک وضو کا (پانی) پہنچتا ہے (2)۔

ابن ہریرہ میں عمران بن خالد کی سند سے ایک تابعی کی روایت منقول ہے کہ صحابہ کرام نے فرمایا جس آدمی نے سونا پہننے کی قدرت رکھتے ہوئے نہ پہنا، اللہ تعالیٰ اسے جنت میں سونا پہنائے گا اور جس نے شراب پینے کی قدرت رکھتے ہوئے اسے پینا ترک کر دیا، اللہ تعالیٰ اسے جنت میں (شراب پیو) سے میراب فرمائے گا۔ نسائی اور حاکم نے عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ (سونے کا) زیور اور ریشم پہننے والوں کو منع فرمایا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اگر تم جنت کا زیور اور ریشم پہننا پسند کرتے ہو تو دنیا میں یہ نہ پہننا کرو (3)۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے دنیا میں ریشم پہنا وہ آخرت میں (جنت کا ریشم) نہیں پہنے گا (4)۔

سے ترکیب کلام میں وَلِيْنَا مَسْهُمْ فِيْهَا حَوِيْرًا کے فاعل سے حال ہے یا اس پر معطوف ہے۔

اسلوب کلام اس لئے تبدیل کر دیا گیا ہے تاکہ اس پر دلالت کرے کہ ریشم ان کا عرفی لباس ہے یا پھر اس لئے تاکہ آیات کے آخری حروف کا وزن ایک رہے۔

بزار ابویعلیٰ اور طبرانی نے حضرت جابر کے واسطے سے صحیح سند کے ساتھ ابو الخیر محمد بن عبد اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ جنت میں ایک درخت ہے جس پر سنسں (باریک ریشم) آگتا ہے، اسی سے اہل جنت کا لباس تیار ہوگا۔ نسائی، علی بن ابی اسحاق نے سنن جبیر کے ساتھ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اس سے پھٹ کر نکلیں گے، یعنی اہل جنت کے کپڑے جنت کا پھل دوبارہ پھٹنے سے نکلیں گے۔

ابن مبارک نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ مومن کا گھر ایک موتی ہوگا جو اندر سے خالی ہوگا۔ اس میں چالیس کمرے ہوں گے، ان کے درمیان میں ایک درخت ہوگا جس پر لباس آگے گا۔ پس بندہ مومن جا کر اس سے اپنی انگلی کے ساتھ ستر جوڑے لباس نکال لے گا جو کہ موتیوں زبرجد اور مرجان سے مزین اور آراستہ ہوں گے۔

فصل: شیخین نے حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ میں نے بذات خود رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ تم ریشم

1- مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 740 (المنکر)

2- صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 127 (قدیمی)

3- صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 867 (وزارت تعلیم)

4- مستدرک حاکم، جلد 4، صفحہ 212 (العلویہ)

اور بیابان نہ پہنچا سوئے چاندی کے برتنوں میں نہ پیو اور ان کی رکابیوں اور پیالوں میں نہ کھاؤ کیونکہ یہ دنیا میں (کافروں کے لئے) ہیں اور آخرت میں تمہارے لئے ہیں (1)۔

شخصین نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس نے دنیا میں ریشم پہنا وہ آخرت میں اسے نہیں پہن سکے گا (یعنی اس سے محروم رہے گا) اسی کی مثل حدیث حضرت انس اور حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی مروی ہے۔

نسائی اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس کسی نے دنیا میں ریشم پہنا وہ آخرت میں شراب (طہور) نہیں پی سکے گا اور جو کوئی دنیا میں سونے چاندی کے برتنوں میں پیئے گا آخرت میں وہ ان میں نہیں پی سکے گا (2)۔

طیبی نے صحیح سند کے ساتھ نہائی ابن حبان اور حاکم نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس کسی نے دنیا میں ریشم پہنا آ آخرت میں وہ اسے نہیں پہن سکتا۔ اگر وہ جنت میں داخل بھی ہوتا تب بھی اس لباس سے وہ محروم رہے گا (3)۔

ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدنیا نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سے ہر ایک کو طوفانی کی طرف لے جایا جائے گا اور اس کے شکونے اس کے لئے نکول دیئے جائیں گے (ان سے لباس برآمد ہوگا) اور وہ جس رنگ کا لباس چاہے گا، لے لے گا، چاہے تو سفید رنگ پسند کرے یا سرخ رنگ چاہے تو سبز رنگ یا زرد رنگ اور اگر سیاہ رنگ پسند کرے (تو وہی لے لے گا) یہ لباس گل الالہ کی طرح ہوگا بلکہ اس سے بھی زیادہ خرم اور خوبصورت ہوگا۔

حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں اگر جنت کے کپڑوں میں سے کوئی کپڑا دنیا میں پہنا جائے تو جو اس کی طرف دیکھے وہ غش کھا کر گر پڑے اور آنکھیں (اس کی چمک کو) برداشت نہ کر سکیں۔

صابونی نے المائین میں حضرت نکرمة کا بیان نقل کیا ہے کہ اہل جنت میں سے جو آدمی جنتی حلقہ پہننے کا تو ایک ساعت میں اس میں ستر رنگ تبدیل ہوں گے۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص جنت میں داخل ہو کر وہاں کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوگا تو اس کا لباس بوسیدہ اور پرانا ہوگا اور اس کا شباب (جوانی) ختم ہوگا (4)۔

وَهُذُوَ اَيُّ الْكَلْبِ مِنَ الْقَوْلِ، سے پہلے قد مقدر ہے اور یہ الذین ام موصول سے حال ہے جو کہ یدخل کا مفعول ہے۔ مضموم یہ ہے در آنحالیکہ دنیا میں ان کی رہنمائی پاکیزہ قول کی طرف کی گئی تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا پاکیزہ قول سے مراد لا الہ الا اللہ واللہ اکبر والحمد للہ کی شہادت دینا ہے۔ سدی نے کہا ہے کہ قول طیب سے مراد قرآن ہے (5)۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں ماضی مستقبل کے معنی میں ہے۔ یعنی جنت میں ان کی رہنمائی پاکیزہ قول کی طرف کی جائے گی اور اس سے مراد ان کا یہ قول ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ صَدَقْتَنَا وَغَدَاؤُنَا اور دنیا میں انہیں اللہ تعالیٰ کا راستہ دکھایا گیا تھا جو تعریف کیا گیا ہے۔ صراط سے مراد اللہ

1- صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 189 (قدیمی) 2- مستدرک حاکم، جلد 4، صفحہ 141 (العلینی)

3- مستدرک حاکم، جلد 4، صفحہ 212 (العلینی) 4- صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 380 (قدیمی) 5- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 108 (المنکر)

تعالیٰ کا دین یعنی دین اسلام ہے اور سعید سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو کہ بذات خود حمد و ستائش کا مستحق ہے۔ یا پھر اس کا معنی یہ ہے کہ ان کی راہنمائی جنت کے اس راستہ کی طرف کی جائے گی جو قابل تعریف ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِي
جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ ۗ وَمَن يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ
لُّذِقْنَاهُ مِن عَذَابِ أَلِيمٍ ۝

”بیٹک وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا اور (دوسروں کو) روکتے ہیں اللہ تعالیٰ کی راہ سے اور مسجد حرام سے جسے ہم نے (بلا امتیاز) سب لوگوں کے لئے (مرکز ہدایت) بنا دیا ہے اور جہاں اس میں وہاں کے رہنے والے اور پردہ کی حالت میں زیادتی کا ناحق ہے تو ہم اسے پکھلائیں گے اور تاک عذاب ہے“

۱۔ بیٹک وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا اور دوسرے لوگوں کو دین اسلام میں داخل ہونے سے روکتے ہیں۔ یہاں یَصُدُّونَ فعل مضارع ہے، اس سے مراد زمانہ حال اور استقبال نہیں بلکہ اس سے مراد استمرار ہے، یعنی مسلسل روکنا ہے جیسا کہ عربوں کا یہ قول ہے فلان يعطى و يمنع یعنی فلان مسلسل عطا کرتا رہتا ہے اور منع کرتا ہے چنانچہ اسی معنی کی بناء پر مضارع کا عطف ماضی پر کیا گیا ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ وَيَصُدُّونَ كَفَرُوا کے فاعل سے حال ہے اور اِنَّ كِخبر محذوف ہے جس پر آیت کا آخری حصہ لُذِقْنَاهُ مِنَ عَذَابِ اَلِيمٍ دلالت کرتا ہے۔

۲۔ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کا عطف سَبِيلِ اللّٰهِ پر ہے یا اسم جلالہ لفظ اللّٰہ پر ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللّٰہ علیہ کے نزدیک مسجد حرام سے مراد صرف مسجد (کعبہ معظمہ) ہے، جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللّٰہ علیہ کے نزدیک اس سے مراد سارا حرم پاک ہے جیسا کہ اس ارشاد شاذی میں ہے سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْمٰی بَعْدَہٗ لَیْلًا یُّنِیْمُ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ حالانکہ یہ کہا گیا ہے کہ واقعہ معراج کا آغاز حضرت ام ہانی کے گھر سے ہوا (جو کہ حرم پاک میں تھا نہ کہ کعبہ معظمہ میں) تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت طیبہ میں مسجد حرام کا اطلاق پورے حرم پاک پر کیا گیا ہے (لہذا اس آیت میں بھی مسجد حرام سے مراد سارا حرم ہے) کیونکہ مکہ مکرمہ کی آبادی سے حقیقی مقصد تو نماز کو قائم کرنا تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول بطور کلامیت ذکر فرمایا ہے رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْأَلُکَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِرَحْمۃِکَ اِنَّکَ رَءِیْفٌ رَّحِیْمٌ ۙ وَرَبِّیْ اِنِّیْ اَسْأَلُکَ بِرَحْمۃِکَ اِنَّکَ رَءِیْفٌ رَّحِیْمٌ۔ اور امام شافعی رحمۃ اللّٰہ علیہ نے بھی آیت طیبہ اِنَّمَا الْمَسْجِدُ الْحَرَامُ لِلنَّاسِ سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ میں مسجد حرام سے مراد حرم پاک ہی لیا ہے۔ کیونکہ آپ نے کہا ہے کہ اس آیت کے مطابق کفار کو مطلقاً حرم پاک میں داخل ہونے سے روکا جائے۔ ہم نے اس کے بارے گفتگو سورہ توبہ میں کی ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ الَّذِیْ جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ مسجد حرام سے مراد حرم پاک ہے۔

۳۔ ابن کثیر نے البناد کو حالت فصل اور وصل دونوں میں اثبات یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ ورش اور بوکر نے صرف وصل کلام میں اس طرح پڑھا ہے۔ حفص نے سواء کو جعلنا کا مفعول ثانی ہونے کی بناء پر منصوب پڑھا ہے اور للناس ظرف لغو ہے۔ یا پھر سواء للناس میں ضمیر متکثر سے حال ہے اور للناس مفعول ثانی ہے اور العاکف اسی کے سبب مرفوع ہے۔ علاوہ ازیں باقی قرآن نے سواء کو مرفوع پڑھا ہے اس لئے کہ العاکف مبتدا ہے اور سواء اس کی خبر مقدم ہے یا پھر سواء مفعول کے قبیلے سے ہونے کی بناء پر مبتدا ہے

اور العاکف اس کا فاعل ہے (جو سد مسد الخمر ہے) اور پھر مکمل جملہ جعلناہ کا دوسرا مفعول ہے۔ اور للناس یا تو حاء ضمیر سے حال ہے یا پھر ظرف لغو ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ للناس مفعول ثانی اور جملہ سابقہ کلام کا بیان ہو۔ یعنی ہم نے اسے لوگوں کے لئے ایسا مرکز ہدایت بنا دیا جس میں مقیم اور مسافر برابر ہیں۔

الہادی سے مراد مسافر ہے اور یہ البدوی کی طرف منسوب ہے صاحب قاموس نے کہا ہے کہ البدوی البادية البداؤة اور البداءة کا معنی حضر (شہر) کے برعکس ہے (1)۔ یعنی کسی آدمی کو بھی کسی دوسرے کے مقابلے میں شہر میں زیادہ اترنے کا حق حاصل نہیں اور جو آدمی بھی کسی جگہ پہلے قیام پذیر ہوگا کسی دوسرے کے لئے اسے وہاں سے نکالنا جائز نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سعید بن جبیر قتادہ اور ابن زید نے اسی طرح کہا ہے۔ ان تمام کا یہ قول ہے کہ حرم پاک کی سرزمین کے مکانوں اور اترنے کی جگہوں میں مقیم اور مسافر کے حقوق برابر ہیں (2)۔

عبدالرحمن بن سابط نے کہا ہے کہ جب حجاج کرام مکہ مکرمہ میں آتے تھے تو اہل مکہ میں سے کسی کو بھی اپنے گھر میں فروکش ہونے کا ترجیحی حق ہائی نہیں رہتا تھا اور حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ ج کے دنوں میں لوگوں کو اپنے دروازے بند کرنے سے منع فرماتے تھے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح ذکر کیا ہے (3)۔

میں کہتا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول عبدالرحمن بن عبد بن حمید نے نافع کے واسطے سے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ ایک آدمی نے مروہ کے پاس آپ سے عرض کی اے امیر المؤمنین! آپ یہاں سے میرے لئے زمین کا کچھ حصہ علیحدہ کر دیجئے تو آپ اسے پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ گئے اور اس سے اعراض فرمایا اور ارشاد فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کا حرم ہے، اس میں مقیم اور مسافر برابر ہیں۔ (ازلاات الخلفاء) عبدالرزاق نے ابن جریر سے یہ نقل کیا ہے کہ عطاء حرم پاک میں گھوڑوں کے داخلے سے منع کرتے تھے اور مجھے یہ خبر بھی پہنچی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہل مکہ کو گھروں کے دروازے بند کرنے سے منع فرما رکھا تھا تاکہ حجاج کرام ان کے صحنوں میں قیام کر سکیں۔ سب سے پہلے وہاں سہیل بن عمرو نے اپنے گھر کا دروازہ بند کیا اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس اپنے کئے کی معذرت بھی پیش کی۔

پس اگر کہا جائے کہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں یہ قول صحیح ہے کہ آپ نے مکہ مکرمہ میں ذیل خانہ بنانے کے لئے ایک گھر چار ہزار درہم کے عوض خریدا تھا۔ اسے بیعتی نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح بیعتی نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت سوہدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا حجرہ مبارک خریدا تھا۔ اور حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے سے روایت ہے کہ انہوں نے دار الندوہ فروخت کیا تھا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں قس بن سہیل نے مسجد کی توسیع کے لئے کچھ گھرانے کے مالکوں سے خریدے تھے اور حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اسی طرح کیا تھا۔ اور اس وقت رباط میں کثیر صحابہ کرام سکونت پذیر تھے مگر کسی نے بھی اس خرید و فروخت کا انکار نہیں کیا۔ (تواس سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ مکرمہ بلکہ حرم پاک میں خرید و فروخت جائز ہے)

2- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 109 (المنکر)

1- التاموس الحویط، جلد 1، صفحہ 96 (اتراات العربی)

3- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 109 (المنکر)

میں کہتا ہوں کہ مذکورہ تمام آثار کو عمارت کی خرید و فروخت پر محمول کیا جائیگا کیونکہ عمارت تو بالیقین مالک کی ملکیت ہوتی ہے۔ اور ممنوع زمین کی بیع ہے۔ اسی لئے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کا نظریہ اور امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ کی اصح ترین روایت یہ ہے کہ مکہ مکرمہ کی زمین کو بیچنا اور وہاں کے مکانوں کو کرائے پر دینا جائز نہیں۔ کیونکہ حرم پاک کی سرزمین آزاد ہے اور کسی کی بھی ملکیت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّكُمْ مَعْلُومَاتُ الْبَيْتِ الْعَرَبِيِّ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بیت عتیق سے مراد سارے حرم کی سرزمین ہے۔ کیونکہ حرم پاک کی سرزمین ہی قربانی کے جانور ذبح کرنے کے لئے مختص ہے۔

اور جو یہ قول ہے کہ اس کا معنی ہے اِنَّكُمْ مَعْلُومَاتُ الْبَيْتِ الْعَرَبِيِّ کہ اس سے مراد وہ جگہیں ہیں جو بیت اللہ شریف کے قریب ہیں۔ تو یہ فقط ایک تکلف ہے اور تقدیر عمارت بلا ضرورت ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ بھی یہی ہے لیکن ان کے نظریہ کا جتنی اور مدار یہ ہے کہ مکہ مکرمہ پر زور شمشیر فتح کیا گیا ہے اور جو شہر پر زور شمشیر فتح کیا جائے وہ وقف ہوتا ہے، اس کی سرزمین کی خرید و فروخت جائز نہیں ہوتی۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا موقف یہ ہے کہ مکہ مکرمہ کے مکانوں کی خرید و فروخت اور انہیں کرائے پر دینا جائز ہے اور وہ اپنے مالکوں کی ملکیت ہیں۔ یہی نظریہ حسن طاؤس و عمرو بن دینار اور ایک جماعت نے اختیار کیا ہے۔ اور آپ کے نزدیک آیت طیبہ میں مسجد حرام سے مراد صرف کعبہ معظمہ ہی ہے اور آیت کا معنی یہ ہے کہ ہم نے کعبہ معظمہ کو لوگوں کی نمازوں اور عبادت کا قبلہ بنا دیا ہے، اس طرح کہ کعبہ معظمہ کی تعظیم، مسجد حرام میں نماز کی فضیلت اور بیت اللہ شریف کے طواف کے حکم میں مقیم اور مسافر سب برابر اور یکساں ہیں (1)۔ ہم کہتے ہیں (کہ اگر مسجد حرام سے مراد فقط کعبہ معظمہ لیا جائے) تو پھر سیاق آیت اس کا تقاضا کرتا ہے کہ مقیم اور مسافر کی مساوات اور یکسانیت صرف مسجد حرام کے ساتھ مختص ہے اس کے باوجود کہ تمام مساجد اس حکم میں یکساں ہیں۔ یعنی تمام مساجد میں مقیم اور مسافر برابر ہیں۔ ہر ایک پر ہر مسجد کی تعظیم واجب ہے اور تمام مساجد تمام لوگوں کے لئے نماز اور دیگر طاعات کے ثواب کے لئے یکساں اور مساوی ہیں، سفر و حضر کے اختلاف کے سبب اس میں کوئی اختلاف رونما نہیں ہوتا۔ (یعنی چاہے کوئی مقیم ہو یا مسافر۔ اس کے لئے ثواب ایک ہی جیسا ہے)

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ مجاہد اور ایک جماعت نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی مثل قول کہا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ مجاہد سے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی مثل بھی قول مروی ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ابراہیم بن صہاجر کی سند سے مجاہد کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ مکہ مکرمہ صباح ہے، اسکی زمین کو بیچنا اور مکانوں کو کرائے پر دینا حلال نہیں (2)۔ ہمارے اس مؤلف کی دلیل وہ روایت ہے جو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الآثار میں نقل کی ہے کہ ہمیں حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے عبد اللہ بن ابی زیاد اور ابویحییٰ کے واسطے سے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس حدیث کی خبر دی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اِنَّكُمْ مَعْلُومَاتُ الْبَيْتِ الْعَرَبِيِّ نے مکہ مکرمہ کو حرم قرار دیا ہے لہذا اس کی زمینوں کو بیچنا اور ان کی قیمت کھانا حرام ہے۔

علامہ ابن جوزی نے التفتیح میں اپنی سند کے ساتھ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک مرفوع روایت اس طرح نقل کی ہے کہ مکہ مکرمہ حرام ہے اس کی زمینیں حرام ہیں اور اس کے مکانوں کا کرایہ حرام ہے (3)۔

اگر یہ کہا جائے کہ دارقطنی نے کہا ہے حدیث کے مرفوع ہونے میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو وہم ہوا ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ

روایت موقوف ہے تو اس کے بارے وضاحت یہ ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے وہم کا دعویٰ کرنا (روایت کی) نفی پر شہادت دیتا ہے اور یہ قابل قبول نہیں بلکہ آپ تو ثقہ ہیں اور ثقہ راوی کا کسی حدیث کو مرفوع ذکر کرنا مقبول ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے مرفوع سند کے ساتھ ایک روایت اس طرح نقل کی ہے کہ جس کسی نے مکہ مکرمہ کے گھروں کی اجرت میں سے کوئی چیز کھائی تو گو یا وہ آگ کھا رہا ہے (1)۔

دارقطنی نے اپنی سند کے ساتھ اسماعیل بن ابراہیم بن مہاجر سے اور انہوں نے اپنے باپ اور عبد اللہ بن باباہ کے واسطے سے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مکہ مکرمہ مباح ہے نہ اس کی زمین کو بیجا جاسکتا ہے اور نہ اس کے مکانوں کو کرائے پر دیا جاسکتا ہے (2)۔ میں کہتا ہوں کہ اسماعیل بن ابراہیم کو یحییٰ اور نسانی نے ضعیف قرار دیا ہے۔ اور ان کے باپ ابراہیم بن مہاجر بن جابر اٹھلی کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ضعیف کہا ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے کہ یہ منکر الحدیث ہے۔ ابن مدینی اور نسانی نے کہا ہے کہ یہ قوی نہیں ہے۔ لیکن سفیان احمد یحییٰ بن یسین اور ابن مہدی نے کہا ہے کہ لا بأس یہ۔ ابو بکر عتیقی نے کہا ہے صحیح بات یہ ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے۔

ابن جوزی نے اپنی سند کے ساتھ سعید بن منصور سے روایت نقل کی ہے کہ ابو معاویہ نے عیش اور مجاہد کے واسطے سے ہمیں حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ بیشک مکہ مکرمہ حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے حرام قرار دیا ہے، اسکی زمین کو بیچنا اور اسکے مکانوں کو کرایہ لینا جائز نہیں (3)۔ یہ روایت مرسل ہے اور مرسل روایت ہمارے نزدیک حجت ہے۔

ہمارے مخالفین نے اس طرح استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَنْ تَبْنُوْا عَلَيْهِنَّ مَسٰجِدًا وَتَذْكُرُوْنَ اَمْواَلَهُنَّ (وہ لوگ جو اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے) اور رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن ارشاد فرمایا جو اہل بیتوں کے گھر میں داخل ہو جائے گا وہ محفوظ و مامون ہو جائیگا (4)۔ (تو یہاں آیت کریمہ اور حدیث طیبہ میں مکانوں کی نسبت ان کے مالکوں کی طرف کی گئی ہے) اور یہ اضافت اس پر دلالت کرتی ہے کہ وہ ان کے مالک ہیں۔ اور اگر یہ گھران کی ملکیت نہ ہوتے تو ان سے نکالے جاتے کے سبب وہ مظلوم قرار نہ پاتے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اضافت یا تو ان کے ان میں رہائش پذیر ہونے کے سبب ہے یا پھر اس لئے کہ انہوں نے ان مکانوں کو تعمیر کیا۔ جیسا کہ یہ کہا جاتا ہے مسجد النبی ﷺ اور مسجد نبی فلاں۔ لہذا یہ اضافت اثبات ملکیت کے لئے نہیں۔ اور ظاہراً انہیں گھروں سے نکالا جانا بھی اس پر دلالت نہیں کرتا کہ انہیں اپنے مملوک گھروں سے نکالا گیا ہے۔ (کیونکہ کلمہ مملوک گھروں سے نکالنے کے ساتھ مختص نہیں) بلکہ مسجد حرام سے انہیں نکال دینے کے سبب بھی ظلم تو ثابت ہو جاتا ہے۔ (حالانکہ یہ کسی کی ملکیت نہیں) بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس میں تمام لوگوں کے لئے برابر (ثواب) رکھا ہے۔ اور مزید فرمایا وَتَنْتَظِمْنَ صَلَاتِکُمْ لِرَبِّکُمْ ذَلِكُمْ فَسَمِعَ اللّٰهُ اَنَّ یُّذَکِّرَ فِیْهَا السَّمْعَ وَاسْمَعٰ لَی سَمِعَ حَرٰثَیْنِ (اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو اللہ تعالیٰ کی مساجد سے روکتا ہے کہ ان میں اس کے نام کا ذکر کیا جائے اور وہ انہیں ویران کرنے کی کوشش کرتا ہے)

مخالفین کی اس باب میں مضبوط ترین دلیل حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اپنے حج کے دوران کل آپ کہاں قیام فرمائیں گے؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تمہیں نے کوئی

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 632 (اصحیہ) 2۔ سنن الدارقطنی، جلد 3، صفحہ 58 (الحسان)

3۔ ابن جوزی، جلد 3، صفحہ 436 (السننۃ الاسلامیہ) 4۔ ایضاً

اڑنے کی ٹنگ چھوڑی ہے؟ پھر آپ ﷺ نے فرمان ان شاء اللہ تعالیٰ کل ہم نجیف بنی کنانہ میں اتاریں گے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کافر مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا اور یہ مسلمان کسی کافر کا وارث بن سکتا ہے۔ (مشفق علیہ 1)۔

علامہ ابن جوزی نے یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ مکہ مکرمہ میں اپنے گھر قیام فرمائیں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا عقل نے کوئی زمین یا مکان چھوڑا ہے؟ (2) زہری نے کہا ہے کہ عقل اور طالب ابوطالب کے وارث بنے تھے اور حضرت جعفر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کسی بھی شئی کے وارث نہ بنے کیونکہ یہ دونوں مسلمان تھے جبکہ عقل اور طالب دونوں ابھی کافر تھے کہ ابوطالب فوت ہو گئے۔ (اس لئے وہ اس کے وارث بنے)

حافظ نے محمد بن ابی حفصہ کی روایت کے آخر میں کہا ہے کہ یہ کہا جاتا ہے جس گھر کی طرف حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اشارہ فرمایا ہے وہ ہاشم بن عبدمناف کا گھر تھا۔ پھر وہ ان کے بیٹے عبدالمطلب کو ملا۔ پھر آپ نے اسے اپنے بیٹوں کے درمیان تقسیم فرمایا جب آپ عمر رسیدہ ہو گئے۔ پھر اس میں سے رسول اللہ ﷺ کو اپنے والد محترم حضرت عبد اللہ کا حصہ ملا۔ جس میں آپ ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ پھر جب حضور نبی کریم ﷺ نے ہجرت فرمائی تو عقل اور طالب سارے گھر کے والی بن گئے کیونکہ باپ کی طرف سے یہی دونوں اس کے وارث بنے تھے اور یہ دونوں ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اور چونکہ رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کے سبب اپنا حصہ چھوڑ دیا تھا (لہذا اس پر بھی انہوں نے قبضہ کر لیا) پھر طالب میدان بدر میں قتل ہو گیا تو عقل نے سارا گھر فروخت کر دیا۔

فانہ کہانی نے لکھا ہے کہ عقل نے گھر فروخت نہیں کیا تھا بلکہ وہ گھر مسلسل عقل کی اولاد کے قبضے میں رہا یہاں تک کہ انہوں نے وہ حجاج کے بھائی محمد بن یوسف کو ایک لاکھ دینار کے عوض فروخت کر دیا۔

مذکورہ استدلال کا جواب یہ ہے کہ عقل کا حالت کفر میں اس گھر کو چھٹا اس پر دلیل نہیں بن سکتا کہ اسلام میں (مکہ مکرمہ کے گھروں کو) بیچنا جائز ہے۔ اور میرے نزدیک حدیث طیبہ کی تاویل یہ ہے کہ اگر اس گھر کو عقل نے فروخت نہیں کیا تھا تو اس وقت وہ اس کی ذاتی حاجات و ضروریات میں مشغول تھا اور اگر فروخت کر دیا تھا تو پھر خریدنے والے کی حاجات میں مصروف تھا تو چونکہ وہ گھر خالی نہیں تھا اس لئے حضور نبی کریم ﷺ نے اس میں سکونت اختیار نہ فرمائی۔ لہذا آپ ﷺ نے فرمایا کیا عقل نے ہمارے لئے کوئی مکان (خالی) چھوڑا ہے؟ تو اس پر راوی کا یہ کہنا کہ عقل ابوطالب کا وارث بنا یہ محض ایک شبہ ہے جس کا دارالمدار علم اور وہم پر ہے۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد کہ کافر مومن کا وارث نہیں بن سکتا اور نہ ہی مومن کافر کا وارث بن سکتا ہے۔ اس کا تعلق کسی اور واقعہ سے ہے لیکن راوی نے فقط ظن و وہم سے دونوں حدیثوں کو ملا دیا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کافر مومن کا وارث نہیں بن سکتا اور نہ ہی مومن کافر کا وارث بن سکتا ہے۔ اسی ارشاد کی بناء پر آپ ﷺ نے فرمایا کیا عقل نے ہمارے لئے کوئی گھر چھوڑا ہے۔ لہذا اس بناء پر حضور ﷺ کا یہ ارشاد لایبوث الکفار المؤمنین ولا المؤمنین الکافرینا اور مفرد کلام ہے۔ اس میں یہ کوئی دلیل نہیں کہ مکہ کی سرزمین کسی کی ملکیت ہے۔ اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ حدیث اس پر دلالت کر رہی ہے کہ مکہ مکرمہ کی سرزمین کو بیچنا جائز ہے۔ تو اس کے جواب میں ہمارا قول یہ ہے کہ ہم نے ایسی کثیر احادیث ذکر کی ہیں جو سرزمین مکہ کی خرید و فروخت کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ گویا کہ وہ احادیث اپنی عبادت کے لحاظ سے خرید و فروخت کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ گویا کہ وہ احادیث

اپنی عمارت کے لحاظ سے خرید و فروخت کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ اور یہ حدیث اشارۃً بیع کے مباح ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ لہذا ہماری روایات کی دلالت اوئی اور اقویٰ ہے۔ پھر اگر ہم یہ تسلیم بھی کر لیں کہ ان احادیث کے مابین تعارض پایا جاتا ہے تو ایسی صورت میں بھی حرام کو مباح پر مقدم کرنا واجب ہے۔ اسی لئے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس قاعدہ کی بناء پر کہا حجت و حرمت کے تعارض کے وقت حرمت کو ترجیح حاصل ہے۔ سر زمین کہ کہ خرید و فروخت کرنے کو مکروہ تحریمی بنا دیا ہے۔ اگر حضرت عبداللہ کا حصہ حضور نبی کریم ﷺ کو ملا تھا تو پھر اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ حصہ بغیر جاہرانہ قبضے کے عقل کے پاس پہنچا۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مسلک ہے کہ کافر مسلمان کے مال پر جبر اور قبضہ کے بعد اس کا مالک بن جاتا ہے۔ مگر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ موقف نہیں اور اگر کافر کو یا پھر قبضہ کے سبب ملکیت حاصل ہو جائے تو پھر رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کا اس حدیث میں کوئی معنی نہیں کہ کافر مومن کا وارث نہیں بنتا اور نہ ہی مومن کا فر کا وارث بن سکتا ہے۔

اگر وہ سارا مگر ابو طالب کا تھا تو پھر اس میں حضور نبی کریم ﷺ کے حصہ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اگرچہ ہم ابو طالب کا مسلمان ہونا بھی فرض کر لیں۔ کیونکہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام ابوطالب کے درنا میں سے نہیں۔ (کیونکہ بیٹوں کی سو جوگی میں دادا کے مال کا پوتا وارث نہیں بن سکتا) نتیجہ ہر تقدیر پر رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ”کیا عقل نے ہمارے اترنے کے لئے کوئی جگہ چھوڑی ہے؟“ کی تاویل واجب ہے۔ اور جو تاویل میں نے ذکر کی ہے وہی اولیٰ اور موزوں ہے کیونکہ اگر ہم تسلیم بھی کر لیں کہ حضرت علی اور حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہما حضرت ابوطالب کے وارث نہیں اور عقل کیا ان کا وارث تھا۔ تب بھی حضور نبی کریم ﷺ جس طرح عاریتہ حضرت علی اور جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حصہ میں اتر سکتے تھے اسی طرح عقل کی ملکیت میں بھی عارضی قیام فرما سکتے تھے۔

یعنی اور جو مسجد حرام میں تاق زنیادی کا ارادہ کرے چاہے مسجد حرام سے مراد فقط مسجد ہو یا سارا حرم ہو تو ہم اسے دردناک عذاب چکھائیں گے۔ ترکیب کلام میں بعض نے کہا ہے کہ بالحد مفعول ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہے اور اس میں بآزاندہ ہے۔ جیسا کہ اس ارشاد میں ہے نسبت بالدھن۔ اسی طرح غمش کا قول ہے ضمنت بوزق عیالنا اور ما احتلنا (1)۔ اس میں بھی بآزاندہ ہے۔ اور بظلم ظرف لغو بورد کے متعلق ہے۔ یا بظرف مستقر ہے اور الحدی کا صفت ہے یا پھر بورد کے فاعل سے حال ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ بورد مفعول محذوف ہے جو یہ شامل ہونے کو شامل ہو سکتا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے من بورد قولاً او فعلاً۔ اس ترکیب کے اعتبار سے بالحد بظلم دونوں حال مترادف ہیں۔ یا حرف جار کے اعادہ کے سبب دوسرا پہلے سے بدل ہے۔ یا پھر اس کا صلہ ہے۔ یعنی یلحد بسبب الظلم۔ (جو ظلم کے سبب زیادتی کرے گا) یعنی جو بھی فعل منی عنہ کا ارتکاب کرے اگرچہ وہ خادم کو گالی گلوچ دینا ہی ہو۔

یٰذٰلِذٰلِکَ مِنْ عَذَابِ اٰلِیْمٍ یٰمَنْ کَا جَوَابِ شَرْطٍ ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تین آدمی اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض ہیں، حرم پاک میں زیادتی کرنے والا، اسلام میں طریقہ جاہلیت کو چاہنے والا اور بغیر حق کے کسی آدمی کا خون بہانے والا (2)۔

ترجمہ ”حاکم“ بیہقی نے المدخل میں اور زرین نے اپنی کتاب میں حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حدیث

نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا چترم کے آدمی ہیں جن پر میں نے لعنت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ان پر لعنت ہے اور ہر مستحباب الدعوات نبی علیہ السلام کی جانب سے بھی۔ (1) کتاب اللہ میں اپنی طرف سے اضافہ کرنے والا۔ (2) نقد برائی کو جھٹلانے والا۔ (3) بالجبر حکومت کرنے والا کہ وہ اپنے اقتدار کے سبب ایسے آدمی کو عزت دے دیتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ذلیل کیا ہے اور اسے وہ ذلیل و رسوا کر دیتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے عزت دی ہے۔ (4) اللہ تعالیٰ کے حرم کو حلال سمجھنے والا۔ (5) میری عزت (اہل بیت اطہار) جس کی تذلیل و حقارت کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے کو حلال خیال کرنے والا۔ (6) اور میری سنت کو چھوڑنے والا۔ (1)۔ حاکم نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اسی طرح مرفوع روایت نقل کی ہے۔

مذکورہ دونوں حدیثیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ مسجد حرام سے مراد حرم پاک ہے۔ کیونکہ حرم پاک کو حلال سمجھنا اور اس میں ظلم و زیادتی کرنا حرام ہے چاہے وہ مسجد میں ہو یا مسجد سے باہر ہو۔

الحاد کا لغوی معنی النسیل و العذوؤن عن قصد السبیل ہے۔ یعنی کج روی اختیار کرنا ایک جانب جھک جانا اور میانہ روی (صراط مستقیم) سے پھر جانا۔ مجاہد اور قتادہ کے قول کے مطابق یہاں الحاد سے مراد شرک کرنا اور غیر اللہ کی عبادت کرنا ہے۔ علماء کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہر وہ شئی ہے جو ممنوع ہو چاہے اس کا تعلق قول سے ہو یا فعل سے اگرچہ وہ خادم کو سب و شتم کرنا ہی ہو (2)۔

عطاء نے کہا ہے کہ اس سے مراد حرم پاک میں پھر احرام کے داخل ہونا ہے اور وہاں ایسی چیزوں کا ارتکاب کرنا ہے جو حرم پاک میں ممنوع ہیں مثلاً شکار کو کول کرنا اور درخت کو کاٹنا (3)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہے کہ الحاد سے مراد حرم پاک میں تیرا اس آدمی کو قتل کرنا ہے جو تیرے قتل کا ارادہ نہ رکھتا ہو اور تیرا ایسے آدمی پر ظلم کرنا ہے جو تجھ پر ظلم کا ارادہ نہ رکھتا ہو۔ ضحاک کے قول کا بھی یہی مفہوم ہے۔ مجاہد نے کہا ہے کہ مکہ مکرمہ میں گناہوں کی سزا بھی کئی گنا بڑھا دی جاتی ہے جیسے وہاں نیکیوں کا اجر کئی گنا بڑھا دیا جاتا ہے۔ حسیب بن ابی ثابت کا قول ہے کہ الحاد سے مراد مکہ مکرمہ میں کھانے (کی اشیاء) کو ذخیرہ اندوز کرنا ہے (4)۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد باری تعالیٰ عن یؤذ فیہ بالحداد بظلم نذقة من عذاب الیم کی وضاحت میں کہا ہے کہ صحابہ کرام فرماتے تھے وہ آدمی جس نے صرف گناہ کا قصد کیا تو وہ گناہ اس کے نامہ اعمال میں اس وقت تک نہیں لکھا جاتا جب تک کہ وہ اس کا ارتکاب نہ کرے۔ اور اگر مکہ مکرمہ میں کسی نے دوسرے آدمی کو قتل کرنے کا ارادہ بھی کیا اگرچہ وہ آدمی عدل یا کسی اور شہر میں ہو تب بھی اللہ تعالیٰ اسے درناک عذاب پکھائے گا (5)۔ (یعنی مکہ مکرمہ میں گناہ کا ارادہ بھی قابل مواخذہ ہے) سمدی کہتے ہیں کہ اگر اس آدمی نے گناہ کا ارادہ کرنے کے بعد اس سے توبہ کر لی تو پھر اس کا مواخذہ نہیں ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے روایت ہے کہ آپ کے دو خیمے تھے ایک مقام صل میں تھا اور دوسرا حرم پاک میں۔ جب آپ اپنے گھر والوں کو متابع اور سرزنش کرنا چاہتے تو انہیں اس خیمے میں جا کر متابع کرتے جو مقام صل میں تھا۔ جب اس کے بارے آپ سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا ہم یہ گفتگو کرتے تھے کہ کسی آدمی کا حرم پاک میں سکنا واللہ اور بلی واللہ کہنا بھی الحاد اور بے دینی ہے (6)۔

1- شعب الایمان، جلد 3، صفحہ 334 (اعلیٰ)

2- تفسیر بنوری، جلد 4، صفحہ 109 (الفلک)

3- ایضاً

4- ایضاً

5- ایضاً

6- ایضاً، صفحہ 110

وَ اِذْ بَوَّأْنَا لِاِبْرٰهٖمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَا تُشْرِكَ بِيْ شَيْئًا وَّ صَهْرًا بَيْنِيْ
لِاِيْمًا يٰقِيْنُ وَاَلْقَا بَيْنِنَا وَ الرُّكْمَ السُّجُوْدِ ۝

”اور یاد کرو جب ہم نے مقرر کر دی ابراہیم (علیہ السلام) کیلئے اس گھر کے (تعمیر کرنے) کی جگہ اور حکم دیا کہ شریک نہ ٹھہرانا میرے ساتھ کسی چیز کو اور صاف ستھرا رکھنا میرے گھر کو جس طواف کرنے والوں کی قیام کرنے والوں اور کورج و سجود کرنے والوں کیلئے ہے“

اور یاد کرو جب ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کیلئے ایک معین جگہ مقرر فرمادی اور ہم نے اسے آپ کے لئے گھر تعمیر کرنے کی جگہ قرار دیا۔ سواہ کا معنی ہے منزل (اترنے کی جگہ) از جا ج نے اسی طرح کہا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ لاہور ایسے شہر میں لام زادہ ہے اور مکان طرف ہے۔ اس اعتبار سے معنی یہ ہے کہ جب ہم نے آپ کو معین جگہ میں اتارا۔ قاموس میں ہے بواہ متولا وفيہ انزلہ اس نے فلاں کو مخصوص جگہ اتارا۔ اور سباً کا معنی ہے منزل اترنے کی جگہ قیام کرنے کی جگہ۔ (1)۔ یہاں آیت کریمہ میں مکان البیت اس لئے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ طوفان نوح کے وقت کعبہ اللہ کو آسمان کی طرف اٹھایا گیا تھا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیت اللہ شریف تعمیر کرنے کا حکم ارشاد فرمایا تو وہ نہیں جانتے تھے کہ بنیاد کہاں رکھی جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک ہوا بھیجی جس کا نام ریح فوج تھا۔ تو اس نے آپ کے لئے کعبہ کے ارد گرد بنیاد سے زمین کو الٹ دیا (جس سے بنیادیں ظاہر ہو گئیں) علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح ذکر کیا ہے (2)۔

ابن جریر ابن ابی حاتم اور بیہقی نے دلائل میں سدی سے یہ روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ہوا بھیجی جسے ریح فوج کہا جاتا تھا اور اس کے دو پر اور ایک سر تھا اور وہ سانپ کی صورت میں تھی۔ پس اس سے کعبہ کے ارد گرد بیت اللہ شریف کی پہلی بنیادوں سے زمین کو الٹ دیا (3)۔ (جس سے بنیادیں ظاہر ہو گئیں)

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کلبی کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کی حدود کے مطابق ایک ہوا بھیجی جو بیت اللہ شریف کے مقام پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس میں ایک سر تھا جو یہ ٹھٹھکو کر رہا تھا اے ابراہیم! میری مقدار بیت اللہ شریف بنا دو چنانچہ آپ نے اسی پر بنیاد رکھ دی (4)۔

یعنی ان لا تُشْرِكْ میں اَنْ مصدر یہ ہے جو فعل محذوف سے متعلق ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام سے شرک نہ کرنے کا عہد لیا یا معنی یہ ہے کہ ہم نے اس طرح کیا کہ آپ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ (فلعلنا ذلک لان لا تُشْرِكْ) یا اَنْ مضمر ہے جو بَوَّأْنَا کی تعمیر بیان کرتا ہے۔ کیونکہ یہ تعبد کے معنی کو مضمّن ہے، جبکہ تَبَوَّءَ تعبد کے لئے آتا ہے۔ اور تعبد امر اور نئی دونوں کو شامل ہے۔ لہذا یہ قول کے معنی میں ہے۔ یعنی سے مراد ہے بعبادت۔ (یعنی حکم دیا کہ میری عبادت میں کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرانا) اور میرے گھر کو بتوں اور غلطت سے صاف ستھرا رکھنا۔ نافع حفص اور ہشام نے بیہقی کو یا مفتوح کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقیوں نے اسے یا سمان کے ساتھ پڑھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بیت کی اضافت اپنی طرف کرنا فقط بیت کی تعریف و تعظیم کے اظہار کے لئے ہے۔ اور اس

1- التاموس الحیظ، جلد 1، صفحہ 97 (تراث العربی)

2- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 110 (المنکر)

3- الدر المنکوح، جلد 4، صفحہ 636 (احمدی)

4- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 110 (المنکر)

لئے کہ یہ وہ مقام ہے جو رب کریم کی خصوصی تجلیات کا مہبط ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے کہ کعبہ معظمہ بیت اللہ (اللہ تعالیٰ کا گھر) ہے اس کے باوجود کہ یہ جسم بھی رکھتا ہے اور دکھائی بھی دیتا ہے۔ یہ ایسی حقیقت اور امر کے مشابہ ہے جو بے کیف ہے کیونکہ اس کی دیواریں اور سر زمین کعبہ کی مٹی تحت اثر مٹی تک قبل نہیں۔ کیا آپ یہ جانتے نہیں کہ اگر اس مقام سے اس کی دیواریں اور مٹی گواٹھا کر کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے تو قبلہ یہی پہلا مقام رہے گا، وہ جگہ قطعاً قبلہ نہیں بنے گی جہاں اس کی دیواریں اور مٹی منتقل کی گئی۔ اور اگر کعبہ معظمہ کی جگہ نئی دیواریں کھڑی کر دی جائیں (کعبہ کی تعمیر نو کر دی جائے) اور کسی دوسری جگہ کی مٹی یہاں منتقل کر دی جائے تو پہلے کی طرح مقام قبلہ رہے گا۔ تو اس سے بخوبی یہ جانا جا سکتا ہے کہ قبلہ ایک ایسا امر ہے جس کی کوئی کیفیت نہیں۔ اور وہ رب کریم کی غیر تکلیف تجلیات کی برسات ہے اور ان کا اراک اور وہی کر سکتے ہیں جنہیں اراک کی قوت اور توفیق رب کریم عطا فرماتا ہے۔

جہ طائفین سے مراد وہ لوگ ہیں جو کعبہ معظمہ کے ارد گرد طواف کرتے ہیں۔ رُفْعِ رَايَعِ كِي جَع ہے۔ یعنی رکوع کرنے والے اور مسجود مساجد کی جمع ہے۔ یعنی عہدہ کرنے والے۔ ان دونوں کا ذکر بغیر حرف عطف کے کیا گیا ہے۔ ایک تو اس لئے کہ ان سے مراد نماز پڑھنے والے لوگ ہیں۔ اور دوسرا اس لئے کہ عہدہ کے بغیر فقط رکوع کوئی مشروع عبادت نہیں۔ چونکہ قیام رکوع اور سجود تینوں نماز کے اراکان ہیں اور یہاں نماز کو اپنے اراکان سے تعبیر کیا گیا ہے تاکہ اس پر دلالت ہو جائے کہ ان میں سے ہر ایک مستقل طور پر طہارت کا تقاضا کرتا ہے۔ (اس لئے ان میں سے ہر ایک کے مقام کا پاک ہونا لازم اور ضروری ہے) لیکن روانہ فضل کا نظریہ یہ ہے کہ نماز میں میں طہارت فقط عہدے میں شرط ہے، یعنی پیشانی رکھنے کی جگہ کا پاک ہونا کافی ہے۔ کسی اور کس کے لئے یہ شرط نہیں۔

وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ﴿٢٧﴾ لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ فِي آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْلَمُونَ عَلَى مَا رَزَقْتَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ نَعَلَكُمُوهَا وَأَظْعَمُوا الْبَابِ السَّقِيمِ ﴿٢٨﴾

”اور اعلان عام کر دو لوگوں میں حج لے کا وہ آئیں گے آپ کے پاس پایادہ سے اور ہر ذمی اذنی پر سوار ہو کر جو آتی ہیں ہر دروازہ راستہ سے۔ (اعلان کیجئے) تاکہ وہ حاضر ہوں اپنے (ذمی و نبوی) فائدوں کے لئے۔ اور ذکر کریں اللہ تعالیٰ کے نام کا مقررہ دنوں میں ان بے زبان چوپایوں پر (ذبح کے وقت) جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائے ہیں۔ پس خود بھی کھاؤ ان سے اور کھلاؤ مصیبت زدہ محتاج کو۔“

لے اور لوگوں میں حج کے لئے اعلان عام کر دو اور انہیں اس کے لئے پکارو۔ ظاہر کلام سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا عطف ظہور پر ہے۔ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس طرح روایت نقل کی ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کوچ کے لئے اعلان کرنے کا حکم دیا گیا تو انہوں نے عرض کی کیا میری آواز پہنچ جائے گی؟ تو جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اذن دینا آواز کا حکم پر لازم ہے اور اسے پہنچانا ہمارا ذمہ ہے۔ چنانچہ آپ مقام ابراہیم پر کھڑے ہوئے تو وہ بلند ہو گیا یہاں تک کہ طویل اونچے پہاڑ کی مثل بلند ہو گیا۔ آپ نے اپنی انگلیاں دونوں دونوں میں رکھیں اور چہرے کو دائیں بائیں اور مشرق کی طرف پھیرتے ہوئے (باواز بلند) کہا اے لوگو! بیشک تمہارے رب نے ایک گھر بنایا ہے اور تم پر اس گھر کا حج فرض قرار دیا

ہے۔ پس تم اپنے رب کی دعوت کو قبول کر لو۔ تو وہ تمام افراد (جو قیامت تک حج کی سعادت حاصل کریں گے) انہوں نے اپنے باپوں کی پشتوں اور ماؤں کی رحموں سے یہ جواب دیا لَبَّيْكَ اللَّهُمَّ لَبَّيْكَ (1)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہے کہ سب سے پہلے اہل یمن نے اس دعوت پر لبیک کہی اسی وجہ سے وہاں کے لوگ زیادہ حج کرتے ہیں۔ یہ روایت بھی ہے کہ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام نے جب اہل یمن پر چڑھ کر آواز لگائی تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اس آیت میں الناس سے مراد اہل قبلہ ہیں (2)۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حسن نے یہ گمان کیا ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ وَاقِنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ۔ نیا کلام ہے۔ اور اس میں خطاب حضور نبی کریم ﷺ کو ہے۔ آپ ﷺ کو حجۃ الوداع کے موقع پر یہ اعلان کرنے کا حکم ارشاد فرمایا گیا (3)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خطبہ ارشاد فرمایا اور فرمایا اے لوگو! تم پر حج فرض کر دیا گیا ہے لہذا تم حج کرو (4)۔ احمد نسائی اور دارمی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اسی طرح روایت نقل کی ہے۔

یٰۤاَنفُوكَ جَوَابِ امْرُؤٍ نَیْ وَجْہِ سَیْحَرُومَ ہے۔ یعنی وہ لوگ آپ کی دعوت پر حج کرنے کے لئے آئیں گے۔ عبارت کا مفہوم یہ ہے۔ ان تو ذن یمانوك۔ (تم آواز دو وہ تمہارے پاس آئیں گے)

رَجَالًا یَبِیْلَ جلتے ہوئے۔ یہ راجل کی جمع ہے جیسا کہ قاسم کی جمع قیام اور نام کی جمع نیام ہے۔ یہ نقطہ وقوع پذیر ہونے والے واقعہ کی خبر ہے۔ اس میں قطعاً یہ ذکر نہیں ہے کہ جو لوگ سواری نہ پا سکیں ان پر بھی حج فرض ہے۔ لہذا یہ آیت داؤد ظاہری اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے موقف کے لئے حجت نہیں بن سکتی۔ (ان کے نزدیک حج ان لوگوں پر بھی فرض ہے جن میں سواری میسر نہ ہو) ہم نے ان دونوں کے خلاف سورۃ آل عمران کی آیت وَذِیْبَعْنِی عَلَی النَّاسِ حِجْمَ الْبَیْتِ مَن اسْتَظَلَّ عَلَیْہِمْ سَبِیْلًا۔ کے تحت ان تمام چیزوں کا ذکر کیا ہے جو فرضیت حج کے لئے شرط ہیں اور انہی میں یہ بھی ہے کہ حج فرض ہونے کے لئے زاو راہ پر گزار ہونا اور سواری کا موجود ہونا شرط ہے۔

مسئلہ: امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک افضل یہ ہے کہ جو بیڈل چلنے کی قدرت رکھتا ہو اسے چاہئے کہ وہ بیڈل چل کر حج کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بیڈل چل کر آنے کا ذکر سوار ہو کر آنے سے پہلے کیا ہے۔ اور اس لئے بھی کہ بیڈل چلنے میں مشقت اور تکلیف زیادہ ہے اور اس میں تواضع اور خشوع و خضوع بھی زیادہ ہے۔ کیونکہ جس نے بیڈل چل کر حج کرنے کی نذر مانی اس پر رسول اللہ ﷺ نے بیڈل حج واجب قرار دیا ہے اور نذر پوری کرنے کی صورت میں جانور کی قربانی واجب قرار دی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حج میں بیڈل چلانا طاعت و عبادت ہے اور طاعت کا کم سے کم درجہ نسیب (ستہب) ہے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ سوار ہو کر حج کرنا افضل ہے کیونکہ حج کے دوران بیڈل چلنے سے بہت سی عبادات میں خلل واقع ہوتا ہے۔ اور دین اسلام میں رہبانیت جائز نہیں۔

سے اور ہر دہلی اونٹنی پر سوار ہو کر جو ہر دور دراز راست سے آتی ہیں۔ ضامر سے مراد ایسا کمزور اور نحیف اونٹ ہے جسے سفر کی دور نے تھکا دیا ہو اور اسی بعد مسافت کے سبب وہ کمزور ہو گیا ہو۔

ابن جریر نے مجاہد کا بیان نقل کیا ہے کہ حجاج کرام سوار نہیں ہوتے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی یا تَتَوَكَّرُ رِجَالًا وَ عَلِيٌّ مَثَلِيٌّ ضَافِرٌ تُوَّأْتِ نَفْسٌ زَادَرَاهُ سَاحَتْهُ لَانَةَ كَالْحَمِّ ارشاد فرمایا اور ساتھ ہی انہیں سوار ہونے اور دوران سفر تجارت کرنے کی رخصت بھی عنایت فرمادی۔

یَابِتَيْنِ ضَاغِرٍ کی صفت ہے چونکہ ضامر کی طرف لفظ کل مضاف کیا گیا ہے اس لئے اس کے معنی کا لحاظ رکھتے ہوئے یابیتین صحیفۃ مؤنث کے ساتھ اس کی صفت ذکر کی گئی ہے۔ یا پھر یہ کل کی صفت ہے۔ اس صورت میں بھی معنی کا اعتبار کرتے ہوئے صیغہ مؤنث لایا گیا ہے۔ یعنی یا تَتَوَكَّرُ عَلِيٌّ مَثَلِيٌّ ضَافِرٌ يَابِتَيْنِ اِنِّى مَعْنَى مَرَّ مَخُونًا لِأَنِّ يَبْعُجُ۔ (دو حج کرنے کیلئے آپ کے پاس ہر اس دہلی اونٹنی پر سوار ہو کر آئیں گے جو مکہ مکرمہ کی طرف آتی ہیں) فَخَبَّ عَجْمِي كَالْحَمِّ بِهٖ دَوْرًا زَارَةً۔
 يٰ لَيْسَ هٰذِهِ الْبَوَانُ کے متعلق ہے یا پھر یا تَتَوَكَّرُ کے معنی تاکہ وہ اپنے دینی یا دنیوی منافع کے لئے حاضر ہوں۔ منافع کو کرہ اس لئے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہاں اس سے مراد منافع کی وہ خاص نوع ہے جو اس عبارت (حج) سے حاصل ہوتی ہے۔
 حضرت محمد بن علی بن حسین بن علی الباقری علیہ السلام اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا ہے کہ یہاں منافع سے مراد غنم اور مغفرت ہے (1)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے اللہ تعالیٰ (کی رضا) کیلئے حج کیا اور دوران حج نے بخش گوئی کی اور نہ ہی فسق و فجور کا ارتکاب کیا تو وہ (اس طرح گناہوں سے پاک ہو کر) واپس لوٹے گا گویا آج ہی اس کی ماں نے اسے جنم دیا ہے۔ متفق علیہ (2)۔

سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ منافع سے مراد تجارت ہے (3)۔ یہی روایت زید کے واسطے سے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی مروی ہے کیونکہ آپ نے منافع کا مفہوم اسواق (بازار) بیان کیا ہے۔

مجاہد کا قول ہے کہ اس سے مراد تجارت اور ہر وہ دنیوی یا اخروی امر ہے جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے (4)۔

یہ اور ذکر کریں اللہ تعالیٰ کے نام کا مقررہ دنوں میں ان بے زبان چوپائیوں پر (ذبح کے وقت) جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائے ہیں۔ تو اس میں ذکر ذبح اور خمر سے کنایہ ہے کیونکہ تمام ذہابح کے حلال ہونے کے لئے ذبح کے وقت ان پر اللہ تعالیٰ کے نام کا ذکر کرنا شرط ہے اور ساتھ ہی اس بات پر تنبیہ بھی ہے کہ اس عمل سے مقصود فقط قرب الہی کا حصول ہے۔

انہام معلومات سے مراد ذوالحجہ کے دس دن ہیں۔ اکثر مفسرین کا یہی قول ہے اور انہیں معلومات اس لئے کہا گیا ہے تاکہ انہیں جاننے اور ان کا حساب رکھنے پر براہین کیا جائے کیونکہ ان کے اختتام پر حج ادا کرنے کا وقت ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہام معلومات سے مراد قربانی کا دن (یوم نحر دسویں ذی الحجہ کا دن) اور اس کے بعد کے تین ایام ہیں (5)۔

حضرت عطاء حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ روایت کرتے ہیں کہ ان سے مراد نویں دسویں ذی الحجہ کے دن اور لایا م تشریق ہیں۔ مقال نے کہا ہے معلومات سے مراد صرف ایام تشریق ہیں (6)۔

بہیمۃ الانعام سے مراد ہدی اور قربانی کے جانور ہیں چاہے قربانی واجب ہو یا مستحب۔ کیونکہ یہ نص مطلق ہے، فعل کو موزون

1- تفسیر بخاری، جلد 4، صفحہ 111 (القر)

2- صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 245 (ذات تعلیم)

6- ایضاً

5- ایضاً

4- ایضاً

3- تفسیر بخاری، جلد 4، صفحہ 111 (القر)

سے معلق کیا ہے اور مردوق کی وضاحت بہیمۃ الانعام سے کی ہے، ایک تو اس لئے تاکہ تقرب الہی پر براہِ مختہ کیا جائے اور دوسرا اس پر تنبیہ کرنے کے لئے کہ ذکر الہی کے تقاضوں کو پورا کیا جائے۔

اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ دم احصار کے علاوہ کسی قربانی کو یومِ نحر اور اس کے بعد کے تین ایام کے سوا کسی دن ذبح کرنا جائز نہیں۔ (دم احصار سے مراد یہ ہے کہ حاجی کو احرام باندھنے کے بعد کسی دشمن کی جانب سے بالجبر راستے میں روک لیا جائے یا کسی اور سبب سے اسے کعبہ معظمہ تک پہنچنے کی اجازت نہ دی جائے تو اس کے لئے اسی جگہ اپنا احرام کھول کر قربانی کا جانور ذبح کر دینا جائز ہے۔) اسی قربانی کو دم احصار کہا جاتا ہے۔ تفصیلات کتب فقہ میں دیکھئے) ہمارا موقف یہ ہے کہ ایامِ معلومات کی قید محض اتفاق ہے۔ (کیونکہ عام قربانی مقررہ دنوں میں ہی ہوتی ہے) اور مفہوم مخالف کے ہم قائل نہیں ہیں (کہ یہ کہہ دیں کہ جو قربانی ان ایام میں نہ کی جائے وہ ناجائز ہے) اس آیت کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ جیسا کہ اوپر ہم حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اقوال ذکر کر چکے ہیں۔

اور ہماری دلیل یہ ہے کہ ظنی نذر مانی ہوئی اور کفارہ کی حدی کے لئے یومِ نحر اور ایامِ تشریق کا ہونا شرط نہیں کیونکہ صحیح روایت ہے کہ جب حدیبیہ کے سال حضور نبی کریم ﷺ عمرہ کے ارادہ سے مدینہ طیبہ سے چلے تھے تو آپ ﷺ یومِ نحر تک مکہ مکرمہ میں ٹھہرنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتے تھے۔ لہذا یہ روایت صراحتاً اس پر دلالت کرتی ہے کہ ذوالقعدہ میں ظنی قربانی کا جانور ذبح کرنا جائز ہے۔ تو جب یہ ثابت ہو گیا کہ یومِ نحر کے سوا بھی قربانی کرنا طاعت اور عبادت ہے۔ اور طاقت مقصودہ نذر کے سبب واجب ہو جاتی ہے۔ تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ نذر کی قربانی بھی ایامِ نحر کے علاوہ دوسرے ایام میں ذبح کرنا جائز ہے۔ اسی طرح ہمارے نزدیک حکاکر کرنے کے سبب لازم ہونے والی قربانی اور کفارات کی قربانی کو ذبح کرنا نحر کے ساتھ محض نہیں کیونکہ کفارہ کی قربانی بھی عبادت ہوتی ہے تو جب اس کا عبادت ہونا ثابت ہے تو پھر اس کا دیگر ایام میں ذبح کرنا بھی جائز ہے۔ اور حکاکر کی جزاء کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اھذینا بنایغ الخھبۃ یہ بھی مطلق ذکر ہے ایسے یومِ نحر کی قید نہ کرئیں۔ اور کتاب اللہ کے مطلق حکم کو اپنی جانب سے مقید کرنا جائز نہیں کیونکہ ایسا کرنا تو مطلق حکم کو منسوخ کرنا ہے لیکن حج قرآن اور حج تمتع کی قربانی یومِ نحر کے ساتھ محض ہے۔ اسی طرح امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دم احصار بھی یومِ نحر کے ساتھ محض ہے۔ لیکن امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا آپ سے اختلاف ہے۔ دونوں مسلوں کا تفصیل ذکر سورۃ بقرہ کی اس آیت کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔

وَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُفِّرُوا بِنَفْسِكُمْ وَأَنْتُمْ كَانُوا أَكْفَرًا مِمَّا كَانُوا
 أَسْتَيْسِرُ مِنَ الْهَيْدَىٰ ۚ..... إِلَىٰ قَوْلِهِ فَمَنْ تَشَاءُ مِنَ الْهَيْدَىٰ إِلَىٰ الْيَوْمِ فَلِمَ اسْتَيْسِرُ مِنَ الْهَيْدَىٰ۔

یعنی ان سے خود بھی کھاد اور مصیبت زدو حجاج کو بھی کھلاؤ۔ یہ امر احتیاب کے لئے ہے جو ب کے لئے نہیں اس پر تمام کا اجماع ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ امر اباحت کے لئے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ اس لئے فرمایا ہے کیونکہ زمانہ جاہلیت کے لوگ اپنی قربانیوں کا گوشت نہیں کھایا کرتے تھے۔

مسئلہ: اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ جب ظنی حدی ہو تو قربانی کرنے والے کے لئے اس کا گوشت کھانا جائز ہے اور اس کی دلیل وہ طویل حدیث ہے جو حجۃ الوداع کے بیان میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ اس میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ یمن سے قربانی کے لئے کچھ اونٹ لے کر آئے اور رسول اللہ ﷺ نے قربانی کی غرض سے اونٹ اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان میں سے

ترتیباً آپ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے ذبح کئے۔ باقی ماندہ اونٹ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سپرد کر دیئے جنہیں آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ذبح کیا۔ اس طرح آپ ﷺ نے اپنی قربانی میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی شریک کر لیا۔ پھر آپ ﷺ نے ہر قربانی سے گوشت کا ایک ایک ٹکڑا لینے کا حکم ارشاد فرمایا (چنانچہ ایسا ہی کیا گیا) اور پھر اسے ہانڈی میں ڈال کر پکایا گیا، بعد ازاں حضور نبی کریم ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں نے یہ گوشت تناول فرمایا اور اس کا شورہ پونش فرمایا، اسے مسلم نے روایت کیا ہے (۱)۔ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ (نظری) قربانی کا گوشت کھانا مستحب ہے کیونکہ اگر اپنی قربانی سے کھانا مستحب نہ ہوتا تو حضور نبی کریم ﷺ ہر اونٹ سے گوشت لینے کا حکم ارشاد نہ فرماتے بلکہ ایک ہی اونٹ سے گوشت لینا کافی ہوتا۔

مسئلہ: اس پر تمام علماء متفق ہیں کہ وہ جانور جو شکار کی جڑاء کے طور پر قربان کیا جائے اس کا گوشت (قربانی کرنے والے کے لئے) کھانا جائز نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شکار کی جڑاء شکاری کا بدل ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿فَصَدَقَٰتُہُمْ مَّا قَتَلُوا مِنْ الشَّيْءِ﴾ اور ہم سورہ بقرہ کی تفسیر میں ممالک کے بیان میں یہ ذکر کر چکے ہیں کہ شکار کی جڑاء یا صورت شکاری کی شکل ہوتی چاہئے یا پھر قیمت کے اعتبار سے اس کی شکل ہوتی چاہئے تو جب شکار آدمی پر حرام ہے تو پھر اس کا بدل بھی اسی کی طرح حرام ہوگا۔ جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ یہود کو ہلاک و برہاد کرے! کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان پر چھ بیاں حرام قرار دیں تو وہ انہیں اکٹھا کرتے رہے اور پھر (پگھلا کر) اسے فروخت کر دیتے اور اس کی قیمت کھا لیتے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے (۲)۔

اسی طرح جمہور علماء کے نزدیک نذر مانے ہوئے جانور کا گوشت کھانا بھی جائز نہیں۔ مگر اس میں حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف ہے۔ اسی طرح جمہور کے نزدیک ان قربانیوں کا گوشت کھانا بھی جائز نہیں جو جنایات کے سبب یا حج کو فاسد کرنے کے سبب آدمی کے ذمہ واجب الادا ہوتی ہیں۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت ہے اور یہی مسلک اہل حق کا بھی ہے کہ آدمی شکار کی جڑاء اور نذر مانے ہوئے جانور کی قربانی کا گوشت نہیں کھا سکتا۔ علاوہ ازیں ہر قسم کی قربانی کا گوشت کھا سکتا ہے (۳)۔ اسی طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے معلق روایت نقل کی ہے۔ چونکہ شکار کی جڑاء کے طور پر ذبح کئے جانے والے جانور کا گوشت کھانا حرام ہے۔ اس لئے اسی پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ کفار جنایات اور نذر مانے ہوئے جانور کی قربانی کا گوشت کھانا بھی حرام ہے۔ اس مسئلہ پر اجماع ہے۔ جامع بات یہ ہے کہ کفار جنایات اور نذر مانے ہوئے جانور کی قربانیوں کو شکار کی جڑاء پر قیاس کرنا درست ہے۔ لہذا کفار کے طور پر ذبح کئے جانے والے جانوروں کے تمام اجزاء مکمل طور پر مستحقین کے حوالے کئے جانے چاہئیں۔ لیکن نذر مانے ہوئے جانور کی قربانی کو شکار کی جڑاء پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔ (کیونکہ یہ کسی جرم کے بدلے آدمی کے ذمہ واجب الادا نہیں ہوتی) مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ نذر یہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ جانور جس کی نذر مانی گئی ہے اس کا گوشت اپنے تمام اجزاء کے ساتھ مستحق کے حوالے کر دیا جائے لہذا قربانی کرنے والا اس سے کوئی حصہ نہیں کھا سکتا)

مسئلہ: اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ قربانی کا گوشت کھانا قربانی کرنے والے کیلئے جائز ہے۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے

2- صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 232 (وزارت تعلیم)

1- صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 399 (قدیمی)

3- مشکوٰۃ المصابیح، جلد 2، صفحہ 130۔ حدیث: 2766 (المنکر)

قول کی دلیل یہ ہے کہ قربانی کرنا عبادت و طاعت ہے اور حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ حدیث نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قربانی کا گوشت کھاؤ (دوسروں کو) کھلاؤ اور (اپنے پاس) ذخیرہ کر کے رکھ لو۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔

اور حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر علماء کا یہ کہنا ہے کہ یہ قربانی مستحب اور مسنون ہے۔ اور ہم نقلی قربانی کا گوشت کھانے کے جواز پر اجماع پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ (لہذا بالاتفاق عام قربانی کا گوشت قربانی کرنے والے کیلئے کھانا جائز ہے)

مسئلہ: حج تمتع اور حج قرآن کی قربانی کے بارے علماء کے مابین اختلاف ہے۔ امام عظیم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ یہ فرماتے ہیں کہ ان کی قربانی کا گوشت کھانا قربانی کرنے والے کے لئے جائز ہے کیونکہ یہ قربانی عبادت و طاعت ہے اور ہم اس سے قبل حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ذکر کر چکے ہیں کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حکم ارشاد فرمایا ہر ذبح شدہ اونٹ سے گوشت کا ایک ایک کھلا لے پھر اسے ہانسی میں ڈال کر پکایا گیا تو پھر دونوں نے وہ گوشت تناول فرمایا اور اس کا شورہ نوش فرمایا۔

علامہ ابن جوزی نے استدلال کرتے ہوئے ذکر کیا ہے کہ عبدالرحمن بن ابی حاتم نے اپنی سنن میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث نقل کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حج تمتع کی قربانی کے بارے حکم ارشاد فرمایا کہ اس کا گوشت صدقہ کر دیں سوائے اس کے جو ہم کھالیں۔ (یعنی کھانے سے جو گوشت بچ جائے اسے میں صدقہ کر دوں) تو یہ روایت صراحتاً اس پر دلالت کرتی ہے کہ حج کی قربانی کا گوشت قربانی کرنے والے کے لئے کھانا جائز ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حج تمتع اور قرآن کی قربانی کا گوشت اور ہر واجب قربانی کا گوشت کھانا جائز نہیں، چاہے تو اس نے نذر کے سبب اس نے خود اپنے اوپر واجب کی ہو یا پھر کسی اور سبب سے اس پر واجب ہوگی ہو۔ آپ نے اپنے موقف کے حق میں تین احادیث سے استدلال کیا ہے ان میں سے ایک حدیث حضرت ناحیہ خزاعی کی ہے کہ آپ ہی غزوہ حدیبیہ میں رسول اللہ ﷺ کے قربانی کے اذنوں کو لانے والے اور ان کے محافظ تھے۔ دوسری حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی ہے اور تیسری حدیث حضرت دوہب بن حلمہ کی ہے۔ ہم نے یہ تینوں احادیث اور ان کے جوابات سورۃ البقرہ آیت ۱۹۱ قَسَمَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ بِالْحَقِّ اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ۚ فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا اُولِيْ اَلْبَاسِ ۗ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ میں ذکر کر دیئے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ ظاہر آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ قربانیوں کا گوشت کھانا جائز ہے، چاہے تو وہ قربانیاں واجب ہوں۔ حج تمتع اور قرآن کی قربانی۔ یا وہ نفل ہوں جیسا کہ ہم نے لفظ کے مطلق ہونے سے اس جانب اشارہ کر دیا ہے۔ پھر اس عام حکم سے اجماع کے سبب نذر مانی ہوئی قربانی کا حکم خاص کر دیا گیا ہے یا پھر اس طرح کہا جائے گا کہ یہ حکم حج کے بارے ہے اور نذر مانی ہوئی قربانی کا تعلق حج کے باب سے نہیں۔ البتہ شکار کی جزاء اور کفار کے سبب واجب ہونے والی قربانیاں اگرچہ حج کے باب سے ہیں لیکن مسلمان کی ظاہر حالت یہ تھا صاف کرتی ہے کہ وہ اس دوران حرام کردہ چیزوں سے اجتناب کرے۔ لہذا اس آیت کا مراد یہ قربانیاں نہیں ہو سکتیں کیونکہ یہاں حکم حج مبرور کا دیا گیا ہے۔ (جو ہر قسم کی جنائت کی آلائش سے مبرا اور پاک صاف ہو) واللہ اعلم۔

الباؤس سے مراد وہ شخص ہے جس کا فقر شدید ہو اور البؤس کا معنی شدت احتیاج کا ہونا اور انہما کی نادار ہونا ہے۔ اور الفقیر یہاں تو البؤس سے بدل ہے یا پھر اس کے لئے عطف بیان ہے۔

ثُمَّ لِيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلِيُوفُوا وِدَّاءَهُمْ وَلِيَبْطِئُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ﴿١٩١﴾

”پھر چاہئے کہ دو رکعتیں اپنی مثل پکیں۔ اور پوری کریں اپنی نذر میں۔ اور طواف کریں ایسے گھر کا جو بہت قدیم ہے۔“
 ۱۔ ورنہ ابو عمرو ذہبی نے لِقَطْوُا کی لام کو کسور پڑھا ہے، جبکہ باقیوں نے اسے ساکن پڑھا ہے۔ معنی یہ ہے کہ انہیں چاہئے وہ اپنی مثل پکیں دو رکعتیں۔ اس طرح کہ سر کا حلق کر لیں، انہیں کانیں ناخن تراشیں، بظلوں اور زیر ناف بال صاف کریں۔ یہ تمام کام طواف زیارت سے پہلے احرام کھول کر کئے جاسکتے ہیں۔ محرم پر حلق کرانے کے بعد سوائے عورتوں کے تمام چیزیں حلال ہو جاتی ہیں۔ اور طواف زیارت کے بعد عورتوں کی قربت بھی حلال ہو جاتی ہے۔ مفسرین نے اسی طرح کہا ہے۔

تضامہ مثل میں فعل اور ادا کے معنی میں ہے۔ یعنی کوئی کام کرنا اور ادا کرنا۔ جیسے کہا جاتا ہے قَضَى ذَنْبَهُ (اس نے اپنا فرض چکا دیا) اور ارشاد باری تعالیٰ ہے قَدْ اَذْهَبْتُمْ ثَمَنَ الْبَيْتِ كُلِّكُمْ (جب تم اپنے مناسک ادا کر چکو) اور قَضَىٰ عَنْ سَبْعَةِ سُبُوَاتٍ (اس نے انہیں سات آسمان بنا دیا) (چونکہ کام ہو چکے کے بعد اس سے فراغت حاصل ہو جاتی ہے) اس لئے تضامہ کو کسی کام سے فارغ ہونا مستلزم ہے۔ جیسا کہ اس کی تائید اللہ تعالیٰ کی اس ارشاد سے ہوتی ہے۔ اَتَيْنَا اَزْجَدْنَ قَضَيْتُمْ (دو مدتوں میں سے جو میں پوری کر چلوں) چونکہ مثل پکیں دو رکعتیں سے اس سے فراغت حاصل ہو جاتی ہے (اس لئے فَرَاغْتُمْ لِقَطْوُا)
 علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم نے فرمایا ہے کہ قضاء النفل سے مراد تمام مناسک حج کو ادا کرنا ہے (۱)۔

مجاہد نے کہا ہے کہ تفت سے مراد مناسک حج کیوں کہ بظلوں اور زیر ناف بال صاف کرنا اور ناخن تراشنا ہے (۲)۔ بعض نے کہا ہے کہ تفت سے مراد ری جمار کرنا ہے۔ پس معنی میںی نظر ہوا کہ ان تمام امور کو کرنا اور ان تمام کو ادا کرنے کا نام تفتاً ہے۔ (یعنی جب تم یہ افعال کر چکو) زجاج کا کہنا ہے کہ تفت کا لفظ اور اس کا معنی ہمیں صرف قرآن کریم سے ملا ہے (۳)۔ یہ لفظ کلام عرب میں عموماً استعمال نہیں ہوتا۔ اور لفظ تم اس پر دلالت کرتا ہے کہ سر کا حلق اور طواف زیارت قربانی سے مؤخر کرنا اور جب ہے۔ پس یہی ارشاد حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کی دلیل ہے کہ ری جمار حج قرآن کرنے والے کی قربانی اور سر کے حلق کے درمیان ترتیب کا لحاظ رکھنا واجب ہے۔ سعید بن جبیر قتادہ حسن اور ثعلبی نے بھی اسی طرح کہا ہے۔

لہذا جس کسی نے عمد آیا خطا اس ترتیب کو ترک کیا اس پر دم (ایک جانور کی قربانی) کو واجب ہوگا۔ کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ جس کسی نے مناسک میں سے کسی عمل کو (اپنی ترتیب سے) مقدم یا مؤخر کیا تو اسے چاہئے کہ وہ ایک جانور قربانی کرے۔ اسے ابن ابی شیبہ نے موقوفاً روایت کیا ہے اور یہ موقوف حکماً مرفوع ہے۔ کیونکہ تضامہ مثل غیر معقول کا ادا کرنا رائے سے نہیں ہو سکتا۔ (یعنی کسی جرم کا تقارہ ای نہیں۔ اور ابن عدی کا قول ہے کہ اس کی حدیث کو وضعاً مثل لکھا جائے گا۔
 تو اس کے بارے ہم یہ کہیں گے کہ وہ صدوق اس طرح ادا کرنا جو عقلاً جرم سے مشابہت نہ رکھتا ہو رائے سے معلوم نہیں ہو سکتا۔ بالیقین حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ قول حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سنا ہوگا)

اور اگر یہ کہا جائے کہ مذکورہ حدیث کی سند میں ایک راوی ابراہیم بن مہاجر ہے جسے ابو حاتم نے منکر الحدیث کہا ہے۔ ابن مذہبی نے اور سائے نے اس کے بارے کہا ہے وہ قوی (صحیح بولنے والا) راوی ہے اور کبار تابعین میں سے ہے اور مسلم نے اس کا متابع بھی ذکر کیا ہے۔ سفیان احمد اور ابن مہدی نے اس کے بارے لا باس بہ (اس میں کوئی عرج نہیں) کہا ہے۔ پھر یہ حدیث فقط اسی راوی پر منحصر نہیں

بلکہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ایک اور سند سے بھی ذکر کیا ہے اور وہ سند یہ ہے۔ قال حد ثنا وہیب عن ایوب عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ منہ اس کے بعد مذکورہ حدیث نقل کی ہے (اور اس سند میں ابراہیم بن مہاجر نام کا کوئی راوی نہیں) امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مناسک کی ادائیگی میں ترتیب واجب ہے اور جس نے جان بوجھ کر ترتیب کو چھوڑ دیا اس پر دم واجب ہوگا۔ لیکن ترتیب کا جو دم عدم علم اور نسیان کے سبب ساقط ہو جاتا ہے۔ (یعنی اگر بھول کر یا نادانانہ قیامت کی بناء پر ترتیب قائم نہ رہی تو پھر دم واجب نہیں ہوگا) ائمہ نے آپ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا کام بھی اسی پر دلالت کرتا ہے اور سب قول میرے نزدیک فتویٰ کے لئے پسندیدہ ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور کثیر علماء مفسک کا نظریہ یہ ہے کہ ترتیب سنت ہے واجب نہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حلق کوری جمار اور قربانی کا جانور ذبح کرنے پر مقدم کرنا جائز نہیں۔ اسی کی مثل امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول بھی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں قربانی ذری جمار حلق اور تقدیم و تاخیر کے بارے عرض کی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کوئی حرج نہیں۔ یہ روایت متفق علیہ ہے (1)۔

بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ قربانی کے منہ منی میں حضور نبی کریم ﷺ سے سوال کئے جا رہے تھے اور آپ ﷺ جواباً فرما رہے تھے کوئی حرج نہیں۔ پس ایک آدمی نے عرض کی میں نے قربانی کا جانور ذبح کرنے سے قبل حلق کرایا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کوئی حرج نہیں، اب ذبح کر لے (2)۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک آدمی حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا عرض کی میں نے ربی جمار سے قبل طواف زیارت کرایا ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کوئی حرج نہیں۔ اس نے پھر عرض کی میں نے ربی جمار سے پہلے قربانی کا جانور ذبح کرایا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کوئی حرج نہیں (3)۔ طہرانی نے اس طرح روایت نقل کی ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں نے ربی جمار سے قبل بیت اللہ شریف کا طواف کرایا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اب ربی کر کوئی حرج نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے صراحت یہ ثابت ہے کہ اس نے قربانی کا جانور ذبح کرنے سے قبل طواف کرنے کے بارے آپ سے سوال کیا تھا۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی روایت کیا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے استدلال اس طرح کیا ہے کہ اگر ترتیب واجب ہوتی تو حضور نبی کریم ﷺ انہیں ان مناسک کے اعادہ کا حکم ارشاد فرماتے جو انہوں نے مقدم کئے تھے کیونکہ یوم نحران مناسک کو ادا کرنے کا وقت تھا۔ یا پھر حضور نبی کریم ﷺ انہیں جانور ذبح کرنے کا حکم ارشاد فرماتے۔ (یعنی ان پر دم واجب کرتے) اور اگر آپ ﷺ نے انہیں ان میں سے کسی شئی کا حکم دیا ہوتا تو وہ بالیقین ہماری جانب نقل کیا جاتا۔ ایک تو اس لئے کہ اس واقعہ میں کثیر تعداد میں مخلوق شریک تھی اور ان میں ہر ایک مناسک کی حفاظت اور ان کی تبلیغ کا حریص تھا لیکن جب ایسی کوئی روایت منقول نہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے کوئی ایسا حکم ارشاد نہیں فرمایا۔ اور جب کوئی حکم ارشاد نہیں فرمایا تو اس سے معلوم ہوا کہ ترتیب واجب نہیں۔ کیونکہ یہ تو حاجت اور ضرورت کا وقت تھا اور

حاجت کے ہوتے ہوئے واجب کی تبلیغ ترک کرنا محال ہے۔ پس اس سے یہ معلوم ہوا کہ ترتیب واجب نہیں۔ اور جب یہ واجب نہیں تو پھر اسے عمد ترک کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس واقعہ کے راویوں میں ایک راوی حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ حالانکہ آپ نے ہی فرمایا ہے کہ جس کسی نے مناسک میں سے کوئی شئی مقدم و مؤخر کی تو اسے چاہئے کہ وہ ایک جانور قربانی کرے اور اگر راوی کا قول اپنی روایت کے خلاف ہو تو وہ روایت مجروح ہوتی ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ راوی ایسی روایت پر مطلع ہے جو اس پہلی روایت کی ناخ ہے۔ لیکن یہ قول امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی تردید کے لئے کافی نہیں کیونکہ آپ کے نزدیک اگر راوی کا قول اپنی روایت کے خلاف ہو تو وہ حدیث مجروح نہیں ہوتی۔ بلکہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مقرر کردہ اصول کے مطابق بھی یہ ان کے قول کو رد نہیں کرتا۔ کیونکہ راوی کا قول اپنی روایت کے خلاف ہونے کی صورت میں روایت مجروح تب ہوتی ہے جب قول موقوف کو حدیث مرفوعہ کے حکم میں سمجھا جائے تو پھر وہ پہلی روایت کے ناخ کے قائم مقام ہو جاتا ہے لیکن یہاں صورت حال ایسی نہیں ہے۔ (اس لئے آپ کا قول اپنی روایت کے لئے ناخ نہیں)

میں کہتا ہوں کہ جب تک احادیث کے درمیان تطبیق ممکن ہو تو ان میں سے کسی پر عمل ترک کرنے سے ان میں تطبیق کر لینا بہتر ہوتا ہے۔ پس حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول جو کہ مرفوعہ کے حکم میں ہے اور درجہ حسن تک پہنچا ہوا ہے ہم اسے عمد ترتیب ترک کرنے پر محمول کریں گے۔ اور جس روایت سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے استدلال کیا ہے اسے نسیان اور عدم علم پر محمول کریں گے۔ پس ہم کہتے ہیں کہ ترتیب واجب ہے لیکن نسیان اور عدم علم کے سبب ساقط ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک فوت شدہ نمازوں کے درمیان ترتیب واجب ہے لیکن نسیان کے سبب ساقط ہو جاتی ہے۔ روزے کی حالت میں (کھانے پینے وغیرہ سے) رکن واجب ہے لیکن بھول کر کھانے پینے کے سبب یہ وجوب ساقط ہو جاتا ہے (اور روزہ نہیں ٹوٹتا) اسی طرح تکبیرات تشریح واجب ہیں لیکن نسیان کے سبب ساقط ہو جاتی ہیں۔

مسئلہ: امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سرکھلی کرنا واجبہ احرام میں سے ہے، یہ رکن حج نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دیگر علماء نے کہا ہے کہ یہ ارکان حج میں سے ایک رکن ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک ضعیف روایت میں ہے اور امام ابو یوسف امام احمد اور بعض اصحاب مالک نے یہ کہا ہے کہ سرکھلی واجب نہیں بلکہ ایک امر مباح ہے۔

ہماری اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل یہی آیت ہے کیونکہ اس میں تقص (میل پھیل) دور کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے مراد حلق کرنا ہے۔ اور امر وجوب کے لئے ہوتا ہے لہذا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ رکن حج ہوا۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ اس کا ثبوت اگر قطعی آیت طیبہ سے ہے۔ لیکن اس معنی پر آیت کی دلالت تاویل نفسی کے سبب ہے۔ کیونکہ آیت کی تفسیر میں علماء کا اختلاف ہے۔ جس سے معنی کا قطعی اور یقینی ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ (اس لئے یہ رکن نہیں بلکہ واجب ہے) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دلیل بھی دی ہے کہ سرکھلی احرام کی پابندیوں کو ختم کر دیتا ہے (اس کے کھولنے کا سبب ہے) اور احرام حج کا رکن ہے۔ لہذا جس (حلق) کے سبب وہ کھل رہا ہے وہ بھی رکن ہے۔ جیسا کہ نماز میں سلام امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نماز کا رکن ہے۔

ہم یہ کہتے ہیں حج کے لئے احرام کے شرط یا رکن ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ جس سے احرام کھل جاتا ہے وہ بھی رکن ہو یا شرط ہو۔

اسی طرح ہمارے نزدیک لفظ سلام کا رکن نماز ہونا بھی قابل تسلیم نہیں۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ یہ قیاس قیاس مع الفارق ہے کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے سلام کو پھر یہ صلوٰۃ کی ابتدا قرار دیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ تعلیل صلوٰۃ سلام پھیرنا ہے۔ پس اگر سلام نہ پایا گیا اور تحریر یہ کی صورت میں کوئی ایسا علم لایا گیا جو تحریر صلوٰۃ کے منافی ہو تو اس سے تحریر باطل ہو جاتی ہے حالانکہ تحریر یہ نماز کے لئے شرط ہے اور مختلف اقوال کے مطابق نماز کا رکن ہے۔ پس تحریر یہ باطل ہونے سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔ لیکن احرام حج افعال ممنوعہ کے کرنے سے باطل نہیں ہوتا۔ جیسا کہ نماز کا تحریر یہ باطل ہو جاتا ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ وقوف عرفہ سے پہلے جماع کرنا فساد کا موجب ہوتا ہے اور اس پر اس حج کی قضا واجب ہوتی ہے لیکن یہ نہیں ہوتا کہ اس سے احرام باطل ہو جائے اور حج قائم رہے اور اس فساد حالت میں اسے پورا کرنا اس کے ذمے لازم ہو۔ (مذکورہ بحث سے معلوم ہوا کہ احرام کے مسئلہ کو سلام کے مسئلہ پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ اور یہ قیاس حجت نہیں)

مسئلہ: حلق راس کا اول وقت یوم نحر کی فجر جاتی سے شروع ہوتا ہے اور اکثر علماء کے نزدیک یوم نحر کی نصف رات سے شروع ہوتا ہے۔ ہماری دلیل حضرت عروہ بن مضرس کی روایت کردہ حدیث ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو کوئی ہمارے ساتھ مقام مزدلفہ میں اس فجر کی نماز میں حاضر ہو اور آٹھ نایک اس سے قبل دن یا رات کو وقوف عرفہ کر چکا ہو تو اس نے اپنا حج مکمل کر لیا اور وہ اپنا نقف دور کر لے (یعنی سر کا حلق کرالے) اسے اصحاب سخن اربع اور حاکم نے روایت کیا ہے (۱)۔ اور حاکم نے کہا ہے کہ یہ تمام اہل حدیث کی شرائط کے مطابق صحیح ہے۔ لیکن بخاری و مسلم نے اسے صحیحین میں نقل نہیں کیا۔ کیونکہ عروہ بن مضرس سے صرف شععی روایت کرتے ہیں۔ اور ہم نے عروہ بن زبیر کو پایا ہے کہ ان سے بھی یہ حدیث مروی ہے۔

سر کے حلق کے آخری وقت کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ پس امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر علماء نے کہا ہے کہ اس کے لئے کوئی آخری وقت مقرر نہیں۔ پھر ائمہ کے مابین یہ بھی اختلاف ہے کہ آیا حلق کے لئے حرم پاک میں ہونا شرط ہے؟ تو اس کے بارے میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ امام زفر رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر علماء نے کہا ہے کہ حلق کے لئے حرم پاک میں ہونا شرط نہیں۔

اور امام اعظم ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا ہے کہ حلق دو اعتبار سے قابل ذکر ہے، ایک تو اس اعتبار سے کہ یہ احرام کو کھول دینا ہے۔ (یعنی اس کے بعد احرام کی پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں) اور دوسرا اس اعتبار سے کہ یہ مناسک حج میں سے ہے۔ جس اس اعتبار سے کہ یہ احرام کو کھولنے والا ہے اس کے لئے کوئی آخری وقت معین نہیں اور نہ ہی یہ کسی معین جگہ کے ساتھ خاص ہے۔ اور اس اعتبار سے کہ اس کا شمار مناسک حج میں ہے یہ یوم نحر اور حرم پاک دونوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ کیونکہ یہ ایک عبادت ہے جس کا ادراک رائے سے نہیں ہو سکتا۔ لہذا اس کی انہی خصوصیات کا لحاظ رکھا جائے گا جو شارع علیہ السلام نے بیان فرمائیں اور ان کے اعتبار سے اس کے لئے وقت اور جگہ دونوں متعین ہیں۔ اور اس اعتبار سے یہ کہ احرام کو کھول دینا ہے، اس امر کو رائے سے جانا جا سکتا ہے۔ کیونکہ محلل (احرام کھولنے کا ذریعہ) وہی ہوتا ہے جو اپنے وقت اور محل کے بغیر کرنے سے جنابت (جرم) بن جاتا ہے۔ اور سر کا حلق اسی طرح ہے۔ کیونکہ اگر حلق کا وقت (یوم نحر) کے بعد ہو اور وہ حرم پاک سے باہر کر لیا جائے تو وہ احرام کو کھول دینا ہے لیکن عبادت باقی نہیں رہتا۔ لہذا واجب

عبادت ترک کرنے کے سبب دم (ایک جانور کی قربانی) لازم ہوتی ہے۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح استدلال کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ذبح کر لو کوئی حرج نہیں۔ آپ ﷺ نے یہ اسے فرمایا تھا جس نے یہ عرض کی تھی۔ میں نے قربانی کا جانور ذبح کرنے سے پہلے طلق کر لیا ہے۔ اور آپ ﷺ نے بذات خود حدیبیہ کے سال مقام حدیبیہ پر حلق کر لیا اور یہ مقام صل میں داخل ہے۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ جس آدمی نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں عرض کیا تھا کہ میں نے ذبح سے پہلے طلق کر لیا ہے تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا اب ذبح کر لو کوئی حرج نہیں۔ یہ عدم علم اور نسیان کے سبب ترتیب سابقہ ہونے کا بیان ہے۔ آپ ﷺ کا یہ ارشاد تعیم زمان کے لئے نہیں تھا۔ کیونکہ اس کے سوال کے وقت ابھی نحر کا دن باقی تھا کیونکہ اس نے نحر کے دن ظہر کے بعد یہ دریافت کیا تھا۔

ربا مسئلہ یہ کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر حلق کر لیا تھا تو اس کے بارے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کا یہ حلق عبادت نہیں تھا بلکہ اس لئے تھا تا کہ قطعی واپسی کا تمام کو علم ہو جائے کیونکہ امام صاحب کے نزدیک محصر پر حلق واجب نہیں۔

میرے نزدیک اس کا جواب اس طرح ہے کہ محصر (جسے راستے میں روک لیا جائے) معذور ہوتا ہے لہذا اس پر کسی اور کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ محصر کے لئے وقت داخل ہونے سے قبل حلق کرنا جائز ہے لیکن غیر محصر کے لئے ایسا کرنا جائز نہیں اس پر اجماع ہے۔ اس طرح جگہ کا حکم بھی ہے۔ (کہ محصر جہاں ہو وہیں حلق کر سکتا ہے۔ جبکہ غیر محصر کے لئے حرم کا ہونا ضروری ہے۔ اس لئے محصر پر غیر محصر کو قیاس نہیں کیا جاسکتا)

ہمارے نزدیک حلق کے لئے حرم پاک کا ہونا شرط ہے اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے **لَمْ يَجْعَلْهَا اِيَّايَ الْبَيْتِ الْمُقَدَّسِ** اس کی تفسیر عقرب آئے گی۔ اور یہ ارشاد ہے۔ **لَنْتَدَخُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَاءَ اللَّهُ اَوْ حِثٌّ مِنْهُ مَحْفُوظِينَ** مَرْغُوسُكُمْ وَمُتَّقُوهُمْ اِنَّ اِسْتِغْنَاءَ اَيْتِ فِي حَلْقِ كَرَانِے اور بال ترشوانے کو دخول مسجد کے خواص میں سے قرار دیا ہے۔ اور اسلاف کا طریقہ بھی یہی ہے۔ کیونکہ حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ و تابعین وغیرہ تمام حج کے موقع پر مٹی میں حلق کرتے رہے اور عمرہ کے موقع پر مردہ کے قریب۔ اور یہ دونوں مقام حرم پاک میں داخل ہیں۔

مسئلہ: حلق اور قصر کی واجب مقدار میں اختلاف ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس وقت تک احرام نہیں کھل سکتا جب تک محرم سارے سر کا حلق یا قصر نہ کرالے۔ (قصر سے مراد بال ترشوانا ہے) امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ یہ ہے کہ چوتھائی سر کا حلق یا قصر کافی ہوتا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ایک بال یا تین بالوں کا حلق یا قصر کافی ہوتا ہے۔ آپ نے کہا ہے کہ اس آیت سے قضاء تہف (حلق کرنا وغیرہ امور) کا وجوب ثابت ہے لیکن بالا جماع قضاء تہف واجب نہیں کیونکہ قصر (بال ترشوانا) جائز ہے۔ اور قصر کے سبب بعض میل کیل دور ہوتی ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض تہف کی قضاء ایک یا تین بال ترشوانے سے حاصل ہو جاتی ہے۔

امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ جو کوئی ایک یا تین بالوں کا حلق کرادے تو اسے عرب میں یہ نہیں کہا جاتا کہ فلاں نے اپنے سر کا حلق کر دیا یا اس نے اپنے تہف (میل کیل) کو دور کر دیا۔ لہذا اس کے لئے شرعاً ایک معین مقدار کا ہونا ضروری

ہے۔ چنانچہ شریعت نے وضو میں چوتھائی سر کو پورے سر کے قائم مقام قرار دیا ہے اس لئے چوتھائی سر کا مسح فرض قرار دیا اور بقیہ تمام اعضا کو مکمل طور پر دھونا واجب قرار دیا۔ جیسا کہ ہم نے اس کی تحقیق سورہ مائدہ کی آیت وضو کے ضمن میں ذکر کر دی ہے۔ اس لئے ہم اس مسئلہ میں کہتے ہیں کہ چوتھائی سر کا طلق یا قصر ضروری ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ جو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ چوتھائی سر پورے سر کے قائم مقام ہے، ہم اسے تسلیم نہیں کرتے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ ان ائمہ کے نزدیک وضو کے دوران مکمل سر کا مسح کرنا فرض ہے۔ اور حضور نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام میں سے کسی سے بھی یہ مروی نہیں کہ انہوں نے بعض سر کے طلق یا قصر کو کافی قرار دیا ہو۔ (لہذا مکمل سر کا طلق یا قصر کرنا لازماً اور ضروری ہے۔

مسئلہ: بالا جماع طلق کرنا ناقص کرانے کی نسبت افضل ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے اللہ! طلق کرانے والوں پر رحم فرما۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! قصر کرانے والوں پر بھی؟ آپ ﷺ نے پھر فرمایا اے اللہ! طلق کرانے والوں پر رحم فرمایا۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! قصر کرانے والوں پر بھی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پھر فرمایا اے اللہ! طلق کرانے والوں پر رحم فرما۔ صحابہ کرام نے پھر عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! قصر کرانے والوں پر بھی۔ تب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی فرمایا۔ قصر کرانے والوں پر بھی۔ اور ایک روایت میں ہے کہ چوتھی بار آپ ﷺ نے فرمایا قصر کرانے والوں پر بھی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اسی طرح حدیث مروی ہے اور یہ دونوں حدیثیں صحیحین میں ہیں (۱)۔

لَوْلِيَوْمًا أَنْذَرْنَاهُمْ - چاہئے کہ وہ اپنی نذر میں پوری کریں۔ اس میں ابن ذکوان نے الام کو مکسور پڑھا ہے اور باقیوں نے سناکن۔ ابو بکر نے لویو لہو پڑھا ہے، اس میں فاء شدہ ہے اور باب تفعیل ہے، جبکہ باقیوں نے باب افعال سے فاء مخففہ کے ساتھ قرأت کی ہے۔ ایفائے نذر کا مفہوم بعض نے اس طرح بیان کیا ہے کہ جو پکھ آدی کے ذمے واجب ہو اسے ادا کرنا چاہئے، اس کی نذر مان رکھی ہو یا بغیر نذر کے واجب ہو۔ کیونکہ جو آدی اپنے ذمے سے واجب ادا کر دے عرب اس کے لئے بولتے ہیں و لہو لہو لہو۔

جبہور کے نزدیک نذر سے مراد آدی کا اپنی ذات پر ایسی شئی کو واجب کرنا ہے جو اس پر واجب نہ ہو۔ پھر نذر کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) نذر رنج (غیر مشروط) مثلاً کوئی یہ کہہ دیتا ہے۔ قسم بخدا مجھ پر دو رکعت نماز پڑھنا لازماً ہے۔ (۲) نذر مطلق (اسکی نذر جو کسی شرط کے ساتھ مطلق ہو۔ پھر اس نذر مطلق کی دو صورتیں ہیں۔ اگر اس میں شرط پسندیدہ اور اچھی ہو مثلاً کوئی یہ کہے اگر اللہ تعالیٰ نے میرے مریض کو شفا عطا فرمائی یا میرا غائب واپس آگیا تو مجھ پر اتنے روزے لازم ہیں۔ تو اس کا نام نذر تردد ہے۔

اور اگر شرط مکروہ اور ناپسندیدہ ہو مثلاً اگر میں زید سے کلام کروں تو مجھ پر حج لازم ہے تو اس کا نام نذر رطیاح ہے۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ نذر سے مراد ایسی شئی کو اپنے ذمے واجب کرنا ہے جو اصلاً واجب نہ ہو۔ تو پھر اگر کسی نے (نذر کی صورت میں) ایسی چیز کو اپنے اوپر واجب کیا جو پہلے ہی اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس پر واجب ہو تو یہ نذر نہیں ہوگی بلکہ محض خبر ہوگی۔ مثلاً قسم بخدا! رمضان المبارک کے

روز سے رکعت یا ظہر کی نماز ادا کرنا: جھ پر لازم ہے۔ تو ایسی صورت میں نہ تو اس پر نذر کا حکم مرتب ہوگا اور نہ ہی واجب کا وصف اور مقدار آدمی کے تبدیل کرنے سے تبدیل ہوں گے۔ مثلاً اگر کسی نے یہ کہا تم بخدا دو سو درہم میں سے دس درہم زکوٰۃ ادا کرنا مجھ پر لازم ہے۔ تو اس صورت میں اس پر صرف پانچ درہم ہی لازم ہوں گے (جو کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے واجب کر دہ ہیں) یا تم بخدا ظہر کی پھر رکعت نماز جھ پر لازم ہے۔ یا تم بخدا! جھ پر لازم ہے کہ میں ہر فرض نماز تازہ وضو کے ساتھ یا جماعت کے ساتھ ادا کروں گا۔ تو ان صورتوں میں ظہر کی نماز چار رکعت ہی ہوگی۔ بغیر تازہ وضو کے وضو کی حالت میں نماز جائز ہوگی۔ اسی طرح جماعت کے بغیر انفرادی حالت میں بھی نماز درست ہوگی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان قیود کے بغیر بھی نماز کو جائز قرار دیا ہے اور اگر ہم اس طرح نماز کو جائز تصور نہ کریں تو اس سے احکام الہی میں سے ایک حکم کو نسخ کرنا لازم آئیگا۔ اور اگر ہم یہ کہیں کہ ان قیود کے بغیر نماز جائز ہے تو پھر ایسی نذر کا کوئی فائدہ نہیں جس کے ذریعے ان امور کو اپنے ذمے واجب کیا جائے کیونکہ ان چیزوں کے مستقل نہ ہونے کی وجہ سے مثل معقول (کفارہ ادا کرنا) کے ساتھ نذر کو پورا کرنا ممکن نہیں اور نہ ہی مثل معقول (قربانی کرنا) کے ساتھ ادا کیلئے ممکن ہے کیونکہ یہ تب ممکن ہوتی ہے جب شریعت کی جانب سے اس کا ثبوت ہو۔ اور شریعت کی جانب سے یہ ثابت نہیں۔ اور یہی معنی ہے علی کے اس قول کا کہ نذر کے سبب کسی شیئی کے وجوب کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ طاقت مقصودہ ہو اور مستقل بذات ہو۔ لیکن اگر کسی نے پیدل چل کر حج کرنے کی نذر مانی پھر راستے میں وہ سوار ہو تو پھر بطور کفارہ ایک جانور کی قربانی اس کے ذمہ لازم ہوگی کیونکہ شریعت کی جانب سے اس کی تعیین کی گئی ہے۔

جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے اس میں یہ اشکال بہر حال موجود ہے کہ جس نے دو سو درہم میں سے دس درہم زکوٰۃ ادا کرنے کی نذر مانی تو اس کی یہ توجیہ ممکن ہے کہ ان میں پانچ وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس پر واجب ہیں اور پانچ وہ ہیں جو نذر کے سبب اس نے اپنے ذمہ لازم کئے ہیں۔ تو اس سے حکم الہی کا نسخ تو لازم نہیں آتا۔ واللہ اعلم۔

وہ امور جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے واجب نہیں (مگر آدمی نذر کے سبب انہیں اپنے اوپر واجب کر لیتا ہے) ان کی تین اقسام ہیں۔

(1) امر طاعت (2) امر معصیت (3) امر مباح جس میں نہ طاعت کا معنی ہوتا ہے اور نہ ہی معصیاں (تا فرمانی اور گناہ) کا۔

اگر نذر امر طاعت کے بارے ہو تو اس کام کے ذریعے اس نذر کو پورا کرنا بلا جماع واجب ہے۔ اس آیت میں اسی نذر کا حکم دیا گیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کردہ اصول اور ضابطہ کے مطابق یہ نذر فرض اور قطعی نہیں۔ کیونکہ یہ ایسی آیت سے ثابت ہے جو عام مخصوص عند بعض ہے (اور ایسا عام فائدہ ظن کا رہتا ہے) لہذا یہ آیت قطعی الدلالہ ہے۔ (اس لئے اس نذر کا ایفاء واجب ہے) اور بعض نے کہا ہے کہ یہ آپ کے بیان کردہ اصول کے مطابق فرض ہے۔ کیونکہ جب اس پر اجماع معتقد ہو چکا ہے تو جس مقدار پر اجماع معتقد ہے اتنی مقدار میں یہ امر قطعی ہو چکا ہے۔ (اور امر قطعی الدلالہ سے فرض ثابت ہوتا ہے) پھر نذر طاعت اگر منجز ہوتو اس سے کفارہ کی طرف عدول کرنا جائز نہیں (بلکہ اسے پورا کرنا لازم اور ضروری ہے) ہاں اگر اسے پورا کرنے کی قوت اور طاعت نہ رکھتا ہو تو پھر اس میں کفارہ قسم ادا کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر وہ نذر کسی شرط کے ساتھ معلق ہو اور پھر وہ شرط پائی جائے۔ تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر علماء کے نزدیک اس کا حکم بھی نذر منجز کی طرح ہے کیونکہ آپ کے نزدیک نذر معلق بشرط نذر منجز کی مثل ہے۔ گویا یہ اسی طرح ہے کہ جب شرط پائی گئی تو اس نے کہا تم بخدا! مجھ پر ایسا کرنا لازم ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے یہ روایت بھی ہے کہ آپ نے اپنے وصال سے سات دن قبل اس موقف سے رجوع فرمایا تھا اور فرمایا

کہ جب نذر معلق باشرط ہو تو حالف کو اختیار ہے چاہے تو بھنیہ نذر کو پورا کرے اور چاہے تو کفارہ قسم ادا کرے۔ یہی قول امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے۔ پس اگر اس (حالف) نے یہ کہا۔ اگر میں اس طرح کروں تو مجھ پر حج لازم ہے یا ایک سال کے روزے ہیں۔ اس صورت میں اگر وہ چاہے تو اپنی نذر پوری کرے اور اگر چاہے تو تین دن روزے رکھے۔ پہلا قول امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ظاہر مذہب ہے۔ اور اختیار و الاقول نادر میں ہے۔ (ظاہر مذہب سے مراد یہ ہے کہ آپ کا یہ قول امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی سچے کتابوں (الجامع الصغیر، الجامع الکبیر، المسیر الصغیر، المسیر الکبیر، زیارات اور مبسوط) میں سے کسی میں ہے۔ اور نادر سے مراد یہ ہے کہ یہ قول ان چھ کتابوں کے علاوہ کسی اور کتاب میں ہے) ظاہر مذہب کی دلیل یہ آیت اور متعدد احادیث ہیں۔ اور قول نادر کی وجہ حدیث ہے جو صحیح مسلم میں حضرت عقبہ بن عامر سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا نذر کا کفارہ کفارہ عین ہی ہے (۱)۔ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ کفارہ ادا کرنے کے ساتھ نذر مطلقاً ساقط ہو جاتی ہے۔ پس اس طرح نصوص کے مابین تعارض آ جاتا ہے۔ لہذا وہ نصوص جو بیحد نذر پورا کرنے کا تقاضا کرتی ہیں انہیں نذر مخیر پر محمول کیا جائے گا اور جو کفارہ کے سبب نذر کے سقوط کا تقاضا کرتی ہیں انہیں نذر معلق پر محمول کیا جائے گا۔ دونوں کے مابین وجہ فرقی یہ ہے کہ نذر معلق فی الحال موجود نہیں ہوتی گویا اس میں نذر معدوم ہوتی ہے جب تک شرط نہ پائی جائے اس لئے یہ قسم کی طرح ہی ہے کیونکہ جب تک قسم کو توڑا نہ جائے تب تک کفارہ واجب نہیں ہوتا۔ گویا وہ بھی قسم کی گفتگو کرتے وقت معدوم ہوتا ہے۔ چنانچہ نذر معلق کا حکم قسم کی طرح ہی ہوگا۔ مگر نذر مخیر اس کے برعکس ہے۔ کیونکہ یہ اپنے وقت میں ثابت ہو جاتی ہے (یعنی فی الحال ثابت ہوتی ہے) لہذا وہ احادیث جن میں نذر کو بیحد پورا کرنے کا حکم ہے ان پر نذر مخیر کی صورت میں عمل کیا جائے گا۔

صاحب ہدایہ اور دیگر محققین علماء احناف کے نزدیک مختار قول یہ ہے کہ وہ نذر معلق جس میں نذر ماننے والے کو اختیار ہوتا ہے اس سے مراد نذر لجاج ہے۔ کیونکہ اس صورت میں وہ وجود شرط چاہتا ہی نہیں۔ گویا وہ نذر کے وجوب کا ارادہ ہی نہیں کرتا۔ بلکہ وہ فعل شرط کو اس میں مانع بنا دیتا ہے۔ کیونکہ انسان نہیں چاہتا کہ عبادات اس پر ہمیشہ واجب رہیں اگرچہ ان سے ثواب حاصل ہوتا ہے کیونکہ اسے یہ خوف لاحق رہتا ہے کہ کتنی عبادت اس پر قائل ہو جائے (اور وہ اپنی غفلت کے سبب اسے ادا نہ کر سکے) اور پھر وہی عبادت اس کیلئے موجب سزا ہو جائے۔ اسی وجہ سے حضور نبی کریم ﷺ سے صحیح حدیث مروی ہے کہ آپ ﷺ نے نذر ماننے سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ نذر خیر (بھلائی) نہیں لاتی۔ بالخصوص جبکہ نذر ایسی عبادت کے بارے میں جو آدمی پر شاق لگتی ہے۔ مثلاً حج اور سال بھر کے روزے وغیرہ لیکن نذر تردد کا حکم یہ ہے کہ اسے ایسا فعل کے ساتھ پورا کرنا لازم ہوتا ہے۔ جس کی نذر مانی گئی ہو۔ کیونکہ اس میں آدمی جب وجود شرط کا ارادہ کرتا ہے تو وہ ساتھ ہی وجود نذر کا بھی ارادہ کرتا ہے۔ جس کی نذر معلق نذر مخیر کے معنی میں ہے۔ لہذا یہ اسی کے حکم میں داخل ہوگی۔ یعنی بیحد نذر کو پورا کرنا واجب ہوگا۔ اس سے کفارہ کی طرف عدول کرنا جائز نہیں ہوگا۔ لہذا وہ روایات جو بیحد نذر کو پورا کرنے کا تقاضا کرتی ہیں انہیں نذر لجاج پر محمول کیا جائے گا۔ اس بارے میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ بھی یہی ہے۔ یہی وہ تفصیل ہے جسے صاحب ہدایہ نے بیان کیا ہے۔ اور المسحاج میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا اظہار قول بھی اسی طرح ہے۔ لیکن آپ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک قول اس طرح ہے کہ نذر لجاج کی صورت میں فقط کفارہ واجب ہوتا ہے۔ اور ایک قول اس طرح بھی ہے کہ ایسی صورت میں صرف نذر کو پورا کرنا ہی واجب ہے۔ کفارہ کی ادائیگی نہیں ہوتی۔

مسئلہ: امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نذر کے سبب کسی شئی کے واجب ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ شئی ایسے واجب کی جنس سے ہو جسے اللہ تعالیٰ نے واجب کیا ہے۔ (مثلاً حج نماز اور روزے وغیرہ کی نذر ماننا) منضاج میں ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہر طاعت کی نذر ماننے کے سبب اس کا وجوب ثابت ہو جاتا ہے اگرچہ وہ ایسے واجب کی جنس میں سے نہ بھی ہو جو اللہ تعالیٰ نے واجب کیا ہے۔ مثلاً مریض کی عیادت کرنا جنازے اور سلام میں شریک ہونا۔

میں کہتا ہوں کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نظریہ پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اعتکاف نذر کے سبب بلا تجماع واجب ہو جاتا ہے حالانکہ یہ ایسے واجب کی جنس سے نہیں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے واجب ہو۔ (اور اگر یہ کہا جائے کہ روزہ اعتکاف کے لئے شرط ہے اور رمضان المبارک کے روزے اللہ تعالیٰ کی جانب سے واجب کردہ ہیں۔ چنانچہ اعتکاف اسی واجب کی جنس سے ہے) تو اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اعتکاف کے لئے روزے کا شرط ہونا قابل تسلیم ہی نہیں۔ اور اگر ہم تسلیم کر بھی لیں تو بھی اعتکاف کی بعض شرائط کا اس واجب کی جنس سے ہونا ثابت ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے واجب کیا ہے۔ تو فقط اتنے سبب سے نذر کا لازم ہونا یہ تقاضا کرتا ہے کہ نذر کے سبب ہر قربت (عبادت) لازم ہو جاتی ہے۔ چاہے وہ عبادت مقصودہ ہو یا غیر مقصودہ کیونکہ ہر عبادت اور قربت کے لئے اسلام اور اخلاص بنیادی شرطیں ہیں اور یہ دونوں ایسے فرض ہیں جو اللہ تعالیٰ کے واجب کردہ ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ نذر کے سبب اعتکاف کا وجوب نذر کے سبب واجب ہونے والے روزے کے تابع ہے۔ (یعنی نذر کے سبب اعتکاف کا وجوب نذر کے سبب واجب ہونے والے روزے کے تابع ہے)۔ (یعنی نذر کے سبب اعتکاف واجب تب ہوگا جب اس کے ساتھ نذر کے روزہ بھی ہو) تو پھر اس سے یہ لازم آئے گا کہ اگر کسی نے رمضان المبارک میں اعتکاف کرنے کی نذر مانی تو وہ اعتکاف اس پر واجب نہیں ہوگا۔ (کیونکہ رمضان المبارک کے روزے تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے فرض ہیں، ان کی موجودگی میں نذر کے سبب واجب ہونے والا روزہ ادا نہیں ہو سکتا۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ اعتکاف کا وجوب نذر ماننے ہوئے روزے کے وجوب کے تابع نہیں۔ کیونکہ رمضان المبارک میں اعتکاف کرنے کی نذر ماننا اور پھر اسے ادا کرنا درست اور صحیح ہے۔) واللہ اعلم۔

مسئلہ: جب کوئی آدمی نذر طاعت کو اپنے معینہ اوقات میں پورا نہ کر سکے تو جمہور کے نزدیک اس پر اس کی قضاء واجب ہے۔ (یعنی اور دنوں میں اسے ادا کرنا اس کے ذمے لازم ہے)۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ کیا اس صورت میں اس پر کفارہ عیبتن بھی واجب ہوگا یا نہیں؟ اس بارے حضرت سفیان ثوری نے یہ کہا ہے کہ اس پر قضاء اور کفارہ دونوں لازم ہوں گے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اگر نذر ماننے والا قسم کی نیت نہ کرے اور صیغہ نذر سے گفتگو کرے چاہے نذر کی نیت کرے یا نہ کرے تو اس پر قضاء واجب ہوگی مگر کفارہ واجب نہیں ہوگا۔

اور اگر اس نے قسم کی نیت کی اور نذر کی نیت کر دی تو اس صورت میں کفارہ قسم واجب ہوگا، نذر کی قضاء لازم نہیں ہوگی۔ اور اگر اس نے قسم کی نیت کی تو اس صورت میں قضاء اور کفارہ دونوں اس پر واجب ہوں گے۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ پہلی صورت میں یہ قسم ہے لہذا اس پر قضاء کے بغیر صرف کفارہ قسم واجب ہوگا۔ گویا اس نے صیغہ نذر سے مجازاً قسم کی نیت کر لی ہے۔

اور دوسری صورت میں وہ نذر ہوگی لہذا اس پر کفارہ کے بغیر صرف نذر کی قضاء واجب ہوگی کیونکہ جب ایک لفظ سے حقیقت اور مجاز

دونوں معنی مراد لئے جا سکتے ہوں تو حقیقت مجاز سے ارجح ہوتی ہے اور حقیقت و مجاز دونوں کو جمع کرنا بھی ممنوع ہوتا ہے۔

سفیان ثوری کے قول کا سبب یہ ہے کہ چونکہ اس نے ایسے صیغہ کے ساتھ نذر مانی ہے جو نیت کا محتاج نہیں۔ لہذا ایسی صورت میں اگر وہ نذر کی نفی کر بھی دے تو بھی نہیں ہوتی۔ کیونکہ صیغہ نذر انشاء ہے جیسا کہ نکاح، طلاق و وصیت اور اعتاق وغیرہ۔ (لہذا جب صیغہ انشاء استعمال کیا جائے تو پھر اس کے حقیقی معنی کی نفی نہیں ہو سکتی۔) حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تین چیزیں ایسی ہیں جنہیں سنجیدگی سے لیا جائے تب بھی واقع ہو جاتی ہیں اور اگر غیر سنجیدگی اور تسخر وغیرہ کی حالت میں لیا جائے تب بھی واقع ہو جاتی ہیں اور وہ ہیں نکاح، طلاق اور رجعت (۱)۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ ابو داؤد ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔

معصف عبدالرزاق میں حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے طلاق دی اس حال میں کہ وہ کھیل رہا ہو (یعنی مزاح میں اس نے طلاق دی) تو اس کی طلاق جائز ہے (واقع ہو جائیگی) اور جس کسی نے کھیل کے انداز میں (اپنے غلام کو) آزاد کیا تو اس کی آزادی جائز ہے (وہ واقع ہو جائے گی) (۲)

ابن عدی نے اکمال میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا تین چیزیں ایسی ہیں جن میں کھیل (مزاح) کا کوئی تصور نہیں۔ جس کسی نے کھیل کے انداز میں ان میں سے کسی کے بارے میں گفتگو کی تو وہ اس پر واجب (ثابت) ہو جائے گی۔ اور وہ ہیں طلاق، اعتاق اور نکاح۔

عبدالرزاق نے حضرت عمرو اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے موقوف روایت نقل کی ہے کہ ان دونوں نے فرمایا تین چیزوں میں کھیل (مزاح) نہیں ہے۔ نکاح، طلاق اور اعتاق۔ اور انہی سے ایک روایت میں چار چیزوں کا ذکر ہے اور چوتھی چیز نذر ہے اور نذر اپنے مقصدی کے مطابق قسم ہوتی ہے کیونکہ اس میں وہ چیز جو واجب نہ ہو اسے اپنے اوپر واجب کرنا ہوتا ہے۔ اور وہ چیز جو حرام نہ ہو اسے اپنے اوپر حرام کرنے سے قسم لازم آتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ ۚ تَبَيَّنَ لَكَ مَا خَلَّفْتُم بَيْنَ يَدَيْكُمْ ۚ قَدْ فَخَّرْنَا اللَّهَ لَكُمْ سِجِّةً آيَاتِنَا لِمَ ۚ وَهُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ۝

یہاں اس سے معلوم ہوا کہ نذر قسم ہونے کے لئے نیت لازم نہیں (بلکہ اس میں بذات خود قسم کے معنی موجود ہیں) اور نہ ہی نذر میں قسم کے معنی کی نفی کرنے سے اس کی نفی ہوتی ہے۔ جیسا کہ اگر کسی نے اپنے قریبی (باپ یا بیٹے وغیرہ) کو خرید لیا تو خریدنے کے ساتھ ہی آزادی لازم ہو جائے گی، نہ اس میں آزادی کی نیت کا ہونا ضروری ہے۔ اور نہ ہی خریدتے وقت اس کی نفی کرنے سے اس کی نفی ہوتی ہے۔

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ جو چیز حرام نہ ہو اسے اپنے اوپر حرام کرنے سے مطلقاً قسم لازم نہیں آتی۔ مثلاً طلاق کے سبب مطلقاً ہوی حرام ہو جاتی ہے۔ عتاق کے سبب آزاد ہونے والی لونڈی حرام ہو جاتی ہے اور بیع سے بائع پر بیع حرام ہو جاتی ہے۔ لیکن ان میں سے کسی صورت میں بھی قسم واقع نہیں ہوتی۔ لیکن جب تحریم میں بالارادہ قسم کی نیت پائی جائے تو پھر قسم ثابت ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ ماریہ اور شہد کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے لئے حرام کیا تھا۔ گویا ارشاد باری تعالیٰ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ ۚ تَبَيَّنَ لَكَ مَا خَلَّفْتُم بَيْنَ يَدَيْكُمْ ۚ قَدْ فَخَّرْنَا اللَّهَ لَكُمْ سِجِّةً آيَاتِنَا لِمَ ۚ اور جب تحریم میں قسم کی نیت نہ ہو تو پھر وہ اپنے حقیقی معنی پر محمول ہوتے ہوئے نذر ہوگی

چاہے وہ نذر کی نیت کرے یا نہ کرے۔ اور جب قسم کی نیت ہو اور نذر کی نئی ہو تو وہ صرف قسم ہوگی۔ گویا اس صورت میں یہ اپنے مجازی معنی پر محمول ہوگی۔ لیکن جب قسم کی نیت ہو اور نذر کی نئی نہ ہو۔ چاہے نذر کی نیت ہو یا نہ ہو تو وہ اپنے صیغہ کے اعتبار سے نذر ہوگی اور اپنے مقصدی (معنی) کے اعتبار سے قسم ہوگی۔ واللہ اعلم۔

فصل: نذر کی دوسری قسم نذر بالمعصیہ (گناہ اور معصیت کی نذر ماننا) ہے۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ (1) ایسے عمل یا شیئی کی نذر ماننا جس کا کوئی فرد بھی معصیت سے خالی نہ ہو۔ مثلاً شراب نوشی اور زنا کاری کی نذر ماننا وغیرہ۔ تو اس کے بارے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ ہے کہ جب آدمی کسی نذر سے قسم کا ارادہ کرے تو نذر منعقد ہو جائے گی۔ لہذا اسے چاہئے کہ وہ قسم تو ذکر کفارہ ادا کرے۔ اور اگر ایسی نذر میں قسم کا ارادہ نہ ہو تو نذر منعقد نہیں ہوگی۔ کلام انہو ہو جائے گا کیونکہ اس کے انعقاد میں کوئی فائدہ نہیں۔ اور بالا جماع اس آیت کریمہ سے ایسی نذر مردود نہیں اور ناسے پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ برائی کرنے کا حکم نہیں دیتا۔ یہی قول امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے۔

لیکن امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں بھی نذر منعقد ہو جائے گی لیکن کفارہ قسم کی ادائیگی واجب ہوگی چاہے وہ قسم کی نیت کرے یا نہ کرے۔ علامہ ابن ہمام نے کہا ہے کہ اکثر مشائخ حنفیہ کا یہی موقف ہے۔ اسی طرح امام مجاہدی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے کہ اگر کسی نے نذر کی نسبت معاصی کی طرف کی مثلاً یہ کہا قسم بخدا افلاں کو کھل کرنا جھ پلازم ہے۔ تو وہ قسم ہوگی۔ اور اس پر اسے تو ذکر کفارہ ادا کرنا لازم ہوگا۔

میں کہتا ہوں کہ امام مجاہدی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ جب لفظ کو اپنے حقیقی معنی پر محمول کرنا سمجھ رہو تو پھر اسے مجازی معنی پر محمول کرنا واجب ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کا مقصدی بھی یہی ہے کہ معصیت کی نذر نہیں اور اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جب آدمی اس سے قسم کی نیت کرے۔ (تب کفارہ قسم لازم ہوگا) دوسری قسم ایسی معصیت کی نذر ماننا ہے جس کی جنس سے ایسی طاعت (عبادت) موجود ہو جو معصیت سے پاک ہو۔ مثلاً عید کے دن روزہ رکھنے کی نذر ماننا اور طلوع آفتاب کے وقت نماز پڑھنے کی نذر ماننا وغیرہ۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نذر کی یہ قسم منعقد ہو جاتی ہے۔ البتہ آدمی پر یہ لازم ہے کہ وہ عید کے دن روزہ نہ رکھے اور بعد میں اس کی قضاء کر لے۔ اس صورت میں اس پر کفارہ نہیں ہوگا۔ اور اگر اس نے عید کے دن روزہ رکھا تو وہ بھی جائز ہوگا۔ اور اگر اس صورت میں قسم کی نیت ہو اور نذر کی نئی ہو تو پھر آدمی پر قسم کا کفارہ لازم ہوتا ہے۔ اور اگر قسم کی نیت کے ساتھ ساتھ نذر کی نئی نہ کی ہو تو نذر کی قضاء اور کفارہ دونوں لازم ہوں گے۔ جیسا کہ نذر طاعت کے بیان میں ہم وضاحت کر چکے ہیں۔

حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ یہ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں آدمی پر یہ لازم ہے کہ وہ عید کے دن روزہ نہ رکھے، بعد میں اس کی قضاء بھی کرے اور کفارہ بھی ادا کرے۔ اور اگر اس نے روزہ رکھا تو وہ بھی جائز نہیں ہوگا۔ اور آپ ہی سے یہ قول بھی مروی ہے کہ اگر اس نے روزہ رکھا تو وہ جائز ہوگا۔ (یعنی نذر پوری ہو جائے گی)

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا ہے کہ نذر بالمعصیت کی پہلی قسم کی طرح یہ نذر بھی منعقد نہیں ہوگی کیونکہ دو معصیوں کے مابین کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اور وہ شئی جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہو وہ بندے کے واجب کرنے سے واجب نہیں ہوتی۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی وجہ فرق یہ ہے کہ آدمی نے (بنیادی طور پر) روزے کی نذر مانی ہے اور روزہ اصلاً مشروع ہے۔ اور عید کے دن رکھنا اس لئے ممنوع ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار لازم آتا ہے۔ (گویا عید کے دن روزہ مشروع باصلاح ہے اور ممنوع بغیر ہ ہے) لہذا اس کی نذر منعقد ہو جائے گی لیکن اس دن روزہ نہ رکھنا لازم ہے تاکہ آدمی روزہ سے متعلق معصیت سے محفوظ رہ سکے۔ اور جو روزہ نذر کے سبب آدمی کے ذمے واجب ہوا تھا اسے ساقط کرنے کے سبب اس کی قضاء واجب ہوگی۔ لیکن اگر اس نے عید کے دن روزہ رکھ لیا تو وہ اپنی نذر سے بری الذمہ ہو جائے گا کیونکہ جیسے اس نے اسے اپنے اوپر لازم کیا تھا اسے ویسے ہی ادا کر دیا۔

مذکورہ اختلاف کا دوسرا ایک اصولی اختلاف پر ہے اور وہ یہ ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک افعال شرعیہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کتابت کرنی ہے لیکن اصلاً وہ افعال مشروع باقی رہتے ہیں۔ (یعنی اگر مشروع افعال سے کسی فعل سے روک دیا جائے تو اس کا سبب وہ خارجی امر ہوتا ہے جو فعل مشروع سے مل کر اس کے لئے قبح اور معصیت کا سبب بن جاتا ہے۔ لیکن اس سے فعل مشروع کا ذاتی اور اصل حکم باطل نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ باقی رہتا ہے) جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ یہ ہے کہ افعال شرعیہ سے نبی ان کی ذات میں قبح ثابت کرتی ہے۔ جس کے سبب وہ مشروع باقی نہیں رہتے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نذر منعقد ہوجاتی ہے اس لئے کہ وہ فعل طاعت ہے۔ نہ کہ اس لئے کہ وہ فعل معصیت ہے۔ لہذا اس نذر کے سبب اس پر کامل روزہ رکھنا واجب ہو جاتا ہے اور اگر اس نے عید کے دن روزہ رکھا تو وہ ادا نہیں ہوگا۔ (کیونکہ وہ کامل نہیں) اور کثیر ایسے افعال ہیں جنہیں اپنے وقت پر ادا کرنا حرام ہوتا ہے لیکن ان کی قضاء لازم ہوتی ہے۔ مثلاً حاضرہ عورت کے لئے رمضان المبارک کا روزہ اپنے وقت پر ادا کرنا حرام ہے لیکن بعد میں اس کی قضاء لازم ہے اور اگر اس نے اپنے وقت پر (حالت حیض میں) روزہ رکھ لیا تو اس کے ذمے سے فرض ادا نہیں ہوگا۔

فصل: تیسری قسم کسی امر مباح کو ترک کرنے کی نذر ماننا ہے تو اس کے بارے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمایا ہے کہ ایسی نذر لغو ہوتی ہے، وہ منعقد نہیں ہوتی مگر جبکہ اس میں قسم کی نیت ہو تو پھر قسم پوری نہ کرنے کی صورت سے کفارہ ادا کرنا لازم ہوگا۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ایسی نذر کو پورا کرنا اس پر واجب نہیں ہوتا البتہ اس سے قسم منعقد ہوجاتی ہے۔ چاہے قسم کی نیت کرے یا نہ کرے۔ پس اگر قسم کو توڑے گا تو اس پر کفارہ قسم لازم ہوگا۔ یہی آپ کا راجح قول ہے۔ اسی طرح المنہاج میں ہے۔ او اس کا سبب وہی ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے، یعنی جب لفظ کو حقیقی معنی پر محمول کرنا محذور ہوتا ہے مجازی معنی پر محمول کیا جائے گا کیونکہ ایسی صورت میں مجازی معنی ہو جاتا ہے۔ (اور وہ قسم ہے کیونکہ جو چیز واجب نہ ہو اسے واجب قرار دینا تحریم مباح ہے اور تحریم مباح قسم ہے) میں کہتا ہوں کہ یہ حجت وہی پیش کر سکتا ہے جو اس کا قائل ہو کہ تحریم مباح قسم ہے۔ واللہ اعلم۔

اب ہم ان احادیث میں سے چند کا ذکر کریں گے جو مذکورہ بالا اقوال کے لئے شاہد ہیں تاکہ ان میں سے راجح اور مرجوح قول کے درمیان امتیاز ہو جائے۔

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری بجالانے کی نذر مانی تو اسے چاہئے کہ وہ اطاعت بجالائے اور جس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے کی نذر مانی تو

اسے چاہئے کہ معصیت کا ارتکاب نہ کرے۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے (1)۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے نہ صرف وہی ہوتی ہے جس کے سبب اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی مقصود ہو۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس آدمی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے نقل کیا ہے جس نے وصوب میں کھڑے رہنے کی نذر مانی تھی۔ اور امام رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دوسرے واقعہ میں اسے نقل کیا ہے۔ اور ابو داؤد نے بھی اس نوع کی حدیث نقل کی ہے۔ ان احادیث کا عموم اس پر دلالت کرتا ہے کہ نذر باطاعت منقطع ہو جاتی ہے چاہے اس کی جنس سے اللہ تعالیٰ کی جانب سے واجب کردہ کوئی واجب ہو یا نہ ہو۔

حضرت عمران بن حصین سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ معصیت کی نذر کو پورا کرنا جائز نہیں اور نہ ہی ایسی نذر کو پورا کرنا لازم ہے جس کا آدمی مالک نہ ہو۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (2)۔

ابو داؤد نے عمرو بن شعیب سے ان کے باپ اور دادا کے واسطے سے صرف حدیث نقل کی ہے کہ ابن آدم کے لئے ایسی شئی کی نظر نہیں جس کا وہ خود مالک نہیں (3)۔ اسی حدیث کی وجہ سے علامہ ابن ہمام نے کہا ہے کہ اگر کسی نے یہ نذر مانی کہ اگر میں نے اس طرح کیا تو میرے مال میں سے ہزار درہم صدقہ ہوں گے۔ پھر اس نے وہ کام کر دیا۔ لیکن اس کی ملکیت میں صرف سو درہم ہیں۔ تو اس صورت میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا صحیح قول یہ ہے کہ اس پر صرف اتنا مال صدقہ کرنا لازم ہوگا جس کا وہ مالک ہے کیونکہ جس مال کا وہ مالک ہی نہیں (اسکی نذر نہیں ہوگی) کیونکہ نذر کی نسبت نہ ملکیت کی طرف ہوتی ہے اور نہ سبب ملکیت کی طرف۔ مسئلہ: کسی نے یہ کہا کہ میرا مال مساکین کے لئے صدقہ ہے اور صورت حال یہ ہے کہ اس کے پاس کوئی مال نہیں تو اس پر کوئی شئی لازم نہیں ہوگی۔

مسئلہ: اگر کسی نے یہ کہا کہ تم بندھا بھج پر لازم ہے کہ میں یہ بکری بیت اللہ شریف میں قربانی کروں گا اور اس نے اشارہ کسی دوسرے آدمی کی بکری کی طرف کیا (جس کا یہ خود مالک نہیں) تو اس پر کوئی شئی لازم نہیں ہوگی۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نذر کا کفارہ قسم کا کفارہ ہی ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے (4) اور طبرانی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ نذر قسم ہے اور اس کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے۔ یہ حدیث بھی اپنے عموم کے سبب اسی معنی پر دلالت کرتی ہے۔

مسئلہ: جس نے نذر مانی اور پھر اسے پورا نہ کیا چاہے اس لئے کہ وہ معصیت کی نذر ہونے کی بناء پر شرعاً ممکن تھی یا وہ طبعاً ممنوع تھی یعنی ایسی چیز کی نذر تھی جسے پورا کرنا اس کی طاقت میں نہ تھا مثلاً ہمیشہ بلا نذر روزہ رکھنے کی نذر۔ یا وہ اس کی طاقت تو رکھتا تھا لیکن اس کا وقت گزر چکا تھا اور اب اس کا تدارک ممکن نہیں یا تو اس لئے کہ وہ مباح التزک تھی یا جسکی نذر مانی تھی وہ شئی معین نہیں تھی مثلاً یوں کہا گیا اللہ کیلئے بھج پر نذر ہے تو اس صورت میں اس پر قسم کا کفارہ واجب ہوگا۔ چاہے اس نے قسم کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو۔

امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو قسم کی نیت کرنے کی صورت پر محمول کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کسی نے نذر مانی اور منذر رہے شئی کو معین نہ کیا تو اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔ جس کسی

2- صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 45 (قدیمی)

1- صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 999 (وزارت تعلیم)

4- سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 116 (وزارت تعلیم)

3- سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 45 (قدیمی)

نے معصیت کی نذر مانی تو اس کا کفارہ بھی قسم کا کفارہ ہے۔ جس نے ایسی نذر مانی جسے پورا کرنے کی وہ طاقت نہ رکھتا، ہو تو اس کا کفارہ بھی قسم کا کفارہ ہے۔ اور جس نے ایسی شئی کی نذر مانی جسے وہ پورا کرنے کی طاقت رکھتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ اپنی نذر کو پورا کرے (۱)۔ اسے ابو داؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اور بعض نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر موقوف قرار دیا ہے۔ اور یہ حدیث سابقہ حدیث کا بیان ہے۔

مسئلہ: وہ آدمی جس نے نذر طاعت مانی۔ اور وہ اسے پورا کرنے کی طاقت بھی رکھتا ہو تو پھر اس کے لئے نذر سے کفارہ کی طرف عدول کرنا جائز نہیں۔ اور اگر اس نے کفارہ اور ابھی کر دیا تو وہ نذر کی جانب سے کافی نہیں ہوگا۔

حضرت عمران بن حصین سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا معصیت کی نذر (جائز) نہیں اور اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔ اسے نسائی حاکم اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث اپنے مطلق ہونے کے سبب امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے اس موقف کے لئے حجت ہے کہ معصیت کی نذر منعقد ہو جاتی ہے اور کفارہ واجب ہوتا ہے۔ لیکن اس کی سند اس طرح ہے کہ اسے محمد بن زبیر حنفلی نے اپنے باپ سے اور وہ عمران بن حصین سے روایت کرتے ہیں تو اس میں محمد بن زبیر راوی قوی نہیں۔ اس کی روایت کے بارے میں علماء کے مابین اختلاف ہے۔ اسی حدیث کو ابن مبارک نے عبدالرزاق سے اور انہوں نے محمد کے باپ زبیر سے اسے روایت کیا ہے۔ حافظ نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ یہ حدیث ایک دوسرے طریق سے بھی مروی ہے جس میں مسند صحیح ہے مگر معلول ہے۔ اسی حدیث کو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اصحاب سنن اور بیہقی نے زہری سے، انہوں نے ابوسعلمہ سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے لیکن یہ سند منقطع ہے کیونکہ زہری کا ابوسعلمہ سے صحیح ثابت نہیں۔

ابو داؤد ترمذی نسائی اور ابن ماجہ نے اس حدیث کو اس سند سے روایت کیا ہے۔ عن سلیمان بن بلال عن موی بن عقبہ و محمد بن یحییٰ عن زہری عن سلیمان بن ارقم عن یحییٰ بن کثیر عن ابی سلمہ عن عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نسائی نے کہا ہے کہ اس سند میں سلیمان بن ارقم راوی متروک ہے۔ اس میں یحییٰ بن کثیر کے کئی اصحاب نے ان سے مخالفت کی ہے اور انہوں نے یحییٰ بن کثیر کے واسطے سے محمد بن زبیر حنفلی سے اور انہوں نے اپنے باپ کے واسطے سے عمران سے یہ روایت نقل کی ہے۔ پس اس طرح یہ سند اس پہلی روایت کی طرف ہی لوٹ آئی جو اس سے قبل بیان ہو چکی ہے۔

حافظ نے کہا ہے کہ عبدالرزاق نے اس حدیث کو معمر بن یحییٰ بن کثیر عن رجل من بنی ضیفہ و ابی سلمہ کی سند سے حضور نبی کریم ﷺ سے مسطور روایت کیا ہے۔ حاکم نے کہا ہے کہ بنی ضیفہ کے آدمی سے مراد محمد بن زبیر ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ ان کا بنی ضیفہ کہنا غلطی ہے کیونکہ ان کا تعلق بنی حظلہ سے تھا۔ اس کی ایک اور مرفوع سند بھی ہے جس کے ساتھ یہ حضرت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے

دارقطنی ابو داؤد ترمذی اور نسائی نے اسے غالب بن عبد اللہ الجوزی عن عطاء کی سند سے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ جس نے اپنے لئے معصیت کی نذر مانی تو اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہی ہے۔ اس میں غالب بن عبد اللہ راوی متروک اللہ حدیث ہے۔ اس حدیث کی ایک دوسری سند بھی ہے کہ ابو داؤد نے اسے کرب کے واسطے سے حضرت ابن

عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اس کی اسناد حسن ہے لیکن اس میں بھی طرح بن بچی راوی مختلف فیہ ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث بافاق محدثین ضعیف ہے "معصیت کی نذر (جائز) نہیں اور اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہی ہے۔" حافظ نے کہا ہے کہ امام غماوی رحمۃ اللہ علیہ اور ابو علی بن سکن نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ اور پھر کہا ہے کہ اس پر محدثین کا اتفاق ہے۔ میں کہتا ہوں کہ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے الجامع الصغیر میں اس حدیث پر صحت کی علامت لکھی دی ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ کا موقف ہے کہ نذر معصیت کی صورت میں کفارہ واجب نہیں ہوتا۔ آپ نے اپنے اس قول میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ نذر دو طرح کی ہوتی ہے پس جس نے نذر باطنانہ مانی تو وہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہوگی اور اسے پورا کرنا لازم ہے اور جس کسی نے معصیت کی نذر مانی تو وہ شیطان کے لئے ہوگی اور اسے پورا کرنا جائز نہیں۔ اس حدیث میں وجہ استدلال یہ ہے کہ کفارہ ادا کرنا تیب واجب ہوتا ہے جب نذر کو پورا کرنا واجب ہو کیونکہ یہ کفارہ نذر پوری نہ کرنے کے گناہ کو ساقط کر دیتا ہے۔ اور جب نذر کو پورا کرنا ہی واجب نہ ہو تو پھر اس پر کفارہ بھی واجب نہیں ہوگا۔ لیکن یہ نص کے مقابلے میں عقلی استدلال ہے اور تمام صورتوں میں یہ جاری بھی نہیں ہو سکتا۔ مثلاً جب کوئی اللہ تعالیٰ کے نام پر گناہ کرنے کی قسم کھاتا ہے تو اس پر واجب ہے کہ قسم توڑ دے اور کفارہ ادا کرے تاکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی کو بے حرمتی سے بچالے (اور اس کی عظمت و شان قائم رہے) تو یہی صورت حال مذکورہ مسئلہ میں بھی ہے۔ حضرت ثابت بن خنک بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مقدس میں ایک آدمی نے مقام بوانہ پر اونٹ قربان کرنے کی نذر مانی۔ چنانچہ وہ آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور اپنی نذر کے بارے آپ ﷺ کو مطلع فرمایا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا کیا عہد جاہلیت کے بتوں میں سے وہاں کوئی نص تہنہ تھا جس کی تو عبادت کرتا تھا۔ تو صحابہ کرام نے عرض کی نہیں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کیا وہاں عہد جاہلیت کے میلوں میں سے کوئی میلہ لگتا تھا۔ صحابہ کرام نے عرض کی نہیں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا تو اپنی نذر پوری کر۔ کیونکہ اس نذر کو پورا کرنا جائز نہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی ہو اور نہ اسے پورا کرنا لازم ہے جس کا انسان مالک نہ ہو۔ اسے ابو داؤد نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے (1)۔

حضرت عمرو بن شعبہ اپنے باپ کے واسطے سے اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ ایک عورت نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میں نے نذر مانی تھی کہ (اظہار سرت کے لئے) میں آپ کے سر پر دف بجاؤں گی تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا تو اپنی نذر پوری کر لے۔ رواہ ابو داؤد (2)۔ اور ایک روایت میں یہ زائد ہے کہ اس نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اور میں نے یہ نذر مانی ہے کہ میں فلاں فلاں مقامات پر جانور ذبح کروں گی۔ اس میں عورت نے ان مقامات کا ذکر کیا جن پر عہد جاہلیت میں جانور ذبح کئے جاتے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا اس مقام پر عہد جاہلیت کے بتوں میں سے کوئی ایسا بت تھا جس کی عبادت کی جاتی تھی؟ اس نے عرض کی نہیں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کیا زمانہ جاہلیت کے میلوں میں سے کوئی میلہ وہاں لگتا تھا؟ اس نے عرض کی نہیں تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا تو اپنی نذر پوری کر لے۔

میں کہتا ہوں کہ یہاں نظر پوری کرنے کا امر و وجوب کے لئے نہیں۔ اس پر تمام علماء کا اجماع ہے۔ اور یہ اس لئے ہے تاکہ ان تمام

احادیث کے درمیان تطبیق ممکن ہو سکے۔ اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد کہ نذر وہ ہوتی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی مقصود ہو۔ لہذا وہ نذر جس میں طاعت و فرمانبرداری نہ ہو تو وہ یہ صلاحیت نہیں رکھتی کہ اسے پورا کرنا واجب ہو اور نہ اس سے مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا ہو سکتی ہے۔ اس لئے یہاں امراباحت کے لئے ہوگا۔ اور معصیت کی نذر میں معصیت کو ترک کرنا اور کفارہ ادا کرنا لازم ہے تو یہاں بدرجہ اولیٰ ترک معصیت ہے۔

جس آدمی نے نذر طاعت مانی لیکن اسے اضافی قیود و اوصاف سے متعین کر دیا تو اگر وہ قیود اور اوصاف اللہ تعالیٰ کے نزدیک مرغوب فیہ اور پسندیدہ ہوں۔ درجات میں اضافے اور ثواب میں کثرت کا موجب ہوں تو پھر ان قیود و اوصاف سمیت نذر کو پورا کرنا واجب ہے۔ اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مرغوب فیہ نہ ہوں اور درجات میں بلندی کا سبب نہ ہوں تو پھر آدمی پر ان شرائط کو پورا کرنا لازم نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ان صفات اور قیود کے نہ پائے جانے کی صورت میں کفارہ واجب ہوگا یا نہیں؟ تو اس کے بارے میں اختلاف ہے جو ہر مباح چیز کو نذر کر کے اسے ترک کرنے کے بارے ہے۔ پس جس نے یہ نذر مانی کہ وہ بازار میں بیٹھنے کے دن نماز پڑھے گا۔ یا یہ نذر مانی کہ وہ روزہ رکھے لیکن نہ بیٹھے گا نہ گفتگو کرے گا اور نہ ہی کسی شئی کا سایہ حاصل کرے گا۔ یا یہ نذر مانی کہ وہ یہ درہم اس شہر میں اس فقیر پر صدقہ کرے گا۔ تو اس صورت میں اس پر نماز اور روزہ واجب ہو جائیں گے اور ساتھ ہی اس کے لئے یہ جائز ہوگا کہ وہ جس جگہ پر جس وقت چاہے نماز پڑھے اور روزہ رکھے اور اس کے ساتھ وہ گفتگو بھی کرتا رہے چاہے تو بیٹھا ہے اور سایہ بھی حاصل کرے۔ اسی طرح وہ جو درہم جس شہر میں جس فقیر پر چاہے صدقہ کر سکتا ہے۔ اس کی دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے۔ آپ بیان فرماتے ہیں کہ اس اثناء میں کہ حضور نبی کریم ﷺ ہمیں خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ اچانک آپ ﷺ کی نظر ایک آدمی پر پڑی جو کھڑا تھا۔ تو آپ ﷺ نے اس کے بارے میں دریافت فرمایا تو صحابہ کرام نے عرض کی یہ ابو اسراہیل ہے، اس نے کھڑے رہنے کی نذر مان رکھی ہے لہذا یہ نہ بیٹھا ہے نہ سایہ حاصل کرتا ہے نہ کلام کرتا ہے اور روزہ رکھے ہوئے ہے۔ تو حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا اسے حکم دو کہ یہ چاہے تو کلام کرے چاہے تو سایہ میں چلا جائے اور چاہے تو بیٹھ جائے اور اس کے ساتھ روزہ مکمل کرے۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے (1)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حیادی نذر پوری کرنا لازم ہے اور دیگر قیود کا لحاظ ضروری نہیں) آپ ﷺ نے اس موقع پر کفارہ کا حکم ارشاد نہیں فرمایا۔

اور جس آدمی نے یہ نذر مانی کہ وہ تین دن مسلسل روزے رکھے گا یا یہ نذر مانی کہ وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھے گا تو اس پر واجب ہے کہ وہ اپنی نذر کو (اسی صورت میں) مکمل کرے۔ لہذا اگر اس نے متفرق روزے رکھے یا بیٹھ کر نماز پڑھی تو یہ اس کے لئے جائز نہیں ہوگی اور اس پر انعام واجب ہوگا۔ کیونکہ بیٹھ کر نماز پڑھنے کا اجر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کے اجر کی نسبت نصف ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نسائی رحمۃ اللہ علیہ اور ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اور ابن ماجہ نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اطہرانی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واسطے سے حضرت عبد اللہ بن مسعود اور مطلب بن ابی ودیعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ ابو یوسف اور ابو داؤد نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی طرح حدیث نقل کی ہے اور مسلم ابو داؤد

اور نساکی نے حضرت ابن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی طرح حدیث روایت کی ہے اور روزوں میں تسلسل مرغوب فیہ امر ہے، اسی لئے کلمات کے روزوں میں تسلسل برقرار رکھنا واجب ہے۔

مسئلہ: اگر کسی نے مطلق نماز کی نذر مانی تو اس پر کھڑے ہو کر نماز پڑھنا واجب ہے کیونکہ نماز میں اصل یہی ہے کہ کھڑے ہو کر ادا کی جائے۔ اور اگر بیٹھ کر نماز پڑھنے کی نذر مانی تو کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر دونوں طریقوں سے نماز پڑھنا جائز ہے۔

مسئلہ: اگر کسی نے یہ نذر مانی کہ وہ پہلو کے بل یا چٹ لیٹ کر نماز پڑھے گا تو اس پر بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر نماز پڑھنا واجب ہے کیونکہ حالت اختیار میں نماز کے دوران ایٹنا شرعاً معروف نہیں۔ جبکہ بیٹھ کر نماز پڑھنا معروف بھی ہے اور جائز بھی۔ ہاں اگر مریض ایسا ہو جو بیٹھے پر قادر نہ ہو تو اگر اس نے لیٹ کر نماز پڑھنے کی نذر مانی تو اسے کے لئے لیٹ کر نماز پڑھنا جائز ہے۔ اور اگر وہ نذر پوری کرنے سے پہلے پہلے صحت یاب ہو گیا تو پھر اس کے لئے لازم ہے کہ وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھے۔

مسئلہ: وہ آدمی جس نے مسجد حرام میں نماز پڑھنے کی نذر مانی تو امام اعظم ابو حنیفہ اور امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم کے نزدیک اس کے لئے جائز ہے کہ وہ جس جگہ چاہے نماز پڑھے۔

امام زفر اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ جس نے بیت المقدس میں نماز پڑھنے کی نذر مانی پھر اس نے رسول اللہ ﷺ کی مسجد یا مسجد حرام میں نماز پڑھی تو اس کی نماز جائز ہوگی اور نذر پوری ہو جائے گی اور جس نے مسجد نبوی ﷺ میں نماز پڑھنے کی نذر مانی تو پھر اگر اس نے مسجد حرام میں نماز پڑھی تو اس کی نذر پوری ہو جائے گی اور اگر کسی اور جگہ نماز پڑھی تو نذر پوری نہیں ہوگی۔ اور جس نے مسجد حرام میں نماز پڑھنے کی نذر مانی تو اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی اور جگہ نماز پڑھے۔ (یعنی کسی اور جگہ نماز پڑھنے سے نذر پوری نہیں ہوگی) امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ فتح مکہ کے دن ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میں نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر یہ نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو فتح عطا فرمادی تو میں بیت المقدس میں دو رکعت نماز ادا کروں گا تو آپ ﷺ نے اسے ارشاد فرمایا یہیں نماز پڑھ لو۔ اس نے دوبارہ یہی عرض کی تو آپ ﷺ نے پھر فرمایا یہیں نماز پڑھ لو۔ اس نے تیسری بار پھر یہی عرض کی تو آپ ﷺ نے فرمایا تمہاری مرضی (۱)۔ (تمہیں اپنے کام کا اختیار ہے جیسے چاہو کر لو) اسے ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ دارمی رحمۃ اللہ علیہ اور بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام زفر رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے بارے میں کہتے ہیں کہ جس نے بیت المقدس میں نماز پڑھنے کی نذر مانی تو اس کے لئے مسجد حرام میں نماز پڑھنا جائز ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے دن مسجد حرام میں ہی تھے لیکن جو مسجد حرام میں نماز پڑھنے کی نذر مانے تو اس کے لئے کیسے جائز ہے کہ وہ کسی اور جگہ نماز پڑھے۔ جبکہ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے ایک آدمی کا اپنے گھر میں نماز پڑھنے کی نسبت محلے کی مسجد میں نماز پڑھنا بچیس گنا زیادہ ہے اور جامع مسجد میں نماز پڑھنا پانچ سو گنا زیادہ ہے اور مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے سے ہزار نماز کا ثواب ہے۔ (مسجد نبوی ﷺ) میں نماز پڑھنے سے پچاس ہزار نمازوں کا ثواب ہے اور مسجد حرام میں نماز پڑھنے سے اس کے لئے ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ہے۔ اسے ابن ماجہ نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے (۲)۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے

روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میری مسجد میں ایک نماز پڑھنا مسجد حرام کے سوا دیگر مساجد میں ایک ہزار نماز پڑھنے سے بہتر ہے (1)۔ صحیحین کی اسی حدیث کی مثل امام غلّاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وساطت سے حضور نبی کریم ﷺ سے حدیث طیبہ نقل کی ہے۔ امام غلّاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عطاء بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میری اس مسجد میں ایک نماز پڑھنا مسجد حرام کے سوا دیگر مساجد میں ایک ہزار نماز پڑھنے سے افضل ہے۔ اور مسجد حرام میں ایک نماز پڑھنا میری اس مسجد میں ایک لاکھ نماز پڑھنے سے افضل ہے (2)۔ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے موقوف اور حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع روایت اسی طرح مروی ہے۔

امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جواب یہ دیا ہے کہ مذکورہ تمام احادیث فرامض کے ساتھ مختص ہیں۔ کیونکہ مساجد میں فرض نماز کی فضیلت مذکورہ ترتیب کے مطابق حق ہے۔ لیکن تو اہل کا یہ حکم نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا فرض نماز کے سوا آدمی کی افضل ترین نماز اپنے گھر میں ہے۔ اسے صحیحین نے صحیحین میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے (3)۔

ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ آدمی کا اپنے گھر میں نماز پڑھنا میری اس مسجد میں نماز پڑھنے سے افضل ہے سوائے فرض نماز کے (4)۔ امام غلّاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ میرے نزدیک اپنے گھر میں نماز پڑھنا مسجد میں نماز پڑھنے سے زیادہ پسندیدہ ہے (5)۔

مسئلہ: جس نے یہ نذر مانی کہ جب میرا غائب (گمشدہ آدمی) آگیا یا جب میرا عرض شفا یاب ہوا تو مجھ پر ایک مہینے کے روزے لازم ہیں۔ تو شرط پائے جانے کے بعد اس پر ایک مہینے کے روزے رکھنا واجب ہوں گے اور اگر اس نے شرط پائے جانے سے پہلے ایک مہینے کے روزے رکھ لئے تو وہ نذر کی طرف سے جائز نہیں ہوں گے۔ اور پھر شرط پائے جانے کے بعد دوبارہ روزے رکھنا اس پر واجب ہوں گے۔ اس میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف ہے۔ کیونکہ ہمارے نزدیک شرط انعقاد سبب کے مانع ہے اور وجود سبب سے قبل ادا جائز نہیں ہوتی اور ان کے نزدیک شرط حکم کے مانع ہے نہ کہ سبب کے۔ لہذا ادا جائز ہوگی جیسا کہ نصاب مکمل ہونے کے بعد سال گزرنے سے قبل زکوٰۃ کی ادا بھی جائز ہوتی ہے۔

مسئلہ: اگر کسی نے وجوب ادا کی نسبت کسی مہینے کی طرف کی تو امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس مہینے کے روزے سے پہلے ہی زکوٰۃ ادا کرنا جائز ہے۔ جبکہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ہے کہ نذر کی نسبت کسی خاص وقت کی طرف کرنا ایسے ہی ہے جیسے اسے کسی شرط کے ساتھ معلق کر دیا جائے۔ (یعنی جس طرح اس میں ادا بھیگی کے صحیح ہونے کے لئے شرط کا وجود ضروری ہے اسی طرح نذر کی ادا بھیگی کے صحیح ہونے کے لئے اس معینہ وقت کا وجود بھی ضروری ہے) لیکن وہ دونوں یہ فرماتے ہیں

2- شرح مشکل الآثار جلد 2، صفحہ 61، حدیث 597 (مؤسسۃ الرسالہ)

1- صحیح مسلم جلد 1، صفحہ 447 (قدیمی)

4- سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 149 (وزارت تعلیم)

3- صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 101 (وزارت تعلیم)

5- شرح معانی الآثار، جلد 1، صفحہ 200 (وزارت تعلیم)

کہ اس طرح نہیں بلکہ یہ تو نذر منجز ہے جسے وقت کی قید سے متقید کر دیا گیا ہے لہذا یہ قیود لغو اور ناقابل اعتبار ہوں گی۔ جیسا کہ کوئی یہ کہے قسم بخدا! میں بازار میں نماز پڑھوں گا تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ جہاں چاہے نماز پڑھے۔ اسی طرح کسی نے یہ نذر مانی کہ میں رجب کے مہینے میں روزے رکھوں گا یہ کہا کہ میں اس سال کے بعد تیسرے سال میں حج کروں گا تو اس کے لئے یہ جائز ہے کہ چاہے تو مقررہ وقت سے پہلے روزے رکھے اور حج بھی کر لے اور اگر چاہے تو وقت گزرے کے بعد بھی وہ روزے اور حج ادا کر سکتا ہے۔

امام زفر رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ میں یہ کہا ہے کہ وہ وقت جس کی طرف اس نے اپنی نذر کی نسبت کی ہے اگر شرعاً فضیلت والا ہو پھر اس نے اس وقت سے پہلے ایسے وقت میں روزے رکھے جو فضیلت کے لحاظ سے کم ہے تو اس کی نذر پوری نہ ہوگی بلکہ معینہ وقت آنے پر روزوں کا اعادہ اس پر واجب ہوگا تا کہ وہ وقت کی فضیلت کو بھی پاسکے۔ اور اگر ایسی صورت حال نہ ہو تو پھر قبل از وقت روزے رکھ لینا جائز ہے۔ میرے نزدیک یہی الظہر ہے۔ مثلاً کسی نے یوم عرفہ (نویں ذی الحجہ کا دن) یا یوم عاشوراء (دسویں محرم کا دن) یا ذوالحجہ کے پہلے نو دنوں یا محرم شریف کے مہینے کے روزے رکھنے کی نذر مانی تو اس کے لئے ان مقررہ دنوں سے قبل روزہ رکھنا جائز نہیں ہوگا۔ اسی طرح جس نے یہ نذر مانی کہ وہ وسط رات کے وقت نماز پڑھے گا تو پھر اس رات سے پہلے یا بعد دن کے وقت نماز پڑھنے سے نذر پوری نہیں ہوگی۔ (اور اگر یہ شب کیا جائے کہ نذر ماننے والا آنے والی رات تک زندہ باقی نہیں رہے گا اس لئے اس نے احتیاطاً دن کے وقت نماز پڑھ لی) تو اس کے بارے ہمارا قول یہ ہے کہ ظن غالب یہ ہے کہ وہ آنے والی رات تک زندہ رہے گا (کیونکہ اس کی موت کے آثار ظاہر نہیں)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا یوم عرفہ کے روزے کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے اتنے اجر و ثواب کی امید رکھتا ہوں کہ وہ اسے گزشتہ سال اور آنے والے سال کے گناہوں کا کفارہ بنا دے گا۔ اور یوم عاشوراء کے روزے کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے اتنے اجر و ثواب کی امید رکھتا ہوں کہ وہ گزشتہ سارے سال کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا (1)۔ اسے مسلم، ابن حبان، ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابو قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ نے ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واسطے سے حضرت قتادہ بن نعمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ اسی بارے میں حضرت زید بن ارقم، سہیل بن سعد اور ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی حدیث طرانی نے روایت کی ہے۔ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث نقل کی ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس بارے میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ سے بھی حدیث مروی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کوئی ایسے دن نہیں جن میں عمل صالح ذی الحجہ کے ان ایام (ایام تشریق) کی نسبت اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہو۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنا بھی (ان دنوں کے عمل کی نسبت) زیادہ پسند نہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنا بھی نہیں مگر جب کوئی آدمی اپنی جان و مال کے ساتھ گھر سے نکلا اور پھر ان میں سے کسی شئی کے ساتھ واپس نہ لوٹا (یعنی جان و مال دونوں اللہ تعالیٰ کے راستے میں قربان کر دیئے تو ایسا جہاد) (ان دنوں کے عمل صالح سے زیادہ پسندیدہ ہے) اسے ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے (2)۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی ایسے دن نہیں جن میں عبادت کرنا ذوالحجہ کے دس دنوں میں عبادت کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کے

نزدیک زیادہ پسندیدہ ہو۔ بیٹک ان میں سے ایک دن کا روزہ ایک سال (روزے رکھنے کے) مساوی ہے اور ان کی ایک ایک رات لیلۃ القدر کے برابر ہے۔ اسے ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے (1)۔ اور یہ حدیث ضعیف ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رمضان المبارک کے روزوں کے بعد افضل ترین روزے شہر اللہ محرم الحرام کے روزے ہیں۔ اور فرض نماز کے بعد افضل ترین نماز رات کی نماز ہے (2)۔ اسے مسلم اور اصحاب سنن ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ علاوہ ازیں رویائی نے مسند میں اور طبرانی نے معجم سے نقل کیا ہے۔

جس کسی نے پیادل چل کر حج کرنے کی نذر مانی تو اس کے بارے میں حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مسلک ذکر کیا گیا ہے کہ اس آدمی کو اختیار ہے چاہے توجہ کے لئے سوار ہو کر جائے یا پیادل۔ یعنی اس پر پیادل حج کرنا واجب نہیں۔ علماء کے ایک اور گروہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ اس قول کا انحصار اس سادہ نظریہ پر ہے کہ جس نے طاعت و عبادت کی نذر مانی تو اس میں ایسی شرط لگادی جو طاعت نہیں تو اس پر اس شرط کو پورا کرنا لازم نہیں ہوگا۔ قدوری اور دیگر اکثر مفسرین میں (آپ رحمۃ اللہ علیہ کا) یہ موقف بیان کیا گیا ہے کہ وہ پیادل چل کر ہی حج ادا کرے گا اور طواف زیارت کرنے تک کسی سواری پر سوار نہیں ہو سکتا۔ البتہ وہ مقام جہاں سے پیادل چلنے کا آغاز کرنا ہے اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ پیادل چلنے کا آغاز عقیقات سے کرے گا کیونکہ حج کے احکام وہیں سے شروع ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے بارے میں صحیح ترین قول یہ ہے کہ وہ اپنے گھر سے ہی پیادل چلے گا۔ کیونکہ عرفاس کی نذر سے یہی مراد ہے۔ لیکن اگر اس کی نیت اس کے خلاف ہو تو پھر نیت پر عمل لازم ہوگا۔ صاحب ہدایے نے کہا ہے کہ جو کچھ قدوری میں ذکر کیا گیا ہے وہ اس طرف اشارہ ہے کہ نذر کے سبب اس پر پیادل چلنا واجب ہے۔ امام غلامی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہی موقف امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

یہاں قول کرنے والوں کی دلیل یہ ہے کہ ان کے نزدیک سوار ہو کر حج کرنا پیادل چل کر حج کرنے کی نسبت افضل ہے۔ اور یہ دلیل بالکل ظاہر ہے کیونکہ منذر کا عبادت ہونا ضروری ہے اور پیادل چلنے میں ترک اولیٰ لازم آتا ہے۔ (کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حج کے لئے استطاعت کو بنیادی شرط قرار دیا ہے اور استطاعت میں سواری بھی شامل ہے)

اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک پیادل چل کر حج کرنا افضل ہے بشرطیکہ چلنے کی قدرت اور طاقت ہو۔ لیکن آپ کے نزدیک وہ شئی جس کی نذر مانی گئی ہے وہ ایسے واجب کی جنس سے نہیں جو واجبات مقصودہ میں سے اللہ تعالیٰ کی جانب سے واجب ہو۔ اور پیادل چلنا ایسے واجب کی جنس سے نہیں۔ (اس لئے پیادل چلنا ہی لازم اور ضروری نہیں ہوگا اس کی تائید احادیث سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا کہ اپنے دو بیٹوں کے درمیان ان کے سہارے چل رہا تھا تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا اسے کیا ہوا ہے؟ تو صحابہ کرام نے عرض کی۔ اس نے پیادل چلنے کی نذر مانی تھی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس سے مستغنی ہے۔ اسے اس کی کوئی حاجت اور ضرورت نہیں کہ یہ اپنے آپ کو مصیبت میں مبتلا کئے ہوئے ہے پھر آپ ﷺ نے اسے سوار ہونے کا حکم ارشاد فرمایا۔ متفق علیہ (3)۔ اور مسلم شریف کی روایت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس طرح مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا اسے بوڑھے! سوار ہو جا کیونکہ اللہ

تعالیٰ تجھ سے اور تیری نذر سے نئی ہے (اسے اس کی کوئی حاجت اور ضرورت نہیں) (۱)

حضرت عقبہ بن عامرؓ جیسی کی حدیث ہے وہ فرماتے ہیں میری بہن نے بیت اللہ شریف تک پیدل چلنے کی نذر مانی پھر انہوں نے مجھے حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں فتویٰ طلب کرنے کے لئے بھیجا۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا چاہے تو پیدل چلے اور چاہے تو سوار ہو جائے۔ (مشفق علیہ (2)۔

دوسرا قول کرنے والوں کی حجت یہ ہے کہ پیدل چلنا عبادت مقصودہ ہے اور طواف زیارت میں پیدل چلنا واجب ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جیسا کہ ہم عقرب بنی ذکر کریں گے۔ لہذا نذر کے سبب بھی پیدل چلنا واجب ہوگا۔ رہا ان کے استدلال کا جواب جو انہوں نے مذکورہ بالا احادیث سے کیا ہے وہ یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اس بوڑھے کو سوار ہونے کا حکم تب ارشاد فرمایا جب اسے دیکھا کہ وہ چلنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں صراحت موجود ہے کہ آپ ﷺ نے اس بوڑھے کو دیکھا وہ اپنے بیٹوں کے درمیان ان کے سہارے سے چل رہا ہے۔ اسی طرح عقبہ کی بہن کے قصہ میں بھی ہے جو کہ ابو داؤد کی روایت میں مذکور ہے۔ کہ وہ چلنے کی طاقت نہیں رکھتی تھیں۔ لہذا ان دونوں حدیثوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب پیدل چلنے کی قدرت اور طاقت نہ ہو تو پھر سوار ہونا جائز ہے۔ لیکن یہ احادیث پیدل چلنے کے واجب نہ ہونے پر دلالت نہیں کرتیں۔ بلکہ نذر کے سبب سوار ہونے کے جواز پر دلالت کرتی ہیں۔

مسئلہ: اگر پیدل چل کر حج کرنے کی نذر میں کوئی آدمی نذر کے سبب یا بغیر نذر کے سوار ہوا تو بالا جماع اس پر یہ واجب نہیں کہ وہ دوبارہ پیدل چل کر حج کرے۔ حالانکہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مقرر کردہ اصول پر قیاس کا مقتضی یہ ہے کہ سوار ہونے کے سبب نذر ماننے والا اپنی نذر سے بری الذمہ نہ ہو۔ (بلکہ اس کا اعادہ اس پر لازم ہو) جیسا کہ اگر کسی نے لگا تا روزے رکھے یا کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی نذر مانی (پھر وہ ایسا نہ کرے تو نذر پوری نہیں ہوتی) لیکن مذکورہ مسئلہ میں ہم نے قیاس کو اس لئے چھوڑ دیا ہے کیونکہ اس میں سوار ہونے کی رخصت نص سے ثابت ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ مذکورہ بالا احادیث سے تو رخصت صرف ان لوگوں کے لئے ثابت ہوتی ہے جو پیدل چلنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں۔ اور جو پیدل چلنے کی طاقت رکھتے ہوں ان کے لئے یہ حکم نہیں۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ اگر چلنے کی طاقت رکھنے والا بغیر نذر کے سوار ہو تو وہ اپنی نذر سے بری الذمہ نہ ہو؟

ہم کہتے ہیں کہ مذکورہ سوال کا جواب دو طرح سے ہو سکتا ہے ایک یہ کہ اکثر احکام شرعیہ عام ہوتے ہیں اور حج میں ظن غالب یہ ہے کہ عموماً پیدل چلنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ اسی لئے علماء نے کہا ہے کہ حج کے لئے زار اور اور سواری پر قادر ہونا اس لئے ضروری ہے کہ آدمی احکام حج ادا کرنے پر قادر ہو جائے۔ یہ فقط سہولت اور آسانی کے لئے نہیں۔ اور جس رخصت کے بارے میں نے کہا ہے اس کی تائید حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ آپ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جب بھی ہمیں خطبہ ارشاد فرمایا تو ہمیں صدقہ کرنے کا حکم فرمایا اور مسئلہ کرنے سے منع فرمایا۔ اور مزید یہ فرمایا کہ یہ بھی مسئلہ کی ہی ایک صورت ہے کہ آدمی پیدل چل کر حج کرنے کی نذر مانے۔ پس جو کوئی پیدل حج کرنے کی نذر مانے۔ اسے چاہئے کہ وہ ایک جانور کی قربانی دے دے اور سواری پر سوار ہو جائے۔ اسے حاکم نے مستدرک میں بیان کیا ہے اور ساتھ کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے (3)۔

جواب کی دوسری صورت یہ ہے کہ اگر واجب عذر کے ساتھ یا بغیر عذر کے ترک ہو جائے تو وہ ہر صورت میں بصورت قضاء ادا کی جاتا ہے۔ پھر اگر پیدل چلنا مستقل عبادت ہے تو پھر اس کا تقاضا ہے کہ بعینہ اسے بصورت قضاء ادا کیا جائے۔ اور اگر وہ عبادت کی جزائش یا وصف ہے تو پھر چونکہ وہ مستقل عبادت نہیں اس لئے مثل معقول کے ساتھ اس کی قضاء کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ مثل غیر معقول کے ساتھ اس کی قضاء تصور ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ عیدہ سہو واجبات نماز کے لئے تقاضا ہے۔ لیکن ایسی قضاء جو مثل غیر معقول ہو اس کا ادراک رائے اور قیاس سے نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کا تعین شارع پر موقوف ہوتا ہے۔ پس اگر شارع کی جانب سے مثل غیر معقول ظاہر ہو جائے تو پھر اسکی قضاء اسی مثل غیر معقول کے ساتھ کی جائے گی اور اس عبادت کو دوبارہ ادا نہیں کیا جائے گا۔ بصورت دیگر اس عبادت کو دوبارہ ادا کیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب روزوں میں تسلسل اور نماز میں قیام کے لئے کوئی مثل غیر معقول ظاہر نہ ہوئی تو ہم نے یہ حکم لگادیا کہ روزہ کا بھی اعادہ کیا جائے اور نماز بھی دوبارہ پڑھی جائے۔ اور پیدل چلنے کی مثل غیر معقول ایک جانور کی قربانی کا ہمیں علم ہو گیا تو ہم حکم لگادیا کہ حج دوبارہ نہ کیا جائے بلکہ اس واجب کی قضا ایک جانور کی قربانی سے کی جائے۔ لہذا معذور اور غیر معذور کے مابین فرق صرف یہ ہے کہ بالغہ پھلنے کو ترک کرنے والا گنہگار نہیں ہوگا، جبکہ بالغہ عذر کے چھوڑنے والا گنہگار ہوگا۔ یہ مسند ایسے ہی ہے جیسے وقوف مزدلفہ کو بغیر عذر کے ترک کرنا جائز نہیں لیکن عذر کے ساتھ ایسا کرنا جائز ہے۔ لیکن ہر دو صورت میں ایک جانور کی قربانی واجب ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ: جس کسی نے پیدل چل کر حج کرنے کی نذر مانی۔ پھر اس نے عذر کے سبب یا بغیر عذر کے سوار ہو کر حج کیا تو اس پر ایک بدنی قربانی واجب ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور صاحبین نے کہا ہے کہ ایسے آدمی پر دو ازم ہے اور وہ کم سے کم ایک بکری کی قربانی ہے اور جب کسی نے اپنے قول اللہ علی ان احج ماشیا سے قسم کا ارادہ کیا تو پھر اس پر کفارہ قسم بھی لازم ہوگا۔ اسی طرح امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ اس پر صرف قسم کا کفارہ لازم ہوگا۔ سوار ہونے کی صورت میں قربانی واجب ہونے کی دلیل حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ ان کی بہن نے بیت اللہ شریف تک پیدل چلنے کی نذر مانی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اسے سوار ہونے اور قربانی دینے کا حکم ارشاد فرمایا تھا (1)۔ اسے ایلوداؤد نے ذکر کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جو حدیث صحیحین میں ہے اس میں اختصار ہے (کیونکہ اس میں قربانی کا ذکر نہیں) جبکہ ایلوادؤد کی روایت میں قربانی کا ذکر ہے) اس لئے یہ حدیث مطلق قربانی کے واجب ہونے میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل ہے۔ اگرچہ وہ مطلق قربانی بکری ہی ہو۔ (تو وہ بھی صحیح ہے)

ہم یہ کہتے ہیں کہ مذکورہ صورت میں قربانی کو بدنی (اونٹ) گائے اور بھینس وغیرہ کی قربانی کے ساتھ خاص کرنا حدیث طیبہ سے ثابت ہے۔ چنانچہ ایلوادؤد حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کرتے ہیں کہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بہن نے پیدل چل کر حج کرنے کی نذر مانی۔ اور وہ چلنے کی طاقت نہیں رکھتی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ کو تیری بہن کے پیدل چلنے کی کوئی ضرورت نہیں، پس اسے چاہئے کہ وہ سوار ہو جائے اور ایک بدنی بطور قربانی دے۔

اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عقبہ بن عامر رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث اس طرح نقل کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں میری بہن نے

کعبہ معظمہ تک پیدل چل کر جانے کی نذر مانی تو آپ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ اس کے پیدل چلنے سے مستغنی ہے۔ (یعنی اللہ تعالیٰ کو اس کے پیدل چلنے کی قطعاً ضرورت نہیں) اسے حکم وہ کہ وہ سوار ہو جائے اور ایک ہدایت قرآنی کرے۔ میں کہتا ہوں یہ حدیث حسن ہے، کیونکہ یہ ابن ابی داؤد سے اس سند کے ساتھ مروی ہے حدیث یحییٰ بن ابراہیم حدیثنا عبد العزیز بن مسلم حدیثنا مطر الوراق عن کرمۃ عن۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ عبد العزیز بن مسلم راوی مجہول ہے اور مطر الوراق کے بارے ابن سعد نے کہا ہے کہ یہ ضعیف فی الحدیث ہے۔ تو ہم یہ کہیں گے کہ ذہبی نے کہا ہے عبد العزیز معروف راوی ہے لہذا جس نے اسے مجہول سمجھا ہے وہ اس کے لئے باعث ضرر نہیں۔ اور مطر الوراق رجال مسلم میں سے ہے اور ذہبی نے اسے ثقہ قرار دیا ہے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور ابن معین نے اسے صرف عطاء سے روایت کرنے میں ضعیف الحدیث قرار دیا ہے، جبکہ یہ روایت تو کرمۃ سے مروی ہے۔ ابن ہمام نے کہا ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث کے راویوں کے قوی ہونے کی بنا پر مطلق قرآنی کا قول کیا ہے اور اسے ہدایت کے ساتھ مقید نہیں کیا۔

ہم کہتے ہیں کہ وہ حدیث جس میں مطلق قرآنی کا ذکر ہے اس کے راویوں کا قوی ہونا اولاً تو قابل تسلیم ہے ہی نہیں اور اگر ہم تسلیم کر بھی لیں تب بھی راویوں کی قوت کے سبب حدیث کو ترجیح جب حاصل ہوتی ہے جب دور وراثتوں کے مابین تعارض پایا جائے۔ لیکن یہاں تو تعارض موجود ہی نہیں بلکہ مطلق اور مقید دونوں روایتیں ایک ہی واقعہ کے بارے میں ایک ہی حکم میں ہیں۔ اس لئے بالیقین مطلق کو مقید پر جموں کیا جائے گا۔ اسی کے بارے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بھی اقوال مروی ہیں۔ یہ موقوف روایات ہیں لیکن مرفوع کے حکم میں ہیں۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سعد بن عروہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے قتادہ سے اور انہوں نے حسن سے یہ نقل کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس آدمی کے بارے فرمایا جو پیدل چلنے کی قسم کھاتا ہے کہ اگر وہ پیدل چلنے سے عاجز ہو تو سوار ہو جائے اور ایک ہدایت قرآنی کرے۔

عبدالرزاق نے صحیح سند کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ نقل کیا ہے کہ جس کسی نے بیت اللہ شریف تک پیدل چلنے کی نذر مانی تو اسے چاہئے کہ وہ پیدل چلے اور اگر تھک جائے تو سوار ہو جائے اور ایک اونٹ قرآنی کرے۔ اسی طرح کے اقوال حضرت ابن عمر ابن عباس قتادہ اور حسن رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہیں۔

مسئلہ: جس کسی نے یہ کہا کہ بیت اللہ شریف یا کعبہ معظمہ تک پیدل چل کر جانا مجھ پر لازم ہے اور اس کے ساتھ اس نے حج یا عمرہ کے الفاظ ذکر نہ کئے تو اس پر اتحساناً پیدل چل کر حج یا عمرہ کرنا لازم ہے۔ اور قیاساً اس پر کوئی شمی بھی لازم نہیں۔ وجہ اتحسان یہ ہے کہ ان الفاظ کے ساتھ حج یا عمرہ کی عبادت متعارف ہے۔ (یعنی اگر ان الفاظ سے نذر ہی مانی جائے تو عرفاً اس سے مراد حج یا عمرہ کرنا ہی ہوتا ہے۔ اس لئے اس پر حج یا عمرہ کرنا لازم ہوگا) اور اگر الفاظ یہ کہے کہ حرم پاک کی طرف پیدل چل کر جانا مجھ پر لازم ہے تو امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس پر کوئی شمی لازم نہیں ہوگی۔ کیونکہ ان الفاظ کے ساتھ حج یا عمرہ کا لازم ہونا متعارف نہیں لیکن صاحبین کے نزدیک احتیاطاً اس پر حج یا عمرہ کرنا لازم ہوگا۔

اور اگر الفاظ اسی طرح کہے کہ صفا یا مروہ یا عرفہ یا مزدلفہ یا منیٰ یا مقام ابراہیم کی طرف پیدل چل کر جانا مجھ پر لازم ہے تو بالاتفاق اس پر کوئی شمی واجب نہیں ہوگی۔ اسی طرح اگر اس نے مشی (پیدل چلنے) کی بجائے ذہاب خروج یا سفر کے الفاظ استعمال کئے، یعنی

مجھ پر بیت اللہ شریف کی طرف جانا یا نکلنا یا سفر کرنا لازم ہے تو اس پر کوئی شیء واجب نہیں ہوگی۔ تو حقیقتاً اس کا دارود اعراف عام پر ہے، بعض الفاظ سے یہ عبادت لازم ہو جاتی ہے اور بعض سے نہیں۔ اور اگر اس نے اپنے قول علی العشی الی بیت اللہ سے مدینہ طیبہ کی مسجد، بیت المقدس یا کسی دوسری مسجد کی طرف چلنے کی نیت کی تو اس پر کچھ بھی لازم نہیں ہوگا کیونکہ بیت اللہ کا اطلاق مسجد پر کرنا صحیح ہے۔

مسئلہ: جس نے کسی طاعت و عبادت کی نذر مانی تو اس کے سبب اس پر وہ عبادت و طاعت بھی لازم ہوگی اور ساتھ ہی ان تمام شرائط کی پابندی بھی لازم ہوگی جن پر اس عبادت کی صحت موقوف ہے۔ مثلاً کسی نے یہ نذر مانی کہ وہ دو رکعت نماز بغیر وضو کے یا بغیر قرأت کے ادا کرے گا یا ایک رکعت یا تین رکعتیں نماز پڑھنے کی نذر مانی۔ تو اس پر دو رکعتیں وضو اور قرأت کے ساتھ پڑھنی لازم ہوگی اور تین رکعتوں کی نذر کی صورت میں چار رکعتیں پڑھنی لازم ہوگی۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسی نذر صحیح نہیں ہوگی۔ لہذا اگر کسی نے بغیر وضو کے دو رکعت نماز پڑھنے کی نذر مانی (تو یہ نذر صحیح نہیں ہوگی) کیونکہ بغیر وضو کے نماز پڑھنا طاعت و عبادت نہیں۔ ہاں اگر بغیر قرأت کے نماز پڑھنے کی نذر مانی تو یہ بھی طاعت ہوتی ہے مثلاً امی (ناخواندہ) آدمی کا نماز پڑھنا۔ علاوہ ازیں تمام صورتوں میں امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا موقف امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے موافق ہے۔

امام زفر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اگر کسی نے تین رکعتیں نماز پڑھنے کی نذر مانی تو اس پر دو رکعتیں نماز پڑھنا لازم ہوگی۔ علاوہ ازیں صورتوں میں اس پر کچھ بھی لازم نہیں ہوگا۔ کیونکہ بغیر وضو کے نماز پڑھنا بغیر قرأت کے یا ایک رکعت نماز پڑھنا چاہے یہ مفرد ہو یا اس سے پہلے دو رکعتیں اور ہوں یہ قربت اور عبادت ہی نہیں۔ لہذا ان کی نذر جائز نہیں ہوگی۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ کوئی بھی شیء اپنے اوپر لازم کر لینے سے لازم ہو جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ وہ تمام چیزیں بھی لازم ہو جاتی ہیں جن کے بغیر اسکا ادا بھی صحیح نہیں ہوتی۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ: جس کسی نے پیدل چل کر حج کے سبب یا بغیر عذر کے سوار ہو کر حج کیا اور بدن کی قربانی دی تو پھر کیا اس پر کفارہ ادا کرنا بھی واجب ہوگا یا نہیں؟ تو اس کے بارے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس پر کفارہ واجب نہیں ہوگا۔ مگر جب اس نے قسم کی نیت کی (تو پھر کفارہ قسم واجب ہوگا) اس مسئلہ میں ایسا ہی اختلاف ہے جیسا کہ اہل منذر کے فوت ہونے کی صورت میں اختلاف اس سے قبل گزر چکا ہے

مسئلہ: جس کسی نے مطلق احکاف کرنے کی نذر مانی تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس پر روزہ اور احکاف دونوں واجب ہوں گے۔ جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس پر روزہ لازم نہیں ہوگا۔ اس اختلاف کا دارود اعراف کے اس اختلاف پر ہے کہ کیا روزہ احکاف کے لئے شرط ہے یا نہیں۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ روزہ احکاف کے لئے شرط نہیں لہذا احکاف بغیر روزے کے اور رات کے وقت بھی صحیح ہو جاتا ہے، اس کی کم سے کم مدت ایک ساعت ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ روزہ احکاف کے لئے شرط ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی حسن نے یہی روایت کی ہے۔ فی الحقیقت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ

واجب اعتکاف کے صحیح ہونے کے لئے روزہ شرط ہے لیکن نقلی اعتکاف کے لئے نہیں۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ اعتکاف کے لئے اس کے ساتھ روزہ رکھنا شرط ہے۔ اس کی دلیل وہ حدیث طیبہ ہے جسے دارقطنی اور بیہقی نے روایت کیا ہے چنانچہ یہ سید بن عبدالعزیز سے، وہ سفیان بن حسین سے، وہ زہری سے اور وہ عروہ کے واسطے سے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حدیث روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اعتکاف نہیں ہوتا مگر روزے کے ساتھ (1)۔ (یعنی روزے کے بغیر اعتکاف صحیح نہیں ہوتا) دارقطنی نے کہا ہے کہ سید سفیان سے نقل کرنے میں منفرد ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے سید متروک الحدیث ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث محل نظر ہے۔ یحییٰ نے کہا ہے یہ کوئی شئی نہیں اور سفیان کے متعلق یحییٰ نے کہا ہے کہ وہ قوی نہیں۔ اور ابن حبان نے کہا ہے کہ سفیان زہری سے منقول حدیثیں نقل کرتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ذہبی نے اس کے بارے کہا ہے کہ وہ صدوق (بہت سچ بولنے والا) اور مشہور راوی ہے۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سند میں زہری کے سوا کسی پر کوئی جرح نہیں۔ مسلم نے اس کی روایت نقل کی ہے۔ علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے الکمال میں ذکر کیا ہے کہ علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے میں نے سفیان کے بارے عیشم سے پوچھا تو اس نے اس کے بارے اچھے کلمات کہے۔ نتیجتاً مذکورہ حدیث سید اور سفیان کی وجہ سے صحیح نہیں کیونکہ یہ زہری کی روایات میں سے ہے اور سفیان زہری سے روایت کرنے میں ضعیف ہے۔ دوسری دلیل وہ حدیث ہے جو ابوداؤد نے عبدالرحمن بن اخطی سے، انہوں نے زہری سے اور انہوں نے عروہ کے واسطے سے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نقل کی ہے، آپ فرماتی ہیں کہ مختلف کے لئے سنت یہ ہے کہ وہ کسی مریض کی عیادت نہ کرے نماز چتا زہ میں حاضر نہ ہو نہ عورت کو کوس کرے اور نہ اس سے مباشرت کرے اور ایسی حاجات کے سوا جن کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں باہر نہ نکلے اعتکاف صحیح نہیں ہوتا مگر روزے کے ساتھ اور اعتکاف نہیں ہوتا مگر جامع مسجد میں (2)۔

اگر یہ کہا جائے کہ ابوداؤد نے یہ کہا ہے کہ عبدالرحمن بن اخطی کے سوا کسی نے بھی اس حدیث کے لئے سنت کا لفظ استعمال نہیں کیا لہذا یہ حدیث موقوف ہے اور دارقطنی نے کہا ہے کہ عبدالرحمن ضعیف راوی ہے۔ میری طرف سے جواب یہ ہے کہ اس حدیث کو مرفوع قرار دینا راوی کی جانب سے زیادتی ہے (اور ثقہ کی زیادتی مقبول ہوتی ہے) اور عبدالرحمن ثقہ راوی ہے البتہ قدر یہ فرقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی طرح ابوداؤد نے کہا ہے۔ ابن معین نے اسے ثقہ کہا ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یہ صالح الحدیث ہے۔ اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ بھی اس کی روایت نقل کرتے ہیں۔

میں کہتا ہوں یہ حدیث حجت بنہ کی صلاحیت نہیں رکھتی کیونکہ یہ بالکل ظاہر اور واضح امر ہے کہ لا اعتکاف کے الفاظ "الْمُسْتَنَّةُ عَلٰی الْمُغْتَكِفِ اَنْ لَا يَفُوْدَ" کے تحت نہیں آسکتے کیونکہ یہ ترتیب کلام میں تبدیلی کا باعث ہے (اور سیاق کلام کے معنی کے خلاف ہے) اور اگر ہم حجت تسلیم بھی کر لیں تو پھر بھی اعتکاف میں روزے کا سنت ہونا ثابت ہوتا ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ اختلاف روزے کے شرط ہونے میں ہے اور یہ ایسا امر ہے جس کے لئے دلیل کا ہونا ضروری ہے۔ علامہ ابن جوزی نے یہ حدیث التحقیق میں دارقطنی کی سند سے نقل کی ہے کہ وہ زہری سے وہ سعید بن المسیب سے اور وہ عروہ کے واسطے سے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے

اور متکلف کے لئے سنت ہے کہ وہ انسانی حاجت کے بغیر باہر نہ نکلے نماز جنازہ کے لئے نہ جائے، عرض میں کی عبادت نہ کرے عورت کو مس نہ کرے اور نہ اس سے مباشرت کرے۔ اور اعتکاف نہیں ہوتا مگر جامع مسجد میں۔ اور آپ ﷺ اعتکاف کرنے والے کو روزہ رکھنے کا حکم ارشاد فرماتے تھے۔ علامہ ابن جوزی نے اس حدیث پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس کی سند میں ایک راوی ابراہیم بن خمر ہے۔ ابن عدی نے اس کے بارے کہا ہے کہ اس کی روایات منکر ہیں۔ اور دارقطنی نے کہا ہے کہا جاتا ہے کہ ان السنۃ للمعتکف کے الفاظ رسول اللہ ﷺ کا قول نہیں۔ بلکہ یہ زہری کا کلام ہے۔ اور جس نے اسے حدیث میں داخل کیا ہے اسے وہم ہوا ہے۔

اسی باب میں دلیل کے طور پر وہ حدیث بھی ہے جسے ابو داؤد نے عبد الرحمن بن بدیل سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے حضرت عمرو بن دینار سے یہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زمانہ جاہلیت میں کعبہ معظمہ کے پاس ایک دن یارات اعتکاف کرنے کی نذر مانی تھی پھر انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ سے اس کے بارے دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اعتکاف بھی کرو اور روزہ بھی رکھو (1)۔ اور انسانی کے الفاظ یہ ہیں کہ آپ ﷺ نے آپ کو اعتکاف کرنے اور روزہ رکھنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ دارقطنی نے کہا ہے کہ اس حدیث کو روایت کرنے میں ابن بدیل منفر د ہے اور وہ ضعیف ہے۔ نافع نے اس حدیث کو حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے اور اس میں روزے کا ذکر نہیں کیا۔ اور ان کی روایت اصح ہے۔ دارقطنی نے کہا ہے کہ میں نے ابو بکر نیشاپوری کو یہ کہتے سنا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے کیونکہ عمرو بن دینار کے شاگردوں میں سے کسی اللہ نے اسے ذکر نہیں کیا ہے۔ نہ ابن جریج نے ذکر کیا، ہے نہ ابن عمیر نے اور نہ ہی حماد بن سلمہ وغیرہ نے۔ علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ابن بدیل نقد راوی ہے۔ ابن عمیر نے کہا یہ صالح فی الحدیث ہے۔ اور ابن حبان نے بھی اس کا ذکر ثقات میں کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ علامہ ذہبی نے اس کی توثیق میں کچھ بھی نہیں کہا۔ بلکہ اس کے بارے یہ کہا ہے کہ یہ ضعیف ہے۔ پھر اگر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے روزے کا حکم ثابت بھی ہو جائے تب بھی ہم اسے اس پر محمول کریں گے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابتدا ہی اعتکاف اور روزہ سے دونوں کی اکٹھی نذر مانی ہوگی اور سوال بھی دونوں کے بارے کیا ہوگا۔ پھر روایت بیان کرتے وقت راوی اسے سوال کی روایت میں روزے کا ذکر کر رہا گیا۔ جیسا کہ جواب کی روایت میں اکثر صحیح الاسناد روایت میں صوم کا لفظ رہ گیا۔ (تو ایسا راوی کو بچھول اور نسیان کے سبب ہوا) اور وہ حدیث جو دارقطنی نے اپنی سند سے سعید بن بشر سے روایت کی ہے کہ وہ عبد اللہ بن عمر سے وہ نافع سے اور وہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حالت شرک میں اعتکاف کرنے اور روزہ رکھنے کی نذر مانی۔ پھر اسلام لانے کے بعد رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے استفسار کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اپنی نذر پوری کرو۔ (2) اگر یہ کہا جائے کہ دارقطنی نے ذکر کیا ہے کہ عبد الحق کا قول ہے اس حدیث کو روایت کرنے میں سعید بن بشر منفر د ہے۔ علامہ ابن جوزی نے ذکر کیا ہے کہ یحییٰ اور ابن نمیر نے اس کے بارے کہا کہ یہ کوئی شی نہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ حافظ نے کہا ہے یہ مختلف قیر راوی ہے۔ علامہ ذہبی نے کہا ہے کہ سعید بن بشر قوادہ کے شاگرد ہیں اور انہیں شعبہ نے نقد قرار دیا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس کی قوت حفظ میں کھام ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا تعلق قدر یہ فرقتے سے تھا۔

میں کہتا ہوں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ سعید بن بشر ابن بدیل سے زیادہ ضعیف نہیں تھا۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا مختلف پروردہ نہیں مگر جبکہ وہ اپنے آپ پر سے لازم کر لے (۱)۔ اسے حاکم نے روایت کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے اور علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں کوئی طعن نہیں کیا۔

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی کہ میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک رات مسجد حرام میں اعکاف کرنے کی نذر مانی تھی تو آپ ﷺ نے فرمایا اپنی نذر پوری کرو۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے (2)۔

وجہ استدلال یہ ہے کہ اس حدیث میں صرف رات کے اعکاف کا ذکر ہے (اور رات تو روزے کے لئے وقت ہی نہیں۔ اس کے معارض وہ حدیث ہے جو امام مسلم نے شعبہ عن عبید اللہ سے نقل کی ہے اس میں رات کی بجائے دن کا ذکر ہے۔ لہذا ابن حبان وغیرہ نے ان دونوں روایتوں کے درمیان تطبیق اس طرح کی ہے کہ آپ نے دن اور رات کے اعکاف کی نذر مانی تھی لہذا جنہوں نے لفظ یوم (دن) ذکر کیا ہے ان کی مراد مطلق وقت ہے۔ یعنی دن اور رات دونوں مراد ہیں۔ اسی طرح جنہوں نے لفظ لیلۃ (رات) ذکر کیا ہے ان کی مراد بھی دن اور رات دونوں ہیں۔ میرے نزدیک جواب یہ ہے کہ جس روایت میں یومنا کا لفظ مذکور ہے وہ شاید ہے۔ یا پھر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب آپ نے دن کے اعکاف کی نذر مانی اور حضور نبی کریم ﷺ نے آپ کو روزہ رکھنے کا حکم ارشاد نہیں فرمایا تو یہ اس پر دلیل ہے کہ روزہ اعکاف کے لئے شرط نہیں۔

اس باب میں بطور حجت حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث بھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! جنگ میں صحرا میں رہ رہا ہوں اور الحمد للہ بین نماز بھی پڑھتا ہوں، آپ میرے لئے ایک رات کی تخصیص فرمادیجئے کہ میں اس رات اس مسجد میں فروکش ہو سکوں تو آپ ﷺ نے فرمایا تیسویں کی رات میں رہا کرو۔ بعد ازاں ان کے بیٹے سے پوچھا گیا کہ تمہارے باپ پھر کیا طریقہ کرتے تھے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ عصر کی نماز کے بعد مسجد میں داخل ہو جاتے تھے اور پھر صبح کی نماز تک کسی حاجت کے لئے مسجد سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ جب صبح کی نماز پڑھ چکے تو وہ مسجد کے دروازے پر اپنی سواری پاتے۔ اس پر بیٹھے اور صحرا کی طرف چلے جاتے۔ اسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے اور یہ روایت رات کے وقت اعکاف کرنے کے جو ازمیں سرسٹ ہے۔ اس کے بارے میں نہیں کہا جاسکتا کہ ہم ایک رات کے ٹھہرے کو اعکاف کا نام نہیں دے سکتے کیونکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اصطلاح کے ثابت ہوجانے کے بعد ہمارے اختلاف اور بھٹکے سے کوئی تمنا نہیں (اور اگر اعکاف کا نام نہ بھی دیا جائے تو اتنا تو ثابت شدہ امر ہے) کہ قربت کی نیت سے مسجد میں ٹھہرنا طاعت و عبادت ہے اور (مستحب) طاعت بھی نذر کے سبب واجب ہوجاتی ہے۔

مسئلہ: جس نے رمضان المبارک میں اعکاف کرنے کی نذر مانی تو یہ نذر اس کے ذمہ لازم ہو جائے گی اور رمضان المبارک کی شرط لغو نہیں ہوگی کیونکہ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ رمضان المبارک میں کی جانے والی طاعت و عبادت کا ثواب دوسرے ایام میں کی جانے والی طاعت و عبادت کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس کسی نے رمضان المبارک میں کوئی عمل خیر بطور نفل

اور قربت ادا کیا تو وہ (اجرا اور تہ کے لحاظ سے) اس آدمی کی طرح ہے جس نے رمضان المبارک کے علاوہ بقیہ دنوں میں کوئی فرض ادا کیا اور جس نے رمضان المبارک میں فرض ادا کیا (تو اس کا اجر و ثواب) بقیہ دنوں میں سرفرض ادا کرنے والے کی مثل ہے۔ اس نے شعب الایمان میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک طویل حدیث میں روایت کیا ہے (۱)۔

اور اگر کسی نے مطلق رمضان میں اعتکاف کرنے کی نذر مانی تو اسے اختیار ہے کہ جس رمضان میں چاہے اعتکاف کر لے اور اگر کسی رمضان کو معین کیا تو پھر اس میں اعتکاف کرنا لازم ہوگا۔ اسی طرح علامہ ابن ہمام نے کہا ہے۔ لیکن یہ حکم اس نظر سے کہ ہر وہ شرط جسے طاعت کے اعتبار سے کوئی فضیلت حاصل نہ ہو اس کی پابندی لازم نہیں اور ایک رمضان کو دوسرے رمضان پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ پس یہ کہنا زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے کہ اگر اس نے اول رمضان معین کر لیا پھر اسے پالیا تو اس پر اسی میں اعتکاف کر لینا لازم ہے کیونکہ طاعت و عبادت میں جلدی کرنا بھی طاعت و عبادت ہے۔ رب کریم ارشاد فرماتے ہیں یُسِرُّنَّحُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَاهِقُونَ۔ اور اگر کوئی دوسرا رمضان معین کیا پھر اس نے پہلے آنے والے رمضان المبارک میں اسے ادا کیا تو نذر پوری ہو جائے گی بلکہ ظاہر ہے کہ اس کے ذمہ لازم ہے کہ وہ پہلے آنے والے رمضان میں اسے ادا کرے کیونکہ دوسرے رمضان تک اس کا نذر رہنا تقبیٰ اور امر غالب نہیں۔

مسئلہ: اگر کسی نے معینہ رمضان میں اعتکاف کے لئے نذر مانی اور روزے رکھے پھر اعتکاف نہ کیا تو اس کے ذمہ لازم ہے کہ وہ دوسرے ایام میں اعتکاف کی قضاء کرے اور ساتھ روزے بھی رکھے۔ یہ مسئلہ امام اعظم ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت اسی طرح سے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری روایت یہ ہے کہ وہ بالکل اس کی قضاء نہ کرے۔ یہی قول امام زفر رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے کیونکہ رمضان المبارک میں اعتکاف کرنا دیگر ایام میں اعتکاف کرنے کی نسبت افضل ہے لہذا دوسرے دنوں میں اعتکاف کرنے سے نذر ادا نہیں ہوگی۔ جیسا کہ اگر کوئی کھڑے ہو کر نماز پڑھنے یا مسلسل روزے رکھنے کی نذر مانے پھر وہ بیٹھ کر نماز پڑھے یا متفرق روزے رکھے تو اس کی نذر ادا نہیں ہوگی۔ اور جب قضاء معجزہ رہو تو نذر ساقط ہو جاتی ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ اس پر رمضان المبارک میں اعتکاف کرنا لازم تھا۔ جب وہ وقت گزر گیا تو اس کے ذمہ مطلق اعتکاف باقی رہا کیونکہ اس کا تدارک ممکن ہے اور رمضان المبارک گزر جانے کے سبب وقت کی فضیلت ساقط ہو گئی کیونکہ اب اس کا تدارک ممکن نہیں۔ اور دوسرے رمضان تک زندہ رہنا غیر یقینی امر ہے بلکہ اس کا تو گمان بھی نہیں کیونکہ درمیان میں مدت طویل ہے۔ (لہذا اس اعتکاف کو دوسرے رمضان تک متوخ نہیں کیا جاسکتا) یہ مسئلہ اسی طرح ہے جیسے کسی کی نماز اپنے وقت سے یا رمضان المبارک کا روزہ فوت ہو گیا تو اس پر دوسرے وقت میں اصل نماز اور روزہ کی قضاء لازم ہے کیونکہ اس کا تدارک ممکن ہے اور وقت کی فضیلت اس سے ساقط ہو جائے گی کیونکہ اس کا تدارک ممکن نہیں۔ لیکن اگر کسی نے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی نذر مانی پھر بیٹھ کر نماز پڑھی تو اسے دوبارہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کا حکم دیا جائیگا کیونکہ اس کا تدارک ممکن ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ جب ایک رمضان میں اعتکاف ادا نہ ہو سکا تو پھر چاہئے کہ اسے دوسرے رمضان میں اس کی قضاء کے واجب

ہونے کا حکم دیا جائے لیکن موت کا احتمال ہونے کے سبب یہ حکم نہیں دیا گیا بلکہ تم نے حکم دیا کہ رمضان المبارک کے بعض مقصود روزوں کے ساتھ اعتکاف کی قضاء واجب ہے۔ پھر جب ایسے آدمی نے رمضان المبارک کے بعد مقصود روزوں کے بعد مقصود روزوں کے ساتھ اعتکاف کیا۔ بعد ازاں دوسرا رمضان اپنی زندگی میں پالیا تو چاہئے تھا کہ اس سے وجوہاً دوبارہ اعتکاف کرنے کا حکم دیا جاتا۔ جیسا کہ جس آدمی پر حج واجب ہو اور وہ خود کسی عذر کے سبب حج کرنے سے عاجز ہو تو وہ اپنی طرف کسی اور آدمی کو حج کرنے کے لئے بھیج دے۔ بعد ازاں وہ خود حج کرنے پر قادر ہو گیا تو اس کا دوسرے کو حج کرانا باطل ہو جاتا ہے اور اس پر بذات خود حج پر جانا لازم ہو جاتا ہے؟

ہم کہتے ہیں کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اعتکاف کے لئے روزے کا شرط ہو ناغص سے ثابت ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ لہذا قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ نماز مانا ہوا اعتکاف رمضان المبارک میں بالکل ادا ہی نہ ہو کیونکہ جب اعتکاف نذر سے سبب واجب ہے تو پھر ساتھ روزے بھی واجب ہو گئے کیونکہ یہ اس کے لئے شرط ہیں۔ اور نماز مانے ہوئے مقصود روزے رمضان المبارک میں ادا نہیں ہوتے۔ کیونکہ رمضان المبارک کے روزے تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے فرض ہیں (اور سارا وقت اللہ تعالیٰ کے حق کے ساتھ مشغول ہے) لہذا چاہئے کہ اعتکاف بھی ادا نہ ہو۔ لیکن ہم نے وقت کی فضیلت کو پانے کے لئے رمضان المبارک میں بالضرورت اعتکاف جائز قرار دیا۔ پس جب رمضان المبارک کے گزار چکئے کے سبب وقت کی فضیلت فوت ہو گئی تو حکم پھر اپنے اصل کی طرف لوٹ آیا لہذا اعتکاف کے لئے بالمشورہ روزے رکھنا واجب ہوں گے۔ پھر جب اس نے آئندہ سال دوسرے رمضان المبارک کو پالیا تو اس کے سبب بالمشورہ واجب کیا جانے والا اعتکاف اور روزے ساتھ نہیں ہوں گے تو چونکہ اس نے بالارادہ روزے اپنے ذمے لازم کئے تھے اس لئے وہ اس اعتکاف کو دوسرے رمضان میں بالکل ادا نہیں کر سکتا۔ واللہ اعلم۔

یہی وجہ ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور صاحبین کے نزدیک ایک رمضان کے اعتکاف کی قضاء دوسرے رمضان میں کرنا جائز نہیں لیکن اگر اس نے رمضان المبارک میں نہ روزے رکھے اور نہ ہی اعتکاف کیا تو پھر قضاء روزوں کے دوران اعتکاف کرنا جائز ہے۔ حالانکہ ہمارے ذکر کردہ قیاس کا تقاضا تو یہی ہے کہ رمضان المبارک کے بعد وقت کی فضیلت فوت ہو جانے کی وجہ سے وہ مقصود روزوں کو بغیر اعتکاف ادا نہ کرے۔ واللہ اعلم۔

ہم نے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا جو قول ذکر کیا ہے اس کا دارودار اس بات پر ہے کہ آپ کے نزدیک اعتکاف کے لئے روزہ رکھنا شرط ہے۔ لہذا جنہوں نے اعتکاف کے لئے روزے کو شرط قرار نہیں دیا ان کے نزدیک جائز ہے کہ وہ رمضان المبارک کے بعد بغیر روزے کے اعتکاف کی قضاء کرے یا دوسرے رمضان میں اس کی قضاء کرے اگر اسے پالے یا قضاء اور کفارہ وغیرہ کے روزوں کے دوران اس کی قضاء کر لے۔ جب وہ رمضان المبارک کے بعد روزے کے ساتھ یا بغیر روزے کے اعتکاف کی قضاء کر لے گا تو پھر دوسرے رمضان کو پانے کی صورت میں اس پر اس کا اعادہ واجب نہیں ہوگا۔ جیسا کہ اگر کسی کی وقتی نماز فوت ہو جائے حالانکہ اس کے پاس پانی موجود تھا پھر موت کے بعد اس نے تیمم کے ساتھ اسے قضاء کیا بعد ازاں اس نے پانی پالیا یا پہلے ٹھکے بدن نماز پڑھ لی اور پھر کپڑا پالیا (تو اس پر نماز کا اعادہ لازم نہیں ہوگا)

مسئلہ: جس نے حالت کفر میں طاعت کی نذر مانی پھر اسلام قبول کر لیا تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک

اس پر نذر کو پورا کرنا واجب ہے جیسا کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ گزر چکا ہے کہ آپ نے دور جاہلیت میں اعتکاف کرنے کی نذر مانی۔ پھر رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا پنی نذر پوری کرو۔ جبکہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا ہے کہ اس پر نذر کو پورا کرنا واجب نہیں کیونکہ کافر طاعت کے اہل نہیں اور اخلاص نہ ہونے کے سبب اس کی طاعت معصیت ہوتی ہے اور معصیت کی نذر کو پورا کرنا اس پر واجب نہیں۔ اور جب ہم نے ضروریات دین میں سے جان لیا کہ کافر عبادت کے اہل نہیں۔ تو پھر ہم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کو اس معنی پر محمول کریں گے کہ نذر کو پورا کرنا اگر چہ ان پر واجب نہیں تھا لیکن جب اسلام قبول کرنے کے بعد اعتکاف میں ان کی رغبت وافر ہوگئی تو حضور نبی کریم ﷺ نے انہیں ابتداءً (نیا) اعتکاف کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ لہذا یہ اس اعتکاف کی قضاء کا حکم نہیں تھا جو نذر کے سبب ان کے ذمہ واجب تھا۔

جس نے طاعت کی نذر مانی پھر مرتہ ہو گیا (العیاذ باللہ عنہ) بعد ازاں پھر اسلام قبول کر لیا تو جو کچھ نذر کے سبب اس کے ذمہ واجب ہوا تھا اسے پورا کرنا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس پر لازم نہیں کیونکہ قربت اور طاعت کی نذر بھی قربت اور طاعت ہی ہوتی ہے لہذا دیگر طاعتوں کی طرح یہ بھی مرتہ ہونے کے سبب باطل ہو جائے گی۔ نتیجتاً اس پر حکم مرتب ہی نہیں ہوگا (لہذا نذر کے سبب واجب ہونے والی شئی کو پورا کرنا لازم نہیں ہوگا)

مسئلہ: جس کسی نے ہمیشہ روزہ رکھنے کی نذر مانی پھر کاروبار معاش میں مشغول ہونے کے سبب روزے نہ رکھ سکے تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ روزے نہ رکھے اور ہر روزے کے عوض نصف صاع گندم (کسی فقیر محتاج) کو دے۔ یہ مسئلہ اسی طرح فتاویٰ کبریٰ میں ہے اور علامہ ابن ہمام نے اسی طرح کہا ہے۔ آپ نے مزید کہا کہ اگر وہ اپنی تنگدستی کے سبب اتنا کھانا دینے پر قادر نہ ہو تو پھر اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے اور معافی مانگے۔ فتویٰ اس پر ہے کہ جس نے ہمیشہ روزہ رکھنے کی نذر مانی وہ اگر چاہے تو روزہ رکھے اور اگر چاہے تو کفارہ ادا کرے۔ اسی طرح فتاویٰ الحج میں ہے۔ یہی اختلاف اس آدمی کے بارے ہے جس نے کوئی بھی ایسی نذر مانی جسے پورا کرنا اس کے لئے انتہائی مشکل ہو اور وہ اس کی طاقت نہ رکھتا ہو۔ جنہوں نے اس میں کفارہ جائز قرار دیا ہے۔ ان کی دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس نے کسی ایسی شئی کی نذر مانی جسے وہ پورا کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس کا کفارہ صاع کفارہ ہی ہے (۱)۔ یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔

مسئلہ: جس کسی نے دس یا سو حج کرنے کی نذر مانی تو اس کے بارے یہ اختلاف ہے کہ آیا اس پر تمام حج کرنے لازم ہوں گے اور ان کے بارے وصیت کرنی لازم ہوگی یا صرف اتنے حج لازم ہوں گے جہاں تک اس کی زندگی نے وفا کی؟ تو خلاصہ میں ہے کہ اس پر تمام حج لازم ہوں گے۔ جبکہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے دوسرا قول مروی ہے اور اسی کو علامہ سرخسی نے بھی اختیار کیا ہے اور اگر اس نے ایک ہی سال میں دس حج کرنے کی نذر مانی تو اس کے بارے علامہ سرخسی نے کہا ہے کہ اس پر دس سال میں دس حج لازم ہوں گے۔ اور خلاصہ صوری روایت میں ہے کہ اس پر ایک ہی سال میں دس حج لازم ہوں گے۔ پس اگر اس نے اپنی طرف سے دس افراد کو حج کرادیا تو اسکی نذر پوری ہو جائے گی، اگر دس سال گزرنے سے قبل وہ فوت ہو گیا۔ اور اگر وہ اتنے عرصہ تک زندہ رہا اور

جب بھی وہ ہر سال حج کا وقت پائے گا تو اس پر بذات خود حج کرنا واجب ہوگا اور اس صورت میں اپنی طرف سے دوسروں کو حج کرانا باطل ہو جائیگا کیونکہ وہ بذات خود حج کرنے پر قادر ہے اس لئے اس کا دوسروں کو حج کرانا صحیح نہیں اور اگر اس نے ہر سال حج کرنے کی طاقت نہ رکھی تو پھر اس صورت میں کفارہ کے جائز ہونے میں سابقہ اختلاف ہی ہے۔

مسئلہ: جس نے یہ کہا میں حج کروں گا تو اتنا کہنے سے اس پر حج کرنا لازم نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ وعدہ ہے نہ نذر نہیں۔ البتہ وعدہ کو وفا کرنا امر مستحب ہے۔

مسئلہ: اگر کسی نے یہ کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس بیماری سے شفا و عطا فرمائی تو مجھ پر حج کرنا لازم ہے۔ تو اس پر فرض حج کے علاوہ حج نذر لازم ہو جائیگا۔ لہذا جب اس نے حج کیا اور کوئی معین نیت نہ کی تو اس پر فرض حج کے علاوہ حج نذر لازم ہو جائے گا۔ لہذا جب اس نے حج کیا اور کوئی معین نیت نہ کی تو اسلام کی جانب سے عائد ہونے والا فریضہ حج ادا ہوگا۔ پھر جب دوسرے سال وہ حج ادا کرے گا اور اس نے اس سے کوئی خاص نیت نہ کی تو کہا گیا ہے کہ وہ نفل حج ہوگا کیونکہ نذر مانے ہوئے حج کیلئے نیت کے ساتھ تعین ضروری ہے۔

مسئلہ: جس نے یہ کہا کہ مجھ پر حج لازم ہوگا اگر فلاں چاہے تو اگر اس فلاں نے چاہا تو پھر اس پر حج کرنا لازم ہوگا۔ اور اس فلاں کی مشیت فقط اس مجلس تک محدود نہیں ہوگی جس میں اسے اس کی خبر پہنچے۔ (بلکہ مجلس خبر کے بعد بھی وہ اپنی مشیت کا اظہار کر سکتا ہے) بخلاف طلاق کو کسی کی مشیت پر معلق کرنے کے۔ (اس کے بارے مجلس میں خبر میں ہی مشیت کا اظہار ضروری ہوتا ہے) کیونکہ طلاق تملیک کو قبول کرتی ہے اور تملیک مجلس میں ہی جواب کا تقاضا کرتی ہے، جبکہ حج کے مسئلہ میں یہ تعلق محض ایک شرط ہے۔ (اس لئے جواب مجلس کے ساتھ ہی مخصوص نہیں)

مسئلہ: جس نے یہ نذر مانی کہ وہ اپنا تمام مال صدقہ کرے گا تو احتیاطاً اس پر وہ تمام مال صدقہ کرنا واجب ہے جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ کیونکہ بندے کے ایجاب کو اللہ تعالیٰ کے ایجاب پر قیاس کیا جائیگا۔ لہذا نذر کے سبب بندے کے واجب کردہ مال کو اس مال کی طرف پھیر دیا جائے گا جس میں شریعت نے صدقہ واجب کیا ہے کیونکہ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے فاضل مال کو صدقہ کرنا مقصود ہے اور فاضل مال وہی ہوتا ہے جو نصاب زکوٰۃ ہے۔ بخلاف وصیت کے کہ وہ حالت استغناء میں واقع ہوتی ہے۔ (یعنی وصیت ایسی حالت میں کی جاتی ہے جب مومن کو مال کی حاجت اور ضرورت نہیں ہوتی اس لئے اس کا حکم بھی مذکورہ بالا حکم کے خلاف ہے) اور جس نے یہ نذر مانی کہ جو کچھ اس کی ملک میں ہے اسے صدقہ کرے گا تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور صاحبین کے نزدیک اس پر تمام مال صدقہ کرنا لازم ہوگا۔ ہدایہ میں اسی طرح ہے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ ہے کہ مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں تمام مال صدقہ کرنا اس کے ذمے واجب ہوگا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ دونوں صورتوں میں اپنے ملوک مال کا تیسرا حصہ صدقہ کرنا اس پر لازم ہوگا کیونکہ حضرت ابولبابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ آپ نے حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی میری توبہ میں سے یہ بھی ہے کہ میں اپنا وہ گھر چھوڑ دوں جس میں مجھ سے گناہ صادر ہوا اور اپنا مال صدقہ کر کے اس سے غلجھگی اختیار کروں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہاری طرف سے مال کا تیسرا حصہ (صدقہ کرنا) کافی ہے (۱)۔ رواہ زرین۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس پر دلالت نہیں کرتی کہ آپ نے اپنا تمام مال صدقہ کرنے کی نذر مانی تھی بلکہ آپ نے فقط صدقہ کا ارادہ کیا تھا۔ پس حضور نبی کریم ﷺ نے آپ کو ایک تہائی مال صدقہ کرنے کا اشارہ دیا تاکہ آکے ذمے جو (غریب) لوگوں کے حقوق ہیں وہ ضائع نہ ہو جائیں۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت کعب بن مالک کی حدیث میں تہائی کا ذکر نہیں فرمایا۔ اسے شیخین نے صحیحین میں نقل کیا ہے کہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی میری تو بہ میں سے یہ ہے کہ میں اپنے مال سے علیحدہ ہو جاؤں اور سب مال اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم ﷺ کی خدمت میں پیش کروں تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اپنا کچھ مال اپنے پاس روک لو، وہ تمہارے لئے بہتر ہوگا تو میں نے عرض کی میں اپنا وہ حصہ روک لیتا ہوں جو خیر میں ہے (۱)۔

مسئلہ: اگر یہ کہا کہ میرا مال مساکین کے لئے صدقہ ہے تو اس میں وہ مال داخل نہیں ہوگا جو لوگوں کے پاس بطور قرض موجود ہے۔
مسئلہ: جس نے یہ نذر مانی کہ جو مال فی الحال میری ملکیت ہے اور مستقبل میں جس کا مالک بنوں گا وہ سب صدقہ کروں گا تو وہ اتنا سامان اپنے پاس روک سکتا ہے جو اس کی اپنی ذات بیوی اور دیگر ان افراد کے خرچہ کے لئے ضرورت ہو جن کا نفعہ اس کے ذمے واجب ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی ہمیشہ روزہ رکھنے کی نذر مانے تو اس پر رمضان المبارک کے روزوں کے بدلے لہذا یہ دن لازم نہیں ہوگا کیونکہ وہ ایام رب کریم کے حق کے ساتھ مشغول ہیں۔ لہذا رمضان المبارک کے علاوہ دیگر نذر مانے ہوئے ایام کے روزے کسی وجہ سے نہ رکھ سکا تو ان روزوں کا تقارہ اس کے ذمے لازم ہوگا۔

مسئلہ: اگر کسی نے یہ کہا کہ اللہ کے لئے بکری گائے یا اونٹ ذبح کرنا مجھ پر لازم ہے یا اس طرح کہا اگر میرا بیض شفا یاب ہو تو ان میں سے کوئی جانور ذبح کرنا مجھ پر لازم ہے تو پہلی صورت میں بالقور نذر پوری کرنے کے لئے جانور کو ذبح کرنا لازم ہے اور دوسری صورت میں شرط پائے جانے پر حکم معلق رہے گا (جب شرط پائی جائے گی تو جانور کو ذبح کرنا لازم ہوگا) دونوں صورتوں میں جہاں چاہے جانور ذبح کر کے گوشت فقراء میں تقسیم کر سکتا ہے۔

نو اور این ساعدہ میں ہے کہ اگر اس نے کہا اللہ کیلئے مجھ پر ذبح کرنا ہے اور ساتھ صدقہ کے الفاظ نہ کہے تو اس پر کوئی شیئی لازم نہیں ہوگی۔ ہم کہتے ہیں کہ اس نے ان الفاظ کے ذریعے اپنے ذمے ایسا مال لازم کیا ہے جس کی جنس سے واجب موجود ہے۔ اس لئے ذبح کرنے سے مراد جانور ذبح کر کے گوشت فقراء میں تقسیم کرنا ہوگا۔ مگر جب اس نے صرف ذبح کا ارادہ کیا (تو پھر گوشت کی تقسیم لازم نہیں ہوگی اور اس کلام کو نذر پر محمول نہیں کیا جائیگا)

اور اگر یہ کہا کہ اللہ کے لئے مجھ پر حدی کی لازم ہے تو اس پر ایسے جانور کو ذبح کرنا واجب ہے جس کی قربانی جائز ہوتی ہے مثلاً بھیڑ بکری اونٹ اور گائے۔ مگر جب اس نے اونٹ یا گائے کی نیت کی تو پھر اس پر وہی لازم ہوگا جس کی نیت کی۔ اور ساتھ ہی حرم پاک میں اسے ذبح کرنا لازم ہوگا۔ لہذا اگر قربانی کے ایام ہوں تو پھر سنت یہ ہے کہ معنی میں ذبح کرے ورنہ مکہ مکرمہ میں ذبح کر دے اور حرم پاک کی حدود میں جہاں چاہے اس کے لئے ذبح کرنا جائز ہے۔

اور اگر کہا مجھ پر جزور (اونٹ) کی حدی لازم ہے تو پھر حرم پاک کی حدود میں اونٹ کی قربانی لازم ہوگی۔ اور اگر کہا مجھ پر جزور

لازم ہے اور ساتھ ہدی کا لفظ ذکر نہ کیا تو پھر حرم پاک سے باہر بھی ذبح کرنا جائز ہوگا۔ اور اگر بدنہ کا لفظ ذکر کیا اور ساتھ ہدی کا لفظ ذکر نہ کیا تو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حرم پاک میں اسے ذبح کرنا لازم ہے کیونکہ بدنہ کا لفظ ہدی کے معنی میں مشہور عام ہے اور ہدی کے لئے حرم پاک کی حدود متعین ہیں لہذا بدنہ کو بھی حرم پاک میں ذبح کرنا لازم ہوگا۔

مگر امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک لفظ بدنہ کہنے سے اسے حرم پاک میں ذبح کرنا لازم نہیں آتا۔ ہاں اگر اس نے بدنہ من شعائر اللہ کہا تو پھر حرم پاک میں اس کو ذبح کرنا لازم ہوگا۔

جب اس نے ہدی کا جانور حرم پاک میں ذبح کیا تو اسے چاہئے کہ وہ اس کا گوشت حرم پاک کے مساکین میں صدقہ کر دے اور اگر اس نے بیرونی مساکین پر بھی وہ گوشت صدقہ کیا تو ایسا کرنا بھی جائز ہے۔

اگر کسی نے ہدی کی نذر مانی تو کیا ہدی کی قیمت وہاں کے مساکین میں صدقہ کرنا جائز ہے؟ تو اس کے بارے میں ابو سلیمان کی روایت یہ ہے کہ ہدی کی قیمت تقسیم کرنا جائز ہے جیسا کہ جانوروں کی ذکوۃ قیمت کی صورت میں دینا جائز ہے اسی طرح ہدی کی نذر کو قیمت کی صورت میں پورا کرنا بھی جائز ہے۔

اور ابو حفص کی روایت میں ہے کہ قیمت تقسیم کرنا جائز نہیں کیونکہ لفظ ہدی میں ذبح کا مفہوم پایا جاتا ہے اور اس صورت میں طاعت و قربت ذبح سے ہی متعلق ہے۔ جبکہ صرف لفظ شاة میں یہ معنی موجود نہیں۔ پھر اس نذر کی صورت میں قیمت تقسیم کرنا ذبح کے تابع آتی ہے۔ بخلاف ذکوۃ کے کیونکہ اس میں قربت اور طاعت کا تعلق صدقہ کرنے سے ہے چاہے اصل جانور صدقہ کر دیا جائے یا اس کی قیمت صدقہ کر دی جائے (اس میں ذبح کا مفہوم نہیں)۔

مسئلہ: جس نے بکری کی نذر مانی اور پھر اس کی جگہ اونٹ ذبح کر دیا تو یہ اقدام احسن اور بہتر ہے کیونکہ اس میں بکری کی جگہ اونٹ ذبح کیا گیا ہے جو کہ اصل منذور جانور سے اعلیٰ بھی ہے اور ذبح کا عمل بھی پایا گیا ہے اس لئے اس سے نذر ادا ہو جائے گی۔ اس لئے اسے بدل بالقیمت قرار نہیں دیا جائیگا۔

اور اگر یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ کے لئے مجھ پر وہ بکریوں کی قربانی لازم ہے پھر اس نے ایک بکری ذبح کی جو کہ قیمت کے اعتبار سے چار بکریوں کے مساوی ہو تو اس سے نذر پوری نہیں ہوگی اور وہ فقط ایک بکری ہی متصور ہوگی۔

مسئلہ: اگر کسی نے کہا اللہ تعالیٰ کے لئے مجھ پر یہ بکری قربان کرنا لازم ہے تو اس پر ایسی بکری کی قربانی لازم ہوگی اور اگر وہ چوری ہوگی یا فوت ہوگی تو پھر کوئی اور بکری اس کے ذمے لازم نہیں ہوگی۔

اسی طرح اگر کسی نے کہا اللہ تعالیٰ کے لئے یہ درابم صدقہ کرنا مجھ پر لازم ہے پھر صدقہ کرنے سے قبل وہ ضائع ہو گئے تو ان کے سوا کوئی شئی بھی اس کے ذمے لازم نہیں ہوگی۔ اور اگر وہ ضائع نہ ہوئے پھر ان کے بدلے انہی کی مثل اور درابم صدقہ کر دینے تو یہ جائز ہے۔ اور اگر کسی نے چند روٹیاں صدقہ کرنے کی نذر مانی پھر ان کی قیمت صدقہ کر دی تو یہ جائز ہے۔

مسئلہ: اگر کسی نے کہا اللہ تعالیٰ کے لئے کپڑے قربان کرنا مجھ پر لازم ہے پھر اس نے وہ کپڑا کعبہ معظمہ کے دربانوں کو دے دیا تو اگر وہ دربان فقرا ہیں تو ایسا کرنا جائز ہے (نذر ادا ہو جائے گی) اور اگر وہ فقرا نہیں تو پھر نذر ادا نہیں ہوگی اور اگر اس نے کپڑے سے کعبہ معظمہ کا غلاف بنا دیا تو اس سے نذر ادا نہیں ہوگی۔

مسئلہ: اگر کسی نے کہا میں یہ بکری بیت اللہ شریف یا مکہ مکرمہ یا کعبہ معظمہ کی طرف ذبح کے لئے بھیجوں گا تو اس پر نذر کو پورا کرنا واجب ہے اور اگر اس نے مذکورہ الفاظ کی بجائے حرم شریف یا مسجد حرام کے الفاظ کہے تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس نذر کو پورا کرنا واجب نہیں۔ جبکہ صاحبین کے نزدیک ہر دو صورت میں نذر ثابت ہو جاتی ہے اور اسے پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے اور اگر صفا وغیرہ کے الفاظ کہے تو بالاتفاق یہ نذر ثابت نہیں ہوگی۔

اگر یہ کہا جائے کہ جب صرف لفظ ہدی ذکر کیا جائے تو پھر نذر ثابت ہو جاتی ہے اور حرم پاک میں جانور کو ذبح کرنا لازم ہوتا ہے تو اگر لفظ ہدی کے ساتھ حرم یا صفا کے الفاظ کا اضافہ کر دیا جائے تو اس سے وجوب ثابت ہونے کے بعد ختم نہیں ہوگا (یعنی چاہئے کہ اس صورت میں جانور کو وہاں ذبح کرنا بدرجہ اولیٰ لازم ہو) تو اس کے بارے ہم یہ کہتے ہیں کہ جب مطلق لفظ ہدی ذکر کیا جائے تو وہاں بیت یا مکہ مکرمہ کے الفاظ مقدر تصور کئے جاتے ہیں۔ اس لئے یہ نذر موجب ہوتی ہے (اور اسے پورا کرنا لازم اور ضروری ہوتا ہے) لیکن جب ہدی کے ساتھ مسجد یا حرم وغیرہ کے الفاظ بیان کر دیئے جائیں تو پھر ان الفاظ کو مضمحل ماننا معتذر ہوتا ہے، اس لئے یہ نذر موجب نہیں ہوتی۔ (لہذا اس کے مطابق عمل کرنا لازم نہیں ہوتا)

مسئلہ: اگر کسی نے کہا میں اپنے اس کبڑے سے بیت اللہ شریف کا خلاف بناؤں گا یا میں یہ کبڑا عظیم کعبہ میں لگاؤں گا تو احتساباً نذر اس کے ذمے لازم ہو جائے گی کیونکہ عرفان الفاظ سے حد یہ ہی مراد لیا جاتا ہے۔

مسئلہ: جس نے کہا اگر میں نے یہ بکری خریدی (اور ساتھ ہی بیکری کی طرف اشارہ کیا) تو مجھ پر لازم ہے میں اسے کعبہ معظمہ تک قربانی کے لئے بھیجوں گا۔ اس کے بارے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس نذر کو پورا کرنا اس کے ذمے لازم نہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک تعلق بالشرط حکم کے انعقاد سے مانع ہے، سبب کے مانع نہیں۔ چونکہ انعقاد سبب کے وقت بکری اس کی اپنی ملکیت ہی نہیں (بلکہ غیر کی ملکیت ہے) اس لئے نذر وقوع ہو جائے گی کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا آدمی جس چیز کا مالک نہ ہو اس کی نذر (صحیح) نہیں۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نذر لازم ہو جائے گی کیونکہ آپ کے نزدیک تعلق انعقاد سبب کے مانع ہے اور وجود شرط (شراء خرید) کے بعد سبب معتقد ہو جاتا ہے لہذا نذر لغو نہیں ہوگی (بلکہ وجود شرط کے بعد اسے پورا کرنا لازم ہوگا)

مسئلہ: جس نے یہ نذر مانی کہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کے لئے اپنے آپ کو یا اپنے بیٹے کو یا اپنے نواسے کو یا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک احتساباً اس پر بکری ذبح کرنا لازم ہے اور اگر اس نے اولاد کو ذبح کرنے کی نذر مانی تو بریے اور بیٹی کے بدلے ایک بکری کو ذبح کرنا لازم ہوگا۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ صرف بیٹے کے عوض بکری ذبح کرنی لازم ہوگی، غلام اور اپنی ذات کے بدلے ذبح لازم نہیں۔ جبکہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کسی کے بدلے بھی اس پر کچھ لازم نہیں ہوگا اور یہی قیاس ہے کیونکہ اس کی یہ نذر نذر بالمعصیت ہے۔ وجہ احتساب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بدلے مینڈھے کی قربانی واجب فرمادی تھی جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے ذبح کو اپنے اوپر واجب کیا تھا۔ جب کہ اپنے آپ کو یا اپنی اولاد کو قتل کرنا شرعاً ممنوع ہے کیونکہ یہ معصیت ہے اور اس نے نذر کے سبب اپنے اوپر قربانی کو لازم کر لیا تو پھر مجازاً جان کا بدلہ قربان کرنا اس کے ذمے لازم ہوگا (اور وہ بکری ہے) اسی طرح

محمد بن منتشر سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے اپنے آپ کو قربان کرنے کی نذر مانی اگر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے دشمن سے نجات عطا فرمائی۔ پھر اس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس کے بارے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا سروق سے پوچھو۔ چنانچہ اس نے آپ سے جا کر سوال کیا تو انہوں نے فرمایا اپنے آپ کو ذبح نہ کرنا کیونکہ اگر تو مومن ہے تو پھر ایک مومن کو تو قتل کرنے والا ہو جائے گا اور اگر تو کافر ہے تو پھر جلدی دوزخ میں پہنچ جائے گا۔ لہذا ایک مینڈھا خرید لے اور اسے مساکین کے لئے ذبح کر دو۔ حضرت اطلق علیہ السلام صحابہ سے بہتر تھے، ان کے بدلے مینڈھا ہی قربان کیا گیا تھا۔ پھر اس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس فیصلے سے آگاہ کیا تو آپ نے بھی فرمایا میں بھی تجھے یہی فتویٰ دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ رواہ ابن رزین۔

مسئلہ: جس نے یہ نذر مانی کہ جو بھگے تیرے مال سے حاصل ہوگا مجھ پر اسے صدقہ کرنا لازم ہے تو جو منافع بھی اسے اس مال سے حاصل ہوگا اسے صدقہ کرنا اس پر لازم ہوگا۔ عمرو کھانا جو کھانے کے لئے اس نے اپنے پیش کیا اسے صدقہ کرنا لازم نہیں ہوگا۔

مسئلہ: اگر کسی نے اس طرح نذر مانی کہ اگر میں اس طرح کروں تو جو میں کھاؤں اسے صدقہ کرنا مجھ پر لازم ہے۔ تو شرط پائے جانے کی صورت میں ہر لقمہ کے بدلے ایک درہم صدقہ کرنا اس پر لازم ہے کیونکہ لقمہ کھانا ہے۔ اور اگر یہ نذر مانی جب بھی میں بیٹوں تو اس کے بدلے صدقہ لازم ہے تو پھر ہر سانس کے بدلے ایک درہم لازم ہوگا نہ کہ ہر گھونٹ کے بدلے۔ (یعنی پینے کے دوران جب بھی وہ سانس نکالنے کے لئے رکے گا تو اس پر ایک درہم صدقہ کرنا لازم ہو جائے گا، ہر گھونٹ کے بدلے درہم لازم نہیں ہوگا)

مسئلہ: جس کسی نے یہ کہا کہ جس دن زید یا بکا اللہ تعالیٰ کا شکر بجالانے کے لئے مجھ پر روزہ رکھنا لازم ہوگا اور اس نے اس قول سے قسم کا ارادہ کیا۔ پھر رمضان المبارک کے کسی دن وہ آ گیا تو حالف پر قسم کا کفارہ ہوگا اور روزے کی قضا نہیں ہوگی کیونکہ شرط (یعنی شکر کی نیت سے روزہ رکھنا) کا وجود ہی نہیں پایا گیا۔ اور اگر روزے کی نیت سے پہلے زید آ گیا اور اس نے اسی روزے سے شکر کی نیت کر لی اور رمضان کی نیت نہ کی تو وہ اس نیت کے سبب اپنی قسم سے بری ہو جائے گا، رمضان کا روزہ بھی ادا ہو جائے گا اور اس پر قضا بھی نہیں ہوگی۔ اور اگر اس نے اپنے اس قول سے قسم کا ارادہ نہ کیا تو اس پر کوئی شئی بھی لازم نہیں ہوگی کیونکہ رمضان المبارک تو اللہ تعالیٰ کے واجب کردہ حق کے ساتھ مشغول ہے لہذا اس پر نذر کا روزہ واجب ہی نہیں ہوگا۔ (گو یا یہ نذر ہی صحیح نہیں)

مسئلہ: جب مریض نے ایک مہینہ روزے رکھنے کی نذر مانی اور پھر صحت یاب ہونے سے پہلے ہی فوت ہو گیا تو اس پر کوئی شئی لازم نہیں ہوگی۔

مسئلہ: جس کسی نے کسی مہینے یا سال کے عین دن کا روزہ رکھنے کی نذر مانی تو جب سال یا مہینے کا وہ عین دن آئے گا تو اس کا روزہ اس پر لازم ہوگا۔

مسئلہ: اگر کسی نے سوموار یا جمعرات کے دن روزہ رکھنے کی نذر مانی تو اس پر ان ایام میں ایک بار روزہ رکھ لینا کافی ہوگا اور اگر اس کی نیت ہر جمعرات یا پھر گوردہ رکھنے کی ہو (تو پھر حکم اس کی نیت کے مطابق ہی ہوگا)

مسئلہ: نذر کے الفاظ بغیر ارادے کے جب زبان پر جاری ہو جائیں تو اسی نذر کو بھی پورا کرنا سکتے ہیں لازم ہوگا کیونکہ یہ انشاء ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تین چیزیں ہیں جنہیں بالارادہ جمیدگی سے کیا جائے تب بھی ادا ہو جاتی ہیں اور مراحا کیا جائے تب بھی واقع ہو جاتی ہیں۔ یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔

مسئلہ: جس نے یہ کہا اللہ تعالیٰ کے لئے مجھ پر اس سال کے روزے کے روزے لازم ہیں تو اس کے بارے بعض نے کہا ہے کہ نذر کے وقت سے لے کر بارہ ماہ تک اس پر روزے رکھنا لازم ہیں۔ فتاویٰ قاضیان اور خلاصہ میں ہے کہ سال کی ابتداء محرم سے ہوتی ہے اور اس کی انتہاء ذوالحجہ پر ہوتی ہے تو جب اس نے نذر کے الفاظ ادا کرتے وقت موجودہ سال کی طرف اشارہ کیا تو اس پر سال کے بقیہ مہینوں کے ذوالحجہ کے آخر تک روزے رکھنے لازم ہوں گے اور سال کا جو وقت پہلے گزر چکا ہے اس کے بدلے کچھ بھی لازم نہیں ہوگا۔ یہ اسی طرح ہے جیسے کوئی یہ نذر مانے کہ مجھ پر گزشتہ دن کا روزہ رکھنا لازم ہے۔ تو اس کی یہ نذر لغو ہوگئی ہے اور اس پر کچھ بھی لازم نہیں ہوگا۔ اسی طرح جس نے یہ نذر مانی کہ مجھ پر اس مہینے کے روزے لازم ہیں تو اس ماہ کے باقی روزے اس کے ذمے لازم ہوں گے۔

مسئلہ: جس نے یہ کہا مجھ پر اللہ تعالیٰ کے لئے آج کا یا آج کل کا روزہ لازم ہے تو اس پر صرف آج کا روزہ لازم ہوگا اور گزشتہ کل کی قضاء لازم نہیں ہوگی۔

مسئلہ: جس نے سال بھر روزے رکھنے کی نذر مانی تو اس پر واجب ہے کہ ان دنوں میں روزے نہ رکھے جن میں روزے رکھنا ممنوع ہیں۔ اسی طرح عورت ایام حیض میں روزے نہیں رکھے گی اور پھر اگر کئی قضاء کرے گی۔ امام زفر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مرد اور عورت دونوں پر دونوں صورتوں میں قضاء لازم نہیں اور اگر ان دنوں میں روزہ رکھا تو روزے دار گنہگار ہوگا لیکن اس سے قضاء سادہ ہو جائے گی۔

مسئلہ: جس عورت نے یہ نذر مانی کہ اللہ تعالیٰ کے لئے مجھ پر ایام حیض کے روزے رکھنا لازم ہیں تو اس کی نذر صحیح نہیں ہوگی اور اس پر قضاء واجب نہیں ہوگی کیونکہ اس نے روزے کی نسبت ایسے وقت کی طرف کی ہے جو روزے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی کچھ پھیرا پھیرا تو روزہ رکھنا لازم ہے (تو چونکہ رات روزے کا وقت نہیں اس لئے نذر صحیح نہیں ہوگی)

ع۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما زبیر بن جہاد اور قتادہ نے کہا ہے کہ بیت اللہ کو متیقن اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے ہر جاہر اور ظالم حکمران کی دست درازی اور تحریک کاری سے آزاد کر رکھا ہے اور کبھی کسی جاہر کا اس پر قبضہ نہیں ہوا (1)۔ ترمذی نے حضرت ابن زبیر سے ایک حدیث نقل کی ہے اور اسے حسن قرار دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بیت اللہ کا نام متیقن اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ کوئی جاہر حکمران اس پر غالب نہیں آسکتا (2)۔ لیکن اس کی تردید حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے ہو جاتی ہے آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کعبہ معظمہ کو چھوٹی پنڈلیوں والا وحشی تباہ کرے گا۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے (3)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا گویا کہ میں اس معظّم کو دیکھ رہا ہوں کہ کھلی رانوں والا وحشی کعبہ معظمہ کا ایک ایک پتھر اکبیر رہا ہے۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے (4)۔

حضرت عبدالبن بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اہل حبشہ کو چھوڑے رکھو جب تک وہ تمہیں چھوڑے رکھیں کیونکہ کعبہ معظمہ کا خزانہ چھوٹی پنڈلیوں والا وحشی کے سوا کوئی نہیں نکال سکے گا (5)۔ اسے ابوداؤد اور حاکم نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

مذکورہ احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ مستقبّل میں کعبہ معظمہ پر جاہر مسلط ہو جائیں گے۔ لہذا یہ احادیث متیقن کے مذکورہ بالا بیان

1- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 114 (الکفر)

2- جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 146 (قاروقی)

3- سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 236 (وزارت تعلیم)

4- ایضاً صفحہ 217

کے لئے معنی کے متناہی ہیں۔

بعض نے متیقن کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے فراق ہونے سے محفوظ رکھا کیونکہ طوفان نوح کے ایام میں کعبہ معظمہ کو ادا پر اٹھایا گیا تھا (1)۔

ابن زید اور حسن نے کہا ہے کہ بیت اللہ کا نام متیقن اس کے بہت قدیمی اور پرانا ہونے کی وجہ سے ہے۔ یہی وہ پہلا گھر ہے جو لوگوں کے لئے بنایا گیا۔ رب کریم فرماتے ہیں اِنَّ اَذَىٰ بَيْتِکُمْ وَوَضَعْنَا لَکُمُاسِیۡنَ۔ کہا جاتا ہے دینار عقیق (پرانا دینار) (2) بعض نے کہا ہے کہ یہاں متیقن بمعنی کریم ہے۔ (معزز عمدہ اور اعلیٰ) گھوڑے کو عمدہ ہونے کی وجہ سے عتاق انیل کہا جاتا ہے جب غلام غلامی کی ذلت سے نکل کر آزادی کی عزت میں داخل ہوتا ہے تو اس وقت کہا جاتا ہے عتق الرقیق۔

میرے نزدیک پسندیدہ قول حضرت سفیان بن عیینہ کا ہے وہ فرماتے ہیں کہ چونکہ کعبہ معظمہ کسی انسان کی ملکیت نہیں اس لئے اس کا نام متیقن رکھا گیا ہے۔ صرف کعبہ معظمہ کا ہی کوئی مالک نہیں بلکہ اس کے گرد سارے حرم شریف کا کوئی آدمی مالک نہیں چاہے وہ مسافر ہو یا شہر کا رہنے والا۔ سَوَاعِدٌ مِّنَ الْعَکْفِ فَبِتَوَّالِبَاہِ۔ جانا چاہئے کہ بیت اللہ شریف کا طواف نماز کی طرح عبادت مقصودہ معقول ہے۔ طواف کی مختلف قسمیں ہیں۔ (1) طواف فرض: یہ طواف حج اور عمرہ کا رکن ہے۔ (2) طواف واجب: اس سے مراد طواف قدم اور طواف وداع ہے۔ ان کی تفصیل آگے بیان ہوگی۔ (3) ان کے علاوہ بغیر تمام طواف نفل ہیں اور ایسے طواف کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے نبی عبد مہتمم میں سے جس کو لوگوں کے امور میں سے کسی کا والی بنایا جائے تو دن یارات کی کسی ساعت میں بھی بیت اللہ شریف کا طواف کرنے اور اس میں نماز پڑھنے سے کسی کو بھی نردو کے (3)۔ اسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اصحاب سنن ابن خزیمہ ابن حبان دارقطنی اور حاکم نے ابوالزہیر سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے اس حدیث کو عبد اللہ بن باباہ کے واسطے سے حضرت جبیر بن مطعم سے نقل کیا ہے اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور دارقطنی نے اسے دوسری دو سندوں سے نافع بن جبرین ابن ابیہ اور حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے لیکن یہ روایت معلول ہے۔ دارقطنی نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی روایت کیا ہے۔ ابونعیم نے تاریخ اصحابان میں اور خطیب نے المغنی میں عامر بن عبیدہ عن ابی الزہیر علی بن عبد اللہ بن عباس عن ابن ابیہ سے بھی روایت کیا ہے۔ اور یہ روایت بھی معلول ہے۔ ابن عدی نے اسے سعید بن راشد سے اور انہوں نے عطاء کے واسطے سے حضرت ابوجہر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے۔

مسئلہ: نقلی طواف نذر کے سبب واجب ہو جاتا ہے جیسا کہ نماز۔ اس آیت میں بالا جماع طواف سے مراد حج کے دوران طواف زیارت کرتا ہے اور یہ طواف بالا جماع حج کے ارکان میں سے ایک رکن ہے۔ طواف زیارت کے علاوہ کوئی طواف بھی رکن نہیں۔

مسئلہ: طواف قدم امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سنت ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک واجب ہے۔ یہی موقف شوافع میں سے ابو ثور نے بھی اختیار کیا ہے۔ اس کے ترک کرنے سے ایک جانور کی قربانی واجب ہوتی ہے البتہ اس کے ترک کرنے سے بالا جماع حج فوت نہیں ہوتا۔

حضرت عمرہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حج ادا فرمایا اور اس کے بارے ام المؤمنین

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے مجھے یہ اطلاع دی کہ حضور نبی کریم ﷺ نے مکہ مکرمہ میں پہنچ کر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ آپ ﷺ نے وضو فرمایا اور بیت اللہ شریف کا طواف کیا۔ پھر اس کے بعد کوئی عمرہ نہیں کیا۔ پھر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حج کیا، آپ نے بھی سب سے پہلے بیت اللہ شریف کا طواف کیا پھر کوئی عمرہ نہیں کیا تھا۔ پھر حضرت عمر اور بعد ازاں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے بھی اسی طرح کیا ہے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے (1)۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب حج اور عمرہ پر قاور ہوئے تو آپ نے مکہ مکرمہ میں پہنچ کر سب سے پہلے طواف کیا۔ اکہیں پہلے تین چکر دوڑ کر گائے اور آخری چار چکر پر سکون چال کیا تھا ادا کئے۔ بعد ازاں دو رکعت نماز ادا کی اور پھر صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی۔ متفق علیہ (2)۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمرو بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حج مفرد ادا کیا اور اسکی دلیل ثَمَّ لَمْ یُکِنِّ غَضْفَةَ (پھر کوئی عمرہ نہیں کیا گیا) کے الفاظ ہیں۔ آپ نے مذکورہ دونوں حدیثوں سے یہ استدلال بھی کیا ہے کہ طواف قدم واجب ہے کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے مکہ مکرمہ پہنچ کر سب سے پہلے طواف قدم ادا کیا۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ما ساءک حج مجھ سے سیکھو۔ لہذا طواف قدم واجب ہوا کیونکہ بالا جماع طواف قدم کے بعد صفا اور مروہ کے مابین سعی جائز ہے۔ اور بالا جماع صفا اور مروہ کے درمیان سعی واجب ہے اور بالا جماع سعی کے جائز ہونے کے لئے اس سے پہلے طواف کا ہونا شرط ہے۔ اور واجب نفل کے تابع نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ مکرمہ کے مایسوں کے لئے طواف زیارت کے بعد ہی صفا اور مروہ کے مابین سعی جائز ہے کیونکہ ان پر طواف قدم نہیں ہے اور طواف کے بعد بطور نفل سعی جائز نہیں۔

اور اگر آپ یہ کہیں کہ کثیرا احادیث صحیحہ اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حج قرآن کیا تھا کیونکہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو حج اور عمرہ کا تلبیہ کہتے خود سنا ہے۔ آپ ﷺ فرما رہے تھے لَبَّيْكَ عُمْرَةً وَ خُجَا - متفق علیہ (3)۔

حضرت عمر ابن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حج اور عمرہ دونوں اکٹھے کئے تھے (4)۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر عمرہ سے حج تک تہنح کیا تھا اور اپنے ساتھ قربانی کے جانور بھی لائے جن کی قربانی کی تھی۔ متفق علیہ (5)۔ اس جیسی اور احادیث کی بناء پر حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ بن ضہیل نے کہا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حج تہنح کیا تھا۔

ہم کہتے ہیں کہ اس حدیث میں تہنح سے مراد حج قرآن ہے۔ کیونکہ عمرہ سے حج تک تہنح کرنے کا لغوی معنی یہ ہے کہ حج کے مہینوں میں ایک ہی سال میں حج اور عمرہ دونوں کو اکٹھا کرنا، چاہے تو دونوں ایک ہی احرام کے ساتھ ادا کئے جائیں یا دو مختلف احراموں کے ساتھ۔ (یعنی دونوں کے لئے علیحدہ علیحدہ احرام باندھا جائے) ارشاد باری تعالیٰ قَسَبْنَا لَكُمْ نَارًا مِّنْ لَّدُنَّا فَمَوْءُودًا اِلَى الْاِحْتِجَابِ فَمَا اسْتَسْتَسْتَعِينُ مِنْ لَّدُنَّا - سے یہی مراد ہے۔ اور حج تہنح کی حج قرآن کے مقابلہ میں جو اصطلاح استعمال ہوئی ہے وہ فقہاء کی جدید اصطلاح ہے اور جو حدود پیش ہم نے ذکر کی ہیں وہ اور انکے علاوہ دیگر احادیث صحیحہ اس پر دلالت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حج اور عمرہ دونوں کے لئے اکٹھا احرام باندھا

1- صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 219 (وزارت تعلیم)

2- ایضاً صفحہ 218

3- صحیح مسلم، جلد 8، صفحہ 176 (العلمیہ)

5- مشکاۃ المصابیح، جلد 2، صفحہ 79 (القدر)

4- ایضاً صفحہ 168

تھا۔

پھر لوگوں کا اس بارے اختلاف ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو کیا آپ ﷺ نے ایک طواف کیا یا دو طواف؟ یعنی ایک طواف قدم اور دوسرا طواف عمرہ۔ تو اس بارے جمہور کا موقف یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ جب مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو آپ نے صرف ایک ہی طواف ادا فرمایا۔ جبکہ امام عظیم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ہے کہ آپ ﷺ نے دو طواف کئے۔ جمہور نے صحیح بخاری کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ مکہ مکرمہ میں تشریف لائے، طواف کیا، صفا و مروہ کے مابین سعی فرمائی اور پھر طواف کے لئے کعبہ معظمہ کے قریب تک نہ گئے یہاں تک کہ عرفہ (عرفات) سے واپس تشریف لے آئے (1)۔

اسی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث ہے کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سال حج کا ارادہ فرمایا جس سال حجاج حضرت ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر چڑھائی گئے ہوئے تھا۔ تو آپ سے یہ عرض کی گئی کہ لوگ باہم جنگ و جدال اور جھگڑے فساد میں مبتلا ہیں۔ اس لئے تمہیں یہ اندیشہ ہے کہ وہ آپ کا راستہ روک لیں گے۔ تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ (اگر ایسی صورت حال پیش آئی) تو میں وہی کروں گا جو رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا۔ بیشک میں تمہیں اس پر گواہ بنانا ہوں کہ میں نے اپنے اوپر عمرہ واجب کر لیا ہے۔ پھر آپ چل پڑے یہاں تک کہ جب مقام بیداء کے باہر پہنچے تو فرمایا حج اور عمرہ کی ایک ہی حالت ہوتی ہے میں تمہیں اس پر گواہ بنانا ہوں کہ میں نے اپنے اوپر عمرہ کے ساتھ حج بھی واجب کر لیا اور آپ نے مقام قدید سے ایک قربانی کا جانور خرید کر وہ بھی ساتھ کر لیا (2)۔ اور مکہ مکرمہ میں یوم نحر آنے سے قبل نہ آپ نے قربانی کی احرام کے سبب ممنوع ہونے والے امور میں سے کسی کا ارتکاب نہیں کیا، سر کا قلع نہیں کرا یا اور نہ ہی بال ترشوائے۔ یہاں تک کہ جب یوم نحر آیا تو آپ نے اپنی قربانی کو ذبح کیا اور سر کا قلع کروایا۔ اور یہ خیال فرمایا کہ آپ کا حج اور عمرہ دونوں پہلے ہی طواف کے ساتھ ادا ہو چکے ہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی اسی طرح کیا تھا۔ متفق علیہ۔ اور ایک روایت میں ہے کہ راوی نے دوسری حدیث میں کہا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرمایا کرتے تھے کہ جس نے حج اور عمرہ دونوں کو اکٹھا کیا تو اس کے لئے ایک ہی طواف کافی ہے۔ وہ احرام نہ کھولے یہاں تک کہ (دونوں ادا کرنے کے بعد) دونوں کی جانب سے اکٹھا احرام کھول دے۔ مسلم کی روایت میں ہے کہ جب آپ بیت اللہ شریف پہنچے تو طواف کے سات پتھر لگائے اور صفا و مروہ کے درمیان سات بار سعی کی اور اس سے زائد کچھ نہ کیا اور یہ خیال کیا کہ یہی کافی ہے۔

احناف نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ آپ نے حج اور عمرہ دونوں کا اکٹھا احرام باندھا اور پھر دونوں کے لئے دو طواف کئے اور صفا و مروہ کے مابین دو مرتبہ ہی سعی کی۔ اور پھر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ایسے ہی کرتے دیکھا ہے (3)۔ دارقطنی اور نسائی نے اسے کئی طرق سے روایت کیا ہے۔ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الآثار میں حضرت امام عظیم ابوحنیفہ سے ان کی اپنی سند کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول روایت نقل کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا جب تہرج اور عمرہ دونوں کے لئے اکٹھا احرام باندھو تو دونوں کے لئے علیحدہ علیحدہ دو طواف کرو اور دونوں کے لئے صفا و مروہ کے درمیان سعی بھی دو بار کرو۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ حج قرآن کرنے والا کعبہ معظمہ کا طواف دو بار کرے اور صفا و مرہ کے مابین سعی بھی دو بار کرے (1)۔

حافظ نے کہا ہے کہ جو اقوال حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع نقل کئے گئے ہیں ان کی اسناد ضعیف ہیں لیکن امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر افراد نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو اقوال مرفوعاً نقل کئے ہیں ان میں مجموعی طور پر کوئی ضعف نہیں وہ قابل قبول ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ حدیث اگر ثابت بھی ہے تو بھی یہ اس پر دلالت نہیں کرتی کہ حضور نبی کریم ﷺ جب مکہ مکرمہ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے منیٰ کی طرف جانے سے قبل دو طواف کئے، ایک طواف عمرہ کے لئے اور ایک طواف قدم۔ بلکہ اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ اپنے عمرہ کے لئے طواف اور سعی منیٰ کی طرف جانے سے پہلے ادا کئے اور پھر یوم النحر کو حج کے لئے طواف اور سعی ادا کی۔ یہی معنی حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے دو بار طواف فرمایا اور دو مرتبہ ہی سعی کی۔ اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے (2)۔

کسی بھی صحیح یا ضعیف حدیث میں آپ ﷺ کے بارے میں مروی نہیں کہ آپ ﷺ نے عمرہ کے طواف کے بعد طواف قدم فرمایا ہو۔ مگر منہ ابی حنیفہ میں رضی بن معبد سے یہ مروی ہے کہ میں جزیرہ سے حج قرآن ادا کرنے کے لئے آیا۔ اس دوران سلیمان بن ربیعہ اور زید بن مسوحان کے پاس سے میرا گزارہ ہوا (اس وقت میں حج اور عمرہ دونوں کے لئے اکٹھا تلبیہ کہ رہا تھا) چنانچہ انہوں نے مجھ سے یہ الفاظ سن لیبیک بحجۃ و عمرۃ۔ تو ان میں سے ایک نے کہا یہ تو اذن سے بھی زیادہ گمراہ ہے۔ دوسرے نے کہا یہ تو فلاں فلاں شی سے بھی بڑھ گمراہ ہے۔ میں چلا گیا یہاں تک کہ میں نے تمام احکام ادا کر دیئے۔ بعد ازاں میں امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس حاضر ہوا۔ راوی آگے بیان کرتے کرتے یہ کہتا ہے کہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سے یہ دریافت کیا کہ پھر تو نے کیا کیا؟ تو میں نے یہ عرض کی میں پہنچا گیا اور میں نے اپنے عمرہ کے لئے طواف کیا اور پھر سعی کی۔ پھر میں واپس لوٹا اور پھر اپنے حج کے لئے اسی طرح کیا (یعنی طواف اور سعی ادا کی) پھر میں احرام کی حالت میں ہی باقی رہا اور وہی کچھ کرتا رہا جو دوسرے حاجی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ میں نے اپنا آخری رکن تک ادا کر دیا تو حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تو نے اپنے نبی کریم ﷺ کی سنت کی ہدایت کو پالیا۔ مسند امام ابی حنیفہ کی روایات جمع کرنے والے اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے درمیان کئی ایسے افراد اور رواۃ موجود ہیں جن کے اموال معروف نہیں اس لئے مسند کی احادیث صحیح بخاری کی اس حدیث کے معارض بننے کی صلاحیت نہیں رکھتیں، جو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے طواف کعبہ معظمہ کے قریب تک نہیں ہوئے یہاں تک کہ آپ عرفات سے واپس لوٹ کر آئے (3)۔ واللہ اعلم۔

جب یہ امر ثابت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حج قرآن ادا فرمایا اور اس وقت عمرہ کے طواف کے سوا طواف قدم نہیں کیا تو اس سے یہ واضح ہو گیا کہ طواف قدم حج کے ارکان میں سے ایک رکن نہیں اور نہ ہی یہ مستقل طور پر واجب ہے بلکہ یہ سنت ہے اور حجۃ المسلمین کی دور کعتوں کی طرح ہے۔ یہ کسی واجب اور دوسری سنت کے ضمن میں ادا ہو جاتا ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ جو آدمی مسجد

2- سنن الدار قطنی، جلد 2، صفحہ 264 (الحاجان)

1- شرح معانی آثار جلد 1، صفحہ 406 (وزارت تعلیم)

3- صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 445 (المنکر)

میں داخل ہو اور آتے ہی وہ فرض یا سنت مؤکدہ ادا کرے تو تحیۃ المسجد کی طرف سے وہی کافی ہو جاتی ہے پس حضور نبی کریم ﷺ جب مکہ مکرمہ شریف لائے اور عمرہ کے لئے طواف فرمایا تو یہی طواف طواف قدیم کی جانب سے بھی کافی ہو گیا۔

مسئلہ: بالا جماع طواف صدر (وداع) بھی حج کا رکڑ نہیں۔ بلکہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک واجب ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے لیکن امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ حج کے واجبات میں سے ہے۔ پس جس نے طواف وداع کیا اور پھر اسے مکہ مکرمہ میں کچھ وقت کے لئے رکنا پڑا اور پھر کچھ وقت گزرنے کے بعد مکہ مکرمہ سے نکلنے کا ارادہ بنا تو اس پر طواف وداع کا اعادہ واجب نہیں۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جو آدمی مکہ مکرمہ سے باہر سفر کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو آخر میں اس پر طواف وداع کرنا واجب ہے۔ گویا مذکورہ صورت میں آپ کے نزدیک اس آدمی پر طواف وداع کا اعادہ واجب ہے۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک طواف وداع سنت ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے۔ اور حنیف اور احصاء کے عذر کے سبب بالا جماع یہ طواف ساقط ہو جاتا ہے۔

ہماری دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے آپ فرماتے ہیں کہ لوگ (حج سے فراغت پانے کے بعد) ہر طرف سے واپس لوٹ آیا کرتے تھے تو حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کوئی بھی واپس کا سفر اختیار نہ کرے یہاں تک کہ اسکی آخری ملاقات بیت اللہ شریف سے ہو جائے۔ (یعنی بیت اللہ شریف کا طواف کر کے وہاں سے رخصت ہو) اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (۱)۔ اور دارقطنی نے اس طرح بیان کیا ہے کہ لوگ منیٰ سے ہنسی اپنے اپنے راستوں پر واپس لوٹ آیا کرتے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں حکم ارشاد فرمایا کہ ان کی آخری ملاقات بیت اللہ شریف سے ہونی چاہئے اور آپ ﷺ نے حاکمہ عورتوں کو رخصت دی۔

اور مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ تم میں سے کوئی (مکہ مکرمہ) واپس نہ لوئے یہاں تک کہ اس کی آخری ملاقات بیت اللہ شریف سے ہو جائے۔ اور متفق علیہ روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے لوگوں کو سب سے آخر میں بیت اللہ شریف سے ملاقات کا حکم ارشاد فرمایا مگر حیض والی عورتوں کے لئے اس میں تخفیف فرمائی۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ جو بیت اللہ شریف کا حج کرے اسے چاہئے کہ وہ تمام امور سے فارغ ہونے کے بعد آخر میں بیت اللہ شریف کا طواف کرے مگر حیض والی عورتوں کو رسول اللہ ﷺ نے رخصت عطا فرمائی ہے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور فرمایا یہ حدیث حسن صحیح ہے (۲)۔

حضرت عبد اللہ بن اوس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے جو اس بیت کا حج کرے یا عمرہ۔ تو اسے چاہئے کہ وہ آخر میں بھی بیت اللہ شریف سے ملاقات کرے (یعنی آخر میں اس کا طواف کرے) اسے ترمذی نے روایت کیا ہے (۳) اور اسی حدیث سے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ طواف وداع حج کے واجبات میں سے ہے کیونکہ حضور نبی کریم کے الفاظ من حج البيت او اعتمر اس کے واجبات حج ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ مذکورہ استدلال پر تو پھر اسے واجبات عمرہ میں سے بھی ہونا چاہئے مگر کسی نے بھی ایسا قول نہیں کیا۔ امام احمد رحمۃ

اللہ علیہ کے نزدیک حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد لَا يَنْفُرُ أَحَدٌ حَتَّى يَكُونَ إِخْوَهُ عَلَيْهِ بِالنَّبِيِّتِ عام ہے (جس سے ثابت ہوتا ہے کہ طواف صدر مطلقاً واجب ہے) اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصول پر مطلق کو مقید پر محمول کرنا لازماً نہیں آتا کیونکہ تنقید سب پر داخل ہے۔ جیسا کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے ہر آزاد اور غلام کی طرف سے ادا کرو۔ (ان دونوں حدیثوں میں سے پہلی میں سن المسلمین کے الفاظ مذکور نہیں، جبکہ دوسری میں مذکور ہیں تو ان میں مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا، یعنی پہلی حدیث میں بھی مسلمان آزاد اور غلام مراد ہوں گے) مگر طواف صدر کی حدیث میں ایسا نہیں کیونکہ اس میں قید سب پر داخل ہے۔ لہذا مکہ مکرمہ سے مطلقاً نکلتا طواف کا سبب ہے اور حج سے فارغ ہونے کے بعد بھی مکہ مکرمہ سے نکلتا طواف کا سبب ہے ان دونوں میں کوئی تعارض اور منافات موجود نہیں۔ واللہ اعلم۔

فصل: بیت اللہ شریف کے طواف کے لئے کچھ شرائط کچھ ارکان کچھ واجبات و سنن اور کچھ آداب ہیں۔

طواف کی شرائط: طواف کے لئے نیت کا ہونا شرط ہے کیونکہ نصوص اور اجماع سے یہ ثابت ہے کہ ہر عبادت مقصودہ کے لئے نیت شرط ہے لیکن طواف زیارت کے لئے مطلق طواف کی نیت کرنا کافی ہے، اس میں فرض کی نیت کا تعین کرنا شرط نہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ وقوف عرفی کی طرح طواف زیارت بھی حج کے ارکان میں سے ایک رکن ہے اور وقوف عرفہ کے لئے تو نیت شرط نہیں بلکہ جس نے نین کی حالت میں یا غشی کی حالت میں وقوف عرفہ کر لیا یا عرفات کی پہاڑی پر وقوف کیا اور وقوف کرنے والا یہ نہ جانتا ہو کہ یہ عرفات کی پہاڑی ہے تب بھی وقوف عرفہ (جو کہ اہم ترین رکن ہے) ادا ہو جاتا ہے۔

حضرت عروہ بن مضرس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں بیٹے کے پہاڑ سے آیا ہوں، میں نے اپنی سواری اور اپنے آپ کو بھی تخت تھکا دیا ہے۔ قسم بخدا! میں نے کوئی پہاڑ نہیں چھوڑا مگر میں نے اس پر وقوف کیا ہے کیا میری جانب سے حج ادا ہو جائے گا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اس مقام جمع میں ہمارے ساتھ حج کی نماز کو پالیا اور اس سے قبل دن یا رات کو عرفات میں حاضر ہوا تو اس کا حج مکمل ہو گیا اور اس کے مناسک حج ادا ہو گئے (۱)۔ رواہ ابوداؤد وغیرہ۔ تو پھر طواف اور وقوف کے درمیان وجہ فرقی کیا ہے؟

پھر اگر (طواف زیارت کے لئے) نیت شرط ہے تو پھر تمہارے اس قول کا سبب کیا ہے کہ مطلق طواف کی نیت ہی کافی ہوگی، تعین فرض کی نیت شرط نہیں۔ حالانکہ ہر اس فرض عبادت کے لئے تعین نیت شرط ہے۔ جس کے لئے وقت ظرف ہے نہ کہ معیاد۔ جیسا کہ نماز۔ (وقت کے ظرف ہونے سے مراد یہ ہے کہ فرض ادا ہو جانے کے بعد بھی وقت باقی رہتا ہے اور معیار سے مراد یہ ہے کہ فرض کی ادا نیکی کے بعد وقت باقی نہیں رہتا۔ اس کی مثال روزہ ہے)

ہم کہتے ہیں کہ اس مقام کی تحقیق یہ ہے کہ جب احرام باندھتے وقت حج کی نیت کی جاتی ہے تو اس کے ضمن میں تمام مناسک حج کی نیت بھی ہو جاتی ہے پھر جب تک کوئی دوسری نیت مناسک کی نیت کے خلاف نہ ہو تو ہر رکن کی ادا نیکی کے وقت سابقہ نیت کا ہی اعتبار کر لیا جائے گا اور نیت کی تجدید شرط نہیں ہوگی جیسا کہ نماز کے افعال میں ہوتا ہے۔ مگر مناسک میں سے جو مستقل عبادت ہیں مثلاً طواف اور طواف کی دو رکعتیں۔ ان میں شروع ہونے وقت مطلق نیت کی تجدید شرط ہے کیونکہ نماز اور طواف میں سے ہر ایک کی دو

جہتیں ہیں ایک جہت سے یہ مستقل عبادت ہیں اور ایک جہت سے عبادت کا جز ہیں۔ لہذا اس حیثیت سے کہ یہ مستقل عبادت ہیں ان کے اجزاء میں سے پہلے جز، کے ساتھ نیت کا ملنا شرط ہے اور اس حیثیت سے کہ یہ عبادت کا جز ہیں ان کے لئے وہ سابقہ نیت ہی کافی ہے جو احرام کے ساتھ مقرر ہے۔ لہذا ہم نے ان دونوں حیثیتوں پر عمل کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ چونکہ طواف عبادت ہے اس لئے اس میں شروع ہوتے وقت مطلق نیت کا ہونا ضروری ہے اور چونکہ یہ عبادت کا جز ہے اس لئے اس میں نیت کی تعیین شرط نہیں۔ اور وہ مناسک جو مستقل عبادت نہیں بلکہ وجہ کا جز ہیں مثلاً وقوف عرفہ اور صفا اور مروہ کے مابین سعی کا وغیرہ تو ان کے لئے ہم نے کہا ہے کہ انہیں شروع کرتے وقت نیت کرنا شرط نہیں بلکہ وہی سابقہ نیت کافی ہے جو احرام کے ساتھ مقرر ہے۔

مسئلہ: جس کسی نے دوسرے کو اٹھا کر طواف کیا، اس میں اگر اٹھانے والا محرم نہ ہو اور جس کو اٹھایا ہے وہ محرم ہو اور اٹھانے والے نے محمول (جس کو اٹھایا گیا) کے طواف کی نیت کی اور محمول نے بھی اپنے طواف کی نیت کی تو ہالہ اجماع یہ نیت صحیح ہے اور طواف درست ہے۔ اسی طرح اگر صورت اس کے برعکس ہو، یعنی اٹھانے والا محرم ہو اور محمول نہ ہو اور اٹھانے والے نے اپنے طواف کی نیت کی تو یہ طواف بالاجماع درست ہے۔

اور اگر دونوں محرم ہوں اور اٹھانے والے نے صرف محمول کے طواف کی نیت کی تو اس کا طواف درست ہوگا اور اگر اس نے اپنے طواف کی نیت کی تو صرف اس کا اپنا طواف صحیح ہوگا اور اگر اس نے دونوں کے طواف کی نیت کی تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صرف اٹھانے والے کا طواف درست ہوگا۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر اٹھانے والے نے اپنے لئے طواف کی نیت کی یا دونوں کے طواف کی نیت کی اور اس کے ساتھ محمول نے بھی اپنے طواف کی نیت کی تو دونوں جانب سے نیت پائے جانے کے سبب دونوں کا طواف ادا ہو جائے گا کیونکہ ان دونوں کی نیتوں کے درمیان کوئی منافات اور تقاضی موجود نہیں۔

مسئلہ: طواف کی شرائط میں سے حدیث اکبر اور حدیث اصغر سے پاک ہونا بھی ہے۔ اسی طرح بدن کپڑے اور جگہ کا حادث سے پاک ہونا ضروری ہے اور جمہور کے نزدیک ستر محوّرہ (شرمگاہ کو ڈھانپنا) بھی طواف کی شرائط میں سے ہے جیسا کہ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث پہلے گزر چکی ہے۔

آپ فرماتی ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے مکہ مکرمہ میں پہنچ کر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ آپ نے وضو فرمایا پھر طواف کیا (۱) اور اس کے ساتھ یہ ارشاد فرمایا خُذُوا عَنِّي مَنَا بَسْكَحْمًا۔ (مناسک حج مجھ سے لےو) صحیحین میں حضرت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ میں حاضر ہوئے کی حالت میں کہ مکہ مکرمہ آئی..... تو آپ ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا تم ویسے ہی افعال کرو جیسے حاجی کرتے ہیں مگر پاک ہونے تک بیت اللہ شریف کا طواف نہ کرو (2)۔ مسلم کی روایت میں ہے (کہ بیت اللہ شریف کا طواف نہ کرنا) یہاں تک کہ تم غسل کرلو۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ مکہ مکرمہ سے واپسی کی رات صبیحہ حانفہ ہو گئیں تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا یوم نحر کو انہوں نے طواف (زیارت) کر لیا تھا؟ تو عرض کی گئی جی ہاں! تو آپ ﷺ نے فرمایا پھر واپس چلو۔ متعلق علیہ (3)۔

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ حجۃ الوداع سے قبل جس حج میں رسول اللہ ﷺ نے

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امرینج بنا کر بھیجا تھا اسی حج کے دوران حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قربانی کے دن مجھے لوگوں کے پاس یہ اعلان کرنے کے لئے بھیجا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے اور نہ کوئی ننگے بدن بیت اللہ شریف کا طواف کرے (۱)۔ (اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ستر حورۃ لازمی اور ضروری ہے)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد فرمایا ہے **فَلْيَهْدِ رَبِّي لَهَا صَبِيحًا وَآيَاتِهِ**۔ (آیۃ)۔ (میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لئے پاک کر دو) چونکہ اللہ تعالیٰ عبارتاً اخص سے صراحۃً مکان کو پاک کرنے کا حکم ارشاد فرماتا ہے تو اس سے دلالتاً بدن اور کپڑوں کی پاکیزگی کا حکم بدرجہ اولیٰ ثابت ہو جاتا ہے۔ اسی طرح تمام قسم کے حدیثوں سے پاک ہونے کا حکم بھی بدرجہ اولیٰ ثابت ہو جاتا ہے کیونکہ احداث (نجاستوں) کا حکم احداث کی نسبت شرعاً اخص ہے کیونکہ ضرورت کے وقت نجاست کے ہوتے ہوئے نماز جائز ہوتی ہے لیکن کسی بھی صورت میں حدیث کے ساتھ نماز جائز نہیں ہوتی۔ (تو جب نجاستوں سے پاکیزگی کا حکم صراحۃً موجود ہے تو احداث سے پاکیزگی کا حکم بدرجہ اولیٰ ثابت ہوگا)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ کو ارشاد فرمایا **يَهْدِي لَهَا صَبِيحًا وَآيَاتِهِ**۔ (آیۃ)۔ (تو اللہ تعالیٰ نے اللہ تعالیٰ نے پس طواف کا ذکر نماز سے پہلے کیا گیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا طواف نماز کی طرح ہی ہے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے طواف کے دوران بولنے کی اجازت دی ہے پس جو بھی اس دوران گفتگو کرے اسے چاہئے کہ وہ اچھی گفتگو کرے (۲)۔ اسے حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے۔ اور صحیح قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں طبرانی اور بیہقی نے بھی نقل کیا ہے اور ابو نعیم نے حلیہ میں صرف مرفوع روایت نقل کی ہے۔

ترمذی حاکم و داؤد قطنی ابن خزیمہ ابن حبان اور بیہقی نے روایت کیا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیت اللہ شریف کا طواف کرنا نماز ہے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے طواف کے دوران کلام کو مباح قرار دیا ہے (۳)۔ ابن مسکن نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نجاستوں سے طہارت حاصل کرنا سنت ہے اور ستر حورۃ اور احداث سے طہارت حاصل کرنا واجب ہے۔ اسے ترک کرنے والا گنہگار ہوگا اور اگر اس نے فرض طواف جنبی حالت میں یا ننگے بدن کیا تو اس پر بدن کی قربانی واجب ہوگی۔ اور اگر فرض طواف بے وضو حالت میں کیا یا اس کے علاوہ کوئی عمل جنابت کی حالت میں یا ننگے بدن کیا تو اس پر مطلق دم (جانور کی قربانی) واجب ہوگا۔ اور اگر فرض طواف کے علاوہ کوئی طواف بغیر وضو کے کیا تو اس پر کسی مسکین کو نصف صالح گنہ گنہ صدقہ کرنا لازم ہوگی۔ ان چیزوں میں سے کوئی بھی آپ کے نزدیک طواف کے لئے شرط نہیں۔ کیونکہ کتاب اللہ سے مطلق طواف ثابت ہے اور کتاب اللہ پر زیادتی کرنا آپ کے نزدیک اس کے حکم کو منسوخ کرنا ہے اور اخباراً حاد سے کتاب اللہ کا نسخ جائز نہیں۔ لہذا آپ نے احادیث پر عمل کرتے ہوئے مذکورہ تمام چیزوں کو واجب قرار دیا ہے، انہیں شرط نہیں کہا تا کہ کتاب اللہ کا نسخ لازم نہ آئے۔

مسئلہ: طواف زیارت کی شرائط میں سے وقت بھی ہے کہ یہ وقت سے پہلے ادا نہیں کیا جاسکتا اور وقت گزر جانے کے بعد بلا اجتماع اس کی قضاء کی جائے گی۔ پس اگر کسی نے اپنی کوتاہی اور سستی کے سبب طواف کو وقت سے مؤخر کر دیا تو امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس پر ایک جانور کی قربانی واجب ہوگی۔ مگر جمہور کا موقف اس کے خلاف ہے اور اگر کسی نے عذر مثلاً انحصار اور پیش وغیرہ کے

سب سے مؤخر کر دیا تو اس پر قربانی واجب نہیں ہوگی۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک طواف زیارت کا وقت یومِ نحر کی طلوعِ فجر سے شروع ہوتا ہے اور دیگر ائمہ ثلاثہ کے نزدیک یومِ نحر کی رات میں نصف رات کے بعد سے شروع ہو جاتا ہے کیونکہ حضرت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے آپ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قربانی کی رات مجھے بھیج دیا۔ پس میں نے فجر سے پہلے رمی جمارِ اکبر پھر واپس جا کر طواف زیارت کیا (1)۔ اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی ضحاک بن عثمان ہے جسے قطان نے یسین فی الحدیث کہا ہے اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کے خلاف بھی ہے۔ اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اہل میں سے کمزوروں کو پہلے بھیج دیا اور انہیں فرمایا سورج طلوع ہونے تک رمی جمار نہ کرنا (2)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث صحیح ہے اور اسے ابو داؤد، نسائی، طحاوی اور ابن حبان نے حسن غریب کی سند سے روایت کیا ہے اور یہ حدیث حسن ہے۔ ترمذی اور طحاوی نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ ابو داؤد، نسائی، طحاوی اور ابن حبان کے نزدیک اس کی دوسری اسناد بھی ہیں جن میں سے بعض کی تقویت کا سبب بنتی ہیں۔ علاوہ انہیں حضرت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث میں طوافِ افاضہ (طوافِ زیارت) ثم اور فاء کے کلمہ کے ساتھ رمی جمار پر معطوف ہے اور یہ طوافِ افاضہ کے طلوعِ فجر سے پہلے کرنے پر دلالت نہیں کرتا۔ (اصل کلمات اس طرح ہیں) **اَلْقَالَتِ اَرْسَلْتُ رَسُوْلِي اللّٰهُ ﷺ لِيَلْتَمِ لَيْلَةَ النَّحْرِ فَرَمَتِ الْجَمْرَةَ قَبْلَ الْفَجْرِ ثُمَّ مَضَتْ فَافْاضَتْ**۔ تو ثم چونکہ تعقیب مع التراخي پر دلالت کرتا ہے اس لئے اس سے طوافِ افاضہ کا طلوعِ فجر سے مقدم ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک طوافِ زیارت کا آخری وقت ایامِ تشریق میں سے دوسرے دن کے غروبِ آفتاب تک ہے اور بعض نے کہا ہے کہ طوافِ زیارت کا وقت صرف یومِ نحر ہے۔ ہم نے سورہ براءت کی آیت **وَاذْكُرْ فِتْرَةَ اللّٰهِ وَرَسُوْلًا اِلَيْهِ النَّاسِ يَوْمَ الَّذِي بَعَثَ الْاَنْبِيَا كُتُبًا كُتُبِهِمْ** میں ذکر کیا ہے کہ جمہور کے نزدیک طوافِ زیارت کا وقت فقط یومِ نحر ہے۔ ابو داؤد اور حاکم نے اسی مفہوم کو حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مرفوع حدیث سے بھی بیان کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور یہی مفہوم حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی مروی ہے۔

ابن جریج نے مجاہد سے یہ قول نقل کیا ہے کہ یوم الحج الاکبر سے مراد تمام ایامِ منیٰ ہیں اور ثوری کہا کرتے تھے کہ یوم الحج الاکبر سے مراد تمام ایامِ منیٰ ہیں کیونکہ یوم سے مراد مطلق وقت اور مدت بھی ہوتی ہے مثلاً یومِ صفین، یومِ جمل اور یومِ بعاث وغیرہ۔

مسئلہ: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک طواف کی شرائط میں سے ترتیب بھی ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے۔ ترتیب یہ ہے کہ طواف کی ابتدا حجرِ اسود سے ہو۔ اس طرح کہ حجرِ اسود کے پاس سامنے کی طرف منہ کر کے سیدھا کھڑا ہو، مکمل حجرِ اسود آئیں جانب ہو اور طواف کرتے وقت بیت اللہ شریف بائیں جانب ہو۔ پس اگر کسی نے بیت اللہ شریف کو دائیں جانب رکھتے ہوئے طواف کیا تو وہ جائز نہیں ہوگا اور اگر حجرِ اسود کے بغیر کسی جگہ سے شروع کر دیا تو اس کا اعتبار بھی نہیں کیا جائے گا۔ پس طوافِ حجرِ اسود کے پاس ہی اختتام پذیر ہو اور وہیں سے اس کا آغاز ہو۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ترتیب طواف کے لئے شرط نہیں بلکہ اکثر حنفیہ کے نزدیک ترتیب سنت ہے، اسے ترک کرنا مکروہ ہے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ امام

اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ترتیب واجب ہے۔ اور اسے ترک کرنے کے سبب ایک جانور کی قربانی لازم ہوگی کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ اس پر مواظبت اختیار فرمائی ہے اور یہ ارشاد بھی فرمایا ہے کہ مناسک حج صحیح سے سیکھو۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے شرط اس لئے نہیں کہا تا کہ کتاب اللہ پر زیادتی لازم نہ آئے۔

مسئلہ: بالا جماع یہ مسئلہ بھی ہے کہ طواف کے لئے مسجد کے اندر سے ہونا شرط ہے نہ کہ مسجد کے ارد گرد۔ خبر مستفیض متواتر اسی طرح منقول ہے۔ اگر کسی نے مسجد کے ارد گرد سے طواف کیا تو اسے طواف بیت اللہ نہیں کہا جائیگا بلکہ طواف مسجد کہا جائے گا۔ اس لئے ولایت عرف کا تقاضا یہی ہے کہ طواف فقط مسجد کے اندر سے ہو۔

فصل: طواف کا رکن طواف کے سات پکڑیں اور اگر کہا جائے کہ امر بکرار کا تقاضا نہیں کرتا (لہذا ایک پکڑی کافی ہے) تو ہم یہ کہیں گے کہ جس طرح امر بکرار کا تقاضا نہیں کرتا اسی طرح امر بکرار کی نفی بھی نہیں کرتا۔ اور ہمارے پاس اخبار مشہور و مستفیض سے یہ منقول ہے کہ طواف کے پکڑوں کی تعداد نماز کی رکعتوں کی تعداد کی طرح ہے۔

مسئلہ: جس نے طواف کے چار پکڑے اور تین چھوڑ دیئے تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ طواف جائز ہے اور طواف زیارت کی صورت میں اس پر جانور کی قربانی واجب ہے اور دوسرے طوافوں کی صورت میں صدقہ لازم ہے کیونکہ اکثر کے لئے کل کا حکم ہوتا ہے اور کی دم اور صدقہ کے ذریعے پوری ہو جاتی ہے۔

لیکن امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ دیگر ائمہ کے نزدیک سات سے کم پکڑوں والا طواف جائز نہیں ہوتا جیسا کہ اگر ظہر کی ایک رکعت چھوڑی جائے تو نماز ادا نہیں ہوتی کیونکہ طواف میں پکڑوں کی تعداد نماز میں رکعتوں کی تعداد کی مثل ہے۔

مسئلہ: عظیم بیت اللہ شریف کا ہی حصہ ہے اس لئے اس کے باہر سے طواف کرنا واجب ہے۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کیا یہ دیوار بیت اللہ شریف میں سے ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جی ہاں! پھر میں نے عرض کی لوگوں کو کیا ہوا کہ انہوں نے اسے بیت اللہ شریف میں داخل نہیں کیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا تمہاری قوم کے پاس اخراجات کم ہو گئے تھے۔ میں نے عرض کی بیت اللہ شریف کا دیوار اذاتا بلند کیوں رکھا گیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ایسا تمہاری قوم نے کیا تا کہ جسے چاہیں اندر داخل ہونے دیں اور جسے چاہیں داخل ہونے سے روک دیں۔ اگر تمہاری قوم کا عہد جاہلیت قریب ہی نہ ہوتا تو مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ ان کے دل انکار کر دیں گے تو میں ان دیواروں کو بیت اللہ شریف میں داخل کر دیتا اور دروازے کو زمین کے ساتھ متصل لگا دیتا۔ متفق علیہ (1)۔

ترمذی اور نسائی نے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہی یہ روایت نقل کی ہے آپ نے فرمایا میں نے کعبہ معظمہ میں نماز پڑھنا پسند کیا تو رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے حجر (عظیم) میں داخل کر دیا اور فرمایا اس میں نماز پڑھ لو کیونکہ یہ بیت اللہ شریف کا ہی حصہ ہے۔ الحدیث (2)۔ ابو داؤد نے اسی طرح روایت نقل کی ہے۔ محققین نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ عظیم کا بعض حصہ بیت اللہ شریف کا حصہ ہے اور وہ چھ گز سے یکھ زائد ہے کیونکہ مسلم نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تمہاری قوم کا عہد شرک ابھی نازہ نہ ہوتا تو میں کعبہ معظمہ کو گرا دیتا اور اسے زمین سے ملا دیتا۔ پھر اسے از سر نو تعمیر کر کے اس کے دو دروازے رکھتا ایک مشرق کی جانب اور ایک مغرب کی جانب اور حجر (عظیم) میں سے چھ گز

کا ٹکڑا بھی اس میں شامل کر دیتا (1)۔ اور مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے کہ کعبہ معظمہ کا جو حصہ انہوں نے (تعمیر سے باہر) چھوڑا میرا خیال ہے کہ وہ تقریباً سات گز ہے۔ امام حمادوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے جریر بن حازم سے نقل کیا ہے کہ بزید بن رومان کا بیان ہے کہ میں اس وقت حاضر تھا جب حضرت ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کعبہ معظمہ کو گرا دیا اور پھر تعمیر کر لیا اور عظیم کو اس میں داخل کیا۔ میں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعمیر کردہ کعبہ معظمہ کی بنیاد کے پتھر اونٹ کی کوبان کی مثل دیکھے۔ یہیں انہوں نے اس جگہ کی طرف اشارہ بھی کیا (2)۔ جریر کا بیان ہے کہ میں نے عظیم کی اس جگہ کا اندازہ لگا دیا وہ تقریباً چھ گز کا ٹکڑا تھا۔

مجاہد کی روایت ہے کہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عظیم کی جانب سے چھ گز زمین کا کعبہ معظمہ میں مزید اضافہ کیا تھا اور ایک روایت میں چھ گز اور ایک باشت کا ذکر ہے۔

مسئلہ: جس نے عظیم کے اندر سے طواف کیا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ طواف ادا ہو جائے گا اور اس پر ایک جانور کی قربانی لازم ہوگی کیونکہ عظیم کا کعبہ معظمہ کا حصہ ہونا حدیث آحاد سے ثابت ہے اور اخبار آحاد سے کتاب اللہ پر زیادتی جائز نہیں۔

جہور کا نظریہ یہ ہے کہ طواف ادا نہیں ہوگا کیونکہ ان کے نزدیک کتاب اللہ پر خبر واحد سے زیادتی جائز ہے۔

میں کہتا ہوں (کہ عظیم کے باہر طواف کرنے کو لازم قرار دینا) کتاب اللہ پر زیادتی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بیت متین کے طواف کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور اہلبیت المتین پر اہل لام محمدی ہے۔ اور اہلبیت سے مراد وہ کعبہ معظمہ ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنایا تھا۔ جیسا کہ سیاق آیت اسی کا تقاضا کرتا ہے۔ قول باری تعالیٰ ہے وَادْخُلْنَا اَنْۡۤاۡلَیۡہِمْۡ یٰۤاٰیۡتِہِمْ مَّکَانَ الْبَیۡتِیۡتِیۡۤہِمْ۔ اور جب دلیل قطعی سے یہ ثابت ہو گیا کہ عظیم بیت اللہ شریف کا حصہ ہے تو جس نے عظیم کے اندر سے طواف کیا تو وہ اس کے ادا ہونے میں شک میں مبتلا ہو گیا حالانکہ اس پر بیت اللہ شریف کا طواف بلاشبہ فرض تھا۔ لہذا شک کے سبب وہ اپنی ذمہ داری سے عہد نہیں ہو سکتے گا۔ یا پھر اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ وہ کعبہ معظمہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنایا تھا وہ اپنی مقدار کے اعتبار سے مجمل ہے اور حدیث طیبہ نے اس اجمال کی تفسیر اور وضاحت کر دی ہے۔

مسئلہ: عذر کے سبب طواف زیارت سوار ہو کر کرنا بلاجماع جائز ہے اور اگر کوئی عذر نہ ہو تو پیدل چل کر طواف کرنا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک واجب ہے۔ لہذا جس کسی نے بغیر عذر کے سوار ہو کر طواف کیا جب تک وہ مکہ مکرمہ میں ہے اس پر دوبارہ طواف کرنا واجب ہے اور اگر اس نے طواف کا اعادہ نہ کیا تو اس پر ایک جانور کی قربانی واجب ہوگی۔

جہور نے کہا ہے کہ طواف میں پیدل چلنا سنت ہے، واجب نہیں۔ کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اونٹ پر سوار ہو کر بیت اللہ شریف کا طواف کیا۔ جب بھی آپ ﷺ کو مکہ کے پاس آئے تو اس شہی سے اشارہ کرتے جو آپ ﷺ کے دست مبارک میں تھی اور اللہ اکبر کہتے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے (3)۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے (اونٹ پر سوار ہو کر) بیت اللہ شریف اور صفا و مروہ کا چکر لگایا تاکہ لوگ آپ ﷺ کو دیکھ لیں آپ ان میں نمایاں ہو جائیں اور وہ آپ سے سوالات کریں۔ اسے مسم نے روایت کیا ہے (4)۔

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حدیث مروی ہے کہ چیتہ الوداع کے موقع پر حضور نبی کریم ﷺ نے

2- صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 15-16 (وزارت تعلیم)

4- صحیح مسلم، جلد 9، صفحہ 17 (اعلیٰ)

1- صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 430 (تقدیمی)

3- مشکوٰۃ المصابیح، جلد 2، صفحہ 87 (انکر)

اپنے اونٹ پر سوار ہو کر کعبہ معظمہ کے گرد طواف کیا اور (ہر چکر میں) استلام رکن کیا کیونکہ آپ ﷺ یہ ناپسند کرتے تھے کہ لوگ رکن سے اعراض برتیں (۱)۔

استناف کا موقف یہ ہے کہ اس موقع پر آپ ﷺ کا سوار ہونا بیماری کے باعث تھا کیونکہ ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ مکہ مکرمہ میں تشریف لائے تو آپ بیماری کا اظہار فرما رہے تھے لہذا آپ ﷺ نے اپنی سواری پر ہی طواف کیا۔ جب بھی آپ ﷺ رکن کے پاس آتے تو اپنے عصا مبارک کے ساتھ رکن کو مس کر لیتے۔ پس جب آپ طواف سے فارغ ہوئے تو اپنے اونٹ کو بٹھایا اور نیچے اتر کر دو رکعت (نماز) ادا کی (۲)۔

اس کا جواب یہ یاد گیا ہے کہ فقط احتمال کافی نہیں ہوتا اور وہ حدیث جو ابوداؤد نے روایت کی ہے وہ ضعیف ہے کیونکہ وہ حدیث یزید بن ابی زید کی روایت میں سے ہے اور وہ قوی اور مضبوط راوی نہیں ہے، اس کی روایت کردہ حدیث سے استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا انکار کرتے ہوئے کہا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ آپ ﷺ اس حج کے موقع پر بیمار تھے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر حضور نبی کریم ﷺ کو تکبرہ میں آتے وقت کوئی تکلیف ہوتی تو بالیقین وہ تکلیف طواف قدم میں بھی پیدل چلنے کے مانع ہوتی۔ جبکہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ سے آپ ﷺ کی صحیح حدیث مروی ہے کہ آپ ﷺ نے طواف قدم فرمایا، اس کے تین پکڑوں میں آپ ﷺ نے رمل کیا اور چار چکر پیدل چل کر مکمل کئے۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ بھی صحیح حدیث مروی ہے کہ آپ ﷺ نے صفا و مروہ کے مابین سعی فرمائی اور سعی کی تیزی کی وجہ سے آپ کی ازار مبارک گھوم رہی تھی۔ (یعنی اڑ رہی تھی)

مذکورہ روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے طواف زیارت اس لئے سوار ہو کر کیا تا کہ ایک تو اس کا جواز ظاہر ہو جائے اور دوسرا لوگوں کو ناسک حج کی تعلیم دی جاسکے۔ (اس سواری کا سبب آپ کی بیماری نہیں تھی) ہر طواف نافذ کا مسئلہ تو جمہور کے نزدیک بلا کراہت سوار ہو کر نقلی طواف کرنا جائز ہے لیکن امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصول کے مطابق یہ مکروہ ہے۔ جمہور کی دلیل بخاری شریف کی وہ روایت ہے جو سورۃ فتح میں ہم نے ذکر کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے جب مکہ مکرمہ فتح کیا اور طواف قدم کیا تو آپ ﷺ نے وہ طواف اپنے اونٹ پر سوار ہو کر کیا۔

مسئلہ: طواف کو لگا تا اور تسلسل کے ساتھ کرنا بالاجماع شرط نہیں بلکہ اس میں تسلسل برقرار رکھنا سنت ہے۔ سعید بن منصور نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے وہ بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے تھے کہ نماز کے لئے اقامت ہو گئی تو انہوں نے طواف کو چھوڑ کر لوگوں کے ساتھ مل کر باجماعت نماز ادا کی۔ پھر نماز سے فارغ ہو کر پہلے طواف کو جاری رکھتے ہوئے باقی طواف کو مکمل کیا۔ اسی طرح عبدالرزاق نے عبدالرحمن بن ابی بکر سے بھی نقل کیا ہے۔

سعید بن منصور نے حضرت جلاء سے یہ نقل کیا ہے کہ وہ ایسے آدمی کے بارے میں کہہ رہے تھے جو اپنے طواف کا کچھ حصہ ادا کر چکا ہو پھر کوئی جنازہ حاضر ہو جائے تو اسے چاہئے کہ وہ طواف چھوڑ کر نماز جنازہ ادا کرے اور پھر واپس لوٹ کر باقی طواف مکمل کرے۔

نافع نے کہا ہے کہ طواف کے دوران لوٹیل قیام کرنا بدعت ہے۔ اور حسن نے کہا ہے کہ اگر کسی آدمی کے طواف کے دوران نماز کھڑی ہو گئی اور اس نے طواف چھوڑ کر نماز پڑھی تو نماز سے فارغ ہونے کے بعد اس کو مکمل طواف کرے۔

فرض طواف کو منقطع کرنا مکروہ ہے اگرچہ فرض نماز کھڑی بھی ہو جائے۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے کہ انہوں نے طواف صدر کیا اور اس وقت حضور نبی کریم ﷺ صبح کی نماز پڑھا رہے تھے۔

مسئلہ:۔ نقلی طواف منقطع کرنا جائز ہے اگر فرض نماز کھڑی ہو جائے یا نماز جنازہ وغیرہ فوت ہو جائے کا اندیشہ ہو مگر نقلی عبادت کے لئے طواف کو منقطع کرنا صحیح نہیں۔ وتر کی نماز کے لئے اسے منقطع کرنا وہی ہے جیسا کہ ہم عبد الرحمن بن ابی بکر کا اثر ذکر کر چکے ہیں۔

مسئلہ:۔ امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک طواف کے سات چکروں کے بعد دو رکعت نماز پڑھنا واجب ہے۔ امام مالک سے بھی اسی طرح مروی ہے اور امام شافعی کا ایک قول بھی اسی طرح ہے۔ ان کو چھوڑنے کے سبب ایک جانوری قربانی لازم آئی۔ ہم نے یہ مسئلہ اور اس کے تمام متعلقات تفصیل کے ساتھ سورۃ البقرہ کی آیت میں ذِئْبِجْنِ ذَاوِیْنِ فَقَاہِرِ اِنۡرِجِمۡ مِصۡلٰی کی تفسیر میں ذکر کر دیئے ہیں۔

فصل:۔ طواف کے آداب یہ ہیں کہ جب آدمی کی نظر بیت اللہ شریف پر پڑے تو اللہ اکبر اور لا الہ الا اللہ کے کلمات کہے اور دعا مانگے۔ طہرائی کی روایت ہے کہ جب عطفہ کو کھینچتے ہی جو دعا مانگی جائے وہ مستجاب اور مقبول ہوتی ہے۔ پھر حجر اسود کے قریب ہو اور اللہ اکبر اور لا الہ الا اللہ کہے اور اگر کسی کو اذیت پہنچائے بغیر ممکن ہو تو اسے دونوں ہاتھوں سے بوس دے۔

امام بخاری نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث روایت کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ حجر اسود کو مس کرتے اور بوسہ دیتے تھے (1)۔

امام شافعی نے مرفوع روایت نقل کی ہے کہ آدمی طویل وقت تک اپنے ہونٹ مبارک حجر اسود پر رکھے رہے۔ اور ابن ماجہ میں ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے ہونٹ مبارک اس پر رکھے اور کافی دیر تک روتے رہے۔ اور حاکم نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے حجر اسود کو بوسہ دیا اور اس پر بچھدہ (1) کیا۔

اور اگر خود حجر اسود تک پہنچنا ممکن نہ ہو کسی شے سے اسے مس کرے اور اس شے کو ہی چوم لے جیسا کہ یہ روایت گزر چکی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے اونٹ پر طواف کیا اور اپنے عصا مبارک کے ساتھ رکن کو مس کرتے تھے۔ اور اگر اس سے بھی عاجز ہو (یعنی کسی شے کے ساتھ بھی حجر اسود چھونا ممکن نہ ہو) تو صرف اس کی طرف منہ کر کے تھوڑا سا رکن کے (اور فقط اشارے سے ہی استلام کر لے) حضرت سعید بن المسیب حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے انہیں ارشاد فرمایا کہ تو ایک طاقتور آدمی ہے۔ حجر اسود کے پاس مزاحمت نہ کر کسی کمزور اور ضعیف کو اذیت پہنچاؤ اگر جگہ خالی پاؤ تو استلام کر لینا اور نہ صرف اس کی طرف متوجہ ہو کر تکبیر و تہلیل کہہ دینا۔ اسے احمد نے روایت کیا ہے (2)۔

مسئلہ:۔ جب آدمی طواف کے دوران رکن یمانی کے پاس پہنچے تو اس کا استلام کرے۔ یہ جمہور کا موقف ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ رکن یمانی کا استلام مستحب ہے سنت نہیں۔

صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، آپ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دونوں (3) یعنی حجر اسود اور رکن یمانی کا استلام کرتے دیکھا ہے۔

1- صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 442 (الفکر) 2- مسند احمد، جلد 2، صفحہ 351 (سار) 3- صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 442 (الفکر)

(1) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ آپ نے حجر اسود کو بوسہ دیا اور اس پر بچھدہ کیا اور پھر کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے۔

دارقطنی نے مرفوع روایت نقل کی ہے کہ آپ ﷺ رکن یمانی کو بوسہ دیتے تھے اور اس پر اپنے رخسار مبارک رکھتے تھے (1)۔
ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت نقل کی ہے کہ رکن یمانی پر ستر فرشتے مقرر ہیں جو کوئی وہاں یہ دعا مانگا ہے "اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ رَبَّنَا إِنَّا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةٌ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ" تو دو فرشتے اس کی دعا پر آمین کہتے ہیں (2)۔

مسئلہ: طواف قدم میں پہلے تین پھکروں میں رمل کرنا چاہئے۔ (رمل سے مراد خوب کندھے یا کمر سینہ تا ن کمر قدم سے تیزی سے چلنا چاہئے) اور ساتھ ہی چادر سے اضطباع کرنا چاہئے۔ (اضطباع سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنے احرام کی چادر دائیں کندھے کی بغل کے بیچے سے گزار کر چادری دونوں طرفیں بائیں کندھے پر ڈال دے تاکہ دایاں کندھا تنگ ہو جائے) طواف کو حجر اسود سے شروع کر کے حجر اسود پر ختم کرنا سنت ہے۔ صحیح حدیث مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے تین پھکروں میں حجر اسود سے لے کر حجر اسود تک رمل کیا اور پھر چار پھکر پیدل چل کر مکمل کئے۔ اور جب بھی آپ ﷺ نے طواف ختم کیا۔ اسی طرح یہ بھی آپ ﷺ سے صحیح حدیث میں مروی ہے کہ آدمی طواف سے فارغ ہو کر مقام ابراہیم کے پاس دو رکعت نفل ادا کرے اور ان میں سورہ قل یا ایہا الکفرون اور سورۃ اخلاص تلاوت کرے۔ پھر حجر اسود کی طرف لوٹ جائے، استلام حجر کرے اور تکبیر و جہیل کہے۔

امام مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے مقام ابراہیم کو اپنے اور بیت اللہ شریف کے درمیان رکھا اور دو رکعت نماز ادا کی اور ان دونوں رکعتوں میں قل یا ایہا الکفرون اور قل هو اللہ احد تلاوت کیں اور پھر لوٹ کر حجر اسود کی طرف تشریف لے گئے اور اس کا بوسہ لیا (3)۔

ذٰلِكَ وَمَنْ يُعِظْمْ حُرْمَتِ اللّٰهِ فَهُوَ حَبِيبٌ خَيْرٌ لَّهِ عِنْدَ رَبِّهِ ۗ وَاُحِلَّتْ لَكُمْ الْاَنْعَامُ
اِلَّا مَا يَمِثُّ عَلَيْكُمْ فَاَجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاَجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ ۗ
حَقًّا لِلّٰهِ عَيْبٌ مُّشْرِكِينَ ۗ بِهِ ۗ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَانَ كَمَا كُنَّا حَزْرًا مِنَ السَّمَاءِ
مُتَحَفِّظَةً الظَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهٖ الرِّيْحُ فِي مَكَانٍ سَجِيْقٍ ۝

"ان احکام کو یاد رکھو۔ اور جو شخص تعظیم کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی حرمتوں کی تو یہ بہتر ہے اس کے لئے اس کے رب کے ہاں ہے۔ اور حلال کئے گئے تمہارے لئے جانور بجز ان کے جن کی حرمت پر بھی تم پر ہے پس پرہیز کرو جنہوں کی نجاست سے ہے اور بچو جنہوں کی بات سے بھیسے مائل ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف، نہ شریک ٹھہراتے ہوئے اللہ کے ساتھ لے۔ اور جو شریک ٹھہراتا ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تو اس کی حالت ایسی ہے گویا وہ گرا ہوا آسمان سے پس اچک لیا ہوا سے کسی پر نہ لے یا بھینک دیا ہوا سے ہوانے سے کسی دور جگہ ۷"

۱۔ ذلک مبتدا محذوف کی خبر ہے یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے یا یہ فعل محذوف کا قائل ہے یا فعل محذوف کے سبب منصوب ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ الامر ذلک (حکم یہ ہے) ذلک ثابت واجب الاتصال (یہ ثابت ہے اس کی بیروی واجب ہے) وجب ذلک (یہ واجب ہے) عرفت ذلک (تو نے اسے پہچان لیا) احفظ ذلک (تو اسے یاد کر لے) ذلک کا اشارہ ما قبل
1- سنن الدارقطنی، جلد 2 صفحہ 290 (النجاشی) 2- سنن ابن ماجہ، جلد 3 صفحہ 444 (المنکر) 3- صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 412 (وزارت تعلیم)

بیان کئے گئے احکام کی طرف ہے ذک اور اس جیسے الفاظ دو کاموں کے مابین فاصلے کے لئے ذکر کئے جاتے ہیں۔
 ع حرمت اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں اور وہ امور ہیں جنہیں کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ ان کی تعظیم سے مراد یہ ہے کہ ان
 گناہوں اور نافرمانیوں کے قریب جانا بھی ان پر مشاق کزرتا ہے۔ کیونکہ بندہ مومن اپنے سے صادر ہونے والے گناہ کو ایسے دیکھتا ہے
 گویا اس کے سر کے اوپر ایک پہاڑ ہے جس کے گرنے کا خوف اسے ہمہ وقت لاحق رہتا ہے۔ اور منافع اپنے سے صادر ہونے والے
 گناہ کو ایسے خیال کرتا ہے گویا وہ ناک پر بیٹھے والی مکھی ہے کہ جو نبی اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو وہ اڑ جائے گی۔ حدیث طیبہ میں ایسی
 ہی تشبیہ مذکور ہے۔

لیٹ نے کہا ہے کہ حرمت اللہ سے مراد وہ حدود اور پابندیاں ہیں جنہیں توڑنا قطعاً حلال نہیں، یعنی ان سے مراد امر و نہی ہیں۔
 ز جاننے کہا کہ حرمت سے مراد وہ شئی ہے جسے کامل اکمل طریقے سے صحیح صحیح ادا کرنا واجب ہو اور اس میں کسی طرح کی تفریط اور غفلت
 حرام ہو۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ حرمت اللہ سے مراد مساکیح ہیں۔
 ابن زید نے کہا ہے کہ یہاں حرمت سے مراد بلذہ حرام (حرمت والا شہیر یعنی مکہ مکرمہ) بیت حرام (حرمت والا گھر یعنی کعبہ معظمہ) اور شہر
 حرام (حرمت والے مینے جن میں بڑائی اور محترم اہرام ہے) ہے (۱)۔

ع تمہارے لئے جانور حلال کئے گئے ہیں بجز ان کے جن کی حرمت آیت حُذِرْتُمْ عَنْہُمْ لَعَلَّكُمْ الْهٰمٰتُ وَالنَّمٰہُ الْاٰیۃ میں بیان کی گئی ہے۔ تو
 پھر تم ان میں سے بخیرہ سائبہ وصلیہ اور حامی وغیرہ کو کیوں حرام قرار دیتے ہو۔ (اللہ تعالیٰ نے تو ان کی حرمت بیان نہیں کی) تزکیب کلام
 میں یہ جملہ مقررہ ہے۔

ع جس سے مراد بت ہی ہیں۔ اور بتوں کو جس (نہاست) اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ عقول اور طبائع سلیم ان سے ایسے ہی نفرت کرتی
 ہیں جیسے کوئی آدمی نہاستوں اور غلطیوں سے نفرت کرتا ہے۔ لہذا اس میں بتوں کی تعظیم سے روکنے اور ان کی عبادت سے نفرت دلانے
 میں حد درجہ مبالغہ کا اظہار ہے۔ بعض نے جس کا معنی رجز کیا ہے اور اس کا معنی عذاب ہے تو چونکہ جس (بت) عذاب دلانے کا سبب
 ہیں اس لئے جس کو بتی عذاب کہہ دیا۔

یہ قول الزود سے مراد جھوٹ ہے۔ یہ زور یعنی انحراف سے مشتق ہے۔ جیسا کہ لفظ اکلک اکت سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی پھیر
 دینا، موڑ دینا۔ اور جھوٹ بھی حقیقی واقعہ سے منحرف اور پھرا ہوا ہوتا ہے
 گھبرائیوں میں گر پڑا۔ کیونکہ اس نے اپنے آپ کو ایسی ذلت میں ڈال دیا کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی ذلت ہی نہیں تھی کہ اس نے اپنی
 مثل ممکن شئی کی عبادت شروع کر دی بلکہ اپنے سے گھٹیا پتھر اور اس جیسی دیگر چیزوں کی (پوجا کرنے لگا)

فخطفہ کو نافع نے باب تفصیل سے خاکہ کو مفتوح اور طوا کو مشدومہاند کے لئے پڑھا ہے۔ اور یاقین نے خاکہ کو ساکن اور طوا کو مخفف
 باب مجرد سے پڑھا ہے۔ اور الطیر استعارہ بالکنایہ ہے اور یہاں طیر سے مراد تباہ و برباد کرنے والی خواہشات ہیں جو کہ انسان کی یکسوئی
 اور اطمینان قلب کو چھین لیتی ہیں۔ اور اس کے انکار و نظریات کو پریشان کر دیتی ہیں۔ الریح بھی الطیر کی مثل استعارہ بالکنایہ ہے اور اس
 صواسے مراد شیطان ہے کیونکہ شیطان ہی انسان کو ذلت اور گمراہی کے گڑھے میں پھینک دیتا ہے۔

۱۷۔ فی مکان مسحوق سے مراد وہ جگہ ہے جو حق سے بہت دور ہو۔ یعنی جس نے شرک کیا اس نے نفس یا شیطان کو اپنے اوپر مسلط کر لیا۔ آیت طہ میں لفظ اذبح کے لئے مع اذبح کے لئے نہیں۔ (یعنی تو ممکن ہے کہ گرنے والے کو پرندے بھی اچک لیں اور ہوا بھی اڑالے جائے لیکن یہ ممکن نہیں کہ ان دونوں میں سے کچھ بھی نہ ہو)۔

علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ لفظ اذبح اور تقسیم کے لئے ہے کیونکہ شرکین میں سے بعض وہ ہیں جن کی شرک سے خلاصی اور نجات بالکل نہیں ہوئی۔ گویا انہیں پرندوں نے اچک لیا اور ان کے جسم کا کوئی حصہ بھی باقی نہیں رہا اور بعض وہ ہوتے ہیں جن کی شرک سے خلاصی اور نجات تو بے سبب ممکن ہوتی ہے (۱) تو یہ اس آدمی کی طرح ہیں جسے ہوانے بہت دور مقام میں اٹھا کر پھینک دیا ہو تو اس کے لئے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ پھر وہاں سے اپنے ٹھکانے کی جانب لوٹ آئے۔

ظاہر یہ ہے کہ یہ تشبیہات مرکہ میں سے ہے۔ معنی یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرے گا تو وہ اس آدمی کی طرح ہے جو آسمان سے گرا پڑا ہو۔ کیونکہ وہ کسی حیلہ اور تدبیر سے اپنے نفس کا مالک نہیں ہو سکتا اور وہ بالیقین ہلاک ہو جاتا ہے چاہے اس کی ہلاکت راستے میں ہی پرندوں کے اچک لینے کے سبب ہو یا پھر کسی دور مقام میں گر جانے کے سبب۔

حسن نے کہا ہے کہ کفار کے اعمال کو اس حال کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ ان کے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور وہ ان میں کسی شے پر قادر نہیں ہوں گے (۲) (یعنی جس طرح آسمان سے گرنے والے کی ہر تدبیر ناکام ہوتی ہے اسی طرح کفار کے اعمال بھی باطل ہوں گے اور قطعاً کوئی شئی ان کے لئے نفع بخش ثابت نہیں ہوگی)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث مروی ہے جس کا بعض حصہ ہم نے سورہ اعراف کی آیت لَا تَقْضِيهِمْ اٰجُوبَ السَّمٰوٰتِ الْاٰخِرٰتِ میں ذکر کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے کافر جند سے کی موت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ملائکہ اس کی روح کو لے کر بلند یوں کی جانب چڑھ جاتے ہیں یہاں تک کہ آسمان دنیا کی بلندی تک پہنچ جاتے ہیں پس وہ اس کے لئے آسمان کا دروازہ کھلوانا چاہتے ہیں لیکن اس کے لئے دروازہ نہیں کھولا جاتا پھر رسول اللہ ﷺ نے لَا تَقْضِيهِمْ اٰجُوبَ السَّمٰوٰتِ الْاٰخِرٰتِ فرمائی (پھر ارشاد فرمایا) کہ اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ اس کی کتاب سب سے نیچے والی زمین میں موجود جنین میں لکھ دو۔ پس اس وقت اس کی روح پھینک دی جاتی ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ومن بشرک باللہ فکانما حور من السماء فتخطفه الطیر الا یہ صلاوات فرمائی۔

ذٰلِكَ وَمَنْ يُعْظَمُ شَعَابِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوٰى الْقُلُوْبِ ۝ لَكُمْ فِيْهَا مَسَافِرُ اٰتٰى
اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَا اِلَى الْبَيْتِ الْعِزِيِّ ۝

”حقیقت یہ ہے اور جو ادب و احترام کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا۔ تو یہ (احترام) اسوجہ سے ہے کہ دلوں میں تقویٰ ہے۔ تمہارے لئے موشیوں میں طرح طرح کے فائدے ہیں ایک معین مدت تک ہے پھر ان کے ذبح کرنے کا مقام ہے۔ بہت دقیق کے قریب ہے۔“

۱۔ ذلک کی تفسیر حسب سابق ہی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا شعابرا اللہ سے مراد اونٹ اور قربانی کے دیگر جانور ہیں۔

۱۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد ۶، صفحہ ۵۱۳ (اعلیٰ)

۲۔ تفسیر بخاری، جلد ۴، صفحہ ۱۱۶ (القرن)

شعائر کی اصل میں اشعار سے ماخوذ ہے اور اشعار سے مراد انہیں ایسی نشانی لگا دیتا ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ یہ قربانی کے جانور ہیں۔ اور ان کی تعظیم کرنے سے مراد انہیں خوب موٹا تازہ کرنا ہے (1)۔

صحیح حدیث ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے سواہت قربانی دینے۔

ابوداؤد نے یہ روایت بیان کی ہے کہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک بختی افغانی کی قربانی دی۔ آپ سے تین سو دیناروں کے عوض اسے خریدنے کی کوشش کی گئی تھی (2)۔

ان کی تعظیم کرنا ایسے لوگوں کے افعال میں سے ہے جن کے دلوں میں تقویٰ ہے کیونکہ من تقوی القلوب اصل میں من افعال ذوی تقوی القلوب ہے۔ اس سے مضافات کا حذف کر دیا گیا ہے۔ اور قلوب کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کیونکہ دل ہی تقویٰ اور غفور و غفار اور مقام ہوتے ہیں۔ اور دل ہی ان دو کا حکم دینے والے ہوتے ہیں۔

سے تمہارے لئے ان شعائر یعنی اونٹوں اور قربانی کے جانوروں میں طرح طرح کے منافع ہیں۔ یعنی تمہارے لئے جائز ہے کہ تم ان جانوروں سے منافع حاصل کرو مثلاً انہیں کوئی ضرر پہنچائے بغیر ان پر سوار ہونا ان پر بوجھ لادنا اور ان کا دودھ پینا وغیرہ۔ انہیں ذبح کرتے وقت ان سے یہ منافع حاصل کرنا جائز ہے۔ اسی طرح عطاء بن رباح نے کہا ہے (3)۔ اور امام مالک امام شافعی امام احمد اور اسحاق نے بھی یہی کہا ہے۔ کہ قربانی کے جانور پر سوار ہونا اس پر بوجھ لادنا اور اس کا دودھ پینا اسے کوئی ضرر پہنچانے بغیر جائز ہے۔ اس کی تائید حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو قربانی کے لئے اونٹ ہانک کر لاتے ہوئے دیکھا تو فرمایا اس پر سوار ہو جاؤ۔ اس نے عرض کی یہ تو قربانی کے لئے ہے آپ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس پر سوار ہو جاؤ۔ اس نے عرض کی یہ قربانی کا اونٹ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس پر سوار ہو جاؤ اور ہانک کر لائے۔ یہ کہ دوسری یا تیسری بار فرمایا۔ متفق علیہ (4)۔ بخاری نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح حدیث نقل کی ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث مروی ہے کہ آپ نے ایک آدمی کو اونٹ ہانک کرتے دیکھا تو اسے فرمایا اس پر سوار ہو جاؤ کسی ایسے راستے پر نہیں چل سکتا جو محمد ﷺ کے راستے کی نسبت زیادہ سیدھا اور ہدایت بخش ہو۔ (یعنی قربانی کے جانور پر سوار ہونا آپ ﷺ کی سنت کے مطابق ہے تو اور راستہ اختیار نہ کرو) رواہ الطحاوی (5) امام اعظم ابوحنیفہ نے کہا ہے ضرورت کے بغیر قربانی کے جانور پر سوار ہونا ان پر بوجھ لادنا اور ان کا دودھ پینا جائز نہیں کیونکہ جب آدمی جانور مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے لئے وقف کر دیتا ہے تو اب اس کی کوئی خطا سے ذاتی منفعیت کے لئے استعمال نہیں کرنی چاہئے۔ یہ معنی تو مطلقاً قربانی کے جانور کو استعمال کرنے کے ممنوع ہونے کا تقاضا کرتا ہے چاہے اس کا استعمال ضرورت کے تحت ہو یا بغیر ضرورت کے ہو۔ اور قول باری تعالیٰ ومن يعظم شعائر الله فانها من تقوى القلوب بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ قربانی کے جانور پر سوار ہونا اور اس پر بوجھ لادنا اس کی تعظیم اور اسے موٹا تازہ کرنے کے مترادف ہے۔ لیکن چونکہ احادیث طیبہ سے ان پر سوار ہونے کا جواز ثابت ہے لہذا ہم نے بھی ضرورت کے تحت سوار ہونا جائز قرار دیا۔ اور مذکورہ بالا احادیث کو اسی حالت پر محمول کیا تاکہ سنت پر ترک عمل لازم نہ آئے۔ اور اس میں حاجت اور ضرورت کی شرط لگانے پر جو حدیث روایت کرتی ہے وہ امام طحاوی نے دو سندوں سے حمید الطویل کے واسطے سے حضرت

1- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 116 (مفکر)
2- سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 244 (دزارت تعلیم)
3- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 116 (المفکر)
4- صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 229 (دزارت تعلیم)
5- شرح معانی الآثار، جلد 1، صفحہ 382 (دزارت تعلیم)

انس رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے۔ کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو اونٹ ہانک کر لاتے دیکھا۔ اور وہ آدمی تھکا ہوا تھا تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا اس پر سوار ہو جا (1) اس نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ قربانی کا اونٹ ہے۔ آپ ﷺ نے پھر فرمایا اس پر سوار ہو جا اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا اس پر سوار ہو جا اگرچہ یہ قربانی کا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب کوئی آدمی قربانی کا اونٹ ہانک کر لاتا اور خود تھک جاتا تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا کرتے تھے اس پر سوار ہو جا تم ایسے راستہ پر چلے والے نہیں جو محمد ﷺ کے راستے کی نسبت زیادہ سیدھا اور ہدایت بخش ہے۔

مسلم نے حضرت ابو الزبیر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے قربانی کے اونٹ پر سوار ہونے کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا میں نے حضور نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب تو اس پر سوار ہونے کا حاتمند ہے تو معروف طریقہ کے مطابق اس پر سوار ہو جا یہاں تک کہ کوئی اور سواری پالے (2)۔ ہمارے نزدیک آیت طیبہ میں منافع سے مراد مجبوری اور حاجت کے وقت اپنی ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ مجاہد قتادہ اور شحاک نے قول باری تعالیٰ لکم فیہا منافع الی اجل مسمیٰ کا معنی بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان جانوروں سے منافع حاصل کرنا جائز ہیں۔ یہاں تک کہ تم انہیں قربانی کے لئے نامزد کرو اور انہیں معین کرو لیکن جب انہیں قربانی کے لئے معین اور نامزد کر دیا جائے تو پھر ان سے منافع کا حصول جائز نہیں (3)۔

یہ محلہا سے مراد جانوروں کو ذبح کرنے کی جگہ ہے (یعنی یہ طرف مکان ہے) بعض نے کہا ہے کہ اس سے فرد ذبح کرنے کا وقت ہے (یعنی طرف زمان ہے) ترکیب کلام میں محلہا منافع پر معطوف ہے۔ اور حرف عطف تراخی پر دلالت کرتا ہے۔ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد تراخی فی الوقت ہو کیونکہ قطع اٹھانے کا وقت ذبح کے وقت سے پہلے ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد تراخی رجبی ہو کیونکہ منافع سے مراد دنیوی منافع ہیں اور انہیں ذبح ثواب کے لئے کیا جاتا ہے اور یہ منافع اخروی ہیں۔ مفہوم یہ ہے کہ تمہارے لئے ان میں دنیوی منافع بھی ہیں پھر تمہارے لئے انہیں وقت مقررہ پر ذبح کرنا ہے۔ اور اس کے منافع (ثواب) تمہیں آخرت میں حاصل ہوں گے۔

الی البیت العتیق ترکیب کلام محلہا سے حال ہے۔ اور وہ حرف عطف کے واسطے سے طرف متعلق کا فاعل ہے، یعنی عبارت اس طرح ہے لکم من جعلہا مکاننا الی البیت العتیق اور یہ ترکیب بھی جائز ہے کہ محلہا مبتدا ہو اور اس کی خبر محذوف ہو اور الی البیت العتیق طرف اس سے حال ہو اور یہ صبریہ نویدا قائماً کے طریقہ پر ہے۔ لہذا تقدیر عبارت اس طرح ہوگی۔ من جعلہا مکاننا منہباً الی البیت العتیق اور یہ بھی جائز ہے کہ محلہا مبتدا ہو اور طرف اس کی خبر ہو اور پھر جملہ سابقہ جملے پر معطوف ہو۔

البیت العتیق سے مراد مکمل حرم پاک ہے کیونکہ وہ تمام کا تمام بیت کے حکم میں ہے۔ اور اسے تینوں کے لئے کہا گیا ہے کیونکہ اس پر کسی کی بھی ملکیت نہیں (لہذا کوئی بھی اس کی خرید و فروخت نہیں کر سکتا تو چونکہ یہ ہر ایک کی ملکیت سے آزاد ہے اس لئے اس کا نام تینوں کے لئے) اور یہ حرم البیت ہے۔ عرف عرب میں یہ کہا جاتا ہے بلغۃ البلید یہ تب بولا جاتا ہے جب کوئی شہر کی فناء میں داخل ہو جائے۔ اس میں تقدیر کلام اس طرح ہونا بھی جائز ہے۔ ثُمَّ مَجْلُهَا الْحَرَمُ مِنَ الْقَصَبِ الْغَنِيِّ مِنْ أَهْلِ الْبَيْتِ الْعَتِيقِ كَالْأَنْوَارِ مِنَ الْقَرِيَانِ گاہ حرم پاک کے کناروں سے لے کر بیت عتیق تک ہے۔ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ حرم پاک میں جہاں کوئی چاہے اس کے

لئے قربانی کرنا جائز ہے۔

حضرت امام مالک نے کہا ہے کہ حج کرنے والے کے لئے منیٰ کے علاوہ اور عمرہ کرنے والے کے لئے عروہ کے علاوہ کسی جگہ قربانی کا جانور ذبح کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ ایسا کرتے تھے۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ کا حج کے دوران منیٰ میں قربانی کرنا کسی اور مقام پر ذبح کرنے کے منافی نہیں، جب کہ وہ کتاب و سنت سے ثابت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا منیٰ مکمل طور پر قربان گاہ ہے۔ اور مکہ مکرمہ کے تمام پہاڑی راستے قربان گاہ ہیں۔ مکمل عرفات اور مکمل مزدلفہ موقف ہے (1)۔ اسے ابو داؤد اور ابن ماجہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ شعائر اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے دین کی علامات اور نشانیاں ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی تعظیم کرنا اہل تقویٰ کے افعال اور شعائر میں سے ہے۔ اس معنی کی بناء پر قول باری تعالیٰ لکم فیہا منافع ارشاد باری تعالیٰ اُجِثْتُ لَكُمْ بِهَيْبَةِ الْاَنْعَامِ اِنْ اَمَّا يَشِئْ عَالِمُكُمْ سے متصل ہوگا یعنی تمہارے لئے جانوروں میں دنیوی منافع ہیں جو تم مقررہ مدت یعنی موت تک حاصل کر سکتے ہو پھر اس بیت کے پاس ذبح ہو کر اپنی انتہا کو پہنچ جاتے ہیں یا جہاں اعمال کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ شعائر اللہ سے مراد حج کے فرائض اور مکہ مکرمہ میں حاضری کے وہ مقامات ہیں جہاں پہنچ کر تمہارے لئے ایک مقررہ مدت تک بازاروں میں تمہارے سبب دنیوی منافع ہیں۔ وقت مقررہ سے مراد مکہ مکرمہ سے واپس لوٹنے اور وہاں سے نکلنے کا وقت ہے۔ اور ایک مقررہ مدت تک مناسک حج ادا کرنے کے سبب اجر و ثواب کی صورت میں اخروی منافع بھی ہیں۔ یہاں مقررہ مدت سے مراد ایام حج گزرنے تک کی مدت ہے۔ پھر مکہ مکرمہ میں لوگوں کے لئے اپنے احرام کھولنے کا آخری مقام بیت العتیق ہے کہ وہ یوم نحر کو بیت اللہ شریف کا طواف زیارت کریں۔ (اور اس کے بعد مکمل طور پر اپنے احرام کی پابندیوں سے آزاد ہو جائیں گے)

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِيُذَكَّرَ وَاسْمُ اللّٰهِ عَلٰی مَا رَزَقْتَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْاَنْعَامِ ط
فَاِنَّهُمْ اِلٰهًا وَّاحِدًا قَلْبًا وَّاسْمُوْا ط وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٢٠﴾ الَّذِيْنَ اِذَا ذَكَرَ اللّٰهُ وَّجِلَتْ
قُلُوْبُهُمْ وَالصُّبْرِيْنَ عَلٰی مَا اَصَابَهُمْ وَالسُّبُوْحِيْنَ الصَّلٰوةِ وَّوَسَّاءِ رَاقِبَتِهِمْ يَتَّقُوْنَ ﴿٢١﴾

”اور ہر امت کے لئے ہم نے مقرر فرمائی ہے ایک قربانی تاکہ وہ ذکر کریں اللہ تعالیٰ کا اسم (یاک) ان کے زبان جانوروں پر ذبح کے وقت جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائے ہیں۔ پس تمہارا خدا خدائے واحد ہے تو اسی کے آگے سر جھکاؤ۔ اور (اسے محبوب) مزدوہ سنائیے تو اذیع کرنے والوں کو وہ لوگ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈرنے لگتے ہیں اور جو صبر کرنے والے ہیں ان (مصائب و آلام) پر جو پہنچتے ہیں انہیں اور جو صحیح ادا کرنے والے ہیں نماز کو اور ان چیزوں سے جو ہم نے انہیں عطا فرمائی ہیں وہ خرچ کرتے ہیں۔“

لے منسکا کو اسی مقام پر اور سورت کے آخر میں عمرہ اور کسائی نے سین کے کسرہ کے ساتھ منسکا پڑھا ہے اس کا معنی ہے عبادت گاہ اور باقیوں نے سین کو مفتوح پڑھا ہے۔ یہ صیغہ اسم ظرف ہے۔ یا پھر یہ مصدر ہے۔ اس صورت میں معنی ہوگا خون بہانا اور قربانیاں ذبح کرنا یا پھر اس سے مراد وہ قربانی ہے جس کے سبب لوگ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتے ہیں۔

ہی تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسم پاک کا ذکر کریں ان سب زبان جانوروں پر ذبح کے وقت جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائے ہیں۔ یعنی کسی اور کا نام ہرگز نہ لیں بلکہ اپنی قربانیاں خالص اللہ کی رضا کے لئے کریں۔ تو گویا یہ اس امر پر تنبیہ ہے کہ قربانیاں کرنے سے مقصود اللہ تعالیٰ کی یاد اور ذکر ہے لہذا یہ ایسی بات کی دلیل ہے کہ ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر لازم اور شرط ہے۔ جانوروں کو بھینٹنے کا نام دیا گیا ہے کیونکہ وہ کلام نہیں کر سکتے۔ آیت میں بھی یہ کلام کی قید سے مقتید کیا گیا ہے کیونکہ کچھ چوپائے ایسے بھی ہیں جو انعام نہیں مثلاً گھوڑے، شیخرا اور گدھے وغیرہ۔ ان میں سے کسی کو بھی قربانی کے طور پر ذبح کرنا جائز نہیں۔ بلکہ بالا جماع قربانی کے لئے جانوروں کا انعام اور پانچ ہوتا ضروری ہے۔

ترکیب کلام میں یہ جملہ مقررہ ہے اور اس میں امت محمدیہ علیہ صلوٰۃ والسلام کو امام سابقہ کا ذکر کر کے قربانی کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ جس قسم اپنے جانوروں کو ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ وحدہ لا شریک کا ہی نام لیں کیونکہ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ یہ جملہ اس امر کی علت بیان کر رہا ہے کہ ہم نے ہر امت کے لئے عبادت گاہ بنا دی ہے تاکہ وہ اللہ وحدہ لا شریک کا ذکر کریں کیونکہ تمام کلام معبود تو ایک ہے اگرچہ امتیں مختلف اور متعدد ہیں۔ پس اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرو، یعنی قربانی اور ذکر خالص اسی کے لئے کرو کسی اور کو اس کا شریک مت بناؤ۔

لے وبشر المحبتین کا عطف قول باری تعالیٰ و اذن فی الناس بالھجج پر ہے اگر یہ خطاب ہمارے نبی اکرم ﷺ کو ہے۔ اور اگر ایسا نہیں تو پھر اس کا عطف و اذنا بونا پر ہے۔ یعنی ہماری جانب سے جگہ مقرر کئے جانے کا وقت یاد کیجئے اور تو وضع و اعلیٰ کر کے والوں کو سزا دینا سنا دیجئے۔ الخبیث سے مراد ہے حقیر شی (1) یعنی وہ آدمی جو خشوع و خضوع کرے اور اپنے آپ کو حقیر شمار کرے۔ جب کوئی آدمی اجتماعی خشوع اور تواضع اختیار کرے تو کہا جاتا ہے اجرت فلان۔ قاصدوں میں اسی طرح مذکور ہے۔ اسی وجہ سے حضرت ابن عباس اور قتادہ رضی اللہ عنہم نے خبیثین کا معنی تواضعین (تواضع کرنے والے) کیا ہے۔ اور انفس نے کہا ہے اس کا معنی ہے خشوع کرنے والے۔ بعض نے کہا کہ خبیث کا معنی ہے زمین کا ہموار حصہ۔ اسی معنی کی بناء پر مجاہد نے کہا ہے کہ خبیثین سے مراد اللہ تعالیٰ کی یاد میں اطمینان پانے والے لوگ ہیں۔ اور خبیث نے کہا ہے کہ اس سے مراد مخلصین ہیں کیونکہ اطمینان ان خاص ہی ہوتا ہے۔ کبھی نے کہا ہے اس سے مراد نرم دل لوگ ہیں۔ عمرو بن اوس نے کہا ہے کہ خبیثین سے مراد وہ لوگ ہیں جو کسی پر ظلم نہیں کرتے اور جب ان پر ظلم کیا جائے تو وہ انتقام نہیں لیتے (2)۔ وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈرنے لگ جاتے ہیں کیونکہ جب اس کے جلال کی شعاعیں ان کے دلوں پر پڑتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی شانِ عظمت کے انوار ان پر جلوہ گھن ہوتے ہیں تو وہ بیت زدہ ہو جاتے ہیں۔ اور وہ ان مصائب و آلام پر جبر کرنے والے لوگ ہیں جو انہیں بھینچتے ہیں۔ اور وہ نمازوں کو ان کے اوقات میں صحیح صحیح ادا کرتے ہیں۔ اور جو چیزیں ہم نے انہیں عطا فرمائی ہیں ان سے وہ خرچ کرتے ہیں۔ ترکیب کلام میں یہ عطف لام موصول کے صلہ پر ہے۔ یعنی بَشْرِ الْبَدَنِ یَقْبَلُونَ الصَّلٰوةَ وَ یَنْفَقُونَ مِمَّا رَزَقْنَهُمْ۔

وَالْبَدَنَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا حَيٰوةً قَدْ كَرِهَ اللَّهُ لَهَا صَوَافٍ
قَدْ اَوْجَبَتْ جُؤْبَاهَا كَلُوا مِنْهَا وَاَطْعَمُوا الْقَانِيَةَ وَ الْمَعْتَرَةَ كَذٰلِكَ سَخَّرْنَا لَكُمْ

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٦٠﴾ لَنْ يَبَالُ اللَّهُ لِعُومِهَا وَلَا دِمَاؤِهَا وَلَكِنْ يَبَالُ الشَّقَاوَى مِنْكُمْ
كَذَلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكْتَبُوا وَاللَّهُ عَلَىٰ مَا هَدَيْكُمْ وَبَشِيرِ الْمُحْسِنِينَ ﴿٦١﴾

”اور قربانی کے فریہ جانوروں کو۔ ہم نے بنایا ہے تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے تمہارے لئے ان میں بھلائی ہے پس لو اللہ تعالیٰ کا نام ان پر ہے۔ اس حال میں کہ ان کا ایک پاؤں بندھا ہو اور تین پر کھڑے ہوں۔ پس جب وہ گر پڑیں کسی پہلو پر تو بخوبی کھاؤ اس سے نیز کھلاؤ قناعت کرنے والے فقیر کو اور بھیک مانگنے والے کو جس اس طرح ہم نے فرما کر بنا دیا ان جانوروں کو تمہارے لئے تاکہ تم (اس احسان کا) شکر یہ ادا کرو گے نہیں جتنے اللہ تعالیٰ کو ان کے گوشت اور ندان کے خون البتہ پہنچتا ہے اس کے حضور تک تقویٰ تمہاری طرف سے۔ یوں اس نے فرما کر بنا دیا ہے انہیں تمہارے لئے تاکہ تم بڑائی بیان کرو اللہ تعالیٰ کی اس (نعت) پر کہ اس نے تم کو ہدایت دی۔ اور (اے حبیب!) خوشخبری دیجئے احسان کرنے والوں کو“

۱۔ بدن بدست کی جمع ہے جیسے خشک خشکی کی جمع ہے۔ بزاری نے نہایہ میں کہا ہے کہ بدن کا اطلاق اونٹ اونٹنی اور گائے وغیرہ پر ہوتا ہے۔ ان کے عظیم الحسیہ اور موٹا تازہ ہونے کی وجہ سے انہیں بدن کہا جاتا ہے (۱) قاموس میں ہے کہ بدن سے مراد اونٹ اور گائے وغیرہ ہے (۲)۔ امام ابوحنیفہ نے بھی اس طرح کہا ہے۔

عظا اور سدی نے کہا ہے کہ اونٹ اور گائے تیل وغیرہ کو بدن کہا جاتا ہے، بھیڑ بکریوں کو بدن نہیں کہا جاتا (۳)۔ امام شافعی نے کہا ہے کہ بدن کا لفظ اونٹ کے لئے خاص ہے۔ علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ اونٹ کو عظیم الحسیہ ہونے کی وجہ سے بدن کہا جاتا ہے اور یہ بدن بدست (وہ عظیم الحسیہ ہو گیا) سے ماخوذ ہے (۴)۔

علامہ بغوی نے کہا ہے کہ بدن کو عظیم الحسیہ اور موٹا تازہ ہونے کی وجہ سے بدن کہا جاتا ہے لہذا اس سے مراد بڑے جسم والے فریہ اور موٹے اونٹ ہیں۔ جب آدمی کا جسم ضخیم ہو جائے تو کہا جاتا ہے بدن المرجل بدنا و بدانة اور جب آدمی عمر رسیدہ ہو جائے اور اس کا سم ڈھیلا پڑ جائے تو پھر بدن تبدینا کہا جاتا ہے (۵)۔

جنہوں نے یہ کہا ہے کہ بدن کا لفظ اونٹ کے لئے خاص ہے وہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ ہم نے حدیبیہ کے سال رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سات سات افراد کی جانب سے ایک گائے اور ایک بدن (اونٹ) قربانی کیا۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث صحیح ہے (۶)۔

ہم کہتے ہیں کہ مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اس طرح حدیث نقل کی ہے کہ ہم مکہ مکرمہ میں آئے تو رسول اللہ ﷺ نے ہمیں فرمایا جس کے پاس قربانی کا کوئی جانور نہیں وہ اپنا احرام کھول دے اور ہمیں حکم ارشاد فرمایا کہ ہم اونٹ اور گائے میں باہم شریک ہو جائیں۔ ہم میں سے ہر سات افراد ایک بدن میں شریک ہوئے۔ (تو اس حدیث میں بدن کا اطلاق گائے اور اونٹ پھر دونوں پر ہوا

2- التاموس الحیظ، جلد 2، صفحہ 1550 (تراث العربی)

4- تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 5176 (المعدیہ)

6- جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 110 (قاروقی)

1- النہایہ، جلد 1، صفحہ 108 (بیروت)

3- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 118 (المقر)

5- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 118 (المقر)

ہے ترکیب کلام میں الہدائن کا لفظ اس فعل مضر کا مفعول اول ہے جس کی تفسیر جعلہنا لکم بیان کر رہا ہے۔ اور یہ مفعول ثانی ہے۔
۱۔ شعائر اللہ سے مراد اللہ کے دین کی وہ علامات ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے شروع قرار دیا ہے۔ ترکیب کلام میں مفعول اول سے حال ہے۔ بعض نے شعائر کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ لفظ اشعار سے بنایا گیا ہے اور اس کا معنی ہے نشان لگانا تو چونکہ اونٹ کی کوبان پر لوہے سے نشان لگادیا جاتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ قربانی کا جانور ہے اس لئے اسے شعائر کہتے ہیں (چونکہ شعائر اللہ میں تمہارے لئے دینی اور دنیوی دونوں طرح کے منافع ہیں۔ پس تم ان پر اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کرو۔

حاکم نے مستدرک میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے موقوف روایت نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا اگر قربانی کے لئے بدنہ (اونٹ) ہو تو اسے کھڑا کر کے یہ کہن چاہئے اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر اللہم منک ولک بھروسہ اللہ پڑھتے ہوئے اس کا نحر کر دینا چاہئے (نحر سے مراد نعلی کے قریب زور سے نیزہ مار کر اسے ذبح کر دینا ہے)

ابوداؤد ابن ماجہ اور حاکم نے مستدرک میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ (قربانی کرتے وقت) یہ پڑھا کرتے تھے اِنِّیْ وَجْهٌ لِّلذِّیْ فَطَرَ السَّمَوٰتِ وَالْاَرْضِ عَلٰی مِلَّةِ اِبْرٰهٖمَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمَشْرِکِیْنَ اِنِّیْ صَلَیْتُ وَنَسَکْتُ وَنَحَّیْتُ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُبْرِتُ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ اللّٰهُمَّ مِنْکَ وَلِکَ (۱) بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَکْبَرُ

اسے صوآف بمعنی مصفوفہ ہے۔ صاحب قاموس نے کہا ہے کہ یہ فواصل کے وزن پر بمعنی مغافل ہے (۲)۔ اس کا معنی ہے تین ٹانگوں پر کھڑا ہوا، یعنی ایسا اونٹ جس کی دونوں ٹانگیں اور ایاں ہاتھ زمین پر لگا ہوا ہو اور اس کا یا ایاں ہاتھ بندھا ہوا ہو تو اسے صوآف کہا جاتا ہے۔ اور اسے اسی حالت میں نحر کر دیا جاتا ہے۔

امام بخاری نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ وہ ایک آدمی کے پاس سے گزرے، اسے دیکھا کہ وہ اونٹ کو بٹھا کر نحر کر رہا ہے۔ تو آپ نے اسے فرمایا اسے کھڑا کر کے باندھ لو یہی محمد ﷺ کی سنت ہے (۳)۔

عبد بن حمید اور ابن ابی الدینانے الاضاحی میں ابن منذر ابن ابی حاتم حاکم اور یحییٰ نے اپنی سنن میں ابو ظہیان سے یہ نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول باری تعالیٰ فاذکروا اسم اللہ علیہا صوآف کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا جب تو اونٹ کو نحر کرنے کا ارادہ کرے تو اسے تین ٹانگوں پر کھڑا کر کے باندھ لے پھر یہ کہہ بسم اللہ واللہ اکبر اللہم منک ولک (۴) اسے حاکم نے صحیح قرار دیا۔ امام بخاری نے معلق روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے صوآف کا معنی قیام کیا ہے (۵) سفیان بن عیینہ نے اپنی تفسیر میں عقید اللہ بن یزید سے اسی طرح نقل کیا ہے اور سعید بن منصور نے بھی اسے بیان کیا ہے۔ مجاہد نے کہا ہے کہ صوآف سے مراد یہ ہے کہ جب کسی اونٹ کی بائیں ٹانگ باندھ دی جائے اور وہ تین پاؤں پر کھڑا ہو جائے۔ حضرت ابن مسعود نے اس کی قرأت صوآف کی ہے اور اس سے مراد ایسا اونٹ ہے جس کا ایک ہاتھ باندھ دیا جائے اور نحر کرنے کے لئے اسے تین پاؤں پر کھڑا کیا جائے۔

2- القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1103 (اترث العربی)

4- الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 651 (العقیدہ)

1- سنن ابن ماجہ، جلد 3، صفحہ 530 (اعلیٰ)

3- صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 231 (وزارت تعلیم)

5- صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 231 (وزارت تعلیم)

ابنِ حسن اور جاہد نے اسے یاء کے ساتھ صوائی پڑھا ہے، اس کا معنی ہے خالص اللہ کی رضا کے لئے۔
 ۳۔ پھر جب وہ کسی پہلو کے بل زمین پر گر پڑیں یعنی سر جائیں تو ان سے خود بھی کھائے۔ فکلو امنہا میں امر اباحت کے لئے ہے اور یہ مسئلہ پہلے گزر چکا ہے کہ قربانی کے جانوروں کا گوشت کھانا جائز ہے۔ ترکیب کلام میں فاذا وحبث ہلہ شرطیہ فاذا کورا پر معطف ہے، یعنی ترتیب عبارت اس طرح ہے۔ فاذا کورا اسم اللہ علیہا فکلو امنہا اذا وحبث جنوبہا (پس تم ان پر اللہ تعالیٰ کا نام لو اور ان سے کھاؤ جب وہ پہلوؤں کے بل گر پڑیں) اور کھلاؤ قاعدت کرنے والے فقیر کو اور بھیک مانگنے والے کو۔ عکرمدہ ابریم اور قوادہ نے کہا ہے کہ قانع سے مراد (ایسا فقیر) ہے جو اپنے گھر میں ہی بیٹھا رہتا ہو، تکلف پاکدامن بنتا ہو جو اسے دے دیا جائے اسی پر قاعدت کرتا ہو اور کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کرتا ہو۔ اور مضر سے مراد بھیک مانگنے اور سوال کرنے والا فقیر ہے۔ عوفی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ قانع وہ ہے جو کسی سے تعرض نہ کرے اور نہ ہی کسی سے سوال کرے اور مضر وہ ہے جو اپنا آپ دکھاتا ہے تعرض بھی کرتا ہے لیکن سوال نہیں کرتا۔

مذکورہ دونوں صورتوں کے مطابق قانع قاعدت سے مشتق ہے جب کوئی دینے گئے جسے کہ اوپر راضی ہو جاتا ہے تو اس وقت کہا جاتا ہے قنع قناعت (اس نے قناعت اختیار کی یعنی مزید کا مطالبہ یا سوال نہیں کیا) سعید بن جبیر، حسن اور کلبی نے کہا ہے کہ قانع وہ ہے جو سوال کرتا ہے اور مضر وہ ہے جو اپنے آپ کو پیش تو کرتا ہے لیکن سوال نہیں کرتا۔ لہذا اس صورت میں قانع قنع یعنی قنع عا سے مشتق ہوگا اور اس کا معنی ہوتا ہے سوال کرنا۔ حسن نے المعز کی بجائے المعز کی قرأت کی ہے۔ دونوں کا معنی ایک ہی ہے۔ مثلاً کیا جاتا ہے۔ عرہ، عرہ، عرہ اور استرہ اور جب کوئی واضح طور پر کچھ طلب کرنے کے لئے آئے، چاہے تو وہ سوال کرے یا فقط تعرض پر ہی اکتفا کرے۔

ابن زید نے کہا ہے کہ قانع منسکین کو کہتے ہیں اور مضر وہ فقیر ہے جو منسکین نہ ہو اور اس کے پاس ذبح کے لئے جانور بھی نہ ہو اور وہ لوگوں کے پاس آتا ہے تاکہ قربانیوں کا گوشت حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو ان کے سامنے ظاہر کرے (۱)۔
 ۴۔ اس طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے لئے فرمانہ دار بنا دیا ہے۔ یعنی جس طرح ہم نے تمہیں یہ قدرت دی کہ تم ان اونٹوں کو کھڑا کر کے نحر کر سکتے ہو اسی طرح ہم نے ان کے عظیم المسبب اور طاقتور ہونے کے باوجود انہیں تمہارا مطیع و فرمانہ دار بنا دیا ہے۔ اور تم انہیں تین پاؤں پر کھڑا کر لیتے ہو اور پھر ان کے سینے میں تیزہ ٹھونپ دیتے ہو۔ تاکہ جو انعامات ہم نے تم پر فرمائے پورے قریب اور اغلاص کے ساتھ تم ان کے شکر گزار بنو۔

۵۔ ابن ابی حاتم، ابن جریر اور ابن منذر نے ابن جریج سے یہ نقل کیا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ قربانی کے اونٹوں کا گوشت اور خون کعبہ معظمہ میں چھڑک دیتے اور پھینک دیتے تھے۔ تو حضور نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام نے کہا کہ اس طرح خون چھڑکنا اور گوشت بکھیرنا ہمارا بذر جاؤلی حق ہے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی لن ینال اللہ الا یہ (۲)۔

ابن منذر اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ مشرکین جب جانور ذبح کرتے تھے تو وہ ان کا خون نلے کر کعبہ معظمہ کے بالکل قریب آجاتے اور کعبہ معظمہ کی طرف وہ خون چھڑک دیتے۔ پس مسلمانوں نے بھی ایسا کرنے کا ارادہ کیا تو

تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ **يُنَالِ اللَّهُ لِحُمُومِهَا وَلَا دِمَازُهَا** (1) مقاتل نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ ہرگز ان کے گوشت اور خون کو اپنی جانب نہیں اٹھاتا (2) بلکہ تمہاری جانب سے وہ اعمال صالحہ جو تقویٰ اور اخلاص پر مرتب ہوتے ہیں وہ اللہ کی جانب بلند ہوتے ہیں۔ تقویٰ سے مراد اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے۔ یعقوب نے **لن تنال قرأت کی** ہے، جبکہ باقیوں نے **بنال** پڑھا ہے۔

یے کذا لک سخر ہا لکم نعمت کی یاد دہانی کے لئے دوبارہ ذکر فرمایا اور لشکر واللہ کے ارشاد سے اس کی علت بیان فرمائی، یعنی تاکر تم اس کی اس عظمت و رفعت کو پہچان لو کہ وہ اس پر قدرت رکھتا ہے جس پر کوئی غیر قادر نہیں۔ اور اس پر شکر ادا کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی میں واحد جان لو۔ کیونکہ دین کی علامات مناسک و حج جانوروں کو مطہع و فرامبردار کرنے کے طریقے اور ان کے سبب قرب خداوندی کے حصول کی کیفیت پر اسی نے تمہاری راہنمائی فرمائی ہے۔ علیٰ ما ہدکم میں ماہ صمدیہ ہے یا ما سوسولہ ہے اور علیٰ تکبیر کے متعلق ہے کیونکہ وہ شکر کے معنی کو محضمن ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ لشکر واللہ سے مراد احرام کھولنے اور جانوروں کو ذبح کرتے وقت تکبیر کہنا ہے۔

وبشر المحسنین کے بارے میں حضرت ابن عباس نے فرمایا محسنین (احسان کرنے والے) سے مراد موحدین (توحید کا اقرار کرنے والے) ہیں (3)۔ ترکیب کام میں اس کا عطف بشار المحسنین پر ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يُدْفِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُجِبُ كُلَّ حَوَانٍ لَقَوِيٍّ أَيْدِينِ
لِلَّذِينَ يُفْتَنُونَ بِأَنَّهُمْ ظَلَمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۗ الَّذِينَ
أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَعْدَ حَقِّ آلَاءِ أَنْ يَقُولُوا رَبَّنَا اللَّهُ ۗ وَكَوَلَا دَفَعَهُ اللَّهُ
النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ أَتَاهُمْ صَوَاعِقُ وَبَيِّنَاتٌ وَمَسْجِدٌ يُذْكَرُ فِيهَا
اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَكَيُصْرَبُ اللَّهُ مِنْهُ صِغْرَةً ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۗ

”یقیناً اللہ تعالیٰ حفاظت کرتا ہے اہل ایمان کی (کفار کے مکر و فریب سے) بیشک اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا کسی دھوکہ باز احسان فراموش کو۔ اذن دے دیا گیا ہے (جہاد کا) ان (مظلوموں) کو جن سے جنگ کی جاتی ہے۔ اس بنا پر کہ ان پر ظلم کیا گیا اور بے شک اللہ تعالیٰ ان کی نصرت پر پوری طرح قادر ہے۔ وہ (مظلوم) جن کو نکال دیا گیا تھا ان کے گھروں سے تا جن سے صرف اتنی بات پر کہ انہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے۔ یہ اور اگر اللہ تعالیٰ بجاؤ نہ کرتا لوگوں کا انہیں ایک دوسرے سے ٹکراتو (طاقتور کی غارتگری سے) منہدم ہو جائیں خائفانہیں اور گرجے اور کھلیے اور مسجدیں جن میں اللہ تعالیٰ کے نام کا ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ضرور مدد فرمائے گا اس کی جو اس (کے دین) کی مدد کرے گا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ قوت والا (اور) سب پر غالب ہے۔“

لہٰذا کثیر اور ابو عمرو نے یہ دفع کی قرأت یہ دفع کی ہے۔ اور اس کا مفعول محذوف ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اہل ایمان سے مشرکین کے مکر و

فریب کو دور کر دے گا اور انہیں موئین (پر زیادتی کرنے) سے روک دے گا۔ باقیوں نے باب مغانہ سے اسے مدفع پڑھا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اہل ایمان کی ایسی حفاظت فرمائے گا کہ انہیں (کفار پر) غالب کر دے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کسی دھوکہ باز احسان فراموش کو دوست نہیں رکھتا۔ کل خون کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی امانتوں میں خیانت کا ارتکاب کرنے والا اور کفر کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری کرنے والا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کفار مکہ نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ خیانت کی اور اس کے ساتھ اوروں کو شریک ٹھہرایا اور انہوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی۔

زبان سے کہا ہے جو کوئی اپنے ذبیحہ کے سبب بتوں کا قرب خیال کرے اور ذبح کرتے وقت ان پر غیر اللہ کا نام لے وہ حوان کفوف ہے (1)۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ (ان اللہ اسحب الایہ) دفع کی علت بیان کرنے کے کل میں ہے۔

ع۔ امام احمد ترمذی مدنی اور حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ کو مکہ مکرمہ سے نکال دیا گیا تو اس وقت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ان لوگوں نے اپنے نبی کو شہر سے نکال دیا ہے، انہیں ضرور ہلاک کیا جائے گا (2)۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیت کریمہ نازل فرمائی (یعنی اذین للذین یقتلون الایہ) اسے حاکم نے صحیح کہا ہے۔ نافع عاصم اور ابو عمرو نے اذن صیفہ مجبول کی صورت میں قرأت کی ہے۔ اور باقیوں نے اذن صیفہ معروف کی صورت میں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جہاد کی اجازت اور رخصت عطا فرمائی۔

نافع ابن عامر اور حفص نے یقتلون میں تاہ کو مستوج پڑھا ہے (یعنی ان کی قرأت میں صیفہ مجبول ہے) یعنی ان موئین کو جہاد کی اجازت دے دی گئی جن سے مشرکین قتال کرتے تھے۔ اور باقیوں نے صیفہ معروف کی صورت میں تاہ کو مکسور پڑھا ہے۔ یعنی ان موئین کو جہاد کرنے اور کفار سے جنگ لڑنے کی اجازت دے دی گئی۔

علامہ لغوی نے ذکر کیا ہے کہ مفسرین نے کہا ہے کہ مشرکین مکہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام کو اذیت پہنچاتے تھے اور وہ مار کھا کر اور زخمی ہو کر آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوتے تھے اور آپ ﷺ کی بارگاہ میں اپنے حالات کے بارے میں شکایت عرض کرتے تھے۔ تو رسول اللہ ﷺ انہیں فرماتے صبر کرو کیونکہ ابھی تک مجھے قتال کا حکم نہیں دیا گیا (3)۔ پھر مدینہ طیبہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔

عبد الرزاق، عبد بن حمید ترمذی نسائی، ابن ماجہ، بزار، ابن جریر، ابن منذر، ابی ابن حاتم، ابن حبان، حاکم، ابن مردودہ اور بیہقی نے دلائل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ نقل کیا ہے کہ ستر سے کچھ زاد آفات میں جنگ کرنے سے منع کرنے کے بعد جہاد کی اجازت کے بارے میں یہ آیت سب سے پہلے نازل ہوئی۔ اسے ترمذی نے حسن اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔

ابن ابی حاتم نے عمرو بن زبیر سے اسے روایت کیا ہے اور عبد الرزاق اور ابن منذر نے زہری سے اسے نقل کیا ہے۔ علامہ ابو نے ذکر کیا ہے کہ مجاہدانے کہا ہے یہ آیت ان مخصوص افراد کے بارے میں نازل ہوئی جو مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی جانب ہجرت کرنے کے لئے نکلے تو کفار ان کا راستہ روکتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں کفار اور ہجرت سے روکنے والوں کے خلاف جنگ لڑنے کی اسی آیت میں اجازت عطا فرمائی (4)۔

2- جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 146 (فاروقی)

1- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 120 (الطبر)

4- ایضاً، صفحہ 121

3- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 121-120 (الطبر)

یعنی چونکہ کفار کی جانب سے ان پر بہت ظلم و زیادتیاں کی گئیں اس لئے انہیں بھی کفار کے خلاف جنگ لڑنے کی اجازت دے دی گئی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہل حرب کی عورتوں کو قتل کرنا جائز نہیں، اس پر تمام کا اجماع ہے۔ مگر جبکہ وہ صاحب رائے یا مالدار ہوں اور اپنی رائے یا مال سے مسلمانوں کے خلاف جنگ لڑنے میں کفار کی معاونت کر رہی ہوں (تو پھر انہیں بھی قتل کرنا جائز ہے) اس طرح شیخ فانی (بیرو فرقت) مرابہب ائمہ سے اور اپنا بیچ لوگوں کو بھی قتل کرنا جائز نہیں۔ اس میں امام شافعی کا ایک قول اس حکم کے خلاف ہے۔ ہاں اگر ان میں سے کوئی بھی اپنی رائے اور مدد سے کفار کی مدد کر رہا ہو تو پھر بالاقافاق انہیں قتل کرنا جائز ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک مرد عورت کو بھی قتل کرنا جائز نہیں بلکہ اسے اس وقت تک قید میں رکھا جائے گا جب تک کہ وہ مرد نہ جائے یا تو یہ نہ کر لے۔

امام ہاک امام شافعی اور امام احمد نے کہا ہے کہ مرد ہونے کی صورت میں مرد اور عورت حکم میں برابر ہیں (یعنی دونوں واجب القتل ہیں) ہناری دلیل حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بچوں اور عورتوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے (1)۔

حضرت رباح بن ربیع روایت کرتے ہیں کہ ہم ایک غزوہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے تو آپ ﷺ نے لوگوں کو کشتی پر جمع ہوتے دیکھا۔ تو آپ ﷺ نے ایک آدمی کو بھیجا کہ دیکھ کر آؤ یہ لوگ کشتی پر جمع ہیں تو اس نے آ کر بتایا کہ یہ اجماع ایک مقتولہ عورت پر ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ جنگ میں شریک تو تھی، اس وقت ہراول دستے کے امیر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ایک آدمی کو ان کی طرف بھیجا کہ خالد کو جا کر کہہ دو کہ کسی عورت اور کسی مرد کو قتل نہ کیا جائے۔ (بعض نے سمیت کا ترجمہ شیخ فانی اور بعض نے اس کا معنی غلام کیا ہے) اسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے (2)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت پر رہتے ہوئے چلو۔ کسی شیخ فانی، چھوٹے بچے اور کسی عورت کو قتل نہ کرو (الحدیث) اسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے (3)۔

مذکورہ احادیث میں مطلق عورت کا ذکر ہے اور لفظ امرأة مکروہی کے تحت آنے کی وجہ سے عام ہے لہذا یہ لفظ کافرہ اور مردہ عورت دونوں کو شامل ہے۔ اور اسے قتل نہ کرنے کی علت اس کا جنگ میں شامل نہ ہونا ہے۔ حنفیہ نے کہا ہے کہ اعمال کی جزاہ و سزا میں اصل تو یہ ہے کہ وہ دار آخرت تک کے لئے مسخر ہے۔ یہ دنیا تو دار العمل اور آزمائش کا مقام ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ لا اکوہا فی الدین۔ (دین میں کوئی جبر نہیں) اور وہ تمام اعمال جن کی سزا دنیا میں شروع قرار دی گئی ہے وہ ایسے مصالح اور منافع کے لئے ہے جو اس دنیا میں ہمیں ہی حاصل ہوتے ہیں۔ جیسا کہ قصاص، شراب پینے، قذف لگانے، زنا کرنے اور چوری کرنے کے سبب حدود کا نفاذ وغیرہ تو یہ تمام چیزیں ہماری جانوں، عزتوں، عقولوں، انساب اور مالوں کی حفاظت کے لئے نافذ کی گئی ہیں۔ لیکن مرد کو قتل کرنے کا حکم اس لئے ہے تاکہ اس کی جنگ کے شر سے محفوظ رہا جائے۔ یہ قتل اسکے کفر کی سزا نہیں کیونکہ اس کے کفر کی سزا تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے کہیں زیادہ اور شدید ہے۔ لہذا قتل کا حکم صرف انہی کے ساتھ مختص ہوگا جو جنگ کر سکتے ہیں اور وہ مرد ہیں۔ (اور

عورت چونکہ جنگ میں لڑتی اس لئے اس کے قتل کا حکم بھی نہیں ہوگا) اگر قتل اس کے کفر کی سزا ہو تو پھر رسول اللہ ﷺ اہل حرب کی عورتوں کو قتل کرنے سے منع نہ فرماتے۔ اور اگر یہ ان کے کفر کی سزا ہو تو پھر قتل کے سبب ان کا کفر سے پاک ہونا بھی لازم آتا ہے۔ جیسا کہ نصاب اور حدود میں ہے (کہ ان کے سبب آدمی اپنے گناہ سے پاک ہو جاتا ہے لیکن کافر کے لئے ایسا حکم نہیں لہذا معلوم ہوا کہ کافر کا قتل اس کے کفر کی سزا نہیں)

جنہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ مرتدہ عورت کو قتل کرنا واجب ہے، انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کی عمومیت سے موقف اختیار کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جس کسی نے اپنے دین کو بدلا تو تم اسے قتل کرو (۱)۔ اسے امام بخاری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔ اس بارے میں طبرانی نے معجم الکبیر میں، بہر بن حکیم عن امیر عن جدہ کی سند سے اور الاوسط میں حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے احادیث نقل کی ہیں۔

حنیفی نے اس کا جواب اس طرح دیا ہے کہ مذکورہ حدیث میں لفظ سن عمومیت پر دلالت کرتا ہے (لیکن عام مطلق نہیں بلکہ عام مخصوص بعض ہے) لہذا دو احادیث جن میں عورتوں کو قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے ان کے سبب ہم نے اس عام سے عورتوں کے حکم کی تخصیص کی ہے (کہ عورتیں اس عام حکم میں داخل نہیں) کیونکہ اگر اس عام کو اپنے عموم پر ہی باقی رکھا جائے (اور اس کی تخصیص نہ کی جائے تو پھر اسے بھی قتل کرنا لازم آئے گا) جس نے اپنے دین کو بدلتے ہوئے کفر کو چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا یا یہودیت کو چھوڑ کر عیسائیت کو قبول کر لیا (حالانکہ حکم اس طرح نہیں تو سبکی اس کا قرینہ ہے کہ من بدل و دینہم کے الفاظ اپنے عموم پر باقی نہیں۔ بلکہ دوسری احادیث ان کی تخصیص ہیں)

میں کہتا ہوں کہ حدیث کے مذکورہ الفاظ کے بارے میں تو یہ جواب دیا جاسکتا ہے لیکن حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ مسلمانوں میں سے جو اپنا دین بدل لے اسے قتل کرو۔ اس حدیث کو حاکم نے صحیح کہا ہے۔ (حدیث کے ان الفاظ میں تو مذکورہ احتمال نہیں آسکتا) تو اس کے بارے حافظ ابن حجر نے کہا ہے کہ یہ حدیث حنفی بن عمر العدنی کی سند سے مروی ہے اور یہ راوی مختلف فیہ ہے۔

مرتدہ عورت کے قتل کے جواز کا قول کرنے والوں کی دوسری دلیل حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ ایک عورت جسے ام مروان کہا جاتا تھا مرتدہ ہو گئی۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے حکم ارشاد فرمایا کہ اس پر اسلام پیش کیا جائے اگر وہ تو یہ کر لے (تو بہتر) ورنہ اسے قتل کر دیا جائے۔ اسے دارقطنی نے دو سندوں سے روایت کیا ہے۔ ان میں سے ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ اس نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا پس اسے قتل کر دیا گیا (۲)۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ دونوں سندیں ضعیف ہیں۔ علامہ ابن ہمام نے کہا ہے کہ پہلی سند عمر بن رواحہ کی وجہ سے ضعیف ہے اور دوسری عبد اللہ بن اذنیہ کے سبب۔ علامہ ابن حبان نے کہا ہے کہ اس حدیث سے استدلال جائز نہیں۔

ایک اور حدیث حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ غزوہ احد کے دن ایک عورت مرتدہ ہو گئی تو حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اس سے تو یہ کرنے کو کہا جائے (اگر انکار کر دے) تو اسے قتل کر دیا جائے (۳)۔ اس روایت کی سند میں

ایک راوی محمد بن عبد الملک ہے جس کے بارے میں علامہ محدثین نے کہا ہے کہ یہ حدیثیں وضع کرتا ہے پھر یہ بھی ہے کہ یہ احادیث اپنی مثل دوسری احادیث کے معارض بھی ہیں۔ مثلاً دارقطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورت جب مرتد ہو جائے تو اسے قتل نہ کیا جائے (1)۔ اس روایت کی سند میں ایک راوی عبد اللہ بن علی بن جریر ہے جس کے بارے دارقطنی نے کہا ہے کہ یہ کذاب ہے اور حدیثیں وضع کرتا ہے۔

ابن عدی نے الکامل میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایک عورت مرتد ہوئی لیکن آپ ﷺ نے اسے قتل کرنے کا حکم ارشاد نہیں فرمایا (2)۔ یہ حدیث حفص بن سلیمان کے سبب ضعیف ہے۔

طبرانی نے معجم میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب انہیں یمن کی طرف بھیجا تو فرمایا جو آدمی دین اسلام سے پھر جائے تو اسے اسلام کی دعوت دینا۔ اگر وہ توبہ کر لے تو اسے قبول کر لینا اور اگر وہ توبہ نہ کرے تو اس کی گردن مارو بنا (یعنی قتل کر دینا) اور جو عورت اسلام سے پھر جائے تو اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دینا اگر توبہ کر لے تو اسے قبول کرنا۔ اور اگر انکار کر دے تو اسے اپنے حال پر چھوڑ دینا (3)۔

امام ابو یوسف نے امام اعظم ابو حنیفہ سے انہوں نے عامر بن ابی نجد سے اور انہوں نے ابو ہریرہ کے واسطے سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ عورتیں جب دین اسلام میں داخل ہو کر مرتد ہو جائیں تو انہیں قتل نہ کیا جائے۔ بلکہ قید کر دیا جائے اور انہیں اسلام کی دعوت دی جائے اور اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے یا عاتق محمد بن حفص نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح مروی ہے۔

عبد الرزاق نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک اثر بیان کیا ہے کہ ان کے زمانہ میں ایک عورت عیسائی ہو گئی تو آپ نے حکم فرمایا کہ اسے ایسی زمین پر لے جا کر فروخت کر دیا جائے جس میں اس پر سخت مشقت اور تکلیف پڑے، ایسی زمین میں فروخت نہ کیا جائے جس میں اس کے ہم مذہب لوگ رہتے ہوں چنانچہ اسے دومۃ الجندل کے علاقہ میں فروخت کر دیا گیا۔ دارقطنی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اثر نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ عورت سے توبہ کرنے کا مطالبہ کیا جائے، اسے قتل نہ کیا جائے۔ اس کی سند میں ایک راوی جلاس ہے جس کی وجہ سے یہ ضعیف ہے۔

مسئلہ: اگر امام وقت کسی مصلحت کے پیش نظر اہل حرب کی عورتوں میں سے بعض کو قتل کرنے کا حکم دے جائے وہ مرتد ہوں یا کافر۔ تو اس میں کوئی حرج نہیں (انہیں قتل کر دیا جائے گا) ہم نے سورۃ فتح کی تفسیر میں یہ ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن لشکر پر مقرر کردہ مسلمان امراء سے یہ عہد لیا کہ جب وہ مکہ مکرمہ میں داخل ہوں تو ہوائے ان افراد کے جو ان سے قتال کریں کسی کو بھی قتل نہ کریں مگر آپ ﷺ نے چند افراد نے نام بتائے اور فرمایا کہ انہیں ضرور قتل کر دو اگرچہ انہیں خلاف کعبہ کے نیچے پاؤ۔ ہم نے سورۃ فتح میں ان کے اسماء بھی ذکر کئے ہیں، ان میں چند عورتوں کے نام بھی تھے، ان میں عبد اللہ بن خطیل کی دوگنے والی باندیاں تھیں ایک قرنہ اور دوسری قرینہ۔ لہذا قرینہ کو قتل کر دیا گیا اور قرنہ نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ دونوں مرتدہ تھیں۔ ان میں ایک عمر بن ہاشم کی لونڈی سارہ تھی اور ایک ابوسفیان کی بیوی ہندہ تھی۔ یہ دونوں اصلاً کافرہ تھیں اور فتح مکہ کے دن اسلام لائیں۔ واللہ اعلم

یعنی اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مسلمانوں کی مدد و نصرت کا وعدہ فرمایا ہے جیسا کہ اس سے قبل کفار کی اذیتوں سے ان کی حفاظت کرنے

کا وعدہ فرمایا۔ اجازت جہاد ان لوگوں کے لئے ہے جنہیں اپنے ان گھروں سے تاحق نکال دیا گیا جو مکہ مکرمہ میں تھے۔ ترکیب کلام میں اللذین اخر جو اہم موصول نکلا جمرو ہے اور یہ اذن للذین یقاتلون میں موجود اہم موصول سے بدل ہے یا وہ محلاً منصوب ہے اور اس سے پہلے انہی یا اندخ افضل مقدر ہے یا پھر محلاً مرفوع ہے اور اس سے پہلے مبتدا مقدر ہے۔ یعنی ہم اللذین اخر جو اہم تمام تراکیبی صورتوں میں مقصود ایک ہی ہے۔

۱۰۔ الا الذین یقولو ربنا اللہ میں ان اپنے صلہ سمیت محل جرمیں ہے اور یہ حق سے مستثنیٰ ہونے کی صورت میں بدل ہے اور اس پر لفظ حق کا اطلاق کفار کے زعم باطل کی بناء پر کیا گیا ہے (چونکہ اہل ایمان نے فقط یہ کیا تھا کہ ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے اور یہ قطعاً جرم نہیں جس کی بناء پر انہیں گھروں سے نکال کر باہر کر دیا جائے لیکن کفار کے زعم باطل کے مطابق اس سے بڑھ کر اور کوئی جرم نہیں، اس لئے انہوں نے حق سمجھ کر انہیں جلا وطن کر دیا۔ تو چونکہ یہ ان کا صریح ظلم تھا) اسی ظلم کو ظاہر کرنے کے لئے یہ انداز اختیار فرمایا تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ جو عمل ان کے فاسد اور باطل گمان کے مطابق جرم ہے کہ انہوں نے توحید کا اقرار کرنے کے سبب انہیں جلا وطن کرنے کو حق قرار دیا یہ ایسا جرم ہے جس کا جرم نہ ہونا بالکل بدیہی اور واضح ہے۔ یہ تو اس قول کی مثل ہے کہ فلاں شخص میں کوئی بھلائی نہیں سوائے اس کے کہ جو اس کے ساتھ نیکی اور احسان کرتا ہے، یعنی یہ اپنے گمان کے مطابق احسان کرنے والے سے برائی کرنا نیکی خیال کرتا ہے۔ تو اس میں کیسے بھلائی اور نیکی ہو سکتی ہے تو یہ گویا دعویٰ مع الدلیل کے قائم مقام ہے۔ اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے وَعَسَى تُهْمُونَ بِنَارِ آلِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّهُمْ لَمُسْلِمُونَ وَبَدَّحْنَاهُمْ لِقَوْمٍ كَفَرٍ۔ تو ہم سے انتقام نہیں لیتا مگر اس بات کا کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ اسی کی مثل شاعر کا قول بھی ہے۔

وَبَلَدَةٌ لَيْسَ بِنَهَا آئِينَسَ إِلَّا الْبَغَايِيزُ وَإِلَّا الْغَيْبِسَ

اور ایسا شہر ہے جس میں ہرنوں اور خاکی رنگ کے اونٹوں کے سوا اور کوئی انہیں وغموں نہیں۔ (تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ ہرن اور اونٹ آدمی کی وحشت میں اضافے کا سبب ہیں انس آدمی نہیں) بعض نے کہا ہے کہ یہ استثناء منقطع ہے اور الا بمعنی لن ہے معنی یہ ہے لیکن انہیں ان کے اس قول کے سبب نکال دیا گیا کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ اور یہ قول حق ہے لہذا انہیں اس قول کے سبب نکالنا ناحق ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ محذوف کلام سے استثناء ہو (یعنی مستثنیٰ مذہب محذوف ہو) تقدیر عبارت اس طرح ہو ما اخر ج الشیء الا بان قالوا ربنا اللہ (یعنی انہیں کس شے کے سبب نہیں نکالا گیا مگر اس کے سبب کہ انہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے) حالانکہ یہ قول حق ہے لہذا اس قول کے سبب انہیں گھروں سے نکالنا ناحق ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ جملہ سابقہ کلام کی علت بیان کرنے کے محل میں ہے۔

۱۱۔ (اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کا بچاؤ نہ کرتا انہیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر) ترکیب کلام میں بعضهم، الناس سے بدل ہے تو دفع اللہ کو نافع نے لولا دفاع اللہ پڑھا ہے۔ یہ مدافعت سے معنی میں ہے اور یہ اظہار مبالغہ کے لئے ہے، جبکہ باقیوں نے بغیر الف کے دفع اللہ قرأت کی ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ مومنین کو کفار پر مسلط کر کے لوگوں کا بچاؤ نہ کرتا تو طاقتور غارگری سے منہدم ہو جائیں، خائف ہیں اگر بنے لکھتے اور مسجدیں جن میں اللہ تعالیٰ کے نام کا ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے۔ نافع اور ابن کثیر نے لہدمت میں دال کو مخفف (یعنی لہومت) پڑھا ہے اور باقیوں نے دال کو شدد پڑھا ہے اور دوسروں نے ادغام نہیں کیا۔ مجاہد اور شحاک نے کہا ہے کہ صواعق سے مراد راہبوں (تارک دنیا لوگوں) کی خائف ہیں اور عبادت گاہیں ہیں اور قواد نے کہا ہے کہ مراد صاحبوں کی عبادت گاہیں

ہیں (۱)۔ بیچ بیچ کی جمع ہے اس سے مراد عیسائیوں کے گرجے ہیں اور صلوات سے مراد یہودیوں کے عبادت خانے یعنی کلیسے ہیں۔ عبرانی زبان میں انہیں صلوات کہا جاتا ہے اور مسجد سے مراد حضور نبی کریم ﷺ کی امت کے مسلمانوں کی عبادت گاہیں ہیں۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کا بچاؤ نہ کرتا تو ہر نبی کے دور میں اس کی امت کی عبادتگاہیں گرا دی جاتیں پس حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں کیسے گرا دیے جاتے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں گرجے اور خانقاہیں گرا دی جاتیں اور حضور نبی کریم ﷺ کے زمانے میں مساجد گرا دی جاتیں۔ ترکیب کلام میں کثیراً محذوف کی صفت سے یعنی ذکر کثیراً۔ اور نیسا کی حاضرین کا مرجع یا تو مساجد ہیں یا پھر چاروں نوع کے عبادت خانے۔ اور اللہ تعالیٰ ضرور مدد فرمائے گا اس کی جو اس کے دین کی مدد کرے گا۔ اس میں جواب قسم محذوف ہے اور جملہ معترضہ وعدہ کو ذکر کرنے کے لئے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرنے کی قوت رکھتا ہے اور سب پر غالب ہے اور اس کے نجبے کو روکنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ وعدہ کی تاکید کے لئے ہے

الَّذِينَ إِن مَّكَّنْتُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَآمَرُوا
بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَإِنَّ يُكْذِّبُوكَ فَقَدْ
كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَقَوْمُ عَادٍ وَنُوحٌ ۗ وَقَوْمُ إِبْرَاهِيمَ وَقَوْمُ لُوطٍ ۗ وَ
أَصْحَابُ مَدْيَنَ ۗ وَكَذَّبَ مُوسَىٰ فَأَمَلَيْتُ لِلْكَافِرِينَ ثُمَّ أَحَدْتَهُمْ ۗ فَكَيْفَ
كَانَ تَكْذِبُهُمْ ۗ فَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ أَهَكَّكُنَّا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى
عُرْسِهَا وَبِئْسَ مَعْظَلَةٌ وَفَصْرٌ مَّشِيدٌ ۝

”وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں اقتدار بخشیں زمین میں تو وہ صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز کو اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور حکم کرتے ہیں (لوگوں کو) نیکی کا اور روکتے ہیں (انہیں) برائی سے۔ اور اللہ تعالیٰ کے لئے ہے سارے کاموں کا انجام۔ اور اگر یہ کفار آپ کو جھٹلاتے ہیں (تو کیا تعجب ہے) پس جھٹلا یا تمہارا سے پہلے قوم نوح نے اور عاود و ثمود نے۔ اور قوم ابراہیم نے اور قوم لوط نے اور مدین کے رہنے والوں نے (اپنے اپنے نبیوں کو) اور جو جھٹلائے گئے موسیٰ بھی سچے تو (کچھ عرصہ) میں نے مہلت دی ان کفار کو (جب وہ باز نہ آئے) تو میں نے انہیں پکڑا۔ (خود ہی بتاؤ) کتنا خوفناک تھا میرا عذاب ہے پس کتنی استیساں ہیں جنہیں ہم نے نہ بولا کر ڈالا کیونکہ وہ ظالم تھے تو اب وہ گمراہی پڑی ہیں اپنی چمٹوں پر بھ اور کتنے تو کھیں ہیں جو بیکار ہو چکے ہیں اور کتنے چوٹے سے بے ہونے مضبوط ٹھل ہیں (جو دوران پڑے ہیں)۔“

۱۔ چونکہ سابقہ آیت میں حفاظت اور مدد و نصرت کا وعدہ بیان ہے اس لئے اس آیت میں ان معنی ادا ہے (یعنی یہ جملہ شرطیہ ہے) لیکن حقیقتہً یہ خبر ہے اور مسلمانوں کے لئے قوت و قدرت عطا کرنے کا وعدہ ہے۔

اس آیت طیبہ میں ان لوگوں کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں جنہیں گھروں سے نکال دیا گیا اور ان میں یہ اوصاف (یعنی نماز قائم کرنا زکوٰۃ ادا کرنا وغیرہ) ان کے آزمائش و امتحان میں جتنا ہونے سے قتل پائے جاتے تھے اور یہ آیت خلفاء راشدین کی خلافت کے صحیح ہونے کی دلیل ہے کیونکہ ان کے علاوہ سب جہازین میں سے کسی کو اقتدار حاصل نہیں ہوا۔ اور چونکہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ان

افراد میں سے نہیں تھے جنہیں گھروں سے نکال کر باہر کر دیا گیا تھا (اس لئے کہ یہ بشارت ان کو شامل نہیں)

بعض نے کہا ہے کہ امام موصول من، بصرہ سے بدل ہے اور معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی ضرورت مدد فرمائے گا جن میں یہ صفات ہوں گی۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خلفاء راشدین کی مدد فرمائی اور اپنا وعدہ پورا فرمایا۔ حتیٰ کہ انہیں سردارانِ عرب اور حکم کی قیصر و کسریٰ کے اوپر غلبہ عطا فرمایا۔ اور مسلمانوں کو ان کے ساتھ گئے وعدہ کے مطابق انکار کی زمینوں گھروں اور مالوں کا وارث بنا دیا۔ اور سارے کاموں کا انجام اللہ تعالیٰ کے لئے ہے کیونکہ تمام امور کا مرجع و مرکز اللہ تعالیٰ کا حکم اور فیصلہ ہی ہے۔ یہ جملہ سابقہ وعدہ کی تاکید کے لئے ہے۔

۱۱۔ وان یکذبوک شرط ہے، اس کی جواز محذوف ہے۔ اور لفظ کذب جواز و محذوف کے لئے تعلیل ہے تقدیر عبارت یہ ہے فان کذبوک فلا تحزنون لانہ لیس بامرہ فبندج فقد کذبت ام محمد ﷺ ایہ انکار کما کر آپ کو جھٹلاتے ہیں تو آپ قطعاً پریشان حال اور غمزدہ نہ ہوں کیونکہ یہ کوئی نیا امر نہیں بلکہ اس سے قبل بھی تو مہنوع عاد و شمود وغیرہ نے اپنے اپنے انبیاء علیہ السلام کو جھٹلایا ہے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ مترجم ہے جو حضور نبی کریم ﷺ کو اطمینان دلانے اور تسلی دینے کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔

۱۲۔ و کذب موسیٰ میں انداز کلام تبدیل کر دیا گیا ہے کیونکہ اس سے قبل اقوام نے جھٹلانے کا ذکر کذب صیغہ معروف سے کیا گیا ہے جبکہ یہاں صیغہ مجہول ذکر کیا گیا ہے تو اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی قوم بنی اسرائیل نے نہیں جھٹلایا تھا بلکہ آپ کی تکذیب قطیوں نے ہی کی تھی۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ چونکہ آپ کے معجزات اتنے عظیم اور متنوع قسم کے تھے کہ ان کے ہوتے ہوئے آپ کی تکذیب کرنا انتہائی شنیع اور قبیح فعل ہے۔

۱۳۔ جس میں نے ان کافروں کو کچھ عرصہ کے لئے مہلت دی اور ان کی سر اور گرفت کو مٹو کر دیا۔ جب وہ باز نہ آئے تو میں نے ان کے معاملات کے انجام میں انہیں پکڑ لیا۔ (اب خود ہی بتاؤ) میرا انکار کرنا ان کے لئے کیسا ثابت ہوا کہ ان کی نعمت مشقت اور مصیبت میں تبدیل ہو گئی۔ حیات بلاکت میں بدل گئی اور آبادی بربادی میں تبدیل ہو گئی۔ (تو یہ عذاب ان کے لئے کتنا خوفناک تھا) یہ استفہام اکتہار تعجب کے لئے ہے یا عذاب کی ہولناکی اور دہشت کو بیان کرنے کے لئے یا پھر اس بات کو مزید پختہ کرنے کے لئے کہ عذاب اپنے وقوع پذیر ہونے کی جگہ پر ہی اترتا ہے۔ ترکیب کلام میں فانما لیس کا عطف کذب پر ہے۔ اور لفظ تکبیر میں ہر مقام پر حالت وصل میں ورنہ نے یا کے اثبات کے ساتھ (یعنی تکبیری) پڑھا ہے اور باقیوں نے یاہ کو حذف کر کے تکبیر پڑھا ہے۔

۱۴۔ ترکیب کلام میں لفظ کابین یا تو مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے یا پھر اس فعل محذوف کے سبب منصوب ہے جس کی تفسیر ما بعد فعل اھلکبھا بیان کر رہا ہے۔ ابو عمرو اور یعقوب نے اس فعل کو صیغہ واحد متکلم کی صورت میں اھلکبھا پڑھا ہے اور باقیوں نے صیغہ جمع متکلم کی صورت میں پڑھا ہے، یعنی پہلے نون مفتوح ہے اور اس کے بعد الف براۓ تعظیم ہے۔ معنی یہ ہے کہ کتنی بستیایں تھیں جن کے رہنے والوں کو ہم نے تو ہلا کر ڈالا۔ یعنی اھلکبھا اصل میں اھلکنا اھلھا ہے، مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے۔ کیونکہ ان کے رہنے والے ظالم تھے (ظلم کا لغوی معنی ہوتا ہے کسی چیز کو بغیر محل کے رکھنا) تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت کو غیر محل میں رکھنے والے تھے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا انکار کرتے تھے اور بتوں پر ایمان رکھتے تھے۔ پس ان بستیوں کی دیواریں اپنی چھتوں پر گر پڑیں، یعنی ان کی عمارتیں تباہ و برباد ہو گئیں کہ پہلے ان کی چھتیں گریں اور پھر ان پر دیواریں گر پڑیں۔ ترکیب کلام میں

علیٰ عمرو وشہا ظرف لغو خواویۃ کے متعلق ہے یا پھر خادیہ کا معنی خالی ہے۔ اس صورت میں علیٰ عمرو وشہا، کائنات کے متعلق ہے۔ یعنی وہ بستیاں اپنی چھتوں کے باقی رہنے اور ان کے سلامت رہنے کے باوجود خالی ہی بنی ہیں (ان میں کوئی رہنے والا نہیں ہے) اس معنی کے مطابق ترکیب کلام میں ظرف مستقرا تو حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے یا پھر ایک خبر کے بعد دوسری خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ یا منصوب ہے کہ ان کی چھتیں گر پڑی ہیں اور دیواریں ابھی تک باقی ہیں جو ان چھتوں کے اوپر جھکی ہوئی ہیں۔ یہ جملہ ترکیب کلام میں اھلکنا پر معطوف ہے۔ وہی ظالمة پر نہیں کیونکہ یہ تو حال ہے اور اہلاک (تباہ و برباد کرنا) ہستیوں کے گرنے سے خالی نہیں ہوتا۔ اور کابین کو منصوب گمان کرنے کی صورت میں اس جملہ کا ترکیب میں کوئی عمل نہیں ہوگا۔

۱۰۔ اور ہستیوں میں کتنے کتنے تھے جو اب بیکار پڑے ہیں، ہم نے ان کنوؤں والوں کو ہلاک و برباد کر دیا۔ اب ان کنوؤں سے کوئی پانی نکالنے والا نہیں۔ ترکیب کلام میں بزرگ کا عطف قریہ پر ہے، یعنی حکم من بنو معطلۃ اور کتنے چونے سے بنے ہوئے مضبوط محل ہیں جن میں سکونت پذیر لوگوں کو ہم نے تباہ و برباد کر دیا۔ یعنی کتنی بستیاں ہیں جن کی عمارتیں ان کی دیوانی کے بعد زمین بوس ہو گئیں اور ان کے مضبوط و عالی شان محلات میں رہنے والوں کو ہم نے ہلاک و برباد کر دیا۔

۱۱۔ قدامہ شحاک اور متعل نے کہا ہے کہ مشید کا معنی ہے انتہائی اونچے اور بلند۔ یہ ماخوذ ہے عربوں کے اس قول سے شاد بناہ اذا رفعه یعنی جب کوئی اپنی عمارت کو انتہائی بلندی اور اونچائی پر لے جائے تو وہ کہتے ہیں شاد بناہ۔ سعید بن جبیر عطاء اور مجاہد نے کہا ہے کہ مشید الشہید سے بنا ہے اور اس کا معنی ہے چونا کھینچ لینا محل جو چونسے تعمیر کیا گیا ہو۔ یعنی انتہائی مضبوط (۱)۔

ترکیب کلام میں جملہ کابین من قریۃ، حکیف کان کجیر سے بدل ہے۔ اسی وجہ سے حرف عطف فا کا ذکر کیا گیا ہے۔ علامہ ابنوی نے کہا ہے کہ بزرگ معطلۃ اور قصر سعید یمن میں تھے۔ یہ محل پہاڑ کی چوٹی پر تھا اور کنوؤں پہاڑ کے دامن میں تھا۔ یہ دونوں ایسے لوگوں کی ملکیت میں تھے جو دنیاوی عیش و عشرت میں گم اور ڈوبے ہوئے تھے جس کی وجہ سے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان تمام کو تباہ و برباد کر دیا اور گول اور کنوؤں دونوں ویران باقی رہ گئے۔

ابوروق نے شحاک سے یہ نقل کیا ہے کہ یہ کنوؤں حضرت موت کے ایک شہر میں تھا جسے حاصور کہا جاتا ہے۔ اور یہ شہر ان چار ہزار افراد پر مشتمل تھا جو حضرت صالح علیہ السلام پر ایمان لائے تھے اور عذاب الہی سے نجات پا گئے تھے۔ اور تمام کے تمام حضرت صالح علیہ السلام کی معیت میں حضرت موت آ گئے تھے۔ جب یہ اس شہر میں پہنچے تو حضرت صالح علیہ السلام کو پیغام اہل آگیا اور ان کا وصال ہو گیا پس اسی سبب سے اس کا نام حضرت موت پڑ گیا۔ کیونکہ حضرت صالح علیہ السلام جو نبی اس شہر میں حاضر ہوئے انہیں موت نے آیا۔ پھر لوگوں نے اس کے ارد گرد ایک فصیل تعمیر کر دی۔ اور اس کنوئوں کے اوپر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اور اپنے اوپر ایک آدمی کو اپنا امیر چن لیا۔ وہ ایک طویل زمانہ تک وہاں رہے، ان کی نسلیں ترقی کرتی رہیں یہاں تک کہ ان کی تعداد کثیر ہو گئی۔ پھر ان کے (ناخلف) اختلاف نے بتوں کی پوجا پائت شروع کر دی اور کفر اختیار کر لیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف حظلہ بن صفوان کو نبی مبعوث فرمایا۔ آپ ان میں بوجھاٹھانے کا کام کرتے تھے (نیبٹا انہوں نے آپ کی بات نہ سنی) اور سر بازار آپ کو قتل کر دیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان تمام کو تباہ و برباد کر دیا، ان کا کنوؤں ویران ہو گیا اور ان کے محل کھنڈرات کی صورت اختیار کر گئے (2)۔

أَقْلَمَ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونُ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ أَدَانٌ يَسْعُونَ
بِهَا فَإِنَّهَا لَا تَعْنِي إِلَّا بَصَارًا وَلَكِنْ تَعْنِي الْقُلُوبَ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ①

”کیا انہوں نے سیر و سیاحت نہیں کی زمین میں تاکہ (ان کھنڈرات کو دیکھ کر) ان کے دل ایسے ہو جاتے ہیں جن سے وہ (حق کو) سمجھ سکتے اور ان ایسے ہو جاتے جن سے یہ نصیحت سن سکتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہوتے ہیں۔“

۱۔ اقلم یسیروا کا عطف محذوف کلام پر ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے الم یخربوا من یوقم فلم یسیروا فی الارض کیا وہ اپنے گھروں سے نہیں نکلے اور انہوں نے زمین کی سیر و سیاحت نہیں کی۔ فتکون ان مقدرہ کی وجہ سے منصوب ہے اور یہ اس مصدر پر عطف ہے جس پر اقلم یسیروا کا قول ضمناً دلالت کر رہا ہے۔ یعنی الم یحصل منهم خروجهم من بیوتهم وسیر فی الارض لان تکون کیا انہیں اپنے گھروں سے نکلنے اور زمین میں سیر و سیاحت کرنے کا موقع نہیں ملا کہ ان کے دل ایسے ہو جاتے ہیں جن سے وہ حق کو سمجھ سکتے۔

فتکون میں یا تو کان تا مدہ ہے اس صورت میں ہم تکون کے فاعل سے حال ہے یا پھر یہ تیسرے معنی میں ہے، اس صورت میں لہم اس کی خبر ہے اور قلوب اس کا اسم مؤخر ہے۔ یعقلون بہا، قلوب کی صفت ہے اور اس کا مفعول محذوف ہے۔ معنی یہ ہے کہ ان کے ایسے دل ہوتے ہیں جن کے سبب وہ ان امور کو سمجھ سکتے جن کا سمجھنا واجب اور ضروری ہے۔ مثلاً توحید باری تعالیٰ وغیرہ۔ یعنی انہیں ایسی بصیرت اور استدلال مل جاتا جس سے ضروری امور کا اور آجاسانی کر سکتے۔

او اذنان کا عطف قلوب پر ہے۔ یہ استفہام انکاری ہے اور انکار سیر و سیاحت کے بعد ان کے دلوں کے قائل ہونے اور ان کے کانوں کے حق کو سننے والا ہونے کی طرف راجع ہے۔ اور اس میں حق کو سمجھنے اور حق کو سننے پر اکتیخت دلائی جا رہی ہے (یعنی سیر و سیاحت کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا کہ انہیں ایسے دل نصیب ہوتے جن میں حق کو سمجھنے کی بصیرت ہوتی اور ایسے کان مل جاتے جو حق کی آواز سن سکتے)۔ فافحما میں ہا ضمیر قصہ ہے یا ضمیر شہم ہے اور اس کی تفسیر مابعد آنے والا قول الابصار کر رہا ہے اور لامعنی میں فاعل ضمیر ہے اور اس کا مربع مابعد آنے والا لفظ الابصار ہے۔ جو کہ رقبۃ ضمیر سے مقدم ہے یا پھر اس کا فاعل اسم ظاہر الابصار ہے اور یہی ضمیر کے قائم مقام ہے۔ اور فاقول برائے نقلیل ہے، یعنی یہ سیر کے انجام میں دلوں کے قائل ہونے اور کانوں کے سامع ہونے کی علت بیان کر رہی ہے۔ مقبوم یہ ہے کہ ان کی آنکھیں تو اندھی نہیں کہ وہ سیر کے بعد تباہ و برباد ہونے والی اور کھنڈرات میں تبدیل ہونے والی اتوں کے آثار کا مشاہدہ نہ کر سکیں بلکہ ان کی حالت یہ ہے کہ وہ آیات و علامات ظاہر ہونے اور انکے آثار کا مشاہدہ کرنے کے باوجود عبرت حاصل نہیں کرتے۔ مگر اس کا سبب یہ نہیں کہ ان کی آنکھیں اندھی ہیں جو دیکھ نہیں سکتیں اور کان بہرے ہیں جو حق کی آواز نہیں سن سکتے (ایسا ہرگز نہیں) پھر اس جملہ کو ان کے ساتھ متواکد کیا گیا ہے اور ساتھ ضمیر قصہ ہے یا ضمیر بہم ذکر کی گئی ہے جس کی تفسیر مابعد بیان کر رہا ہے تو گویا اس میں عی (نا بنے پنے) کی لفظی کر کے سننے والے کو انکار کرنے والے کے قائم مقام کر دیا گیا ہے۔ پھر حرف استدراک لکن ذکر فرمایا اور اس کے ذریعے ان سے مطلقاً عی کی لفظی کو دور کر دیا اور ان کے بارے تمام تشبیہات کا ازالہ کر دیا کہ اس بارے میں عقلاء کی عقلیں حیران ہیں کہ وہ توحید کی علامات دیکھتے تو ہیں مگر توحید کا اعتقاد نہیں رکھتے، حق کے دلائل سننے تو ہیں مگر ان میں غور و فکر نہیں کرتے تو اس کا سبب یہ

ہے کہ ان کے سینوں میں موجود دل اندھے ہیں۔ آیت طیبہ میں صدور کا ذکر تاکید کے لئے ہے اور عجاز کے احتمال کی نفی کے لئے ہے۔ جیسا کہ اس قول باری تعالیٰ میں ہے **لَوْ هُوَ لِيُظْهِرَهُ لِبَنَاتِهِ مَا لَكُمْ مِنْهُ لَنْ نَكْفُرَ بِهِ لَأْتِيَ النَّاسُ بِهِ لَكُم مِّنْهُ آيَاتٌ لَّئِنْ لَمْ تَكْفُرْ لَآتِيَنَّكُم بِآيَاتٍ مَّا كَانَتْ لَكُم بِهَا عِلْمٌ مِّنْ قَبْلُ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ** (یعنی تو ت بصارت کا زائل ہو جانا) بلکہ (حقیقی نابینائی دلوں کا اندھا ہو جانا جو سینوں میں موجود ہے کہ انسان میں بصارت ہونے کے باوجود بصیرت باقی نہیں ہوتی)

قائد نے کہا ہے کہ آنکھ کی بصارت ظاہر چیز تک پہنچانے والی اور اس سے متباعد ہونے کا فائدہ دیتی ہے اور دل کی بصیرت حقیقت نفع دینے والی ہوتی ہے (۱) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا سب سے بڑا اندھا پن دل کا اندھا ہو جانا ہے (۲)۔ اسے نبیؐ نے دلائل میں، ابن عساکر نے عقیدہ بن عامر جنہی سے اور ابو النصر سجری نے الابانہ میں ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور امام شافعی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوفاً روایت کیا ہے۔

آیت طیبہ میں دلوں کی نابینائی کا ذکر کیا گیا ہے اور اس سے مراد دلوں کے تمام آلات علم و شعور کا سلب ہو جانا ہے۔ گویا کہ اس طرح فرمایا کہ ان کے وہ دل جو سینوں میں ہیں ان کی آنکھیں اندھی ہیں اور ان کے کان بہرے ہیں۔ علامہ بیضاوی نے فرمایا جب آیت کریمہ **وَعَنْ كَانٍ فِي هَذِهِ آيَاتٍ لِّأَنَّهَا فِي الْأَجْنَافِ نَازِلٌ** ہوئی تو حضرت ابن ام بکتوم رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں دنیا میں دنیا میں نابینا ہوں کیا میں، آخرت میں بھی نابینا ہی ہوں گا تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (۳)۔

میں کہتا ہوں کہ ابن ابی حاتم نے قائد سے بھی اسی طرح کا قول نقل کیا ہے۔ کہہ نہیں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ آیت عبد اللہ بن زائدہ یعنی ابن مکتوم کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

**وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ وَإِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ
كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ ﴿۱۰﴾ وَكَأَيِّنْ مِنْ قَدِيمٍ آتَمَّكَ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ لَّهُمْ
أَحَدُهَا وَرَأَى الْأَمَّيَّةُ ﴿۱۱﴾**

”یہ لوگ جلدی مانگ رہے ہیں آپ سے وہ عذاب ل (یہ تسلی رکھیں) اللہ تعالیٰ خلاف وعدہ نہیں کرے گا اپنے وعدہ کی جہ اور بیشک ایک دن تیرے رب کے ہاں ایک ہزار سال کی طرح ہوتا ہے جس حساب سے تم گنتی کرتے ہو سب اور کتنی بستیاں تمہیں جنہیں میں نے (کافی عرصہ) ڈھیل دی حالانکہ وہ ظالم تھیں پھر (بھی جب وہ باز نہ آئے) تو میں نے انہیں پکڑ لیا اور میری طرف ہی (سب کو) لوٹنا ہے۔“

۱۔ یہ لوگ جلدی مانگ رہے ہیں آپ سے وہ عذاب جس کی انہیں وعید سنائی جا رہی ہے۔ یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ ان (کفار) کے دل اندھے ہو چکے ہیں کیونکہ عذاب کے جلدی آنے کا مطالبہ ہی ان کے اندھے پن کی دلیل ہے۔ علامہ بغوی نے کہا ہے کہ یہ آیت نصر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ اس نے یہ دعا مانگی تھی: **إِنَّ كَانْ هَذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِندِكَ فَأَهْطَلْ عَلَيْنَا جَحِيمًا تَأْتِي مِنَ السَّمَاءِ أَوْ أَلْتِنَا بِعَذَابٍ آتِيئًا** اگر تیرے میری طرف سے حق ہے تو میری آسمان سے پھروں کی بارش نازل فرمایا نام پر کوئی دردناک عذاب بھیج دے (۴)

2۔ موصوفہ اطراف اللہ ص 286 صفحہ 286 (القر)

4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 123 (القر)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 123 (القر)

3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 527 (العلیہ)

یہ تسلی رکھیں، اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرے گا کیونکہ یہ متنع ہے کہ جو نذرہ دے پھر اس کے خلاف واقع ہو۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے انہیں جس عذاب کی وعید سنائی ہے وہ بالیقین ان تک پہنچے گا اگرچہ کچھ وقت کے بعد ہی پہنچے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو مہربان ہے (بہت زیادہ مہربان کرنے والا ہے) وہ سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ غزوہ بدر کے دن پورا فرمادیا۔

ترکیب کلام میں جملہ ولن یخلف اللہ وعدہ یا حال ہے یا یہ جملہ معترضہ ہے۔ اسی طرح جملہ وان یوما عند ربک حال ہے یا جملہ معترضہ ہے۔ گویا کہ یہ کہا ہے لم تستعجلونہ وهو لا یجوز فواتہ (تم اس کے جلدی آنے کا مطالبہ کیوں کر رہے ہو حالانکہ اس کا ثل جانا جائز نہیں) یعنی وہ بالیقین آ کر رہے گا) تو یہ آیت اس پر دلالت کر رہی ہے کہ جس طرح (ثواب کے) وعدہ میں وعدہ خلافی حال ہے اسی طرح (عذاب کی) وعید میں بھی اس کا خلاف ناممکن ہے۔ لیکن اس سے اللہ تعالیٰ کی صفت مغفرت کی لٹی نہیں ہوتی۔ کیونکہ قرآن وحدیث کے نصوص اور اجماع سے یہ ثابت ہے کہ وعید کی آیات صرف ان کے لئے مخصوص ہیں جو کسی طور پر مغفرت کے اہل نہیں ہوں گے (یعنی ان کا خاتمہ کفر و شرک پر ہی ہوا)

۱۔ تعدون کو این کثیر متروہ اور کسائی نے یعدون پڑھا ہے کیونکہ یہاں آیت کے آغاز میں ويستعجلونک مذکور ہے اور باقیوں نے تعدون تاکہ ساتھ پڑھا ہے۔ یہ عام ہے کیونکہ یہ خطاب جلدی عذاب طلب کرنے والوں اور موثنین تمام کو شامل ہے۔

حضرت عطاء سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے آیت کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ مہلت دینے میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک دن اور ہزار سال برابر ہیں۔ کیونکہ وہ جب چاہے انہیں پکڑنے کی قدرت رکھتا ہے۔ تاخیر اور مہلت کے سبب کوئی چیز اس کے قبضہ اختیار سے باہر نہیں ہوگی۔ لہذا اس کی قدرت میں وہ عذاب جس کے جلدی آنے کا وہ مطالبہ کر رہے ہیں اس کا واقع ہونا اور اس کا مؤخر ہونا دونوں برابر ہیں۔ بعض نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ وہ عذاب جس کے جلدی آنے کا وہ مطالبہ کر رہے ہیں اس کا ایک دن اپنی تکلیف طوالت اور شدت میں ان ہزار سالوں کے برابر ہے جنہیں تم شمار کرتے ہو۔ تو وہ کیسے ایسے عذاب کے جلدی آنے کی خواہش کرتے ہیں یہ ایسے ہی جیسے کہا جاتا ہے کہ غم و اندوہ کے دن طویل ہوتے ہیں اور خوشی و مسرت کے دن چھوٹے ہوتے ہیں (۱)۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے صبر و حلم کی انتہا کا بیان ہے، یعنی بیگ اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرے گا لیکن اس نے عذاب کو اس دن تک مؤخر کر رکھا ہے جو ایک دن رب کریم کے نزدیک تمہارے ہزار سال کے برابر ہے۔ مجاہد اور عکرمہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد ایام آخرت میں سے ایک دن ہے۔ اور اس پر دلیل وہ روایت ہے جو حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے فقراء مہاجرین کے گروہ جنہیں بشارت ہو کہ تم قیامت کے دن کامل نور کے ساتھ جنت میں داخل ہو گے اور تمہارا داخلہ مالدار لوگوں کی نسبت نصف دن پہلے ہو گا۔ اور تمہارے رب کے نزدیک وہ ایک دن ہزار سال کے برابر ہے (۲)۔ اسے امام احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے حسن قرار دیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ فقراء انصاریہ کی نسبت پانچ سو سال اور نصف دن پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے (۳)۔

۲۔ اور کتنی بستیاں جنہیں میں نے کافی عرصہ ڈھیل دی۔ تو اس میں من قریۃ اصل میں من اہل قریۃ ہے (یعنی بستوں والے)

اور پھر مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اعراب میں اس کے قائم مقام کر دیا گیا ہے۔ نماز اور احکام کو لانا تا تقسیم میں اظہار مبالغہ کی خاطر ہے۔ ترکیب کلام میں اس جملہ کا عطف حرف واؤ کے ساتھ و مستعملوں تک اور لن یخلف پر کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ آیت بھی اسی استدلال کے عمل میں ہے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی ہرگز نہیں کرتا اور اس میں اس کا بیان ہے کہ جس عذاب سے وعید کی گئی وہ بالیقین واقع ہو کر ہے گا۔ رہا مسئلہ عذاب کی موخر کرنے کا۔ تو یہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی عادت مبارکہ کے عین مطابق ہے کیونکہ کثیر ایسی باتیں جنہیں جنہیں میں نے اسی طرح مہلت دی جیسے میں نے جنہیں مہلت دے رکھی ہے حالانکہ وہ تمہاری مثل ہی ظالم تھیں۔ ترکیب کلام میں وہی ظالمۃ قریبہ سے حال ہے۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا آتَاكُمُ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿١﴾ فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَرِيمٌ ﴿٢﴾ وَالَّذِينَ سَعَوْا فِي آيَاتِنَا مُعْجِزِينَ أُولَئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿٣﴾

” (اے حبیب!) آپ فرمائیے اے لوگو! میں تو تمہیں (عذاب الہی سے) کھلا ڈرانے والا ہوں۔ سو جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کے لئے تمہیں بھی ہے اور با عزت روزی بھی ملے اور جو لوگ کوشش کرتے رہے ہماری آیتوں (کی تردید) میں اس خیال سے کہ وہ ہمیں ہر ادیس گئے سبکی لوگ دوزخی ہیں۔“

اے محمد ﷺ آپ کا کفار کو فرما دیجئے میں تو تمہیں عذاب الہی سے کھلا ڈرانے والا ہوں، یعنی میں عذاب لانے پر قادر نہیں بلکہ تمہیں واضح انداز میں عذاب کے خطرات سے آگاہ کر رہا ہوں۔ چونکہ آیت میں خطاب ان شرکین کو ہے جو عذاب جلدی آنے کی تمار کستے ہیں اور مومنین اور ان کے اجر و ثواب کا ذکر فقط ان کے فیض و غضب میں اضافہ کرنے کے لئے ہے اس لئے صرف انداز کے ذکر پر اکتفا کیا (حالانکہ حضور نبی کریم ﷺ نذیر ہونے کے ساتھ ساتھ شیر بھی ہیں)

اور یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ انداز (ڈرانا) ابشار (خوش کرنا) پر مقدم ہوتا ہے اور یہ دونوں فریقوں کو شامل ہے، جبکہ ابشار تو صرف اطاعت شعاروں اور فرمانبرداروں کے ساتھ مختص ہے اسلئے یہاں صرف انداز پر اکتفاء کیا گیا۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری مثال اور اس (دین) مثال جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث فرمایا ہے اس آدمی کی طرح ہے جو کسی قوم کے پاس آیا اور کہا کہ اے قوم! میں نے اپنی آنکھوں کے ساتھ ایک لشکر دیکھا ہے (جو تم پر حملہ آور ہونے کی تیاری کر رہا ہے) لہذا میں تمہیں واضح طور پر اس سے ڈرا رہا ہوں، تم جلدی محفوظ مقام پر چلے جاؤ، یہاں سے محفوظ ہو جاؤ پس اس کی قوم کے ایک گروہ نے اس کی بات تسلیم کر لی اور وہ رات کے وقت ہی چل پڑے اور مہلت کے لمحات سے فائدہ اٹھا کر وہ نکل گئے تو وہ محفوظ ہو گئے اور راہ نجات پا گئے۔ اور ان میں سے ایک گروہ نے اس کی تکذیب کی اور انہوں نے اپنی صبح اسی جگہ پر کی۔ تو صبح لشکر ان پر حملہ آور ہوا اور انہیں ہلاک اور تباہ و برباد کر دیا۔ پس یہی مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے میری اطاعت کی اور میرے لائے ہوئے دین کی اتباع و پیروی اختیار کی اور ان کی جنہوں نے میری نافرمانی کی اور جو دین حق نیکر آیا اس کی تکذیب کی (۱)۔

۱۔ سو وہ لوگ جو میرے لائے ہوئے دین کے ساتھ ایمان لائے اور انہوں نے اس طرح نیک کام کئے جیسے میں نے انہیں حکم دیا تو

ان کے لئے گزشتہ گناہوں سے مغفرت بھی ہے اور باعزت روزی یعنی جنت بھی ہے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بیشک اسلام ان گناہوں کو ختم کر دیتا ہے جو اسلام سے قبل سرزد ہوئے ہوں (1)۔

سے اور جو لوگ ہماری آیات کو رد اور باطل کرنے کی کوشش کرتے رہے اس خیال سے کہ وہ ہمیں عاجز کر دیں، وہی لوگ دوزخی ہیں۔ ترکیب کلام میں معجزین، سحوا کے قائل سے حال ہے۔

ابن کثیر اور ابو عمرو نے اسے معجزین تشدید کے ساتھ باب تفصیل سے پڑھا ہے۔ اس مقام پر اور سورہ سہا میں معنی یہ ہے کہ وہ لوگوں کو ایمان سے باز رکھنا چاہتے ہیں کہ وہ ان کی نسبت بجز کی طرف کرتے ہیں۔ اور باقیوں نے اسے باب معاملہ سے الف کے ساتھ پڑھا ہے یعنی وہ سرکشی اختیار کرتے ہوئے مشقت اٹھانے والے ہیں۔

قائد نے معجزین کا معنی گمان کرنے والے اور اندازہ لگانے والے کیا ہے، یعنی وہ اپنے خیال کے مطابق ہمیں ہرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہ نہ کوئی حشر و نشر ہوگا اور نہ کوئی جنت و دوزخ کا کوئی تصور۔ یا پھر یہ معنی ہے کہ وہ ہمارے قبضے سے نکل جائیں گے اور ہم ان پر قادر نہیں ہو سکیں گے (2)۔

بعض نے معجزین کا معنی مغالین کیا ہے، یعنی وہ مقابلے میں ہم پر غالب آنے کا ارادہ رکھتے ہیں کہ ہم انہیں پانے اور ان کے ادراک سے عاجز ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ اس کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ رسول کریم ﷺ کو عاجز بنا دینے کا ارادہ رکھتے ہیں کیونکہ آپ ﷺ نہیں جہنم میں داخل ہونے سے روکتے ہیں اور وہ اس میں زور سے گھے جا رہے ہیں۔ میری مثال اس آدمی کی طرح ہے جس نے آگ روشن کی پس جب وہ آگ اپنے گرد نواح کو خوب روشن کرنے لگے تو پروانے اور وہ کبڑے جو آگ میں گرتے رہتے ہیں وہ اس میں گرنے لگ جاتے ہیں اور وہ آدمی انہیں روکنے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ اس پر غالب آ جاتے ہیں اور اس (آگ) میں واقع ہوتے رہتے ہیں پس میں بھی تمہاری کمروں کو پکڑ کر تمہیں آگ سے دور کر رہا ہوں اور تم اس میں واقع ہو رہے ہو (3) یہ الفاظ بخاری کے ہیں اور مسلم کے الفاظ بھی اسی طرح ہیں۔

علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور محمد بن کعب القرظی وغیرہ مفسرین نے کہا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ آپ کی قوم آپ سے منہ پھیر رہی ہے تو جب آپ ﷺ نے انہیں اس دین سے بہت دور ہوتے دیکھا جو آپ نکیر آئے تو آپ ﷺ پر یہ انتہائی شاق گزرا اور آپ ﷺ کے دل میں یہ تمنا اور آرزو پیدا ہوئی کہ کاش اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی ایسا طریقہ اور اصول مل جائے جس کے سبب آپ کی قوم اور آپ کے مائین قرابت پیدا ہو جائے (اور یہ آرزو اور خواہش اس لئے تھی) کہ آپ ﷺ ان کے ایمان لانے کے انتہائی ترسیتے تھے۔ پس آپ ﷺ ایک دن قریش کی مجلس میں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر سورہ النجم نازل فرمائی اور آپ ﷺ نے لوگوں کے سامنے اس کی تلاوت کی۔ جب آپ ﷺ پڑھتے پڑھتے اس مقام پر پہنچے **أَفَرَأَيْتُمُ اللَّيْلَ وَالنَّجْمَ فِي سَوَاءٍ وَأَمَّا الْغَالِيَّةُ الْأَخْرَسِيُّ** تو اس وقت وہ خواہش اور آرزو جو آپ ﷺ کے دل میں پیدا ہوتی رہتی تھی شیطان نے آپ ﷺ کی زبان پر لاد دی (اور بلا قصد آپ کی زبان اقدس سے یہ کلمات نکل گئے) تلک الغرایق العلی وان

شفاعہمہن لئو تصحی (یعنی یہ بت وہاں بلند پرواز ہیں اور ان کی شفاعت کی امید کی جاسکتی ہے) تو جو نبی قریش نے یہ کلمات سنے تو وہ انتہائی مسرور ہوئے اور رسول اللہ ﷺ تو قرأت کرتے رہے حتیٰ کہ مکمل سورت کی قرأت فرمادی اور سورت کے آخر میں سجدہ فرمایا اور مسلمانوں نے بھی آپ ﷺ کے ساتھ سجدہ کیا۔ بلکہ وہاں کعبہ معظمہ میں جتنے مشرکین بھی تھے وہ بھی سجدے میں گر گئے۔ ولید بن مغیرہ اور سعید بن عاص کے سوا کوئی مومن یا کافر ایسا باقی نہیں رہا جس نے سجدہ نہ کیا ہو۔ اور ان دونوں نے ایک ایک مٹھی ننگریاں اٹھائیں اور اپنی پیشانی سے لگائیں کہ اتنا سجدہ ہی ہمارے لئے کافی ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ دونوں انتہائی بوزھے تھے اور سجدہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ آج جب قریش کی مجلس برخواست ہوئی تو انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ سے اپنے جوں کا ذکر سنا تھا، اس پر انتہائی خوش اور مسرور تھے اور یہ کہہ رہے تھے کہ محمد (ﷺ) نے ہمارے معبودوں کا ذکر کیا، بہت اچھی طرح کیا ہے۔ اور ساتھ یہ کہنے لگے کہ ہم نے یہ جان لیا ہے کہ موت و حیات اللہ تعالیٰ کے قبضہ اختیار میں ہے۔ وہی ہر شے کو تخلیق کرتا ہے اور وہی رزق دیتا ہے لیکن ہمارے یہ معبود تو فقط اس کے پاس ہماری شفاعت و سفارش کریں گے۔ لہذا جب محمد (ﷺ) نے انہیں ان کا حصہ دے دیا ہے تو اب ہم بھی محمد (ﷺ) کے ساتھ ہیں۔

پھر جب شام ہوئی تو رسول اللہ ﷺ کے پاس حضرت جبرائیل امین حاضر ہوئے اور آ کر عرض کی کہ اے محمد (ﷺ)! آپ نے کیا کیا کہ آپ نے لوگوں پر وہ کلام تلاوت کر دیا جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ پر نازل نہیں ہوا تھا تو یہ سن کر رسول اللہ ﷺ انتہائی غمزدہ ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ پر شدید خوف محسوس کرنے لگے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ پر درج ذیل آیت نازل فرمائی۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكُمُ اللَّهُ الْبَيِّنَاتِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿١٠﴾

”اور نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول اور نہ کوئی نبی۔ مگر اس کے ساتھ یہ ہوا کہ جب اس نے کچھ پڑھا تو ڈال دیئے شیطان نے اس کے پڑھنے میں (خلوک)۔ پس منادیتا ہے اللہ تعالیٰ جو دخل انداز شیطان کرتا ہے پھر

پختہ کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی آیتوں کو۔ اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا بہت دانا ہے۔“

۱۰۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو تسلی عطا فرماتا ہے اور آپ ﷺ کے لئے انتہائی رحیم و کریم تھا۔ ان دنوں رسول اللہ ﷺ کے جو اصحاب حبشہ میں تھے جب ان تک یہ خبر پہنچی تو قریش نے بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ مل کر سجدہ کیا ہے اور جب انہیں یہ بتایا گیا کہ قریش اسلام لاکچے ہیں اور اہل مکہ نے اسلام قبول کر لیا ہے تو ان صحابہ کرام میں سے اکثر اپنے اپنے قبائل کی طرف لوٹ پڑے اور کہنے لگے کہ اہل مکہ ہمارے نزدیک بہت پسندیدہ اور اچھے لوگ ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ مکہ مکرمہ کے قریب پہنچے تو انہیں یہ خبر موصول ہوئی کہ اہل مکہ کے اسلام لانے کی جو خبر انہوں نے سنی تھی وہ بیکسر غلط اور باطل تھی۔ نتیجتاً ان میں سے ہر کوئی کسی کی پناہ لیکر یا چھپ چھپا کر مکہ میں داخل ہوا (۱)۔

من رسول میں من زائدہ تعمیم کے لئے ہے۔ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ رسول وہ ہوتا ہے جس کے پاس جبرائیل امین علیہ السلام ظاہر ہوتے ہیں۔ اور نبی وہ ہوتا ہے جس کی نبوت الہامی یا منامی ہوتی ہے (۲) (یعنی نبوت کے بارے میں یا تو اسے الہام کیا جاتا ہے یا پھر

عالم خواب میں اس کی اپنی نبوت کی اطلاع دی جاتی ہے، یعنی اس کے خواب روز روشن کی طرح عیاں اور سچے ہوتے ہیں) بعض نے کہا ہے کہ رسول وہ ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نئی شریعت عطا فرما کر مبعوث فرماتا ہے اور وہ لوگوں کو اس کی طرف دعوت دیتا ہے اور نبی اس کے مقابلے میں عام ہوتا ہے نبی وہ ہوتا ہے۔ جسے سابقہ شریعت کی تائید کے لئے اللہ تعالیٰ مبعوث فرماتا ہے۔ جیسا کہ حضرت منویٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مابین بنی اسرائیل کے انبیاء علیہ السلام تھے۔ پس ہر رسول نبی ہوتا ہے لیکن نبی کا رسول ہونا ضروری نہیں۔

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! انبیاء میں سے سب سے پہلا نبی کون ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا آدم علیہ السلام۔ پھر میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ نبی تھے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جی ہاں آپ ایسے نبی تھے جن سے کام لیا گیا تھا۔ پھر میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! رسول کہتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا تین سو دس سے کچھ زائد کا جم غفیر (۱)۔

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! انبیاء علیہم السلام کی مجموعی تعداد کتنی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ایک لاکھ چوبیس ہزار۔ اور ان میں سے تین سو پندرہ کی کثیر تعداد میں رسول ہیں (۲)۔ اسے امام احمد اور ابن راہویہ نے اپنی مسانید میں ائین حبان نے اپنی صحیح میں اور حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے اور حاکم نے حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اذا تمنیٰ کا معنی ہے جب اس نے کسی شے کو پسند کیا اور اس کی خواہش کی اور اس نے دل ہی دل میں ایسی بات کی جس کا اسے حکم نہیں دیا گیا تھا۔ ترکیب کام میں یہ من رسول ولا نبی سے حال ہونے کی بنا پر مستثنیٰ مفرغ ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے مَا زَسَلْنَا مِنْ رُسُلٍ وَلَا نَبِيٍّ فِيْ حِيَالٍ بَيْنَ الْاَحْوَالِ اِلَّا مَقْدَرًا فَبِيْ شَايِبِهِ اِنَّهُ اِذَا تَمَنَّى۔

القیٰ الشیطن کا معنی ہے شیطان نے اس میں وسوسہ اندازی کی شیطان نے وسوسہ اندازی کے لئے اس تک راستہ پالیا اور اپنی جانب سے مراد نبی میں کچھ ڈال دیا۔ مفہوم یہ ہے کہ کوئی نبی نہیں مگر جب بھی اس نے اپنی قوم کے ایمان لانے کی تمنا اور آرزو کی تو شیطان نے اس میں ایسی بات ڈال دی جو اس کی قوم کے لئے باعث رضا اور خوشی ہو۔

علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ جب پیغمبر اپنی خواہشات کو دل میں مزین اور راستہ کر لیتا ہے تو اس کی پسندیدہ خواہش میں شیطان ایسی بات ڈال دیتا ہے جو دنیا میں اس کے مشغول ہونے کا موجب ہوتی ہے (۳)۔

پس اللہ تعالیٰ مناد دیتا ہے جو دخل اندازی شیطان کرتا ہے۔ یعنی اس کے وسوسہ کو باطل قرار دیتا ہے اور اپنے نبی کو اس کی طرف جھکنے اور مائل ہونے سے بچاتے ہوئے اسے ڈال کر دیتا ہے اور اپنے نبی کی راہنمائی ایسے طریقے کی جانب فرمادیتا ہے جو شیطانی وسوسہ کو مناد دیتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ اپنی ان آیتوں کو چختہ کر دیتا ہے جو امور آخرت میں مستغرق رہنے کی دعوت دیتی ہیں۔ اکثر مفسرین نے الا اذا تمنیٰ کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ جب اس نے کتاب اللہ کو پڑھا تو شیطان نے اس کے پڑھنے میں شلوک ڈال دیئے۔ شاعر نے حضرت

نشان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ایک شعر کہا ہے اور اس میں تمہنی کا لفظ قرآن کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

نَضَى كِتَابَ اللَّهِ أَوَّلَ لَيْلَةٍ وَأَخْرَجَهَا لَا قَهِي حَمَامِ الْمَفَادِرِ

آپ رضی اللہ عنہ نے ابتداء رات میں کتاب اللہ کی تلاوت فرمائی اور آخر رات میں مقدمہ موت سے ملاقات کی۔ پس اگر یہ کہا جائے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی طرف تلاوت میں غلطی کی نسبت کرنا کیسے جائز ہے؟ حالانکہ آپ ﷺ تو اصل دین میں غلطی کرنے سے معصوم ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے لَا يَأْتِيهِ الْبَاتِلُ مِنْ يَمِينٍ وَلَا مِنْ شِمَالٍ وَلَا مِنْ فَوْقٍ وَلَا مِنْ دُونِ ذَلِكَ يَسْمَعُ الْغَيْبَ (کہ باطل یعنی شیطان آپ کی طرف نہیں آسکتا نہ سامنے اور نہ ہی پیچھے سے (1) اور اسی وجہ سے علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ اس آیت کے شان نزول میں جو واقعہ سورۃ انعم کی قرأت کے دوران شیطان کے کچھ ڈالنے کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ محققین علماء کی نظر میں مردود ہے (2)۔ لیکن شیخ جلال الدین سیوطی نے یہ واقعہ بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ اسے بزاز ابن مردود نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ یعنی انہوں نے یہ واقعہ حضرت سعید بن جبیر کی وساطت سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بزاز نے کہا ہے کہ یہ واقعہ صرف اسی استاد سے متصل مروی ہے اور اس کی سند کو متصل بنانے والا منظر راوی امیہ بن خالد ہے اور یہ ثقہ اور مشہور راوی ہے۔

ابن ابی حاتم ابن جریر اور ابن المنذر نے صحیح سند کے ساتھ حضرت سعید بن جبیر سے اسے مرسل نقل کیا ہے۔ کہ آپ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے ذکر کرمہ میں سورۃ انعم پڑھی، جب آپ ﷺ اس آیت پر پہنچے اَنَّا كَوْنُكُمْ لَنَا وَالْعَزِيْزِ وَمَا كُنَّا بِغَائِبَةٍ اَلَا اَخْرَجَ تُوْشِيْطَانَ نَعْنِيْكَ ﷺ کی زبان پر یہ کلمات جاری کر دیئے۔ تلک الغرائق العلی ان شفاععهن لتوجهی تو یہ کن کر مشرکین نے کہا کہ آپ ﷺ نے آج سے قبل ہمارے معبودوں کا اتنا اچھا ذکر نہیں کیا۔ چنانچہ جب آپ ﷺ نے سجدہ کیا تو انہوں نے بھی آپ کے ساتھ سجدہ کیا تو اس وقت آیت مبارک وما ارسلنا من قبلك الا نازل فرمائی (3)۔ لیکن اس واقعہ کو متصل سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے مگر اس سند میں ایک راوی واقدی ہے (اور وہ غیر معتبر ہے) ان مردود نے کبھی کی سند سے ابوصالح کے واسطے سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ابن جریر نے عوفی کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔

ابن اسحاق نے السیرۃ میں محمد بن کعب اور موسیٰ بن عقبہ سے المغازی میں ابن شہاب سے ابن جریر نے محمد بن کعب اور محمد بن قیس سے اور ابن ابی حاتم نے سدی سے نقل کیا ہے تمام کی روایات کا مفہوم ایک ہے مگر تمام کی تمام روایات یا ضعیف ہیں یا منقطع ہیں۔ ہاں سب سے پہلی وہ روایت جو سعید بن جبیر کی سند سے بزاز ابن مردود نے اور طبرانی نے ذکر کی ہے وہ متصل اور قوی ہے۔

علامہ حافظ ابن حجر مرتضیٰ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اس روایت کی کثیر استاد اس پر دلالت کرتی ہیں کہ اس واقعہ کی اصل موجود ہے۔ جبکہ اس کے لئے دو صحیح مرسل استاد بھی موجود ہیں اور ان کے روایات صحیحین کی شرائط کے مطابق ہیں۔ ان میں سے ایک کو طبرانی نے اس سند کے ساتھ روایت کیا ہے من طریق یونس بن یزید عن ابن شہاب الزہری حدیث ابو بکر بن عبد الرحمن بن الحارث بن ہشام۔ اور دوسری کو بھی آپ نے ہی عقیم بن سلیمان اور حماد بن سلمہ کی سند سے داؤد بن ابی ہند بن ابی العالیہ سے روایت کیا ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ علماء نے اس اشکال کا جواب مختلف انداز میں دیا ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ الفاظ نہیں پڑھے اور نہ ہی صحابہ کرام نے آپ ﷺ سے وہ الفاظ سنے۔ بلکہ شیطان نے آپ ﷺ کی قرأت کے دوران (آپ کی آواز بنا

کر) مشرکین کے کانوں میں وہ الفاظ ڈال دیئے۔ اور مشرکین نے یہ گمان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے وہ الفاظ پڑھے ہیں۔

قداہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ پر فیند کا غلبہ تھا پس اسی دوران سہواً اور نسیاناً شیطان کے القاء کرنے کے سبب وہ الفاظ آپ ﷺ کی زبان اقدس سے نکل گئے۔ لیکن پھر فوراً ہی اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس پر متنبہ فرما دیا (۱)۔ کہا جاتا ہے کہ ایک شیطان تھا جسے ایضاً کہا جاتا تھا اس نے عمل کیا تھا اور یہ بہت بڑی آزمائش اور فتنہ تھا اور اللہ تعالیٰ جیسے چاہتا ہے اپنے بندوں کے امتحان لیتا رہتا ہے (۱)۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ مذکورہ دونوں صورتوں میں یعنی چاہے تو شیطان نے وہ الفاظ کہے اور لوگوں نے یہ گمان کیا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اس طرح قرأت کی ہے یا آپ ﷺ پر فیند کا غلبہ ہوا اور اس دوران آپ ﷺ کی زبان سے وہ الفاظ سہواً نکل گئے۔ ہر دو صورت میں قرآن کریم پر اعتماد اور وثوق کمزور ہو جاتا ہے؟ تو اس کے بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ فوراً بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد **قَيِّنَا اللَّهُ مَا يَتْلِي الشَّيْطَانُ** کے ساتھ اس اعتماد اور وثوق کی ضمانت فراہم کر دی ہے۔ کہ جو کچھ شیطان القاء کرتا ہے رب کریم اسے مناد بنا دیتا ہے زائل کر دیتا ہے اور لوگوں پر اسے بالکل ظاہر کر دیتا ہے۔ پھر فرمایا **يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ** کہ اللہ تعالیٰ آیات منزل کو ثابت اور مضبوط کر دیتا ہے اور شیطان کی جانب سے ان میں کسی بھی زیادتی سے انہیں محفوظ رکھتا ہے۔

پھر اگر یہ کہا جائے کہ یہ آیت **(قَيِّنَا اللَّهُ آيَاتِهِ)** بھی تو مذکورہ احتمال رکھتی ہے (یعنی اس میں بھی القاء شیطان کا شہہ ہو سکتا ہے) تو اس کے بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ جب اس آیت کو اس دلیل عقلی سے ملا دیا جائے جو یہ تقاضا کرتی ہے کہ رسولوں کی رسالت صحیح ہو وہ

۱- تفسیر ربوئی، جلد 4، صفحہ 126 (الفکر)

(۱) حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ نے الشفاء میں ذکر کیا ہے صحیح روایت کرنے والے علماء میں سے کسی نے بھی اس روایت کو بیان نہیں کیا اور نہ کسی ثقہ نے اسے متصل صحیح سند کیا تھا اسے روایت کیا ہے۔ مفسرین اور مورخین مسلمان ہی ایسی غرائب تھی روایت نقل کرنے کے محتاج ہوتے ہیں اور وہ صحیح اور غلط واقعہ کا بیان میں نقل کر دیتے ہیں۔ قاضی بکر بن علان لکھی نے صحیح کہا ہے کہ لوگ بہتر صحیح اور خواہش نفس کے تابع مفسرین کے پیچھے گئے رہتے ہیں اور وہ یقیناً ان کی بیان کردہ روایات سے چمٹے رہتے ہیں حالانکہ وہ روایات ضعیف ہوتی ہیں ان میں اضطراب پایا جاتا ہے ان کی اسانید میں انتظام پایا جاتا ہے اور ان کے الفاظ میں اختلاف ہوتا ہے۔ مثلاً اسی واقعہ کے بارے میں بعض نے یہ کہا ہے کہ اس وقت آپ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ آپ ﷺ نے وہ الفاظ قرآنی تم غفلت میں کہے، جبکہ آپ ﷺ پر سورۃ البقرہ نازل ہوئی۔ کسی نے یہ کہا ہے کہ آپ ﷺ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا اور سہواً آپ کی زبان سے وہ کلمات نکل گئے۔ کسی نے کہا ہے کہ آپ ﷺ پر فیند عاری ہو گئی اور اس دوران آپ کی زبان سے یہ کلمات نکلے۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ شیطان نے آپ ﷺ کی زبان سے یہ کلمات نکلا دیئے پھر جب آپ ﷺ نے جبرائیل امین علیہ السلام کے سامنے یہ الفاظ پڑھے تو اس نے کہا میں نے تو اس طرح آپ کو یہ الفاظ نہیں پڑھائے تھے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ شیطان نے مشرکین کو یہ چاہا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اس طرح قرأت کی ہے۔ جب حضور نبی کریم ﷺ کے پاس یہ خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا تم بندہ اس طرح تو یہ سورت نازل نہیں ہوئی پس اس طرح کی مختلف روایات ہیں اور جن مفسرین اور محدثین نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے کسی نے بھی اس کی نسبت صحابی کی طرف نہیں کی اور نہ اسے مرفوعاً ذکر کیا ہے۔ ان میں سے اکثر

استاد اجتہادی ضعیف اور کمزور ہیں۔ ان میں مرفوع روایت صرف اس ایک سند سے مروی ہے سعید بن ابی بشر بن سعید بن جبیر بن ابن عباس رضی اللہ عنہما۔ لیکن اس روایت میں بھی شک ہے کہ آیا حضور نبی کریم ﷺ اس وقت مکہ مکرمہ میں تھے (کعبہ میں قوم کی مجلس میں پائی میں) اور اگر ہزارے کہا ہے کہ ہم نہیں جانتے یہ حضور نبی کریم ﷺ نے ایسی متصل سند کے ساتھ مروی ہو جس کا ذکر جائز ہو۔ مگر امیر سعید بن جبیر وانی متصل ہے۔ امیر بن خالد وغیرہ نے اس روایت کو سعید بن جبیر سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ البتہ یہ مرفوع ہے کہ گہنی نے ابوصالح کے واسطے سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔ اور ابوبکر نے یہ بیان کیا ہے کہ اس سند کے علاوہ اس روایت کی کوئی ایسی سند معروف نہیں جو قابل ذکر ہو۔ اور اس میں شک واقع ہونے کے سبب ضعیف پایا جاتا ہے اور گہنی کی مرویات اتنی ضعیف ہوتی ہیں کہ ان کی روایت جائز ہے اور ان کا ذکر جائز ہے کیونکہ وہ کذاب

روای ہے۔ (از مؤلف قدس سرہ)

اصول دین میں خطا اور غلطی سے معصوم ہوں تو یہ یقین بندہ کی فائدہ دیتی ہے کہ یہ آیت (فَيَسْمَعُ اللَّهُ لَأَيِّهِ) اور دیگر وہ تمام آیات اور احکام شریعت جنہیں اللہ تعالیٰ نے حکم قرار دیا ہے وہ تمام تر شکوک و شبہات سے مبرا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم قرار دیا ہے تاکہ اہل علم جان لیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حق ہیں۔ اور وہ ان کے ساتھ ایمان لائیں اور ان کے سامنے جھک جائیں۔ اور اللہ تعالیٰ ہی اہل ایمان کی صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مزید ارشاد فرمایا قَالُوا مَا آتَانَا اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ إِذْ أَنْزَلْنَا إِلَيْنَا الْقُرْآنَ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ عِلْمًا

اللہ تعالیٰ لوگوں کے احوال اور ان کی استعداد کو جانتا ہے اور وہ ہر ایک سے ایسا ہی سلوک کرتا ہے جس کا وہ مستحق ہوتا ہے، یعنی جو ہدایت کا مستحق ہوتا ہے اسے ہدایت دے دیتا ہے۔ اور جو گمراہی کا مستحق ہوتا ہے اسے گمراہ کر دیتا ہے۔ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے حکمت کے تحت کرتا ہے لہذا کسی کے لئے بھی اس پر اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں۔ یا معنی یہ ہے کہ جو کچھ نبی کریم ﷺ کی جانب سے وحی فرمائی گئی اور جو شیطان نے قصد و ارادہ کیا اللہ تعالیٰ ان تمام حالات سے خوب واقف اور انہیں جاننے والا ہے اور چونکہ رب کریم حکیم ہے اس لئے وہ شیطان کی طرف سے القاء کئے گئے الفاظ کو ظاہر کئے بغیر قطعاً نہیں چھوڑتا بلکہ اسے زائل کر دیتا ہے اور مٹا ڈالتا ہے۔

لِيَجْعَلَ مَا يَنْفِقُ الشَّيْطَانُ فِتْنَةً لِلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَالْقَالِمِينَ قُلُوبُهُمْ وَإِنَّ الظَّالِمِينَ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ﴿١٠﴾ وَيُعَلِّمُ الَّذِينَ اتُّوتُوا الْعِلْمَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَيُؤْمِنُوا بِهِ فَتُخْبِتَ لَهُمْ قُلُوبُهُمْ وَإِنَّ اللَّهَ لَكَهَادِلٌ لِيَنْصُرَ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿١١﴾

”یہ سب اس لئے تاکہ اللہ تعالیٰ بنا دے جو دوسرا داتا ہے شیطان ایک آزمائش ان لوگوں کے لئے جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جن کے دل بہت سخت ہیں اور بیچک ظالم لوگ مخالفت میں بہت دور نکل جاتے ہیں۔ نیز اس میں یہ حکمت بھی ہے کہ جان لیں وہ لوگ جنہیں علم بخشا گیا کہ کتاب حق ہے آپ کے رب کی طرف سے بل تاکہ ایمان لائیں اس کے ساتھ اور جھک جائیں اس (کی سچائی) کے آگے ان کے دل اور بیچک اللہ تعالیٰ ہدایت دینے والا ہے ایمان والوں کو راہ راست کی طرف سے“

۱۰۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو ایسا کرنے کی قدرت اس لئے دی تاکہ وہ اس کے دوسرے کو ان لوگوں کے لئے آزمائش اور فتنہ بنا دے جن کے دلوں میں شک اور فتناء ہے اور جن کے دل بہت سخت ہیں یعنی مشرکین۔ اور بیچک منافقین اور مشرکین حق کی مخالفت کرنے یا رسول اللہ ﷺ اور مومنین کی مخالفت میں بہت دور نکل جاتے ہیں۔ وَإِنَّ الظَّالِمِينَ فِي صِدْقِ عَصَىٰ مِثْرَةٍ فِي جَدِّهِمْ غَابِرًا وَرُكَّاعًا لَهَا فَسَاءَ مَا كَفَرُوا ﴿١١﴾ اور منافقین و مشرکین کے ظلم و زیادتی کی وضاحت ہو جائے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو قریش نے یہ کہا کہ ہمارے معبودوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو کچھ نازل کیا گیا ہے محمد (ﷺ) اس کے ذکر پر نام ہیں لہذا اسے بدل ڈالا۔ اور وہ دوحرف جو شیطان نے آپ ﷺ کی قرأت میں ڈال دیئے تھے وہ ہر مشرک کے منہ پر تھے چنانچہ ان کے شر میں اضافہ ہو گیا اور مسلمانوں پر ان کی شدت اور سختی بڑھ گئی (۱)۔

۱۱۔ وَلِيُعَلِّمَهُمُ الْكَلِمَةَ الَّتِي كَانَتْ تَخْرُجُ مِنْ فَمِّهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿١٢﴾ یعنی فَعَلْنَا لِمَنْ كَانَتْ تَخْرُجُ مِنْ فَمِّهِمْ لَعْنَةَ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿١٢﴾

يُلْقِي الشَّيْطَانُ لَمْ يُزَيِّنْ لِنَجْعَلِ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ إِلَىٰ آخِرِهِ وَلِيَعْلَمَ۔ یعنی ہم نے شیطان کو القاء کرنے کی قدرت دی اور پھر اس کے القاء کرنے کو مٹا ڈالا۔ اس کا سبب دو امر ہیں، ایک تو یہ کہ جو کچھ شیطان دوسوڑتا ہے ہم اسے آزمائش بنادیں اور دوسرا یہ کہ اہل علم جان لیں کہ یہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ لام قول باری تعالیٰ القی الشَّيْطَانُ کے متعلق ہو۔ اس صورت میں لِنَجْعَلِ اور لِيَعْلَمَ میں لام عاقبت کے لئے ہوگا (کہ اس فعل کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ شریکین کے لئے باعث فتنہ ہوگا اور اہل ایمان کے لئے ایمان کی مضبوطی کا سبب ہوگا) جیسا کہ اس ارشاد میں لام عاقبت کے لئے فَاتَّقِطَةَ الْفِرْعَوْنَ لِيُنْذِرَ لِقَوْمِمْ عَذَابَ الْوَحْشِ ۗ تَا کہ جان لیں وہ لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے احکام کے بارے میں شک تھا گیا ہے۔ سدی نے کہا ہے کہ الْبَدْنِ اَوْ تَوَلَّوْا الْعِلْمَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو یہ تصدیق کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ شیطان کی جانب سے القاء کردہ چیزوں کو مٹا ڈالتا ہے کہ وہ آیات قرآنیہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے محکم اور مضبوط کر دیا ہے وہ حق ہیں اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہی نازل ہونے والی ہیں (۱) یا معنی یہ ہے کہ شیطان کو القاء کرنے کی قدرت دینا حق ہے کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے وقت سے ہی جنس انسان میں یہی دستور خداوندی جاری رہا ہے۔

۷ تا کہ وہ قرآن کریم کے ساتھ ایمان لائیں اور یہ پختہ اعتقاد بنا لیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ یا معنی ہے تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لے آئیں۔ یُوْمِنُوْا كَرَفِئَاةٍ سَعَىٰ يَعْلَمُ پر عطف اس بات کی دلیل ہے کہ فقط علم کا نام ایمان نہیں بلکہ یہ تو امر وہی ہے جو کہ دستور کے مطابق اکثر علم کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔ اور تا کہ ان کے دل اطاعت و انقیاد اور خشیت کے سبب جھک جائیں اور انہیں راحت قلبی اور اطمینان حاصل ہو جائے اور جب کبھی اہل ایمان شہادت میں مبتلا ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ ہی انہیں راہ راست کی طرف ہدایت دینے والا ہے۔ صراطِ مستقیم سے مراد صحیح اعتقاد اور سیدھا راستہ ہے اور وہ اسلام ہے۔

وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي مَرِيئَتِهِمْ حَتَّىٰ تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً ۗ أَوْ يَأْتِيَهُمْ عَذَابٌ
يُؤْرَعِقُهُمْ ۖ أَلَمْ تَرَ يَوْمَ مَدْيَنَ ۖ إِذْ جَاءَتْهُمْ حُرُوفٌ فَاصَّةٌ ۖ فَكَلَّبُوا لِئِنْ أَتَوْا بِعِلْمٍ سَلِطٍ
فِي جَنَّتِ النَّعِيمِ ۖ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۖ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿٢٥﴾

”اور ہمیشہ شک میں مبتلا رہیں گے کفار اس کے بارے میں یہاں تک کہ آجائے ان پر قیامت اچانک یا آجائے ان پر عذاب منحوس دن کا۔“ حکمرانی اس روز اللہ تعالیٰ کی ہی ہوگی۔ وہی فیصلہ فرمائے گا لوگوں کے درمیان ۷ تا پس جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے تو وہ نعمت (واحسان) کے باغوں میں (قیام پذیر) ہوں گے اور جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آجوں کو جھٹلایا تو یہ وہ بد نصیب ہیں جن کے لئے رسوا کن عذاب ہوگا ۷“

۷ مزیدہ کا معنی ہے شک۔ مِنْهُ کی وہ ضمیر سے مراد قرآن کریم ہے یا رسول کریم ہیں یا اہل ایمان ہیں یا پھر اس سے مراد وہ دوسرے جو شیطان نے آپ کی قرأت کے دوران ڈال دیا۔ معنی یہ ہے کہ کفار ان چیزوں کے سبب ہمیشہ شک میں مبتلا رہیں گے کہ آپ ﷺ کو کیا ہوا کہ آپ نے پہلے تو بتوں کا ذکر بڑے اچھے انداز سے کیا مگر پھر ایسا نہ کیا۔ یہاں تک کہ ان پر اچانک قیامت آجائے یا ان پر منحوس دن کا عذاب آجائے۔ السَّاعَةُ سے مراد موت کا وقت ہے اور بغتہ سے مراد اچانک آ جانا۔

مکرم اور شحاک نے کہا ہے کہ عذابِ یومِ عقیق سے مراد اس دن کا عذاب ہے جس کی رات نہ ہو اور وہ قیامت کا دن ہے (۲)۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ الساعۃ سے مراد قیامت کا دن ہے اور یوم عقیم سے مراد بدر کا دن ہے کیونکہ اس دن کفار کو کوئی بھلائی اور نفع حاصل نہیں ہوا تھا۔ لغت میں عقیم کا معنی ہے روکا ہوا منبغ کیا ہوا۔ اور اسی سے ہے المرحم العقیم۔ یعنی ایسی ہوا جس میں بارش نہ ہو۔

یہ کہنا بھی جائز ہے کہ الساعۃ اور یوم عقیم دونوں سے مراد ایک ہی ہو، یعنی دونوں سے مراد یوم قیامت ہو۔ اور اس دن کی دہشت اور ہولناکی کے اظہار کے لئے دوسری جگہ اسم ضمیر کی بجائے اسم ظاہر ذکر کیا گیا ہو۔

یعنی جس دن کفار کا شک و دور ہوگا اس دن حکمرانی صرف اللہ تعالیٰ کی ہی ہوگی وہی لوگوں کے درمیان جزاء کا فیصلہ فرمائے گا۔ بلکہ طرف مستقر ہے۔ اور یحکمکم بینہم جملہ مستاتفہ ہے یا حال ہونے کی بناء پر کل نصب میں ہے اور ہم ضمیر اہل ایمان اور کفار تمام کو شامل ہے اور اس پر دلیل ما بعد آیت طیبہ ہے۔

اس دن ان دونوں آیتوں میں سے پہلی میں خبر (فی جنات النعیم) بغیر فاعل کے ذکر کی گئی ہے اور دوسری میں خبر (فَأُولَٰئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ) کے ساتھ ذکر کی گئی ہے۔ یہ طرز کلام اس پر مستند کر رہا ہے کہ مومنین کو بطور ثواب و جزاء جنت کا عطا ہونا محض اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی عنایت ہے اور کفار کے لئے عذاب و عتاب کا سبب ان کے اعمال ہیں۔ اسی وجہ سے فرمایا لہم عذاب (ان کے لئے عذاب ہوگا) یہ نہیں فرمایا لہم عذاب (کہ وہ عذاب میں ہوں گے) (جبکہ اہل ایمان کے لئے فرمایا وہ نعمت و احسان کے بانوں میں قیام پذیر ہوں گے) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کسی کو اس کا عمل ہرگز نجات نہیں دلا سکتے گا صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ کو بھی نہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا مجھے بھی نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی خصوصی رحمت اور فضل سے مجھے ڈھانپ لے گا (۱)۔ اسے شیخین نے صحیحین میں روایت کیا ہے۔

دونوں نے صحیحین میں حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حدیث روایت کی ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا سیدھے چلتے رہو قربت اختیار کرتے جاؤ اور خوش رہو کیونکہ کسی کو اس کا عمل جنت میں نہیں لے جائے گا۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ کو بھی نہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا مجھے بھی نہیں مگر یہ کہ وہ مجھے مغفرت و رحمت سے ڈھانپ لے گا (2)۔ اسی طرح کی حدیث مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کی ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ابو سعید کی حدیث اور طبرانی نے ابن ابی موسیٰ شریک بن طارق اسامہ بن شریک اور اسد بن کرزہ کی حدیث نقل کی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے اذْخُلُوا الْجَنَّةَ بِهَا كُنْتُمْ تُعْمَلُونَ۔ (تم جنت میں داخل ہو جاؤ ان اعمال کے سبب جو تم کرتے تھے) (اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں داخلہ اعمال کے سبب ہوگا) تو اس کی وضاحت یہ ہے کہ جنت کے مختلف مراتب اور درجات ہیں، وہ اعمال کے سبب ہی حاصل ہوں گے (یعنی جیسے اعمال ہوں گے ویسے ہی جنت میں مرتبہ اور درجہ نصیب ہوگا) لہذا اس آیت کو جنت کے مراتب پانے پر جموں کیا جائے گا۔ ہاں اصل جنت میں داخل ہونا اور اس میں ہمیشہ رہنا تو یہ محض اللہ تعالیٰ کی عنایت اور فضل کے سبب ہی ہوگا۔

بنادنے اڑہد میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ قول نقل کیا ہے آپ فرماتے ہیں تم اللہ تعالیٰ کی عنو (درگزر) کے ساتھ بل صراط عبور کرو گے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ساتھ جنت میں داخل ہو گے اور اپنے اعمال کے سبب مراتب و درجات حاصل کرو گے۔ ابو نعیم نے عون بن عبد اللہ سے بھی یہ اثر نقل کیا ہے۔

وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَمْ يَكُنْ لَهُمْ مَبْرَأَةٌ أَوْ مَأْتُوا لِيَرْزُقَهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ ۗ وَالَّذِينَ هَاجَرُوا مِنْكُمْ فَلْيُحَرِّمُوا لَهُمْ مَبْرَأَتَهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٥٥﴾

اللَّهُ لَعَلَّيْكُمْ حَلِيمٌ ﴿٥٦﴾ ذَلِكَ ۗ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوقِبَ بِهِ لَمْ يَكُنْ بِعَيْبِهِ لِيَبْصُرْهُ اللَّهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَعَفُوفٌ غَفُورٌ ﴿٥٧﴾

”اور جن لوگوں نے ہجرت کی راہ خدا میں پھر وہ (جہاد میں) قتل کر دیئے گئے یا طبی طور پر فوت ہوئے تو ضرور عطا فرمایا جائے گا انہیں اللہ تعالیٰ بہترین رزق اور بیشک اللہ تعالیٰ ہی ہے جو سب سے بہتر روزی دینے والا ہے۔ وہ ضرور داخل کرے گا انہیں ایسی جگہ جسے وہ پسند کریں گے اور یقیناً اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا بڑا بردبار ہے۔ ان باتوں کو یاد رکھو! اور جس نے بد لایا یا ناقدرستی تکلیف اسے دی گئی تھی پھر (مزید) زیادتی کی گئی اس پر تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی مدد فرمائے گا۔ بیشک اللہ تعالیٰ بہت معاف فرمانے والا بہت بخشنے والا ہے۔“

۱۔ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنے وطنوں اور اعزاد اقارب سے مفارقت اور جدائی اختیار کی پھر وہ جہاد میں قتل کر دیئے گئے۔ **فَلْيُحَرِّمُوا لَهُمْ مَبْرَأَتَهُمْ** اور مبالغہ کے معنی کا اظہار کرنے کے لئے باب تفعیل سے شد کے ساتھ **فَلْيُحَرِّمُوا** پڑھا ہے اور **يُحَرِّمُوا** نے تخفیف کے ساتھ **فَلْيُحَرِّمُوا** پڑھا ہے یا وہ طبی طور پر فوت ہوئے تو اللہ تعالیٰ انہیں ضرور جنت میں ایسی نعمتیں عطا فرمائے گا جو کبھی ختم نہیں ہوگی اور ان نعمتوں کی کوئی مثل نہیں اور بیشک اللہ تعالیٰ ہی ہے جو سب سے بہتر روزی دینے والا ہے کیونکہ وہ بغیر حساب کے رزق عطا فرماتا ہے۔

۲۔ وہ ضرور داخل کرے گا انہیں ایسی جگہ جسے وہ پسند کریں گے، یعنی وہ انہیں جنت میں داخل فرمائے گا اور اس میں ہر وہ نعمت ہوگی جس کی چاہت اور خواہش انہوں نے نہیں کرے گی اور انہیں ایسی نعمتوں سے لذت آشنا ہوں گی جنہیں کسی آنکھ نے نہ دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ ہی کسی انسان کے دل میں ان کا تصور تک کھٹکا۔

یقیناً اللہ تعالیٰ ان کے احوال اور ان کے معاندین کے احوال جاننے والا ہے اور بڑا بردبار ہے کہ وہ مزاونے میں جلدی نہیں کرتا۔

۳۔ **ذَلِكَ** ترکیب کلام میں یا تو خبر ہے مبتدا محذوف کی جو کہ الامر ہے۔ یعنی **الامور ذلک** (معاہدہ ہے) یا مبتدا اور اس کی خبر محذوف ہے یعنی **ذلک حق** (یہ بات حق ہے) یا محل رفع میں فاعل واقع ہو رہا ہے، یعنی **تحقق ذلک** (یہ بات ثابت اور تحقیق ہے) یا محل نصب میں مفعول واقع ہو رہا ہے۔ یعنی **عَوَّلْتُ ذَٰلِكَ الَّذِي فَضَّلْنَا عَلَيْهِ** (تو نے وہ کچھ جان لیا جو ہم نے تجھ پر بیان کیا)

۴۔ جس کسی نے ظالم سے اتنا ہی انتقام لیا جتنی مقدار اس پر ظلم کیا گیا۔ عقاب سے مراد وہ سزا یا بدلہ ہے جو کسی ظلم یا زیادتی کے عوض اور مقابلہ میں دی جائے مگر یہاں ابتدائی ظلم کو بھی عقاب کا نام دیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدائی ظلم اور اس کا بدلہ دونوں ہم شکل اور ایک جیسے ہیں۔

پھر پہلے مظلوم پر دوبارہ ظلم و زیادتی کی گئی تو بالیقین اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرمائے گا بیشک اللہ تعالیٰ بہت معاف فرمانے والا بہت

بخشے والا ہے، یعنی پہلے مظلوم نے انتقام لینے میں، جہاں تک خواہش نفس کی پیروی کی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد وَلَئِنْ صَدَقْتُمْ لَتَعْلَمُنَّ مَا كَانُوا يَكْفُرُونَ (یعنی جو صبر کرے اور معاف کر دے تو بلاشبہ یہ بڑے مانی جو مسلک کا کام ہے) کے ذریعے جو کچھ اس کے لئے مستحب قرار دیا تھا اور اس نے اس سے اعراض برت کر جرم کا ارتکاب کیا اللہ تعالیٰ اسے معاف فرمائے والا اور بہت بخشے والا ہے (یعنی اس جرم پر اس کی گرفت نہیں فرمائے گا) اس آیت میں معاف کرنے کی انجنت اور ترفیب دلائی گئی ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ اپنی کمال قدرت اور علو شان کے باوجود معاف فرمادیتا ہے اور بخش دیتا ہے تو پھر دوسروں کو بدرجہ اولیٰ ایسا کرنا چاہئے اور دوسرا اس میں یہ سنجیدہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ سزا دینے کی قدرت رکھتا ہے کیونکہ عفو کی صفت سے وہی متصف ہو سکتا ہے جو سزا دینے کی قدرت رکھتا ہو۔

علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ حسن نے کہا ہے قول ہاری تعالیٰ ذُنُوبٌ غَافِبٌ بِمِثْلِ مَا عُوْثِبَ بِهِ كَمَا مَعْنَىٰ يَهِيَ كَمَا جَسَ نَعِ شَرِكِينَ سے اسی طرح قال کیا جیسے انہوں نے اس سے قال کیا پھر اس پر مزید ظلم کیا گیا کہ اسے اپنے گھر سے باہر نکال دیا گیا۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت مشرکین کے ایک گروہ کے بارے میں نازل ہوئی جو کہ مسلمانوں کے ساتھ لڑنے کے لئے آیا جبکہ ابھی محرم الحرام کے دو دن باقی تھے۔ چنانچہ اس میں نے احترام میں مسلمانوں نے ان کے ساتھ لڑنا پسند نہ کیا۔ اور ان سے یہ کہا کہ تم اس ماہ محرم الحرام کی وجہ سے جنگ سے رک جاؤ۔ لیکن مشرکین نے ان بات کو رد کر دیا اور مسلمانوں سے لڑنا شروع ہو گئے۔ پس یہ ان کی جانب سے مسلمانوں پر اہتجاجی ظلم اور زیادتی تھی۔ لیکن مسلمان ثابت قدم رہے تو اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کے سبب مسلمان ان پر غالب آ گئے (۱)۔

میں کہتا ہوں کہ اس واقعہ کے مطابق آیت طہیرہ کے مذکورہ حصہ کا معنی یہ ہوگا کہ جنگ اللہ تعالیٰ کو موثقیں کو معاف فرمانے والا ہے اور ماہ حرام میں ان کے جنگ کرنے کے جرم کو بخشے والا ہے۔ ابن ابی حاتم نے مقاتل سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوَلِّىْ لِمَن يَّوَلِّىْهُمُ الْاَسْبَابَ وَيُوَلِّىْ لِمَن يَّوَلِّىْهُمُ الْاَسْبَابَ فِي الْبَيْلِ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَبِيْعٌ
بِصَبِيْعٍ ۝۱۱ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَاَنَّ
اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ۝۱۲ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَاءً فَنُصِبْنَا
اَلْاَرْضَ مَحْضَرَةً ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ حَمِيْدٌ ۝۱۳ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى
اَلْاَرْضِ ۗ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهٗوَ الْعَلِيُّ الْحَمِيْدُ ۝۱۴

”اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی داخل کرتا ہے رات (کے کچھ حصہ) کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن (کے کچھ حصہ) کو رات میں اور اللہ تعالیٰ سب باتیں سننے والا سب کچھ دیکھنے والا ہے۔ نیز اس کی وجہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو خدا کے برحق ہے۔ اور جسے وہ چاہتا ہے اس کے علاوہ وہ سراسر باطل ہے اور اللہ تعالیٰ ہی ہے جو سب سے بلند (اور) سب سے بڑا ہے۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اتارا آسمان سے پانی تو ہو جاتی ہے (خلك) زمین سرسبز و شاداب۔ جنگ اللہ تعالیٰ ہمیشہ لطف فرمانے والا ہر چیز سے باخبر ہے۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو سب سے بڑا اور ہر تعریف کا مستحق ہے“

۱۔ اس مدد کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شئی پر قادر ہے اور اس کی یہ عادت جاری ہے کہ وہ متضاد چیزوں کے درمیان تغیر و تبدل کرتا رہتا

ہے۔ اسی وجہ سے وہ رات اور دن میں سے ایک میں اتنی مقدار کا اضافہ فرماتا ہے جتنی مقدار دوسرے میں کمی کرتا ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ سورج کو فروپ کر کے دن کے اجالے اور نور کی جگہ رات کی ظلمت و تاریکی لے آتا ہے اور طلع آفتاب کے سبب رات کی تاریکی کو دن کے نور میں تبدیل کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ انتقام لینے والے اور جس سے انتقام لیا جائے دونوں کے اقوال کو سننے والا ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ اہل ایمان کی دعا سنتا ہے اور ان کی دعا قبول بھی فرماتا ہے اور وہ دونوں کے افعال کو دیکھنے والا ہے لہذا وہ دونوں میں سے کسی کے افعال کو کھل اور جزاء و سزا کے بغیر نہیں چھوڑے گا۔

یہ نیز وہ کمال علم و قدرت اور کمال سبح بصر سے اس لئے متصف ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی خدا ہے برحق ہے، وہ فی نفسہ ثابت اور موجود ہے اور وہ اپنی ذات کے اعتبار سے واجب الوجود اور وحدہ لا شریک ہے کیونکہ اس کا واجب الوجود ہونا اور وحدہ لا شریک ہونا دونوں یہ تقاضا کرتے ہیں کہ وہ اپنے سوا پائی جانے والی ہر شئی کے لئے مبداء اور سرچشمہ وجود ہو، وہ ساری کائنات اور اپنی ذات کا عالم بھی ہو۔ اور تمام صفات کمالیہ سے متصف بھی ہو کیونکہ جب اس کا الہ ہونا ثابت ہے تو پھر لازم ہے کہ وہ اپنی ذات اور علم میں کامل ہو اور وہ سبج و مبصر ہونے میں تام ہو۔ یہ نافع نہیں کثیر اہل عام اور اولیاء نے یہاں اور سورۃ القمان میں دونوں مقامات پر خانیذ علون کو تانا کے ساتھ مَا تَذَعُونَ پڑھا ہے کہ مشرکین اللہ تعالیٰ کے علاوہ جن کو پوجتے ہیں وہ سراسر باطل ہیں۔ معدوم ہیں اور ذاتی اعتبار سے ان کا وجود متعجب ہے یا معنی یہ ہے کہ ان کا الہ ہونا باطل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہی ہے جو اس سے بلند و برتر ہے کہ اس کا کوئی شریک ہو اور وہ ایسا عظیم ہے کہ اس کی مثل کوئی شئی نہیں۔

یہ کیا تو نے نہیں دیکھا یا کیا تو نے جان نہیں لیا۔ یہ استہتام انکاری ہے یعنی تو نے جان لیا ہے اور دیکھ لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی اتارا تو خشک زمین سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے، یعنی زمین نباتات کے ساتھ سرسبز و شاداب ہوگئی۔ یہاں ماخضی کے لئے مضارع کا لفظ ذکر کیا گیا ہے، ایک تو اس لئے کہ ماخضی کی تصویر ذہن میں حاضر ہے اور دوسرا اس پر دلالت کرنے کے لئے کہ بارش کے اثرات کافی وقت تک باقی رہتے ہیں اور یہ جملہ اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت اور کمال علم پر دوسری دلیل ہے۔

بیشک اللہ تعالیٰ ہمیشہ لطف فرمانے والا ہے، یعنی اس کا علم یا اس کی مہربانی ہر چیز تک پہنچنے والی ہے چاہے وہ کتنی دقیق ہو یا کتنی بڑی اور عظیم ہو۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز سے باخبر ہے، یعنی تدابیر ظاہرہ سے بھی اور تدابیر باطنیہ سے بھی اپنے بندوں کے احوال سے بھی اور رزق میں سے جس جس شئی کے محتاج اور ضرورت مند ہیں رب کریم اس سے باخبر ہے۔

یہ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، یعنی ہر شئی اسی کی پیدا کی ہوئی ہے اور اسی کی ملکیت ہے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو اپنی ذات میں ہر شئی سے مستغنی اور بے پرواہ ہے اور وہی اپنی صفات و افعال کے اعتبار سے مستحق حمد و ستائش ہے یا مشہور یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کے اعتبار سے خود محمود ہے اگرچہ اس کی ذات کے سوا کوئی حمد و تعریف کرنے والا نہ بھی موجود ہو۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمْ مِمَّا فِي الْأَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ ۗ
يُؤَسِّسُ السَّمَاءَ أَنْ تَقَعَّ عَلَى الْأَرْضِ وَإِلَّا بِذِيهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ بَالِغُ أَمْرِهِ
رَحِيمٌ ۝ وَهُوَ الَّذِي أَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ۗ إِنَّ الْإِنْسَانَ
لَكَفُورٌ ۝

”اور کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرما تبار بنا دیا ہے تمہارے لئے ہر چیز کو جو زمین میں ہے اور کشتی کو بھی کہ چلتی ہے سمندر میں اس کے حکم سے۔ اور اس نے روکا ہوا ہے آسمان کو کہ گر نہ پڑے پر بجز اس کے فرمان کے۔ عینک اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ بڑی مہربانی فرمانے والا ہمیشہ رحم کرنے والا ہے۔ اور وہی ہے جس نے تمہیں زندگی دی پھر مارے گا تمہیں پھر زندہ کرے گا تمہیں، عینک انسان بڑا ناشکر ہے۔“

۱۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرما تبار بنا دیا ہے تمہارے لئے ہر چیز کو جو زمین میں ہے، یعنی اسے تمہارے لئے مطیع کر دیا ہے اور اسے تمہارے منافع اور فوائد کے لئے تیار کیا ہے۔ ترکیب کلام میں الفلک منصوب ہے، اس کا عطف ما پر ہے یا اُن کے اسم پر ہے۔ اور تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِ يَا تَوَالفک سے حاصل ہے یا جملہ مستانہ ہے۔ بعض نے اس کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں پائے جانے والے سواری کے جانور تمہارے لئے فرما تبار بنا دیئے ہیں تاکہ تم خشکی میں ان پر سواری کرو اور کشتی کو تمہارے لئے سحر کر دیا ہے تاکہ تم سمندر میں اس پر سواری کرو۔

۲۔ اور اس نے آسمان کو زمین پر گرنے سے روکا ہوا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اجسام فلکیہ بھی اجسام ارضیہ کی مثل نیچے کی طرف آنے کا میلان رکھتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے انہیں روک رکھا ہے۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ امسکھ اللہ تعالیٰ نے انہیں روک رکھا ہے) کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی ہیئت اور صورتوں پر بنایا ہے جو کہ بذات خود اوپر چڑھنے کا تقاضا کرتی ہیں (۱)۔

۱) لَا يَذُوبُ قَوْلَ بَارِي تَعَالَى يُنْفِخُ السَّمَاءَ أَنْ تَقَعَ عَلَى الْأَرْضِ كَثْرَةُ مَضْمُونِ السَّمَاءِ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اجازت کے بغیر کسی حال میں بھی آسمان زمین پر نہیں گرے گا۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے وہ قیامت کا دن ہے (۲) (جس میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ آسمان زمین پر گرے پڑے گا)

میں کہتا ہوں کہ قیامت کے دن بھی آسمان کے زمین پر گرنے کو ہم نہیں جانتے بلکہ اس کے چھٹنے اس میں شکاف ہونے، پھٹنے ہوئی دھات کی طرح ہو جانے، تیل کی چمچ کی طرح ہونے اور اس کے کاغذ کے لپٹنے کی طرح لپٹ جانے کا ذکر آیا ہے۔ لہذا یہ کہنا زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے کہ استثناء یہ تقاضا کرتا ہے کہ کلام استثناء کے بعد ماہی کے بارے سے اور یہ مشی کے وجود کا تقاضا نہیں کرتا۔ پس آیت کا معنی یہ ہوگا کہ آسمان اذن خداوندی کے بغیر زمین پر نہیں گرے گا۔ لیکن اس آیت سے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کونسا وہ مخصوص وقت ہے جبکہ اسے زمین پر گرنے کی اجازت ہوگی اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے زمین پر گرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ واللہ اعلم۔

۳۔ عینک اللہ تعالیٰ لوگوں کیساتھ بڑی مہربانی فرمانے والا ہمیشہ رحم کرنے والا ہے۔ اس طرح کہ اس نے لوگوں کے لئے (اپنی وحدانیت کی پیمان کے لئے) استدلال کے اسباب پیدا فرمادیئے ہیں منافع اور فوائد کے دروازے ان پر کھول دیئے ہیں اور ان سے طرح طرح کی مصیبتوں اور تکالیف کو دور فرما دیتا ہے۔

۴۔ اور وہی ہے جس نے تمہارے جسموں میں ارواح پھونک کر تمہیں زندگی عطا فرمائی حالانکہ اس سے قبل تم جامد حالت میں تھے عناصر تھے نطفہ تھے جما ہوا خون تھے گوشت کا ایک لوتھرا تھے اور بغیر روح کے جسم تھے۔ (اللہ تعالیٰ نے تمہیں مذکورہ تمام مراحل سے گزار کر

تمہارے جسموں میں ارواح چھوٹ کر تمہیں نعمت حیات سے نوازدیا (پھر وہی تمہاری مدت حیات گزرنے کے بعد تمہارے جسموں سے ارواح نکال کر تمہیں موت دے گا اور پھر آخرت میں تمہیں دوبارہ جسم عطا کر کے اور ان میں ارواح چھوٹ کر تمہیں زندہ کرے گا۔ یہ بیشک انسان (مشرک) ان نعمتوں کے ظاہر ہونے کے بعد ان کا انکار کر کے ناشکر کی کارکنگ کرتا ہے۔ وہ تو اس ابتدائی اور بنیادی نعمت کو پہچانتا ہے جو اسے وجود عطا کرتی ہے اور نہ نعمت موت کا اعتراف کرتا ہے جو اسے دوسری زندگی کے قریب کرنے والی ہے جس کا اس سے وعدہ کیا گیا ہے اور نہ دوبارہ زندہ کئے جانے کی نعمت کو تسلیم کرتا ہے جو اسے مقصد و اصلی (جہاد و امام) تک پہنچانے والی ہے۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود و وحدانیت اور اس کی صفات کا ملکہ پر قطعی دلائل قائم ہونے کے باوجود بھی مشرک انسان اپنے رب کا انکار کرتا ہے اور اسے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

لَئِنْ أُمَّةٌ جَعَلْنَا مَنَسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَارِعُ عُنُقًا فِي الْآمْرِ وَادْعُم إِلَىٰ رَبِّكَ ۗ إِنَّكَ لَعَلَّ هُدًى مُّسْتَقِيمًا ﴿٥٠﴾ وَإِنْ جَدَلْتُمْ فَقُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿٥١﴾ اللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿٥٢﴾

”ہر امت کے لئے ہم نے مقرر کر دیا ہے عبادت کا طریقہ جس کے مطابق وہ عبادت کرتے ہیں۔ تو انہیں چاہئے کہ وہ نہ جھگڑا کریں آپ سے اس معاملہ میں بلکہ آپ ہاتھ رہیں انہیں اپنے رب کی طرف (اے محبوب!) آپ بیشک سیدھی راہ پر (کاہزن) ہیں اور اگر وہ (پھر بھی) آپ سے جھگڑا کریں تو آپ (صرف اتنا) فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو تم کر رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے گا تمہارے درمیان قیامت کے دن ان امور کے بارے میں جن میں تم اختلاف کرتے رہتے ہو۔“

۱۔ اس آیت سے قبل عطف کے لئے واؤ ذکر نہیں کی جیسا کہ اس سے قبل حرف عطف ذکر کیا گیا تھا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں عبادت سے متعلق ایک دوسرے سے مناسبت رکھنے والی کئی آیات ذکر کی گئی تھیں اس لئے وہاں ان کا ایک دوسرے پر عطف کیا گیا ہے لیکن یہ آیت معنوی اعتبار سے بہت دور واقع ہے اس لئے اس کا عطف نہیں کیا گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہے کہ منسک سے مراد وہ شریعت ہے جس کے مطابق سابقہ امتوں کے باقی عمل پیرا تھے۔ آپ کے بارے میں یہ روایت بھی ہے کہ آپ نے فرمایا اس سے مراد عید (تہوار) ہے۔ مجاہد اور قتادہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد قربان گاہ ہے جہاں لوگ اپنے جانور ذبح کرتے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی محل عبادت ہے۔ بعض نے کہا ہے اس سے مراد وہ ماٹوں مقام ہے جس سے لوگ اُس اور محبت رکھتے ہوں (میلہ) کلام عرب میں منسک سے مراد وہ مقام ہے جہاں لوگ اچھے یا برے کام کے لئے عموماً جمع ہوتے ہوں۔ اسی سے مناسک حج بھی ہیں کیونکہ لوگ مقامات حج کی طرف بار بار لوٹ کر آتے ہیں (۱)۔ قاسم بن سنان نے کہا ہے کہ منسک کا معنی عبادت ہے اور اؤ نامنا منسک کا معنی ہے ہمیں ہماری عبادت گاہیں دکھا۔ منسک کا معنی نفس ذبح بھی ہے اور وہ مقام بھی ہے جہاں جانور ذبح کیا جاتا ہے (۲)۔ نسبیکہ کا معنی ذبح ہونے والا جانور ہے۔ منسک سے مراد مقام مالوف (میلہ) ہے اور منسک بیٹھنے کی جگہ کو بھی کہتے ہیں

۲۔ پس تمام ارباب ملل کو چاہئے کہ وہ دین یا عبادت (یا ذبح کے طریقوں) کے بارے میں آپ سے جھگڑا نہ کریں کیونکہ وہ یا تو جاہل

ہیں یا عناد رکھنے والے ہیں۔ اگر ان کے اہل علم عناد نہ رکھتے ہوتے تو آپ کے ساتھ ان کے جھگڑا کرنے کا کوئی جواز اور سبب نہیں۔ کیونکہ آپ کے دین کا معاملہ اتنا واضح اور ظاہر ہے کہ اس میں کسی نزاع اور جھگڑے کی قطعاً گنجائش نہیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ آیت بدیل بن ورقاہ بن بشر بن سفیان اور یزید بن خنیس کے بارے میں تازل ہوئی، انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کے صحابہ کو کہا تھا کہ تم ان جانوروں کو تو کھالیتے ہو جنہیں اپنے ہاتھوں سے مار دیتے ہو اور جنہیں اللہ تعالیٰ مار دیتا ہے انہیں نہیں کھاتے (بلکہ کہتے ہو کہ یہ مردار ہے)

زجاج نے کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ لَا يَنْزَاغُنْكَ کا معنی ہے آپ ان سے جھگڑا نہ کیجئے۔ جیسا کہ یہ کہا جاتا ہے لا یخاصمک فلان (فلان کو چاہئے وہ آپ سے جھگڑا نہ کرے) اس کا معنی ہے لا تخصمہ۔ تو اس سے جھگڑا نہ کر۔ یہ معنی لینا صرف ان افعال میں جائز ہوتا ہے جو وہ افراد سے صادر ہوں۔ لہذا لا یضربنک ذنبا (چاہئے کہ زید تجھے نہ مارے) بول کر لا تضربنہ (تو اسے نہ مار) مراد لینا جائز نہیں۔ البتہ لا یضربنک بول کر لا تضربہ مراد لینا جائز ہے۔ اور اس کی وجہ ہے کہ منازعت اور نصیحت وہ افراد کے بغیر مکمل نہیں ہوتا (یعنی جھگڑا کرنے کے لئے کم از کم دو افراد کا ہونا ضروری ہے) اور جب ان میں سے ایک جھگڑا چھوڑ دے تو جھگڑا ختم ہو جاتا ہے (۱)۔

اسے آپ لوگوں کو اپنے رب کی توحید اور عبادت کی طرف بلا تے رہئے۔ میں تو کہتا ہوں۔ بلکہ آپ اپنے رب کی ذات اور بلا کیف اس کا قرب اختیار کرنے کی طرف دعوت دیتے رہئے۔ بلاشبہ آپ اس سیدھی راہ پر گامزن ہیں جو حق اور مدارج قرب کی طرف لے جانے والا ہے۔

اسے اگر حق ظاہر ہونے اور حجت قائم ہونے کے بعد بھی وہ آپ سے جھگڑا کریں تو آپ فقط اتنا فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کچھ تم باطل جھگڑے فساد اور دیگر افعال میں سے کرتے ہو پس وہی تمہیں ان کا بدلہ دے گا۔ اس جملہ میں (مشرکین کو) نرم لہجہ میں وعید کی گئی ہے۔ یہ حکم جہاد کے حکم سے پہلے کا ہے۔ ترکیب کلام میں اس جملہ شرطیہ کا عطف فلان یضاز عنک پر ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی قیامت کے دن اہل ایمان اور کافرین کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ تو اس دن حق باطل سے بالکل ظاہر ہو جائے گا، یعنی قیامت کے دن اہل ایمان کو ثواب اور جزا امدی جائے گی اور کفار کے لئے اعمال کی سزا ہوگی۔ جیسا کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے دلائل و آیات کے ساتھ ان کے درمیان فیصلہ کر رکھا ہے۔ امور دینیہ میں سے جن میں تم اختلاف کرتے رہتے ہو۔ اختلاف سے مراد وہ جھگڑا کرنے والوں میں سے ہر ایک کا دوسرے کے خلاف رائے قائم کرنا ہے۔

أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّ ذَلِكَ فِي كِتَابٍ إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۝ وَيُعِيدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَمْ يَنْزِلْ بِهِ سُلْطَانٌ وَمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهِ عِلْمٌ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ نَصِيرٍ ۝ وَإِذْ أَتَى عَلَىهِمُ الْإِنشَاءُ بَيْتٍ تَعْرِفُ فِي وُجُوهِ الَّذِينَ كَفَرُوا الْمُنْكَرُ يَكَادُونَ يَسْطُونَ بِالَّذِينَ يَسْتَلُونَ عَلَيْهِمْ

الْبَيْتِۙ قُلْ اَفَاَنْتُمْ بِمَسِيْرِۙ مِّنْ ذٰلِكُمْۙ اَلَا تَاْمُرُوْنَۙ وَعَدَا۟ اللّٰهَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا وَّ

بِئْسَ الصّٰیۡرُوْنَ ﴿۱۰﴾

”کیا آپ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے یہ سب کچھ ایک کتاب میں (لکھا ہوا) ہے۔ بیٹک (ہندی اور ہستی کی ہر چیز کو جان لینا) اللہ تعالیٰ پر آسان ہے۔ اور وہ پوجتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا ان کو نہیں اتاری جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے کوئی سند۔ اور انہیں خود بھی ان کے بارے کوئی علم نہیں۔ اور نہیں ہوگا ظلم و ستم کرنے والوں کا کوئی مددگار۔ اور جب تلاوت کی جاتی ہے ان کے سامنے ہماری آیتیں صاف صاف تو آپ پہچان لیتے ہیں کفار کے چہروں پر ناپسندیدگی کے آثار۔ یوں پتہ چلتا ہے کہ وہ عنقریب جھپٹ پڑیں گے ان لوگوں پر جو پڑھتے ہیں ان کے سامنے ہماری آیتیں۔ آپ فرمائیے (اے جہنم ہونے والو!) کیا میں آگاہ کروں تمہیں اس سے بھی تکلیف دہ چیز پر دو ذبح کی آگ! ا وعدہ کیا ہے اس آگ کا اللہ تعالیٰ نے کفار سے اور دو ذبح بہت برا ٹھکانا ہے۔“

۱۰. اَلَمْ نَعْلَمْ میں استفہام تقریری ہے۔ کیا آپ نہیں جانتے (یعنی آپ یقیناً جانتے ہیں) کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ زمین و آسمان میں ہے، یعنی اس پر کوئی شکی غشی اور پوشیدہ نہیں۔ یہ سب کچھ ایک کتاب میں لکھا ہوا ہے کتاب سے مراد وہ لوح محفوظ ہے جس میں زمین و آسمان کی تخلیق سے پہلے ماکان اور مہا یوگن سب کچھ اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے۔ (یعنی جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے سب کچھ اس میں درج ہے، اس میں ان مشرکین کے تمام معاملات بھی محفوظ ہیں) اس لئے آپ ان کے معاملات اور ان کے کردار کو قطعاً کوئی اہمیت نہ دیں کیونکہ ان کی تمام کارستانیاں ہمارے علم میں ہیں اور ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ بیٹک ان تمام کا احاطہ کرتا یا نہیں لوح محفوظ میں درج اور ثابت کرنا یا تمہارے درمیان (جزا و منہا کا) فیصلہ کرنا اللہ تعالیٰ پر آسان ہے۔ کیونکہ اس کی ذات اس تمام علم کا تقاضا کرتی ہے اور تمام معلومات کی نسبت اس کے علم کی طرف مساوی اور یکساں ہے۔

۱۱. وَيُعْبَدُوْنَ کا عطف سابقہ ان آیات کے مضمون پر ہے جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور کمال قدرت پر دلالت کرتی ہیں، یعنی کیا تم توحید باری تعالیٰ اور الوہیت خداوندی کے بارے ان واضح دلائل اور براہین قطعہ کو جانتے ہو؟ اور یہ مشرکین ایسے دلائل ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے علاوہ ان کی پرستش کرتے ہیں جن کے بارے اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی سند اور جہت نازل نہیں فرمائی جو ان کی عبادت و پرستش کے جائز ہونے پر دلالت کرتی ہو۔ اور انہیں خود بھی ان کے بارے کوئی علم نہیں جو انہیں قضیہ عقل سے حاصل ہوا ہو یا استدلال نظری کا نتیجہ ہو یا اس خبر صادق کی جانب سے علم کا فائدہ دینے والی صحیح روایت ہو جس کی صداقت پر دلائل و براہین موجود ہوں یا پھر ایسی خبر متواتر ہو جس کی انتہا ہو اس خد سے کسی پر ہو۔

اور وہ مشرکین جنہوں نے اس قسم کے ظلم کا ارتکاب کیا ہے ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا جو انہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچا سکے گا۔

۱۲. وَاِذَا قُلْتُمْ عَلٰیہِمْ۔ الایہ مکمل شرط و جزا کا عطف یُعْبَدُوْنَ پر ہے اور جب ان پر قرآن کریم سے ہماری آیات ان پر تلاوت کی جاتی ہیں جن کا اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہونا بالکل حین اور واضح ہے یا عقائد حقہ اور احکام الہیہ پر انکی دلالت واضح ہے۔ تو آپ کفار کے چہروں پر ناپسندیدگی کے آثار پہچان لیتے ہیں۔ یہاں منکر سے مراد انکار ہے۔ یعنی ترش روئی اور نفی و غضب کے سبب انکار

کے آثار ان کے چروں پر ظاہر ہو جاتے ہیں۔ آیت کریمہ میں لُئِي وَجُوهُهُمْ شَرِكِي جَدِّ لِي وَجُوهُ الَّذِينَ اسْم ظاہر ذکر کیا ہے تاکہ اس پر دلالت ہو جائے کہ انہیں اس انکار پر برا سمجھنے کرنے والی شدت کفر کے سوا اور کوئی شئی نہیں۔

یا پھر منکر سے مراد وہ شر ہے جس کا وہ موتیوں کے بارے قصد کرتے ہیں۔ یُكَادُونَ يَسْطُونَ ترکیب کلام میں الَّذِينَ كَفَرُوا ہے حال ہے۔ يَسْطُونَ کا معنی ہے وہ پکڑ لیں گے یا معنی ہے کہ وہ اہل ایمان کو ضرر اور تکلیف پہنچانے کے لئے ان کی طرف اپنے ہاتھ پھیلائیں گے۔ یہ سطا الفرس سے ماخوذ ہے۔ یہ جملہ تب کہا جاتا ہے جب گھوڑا آگڑ وغرور کے سبب یا مادہ پرکوند نے کی غرض سے اپنے آگے والے دونوں پاؤں زمین سے اٹھا کر صرف پیچھے والے دو پاؤں پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ قاسوس میں ہے کہ۔ سطا علیہ اور سطاہ دونوں کا معنی ہے حملہ کرنا یا پکڑنے کے لئے جبر و تشدد کرنا۔ اس کا مصدر سطا اور سطاوہ ہے (1)۔

معنی یہ ہے کہ یوں پتہ چلتا ہے وہ قریب جمیٹ پڑیں گے ان لوگوں یعنی محمد ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام پر جو ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھتے ہیں۔

یہ اے محمد ﷺ آپ انہیں فرمادیجئے کیا میں تمہیں آگاہ کروں اس شئی سے جو تمہارے لئے زیادہ تکلیف دہ اور تمہارے لئے زیادہ ناپسندیدہ ہے اس قرآن سے یا تمہارے اس غصے سے جو تمہیں تلاوت کرنے والوں پر ہے یا تمہارے ان پر حملہ کرنے سے یا اس ننگی اور پریشانی سے جو تمہیں تلاوت قرآن کریم سننے کے سبب لاحق ہوئی اور وہ ہے دوزخ کی آگ۔ ترکیب کلام میں النار خبر ہے مبتدا محذوف کی جو کہ ہو ہے۔ گو یا کہ النار سائل کے اس سوال کا جواب ہے ما ہو۔ (وہ کیا ہے تو جواب میں فرمایا النار۔ وہ دوزخ ہے۔) اور یہ بھی جائز ہے کہ النار مبتدا ہو اور اس کی خبر وَعَذَابُ اللَّهِ الْآبِيَةِ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے کفار سے اس آگ کا وعدہ کر رکھا ہے اور دوزخ بہت برا ٹھکانا ہے۔ النار کی کابلی ترکیب کی صورت میں وَعَذَابُ اللَّهِ الْآبِيَةِ جملہ مستند ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ ضَرْبٌ مِّثْلُ قَاسِمٍ مَوْالَةٍ إِنَّ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَنْ يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوْ اجْتَمَعُوا لَهُ وَإِنْ يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ سَيْفًا لَا يَسْتَنْقِذُوهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبِ وَالْمَطْلُوبِ ۝

”اے لوگو! ایک مثال بیان کی جا رہی ہے پس غور سے سنو! ۱۔ ایک جن مجبوروں کو تمہارے ہوا اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر یہ تو کبھی بھی پیدا نہیں کر سکتے اگرچہ وہ سب جمع ہو جائیں اس (معمولی سے) کام کے لئے ۲۔ اور اگر جینیں لے ان سے کبھی بھی کوئی چیز تو وہ نہیں چھڑا سکتے اسے اس کبھی سے ۳۔ (آہ!) کتابے بس ہے ایسا طالب اور کتا بے بس ہے ایسا مطلوب۔ ۴۔“

۱۔ اے لوگو! تمہارے لئے ایک عجیب حالت یا عجیب قصہ بیان کیا جا رہا ہے بس تم اس مثال کو پورے تہہ براور غور و فکر سے سنو۔ بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے میری مثل (دوسروں کو) بنایا گیا ہے، یعنی کفار نے جنوں کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی مثل ہی مستحق عبادت قرار دیا ہے۔ پس تم ان کا حال تو جاور غور سے سنئے پھر یہ فیصلہ کیجئے کہ کیا انہیں اللہ تعالیٰ کی مثل قرار دینا جائز ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اس حال کو تفصیل سے بیان فرمایا۔

ع. تَدْعُونَ كُوَيْتُوبَ نِيَا كَسَا تَه تَدْعُونَ پڑھا ہے۔ اور اس کی ضمیر کفار کی طرف راجع ہے۔ باقیوں نے نیا کے ساتھ پڑھا ہے اس لئے کہ یہ خطاب کفار کو ہے اور اسم موصول الذین کی طرف لوتنے والی ضمیر عائد محذوف ہے۔ اصل عبارت ہے اِنَّ الذِّينَ تَدْعُوْنَ نَهَابِهَا الْكُفَّارِ الْهَاتِ كَانَتْ۔ اے کفار! جن مجبوروں کو الہ بگھتے ہوئے تم ان کی پرستش کرتے ہو اور انہیں پکارتے ہو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر۔

مِنْ ذُوْنِ اللّٰهِ سے مراد بت ہیں۔ وہ تو ایک کبھی کو بھی پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتے اس کے باوجود کہ وہ چھوٹی سی بقلیل سی اور انتہائی حقیر سی شئی ہے۔ لیکن نیا کی تاکید کا معنی دیتا ہے اور یہ معنی (جس کی نفی کی جائے) اور معنی عند (جس سے نفی کی جائے) کے مابین منافاة پائے جانے پر دلالت کرتا ہے۔ الذباب۔ الذباب۔ الذب سے مشتق ہے، اس کا معنی ہے دفع کرنا اور کبھی اڑانا۔ تو چونکہ کبھی کو بھی ہر آدمی اڑاتا اور دفع کرتا ہے اس لئے اسے ذباب کہا جاتا ہے۔ ذباب کی جمع قلت الذبۃ ہے اور جمع کثرت ذبائین ہے جیسا کہ غراب کی جمع قلت اغریۃ اور جمع کثرت غیر بان آتی ہے۔

اگرچہ کبھی کو بنانے کے لئے تمام کے تمام بت جمع ہو جائیں۔ یہ جملہ حال کے فعل میں مقدر جواب کے لئے اظہار مبالغہ کے لئے ذکر کیا گیا ہے، یعنی وہ کبھی کو پیدا کرنے پر قادر نہیں ہو سکتے درآسمان۔ وہ تمام کے تمام اس کام کے لئے جمع ہو جائیں اور ایک دوسرے سے تعاون کریں تو پھر انفرادی طور پر وہ کیسے قادر ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں واؤ عالیہ ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ واؤ عاطفہ ہے اور اس کا معطوف محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے فَسَبِّحْهَا لِحَمْدِهَا عَلٰی الْخَلْقِ لَوْ لَمْ يَخْتَفِعْهَا الْخَلْفَةُ وَلَوْ اَجْتَمَعُوْا لَهٗ۔ یعنی تخلیق کی قدرت نہ رکھنے میں بھی اس پر قادر نہیں ہو سکتے۔

ع. اور اگر کبھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اسے اس سے چھینا نہیں سکتے۔ مشرکین اپنے بتوں پر زعفران کا طلاہ کرتے اور ان کے سامنے کھانا رکھتے تھے۔ کبھی اس پر بیٹھتی اور اس سے کچھ لے کر اڑ جاتی تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر کبھی بھی ان سے کوئی شئی چھین کر اڑ جائے تو وہ بت نہ تو اس شئی کو اس سے چھرانے کی قدرت رکھتے ہیں اور خدا اس سے مقابلہ کرنے کی قوت رکھتے ہیں چہ جائیکہ یہ بت کبھی کو بنا لیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت طیبہ میں کفار کی حد درجہ جہالت کا ذکر فرمایا ہے اس طرح کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو کہ تمام ممکنات پر قادر ہے اور تمام کی تمام موجودات کا منفرد موجود ہے ایسی حقیر ترین چیز کو شریک ٹھہرا دیا ہے جو کہ سب سے کتر اور ذلیل ترین شئی کو بھی پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتی۔ اور وہ اپنی ذات کا دفاع کرنے سے بھی عاجز ہے کہ اگر اس سے کوئی شئی اچک کر لے جائے تو وہ اسے چھرانے اور پچانے کی قدرت نہیں رکھتی۔

ع. طالب اور مطلوب دونوں کتنے بے بس اور کمزور ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہے کہ طالب سے مراد کبھی ہے جو بت سے وہ شئی طلب کرتی ہے جسے وہ چھیننا چاہتی ہے اور مطلوب سے مراد بت ہے جس سے کبھی وہ شئی چھیننے کی خواہش رکھتی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ طالب بھی کمزور ہے اور مطلوب اس سے زیادہ بے بس ہے۔ بعض نے اس کے برعکس کہا ہے کہ طالب سے مراد بت ہے کیونکہ وہ چھینتی ہوئی شئی کو تقدیر اور فرضاً طلب کرنے والا ہے اور مطلوب سے مراد کبھی ہے کہ اس سے وہ شئی طلب کی جاتی ہے۔ ضحاک نے کہا ہے کہ طالب سے مراد بت کی پوجا کرنے والا اور مطلوب سے مراد بت ہے (۱)۔

مَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَكَنُومٌ عَصِيبٌ ۖ إِنَّ اللَّهَ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ
رُسُلًا ۚ وَمِنَ النَّاسِ ۗ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ﴿٥٦﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا
خَلْفَهُمْ ۗ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿٥٧﴾

”نہ قدر پہچانی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی جیسے اس کی قدر پہچانے کا حق تھا بیشک اللہ تعالیٰ بڑا طاقتور (اور) سب پر غالب ہے۔ اللہ تعالیٰ جن لیتا ہے فرشتوں سے بعض پیغام پہنچانے والے اور انسانوں سے بھی بعض کو رسول و بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ انکے آگے ہے اور جو کچھ انکے پیچھے ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف ہی لوٹائے جائیں گے سارے معاملات۔“

انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ایسے تعظیم نہیں کی جیسے اس کی تعظیم کرنے کا حق تھا انہوں نے اللہ تعالیٰ کو ایسے نہیں پہچانا جیسے اس کی معرفت کا حق تھا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ایسے اوصاف بیان نہیں کئے جیسے اس کے اوصاف بیان کرنے کا حق تھا۔ اسی لئے انہوں نے ایسی چیزوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا جو حقہ ترین مخلوق کسی سے بھی اپنا دفاع نہیں کر سکتیں اور نہ اس سے انتقام لے سکتے ہیں۔

بیشک اللہ تعالیٰ بڑا طاقتور ہے، یعنی وہ تمام ممکنات کی تخلیق کی قدرت رکھتا ہے اور وہ سب پر غالب ہے لیکن اس پر کوئی شئی غالب نہیں۔ ان کے معبود تو قلیل ترین اور انتہائی اونٹنی چیز کے بھی دفاع کرنے سے عاجز ہیں اور حقیر اور ذلیل ترین مخلوق سے مغلوب ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں میں سے بعض پیغام پہنچانے والے جن لیتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ اور انبیاء علیہم السلام کے مابین وحی پہنچانے کے لئے واسطہ بنتے ہیں اور اسی طرح لوگوں کی روحیں قبض کرنے ان تک رزق پہنچانے اور ان ہی جیسے دیگر امور سرانجام دینے کے لئے اللہ تعالیٰ اور لوگوں کے درمیان واسطہ ہوتے ہیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے وہ ملائکہ حضرت جبرئیل، حضرت میکائیل، حضرت اسرافیل اور حضرت عزرائیل علیہم السلام وغیرہ ہیں (1)۔ اور اللہ تعالیٰ لوگوں میں سے بعض کو رسول جن لیتا ہے۔ وہ تمام لوگوں کو حق کی طرف دعوت دیتے ہیں اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان پر نازل کیا جاتا ہے وہ لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ رسولوں میں سب سے اول حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور سب سے آخر خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ ہیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب مشرکین نے یہ کہا: اَنْزِلْ عَلَيْنَا الْكِتَابَ مِنْ سَمٰوٰتِنَا (کیا ہم میں سے ان پر قرآن نازل کیا گیا ہے) (انہوں نے تو آپ ﷺ کو حقیر جان کر ایسا کہا) تو رب کریم نے مذکورہ آیت نازل فرما کر انہیں مطلع کیا کہ (اس اہم ترین منصب کے لئے) انتخاب اور چناؤ کا اختیار اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ اپنی مخلوق میں سے جسے چاہتا ہے جن لیتا ہے (2)۔

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس سے قبل اپنی وحدانیت کا ذکر فرمایا اور اپنی الوہیت اور صفات میں کسی غیر کے شریک ہونے کی کلمی نفی فرمادی تو پھر ان آیات میں یہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ہیں جنہیں وہ رسالت کے لئے جن لیتا ہے۔ انہی کی بات کو تسلیم کرنے اور انہی کی اقتدا کرنے کو اللہ تعالیٰ کی عبادت و طاعت کیلئے وسیلہ بنایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ

کے سوا تمام موجودات کیلئے (انہی کی اتباع و پیروی) سب سے اعلیٰ مرتبہ اور انتہائی بلند درجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد انبیاء علیہم السلام کی نبوت کو ثابت کرنے اور کفار کے اس قول کی تردید کیلئے ہے۔ مَا تَعْبُدُونَ إِلَّا لِيُقَدِّمُ يَوْمَئِذٍ آلِي اللَّهِ زَكَاةً أَنْ لَا يَكُونَ لَكُمْ مَتَّعِينَ (کہ تم تو بتوں اور ملائکہ کی پوجا اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے بہت قریب کر دیں گے) اور یہ ان کے اس قول کی تردید کے لئے ہے کہ الصَّلَاةُ تَكْفِي بِنَاتِ اللَّهِ (کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں) (1)

بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے یعنی اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کا علم رکھتا ہے چاہے انکا تعلق مسوعات سے ہو یا مریات سے۔ علی اللہ تعالیٰ جاتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ سَعَاءٌ اور وہ کچھ ہے جو انہوں نے آگے بھیج دیا اور وَخَلْفَهُمْ سَعَاءٌ ہے جو وہ پیچھے چھوڑ آئے (یعنی وہ مال یا نیک و بد اعمال جو انہوں نے آگے بھیج دیئے اور وہ مال یا اچھا یا برا راستہ جو انہوں نے پیچھلوں کے لئے چھوڑا اللہ تعالیٰ اس سب سے واقف ہے۔) حسن نے کہا ہے کہ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ سَعَاءٌ اور وہ اعمال ہیں جو انہوں نے کر دیئے ہیں اور وَخَلْفَهُمْ سَعَاءٌ اور وہ اعمال ہیں جو وہ بعد میں کریں گے (2)۔ بعض نے کہا ہے کہ ضمیر کا مرجع رسل کرام ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ رسل عظام علیہم السلام کی خلافت سے قبل کے حالات کو کبھی جانتا ہے اور ان کے دصال کے بعد جو کچھ ہوا یا ہوگا سے بھی خوب جانتا ہے۔

اور تمام معاملات اور امور اللہ تعالیٰ کی طرف ہی لوٹانے جائیں گے کیونکہ وہی بذات تمام امور کا مالک ہے وہ (بندوں میں سے) انتخاب اور چناؤ وغیرہ کا جو عمل کرتا ہے اس کے متعلق قطعاً اس سے باز پرس نہیں کی جاسکتی (اس نے ایسا کیوں کیا) البتہ بندوں سے ایسی باز پرس کی جائے گی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْكُنُوا أَسْجِدَ وَإِعْبُدُوا أَسْبَاطَكُمْ وَأَقْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿١٣٣﴾

”اے ایمان والو! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور عبادت کرو اپنے پروردگار کی اور (ہمیشہ) مفید کام کیا کرو تا کہ تم (دین و دنیا میں) کامیاب ہو جاؤ۔“

۱۔ مفہوم ہکام یہ ہے کہ اے اہل ایمان! نماز پڑھو۔ یہاں نماز کو رکوع اور سجود کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے اس لئے کہ یہ دونوں نماز کے لازمی رکن ہیں جن سے کبھی بھی نماز جدا نہیں ہو سکتی (یعنی ان کے بغیر نماز کا وجود باقی ہی نہیں رہتا) بخلاف دیگر ارکان کے کہ ان کی نوعیت ایسی نہیں۔ کیونکہ قرآن نماز کے لئے رکن تو ہے مگر گونگے آدمی سے ساقط ہو جاتی ہے۔ اسی طرح قیام رکن ہے مگر جو قیام کی طاقت نہ رکھتا ہو اس سے ساقط ہو جاتا ہے۔ رہے رکوع و سجود تو یہ دونوں امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کبھی بھی ساقط نہیں ہوتے۔ کیونکہ آپ یہ فرماتے ہیں کہ جو آدمی رکوع اور سجود کے لئے سر کے ساتھ اشارہ کرنے پر قادر نہ ہو تو اس سے نماز منوخر ہو جائے گی۔ وہ آبرو یا دل کے اشارے کے ساتھ نماز ادا نہیں کر سکتا۔

۲۔ اور تم اپنے پروردگار کی عبادت کرو ہر ایسے انداز سے جو اس کی عبادت ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو اور (ہمیشہ) مفید کام کیا کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ عمل خیر سے مراد صلہ رحمی کرنا اور ہر کام اخلاق کو اپنانا ہے (3)۔ ظاہر معنی یہ ہے کہ

لفظ خیر تمام نیک افعال کو شامل ہے، یعنی ہر وہ کام کرو جس میں نیکی اور بھلائی ہو اور وہ زیادہ مفید ہو چاہے اسے کرنا مفید ہو یا اسے چھوڑنا مفید ہو۔ (یعنی جو بھی نیکی کی اور نفع بخش صورت ہو وہی اپناؤ) تاکہ تم دین و دنیا میں کامیاب ہو جاؤ۔ ترکیب کلام میں نَفْعُكُمْ نَفْعُخَوْنِ کا بارہلہ حال ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہے۔ یعنی تم تمام نیک کام کرو اور آنحضالیہ تم کامیابی کی امید رکھتے ہو۔ مگر اپنے اعمال کے بارے میں یہ یقین رکھنا اور ان پر یہ اعتماد کرنا (کہ وہ بالیقین تمہیں کامیابی کی نعمت سے سرفراز کریں گے)

حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا انبیاء بنی اسرائیل میں سے کسی نبی کی جانب یہ وحی کی گئی کہ اپنی امت میں سے میری طاعت و فرمانبرداری کرنے والے لوگوں سے کہہ دو کہ وہ اپنے اعمال پر توکل اور بھروسہ نہ کریں کیونکہ قیامت کے دن جس بندے کو میں حساب و کتاب کے لئے کھڑا کروں گا اور اسے عذاب دینا چاہوں گا تو اسے ضرور عذاب دوں گا۔ اور اپنی امت میں میری نافرمانی اور گناہ کرنے والوں سے کہہ دو کہ وہ خود اپنے آپ کو بلاکت میں نہ ڈالیں کیونکہ میں بڑے بڑے گناہوں کو بخش دوں گا اور مجھے پرواہ تک نہ ہوگی۔ اسے ابو نعیم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ بزار نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضور نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ ہر آدمی کے لئے تین رجز نکال کر لائے جائیں گے ان میں سے ایک میں اس کے اعمال صالحہ ہوں گے ایک میں اس کے گناہ ہوں گے اور تیسرے میں وہ نعمتیں درج ہوں گی جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس بندے کو عطا کی گئیں۔ رجز میں درج نعمتوں میں سے سب سے چھوٹی نعمت کو اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ تو اعمال صالحہ میں سے اپنے مقابلے کا عمل لے لے۔ تو وہ ایک نعمت تمام اعمال صالحہ کو محیط ہو جائے گا۔ اور رب کریم کی بارگاہ میں عرض کتنا ہوگی تیری عزت کی قسم! میں نے تو اپنے مقابلہ میں تمام اعمال صالحہ کا احاطہ کر لیا ہے۔ اب گناہ باقی رہ گئے ہیں۔ تمام اعمال صالحہ تو ختم ہو چکے ہیں۔ تو جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر رحم کرنے کا ارادہ فرمائے گا تو فرمائے گا اسے میرے بندے! میں نے تیرے لئے تیری نیکیاں کئی گنا کر دی ہیں۔ تیرے گناہوں سے درگزر کر لی ہے اور تجھے اپنی نعمت عطا فرمادی ہے (۱)۔

مسئلہ: اس آیت طیبہ کی تلاوت کے وقت سجدہ تلاوت کے واجب ہونے میں علماء کا اختلاف ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور سفیان ثوری وغیرہ نے کہا ہے کہ اس مقام پر سجدہ تلاوت واجب نہیں ہے کیونکہ اس میں سجود سے مراد نماز کا سجدہ ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ سجدہ رکوع کے ساتھ متصل مذکور ہے۔ اور استقر اء اور نور و فکر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں بھی دونوں کا اس طرح متصل ذکر کیا گیا ہے وہاں سجدہ سے مراد نماز کا رکوع سجدہ ہے۔ جیسا کہ یہ آیت ہے وَاسْجُدْ سُّجُودًا رَاغِبًا لِّعَلَّكَ تَكْفُرُ (سجدہ کرو اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ) (تو چونکہ اس میں رکوع کے ساتھ سجدہ کا ذکر ہے اس لئے سجدہ سے مراد نماز کا سجدہ ہے)

ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور احناف رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے کہا ہے کہ آیت کی تلاوت کے وقت سجدہ تلاوت کرنا ضروری ہے اور یہ حدیث عقبہ بن عامر سے ثابت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی کیا سورہ حج کو اس میں دو سجدے ہونے کی وجہ سے فضیلت دی گئی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جی ہاں۔ اور جو یہ دو سجدے نہ کرے اسے چاہئے کہ وہ انکس نہ پڑھے۔ اسے احمد ابوداؤد ترمذی دارقطنی بیہقی اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کی

سند میں ایک راوی ابن لہیعہ ہے اور وہ ضعیف ہے۔ ترمذی نے کہا ہے کہ اس کی اسناد قوی نہیں ہے۔ ابن جوزی نے ذکر کیا ہے کہ ابن وہب نے کہا ہے ابن لہیعہ صدوق (سچ بولنے والا) راوی ہے مگر اسے قوت حفظ کے کمزور ہونے کی وجہ سے ضعیف کہا گیا ہے۔ حاکم کا قول ہے کہ عبد اللہ بن لہیعہ تو ایک امام ہے۔ وہ آخری عمر میں اختلاط میں مبتلا ہو گیا تھا (یعنی قوت حفظ کمزور ہو گئی تھی) اور اس حدیث کی روایت میں وہ منقرہ ہے (اس لئے یہ حدیث ضعیف ہے)

ابوداؤد نے مراسیل میں حضور نبی کریم ﷺ سے حدیث روایت کی ہے کہ سورہ حج کو دو ترجموں کے سبب فضیلت دی گئی ہے (1)۔ بعض نے اسے منسک کہا ہے مگر یہ کہنا صحیح نہیں ہے۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ قرآن کریم میں حضور نبی کریم ﷺ نے مجھے پندرہ آیات مجیدہ پڑھائیں ان میں سے تین مجیدے مفصلات میں ہیں اور سورہ حج میں دو جہدے ہیں (2)۔ اسے ابوداؤد ابن ماجہ دارقطنی اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ منذری رحمۃ اللہ علیہ اور نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حسن کہا ہے۔ عبدالحی اور ابن قطان نے اسے ضعیف کہا ہے۔ اس میں ایک راوی عبد اللہ بن شہین کلانی ہے اور وہ مجہول راوی ہے۔ اور اس سے روایت کرنے والا حارث بن سعید ثقفی مصری ہے اور وہ بھی معروف نہیں۔ ابن ماجہ نے کہا ہے کہ اس حدیث کے علاوہ اس سے کوئی حدیث مروی نہیں۔

حاکم نے عقبہ بن عامر کی حدیث کی تائید کے لئے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ یہ روایت صحیح ہے کیونکہ اس بارے میں حضرت عمر فاروق اعظم، حضرت ابن عمر، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت ابوالدرداء، حضرت ابویوسف اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اقوال بھی صحیح روایت سے موقوف فرمادی ہیں۔ اور علامہ تہذیبی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی خالد بن معدان کی مرسل روایت سے المرغف میں اس کی تائید ذکر کی ہے۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی یہی قول مروی ہے۔ (3) میں کہتا ہوں کہ اس باب میں موقوف روایت مرفوع کے حکم میں ہے (کیونکہ اس جہدہ کا دارودار صحابہ کرام کی روایات پر ہے اور اگر صحابہ کرام نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اس کے بارے میں نہ سنا ہوتا تو وہ خود اپنی طرف سے اسے بیان نہ کرتے) مجیدہ تلاوت کے تفصیلی احکام ہم نے سورہ الشقاق میں ذکر کئے ہیں۔

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ ۗ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۗ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ ۗ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلِ وَفِي هَذَا لِيَلْبِتُونَ
الرَّسُولَ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا
الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ ﴿٥١﴾

”اور (سرتوز) کوشش کرو اللہ تعالیٰ کی راہ میں۔ جس طرح کوشش کرنے کا حق ہے اس نے جن لیا ہے تمہیں (حق) کی پاسپائی اور اشاعت کے لئے)۔ حق اور نہیں روارنگی اس نے تم پر دین کے معاملہ میں کوئی گتھی بیدرو کر دی۔ اپنے باپ

1- سنن ابی داؤد، (مراتل) جلد 1، صفحہ 7 (وزارت تعلیم)

2- سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 562 (العلیہ)

3- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 133 (المنکر)

ابراہیم کے دین کی ہے اسی نے تمہارا نام مسلم (سراطعت خم کرنے والا) رکھا ہے اس سے پہلے اور اس قرآن میں بھی تمہارا یہی نام ہے۔ تاکہ ہو جائے رسول (کریم) گواہ تم پر اور تم گواہ ہو جاؤ لوگوں پر یسے پس (اسے دین حق کے علمبرداروں!) صحیح ادا کیا کرو نواز اور دیا کرو ذکوٰۃ اور مضبوط پکڑ لو اللہ تعالیٰ (کے دامن رحمت) کو۔ وہی تمہارا کارساز ہے۔ پس وہ بہترین کارساز ہے اور بہترین مددفرمانے والا ہے۔ ۱۹

۱۔ الجہد بالضم کا معنی وسعت اور طاقت ہے اور الجہد بالفتح کا معنی مشقت ہے۔ بعض نے کہا ہے اس کا معنی ہے بہت زیادہ اور حد درجے کوشش کرنا۔ بعض نے کہا ہے ان دونوں لغتوں کے مطابق اس کا معنی وسعت اور طاقت ہے لیکن جب اس کا معنی مشقت اور سر توڑ کوشش ہو تو پھر اس کا تلفظ الجہد بالفتح ہی ہوگا۔ جہاد اور مجاہدہ (باب مفاعله) اسی سے ماخوذ ہیں۔ (یعنی طرفین سے حد درجہ کوشش کرنا اور مشقت اٹھانا) کیونکہ باب مفاعله کا خاصہ اشتراک ہے۔ اور دشمن کے ساتھ جنگ کرنے کے دوران ایسا ہی ہوتا ہے کیونکہ اس میں دوفریق مشقت اٹھاتے ہیں قول فعل کے اعتبار سے پوری وسعت اور طاقت خرچ کر دیتے ہیں اور سر توڑ کوشش کرتے ہیں۔ فی اللہ سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کے راستے میں اس کے دین کی سربلندی اور اس کے احکام کو ادا کرنے کی خاطر۔ بعض نے کہا ہے اس کا معنی ہے خالص اللہ تعالیٰ کے لئے۔

۲۔ حق جہاد۔ مصدر بیت کی (مفعول مطلق کی) بنا پر منصوب ہے۔ معنی یہ ہے تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرو ایسا جہاد جس میں خالص حق ہو۔ یعنی وہ جہاد حق ہو اور خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر ہو۔ حق کی اضافت جہاد کی طرف اظہار مبالغہ کے لئے کی گئی ہے جیسے تیرا یہ قول ہے حق غلبہ اور جہاد کی اضافت ضمیر کی طرف اظہار وسعت کے لئے ہے یا یہ منصوب ہے اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کیا جائے۔ اسی وجہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ جہاد کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کے راستے میں پوری طاقت صرف کر دینا اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوفزدہ نہ ہونا یہی جہاد کا حق ہے (۱)۔ ضحاک اور مقاتل نے کہا ہے کہ حق جہاد کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کے لئے عمل کرو جیسے عمل کا حق ہے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو جیسے عبادت کرنے کا حق ہے۔

۳۔ کفر مفسرین نے کہا ہے کہ حق الجہاد کا معنی ہے نیت کا خالص اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے ہونا۔ سدی نے کہا ہے اس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کی جائے اور اس کی نافرمانی نہ کی جائے۔ عبد اللہ بن مبارک نے کہا ہے کہ نفس اور خواہش نفسانی کے خلاف جہاد کرنا جہاد اکبر ہے اور وہی حق الجہاد ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب غزوہ تبوک سے واپس تشریف لائے تو فرمایا جعتان الجہاد الا صغر الی الجہاد الا کبر۔ ہم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹ آتے ہیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی جہاد اصغر سے مراد کفار کے ساتھ جہاد کرنا ہے اور جہاد اکبر سے مراد نفس کے ساتھ جہاد کرنا ہے (۲)۔

علامہ تیبلی نے الزہد میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ نماز یوں کی ایک جماعت رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی تو آپ ﷺ نے انہیں ارشاد فرمایا تم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف آگئے۔ آپ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی

گئی جہاد اکبر کونسا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا بندے کا اپنی خواہش نفسانی کے ساتھ جہاد کرنا۔ (۱) علامہ شبلی نے کہا ہے اس حدیث کی اسناد میں ضعف ہے۔

میں کہتا ہوں اس آیت طیبہ میں جہاد سے مراد صرف کفار کے ساتھ جنگ کرنا نہیں کیونکہ سیاق آیت اس کا انکار کرتا ہے کیونکہ آپ کی تربیت میں ہر عطف کے ساتھ انھیں سے اہم کی طرف ارتقا ہے۔ اس طرح کے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد میں از کفوف و انسجذوا میں نماز کا ذکر فرمایا۔ کیونکہ نماز تمام عبادات میں اہم ترین عبادت ہے۔ پھر اس پر عطف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا و العبدوا ان نیکم۔ یہ ارشاد نماز اور دیگر تمام عبادات کو بھی شامل ہے۔ پھر ارشاد فرمایا و افعلوا الخیر۔ یہ ارشاد تمام حقوق اللہ مثلاً عبادات عقوبات اور کفار کے ساتھ جنگ کرنے وغیرہ تمام حقوق العباد اور کارم اخلاق وغیرہ اور تمام مستحبات اور سنن ادا کرنے کو بھی شامل ہے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا و یاخذوا فی اللہ حق جہادہ لہذا اس ارشاد کو صرف کفار کے ساتھ جنگ کرنے پر محمول کرنے کی کوئی وجہ اور سبب موجود نہیں بلکہ اس سے مراد تمام اقوال و اعمال اور احوال میں اخلاص کا ہونا ہے اور یہ اخلاص نفس کے ساتھ جہاد کرنے اور خواہش نفس کی مخالفت کرنے سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ اخلاص صفا قلب اور فنا نفس سے حاصل ہوتا ہے اور یہ دونوں چیزیں مشکوٰۃ نبوت سے انوار (و تجلیات) کے حصول کے ساتھ ساتھ برائی پر ابراحتہ کرنے والے نفس امارہ کے ساتھ جہاد کرنے اور خواہش نفس کی مخالفت کرنے سے حاصل ہوتی ہیں۔ ایک گروہ کی اصطلاح میں اسے ہی سلوک اور جذب کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور متقدمین مفسرین کے اقوال میں اسی مفہوم کو اخلاص کا نام دیا گیا ہے کیونکہ فنا، نفس اور صفا قلب کے سبب جب صوفی تخلصین میں شمار ہو جاتا ہے تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوفزدہ نہیں ہوتا اور وہ ریا کاری اور حصول شہرت کی نیت کے بغیر خالص اللہ تعالیٰ کی رضا چاہنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی عبادت ایسے کرتا ہے جیسے اس کی عبادت کا حق ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کرتا ہے اور مصیبت و نا فرمانی کا ارتکاب نہیں کرتا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہی جہاد اکبر ہے۔ لیکن جہاد اصغر یعنی کفار کے ساتھ جنگ لڑنا یہ تو فقط جہاد کی ایک صورت ہے یہ اور دیگر عبادات میں سے کوئی بھی جو خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے نہ ہو۔ اس کا کوئی اعتبار نہیں وہ بیکار ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اعمال کا ادراہ ارتقوت پر ہے۔ آدمی کے لئے وہی کچھ ہے جو اس نے نیت کی پس جس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کریم ﷺ کے لئے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے لئے ہی ہے اور جس نے دنیا کے لئے ہجرت کی کہ وہ اسے پالے گا کسی عورت کے لئے ہجرت کی کہ وہ اس سے نکاح کرے گا تو اس کی ہجرت اسی کے لئے ہے جس کی طرف اس نے ہجرت کی۔ یہ حدیث حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے اور متفق علیہ ہے (2)۔

رسول اللہ ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے میں تمام شرکاء کی نسبت شرک سے زیادہ غمی اور بے نیاز ہوں۔ پس جس کسی نے کوئی (نیک) کام کیا اور اس میں میرے ساتھ کسی غیر کو بھی شریک ٹھہرا لیا تو میں اس کے عمل سے بری ہوں (یعنی اس کے عمل کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں) اور اس کا عمل اسی کے لئے ہوگا جس کیلئے اس نے کیا۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

فائدہ: حضور نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد کہ تم جہاد اکبر کی طرف آئے ہو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاد اکبر یعنی نفس کے خلاف جہاد

کرنا شیخ کامل و مکمل کی محبت سے مرید کو حاصل ہوتا ہے کیونکہ وہ جب کفار کے ساتھ جنگ لڑنے کے بعد حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو انہیں آپ ﷺ کی صحبت نصیب ہوئی اور ان پر انوار نبوت کی شعاؤں کا گیس پڑا تو اس کی برکت سے ان کے دل صاف اور طیب و طاہر ہوئے اور ساتھ ہی نفس کی نفسانیت فنا ہو گئی۔

آپ ﷺ کا ارشاد کہ ہم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹے ہیں میں وجعنا صینہ جمع منکلم ہے۔ اور اس کی نسبت آپ ﷺ اور آپ کے ساتھ موجود تمام صحابہ کرام کی طرف ہے کیونکہ وہ تمام کفار کے ساتھ جنگ میں مشغول ہونے کے وقت حالت جہاد میں تھے، وہ اگرچہ حضور ﷺ کے ساتھ آپ کی مصاحبت میں تھے۔ لیکن ان کی تمام ہمتیں اور قوتیں کفار کے ساتھ لڑنے اور ان کی مداخلت میں خرچ ہو رہی تھیں۔ پھر جب وہ مدینہ طیبہ پہنچ کر حضور نبی کریم ﷺ کی معیت میں مقیم ہو گئے تو پھر ان کی تمام تر ہمتیں انوار نبوت سے فیض یاب ہوئے آپ کے آثار و سنن پر عمل پیرا ہونے اور آپ ﷺ کی جناب خاص سے علوم ظاہرہ اور باطنہ اخذ کرنے میں صرف ہونے لگیں (اور یہی جہاد اکبر ہے)

یعنی اس نے تمہیں ساری مخلوق سے اپنے نبی مکرم اور حبیب معظم ﷺ کی مصاحبت کے لئے جن لیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بیٹک اللہ تعالیٰ نے (ساری مخلوق سے) مجھے جن لیا ہے اور پھر میرے لئے صحابہ کرام کو جن لیا ہے۔ اور پھر ان میں سے میرے لئے سسرالی رشتہ دار اور انصار و مددگار منتخب فرمادیئے ہیں (1)۔ واہلہ بن اسحق سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے۔ بیٹک اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے بنی کنانہ کو چاہا ہے بنی کنانہ میں سے قریش کو منتخب فرمایا ہے اور قریش میں سے بنی ہاشم کو منتخب فرمایا ہے اور بنی ہاشم میں سے مجھے جن لیا ہے (2)۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے اور ترمذی کی روایت میں اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے بنی کنانہ کو جن لیا ہے (3)۔

یہ اور اس نے تم پر دین کے معاملہ میں کوئی تنگی روا نہیں رکھی۔ حرج سے مراد تنگی اور تکلیف ہے جس کے ساتھ حکم کی تعمیل تم پر سخت اور مشکل ہو جائے گی۔ بعض نے اس کا معنی یہ کیا ہے کہ بندہ مومن کسی گناہ میں بھی مبتلا نہیں ہوتا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے اس سے نکلنے کی راہ اور ذریعہ بنا دیا ہے۔ بعض گناہوں کے لئے توبہ ہے، بعض کے لئے قصاص اور دنیوی سزا ہے اور بعض کے لئے مختلف انواع کے کفارات ہیں۔ مختصر دین اسلام میں کوئی ایسا گناہ اور غلطی نہیں جس کی سزا سے خلاصی اور نجات حاصل کرنے کا بندہ کے پاس کوئی راستہ نہ ہو (4)۔ جبکہ سابقہ امتوں میں بعض ایسے گناہ تھے جن کے لئے توبہ کا کوئی تصور نہیں تھا۔

بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے تمہارے فراموشی کی ادا سبکی کے اوقات میں تم پر کوئی تنگی اور اشتباہ نہیں رکھا مثلاً رمضان المبارک کے مہینے کا چاند بظلال عید الفطر اور حج کے اوقات وغیرہ۔ جب تم پر ان کا معاملہ مشتبہ ہو جائے تو تمہارے لئے یقین حاصل ہونے تک وسعت اور تمکین ہے۔

مقابل نے کہا ہے کہ اس سے مراد عند الضرورت حاصل ہونے والی رخصتیں ہیں۔ مثلاً سفر میں نماز کا قصر ہونا، حیم کی اجازت ہونا حالت سفر اور مرض میں روزہ و افطار کرنے کی رخصت، عدا حاجت مراد رکھانے کی رخصت، کھڑے ہو کر نماز پڑھنے سے عاجز ہونے کی

1- کنز العمال، جلد 11، صفحہ 540 (الترغیب العربی)

2- صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 245 (تذہبی)

4- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 135 (الکر)

3- جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 201 (قاری)

صورت میں پیشہ کر یا چت لیت کر نماز ادا کرنے کی رخصت وغیرہ۔ یہی بھی کا قول بھی ہے (1) اور یہی معنی حضور نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کا ہے کہ جب میں تمہیں کسی کام کا حکم دوں تو تم اسے بجا لاؤ یعنی تم طاعت رکھتے ہو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ قول مروی ہے کہ تنگی نہ ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ بار اور شدت جو بنی اسرائیل پر تھی اللہ تعالیٰ نے اسے اس امت سے دو فرما دیا (2)۔

میں کہتا ہوں کہ قول باری تعالیٰ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ کا یہ معنی بھی کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے احکام شریعہ کی تکلیف کو تم سے اٹھالیا یہاں تک کہ احکام شریعہ کی پابندی تمہارے نزدیک مرغوبات طبعیہ کی نسبت زیادہ پسندیدہ اور مرغوب فیہ بن گئی۔ اور یہ اجتہاد کے لوازم میں سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میری آنکھوں کی خشک نماز میں ہے (3)۔ اسے احمد نسائی حاکم اور بیہقی نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

یہ ملتة ابيکم اغراء کی بناء پر منصوب ہے یعنی علیکم ملتة ابيکم ابراهيم۔ تم پر اپنے باپ ابراہیم کے دین کی پیروی لازم ہے۔ یا یہ اختصاص کی بناء پر منصوب ہے یعنی اعنی بالدين ملتة ابيکم۔ دین سے میری مراد تمہارے باپ ابراہیم کا دین ہے یا پھر اسے فعل کا مصدر ہونے کی بناء پر جہی پر ما قبل جملہ کا مضمون دلالت کرتا ہے اور پھر کلام سے مصدر مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے یعنی واسع دینکم توسعة ملتة ابيکم۔ (یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے دین کو تمہارے باپ کے دین کی وسعت عطا کر دی ہے)

بجز اہل بیت کی ترکیب کلام میں عطف بیان ہے۔ چونکہ یہ صورت کلی ہے، اس لئے ظاہر مفہوم یہی ہے کہ یہ خطاب قریش میں سے اہل ایمان کو ہے اور دوسرے لوگوں کو قریش کی تبع میں یہ خطاب ہے۔ (کیونکہ کثیر ایسے لوگ تھے جن کے نسبی مورث اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام نہیں تھے) حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اس معاملہ میں لوگ قریش کے تابع ہیں۔ مسلمان قریش میں سے اہل اسلام کے تابع ہیں اور کافران میں سے کفار کے تابع ہیں۔ یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے اور متفق علیہ ہے (4)۔ مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس طرح روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا لوگ خیر و شر میں قریش کے تابع ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ خطاب اہل عرب کو ہے کیونکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ خطاب تمام مسلمانوں کو ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کے جد اعلیٰ تھے اور آپ ﷺ اپنی امت کے لئے باپ کی طرح ہیں۔ کیونکہ حضور نبی رحمت ﷺ ہی لوگوں کے لئے حیاتِ سرمدی اور ان کے لئے ایسے وجود کا سبب ہیں جو آخرت میں قابل اعتبار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ وَآزَوٰجُهُمْ۔ (حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات مومنوں کی مائیں ہیں) حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک میں تمہارے لئے والد کے قائم مقام ہوں۔ میں تمہیں تعلیم دیتا ہوں کہ جب تم میں سے کوئی بیت الخلاء میں داخل ہو تو قبلہ شریف کی طرف منہ کرے، نہ پیچھے اور نہ ہی اپنے دائیں ہاتھ سے نجاست صاف کرے (5)۔ اسے احمد ابوداؤد نسائی ابن ماجہ اور ابن حبان نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔

چونکہ اہل مکہ کے لئے دین ابراہیمی ہی پسندیدہ اور مرغوب فیہ دین تھا چاہے وہ مکہ مکرمہ کے مومنین ہوں یا کفار لہذا کفار اپنے

3۔ منہ احمد، جلد 3، صفحہ 128 (صادر)

1۔ تفسیر لغوی، جلد 4، صفحہ 135 (الکر)

2۔ ایضا

5۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 3 (وزارت تعلیم)

4۔ صحیح بخاری، 1288: (ابن کثیر)

ہارے میں یہ گمان کرتے تھے کہ وہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہیں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں مستبہ فرمایا کہ دین محمد ﷺ ہی درحقیقت دین ابراہیمی ہے۔ علاوہ ازیں کوئی دین بھی دین ابراہیمی نہیں (لہذا مومنین دین ابراہیمی کے مطابق عمل پیرا ہیں) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّ اَوَّلَ النَّاسِ بِاِيْهِمْ لَدُنِّيْٓ اَفْضَلُ وَوَهَّابُ الَّذِيْ يُّؤْتِيْكَ الْوَسِيْلَةَ وَالَّذِيْ يُّنْفِثُ فِيْ الْعَمَلُوْنَ (جبکہ ابراہیم علیہ السلام سے سب سے زیادہ قربی تعلق رکھنے والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کی پیروی کی اور وہ لوگ جو ایمان لے آئے)

یہ اسی نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے اس سے پہلے اور اس قرآن میں بھی تمہارا یہی نام ہے۔ نحو سے مراد اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ذات اقدس ہے۔ اور مِنْ قَبْلِيْ سے مراد ہے قرآن کریم نازل ہونے سے قبل نازل ہونے والی سابقہ کتابیں۔ ابن زید نے کہا ہے کہ نحو سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس دور سے قبل اپنے زمانے میں تمہارا نام مسلم رکھا جبکہ انہوں نے رب کریم کی بارگاہ میں اٹھا کر تے ہوئے یہ عرض کی تھی رَبَّنَا وَاَجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ۔ (اے ہمارے رب! بنادے ہم کو فرما نبی اور اپنا اور ہماری اولاد سے بھی ایک ایسی جماعت پیدا کرنا جو تیری فرمانبردار ہو ۱۱۱) یعنی اہل مکہ کو امت مسلمہ بنادے اگرچہ قرآن کریم میں اہل مکہ کا نام مسلم حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نہیں رکھا لیکن چونکہ اس سے قبل آپ نے ہی انہیں مسلمان کہا تھا ہی سب سے قرآن میں بھی انہیں مسلمان کہا گیا۔

بعض نے کہا ہے کہ تقدیر کلام اس طرح ہے وَفِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ بَيٰٰنٌ مِّنْ سُنْبُوْٓهٖ اِيَّاكُمْ مُّسْلِمِيْنَ۔ کہ اس سے قبل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تمہارا نام مسلم رکھا اور اس قرآن میں تمہارا نام مسلم رکھنے کا بیان ہے۔ اور ترکیب کلام میں یہ جملہ قول باری تعالیٰ هُوَ اَجْتَبَاكُمْ كَمَا بَيٰٰن ہے کیونکہ اسلام حقیقی کی طرف رہنمائی کرنے اور مسلمان نام رکھنے کا انحصار اور درمادار ای پر ہے کہ اس نے تمہیں چن لیا ہے۔

یہ لِيَكُوْنُ الرَّسُوْلُ۔ هُوَ سَمَّكُمْ الْمُسْلِمِيْنَ کے مضمون کے متعلق ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں دولت اسلام سے نوازا اور تمہیں مسلمان بنایا تاکہ قیامت کے دن رسول کریم تم پر گواہ ہو جائے کہ اس نے تم تک اسلام کا پیغام پہنچا دیا۔ اور تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ کہ ان کے رسولوں نے ان تک اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا تھا (2)۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بھی جائز ہے کہ لِيَكُوْنُ الرَّسُوْلُ قول باری تعالیٰ اِذْ سَخُوْا وَاَسْخَذُوْا اور ان کے معطوفات کے متعلق ہو۔ ابن جریر اور ابن مندہ نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا میں اور میری امت قیامت کے دن بلند جگہ پر قیام پزیر ہوں گے اور ساری مخلوق کو اوپر سے دیکھ رہے ہوں گے اور ہر آدمی کی یہ خواہش ہوگی کہ وہ ہم میں سے ہو جائے (یعنی ہمارے پاس بلند مقام پر آ جائے) اور کوئی ایسا نبی نہیں ہوگا جس کی تکذیب اس کی قوم نے کی ہو اور پھر ہم شہادت دیں گے کہ اس (نبی) نے اپنے رب کا پیغام اپنی امت تک پہنچا دیا تھا۔

ابن مبارک نے الزہد میں ذکر کیا ہے کہ رشد بن سعد نے اپنے چچا کے بیٹے کی جانب سے ہمیں یہ خبر دی ہے کہ ابوجہلہ نے اپنی سند سے یہ روایت بیان کی ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے حضرت اسرافیل علیہ السلام کو بلا یا جائیگا اور اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا کیا تم نے میرا پیغام پہنچا دیا تھا؟ تو وہ عرض کریں گے جی ہاں! میں نے حضرت جبرئیل علیہ السلام تک پہنچا دیا تھا۔ پھر جبرئیل علیہ السلام کو بلا یا جائیگا اور ان سے پوچھا جائیگا کیا اسرافیل علیہ السلام نے تم تک میرا پیغام پہنچا دیا تھا؟ تو وہ عرض کریں گے جی ہاں! میں اس طرح

حضرت اسرافیل علیہ السلام کو فارغ کر دیا جائے گا۔ پھر رب کریم حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرمائے گا تو نے میرے پیغام کے بارے کیا کیا؟ تو وہ عرض کریں گے اے میرے پروردگار! میں نے وہ رسل علیہم السلام تک پہنچا دیا تھا۔ پھر رسولوں کو بلا دیا جائے گا اور ان سے پوچھا جائے گا کیا تم تک جبرئیل علیہ السلام نے پیغام پہنچا دیا تھا؟ تو وہ عرض کریں گے جی ہاں۔ پھر ان سے پوچھا جائے گا تو پھر تم نے اس کے بارے کیا کیا؟ تو وہ عرض کناں ہو گئے ہم نے وہ پیغام اپنی اپنی امتوں تک پہنچا دیا۔ پھر تمام امتوں کو بلا دیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کیا رسولوں نے تم تک میرا پیغام پہنچا دیا تھا؟ تو ان میں سے بعض رسل علیہم السلام کی تکذیب کریں گے اور بعض تصدیق کریں گے۔ پھر رسول عرض کریں گے ہمارے پاس ان کے خلاف گواہ موجود ہیں۔ رب کریم فرمائے گا وہ کون ہیں؟ تو وہ عرض کریں گے امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔ چنانچہ آپ ﷺ کی امت کو طلب کیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کیا تم شہادت دیتے ہو کہ رسل عظیم السلام نے اپنی امت تک میرا پیغام پہنچا دیا تھا؟ تو وہ عرض کریں گے جی ہاں۔ تو اس پر ساقی امتیں یہ عرض کریں گی اے ہمارے رب! وہ لوگ ہمارے خلاف کیسے شہادت دے سکتے ہیں جنہوں نے ہمارا زمانہ پایا ہی نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ اس امت سے ارشاد فرمائے گا تم کیسے ان کے خلاف شہادت دیتے ہو حالانکہ تم نے ان کا زمانہ پایا ہی نہیں؟ تو اس امت کے افراد عرض کریں گے اے ہمارے پروردگار! تو نے ہماری طرف ایک شان والا رسول مبعوث فرمایا تھا اور ہم پر ایک عظمت والی کتاب (قرآن کریم) نازل فرمائی تھی اور اس کتاب میں تو نے ہمیں اس پر مطلع کیا تھا کہ انبیاء علیہم السلام نے اپنی اپنی امتوں تک پیغام خداوندی پہنچایا ہے۔ پس اسی شی کا بیان اس ارشاد فرامی میں ہے وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ اللَّهُمُّ لَكُمْ شَهِيدًا (۱)۔ ہم نے اسی آیت طیبہ کی تفسیر میں سورہ بقرہ میں وہ حدیث طیبہ بھی ذکر کر دی ہے جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے۔

۵۔ (اے دین حق کے علمبردارو!) نماز قائم کرو، یعنی اس پر دوام اختیار کرو اور زکوٰۃ دو یعنی مختلف انواع کی طاقتوں اور عبادتوں سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرو کیونکہ اس نے تمہیں اس فضل و شرف کے لئے منتخب کر دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے دامن رحمت کو مضبوط پکڑ لو یعنی اپنے تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ اور اعتماد رکھو اور ہر کام میں اسی سے مدد طلب کرو۔
حسن نے کہا فَاغْتَصِمُوا بِاللَّهِ كَمَا مَعْنَى بے تم اللہ تعالیٰ کے دین کو مضبوطی سے تھام لو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے تم اپنے رب سے مانگو تمہیں تمام ناپسندیدہ اور گمراہ چیزوں سے محفوظ رکھے گا۔ بعض نے کہا اس کا معنی ہے تم اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو کہ وہ تمہیں اپنے دین پر ثابت اور استقامت عطا فرمائے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ احتسام باللہ سے مراد کتاب و سنت کو مضبوطی سے تھامنا ہے (۲) کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں جب تک تم نے ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رکھا تم ہرگز گمراہ نہیں ہو گے۔ اور وہ ہیں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ۔
اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں مرسل روایت کیا ہے۔ (۳)

عصیف بن حارث یمانی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کسی قوم نے (اپنے دین میں) کسی بدعت (نئی شئی) کا آغاز نہیں کیا مگر اس کی مثل اتنی مقدار سنت اٹھائی گئی۔ (یعنی بدعت پر عمل پیرا ہونے کے سبب سنت پر عمل چھوڑ دیا گیا) پس

سنت پر مضبوطی سے عمل کرنا بدعت پر عمل کرنے سے بہتر ہے۔ (رواد احمد ۱)۔

۳۔ وہی تمہارا کارساز ہے اور وہی تمہارا مددگار اور محافظ ہے اور تمہارے تمام تر امور کا والی ہے۔ جو مولکم کا جملہ واعتموما باللہ کی علت بیان کر رہا ہے۔ پس وہ بہترین کارساز ہے اور بہترین مدد فرمانے والا ہے۔ فَتَنْعَمُ الْمَوْلَىٰ فِيهِ فَأَسْوِيَةٌ لَّهُ جِبِ يَ ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ہی تمہارا کارساز اور تمہارا مددگار ہے تو وہی سب سے اچھا تمہارا کارساز اور تمہارا مددگار ہے۔ کیونکہ ولایت اور معاونت میں کسی شغل کوئی نہیں۔ بلکہ فی الحقیقت اس کے سوا کوئی کارساز اور مددگار ہی نہیں۔ واللہ اعلم۔
الحمد لله سورة حج کی تفسیر 15 ذی الحجہ 1203ھ کو ختم ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے فضل و احسان سے 16 شعبان المعظم 1421ھ بمطابق 13 نومبر 2000ء بروز پیر رات 9 بجے تک 40 منٹ پر سورۃ حج کا ترجمہ انتہائی پزیر ہوا۔ الحمد لله علی ذالک۔ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ خیر خلقہ سیدنا و مولینا محمد والہ واصحابہ اجمعین۔

بالکل نہ ہو۔ نہ قبر میں نہ حساب میں مناقشہ کے سبب نہ یوم قیامت کی سختیوں کے سبب نہ جہنم میں دخول کے سبب اور نہ ہی اہل صراط سے گزرنے کی صعوبت اور مشکل کے سبب۔ اس کے ساتھ ساتھ جنت میں اعلیٰ مقاصد اور مراتب قرب حاصل ہوں۔ دیدار الہی کی سعادت نصیب ہو اور رب کائنات کی رضا اور خوشنودی مقدر بن جائے۔

ہر مطلق کامیابی تو وہ صرف ان لوگوں کے ساتھ مختص نہیں جو ان آیات طہیات میں مذکور صفات سے متصف ہیں۔ بلکہ وہ تو ہر اس آدمی کے لئے ہے جس نے لا الہ الا اللہ پڑھ لیا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے قَتْنٌ يَّعْمَلُ شُقْبَالَ ذَرَّتْ وَ حَبِّهٖ اَيُّوۡاۡ۔ (پس جس نے ذرہ برابر بھی خشکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا) اور ایمان اور توحید تو تمام اعمال خیر کی اصل اور سرخیل ہیں۔ اسی وجہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا تو حید کی تصدیق کرنے والے سعادت مند اور خوش بخت ہیں وہ (ہمیشہ) جنت میں باقی رہیں گے (۱)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مرفوع روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت عدن کو پیدا فرمایا اور اس میں اس کے درختوں کے پھل لٹکا دیئے اور اس میں نہریں جاری کر دیں پھر اس کی طرف دیکھا اور فرمایا کلام کہ تو جنت ہے کہہا قَدْ اَفْتَحْتَ الْمُوْجُوْثُوْنَ۔ رب کریم نے فرمایا مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم تجھ میں کوئی پھل میرے قریب بھی نہیں آئے گا۔ اسے طہرانی نے روایت کیا ہے (۲)۔ میں کہتا ہوں کہ شاید یہاں پھل سے مراد کافر ہے، کیونکہ وہ توحید کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرنے سے نکل کرتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ہی طہرانی نے ایک روایت اور جید سند کے ساتھ نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے جنت عدن کو پیدا فرمایا تو اس میں ایسی ایسی نعمتوں کو پیدا فرمایا جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں ان کا خیال تک آیا۔ پھر اسے ارشاد فرمایا تو گفتگو کہ تو جنت ہے کہہا قَدْ اَفْتَحْتَ الْمُوْجُوْثُوْنَ (۳) اور طہرانی اور بیہقی نے بھی اسی طرح اسی مرفوع روایت حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کی ہے۔ اسی طرح ایک روایت بیہقی نے مجاہد اور کعب سے نقل کی ہے اور حاکم نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت بیان کی ہے۔ ابن ابی الدنیانے جنت کی صفات کے بارے میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے جنت عدن کو سفید موتیوں اور سرخ یاقوت اور بیز زمردی اینٹوں سے بنایا ہے۔ اس کا لپ کستوری کا ہے۔ اس کی کھاس زعفران ہے اس کے ٹنگر بڑے موتی ہیں اور اس کی مٹی نمبر ہے۔ پھر اسے فرمایا تو بول۔ تو اس نے کہہا قَدْ اَفْتَحْتَ الْمُوْجُوْثُوْنَ رب کریم نے فرمایا میری عزت کی قسم تجھ میں کوئی پھل میرے قریب نہیں آئے گا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ فلاح سے مراد مطلقاً جنت میں داخل ہونا اگرچہ عذاب دیئے جانے کے بعد ہی ہو۔ اور یہ فلاح تمام اہل ایمان کے لئے ہے جیسا کہ مذکورہ احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں۔ قرآن کریم میں فلاح کے لئے مذکورہ صفات کی قید لگانا احتراز کے لئے نہیں بلکہ مدح اور تعریف کے لئے ہے، کیونکہ بندۂ مومن کی شان یہ ہے کہ وہ اس کے لئے ان صفات سے متصف ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ اور اگر فلاح سے مراد فلاح کامل ہو اور مذکورہ صفات کی قید برائے احتراز ہو تو پھر یہ آیات اس معنی پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کامل فلاح کا وعدہ ان کامل مومنین کے ساتھ کیا ہے جو ان آیات طہیات میں مذکورہ صفات سے متصف ہیں، لیکن اس معنی پر قطعاً دلالت نہیں کرتیں کہ ان کے سوا دراصل ایمان قطعاً فلاح نہیں پائیں گے۔ کیونکہ ہم مفہوم مخالف کے قائل

نہیں چاہے وہ صفت کی قید سے پیدا ہو یا شرط کے ذکر سے۔ جیسا کہ اصول فقہ میں سے اسے تحقیقاً لکھ دیا گیا ہے کہ شرط یا صفت کی تشبیہ اس شئی کو مسکوت عنہ کے حکم میں کر دیتی ہے جس میں وہ شرط یا صفت نہ پائی جائے اور احتراز سے یہی مراد ہے۔ نئی حکم کے سبب وہ اسے منطوق کے حکم میں نہیں کرتی۔ (یعنی جس میں وہ شرط اور صفت نہیں پائی جائے گی اس کے بارے مطلقاً خاموشی ہوگی، یعنی نہ تو اس کے لئے حکم ثابت ہوگا اور نہ اس کے حکم کی نفی ہوگی)۔ اور اس پر اجماع متفقہ ہو چکا ہے کہ اگر مومنین میں سے گناہ کبیرہ کے مرتکب بغیر توبہ کے مر جائیں گے تو بالآخر ان کا انجام بھی جنت ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تحت ہوں گے اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو انہیں عذاب دے دے پھر انہیں جنت میں داخل کر دے۔ اور اگر چاہے تو بغیر عذاب دینے ان کی مغفرت فرما دے۔

ع۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا غاشغون سے مراد عاجزی کرنے والے اور اپنے آپ کو انتہائی حقیر اور عاجز جاننے والے لوگ ہیں۔ حسن نے کہا ہے غاشغون سے مراد ڈرنے والے لوگ ہیں۔ مقاتل نے کہا ہے اس کا معنی تو اضع کرنے والے ہیں۔ مجاہد نے کہا ہے اس سے مراد آنکھوں کو جھکانے اور آواز کو پست کرنے والے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد فرمایا اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو دائیں بائیں متوجہ نہ ہوں۔ حضرت سعید بن جبیر کا قول ہے ایسا آدمی جو اپنے دائیں بائیں کھڑا ہونے والے کی پہچان نہ کر سکے اور اللہ تعالیٰ کے لئے خشوع کے سبب وہ کسی جانب بھی متوجہ نہ ہو (1)۔

حضرت عمرو بن دینار کا قول ہے کہ خشوع سے مراد سکون اور حسن ہیئت ہے۔ اور علماء کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ خشوع سے مراد یہ ہے کہ تیری آنکھ اپنی عبادت گاہ سے نہ اٹھے۔ حضرت عطاء نے کہا کہ اس کا معنی ہے تو نماز کے دوران اپنے جسمانی اعضاء میں سے کسی سے نہ کھیلے۔

بعض نے کہا ہے کہ نماز میں خشوع سے مراد یہ ہے کہ اپنی تمام تہمت اور توجہ کو نماز میں مرکوز کر دینا اور اس کے سوا ہر شئی سے مکمل اعراض کر لینا اور قرآن کریم کی قرأت اور ذکر الہی میں سے جو الفاظ زبان پر ہوں ان میں غور و فکر اور تہ بکرنا (2)۔ اپنی توجہ نماز سے باہر نہ جانے دے اور ہر اور متوجہ نہ ہونے نماز سے غائب ہونے کسی اور جانب مائل ہونے اپنی انگلیوں کے چٹخارے نکالنے نہ نگرینوں کو الٹ پلٹ کرے اور نہ ہی نماز میں کسی فعل مکروہ کا ارتکاب کرے۔

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ خشوع کا معنی قول میں اخلاص کا ہونا، تقییم کے ساتھ کھڑا ہونا، کامل یقین ہونا اور کامل توجہ اور یکسوئی کا ہونا ہے۔

قاموس میں ہے کہ خشوع سے مراد خضوع ہے، یعنی تواضع اور انکساری کرنا۔ یا خشوع معنوی اعتبار سے خضوع کے قریب ہے یا خضوع بدن میں ہوتا ہے اور خشوع آواز اور آنکھ میں ہوتا ہے نیز اس سے مراد سکون اور عاجزی کا اظہار ہے (3)۔

نہایت میں ہے کہ خشوع کا تعلق آواز اور آنکھ سے ہے جیسا کہ خضوع کا تعلق بدن سے ہوتا ہے (4)۔

حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ مسلسل بندے کی طرف متوجہ رہتا ہے جب تک بندہ اپنی نماز میں ادھر ادھر نہیں ہوتا اور جب بندے کی توجہ نماز سے ہٹ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے اعراض فرما لیتا ہے (5)۔ اسے احمد ابوداؤد نسائی اور دارمی نے روایت کیا ہے۔

1- تفسیر ابن کثیر، جلد 4، صفحہ 137 (القول)
2- ایضاً صفحہ 138
3- القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 958 (اتر العربی)
4- التنبیہ، جلد 2، صفحہ 34 (بیروت)
5- سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 131 (وزارت تعلیم)

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے نماز میں التفات کے بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس سے مراد جھپٹا مار کر کسی شئی کو چھین لینا ہے۔ شیطان بندے کی نماز اس طرح چھین لیتا ہے۔ متفق علیہ (1)۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا ہے لوگوں کو کہ وہ نماز کے دوران اپنی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھا لیتے ہیں؟ آپ ﷺ کا ارشاد اس بارے میں اتنا شدید اور سخت تھا کہ آپ ﷺ نے فرمایا لوگوں کو چاہئے کہ وہ ایسا کرنے سے رک جائیں یا پھر ان کی آنکھیں اچک لی جائیں گی رواہ ابوی۔ مسلم اور نسائی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں کو چاہئے کہ وہ نماز میں دعا کے وقت اپنی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھانے سے باز آجائیں یا پھر ان کی آنکھیں اچک لی جائیں گی (2)۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس طرح روایت ہے کہ لوگوں کو چاہئے کہ وہ دوران نماز اپنی نگاہیں آسمان کی طرف نہ اٹھائیں ورنہ ان کی نگاہیں ان کی طرف واپس نہیں لوٹیں گی (3)۔ اسے احمد، مسلم، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا وہ نماز میں اپنی ڈاڑھی سے کھیل رہا تھا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر اس کے دل میں شوع (1) ہوتا تو اس کے اعضاء میں ہاتھیں شوع ہوتا (ب) اسے تیسہم تہدی نے نوادراصول میں ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے (4)۔

حضرت ابواحوص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی نماز کے لئے کھڑا ہو تو اسے چاہئے کہ وہ ننگریوں کو صاف نہ کرے کیونکہ (اللہ تعالیٰ کی) رحمت اس کے سامنے ہوتی ہے (5)۔ اسے علامہ ابنی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور احمد، ابن عدی، نسائی، ابن ماجہ اور ابن حبان نے حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسے روایت کیا ہے۔ فصل: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے انہیں ارشاد فرمایا اے انس! اپنی نگاہ تہجد کرنے کی جگہ پر رکھا کرو۔ اسے علامہ بیہقی نے سنن کبیری میں نقل کیا ہے (6)۔

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا اے نبی! نماز میں ادھر ادھر توجہ کرنے سے

1- صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 104 (وزارت تعلیم) 2- صحیح مسلم، جلد 4، صفحہ 127 (اعلیٰ) 3- ایضاً

4- نوادر الاصول، صفحہ 184 (بیروت) 5- تفسیر ابنی، جلد 4، صفحہ 138 (المنکر) 6- سنن کبریٰ از نسائی، جلد 2، صفحہ 284 (المنکر)

(1) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہم ایسے شوع سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتے ہیں جس میں نفاق ہو۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ نفاق والا شوع کیا ہوتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا بدن میں شوع ہو اور دل میں نفاق ہو۔ (یعنی اعضاء نماز میں ہوں اور دل کام میں مشغول ہو) حضرت مجاہد حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ جب وہ نماز میں کھڑے ہوتے تھے تو اسے محسوس ہوتا کہ گڑی کھڑی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ایسا ہی کرتے تھے۔

(ب) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی والدہ ام رومان بیان کرتی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے دوران نماز ادھر ادھر جھٹکتے دیکھا تو آپ نے مجھے اتنا سخت جھڑکا کہ قریب تھا میں اپنی نماز توڑ دوں انہوں نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے جب تم میں سے کوئی نماز میں کھڑا ہو تو اس کے اعضاء پر کون رہنے چاہئیں۔ وہ یہودیوں کی طرح ادھر ادھر نہ جھٹکے کیونکہ دوران نماز اعضاء میں سکون ہونا نماز کی تکمیل کا ایک جز ہے۔ ازلہ الخفاء۔

پر نیز کر کیونکہ نماز میں ادھر ادھر دیکھنا بلاکت اور بربادی ہے۔ اگر کہیں مجبوری ہو تو نفل نماز میں (ایسا کیا جا سکتا ہے) فرض نماز میں جرگز نہیں (1)۔

وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّعْمِ مَعْزُونَ ﴿۱﴾ وَالَّذِينَ هُمْ بِزَكَاةٍ فَعُونَ ﴿۲﴾ وَالَّذِينَ هُمْ بِقُرْآنِهِمْ حَفِظُونَ ﴿۳﴾ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَنُوعِينَ ﴿۴﴾ فَمَنْ ابْتغىٰ وَرَاءَ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَدُونَ ﴿۵﴾

” (اور وہ جو ہر بیوہ امر سے منہ پھیرے ہوتے ہیں۔ اور وہ جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اور وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ جو اپنی بیویوں کے اور ان کنیزوں کے جو ان کے ہاتھوں کی ملکیت ہیں تو جب تک انہیں ملائمت نہ کی جائے گی۔ اور جس نے خواہش کی ان دو کے ماسوا تو یہی لوگ حد سے بہت زیادہ تجاوز کرنے والے ہیں۔“

۱۔ حضرت عطاء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نقل کیا ہے کہ لغو سے مراد شرک ہے۔ حسن نے کہا ہے کہ لغو سے مراد معاصی اور گناہ ہیں (2)۔ میں کہتا ہوں کہ یہ کیما زیادہ بہتر ہے کہ لغو سے مراد ایسا عمل ہے جو آخرت میں نفع بخش نہ ہو۔ چاہے وہ کلام ہو یا کوئی اور فعل۔ اور ایسا قول یا فعل جس پر آدمی کی تعریف نہ کی جائے وہ لغو ہوتا ہے۔ مفعول ہون کا مفہوم یہ ہے کہ ان کا شرک معاصی اور دیگر ضرر رساں افعال کا ارتکاب کرنا تو درکنار وہ ان کی طرف متنبہ نہیں کرتے۔ (اور عمل اعراض کئے رہتے ہیں) بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ وہ کفار کے مقابلہ میں انہیں سب و قتل نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: **وَإِلَّا تَصُومُوا**؛ کیا تم ایسا یعنی جب وہ کوئی قبیح اور برا کلام سنتے ہیں تو وہ ذوقی طور پر اپنے آپ کو اس میں شامل کرنے سے محفوظ رکھتے ہیں (3)۔

۲۔ علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ مفعول ہون کیما اللذین لا یلیہون (وہ غافل نہیں ہوتے) کی نسبت زیادہ بلیغ ہے اور اس کی کمی وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ جملہ اسمیہ ہے اور حکم کی بنا خیر پر ہے اور اسے اسم سے تعبیر کیا گیا ہے اور پھر مفعولوں کا صلہ اس سے مقدم کیا گیا ہے اور اس میں ترک (چھوڑنے) کی جگہ اعراض کو لایا گیا ہے تاکہ یہ اس پر دلالت کرے کہ وہ مکمل طور پر بیوہ امور سے دور رہتے ہیں۔ نہ بلا واسطہ کرتے ہیں نہ بالواسطہ نہ ایسے امور کی طرف میلان رکھتے ہیں اور نہ ان میں حاضر ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ وہ ایسے غیر مفید کاموں میں حاضر ہوئے بغیر ان سے اعراض کئے رکھتے ہیں دور رہتے ہیں (4)۔

۳۔ زکوٰۃ کا اطلاق اس واجب مقدار پر ہے جو زکوٰۃ ادا کرنے والا نصاب میں سے نکالتا ہے۔ اور اس کا اطلاق زکوٰۃ دینے والے کے فعل پر بھی ہوتا ہے۔ اور یہاں مراد وہی کس کا فعل ہی ہے کیونکہ فعل فاعل ہی کرتا ہے اور اس کا اطلاق نفس مال پر نہیں ہوتا۔ البتہ بین مال مراد لینا جائز ہے، جبکہ زکوٰۃ سے پہلے مضاف مقدر مان لیا جائے، یعنی **لِإِذَا الزَّكَاةَ فَاعْلُونَ**۔ لفظ فاعلون اس پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ زکوٰۃ ادا کرنے میں مدد اور ہمتی اختیار کرتے ہیں۔ للذکوٰۃ پر لام اس لئے داخل ہے کہ مفعول مقدم ہے اور اسم فاعل ضعیف اور کمزور عامل ہے۔ اسی طرح یہ کہا جاتا ہے صواب لزید لیکن ضرب لڑ نہیں کہا جاتا (کیونکہ یہ عامل قوی ہے)۔ بعض نے کہا ہے کہ زکوٰۃ سے مراد عمل صالح ہے، یعنی وہ لوگ ہیں جو عمل صالح کرنے والے ہیں (5)۔

1۔ مشکوٰۃ الصالح، جلد 1، صفحہ 297 (المنکر) 2۔ تفسیر بنوی، جلد 4، صفحہ 138 (المنکر) 3۔ ایضاً

4۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 557 (الحدیث) 5۔ تفسیر بنوی، جلد 4، صفحہ 138 (المنکر)

یعنی فرج سے مراد شرمگاہ ہے۔ چاہے وہ مرد کی ہو یا عورت کی۔ اور فرج کی حفاظت سے مراد (فعل) حرام سے بچنا اور پاکدامن رہنا ہے۔ اَلَا عَلٰی اَزْوَاجِهِمْ حَافِظُوْنَ کا صلہ ہے (اور حفظ کا صلہ علی اس مقلوبہ سے ماخوذ ہے) کہ تیرا قول اِحْفَظْ عَلٰی عَنَانِ فَرَسِي (میرے گھوڑے کی لگام بکڑے رکھ)، یعنی اسے آزاد نہ چھوڑ دینا اور صحیح معنی یہ ہے کہ حفظ کا لفظ نئی بدل کے معنی کو متضمن ہے، یعنی اس کا معنی لا ینذلون الا علی ازواجہم (کہ وہ اپنی شرمگاہوں کو اپنی بیویوں کے سوا استعمال نہیں کرتے)۔ یا پھر یہ صلہ سے فعل مقدر کا۔ اور وہ ہے لا ینذلونہا الا علی ازواجہم اور اس پر قول باری تعالیٰ غَیْرُ مَلْؤُْمِیْنَ دَلالت کرتا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ مستثنیٰ مفرغ حال ہونے کی بناء پر منصوب ہو۔ تقدیر عبارت یہ ہوگی حَافِظُوْنَ لِفَرَسِیْ جَمِیْعِ الْاَحْوَالِ الْاَقْدَرِیْنَ عَلٰی اَزْوَاجِهِمْ (وہ تمام حالات میں اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں سوائے اس حال کے کہ وہ اپنی ازواج پر قادر ہوں)۔ مَنَّا مَلَکَتْ سے مراد باندریاں ہیں۔ یعنی وہ اپنی مسکوحہ بیویوں یا اپنی مملوکہ کنیزوں کے سوا اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ یہاں ممالیک (لوندیوں اور غلاموں) کو غیر ذوی العقول کے قائم مقام رکھتے ہوئے ان کے لئے لفظ ما ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ ان میں ملکیت اصل اور رائج ہے (۱)۔ (علامہ بیضاوی کی اس وضاحت کے مطابق کہ ملکیت کا لفظ غلاموں کو بھی شامل ہے اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ اگر کوئی عورت اپنا غلام رکھتی ہو تو پھر اس کے لئے اپنے غلام سے جنسی تعلق قائم کرنا جائز ہو، حالانکہ ایسا کرنا جائز نہیں تو اس شبہ کا ازالہ کرنے کے لئے مصنف نے کہا ہے) میں کہتا ہوں یہاں مراد اطفال کنیزیں ہیں کیونکہ عورتوں کو ناقص العقل ہونے کی بناء پر غیر ذوی العقول سے ملحق کر دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر ذوی العقول کے لئے سوئٹ ضمیریں استعمال کی جاتی ہیں۔ پس یہاں لفظ ما اس بات پر دلالت کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے کہ اس سے مراد کنیزیں ہیں نہ کہ غلام۔ لہذا عورتوں کے لئے اپنے غلاموں کی شرمگاہوں سے استمتاع کرنا جائز نہیں۔

تو بیٹیک ایسا کرنے میں انہیں ملامت نہیں کی جائے گی۔ فافہم کی ہم ضمیر منصوب حافظون کے لئے ہے۔ (یعنی دونوں سے مراد ایک ہے) اور اس کے لئے ہے جس پر استثناء دلالت کرتا ہے، یعنی اگر وہ اپنی شرمگاہیں اپنی بیویوں یا کنیزوں پر استعمال کرتے ہیں تو اس پر انہیں ملامت نہیں کی جائے گی۔

۱۱۔ اور جس نے خواہش کی بیوی اور مملوکہ لوندی کے سوا شرمگاہ استعمال کرنے کی تو یہی لوگ حد سے بہت زیادہ تجاوز کرنے والے ہیں یعنی ظلم و عداوت میں کامل ہیں اور حلال سے حرام کی طرف تجاوز کرنے والے ہیں۔ یہ آیت عورتوں سے حد کرنے کی اجازت کے لئے ناسخ ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ابتدائے اسلام میں عورتوں سے حد جائز تھا جب کوئی آدمی کسی شہر میں آتا اور وہاں اس کی کسی سے جان پہچان نہ ہوتی تو وہ اتنی مدت کے لئے کسی عورت سے شادی کر لیتا جنسی مدت وہاں ٹھہرنے کا ارادہ ہوتا۔ تاکہ وہ اس کے ساز و سامان کی بھی حفاظت کرے اور اس کے لئے کھانا پکانا اور دیگر معاملات بھی سرانجام دے۔ جب آیت طیبہ اَلَا عَلٰی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَنَّا مَلَکَتْ اِنْمَانَتْھُمْ نازل ہوئی تو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا ان دو قسم کی عورتوں کے سوا ہر عورت حرام ہے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے (۲)۔

اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ عورتیں جن سے متحہ کیا جاتا ہے وہ ازواج (بیویوں) میں سے نہیں ہوتیں اور اس پر تو اجماع ہے کہ ایسے مرد اور عورتیں باہم ایک دوسرے کا وارث نہیں بنتے۔ حتیٰ کہ روافض بھی وارثت کے قائل نہیں حالانکہ زوجین کا ایک دوسرے کا وارث بننا تو تصریح قرآنی سے ثابت ہے۔ ارشاد خداوندی ہے وَكُلُّكُمْ لِرِجَالِكُمُ وَاللَّيْئِئِ نَاصِبَةٌ كَذَّابُوا وَاجْتَنِبُوا رِجَالَكُمْ (اور تمہارے لئے اپنی ازواج کے ترکہ کا نصف ہے) ہم نے محض النساء کا مسئلہ بالتفصیل سورہ نساء کی آیت قَسَمْنَا لَكُمْ مَثَلَهُمْ فِي الْكُفْرَانِ أَجْزَاءً مِّمَّا كَفَرْتُمْ فِي تَفْسِيرِ میں بیان کر دیا ہے۔ زیر بحث آیت اس پر بھی ولادت کرتی ہے کہ استمتاع بالید (جلق) بھی حرام ہے۔ یہی عام علماء کا قول ہے۔ ابن جریج نے کہا ہے کہ میں نے حضرت عطاء سے اس کے بارے پوچھا تو انہوں نے کہ یہ عمل مکروہ (تحریمی) ہے۔ میں نے یہ سنا ہے کہ ایک قوم کو اس حال میں اٹھایا جائے گا کہ ان کے ہاتھ حاملہ ہوں گے میرا گمان ہے کہ یہ ایسے ہی لوگ ہیں۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے اللہ تعالیٰ نے ایک جماعت کو عذاب دیا ہے کہ وہ اپنے عضو تناسل سے کھینٹے ہیں (1)۔

وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمْتِهِمْ وَعَبِيدِهِمْ رُحَمَاءٌ ۖ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ﴿١﴾
 وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَاذِبُونَ ۖ الَّذِينَ يَدْعُونَ الْقُرْدُوسَ ۗ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢﴾

”نیز وہ (مومن با مرد ہیں) جو اپنی امثال اور اپنے وعدوں کی پاسداری کرنے والے ہیں اور وہ جو اپنی نمازوں کی پوری حفاظت کرتے ہیں یہی لوگ وارث ہیں۔ جو وارث نہیں گے فردوس (بریں) کے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے“

ابن کثیر نے یہاں اور سورہ معارج میں لامنتہم مفرود پڑھا ہے اور باقیوں نے امنتہم صحیح پڑھا ہے۔ امامتوں سے مراد وہ چیزیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسان کے پاس امانت ہیں اور بندوں سے انہیں بجالانے کا عہد لیا جاتا ہے۔ مثلاً نماز روزہ اور حج وغیرہ عبادات جو اللہ تعالیٰ نے واجب قرار دی ہیں۔ یا عہد سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کا وعدہ مخلوق کی جانب سے ہوتا ہے۔ جیسے سامان و دہنت اور سامان تجارت کے معاہدے وغیرہ جو لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔ پس ان تمام کو پورا کرنا بندے پر لازم ہوتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے جس عمل کا آدمی سے حساب لیا جائیگا وہ نماز ہے۔ اگر صحیح ثابت ہوئی تو وہ کامیاب و کامران ہوگا اور اگر وہ فاسد اور شراب نگلی تو آدمی غائب و خاسر ہوگا۔ اور اگر فرض کی ادائیگی میں کوئی نقص اور کمی ظاہر ہوگی تو اللہ تبارک و تعالیٰ فرمائے گا دیکھو! کیا میرے بندے کے کچھ نوافل ہیں؟ تو ان کے ساتھ فرض کی کمی کو پورا کر دیا جائیگا۔ پھر باقی تمام اعمال کا حال اسی طرح ہوگا (2)۔ اور ایک روایت میں ہے کہ بجز زکوٰۃ کا حال اسی طرح ہوگا پھر تمام اعمال کا حساب اسی طرح ہوگا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ بجز زکوٰۃ کا حال اسی طرح ہوگا پھر تمام اعمال کا حساب اسی طرح لیا جائے گا۔ اسے ابو داؤد اور احمد نے ایک آدمی سے روایت کیا ہے۔

ابن حزمہ اور کسائی نے صلواتہم مفرود صورت میں پڑھا ہے جبکہ باقیوں نے جمع کی صورت میں صلواتہم پڑھا ہے۔ يُحَافِظُونَ کا معنی ہے کہ وہ اپنی نمازوں پر مواظبت اختیار کرتے ہیں اور انہیں اپنے وقت پر ادا کرتے ہیں۔ یہاں لفظ حفظ نماز میں تہجد اور تکرار کے معنی کے اظہار کے لئے ہے۔ یعنی وہ تمام اوقات کی اپنی نمازیں مقررہ اوقات میں پوری پابندی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ جو نبی نماز کا وقت آتا ہے تو وہ اس کی ادائیگی کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ اس سے تکرار و صف لازم نہیں آتا۔ کیونکہ ابتداء میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ وہ اپنی

نمازیں بڑے خشوع کے ساتھ ادا کرتے ہیں اور یہاں بیان فرمایا کہ وہ اپنی نمازوں کی پوری محافظت کرتے ہیں اور نماز میں خشوع اور نماز کی محافظت دونوں علیحدہ علیحدہ صفئیں ہیں۔ ان لوگوں کے اوصاف کی ابتدا ابھی نماز کے ذکر سے کی اور اختتام بھی نماز کے ذکر پر کیا، اس لئے تاکہ نماز کی اہمیت اور عظمت و شان کا اظہار ہو جائے۔ جب وصف خشوع کا ذکر کیا تو ساتھ لفظ صلا مفرد ذکر فرمایا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ نماز جو بھی ہو جس نماز میں خشوع لازم اور ضروری ہے۔ اور جب وصف محافظت کا ذکر فرمایا تو ساتھ لفظ صلا جمع کی صورت میں ذکر کیا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ نماز کی تمام انواع کی محافظت ضروری ہے چاہے وہ فرائض اور واجبات ہوں یا سنن اور نوافل ہوں۔ پس جو ہی لوگ جو ان مذکورہ تمام صفات کے جامع ہیں وہی وارث ہیں یعنی وہی یہ حق رکھتے ہیں کہ انہیں (فردوس) کا وارث کہا جائے۔ نہ کہ ان کے سوا کوئی اور۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ محترضہ مدح کے لئے ہے۔

سے اَلَّذِينَ يَرْتَدُّونَ الْفُرْقَانِ ترکیب کلام میں الوارثون کی صفت ہے اور اس میں اس شئی کا بیان ہے جس کے وہ وارث ہوں گے۔ (یعنی جنت الفردوس)، یعنی یہی لوگ فردوس بریں کے وارث بنیں گے۔ پہلے مطلق وارث بننے کا ذکر کیا پھر فردوس کا ذکر فرما کر وراثت کو فردوس سے مقید کر دیا تاکہ وراثت کی عظمت و شان ظاہر ہو اور دوسرا اس سے مقصود تاکید بھی ہے۔ یعنی وہ جنت میں ان گھروں کے بھی وارث ہوں گے جو کفار کے لئے تیار کئے گئے ہیں کہ اگر وہ ایمان لاتے تو ان کے حصے میں آتے۔ (مگر اب یہ اہل ایمان ہی ان گھروں کے بھی وارث ہوں گے)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سے ہر ایک کے لئے دو گھر ہیں ایک گھر جنت میں ہے اور ایک دوزخ میں۔ پس جب کوئی مرتا ہے اور جنم میں داخل ہو جاتا ہے تو پھر اہل جنت ہی جنت میں اس کے گھر کے وارث بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی اُولَئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ کا یہی مفہوم ہے (1)۔ اسے ابن ماجہ سعید بن منصور اور ابن منذر ابن ابی حاتم ابن برویہ اور بیہقی نے البعث میں ذکر کیا ہے۔

عبدالرزاق عبد بن حمید ابن جریر اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے کہ وہ اپنے مسکنوں کے بھی وارث ہوں گے اور اپنے ان بھائیوں کے ان گھروں کے بھی جو تیار کئے گئے ہیں کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے تو وہ ان میں سکونت پذیر ہوتے۔ حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

ابن ماجہ نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اپنے وارث کی میراث سے بھاگے گا اللہ تعالیٰ جنت میں اس کی میراث کو ختم کر دے گا (2)۔

بعض نے کہا ہے کہ وراثت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ہلاخ جنت کی طرف لوٹ آئیں گے اور اسے پالیں گے۔ جیسا کہ بالآخر وراثت میراث کی طرف لوٹ کر اسے پالیتا ہے۔ فردوس سے مراد جنت اعلیٰ ہے۔ اس کا تفصیلی ذکر سورہ کہف میں گزر چکا ہے۔

هُمُ فِيهَا مِنْ حَادٍ مُّضْمِرٍ فردوس کی طرف لوٹ رہی ہے اور چونکہ فردوس جنت کا نام ہے اس لئے ضمیر مضمون ذکر کی گئی ہے۔ خلیلون کا مفہوم یہ ہے کہ تو وہ جنت میں مریں گے اور نہ انہیں اس سے نکالا جائیگا۔ (بلکہ وہ اس میں ہمیشہ زندہ رہیں گے) ترکیب کلام میں یہ جملہ مستأنف ہے۔

امام احمد ترمذی نسائی اور حاکم نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ پر جب وحی

نازل ہوتی تھی تو آپ ﷺ کے چہرہ القدس کے پاس شہد کی مکھوں کی جھنساہٹ سنائی دیتی تھی۔ ایک دن آپ ﷺ پر وحی نازل ہوئی تو ہم اختتامِ وحی تک آپ ﷺ کے پاس ہی ٹھہرے رہے۔ بس جب وحی اختتام پزیر ہوئی تو حضور نبی کریم ﷺ نے اپنا رخ زیبا قبلہ سمت کیا اور دست مبارک بلند کر کے رب کریم کے حضور یہ التجا کی کہ اَللّٰهُمَّ زِدْنَا وَلَا تَنْقُصْنَا وَانْحَرِمْنَا وَلَا تُهِنَّا وَاعْظِمْنَا وَلَا تُخَوِّمْنَا وَابْرُقْنَا وَلَا تُؤَبِّرْ عَلَيْنَا وَارْضِنَا وَارْضِ عَنَّا (اے اللہ! ہمیں مزید عطا فرما ہم میں کمی اور نقصان نہ کر، ہمیں عزت داکر اور عطا فرما ہمیں رسوا اور ذلیل نہ کر، ہمیں عطا فرما ہمیں محروم نہ کر، ہمیں ترجیح عطا فرما کسی اور کو ہم پر فوقیت نہ دے، ہمیں رضا اور خوشی عطا فرما اور ہم سے راضی ہو جا) پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھ پر اس آیت طیبات نازل کی گئی ہیں جو کوئی ان کے مطابق عمل کرے گا وہ جنت میں داخل ہوگا۔ پھر آپ ﷺ نے قَدْ افْتَحَ الْمُبْتُؤُونَ سے لیکر دسویں آیت کے اختتام تک تمام آیات تلاوت فرمائیں (۱)۔ سنائی نہ کہا ہے یہ حدیث منکر ہے لیکن حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔ یہ آیت تمام ابوابِ غیر کو جامع ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان میں مومنین کے اوصاف بیان فرمائے ہیں کہ وہ نماز میں مشغول کرتے ہیں ہمیشہ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ لغویات سے اعراض کرتے ہیں۔ حرام چیزوں سے اجتناب کرتے ہیں اور ان تمام چیزوں سے پرہیز کرتے ہیں جو خلافِ مروت ہوں۔ تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حد درجہ عباداتِ بندہ اور طاعاتِ مالیہ کے خور ہیں اور انہیں (ان اوصاف کے سبب) اس طرح طہارت اور پاکیزگی حاصل ہو جاتی ہے کہ ان میں تجلیاتِ ذیہ اور صفائیہ کے انوار کو تیشے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظًا فَكَسَوْنَا الْعِظَ لَحْمًا ۝ ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۝ فَكَلَّمَكُمُ اللَّهُ أَحْسَنَ الْخَلْقِينَ ۝

”اور جب تک ہم نے پیدا کیا انسان کو مٹی کے جوہر سے۔ پھر ہم نے رکھا اسے پانی کی بوند بنا کر ایک محفوظ مقام میں پھر ہم نے بنا دیا نطفہ کو خون کا ٹھنڈا پھر ہم نے بنا دیا اس کو ٹھوسے کو گوشت کی بوٹی۔ پھر ہم نے پیدا کر دیں اس بوٹی سے ہڈیاں پھر ہم نے پہنا دیا ان ہڈیوں کو گوشت۔ پھر (روح پھونک کر) ہم نے اسے دوسری مخلوق بنا دیا جسے جس بڑا بابرکت ہے اللہ جو سب سے بہتر بنانے والا ہے۔“

۱۔ آیت طیبہ میں انسان سے مراد جنسِ انسان ہے یا اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور یہ آیت محذوف قسم کا جواب ہے اور یہ جملہ قول باری تعالیٰ قَدْ افْتَحَ الْمُبْتُؤُونَ پر معطوف ہے۔ کیونکہ ان آیات میں ایمان اور عبادت و طاعت کی مختلف اقسام کا ذکر ہے۔ اور اس آیت میں اس چیز کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی عبادت و طاعت کا مستحق ہے نیز اس میں وجوب عبادت کا سبب مذکور ہے۔ گویا یہ فرمایا گیا ہے کہ بندوں پر لازم ہے کہ وہ ہماری عبادت کریں اور ہماری وحدانیت کا اقرار کریں۔ کیونکہ قسم ہے اپنی ذات کی کہ ہم نے ہی انہیں پیدا کیا ہے۔

سَلْلَةُ مِثْلِي كَادُوہ اور غلامہ جو کچھ اور مٹی سے نکالا جائے۔ مَن سَلْلَةُ مِثْلِي مَن اِبتداءً یہ ہے اور مَن طِينِ مِثْلِي مَن بیان ہے۔ ترکیب کلام میں مَن طِينِ سَلْلَةُ مِثْلِي صفت ہے۔ یعنی سَلْلَةُ سے مراد مٹی ہے۔ یعنی مٹی کا وہ جو ہر جو روئے زمین سے نکالا گیا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق مٹی کے جوہر سے ہوئی اور باقی تمام لوگوں کی پیدائش اس لطف سے ہوئی جو غذاؤں سے بنتا ہے۔ اور غذاؤں زمین سے پیدا ہوتی ہیں۔

یہ بھی جائز ہے کہ مَن طِينِ لُطْفِ لِقُوہ اور سَلْلَةُ بمعنی مسلولہ کے متعلق ہو اور اس میں مَن اِبتداءً یہ ہو رکھی ہے۔ کہا ہے طین سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور مٹی ہے کہ ہم نے جنس انسان کو لطف سے پیدا کیا ہے جسے طین سے نکالا گیا ہے۔ اور طین سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ (1)

عبدالرزاق ابن جریر، عبد بن محمد اور ابن ابی حاتم نے قواد سے نقل کیا ہے کہ طین سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ عبد بن حمید نے بیان ہے یہ نقل کیا ہے کہ قوس باری تعالیٰ مَن سَلْلَةُ مِثْلِي مَن طِينِ مِثْلِي سے مراد بنی آدم کا لطف ہے۔ (2) سلامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ سَلْلَةُ سے مراد پانی کا خلاصہ اور جوہر ہے۔ مگر مَن سے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ پانی ہے جو پیچھے سے نکالا جاتا ہے۔ (اور ہر لطف کو ہی سلالۃ کہتے ہیں۔) (3)

پھر ہم نے اس جوہر کو پانی کی بوند بنا کر رکھا۔ سَلْلَةُ مِثْلِي مَن سَلْلَةُ مِثْلِي کا مَرِيع سے سلالۃ ہے اس لئے کہ یہاں سلالۃ بمعنی مسلول (ام مفعول) ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر کا مَرِيع انسان ہو اور لُطْفَةُ سے قبل (مَن) حرف جار محذوف ہے اور لُطْفَةُ منصوب ہو۔ پھر اگر انسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہوں تو اس سے پہلے مضاف محذوف ہے اور مضاف الیہ کو ہی اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے۔ اور مٹی یہ ہے کہ ہم نے جنس انسان کو لطف سے پیدا کیا ہے یا ہم نے بنی آدم کو لطف سے پیدا کیا ہے۔ جسے ایک محفوظ مقام یعنی رحم میں رکھا ہے۔ ممکن فی الحقیقت ٹھہرنے والے کی صفت ہے۔ مگر اظہار مبالغہ کے لئے یہاں محل قراری کی صفت بنا دیا گیا ہے۔ جیسا کہ مبالغہ کے لئے یہ محل قرار کو لفظ قرار سے تعبیر کیا گیا ہے حالانکہ قرار مصدر ہے۔

پھر ہم نے سفید لطف کو سرخ خون کا لُطْفُ بنا دیا۔ پھر ہم نے اس لُطْفُ کو اتنی مقدار میں گوشت کا کُلا بنا دیا جسے چبایا جاسکتا ہے۔ پھر ہم نے گوشت کے ٹکڑے سے ہڈیاں پیدا کر دیں اس طرح کہ ہم نے اسے سخت بنا دیا۔ پھر گوشت کے ٹکڑے کا وہ حصہ جو ہڈیاں بننے سے باقی بچا وہ ہم نے ان ہڈیوں کو پبنا دیا۔ یا معنی یہ ہے کہ ہم نے ان ہڈیوں پر اتنی مقدار گوشت پیدا کر دیا جو انہیں ڈھانپ سکتا ہے۔ لُحْمًا کا لُطْفُ اپنے سے قبل (یا) حرف جار محذوف ہونے کے سبب منصوب ہے یعنی اصل عبارت ہے كَسْنُوْنَا الْعِظَامَ بِاللَّحْمِ۔ یا پھر لُحْمًا كَسْنُوْنَا کا وہ مفعول ہے اور كَسْنُوْنَا اَعْطَيْنَا کے معنی کو متضمن ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے كَسْنُوْنَا زَيْدًا حَلَّةً یعنی اعطینہ ایماہر (کہیں نے اسے عطا کیا)۔ مہر نے عظاماً پڑھا ہے۔ چونکہ ہڈیاں اپنی ہیئت اور حتی کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہیں اس لئے دونوں جگہوں پر لُطْفُ عظام مع کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے۔ جبکہ ابو بکر اور ابن عامر نے اسے عظاماً پڑھا ہے۔ اور الْعِظَامَ لُطْفُ واحد ہے گویا اس صورت میں جمع کی بجائے اسم جنس پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔ یعنی لُطْفُ عِظَامَ بحیث اسم جنس مستعمل ہے۔

پھر ہم نے (روح ڈال کر) اسے دوسری مخلوق بنا دیا ہے۔ اَنْشَأْنَاہُ کی ضمیر سلالۃ کی طرف راجع ہے، یا انسان کی طرف چاہے انسان سے مراد جنس انسان ہو یا حضرت آدم علیہ السلام ہو۔ اور یہاں مضاف مقدر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ خَلَقْنَا اخْرَجْنَا ترکیب

کلام میں انشاء کا ہم معنی ہونے کی وجہ سے مصدر مفعول مطلق ہے۔ اور یہ خلفناہ خلقناہ اخرا کے معنی میں ہے۔ یا پھر خلقناہ اخرا انشاء کے معنی میں ہے۔ یا پھر انشاءنا حصیرنا کے معنی میں ہے اور خلقناہ اخرا اس کا مفعول ثانی ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ خلفناہ اخرا انشاء کی ضمیر منصوب سے بدل اشمال ہو۔ معنی یہ ہے کہ ہم نے (روح ذوال کر) اس جو ہر یا انسان کو (دوسری طرح کی مخلوق بنا دیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما مجاہد شعی، مکرّمہ شحاک اور ابو العالیہ نے کہا ہے کہ خلقناہ اخرا سے مراد اس میں روح پھونکنا ہے (1)۔

میں کہتا ہوں کہ ان کے اقوال میں روح سے مراد روح سظی ہے جسے روح حیوانی کہا جاتا ہے۔ اور نفس سے مراد روح علوی کی سواری ہے۔ روح علوی کا تعلق عالم ارواح سے ہے اور اس کی قرار گاہ نظر کشف میں عرش کے اوپر ہے۔ اور یہ مکانی شئی نہیں ہے۔ اور نفس سے مراد وہ بخار (بھاپ) ہے جو عناصر سے اٹھتا ہے اور جسم کی ہیئت اختیار کر لیتا ہے۔ اور یہ ایک جسم لطیف ہے جو جسم کثیف میں چلتا ہے۔ اسی بنا پر انشاء کی ضمیر کو سلالہ کی طرف لانا صحیح ہے۔ بخلاف اس صورت کے کہ روح سے مراد روح علوی ہو (پھر ضمیر کا مرجع سلالہ کو ماننا صحیح نہیں ہے)، کیونکہ روح علوی سلالہ سے ماخوذ نہیں ہے۔ اور لفظ ضمیر بھی اسی معنی پر دلالت کرتا ہے کیونکہ ارواح علوی کی تخلیق ابدان کی تخلیق سے پہلے ہوئی کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے ارواح سے بیٹاق لیا تو اس وقت بدن موجود نہیں تھے۔

ربا مسئلہ نفع روح کا؟ تو یہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے وَنَفَخْتُ فِيهِمْ رُوحًا مِنْ رُوحِي فَسَمِعُوا مَا يُنَادِيهِمْ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لِكَافِرِينَ حَالَهُمْ فِي الْيَوْمِ الَّذِي هُمْ فِيهِ مُوقِنُونَ۔ اور یہ درست ہے (کیونکہ جسم حادث ہے اور روح بذات خود قدیم ہے) اور پھر صفت قدیم کا جسم حادث سے تعلق حادث ہے) اور جسم کی تخلیق صفت قدیم کے موخر ہے۔ ہاں اگر انشاء سے مراد نفع روح (روح پھونکنا) ہو تعلق روح (روح کی پیدائش) مقصود نہ ہو تو پھر اس میں تو جہد کی ضرورت نہیں۔ واللہ اعلم

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے صادق و مہدوق نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے ہر ایک کے مادہ تخلیق کو چالیس دن تک اپنی ماں کے پیٹ میں نطفہ کی صورت میں بیج رکھا جاتا ہے۔ پھر وہ اسے ہی دن جتے ہوئے خون کی شکل میں رہتا ہے۔ پھر اتنی ہی مدت کے لئے وہ گوشت کا لوتھڑا بن کر رہتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ چار کلمات کے ساتھ اس کی طرف فرشتہ بھیجتا ہے۔ چنانچہ وہ اس کا عمل عمر رزق اور شقاوت یا سعادت لکھ دیتا ہے۔ پھر اس میں روح پھونک دی جاتی ہے۔ پس مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی اور موجود نہیں تم میں سے ایک آدمی اہل جنت کے اعمال کی مثل عمل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ ہنت اور اس کے درمیان ایک ذراع کا فاصلہ رہتا ہے تو اس پر لکھی ہوئی تقدیر سبقت لے جاتی ہے اور وہ اہل جہنم جیسے عمل کرنے لگ جاتا ہے۔ (اور انہی اعمال پر اسے موت آ جاتی ہے) اور ایک آدمی اہل جہنم کے اعمال کی مثل عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ جہنم اور اس کے درمیان ایک ذراع کا فاصلہ رہتا ہے پھر اس پر لکھی ہوئی تقدیر سبقت لے جاتی ہے اور وہ اہل جنت جیسے اعمال کرنے لگ جاتا ہے۔ (اور انہی اعمال پر اسے موت آ جاتی ہے) یہ حدیث متفق علیہ ہے (2)

اگر یہ سوال کیا جائے کہ حدیث طیبہ میں انسان کی تخلیق کی مختلف تہذیبوں کے ذکر کے دوران لفظ ضمیر ذکر کیا گیا ہے جو تراخی پر دلالت کرتا ہے (یعنی ہر تہذیب طویل عرصہ گزرنے کے بعد وقوع پذیر ہو) اور قرآن کریم میں اس کا ذکر کلمہ فاعے کیا گیا ہے جو تعقیب پر

دالات کرتی ہے (یعنی ہر تبدیلی دوسری کے فوراً بعد وقوع پذیر ہوئی) تو پھر ان دونوں کے مابین تطبیق کیسے کی جائے گی؟ میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک حال سے دوسرے حال میں تبدیل ہونے کے درمیان چالیس دن کا ذکر کیا ہے۔ اور یہ ایک طویل زمانہ ہے اور لفظ فہم کے ساتھ عطف کا تقاضا کرتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے کلمہ فا ذکر فرمایا ہے تاکہ اس پر دالات ہو جائے کہ وہ چالیس دن کی طویل مدت اس عظیم تبدیلی کے لئے انتہائی قلیل اور تھوڑی مدت ہے جو تخلیق انسانی کے دوران ایک حال سے دوسرے حال کی طرف بدلنے کے دوران ہوتی ہے۔

بعض مقامات پر لفظ فہم اور بعض مقامات پر لفظ فا مختلف الانواع تبدیلیوں اور تغیرات پر دالات کرنے کے لئے ذکر کئے گئے ہیں۔ یہ آپ نہیں دیکھتے کہ کسی کے جوہر کا نصف میں تبدیل ہونا بہت بڑی اور عظیم تبدیلی ہے؟ پھر وہ نصف مرد کی پشت اور عورت کے سینے میں طویل زمانہ تک آرا پذیر رہتا ہے۔ پھر وہ عورت کی رحم میں منتقل ہوتا ہے وہاں پہنچ کر گھٹا ہو کر چالیس دن تک وہ نصف اپنی صورت میں رحم میں باقی رہتا ہے۔ یہ بھی ایک نادر تبدیلی ہے پھر یہ طویل وقت گزرنے کے بعد وہ علقہ بن جاتا ہے اور یہ بھی انتہائی عظیم الشان تبدیلی ہے۔ لہذا یہ تمام تغیرات اور تبدیلیاں عظیم الشان ہونے کے سبب لفظ فہم سے عطف کا تقاضا کرتی ہیں۔ جبکہ ان کے برعکس دوسری تبدیلیاں، یعنی علقہ سے مضغ اور پھر مضغ میں بدلیوں کا پیدا ہونا اور ان پر گوشت چڑھانا یہ تمام اتنی بڑی اور نادر تبدیلیاں نہیں اس لئے ان کے ذکر کے دوران باہم عطف کے لئے لفظ فا ذکر کیا گیا ہے۔ اور پھر بعد رجبی پر دالات کرنے کے لئے اور دونوں خلیقوں کے درمیان کمال تفاوت کو ظاہر کرنے کیلئے قول باری تعالیٰ فہم انشأئہ خلقا اخر میں لفظ فہم بطور عطف ذکر کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ: یہ آیت اس پر دالات کرتی ہے کہ جس آدمی نے انڈا انصبا کیا پھر اس کے پاس اس انڈے سے بچہ پیدا ہوا اور پھر وہ بچہ مر گیا یا کسی نے حرم پاک سے انزال کیا اور اسے متاع حاصل کی طرف نکال لایا پھر اس سے بچہ پیدا ہوا تو ایسے آدمی پر صرف انڈے کی ضمانت لازم ہوگی چوزے (بچے) کی نہیں۔ کیونکہ وہ دوسری تخلیق ہے اور اس میں روح طفلی ہے اور وہی روح حیوانی ہے (اور ضمان کا تعلق تخلیق اول سے ہے) واللہ اعلم۔

قد وہ نے کہا ہے کہ فہم انشأئہ خلقا اخر کا معنی دانوں کا نکلنا اور بالوں کا اگانا ہے۔

ان برتن نے مجاہد سے روایت کی ہے کہ اس سے مراد مکمل جوان ہونا ہے اور حسن نے کہا ہے کہ اس سے مراد مذکر (نر) یا مؤنث (مادہ) ہونا ہے۔

عوفی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ روایت کی ہے کہ اس سے مراد ولادت کے بعد مختلف احوال میں تبدیل ہونا ہے۔ مثلاً پیدا ہونے کے بعد رونا، پھر دودھ پینے کے قابل ہونا، پھر بیضے کی صلاحیت کا آنا، پھر کھڑے ہونے پر قادر ہونا، پھر چلنے کی طاقت آنا، پھر دودھ چھوڑ کر دیگر چیزیں کھانے پینے کے قابل ہونا یہاں تک آدمی بالغ ہو جاتا ہے اور اس کے بعد وہ شہوان میں گھوسنے پھرے بنتا ہے۔ (۱۱)

میں کہتا ہوں کہ یہ بھی ممکن ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ فہم انشأئہ خلقا اخر سے وہ ولادت کا یہ ہو جو نقرہ اور صوفیا کو مرتبہ فنا حاصل ہونے کے سبب حاصل ہوتی ہے، کہ اس طرح وہ صفات بسمعیہ سمعیہ اور بشریہ سے نکل کر صفات فلکیہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اور پھر

صفات فلکیہ سے صفات رحمانیہ کی جانب ترقی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفات قدسیہ کے ساتھ مقام بقاء پر فائز ہو جاتے ہیں۔ لفظ **كَمْ** کے ساتھ عطف کرنے کی یہی مناسب ترین تاویل ہے۔

یہ **فَسَيُرَكَّبُ** اللہ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ بلند و برتر اور عظمت و شان والا ہے، کہ اس کا کوئی شریک بنایا جائے یا اس کے اوامر کی پیروی کرنے اور اس کی منایا سے رکنے میں کسی بھی طرح کی غفلت اور سستی برتی جائے۔ اس میں فاسیہ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ مذکورہ بالا صفت تخلیق سے متصف ہے۔ اور پیدا کرنے کی یہی صلاحیت اس کی قدرت کے عمل ہونے اور حکمت کے تمام ہونے کی دلیل ہے۔ اور یہی اس کی عظمت و کبریائی کا تقاضا کرتی ہے۔ کہ اس کی شان انتہائی بلند ہے اور اس کا شریک ہونا محال اور ناممکن ہے۔ وہ سب سے بہتر بنانے والا ہے۔ ترکیب کلام میں **أَحْسَنُ** الخالقین لفظ اللہ سے بدل ہے یا پھر مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ یہ صفت نہیں ہے کیونکہ یہ نکرہ ہے۔ اگرچہ یہ مضاف ہے کیونکہ اس میں مضاف الیہ من تفضیلیہ کا عوض ہے۔ اور اس میں تیز محذوف ہے اللہ پر کلام اس طرح ہے احسن الخالقین مخلقا یہاں ضمیر کا ذکر نہیں کیا گیا۔ کیونکہ لفظ خالقین اس پر دلالت کر رہا ہے۔

معجز لے نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ کہ بندے اپنے افعال اختیار یہ کہ خود خالق ہیں۔ تب ہی تو کثیر پیدا کرنے والوں میں اللہ تعالیٰ کی برتری اور فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ (ورنہ اللہ تعالیٰ کے لیے احسن الخالقین کا مفہوم ثابت نہیں ہو سکتا) حالانکہ اوائل عقلیہ اور اول شریعہ سے یہ ثابت ہے کہ بندوں کے افعال اختیار یہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں۔ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا **هَبْ حَقِّقْ كُنُوزًا وَمَا تَعْسَفُونَ**۔ (اللہ تعالیٰ نے ہی تمہیں اور تمہارے اعمال کو پیدا کیا ہے) اور اس لئے بھی کہ ممکن وہ ہوتا ہے جس کی ذات اپنے وجود کا بھی تقاضا کرتی تو پھر اس کی ذات سے کسی اور کے وجود کے تقاضے کا تصور کیسے کیا جاسکتا ہے؟ (یعنی ممکن کی اپنی ذات بھی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے تو پھر ممکن کسی اور کو کیسے پیدا کر سکتا ہے؟) اور اس پر تمام صحابہ کرام اور ان کے بعد علماء امت کا اجماع ہے کہ خالق حقیقی فقط اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

معجز لے کے استدلال کا جواب یہ ہے کہ ہم اس کا انکار نہیں کرتے کہ بندے کو اپنے افعال اختیار یہ میں ایک نوع کا ارادہ اور اختیار حاصل ہوتا ہے۔ وہی ارادہ اور اختیار بندے کے مکلف ہونے کی علت ہے، مثلاً ثواب و عقاب ہے اور افعال کی نسبت بندوں کی طرف کرنے کا موجب ہے۔ ہم اسے کسب کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن وہ ارادہ اور اختیار معدوم کو وجود عطا کرنے کے لئے بالکل کافی نہیں۔ چاہے وہ جوہر ہو یا عرض۔ بلکہ یہ ایجاد فقط اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور اس کے ارادہ و اختیار سے ہی ممکن ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی قدرت ارادے اور اختیار کا جو تعلق مخلوق سے ہوتا ہے اسے ہم خلق کہتے ہیں اور ہر معدوم کو وجود میں لانے کے لئے یہ کافی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی حکمت کا یہ تقاضا ہے (اگرچہ وہ حکمت ہم پر مخفی ہے) کہ وہ بندے کے کسب کو بھی ان کے بعض افعال میں شامل کر دے۔ پس معجز لے کے ساتھ ہمارا نزاع معنی میں ہے کیونکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ بندے کا ارادہ اور قدرت معدوم کو وجود میں لانے کے لئے کافی ہے۔ اور ہم اس کے قائل نہیں۔ اور بندے کے کسب پر لفظ خلق کے اطلاق کے جائز ہونے میں بھی ہمارا کوئی اختلاف نہیں کیونکہ یہ تو نزاع لفظی ہے۔ اور احسن الخالقین اس پر دلالت کرتا ہے کہ لغوی طور پر کسب کے معنی پر لفظ خلق کا اطلاق صحیح ہے۔ اسی وجہ سے مجاہد نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ **يُضَعُّونَ وَ يَضْعَعُونَ وَ يَضْعَعُ اللَّهُ وَ اللَّهُ خَيْرُ الصَّابِعِينَ** کہ بندے بھی بناتے ہیں اور اللہ بھی بناتا

ہے اور اللہ تعالیٰ سب بنانے والوں میں سے بہتر اور اچھا بنانے والا ہے۔

اسی طرح کہا جاتا ہے جو محل خالق تو اس میں خالق بمعنی صالح (بنانے والا) ہوتا ہے (۱)۔ اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا: **سَخَّطُونَ اِفْكَا** اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول بطور حکایت نقل کیا ہے کہ **اَلَيْ اَ اَخْتِي تَلْتَمِسُنَّ قَبْرَ الْقَيْظِ كَهَيْئَةِ الْقَظِيْبِ**۔ (ان دونوں ارشادات میں خلق بمعنی صانع استعمال ہوا ہے) بعض نے یہ کہا ہے کہ یہاں خالقین کا لفظ تصویریں بنانے والے یا اندازہ لگانے والے کے معنی میں ہے اور لغت میں خلق کا معنی اندازہ لگانا ہے۔

بعض نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ یہاں لفظ خالقین کا استعمال علی سبیل الفرض ہے اور محال شئی کو فرض کرنا محال نہیں ہوتا۔ یعنی اگر فرض بھی کر لیں کہ پیدا کرنے والے متعدد ہیں (جیسا کہ اس امت کے تجوی مختزلہ کی رائے ہے) تو پھر بھی اللہ تعالیٰ ان تمام سے بہتر اور اچھا خالق ہے۔

ابن ابی حاتم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ چار مرتبہ نزول قرآن کے وقت قرآن کریم کے الفاظ میں میری اپنے رب سے موافقت ہوگئی جب اللہ تعالیٰ کے یہ آیات نازل فرمائیں **وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سَلْمٰلَةٍ مِّنْ طِينٍ**۔ تو پرست میری زبان سے **كَالْقَبْرِ كَ اللّٰهِ اَحْسَنُ الْاِحْسَانِ**۔ تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھی آخر میں یہی الفاظ نازل ہو گئے اللہ بیٹ (۱) یہ قصہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ قرآن کریم کے ایک آیت سے کم الفاظ معجز نہیں، کیونکہ انسان انہیں کہنے کی قدرت رکھتا ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبان سے نزول سے قبل وہی الفاظ نکلے۔ (جو بعد میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوئے)

بعض نے کہا ہے کہ عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن سعد بن ابی سرح حضور نبی کریم ﷺ کے کاتب وحی تھی۔ حضور نبی کریم ﷺ کے املاء کرانے سے قبل ان کی زبان سے آیت مذکورہ کے آخری الفاظ نکلے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا اسی طرح لکھ دو یہی الفاظ نازل ہوئے ہیں۔ پھر عبد اللہ نے کہا اگر محمد (ﷺ) نبی ہیں اور ان کی طرف وحی کی جاتی ہے تو میں بھی نبی ہوں۔ میری طرف بھی وحی کی جاتی ہے۔ پس یہ کہ کرو مرتد ہو گیا اور مکہ چلا گیا۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ فتح کیا تو آپ ﷺ نے اور چند افراد کو واجب القتل قرار دینے کے ساتھ ساتھ اسے بھی واجب القتل قرار دیا۔ اور اس کا خون مباح قرار دیا۔ پھر وہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس حاضر ہوا (اور آپ سے سفارش کی درخواست کی) چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں اس کی امان کی درخواست کی۔ تو آپ ﷺ کافی دیر تک خاموش رہے اور پھر ارشاد فرمایا نعم۔ (جی ہاں اچھا) جب حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہاں پہلے گئے تو حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا میں اس لئے آئی دیر تک خاموش رہا تا کہ اس دوران تم اسے قتل کرو۔ (تم نے ایسا کیوں نہ کر دیا) تو ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے ہمیں اشارہ کیوں نہ کر دیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کسی نبی کے لئے یہ زیبا نہیں کہ اس کی آنکھ خیانت کی مرتکب ہو۔ پھر وہ اسی دن اسلام لے آیا اور پھر خوب اچھی طرح اسلام پر کار بند رہا۔

میں کہتا ہوں کہ تکمیل ارشاد میں عبد اللہ کے مرتد ہونے نبی کریم ﷺ کی جانب سے اس کا خون مباح ہونے اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جانب سے سفارش کرنے وغیرہ کا ذکر موجود ہے۔ مگر اس میں مرتد ہونے کا یہ سبب مذکور نہیں کہ آپ ﷺ کے املاء

کرانے سے قبل اس نے اس آیت کے الفاظ کہہ دیئے تھے۔ اور فی الحقیقت بھی اس کے مرتبہ ہونے کا یہ سبب نہیں بن سکتا کیونکہ وہ عہد بنو نوحہ میں مرتبہ ہوئے جبکہ یہ سورۃ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ واللہ اعلم۔

ثُمَّ إِنَّكُمْ بَعْدَ ذَلِكَ لَكَيْسُونَ ﴿١٠﴾ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُونَ ﴿١١﴾ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَائِقَ ﴿١٢﴾ وَمَا كُنَّا عَنِ الْغَافِلِينَ ﴿١٣﴾ وَ أُنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ فَأَسْكَنَتْهُ فِي الْآرْمِضِ ﴿١٤﴾ وَإِنَّا عَلَى ذَهَابٍ بِهِ لَقَادِرُونَ ﴿١٥﴾

”پھر یقیناً تم ان مرحلوں سے گزرنے کے بعد مرنے والے ہو۔ پھر بلاشبہ تمہیں روز قیامت (قبروں سے) اٹھایا جائے گا۔ اور بیشک ہم نے تمہارے اوپر سات راستے بنا دیئے اور ہم اپنی مخلوق (کی مصیبتوں) سے بے خبر نہ تھے۔ ہم نے اتارا آسمان سے پانی اندازہ کے مطابق پھر ہم نے ٹھہرایا اسے زمین میں اور یقیناً ہم اسے باکل ناپید کرنے پر پوری طرح قادر ہیں۔“

۱۔ ہم نے تمہارے بارے میں جن مراحل کا ذکر کیا ہے، ان سے گزرنے کے بعد اور اپنی مدت پوری کر لینے کے بعد یقیناً تم تمام مرنے والے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں عین صفت کا ذکر کیا گیا ہے جس میں (دوام) اور ثبوت کا معنی پایا جاتا ہے۔ اسم فاعل کا صیغہ ذکر نہیں فرمایا (کیونکہ وہ معنی ثبوت پر دلالت نہیں کرتا) ترکیب کلام میں یہ جملہ اپنے معطوفات سمیت وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ والی آیات پر معطوف ہے۔ اور اس میں غیب سے خطاب کی طرف التفات ہے۔ پھر اس جملہ کو ان اور ام کے ساتھ مؤکد کیا گیا ہے۔ کیونکہ لوگ گناہوں کے ارتکاب پر مصر ہوتے ہیں۔ اور یہی موت اور جنت بعد الموت سے ان کے انکار کی دلیل ہے۔ پس اس طرح وہ ان دونوں کا انکار کرنے والوں کے قائم مقام ہو گئے۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ میت اور مائت وہ ہوتا ہے جو ابھی تک نہ مرا ہو اور معترب مرنے والا ہو۔ اور میت بالتحقیف وہ ہوتا ہے جو مر چکا ہو۔ اسی لئے یہاں اسے تخفیف کے ساتھ پڑھنا جائز نہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے۔ إِنَّكَ مَيِّتٌ وَ إِنَّهُمْ قَيِّمُونَ۔ (۱) قاموس میں ہے کہ مائت مَيِّتٌ (باب لھر۔ بصر) مائت مَيِّتٌ (باب ففتح یفتح) اور مائت مَيِّتٌ (باب ضرب۔ بضر) فہو میت بالتحقیف اور مَيِّتٌ بالتحقیف یہ حتیٰ کی ضد ہے۔ اور مائت کا معنی ساکن ہونا اور سو جانا بھی ہے۔ یا پھر میت بالتحقیف کا معنی ہے جو مر چکا ہو اور میت اور مائت سے مراد وہ ہے جو ابھی تک نہ مرا ہو (2)

۲۔ پھر تمہیں قیامت کے دن اپنی قبروں سے حساب و کتاب اور جزا و سزا کے لیے اٹھایا جائے گا۔

۳۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَائِقَ کا جواب ہے۔ اور اس کا عطف وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ پر ہے۔ سبغ طرّ آفئ سے مراد سات آسمان ہیں۔ کیونکہ ان میں سے بعض بعض کے اوپر ہیں، اور ہر وہ شئی جس کے اوپر اسی کی مثل شئی ہو تو نیچی والی شئی کو طریقت کہا جاتا ہے۔ یا پھر آسمانوں کو طرائق اس لئے کہا گیا ہے کہ ان میں ملائکہ یا ساروں کے چلنے کے راستے ہیں۔ بالخلق سے مراد جن مخلوق ہے۔ معنی یہ ہے کہ ہم جن مخلوق کے معاملات سے بے خبر اور انہیں مہمل چھوڑنے والے نہ تھے۔ بلکہ ہم ان کے زوال پذیر ہونے اور ان میں غفلت پڑنے سے ان کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اور ہم اس کے معاملات کی تدبیر کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اس حد کمال تک پہنچ جاتا ہے جو ہم

نے اس کے لئے اپنی حکمت کے تقاضے کے مطابق مقرر کی ہے۔ ہماری مشیت ان معاملات سے متعلق ہے اور وہ آسمانوں کو زمین پر گرنے سے روکے ہوئے ہے۔

ترکیب کا ہم میں یہ جملہ یا تو خلقنا کے فاعل سے حال ہے یا قول باری تعالیٰ لَقَدْ خَلَقْنَاكَ مَعْظُوفٌ ہے۔ اور یہ مقام تعلیل میں واقع ہے یعنی ہم نے تمہارے اوپر سات آسمان بنائے ہیں تاکہ ہم تم پر طرح طرح کے رزق اور برکتوں کے دروازے کھول دیں۔ اور تم پر آفتاب و مابتاب اور ستارے چمکتے رکھتے رہیں۔ کیونکہ ہم تم سے اور تمہاری مصلحت سے متعلقہ امور سے فاعل اور بے خبر نہیں تھے۔

یہ اس میں ماء سے مراد بارش ہے۔ یعنی ہم نے آسمان سے بارش کا پانی اتارا۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف حلقنا پر ہے۔ بِقَدْرِ سے مراد اتنی مقدار ہے جسے ہم نے مخلوق کے لئے نفع بخش اور مصلحت آمیز بنا دیا۔ فَاَسْكِنُكَ كَمَا عَطَفْتُ كَمَا سَابِقٌ پر ہے۔ یعنی ہم نے پانی کو زمین میں ثابت کر دیا ہے اور ٹھہرا لیا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ پانی ہے جو آسمانوں اور گھڑوں میں جمع ہو کر باقی رہتا ہے اور بارش نہ ہونے کے وقت لوگ اس سے نفع اٹھاتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ پانی ہے جسے زمین اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ وہ پانی اس کے مساموں سے اندر داخل ہو جاتا ہے۔ پھر اسی کے سبب زمین میں چشمے پھوٹتے ہیں۔ اس بنا پر زمین سے نکلنے والا تمام پانی آسمان سے ہی نازل شدہ ہوتا ہے۔

وَأَنَا عَلِيُّ ذَهَابٌ مَّاءٌ كَمَا عَطَفْتُ فَاَسْكِنُكَ پر ہے۔ یعنی ہم اسے زائل کرنے اور مکمل طور پر ناپید کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ چاہے اسے خراب کر دیں یا بھاپ بنا کر اڑادیں۔ یا پھر زمین میں اتنی کھرائی تک پہنچا دیں کہ تمہارا اس تک پہنچنا ہی محض ہو جائے۔ ذَهَابٌ كَمَا عَطَفْتُ مَاءٌ كَمَا عَطَفْتُ فَاَسْكِنُكَ پر ہے۔ اور اسے واپس لوٹانے میں اظہارِ مبالغہ مقصود ہے۔ لَقَدْ زُوِّنَ كَمَا مَقِيٌّ یہ ہے کہ ہم پانی کو زائل کرنے کی قدرت اسی طرح رکھتے ہیں جیسے ہم اسے نازل کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ اگر ہم اس طرح کر دیں تو تم یہاں سے مر جاؤ تمہارے جانور ہلاک ہو جائیں اور تمہاری زمینیں بخر ہو جائیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حدیث طبریہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چار دریا بابت سے اتارے ہیں۔ یعنی حیان، حیران، وجہ اور فرات (۱)۔ اور انہوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ حسن بن سفیان نے عثمان بن سعید سے بآلاجات سعید بن سابق الاسکندرانی سے انہوں نے سلمہ بن علی سے انہوں نے مقاتل بن حبان سے انہوں نے مکرمہ کے واسط سے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اور انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کے درجات میں سے نچلے درجہ میں موجود ایک چشمے سے پانچ دریا اتارے ہیں۔ حیان، حیران، وجہ اور فرات اور نیل۔ اللہ تعالیٰ نے ان پانچوں کو حضرت جبرائیل علیہ السلام کے دونوں پروں پر نازل کیا۔ پھر آپ نے انہیں پہاڑوں کے سپرد کیا۔ اور زمین میں جاری کر کے انہیں لوگوں کے لئے نفع بخش بنا دیا۔ اسی کے بارے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بَقِيَّةً لِّكَافَّةً فِي الْأَرْضِ يَبْرِجُ جَبَّاجُوجُ كَمَا زَمَانَةٌ كَمَا تَوَلَّى اللَّهُ تَعَالَى جِبْرَائِيلَ امِينًا كُوْنُ يَحْيِيهِمْ كَا۔ اور زمین سے قرآن کریم تمام علوم و حرام و حلال مقام ابراہیم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام کے تابوت کو انہیں موجود چیزوں سمیت اور ان پانچوں دریاؤں کو زمین سے آسمان کی طرف اٹھالے گا۔ اسی کی جانب اس ارشاد میں اشارہ ہے وَإِنَّا لَعَلُّ ذَهَابٌ مَّاءٌ نَفْسٌ مُرْوَاتٌ۔ پس جب یہ تمام چیزیں زمین سے اٹھائی جائیں گی تو زمین کے باسی دین و دنیا کی بھلائی سے محروم ہو جائیں گے (۲)۔ میں کہتا ہوں کہ شاید دنیا

کے تمام دریا جنت کے چشموں سے ہی جاری ہوئے ہیں۔ اور حدیث طیبہ میں صرف پانچ کا ذکر بطور تشبیل ہے۔ واللہ اعلم۔

فَأَشْنَأْنَا لَكُمْ بِهِ جَنَّتٍ مِّنْ تُخَيْلٍ وَ أَعْلَبٍ لَّكُمْ فِيهَا قَوَائِكُمْ كَثِيرَةٌ وَ مِنْهَا تَأْكُلُونَ ﴿١٠﴾ وَ شَجَرَةٌ تَخْرُجُ مِنْ طُورٍ سَيْبَاءَةٍ تَنْثُرُ بِلُدُنِّهِمْ وَ صِهْرٌ لِّأَكْلِيئِنَ ﴿١١﴾

”پھر ہم نے اگائے تمہارے لئے اس پانی سے باغات کھجوروں اور انگوروں کے تمہارے لئے ان میں بہت سے پھل ہیں اور ان میں سے تم کھاتے بھی ہو۔ نیز پیدا کیا ایک درخت جو اگتا ہے طور سینا میں وہ اگتا ہے تیل لئے ہوئے اور سائے لئے ہوئے کھانے والوں کے لئے ہے۔“

۱۰. فَأَشْنَأْنَا کا عطف اَنْزَلْنَا پر ہے۔ بہ کی وہ ضمیر کا مربع مآء (پانی) ہے۔ فِیْہَا میں خانمیر کا مربع جنات ہے۔ اسی طرح مِنْہَا کی خانمیر سے مراد بھی جنات ہے۔ معنی یہ ہے کہ ہم نے اس پانی سے تمہارے لئے باغات اگائے ہیں۔ جن میں کھجوروں اور انگوروں کے علاوہ کثیر ایسے پھل پائے جاتے ہیں جن سے تم تھکے حاصل کرتے ہو اور لطف اندوز ہوتے ہو۔ اور انہی میں سے بعض پھلوں اور دیگر پیداوار کو بطور غذا استعمال کرتے ہو رزق حاصل کرتے ہو اور اپنا سامان زینت حاصل کرتے ہو۔ اسی معنی میں عربوں کا یہ قول فُلَانٌ یَأْكُلُ مِنْ جَوْفِہِہِ (فلاس اپنے حرفہ اور پیشے کے سامان زندگی حاصل کرتا ہے)

یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر کا مربع نخعیل اور اعصاب کے الفاظ ہوں، یعنی تمہارے لئے ان کے پھلوں میں تھکے اور لطف اندوز ہونے کی طرح طرح کی اقسام ہیں۔ مثلاً تر کھجوریں (چھوڑے) انگور کھجوریں کشمش جوس اور رس وغیرہ۔ صرف کھجور اور انگور کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کیونکہ یہی دونوں پھل عرب میں کثرت سے پائے جاتے تھے۔ ترکیب کلام میں مِنْہَا تا کلون کا جملہ ظرف کے فاعل سے حال ہے، یعنی لکم فیہا فواکہ۔ یا پھر اس پر اور جنات یا نخعیل پر معطوف ہے۔

۱۱. وَ شَجَرَةٌ تَخْرُجُ الْآیَةِ کا عطف جنات پر ہے۔ اور شَجَرَةٌ سے مراد جنات کا درخت ہے۔

اہل حجاز اور ابو عمرو نے سیناء کی بجائے سَبِیْنَاءَ پڑھا ہے۔ جبکہ ابن عامر یعقوب اور کوفیوں نے اسے سَبِیْنَاءَ پڑھا ہے۔ علماء نے سیناء اور سینین کے مختلف معنی ذکر کئے ہیں۔ مثلاً مجاہد نے کہا ہے اس کا معنی برکت ہے، یعنی برکت والے پہاڑ سے ایک درخت اگتا ہے۔ قتادہ ضاحک اور کرم نے اس کا معنی حسن کیا ہے، یعنی خوبصورت اور حسین پہاڑ۔ ضاحک نے کہا ہے یہ قبلی زبان کا لفظ ہے۔ اور کرم نے اسے حبشی زبان کا لفظ قرار دیا۔ یکلی نے کہا ہے اس کا معنی ہے درختوں والا۔ یعنی گھنے درختوں والا پہاڑ۔ بعض نے کہا ہے یہ سریانی زبان کا لفظ ہے۔ مقاتل کا قول ہے ہر وہ پہاڑ جس پر کثرت سے پھل دار درخت ہوں اسے عظمی زبان میں سیناء اور سینین کہا جاتا ہے (۱)۔ مجاہد کا نظریہ یہ ہے کہ سیناء پتھر کی ایک معینہ قسم کا نام ہے۔ چونکہ وہ خاص قسم کا پتھر اس پہاڑ میں پایا جاتا ہے اسی لئے اسی کے نام پر پہاڑ کا نام رکھ دیا گیا۔

کرم نے کہا ہے یہ اس جگہ کا نام ہے جہاں یہ پہاڑ واقع ہے (۲)۔ بعض کا خیال ہے کہ طور سیناء دونوں لفظوں سے مرکب ایک پہاڑ کا نام ہے جو مصر اور اریطہ کے درمیان واقع ہے۔ اور وہیں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ندا دی گئی۔ جیسا کہ امرؤ القیس ایک نام ہے۔ ابن زید نے اسی طرح کہا ہے۔

سیناء کے غیر منصرف ہونے کا سبب معرّفہ اور عجم یا علی تاویل بقول تائید اور ترجمہ ہے۔ اس کے غیر منصرف ہونے کا سبب تائید یا الف نہیں۔ کیونکہ یہ فیعال کے وزن پر ہے۔ جیسے دیماں۔ اور سناء بمعنی رفعت و بلندی سے ماخوذ ہے۔ یا پھر اس میں الف مقصورہ بمعنی نور ہے۔ یا یہ فیعال سے ملحق ہے۔ کیونکہ یہ فعلیّہ کے وزن پر نہیں جس میں الف تائید موجود ہے۔ یہ اہل حجاز کی قرأت کے مطابق ہے۔ لیکن یہ کوئیوں کی قرأت کے مطابق فیعال کے وزن پر ہے۔ جیسا کہ تخمیناً ہے۔ یا پھر فعلاء کے وزن پر ہے۔ جیسے صحرا و اور اسکا الف تائید کیلئے ہے۔ فعلاں کے وزن پر نہیں۔ کیونکہ یہ وزن ان کے کلام میں نہیں پایا جاتا۔

اس ابن کثیر ابو عمرو اور یعقوب نے تثبیت کو باب افعال سے تا کے ضمہ اور باء کے کسرہ کے ساتھ تثبیت پڑھا ہے۔ یعنی زیتون کا درخت آتا ہے۔ درآ نکلیکہ وہ تیل بھی اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ زجاج نے کہا ہے کہ باء یہاں حال کے لئے ہے۔ یعنی تیل اپنے ساتھ ہوتا ہے۔ (۱) بعض نے کہا ہے کہ بالذھن میں بلنہ لاندہ ہے۔ اور بعض نے کہا ہے انث بمعنی برب ہے۔ اور معنی باقیوں کی قرأت کے مطابق ہی ہے، یعنی یہ لفظ تاء کے فتح اور باء کے ضمہ کے ساتھ باب مجرد سے ہی ماخوذ ہے یعنی وہ درخت آگتا ہے درآ نکلیکہ اپنے ساتھ تیل لے جاتا ہے۔ اور یہ کہنا جائز ہے کہ باء تعدی کے لئے ہو۔ اور اس کا معنی ثَبَّتِ الذَّهْنُ ہو۔ (یعنی وہ درخت تیل پیدا کرتا ہے) اور کھانے والوں کے لئے سامن لئے ہوتا ہے۔ ترکیب کلام میں "وصنیح" الذَّهْنُ پر معطوف ہے۔ لہذا اسے وہی کسرہ کا اعراب دیا گیا ہے۔ اس میں ایک شی کے دو معنوں میں سے ایک کا دوسرے پر عطف ہے، یعنی یہ ایسا درخت آگتا ہے جس میں تیل بھی ہوتا ہے جو ماش کے کام آتا ہے۔ اور اس سے چراغ بھی جلائے جاتے ہیں۔ اور وہ سامن کے کام بھی آتا ہے۔ جس میں روئی ڈبوئی جا سکتی ہے جو ماش علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ صیغ اور صباغ سے مراد وہ سامن ہے جس میں روئی ڈبوئی جا سکتی ہو اور روئی اس سے رنگین ہو۔ جاتی ہو۔ اور اوام سے مراد ہر وہ سامن ہے جس سے روئی کھائی جا سکتی ہو۔ چاہے وہی اس سے رنگی جائے یا نہیں۔ (۲) مقاتل نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس درخت میں سامن اور تیل دونوں پیدا کئے ہیں۔ سامن (اوام) زیتون سے اور دھن (تیل) ازیت ہے (۳) طور کو زیتون کے لئے خاص اس لئے کیا گیا ہے کیونکہ سب سے پہلے زیتون کا درخت اسی پڑا گا۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ زیتون وہ پہلا درخت ہے جو طوقان نوح کے بعد سب سے پہلے دنیا میں اگا (۴)

وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ نُسْقِيكُمْ مِمَّا فِي بُطُونِهَا وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ
كَثِيرَةٌ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ۗ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُونَ ۝ وَلَقَدْ
أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ مَلَائِكُمْ مِنْ إِلَهِ
عِبْرَةٍ ۗ أَفَلَا تَتَّقُونَ ۝

"اور جبکہ تمہارے لئے جانوروں میں بھی غور و فکر کا مقام ہے۔ ہم پلاتے ہیں تمہیں اس (دودھ) سے جو ان کے شکموں میں ہے اور تمہارے لئے ان میں طرح طرح کے بہت فائدہ ہیں اور انہیں کے گوشت سے تم کھاتے ہو اور ان پر اور کشتیوں پر تمہیں سوار کیا جاتا ہے۔ اور ہم نے بھیجا نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی طرف تو آپ نے فرمایا اسے میری قوم! اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، تمہیں ہے تمہارا کوئی خدا اس کے بغیر۔ کیا تم (بت پرستی کے انجام سے) نہیں

ڈرتے ہیں۔

۱۔ عبرت کا معنی علامت، نشانی اور دلیل ہے، یعنی تمہارے لئے جانوروں کی حالت میں ایسی نشانیاں اور عمارتیں موجود ہیں جن سے تم انہیں پیدا کرنے والے کی حکمت اور کمال قدرت پر استدلال کر سکتے ہو۔ چونکہ اکثر لوگ ان کی حالت میں گہری غور و فکر کرنے سے غافل ہوتے ہیں، (ان سے عبرت اور درس حاصل نہیں کرتے) اس لئے انہیں انکار کرنے والوں کی مثل قرار دے کر جملہ مؤکدہ ذکر کیا گیا ہے۔ (یعنی شروع میں ان حرف برائے تاکید کے لئے لگا یا گیا ہے)۔ ترکیب کلام میں اس جملہ کا عطف *فَانَسْنَا مَا لَكُمْ* پر ہے۔

۲۔ نافع ابن عامر ابو بکر اور یعقوب نے *نَسْفِئُكُمْ* کو باب مجرد سے صیغہ جمع متکلم ہونے کی بناء پر نون مفتوح کے ساتھ *نَسْفِئُكُمْ* پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے باب افعال سے صیغہ جمع متکلم بنا کر نون کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ جیسا کہ ہم سورہ نحل میں ذکر کر چکے ہیں۔ ابو جعفر نے اس مقام پر باب مجرد سے صیغہ واحد موصوت غائب ہونے کی بناء پر اسے تا مفتوحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اس قرأت کے مطابق تعمیر کا مرخ *الانعام* ہے۔

مِمَّا فِي بُطُونِهَا سے مراد دودھ ہے یا چارو۔ کیونکہ دودھ بھی چارے سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ یہ من یا تمغیضیہ ہے یا ابتدا یہ ہے۔ اور ان میں تمہارے لئے طرح طرح کے بہت فائدہ مند ہیں، یعنی ان کی پشتوں یا بالوں اور اون وغیرہ میں کثیر فوائد ہیں۔ اور انہیں میں سے بعض کے گوشت تم کھاتے ہو۔ گویا تم ان کی ذاتوں کے منافع اور فوائد حاصل کرتے ہو۔

۳۔ *عَلَيْهَا* کی حاضریہ کا مرخ *الانعام* ہے۔ اور جانوروں اور کشتیوں پر تمہیں خشکی اور سمندر میں سوار کیا جاتا ہے۔ کیونکہ بعض ایسے جانور ہیں جن پر بوجھ لا دیا جاتا ہے۔ مثلاً اونٹ اور تیل وغیرہ۔ بعض لے کر کہا ہے کہ اس سے مراد صرف اونٹ ہے۔ کیونکہ علاقہ عرب میں صرف اسی پر ہی بوجھ لا دیا جاتا ہے اور سوار ہوا جاتا تھا۔ اور لفظ فلک کیساتھ مناسبت بھی یہی رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ خشکی کا فائدہ کہلاتا ہے۔ ذوالرحمہ کا قول ہے *سَبَفْنَا بَرَّ نَحْتِ حَدِّي وَ مَابَهَا*۔ (خشکی کے جہاز کی کام میرے رخسار کے نیچے ہے) اور اس میں ضمیر ایسے ہی ہے جیسے اس ارشاد میں *وَبَعُولَتَيْنِ آخَىٰ بِرَبِّهِنَّ*۔

نَسْفِئُكُمْ سے لے کر تا آخر مکمل جملہ عبرت کا بیان اور وضاحت ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ گوبر اور خون کے درمیان سے پینے والوں کے لئے خالص لذیذ سفید رنگ کا دودھ پیدا فرماتا ہے۔ یہ عبرت اور درس حاصل کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ملکہ کی واضح دلیل ہے۔ اور ان میں مزید عبرت کی علامت اور نشانی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو قوی ہیکل عظیم ایٹھ جانوروں دودھ دہنے کے لئے اون اور بال کاٹنے کے لئے سواری اور بار برداری کے لئے نیز ذبح کرنے کے لئے ایک ضعیف اور کمزور انسان کے لیے مطیع اور تابع فرمان بنا دیا ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ملکہ اور حکمت نامہ کی بہت بڑی دلیل اور نشانی ہے۔

۴۔ *وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا* کا عطف *وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ* پر ہے۔ سورت کے شروع میں مطیع فرمانبردار اہل ایمان کے حالات کا ذکر کیا گیا ہے۔ پھر اس کے بعد وہ آیات لائی گئی ہیں جو ایمان و طاعت کا تقاضا کرتی ہیں۔ اور پھر سرکش کفار کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور ان کے انجام کا تذکرہ ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا اسے میری قوم! اللہ تعالیٰ کی عبادت و طاعت اختیار کرو اور اس کی وحدانیت کا اقرار کرو۔ اس کے سوا تمہارے لئے کوئی معبود نہیں۔

ترکیب کلام میں جملہ فاسمجنہا، بہذا یؤید کے قائل سے حال ہے اور حال اور اس کے عامل کے درمیان جملہ شرطیہ مختصر ہے۔ یہ نہیں ہے مگر ایسا شخص جسے جنوں کا مرض ہو گیا ہے۔ کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے رسول ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ اِنْ هُوَ اِلَّا زُخْلُ الْاٰیۃ جملہ مستأنفہ ہے۔ یا نئی رسالت کی تاکید کے لئے ہے۔ کیونکہ جنوں کبھی بھی رسول نہیں ہو سکتا۔ سو تم اسے برداشت کرو اور اس کے انجام کا انتظار کرو۔ شاید اسے جنوں سے افادہ ہو جائے۔ یا پھر یہ مر جائے۔

فَتَرَوْهُم مِّنْ سَآءِیۡہِیۡہِیۡہِ۔ کیونکہ اس کا جنون ہونا ہی انتظار کرنے اور جلدی انتقام نہ لینے کا موجب ہے۔

جب حضرت نوح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے بذریعہ وحی یہ بتا دیا گیا کہ آپ کی قوم میں سے سوائے ان افراد کے جو ایمان لائے ہیں اور کوئی ایمان نہیں لائے گا۔ تو پھر انہوں نے عرض کی اے رب! تو ہی میری مدد فرما، یعنی انہیں ہلاک ویر باد کرو اور جس عذاب سے میں انہیں ڈراتا رہا ہوں اس کا وعدہ پورا فرما دے کیونکہ انہوں نے تو میری تکذیب کر دی ہے اور مجھے سمجھا یا ہے۔ ہاں میں باء برائے بدل ہے یا عیب ہے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ مستأنفہ ہے۔

فَاَوْحٰیۡنَاۤ اِلَیۡہِۡہٗ اَنْ اَصۡبِرِ الْعُقٰتَ بِاَعۡیۡنِنَا وَّوَحِیۡنَا فَاِذۡ اَجَآءَ اَمۡرُنَا وَاَقۡرَأَ الشُّعۡرٰۃَ
فَاَسۡلَکَ فِیۡہَا مِنْ کُلِّ رُوۡحِیۡنِ الشُّجَیۡنِ وَاَهۡلَکَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیۡہِ الْقَوۡلُ
مِنۡہُمۡ ۚ وَلَا تَحۡطِیۡبِیۡ فِیۡ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡۤا اِنَّہُمۡ مُّعۡرَظُوۡنَ ﴿۵﴾

”تو ہم نے وحی بھیجی ان کی طرف کہ بناؤ ایک کشتی ہماری نگاہوں کے سامنے اور ہمارے حکم کے مطابق۔ پھر جب آجائے ہمارا عذاب اور (پانی) اہل پڑے تنور سے، تو داخل کر لو اس میں ہر جوڑے میں سے دو دو، اور اپنے گھر والوں کو بجز ان کے جن کے بارے میں پہلے فیصلہ ہو چکا ہے ان میں سے اور گفتگو نہ کرنا میرے ساتھ ان کے متعلق جنہوں نے ظلم کیا وہ تو ضرور نغرق کئے جائیں گے“

فَاَوْحٰیۡنَا کا عطف مقدر عبارت پر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے فَاَسۡتَجِنَا ذُعَاۃَہٗ فَاَوْحٰیۡنَا۔ پس ہم نے حضرت نوح علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی اور ان کی طرف وحی بھیجی کہ ہماری حفاظت میں ایک کشتی بناؤ کہ اس کے بچانے میں کوئی خطا اور غلطی نہیں ہوگی یا تمہارے اس کام کو کوئی خراب نہیں کر سکے گا۔ اِنْ اَصۡنَعۡ مِیۡنَ اَوْحٰیۡنَا کی تفسیر کے لئے ہے، یعنی یہ ان طمرہ ہے۔ کیونکہ یہ قول کے معنی میں ہے۔

اور کشتی بناؤ ہمارے حکم اور ہماری تعلیم سے کہ وہ کیسے بنائی جاتی ہے۔ پھر جب کشتی پر سوار ہونے یا عذاب نازل ہونے کے بارے ہمارا حکم آجائے۔ ترکیب کلام میں فَاِذَا جَآءَ الْاٰیۃَہٗ کا عطف اَنْ اَصۡنَعۡ پر ہے۔ اور دروئیاں پکانے کے تنور سے پانی اہل پڑے تو خود بھی کشتی میں سوار ہو جاؤ اور اپنے ساتھ متعین کو بھی سوار کرو۔ گویا حضرت نوح علیہ السلام کے لئے تنور سے پانی اٹھنے کو علامت اور نشانی قرار دیا۔ پھر جب تنور سے پانی ٹھکانا شروع ہو گیا اور آپ کی زوجہ نے آپ کو اس کی اطلاع دی تو آپ کشتی پر سوار ہو گئے۔ آپ کا محل کوئی مسجد میں باب کندہ سے داخل ہوتے وقت دائیں جانب واقع تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ آپ شام کی ایک پہاڑی کی چوٹی پر رہائش پذیر تھے۔

ج تو اس میں ہر جوڑے میں سے دو دو داخل کر لو۔ سُلُک فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے سلکت فی سکتا، یعنی میں فلاں جگہ داخل ہوا۔ (اس جملہ میں یہ لازم استعمال ہوا ہے) اور ارشاد خداوندی ہے **صَاسِكُمْ لَكُمْ فِي سَقَرًا**۔ (تمہیں جہنم میں کس نے داخل کیا) (یہاں فعل متعدی استعمال ہوا ہے)

لفظ **كُلٌّ** کو جسم جوڑنے زودین کی طرف مضاف کر کے پڑھا ہے۔ اس صورت میں اثنین مفعول ہونے کی بنا پر مضموم ہے۔ معنی یہ ہے کہ حیوانات کی تمام اقسام میں سے دو دو اس میں داخل کر لو، یعنی ایک مذکر (نر) اور ایک مؤنث (مادہ) (مفصّل نے **كُلٌّ** کو مضاف الیہ کے عوض توین کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی اس میں ہر نوع میں سے جوڑا جوڑا داخل کر لو۔ اس صورت میں اثنین زودین کی تاکید کے لئے ہے۔

اس واقعہ میں یہ بھی بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کے پاس ہر قسم کے جانور مردے پرندے اور دیگر جانور جمع کروائے۔ آپ اپنے دونوں ہاتھ ان میں سے ہر قسم پر رکھتے تو آپ کا دایاں ہاتھ مذکر (نر) پر پڑتا اور بائیں ہاتھ مؤنث (مادہ) پر پڑتا۔ پس اس طرح آپ انہیں جنتی میں سوار کر لیتے تھے۔

اس اپنے اہل کو اس میں سوار کر لیجئے اہل سے مراد یا تو آپ کے اہل خانہ ہیں یا وہ تمام لوگ ہیں جو آپ کے ساتھ ایمان لائے۔ مگر اہل میں وہ افراد داخل نہیں جنہیں حالت کفر میں ہلاک کئے جانے کا فیصلہ ازل سے ہی کیا جا چکا تھا آپ کے اہل میں سے ان افراد میں آپ کی بیوی اور بیٹا کفکان تھے۔

سبق کا صلہ علیہ ذکر کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ ازلی فیصلہ ان کے لئے ضرور مسال تھا۔ اور علی کا لفظ اسی معنی پر دلالت کرتا ہے اس لئے یہاں صلہ علی ذکر کیا گیا ہے۔ جبکہ لام انتفاع کے لئے آتا ہے۔ جیسا کہ اس ارشاد باری تعالیٰ میں ہے **إِنَّ الْإِنِّ سَبَقَتْ لَهُمْ مَثَأَ الْحُسْنَى**۔ چونکہ اس میں ازلی فیصلہ نفع بخش ہے اس لئے صلہ لہم ذکر کیا گیا ہے۔

وَلَا تُخَاطِبُنِي كَالْعَافِيَةِ إِذْ أُصِغِرْتُ یا **فَأَسْلُكُ** پر ہے، یعنی جنہوں نے کفر کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا انہیں بچانے کے لئے ان کے حق میں مجھ سے دعا نہ کرنا۔ کیونکہ وہ تو شرک کرنے کے سبب اپنے ظلم کی وجہ سے بالیقین عرق کینے جائیں گے۔ **إِنَّهُمْ مُعْرِضُونَ** قول باری تعالیٰ **لَا تُخَاطِبُنِي** کے لئے جملہ معللہ ہے۔

فَإِذَا اسْتَمِيَّتْ أَنْتَ وَمَنْ مَعَكَ عَلَى الْفُلِكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي نَجَّسَنَا مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝۵۰ وَ قُلْ رَبِّ أَنْزِلْنِي مُنْزَلًا مُبْرَكًا وَ أَنْتَ حَيُّ الْمُنْتَهَى ۝۵۱ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّرَبِّكَ لَعَلَّكَ تَتَذَكَّرُ ۝۵۲

”پھر جب اچھی طرح بیٹھ جائیں آپ اور آپ کے ساتھی کشتی کے عرش پر تو کہنا سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے جس نے ہمیں نجات دی ظالم قوم (کے جوہرہ) سے۔ اور یہ بھی عرض کرنا کہ اے میرے رب! اتار مجھے بابرکت منزل پر لے اور تو ہی سب سے بہتر اتارنے والا ہے۔ ج۔ بیٹک اس قصہ میں ہماری قدرت کی نشانیاں ہیں اور ہم ضرور (اپنے بندوں کو) آزارینوالے ہیں سے۔“

پھر جب آپ اور آپ کے ساتھی کشتی کے عرش پر اچھی طرح بیٹھ جائیں۔ اور برے پڑوسیوں کی مصاحبت اور سنگت سے نجات پا جائیں، تو کہنا سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے ہمیں ظالم قوم کے جوہرہ سے نجات دی۔ اور یہ کہنا اے میرے رب! سوار

ہونے کے بعد کشتی میں یا کشتی سے نکلنے کے بعد زمین میں مجھے پابرت منزل پر اتار۔

ابوبکر نے عام سے منجز لاکے قرأت خیر لایینی میم مفتوح اور زامکسور کے ساتھ نقل کی ہے۔ اس کا معنی ہے اترنے کی جگہ۔ باقیوں نے میم کو مضموم اور زام کو مفتوح پڑھا ہے۔ اور یہ معنی انزال اتارنا ہے۔

منجز کا پابرت۔ اس سے مراد وہ شی ہے جو دارین میں خیر اور بھلائی میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔ اب کشتی میں برکت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کی مصاحبت اور سنگت سے نجات اور عبادت الہی میں مشغول ہونے کے لئے ذریعہ بنو۔ اور کشتی سے نکلنے کے بعد زمین میں برکت سے مراد یہ ہے کہ نسل میں اضافہ اور رزق میں کثرت کا ہونا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہونا۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ شرطیہ فاسلک پر معطوف ہے۔

۱۱۔ اور تو ہی سب سے بہتر اتارنے والا ہے۔ ترکیب کلام میں وَأَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِينَ کا جملہ أَنْزَلْنِي کے قائل سے حال ہے۔ اور اس میں تعریف آپ کی دعا کے مطابق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صرف حضرت نوح علیہ السلام کو دعا کا حکم ارشاد فرمایا کہ اپنے لئے اور اپنے ساتھیوں کے لئے مساوی ایک جیسی دعا مانگیں۔ تو اس میں آپ علیہ السلام کی فضیلت کا اظہار ہے۔ اور ساتھ ہی یہ احساس دلایا گیا ہے کہ آپ کی دعا ہی آپ کے ساتھیوں کے لئے بھی کافی ہے۔ (انہیں مزید دعا کی ضرورت نہیں)

۱۲۔ جینک اس قصہ میں، یعنی جو کچھ ہم نے حضرت نوح علیہ السلام اور آپ کی قوم کے ساتھ کیا۔ اس میں ایسی نشانیاں ہیں جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور تام ہے۔ وہ مسلمانوں اور مطیع و فرمانبردار لوگوں کے ساتھ انتہائی راحت و رحمت کا سلوک کرتا ہے۔ اور ظلم کرنے والوں کے لئے اس کا غضب انتہائی شدید اور سخت ہے۔ اہل بصیرت ان علامات سے درس عبرت حاصل کرتے ہیں۔ وَأَنْتَ كُنَّا لَمُنْتَلِينَ میں ان خلفہ عن خلفہ ہے۔ یہ اصل میں ان تھا۔ اور لستلین پر لام فارق ہے۔ (یعنی ان خلفہ اور ان نافیہ میں فرق کرنے کے لئے ہے) یعنی ہم حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کو انتہائی شدید اور عظیم مصائب میں مبتلا کرنے والے تھے۔ یا ہم اپنے بندوں کی آزمائش کرنے والے ہیں۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ ان نافیہ ہے اور لام معنی اللہ ہے، یعنی نوح علیہ السلام کو رسول بنا کر مبعوث کرنے اور ان کے وعظ و وصیحت کرنے سے اس کے سوا کوئی مقصد نہ تھا کہ ان کی قوم کو آزمائیں۔ اور انہیں امتحان میں ذلیل بنا کر ہم دیکھیں کہ وہ عذاب نازل ہونے سے قبل کیسے عمل کرتے ہیں۔

ثُمَّ أَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ ﴿٦٠﴾ فَأَمْرَسْنَا فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ أَنْ
اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ ۗ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿٦١﴾ وَقَالَ الْإِسْلَامُ مِنْ قَوْمِهِ
الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَالْآخِرَةَ وَأَسْرَفْنَاهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا مَا هَذَا
إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُونَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُونَ ﴿٦٢﴾

”پھر ہم نے پیدافرادی ان کے (غرق ہونے کے) بعد ایک دوسری جماعت لہ بھر ہم نے بھیجا ان میں ایک رسول ان میں سے (اس نے انہیں کہا) کہ عبادت کرو اللہ کی انہیں ہے تمہارا کوئی خدا اس کے سوا کیا تم (شرک کے انجام سے) نہیں ڈرتے ہو۔ تو بولے اگلی قوم کے سردار جنہوں نے کفر کیا تھا اور جنہوں نے بھلا یا تھا قیامت کی حاضری کو اور ہم

نے خوشحال بنا دیا تھا انہیں دنیوی زندگی میں۔ (اے لوگو!) نہیں ہے یہ مگر ایک بشر تمہاری مانند یہ کھاتا ہے وہی خوراک جو تم کھاتے ہو اور پیتا ہے اس سے جو تم پیتے ہو۔“

لَمْ أَنْشَأْنَاكَ عَظْفًا مَحْدُوفًا کلام پر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے فَأَعْرَفْنَا هُمْ ثُمَّ أَنْشَأْنَا. (پس ہم نے انہیں خلق کر دیا پھر ان کے بعد ہم نے ایک دوسری جماعت پیدا فرمادی) فَعَرَفْنَا الْآخِرِينَ سے مراد قوم عادیہ قوم مشود ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ قوم عاد مراد لینا زیادہ اظہر اور مناسب ہے (۱)۔

ابو جعفر ابن کثیر اور ابو عمرو نے نَسُوا کو وصل کلام میں توین کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور حالت وقف میں توین کی بجائے الف کے ساتھ قرأت کی ہے۔ اسی لئے ابو عمرو اس میں امالہ نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کے نزدیک اس کے آخر میں الف اسی طرح ہے جیسے حالت نصبی میں زید کا الف ہوتا ہے۔ نَسُوا کو مصدر ہے۔ اور تو اترا اور مو اترا کے معنی میں ہے۔ اور اس سے مراد چیزوں کا فردا فردا ایک دوسرے کے پیچھے ہونا ہے۔ جبکہ یہ آپس میں جمع نہ ہوں۔ قاموس میں ہے کہ تو اترا کا معنی متابع ہے۔ یعنی چیزوں کا پنے در پے ہونا، مسلسل ہونا (بغیر کسی انقطاع کے) یا انقطاع کے ساتھ۔ اور و اترا مو اترا اور و اترا کا معنی ہوتا ہے تابع۔ وہ مسلسل کیے بعد دیگرے لے آئے۔ کیونکہ چیزوں کے مابین جب تک مو اترا ثابت ہی نہیں ہوتی جب تک ان کے درمیان انقطاع اور کچھ وقفہ واقع نہ ہو۔ یعنی بعض لوگوں نے تو اترا کے معنی میں چیزوں کے درمیان انقطاع اور کچھ وقفہ ہونے کا اعتبار کیا ہے۔ (یعنی تو اترا کے اثبات کے لئے ان کے مابین اتصال اور التصاق نہیں ہونا چاہئے)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث مروی ہے ”لا بأس بقضاء رمضان تسری“ یعنی رمضان المبارک کے تقاروز سے متفرق طور پر بغیر تسلسل کے رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح نہایہ میں ہے۔

اصحیٰ نے کہا ہے کہ کہا جاتا ہے و اترا تسخیر۔ یہ تب کہا جاتا ہے جب خبریں تسلسل کے ساتھ ایک دوسرے کے بعد موصول ہوں۔ اور یاد خیروں کے درمیان کچھ وقفہ ہو۔

میں کہتا ہوں یہی وجہ ہے کہ خبر مو اترا میں یہ شرط ہے کہ وہ ایسی مختلف اور متفرق اسناد اور ایسے راویوں سے مروی ہو جو آپس میں جمع نہ ہوں۔ اس طرح کہ ان کے جموت پر اتفاق کرنے کا احتمال نہ ہو۔

اکثر قرآن نے تتری بر وزن سکرئی تانیث بالالف المقصورہ کے ساتھ بغیر توین کے پڑھا ہے۔ یہ غیر منصرف ہے۔ کیونکہ اس میں ایک سبب تانیث اور ایک تانیث کا استیلازم ہوتا ہے۔ تانیث کا سینہ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ رُسُلٌ سے مراد جماعت ہے۔ ترکیب کلام میں لَمْ أَنْشَأْنَاكَ قَوْلَ بَارِي تَعَالَى لَمْ أَنْشَأْنَاكَ پَرْمُطُوفٌ ہے۔ اس میں جمع کا مقابلہ جمع سے کیا گیا ہے۔ مگر اس سے مراد جمع کی ایک اکائی کو دوسری جمع کی ایک اکائی کے مقابل لانا ہے۔ پھر تم برائے تراشی کا ذکر صحیح ہوگا۔ گویا یہ فرمایا کہ پھر ہم نے ایک قوم کو پیدا کیا اور اس کی راہنمائی کے لئے ایک رسول بھیجا۔ پھر ایک دوسری قوم کو پیدا کیا اور پھر اس کی ہدایت کے لئے ایک رسول مبعوث فرمایا۔ پس مکمل ترتیب اس طرح ہے۔ لہذا اس مفہوم کے بعد یہ کہنا قطعاً صحیح نہیں ہوگا کہ پہلے ہم نے بہت سی امتوں کو پیدا کیا۔ اور ان تمام قوموں کے بعد ہم نے رسولوں کو مبعوث فرمایا۔ (یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے)

4۔ جب کبھی کسی امت کے پاس اس کا رسول آیا تو انہوں نے اسے جھٹلایا۔ جب رسول کو بھیجے گا ذکر ہو تو اس کی نسبت مرسل (بھیجے

اپنے جیسے بشری تو تم تب نقصان اٹھانے والے ہو جاؤ گے) اس طرح کہ تم اپنے ہم مثل کی اطاعت و فرمانبرداری اختیار کرنے کے سبب اپنے آپ کو ذلیل اور حقیر بنا لو گے۔ وہ بھی عجیب قسم کے احمق یہ تو فوج اور جاہل لوگ تھے کہ انہوں نے اپنے ہم مثل کی اتباع و پیروی اختیار کرنے سے تو انکار کیا لیکن ان سے بڑھ کر عاجز ترین پتھروں کی پوجا اور عبادت کرتے تھے۔ (اور اس طرح اپنی ذلت اور حقارت کا اظہار کرتے تھے)۔

عَلَّيْكُمْ مِنْكُمْ میں استفہام انکاری ہے یا استفہام تقریری ہے، یعنی وہ یقیناً تم سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ تم جب مر جاؤ گے اور گوشت اور اعصاب سے خالی ہو کر مٹی اور ہڈیاں ہو جاؤ گے تو تمہیں پھر قبروں سے زندہ کر کے نکالا جائے گا۔
نافع حمزہ کسائی اور حفص نے ماث ینماث سے ماخوذ کر کے مضم میم کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے ماث ینماث سے بنا کر میم کو ضم کے ساتھ مضم پڑھا ہے۔

اَنْتُمْ مَخْرُجُونَ میں اَنْتُمْ پہلے اَنْتُمْ کی تاکید کیلئے مکرر ذکر کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ پہلے اَنْتُمْ اور اس کی خبر کے درمیان طویل فاصلہ پایا جا رہا ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے۔ اَنْتُمْ مَخْرُجُونَ اِذَا مِتُّمْ وَ كُنْتُمْ تُرَابًا وَّ عِظَامًا اَنْتُمْ مَخْرُجُونَ۔
حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی طرح قرأت کی ہے۔ ترکیب میں یہ بھی جائز ہے کہ اَنْتُمْ مَخْرُجُونَ مبتدا متوخر ہو اور ظرف مقدم اس کی خبر ہو۔ یا پھر اَنْتُمْ مَخْرُجُونَ فعل مقدر کا فاعل ہے اور جواب شرط ہے۔ پھر کھل جملہ پہلے اَنْتُمْ کی خبر ہے۔ ان دونوں ترکیبوں میں تقدیر کلام اس طرح ہے اَنْتُمْ اِنْخَرْتُمْ وَاَقْبَعْتُمْ اِذَا مِتُّمْ اَوْ اِنْخَرْتُمْ۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ پہلے اَنْتُمْ کی خبر محذوف ہو کیونکہ دوسرے کی خبر اس پر دلالت کرتی ہے۔ اور اَنْتُمْ مَخْرُجُونَ کا جملہ نبوت کے بارے میں سابقہ اور نظر کو مزید پختہ کرنے کے لئے انہوں نے کہا۔ یا پھر یہ جملہ ان کے سابقہ قول کی علت بیان کر رہا ہے کہ انہوں نے پہلے یہ کہا کہ اگر تم اپنی مثل اس بشری اطاعت و فرمانبرداری کرو گے تو یا یقیناً نقصان اٹھاؤ گے۔ (اور ان کا سبب یہ ہے کہ یہ تو وقوع قیامت کا اعتقاد رکھتا ہے جس سے زندگی کی بیش و طرب ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ نتیجتاً خسارہ اور نقصان ہی اٹھانا پڑتا ہے)۔

ع۔ ہیہات اسم فعل ہے۔ اور اس کا فاعل پوشیدہ ضمیر ہے۔ معنی یہ ہے کہ جو وعدہ یہ تم سے کر رہا ہے اس کا وقوع پذیر ہونا بعید از عقل و تصور ہے۔ یا اس وعدہ کی تصدیق کرنا اور اس پر ایمان لانا انتہائی بعید ہے۔ دوسرا ہینہات پہلے کی تاکید کے لئے ہے۔ ترکیب کلام میں لِمَا تُؤْعَدُونَ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ یعنی یہ بعد اور دوری اس چیز کی ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ گویا کہ جب انہوں نے نکلہ استبعاد (ہینہات) زبان سے کہا تو ان (سرداروں) سے یہ پوچھا گیا یہ بعد اور دوری کس شئی کے لئے ہے؟ (یعنی کوئی شئی بعید از عقل و تصور ہے) تو انہوں نے اس سوال کے جواب میں کہا لِمَا تُؤْعَدُونَ۔ (یعنی وہ شئی بعید از عقل ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے)۔ یہ بھی ممکن ہے کہ لِمَا تُؤْعَدُونَ میں لام زائدہ بیانہ ہو۔ اور ما موصول اپنے صلہ سمیت ہینہات کا فاعل ہو۔ جیسا کہ ہِئْتُمْ لَنْ كُنْتُمْ لام زائدہ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ہیہات مصدر بمعنی بعد مبتدا ہے۔ اور لِمَا تُؤْعَدُونَ اس کی خبر ہے۔ یعنی دوری ہے اس بات کے لئے جو تم سے کہی جا رہی ہے۔

جبہور نے ہینہات میں تا کو مبنی برفقہ پڑھا ہے۔ ابو جعفر نے تا کو کسرہ کے ساتھ بغیر تونین کے پڑھا ہے۔ اور تونین کے ساتھ بھی محسوس پڑھا گیا ہے۔ اور تا کو تونین کے ساتھ مضموم بھی۔ اس بناء پر کہ یہ ہینہ کی جمع ہے۔ اور اسے قَبْلُ اور بَعْدُ کے مشابہ قرار دے کر تونین

کے بغیر پڑھا گیا ہے۔ اور اس کی ایک قرأت سکون کے ساتھ بھی ہے۔ اس لئے کہ اس پر وقت کیا گیا ہے۔ اور تاکوھا وقت کے ساتھ بدل دیا گیا ہے۔ اکثر قرأتے اس میں تاء کے ساتھ ہی وقت کیا ہے۔ اور ھِیْہَاتُ لِمَا کُوْنُ عَذُوْنُ جَمَلًا مَعْتَرَضًا ہے۔

۳۔ ان ہی میں ان نافیہ ہے۔ اور ہی ضمیر سے مراد جنس حیات ہے۔ یعنی وہ دنیوی زندگی جس میں ہم ہیں اور جو ہمارے قریب ہے اس کے سوا ہمارے لئے کوئی زندگی نہیں۔ پہلی بار حیا کے قائم مقام ہی ضمیر کو رکھا گیا ہے۔ کیونکہ دوسری بار حیاتنا الدُّنْیَا کا مذکور لفظ اس پر دلالت کر رہا ہے۔ اور یہ اس لئے ہے تاکہ لفظ کا تکرار لازم نہ آئے۔ اور اس بات پر مطلع کرنے کے لئے ہے کہ اس کی تیسرے کے سبب اسے صراحت ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ چونکہ ہی ضمیر الحیا کے معنی میں ہے اور یہ جنس پر دلالت کرتی ہے۔ اس لئے اس سے قبل ان نافیہ لافی جنس کی طرح جنس کی نفی کے لئے ہے۔

نَمُوْتُ وَنَحْیَا کا معنی ہے کہ ہم میں سے بعض مرتے ہیں اور بعض زندہ ہوتے ہیں۔ (یعنی پیدا ہوتے ہیں) علامہ ابن عربی رحمہ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ چونکہ وہ لوگ موت کے بعد دوبارہ اٹھانے جانے کا انکار کرتے تھے۔ (اس لئے یہ معنی نہیں ہو سکتا کہ ہم مرتے ہیں اور ہم زندہ ہوں گے) لہذا کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ یعنی نَحْیَا وَ نَمُوْتُ کہ ہم زندہ ہوتے ہیں اور پھر مرتے ہیں (۱۱)۔ اس قول کا وارد اور اس بات پر ہے جبکہ جمع متکلم کی ضمیر سے مراد تمام لوگ ہوں۔

میں کہتا ہوں کہ اگر جمع متکلم کی ضمیر سے مراد تمام لوگ بھی لئے جائیں تب بھی یہاں تقدیم و تاخیر کا قول کرنے کی کوئی حاجت اور ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ مطلق جمع کے لئے آئی ہے تاکہ ترتیب کے لئے۔ پس معنی یہ بنتا ہے کہ دنیا میں رہنے والے تمام لوگوں کے لئے موت و حیات ثابت ہے۔ اور ان کے لئے اس دنیوی زندگی کے سوا اور کوئی زندگی نہیں۔ اور ہمیں موت کے بعد دوبارہ نہیں اٹھایا جائیگا۔ ترکیب کلام میں وَمَا نَحْنُ بِمَنْعُوْنِیْنَ یَا حَالِ بن رہا ہے یا معلوف ہے۔ (یعنی واؤ یا حالیہ ہے یا عاظفہ ہے)

إِنْ هُوَ إِلَّا سَجْلٌ افْتَرَىٰ عَلَىٰ اللَّهِ كَذِبًا ۚ وَمَا نَحْنُ لَهُ بِمُعْتَبِرِينَ ۝ قَالَ رَبِّ انصُرْنِي بِمَا كَذَبْتَنِي ۝ قَالَ عَمَّا قَلِيلٍ لَيُصِيبُ حَرْبٌ لِّبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنَاهُمْ غَمًّا ۚ فَمَعَدَّ إِلْتِقَا وَرَاطِبِينَ ۝

”وہ نہیں مگر ایسا شخص جس نے بہتان لگایا ہے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا اور ہم تو قطعاً اس پر ایمان نہیں لائیں گے۔ اس پیغمبر نے کہا میرے رب! اب تو میری مدد فرما کیونکہ انہوں نے تو مجھے جھٹلایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا مقرر یہ ہی یہ لوگ اپنے کئے پر نادم ہو جائیں گے۔ اس تو آجکرا انہیں حقیقی چنگھاڑنے تو ہم نے انہیں خس و خاشاک بنا دیا تو برا بد ہو جائے وہ تو ہم جو قسم شعار ہے۔“

۱۔ وہ شخص جو یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے رسول ہوں اور ساتھ ہی موت کے بعد دوبارہ اٹھانے جانے کا وعدہ کر رہا ہے وہ اپنے قول میں جھوٹا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر بہتان لگا رہا ہے۔ لہذا ہم تو قطعاً اس کی تصدیق نہیں کریں گے۔ یہ جملہ ان کے قول مانا لہذا اِلَّا نَشْرُکِ تاکید کے لئے ہے۔

۲۔ اس پیغمبر نے اپنے رب کی بارگاہ میں التجا کی۔ اسے پروردگار! انہوں نے میری تکذیب کر دی ہے انہوں نے تو مجھے جھٹلایا ہے تو

ان کے خلاف میری مدد فرما۔ اور ان سے مجھے جھٹلانے کا انتقام لے۔ (یعنی ان پر عذاب نازل فرما)

یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا عقرب جو نبی یہ خواب دیکھیں گے تو یہ اپنے عمل (تکذیب کرنے) پر نادم ہو جائیں گے۔ عَمَّا قَلِيلٍ مِّنْ مَّا زَانَدَهُ، یعنی قلت کی تاکید کے لئے ہے۔ یا ما کرہ و موصوفہ معنی شئی ہے۔ اور قلیل اس کی صفت ہے۔ مقصود قلیل زمانہ ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ صیغہ سے مراد بلاکت ہے۔ قاموس میں ہے کہ صیغہ اور صیاح سے مراد پوری قوت اور طاقت کے ساتھ آواز کو بلند کرنا ہے۔ یعنی چیخ مارتا ہے۔ صیغہ بھم کا معنی ہے انہیں پریشان کر دیا گیا۔ انہیں گھبرا دیا گیا۔ اور صیغہ فیہم کا معنی ہے وہ ہلاک و برباد ہو گئے (۱)۔ اور الصیغہ کا معنی عذاب بھی ہے۔ اگر یہ قصہ قوم عاد کا ہے تو یہاں صیغہ سے مراد عذاب ہے۔ اور اگر قوم ثمود کا واقعہ ہے تو پھر صیغہ سے مراد چیخ ہے۔ ہم نے ان کا قصہ سورہ اعراف میں ذکر کیا ہے۔ کہ ان پر آسمان سے ایک چیخ آئی اس میں بادلوں کی کڑک بھی تھی اور زمین میں موجود ہر شئی کی آواز بھی تھی۔ پس اس کے سبب ان کے دل چھٹ گئے۔

بالحق سے مراد یہ ہے کہ وہ چیخ ایک ایسی حقیقت تھی جس کا دفاع یا انکار ممکن نہیں۔ یا معنی ہے کہ وہ چیخ عین عدل و انصاف کے مطابق تھی۔ جیسے تیرا یہ قول فلان بفضی بالحق۔ (فلان عدل کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے) یا منہوم یہ ہے کہ وہ چیخ سچے وعدہ کے مطابق تھی۔ فَجَعَلْنَاهُمْ غُلَّاقًا، کا معنی ہے تو ہم نے انہیں خس و خاشاک بنا دیا۔ ہم نے انہیں اس طرح ہلاک کر دیا گویا کہ وہ سیلاب کے ساتھ بہ کر آنے والے خس و خاشاک کی مثل ہو گئے۔ جو شخص ہلاک ہو جائے تو اس کے لئے عرب بولتے ہیں سال بہ الوادی۔ (وادئی کا سیلاب اسے بہا لے گیا)

یہ جملہ خبریہ بننے کا احتمال بھی رکھتا ہے۔ (کہ ظالمین کی قوم ہلاک ہو گئی) اور جملہ دعائیہ بننے کا احتمال بھی رکھتا ہے۔ یعنی برباد ہو جائے وہ قوم جو ستم شعار ہے۔ اس میں بَعْدًا بَعْدًا معنی ہلک کا مصدر ہے۔ اور یہ ان مصادر میں سے ہے جن کے فعل کو استعمال میں مضمر کرنا واجب ہوتا ہے۔ اور یہ افعال کے قائم مقام ہوتے ہیں۔ اور لَلْفُؤْمِ الظَّالِمِينَ اس مصدر کا فاعل ہے جو فعل کے قائم مقام ہے۔ اس میں لام زائدہ ہے۔ یا پھر مصدر کے عمل کو تقویت پہنچانے کے لئے ہے۔ جیسا کہ اس قول میں ہے اعجبنی جلوس نوید و قیام لعمرو۔ نیز علت بیان کرنے کیلئے ضمیر کی جگہ پر اسم ظاہر الظالمین ذکر کیا گیا ہے۔

ثُمَّ أَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قُرُونًا آخَرِينَ ﴿٣٧﴾ مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ ﴿٣٨﴾ ثُمَّ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرًا ﴿٣٩﴾ كُلَّمَا جَاءَ أُمَّةً رَّسُولًا كَذَّبُوهُ ﴿٤٠﴾ فَاتَّخَذْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وُجُوهًا لَّيُؤْمِنُونَ ﴿٤١﴾

”پھر ہم نے بعد انہیں (کی بربادی) کے بعد کئی قومیں لے آگئے نہیں بڑھ سکتی کوئی قوم اپنی مقررہ معیاد سے اور نہ وہ لوگ پیچھے رکھتے ہیں بل پھر ہم بھیجتے رہے اپنے رسول کے بعد دیگرے۔ جب کبھی کسی امت کے پاس اس کا رسول آیا تو انہوں نے اسے جھٹلایا۔ پس ہم بھی ایک کے بعد دوسرے کو ہلاک کرتے گئے اور ہم نے (ان جابر) قوموں کو افسانے بنا دیے یا پس خدا کی پھینکا ہوا ایسی قوم پر جو ایمان نہیں لائی ہے“

۱۔ ترکیب کلام میں ثُمَّ أَنْشَأْنَا کا عطف جعلْنَا ہم غُلَّاقًا پر ہے۔ مِنْ بَعْدِهِمْ سے مراد ہے قوم عاد کے بعد۔ اور قُرُونًا آخَرِينَ سے

مراد حضرت صالحؑ حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام وغیرہ کی اقوام ہیں۔

ج. مَا نُشِئُ مِنْ أُمَّةٍ میں من زائدہ استغراق کے لئے ہے اور اُمَّةٌ قائل ہونے کی بناء پر کل رفع میں ہے۔ اَجْلَہَا سے مراد ان قوموں کی ہلاکت اور بربادی کا مقررہ وقت ہے۔ یعنی کسی قوم کی تباہی اور ہلاکت کے لئے جو وقت مقرر کیا گیا ہے اس سے قبل کوئی قوم ہلاک نہیں ہوتی۔ اور نہ وہ اپنے مقررہ وقت سے پیچھے رہ سکتی ہے، یعنی وہ ہلاکت کے مقررہ وقت کے بعد زندہ باقی نہیں رہ سکتی۔ معنی کے اعتبار سے تانیف کے بعد ضمیر مذکر ذکر کی گئی ہے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ محترضہ ہے۔

ح. پھر ہم کیے بعد مگر سے اپنے رسول بھیجتے رہے۔ فَتَوَّاهِمْ رَبُّہُمْ۔ فتوواہم میں و تڑپنی ہے۔ اور یہ الوتر (طاق) سے ماخوذ ہے جو کہ شفع (ہفت) کی ضد ہے۔ پھر واؤ کو تاء سے تبدیل کر دیا گیا۔ جیسا کہ تراث اور تقویٰ میں کیا گیا۔ ترکیب کلام میں فتورا اَنْسَلْنَا اَزْ سَلْمٰنَا مَفْعُول سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔

ابو جعفر ابن کثیر اور ابو عمر نے فتورا کو اصل کلام میں توین کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور حالت وقف میں توین کی بجائے الف کے ساتھ قرأت کی ہے۔ اسی لئے ابو عمر اس میں امانہ نہیں کرتے کیونکہ ان کے نزدیک اس کے آخر میں الف ہی طرح ہے جیسے حالت نصی میں نیز ا کا الف ہوتا ہے فتورا مصدر ہے اور فتورا اور مواترۃ کے معنی میں ہے اور اس سے مراد چیزوں کا فرد ایک ایک دوسرے کے پیچھے ہونا ہے۔ جبکہ یہ آپس میں جمع نہ ہوں۔ قاموس میں ہے کہ فتورا کا معنی متابع ہے یعنی چیزوں کا پے در پے ہونا مسلسل ہونا۔ (بخیر کسی انقطاع کے) یا انقطاع کے ساتھ۔ اورۃ الخ مواترۃ اور تارا کا معنی ہوتا ہے تابع۔ وہ مسلسل کیے بعد مگر سے آئے۔ کیونکہ چیزوں کے مابین تب تک مواتر ثابت ہی نہیں ہوتی جب تک ان کے درمیان انقطاع اور کچھ وقفہ واقع نہ ہو۔ (1) یعنی بعض لوگوں نے فتورا کے معنی میں چیزوں کے درمیان انقطاع اور کچھ وقفہ ہونے کا اعتبار کیا ہے۔ (یعنی فتورا کے اثبات کے لئے ان کے مابین اتصال اور التصاق نہیں ہونا چاہئے) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث مروی ہے "لَا تَأْسُ بِفَضَاءٍ وَفَضَاءٍ تَتَوَّاهُ" یعنی رمضان المبارک کے قضا روزے متفرق طور پر بغیر تسلسل کے رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح نہایہ میں ہے۔ (2)

اصحیٰ نے کہا ہے کہ کہا جاتا ہے و اتوت الخیر۔ یہ تب کہا جاتا ہے جب خبریں تسلسل کے ساتھ ایک دوسرے کے بعد موصول ہوں اور ہر دو خبروں کے درمیان کچھ وقفہ ہو۔ (3)

میں کہتا ہوں یہی وجہ ہے کہ خبر مواتر میں یہ شرط ہے کہ وہ ایسی مختلف اور متفرق اسناد اور ایسے راویوں سے مروی ہو جو آپس میں جمع نہ ہوں۔ اس طرح کہ ان کے جموت پر اتفاق کرنے کا احتمال نہ ہو۔

اکثر قراء نے تڑپنی ہی بروزن سکرئی تانیف بالا الف المقصورہ کے ساتھ بغیر توین کے پڑھا ہے۔ یہ غیر منصرف ہے کیونکہ اس میں ایک سبب تانیف اور دوسرا تانیف کا اسے لازم ہونا ہے۔ تانیف کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ ذیل منسل سے مراد جماعت ہے۔ ترکیب کلام میں ثُمَّ اَنْسَلْنَا قَوْلَ بَارِئِ تَعَالٰی ثُمَّ اَنْشَأْنَا بِرْمَعُوفٍ ہے۔ اس میں جمع کا مقابلہ جمع سے کیا گیا ہے۔ مگر اس سے مراد جمع کی ایک اکائی کو دوسری جمع کی ایک اکائی کے مقابل لانا ہے۔ پھر ضم برائے تراخی کا ذکر صحیح ہوگا۔ گویا یہ فرمایا کہ پھر ہم نے ایک قوم کو پیدا کیا اور اس کی راہنمائی کے لئے ایک رسول بھیجا۔ پھر ایک دوسری قوم کو پیدا کیا اور پھر اس کی ہدایت کے لئے ایک رسول مبعوث فرمایا۔ پس مکمل

ترتیب اسی طرح ہے۔ لہذا اس مفہوم کے بعد یہ کہنا قطعاً صحیح نہیں ہوگا کہ پہلے ہم نے بہت سی امتوں کو پیدا کیا اور ان تمام قوموں کے بعد ہم نے رسولوں کو مبعوث فرمایا۔ (یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے)

یہ جب کبھی کسی امت کے پاس اس کا رسول آیا تو انہوں نے اسے جھٹلایا۔ جب رسول کو بھیجے گا ذکر ہو تو اس کی نسبت مرسل (بھیجنے والے) کی طرف ہوتی ہے۔ اور جب رسول کے آنے کا ذکر ہو تو اس کی نسبت مرسل اکہم (جن کی طرف رسول کو بھیجا جاتا ہے) کی طرف ہوتی ہے۔ کیونکہ رسول کے بارے میں اسے بھیجتا مبداء اور نیا ہے۔ (اس لئے اسے بھیجے کی نسبت بھیجنے والے کی طرف ہی ہوتی چاہئے) اور اس کا آنا اور پہنچنا اس کے معاملہ کے لئے منتهاء ہے۔ (لہذا اس کی نسبت مرسل اکہم کی طرف ہی ہوتی چاہئے) چونکہ ان میں سے اکثر نے رسول کی تکذیب کی۔ اس لئے جھٹلانے کی نسبت تمام کی طرف کردی۔ کیونکہ اکثر کے لئے کل کا حکم ہی ہوتا ہے۔ (اگر چنانچہ ان میں سے بعض ایمان بھی لے آئے تھے) یہ جملہ مستانہ ہے۔

پس ہم بھی ایک کے بعد دوسرے کو اسی طرح ہلاک کرتے گئے جیسے ہم نے انہیں یکے بعد دیگرے پیدا کیا۔ اور پھر فرداً فرداً مسلسل ان کی طرف رسول مبعوث فرمائے۔ **فَاتَّبَعْنَاكَ حَاطَفٌ كَذَّبُوهُ** پر ہے۔

اور ہم نے ان قوموں کو افسانے بنا دیا۔ یعنی ہم نے نوسائے حکایات اور کہانیوں کے ان کا کوئی اثر باقی نہ رہنے دیا۔ وہ فقط افسانے بن گئے جنہیں لوگ بطور قصہ بیان کرتے ہیں۔ اور عبرت پانے والے لوگ ان سے درس عبرت حاصل کرتے ہیں۔ **أَخَادِيثٌ أَحَدُوشِ كِي** جمع ہے۔ اس سے مراد وہ افسانہ اور کہانی ہوتی ہے جسے لوگ بطور لہو و لعب اور توجہ کے بیان کرتے ہیں۔

انفس نے کہا ہے کہ **أَحَدُوشِ** اور احادیث کا لکھ کر شکر کے بارے میں استعمال ہوتا ہے۔ خیر کے کل میں یہ نہیں کہا جاتا **جَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ** واحدوثة۔ (میں نے انہیں افسانے اور داستان بنا دیا ہے) بلکہ اس طرح کہا جاتا ہے **صَارَ فُلَانٌ حَدِيثًا**۔ (کرفلان آدمی (ایک یادگار) واقعہ ہو گیا) (1)۔

بعض نے کہا ہے کہ احادیث حدیث کی اسم جمع ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے احادیث النبی ﷺ
فَبَعْدًا لِقَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ كَامَعْنَى يَهِي كَخَدَاكِي يَهِي كَارِهَوَانِي قَوْمٍ بِرَجُورِ سُلُوكِ كَسَاتِحِ الْإِيمَانِ نَكْسِ اللَّائِي أَوْرَدْنَا كِي تَهْدِي كِي۔

لَمْ أَمْسَلْنَا مُؤْمِسِي وَآخَاكَ هُرُونَ ۙ بَالِيْتِنَا وَ سُلْطِنِ مُؤْمِنِينَ ﴿١٠﴾ إِلَى فِرْعَوْنَ وَ
مَلَائِكِهِ فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا عَالِينَ ﴿١١﴾ فَقَالُوا أَنُؤْمِنُ مِنْ لَيْسَرِينَ مِثْلَنَا وَ
قَوْمَهُمَا لِنَاعِبِدُونَ ﴿١٢﴾ فَكَذَّبُوا هُبَا فَكَانُوا مِنَ الْمُهْلَكِينَ ﴿١٣﴾

”پھر ہم نے بھیجا موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون کو اپنی نشانیاں اور واضح دلیل دے کر۔ فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف تو انہوں نے بھی غرور و تکبر کیا اور وہ لوگ بڑے سرکش تھے۔ تو انہوں نے کہا کیا ہم ایمان لے آئیں ان دو آدمیوں پر جو ہماری مانند ہیں حالانکہ ان کی قوم ہماری غلام ہے پس انہوں نے ان دونوں کو جھٹلایا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بھی برباد ہونے والوں میں شامل ہو گئے۔“

لَمْ نُؤْمَرْ سَلْنَا مُوسَىٰ كَاعْطَفَ ثُمَّ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِرَبِّهِ۔ هُرُونَ أَخَاهُ سَ بَدَلْ هُ۔ بَالِيْتِنَا سَ مَرَادُ وَنَشَانِيَا هِي أَوْ سُلْطَنِيَا

ٹہنیں سے مراد واضح دلیل ہے جو فہم، یعنی مد مقابل کو خاموش ہونے پر مجبور کر دے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا مبارک ہو۔ اور اسے انفرادی طور پر طبعاً اس لئے ذکر کیا گیا کیونکہ سب سے پہلا معجزہ یہی تھا۔ اور دیگر مختلف معجزات اس سے متعلق تھے۔ مثلاً یہ اژدھا کی صورت میں تبدیل ہوا جاڈگروں نے جن رسیوں کو سانپ بنا کر پھینکا تھا اس نے انہیں نگل لیا، سمندر پر لگا تو وہ پھٹ گیا (اور اس سے راستے بن گئے) چتر پر لگا تو اس سے چشمے جاری ہو گئے کسی مقام پر پڑاؤ کے وقت یہ محافظ کا کام بھی کرتا تھا رات کی تاریکی میں شمع کی مثل روشنی دیتا، پھلدار درخت بھی بنا اور پانی نکالنے کے لئے یہ رسی اور ڈول کا کام بھی دیتا۔

یہ کہنا بھی جائز ہے کہ سُلْطَنُ ٹہنیں سے مراد معجزات ہوں۔ اور آیات سے مراد اول لائل ہوں۔ اور دونوں سے بھی مراد معجزات لئے جاسکتے ہیں کیونکہ معجزات نبوت کی علامات اور نشانیاں ہوتے ہیں۔ اور نبی جو دعویٰ کر رہا ہوتا ہے معجزہ اس دعویٰ کی دلیل ہوتی ہے۔

عَلَيْهِ فَاسْتَكْبَرُوا كَمَا صَبَّحَ عَلَى كَفْرٍ عَمَّنْ اُوْرَاسِ كَدْرَبَارِيُوْنِ اِنَّمَا لَانِي اُوْرَاسِ كَرَمِ كِتَابَتِ اُوْرَبِيُوْدِي اِخْتِيَارِ كَرْنِي سِي عُرُوْرٍ وَكَبِيْرِيَا۔ اُوْرِدِه لُوْكَ بَرِيْءِ سِرْ كَشِي تَحِي۔ لُوْكَوْنِ پَر فُرُوْرٍ وَكَبِيْرِ كِي سَب اِنِي بَرْتَرِي كَا اَطْبَهَارِ كَرْتِي تَحِي۔ اُوْر اِن پَر طَرَحِ طَرَحِ كِ ظَلَمِ وَتَمِ اُوْر جَر كِيَا كَرْتِي تَحِي۔

سے تو انہوں نے کہا کیا ہم ایمان لے آئیں ان دو آدمیوں پر جو ہماری مانند ہیں؟ انؤمہن میں استنبہام انکاری ہے۔ یعنی ہم ان کی نبوت و فضیلت کا تعترف کرتے ہیں نہ اسکی تصدیق کرتے ہیں۔

بِشْرِيْنِ كَمَا۔ كِيُوْنِكِه لَفْظُ بَشْرِ كَا اِطْلَاقِ وَاَحَدٍ پَر مَعْنِي هُوْتَا هِي۔ جِيْسِي اللّٰهُ تَعَالٰى كَا يِه اِرْشَادِ هِي فَتَمَثَّلُ لَهَا يَسْمُ اَسْمُوِيًّا۔ اِسي طَرَحِ اِس كَا اِطْلَاقِ مَعْنِي پَر مَعْنِي هُوْتَا هِي۔ جِيْسِي يِه اِرْشَادِ هِي فَاقْتَاتَرِيْنِ مِّنَ الْبَشَرِ اَحْكَمِ ا۔

مِثْلًا لَفْظِ مَشْرِ كُوْتَشِيْهِ ذِكْرُنِيْسِ كِيَا۔ كِيُوْنِكِه يِه مَصْدَرِ كِي كَلِمِ مِيں هُوْتَا هِي۔ اُوْر لَفْظِ مَشْرِ اُوْر غَيْرِ كِي سَاتِه وَاَحَدٌ شَرِيْهِ مَعْنِي ذِكْرِ اُوْر مَوْتِ تَمَامِ كِي صِفْتِ لَكَا كِي جَا سَكْتِي هِي۔

وَقَوْمُهُمَا سِي مَرَادِيْنِ اِسْرَائِيْلِ هِي۔ اُوْر لَنَا عِبْدُوْنِ سِي مَرَادِ اطَاعَتِ وَفِرْمَانِ دَاوِي كَرْنِي وَاَلِي اُوْر غَلَاوِي اُوْر خِدْمَتِ كَرْنِي وَاَلِي لُوْكَ هِي۔ يُوْكَوْنِي كِي كَا مَطْبَعِ وَفِرْمَانِ دَاوِي اُوْر خِدْمَتِ مَكَا رِ هُوْتَا مَرَبِ اِس كِي لِي كِيْتِي اللّٰهُ عَابِدِ لَه۔ (يِه تُوَس كَا غَلَامِ هِي) تَرَكِيْبِ كَلَامِ مِيں وَقَوْمُهُمَا لَنَا عِبْدُوْنِ كَا جَمْلِ نُوْمُوْنِ كِي قَاعِلِ سِي حَالِ هِي۔ يَالْبَشْرِيْنِ سِي يَالْهُمَا (مَعْنِي مَوِي دَاوِنِ) سِي حَالِ هِي۔ فَكَذَّبُوْهُمَا كَا عَطْفِ اَزْمِنَا پَر هِي۔

فَكَفَرْنَا مِنَ الْمُهْلِكِيْنِ كَا مَقْبُوْمِ هِي كَدْرِه يِهِي فَرَقِ هُو كَر بَر بَادِ هُوْنِي وَاَلُوْنِ مِيں شَامِلِ هُو گئے۔

وَلَقَدْ اَتَيْنَا مُوسٰى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝ وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّةً اٰیٰتٍ وَّاُوْٓيٰٓهٖٓ

اَوْ يُهْمَا اِلٰى رَبِّوْٓرِٓ ذٰلِكَ قُرْاٰنِ وَاَمْرًا وَّصِيْحٰتٍ ۝

”اور بیشک ہم نے عطا فرمائی موسیٰ علیہ السلام کو کتاب تاکہ (ان کی قوم) ہدایت یافتہ ہو جائے۔ اور ہم نے بنا دیا مریم کے فرزند اور اس کی ماں (مریم) کو (اپنی قدرت کی) نشانی اور انہیں بسا ایک بلند مقام پر جو رہائش کے قابل تھا اور جہاں چشمے جاری تھے۔“

اور بیشک ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا فرمائی۔ یہاں کتاب سے مراد توریت ہے۔ تاکہ ان کی قوم معارف و احکام کیلئے ہدایت

یا فتہ ہو جائے۔ لَعَلَّهُمْ میں ہم ضمیر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام دونوں کی قوم کی طرف راجع ہے۔ (یعنی اس کا مرجع قَوْمُهُمَا ہے) فرعون اور اس کی قوم کی طرف اس ضمیر کا لوٹنا جائز نہیں۔ کیونکہ تو ریت انیس غرق کئے جانے کے بعد نازل ہوئی تھی۔

ع اور ہم نے مریم کے فرزند اور اس کی ماں (مریم) کو اپنی قدرت کی نشانی بنا دیا۔ اس طرح کہ حضرت مریم نے اپنے فرزند کو کسی مرد کے چھوٹے اور قرب اختیار کرنے کے بغیر جنم دیا۔ چونکہ یہ نشانی یعنی ولادت امر واحد ہے اس لئے لفظ ایۃ واحدہ ذکر کیا۔ اور اس کی نسبت دونوں کی طرف کر دی۔ یا پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ لفظ ایۃ ابن مریم کے بعد مقدر ہے۔ یعنی ہم نے مریم علیہا السلام کے فرزند کو اپنی قدرت کی نشانی بنا دیا، اس طرح کہ اس نے پتھروں میں گفتگو کی اور علاوہ ازیں اس سے کئی معجزات ظاہر ہوئے۔ اور اس کی ماں مریم کو بھی نشانی بنا دیا، اس طرح کہ اس نے مرد کی قربت اختیار کئے بغیر اپنے بچے کو جنم دیا۔ پھر پہلے ایۃ کو حذف کر دیا۔ کیونکہ دوسرا اس پر دلالت کر رہا ہے۔

ذُنُوبُهُ کا معنی ہے زمین کا بلند مقام۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔ یہ مقام دمشق ہے حضرت سعید بن المسیب اور مقاتل کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت مجاہد نے کہا ہے کہ اس سے مراد غوطہ (۱) دمشق ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا ہے اس سے مراد مدینہ ہے۔ حضرت عطاء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بیت المقدس نقل کیا ہے۔ یہی قول قتادہ اور کعب کا بھی ہے۔ کعب نے کہا کہ ذنوبہ کا حصہ دوسری زمین کی نسبت اٹھارہ میل آسمان کے زیادہ قریب ہے۔ ابن زید نے کہا ہے اس سے مراد مصر ہے۔ اور سدی نے کہا ہے اس سے مراد سرزمین فلسطین ہے (۱)۔ ذات قزاق سے مراد ہموار اور وسیع زمین ہے جس پر رہائش اختیار کرنے والے قرا حاصل کر سکیں۔ بعض نے کہا اس سے مراد چیلوں اور اناج کی زمین ہے جن کے سبب لوگ وہاں رہائش پذیر ہوتے ہوں۔ اور معین سے مراد ہے ظاہر جاری پانی۔ یہ فعلیل کے وزن پر ہے اور من الماء سے ماخوذ ہے۔ جب پانی جاری ہو جائے تو کہا جاتا ہے معین الماء۔

یا پھر یہ مانع سے بنایا گیا ہے اور اس کا معنی ہے منفعت اور فائدہ۔ اور پانی بھی انتہائی نفع بخش چیز ہے اس لئے اسے معین کیا گیا ہے۔ یا یہ مانع سے اسم مفعول ہے۔ اس کا معنی ہے آنکھ سے کسی شے کا مشاہدہ کرنا۔ چونکہ (سرزمین) راہوہ بھی اپنے بلند اور ظاہر ہونے کے سبب آنکھوں سے دیکھی جا سکتی ہے اس لئے اسے معین کیا گیا۔

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُّوْا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْبُدُوا صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿۱۰۶﴾
 إِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ ﴿۱۰۷﴾

”اے (میرے) پیغمبرو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور اچھے کام کرو بیشک میں جو اعمال تم کر رہے ہو ان سے خوب واقف

ہوں۔ اور یہی تمہارا دین ہے (اور) وہ ایک ہی ہے اور میں تم سب کا پروردگار ہوں سو تم ڈرا کرو مجھ سے۔“

لِ الطَّيِّبَاتِ سے مراد حلال چیزیں ہیں۔ كُلُّوْا مِنَ الطَّيِّبَاتِ کا امر و جوب کے لئے ہے، کیونکہ یہ درحقیقت حرام کردہ چیزوں کے

1 تفسیر بخاری، جلد 4، صفحہ 194 (المکر)

(۱) غوطہ کا معنی ہے زمین کا انتہائی گہرا اور بھی حصہ۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ غوطہ دمشق کے قریب ایک شہر کا نام ہے۔ لیکن اجماع کے مؤلف نے بھی یہ کہا ہے کہ غوطہ دمشق کے قریب باغات اور چشموں کا نام تھا۔

کھانے سے منع کرنے کے معنی میں ہے۔ یا پھر یہ مباح اشیاء میں سے لذیذ اور راحت بخش چیزیں تناول کرنے کے بارے میں ہے اور اس صورت میں یہ امر اسباب کے معنی میں ہوگا۔ اور حلال اور پاکیزہ چیزیں چھوڑ کر رہنا ہیانت و اختیار کرنے کی تردید کے لئے ہوگا۔

بعض نے کہا ہے کہ طبیات سے مراد حلال اوصاف اور قوام اشیاء ہیں۔ حلال تو حرام کی ضد ہے۔ مراد وہ چیزیں ہیں جنہیں استعمال کرنے سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہ لازم نہ آئے۔ صافی سے مراد ایسی اشیاء ہیں جو اللہ تعالیٰ کی یاد بھلا نہ دیں۔ یہ ان چیزوں کی ضد ہے جو انسان کو غافل کر دیتی ہیں۔ اور شہوات نفسانیہ میں مستغرق کر دیتی ہیں۔ اور قوام سے مراد ایسی اشیاء ہیں جو خواہش نفس (کے غلبہ) کو روکتی ہیں، عقل اور دیگر قوی کی حفاظت کرتی ہیں۔ یہ پیٹ بھرنے سے زائد مقدار ہونے کی ضد ہے۔ (یعنی انسان اتنا کھائے کہ پیٹ بھرنے سے بھی اس کی مقدار بڑھ جائے۔ کیونکہ اتنی زائد مقدار عقل اور دیگر اعضا سے بدنیہ کے لئے نفع کی بجائے نقصان دہ ہوتی ہے)۔
 اعمال صالحہ سے مراد ایسے اعمال ہیں جو خاصۃً اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے اس کے حکم کے بین مطابق کئے جائیں۔ اور ان میں شرک جلی اور خفی کی آمیزش نہ ہو۔ ان کی ضد اعمال فاسدہ ہیں، یعنی ایسا قول یا فعل جسے اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہو۔ (اس کے حکم کے مطابق نہ ہو وہ عمل فاسد ہوگا)

کلام کے شروع میں قول مقدر ہے، یعنی قلنا لهم یا ایہا المرسل الایۃ۔ یہ درحقیقت اس خطاب کا خلاصہ اور بیان ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام کو اپنے زمانے میں انفرادی طور پر فرمایا گیا۔ اس کا یہ معنی ہرگز نہیں کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو یہ خطاب ایک ہی بار اجتماعی طور پر فرمایا گیا۔

حسن مجاہد، قتادہ، سدی، بخاری اور علماء کی ایک پوری جماعت کا یہ موقف ہے کہ یہ خطاب صرف حضور نبی کریم محمد ﷺ کو ہے اور عرب کے طریقہ کے مطابق ایک ذات کو لفظ جمع کے ساتھ خطاب فرمایا گیا ہے (۱)۔

میں کہتا ہوں کہ اس کا سبب آپ ﷺ کی تعظیم و توقیر کا اظہار کرنا ہے اور اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ آپ اپنی فضیلت و شان میں پوری جماعت کے قائم مقام ہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ کو تمام لوگوں کی جانب رسول بنا کر بھیجا گیا۔

اور یہ کہنا بھی جائز ہے کہ اس خطاب میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آپ کی امت کے علماء بھی شامل ہوں۔ کیونکہ علماء رسول معظم ﷺ اور آپ کی امت کے درمیان ایک برزخی تعلق رکھتے ہیں۔ جیسا کہ رسول معظم ﷺ اللہ تعالیٰ اور علماء امت کے مابین برزخی تعلق رکھتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **وَدَفَعْنَا إِلَيْكُمْ أَلْبَانًا** (۲)۔ علماء انبیاء علیہم السلام کے (علوم کے) وارث ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ خطاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو فرمایا گیا۔ جبکہ وہ اپنی والدہ محترمہ کے ہمراہ ربوۃ میں سکونت پذیر ہوئے۔ تو ان دنوں کو وہی خطاب فرمایا گیا جو ان سے قبل انبیاء علیہم السلام کو ہر زمانے میں علیحدہ علیحدہ خطاب کیا گیا۔ تاکہ یہ دونوں بھی رزق کے حصول اور کھانے کے تناول کرنے میں ان انبیاء و رسول علیہم السلام کی اقتدا و پیروی کریں۔ قصہ کا سیاق و سباق یہی تھا۔ قضا کرتا ہے کہ یہ خطاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کی والدہ محترمہ کو بھی ہو۔

إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ کا معنی ہے کہ میں جو اعمال تم کر رہے ہو ان سے خوب واقف ہوں۔ لہذا میں ان کے مطابق ہی تمہیں جزا دوں گا۔ یہ جملہ عمل تعلیل میں واقع ہے۔

سے بیٹک حلال اور طیب چیزیں کھانا اور اعمال صالحہ کرنا ہی تمہارا وہ دین اور شریعت ہے جس پر تم سب قائم ہو۔ کوئیوں نے ان کے ہمزہ کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ جملہ مخلوقِ فعل کے قائل سے حال ہونے کی بناء پر عملِ نصب میں واقع ہے۔ یا پھر یہ سابقہ جملہ پر معطوف ہے۔ اور یہ بھی مقدر قلنا کا مقولہ ہے۔ اور باقیوں نے اُن کے ہمزہ کو فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ ترکیب کلام میں یا تو اس کا عطف مانا نفعْمَلُونِ پر ہے یا پھر اس سے پہلے لام مقدر ہے یعنی اصل عبارت اس طرح ہے وَلَا نَ هَلْه اَمْتُكُمْ۔ یا پھر اس سے پہلے اِغْلَمُوا فعل مقدر ہے اور یہ اس کے سبب منصوب ہے۔ اَمْتُكُمْ اَمَةٌ وَاِحْدَةٌ یعنی تمہارا دین ہے (اور) وہ ایک ہی ہے۔ یعنی دین اسلام، عقائد اور اصول شریعت میں بنیادی طور پر متحد اور ایک ہے۔ اور فروعات میں عمل ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہوا اور ان میں سے منسوخ کو چھوڑ کر ناسخ پر عمل ضروری ہے۔ ترکیب کلام میں اَمَةٌ وَاِحْدَةٌ واحدہ اَمْتُكُمْ کے لئے حال منکوحہ ہے۔ جیسے اس جملہ میں ہے زید ابو ک عطفوا۔ اور اس میں عامل معنی اشارہ ہے۔

وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ میں فاسیہ ہے۔ یعنی تم مجھ سے ڈرا کرو کیونکہ میں تمہارا پروردگار ہوں۔

فَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ قَرِحُونَ ﴿٥٠﴾ فَذَرَاهُمْ فِي
عَمَّا بَدَّيْتُمْ حَتَّىٰ حِينٍ ﴿٥١﴾

”لیکن کات کر بنا دیا انہوں نے اپنی دینی وحدت کو باہمی اختلاف سے پارہ پارہ۔ ہر گروہ اپنے نظریات پر سرورد ہے۔ پس (اے محبوب!) رہنے دو انہیں اپنی مدھوشی میں کچھ وقت تک۔“

یعنی وہ لوگ جن کے پاس انبیاء و رسول علیہم السلام کے سب امور دینیہ ارسال کئے گئے۔ انہوں نے اس دین کو پارہ پارہ کر کے باہم تفرقہ ڈال دیا اور انہوں نے بنیادی اصول دین کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے مختلف ادیان بنا لئے۔ ان میں سے بعض لوگ ایسے تھے جو تمام انبیاء و رسول علیہم السلام اور ان کے لئے ہوئے دین پر ایمان لائے۔ ہر دور میں یہی لوگ اہل حق تھے۔ بعض ایسے تھے جو بعض پر ایمان لائے اور بعض کو چھوڑ دیا۔ جیسے یہودی عیسائی اور صابئی وغیرہ۔ اور بعض ایسے تھے جنہوں نے تمام انبیاء اور ان کے لئے ہوئے دین کا انکار کر دیا مثلاً جوحی (آئس پرست) اور بت پرست (شترکین)۔

فَقَطَّعُوا بَابُ تَفْعِيلٍ کے معنی میں ہے۔ یعنی قَطَّعُوا کے معنی میں ہے۔ (انہوں نے کات دیا۔ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا) یہ معنی کرنا بھی جائز ہے کہ وہ دین کے معاملہ میں متفرق ہو گئے اور گروہ گروہ بن گئے۔ اور انہوں نے ایک دین کے ٹکڑے ادیان بنا لئے۔ یہ تب ہو سکتا ہے جب کہ اَمْرُهُمْ سے پہلے نئی حرف جار محذوف ہو۔ لہذا اَمْرُهُمْ حرف جار کے محذوف ہونے کے سبب منصوب ہے۔ یا پھر یہ ان کی طرف تفرقہ کی نسبت ہونے کے سبب تیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور قَطَّعُوا کی ضمیر ان لوگوں کی طرف لوٹ رہی ہے جن کی طرف انبیاء و رسول کو بھیجا گیا تھا اور ان کا ذکر مذکورہ قصص میں کیا گیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا وَقَدْ أَنْزَلْنَا آيَاتِنَا أَنْزَالًا وَيَعْبُدُهُمْ أَشْرُوتًا۔ وَأَنْزَلْنَا آيَاتِنَا أَنْزَالًا وَيَعْبُدُهُمْ أَشْرُوتًا۔ وغیر ذالک ترکیب کلام میں یہ جملہ اَنْزَلْنَا پر معطوف ہے۔

زُبُرًا کا معنی ہے پارہ پارہ گروہ گروہ اور ٹکڑے ٹکڑے۔ یہ زبور کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے گروہ اور فرقہ۔ اسی سے زُبُرُ الحدید ہے (لوہے کے ٹکڑے) ترکیب کلام میں یہ صدر ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ یہ لفظوں میں فعل سے مختلف ہے۔ (یعنی یہ ہم معنی فعل ہونے کی بناء پر مفعول مطلق ہے) جیسے اَنْبَتَهُ اللّٰهُ نَبَاتًا میں ہے۔ یا اَمْرُهُمْ سے حال ہے۔ یا قَطَّعُوا کے قائل سے حال ہے۔ یا پھر قَطَّعُوا

جعل کے معنی کو متضمن ہے اور نیز اس کا مفعول ثانی ہے۔ یعنی انہوں نے اپنی وحی وحدت کو کاث دیا اور اسے پارہ پارہ بنا دیا۔ بعض نے کہا ہے کہ زُجْرُہ کا معنی کتابیں ہیں یہ ذُبُوْثُ الکتاب سے ماخوذ ہے۔ یہ جملہ تب کہا جاتا ہے جب کوئی کتاب جلی اور سونے حروف میں لکھی جائے۔ ہر وہ کتاب جو جلی اور سونے حروف میں لکھی جائے اسے زبور کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ دین جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کردہ ایک کتاب کی صورت میں تھا۔ انہوں نے اپنے دین میں تحریف کر کے اس کی کئی کتابیں بنا ڈالیں۔ پس اس صورت میں تَقَطُّعُوا آقا مفعول ثانی ہوگا۔ یا اَمْرُوْهُم سے حال ہوگا۔ معنی یہ ہوگا کہ انہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور آسمانیکہ وہ آسمان سے نازل شدہ کتابوں کی شکل میں تھا۔ اور وہ دین کے بنیادی اصولوں میں متفق تھیں۔ اور وہ آپس میں ایک دوسرے کی تصدیق کرتی تھیں۔ تو انہوں نے یہ کہا کہ ہم کتاب کے بعض احکام پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔

حسن سے یہ معنی منقول ہے کہ انہوں نے کتاب اللہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اس میں طرح طرح کی تحریف کر دی (۱) ان میں سے ہر گروہ اپنے دینی نظریات یا خواہشات نفسانی پر ہی سرور اور اتراٹنے والا ہے اور یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ وہی حق پر ہے۔ ترکیب کلام میں کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فِئْحُوْنَ جِلْمٌ متا لفہ ہے۔

۱۔ پس اے محمد ﷺ! رہنے دو انہیں اپنی مدہوشی میں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غَمْرُوْهُم کا معنی کھروم و ضلالیہم کیا ہے۔ یعنی انہیں اپنے لغز اور گمراہی میں رہنے دیجئے (۲) بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے انہیں اپنی غفلت اور جہالت مرکبہ میں ہی رہنے دیجئے۔ (جہالت مرکبہ سے مراد ہے کسی چیز کو نہ جاننے کے باوجود جاننے کا دعویٰ کرنا) یہاں ان کی غفلت کو اس پانی سے تشبیہ دی گئی ہے جس میں آدی پوری قد و قامت کے ساتھ ڈوب جاتا ہے۔ اور وہ مکمل طور پر اسے اندر چھپالیتا ہے۔

حقیقی جہنم سے مراد ان کے مرنے کے زمانے تک یا اس وقت تک کہ ہم آپ کو انہیں قتل کرنے کا حکم دیں اس وقت تک انہیں اپنے حال پر رہنے دیجئے۔ یعنی آپ ان کے فرقوں میں تقسیم ہونے اور نظر اٹھیا کر کے کے سب غمزدہ نہ ہوں۔ کیونکہ ہم انہیں ضرور پکڑیں گے۔ یا تو اپنی جانب سے عذاب نازل کر کے یا پھر تمہیں ان کے خلاف قتال کی اجازت دے کر تمہارے ہاتھوں انہیں برباد کریں گے۔

أَيَحْسَبُونَ أَنَّمَا نُسَبِّهُمْ بِهِ مِنْ مَّالٍ وَبَنِيْنَ ۖ نُسَاۡرٍۭ لَّهُمْ فِي الْحَيٰۡتِ طٰٓئِلٌ
لَّا يَسْعُرُوْنَ ۗ ۙ إِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِنْ حَشِيَّتِهِ لَسَابِقُوْنَ ۗ وَالَّذِيْنَ هُمْ
بِآيٰتِنَا يَتَّبِعُوْنَ ۗ ۙ

”کیا یہ فرقہ باز خیال کرتے ہیں کہ ہم جو ان کی مدد کر رہے ہیں مال و اولاد کی کثرت سے تو ہم جلدی کر رہے ہیں انہیں بھلائیوں پہنچانے میں (یوں نہیں) بلکہ وہ (حقیقت حال سے) بے خبر ہیں۔ چیلک وہ لوگ جو اپنے رب کے خوف سے ڈر رہے ہیں۔ اور وہ جو اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں سے“

۱۔ جو لوگ اپنی مصلحت و گمراہی پر اطمینان فرحت و مسرت کر رہے ہیں اور انبیاء علیہم السلام کی اتباع و پیروی نہیں کرتے بلکہ ان کی تکذیب کرتے ہیں اور جو کثیر مال و اولاد انہیں عطا فرما کر ہم ان کے لئے معاون و مددگار بنا رہے ہیں۔

نُسَاۡرٍۭ لَّهُمْ هٰی الْحَيٰۡوٰتِ ترکیب کلام میں اُن کی خبر ہے۔ اور ضمیر عامہ محذوف ہے۔ اور محذوف اپنے اسم اور خبر کے ساتھ ملکر

”مُحْسِنُونَ“ کے دو دفعوں کے قائم مقام ہے۔ یہ مستقہام تو بیخ اور ان کے ہم و گمان کے رو کے لئے ہے۔ معنی یہ ہے کیا وہ یہ گمان کر رہے ہیں کہ جو مال و اولاد کثرت سے ہم انہیں دنیا میں عطا کر کے ان کے لئے مددگار بنا رہے ہیں تو اس سے ہم انہیں خیر و برکت اور عزت و اکرام عطا کر رہے ہیں؟ یا ان کے اعمال کا اجر و ثواب ہے اور یہ ان کے عقائد و نظریات کے ساتھ ہماری رضامندی اور خوشنودی کی علامت ہے اور یہی گمان ان کی فرحت و مسرت کا باعث ہے؟ (تو انہیں جان لینا چاہئے) کہ فی الحقیقت معاملہ اس طرح نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو حقیقت حال سے بے خبر ہیں (۱)۔ وہ چوپاؤں کی مانند ہیں ان میں نہ تو عقل ہے نہ شعور کہ وہ غور و فکر کر سکیں۔ انہیں یہ جاننا چاہئے کہ ان کے یہ اعمال اور عقائد نہ مستوجب ثواب ہیں اور نہ باعث رضا۔ بیشک یہ امداد تو ان کے خلاف ایک تدبیر ہے نہ کہ ان کے لئے منافع اور فوائد میں جلدی ہے۔ یہ آیت معتزلہ کے اس قول کے خلاف حجت ہے الْأَصْلَحُ لِلْعِبَادِ فِي الْبَدِينِ عَلِيٌّ اللَّهُ وَاجِبٌ۔ (دین کے معاملہ میں بندوں کے لئے نفع بخش چیز عطا کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے)

ع۔ بیشک وہ لوگ جو اپنے رب کے عذاب سے ڈر رہے ہیں، یعنی وہ ایسے اعمال سے بچتے ہیں جو عذاب الہی کا سبب بنتے ہیں۔ یا معنی یہ ہے کہ بیشک وہ لوگ جو خشیت الہی سے متصف ہونے کے سبب اللہ تعالیٰ کی سزا اور گرفت سے ڈرتے رہتے ہیں۔ اور یہ کہ ناممکن ہے کہ خشیت سے مراد ایسا عمل ہے جس کے سبب خشیت پیدا ہوتی ہے۔ لہذا معنی یہ ہوگا کہ وہ اپنے رب کے عذاب سے ڈر رہے ہیں۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ مومن نیکی اور خشیت کو جمع کرتا ہے، یعنی نیکی بھی کرتا ہے اور ساتھ ساتھ اپنے رب سے ڈرتا بھی ہے اور منافق برائی اور اس کو جمع کرتا ہے یعنی برائی کرتا ہے اور ساتھ بے فکر بھی رہتا ہے (۱)

ع۔ اور وہ جو اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ آیات سے مراد قرآن کریم میں نازل ہونے والی آیات ہیں۔ یا آیات سے مراد وہ علامات اور نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی توحید پر دلالت کرتی ہیں۔ اور یہ مومن سے مراد ہے کہ وہ آیات اور علامات جن چیزوں پر دلالت کرتی ہیں وہ ان دلولات پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کی تصدیق کرتے ہیں۔

وَالَّذِينَ هُمْ بِهِ يُبْتَلُونَ ۗ وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوْا وَقَلُوبُهُمْ وَجَلَةٌ
أَنْتُمْ إِلَىٰ مَا لَهُمْ مِنْ حِجْوَةٍ ۗ ۝۱۱

”اور وہ جو اپنے رب کے ساتھ (کسی کو) شریک نہیں بناتے، اور وہ جو دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اس حال میں کہ ان کے دل ڈر رہے ہیں (اس خیال سے) کہ وہ (ایک دن) اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں جسے لوگ جلدی کرتے ہیں بھلائیاں کرنے میں اور وہ بھلائیوں کی طرف سبقت لے جانے والے ہیں۔“

1۔ تفسیر بخاری، جلد 4، صفحہ 151 (ألفظ)

(۱) حسن بصری سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس کسریٰ بن ہرجس سے حاصل ہونے والا مال غنیمت لایا گیا اور آپ کے سامنے رکھ دیا گیا۔ آپ کے پاس حضرت سراقہ بن مالک موجود تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کسریٰ کے دو گھنٹے اٹھائے اور سراقہ کی طرف پھینک دیئے۔ سراقہ نے انہیں اٹھایا اور اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ اور وہ آپ کے کندھوں تک پہنچ گئے۔ پس آپ نے کہا الحمد للہ کسریٰ بن ہرجس کے گھنٹے سراقہ بن مالک بن ہشیم کے ہاتھوں میں ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہے۔ پھر کہا اے اللہ! میں جانتا ہوں کہ تیرا رسول مال حاصل کرنے اور اسے تیرے راستے اور تیرے بندوں پر خرچ کرنے کا تیرا صلہ تھا۔ میں نے یہ بھی اسی لئے یہ اٹھا لیا ہے۔ اے اللہ! تیری ہی پناہ جانتا ہوں اس سے کہ یہ مال تیری جانب سے میرے لئے کوئی نکتہ ہو۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی۔ اِنْ مَسَّكُمُ الضَّرَبُ مِنْ بَرٍّ أَوْ بِحَرٍّ فَلْيَسْتَعِذُوا بِاللَّهِ ۗ

۱۔ اور وہ جو اپنے رب کے ساتھ کسی غیر کو عبادت میں شریک نہیں بناتے۔ نہ وہ شریک جلی کرتے ہیں اور نہ شریک خفی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اس آیت کا ماقبل آیت سے تکرار لازم نہیں آتا۔ کیونکہ (اس میں ایمان لانے کا ذکر ہے) اور اللہ تعالیٰ وعدہ لا شریک کے ساتھ ایمان لانا عبادت میں کسی غیر کو اس کے ساتھ شریک کرنے کے منافی نہیں۔

ع وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوْا كَامِعْنِي ہے کہ وہ صدقات و خیرات میں سے جو کچھ بھی دیتے ہیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ آپ یہ آیت کریمہ تلاوت فرماتیں یُوْتُونَ مَا آتَوْا تو فرماتیں وہ جو نیک اعمال میں سے جو عمل کرتے ہیں (۱)۔ (گویا آپ کے نزدیک اس سے مراد خیر اور نیک کام ہے) اس حال میں کہ ان کے دل ڈر رہے ہوتے ہیں۔ (اس طرح کہ وہ یہ گمان کر رہے ہوتے ہیں ممکن ہے) ان کی جانب سے یہ صدقات و اعمال قبول نہ ہوں۔ یا یہ اس طرح وقوع پذیر نہ ہوتے ہوں جیسے رب کریم کی بارگاہ کے لائق اور مناسب ہے۔ پس اسی کے سبب ان کا متکلفہ ہو جائے۔ یا خطاؤں کے کثیر ہونے اور عبادات و طاعات کے کم ہونے کی وجہ سے یہ انہیں عذاب الہی سے نجات دلانے کا سبب نہ بن سکیں۔

أَنْتُمْ إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَجَعَلُوا حَقِيقَةً مَّا قَالُوا كَلَامِ كِي عِلَّتِ ہے یہ اصل میں لِأَنْتُمْ تَحَالِي ذُرْنِي کی علت اور سبب یہ ہے کہ انہیں یہ خیال رہتا ہے کہ وہ ایک دن اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یا پھر اَنْتُمْ سے قبل من محذوف ہے معنی یہ ہے کہ ان کے دل اس بات سے ڈر رہے ہیں کہ انہوں نے ایک دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں لوٹ کر جانا ہے۔ اور وہ ان کے خفی اور پوشیدہ اعمال سے بھی واقف و آگاہ ہے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اس کا معنی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے طاعت و عبادت کے اعمال کرتے ہیں اور خوب کوشش یعنی مجر و ہتکساری سے بجاتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے دل ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں ان کے اعمال کو مردود قرار دے کر واپس ہی نہ لوٹا یا جائے۔ (2)

حضرت ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس آیت وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوْا وَقَلُّوا لَهُمْ وَجَلَّةٌ کے بارے دریافت کیا۔ کیا یہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جو شراب پیتے ہیں اور چوری کرتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا نہیں۔ اے صدیق کی نخت جگر! بلکہ یہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جو روزے رکھتے ہیں نمازیں پڑھتے ہیں صدقات و خیرات کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ ڈر رہے ہوتے ہیں کہ کہیں یہ اعمال روکنے کر دیئے جائیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو بھلائیوں کرنے میں تیزی کرتے ہیں۔ اسے احمد ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے (3)۔

علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اس طرح روایت کی ہے کہ آپ فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کہ آیت وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوْا وَقَلُّوا لَهُمْ وَجَلَّةٌ کیا اس آدمی کے بارے میں ہے جو زنا کرتا ہے شراب پیتا ہے؟ اور چوری کرتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں اے صدیق کی نخت جگر! بلکہ یہ تو اس آدمی کے لئے ہے جو (رات کو) قیام کرتا ہے اور صدقات و خیرات کرتا ہے اور ساتھ ساتھ ان کے قبول نہ ہونے کے بارے میں ڈرتا بھی رہتا ہے (4)۔

ترکیب کلام میں تمام موصولات ایک دوسرے پر معطوف ہو کر الیٰ کا اسم ہیں۔ اسم موصول کو مکرر ذکر کیا گیا ہے لیکن صلوات کو آپس میں

2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 151 (المکر)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 151 (المکر)

4۔ شعب الایمان، جلد 1، صفحہ 477 (المعلیٰ)

3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 147 (وزارت تعلیم)

ایک دوسرے پر عطف نہیں کیا گیا۔ تاکہ اس پر دلالت ہو جائے کہ مذکورہ صفات میں ہر ایک بھلائی اور خیر کے ثبوت کے لئے مستقل ہے۔ اور ان کی خبر اُولَئِكَ يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ ہے۔ اور اس کا معنی ہے وہ طاعت و عبادت میں سو درجہ رغبت رکھتے ہیں۔ اور وہ اسے ادا کرنے میں انتہائی جلدی کرتے ہیں۔ تاکہ ان سے کوئی طاعت و عبادت ادا ہونے سے رہ نہ جائے۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ اخروی نعمتوں کو حاصل کرنے میں جلدی کرتے ہیں۔ جن کا وعدہ طاعات و عبادات جلدی بجالانے کی بنا پر کیا گیا ہے۔ یا وہ دنیوی نعمتوں کو حاصل کرنے میں جلدی کرتے ہیں، جن کا وعدہ اعمال صالحہ تیزی سے کرنے کی بناء پر کیا گیا ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا لَا يُزِيدُ إِلَّا الْبَلَاءَ إِلَّا اللُّغَاءُ وَلَا يَزِيدُ فِي الْعُصْرِ إِلَّا الْبُرْ (1)۔ یعنی مصیبت اور آرزائش و عا کے بغیر رو نہیں ہوتی اور عمر میں نیکی کے بغیر اضافہ نہیں ہوتا۔ اس صورت میں یہ آیت اس ارشاد گرامی کی طرح ہے فَآتَاهُمُ اللَّهُ كَثْرًا مِّنَ الثَّمَنِ وَحَسَنَ ثَوَابًا الْآخِرَةِ۔ پس ان کے لئے ایسے انعامات خداوندی ہوں گے جو ان کے متضاد اور مخالف افراد کو حاصل نہیں ہوں گے۔

میں کہتا ہوں کہ شاید خیرات سے مراد وہ بھلائیاں ہیں جنہیں دنیا میں حاصل کرنے کے لئے اہل ایمان تیزی کرتے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اطمینان حاصل کرنا اس کی یاد سے لطف اندوز ہونا بقدر حاجت کھانے سے سیر ہو جانا دنیوی نعمتوں کے زائل ہونے کا خوف نہ ہونا اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈرنا اور نہ کوئی امید وابستہ رکھنا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بذریعہ انہام یا خواب ان پر مشرعات کا درود بھی ہوتا رہتا ہے۔

سے اور وہی بھلائیوں کی طرف سبقت لیجانے والے ہیں۔ یعنی وہ نیکیوں اور بھلائیوں کے سبب جنتوں کی طرف دوسرے لوگوں کی نسبت سبقت لے جانے والے ہیں۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ طاعتوں کی طرف یا ثواب کے حصول کی طرف یا جنت کی طرف بڑھنے والے ہیں۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ ان بھلائیوں اور نعمتوں کی طرف سبقت لے جانے والے ہیں جنہیں وہ آخرت سے قبل دنیا میں پاسکتے ہیں۔ کیونکہ وہ انہیں جلدی عطا کر دی جاتی ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ لہذا ہم لام بمعنی الی ہے، یعنی وہ بھلائیوں کی طرف سبقت لے جانے والے ہیں۔ جیسا کہ اس ارشاد میں ہے لَمَّا نَهَوَانَهُ مِمَّا آتَيْنَاهَا عَنْهُ مَعْنَى مِمَّا فِيهَا

کلمی نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ وہ تمام امتوں میں سے بھلائیوں کی طرف سبقت لے جانے والے ہیں (2) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا آیت کا معنی یہ ہے کہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے سعادت و خوشحالی پہلے ہی (تقدیر میں) لکھی جا چکی ہے (3)۔

وَلَا تُكْفِرُ نَفْسًا إِلَّا رُسْعَهَا وَكَذَٰلِكَ يَتْلُقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٣٦﴾
 بَلْ قَاتِلُوهُمْ فِي عَمَلِهِمْ هَٰذَا أَوْلَهُمْ أَعْمَالٌ مِّنْ دُونِ ذَٰلِكَ هُمْ لَهَا عَمِلُونَ ﴿٣٧﴾
 حَتَّىٰ إِذَا آخَذْنَا مِيثَاقَهُمْ بِالْعَدَابِ إِذَا هُمْ يَجْعَرُونَ ﴿٣٨﴾ لَا تَجْرُوا
 الْيَوْمَ ۚ إِنَّكُمْ مَتَلَا تُصْرُونَ ﴿٣٩﴾

”اور ہم تکلیف نہیں دیتے کسی شخص کو مگر جتنی اس کی طاقت ہے اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو بولتی ہے اور ان

پروٹی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ ان کے دل مدہوش ہیں اس (خوفناک حقیقت) سے اور ان کے اعمال مومنوں کے اعمال سے مختلف ہیں۔ یہ (ناباکر) ان برے کاموں کو بھی کرنے والے ہیں۔ یہاں تک کہ جب ہم پکڑیں گے ان کے خوشحال لوگوں کو عذاب سے اس وقت وہ چلائیں گے۔ (خالمو!) آج نہ چلاؤ تمہاری ہماری طرف سے اب کوئی مدد نہ کی جائے گی۔“

لَا تَكْفِلُ نَفْسًا كَاجِلٍ يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ فِي الْحَالِ هُوَ نِيَّةُ الْبَاءِ بِمَنْعِ نَصَبِ مِمَّنْ وَقَعَ بِهِ۔ معنی یہ ہے کہ بھلائیوں کے حصول کے لئے سرعت رفتار سے ان کا جدوجہد کرنا اپنے نفسوں کی پسند اور خوشدلی سے ہے۔ (یعنی زیادہ مشقت برداشت کرتے ہیں) اتنا زیادہ اس کی لذت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور ہم ان کی طاقت سے بڑھ کر قطعاً انہیں تکلیف نہیں دیتے۔

وَلَدَيْنَا كِتَابٌ فِيهِ كِتَابٌ مِنْ كِتَابِ مَرادِ لَوْحِ مَحْفُوظٍ هُوَ۔ یادہ صحائف ہیں جن میں اعمال درج ہیں۔ معنی یہ ہے کہ ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو بچ بچتی ہے، یعنی وہ جتنی ہے جوئی الحقیقت ثابت اور متحقق ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ ان کے اعمال ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ ہم ان میں سے کسی شئی کو ضائع نہیں ہونے دیتے بلکہ ہر عمل پر اجر و ثواب عطا فرماتے ہیں۔ اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ یعنی ان کی نیکیوں میں کسی شئی کی کمی نہیں کی جائے گی اور ان کے گناہوں اور برائیوں میں کسی شئی کا اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ ترکیب کلام میں قول باری تعالیٰ وَلَدَيْنَا كِتَابٌ حَالِ ثَانِيٍ پہلے کے مراد ہے۔ اور قول خُذُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُقْرَبُوا اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُونَ سے لے کر آخر تک کفار کے ذکر کے دوران اہل ایمان کے احوال بیان کرنے کے لئے جملہ معترضہ ہے۔

بَلْ قُلُوْا لِيْهِمْ اِرْشَادِ بَارِي تَعَالٰی بَلٰی لَا يَسْعَوْنَ اِلَّا فِيْ سَعْوٰتِهِمْ هُوَ۔ یعنی ان کفار کے دل جن میں کوئی عقل و شعور نہیں مدہوش ہیں۔ یعنی چھانچانے والی غفلت میں ہیں۔

مِنْ هٰذَا سے اشارہ اس طرف ہے کہ وہ اپنے عدم شعور کے سبب جس طرح شعور نہیں رکھتے اسی طرح وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ ان میں عقل و شعور نہیں ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ نفس شعور سے غافل ہیں۔ پس وہ جس طرح زمانہ حال میں شعور نہیں رکھتے اسی طرح مستقبل میں بھی وہ شعور سے عاری رہیں گے۔ کیونکہ ان میں اس انتہائی غفلت کے سبب شعور کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ اس سے غافل ہیں کہ انہوں نے اپنے دین کو پارہ پارہ کر دیا ہے اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ دین کو چھوڑ دیا ہے اور اپنی خواہشات کے تقاضوں کے مطابق اسے ڈھال لیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ معنی ہے وہ اس قرآن سے غافل ہیں۔ لہذا ان کے اعمال برے ہیں۔ ناپسندیدہ ہیں جو یہ کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ ان اعمال سے مختلف ہیں جن سے اہل ایمان متصف ہوتے ہیں۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ شرک کا ارتکاب کرتے ہیں اور پھر ان کے برے اعمال اس سے زائد ہیں۔

هُمْ لَهَا عَامِلُونَ کا معنی ہے کہ وہ یہ برے اعمال کرنے کے عادی ہیں۔ مسلسل کرتے رہتے ہیں۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ اعمال کی صفت ہے۔ سَعْوٰتِهِمْ کا معنی ہے خوشحال لوگ آرام پسند لوگ۔ یعنی یہاں تک کہ جب ہم ان کے خوشحال لوگوں کو عذاب سے پکڑیں گے اس وقت وہ چلائیں گے۔ ابن جریر نے ابن جریج کے واسطے سے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ اس عذاب سے مراد غزوہ بدر میں ان کا قتل ہونا ہے (1)۔ شحاک نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ بھوک اور قحط ہے جس کی دعا ان کے لئے رسول اللہ

ﷺ نے فرمائی تھی۔ آپ ﷺ نے رب کریم کی بارگاہ میں التجا کی تھی اے اللہ! مضر پر اپنی گرفت سخت کر دے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے قحط کی طرح ان پر قحط مسلط کر دے۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں قحط میں مبتلا کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ کتے، عمر دار اور چلی ہوئی ہڈیاں تک کھانے پر مجبور ہو گئے (1)۔ ان کے خلاف یہ دعا صحیحین میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔

جنو کا معنی یہ مدد طلب کرنے کے لئے آواز بلند کرنا، چیخا، چلانا، ترکیب کلام میں اِذَا هُمْ يَجْتَنُونَ جواب شرط ہے۔ یہ اذا افتحا جاتیہ ہے۔ اور یہ جملہ اسمیہ پر قائم مقام جزائیہ کے ہے۔ آیت کے شروع میں حتیٰ اس پر دلالت کرتا ہے کہ حتیٰ کا ماقبل اسکے مابعد کیلئے سبب ہے۔ اور یہاں بھی ان کی غفلت ان کے ہلاک ہونے اور مدد کے لئے چیخنے چلانے کا سبب ہے۔ جیسا کہ اس قول میں ماقبل مابعد کے لئے سبب ہے۔ مَرَضٌ فَلَنْ يَخْفَىٰ لَا يَزُجُونَ (فلاں بیمار ہوا یہاں تک کہ انہیں اس کے (زندہ بچنے کی) امید تک نہ رہی۔)

ترکیب کے اعتبار سے یہ بھی جائز ہے کہ اِذَا هُمْ يَجْتَنُونَ اِذَا اخْلَدْنَا سے بدل ہے۔ اور جواب شرط قول باری تعالیٰ لَا تَجْتَنُوا الْيَوْمَ ہے۔ کیونکہ اس سے قبل قول مقدر ہے۔ اصل عبارت اس طرح ہے قَبْلَ لَهْمٌ لَا تَجْتَنُوا (ان سے کہا جائے گا نکلوا!) آج نہ چلاؤ۔ پہلی تاویل کے مطابق یہ جملہ مستفاد ہے۔

انکم منا لَا تَنْصُرُونَ نبی کی علت ہے۔ یعنی تم نہ چلاؤ، کیونکہ چلانا تمہارے لئے نفع بخش نہیں ہوگا اور نہ ہماری طرف سے تمہیں کوئی مدد اور معاونت حاصل ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کا دفاع ممکن نہیں ہوتا۔ مگر اس کے لئے جس کی مدد اور نصرت ہماری جانب سے کی جائے۔

قَدْ كَانَتْ اِلٰهِي تُشَلِّ عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ تَكْفُرُونَ ﴿١٠﴾ مُسْتَكْبِرِينَ ۙ يَهْتَمِرُونَ ﴿١١﴾ اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَاءَهُمْ مَّا لَمْ يَأْتِ اٰبَاءَهُمْ اِلَّا ذٰلِكَ ﴿١٢﴾

” (وہ وقت یاد کرو) جب ہماری آیتیں تمہارے سامنے پڑھی جاتی تھیں اور تم اپنی ایزدوں کے من لوٹ جایا کرتے تھے غرور و تکبر کرتے ہوئے (پھر حق حرم میں) تم داستان سرائی کیا کرتے تھے اور قرآن کی شان میں بکواس کیا کرتے تھے۔ جسے کیا انہوں نے کبھی تدبیر نہ کیا قرآن میں سے یا آئی تھی ان کے پاس ایسی چیز جو نہ آئی تھی ان کے پہلے آباؤ اجداد کے پاس سے۔“

لہٰذا یعنی سے مراد قرآن کریم میں نازل شدہ آیات طہیات ہیں۔ النکو ص کا معنی ہے الے پاؤں واپس لوٹنا۔ معنی یہ ہے (کہ وہ وقت یاد کرو) جب ہماری آیتیں تمہارے سامنے پڑھی جاتی تھیں تو تم الے پاؤں واپس لوٹ جایا کرتے تھے۔ یعنی انہیں سننے اور ان کے مطابق عمل کرنے سے پیچھے پھیر کر اعراض کر لیا کرتے تھے۔ یہ جملہ قول باری تعالیٰ انکم منا لَا تَنْصُرُونَ کی علت بیان کر رہا ہے۔ مُسْتَكْبِرِينَ یہ کا معنی ہے کہ تم حضور نبی کریم ﷺ کی اتباع کرنے اور آپ ﷺ پر ایمان لانے سے غرور و تکبر کرتے تھے۔ اور اپنے آپ کو دوسرے تمام لوگوں سے برتر اور اعلیٰ خیال کرتے تھے۔ یہ ضمیر کا مرجع کلام میں مذکور نہیں اور وہ ہے الحرم۔ یعنی تم یہ کہہ کر اظہار غرور و تکبر کرتے تھے کہ ہم حرم کے ہاں ہیں اور بیت اللہ کے جوار میں رہنے والے ہیں۔ کوئی بھی ہمارے اوپر غالب نہیں آ سکتا اور نہ ہم کسی سے خوفزدہ ہوتے ہیں (2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما مجاہد اور مفسرین کی ایک جماعت نے یہی تفسیر بیان کی ہے۔

چونکہ بیت اللہ شریف کے سبب ان کا فخر و تکبر کا اظہار کرنا بہت زیادہ مشہور تھا، اس لئے مزاج کو ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ ضمیر کا مزاج ایسی ہے۔ (آیات توحیح بالالف والہا مونت ہے اور اس کی طرف لوٹنے والی ہضمیر واحد مذکر ہے۔ پھر اس کی طرف یہ ضمیر کیسے لوٹ سکتی ہے؟) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے آیات بمعنی کتاب ہے اور چونکہ مستکبرین منکذبین کے معنی کو متضمن ہے۔ اس لئے ہا مستکبرین کے متعلق ہے۔ یا اس لئے کہ مسلمانوں پر ان کا اظہار تکبر و غرور کرنا سماعت قرآن کے سبب ہی پیدا ہوا تھا۔ اور ترکیب کلام میں مستکبرین تکصوں کے فاعل سے حال ہے۔ اسی طرح سنبؤا بھی اسی فاعل سے حال ہے یا مستکبرین کے فاعل سے حال ہے، یعنی حال کو انکم تسنبؤون۔ یعنی تم رات کے وقت بیت اللہ شریف کے ارد گرد اپنی مجالس جما کر قہقہے کہانیاں بیان کرتے رہتے ہو۔

۱۔ سمر کا معنی ہے رات کے وقت قہقہے کہانیاں سنانا۔ اور سمر اس سے اسم جمع ہے۔ جیسے باقرہ کے لئے اور جال جمل کے لئے اسم جمع ہے۔ کہا جاتا ہے سمر القوم (قوم نے داستان سرائی کی) کسمر ون لہم سمار و سامو۔ نہا یہ میں اسی طرح ہے (۱)۔ اسی طرح حدیث قبیلہ میں ہے اجزاء و وجہا من السامر۔ یعنی جب اس کا خاندان قوم سے آیا جو تھے اور داستانیں بیان کر رہے تھے۔ قاموس میں ہے سَمْرٌ سَمْرًا و سَمُورًا۔ وہ سو یا یعنی بیدار باہوہم السمار و السامرة۔ اور سمر اسم جمع ہے۔ اور سمر کا معنی ہے رات رات کی داستانیں چاند کی چاندنی اور طلعت دنار کی (۲)۔

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ السامر فی الحقیقت مصدر ہے جو فاعل کے وزن پر ہے جیسے عافیۃ۔ (۳) بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ مفرد ہے اور اصل جمع میں ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں نُحْمِرُ جُنُکُمْ طِفْلًا۔ اس میں طفلاً بمعنی اطفالا ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ سمر اسم معنی تاریخ رات ہے۔ اس تاویل کے مطابق سامورا طرف ہونے کی بنا پر منصوب ہوگا۔ یعنی تم اعراض کرتے ہو اور رات کے وقت داستان سرائی کرتے ہوئے قرآن کریم سننے سے غرور و تکبر کا اظہار کرتے ہو۔

نہُجْرُونَ کو نافع نے تا کے ضمیر اور جمع کے کسرہ کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے۔ اور اس کا مصدر اُجْرًا ہے۔ اور اس کا معنی ہے فحش گوئی کرنا یعنی تم حضور نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کے بارے فحش زبان استعمال کرتے ہو اور انہیں برا بھلا کہتے ہو۔ باقیوں نے اسے تا کے فتح اور جمع کے ضمیر کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ ہَجْرٌ یہجر ہَجْرًا سے مشتق ہے اس کا معنی بھی ہے فحش گوئی کرنا اور برا اور فحش قول کہنا۔ لہذا دونوں قرآنوں کے مطابق معنی ایک ہی ہے اور اگر مصدر ہَجْرًا ہو یعنی ہجرت متخرج ہو تو اس کا معنی ہے کٹ جانا اور اعراض کرنا۔ یا اس کا معنی ہے جو اس کرنا۔ یعنی تم قرآن کریم سے اعراض کرتے ہو یا نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان میں یا قرآن کریم کے بارے میں بکواسات کہتے ہو۔ اور وہ کچھ کہتے ہو جو تم جانتے نہیں۔

ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ قریش کعبہ معظمہ کے ارد گرد بیٹھ کر قہقہے کہانیاں سناتے تھے اور بیت اللہ شریف کا طواف نہیں کرتے تھے اور غرور و تکبر کا اظہار کرتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ مُسْتَبِیْنٌ مَّسْمُورٍ اَنْهَجْرُونَ (۴)

۱۔ اَلَمْ يَذَّبُوا الْقُرْآنًا مِنْ قَبْلِهِمْ لَمْ يَنْفَعُوا الْقُرْآنَ لَمْ يَسْمَعُوا لَكُمْ يَذَّبُوا الْقُرْآنَ۔ یعنی کیا انہوں نے قرآن نہیں سنا اور اس میں کبھی تم نہیں کیا؟

1- التباہیہ، جلد 2، صفحہ 400 (اعلیٰ)

2- القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 576 (الترغاب والترغی)

3- تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 591 (اعلیٰ)

4- الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 24 (اعلیٰ)

القول پر افس لام عہدی ہے، یعنی قول سے مراد وہ قرآن کریم ہے جو حضور نبی کریم ﷺ لے کر تشریف لائے۔ مفہوم یہ ہے کہ انہوں نے قرآن سنا اور اس وقت آپس میں خوب غور و فکر کیا جب انہوں نے اس کا معارضہ لائے گا ارادہ کیا۔ لیکن وہ اس کی مثل ایک چھوٹی سی سورۃ بھی لائے پر تاور نہ ہو سکے۔ تو اس کے اعجاز اخبار اور قصص سے یہ ظاہر ہو گیا کہ قرآن کریم کسی بشر کا کلام نہیں۔

۱۱۔ اَمْرٌ جَاءَهُمْ مِنْ اَمْرِ مَشْهُودٍ یعنی بل سے اور ہمزہ اشتہام انکاری کے لئے ہے۔ معنی یہ ہے یا اُمّی تھی ان کے پاس اسکی چیز جو نہ آئی تھی ان کے پہلے آ یا وہ اجداد کے پاس۔ یعنی بلکہ ان کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں آئی جو ان کے پہلے آ یا وہ اجداد کے پاس نہیں آئی۔ بلکہ ان کے پاس وہی چیز (کتاب) آئی جو ان کے پہلے بزرگوں حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کے پیچھے آنے والے رسل علیہم السلام کے پاس آئی اور قریش حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہم السلام کی نبوت اور ان کی فضیلت کے معترف تھے اور محمد ﷺ بھی انہی دو کی مثل نبی ہیں۔ اور اس میں کوئی شئی بھی محال نہیں۔

اَمْرٌ لَمْ يَعْرِفُوا اَسْأَلُوهُمْ فَمَنْ لَهٗ مِنْكَ رُوْنٌ ﴿۱۱﴾ اَمْرٌ يَقُولُوْنَ بِهٖ حِجَّةٌ لِّبَلِّ جَاءَهُمْ
بِالْحَقِّ وَاَكْتَرَهُمْ لِدَلَّتْ لُحُوْنٌ ﴿۱۲﴾ وَلَوْ اَتَّبَعْتَ الْحَقَّ اَهْوَاَءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ
وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ لَبَلِّ اَتَّبِعْتَهُمْ يَذُّرْهُمْ فَمَنْ عَنْ ذِكْرِهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۱۳﴾

”یا انہوں نے اپنے رسول (کرم) کو نہ پہچانا تھا اس لئے وہ اس کے منکر بنے رہے یا، کہتے ہیں کہ اسے سودا کا مرض ہے۔“ (یوں نہیں) بلکہ وہ تشریف لایا یا ان کے پاس حق کے ساتھ اور بہت سے لوگ ان میں سے حق کو ناپسند کرتے ہیں۔ اور اگر بیروی کرتا حق ان کی خواہشات (نفسانی) کی تو درہم برہم ہو جاتے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے۔ بلکہ ہم ان کے پاس لے آئے ان کی صحیح تو وہ اپنی صحیح سے ہی روگردانی کرنے والے ہیں۔“

۱۱۔ یا انہوں نے اپنے رسول کرم محمد مصطفیٰ علیہ الطیبہ والتیہ و الثناء ﷺ کو نہیں پہچانا تھا۔ یعنی وہ آپ ﷺ کی حیات طیبہ کے تمام مراحل (بچپن لڑکپن اور جوانی وغیرہ) کو پہچانتے تھے۔ آپ کے حسب و نسب امانت و صداقت حسن اخلاق عہد کی پاسداری اور کسی انسان سے تعلیم حاصل کئے بغیر آپ ﷺ کے کمال علم و ادب اور دیگر اوصاف سے واقف و آگاہ تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس طرح مروی ہے۔

فَمَنْ لَمْ يَعْرِفُوا فَمَنْ لَمْ يَعْرِفُوا كَمَا عَظَفَ هُوَ۔ یعنی مذکورہ اسباب میں سے کسی کے سبب انکار ممکن ہے اور ان میں سے تو کوئی شئی بھی موجود نہیں بلکہ ان کی اہم داد ثابت ہیں۔ (نتیجہ ان کا انکار کسی اعتبار سے بھی درست اور جائز نہیں)

۱۲۔ اَمْرٌ يَقُولُوْنَ بِهٖ میں بھی اُمّ مشہودہ ہے اور اس کے ضمن میں آنے والا ہمزہ روع اور توجیح کے لئے ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ بلکہ کیا یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کو مجنون کہتے ہیں؟ حالانکہ آپ ﷺ عقل و دانش کے اعتبار سے ان تمام سے اعلیٰ اور فکر و نظر کے اعتبار سے تمام سے پختہ اور مضبوط ہیں۔ آپ ﷺ کی مثل آدمی کی جانب جنون اور دیوانگی کی نسبت وہی کر سکتا ہے جو انتہائی سرکش اور بغض رکھے والا ہو۔ یا پھر وہ خود دیوانہ اور مجنون ہو۔ یہ بھی ممکن ہیں کہ تمام مواقع پر اُمّ متصلہ ہو اور مفہوم مراد کی نفی کے لئے اس عبارت پر ہوجس پر ہمزہ اشتہام داخل ہے، یعنی اَقْلَمُ يَذُّبُوْنَ ا۔ اور جملہ اَقْلَمُ يَذُّبُوْنَ استثناء ہو۔ گویا کہ جب سامع نے یہ ارشاد خداوندی سنا تو گمانت الہی

شَتَّىٰ عَلَيْهِمْ لَكُمْ فَلَمْ يَمُؤْنُوا عَلَىٰ أَغْثَابِكُمْ يُكْفُرُونَ ﴿١٠﴾ مُسْتَكْبِرِينَ ﴿١١﴾ يَهْتَجِرُونَ ﴿١٢﴾ لَوْ سَمِعْتُمْ لَهُمْ لَكَرِهْتُمْ لَوْلَا إِتْرَاقُهَا يَخْتَلِفُ فِيهَا مَا مَلَكَتْ أَيْدِيكُمْ فَتُكْفَرُونَ ﴿١٣﴾

ظہار کرنے اور بکواسات کرنے کا سبب کیا ہے؟ کیا اس کا سبب مذکورہ بالا امور میں سے کوئی شئی ہے؟ یعنی ان کا قرآن کریم میں غرور و تکبر اور تردید کرنا یا اپنے سے پہلے کسی نبی علیہ السلام کے آنے کا علم نہ ہونا، یا رسول اللہ ﷺ کی امانت و صداقت وغیرہ کو نہ پہچاننا یا پھر ان کا آپ ﷺ کے بارے میں گمان کرنا کہ آپ ﷺ تو مجنون ہیں؟ (نعوذ باللہ من ذالک) تو اللہ تعالیٰ نے اس سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا نہیں۔ ان اسباب میں سے کوئی شئی بھی موجود نہ تھی۔

اس بلکہ اس جھگڑے، نفاق اور بغض و عناد کا سبب یہ ہے کہ آپ ﷺ تو ان کے پاس حق لے کر تشریف لائے ہیں۔ حق سے مراد ایسا قول ثابت ہے جو تحقیق ہو، عقلاً نظراً اس کی صداقت اور چوائی بالکل ظاہر ہو اور واضح ہو اور کسی عقل و دانش رکھنے والے پر اس کی صحت اور حسن منطقی نہ ہو۔

ترکیب کلام میں جملہ ذَوَّلِ الْكُفْرَانِ الْبَاقِي كِلْمٌ مَّفْعُولٌ مِّنْهُ لَمْ يَمُؤْنُوا عَلَىٰ أَغْثَابِكُمْ کے مفعول سے حال ہے۔ یعنی آپ ﷺ ان کے پاس حق لے کر آئے۔ درآغماضیکہ وہ بغض و عناد اور ظلم و زیادتی کرتے ہوئے اسے ناپسند کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ حکومت و ریاست کے طلبکار اور چاہنے والے ہیں، شہوات نفسانیہ کے پیروکار ہیں، جاہلوں کی تقلید کے خواہش مند ہیں اور عادات اور رسوم و رواج کے پابند ہیں۔ ان کا یہ انکار اور ناپسندیدگی کا اظہار ان کی عقل و دانش یا فہم و فراست کا نتیجہ نہیں ہے۔

اس حکم میں اکثر کی تید کر کی گئی ہے، کیونکہ ان میں سے بچھا ہے بھی تھے جنہوں نے اپنی قوم کی جھڑکیوں اور زبرد توخ کے سبب ایمان چھوڑ دیا تھا۔ یا اپنی ذہانت و وفائت کے کم ہونے کے سبب یا پھر غرور و تکبر کرنے کے سبب ایسا کیا تھا۔ نہ کہ اس لئے کہ وہ حق کو ناپسند کرتے تھے اور اس کے خلاف بغض و عناد رکھتے تھے۔

یہ اور اگر حق ان کی خواہشات نفسانی کی پیروی کرتا، اس طرح کئی مواقع متعدد وجود دیتے تو آسمان زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب درہم برہم ہو کر رہ جاتا۔ اور کوئی چیز عدم کے پردے سے معرض وجود میں نہ آتی۔ جیسا کہ ہم اس کا تفصیلی بیان سورہ حج کی آیت لَوْ كَانَ فِضْيُنًا مِنَ الْآلِهَةِ لَأَرَادْنَا أَنْ نَقْتُلَكَ إِذْ نَسَّكَ فِي الْهَيْكَلِ تَوَكَّلْتُ عَلَيْكَ يَا مَعْشَرَ الْكٰفِرِيْنَ كَيْفَ تَعْبُدُوْنَ اِيْنَ كَرِهْتُمْ اِنْ تَوَكَّلْتُمْ عَلٰى سِوَايَ اللّٰهِ فَقَدْ تَكْفُرُوْنَ ﴿١٠٠﴾ میں ذکر کر چکے ہیں۔

ابن جریر، مقاتل سندی اور مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ حق سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے (۱) لیکن قرآن اور زبان نے کہا ہے کہ حق سے مراد قرآن کریم ہے (۲)۔ معنی یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ان کی خواہشات اور مقصود کی پیروی کرتا اور اپنے لئے کئی شریک بنا لیتا، یا اپنی اولاد پیدا کرتا اور قرآن کریم ان کی خواہشات اور پسند کے مطابق نازل فرماتا تو پھر قرآن شرک اور دیگر بتوں کا درس دیتا اور اللہ تعالیٰ الٰہی نہ ہوتا۔ کیونکہ الوہیت شرک کا احتمال نہیں رکھتی اور اللہ تعالیٰ فاشی کا حکم نہیں دیتا کیونکہ فشاء کا حکم ایک رذیل امر ہے سخت عیب اور برائی ہے۔ اور الوہیت برہم کے رذائل سے منزہ ہونے اور پاک ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ الٰہی نہ ہوتا تو بالیقین تمام تر منکرات کا وجود درہم برہم ہو کر رہ جاتا، نام و نشان تک نہ ہوتا۔

بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ اگر حق ان کی خواہشات کے تابع ہو جاتا اور باطل سے بدل جاتا تو وہ شئی فتم ہو جاتی جس کے ساتھ عالم قائم ہے۔ لہذا اسکے لئے تو ام باقی نہ رہتا۔ یہ معنی بھی کیا گیا ہے کہ اگر وہ حق جو حضور نبی کریم ﷺ وین کی صورت میں لے کر تشریف

لائے۔ ان کی خواہشات کے تابع ہو جاتا اور وہ شرک من جاتا تو بالیقین اللہ تعالیٰ ان پر عذاب نازل کر دیتا اور پورے عالم کو اپنی شدت غضب سے تباہ و برباد کر کے رکھ دیتا۔ **بَلْ أَنْتُمْ كَاغْفِیْهِمْ كَاغْفِیْ قَوْلِ بَارِئِ تَعَالَى بَلْ خِیَآءٌ هُمْ بِأَلْحَقِیْ لَخِیْرٌ بِرَبِّهِمْ**۔ جملہ لو اَتَّبِعِ الْهَقِیْقَ اَهْوَاَءَهُمْ معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان محترمہ ہے جو کہ ان کی خواہشات کے بظان کے بیان کے لئے ہے۔

یہ ہلڈ ٹیکرہم سے مراد وہ کتاب (قرآن مجید) ہے جو انہیں اللہ تعالیٰ کی یاد دلاتی ہے۔ یا ان کے لئے نصیحت ہے۔ یا اس سے مراد وہی ذکر ہے جس کی تمنا انہوں نے اس قول میں کی **لَوْ اَنَّ عِبَادًا مِّنْكُمْ اَبْرَأُوْا اِلَآئِیَّ لَیْسَ لَکُمْ اَلِیُّوْسُ** لَکُمْ اَلِیُّوْسُ اَلِیُّوْسُ اَلِیُّوْسُ (اگر ہمارے پاس پہلے لوگوں کی جانب سے کوئی یادداشت ہوتی تو ہم اللہ تعالیٰ کے غلط بندے ہوتے)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا ذکر سے مراد ایسی کتاب ہے جس میں ان کے لئے فخر و شرف موجود ہے۔ یعنی قرآن کریم اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے **لَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ کِتٰبًا فِیْہِ ذِکْرٌ لَّکُمْ** (ہم نے تمہاری طرف کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارے لئے عزت و شرف ہے۔ مزید فرمایا **اِنَّہٗ لَذِکْرٌ لَّکُمْ**۔ (بلاشبہ یہ آپ کے لئے باعث شرف ہے) اور جب یہ ہے کہ قرآن کریم لغت قریش کے مطابق نازل ہوا (اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کو قریش کا تابع بنا دیا اور اہم امتی میں مصور ہو گئی۔ لیکن وہ خود ایسی کتاب کی طرف توجہ نہیں کرتے (جو ان کے لئے باعث شرف ہے) اور نہ وہ خود عزت و شرف کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اَمْ تَسْتَلْہُمْ حَرْجًا وَّحَرْبًا جِهًا اَلَّیْ خَیْرٌ وَّہُوَ خَیْرٌ الرَّزِیْقِیْنَ ۝ وَاِنَّکَ لَتَدْعُوْہُمْ اِلٰی

صِرٰطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ وَاِنَّ اَلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاَلْاٰخِرَةِ لَکِنِ الصِّرٰطِ اَلَّذِیْکُمْ ۝

”کیا آپ طلب کرتے ہیں ان سے کچھ معاوضہ؟ (آپ کے لئے) تو آپ کے رب کی عطا بہتر ہے اور وہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔ اور بیشک آپ تو انہیں بلا تے ہیں یہ بھی راہ کی طرف بلانے بلاشبہ وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے آخرت پر وہ راہ راست سے منحرف ہونے والے ہیں۔“

اَمْ تَسْتَلْہُمْ کا عطف اَمْ پہ جتنے پر ہے۔ اور اس میں غیب سے خطاب کی طرف التفات ہے اور یہاں بھی استفہام انکار کے لئے ہے۔ یعنی مفہوم یہ ہے کہ آپ ان سے کسی اجر کا مطالبہ تو نہیں کرتے کہ وہ اس تادان کے خوف سے آپ پر ایمان نہ لائیں۔ پس آپ کے لئے تو آپ کے رب کا وہ اجر و ثواب جو آپ کو آخرت میں عطا فرمائے گا وہ بہتر ہے۔ مزہ اور کسائی نے خواجہ اور فخر خج زبک دونوں مقامات پر الف کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عامر نے دونوں مقام پر بغیر الف کے پڑھا ہے۔ لیکن دونوں کا معنی ایک ہے۔ اور وہ کسی کام کا معاوضہ اور اجرت تادان۔ قاسموس میں ہے کہ خرج خراج کی شکل ہے۔ اس کا معنی تادان اور نکس ہے (2)۔ یا قبوں نے اَمْ تَسْتَلْہُمْ خَوْجًا بغیر الف کے اور فخر خج زبک الف کے ساتھ پڑھا ہے۔

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے خرج (خرج) وطل (آمدن) کے مقابل آتا ہے۔ اور خرج کا معنی وہ شئی ہے جو تو اپنے پاس سے کسی دوسرے کو دیتا ہے۔ اور خراج کا غالب اطلاق اس نکس پر ہوتا ہے جو سلطان وقت کی جانب سے زمین پر لگا یا جاتا ہے (3) پس اس قرأت کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف خراج کی نسبت یہ احساس دلانے کے لئے ہے کہ رب کریم کی عطا کثیر بھی ہے اور لازم بھی۔

اور وہی اپنی وسعت اور دائمی ہونے کے سبب بہتر ہے۔ پس اپنے رب کریم کی جانب سے اس کثیر اور فراخ عطا کے سبب ان سے اجر کے مطالبے سے آپ مستغنی ہیں۔ یہ جملہ نئی سوال کی علت بیان کرنے کے لئے ہے۔ وھو خیر الزینین (اور وہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے) ترکیب کلام میں اس کا عطف نحو راجح و ینک خیر پر ہے۔ یا پھر ینک سے حال ہے۔

۷۔ ینک اسے محمد ﷺ آپ تو انہیں سیدھی راہ کی طرف بلا تے ہیں۔ جس کے سیدھا ہونے اور اس میں کوئی گئی اور نیز حایین نہ ہونے کی شہادت تمام مقول سیدہ دیتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات طیبات میں اس چیز کی وضاحت بیان کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی دعوت سے انکار کا سبب حق کو ناپسند کرنے اور قلت فہم کے سوا اور کوئی نہیں۔ ایمان کی طرف دعوت دینے والے کا ذکر فرمایا۔ اور فرمایا کہ وہ جس کی طرف دعوت دیتا ہے وہ صراط مستقیم ہے۔ تمام اہل عقل و دانش کے نزدیک پسندیدہ اور مرغوب فیہ ہے اور وہ ان کے لئے باعث شرف ہے۔ کیونکہ وہ بالخصوص قریش کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔ (پس اس کے باوجود ان کا اسلام قبول نہ کرنا) اس بات پر دلیل ہے کہ ان کے انکار کا موجب فقط حق کو ناپسند کرنا تھا اور اس کا سبب ان کا عناد اور بغض تھا یا فہم و فراست کی کمی تھی۔ اور اس کا دار و مدار اس شقاوت و بدبختی پر ہے جو ازل سے ہی ان کے لئے لکھی جا چکی ہے۔ کیونکہ وہ عقلمند تھے۔ دنیوی منافع جیسے چاہتے حاصل کر لیتے۔ لہذا انہیں جلدی یا دیر سے ملنے والے دائمی منافع جو کہ قسم قسم کے بخش کی آزمائش سے خالص اور پاک ہے انہیں ان کا ادراک نہ ہوا ان کی ازلی شقاوت و بدبختی کے باعث ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے سیدھی راہ کی جانب راہنمائی فرماتا ہے۔ وَاللّٰهُ يَهْدِي مَن يَشَاءُ لِرَاسٍ مُّبِينٍ۔

۸۔ الضراط سے مراد صراط مستقیم ہے۔ کیونکہ الصراط الیاف لام عہدی ہے۔ معنی یہ ہے کہ بلاشبہ وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے وہ راہ راست سے منحرف ہونے والے ہیں۔ ان میں استعداد اور صلاحیت ہی موجود نہیں۔ کیونکہ ان کی تخلیق ہی اس مضمحل کے پر تو سے ہوئی ہے۔ اس لئے ان کا صراط مستقیم کی طرف راہنمائی پانا ممکن ہی نہیں اور وہ حق کے ظاہر ہونے کے بعد اسے ناپسند کرتے ہیں۔

وَلَوْ رَحِمْنَهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِنْ ضُرٍّ لَلَجُّوا فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿٥١﴾ وَلَقَدْ
 أَخَذْنَاهُم بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكْبَرُوا لِيُرِيَهُمْ وَمَا يَكْتُمُونَ ﴿٥٢﴾ حَتَّىٰ إِذَا فَتَنَّا
 عَلَيْهِمْ بِبَابِآءِ عَذَابٍ شَدِيدٍ إِذْ أَهْمُ فِيهِمْ مِّمْلَسُونَ ﴿٥٣﴾

”اور اگر ہم ان پر مہربانی بھی فرمائیں اور درد بھی کر دیں اس مصیبت کو جس میں مبتلا ہیں پھر بھی وہ بے حسے جائیں گے اپنی سرکشی میں اندھے بنے ہوئے۔ اور ہم نے کھڑا کیا انہیں عذاب سے پھر بھی وہ نہ دیکھے اپنے رب کی بارگاہ میں اور نہ وہ اب گڑبگڑا کر (توبہ کرتے) ہیں۔ یہاں تک کہ جب ہم کھول دیں گے ان پر دروازہ سخت عذاب والا وہ اس وقت بالکل مایوس ہو جائیں گے۔“

۱۔ اور اگر ہم ان پر مہربانی بھی فرمائیں اور ان سے وہ عذاب دور کر دیں جس کے ساتھ ہم نے ان کے خوشحال لوگوں کو کھڑا ہے۔ چاہے عذاب سے مراد ان کا میدان بدر میں قتل ہونا ہو۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول ہے یا عذاب سے مراد بھوک اور قحط سالی ہو۔ جیسا کہ شماخ نے ذکر کیا ہے (۱) ہم نے یہ دونوں قول اس سے قتل بیان کر دیئے ہیں۔ پھر بھی وہ اپنی سرکشی میں اندھے

بنے ہوئے بڑھتے جائیں گے۔ اللہ حاج کا معنی ہے عباد و مخالفت میں بڑھے چلے جانا اور جس فعل سے روکا جائے اس کا ارتکاب کرنا۔ (اللَّحَاجُ النَّصَادِي فِي الْعِبَادِ وَتَعَاطِي الْفِعْلِ الْمَزْجُورُ عَنْهُ فِي طَعْنَابِهِمْ) کا معنی ہے کہ وہ حق سے ٹکرا اور غرور اختیار کرنے میں کفر میں غلو اور افراط اختیار کرنے میں اور رسول اللہ ﷺ سے عداوت اختیار کرنے میں (بڑھتے ہی جائیں گے)۔ يَغْمَهُونَ کا معنی ہے کہ وہ ہدایت سے اندھے بنے ہوئے ہیں۔ ترکیب کلام میں یہ لُجُؤُا کے فاعل سے حال ہے اور یہ جملہ شرطیہ لَا تَخْضَرُوا وَالْيَوْمَ أَنْتُمْ مَنَا لَا تَنْصُرُونُ پر معطوف ہے۔ کیونکہ اس کا معنی ہے قیل لہم لَا تَخْضَرُوا الرَّحْمٰنُ۔ اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ بیشک ہم نے ان پر مہربانی نہیں کی۔ اور اگر ہم ان پر مہربانی کر بھی دیتے پھر بھی وہ اپنی سرکشی میں بڑھتے چلے جاتے اور توبہ نہ کرتے۔ گویا یہ جملہ ان پر مہربانی نہ کرنے کے علل بیان کر رہا۔ نسائی اور حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ ابو سفیان رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی اے محمد! ﷺ میں تمہیں اللہ تعالیٰ اور قرابتداری کا وہ اہل طرد جتانہوں کہ اب تو ہم ان اور خون کھاتے لگے ہیں (۱) تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

ع تحقیق ہم نے انہیں عذاب کے ساتھ پکڑ لیا۔ عذاب سے مراد غزوة بدر میں ان کا قتل ہونا۔ یا پھر قحط کا مسلط ہونا ہے۔ پھر بھی وہ اپنے رب کی بارگاہ میں نہ بچکے۔ یعنی انہوں نے (اپنے کفر و عناد) سے توبہ کرتے ہوئے اپنے رب کی طرف رجوع نہیں کیا۔ بلکہ اپنی ہمت دھری پر قائم رہے اور اپنی سرکشی اور عناد پر ہی چلے رہے۔ اِنْ سَكَنْتُمْ اِيَّا تَوَابًا اِسْتَعَالَ هُوَ اور اس کا مادہ الکلون ہے۔ کیونکہ محتاج ایک کون سے دوسرے کون، یعنی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونا رہتا ہے۔ یا پھر یہ باب استعمال ہے اور اس کا مادہ اسکلون ہے۔ اور کاف کے بعد الف اشباع فتح کا ہے۔ غلیب۔

وَمَا يَنْصُرُوْنَ حُوْنٌ (اور نہ وہ اب گڑگڑا کر توبہ کرتے ہیں)۔ یعنی عاجزی زاری اور خشوع ان کی عادت ہی نہیں۔ علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے دلائل میں بیان کیا ہے کہ ابن اثال حنفی قید بقید ہو کر حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے اسے رہا کر دیا۔ چنانچہ وہ دولت اسلام سے مشرف ہوا اور مکہ مکرمہ چلا گیا۔ پھر وہاں سے واپس لوٹ کر آیا اور مکہ مکرمہ اور یمامہ کے علاقے قیرہ کے درمیان ذریہ لگا لیا۔ اور یمامہ سے جو بھی سامان رسد مکہ کی جانب آتا تو وہ اسے راستے میں روک لیتا، یہاں تک کہ قریش بھوک سے مرنے لگے اور جانوروں کی ان کھانے تک مجبور ہو گئے۔ چنانچہ ابوسفیان حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی کیا آپ یہ نہیں کہتے کہ آپ کو عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں۔ اسی طرح ہے۔ تو پھر اس نے کہا (یہ کیا ہے؟) کہ آپ نے اپنے آباء کو تو تموار کے ساتھ قتل کر دیا اور بیٹوں کو بھوک سے قتل کر رہے ہیں۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (۲)۔ اس آیت میں اس بات پر استہساہ موجود ہے کہ جب عذاب میں گرفتار ہونے کے باوجود انہوں نے عاجزی اور زاری نہیں کی تو اگر ہم ان پر مہربانی فرمادیتے اور ان سے دوسرے عذاب کو دور بھی کر دیتے تو پھر بھی بطریق اولیٰ وہ عجز کا اظہار نہ کرتے اور ان سے تضرع اور زاری کا مظاہرہ نہ ہوتا۔

اگر یہ کہا جائے کہ آیت کی تفسیر میں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے۔ وہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے وہ عذاب دور نہیں کیا جس کے ساتھ ان میں سے خوشحال لوگوں کو پکڑا حالانکہ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ذکر کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے قریش کے

خلاف یہ دعا کہ اسے اللہ! حضرت یوسف علیہ السلام کے دور کا قحط کسی طرح ان پر بھی مسلط فرما۔ نتیجتاً ان پر قحط چھا گیا۔ تو پھر ابوسفیان حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی میں آپکو اللہ تعالیٰ اوزر قرابتاری کا واسطہ دیتا ہوں کیا آپ یہ نہیں کہتے کہ آپ کو عالین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ہاں کیوں نہیں۔ (یہ درست ہے)۔ تو اس نے کہا کہ آپ نے آہا کو تلوار کے ساتھ قتل کر دیا ہے اور بیٹوں کو بھوک، یعنی قحط کے ساتھ قتل کر رہے ہیں۔ آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کیجئے کہ وہ ہم سے اس قحط کو دور فرماوے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے دعا فرمائی تو ان سے قحط دور ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (۱) یہ قصہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی دعا کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان سے قحط سالی کا عذاب دور فرمایا۔ پس ان میں وہ تظہیر کیا ہے؟

میں کہتا ہوں کہ آیت صرف اس معنی پر دلالت کرتی ہے کہ زمانہ ماضی میں ان پر مہربانی نہیں ہوئی اور ان سے عذاب دور نہیں ہوا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ یہ جانتا تھا کہ اس عذاب اور مصیبت کو ان سے دور کرنے کے باوجود وہ اپنی سرکشی پر قائم رہیں گے۔ لیکن آیت اس معنی پر دلالت نہیں کرتی کہ زمانہ مستقبل میں بھی ان سے عذاب دور نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ حضور نبی رحمت ﷺ نے رب کریم کی بارگاہ میں ان سے اس مصیبت کو دور کرنے کی التجا کی۔ رب کریم نے اسے شرف قبول عطا فرمایا اور ان سے عذاب دور فرمادیا۔ (قحط سالی ختم ہو گئی) لیکن اس کے باوجود انہوں نے بجز واکساری نہ کی بلکہ اندھے بن کر اپنی سرکشی اور بغض و عناد پر مصر رہے۔ اور اپنے رب کی جانب توبہ کرتے ہوئے رجوع نہ کیا۔

۱۱ اس آیت میں حتی ابتداء یہ ہے۔ اور عذاب سے مراد بھوک اور قحط سالی کا عذاب ہے۔ بشرطیکہ ارشاد باری تعالیٰ سَلَّىٰ اِذَا آآ آخَذْنَا مُثْقَلِيهِمْ بِالْعَذَابِ میں عذاب سے مراد غزوہ بدر میں انہیں قتل کرنا اور قیدی بنانا ہو۔ اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا ہے۔ کیونکہ قحط سالی قید اور قتل کی نسبت زیادہ شدید ہے۔ معنی یہ ہوگا یہاں تک کہ جب ہم ان پر قحط کے عذاب کا دروازہ کھول دیں گے۔ وہ اس وقت بالکل مایوس ہو جائیں گے۔

مُثْلِبُسُونَ کا معنی ہے کہ وہ ہر بھلائی سے حیرت اور مایوسی کا شکار ہو جائیں گے۔ حتیٰ کہ ان میں سب سے زیادہ سرکش اور بغض رکھنے والا انسان آپ کے پاس حاضر ہوا اور مہربانی اور دعائے رحمت کی آرزو کرنے لگا۔

اور اگر سابقہ ارشاد میں عذاب سے مراد بھوک اور قحط کا عذاب ہو جیسا کہ شحاک کا قول ہے تو پھر یہاں عذاب شدید سے مراد موت اور عذاب قبر ہوگا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد قیامت کا قائم ہونا اور جہنم کا عذاب ہے۔

آیت طیبہ میں فَخَصْنَا مُسْتَقْبِلَ كَامْتِی اِذَا كُرْنِے کے لئے ماضی کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے۔ تاکہ اس کے وقوع پر ہونے کا یقین حاصل ہو جائے۔ جیسا کہ قول باری تعالیٰ اِذَا شَفَعْتُمْ مَعَهُ تَرْثُ میں ہے۔ معنی اس طرح ہے کہ بیشک ہم نے ہر قسم کی آزمائش اور تکلیف کے ساتھ انہیں آزمایا۔ انہیں قتل اور قید سے دوچار کیا اور انہیں قحط سالی میں جکڑا۔ لیکن انہوں نے توبہ نہ کی اور نہ انہوں نے عاجزی و زاری کا اظہار کیا۔ حتیٰ کہ جب انہیں جہنم کا عذاب دیا جائے گا تو اس وقت وہ بالکل مایوس ہو جائیں گے۔ یہی مفہوم اس ارشاد میں بھی ہے یَبْعَثُ اللَّهُ مَوْتًا سَاعَةً لِّبَنِي سَاعَةَ النَّهْرِ مَوْتًا۔

وَهُوَ الَّذِي اَسْأَلُكُمْ السَّلَامَ وَالْاَبْصَارَ لَا تَفِدَا قَلِيلًا مَا تَشْكُرُونَ ﴿٥٦﴾ وَهُوَ الَّذِي

ذَمَّا كُمْ فِي الْأَرْضِ وَإِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٦٠﴾ وَهُوَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ وَلَهُ
 اخْتِلَافٌ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٦١﴾

”اور وہ وہی ہے جس نے بنائے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل لیکن (ان عظیم نعمتوں پر بھی) تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو اور وہ وہی ہے جس نے پھیلا دیا تمہیں زمین (کے اطراف) میں اور (انجام کار) اسی کی جناب میں اٹکنے کے جاؤ گے اور وہ وہی ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور اسی کے اختیار میں ہے رُوشِ نِیلِ دنہار کیا (اتنا بھی) تم نہیں سمجھتے۔“

۱۔ اللہ تعالیٰ نے کان اور آنکھیں بنائیں تاکہ تم ان سے اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ علامات اور نشانیوں کو جان سکو اور محسوس کر سکو اور دل بنا یا تاکہ تم ان نشانیوں میں گہری غور و فکر کر سکو اور اس سے دیگر منافع دینیہ و دنیویہ پر مزید راہنمائی پاسکو۔
 قَوْلُهُمَا تَلْعَلُ تَعْقِلُونَ میں مازائد و تاکید کے لئے ہے۔ اور قَوْلُهُمَا مَصْدَرِيت (مفعول مطلق ہونے) یا ظرفیت (مفعول فی پر ہونے) کی بنا پر منصوب ہے۔ یعنی تَشْكُرُونَ شُكْرًا قَلِيلًا (تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو) یا تَشْكُرُونَ فِي زَمَانٍ قَلِيلٍ (تم بہت قلیل وقت شکر ادا کرتے ہو) کیونکہ عمدہ اور اعلیٰ نوع کا شکر یہ ہے کہ ان کا استعمال اسی کام میں کیا جائے جن کے لئے یہ پیدا کئے گئے ہیں۔ اور کسی اور کو شکر یک ٹھہرانے بغیر انکے عطا کرنے والے پر یقین رکھا جائے۔

بعض نے کہا ہے کہ عرف کے مطابق اس عبارت کا معنی یہ ہے کہ تم بالکل شکر ادا نہیں کرتے۔

۲۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہی تمہیں پیدا فرمایا ہے اور پھر تو اللہ و تعالیٰ کے سبب تمہیں زمین میں پھیلا دیا ہے۔ اور تمہارے بکھر جانے اور پھیل جانے کے بعد انجام کار قیامت کے دن تمہیں پھر اکٹھا کر دیا جائیگا۔

۳۔ اور اللہ تعالیٰ ہی ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ اور رات دن میں تاری اور بخندنی اور دیگر منافع کے اعتبار سے اختلاف یا موسم سرما اور گرمیوں اور راتوں میں طویل اور چھوٹا ہونے کے اعتبار سے اختلاف اسی کے حکم اور فیصلے کے مطابق ہوتا ہے۔ کیا غور و فکر اور تامل کے سبب تم اتنا بھی نہیں سمجھتے؟ کہ یہ سب ہماری جانب سے ہے اور ہماری قدرت تمام ممکنات کو محیط ہے۔ اور انہی ممکنات میں سے موت کے بعد دوبارہ زندہ کرنا بھی ہے۔ (یعنی ہم اس پر بھی قادر ہیں) ارشاد باری تعالیٰ وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَكُم مِّن سَعْيِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ہے۔ جو کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنے اور ان مجسم نعمتوں کے بعد ان کے کفر پر ڈالنے پر اظہار شکایت کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔

بَلْ قَالُوا امْشِلْ مَا قَالِ الْآوَلُونَ ﴿٦٢﴾ قَالُوا إِذْ أَمْنْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا ۖ إِنَّا
 لَسَبْعُونَ ﴿٦٣﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا حُنًى وَأَبًا ۖ وَنَاهَدْنَا عَنْ قَبْلِ أَنْ هَذَا إِلَّا آسَاطِيرُ
 الْأَوَّلِينَ ﴿٦٤﴾

”بلکہ انہوں نے بھی وہی بات کہی جو پہلے (کفار) کہا کرتے تھے۔ انہوں نے کہا: کیا جب ہم مر جائیں گے اور بن جائیں گے خاک اور ہڈیاں تو کیا ہمیں پھر اٹھایا جائے گا؟ بلکہ بلاشبہ یہ وعدہ کیا گیا ہم سے اور ہمارے باپ دادا کے

ساتھ بھی آج سے پہلے (لیکن آج تک پورا نہ ہوا) نہیں ہیں یہ باتیں مگر سن گھڑت افسانے پہلے لوگوں کے سے۔
 لہٰذا قائلوا الخ کا عطف ہوا اَنْتُمْ بِذُنُوبِكُمْ پر ہے۔ یعنی بلکہ نکار کہ نہ اسی طرح کہا جیسے سابقہ آیتوں کے پہلے نکار کہا کرتے تھے۔
 یہ قائلوا پہلے مذکور قائلوا سے بدل ہے۔ ء اِذَا جِئْتُمْ اسْتَفْهَامُ انکار کی ہے۔ انہوں نے انکار کیا اور اسے بعید از عقل سمجھا۔ لیکن انہوں
 نے اپنی تخلیق کی ابتداء میں غور و فکر نہیں کیا کہ وہ اس سے قبل مٹی تھے اور اس مٹی سے پہلے بالکل کچھ بھی نہ تھے۔ اور بغیر کسی سابقہ مادہ کے
 وہ پیدا کر دیے گئے۔

یعنی بعث بعد الموت کا وعدہ تو آج سے پہلے ہمارے باپ دادا سے وہ لوگ کرتے آئے ہیں، جن کے بارے میں یہ ذکر کیا جاتا ہے
 کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ مِنْ قَبْلِ اس فعل کی طرف ہے جس پر حرف عطف والت کر رہا ہے، یعنی وَعِدَ بِهَذَا اَبَاؤُنَا مِنْ قَبْلِ
 هَذَا الزَّمَانِ وَلَمْ يَقَعْ اِلَى الْاَنِّ مَعَ تَقَاوُلِ الزَّمَانِ۔ (اس کا وعدہ تو اس زمانے سے قبل ہمارے آباؤ اجداد سے بھی کیا گیا لیکن اتنا
 طویل زمانہ گزرنے کے باوجود ابھی تک وہ پورا نہیں ہوا۔ لہٰذا نہیں ہے یہ وعدہ مگر پہلے لوگوں کے سن گھڑت افسانے۔ سطر کا معنی ہے
 کتاب کی لکھی ہوئی ایک سطر زمین میں لگا کے گئے درختوں کی ایک قطار لائن۔ کھڑے ہوئے آدمیوں کی ایک لائن۔ یہاں مراد پہلا
 معنی ہے۔ کہا جاتا ہے سطر فلان کذا اس کے ایک سطر لکھی۔ اس کی جمع اسطر۔ طور اور اسطر ہے۔ اور پھر اسطر کی جمع اساطیر ہے۔
 مفہوم یہ ہے کہ یہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہونے والا نہیں بلکہ یہ تو پہلے لوگوں کے لکھے ہوئے جھوٹ ہیں۔ مبر دئے کہا
 ہے کہ اساطیر اسطرہ کی جمع ہے (۱) جیسے ارجوہ کی جمع ارجوحہ کی جمع احادیث اجموہ کی جمع اعاجیب اور اشکوٰۃ کی جمع اضادیک
 ہے۔ اور اس کا استعمال ایسے جھوٹوں کے لئے ہوتا ہے جو دل بہانے کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے مفسرین نے اس کا معنی
 اکاذیب کیا ہے۔ قول باری تعالیٰ لَقَدْ وُعِدْنَا سے تا آخر مذکورہ انکار کے لئے تعلیل و تقریر ہے۔

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيهَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۳۸﴾ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا
 تَذَكَّرُونَ ﴿۳۹﴾ قُلْ مَنْ رَآبُ السَّمٰوٰتِ السَّمْعِ وَرَآبُ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۴۰﴾
 سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿۴۱﴾

”اے حبیب! ﷺ آپ پوچھئے کسی کی ملکیت ہے یہ زمین اور جو کچھ اس میں ہے (بتاؤ) اگر تم جانتے ہو۔ وہ
 کہیں گے (یہ سب) اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے۔ آپ فرمائیے پھر کیا تم غور نہیں کرتے۔ پوچھئے کون ہے مالک سات
 آسمانوں کا اور (کون ہے) مالک عرش عظیم کا؟ وہ کہیں گے (یہ سب) اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے۔ آپ فرمائیے تم اس
 سے کیوں نہیں ڈرتے۔“

لہٰذا قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيهَا جملہ مستانفہ ہے گویا کہ یہ جملہ رسول اللہ ﷺ کے اس قول کے جواب میں کہا گیا کہ جب آپ نے کہا کہ
 میں نہیں کیا کہوں جبکہ وہ بعث بعد الموت کا انکار کرتے ہیں۔ یہ استہتام تقریری ہے، یعنی مخاطب کو اقرار پر برا بیخیز کیا گیا ہے۔ (تا کہ
 اس کے لئے سوائے اقرار کے اور کوئی چارہ نہ رہے)

اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ۔ شرط ہے اور اس کا جواب محذوف ہے کیونکہ کلام اس پر دلالت کر رہی ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے اِنْ كُنْتُمْ مِنْ اَهْلِ

الْعِلْمِ أَوْ مِنَ الْعَالَمِينَ بِذَلِكَ فَاجْبُوا۔ یعنی اگر تم اہل علم میں سے ہو یا تم اس کے بارے جانتے ہو تو پھر جواب دو۔ اور اس سوال میں ان کی تکفیر اور اہانت بھی مقصود ہے۔ اور ان کی انتہائی جہالت کا اثبات ہے۔ کیونکہ ان کی حالت اور گفتگو اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ وہ واضح اور ظاہر شئی کے بارے بالکل جاہل ہیں۔ جسے سچے اور مجنون بھی جانتے ہیں۔ اور اس سوال کے ذریعے انہیں ایسی شئی کا الزام دینا ہے (یعنی ان پر ایسی شئی لازم کرنا ہے) جس کا انکار معمولی سی عقل و فہم رکھنے والے آدمی کے لئے ممکن ہی نہیں۔ اسی لئے ان کے جواب دینے سے قبل ہی ان کے جواب سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا سَمِفُو لُونُ لِلَّهِ (کہ وہ کہیں گے زمین و آسمان میں موجود تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں) کیونکہ عقل صریح اور نقل صحیح اور تمام لوگوں کا اعتراف اس پر شاہد ہے۔ لہذا وہ بھی یہ جواب دینے پر مجبور ہیں۔

۲۔ ان کے اس اعتراف اور اقرار کے بعد پھر انہیں فرمائیے کیا تم پھر غور و فکر نہیں کرتے؟ حمزہ علی اور حفص نے تَنذَرُ كُونُ میں سے ایک تاہم کو تخفیف کے لئے حذف کر کے پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے اسے تشدید اور ادغام کیا تھا پڑھا ہے۔ یعنی تَنذَرُ كُونُ بیٹک وہ ذات جو زمین اور اس میں موجود تمام چیزوں کو اپنا تمام پیدا کرنے کی قدرت رکھتی ہے وہ دوسری بار بھی انہیں زندہ کرنے پر قادر ہے۔ پھر اس کے انکار کی کیا وجہ ہے؟

۳۔ آپ ان سے پوچھئے ان سات آسمانوں کا مالک کون ہے؟ اور عرش عظیم کا مالک کون ہے؟ کیونکہ زمین کی نسبت آسمان عظیم ہے۔ ایک الزام کو ثابت کرنے کے بعد دوسرے الزام کی تلقین کے لئے یہ دوسرا جملہ مستاہد ہے۔ تو وہ اس سوال کے جواب میں کہیں گیا ان سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ لہذا کو عام قراء نے اس مقام پر اور اس کے بعد لام اور جر کے ساتھ پڑھا ہے۔ پس معنوی طور پر یہ بھی سوال کا جواب ہے۔ جیسا کہ کوئی نہ کہے من مولاک؟ تو جواب میں کہا جائے لفلان تو اس کا مطلب یہ ہے اَنَا لِفَلَانٍ فَهَوُ مَوْلَانِ۔ (میں فلاں کا ہوں پس وہی میرا آقا ہے) مگر اہل بصرہ نے دونوں مقامات پر اللہ تبارک و تعالیٰ کے ساتھ پڑھا ہے۔ کیونکہ سوال اسی کا تقاضا کرتا ہے۔ اہل بصرہ کے مصحف میں اسی طرح اور تمام مصاحف میں پہلے مقام کی طرح ان مقامات پر بھی بغیر الف کے لکھا ہوا ہے۔

۴۔ قُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ (آپ فرمائیے تم اس سے کیوں نہیں ڈرتے؟) یعنی جب تم یہ اقرار اور اعتراف کرتے ہو کہ آسمانوں اور عرش کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے اور کوئی نہیں تو پھر تم اس کے عذاب سے ڈرتے نہیں؟ اگر تم مخلوق میں سے بعض کو اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو اور بعض ممکنات میں تم اس کی قدرت کا انکار کرتے ہو۔

قُلْ مَنْ بَدِئَهُ مَلَائِكَةٌ مِّنْ سَمَائِهِ وَهُوَ يُحْيِيهِ وَلا يُجَاوِزُ عَلَيْهِمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۰﴾ سَمِفُو لُونُ لِلَّهِ قُلْ فَإِنَّ تُسْحَرُونَ ﴿۱۱﴾ بَلْ آتَيْنَهُم بِالْحَقِّ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿۱۲﴾ مَا اتَّخَذَ اللَّهُ مِنْ وَلِيٍّ وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَهِ إِذْ أَذَّكَ هَبْ كُلُّ إِلَهِ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَّ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ سُبْحٰنَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿۱۳﴾

”آپ پوچھئے وہ وہ کون ہے جس کے دست قدرت میں ہر چیز کی کامل ملکیت ہے اور وہ پناہ دیتا ہے (جسے چاہے) اور پناہ نہیں دی جاسکتی اس کی مرضی کے خلاف (تبارک) اگر تم کچھ علم رکھتے ہو۔ وہ کہیں گے یہ اللہ تعالیٰ کی ہی شان ہے فرمائیے

پھر کیسے تم دھوکہ میں مبتلا ہو جاتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے پہنچا دیا انہیں حق اور وہ یقیناً جموںے ہیں۔ سے نہیں بنایا اللہ نے کسی کو (اپنا) بیٹا اور نہ ہی اس کے ساتھ کوئی اور خدا ہے۔ ورنہ لے جاتا ہر خدا ہر اس چیز کو جو اس نے پیدا کی ہوتی اور غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے وہ خدا ایک دوسرے پر۔ پاک ہے اللہ تعالیٰ ان تمام (نازیبا) باتوں سے جو وہ بیان کرتے ہیں۔“

۱۔ مَلَکُوت سے مراد ملکیت اور حکومت ہے، یعنی عزت اور غلبہ ہے اس میں واؤ اور تلمو بالغہ کے لئے ہیں یعنی وہ کامل ملکیت اور انتہائی غلبہ جس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس لفظ کا استعمال اللہ تعالیٰ کی ملکیت کے لئے مختص ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ ملکوت سے مراد اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں۔

وَهُوَ يُعْزِبُ کا معنی ہے وہ مہنگالت کرتا ہے۔ اور برائی سے محفوظ رکھتا ہے اور پناہ دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔

وَلَا يُعَاذُ بِعَلِيٍّ كَا عَطْفِ سَابِقِ كَلَامِ پر ہے۔ یا پھر بجز نبی کے فاعل سے حال ہے۔ یعنی جسے اللہ تعالیٰ خوفزدہ کرنا چاہے اسے پناہ نہیں دی جا سکتی اور جسے اللہ تعالیٰ تکلیف اور مصیبت میں مبتلا کرنے کا ارادہ فرمائے اسے مصیبت سے بچایا نہیں جا سکتا۔ یا معنی یہ ہے کہ کوئی بھی اللہ تعالیٰ کو ضرر پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتا۔ کہ اس کی مرضی کے خلاف پناہ دی جا سکتی ہو۔ چونکہ یہ لفظ نصوہ کے معنی کو مضمّن ہے اس لئے اسے صلیحی کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے۔

۲۔ قُلْ مَا تَشْعُرُونَ کا معنی ہے کہ جب تم یہ اعتراف کرتے (کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ہی شان ہے) تو پھر کیسے تم دھوکہ میں مبتلا ہو جاتے ہو؟ اور شد و بدایت سے اعراض کرتے ہوئے مزہ پھیر لیتے ہو؟۔ یا معنی یہ ہے کہ جب تم اس کا اقرار اور اعتراف کرتے ہو تو پھر تم کیسے حق کو باطل خیال کرنے لگ جاتے ہو؟۔

۳۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے انہیں حق پہنچا دیا ہے۔ حق سے مراد وحید اور موت کے بعد دوبارہ زندہ کرنے (قیامت) کا وعدہ ہے۔ ترکیب کلام میں نَبِيٍّ اَتَيْنَهُمْ كَا عَطْفِ بَلِيٍّ قَالُوْا اَيْحٰلَ مَا قَالِ الْاَوَّلُوْنَ پر ہے۔ یہ اس سے انصراب ہے اور ان دونوں کے درمیان جملے مترسے ہیں۔

وَرِثَتُمْ لِكُلِّبُيُوْنِ کا معنی ہے کہ وہ اس کا (توحید اور قیامت) کا انکار کرنے میں یقیناً جموںے ہیں۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف سابقہ کلام پر ہے۔ یا پھر اَتَيْنَهُمْ کی ضمیر منسوب سے حال ہے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ نے کسی کو اپنا بیٹا نہیں بنایا۔ (کیونکہ اولاد اپنے والدین کی ہم جنس ہوتی ہے) اور اللہ تعالیٰ ہر کسی کی مماثلت اور اور اس کے ہم جنس ہونے سے پاک اور منزہ ہے۔ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ مِّنْ زَانِدَةٍ نَّفِيٍّ كَا تَاكِدِ كَيْفِ لَمْ يَكُنْ۔ اور یہ جملہ قول باری تعالیٰ وَرِثَتُمْ لِكُلِّبُيُوْنِ کی علت بیان کرنے کے کل میں ہے۔

اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور خدا ہے جو اس کی الوہیت میں شریک ہو۔ اِذْ اَشْرَكَ كَرْنِے والے کے جواب میں واقع ہے۔ اور شرط کی جزا محذوف ہے۔ اس پر قول باری تعالیٰ مَا كَانَ مَعَهُ مِنْ اِلٰهٍ وَّلَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ تقدیر کلام اس طرح ہے۔

لَوْ كَانَ مَعَهُ اِلٰهَةٌ اِذْنٌ لِّلَّذِيْ هُوَ كُلُّ اِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ (اگر اس کے ساتھ کوئی اور خدا ہوتا تو ہر خدا ہر اس چیز کو لے جاتا جو اس نے پیدا کی ہوتی اور اس کو اپنے ساتھ مختص کر لیتا) اپنے سوا دوسرے کو اس میں تصرف کرنے سے روک دیتا اور اپنی ملکیت کو دوسرے کی ملکیت

سے علیحدہ اور متماز کر لیتا۔ اور پھر وہ خدا ایک دوسرے پر غلبہ پانے کی کوشش کرتے۔ نتیجتاً ان کے مابین جنگ چھڑ جاتی۔ جیسا کہ نبوی بادشاہوں کے درمیان ہوتی ہے۔ کیونکہ خدا متعدد ہوں تو ایسا ہونا ممکن ہے اور مغلوب الٰہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مغلوب ہونا عاجز اور حادث ہونے کی نشانی اور دلیل ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر دو میں سے کوئی بھی دوسرے پر غالب نہ آئے تو اس سے دونوں کا عاجز ہونا لازم آتا ہے۔ اور یہ شان الوہیت کے منافی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ان تمام نازیبا باتوں سے پاک ہے جو وہ بیان کرتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے اور اسکی الوہیت میں اور بھی شریک ہیں۔ (اللہ تعالیٰ کی ذات ان تمام سے ہمراہ اور منزہ ہے) اور اس کے فساد کی دلیل پہلے بیان کی جا چکی ہے۔

عَلِيمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَعَلَىٰ عَمَائِشُ كُونَ ﴿١٠﴾ قُلْ رَبِّ إِنَّمَا تُبَوِّئُ مَائِدَ عَدُوِّنَ ﴿١١﴾
 رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِي فِي الْقَوَّورِ الظَّالِمِينَ ﴿١٢﴾ وَ إِنَّا عَلَىٰ أَنْ تُؤَيِّدَهُمْ
 لَقَدِيرُونَ ﴿١٣﴾ اِدْفَعِ اللَّيْطِيَّ هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةِ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَصِفُونَ ﴿١٤﴾

”وہ جاننے والا ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر کو پتا وہ بلند ہے اس شرک سے جو وہ کرتے ہیں آپ یہ دعا مانگئے اے میرے پروردگار! اگر تو ضرور مجھے دکھانا چاہتا ہے وہ (عذاب) جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے تو میرے رب! (ازراہ عنایت) مجھے ان ظالموں کے ساتھ نہ کرنا۔ اور ہم اس بات پر کہ دکھادیں تجھے وہ عذاب جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے قادر ہیں۔ اور دور کر دو اس چیز سے جو بہت بہتر ہے برائی کو۔ ہم خوب جانتے ہیں جو باتیں وہ بیان کرتے ہیں سہ۔“

لے اہل مدینہ اور شخص کے سوا اہل کوفہ نے عالم کورف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس لئے کہ وہ مجتہد مخدوف کی خبر ہے۔ اور باقیوں نے لفظ اللہ کی صفت ہونے کی بناء پر اسے مجرور پڑھا ہے۔ اور یہ شریک کی نفی پر دوسری دلیل ہے۔ (کیونکہ اگر کسی موصوف کی کوئی خاص صفت بیان کی جائے تو وہ صفت ہی اس کے حکم کی علت ہوتی ہے مثلاً احسن بزید صدیقک القدیم۔ اپنے پرانے دوست زید کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی علت اس کی قدیمی دوستی ہے۔ اور یہ موصوف کی صفت ہے۔ اسی طرح یہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہ ہونے کی اس طرح دلیل ہے کہ وہی پوشیدہ اور ظاہر کو جاننے والا ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی ایسا علم رکھنے والا نہیں۔ لہذا اس کا کوئی شریک بھی نہیں) کیونکہ اس پر تو مشرکین کا بھی اتفاق تھا کہ اللہ تعالیٰ ہر ظاہر و باطن کا علم رکھنے میں منفرد اور یکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابجد کلام فاء کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ کہ پس وہ بلند ہے اس شرک سے جو وہ کرتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے کہیں بلند اور عظیم ہے کہ اسے اولاد یا شریک کے ساتھ متصف کیا جائے۔

لے اِنَّمَا تُبَوِّئِي اصل میں اِنَّمَا تُبَوِّئِي ہے۔ پہلے نون کو ہم میں مدغم کیا گیا تو اِنَّمَا بنا۔ اور پھر تین نونوں کے اجتماع کے مکروہ ہونے کی وجہ سے نون وقایہ کو حذف کر دیا۔ تو بُوِّئِي بن گیا۔ ترکیب کلام میں یہ شرط ہے۔ جسے ماخذہ اور نون کے ساتھ مگوکہ کیا گیا ہے۔ معنی یہ ہے اگر یہ ضروری ہے کہ تو مجھے (وہ عذاب) دکھائے جس کا وعدہ دنیا اور آخرت کے عذاب میں سے کفار کے ساتھ کیا گیا ہے تو میرے رب (ازراہ عنایت) مجھے ان ظالموں کے ساتھ نہ کرنا۔ یعنی عذاب میں ان کا ساتھی نہ بنانا۔ یہ دعا کی تلقین کے لئے جملہ معترضہ ہے۔ خدا (اے میرے پروردگار! رب) کو کھرا لانا اور شرط اور جزا میں سے ہر ایک کو لانا تضرع اور عاجزی کے اظہار میں زیادتی اور اضافہ کے لئے ہے۔ اور دعا کی تلقین میں اس طرح اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے خوفزدہ رہنا اور نفس کو اس کا مطیع و

فرمانبردار بنانا واجب ہے۔ اور اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ظلم کی نحوست ظلم کرنے والے کو بھی اپنے احاطہ میں لے لیتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **وَاللَّهُ أَقْسَمًا لَّا تَهْتَبِينَ آلَ الَّذِينَ تَلَكَؤُنَّ أَيْمَانَكُمْ خَاصَّةً**۔ (اس فتنے سے بچو جو تم میں سے صرف ظالموں کو ہی نہیں پہنچے گا)

سے اور جنگ ہم اس بات پر قادر ہیں کہ ہم آپ کو وہ عذاب دکھادیں، جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے۔ لیکن ہم تباہ و برباد کرنے والے اور کئی طور پر ختم کر دینے والا عذاب نہیں دیں گے۔ کیونکہ ان کے درمیان آپ تشریف فرما ہیں۔ اور ہم یہ جانتے ہیں کہ ان میں سے بعض یا ان کی اولادوں میں سے بعض ایمان لے آئیں گے۔ یہ جملہ معترضہ ہے جو کہ ان کے قیامت اور اس عذاب کا انکار کرنے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے یا استہزاء جلدی عذاب آنے کی طلب کرنے کو رد کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔

سے برائی کو دور کرو اور چیز اور خلعت سے جو بہت بہتر اور اچھی ہے۔ اچھی اور بہتر خصلتیں یہ ہیں، درگزر کرنا، اعراض کرنا صبر کرنا اور احسان کرنا وغیرہ۔ **الْمُشْتَرِكِ** کلام میں اذفع کا مفعول ہے۔ یعنی آپ ان کی برائی کا ازالہ اپنی نیکی اور احسان سے کیجئے۔ پس اس بناء پر یہ ان کی اذیت رسانی پر صبر کرنے کا حکم ہے اور ان سے جنگ کرنے سے حکم کا حکم ہے۔ یہ آیت حکم جہاد والی آیت سے منسوخ متصور ہوگی۔ بعض نے کہا ہے حسد سے مراد کلمہ توحید اور سید سے مراد کلمہ شریک ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ سید سے مراد منکر، یعنی برائی اور گناہ ہے اور حسد سے مراد اس سے روکنا ہے۔

یہ آیت **ادْفَعْ بِالْخَيْرِ الشَّيْئَةَ** کی نسبت زیادہ بلند ہے۔ کیونکہ اس میں صیغہ اسم تفضیل کے ساتھ نیکی کی برتری اور فضیلت کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

نَحْنُ اعْلَمُ بِمَا يَصِفُونَ کا معنی ہے کہ جو باتیں وہ آپ کے بارے کرتے ہیں ہم انہیں خوب جانتے ہیں یا معنی یہ ہے کہ آپ کے حال کے خلاف جو کچھ وہ بیان کرتے رہتے ہیں ہم اسے خوب جانتے ہیں۔ اور ہم انہیں مزادینے کی پوری قوت رکھتے ہیں۔ لہذا آپ اپنا معاملہ ہمارے سپرد کر دیجئے اور بذات خود ان سے انتقام لینے کا قصد نہ کیجئے۔

یہ جملہ **ادْفَعْ بِالْخَيْرِ** کی علت بیان کرنے کے مقام میں واقع ہے۔

وَقُلْ رَبِّ اَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيْطَانِ ۝۱۰۱ وَ اَعُوذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّخْضَرُوْنِ ۝۱۰۲
حَتَّىٰ اِذَا جَاءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝۱۰۳ لَعَلِّيْ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا
تَرَكْتُ ۝۱۰۴ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا وَمِنْ وَرَائِهِمْ بَدْرُ الْحَرِّ ۝۱۰۵ اِنَّ يَوْمَ يَدْعُوْنَ

”اور کہئے میرے رب! میں پناہ طلب کرتا ہوں تیری شیطانون کے دوسوں سے اور میں تیری پناہ طلب کرتا ہوں میرے رب اس سے کہ وہ میرے پاس آئیں۔ یہاں تک کہ جب آئے گی ان میں سے کسی کو موت تو وہ (بصد حسرت) کہے گا میرے مالک! مجھے (دنیا میں) واپس بھیج دے۔ شاید میں اچھے کام کروں اور دنیا میں دوبارہ جا کر جسے میں ایک بار چھوڑ آیا ہوں۔ میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک (لفظ) بات ہے جو وہ کہہ رہا ہے اور ان کے آگے ایک آڑ ہے اس دن تک جب وہ دوبارہ زندہ کئے جائیں گے۔“

یہ آپ کہتے ہیں میرے رب! میں تیری حفاظت اور پناہ میں آتا ہوں۔ ہمز کا معنی ہے شدت اور قوت کے ساتھ دھکا دینا، یعنی

شیاطین کا مکرو فریب اور دوساں کے سبب گناہوں کی طرف لے جانے سے میں تیری پناہ طلب کرتا ہوں۔ اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ وہ میری نماز اور دیگر امور میں سے کسی میں حاضر ہوں۔ کیونکہ جب وہ حاضر ہوگا تو سوسا اندازی کرے گا۔ یعقوب نے اُن یَحْضُرُونَ کو حالت وصل اور وقت دونوں میں شَحْضُوْهُنِیٰ یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے دونوں حالتوں میں بغیر یا کے پڑھا ہے۔ ترکیب کلام میں جملہ وَقْلٌ رَبِّ اَعُوْذُ بِكَ قول باری تعالیٰ اِنَّمَا تُرَفِّقُ پر معطوف ہے۔

۱۰۔ حَتّٰی اِذَا جَآءَ لَیْسَ حَتّٰی اِنَّمَا تُرَفِّقُ پر معطوف ہے۔ اور ارشاد خداوندی یَصْفُوْنَ یا کَلِیْبُوْنَ سے متعلق ہے۔ یعنی جب موت آنے کے وقت وہ جنت میں اپنا ٹھکانہ دیکھے گا کہ اگر وہ ایمان لاتا (تو وہ اس کا ٹھکانا ہوتا) اور پھر وہ جہنم میں اپنا ٹھکانہ دیکھے گا اور اسے کہہ دیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے کفر کے سبب تیرے لئے جنت کے ٹھکانے کو جہنم کے اس ٹھکانے سے بدل دیا ہے۔ تو وہ اس وقت بعد حسرت کہے گا، میرے مالک! مجھے دنیا میں واپس بھیج دے۔ اِنْ جَعَلُوْنَ کُوْلِیْعُقُوْبِیْنَ حَالًا وَّصَلَّیْ اُوْرُوْا وَقْتِ دُنُوْنِیْ مِیْنَ اِیْکَ سَآءِیْہِیْ۔ اور باقیوں نے دونوں حالتوں میں بغیر یا کے پڑھا ہے۔ اس میں جمع کی ضمیر (رب کریم کی) عظمت و تعظیم کیلئے ذکر کی گئی ہے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ جمع کی ضمیر فعل کے تکرار کو ظاہر کرنے کے لئے ہے۔ یہ اصل میں تھا اور جمعنی اور جمعنی (تو مجھے ضرور لوٹا دے) جیسا کہ فقار و اطرقا میں کہا گیا ہے۔ اور بعض کا خیال ہے کہ یہ خطاب اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان ملائکہ کو بھی ہے جو اس کی روح قبض کرنے آتے ہیں۔ ابتداء یہ خطاب اللہ تعالیٰ کو ہے کیونکہ اَوْلَآءِہِیْ اُوْرُوْا وَّوَدَّکِیْ اِتِّجَآءُ اللّٰہِ تَعَالٰی سے ہی ہے۔ اور پھر ملائکہ سے دنیا کی طرف لوٹانے کی درخواست کی۔

۱۱۔ اَسْمَلٌ صَالِحًا مِیْنَ صَالِحًا یَا تُوْمَعُوْلٌ ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ یا پھر مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے۔ اور اصل میں اعمل عملاً صالحاً ہے۔ فِیْمَا تَرْتَحْتُ سے مراد وہ ایمان ہے جسے قبول کرنے سے میں نے ایک بار چھوڑ دیا ہے۔ معنی یہ ہوگا شاید میں ایمان لے آؤں اور اس میں اچھے اعمال کروں۔

بعض نے کہا ہے کہ فِیْمَا تَرْتَحْتُ سے مراد ہے مال میں سے جو میں نے چھوڑا ہے یا دنیا میں جو کچھ میں نے چھوڑا ہے۔ اس تفسیر کے مطابق فِیْمَا تَرْتَحْتُ کا ظرف ہونا بالکل ظاہر ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ مَا تَرْتَحْتُ مَفْعُوْلٌ بہ ہے۔ اور فی زائدہ ہے، یعنی شاید میں وہ عمل کروں جو میں نے اس حال میں چھوڑا ہے کہ وہ صالح ہے۔ مثلاً ایمان وغیرہ۔ یا شاید میں وہ عمل کروں جو عمل میں نے چھوڑا ہے اور وہ عمل بغیر کس فساد کے صالح ہے۔ ابن جریر نے ابن جریج کی حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب بندہ مومن (موت کے) فرشتوں کو دیکھتا ہے تو وہ اسے کہتے ہیں کیا ہم تجھے دنیا کی طرف لوٹا دیں؟ تو وہ کہتا ہے کیا تم لوں اور پریشانیوں کے گھر کی طرف؟ (ایسا ہرگز نہیں) بلکہ میں تو اللہ تعالیٰ کے پاس جانا چاہتا ہوں (۱) لیکن کافر (اس حالت میں) یہ کہتا ہے رَبِّ اِنْ جَعَلُوْنَ۔ (اے میرے پروردگار مجھے واپس دنیا کی طرف لوٹا دے)

صحیحین میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملاقات پسند کرتا ہے۔ اور جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے۔ تو ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا یا ازواج مطہرات میں سے کسی اور نے کہا بیٹک ہم تو موت کو ناپسند

کرتے ہیں۔ (کون انکی خواہش کرتا ہے؟) تو آپ ﷺ نے فرمایا مطلب اس طرح نہیں ہے بلکہ معنی یہ ہے کہ بندۂ مومن کے پاس جب موت حاضر ہوتی ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے خوشنودی اور عزت افزائی کی بشارت دی جاتی ہے۔ پس اس وقت اس کے نزدیک سامنے موجود شئی سے پسندیدہ کوئی چیز نہیں ہوتی۔ چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ سے مل جانا پسند کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بھی اس کی ملاقات کو پسند فرماتا ہے۔ لیکن کافر کے پاس جب موت آتی ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کے عذاب اور سزا کی خبر دی جاتی ہے۔ اور اس وقت اس کے نزدیک سامنے موجود شئی سے بڑھ کر پسندیدہ کوئی شئی نہیں ہوتی۔ لہذا وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کو پسند کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی اس کی ملاقات کو پسند کرتا ہے۔ (1)۔

یہ کلاماً ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہ اسے واپس لوٹنے کی طلب پر جھڑکا جا رہا ہے، کہ اب اس کی دنیا کی طرف مراجعت نہیں ہو سکتی۔ انہما کیلئے مراد اب ان جملوں سے آخر تک اس کا قول ہے۔ خبر کی جانست کے لئے انہما میں خاصیر مومن ذکر کی گئی ہے۔ کلمۃ سے مراد کلام کا وہ طائفہ ہے جس کے الفاظ آپس میں ایک دوسرے سے منظم ہوں۔ اور اس کا اطلاق جملہ مرکبہ مفیدہ پر ہوتا ہے۔ لیکن اصطلاح نحو میں کلمہ کا اطلاق لفظ مفرد پر ہوتا ہے۔

هُوَ فَابْتَلِيْهَا سے مراد ہے (کہ یہ ایک لغو بات ہے جو کافر کہہ رہا ہے) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اب اس پر یأس و حسرت چھا رہی ہوتی ہے اور عذاب کا خوف واضح ہو گیا ہے۔ (اس لئے وہ دنیا کی طرف واپس لوٹنے کی آرزو کرتا ہے ورنہ ایسا ممکن نہیں) میں وژا و ہم سے مراد ہے ان کے سامنے اور اس میں صبح کی تعمیر جماعت کفار کے لئے ہے۔

بُرُوْخٌ کے بارے میں مجاہد نے کہا کہ اس کا معنی حجاب (پردہ) ہے۔ یعنی ان کے اور واپس لوٹنے کے درمیان ایک حجاب ہے (2) ترکیب کلام میں میں وژا و ہم بُرُوْخٌ کا جملہ تکرار کے معنوں پر معطوف ہے۔ یعنی لا یکنون ما یطلبون میں وژا و ہم بُرُوْخٌ۔ (جو وہ مطالبہ کر رہے ہیں ایسا نہیں ہو سکتا اور ان کے آگے ایک آڑ ہے)

قرآن نے کہا ہے کہ بُرُوْخٌ سے مراد دنیا کی عمر کا باقی رہنے والا حصہ ہے (3)۔ کیونکہ اس وقت تک زندگی کی طرف رجوع ممکن نہیں جب تک دنیا کی عمر ختم نہیں ہو جاتی۔ ضحاک نے کہا ہے کہ بُرُوْخٌ سے مراد موت سے لے کر قیامت کے دن دوبارہ اٹھانے جانے کی مدت ہے (4)۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ بُرُوْخٌ سے مراد قبر ہے اور وہ دوبارہ زندہ کئے جانے کے دن تک قبر میں ہی رہیں گے۔

فَاِذَا نَفَخَ فِي الصُّوْرِ فَلَا اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُوْنَ ﴿٥﴾ فَمَنْ تَعَلَّقَتْ

مَوَازِيْنُهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿٦﴾

”تو جب صور پھونکا جائے گا تو کوئی رشتہ داریاں نہ رہیں گی ان کے درمیان اس روز اور نہ وہ ایک دوسرے کے متعلق پوچھ سکیں گے۔ البتہ جن کے پلڑے بھاری ہوں گے تو وہی لوگ کامیاب و کامران ہوں گے۔“

ل۔ (جب قیامت کے دن صور پھونکا جائے گا) سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ آیت میں اس لفظ سے مراد کچھ ادا ہے، یعنی جس کے سبب زمین و آسمان میں موجود ہر شئی بیہوش ہو کر گر پڑے گی اس دن ان کے درمیان رشتہ داریاں نہیں رہیں گی۔ اور نہ وہ ایک دوسرے کے متعلق پوچھ سکیں گے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں اس کا ذکر ان الفاظ میں ہے۔

وَتُعْفَى فِي الصُّبْحِ فَصَبَّحَ مِنْ فِي السُّبُوتِ وَفِي الْأَمْرِضِ" اور پھونکا جائے گا صور، پس غش کھا کر گر پڑے گا جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ "فَلَا أَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُونَ" تو کوئی رشتہ داریاں نہ رہیں گی ان کے درمیان اس روز اور نہ وہ ایک دوسرے کے متعلق پوچھ سکیں گے۔ "كُلُّهُمْ لِيَوْمِئِذٍ لِقَاءِ اللَّهِ فِي آخِرِ مَا قَادُوا مِنْهُمْ قِيَامًا يَوْمَئِذٍ يُنظَرُونَ" پھر دوبارہ (جب) اس میں پھونکا جائے گا تو اچانک وہ کھڑے ہو کر (حیرت سے) دیکھنے لگ جائیں گے۔ "وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ" اور متوجہ ہوں گے ایک دوسرے کی طرف (اور) سوال جواب کریں گے" (1) لیکن صحیح روایت یہ ہے کہ آیت میں لختہ سے مراد لختہ ثانیہ ہے۔ جس کے بعد سب لوگ دوبارہ زندہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن کسی بندے یا بندہ کا ہاتھ پکڑ کر اولین و آخرین سب لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا جائے گا۔ پھر ندا دینے والا یہ ندا دے گا یہ فلاں بن فلاں ہے۔ پس جس کسی کا اس کے ذمے کوئی حق ہو وہ اپنا حق لینے کے لئے آ جائے پس جس کسی آدمی کا حق اپنے باپ بیٹے بیوی یا بھائی کے ذمے ہو گا وہ خوش ہو جائے گا اور وہ اپنا حق وصول کرے گا (2) پھر حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ آیت تلاوت فرمائی فَلَا أَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُونَ۔ (کہ اس دن ان کے درمیان رشتہ داریاں باقی نہیں رہیں گی اور نہ وہ ایک دوسرے کے متعلق پوچھ سکیں گے) اسی طرح کا قول حضرت عطاء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی روایت کیا ہے، کہ اس سے مراد لختہ ثانیہ ہے۔ اور فَلَا أَنْسَابَ بَيْنَهُمْ سے مراد یہ ہے کہ اس دن صلب و نسب کے سبب آپس میں اظہار تقاضا نہیں کر سکیں گے۔ جیسا کہ وہ دنیا میں نسبی عظمت و شرف کے سبب باہم فخر کا اظہار کیا کرتے تھے (3) یا معنی یہ ہے کہ اس دن آپس کی رشتہ داریاں کوئی نفع اور فائدہ نہیں پہنچائیں گی۔ کیونکہ انتہائی دہشت زدہ اور حیرت میں مبتلا ہونے کے سبب باہمی رافت و رحمت اور ایک دوسرے پر مہربانی کرنے کے جذبات ناپید ہو چکے ہوں گے۔ اس طرح کہ آدمی اپنے بھائی ماں باپ بیوی اور اپنے بچوں سے بھی بھاگے گا۔ (قرآن کریم نے ارشاد فرمایا كَيْفَ يَصِفُ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ كَانُوا إِخْوًا وَآبَاءً وَأَبْنَاءً وَذُرِّيَّةً وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمْ وَيَتَنَبَّهُونَ۔

آیت میں مذکور بَيْنَهُمْ کی ضمیر کفار کی طرف لوٹ رہی ہے، کیونکہ اس سے قبل انہی کا ذکر ہے۔ مؤمنین کی طرف نہیں بلکہ مؤمنین کے بارے میں تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا أَلَمْ نَجْعَلِ لَهُمْ آبَاءَ لَهُمْ فِي النَّاسِ۔ (کہ ہم ان کے ساتھ ان کی اولادوں کو بھی ملا دیں گے) حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جب قیامت کا دن ہوگا تو اس دن مسلمانوں کے بچے اپنے ہاتھوں میں شراب ٹھہر (کے جام لئے) نکلیں گے۔ تو لوگ انہیں کہیں گے ہمیں پلا دو۔ تو وہ جواب میں کہیں گے ابوینا۔ ابوینا۔ کہ ہم تو اپنے ماں باپ کو پلا نہیں گے۔ اپنے والدین کو پلا نہیں گے۔ حتیٰ کہ ساقط ہونے والا بچہ بھی جنت کے دروازے میں کھڑا ہو کر کہے گا میں جنت میں داخل نہیں ہوں گا یہاں تک کہ میرے والدین داخل ہو جائیں۔ اسے ابن ابی الدنیانے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور اسی کے ہم معنی روایت حضرت ابو ذر راہ سے بھی مروی ہے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ حدیث طیبہ میں موجود ہے قیامت کے دن میرے نسبی اور سرسالی رشتے کے سوا تمام نسبی اور سرسالی رشتے ختم ہو جائیں گے (4)۔ اسے ابن عساکر نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ مؤمنین کے نسب حضور نبی کریم ﷺ کے نسب میں داخل ہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ کے نسب میں داخل نہیں ہوں گا

مطہرات مومنین کی مائیں ہیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حدیث کا معنی ہے کہ قیامت کے دن حضور نبی کریم ﷺ کے نسب اور سبب (یعنی آپ کے ساتھ تعلق) کے سوا کوئی نسب اور سبب نفع مند ثابت نہیں ہوگا اور آپ ﷺ کے ساتھ تعلق اور سبب سے مراد قرآن اور ایمان ہے (1)۔ اور قول باری تعالیٰ لَا يَنْسَأَنَّ لَوْنُ كَاغَمْتِي يَوْمَ الْقِيَامَتِ سے مراد یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے رشتے اور تعلق کے بارے سوال نہیں کریں گے۔ جیسے دنیا میں کہا کرتے تھے کہ تو کون ہے اور تو کون سے قبیلے سے تعلق رکھتا ہے؟ وغیرہ۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا ہے وَ أَقْبَلُ بِمَعْصُومِي وَعَلَىٰ بَعْضِهِمْ بَعْضٌ يَوْمَ الْقِيَامَتِ کہ وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر آپس میں سوال کریں گے۔ (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے احوال تو پوچھیں گے؟) تو اس کے بارے ہمارا کہنا یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا ینکح قیامت کے مختلف احوال اور مختلف مقامات ہوں گے۔ بعض مقامات پر ان پر شدید خوف طاری ہو جائے گا۔ اور اس کی شدت اور سختی انہیں باہم ایک دوسرے سے سوال کرنے سے مشغول کر دے گی۔ لہذا وہ ایک دوسرے کو نہیں پوچھیں گے۔ اور بعض مقامات میں وہ ذرا فاقہ اور سکون محسوس کریں گے تو اس وقت وہ ایک دوسرے کے احوال دریافت کر لیں گے (2)۔

۱۔ موازین موزون کی جمع ہے، یعنی اس کے وہ عقائد اور اعمال جن کا وزن کیا گیا۔ ان سے مراد اعمال صالحہ ہیں۔ (یعنی جن کے اعمال صالحہ کے پلڑے بھاری ہوں گے) بھاری ہونے سے مراد یہ ہے کہ اعمال صالحہ زیادہ ہوں گے۔ اس کی نیکیاں، برائیوں کے مقابلہ میں ترجیح پا جائیں گی۔ (یا موازین میزان کی جمع ہے اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ جس کے میزان میں نیکیوں کا پلڑہ جھک جائے گا۔ میزان کو صیغہ جمع موازین کی صورت میں اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ یا تو ہر انسان کا علیحدہ علیحدہ میزان ہوگا۔ یا پھر اس لئے کہ میزان کا متعدد ہونا وزن کے متعدد ہونے کے اعتبار سے ہے۔ اور ترکیب کلام میں ضمنی موصولہ اپنے صلہ کے ساتھ ملکر مبتدا ہے۔ اور اس کی خبر فَاذْلِكُمْ هُمْ الْمُفْلِحُونَ ہے۔ اس کا معنی ہے۔ کہ وہی لوگ نجات پائے اور درجات حاصل کرنے کے سبب کامیاب ہوں گے۔ ترکیب کلام میں اس جملے کا عطف محذوف کلام پر ہے۔ یعنی فوضع المیزان فمن ثقلت الخ۔

علمائے اہل سنت کا اس پر اجماع ہے کہ میزان کا قائم ہونا اور اس کے ساتھ اعمال کا وزن کیا جانا برحق ہے، لیکن معتزلہ کو رافضی خوارج اور اکثر اہل بدعت نے اس کا انکار کیا ہے۔

علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے البعث میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث جبرائیل نقل کی ہے کہ حضرت جبرائیل امین علیہ السلام نے حضور نبی کریم ﷺ سے ایمان کے بارے سوال کرتے ہوئے کہا اے محمد! ﷺ ایمان کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ایمان سے مراد اللہ تعالیٰ اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں کو ماننا اور تسلیم کرنا ہے۔ (علاوہ ازیں) جنت دوزخ اور میزان کو تسلیم کرنا، موت کے بعد دوبارہ اٹھانے جانے کو ماننا اور اچھی اور بری تقدیر کو تسلیم کرنا ہے۔ جبرائیل علیہ السلام نے کہا جب میں ایسا کروں تو میں مومن ہو جاؤں گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا جی ہاں۔ تو جبرائیل علیہ السلام نے کہا آپ نے مجھ کو فرمایا (3)۔

حاکم نے مستدرک میں حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک حدیث نقل کی ہے اور اسے مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح قرار دیا

ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن میزان رکھا جائے گا۔ اگر اس میں زمین و آسمان بھی رکھ دیئے جائیں تو اس میں (ان کے سہا جانے کی بھی) وسعت ہوگی اللہ ہیث (1)۔

ابن مبارک نے ائزہ میں اور اجدی نے الشریبہ میں حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے موقوف قول نقل کیا ہے اور ابو اشخ ابن حبان نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے قول نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میزان کی ایک زبان اور دو پلڑے سے ہوں گے (2)۔ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں اور ابن ابی الدنیا نے حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن صاحب میزان حضرت جبرئیل امین علیہ السلام ہوں گے (3)۔ میزان سے متعلقہ احادیث تو اتنے معنوی کے درجہ تک پہنچی ہوئی ہیں۔
فصل: وزن کی کیفیت کے بارے علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ بندے کا اپنے اعمال سمیت وزن کیا جائے گا۔ پس بندہ مومن کا وزن اپنی نیکیوں کی مقدار کے مطابق ہوگا اور کافر کا کوئی وزن نہیں ہوگا۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن عظیم الجثہ مونا تازہ آدی آئے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک چھبر کے برابر بھی اس کا وزن نہیں ہوگا۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی **فَلَا تَعْلَمُ لَهُم مَّيْمَةٌ وَلَا يَسْئَلُهُمْ عَلَيْهِمْ فِئْرُونَ**۔ یہ حدیث متفق علیہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے (4)۔

پس مذکورہ تفسیر کے مطابق **مَنْ خَفَّتْ مِيزَانُهُ** (جن کا پلڑہ ہلکا ہوگا) سے مراد کفار ہیں اور کوئی نہیں۔
بعض کا خیال یہ ہے کہ میزان میں نیکیوں اور برائیوں کے صحائف (امنانا سے) کا وزن کیا جائے گا۔

ترمذی ابن ماجہ ابن حبان حاکم اور بیہقی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن میری امت کا ایک آدمی سب کے سامنے لایا جائے گا اور اس کے نالوے رجسٹر کھولے جائیں گے ان میں سے ہر رجسٹر کی لمبائی حدنگاہ تک ہوگی، پھر رب کریم اسے فرمائے گا: کیا ان میں سے کسی شیئی سے تو انکار کرتا ہے کہ میری طرف سے اعمال لکھنے والے فرشتوں نے تیرے ساتھ زیادتی کی ہو؟ وہ آدمی عرض کرے گا: نہیں۔ اسے میرے پروردگار! تو پھر رب کریم فرمائے گا کیوں نہیں۔ بیشک تیری ایک نیکی ہمارے پاس ہے۔ آج کے دن تجھ پر ظلم نہیں ہوگا۔ چنانچہ اس کے لئے ایک پرچہ نکالا جائے گا، جس پر یہ لکھا ہوگا **أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ**۔ تو اسے دیکھ کر وہ آدمی عرض کرے گا: میرے رب! اس پرچے کی ان رجسٹروں کے سامنے کیا حیثیت ہے؟ تو رب کریم فرمائے گا: بیشک تیرے ساتھ کوئی ظلم اور زیادتی نہیں کی جائے گی۔ چنانچہ ترازو کے ایک پلڑے میں وہ رجسٹر رکھ دیئے جائیں گے۔ اور دوسرے میں وہ پرچہ رکھ دیا جائے گا۔ نتیجہ وہ رجسٹر ہلکے ہو جائیں گے (ان کا پلڑہ اوپر اٹھ جائے گا) اور یہ پرچہ بھاری ہو جائے گا۔ (یعنی وزن کے سبب اس کا پلڑا جھک جائیگا) اور کوئی شیئی بھی اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی سے بھاری اور وزنی نہیں ہوتی (5)۔ اسے حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔ حضرت امام احمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حسن صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اسی طرح حدیث نقل کی ہے۔
بعض نے یہ موقف اپنایا ہے کہ اعمال کو جسامتی وجود عطا کر کے ان کا وزن کیا جائے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت

- 1- مستدرک حاکم، جلد 4، صفحہ 629 (اعلیٰ)
- 2- تفسیر ابی اسود، جلد 6، صفحہ 464 (اعلیٰ)
- 3- تفسیر طبری، جلد 18، صفحہ 37 (الامیریہ)
- 4- صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 370 (قدیمی)
- 5- سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 328 (وزارت تعلیم)

میں میری جان ہے کہ اگر تمام آسمان اور زمین جو کچھ ان میں ہے جو کچھ ان کے درمیان ہے اور جو کچھ ان کے نیچے ہے، اگر وہ سب لا کر ترازو کے پلڑے میں رکھ دیا جائے اور دوسرے پلڑے میں لا الہ الا اللہ کی شہادت رکھ دی جائے تو ان کے مقابلہ میں شہادت والا پلڑا ہماری ہو کر جھک جائیگا۔ اسے طہرانی نے روایت کیا ہے (1)۔

ابن عبدالرزاق نے علم کی فضیلت کے بیان میں اپنی سند کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کی یہ قول نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن ایک آدمی کے عمل لائے جائیں گے اور انہیں ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے گا۔ تو وہ ہلکے اور خفیف ہو گئے۔ پھر بادلوں کی مثل کوئی شیئی لا کر ترازو کے پلڑے میں رکھ دی جائے گی تو وہ پلڑا ہماری ہو جائے گا۔ پھر اسے کہا جائیگا کیا تو جانتا ہے یہ کیا ہے؟ تو وہ آدمی عرض کرے گا نہیں۔ تو اسے بتایا جائے گا یہ اس علم کی فضیلت ہے جس کی تعلیم تو لوگوں کو دیا کرتا تھا۔ (2)

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے علم کی فضیلت کے بیان میں حضرت عمران بن حصین سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن علماء کی روشنائی اور شہداء کے خون کے مابین موازنہ کیا جائے گا تو علماء کی روشنائی شہداء کے خون کے مقابلہ میں بھاری ہو جائے گی (3)۔

میں کہتا ہوں کہ بندے کو اپنی جسم نکیوں سمیت یا نکیوں کے صحائف سمیت میزان کے ایک پلڑے میں رکھا جائے گا۔ (اب چاہے نکیوں کی جسم صورت ہو یا نکیوں کے صحائف ہوں) دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔ صحائف کا بوجھ نکیوں کے بوجھ کے سبب ہوگا۔ اور اس کی جسم برائیوں یا وہ صحائف جو گناہوں کے بوجھ کے سبب بھاری ہوں گے، انہیں ترازو کے دوسرے پلڑے میں رکھا جائے گا۔ تو فرازون و نچھڑے پر کے برابر بھی نہیں ہوگا۔ اور اسی کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَمَنْ حَقَّتْ مَوَازِينُهُ، یعنی اس کی میزان میں اس کا کوئی وزن اور بوجھ نہیں ہوگا۔

لیکن بندہ مومن کا ترازو وزن سے خالی نہیں ہوگا، اگرچہ وہ لا الہ الا اللہ کی شہادت کے سبب ہی ہو۔ اور اسی لئے کنایۃ ارشاد فرمایا فَمَنْ نَقَلَتْ مَوَازِينُهُ (جن کے پلڑے بھاری ہوں گے) مگر بندہ مومن کے وزن اور ثقل کے کئی مراتب اور درجات ہیں۔ مثلاً ان میں سے بعض ایسے ہوں گے جو کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرتے رہے اور اللہ تعالیٰ نے ان سے ان کے گناہوں کو دور کر دیا۔ (یعنی انہیں مٹا ڈالا) تو ان کے میزانوں کے پلڑے سب سے زیادہ وزنی اور بھاری ہوں گے، ان کے گناہوں کا پلڑا خالی اور فارغ ہونے کے سبب بالکل اٹھ جائیگا۔

اور کچھ ایسے لوگ ہوں گے جنہوں نے اعمال صالحہ بھی کئے ہوں گے اور اعمال سیئہ بھی۔ (یعنی ان میں دونوں قسم کے اعمال پائے جائیں گے) یہی لوگ ہیں جن کے ہارے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا قیامت کے دن لوگوں سے حساب لیا جائیگا۔ پس جس کی ایک نیکی بھی گناہوں کی نسبت زیادہ ہوگی وہ جنت میں داخل ہو جائیگا۔ اور جس کے گناہ نکیوں سے بڑھ جائیں گے وہ جہنم میں داخل ہوگا۔ تاکہ وہ گناہوں سے پاک صاف ہو جائے۔ جیسا کہ لوہا آگ میں پڑ کر سیل کچیل اور دیگر آمیزشوں سے پاک صاف ہو جاتا ہے۔ پس وہ آدمی پھر جنت میں داخل ہونے کے قابل ہو جائے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا چنگ میزان ایک حب (داق) کے وزن کے سبب بھی ہلکا اور بھاری ہو جاتا ہے۔

2- مصنف عبدالرزاق، جلد 11، صفحہ 253 (مکتب الاسلامی)

1- فتح البیر طہرانی، جلد 12، صفحہ 254 (الترات الاسلامی)

3- کنز العمال، جلد 10، صفحہ 173 (الترات الاسلامی)

اور وہ آدمی جس کی نیکیاں اور گناہ برابر اور مساوی ہو جائیں گے، وہ اصحاب الاعراف میں سے ہوگا۔ (اور یہ لوگ اسی مقام پر رہیں گے) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کے بارے جنت میں داخل ہونے کا حکم ارشاد فرمادے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا یہ قول ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے اور اس میں کفار کا حال مذکور نہیں، اس لئے کہ ان کے نامہ اعمال میں کوئی نیکی بھی نہیں ہوگی۔ اور قرآن کریم میں نیک اور صالح مومنین اور کفار کے حال کا ذکر کیا گیا ہے لیکن غالباً گنہگار مومنین کے ذکر سے خاموش ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ نزول قرآن کے زمانہ میں تمام مومنین عادل تھے۔ گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے اجتناب کرنے والے تھے یا پھر تو یہ کرنے والے تھے اور گناہ سے تو یہ کرنے والا اس کی طرح ہوتا ہے جس کا کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ (اور وہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین تھے)

وَصَنِّحْتُمْ مَوَازِينَهُ فَأُولَئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ فِي جَهَنَّمَ خَالِدُونَ ﴿٦٦﴾
تَتَّقُوا وَجُوهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيهَا كَالْحِجُونَ ﴿٦٧﴾

”اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے تو وہی لوگ ہیں جنہوں نے نقصان پہنچایا اپنے آپ کو وہ جہنم میں ہمیشہ (جلتے) رہیں گے۔ بری طرح جھلس دے گی ان کے چہروں کو آگ اور وہ اس میں دانت نکالے ہوں گے۔“

۱۔ اور جن کے نیک اعمال ہلکے ہوں گے یا نیکیوں کا پلڑا ہلکا ہوگا اس طرح کہ اس کا بالکل وزن ہی نہیں ہوگا تو وہ پانچویں کافر ہی ہوگا۔ بزاز اور بیہقی نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ان آدم کو قیامت کے دن لا یا جائے گا اور میزان کے دو پلڑوں کے درمیان اسے کھڑا کر دیا جائیگا اور میزان پر ایک فرشتہ مقرر کر دیا جائے گا۔ پس اگر اس کے پلڑے بھاری رہے تو وہ فرشتہ اتنی بلندی سے نوازے گا کہ وہ ساری مخلوق کو سنانی دے گی اور کئے گا فلاں سعادت مند اور خوش بخت ہو گیا اس کے بعد کبھی شقی اور بد بخت نہیں ہوگا۔ اور اگر اس کے پلڑے ہلکے ہوں گے تو وہ فرشتہ اتنی بلندی سے نوازے گا کہ وہ ساری مخلوق کو سنانی دے گی اور کئے گا فلاں شقی اور بد بخت ہو گیا۔ اس کے بعد کبھی بھی سعادت مند اور خوش بخت نہیں ہوگا (۱)۔

اس حدیث میں بھی پلڑا ہلکا ہونے سے مراد وہی ہے جس کا بالکل کوئی وزن نہیں ہوگا۔

میں کہتا ہوں شاید گنہگار مومنین کے اعمال کا وزن دو بار کیا جائے گا۔ اگر ان کی نیکیوں کا پلڑا کچھ ہلکا ہوگا تو انہیں جہنم میں داخل کر دیا جائے گا یہاں تک کہ (وہ گناہوں کی آلودگی سے) پاک صاف ہو جائیں۔ اس طہارت اور پاکیزگی کے حصول کے بعد ان کے اعمال کا دوبارہ وزن کیا جائے گا، تو پھر اس کے پلڑے وزنی اور بھاری ہو جائیں گے اور اس وقت وہ فرشتہ نوازے گا فلاں اس طرح سعادت مند اور خوش بخت ہو گیا کہ اس کے بعد کبھی بھی شقی اور بد بخت نہیں ہوگا۔ اس بارے میں کچھ تحقیقات ہم نے سورۃ القارعہ میں ذکر کی ہیں۔ اس بات پر دلیل کہ اس آیت سے مراد صرف کفار ہیں۔ گنہگار مومنین ان میں شامل نہیں۔ آگے آنے والا ارشاد باری تعالیٰ ہے جو کہ ترکیب کلام میں فن موصول کی خبر ہے، یعنی فَأُولَئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ تو یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو دھوکہ دیا اور نقصان پہنچایا۔ اور اپنے نفس کو کامل بنانے کا زمانہ ضائع کر دیا۔ فَبِئْسَ جَهَنَّمَ خَلِيلُونَ صلہ سے بدل ہے یا أُولَئِكَ کی مدد سے خبر ہے یا پھر مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے وَهُمْ فِي جَهَنَّمَ خَالِدُونَ

ہے (آگ ان کے چروں کو بری طرح جھلس دے گی)، یعنی آگ ان کے چروں کو جلا دے گی قاسم میں اسی طرح ہے (1)۔ لیکن مومنین کے چروں کو آگ نہیں جلائے گی۔ جیسا کہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اس امت کے کچھ لوگ جہنم میں داخل ہوں گے تو ان کے چرے کے دائرہ کے سوا آگ انہیں جلا دے گی۔ پھر کچھ وقت کے بعد انہیں جہنم سے نکال لیا جائے گا (2)۔

ابن مردودہ اور ابیہ نے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ قول باری تعالیٰ تَلْفُخُ وَجُوْهُهُمْ النَّارَ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا آگ انہیں ایک ہی بار اتا جلا دے گی کہ ان کے گوشت بہہ کر ایزیوں پر جا پھینگیں گے (3)۔

طبرانی نے الاوسط میں اور ابو نعیم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ اہل جہنم کو جب بائک کر جہنم کی طرف لے جایا جائے گا تو وہ انہیں ایک بار میں اتا جلا دے گی کہ وہ ہڈیوں پر گوشت باقی نہیں چھوڑے گی مگر اسے ان کی ایزیوں پر پھینک دے گی (4)۔

وَهُمْ فِيْهَا كَالْبُخُوْنِ كَابْهَلِمْ خَيْرٌ يَّجْرُورٌ مِّضَافٌ اِلَيْهِ (یعنی وَجُوْهُهُمْ كِي ضَمِيرٌ) (ع)۔ حال ہے۔ مَخْلُوْجٌ كَامَعْنٰی کے ہاتھوں کے اوپر سے دونوں ہوتوں کا سکر جانا۔

ترمذی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے قول باری تعالیٰ وَهُمْ فِيْهَا كَالْبُخُوْنِ کے بارے میں فرمایا کہ آگ اسے اس طرح جھون دے گی کہ اس کا اور پر والا ہونٹ اوپر کی جانب اتا سکر جائے گا کہ وہ اس کے سر کے وسط تک جا پہنچے گا اور نیچے والا ہونٹ اتا تک جائے گا کہ وہ اس کی ناف سے جا لگے گا (5)۔

ہناد نے حضرت ابوسعود سے وَهُمْ فِيْهَا كَالْبُخُوْنِ کے بارے میں یہ نقل کیا ہے کہ وہ اس میں بکے ہوئے سر کی مثل ہو جائیں گے کہ ان کے دانت ظاہر (باہر نکلے ہوئے) ہوں گے اور ہونٹ سکرے ہوئے ہوں گے (6)۔

اَلَمْ يَكُنْ اَلَيْسَى تَشْتَلِ عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُشَكِّدُوْنَ ۝۱۰۰ قَالُوْا اِرْبَابَنَا عَنَيْتَ عَلَيْنَا
شِقْوَتَنَا وَكُنَّا تَوَاصُّا لِيْنِ ۝۱۰۱ رَابِعًا اٰخِرًا جَمَاعًا مِنْهَا قَانَ عَذَابًا قَاتِلًا اٰظْلَمُوْنَ ۝۱۰۲
قَالَ اَحْسَبُوْا فِيْهَا وَاَوْ لَا تُكَلِّمُوْنَ ۝۱۰۳

”اب منہ کیوں بسورتے ہو؟ کیا ہماری آیتیں نہیں پڑھی جاتی تھیں تمہارے سامنے اور تم انہیں جھٹلایا کرتے تھے (معدرت کرتے ہوئے) کہیں گے اے ہمارے رب! غالب آگئی تھی ہم پر ہماری بدبختی اور ہم گم کردہ راہ لوگ تھے۔ اے ہمارے مالک! (ایک بار) ہمیں نکال اس سے۔ پھر اگر ہم نافرمانی کی طرف رجوع کریں تو یقیناً پھر ہم ظالم ہوں گے۔ جواب ملے گا پھر نکارے ہوئے پڑے رہو اس میں اور مت بولو میرے ساتھ“

1- التامس المحیط، جلد 1، صفحہ 359 (الترغیب العربی)

3- الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 31 (احمدیہ)

5- جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 147 (وزارت تعلیم)

2- صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 107 (قدیمی)

4- شیخ الازہاد، جلد 10، صفحہ 711 (المنیر)

6- الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 31 (احمدیہ)

۱۔ جبہور نے **بَشِقُوا نُنَّا** کو شہین کے کسرہ اور قاف کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ جبکہ خزہ اور کسائی نے اسے **بَشِقُوا نُنَّا** یعنی شہین اور قاف کے فتنہ اور اس کے بعد الف کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں۔ معنی یہ ہے کہ ہماری شقاوت اور بدبختی ہم پر قابض ہوگئی۔ ہم پر غالب آگئی یہاں تک کہ ہمارے احوال اس برے اور اذیت ناک انجام تک پہنچانے والے ہو گئے۔ اور ہم حق سے ہٹنے ہوئے لوگ تھے۔

۲۔ اسے ہمارے رب! ایک بار ہمیں اس آگ سے نکال۔ پھر اگر ہم نافرمانی اور تکذیب کی طرف رجوع کریں تو یقیناً پھر ہم اپنے نفسوں کے ساتھ ظلم کرنے والے ہوں گے، تو اس وقت کے بعد ہمیں عذاب سے نجات اور خلاصی عطا نہ کرنا۔
 ۳۔ تو اللہ تعالیٰ ان کے جواب میں فرمائے گا **پھنکارے ہوئے پڑے رہو اس میں۔** یعنی ذلت و رسوائی کے ساتھ خاموش رہو کیونکہ یہ التبا اور دعا کا مقام نہیں اور دور ہو جاؤ۔ قاسوس میں ہے **خَسْنَا الْكَلْبُ** یہ باب **مَنْعٌ مِّنْعٌ** ہے۔ (اس نے کتے کو دھکڑا کر نکال دیا) مصدر **خَسَّ** اور **خَسُوْهُ** ہے۔ اور **خَسْنَا الْكَلْبُ** (کتا دور ہو گیا) جیسا کہ **اِنْخَسَّ** باب **اِنْفَاعِلٌ** کا یہی معنی ہے (۱) گویا یہ فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔

وَاذْكُرْ تَكْوِيْنًا کو وصل اور وقت دونوں حالتوں میں یعقوب نے یا اے کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے بغیر یا کے پڑھا ہے۔ معنی یہ ہے۔ اور تم مجھ سے عذاب اٹھانے کے بارے بات تک مت کرو۔ کیونکہ میں تم سے عذاب نہیں اٹھاؤں گا۔ اس وقت وہ ہر قسم کی امید اور گنجائش سے مایوس ہو جائیں گے۔ یا معنی یہ ہے تم میرے ساتھ مت بولو۔ (یعنی مطلق خاموش رہنے کا حکم ہے) حسن نے کہا ہے کہ یہ آخری کلام ہے جو اہل دوزخ کریں گے پھر اس کے بعد کوئی کلام نہیں کریں گے۔ مگر یہ کہ وہ گدھوں کی آواز کی مثل آوازیں نکالیں گے اور کتوں کے بھونکنے کی مثل وہ بھونکیں گے نہ خود بات سمجھیں گے اور نہ اپنی بات سمجھا سکیں گے (2)۔

علامہ قرطبی نے کہا ہے جب انہیں یہ کہا جائیگا **اِخْسَنُوْا فِيْهَا وَلَا تَكْلِمُوْنَ** تو ان کی امیدیں ختم ہو جائیں گی اور وہ ایک دوسرے کی طرف مت کر کے بھونکنے لگ جائیں گے۔ اور اس وقت ان پر دوزخ بند کر دی جائے گی (3)۔

ہناد طبرانی ابن ابی حاتم حاکم بیہقی اور عبد اللہ بن احمد نے زوائد الزبد میں حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت نقل کی ہے کہ بیٹک اہل نار مالک (داروقہ جنم) کو پکار کر کہیں گے اے مالک! تیرے رب کو ہمارا فیصلہ کر دینا چاہئے تو مالک جا لیس سال تک انہیں ویسے چھوڑے رکھیں گے کوئی جواب نہیں دیں گے پھر جواب دیں گے تو کہیں گے **اِنَّكُمْ مَا كُنْتُمْ** (بیٹک تم ہمیشہ کے لئے) ہمیں ٹھہرنے والے ہو) پھر وہ اپنے رب کو پکاریں گے۔ **رَبَّنَا اٰخِرُ جَنَّتِهَا فَاِنِ عَذَابُنَا فَاِنَّا ظَالِمُوْنَ**۔ (اے ہمارے رب! ایک بار) ہمیں اس سے نکال پھر اگر ہم نافرمانی کی طرف رجوع کریں تو یقیناً پھر ہم ظالم ہوں گے) پس اللہ تعالیٰ بھی انہیں دنیا کی مدت سے دو نادمات تک ویسے ہی چھوڑے رکھے گا انہیں کوئی جواب نہیں دے گا۔ پھر انہیں جواب دیتے ہوئے فرمائے گا **اِخْسَنُوْا فِيْهَا وَلَا تَكْلِمُوْنَ**۔ (پھنکارے ہوئے پڑے رہو اس میں اور میرے ساتھ مت بولو) فرمایا اس وقت وہ بالکل مایوس ہو جائیں گے اور اس کے بعد کوئی کلام نہیں کر سکیں گے مگر گدھوں کی آواز کی مثل آوازیں نکالیں گے اور اسی میں پڑے رہیں گے (4) اس روایت کو حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔ سعید بن منصور اور بیہقی نے محمد بن کعب سے یہ قول نقل کیا ہے کہ اہل دوزخ پانچ مرتبہ پکاریں گے۔ چار بار کی پکار تو اللہ تعالیٰ انہیں

2۔ تفسیر ابن عربی جلد 4، صفحہ 433 (اعلیٰ)

4۔ الدر المنثور جلد 5، صفحہ 32 (اعلیٰ)

1۔ التاموس الحیث جلد 1، صفحہ 102 (اترث العربی)

3۔ تفسیر بخاری جلد 4، صفحہ 162 (القر)

جواب دے گا اور جب پانچویں بار پکارتیں گے تو اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے کلام نہیں کر سکیں گے۔ وہ کہیں گے رَبَّنَا آمَنَّا بِكَ سُبْحَانَ وَ
 أَحْسَبُكَ اللَّهُمَّ يَا قَاتِلَ الْمُشْرِكِينَ يَا قَاتِلَ الْكُفْرَانِ يَا قَاتِلَ الْبَغْيِ يَا قَاتِلَ الْفِرْيَانِ يَا قَاتِلَ الْفُجْرَانِ يَا قَاتِلَ الْفُجْرَانِ يَا قَاتِلَ الْفُجْرَانِ
 عطا کی۔ اب ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں کیا یہاں سے نکلنے کی کوئی راہ ہے؟ تو اللہ تعالیٰ انہیں جواب دے گا ذَلِكُمْ بِرَبِّكَ إِذَا
 دُعِيَ اللَّهُ وَحْدًا كَكَفَرْتُمْ ۚ وَإِنْ يُقْسِرُ لَكُمْ بِهَيْبَتِهِمْ ۖ قَالَ اللَّهُ لِيُذِيقَهُمْ مَوَاطِنَ الَّذِي أَلْقَوْنَهُمْ فِيهِ ۖ فَالْحَكِيمُ الَّذِي لَيْسَ يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ۔ (تمہاری یہ حالت اس وجہ سے ہے کہ جب ایک خدا کو پکارا
 جاتا تھا تو تم انکار کرتے تھے اور جب اس کے ساتھ دوسروں کو شریک بنایا جاتا تھا تو تم یقین کر لیتے تھے جس (آج) فیصلہ ای اللہ کے
 ہاتھ میں ہے جو سب سے بالا اور بزرگ ہے) پھر وہ کہیں گے رَبَّنَا آمَنَّا بِكَ سُبْحَانَ وَحَسْبُكَ اللَّهُمَّ يَا قَاتِلَ الْمُشْرِكِينَ۔ (اے ہمارے
 رب! ہم نے دیکھ لیا اور ہم نے سن لیا اب ہمیں دنیا کی طرف لوٹا دے تاکہ ہم نیک کام کریں بلاشبہ ہم یقین رکھتے ہیں) تو اللہ تعالیٰ
 انہیں جواب دے گا فَذُوقُوا عَذَابَ الْيَسِينِ ۚ إِنَّكُمْ بِعَذَابِنَا كَافِرُونَ۔ (تم اس دن کی ملاقات کو
 بھول گئے تھے سو اس کا مزہ چکھو بیچک ہم نے بھی تمہیں بھلا دیا ہے اور تم اپنے کرتوتوں کے بدلے دائمی عذاب کا مزہ چکھو) پھر وہ کہیں
 گے رَبَّنَا آمَنَّا بِكَ يَا قَاتِلَ الْفُجْرَانِ ۚ فَذُوقُوا عَذَابَ الْيَسِينِ ۚ إِنَّكُمْ بِعَذَابِنَا كَافِرُونَ۔ (اے ہمارے رب! تمہاری رحمت تک ہمیں مہلت دے دے تاکہ ہم
 تیری دعوت کو قبول کر لیں اور پیغمبروں کی اتباع کریں) تو اللہ تعالیٰ انہیں جواب دے گا أَوَلَمْ تَكُونُوا أَقْسَمْتُمْ لَنْ لَا تَكُونُوا
 فِيهَا ۚ فَذُوقُوا عَذَابَ الْيَسِينِ ۚ إِنَّكُمْ بِعَذَابِنَا كَافِرُونَ۔ (کیا تم نے اس (قیامت کے برپا ہونے) سے پہلے (اپنی زندگی میں) قسمیں نہیں کھائی تھیں کہ تم کو زوال نہ ہوگا) پھر وہ عرض
 کریں گے رَبَّنَا آمَنَّا بِكَ سُبْحَانَ وَحَسْبُكَ اللَّهُمَّ يَا قَاتِلَ الْمُشْرِكِينَ۔ (اے ہمارے رب! ہمیں یہاں سے نکال لے تاکہ ہم نیک عمل کریں جو
 ان کے خلاف ہوں جو پہلے ہم نے کئے) تو اللہ تعالیٰ انہیں جواب دے گا أَوَلَمْ تَكُونُوا أَقْسَمْتُمْ لَنْ لَا تَكُونُوا فِيهَا ۚ فَذُوقُوا عَذَابَ الْيَسِينِ ۚ
 إِنَّكُمْ بِعَذَابِنَا كَافِرُونَ۔ (کیا ہم نے تم کو اتنی زندگی نہیں دی کہ جو اس میں نصیحت حاصل کرنا چاہے وہ نصیحت حاصل کر لے اور
 (کیا) تمہارے پاس ڈرانے والا نہیں آیا تھا اب مزہ چکھو (آج) کا قروں کا کوئی مددگار نہیں ہے) پھر وہ کہیں گے قَاتِلُوا رَبَّنَا غَلَبَتْ
 عَلَيْهِمْ سَائِجِرَاتُ الْبَلَدِ ۚ فَذُوقُوا عَذَابَ الْيَسِينِ ۚ إِنَّكُمْ بِعَذَابِنَا كَافِرُونَ۔ (اے ہمارے رب ہم پر ہماری بدبختی غالب آگئی تھی
 اور ہم تم کو مددگار وہ لوگ تھے اے ہمارے مالک! (ایک بار) ہمیں اس سے نکال۔ پھر اگر ہم تانفرمانی کی طرف رجوع کریں تو یقیناً پھر ہم
 ظالم ہوں گے) تو اللہ تعالیٰ انہیں جواب دے گا اخْسَبُوا فِيهَا وَلَا تُكْفُرُوا ۚ فَذُوقُوا عَذَابَ الْيَسِينِ ۚ إِنَّكُمْ بِعَذَابِنَا كَافِرُونَ۔ (اے ہمارے رب ہمیں اس سے نکال
 یولو) تو اس کے بعد ان کے چہرے گوشت کا ٹکڑا ہو جائیں گے جس میں نہ منہ ہوگا نہ ناک۔ سانس ان کے پیوں میں ہی گردش کرنے
 لگے گا (۱۱)۔ اور ان پر جہنم کے سانپ اور بچھو ٹوت پڑیں گے۔ اگر ان میں سے کوئی سانپ شرق میں پھونک مارے تو اس سے مغرب
 میں رہنے والے جل جائیں اور اگر ان میں سے کوئی بچھو اہل دنیا کو ڈس دے تو (اس کے زہر سے) وہ جل جائیں۔ بیچک یہ
 سانپ اور بچھو ان پر حملہ آور ہیں گے اور ان کے گوشت اور جلدوں میں گھس جائیں گے۔ اور وہاں ان کی ایسی آوازیں سنائی دیں گی
 جیسے جنکوں میں وحشی جانوروں کی آوازیں ہوتی ہیں۔

إِنَّهُ كَانَ فَرِيضٍ مِّنْ عِبَادِي يَقُولُ رَبَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَإِنَّا حَسِبْنَا أَنَّكَ تَخِيَرُ
 الرَّحِيمِينَ ﴿٥٠﴾ فَاتَّخَذَ سُوهُمَ بَسْحَرِيًّا حَتَّىٰ أَتَسْوَأُكُمْ ذِكْرِي وَكُنْتُمْ مِنْهُمْ

تَضَحُّوْنَ ﴿۱۰﴾ اِنِّیْ جَزَّیْتُھُمْ الْیَوْمَ بِمَا صَبَرُوْا اَلَا اَنْتُمْ هُمْ اِنْفَاطِرُوْنَ ﴿۱۱﴾

(تمہیں یاد ہے) ایک گروہ میرے بندوں میں سے ایسا تھا جو عرض کیا کرتا تھا اے ہمارے رب! ہم ایمان لے آئے ہیں سو تو بخش دے ہمیں اور تم فرما ہم پر اور تو سب سے بہتر رحم فرمانے والا ہے۔ تم نے ان کا مذاق اڑانا شروع کر دیا حتیٰ کہ اس مشغلہ نے غافل کر دیا تمہیں میری یاد سے اور تم ان پر قہقہے لگایا کرتے تھے۔ ان میں نے بدلہ دے دیا انہیں آج ان کے صبر کا (ذرا دیکھو) وہی نہیں مرا دکو پانے والے ہیں۔

۱۰۔ تَضَحُّوْنَ کو اہل مدینہ حمزہ اور کسائی نے یہاں اور سورہ صاف میں سین کے ضمہ کے ساتھ مُضَحُّوْنَ پڑھا اور باقیوں نے سین کے کسرہ کے ساتھ تَضَحُّوْنَ پڑھا ہے۔ جبکہ سورہ زخرف میں سین کے ضمہ پر تمام نے اتفاق کیا ہے۔ کسائی اور افراد نے کہا ہے سین کے کسرہ کے ساتھ لفظ مضحکو کا معنی کسی سے بالقول، یعنی زبان سے استہزاء اور تمسخر کرنا ہے اور سین کے ضمہ کے ساتھ لفظ مضحکو کا معنی ہے کسی کو باغفل تابع بنالینا اور غلام بنالینا۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ زخرف میں سین کے ضمہ پر تمام کا اتفاق ہے۔ کیونکہ وہاں صرف تابع اور غلام بنا لینے کا مفہوم ہے اس کے علاوہ کسی اور معنی کا وہ احتمال ہی نہیں رکھتا۔

غلیل کا موقف ہے کہ دونوں لغتوں کے اعتبار سے یہ لفظ مترادف اور ہم معنی ہے۔ جیسا کہ بحر لُجَی اور بَحْر لُجَی۔ تَضَحُّوْنَ اور تَضَحُّوْنَ قَرِیْبَیْنِیْ میں لام اور دال مضموم بھی ہیں اور کسور بھی۔ اور یہ مترادف ہیں (۱) قاصوس میں بھی اسی طرح ہے۔ صاحب قاصوس نے کہا ہے مضحکو و منه و بد۔ (انہوں نے استہزاء کیا) جیسا کہ استسخو کا معنی ہے اس نے مذاق کیا، طعنا کیا۔ اور التضحیۃ اور التضحیۃ اور التضحیۃ امم ہیں۔ سین مضموم بھی ہے اور کسور بھی اور تضحیۃ جیسا کہ فہمہ ہے۔ (یعنی باب مفتح مفتح) مصدر تضحیۃ اور تضحیۃ اس کا معنی ہے ایسا کام کرنے کا پابند کر دینا جسے وہ نہ کرنا چاہتا ہو (بیگار لینا) اور مغلوب کر دینا (مجبور کر دینا) (۲) نہیں میں اسی طرح ہے۔

بہر حال ہرمعنی اور تقدیر کے مطابق مسعودی مصدر ہے اور اس میں مبالغہ کے لئے یا نسبت کا اضافہ کیا گیا ہے اور معنوی لحاظ سے یہاں استہزاء اور تمسخر مراد ہے۔ اور اس پر قرینہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے خَشِيَ اَنْسَوْكُمْ وَ كَذَّبْتِیْ وَ كُنْتُمْ مِنْهُمْ تَضَحُّوْنَ۔ کیونکہ ضحک (ہنسنا) استہزاء پر ہی مرتب ہوتا ہے نہ کہ تابع اور غلام بنانے پر۔ (یعنی جب استہزاء کیا جاتا ہے تو چہرہ ہی بھی آتی ہے فقط کسی کو اپنا تابع یا غلام بنانے پر ہی نہیں آتی لہذا یہاں لفظ تضححون اس پر دلالت کرتا ہے کہ مسخو سے مراد استہزاء ہے)

اس میں حتیٰ ابتدا یہ ہے۔ جیسا کہ اس قول میں ہے مَوْضِعُ فُلَانٍ حَضِيٌّ لَا يَزِيْجُوْنَهُ۔ یعنی تمہارے ان کے ساتھ استہزاء کرنے اور ان پر قہقہے لگانے میں مشغول ہونے سے میری یاد سے تمہیں غافل کر دیا ہے۔ یہاں بھلائے اور غافل کر دینے کی نسبت مؤمنین کی طرف مجازاً آئی گئی ہے۔ ماقبل نے کہا ہے کہ یہ آیت حضرت عمار صحیب اور سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور دیگر انفقراء صحابہ کرام کے بارے نازل ہوئی ہے کیونکہ کفار قریش ان کے ساتھ استہزاء کرتے تھے (۳)

یعنی ان مؤمنین نے تمہاری اذیت رسانی اور استہزاء کرنے پر جس صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا میں نے آج انہیں اس کا بدلہ دے دیا۔ (ذرا دیکھو) وہی مرا دکو پانے والے ہیں۔ نہ کہ تم۔ حمزہ اور کسائی نے استہزاء کی بنا پر اَنْتُمْ کے حمزہ کو کسور پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے حمزہ

کو منتوح پڑھا ہے اس لئے کہ یہ جَزَيْفُهُمْ کا مفعول ثانی ہے۔

فَلِكَلِمَةٍ لَّبِئْسَتْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ بَسِينِينَ ﴿١٠﴾ قَالُوا لَيْسَ لَنَا بِمَالٍ وَلَا بَدَنٍ يَبُورُ
فَسَأَلِ الْعَادِيَةَ ﴿١١﴾ فَلَإِنْ لَبِئْسَتْ إِلَّا قَلِيلًا لَّوْ أَتَاكُمْ نَسِيتُمْ مَبْعُوثُونَ ﴿١٢﴾

”اللہ تعالیٰ فرمائے گا (ذرا بتاؤ) کتنے سال زمین میں ٹھہرے رہے۔ کہیں گے ہم ٹھہرے بس ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ آپ پوچھ لیں سال گننے والوں سے۔ ارشاد ہوگا تم نہیں ٹھہرے مگر تھوڑا عرصہ صلہ کا۔ اتم اس (حقیقت) کو (پہیلی) جان لیتے ہیں۔“

۱۔ قَالِیٰ کی جگہ بعض نے قُلْ پڑھا ہے۔ اس بنا پر کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے قیامت کے دن فرشتے کو حکم ہوگا یا اہل نار کے رسوا میں سے کسی کو کہ تمام اہل دوزخ سے یہ سوال کریں۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ خطاب اہل دوزخ میں سے ہر ایک کو ہے کہ اس سوال کا جواب دو (قُلْ جوابِ ہذا)

باتیوں نے اسے الف کے ساتھ قَالِ پڑھا ہے۔ یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کفار سے فرمائے گا۔ ذرا بتاؤ کتنے سال تم زمین میں ٹھہرے رہے، یعنی زندگی کی حالت میں اور مرنے کے بعد قبروں میں۔ ترکیب کلام میں عَدَدَ بَسِينِينَ حکم کی تیسر ہے۔
۲۔ تو جواب میں کفار زمین میں اپنے ٹھہرنے کی مدت کو انتہائی کم اور قلیل قرار دیتے ہوئے کہیں گے، ہم ٹھہرے تھے بس ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ (اب انہوں نے اس مدت کو انتہائی کم بیان کیا اسکی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں) مثلاً وہ آدمی جسے عذاب دیا جا رہا ہو وہ اپنی تکلیف اور مصیبت کے ایام کو انتہائی طویل خیال کرتا ہے اور اس سے پہلے کے معاملات کو انتہائی قلیل اور چھوٹا گمان کرتا ہے۔ یا اس لئے کہ زمین پر ٹھہرنے کی مدت گزر چکی تھی اور جو چیز گزر جائے وہ معدول کے حکم میں ہو جاتی ہے (یعنی اسے حقیر سمجھ کر اس سے رخ پھیر لیا جاتا ہے) یا اس کا سبب یہ ہے کہ چونکہ حیات اخروی کی مدت ختم ہونے والی نہیں اس لئے اس کی نسبت حیات دنیوی اور قبر میں رہنے کی مدت انتہائی قلیل اور کم ہے۔ یا اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیوی زندگی کے ایام ان کے لئے خوشی اور مسرت کے ایام تھے اور خوشی کے دن چھوٹے تصور ہوتے ہیں۔ لیکن یہ وہ جب بیان کی جا سکتی ہے جبکہ سوال کا تعلق فقط دنیوی حیات کی مدت سے ہو۔ قبر میں ٹھہرنے کی مدت کے بارے سوال نہ ہو۔ کیونکہ ان کے لئے ایام قبر خوشی اور مسرت کے دن نہیں، کیونکہ نفوسِ قطعیہ اور اجماع سے (بالخصوص کفار کے لئے) عذابِ قبر ثابت ہے۔

فَسَأَلِ الْعَادِيَةَ۔ (آپ پوچھ لیں سال گننے والوں سے) یہاں عَادِيَةَ یعنی گننے والوں سے مراد وہ فرشتے ہیں جو انسانوں کے اعمال محفوظ رکھتے ہیں اور انہیں شمار کرتے رہتے ہیں۔ لہذا ان کے پاس ہمارے ٹھہرنے کی مدت بدرجہ اولیٰ محفوظ ہوگی۔ یا عادین سے مراد وہ انسان ہیں جو ان ایام کو شمار کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ یعنی اگر آپ اس مدت کی تحقیق کا ارادہ رکھتے ہیں تو پھر ان گننے والوں سے اس کے بارے پوچھ لیں۔ کیونکہ ہم تو عذاب میں گھرے ہوئے ہیں جو ہمیں اس مدت کی یاد دلانے سے مانع ہے۔

۳۔ قَالِیٰ کو تھرا اور کساہی نے بغیر الف کے صیغہ امر کی صورت میں قُلْ پڑھا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے امر ہے۔ اور باتیوں نے اسے بصورت حکایت الف کے ساتھ پڑھا ہے یعنی قَالَ اللَّهُ تَعَالَى (اللہ تعالیٰ فرمائے گا) (اِنَّ لَبِئْسَتْ مِیْنِ اِنْ نَافِیْہِ عَنِیْ تَم دُنِیَا مِیْنِ نِّیْسِ نَظْمِہِ رَ مَکْر تَھُوْزَا زَا نَا نَا یَا بَہْت کَم۔ یعنی تقدیر عبارت ہے ذَمَانَا قَلِیْلًا یَا لَیْسَا قَلِیْلًا۔) (جہلی صورت میں مفعول فیہ ہے اور دوسری میں

منفوع مطلق۔ معنی یہ ہے کہ پیش آنے والے عذاب کی مدت کی نسبت تم بہت کم یا قلیل وقت دنیا میں ٹھہرے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم بخدا! آخرت کے مقابلے میں دنیا کی مثال اس طرح ہے کہ تم میں سے کوئی اپنی انگلی سمندر میں رکھے اور پھر اسے باہر نکال کر دیکھے کہ وہ سمندر کے پانی میں سے کتنی مقدار ساتھ لے کر باہر آئی۔ (یعنی دنیا کی مدت حیات کو آخرت کی مدت سے وہی نسبت ہے جو انگلی سے نکلنے والے پانی کو سمندر کے پانی سے ہے) اسے احمد مسلم اور ابن ماجہ نے مستور سے روایت کیا ہے (1)

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَنْ يَسْأَلَكُمْ عَنْهَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَلَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ۔ (کاش تم اس (حقیقت) کو (پہلے ہی) جان لیتے) تقدیر عبارت اس طرح ہے لَوْ نَفِثْنَا أَنْتُمْ مَحْنَمَ تَعْلَمُونَ ذَلِكِ۔ اس میں کلمہ تَعْلَمُونَ اور تَوَجَّحَ کے لئے ہے، یعنی کاش تم جان لیتے کہ دنیا میں تمہارا قیام اور ٹھہرنا قلیل ہے۔ تو پھر تم اس مدت کو ابو و لعب اور فوجائش پرستی میں ضائع نہ کرے اور نہ تم اس دن کی ملاقات کو بھولتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دنیا اس طرح رہو گویا کہ تم مسافر ہو یا راہگیر ہو۔ اسے بخاری نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے۔ امام احمد ترمذی اور ابن ماجہ نے اس حدیث میں یہ بھی ذکر کیا ہے کہ تو اپنے آپ کو اہل قبور میں سے شاکر کر (2)

أَفَصَبِيْتُمْ أَنَا خَلَقْتُمْ عِبَادًا وَأَنْتُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ ۝ فَتَعَلَى اللَّهُ الْمَلِكُ
الْحَقُّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ سَرَّابُ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ ۝ وَمَنْ يَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ لَا
بُرْهَانَ لَهُ بِهِ فَإِنَّمَا حِسَابُهُ عِنْدَ رَبِّهِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ ۝ وَقُلْ سَرَّابُ
الْغَفْرِ وَأَمْرًا حَمًّا وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّاجِعِينَ ۝

”کیا تم نے یہ گمان کر رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں بے مقصد پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف نہیں لوٹنے جاؤ گے۔ پس بہت بلند ہے اللہ جو بادشاہ حقیقی ہے (بے مقصد تخلیق سے) نہیں کوئی معبود بجز اس کے وہ مالک ہے عزت والے عرش کا، اور جو پوجتا ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو جس کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے۔ بلاشبہ نہیں کامیاب ہوں گے حق کا انکار کرنے والے۔ اور (اے محبوب!) آپ (یوں) عرض کر دو میرے رب! بخش دے (میری گنہگار مت کو) اور جہنم (ہم سب پر) اور تو سب سے بہتر مہر فرمانے والا ہے۔“

لَا أَفَصَبِيْتُمْ میں فاء مجذوف کلام پر عطف کے لئے اور حمزہ استقہام انکاری اور توجہ کے لئے ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے اَفَوَلَمْ تَحْسَبُنَا۔ یعنی کیا تمہیں ہم ہو اور تم نے یہ گمان کر رکھا تھا؟

أَنَا خَلَقْتُمْ عِبَادًا میں أَنَا کے بعد ما کا فہ ہے جو اسے عمل سے روک رہا ہے۔ لہذا یہ جملہ فعلیہ پر داخل ہے۔ اور پھر یہ اپنے جملہ سمیت حَسَبْتُمْ کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ اور عِبَادًا مفعول لہ ہے۔ یا خَلَقْتُمْ فعل کے فاعل ہے۔ حال ہے۔ یا مفعول سے حال ہے۔ یا پھر حرف جر کے مجذوف ہونے کے سبب یہ منصوب ہے۔ یعنی ہم نے تمہیں بے مقصد پیدا نہیں کیا، بغیر حکمت کے پیدا نہیں کیا یا تمہیں محض ابو و لعب کے لئے پیدا نہیں کیا۔ یا ہم نے تمہیں پیدا نہیں کیا اور آنحالیکہ تمہاری تخلیق سے کسی حکمت اور مقصد کا راہ نہ ہوا یا ہم نے تمہیں پیدا نہیں کیا اور آنحالیکہ تمہیں طاعت، معرفت اور جزاء سے مکلف کرنا مقصود نہ ہو یا ہم نے تمہیں اس لئے پیدا نہیں کیا کہ تم بھلے رہو اور بیکار زندگی بسر کرو۔ ایسا ہرگز نہیں۔ بلکہ ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے تاکہ تم اپنے رب کی معرفت حاصل کرو اس کی عبادت میں

مصرف رہو اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرتے رہو۔ مذکورہ بالا ترکیب کے مطابق تقدیر عبارت کچھ اس طرح ہے۔ "أَتَمْنَا خَلْقَنَا كُمْ عِبَادًا لَمْ نَخْلُقْكُمْ خَلْقًا عَبْدًا لِنَلْعَبُوا أَوْ لِنُلْهِيَهُمْ أَوْ عَابِدِينَ أَوْ حَالٍ كَوْنِكُمْ مَبْعُوثِينَ أَوْ لِنَلْعَبُوا وَتَعْبُتُوا"۔

وَ أَتَمَّمْنَا إِنِّيْنَا لَشُرُوعُونَ میں جزوہ اور کسائی نے باب مجرد سے صیغہ معروف کی صورت میں تا کو فتح اور نیم کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی تَوَجَّعُونَ اور باقیوں نے باب افعال سے صیغہ مجهول کی صورت میں تاہ کو ضمہ اور نیم کو فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ تَوَجَّعُونَ۔ یہ از جاع سے بنایا گیا ہے۔ اور ترکیب کلام میں اُن اپنے جملے کے ساتھ ل کر اَتَمَّا خَلَقْنَا پر معطوف ہے۔ معنی یہ ہے کہ کیا تم نے یہ گمان کر رکھا تھا کہ تم جزاء کے لئے ہماری طرف لوٹنے والے نہیں ہو۔

یہ پس بہت بلند سے اللہ جو بادشاہ حقیقی ہے، یعنی وہی بادشاہی اور حکومت کا حق رکھتا ہے کیونکہ اس کے سوا تمام بالذات مملوک ہیں اور بالعرض مالک ہیں۔ یہی ان کی حکومت ہوتی ہے اور کبھی نہیں۔ (لیکن اللہ تعالیٰ بالذات مالک ہے اور اس کی حکومت او بادشاہی ہمہ وقت ہر شے پر قائم ہے لکن تعالیٰ میں قائم تعلق کے لئے ہے۔ اور یہ جملہ انکار کی علت بیان کرنے کے عمل میں واقع ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اس سے بلند اور پاک ہے کہ اس کا کوئی مثل ہے مقصد ہو۔

اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ عزت والے عرش کا مالک ہے۔ یہاں عرش کی صفت کریم ذکر کی گئی ہے، کیونکہ بالخصوص عرش ہی ان تجلیات کریمہ کا مہبط ہے جن کا نزول الاحکام میں رب کی جانب سے ہوتا ہے۔

اس اور جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پوجتا ہے یعنی غیر اللہ کی عبادت کرتا ہے۔ جس کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ ترکیب کلام میں لَا تُؤْبَهُنَّ لَهٗ الْإِلَهَا کی دوسری صفت ہے اور یہ صفت اسے لازم ہے، کیونکہ غیر اللہ کی عبادت باطل ہے۔ اور باطل کی کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ یہ صفت تاکید کے لئے ذکر کی گئی ہے۔ یا حکم تو حید کی بنا ہی پر ہے۔ آمین اس بات پر تنبیہ ہے کہ ایسا دین اپنانا جس پر کوئی دلیل نہ ہو وہ ممنوع ہے چہ جائیکہ (ایسا دین اختیار کیا جائے) جس کے باطل ہونے پر دلائل موجود ہوں۔ یا یہ شرط و جزا کے درمیان جملہ محضر ہے کیونکہ فَاتَمَّا حَسْبَانَهُ جَعَلَ وَتَدَّ جَمَلَهُ مِنْ شَرِيكِهٖ جَزَاءً ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اتنی مقدار اسے سزا دے گا جتنا وہ حق رکھتا ہے۔

إِنَّ لَهُ لَا يُظْلَمُ الْكَافِرُونَ یہ ان کی جزا کا بیان اور وضاحت ہے۔ یعنی انہیں جہنم کے عذاب سے نجات حاصل نہیں ہوگی اور جنت میں داخل ہونے کے لئے کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے سورہ کی ابتداء میں مؤمنین کے لئے فلاح و کامرانی کا ذکر کیا تھا اور سورہ کا اختتام اس پر کیا کہ کفار کبھی بھی فلاح و کامرانی نہیں پاسکیں گے۔ پھر اپنے رسول معظم ﷺ کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ استغفار کریں اور رحم طلب کریں، تاکہ آپ کی امت کے اہل ایمان بھی آپ کی پیروی کریں اور وہ فلاح و کامرانی کے مدارج کو پانے میں کامیاب ہو جائیں۔ چنانچہ فرمایا وَ قُلْ رَبِّ اجْعَلْنِي مِمَّنْ ذُكِّرْتُ وَيُذَكَّرُونَ وَأَنْتَ خَيْرُ الْمُوَحِّدِينَ اِذْ عَسَمَ فَعَلِ كَيْ فاعل سے حال ہے۔ اور اس سے مفعول محذوف ہے۔ یعنی جسے بخش دیا جائے اور جس پر رحم کیا جائے۔ اس لئے تاکہ دعا میں عمومیت پیدا ہو جائے کہ وہ مغفرت کے سبب تمام ضرر رساں اور تکلیف دینے والی چیزوں کی نفی کی ضامن ہو اور رحمت کے سبب تمام نفع بخش اشیاء کو لانے کا سبب ہو۔

علامہ بقوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسکی تفسیر میں انشس سے یہ قول نقل کیا ہے کہ ایک مجنون آدمی حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس لایا گیا، تو آپ نے اس کے دونوں کانوں میں اَفَصِيْبِيْمُ اَكْتَا حَقْنُكُم عَدِيًّا اَعْتَا مَسُوْرَةٌ پڑھ کر دم کر دیا تو وہ صحت یاب ہو گیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے آپ سے پوچھا تم نے اس کے کان میں کیا پڑھ کر دم کیا ہے تو انہوں نے سب کچھ آپ ﷺ کو عرض کر دیا۔ تو اس پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا وَ الَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ اَنَّ رُحُلًا مَوْفَنَا قَرَأَهَا عَلَيَّ حَبِيْلٍ لَفَرَأَلْتُ۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر کوئی شخص پورے ایقان کے ساتھ یہ پڑھ کر پہاڑ پر بھی دم کر دے تو وہ بھی اپنی جگہ چھوڑ دے۔ (1)

الحمد للہ سورۃ المؤمنون کی تفسیر 15 صفحہ 1204 ہ کو ختم ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے فضل و احسان سے سورۃ المؤمنون کا ترجمہ 9 رمضان المبارک 1421ھ بمطابق 6 دسمبر 2000ء بروز بدھ صبح آٹھ بجے اختتام پزیر ہوا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی ذٰلِكَ وَ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَيْرِ خَلْقِهِ سَيِّدِنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَآلِهِ وَاصْحَابِهِ اَجْمَعِيْنَ.

سورة النور

﴿ اٰیٰتھا ۲۴ ﴾ ﴿ سُوْرَةُ النُّوْرِ مَكِّيَّةٌ ۲۴ ﴾ ﴿ رُكُوْعُهَا ۹ ﴾

سورة نور مدنی ہے اس میں 9 رکوع اور 64 آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَاَوْفَرَضْنٰهَا وَاَنْزَلْنَا فِيْهَا آٰیٰتٍ بَّیِّنٰتٍ لِّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱﴾

” (ایک عظیم الشان) سورۃ ہے۔ جو ہم نے نازل فرمائی ہے اور ہم نے فرض کیا ہے اس (کے احکام) کو جسے اور ہم نے اتاری ہیں اس میں روشن آیتیں تاکہ تم نصیحت قبول کرو۔“

۱۔ سورۃ کا لفظ یا تو مبتدا محذوف کی خبر ہے یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ پہلی صورت میں تقدیر عبارت ہذہ سورۃ ہوگی اور دوسری صورت میں فیما او حیثا الیک سورۃ ہوگی۔

۲۔ انزلناھا سورۃ کی صفت ہے۔ یعنی اس سورت کو ہم نے نازل کیا ہے اور اس کے احکام پر عمل کرنا بھی ہم نے لازم کیا ہے، بعض علماء نے فرضناھا کا معنی قدرناھا کیا ہے، یعنی ہم نے اس میں حدود کو مقدم فرمایا ہے۔ جمہور قراء نے فرضناھا کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ ابن کثیر اور ابو عمرو نے کثرت کے معنی پر دلالت کرنے کے لیے باب تفعیل سے شد کے ساتھ پڑھا ہے، کیونکہ اس میں فرأض کثیر ہیں یا جن پر یہ احکام فرض ہیں وہ زیادہ ہیں۔ یعنی تم پر اور قیامت تک آنے والے تمام لوگوں پر اس کے احکام فرض کئے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں فرضناھا کا معنی فصلنا اور بیٹنا ہے، یعنی ہم نے وضاحت کے ساتھ اس کے احکام کو بیان فرمایا ہے۔

۳۔ اور اس سورہ پاک کی آیات بڑی واضح ہیں۔ ان کے مراد و مقصود میں کچھ ابہام و اختیاف نہیں ہے اور اس سورت کے احکام کے نزول کا مقصد صرف اور صرف یہ ہے کہ تم نصیحت حاصل کرو یا محارم الہیہ سے اجتناب کرو۔

اَلرَّٰثِبَةُ وَ الرَّاٰی فَاَجْلِدُوْا كُلَّ وَ اِحِدٍ مِنْهُمَا مِائَةً جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْكُمْ
بِهَمٰ سَرٰ اَقَّةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُوْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَاٰیٰتُہٗ
عَدَّ اٰیٰتُہٗا طٰیْفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱﴾

”جو عورت بدکار ہو اور جو مرد بدکار ہو، تو لگاؤ ہر ایک کو اس ان دونوں میں سے سزا (سو) دور سے اور نہ آئے جنہیں ان دونوں پر (ذرا) رحم اللہ تعالیٰ کے دین کے معاملہ میں ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ تعالیٰ پر اور روز آخرت پر ہر اور چاہئے کہ مشاہدہ کرے دونوں کی سزا کو اہل ایمان کا ایک گروہ۔“

۱۔ اَلرَّٰثِبَةُ وَ الرَّاٰی مبتدا ہے اور اس کی خبر سیویہ کے نزدیک سند کو حکمہ محذوف ہے اور فاحلہ و اہل ان کے حکم کا بیان اور تفصیل ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اِذَا نَبَتْ وَاٰیٰتُہٗا فَاَجْلِدُوْا۔ یعنی جب دونوں کا زنا ثابت ہو جائے تو انہیں کوڑے لگاؤ۔

مرد بدکاری کہے ہیں اس کی خبر فاجلدو کا جملہ ہے (۱)۔ اور خبر پر اس لئے آئی ہے کیونکہ مبتداء کے ضمن میں شرط کا معنی پایا جاتا ہے۔ کیونکہ
الرائیہ پرالف لام الذی کے معنی میں ہے۔ لفقہ پرکام اس طرح ہوگی الذی ذنی والئی ذنت فیقال فی شأنہما اخیلوا یعنی جو
مرد بدکاری کرے اور جو عورت بدکاری کرے اس کے بارے کہا جائے گا کہ انہیں کوڑے مارو۔

ع کلن ذاجی ینٹھنا پر نصب مفعول ہونے کی بنا پر ہے جب کوئی کسی کے جسم پر کوڑے لگائے تو عرب کہتے ہیں ضرب جلدہ اور
جب کوئی کسی کو سر اور پیٹ پر ضرب مارے تو کہتے ہیں ضرب داسہ و بطنہ۔ یہاں لفظ جلدہ ذکر فرمایا ہے تاکہ اس طرح اسے
کوڑے نہ لگائے جائیں کہ چیزی ادھیڑ کر گوشت تک پہنچ جائے۔ اسی وجہ سے فقہاء فرماتے ہیں زانی اور زانیہ کو ایسے کوڑے کے ساتھ
سزا دی جائے گی جس کی گرہیں نہ ہوں اور متوسط طریقہ پر ضرب لگائی جائے گی۔ ابن ابی شیبہ نے عیسیٰ بن یوسف عن حنظلہ السد دی عن
انس بن مالک کی سند سے روایت کیا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے تھے کہ ایسا درہ مارنے کا حکم دیا جاتا تھا جس کی گرہیں
ختم کر دی گئی ہوں اور پھر اسے دو پتھروں کے درمیان رکھ کر کوٹا گیا ہو۔ پھر اس کے ساتھ جرم کو سزا دی جائے۔ (2) حضرت انس رضی
اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا گیا یہ عمل کس کے زمانہ میں کیا جاتا تھا فرمایا ”حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں ایسا کیا جاتا تھا۔“

عبدالرزاق نے یحییٰ بن ابی کثیر سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ!
میں نے ایسا جرم کیا ہے جس کی وجہ سے مجھ پر حد لازم ہوتی ہے مجھ پر آپ حد قائم فرمائیں۔ آپ ﷺ نے کوڑا منگوا لیا تو آپ کو سخت درہ
دیا گیا جس کی گرہیں تھیں۔ آپ ﷺ نے وہ درہ اٹس کرتے ہوئے فرمایا کوئی اور کوڑا لاؤ جس کی گرہیں نہ ہوں۔ پھر آپ ﷺ کوٹا ہوا
یا کل نرم درہ دیا گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا ایسا درہ لاؤ جو اس سے تھوڑا سخت ہو تیسری مرتباً آپ کو ایسا درہ پیش کیا گیا جو مذکورہ دونوں دروں
سے متوسط تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں یہ ٹھیک ہے ایسے ہی درے کے ساتھ سزا دینے کا حکم ہے۔ پھر اس شخص کو کوڑے لگائے گئے (3)۔
ابن ابی شیبہ نے زید بن اسلم سے اسی طرح حدیث روایت کی ہے اور امام مالک نے مولانا میں بھی اسی طرح روایت کی ہے۔

سے وائتہ جلدی تو پر نصب مصدریت کی بنا پر ہے۔ اس آیت کریمہ میں زانی پر زانیہ کو مقدم کیا گیا ہے کیونکہ زانیہ معمولی طور پر اس وقت ہوتا
ہے جب عورت اپنے آپ کو مرد پر پیش کرتی ہے اور چوری کی سزا میں مرد کا ذکر پہلے فرمایا کیونکہ عام طور پر چوری مردوں کی طرف سے
پائی جاتی ہے۔ اسلئے مرد کا ذکر پہلے اور عورت کا ذکر بعد میں فرمایا۔ ارشاد ہے وَالسَّارِقِ وَالسَّارِقَاتِ فَالْأُولَىٰ بَعْضُهُمَا
کرنے والے اور چوری کرنے والی (کی سزا یہ ہے) کہ کاٹوان کے ہاتھ۔

مسئلہ: علماء امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ جب بدکاری کرنے والا جوڑا اگر آزاد بالغ عاقل اور غیر شادی شدہ ہو تو ان دونوں میں
سے ہر ایک کو (ثبوت کے بعد) سو سو کوڑے لگائے جائیں گے اور اس کی دلیل یہی آیت کریمہ ہے۔ امام الاصفیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے
نزدیک اس سزا پر کچھ اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس سزا کے علاوہ قہر کی
مسافت یا اس سے زیادہ دور ایک سال کے لئے جلا وطن کرنا بھی واجب ہے بشرطیکہ راستہ ماسون ہو۔ اور عورت کو بوجہ حرم کے جلا وطن
کرنے کے متعلق دو قول ہیں۔ المنہاج میں ہے اصح قول کے مطابق عورت کو اکٹیلے جلا وطن نہیں کیا جائے گا بلکہ خاندان یا حرم شخص کے
ساتھ اسے جلا وطن کیا جائے گا۔ اگرچہ انہیں اجرت بھی دینی پڑے اور ایک قول کے مطابق اجرت عورت پر ہوگی اور دوسرے قول کے

2- مصنف ابن ابی شیبہ جلد 5 صفحہ 530 (دار التاج)

1- المنہاج الاکرام القرآن جلد 6 صفحہ 160 (الازہریہ)

3- مصنف عبدالرزاق جلد 7 صفحہ 369 (مکتب الاسلامی)

مطابق اجرت بیت المال سے ادا کی جائے گی اور اگر وہ مجرم اجرت کی ادائیگی کے باوجود بھی انکار کرے تو ایک قول کے مطابق حاکم اسے ساتھ جانے پر مجبور کرے گا۔ اور المسماح میں ہے کہ صحیح قول کے مطابق حاکم مجرم شخص کو عورت کے ساتھ جانے پر مجبور نہیں کرے گا۔ امام مالک فرماتے ہیں بدکار مرد کو جلا وطن کرنا واجب ہے، بدکار عورت کو جلا وطن کرنا واجب نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے قول کی صحت پر دلیل عبادہ بن الصامت کی حدیث کو بنایا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا بدکارہ عورتوں کا حکم بن لو بدکارہ عورتوں کے متعلق حکم بن لو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ایک حکم بیان فرمایا ہے۔ غیر شادی شدہ کو سو کوڑے اور ایک سال کے لئے جلا وطن کیا جائے اور شادی شدہ کو سو کوڑے اور رجم کیا جائے (۱)۔ یہ حدیث پاک سورہ نساء میں قَامِسِلْكُوْهُنَّ فِي الْبَيْتُوْتِ حَتّٰى يَتَوَقَّهِنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِهِنَّ سَبِيْلًا کی تفسیر میں بیان ہو چکی ہے۔ امام شافعی دوسری دلیل میں زید بن خالد کی حدیث پیش کرتے ہیں زید بن خالد فرماتے ہیں میں نے غیر شادی شدہ زانی شخص کے متعلق حضور ﷺ کو یہ ارشاد فرماتا سنا ہے کہ اسے سو کوڑے مارے جائیں اور ایک سال کے لئے جلا وطن کیا جائے۔ اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے (۲)۔

صحیحین میں زید بن خالد اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث مروی ہے کہ وہ شخص رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں ایک جھگڑا لے کر آئے۔ ایک نے عرض کی حضور ﷺ! آپ ہمارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ فرمائیں اور مجھے مسئلہ کی نوعیت عرض کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم جھگڑے کی نوعیت بیان کرو۔ اس شخص نے عرض کی حضور میرا الزکا اس شخص کے ہاں ملازم تھا اس نے اس شخص کی بیوی سے بدکاری کی ہے۔ علماء نے مجھے بتایا کہ میرے بیٹے پر رجم (سنگار کرنا) ہے۔ پھر میں نے بطور فدیہ سو بکریاں اور ایک لونڈی دی۔ پھر جب میں نے اہل علم سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ میرے بیٹے پر سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی ہے اور رجم اس کی عورت پر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے میں تمہارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا تمہاری بکریاں اور تمہاری لونڈی تمہیں واپس کی جائیں گی اور تیرے بیٹے پر سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی ہے۔ اور فرمایا ہے انیس تم اس شخص کی عورت کے پاس جاؤ اگر وہ جرم کا اعتراف کرے تو اسے رجم کرو۔ اس عورت سے جب پوچھا گیا تو اس نے اعتراف جرم کر لیا تو اس نے اسے رجم کر دیا (۳)۔ امام مالک فرماتے ہیں حضور ﷺ کا ارشاد "الْبِكْرُ بِالْبِكْرِ جَلْدٌ مِائَةً وَتَغْرِيْبٌ عَامٌ" (غیر شادی شدہ مرد غیر شادی شدہ عورت سے بدکاری کرے تو ہر ایک پر سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی ہے) عورتوں کو شامل نہیں ہے۔ اس لئے جلا وطنی کا حکم عورتوں کے لئے ثابت نہ ہوگا لیکن امام مالک کا یہ کہنا درست نہیں، کیونکہ حدیث کا سیاق بالکل واضح دلالت کر رہا ہے کہ یہ حکم عورتوں کے متعلق ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے۔ خُلُوْا عَنِّيْ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِهِنَّ سَبِيْلًا۔ اس حدیث میں جن ضمیر مراد عورتوں کے لئے ہے۔ اور بکر کے لفظ میں عورت کیسے شامل نہیں ہو سکتی جبکہ خود رسول اللہ ﷺ نے اس لفظ کو عورت کے لئے استعمال فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اَلْبِكْرُ نُسْتَأْذِنُ، غیر شادی شدہ (کنواری) عورت سے نکاح کی اجازت طلب کی جائے گی۔ حضرت زید کی حدیث میں مِنْ مِّنْ ذُنٰى (جس نے بھی بدکاری کی) کا لفظ عام ہے مگر نمونہ دونوں کو شامل ہے۔ لیکن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی صحیح دلیل حضور ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ عورت مجرم شخص کے بغیر سزا نہ کرے (۴)۔ اس حدیث کو امام بخاری، مسلم، امام احمد اور ابوداؤد نے ابن عمر

سے روایت کیا ہے۔ صحیحین میں اور امام احمد نے ابن عباس سے بھی روایت کیا ہے۔ ابو داؤد اور حاکم نے السنن رک میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اسی طرح روایت کی ہے، اسی وجہ سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے جلاوطنی کا حکم مردوں کے ساتھ خاص کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں عورت کیلئے جلاوطنی کا حکم نہیں ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جلاوطنی کے لئے محرم شخص کے ساتھ ہونے کو شرط قرار دیتے ہیں۔

امام طحاوی فرماتے ہیں جب بغیر محرم کے سفر کرنے کی نئی کی وجہ سے عورتوں سے جلاوطنی کی سزا باطل ہوگئی تو مردوں سے بھی سزا منسوخ ہوگئی۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حد میں جلاوطنی کی سزا کے نہ ہونے پر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی لوطی بدکاری کی مرتکب ہو اور اس کی بدکاری ثابت ہو جائے تو اسے بطور حد کوڑے لگائے اور مزید اس پر زجر و توبیح نہ کرے۔ پھر اگر وہ بارہ زنا کا ارتکاب کرے تو دو بارہ اسے کوڑے لگائے اور اس پر چھ زجر و توبیح نہ کرے۔ پھر اگر وہ تیسری مرتبہ بے حیائی کا ارتکاب کرے اور اس کی بے حیائی ثابت ہو جائے تو مالک اسے چھ دفعہ خواہ بالوں سے بنی ہوئی رسی کے بدلے سچ دے (۱) یہ حدیث بخاری اور مسلم دونوں نے روایت کی ہے۔ امام طحاوی فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے بدکاری کے ارتکاب کے بعد بیچنے کا حکم فرمایا ہے اور یہ حال ہے کہ آپ ﷺ اس چیز کے بیچنے کا حکم فرمائیں جس کو مشتری بائع سے حاصل کرنے پر قادر ہی نہ ہو۔ پس لوطیوں کی جلاوطنی کا حکم زنا کے ارتکاب کے بعد ثابت نہ ہوا۔ اور جب لوطیوں کی جلاوطنی کا حکم باطل ہو گیا تو آزاد عورتوں کی جلاوطنی کا حکم بھی اللہ تعالیٰ کے ارشاد **فَعَلَيْهِمْ نَصْفٌ مِّمَّا كَسَبُوا** سے ثابت ہے۔ (تو ان پر سزا کا نصف ہے جو آزاد عورتوں کے لئے ہے) سے باطل ہو گیا۔ پھر جب آزاد عورتوں کی جلاوطنی کا حکم باطل ہو گیا تو مردوں کی جلاوطنی کا حکم بھی باطل ہو گیا۔ لیکن یہ قول صحت پر مبنی نہیں ہے کیونکہ مطلقاً عورتوں کی جلاوطنی کی نفی سے یا لوطیوں کے متعلق نصوص میں تعارض کی وجہ سے جلاوطنی کی نفی سے مردوں کے حق میں اس حکم کا ساقط ہونا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ مردوں کے متعلق نصوص میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

بعض حنفی فقہاء فرماتے ہیں جلاوطنی والی حدیث پر اس لئے عمل نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس سے کتاب اللہ پر زیادتی لازم آتی ہے اور زیادتی سچ کے حکم میں ہوتی ہے اور خبر واحد کے ساتھ کتاب اللہ کا سنج جاؤ نہیں ہے، لیکن بعض فقہاء حنفیہ کا یہ استدلال مردود ہے کیونکہ کتاب اللہ پر وہ زیادتی سچ کے حکم میں ہوتی ہے جو رکن یا شرط یا ماسورہ میں وصف کی زیادتی ہو۔ حتیٰ کہ اس کے بغیر وہ ماسورہ پایا ہی نہ جائے۔ جیسے ارکان نماز میں فاتحہ کی تعیین، کفارہ کے غلام میں صفت ایمان روزہ میں متابع اور طواف میں طہارت ہے۔ اس قسم کی زیادتی کتاب اللہ پر ممنوع ہے لیکن مطلقاً زیادتی ممنوع نہیں ہے۔ اگر مطلقاً زیادتی ممنوع ہو تو پھر اکثر احادیث طیبہ بے معنی ہو کر رہ جائیں گی۔ مثلاً جس عورت کا خاندان فوت ہو چکا ہو اس کی عدت نص قرآنی سے ثابت ہے جبکہ اس کا سوگ ماننا "تزیب و زینت نہ کرنا حدیث پاک سے ثابت ہے اور عدت میں سوگ ماننا شرط نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اگر وہ چار ماہوں دن عدت گزارتی ہے اور زیب و زینت کو ترک نہیں کرتی اور سوگ نہیں مانتی تو وہ واجب کے ترک کی وجہ سے گنہگار ہوگی لیکن اس کی عدت گزار جانے کی اور اس کے ساتھ اس مدت کے بعد کاح کرنا حلال ہوگا۔ اسی طرح امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں سورہ فاتحہ کی تعیین سورہ کا کلاما وغیر ہما نماز کے

واجبات میں سے ہیں۔ امام صاحب ان کے متعلق وجوب کا قول فرماتے ہیں۔ انکو نماز کا رکن نہیں کہتے اور حد میں جلا وطنی کی زیادتی سو کوڑوں کی سزا کے لئے رکن نہیں ہے جسکے بغیر وہ حد پائی ہی نہ جائے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب فرماتے ہیں آیت کریمہ جلا وطنی کے حکم کے متعلق خاموش ہے آیت کریمہ میں کوئی ایسا اشارہ بھی نہیں ہے جو جلا وطنی کے حکم کے متافی ہو تاکہ ان میں ایک دوسرے کے لئے نسخ مقبول (۱) یا نسخ مردود ہو جائے۔ احناف میں سے متحققین علماء فرماتے ہیں فاجلدوا کا ارشاد سیویو کے قول کے مطابق الوضیہ والوضی کے ارشاد میں جو حکم ہے اس کا بیان ہے اور مذکور حکم عمل ہے ورنہ اس سے جہالت ثابت ہوگی کیونکہ اس سے یہ مفہوم ملتا ہے کہ حکم مکمل ہے لیکن حقیقت میں مفہوم مکمل نہیں ہے۔ پس ایسے بیان سے تو ترک بیان بہتر ہے، کیونکہ یہ جمل مرکب میں ڈالتا ہے اور مرد کے قول کے مطابق فاجلدوا بشرط کی جزاء ہے جس کا مفاد یہ ہوتا ہے کہ صرف یہی حکم مرتب ہے۔ اگر کوئی دوسری چیز بھی اس کے ساتھ ثابت ہو تو وہ پہلے حکم کے معارض ہوگی نہ کہ اس چیز کو ثابت کرنے والی ہوگی جس کا پہلے حکم میں کوئی ذکر نہیں ہے اور یہ زیادتی ممنوع ہے۔ اس پر ایک اعتراض یہ وارد کیا گیا ہے کہ یہ حدیث مشہور ہے جسے علماء امت نے قبول کیا ہے۔ اس لئے اس کے ساتھ کتاب اللہ کا نسخ جائز ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اگر تلقی بالتقول سے مراد اس حدیث پر عمل کرنے پر علماء کا اجماع ہے تو یہ بھی درست نہیں ہے۔ کیونکہ اختلاف علماء ظاہر ہے اور اگر تلقی بالتقول سے مراد اس حدیث کی سند کی صحت پر علماء کا اجماع ہے تو اس طرح پھر بہت سی اخبار احاد کی صحت پر اجماع ہے۔ علماء کا ان کی اسناد پر صحت کے لیے اجماع کرنا بھی انہیں اخبار احاد ہونے سے خارج نہیں کرتا۔

اگر یہ لیا جائے کہ آیت کریمہ قطعی السند ہے لیکن لفظی اللہ اللہ ہے کیونکہ آیت کریمہ کا حکم عام ہے اور پھر اس سے بعض افراد کو خاص کیا گیا ہے اور خصوصاً افراد مرد ہونے پر علماء کا اجماع ہے، کیونکہ کوڑوں کی سزا کا حکم آزاد مردوں اور آزاد عورتوں کے ساتھ خاص ہے غلام اور لونڈیاں اس حکم میں شامل نہیں ہیں۔ نیز اکثر علماء کے نزدیک یہ حکم شادی شدہ آزاد مسلمان کے ساتھ مختص ہے۔ اسی طرح صرف کوڑوں کی سزا کے حکم پر آیت کی دلالت ظنی ہے اور اجتہاد سے مستنبط ہے حتیٰ کہ اکثر فقہاء اور اہل عرب نے اس حکم کو مستنبط نہیں کیا۔ اور حدیث ظنی السند اور قطعی اللہ اللہ ہے پس آیت اور حدیث حکم میں مساوی ہو گئیں۔ پس خبر واحد کا کتاب کے حکم کے لئے ناخ ہونا جائز ہے پس ایسی خبر واحد کے ساتھ کتاب اللہ پر زیادتی کرنا جائز بلکہ اولیٰ ہے۔

ہم اس اعتراض کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ اگر آیت اور حدیث کو مساوی تسلیم کر بھی لیا جائے تو پھر بھی حضرت عبادہ کی حدیث کا سیاق دلالت کرتا ہے کہ یہ پہلا حکم ہے جو حضور ﷺ نے بدکار کنوارے مردوں اور کنواری عورتوں کے متعلق ارشاد فرمایا تھا، کیونکہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: حَلْدُوا عَنِّي قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لَهُنَّ سَبِيلًا الْبُكْرُ بِالْبُكْرِ حَلْدٌ مَانَةٌ وَتَغْرِيثٌ غَامٌ وَالسَّبَبُ بِالسَّبَبِ حَلْدٌ مَانَةٌ وَالرَّجْمُ۔ (مجھ سے یہ حکم لے لو اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کے متعلق حکم فرمادیا ہے غیر شادی شدہ مرد عورت بدکاری کریں تو ہر ایک کو سو سو کوڑے اور ایک سال جلا وطنی ہے اور شادی شدہ مرد عورت بدکاری کریں تو سو کوڑے اور ہر جمعہ ہے (۱)۔

پس آیت کریمہ حدیث کے معارض ہونے کی وجہ سے ناخ ہوگی منسوخ نہ ہوگی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں شبیہ (شادی شدہ عورت) کے حق میں کوڑوں کی سزا منسوخ ہے۔ پس اس آیت کریمہ کی وجہ سے باکرہ کے حق میں بھی جلا وطنی کے منسوخ ہونے

۱۔ شرح صحابی الآثار، جلد ۲، صفحہ ۷۸ (امدادیہ)

(۱) نسخ مقبول وہ ہوتا ہے جب کتاب کا نسخ سنت متواترہ سے ہو اور نسخ مردود ہوتا ہے جو کتاب کا نسخ اخبار احاد کے ساتھ ہو۔

میں کوئی مانع نہیں ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں ذہیرہ واحادیث میں کوئی ایسی حدیث نہیں ہے جو اس بات پر دلالت کرے کہ جلاوطنی کے وجہ کا حکم حد کے طریق پر واجب ہے کیونکہ اس میں زیادہ سے زیادہ اَلْبُكْرُ بِالْبُكْرِ جِلْدُ مَانِيَةٍ وَتَعْرِيفُ عَامٍ کا قول دلالت کر رہا ہے۔ اور وہ واجب کا واجب پر عطف ہے اور یہ اس بات کا مختصی نہیں ہے بلکہ بخاری شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول کہ رسول اللہ ﷺ نے غیر محسن زانی کے متعلق جلاوطنی اور حد کے قیام کا فیصلہ فرمایا تو یہ قول صراحتاً دلالت کر رہا ہے کہ جلاوطنی حد میں شامل نہیں ہے۔ کیونکہ وہ حد پر معطوف کی گئی ہے۔ پس حد کے سہمی کے جز میں جلاوطنی کا مستعمل ہونا اور پھر دوسرے جز پر اس کا معطوف ہونا دلیل کا موجب نہیں ہے۔ اور جو الفاظ ذکر کئے گئے ہیں وہ جلاوطنی کے حد ہونے کے لئے مفید نہیں ہیں۔ پس ہو سکتا ہے کہ یہ جلاوطنی کسی مصلحت کے لئے ہو۔

فائدہ: امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مقلدین جلاوطنی کو ثابت کرنے والی حدیث کو عقلی اعتبار سے بھی ترجیح دیتے ہیں وہ کہتے ہیں جلاوطنی زنا کا جز سے خارج کر دیتی ہے۔ کیونکہ دوسرے علاقہ میں انسان کی جان بچان کم ہوتی ہے تو بدکاری کے مواقع بھی میسر نہیں آتے۔ احناف اس کے جواب میں یہ فرماتے ہیں کہ جلاوطنی سے بدکاری کا دروازہ کھل جاتا ہے کیونکہ جلاوطن شخص اپنے خاندان اور معاشرہ سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ اور جن لوگوں کے اسے حیا محسوس ہوتی ہے ان سے دور ہو جاتا ہے۔ اُرایسے حالات میں عورت کو شہوت زیادہ ہوتی ہے اور وہ معیشت کی حاجت کی خاطر بدکاری کا ارتکاب زیادہ کرے گی۔ احناف کے مسلک کی تائید عبد الرزاق اور محمد بن اُحس کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں ہمیں امام ابوحنیفہ نے حماد بن ابراہیم النخعی کے سلسلہ سے بتایا کہ عبد اللہ بن مسعود نے فرمایا غیر شادی شدہ مرد غیر شادی شدہ عورت سے بدکاری کرے تو ان میں سے ہر ایک کو کوڑے لگائے جائیں اور دونوں کو ایک سال کیلئے جلاوطن کر دیا جائے اس پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ان دونوں کو جلاوطن کرنا ان کے تہمت میں جلتا ہونے کے لئے کافی ہے (۱) اسی طرح امام محمد نے امام ابوحنیفہ عن حماد بن ابراہیم کے سلسلہ سند سے روایت کیا ہے کہ جلاوطنی تہمت کے لئے کافی ہے۔ حضرت عبد الرزاق نے زہری سے اور انہوں نے سعید بن مسیب سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ربيع بن امیہ بن خلف کو شراب پینے کی وجہ سے خیبر کی طرف جلاوطن کر دیا تھا تو وہ ہرقل کے ساتھ مل گیا اور نصرانی ہو گیا حضرت عمر کو پتہ چلا تو فرمایا آئندہ کبھی کسی مسلمان کو جلاوطن نہیں کروں گا (۲)

مسئلہ: امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کوڑوں کی حد کے ساتھ امام وقت اگر جلاوطنی میں مصلحت دیکھے تو اس کے لئے جلاوطن کرنا جائز ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ ابو بکر صدیقؓ عمر فاروقؓ اور عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے جو جلاوطنی مروی ہے وہ بھی اسی مصلحت کے تحت تھی۔ نسائی ترمذی حاکم اور دارقطنی نے ابن عمر کی حدیث روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کوڑے لگائے اور جلاوطن کیا۔ ابو بکر نے کوڑے مارے اور جلاوطن کیا۔ حضرت عمر نے سزا دی اور جلاوطن کیا (۳)۔ ابن القطان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور دارقطنی نے اس کے موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے۔ ابن ابی شیبہ نے ایسی سند کے ساتھ روایت کی ہے جس میں ایک مجہول راوی ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بدکاری کی وجہ سے ایک عورت کو کوڑے لگائے اور پھر اسے خیبر کی طرف بھیج دیا اور پھر اسے جلاوطن کر دیا (۴)۔ تو جلاوطنی صرف زنا کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر برائی اور فساد کے لئے جلاوطن کرنا امام کے لئے جائز ہے جبکہ امام جلاوطنی

2- ایضاً صفحہ 312

4- مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 5، صفحہ 42-541 (دارالمنج)

1- مصنف عبد الرزاق، جلد 7، صفحہ 312 (المکتب الاسلامی)

3- جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 173 (وزارت تعلیم)

میں مصلحت دیکھے۔ امام طحاوی نے اپنی سند کے ساتھ عمرو بن شیبہ عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے اپنے غلام کو بعد اقل کر دیا تھا تو نبی کریم ﷺ نے اس شخص کو سو کوڑے لگائے اور ایک سال کے لئے جلا وطن کر دیا اور اس کو جو مسلمانوں کے طرف سے وظیفہ ملتا تھا وہ بھی آپ نے ختم کر دیا اور اسے ایک غلام آزاد کرنے کا بھی حکم دیا (1)۔ سعید بن مسعود نے روایت کیا ہے کہ عمر بن الخطاب کے پاس ایک شخص لایا گیا جس نے رمضان شریف میں شراب پی تھی آپ نے اسے سو کوڑے لگوائے اور پھر شام کی طرف اسے جلا وطن کر دیا (2)۔ امام ابوہی نے الجحدیات میں اسی روایت کو نقل کیا ہے اور یہ زائد روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب کسی شخص پر ناراض ہوتے تو اسے شام کی طرف بھیج دیتے۔ ہر امام نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ بصرہ کی طرف جلا وطن کرتے تھے۔ عبدالرزاق نے معمر بن ایوب عن نافع کی سند سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فدک کی طرف جلا وطن فرماتے تھے (3) اسی وجہ سے صوفیاء کرام اپنے مریدوں کو دوسرے دور دراز کے علاقوں میں بھیج دیتے تھے جن میں نفس کی قوت زیادہ دیکھتے تھے تاکہ خواہشات نفس ختم ہو جائیں اور نفس نرم ہو جائے۔

میں کہتا ہوں جب قاضی کسی مسلمان کو دیکھے کہ وہ غلبہ شہوت کی وجہ سے گناہوں میں ملوث ہے جبکہ ساتھ ساتھ وہ اپنے افعال پر بد شرمنہ بھی ہے تو قاضی اسے وہاں سے نکل جانے اور سفر کرنے کا حکم دے۔ اور جو اپنے افعال پر بد شرمنہ بھی نہیں ہوتا تو اسے قید کر دینے کی کوئی وجہ نہ ہے۔

مسئلہ: اگر زانی اور زانیہ شادی شدہ ہوں تو انہیں سنگسار کیا جائے گا اور یہ حکم صحابہ کرام اور بعد کے علماء حق کے اجماع سے ثابت ہے لیکن خارجی لوگ رجم (سنگساری) کی سزا کے منکر ہیں۔ کیونکہ وہ صحابہ کرام کے اجماع اور اخبار احادی کی جیت کے انکار ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ رجم کی سزا قرآن حکیم اور نبی کریم ﷺ کی سنت منقرضہ سے ثابت نہیں ہے۔ صرف اخبار احاد سے یہ سزا ثابت ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ رجم نبی کریم ﷺ سے اخبار ستوراہہ بالمعنی کے ساتھ ثابت ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ثابت ہے جیسے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت و شجاعت اور حاتم کی سخاوت ثابت ہے، اگرچہ ان کی تفصیل صورتہ اخبار احاد سے ثابت ہیں۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا اور ان پر کتاب نازل فرمائی اور جو ان پر نازل فرمایا اس میں آیت رجم بھی ہے رسول اللہ ﷺ نے رجم فرمایا اور آپ ﷺ کے بعد ہم نے بھی رجم کیا۔ رجم کتاب اللہ میں اس شخص پر ثابت ہے جو زنا کا ارتکاب کرے، بشرطیکہ وہ شادی شدہ مرد ہو یا عورت ہو جبکہ اس پر شہادت مکمل ہو جائے یا مکمل ہو یا اعتراف جرم پایا جائے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے (4)۔ امام بیہقی نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا اور ان پر اپنی کتاب نازل فرمائی اور جو آپ ﷺ پر نازل ہوا اس میں آیت رجم بھی تھی۔ ہم نے اسے پڑھا اور یاد بھی کیا۔ اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ إِذَا زَانَا فَارْجُمُوهُمَا الْبَيْتَةَ نَكَالًا بَيْنَ اللَّهِ وَاللَّهِ عَزَّوَجَلَّ حِكْمَةً۔ اور رسول اللہ ﷺ نے رجم فرمایا اور آپ ﷺ کے بعد ہم نے بھی رجم کیا (5)۔ (اس حدیث کے آخر میں ہے) اگر مجھے لوگوں کی اس بات کا غدر نہ ہوتا کہ عمر نے کتاب اللہ میں زیادتی کی ہے تو میں اس آیت رجم کو

1- شرح معانی الآثار، جلد 2، صفحہ 78 (امدادیہ) 2- معنی عبدالرزاق، جلد 7، صفحہ 382 (الکتب الاسلامیہ) 3- ایضاً، صفحہ 315

4- صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 65 (قدیمی) 5- سنن کبریٰ بیہقی، جلد 8، صفحہ 211 (المنیر)

صحیف کے حاشیہ پر لکھ دیتا۔ حضرت ابو داؤد نے بھی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خطبہ نقل کیا ہے۔ اس میں ہے کہ مجھے لوگوں پر طویل زمانہ گزرنے کی وجہ سے یہ خوف ہے کہ کہیں کوئی یہ نہ کہتا پھرے کہ ہم تو اللہ کی کتاب میں آیت رجم کو نہیں دیکھتے (1)۔ ترمذی کی روایت میں اس طرح ہے اگر مجھے کتاب اللہ میں زیادتی کرنا پسند نہ ہوتا تو میں اس آیت رجم کو صحیف میں لکھ دیتا کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ ایسے لوگ بھی آئیں گے جو کتاب اللہ میں اس آیت رجم کو نہ پائیں گے تو وہ اس کا انکار کر دیں گے (2)۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ خطبہ صحابہ کرام کی موجودگی میں تھا اور کسی نے بھی آپ پر اعتراض نہیں کیا۔ حضرت ابی امامہ بن سہل اپنی خالد النجماء سے ان الفاظ میں یہ آیت رجم روایت کرتے ہیں "الشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ إِذَا زَانَا فَازْجُمُوهُمَا بِمَا قَضَيْتُمَا مِنَ اللَّدْنَةِ" اس حدیث کو حاکم الطبرانی نے روایت کیا ہے (3) اور ابن حبان کی صحیح میں حدیث ہے کہ سورہ احزاب سورہ بقرہ کی طرح سچی اور اس میں آیت رجم الشیخ والشیخہ الخ بھی سچی۔ صحیحین میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی مسلمان مرد کا خون (بہانا) حلال نہیں ہے جو لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی گواہی دیتا ہو۔ مگر تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت پائی جائے تو پھر مسلمان کا خون بہانا حلال ہوتا ہے۔ 1۔ اگر کوئی انسان دوسرے انسان کو قتل کر دے۔ 2۔ شادی شدہ زنا کار۔ 3۔ دین سے نکل جانے والا جماعت کو چھوڑنے والا۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم نے نقل کی ہے (4)۔

حضرت ابی امامہ بن سہل بن حنیف سے مروی ہے کہ عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے خاصہ کے دن لوگوں سے فرمایا، قسم بخدا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی مسلمان کا خون (بہانا) حلال نہیں ہے مگر تین صورتوں میں سے کسی ایک صورت کے پائے جانے کے وقت مسلمان کا خون بہانا حلال ہوتا ہے۔

1۔ شادی شدہ مسلمان زنا کار تکاب کرے۔ 2۔ اسلام قبول کرنے کے بعد مرتد ہو جائے۔ 3۔ بغیر حق شرع کے جو کسی کو قتل کر دے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا؟ قسم بخدا میں نے نہ جاہلیت میں اور نہ زمانہ اسلام میں زنا کیا ہے اور جب سے میں نے رسول اللہ ﷺ کے دست اقدس پر بیعت کی ہے کبھی مرتد نہیں ہوا اور نہ میں نے کسی ایسے شخص کو قتل کیا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے (جب میرا خون بہانے کی کوئی بھی وجہ ہوا نہیں ہے) تو تم مجھے کیوں قتل کرتے ہو (5)۔ اس حدیث کو ترمذی نسائی ابن ماجہ داری نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کو امام شافعی نے اپنی مسند میں اور بزار اور حاکم نے بھی روایت کیا ہے حاکم فرماتے ہیں یہ حدیث شریفین کی شرط پر صحیح ہے۔ بیہقی اور ابو داؤد نے بھی روایت کی ہے۔ بخاری نے ابو قتادہ کے ذریعے حضور ﷺ کا اصل روایت کیا ہے حضرت ابو قتادہ کہتے ہیں قسم بخدا رسول اللہ ﷺ نے کسی شخص کو کبھی قتل نہیں کیا۔ مگر تین وجوہات کی بناء پر آپ نے قتل کیا۔ 1۔ اس شخص کو جس نے کسی کو قتل کیا۔ 2۔ وہ شخص جس نے شادی کرنے کے بعد زنی کیا۔ 3۔ وہ شخص جس نے اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کی اور اسلام سے مرتد ہو گیا (6)۔

حضور نبی کریم ﷺ سے صحیح حدیث مروی ہے کہ آپ ﷺ نے مازن بن مالک کو رجم کیا جب انہوں نے زنا کا اعتراف کیا تھا۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے امام ترمذی ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے

2- جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 172 (وزارت تعلیم)

1- سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 256 (وزارت تعلیم)

4- صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1016 (وزارت تعلیم)

3- صحیح کبیر طبرانی، جلد 24، صفحہ 350 (الاحزاب الاسلاوی)

6- صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1019 (وزارت تعلیم)

5- جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 38 (وزارت تعلیم)

روایت کیا ہے۔ صحیحین میں ابو ہریرہ ابن عباسؓ جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور ایک جہول راوی سے مروی ہے۔ مسلم نے حضرت بریدہ سے روایت کی ہے۔ راوی فرماتے ہیں ماہز بن مالک، نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ! مجھے پاک فرمائیے (۱) رسول اللہ ﷺ نے خاند یہ عورت کو رجم کیا تھا اس نے عرض کی تھی یا رسول اللہ ﷺ میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں زنا سے حاملہ ہوں تو آپ ﷺ نے وضع حمل کے بعد رجم (سنگسار) فرمایا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے اسے اس وقت رجم فرمایا جب اس کا بچہ خوراک کھانے لگ گیا تھا۔ اس حدیث کو مسلم نے حضرت بریدہ سے روایت کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے جبینہ کی ایک عورت کو رجم کیا تھا جب اس نے زنا کا اعتراف کیا تھا۔ اس حدیث کو امام مسلم نے عمران بن حصین سے روایت کیا ہے۔

فتنہا اور محدثین فرماتے ہیں رجم کے متعلق خلفاء راشدین کا عمل حد تو اترا تو پہنچا ہوا ہے۔

مسئلہ: اگر زنا کرنے والوں میں سے ایک محسن اور دوسرا غیر محسن ہو تو محسن (شادی شدہ) کو رجم کیا جائے گا اور غیر شادی شدہ کوڑے لگائے جائیں گے، ویسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کے متعلق فیصلہ فرمایا تھا جو دوسرے شخص کے پاس ملازم تھا اور اس کی بیوی سے زنا کیا تھا۔ یہ حدیث گزرجلی ہے۔

مسئلہ: کیا شادی شدہ زانی کو رجم سے پہلے کوڑے لگائے جائیں گے یا نہیں۔ امام احمد فرماتے ہیں آیت کے حکم کے مطابق پہلے اسے کوڑے لگائے جائیں گے پھر اسے رجم کیا جائے گا۔ امام احمد کے نزدیک آیت کریمہ غیر محسن کے ساتھ خاص بھی نہیں ہے اور منسوخ بھی نہیں ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں کوڑوں کی سزا مکمل حد نہیں بلکہ حد کا ایک جز ہے۔ امام احمد غیر محسن شخص کے لئے کوڑوں کی سزا کے ساتھ حدیث نبویہ کے ذریعے ایک سال کی جلا وطنی کو ملاتے ہیں۔ اور محسن (شادی شدہ) میں رجم کو ساتھ ملاتے ہیں۔ جس طرح جلا وطنی کی حد آیت کریمہ کے مزاجم نہیں ہے اسی طرح رجم کی حدیث بھی آیت کے مزاجم نہیں ہے۔ حدیث اترتا ہے تو دونوں پر عمل کرنا واجب ہے اور ہمارے قول کی تائید عبادہ بن الصامت کی حدیث سے ہوتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ غیر شادی شدہ مرد کا غیر شادی شدہ عورت سے بدکاری کرنے کی صورت میں ہر ایک کو سو کوڑے لگائے جائیں گے اور ہر ایک کو ایک سال جلا وطن کیا جائے گا اور شادی شدہ مرد شادی شدہ عورت سے بدکاری کرے تو ہر ایک کو سو کوڑے اور رجم کیا جائے گا (۲)۔

حضرت سلمہ بن اخیق سے بھی اسی طرح حدیث مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھ سے (بدکاری کرنے والی عورتوں کے متعلق احکام) لے لو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ایک حکم مقرر فرمایا ہے۔ غیر شادی شدہ مرد غیر شادی شدہ سے بدکاری کرے تو ہر ایک پر سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی ہے اور شادی شدہ مرد شادی شدہ عورت سے بدکاری کرے تو سو کوڑے اور رجم ہے (۳)۔

اس مسلک کی تائید علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن ابی طالب کے اثر سے بھی ہوتی ہے جسے امام احمد، حاکم اور نسائی نے امام شعبی سے روایت فرمایا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سمراتہ الہمدانیہ کو کوڑوں میں کوڑے لگائے اور پھر اسے رجم کیا۔ جمعرات کو اسے کوڑے لگائے اور جمعہ کے روز اسے رجم کیا اور فرمایا میں کتاب کے مطابق اسے کوڑے لگا تا ہوں اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق اسے رجم کرتا ہوں۔ اس اثر کی اصل بخاری میں ہے لیکن وہاں عورت کا نام ذکر نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ غیر شادی شدہ شخص کے ساتھ خاص ہے یا شادی شدہ کے حق میں منسوخ ہے۔ اسی طرح عبادہ بن الصامت اور سلمہ بن اخیق کی حدیث کا بھی یہی حکم ہے اور اس آیت کریمہ کے محسن شخص کے حق میں منسوخ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے معاذ بن عفراءؓ اور انجینہ کو رجم فرمایا تھا اور یہ واقعات مختلف اور کثیر طرق و اسانید سے مروی ہیں اور کسی طریق سے یہ ثابت نہیں ہے کہ پہلے آپ ﷺ نے کوڑے مارے ہوں اور پھر رجم فرمایا ہو۔ زید اور خالد کی حدیث کثیرہ راجحہ ہے جس میں دو آدمیوں کا واقعہ ذکر ہے کہ وہ دونوں جھگڑتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے ان میں سے ایک کا بیٹا دوسرے شخص کے پاس ملازم تھا اس ملازم نے دوسرے شخص (مستاجر) کی بیوی سے بدکاری کی تو رسول اللہ ﷺ نے ملازم کے پرکڑوں اور جلا وطنی کا فیصلہ فرمایا اور ارشاد فرمایا اے انیس اس شخص کی بیوی کے پاس جاؤ اگر وہ اعتراف کرے تو اسے رجم کرو۔ آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ پہلے اسکو کوڑے لگاؤ اور پھر رجم کرو۔

ناخ یا تو وہی غیر تلو ہے یا ایسی وہی ہے جو منسوخ الصلاۃ ہے۔ یعنی الشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ إِذَا فَازَ جُمُوعًا هُنَا۔ یہ آیت منسوخ الصلاۃ ہے اور اس کا ناخ ہونا مشہور نہیں ہو سکتا۔ مگر اسی صورت میں جس کو شیخی محققین نے ثابت کیا ہے۔ یعنی اس آیت میں مذکور حکم تمام کا تمام واجب ہے اور الزانیۃ و الزانی فاجلدوا اگر ارشاد اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کوڑے بھی واجب ہیں اور الشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ إِذَا فَازَ جُمُوعًا ہاں آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ رجم بھی واجب ہے پس دونوں آیات کا حکم متعارض ہو گیا ایک ان میں سے دوسرے کے لئے ضرور ناخ ہوگی۔ اگر یہ نہ سمجھا جائے کہ دونوں آیتوں کا پورا حکم مذکور واجب ہے تو نہ تعارض ہوگا اور نہ رجم اور کوڑوں کو جمع کرنا واجب ہوگا جیسا کہ امام احمد کا قول ہے۔

ربا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اثر کا معاملہ تو اس کے مقابلہ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اثر ہے۔ پس یہ اجتہادی امر ہے جیسا کہ امام احمد کا قول ہے۔ امام عطاء نے اپنی سند سے ابی واقد اللہی سے روایت کیا ہے کہ ایک صحابی رسول فرماتے ہیں ہم جاہلیہ کے مقام پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تھے کہ ایک شخص آیا اور کہا اے امیر المؤمنین پھر کی بیوی نے بدکاری کی ہے اور وہ اس اپنے جرم کا اعتراف بھی کرتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے اس عورت کی طرف ایک گروہ کے ساتھ بھیجا۔ ہم نے اس سے اس فعل کے متعلق پوچھا اور میں نے اسے اس کے خاندانی رپورٹ کے متعلق بتایا تو اس نے اپنے خاندانی تصدیق کی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب ہم نے وہاں آکر اس کی تصدیق کی شہادت دی تو حضرت عمر نے اسے رجم کرنے کا حکم فرمایا (بجگہ صحابہ کرام بھی موجود تھے) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رجم سے پہلے اسے کوڑے نہیں مارے۔ میں کہتا ہوں شاید حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سراج ہمدانی کو اس وقت کوڑے لگائے تھے جب اس کے محض ہونے کا ثبوت نہیں ہوا تھا پھر محض ہونے کے ثبوت کے بعد آپ نے اسے سنگسار کیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ارشاد اَجْلِدُوهَا لِكِتَابِ اللّٰهِ وَازْجُمُوعَهَا بِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ کا مطلب یہ ہے کہ کوڑے غیر محسن کے حق میں قرآن سے ثابت ہیں اور رجم محسن کے حق میں سنت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ثابت ہے۔ جب اس کا محسن ہونا ثابت ہو گیا تو میں نے اسے رجم کر دیا۔ حضور نبی کریم ﷺ سے اسی طرح مروی ہے۔

امام عطاء نے اپنی سند کے ساتھ حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے زنا کیا تو نبی کریم ﷺ نے اس کو کوڑے لگانے کا حکم دیا پھر جب یہ چلا کہ یہ محسن ہے تو آپ ﷺ نے اسکو سنگسار کرنے کا حکم دیا (2)۔

فائدہ: احسان کا لفظ قرآن میں کئی معانی میں استعمال ہوا ہے۔ 1۔ آزادی۔ 2۔ نکاح کرنا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْمُحْسِنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ اُولٰٓئِهِنَّ كَلِمَةٌ سَيِّئَةٌ مِمَّا قَالُوْنَ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْنَ لَهُنَّ مِنْ حُرْمٰتِ اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۰﴾ فَاُوْا حُرْمٰتِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۱﴾ اس ارشاد میں احسن سے مراد شادی شدہ اور محسنات سے مراد آزاد عورتیں ہیں۔ اسی طرح احسان کا معنی عفت بھی ہے۔ ارشاد الہی ہے: وَالْمُحْسِنٰتُ مِنَ النِّسَاءِ مِثْلُ الَّذِيْنَ لَهُنَّ مِنْ حُرْمٰتِ اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۰﴾ اس طرح ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقٰنًا ۙ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۰﴾ اور زانیہ اور زانی کی سزا رجم کے لئے جو احسان شرط ہے اس سے مراد نکاح صحیح کے ساتھ دخول ہے کیونکہ نکاح کا شرط یہی ہے۔ اس حکم میں احسان کا یہی معنی مراد ہونے پر نبی کریم ﷺ کے الفاظ بھی دلیل ہیں کہ احسن سے مراد شادی شدہ ہے اور غیر احسن سے مراد غیر شادی شدہ ہے۔

علماء کرام نے رجم کی سزا کے لئے احسان کی شرائط بیان کی ہیں۔ 1۔ آزاد ہونا۔ 2۔ عقلمند ہونا۔ 3۔ بالغ ہونا۔ 4۔ نکاح صحیح کا کیا ہوا ہونا۔ 5۔ بیوی کے ساتھ دخول کیا ہونا۔ یہ پانچ شرائط رجم کی سزا کے لئے متفق علیہا ہیں۔ لیکن عاقل اور بالغ ہونا سزا کی اہلیت کے لئے شرط ہیں بلکہ مطلقاً خطاب کی اہلیت کے لئے شرط ہیں۔ اس لئے رجم کے احسان میں ان کے ذکر کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ آزاد ہونا مطلقاً حد تکمیل کے لئے شرط ہے۔ خاص رجم کے لئے شرط نہیں ہے۔ حتیٰ کہ غلام کو سوزے لگائے جاتے ہیں۔ پس صرف نکاح صحیح کے ساتھ دخول کا اعتبار باقی رہ جاتا ہے۔ امام ابو یوسف امام مالک اور امام محمد نے احسان الرجم میں اسلام کی بھی شرط لگائی ہے جبکہ امام شافعی امام ابو یوسف اور امام احمد کا قول اس کے خلاف ہے۔ احناف نے اسلام کی جو شرط لگائی ہے اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: مَنْ اَشْرَكَ بِاللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُحْسِنٍ۔ (کہ جس نے اللہ کے ساتھ شریک کیا وہ محسن نہیں ہے) (1) اس حدیث کو اہل حق بن رازوی نے اپنی مسند میں اس سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ثناء عبدالعزیز بن محمد ثناء عبدالعزیز بن مہاجر عمن ابن عمر۔ حضرت اہل حق فرماتے ہیں ابن عمر نے اس حدیث کو ایک مرتبہ مرفوع اور ایک مرتبہ موقوف بیان کیا ہے۔ ابن جوزی لکھتے ہیں اہل حق کے علاوہ اس حدیث کو کسی نے مرفوع روایت نہیں کیا۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اہل حق نے اپنے قول سے رجوع کر لیا تھا اور درست موقوف ہی ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں اس قسم کی حدیث پر سند کی صحت کے بعد مرفوع کا حکم لگایا جاتا ہے کیونکہ راوی اسی کے مطابق فتویٰ دیتا ہے جیسے فعل واقع ہو چکا ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں جب اہل حق نے مرفوع کے قول سے رجوع کر لیا اور اپنی خطا کا اعتراف کر لیا اور کسی دوسرے مجھٹ نے اس کو مرفوع روایت ہی نہیں کیا تو پھر اس پر مرفوع کا حکم کیسے لگایا جائے گا۔ اگر ہم اس حدیث کا مرفوع ہونا تسلیم کر بھی لیں تو پھر بھی حدیث خاص رجم کے احسان پر دلالت نہیں کرتی۔ ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ احسان کا لفظ قرآن میں کئی معانی کے لئے مستعمل ہوا ہے۔ ان معانی میں ایک معنی عفت و پاکدامنی بھی ہے۔ شاید حدیث کا معنی یہ ہے کہ جس نے شریک کیا وہ پاکدامن نہیں ہے۔ اس لئے اس پر تہمت لگانے والے پر حد توقف نہ ہوگی۔ پس اس حدیث سے رجم کے لئے اسلام کی شرط ثابت نہیں ہوتی، جبکہ الشیبہ بالشیبہ کے الفاظ کا عموم اور مؤمن و کافر دونوں کو شامل ہے۔

شیخان نے صحیحین میں ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ یہودی حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں آئے اور عرض کی کہ ہمارے ایک مرد

اور ایک عورت نے زنا کیا ہے (ان کا کیا حکم ہے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم تورات میں رجم کے متعلق کیا پڑھتے ہو انہوں نے کہا ہم ایسے مجرموں کو رسوا کریں اور کوڑے لگائیں۔ عبد اللہ بن سلام نے فرمایا تم نے جھوٹ بولا ہے۔ تورات میں ایسے افراد کا حکم رجم ہے وہ تورات لے کر آئے اسے کھولا پھر ان میں سے ایک نے آیت رجم پر ہاتھ رکھ دیا پھر اس آیت کا ماقبل اور مابعد پڑھا۔ عبد اللہ بن سلام نے فرمایا تو ابنا تھ اٹھا۔ ہاتھ اٹھایا تو نیچے آیت رجم لکھی تھی۔ تمام نے اقرار کیا کہ اسے محمد ﷺ آپ نے کجا کہا ہمیں آیت رجم ہے۔ آپ ﷺ نے ان دونوں بدکاروں کو رجم کرنے کا حکم فرمایا (۱)۔ یہ حدیث امام شافعی امام احمد کی حجت ہے اور صاحب بدایہ نے اس حدیث کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ حکم تورات کا تھا پھر یہ منسوخ ہو گیا۔

میں کہتا ہوں شریعت محمدیہ سے پہلے کی تمام شرائع پر عمل واجب ہے امام ابوحنیفہ کی اصل پر جبکہ ان کا ہماری شریعت میں منسوخ ہونا ظاہر نہ ہو۔ خصوصاً جبکہ ان فعل پر نبی کریم ﷺ نے خود عمل کیا ہو کیونکہ آپ ﷺ کا اس پر عمل کرنا واضح دلیل ہے کہ یہ حکم ہماری شریعت میں بھی باقی ہے۔ اس لئے یہ حال ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی نازل شدہ شریعت کے خلاف منسوخ شدہ حکم کے مطابق فیصلہ صادر فرمائیں۔ آیات اور احادیث میں سے کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جو اس حکم کے منسوخ ہونے پر دلالت کرے کیونکہ الزانی والزانیۃ اور الشیخ والشیخۃ والنیک والنیکی کے الفاظ مومن و کافر دونوں کو شامل ہیں۔ اور من اشرك فلیس بمحصن والی حدیث رجم میں اسلام کی شرط پر دلالت نہیں کرتی بلکہ یہ تقدیر کے احسان پر محمول ہے۔

مسئلہ: امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے رجم کے احسان کی شرائط میں یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ دونوں مرد اور عورت نکاح صحیح کے ساتھ دخول کے وقت آزاد مسلمان عاقل اور بالغ ہوں۔ اسی طرح امام احمد نے اسلام کے سوا باقی تمام شرائط کا قائل کیا ہے۔ حتیٰ کہ اگر آزاد مسلمان عاقل بالغ لوہڑی اپنی یا گھل یا کتا یہ عورت سے نکاح کرتا ہے اور اس کے ساتھ دخول بھی کرتا ہے تو وہ اس دخول کی وجہ سے محسن نہیں ہوگا۔ اگر اس دخول کے بعد وہ زنا کا مرتکب ہوگا تو اسے رجم نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر آزاد نابالغ عاقلہ عورت کسی غلام مجنون یا بچے سے نکاح کرتی ہے اور وہ اس کے ساتھ دخول کرتا ہے تو وہ عورت محسنہ شمار نہ ہوگی۔ ایسے دخول کے بعد اگر وہ بدکاری کرتی ہے تو اسے رجم نہیں کیا جائے گا۔ اگر مسلمان کسی ذمیہ عورت سے نکاح کرتا ہے پھر وہ دخول کے بعد مسلمان ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے اسلام قبول کرنے کے بعد مسلمان خاندان نے اس کے ساتھ دخول نہیں کیا تھا کہ اس عورت نے بدکاری کی تو اسے بھی رجم نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر ایسی لوہڑی دخول کے بعد آزاد ہو گئی جو کسی آزاد مسلمان عاقل بالغ کے نکاح میں تھی اس کے آزاد ہونے کے بعد مسلمان خاندان نے اس کے ساتھ آزاد ہونے کے بعد دخول نہیں کیا تھا کہ اس نے زنا کا ارتکاب کیا تو اسے رجم نہیں کیا جائے گا۔

احناف کی دلیل دارقطنی کی روایت ہے جو اس سند سے مروی ہے ابن عدی نے بھی روایت کی ہے۔ عن ابی بکر بن عبد اللہ بن ابی مریم عن علی بن ابی طلحہ عن کعب بن مالک۔ حضرت کعب بن مالک نے ایک یہود عورت یا نصرانی عورت سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا تو نبی کریم ﷺ سے مسئلہ دریافت فرمایا۔ آپ ﷺ نے انہیں اس سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا یہ تمہیں محسن نہیں بنائے گی (2)۔ دارقطنی کہتے ہیں ابو بکر بن ابی مریم انتہائی ضعیف راوی ہے اور علی بن ابی طلحہ نے کعب سے ملاقات نہیں کی ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں اس حدیث کو ذیل کی سند سے بھی روایت کیا گیا ہے۔ بقیۃ بن الولید عن عتبہ بن حمیم عن علی بن ابی طلحہ عن

کعب۔ اور یہ سند منقطع ہے۔ میں کہتا ہوں بقیۃ بن الولید بھی ضعیف اور مدلس راوی ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں انقطاع ہمارے نزدیک ارسال میں داخل ہے اور مرسل حدیث ہمارے نزدیک راویوں کی عدالت کے بعد حجت ہے۔

میں کہتا ہوں یہ حدیث صحیحین کی حدیث کے مقابل نہیں ہے جس میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہودیوں اور یہودیہ کو رجم کیا تھا۔ پس صحیحین کی حدیث کے ہوتے ہوئے اس حدیث پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ اور یہ حدیث امام احمد کے لئے بھی دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ انہوں نے احسان کے لئے اسلام کی شرط لگائی ہے۔

امام بیہقی نے ابی وہب عن یونس بن ابن شہاب کے طریق سے روایت کیا ہے کہ ابن شہاب نے عبد الملک سے سنا کہ انہوں نے عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ سے لوٹنے کی کے متعلق پوچھا کہ کیا یہ آزاد کو محسن بناتی ہے انہوں نے فرمایا ہاں۔ پھر انہوں نے پوچھا یہ کس نے کہا ہے؟ عبید اللہ نے کہا ہم نے رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کو یہی فتویٰ دیتے ہوئے پایا ہے (۱) امام بیہقی فرماتے ہیں مجھے محمد بن یحییٰ کے ذریعے یہ خبر پہنچی ہے کہ وہ فرماتے ہیں میں نے اوزاعی سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔

بیہقی نے عبد الرزاق عن مہر بن ابی ہریرہ عن عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ کے طریق سے اس کی مثل روایت کیا ہے۔

مسئلہ: بدکاری کرنے والے مرد اور عورت میں سے ایک محسن اور دوسرا غیر محسن ہو تو ان میں سے جو محسن ہوگا اسے رجم کیا جائے گا اور جو غیر محسن ہوگا اسے کوڑے لگائے جائیں گے اور اس پر اجماع ہے کیونکہ زید بن خالد اور ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث میں ملازم شخص نے جب اپنے مستاجر کی بیوی سے بدکاری کی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تیرے بیٹے پر سو کوڑے اور جلا وطنی کی سزا ہے۔ اور اسے انیس تم عورت کے پاس جاؤ اگر وہ اعتراف جرم کرنے تو اسے رجم کر دو۔ عورت نے اعتراف جرم کر لیا تو اسے رجم کیا گیا۔ (مشفق علیہ)

مسئلہ: اگر بدکاری کرنے والوں میں سے ایک مجنون (پاگل) اور دوسرا عظیمند، ہو تو امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک عاقل پر حد واجب ہوگی۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں اگر مرد عاقل ہو اور عورت پاگل ہو تو صرف مرد پر حد واجب ہوگی۔ لیکن اگر عورت عاقل ہو اور مرد مجنون ہو تو عورت پر حد واجب نہ ہوگی۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں زنا کا فعل مردوں کی طرف سے متحقق ہوتا ہے۔ عورت تو صرف محل زنا ہے اسے زانیہ سے تعبیر کرنا مجازاً ہے۔ پس اس کے حق میں حد زنا کے فعل پر قدرت دینے کی وجہ سے متحقق ہوتی ہے اور یہ اس کا فعل ہے جو اس فعل کی نبی کا مخاطب ہے۔ جمہور ملاما فرماتے ہیں عورت کی جانب سے حد زمرہ کی جانب سے حد کا بالا تمام ساتھ نہیں کرتا۔ اسی طرح مرد کی جانب سے حد عورت کی حد کا ساتھ نہیں کرتا۔ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ زانیہ پر زنا کا اطلاق مجازاً ہے۔ اگر ہم یہ تسلیم بھی کر لیں تو اس کا مجازی معنی زنا پر قدرت دینا بھی اس کے حق میں حد کا موجب ہے اور پھر اور مجنون کے فعل کا زنا نہ ہونے کا قول بھی درست نہیں ہے؟ بلکہ اس کا فعل بھی لغتاً اور شرعاً زنا ہے اور اس پر گناہ کا نہ ہونا اس کے غیر مکلف ہونے کی وجہ سے ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ: شرعاً اور لغتاً زنا کا مطلب یہ ہے کہ مرد عورت سے قبیل میں بغیر ملکیت کے واپس کرے۔ ذہن میں واپس خواہ مشغول بہ مرد ہو یا عورت ہو لغتاً اور شرعاً زنا نہیں ہے۔ ہم نے سورہ نساء کی آیت وَالَّذِينَ يَأْتِيهِمْ فُلُوقُهُمْ فَانكِحُوا ذَٰلِكُمْ حَلَالًا مَّا كَانَتْ مِنْهُ خَلَاءًا كَمَا اختلفا ذکر کیا ہے۔ پس جس نے اپنی بیوی حائضہ روزہ دار احرام باندھنے والی یا لونڈی سے استبراء رحم سے پہلے واپس کی یا مشرک کہ

لوٹوی یا غیر کی منکوہ لوٹوی یا رضاع کی وجہ سے حرام لوٹوی سے دلہی کی تو یہ زمانہ ہوگا اور ملک کے پائے جانے کی وجہ سے حد واجب نہ ہوگی لیکن گناہیگ ہوگا۔ شہد ملک شراعت ملک کے ساتھ ملحق ہے۔ پس شہد ملک کی وجہ سے بھی ائمہ اربعہ اور جمہور علماء کے نزدیک حد ساقط ہو جاتی ہے۔ لیکن ظاہر علماء اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ ائمہ اربعہ اور جمہور علماء کی دلیل نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے اِذْرَءُ وَا الْخُدُوْدُ بِالْشُّبْهَاتِ (یعنی شبہات کی وجہ سے حدود کو دور کرو) (1) مسند ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ میں مفسر عن ابن عباس کے سلسلہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اذروء الحدود بالشبہات سے حدود کو شبہات کی وجہ سے دور کرو۔

امام ترمذی حاکم اور بیہقی نے زہری عن عروہ عن عائشہ کی سند سے اس طرح روایت کیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں سے حدود کو دور کرو۔ جب کسی مسلمان کا حد سے بچنے کا کوئی راستہ ہو تو اسے چھوڑ دو۔ کیونکہ امام کا معافی دینے میں خطا کرنا سزا دینے میں خطا کرنے سے بہتر ہے (2) اس حدیث کی سند میں یزید بن زیاد دہشتی ہے جو ضعیف راوی ہے۔ بخاری نے اسے منکر الحدیث اور امام نسائی نے متروک لکھا ہے۔ کچھ نے اس حدیث کو موقوف روایت کیا ہے اور یہی اصح ہے۔ امام ترمذی نے بھی موقوف صراح کہا ہے فرماتے ہیں یہ حدیث کئی صحابہ سے مروی ہے وہ بھی یہی فرماتے تھے۔ امام بیہقی فرماتے ہیں کئی روایت صواب کے زیادہ قریب ہے اور فرماتے ہیں اس حدیث کو رشیدین نے نقل کی ہے اور انہوں نے زہری سے روایت کیا ہے۔ لیکن رشیدین بھی ضعیف راوی ہے۔ ہم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعاً روایت کی ہے حدود کو شبہات کی وجہ سے دور کرو اور امام کے لئے حدود کو معطل کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس حدیث کی سند میں الخزاز بن نافع ہے جو منکر الحدیث ہے۔ بخاری نے یہی لکھا ہے اس باب میں اصح ترین حدیث یہ ہے سفیان الثوری عن عاصم بن ابی وائل عن عبد اللہ بن مسعود قال اِذْرَءُ وَا الْخُدُوْدُ بِالْشُّبْهَاتِ اِذْفَعُوا الْقَتْلَ عَنِ الْمُسْلِمِيْنَ مَا اسْتَطَعْتُمْ۔ یعنی حدود کو شبہات کی بنا پر دور کرو اور مسلمانوں سے جہاں تک ممکن ہو قتل کو دور کرو (3)۔ اس حدیث کو ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔ اور عقبہ بن عامر اور معاذ سے یہ حدیث موقوف بھی مروی ہے اس کو بھی ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عمر سے منقطع اور موقوف روایت کی ہے۔ ابن حزم نے کتاب الایصال میں صحیح سند کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے موقوف روایت کی ہے۔

ابن ابی شیبہ نے ابراہیم التیمی عن عمر کے سلسلہ سے اس طرح روایت کی ہے کہ شبہات کی وجہ سے حدود کو قائم نہ کرنا میرے نزدیک شبہات کی بنا پر حدود قائم کرنے سے بہتر ہے (4)۔

ظاہر یہ کہتے ہیں حد کے ثبوت کے بعد کسی شبہ کی وجہ سے اسے دور کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ بلکہ صحابہ کرام سے کسی صحیح سند کے ساتھ حدود کو دور کرنے کے متعلق کوئی چیز مروی نہیں ہے۔ وہ عبد اللہ بن مسعود کی حدیث کی ارسال کے ساتھ علت بیان کرتے ہیں اور عبد الرزاق نے جو عبد اللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے وہ ابن ابی شیبہ کی روایت کے علاوہ ہے لیکن وہ اسحاق بن ابی فرہہ راوی کی وجہ سے مطول ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں اس حدیث کو علماء امت نے قبولیت کے ساتھ لیا ہے اور نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام سے ثابت ہے کہ وہ بار بار سوال کرتے تھے۔ مثلاً نبی کریم ﷺ نے ماعز کو کہا تھا شاید تو نے بوس لیا ہو شاید تو نے صرف مس کیا

2- جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 171 (وزارت تعلیم)

4- ایضاً

1- کنز العمال، جلد 5، صفحہ 309 (اتراٹ الاسلامی)

3- مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 5، صفحہ 511 (دارالترج)

ہو شاید تو نے صرف اشارہ کیا ہو۔ آپ ﷺ بار بار اسے اقرار کے بعد رجوع کی تلقین کرتے رہے اور اس کا فائدہ صرف یہ تھا کہ اگر وہ ہاں کہہ دیں تو انہیں چھوڑ دیں گے۔ (اور سنگسار نہیں کریں گے) اسی طرح چور کو پکڑ کر لایا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا میرے خیال میں اس نے چوری نہیں کی۔ اسی طرح آپ ﷺ نے غامد یہ سے کہا تھا۔ ایسے ہی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سراج سے کہا تھا شاید وہ تجھ پر واقع ہوا ہو جب تو سوئی ہوئی تھی۔ شاید اس نے تجھے مجبور کیا ہو۔ شاید تیرا مولا تیرا خاوند ہو اور تو اسے چھپا رہی ہو (1)۔ آپ ہر شخص سے اسی کی مثل بار بار سوال کرتے تھے جو کلام کی طوالت کا موجب بنتا تھا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ حد کو دور کرنے کا حلیہ ضرور کرنا چاہئے۔ یس اس مضمون پر حدیث اور آثار قطعی العلامت ہیں۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ: شہ کی دو قسمیں ہیں (1) شبہ اشتباہ۔ یہ ایسی صورت ہوتی ہے جس میں اس فعل کی حالت کی کوئی دلیل نہیں ہوتی لیکن اس فعل کو کرنے والا غیر دلیل کو دلیل گمان کر کے اس فعل کا ارتکاب کرتا ہے۔ جیسے کوئی اپنے باپ ماں اور بیوی کی لوٹری سے وہلی کر دے۔ اس گمان پر کہ والدین اور بیٹے کی ملکیت متصل ہوتی ہے اور بیوی کی لوٹری سے وہلی کر کے اس گمان سے کہ اس کے مال اور میرے مال میں کیا فرق ہے نیز میرا ان کے ساتھ اتنا قریبی تعلق ہے کہ ان کے حق میں میری گواہی بھی قبول نہیں ہے۔ یا کوئی تین طلاقیں دینے کے بعد بیوی سے وہلی کرتا ہے حقوق نکاح کے باقی ہونے کی وجہ سے۔ مثلاً او جو ب نقتہ اور غیر سے عدت میں اس کا نکاح کرنا منع ہے یا اسی طرح کوئی مال پر طلاق دینے کے بعد وہلی کرتا ہے اور ام ولد بننے آقائے آزاد کر دیا جبکہ ابھی وہ عدت میں ہے اس کے ساتھ کسی شہ کی بنا پر وہلی کرتا ہے اور آقا کی لوٹری سے غلام وہلی کرتا ہے یا رہن رکھی ہوئی لوٹری سے مرتہن وہلی کرتا ہے اس گمان سے کہ مجھے ملکیت کا قبضہ حاصل ہے۔ ایسے شخص کو حد نہیں لگائی جائے گی۔ اور اگر اسے ان عورتوں کے حرام ہونے کا علم تھا اور پھر اس نے یہ فعل کیا تو اسے حد لگائی جائے گی، کیونکہ حلت کی کوئی دلیل موجود نہیں تھی 2۔ شہدۃ الملک۔ یہ ایسی صورت ہوتی ہے کہ کوئی ایسی دلیل پائی جاتی ہے جو اس فعل کی حلت کا موجب ہوتی ہے جیسا کہ کوئی شخص اپنے بیٹے کی لوٹری سے وہلی کر لے نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کو دیکھتے ہوئے کہ اَنْتَ وَمَا لَکَ لِیَ بَیْکَ۔ (تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے) اس حدیث کو ابنا ماجہ نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے (2) یہ ارشاد حضور ﷺ نے اس شخص کے جواب میں فرمایا تھا جس نے یہ کہا تھا کہ یا رسول اللہ ﷺ میرا مال بھی ہے اور میری اولاد بھی ہے جبکہ میرا باپ میرا مال لینا چاہتا ہے۔

ابن القطن اور المنذری نے لکھا ہے کہ اسکی سند صحیح ہے۔ طبرانی نے الاصفہ میں اور بیہقی نے الدلائل میں روایت کی ہے۔ اسی طرح الفاظ کنایہ کے ساتھ جس عورت کو طلاق دی گئی اور پھر اس کا خاوند اس سے وہلی کرے (تو اسے حد نہیں لگائی جائے گی) کیونکہ صحابہ کرام کا اختلاف ہے کہ اس عورت سے رجوع ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اسی طرح فروخت شدہ لوٹری اور جس کو مہر دیا گیا ہو وہ بھی بائع اور خاوند کے حق میں شہدۃ الملک ہے کیونکہ وہ اس کی ضمان میں ہے۔ اسی طرح ہر ایسی صورت جسے کسی عالم (مفتی) نے مباح قرار دیا ہو جیسے بغیر گواہوں کے نکاح وغیرہ ان تمام صورتوں میں وہلی کرنے والے کو حد نہیں لگائی جائے گی اگرچہ وہلی کرنے والا اس عورت کی حرمت کا اعتقاد بھی رکھتا ہو۔ اسی طرح پہلی رات کسی کے پاس اپنی بیوی کے علاوہ کوئی دوسری عورت بھیج دی گئی اور عورتوں نے اسے کہا کہ یہی تیری بیوی ہے (اس نے اس سے جماع کر دیا) تو اس شخص پر پالا جماع حد نہیں ہے۔ اور اس پر مہر واجب ہوگا اور عدت بھی ہوگی۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہی فیصلہ فرمایا تھا۔ اس شخص کو حد اس لئے نہ ہوگی کیونکہ اس نے دلیل پر اعتماد کیا تھا۔ اور وہ

دلیل اشتباہ کے موقع پر کسی کا خیر دینا ہے کیونکہ انسان پہلی مرتبہ اپنی بیوی اور دوسری عورت کے درمیان تیز نہیں کر سکتا۔ لیکن جسکے بستر پر کوئی عورت لیٹی ہوئی ہو اور وہ اس سے وہلی کر دے تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس پر حد واجب ہے لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حد واجب نہیں ہے وہ اسے پہلی رات بھیجی جائے والی عورت پر قیاس کرتے ہیں جس کے ساتھ مرد ولت کے گمان سے جماع کرتا ہے۔ اور امام ابوحنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ شادی کو جب زیادہ وقت گزر جائے تو پھر اپنی بیوی اور دوسری عورتوں کے درمیان کوئی اشتباہ نہیں رہتا۔ (بیوی کو مس کرنے اس کے سانس اور اس کی خوشبو سے پتہ چل جاتا ہے) پس ایسے شخص کا ظن کسی دلیل پر قائم نہ ہوگا۔ اسی طرح جب اندھا شخص جسے صرف نام پتہ پوچھنے سے اپنی بیوی کی تیز ہوتی ہے وہ اپنی بیوی کو بلاتا ہے اور کوئی غیر عورت اسے جواب دیتی ہے اور کہتی ہے میں تیری بیوی ہوں وہ اس سے جماع کر لیتا ہے تو اس پر حد جاری نہ ہوگی کیونکہ خبر اس کے لئے دلیل ہے اور آواز کا دوسری آواز کے مشابہ ہونا ممکن ہے خصوصاً جبکہ شادی کو زیادہ عرصہ نہ گزرا ہو تو اشتباہ ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ: امام ابوحنیفہ زفر سفیان الثوری کے نزدیک ایک شبہ عقد بھی ہے، مثلاً جس نے کسی ایسی عورت سے نکاح کیا جس کے ساتھ اس کا نکاح حلال نہیں تھا تو اس شخص پر امام ابوحنیفہ کے نزدیک حد واجب نہیں ہے لیکن سخت سزا اس پر واجب ہوگی۔ میں کہتا ہوں یہ کتنا بستر ہے کہ اسے بطور حد قتل کیا جائے۔ تاکہ حد یت کی اتباع ہو جائے۔

امام مالک شافعی احمد ابو یوسف اور محمد کے نزدیک اگر وہ شخص حرمت کو جانتا تھا اور پھر اس نے کسی عورت سے نکاح کیا تھا تو اس پر زنا کی حد واجب ہوگی کیونکہ اس نے بغیر ملکیت اور بغیر شبہ ملک کے ایسی شہ گاہ میں وہلی کی ہے جس کی تحریم پر اجماع ہے۔ اور تحریم کو جانتے ہوئے وہلی کرنے والا حد کا مستحق ہے۔ پس ایسے شخص پر حد واجب ہوگی، جیسا کہ اگر عقد نکاح نہ پایا جائے اور کوئی وہلی کرے تو اس پر حد واجب ہوتی ہے۔ کیونکہ عقد کسی شبہ کی وجہ سے نہ تھا کیونکہ اس نے محل نکاح میں نکاح نہیں کیا اور یہی نفسہ ایسی خیانت ہے جو سزا کا موجب ہے جو زنا کے ساتھ مل گئی ہے پس کوئی شبہ باقی نہ رہا۔ جیسا کہ اگر کوئی عورت کو بدکاری پر مجبور کرتا اور اسے سزا دیتا اور پھر اس کے ساتھ زنا کرتا۔ اگر ہم تسلیم بھی کر لیں کہ عقد شبہ ہے اور وہلی بالمشہ زنا نہیں ہوتی یہ وہلی زنا سے بھی زیادہ قبیح جرم ہے اسلئے جو سزا زنا کی ہے اس جرم پر وہ سزا زنا سے زیادہ مناسب ہے۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں اس شخص نے مطلق نکاح کے محل میں عقد نکاح کیا ہے کیونکہ وہ عورت بنی آدم سے ایک مونث ہے۔ اگرچہ نکاح مخصوص کا وہ عورت محل نہ تھی اس وجہ سے نکاح باطل ہو گیا لیکن شبہ کا موجب ہے کیونکہ شبہ وہ ہوتا ہے جو کسی ثابت شدہ کے مشابہ ہوتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ثابت کا مشابہ ثابت نہیں ہوتا۔ پس شبہ کسی اعتبار سے بھی حلت کے ثبوت کا تقاضا نہیں کرتا۔ اور جب انہیں شبہ الملک ثابت ہو گیا تو زنا کا مفہوم نہ رہا اور اس فعل کا زنا سے زیادہ افظل ہونا حد کے وجوب کا تقاضا نہیں کرتا کیونکہ حد کا معاملہ تو قیفی ہے۔ مثلاً دیکھو اگر کوئی شخص کسی پاکدامن پر زنا کی تہمت لگاتا ہے تو اس پر حد قدف اسی کوڑے سے واجب ہوتی ہے اور جو اس پاکدامن پر کفر کی تہمت لگائے تو قذف پر حد قدف واجب نہیں ہوتی حالانکہ کفر زنا سے افظل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیمت زنا سے بھی زیادہ اشد اور سخت (گناہ) ہے اس حد کو تہمتی نے شعب الایمان میں حضرت ابو سعید اور جابر سے روایت کیا ہے (۱) اور شہادت کی تعریف میں جہاں یہ لکھا ہے کہ ایسی حد سے نکاح کرے جسکے ساتھ

نکاح حلال نہیں ہے۔ اس سے مراد بافتاق علماء یہ ہے کہ ہمیشہ ہمیش کے لئے اس عورت سے نکاح حلال نہیں ہے جیسے نسب رضاع یا صبریت کی وجہ سے حرام ہونے والی عورتیں ہمیشہ ہمیش کے لئے حرام ہوتی ہیں، لیکن وہ نکاح جو مختلف فیہ ہو جیسے بغیر ولی کے نکاح اور بغیر شہود کے نکاح تو یہ نکاح بالاتفاق حد کو ساتھ کرتا ہے کیونکہ تمام علماء کے نزدیک شبہ ممکن ہے۔

اگر نکاح بالاتفاق حرام ہو لیکن ہمہ ہمیشہ کے لئے حرام نہ ہو جیسا کہ کوئی شخص آزاد بیوی کے ہوتے ہوئے کسی لونڈی سے نکاح کر لے یا لونڈی سے نکاح کر لے اس کے آقا کی اجازت کے بغیر یا غلام نکاح کرے اپنے آقا کی اجازت کے بغیر یا غیر کی منکوحہ سے نکاح کرے یا غیر کی معتدہ سے نکاح کرے یا مطلقہ نکاح سے نکاح کرے یا پانچویں عورت سے نکاح کرے یا اپنی بیوی کی بہن سے نکاح کرے یا اس کی عدت میں نکاح کرے ان تمام صورتوں میں امام ابوحنیفہ کے نزدیک حد واجب نہ ہوگی۔ صاحبین سے ایک روایت ہے کہ اسے حد لگائی جائے گی اور دوسری روایت ہے کہ اس کو حد نہ لگائی جائے گی۔ امام ابوحنیفہ کے قول کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو امام محمدی نے روایت کی ہے کہ ایک شخص نے ایک عورت سے اس کی عدت کے اندر نکاح کیا اس کا مقدمہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے اسے سزا دی اور عورت کے لئے مہر کا حکم فرمایا اور ان دونوں کے درمیان جدائی کر دی پھر فرمایا یہ دونوں کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔ راوی فرماتے ہیں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اگر تو یہ کر لیں اور اصلاح کر لیں (۱)۔

محارم کے مسئلہ میں حضرت جابر سے مروی ہے کہ جو کسی محرم عورت سے نکاح کرے گا تو اس کو قتل کیا جائے گا۔ اسی طرح امام احمدی اخیق اور اہل نواہر سے منقول ہے۔ ابن حزم نے حد کو اپنے مورد پر رکھتے ہوئے اس شخص کے قتل کا فتویٰ دیا ہے جو اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کرے۔ امام احمد سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس شخص کو قتل کیا جائے گا اور اسکا مال بیت المال میں جمع کر لیا جائے گا۔ کیونکہ حدیث براہ بن عازب میں ہے کہ آپ فرماتے ہیں میں اپنے خالو سے ملا، جبکہ ان کے ساتھ ایک لنگھترا۔ میں نے پوچھا کہاں کا ارادہ ہے؟ انہوں نے فرمایا مجھے رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسے شخص کو قتل کرنے اور اس کا مال لینے کے لئے بھیجا ہے جس نے اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کر لیا ہے (۲)۔ اس حدیث کو ابو داؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث حسن ہے۔ امام طحاوی نے یہ حدیث بعض طرق سے نقل کی ہے لیکن ان میں مال لینے کا ذکر نہیں ہے اور بعض طرق میں مال لینے کا ذکر ہے۔ ابن ماجہ نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اپنی محرم عورت سے بدکاری کرے اسے قتل کر دو (۳)۔ معاذ یہ بن قرہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے دادا اعداہ سے کہا اس شخص کو قتل کرنے اور اس کے مال کاٹنے لینے کے لئے بھیجا جس نے اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کیا تھا (۴)۔

علماء احناف (رحمہم اللہ) فرماتے ہیں ان احادیث میں اس شخص کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے جو یہ کہتا ہے کہ حد کے وجوب میں کوڑے اور رجم دونوں ہیں کیونکہ ان احادیث میں کوڑوں اور رجم کا ذکر نہیں ہے۔ نیز حدیث میں محرم عورت کے ساتھ دخول کا ذکر نہیں بلکہ محرمہ کے ساتھ صرف نکاح کا ذکر ہے اور نفس نکاح بالا جماع حد کا موجب نہیں ہے۔ پس ضروری ہوگا کہ یہ کہا جائے کہ آپ ﷺ نے ایسے شخص کو قتل کرنے اور اس کا مال لینے کا حکم یا تو سیانہ فرمایا ہے یا اس لئے کہ اس فعل کو اس شخص نے حلال سمجھتے ہوئے کیا تھا جیسا کہ وہ زمانہ جاہلیت میں کیا کرتے تھے۔ پس ورمہ ہو گیا تھا اور شاید وہ محارب ہو گیا ہو۔ اسی وجہ سے آپ ﷺ نے اس کے قتل

2- سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 190 (وزارت تعلیم)

1- شرح معانی الآثار، جلد 2، صفحہ 85 (امدادیہ)

4- شرح معانی الآثار، جلد 2، صفحہ 85 (امدادیہ)

3- سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 187 (وزارت تعلیم)

کرنے اور اس کا مال لینے اور فس لینے کا حکم فرمایا تھا۔

مسئلہ: شبہ عقد میں سے یہ بھی ہے کہ کوئی شخص کسی عورت کو زنا کے لئے اجرت پر لیتا ہے پھر اس کے ساتھ زنا کرتا ہے تو ایسے شخص پر امام صاحب کے نزدیک حد نہیں ہے بلکہ اسے تعزیر لگائی جائے گی۔ امام ابو یوسفؒ، محمد مالکؒ، شافعی رحمۃ اللہ علیہم اور احمد فرماتے ہیں ایسے شخص کو حد لگائی جائے گی کیونکہ عقد اجارہ کی وجہ سے بیعت مباح نہیں ہوتا جس طرح اگر کوئی شخص کسی عورت کو کھانا پکانے یا گھر کے دوسرے کام کاج کے لئے لے آئے اور پھر اس سے زنا کرے تو اسے بالاتفاق حد لگائی جائے گی۔

امام ابو حنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ زنا سے مقصود منفعت ہے اور منفعت اجارہ میں معقود علیہ ہوتی ہے لیکن وہ عین چیز کے حکم میں ہوتی ہے۔ چونکہ حقیقت کے اعتبار سے وہ عقد اجارہ کا مکمل ہے۔ پس یہ شبہ کا موجب ہے لیکن کھانا پکانے کے لئے اجرت پر لانے کی صورت میں مذکورہ صورت سے مختلف ہے کیونکہ اس میں عقد وٹی پر نہیں ہوتی اور عقد جو کسی محل کی طرف منسوب ہو وہ اس میں شبہ کا موجب بنتا ہے کسی دوسرے محل میں شبہ کا موجب نہیں بنتا۔

مسئلہ: علماء کا اتفاق ہے کہ زنا کا ثبوت چار مردوں کی گواہی سے ہوتا ہے۔ اس سے کم شہادت پر زنا کا ثبوت نہیں ہوتا اور نہ ہی اس میں عورتوں کی شہادت قبول ہے کیونکہ ارشاد ہے **قَالَ تَشْهَدُونَ وَعَلَيْكُمْ أَنْ تَبْتَغُوا بِهَا مَعْرَضًا وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ ذَلِكَ فَمَا يَكْتَسِبْ** (تو گواہ طلب کرو تبہت لگانے والے سے) ان پر چار مرد اپنوں میں سے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے **لَوْ كَانُوا يَتَّخِذُونَ عَلَيْهَا مَبْعَثًا فَقَد ضَلُّوا السَّبِيلَ** (اگر وہ سچے تھے تو) تو کیوں نہیں پیش کر سکتے اس پر چار گواہ؟ مسئلہ: اگر چار متفرق گواہ گواہی دیں تو بھی زنا ثابت ہو جائے گا اور امام شافعی کے نزدیک نصاب کے مکمل ہونے کی وجہ سے حد واجب ہوگی۔ اور اثنا عشر اشک کے نزدیک ان گواہوں کو حد قذف لگائی جائے گی کیونکہ پہلی مرتبہ نصاب مکمل نہ تھا۔ پس ان کی گواہی رد کی جائے گی۔ ایک مرتبہ گواہی کے رد ہونے کے بعد پھر ان کی گواہی مقبول نہ ہوگی۔ اگر وہ گواہ علیحدہ علیحدہ آئے پھر اکٹھے ہو گئے اور پھر ملکر گواہی دی تو امام احمد کے نزدیک ان کی گواہی قبول ہوگی۔ امام مالک اور ابو حنیفہ کے نزدیک چاروں گواہوں کا ملکر آنا اور ملکر گواہی ادا کرنا شرط ہے۔

مسئلہ: کیا اقرار میں تعداد شرط ہے یا نہیں۔ امام ابو حنیفہؒ، امام احمد اور اکثر علماء فرماتے ہیں اقرار سے زنا اس وقت ثابت ہوگا جب مائل بالغ شخص اپنے اوپر چار مرتبہ اقرار کرے گا۔ اور پھر اس میں اختلاف ہے کہ یہ چار مرتبہ اقرار چار مجالس میں ہوگا یا ایک ہی مجلس میں چار مرتبہ اقرار کافی ہے۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں چار مختلف مجالس میں اقرار کرنا ضروری ہے کیونکہ مجلس تفرقات کی جامع ہوتی ہے اور باب الزنا باب الاحتیاط ہے۔ امام احمد اور ابو حنیفہ فرماتے ہیں ایک مجلس میں چار مرتبہ اقرار کافی ہے، کیونکہ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں ایک شخص نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا جبکہ آپ مسجد میں تشریف فرما تھے اس نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں نے زنا کیا ہے۔ آپ ﷺ نے اس سے اعراض فرمایا۔ پھر وہ آپ ﷺ کے سامنے آیا اور عرض کی میں نے زنا کیا ہے۔ آپ ﷺ نے پھر اس کی طرف سے چہرہ انور پھیر لیا، پھر جب اس نے چار مرتبہ یہ اقرار کیا تو آپ ﷺ نے اسے بلایا اور فرمایا کیا تو پاگل ہے؟ اس نے عرض کی نہیں۔ پھر پوچھا کیا تو محسن (شادی شدہ) ہے؟ عرض کی جی ہاں یا رسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اسے لے جاؤ اور رجم کر دو (1) امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث سے حجت پکڑی

ہے جو مسلم نے حضرت بریدہ سے روایت کی ہے کہ ماعز نبی کریم ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ نے انہیں واپس لوٹا دیا پھر وہ دوسرے دن دوبارہ آئے تو آپ ﷺ نے انہیں واپس لوٹا دیا پھر آپ ﷺ نے ان کی قوم سے پوچھنے کے لئے ایک شخص کو بھیجا کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس کی عقل میں کچھ خرابی تو نہیں ان کی قوم والوں نے کہا ہم تو اسے عقلمندوں سے جانتے ہیں پھر وہ تیسری مرتبہ آئے۔ آپ ﷺ نے ان کی قوم سے ان کے متعلق پوچھنے کے لئے ایک شخص کو بھیجا تو اس نے جب ان کی قوم سے ان کی ذہنی کیفیت کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ان کو کوئی تکلیف نہیں ہے اور نہ ان کی عقل میں کوئی خلل ہے۔ پھر جب ماعز چوتھی مرتبہ آئے تو ان کے لئے ایک گڑھا کھودا گیا اور پھر انہیں رجم کیا گیا (1)۔

امام احمد انحن بن راہویہ اور ابن ابی شیبہ نے المصنف میں حضرت ابی بکر سے روایت کیا ہے کہ ماعز بن مالک نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور زنا کا اعتراف کیا۔ راوی فرماتے ہیں میں آپ کے پاس موجود تھا۔ آپ ﷺ نے اسے واپس لوٹا دیا۔ پھر دوبارہ وہ آیا اور اپنے جرم کا اعتراف کیا۔ آپ ﷺ نے پھر بھی اسے واپس لوٹا دیا۔ پھر وہ تیسری مرتبہ حاضر ہوا اور اعتراف جرم کیا۔ آپ نے پھر لوٹا دیا۔ میں نے ماعز کو کہا اگر تو نے چوتھی مرتبہ اعتراف جرم کیا تو آپ ﷺ تمہیں رجم کر دیں گے۔ راوی فرماتے ہیں چوتھی مرتبہ بھی ماعز نے اعتراف جرم کر لیا۔ آپ ﷺ نے اس مرتبہ اسے روک لیا اور ان کے متعلق (لوگوں سے) سے پوچھا تو بتایا کہ ہم تو ان کے متعلق خبر ہی جانتے ہیں۔ پس انہیں رجم کیا گیا (2) یہ حدیث متعدد مرتبہ آنے پر صراحتاً دلالت کرتی ہے اور ہر مرتبہ اس کا مجلس سے غائب ہونے کو مستلزم ہے۔ اسی وجہ سے احناف رجم اللہ فرماتے ہیں جب وہ ایک مرتبہ مجلس سے غائب ہو جائے اور پھر لوٹ آئے تو دوسری مجلس شمار ہوگی۔

ابن حبان نے اپنی صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ماعز بن مالک نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور عرض کی خیر و بھلائی سے دور شخص نے زنا کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تیرے لئے ہلاکت ہو تجھے پتہ ہے زنا کیا ہے؟ آپ ﷺ نے انہیں مجلس سے بھگانے اور نکالنے کا حکم دیا۔ وہ نکل گئے۔ پھر وہ دوسری مرتبہ آئے اور پہلے کی طرح اقرار کیا؟ آپ ﷺ نے پھر انہیں مجلس سے نکالنے کا حکم دیا۔ وہ چلے گئے تو تیسری مرتبہ پھر وہ واپس لوٹ آئے اور پہلے کی طرح اعتراف جرم کیا؟ آپ ﷺ نے اس مرتبہ بھی نکالنے کا حکم دیا پھر وہ چوتھی مرتبہ آئے اور زنا کا اعتراف کیا۔ آپ ﷺ نے ماعز سے پوچھا کیا تو نے داخل کیا اور نکالا؟ تو ماعز نے کہا جی ہاں۔ آپ ﷺ نے اسے رجم کرنے کا حکم دیا۔ یہ حدیث علیہا اور دوسری احادیث تعدد مجلس پر صراحتاً دلالت کرتی ہیں پس پہلی حدیث کو بھی اسی پر محمول کیا جائے گا۔

پہلی حدیث میں یہ ارشاد کہ آپ ﷺ نے چہرۃ اقدس پھیر لیا تھا پہلے قول کے ساتھ ایک اقرار شمار ہوگا۔ کیونکہ وہ ایک مجلس میں تھ اور یہ ارشاد کہ جب انہوں نے چار مرتبہ اقرار کر لیا اس سے مراد چار مجالس میں اقرار کرنا ہے کیونکہ یہ اس کے منافی نہیں ہے۔

امام مالک الشافعی ابو یوسف و ابن حنبل نے ابی سلیمان فرماتے ہیں ایک مرتبہ اقرار سے بھی زنا ثابت ہو جاتا ہے کیونکہ زید بن خالد اور ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث میں ملازم شخص کے واقعہ میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔ اے انہیں اس شخص کی عورت کے پاس جاؤ اگر وہ اعتراف کرے تو اس کو رجم کرو۔ وہ اس عورت کے پاس گئے تو اس نے اعتراف کر لیا پھر انہوں نے اس کو رجم کر دیا (3)۔ اسی

طرح امام مالک شافعی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ فرماتے ہیں کہ عاقد یہ عورت کے واقعہ میں بھی ایک مرتبہ اقرار کا ذکر ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کے ارشاد ”اگر اعتراف کرے تو اسے رجم کر دو“ کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ایسا اعتراف کرے جو زنا کے حد میں مقبول ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے صرف ”ان اعترف“ کے الفاظ پر اکتفا فرمایا کیونکہ آپ ﷺ کو معلوم تھا کہ صحابہ کرام ماعز وغیرہ کے واقعہ سے جانتے ہیں کہ زنا میں معتبر اقرار چار مختلف مجالس میں چار مرتبہ اقرار کرنا ہے اور امام مالک اور شافعی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ کا کہنا کہ عاقد یہ کے واقعہ میں ایک مرتبہ اقرار کا ذکر ہے۔ تو یہ درست نہیں ہے بلکہ ابو داؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے کہ صحابہ کرام آپس میں یہ گفتگو کرتے تھے کہ عاقد یہ اور ماعز بن مالک اگر اعتراف کے بعد رجوع کر لیتے تو آپ دو بارہ ان سے مطالبہ نہ کرتے۔ آپ ﷺ نے چوتھی مرتبہ اعتراف کے بعد رجم فرمایا تھا (۱)۔ یہ چار مرتبہ اقرار پر نص صریح ہے اور اس کے متعلق غایت یہ ہے کہ اس واقعہ کی تفصیل احادیث میں منقول نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

بزار نے اپنی سند میں زکریا بن سلیم قنا شیخ من قوریش عن عبدالرحمن بن ابی بکرہ عن ابیہ کے طریق سے روایت کیا ہے کہ عاقد یہ عورت نے چار مرتبہ اقرار کیا تھا اور آپ ﷺ اسے ہر مرتبہ بولتے رہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا تم چلی جاؤ حتیٰ کہ بچہ جنم دے۔ اس حدیث کی سند میں ایک مجموعہ راوی ہے جس کی جہالت ابو داؤد اور نسائی کی حدیث سے دور ہو جاتی ہے۔ مسئلہ امام کے لئے مستحب ہے کہ وہ اقرار سے رجوع کی اسے تلقین کرے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ماعز بن مالک کو فرمایا تھا ”شاید تو نے بوسہ لیا ہو یا تو نے چھوا ہو۔“

مسئلہ: اگر مجرم چار مرتبہ زنا کا اقرار کرنے کے بعد حد لگنے سے پہلے یا حد کے درمیان رجوع کر لے تو اس کا رجوع قبول ہوگا اور اس سے استغاثہ کے نزدیک حد ساقط ہو جائے گی۔ امام مالک سے دور روایتیں مروی ہیں۔

اس سلسلہ میں ہماری دلیل یہ ہے کہ رجوع ایک خبر ہے جو صدق کا احتمال رکھتی ہے۔ جیسا کہ اقرار ہے اور کوئی شخص اس کی اس بات کی تکذیب کرنے والا بھی نہیں ہے۔ تو اقرار میں شہرہ تحقیق ہو گیا اور حدود شہادت کی وجہ سے دور ہو جاتی ہیں۔ بخلاف اس صورت کے جس میں بندے کا حق ہو اور وہ قصاص اور حد قذف (کی صورت ہے) کیونکہ ان صورتوں میں اس کے رجوع کو جھٹلانے والا موجود ہوتا ہے۔ ماعز کا واقعہ ہماری اس دلیل کی تائید کرتا ہے ابو داؤد نے بزید بن نعیم سے ماعز کا قصہ روایت کیا ہے۔ اس میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ جب انہیں رجم کیا گیا جب انہیں پتھر لگے تو وہ چلانے لگے اور دوڑ پڑے راستہ میں انہیں عبد اللہ بن انیس ملے جبکہ صحابہ کرام حضرت ماعز کو پکڑنے سے عاجز آچکے تھے۔ عبد اللہ ابن انیس نے انہیں اونٹ کا پاؤں نکال کر مارا اور انہیں قتل کر دیا۔ پھر جب عبد اللہ بن انیس حضور ﷺ کے پاس آئے اور سارا ماجرا بیان کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا تم نے اسے چھوڑ کیوں نہ دیا تھا شاید وہ توبہ کرتا اور اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمائیے (2) ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔

مسئلہ: جب مریض زنا کرے اور اسکی حد رجم ہو تو اسے اسی حالت میں رجم کیا جائے گا کیونکہ اطلاق ثابت ہو چکا ہے جس مرض کے سبب اسے روکا نہیں جائے گا۔ اور اگر مریض کی حد کوڑے ہو تو اسے درست ہونے سے پہلے کوڑے نہ لگائے جائیں گے تاکہ کہیں ہلاک نہ ہو جائے اور اگر وہ ایسا مریض ہو کہ اس کے درست ہونے کی امید ہی نہ ہو جیسے گردوں کا مریض ہے یا انتہائی ضعیف التکلیف

ہے تو امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک اسے ایسے کھجور کے خوشکے ساتھ مارا جائے گا جس کی سوشائیں ہوں اور اسے ایک ہی مرتبہ دو خوش مارا جائے لیکن اس طرح مارا جائے کہ ہر شاخ اس کے جسم کو لگ جائے۔ جیسا کہ امام بغوی نے شرح السنہ میں اور ابن ماجہ نے ابی امامہ بن سہل بن حنیف بن سعید بن سعد بن عبادہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں ہماری اونٹنیوں میں ایک انتہائی کمزور آدمی تھا ایک روز وہ گھر کی لوٹدی کہ بے کاری کر رہا تھا حضرت سعید بن عبادہ نے اس کا مسئلہ بارگاہ رسالت میں پیش کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اسے سوکڑے لگاؤ۔ حضرت سعد نے عرض کی یا نبی اللہ ﷺ! وہ تو انتہائی کمزور ہے اگر ہم اسے سوکڑے ماریں گے تو وہ مر جائے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم اس کے لئے ایک خوشکے لوجس میں سوشائیں ہوں اس کے ساتھ اسے یکبارگی مارو اور اسے چھوڑ دو (1)۔ اس حدیث کو ابو داؤد نے ابی امامہ بن سہل بن سہل عن رجل من الانصار کی سند سے روایت کیا ہے اور نسائی نے عن ابی امامہ بن سہل عن ابیہ کے سلسلہ سے اور طبرانی نے عن ابی امامہ بن سہل عن ابی سعید الخدری کے طریق سے روایت کی ہے۔ الخلفاء ان جعفر فرماتے ہیں اگر اس کے تمام طرق محفوظ ہیں تو ابوامامہ نے اسے صحابہ کی ایک جماعت سے روایت کیا ہے۔ اسی حدیث کو بیہقی نے ابی امامہ سے مرسل روایت کیا ہے۔

مسئلہ: اگر حاملہ عورت زنا کرے تو اسے حد نہیں لگائی جائے گی حتیٰ کہ وضع حمل ہو جائے، تا کہ اس کے پیرت میں جو نفس محترمہ مدہ وہ ہلاک نہ ہو جائے اور اگر اسکی حد کو زنا سے ہوں تو کوڑے نہ مارے جائیں حتیٰ کہ نفاس سے پاک ہو جائے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرمایا اے لوگو! اپنے غلاموں پر بھی حد قائم کرو خواہ وہ حصن ہوں یا حصن نہ ہوں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی لوٹدی نے زنا کیا تو آپ ﷺ نے مجھے اسے کوڑے لگانے کا حکم فرمایا جبکہ وہ ابھی تک نفاس کی حالت میں تھی۔ مجھے خندہ ہوا کہ اگر میں نے اسے کوڑے لگائے تو قتل ہو جائے گی۔ میں نے اس کی کیفیت نبی کریم ﷺ کے سامنے بیان کی تو آپ ﷺ نے (مجھے اس تاخیر پر) فرمایا تو نے اچھا کیا ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے (2)۔ ابو داؤد کی روایت میں ہے فرمایا اسے چھوڑ دو حتیٰ کہ اس کا خون (نفاس) ختم ہو جائے پھر اس کو حد لگاؤ اور (فرمایا) اپنے غلاموں اور لونڈیوں پر یہ حد دو قائم کرو۔ اگر نفاس والی عورتوں کی حد رحم ہو تو ان کے بچے ان سے دور ہونے کے بعد اور ان کے ہلاکت کے استحقاق کے وقت انہیں رجم کیا جائے گا۔

امام ابوحنیفہ سے مروی ہے کہ اس کی حد کو مؤخر کیا جائے حتیٰ کہ بچہ ماں سے مستغنی ہو جائے، جبکہ بچہ کی تربیت کرنے والا کوئی نہ ہو تا کہ بچہ ضائع ہونے سے بچ جائے۔ مسلم نے پریدہ کے واقعہ میں روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس کے رجم کو مؤخر کیا حتیٰ کہ اس نے بچہ جن دیا۔ ایک انصاری اس کا قتل تھا حتیٰ کہ اس نے بچہ جن دیا۔ راوی فرماتے ہیں غامد یہ ہے بچہ جاتا تو فرمایا اس کو رجم نہ کرو تا کہ چھوٹا بچہ چھوڑ کر مر نہ جائے جبکہ اس کو دودھ پلانے والا کوئی نہ ہو۔ ایک انصاری انصارو کہا ہے اللہ کے نبی (ﷺ) میں اس کی رضاعت کا ضامن ہوں تو آپ ﷺ نے اسے رجم کر دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے غامد یہ کو کہا تو جلی جا حتیٰ کہ تیرا بچہ پیدا ہو جائے۔ جب اس نے بچہ کو ختم دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا جاؤ اور اسے دودھ پلاؤ حتیٰ کہ اس کا دودھ چھڑا دے۔ جب اس نے بچہ کا دودھ چھڑا دیا تو پھر وہ بچہ لے کر آئی جبکہ بچہ کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا۔ عرض کی یا نبی اللہ ﷺ! یہ بچہ ہے میں نے اس کا دودھ چھڑا دیا ہے اور کھانا کھانے لگ گیا ہے۔ وہ بچہ ایک مسلمان آدمی کے سپرد کیا گیا اور پھر عورت کے لئے سینہ تک مڑھا کھو دیا گیا

پھر لوگوں کو اسے رجم کرنے کا حکم دینا گیا اور لوگوں نے اسے رجم کر دیا (۱)

مسئلہ: فاجلدوا کا خطاب وقت کے حکام کو ہے۔ اس لئے امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں حاکم (امام) کی اجازت کے بغیر آقا کو اپنے غلاموں پر حد قادم کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ امام مالک، الشافعی اور احمد فرماتے ہیں حاکم کی اجازت کے بغیر بھی آقا اپنے غلاموں پر حد قادم کر سکتا ہے۔ امام مالک سے ایک یہ روایت بھی ہے کہ آقا حد قادم کر سکتا ہے لیکن اپنی بیایا ہوئی لونڈی پر حد قادم نہیں کر سکتا۔ امام شافعی نے آقا سے ذمی مکاتب اور عورت کی استنثار فرمائی ہے۔

کیا یہ مطلق حکم ہے کہ ہر صورت میں آقا حد قادم کر سکتا ہے؟ غلام کو مرتد ہونے یا ڈاکو ڈالنے یا چوری کرنے پر حد قادم کر سکتا ہے؟ تو اس کے متعلق بھی ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام ابوہریرہ فرماتے ہیں خبر کے اطلاق کی وجہ سے یہ ہر حد کو عام ہے اور اصح منصوص ہی ہے۔ تہذیب میں اصح قول یہ لکھا ہے کہ نقل اور قطع یہ کی حد امام قادم کرے گا۔

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے جب اس لونڈی کے متعلق پوچھا گیا جو بدکاری کرے اور جھنڈ نہ ہو تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر وہ زنا کرے تو اسے کوڑے لگاؤ پھر اگر زنا کرے تو پھر اسے کوڑے لگاؤ پھر اگر زنا کرے تو اسے کوڑے لگاؤ۔ پھر اگر زنا کرے تو اسے چھ دو اگرچہ بالوں کی رسی کے بدلے ہی (۲)۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا اپنے غلاموں پر حد قادم کر دو (۳)۔ اس حدیث کو نسائی اور بیہقی نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے اور اس کی اصل مسلم میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر موقوف ہے۔ امام شافعی نے روایت کیا ہے کہ حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنی اس لونڈی کو کوڑے لگائے جس نے زنا کیا تھا (۴)۔

ابن وہب نے ابن جریج عن عمرو بن دینار کے حوالہ سے روایت کیا ہے کہ فاطمہ بنت رسول اللہ ﷺ اپنی لونڈی کو پچاس کوڑے لگاتی تھیں جب وہ بدکاری کا ارتکاب کرتی تھی۔

حضرت امام شافعی نے من مالک عن نافع کے سلسلہ سے یہ روایت کیا ہے کہ عبد اللہ بن عمر کے ایک غلام نے چوری کی تھی عبد اللہ نے اسے حضرت سعید بن العاص کی طرف بھیجا جو مدینہ کے امیر تھے تاکہ وہ اس کا ہاتھ کاٹ دیں۔ حضرت سعید امیر مدینہ نے اس غلام کا ہاتھ کاٹنے سے انکار کیا اور فرمایا غلام کا ہاتھ نہیں کاٹا جاتا جب وہ چوری کرے۔ حضرت ابن عمر نے اسے فرمایا تم نے یہ حکم کس کتاب میں پڑھا ہے۔ پھر ابن عمر نے اس کا خود حکم دیا اور اس کا ہاتھ کاٹا گیا (۵)۔ اس حدیث کو عبد الرزاق نے اپنی مصنف میں عن معمر عن ایوب عن نافع کی سند سے اس طرح روایت کیا ہے کہ ابن عمر نے خود اپنے غلام کا ہاتھ کاٹا تھا جس نے چوری کی تھی اور اس غلام کو کوڑے لگائے تھے جس نے زنا کیا تھا اور انہیں والی کی طرف نہیں بھیجا تھا (۶) اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور اس میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا وعدہ ہے۔ سعید بن منصور نے عن ہشیم عن ابن ابی لیلیٰ عن نافع کے طریق سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ موطا میں امام مالک نے اور امام شافعی نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تکہ جاری تھیں اور آپ کے ساتھ بنی عبد اللہ بن ابی بکر الصدیق کا ایک غلام تھا۔ اس نے چوری کی اور پھر اعتراف جرم بھی کر لیا تو حضرت عائشہ

۱- صحیح مسلم، جلد ۲ صفحہ ۶۸ (قدیمی)

۲- ایضاً صفحہ ۷۰

۳- سنن کبریٰ بیہقی، جلد ۸ صفحہ ۲۴۵ (الفلک)

۴- موسوعۃ الامام الشافعی، جلد ۸ صفحہ ۲۸ (الترتیب العربی)

۵- مصنف عبد الرزاق، جلد ۱۰ صفحہ ۲۳۹ (مکتبہ اسلامیہ)

۶- موطا امام مالک، جلد ۲ صفحہ ۸۳۳ (الترتیب العربی)

رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا (1) امام مالک نے مطا میں یہ بھی روایت کیا ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنی اس لونٹری کو قتل کیا تھا جس نے جاوہ کیا تھا (2) اس اثر کو عبد الرزاق نے روایت کیا ہے اور انہوں نے یہ بھی روایت کیا ہے کہ حضرت عثمان نے حضرت حفصہ سے اس فعل کو ناپسند کیا تو حضرت ابن عمر نے فرمایا آپ ام المومنین سے اس فعل پر کیوں معترض ہیں جبکہ انہوں نے ایسی عورت کو قتل کیا ہے جس نے جاوہ کیا تھا اور اعتراف بھی کر لیا تھا۔

امام ابو حنیفہ کی دلیل وہ حدیث ہے جسے اصحاب سنن نے اپنی اپنی کتب میں ابن مسعود ابن عباس اور ابن زبیر سے موقوفاً اور مروفاً روایت کیا ہے کہ چار چیزیں والیوں (حکام) کے سپرد ہیں۔ 1۔ حدود 2۔ صدقات 3۔ جماعات 4۔ فنی۔

ابن کثیر نے رافہ کو ہمزہ کے نفع کے ساتھ پڑھا ہے اور سورۃ الحدید میں ہمزہ ساکن ہے، کیونکہ ورحمۃ کی مجاہدت میں ہے اور سورۃ حدید کے ہمزہ کے سکون میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ دین اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ یعنی حدود کو اس طرح معطل نہ کرو کہ تم لوگوں پر رحمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں قائم نہ کرو۔ مجاہد عکرمہ عطاء سعید بن جبیر نخعی، نخعی نے یہی معنی بیان کیا ہے (3) شیخین نے صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ قریش کے لئے مخزومیہ عورت جس نے چوری کی تھی ایک پریشان کن مسئلہ بن گئی۔ انہوں نے مشورہ کیا کہ اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے کون سفارش کرے گا۔ تو سب نے کہا یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کے محبوب اسامہ بن زید ہی حل کر سکتے ہیں۔ حضرت اسامہ نے آپ ﷺ سے بات کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم اللہ کی حدود میں سے ایک حد کے متعلق سفارش کرتے ہو۔ پھر آپ ﷺ کھڑے ہوئے اور خطبہ ارشاد فرمایا۔ فرمایا تم سے پہلے لوگ اسی وجہ سے ہلاک ہوئے کہ جب ان کا کوئی امیر آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی غریب آدمی چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے۔ قسم بخدا اگر قاطعہ بنت محمد ﷺ چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا (4)

بعض علما نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ تمہیں زانی اور زانیہ پر اس طرح رحم نہ آئے کہ تم ان کو آہستہ آہستہ مارو بلکہ انہیں سخت اذیت پہنچاؤ۔ یہ معنی سعید بن مسیب اور حسن بصری نے بیان فرمایا ہے۔

امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں سب سے سخت کوڑے حد زنا میں لگائے جائیں۔ پھر اس سے آہستہ حد شرب میں اور حد قذف میں اس سے بھی آہستہ لگائے جائیں کیونکہ اس کا سبب محتمل ہے اس لیے کہ ہو سکتا ہے قاذف سچا ہو جبکہ حد شرب کا سبب قہقہ سے اور زنا کی بنا بہت شراب پینے سے زیادہ گھٹاؤنی ہے (5) قتادہ فرماتے ہیں حد شرب اور حد قذف آہستہ اور حد زنا سخت لگائی جائے (6) زہری فرماتے ہیں حد زنا اور حد قذف سخت لگائی جائے کیونکہ ان کا ثبوت کتاب اللہ سے ہے اور حد شرب آہستہ لگائی جائے کیونکہ اس کا ثبوت سنت سے ہے (7) امام ابو یوسف فرماتے ہیں روایت ہے کہ عبد اللہ بن عمر نے اپنی لونٹری کو کوڑے لگائے جس نے زنا کیا تھا اور آپ نے جلاو کو حکم دیا اس کی بیٹھ اور اس کے پاؤں پر مارو۔ آپ کے بیٹے نے آیکو کہا لا نأخذنکم بیہما زافۃ فیہن اللہ۔ تو عبد اللہ بن عمر نے فرمایا بیٹا! اللہ نے مجھے اس کے قتل کرنے کا تو حکم نہیں دیا ہے۔ میں نے اسے مارا بھی ہے اور سخت تکلیف بھی پہنچائی ہے (8)۔

یہ شرط ہے اور باقی کلام کی وجہ سے جزا سے مستثنیٰ ہے یعنی اگر تم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو حکم الہی کو بجالانے میں جلدی کرو

1۔ موطا امام مالک، جلد 2، صفحہ 833 (اثرات العربی) 2۔ ایضاً صفحہ 871 3۔ تفسیر ابو یوسف، جلد 4، صفحہ 166 (الفلک)

4۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 64 (تقریبی) 5۔ تفسیر ابو یوسف، جلد 4، صفحہ 166 (الفلک)

6۔ ایضاً 7۔ ایضاً 8۔ ایضاً

اور دودھ کا قائم کرنے میں کوشش کر دو کیونکہ ایمان اسی بات کا محتضی ہے۔

یہ مجرم کی رسوائی اور دوسروں کو عبرت دلانے کے لئے فرمایا بدکاروں کی سزا کے وقت اہل ایمان کا ایک گروہ موجود ہونا چاہئے کیونکہ تعذیب کی بنیہت رسوائی انسان کو برائی سے زیادہ روکتی ہے۔ طائف کا معنی گروہ اور فرقہ ہے کسی شے کے ارد گرد گھبرائی اس کا معنی ہو سکتا ہے اس معنی کے اعتبار سے یہ طوف سے مشتق ہوگا فرقہ سے مراد بعض علماء فرماتے ہیں چار ہیں کیونکہ اطراف چار ہیں۔ بعض فرماتے ہیں تین افراد ہیں کیونکہ یہ بیع کا دوئی فرد ہے اور یہ طائف کی جمع ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں طائف کا اطلاق ایک اور دو افراد پر بھی ہوتا ہے۔ جیسے ارشاد ہے وَإِنْ كَلَّ يَهْتَدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فَاسْتَلُوا۔ اس آیت میں طائف سے مراد ایک فرد ہے۔ قاسوس میں ہے اس کا معنی کسی چیز کا ٹکڑا یا ایک فرد اور زیادہ افراد بھی مراد ہوتے ہیں۔ ہزار تک افراد ہو سکتے ہیں۔ کم از کم دو افراد یا ایک فرد بھی مراد ہوتا ہے اس وقت یہ نفس کے معنی میں ہوتا ہے (۱)۔ میں کہتا ہوں طائف کا جمع ہونا بھی صحیح ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ واحد سے کنایہ ہو۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ یہ زایہ اور علامت کی طرح ہو یعنی اور مجاہد کہتے ہیں کم از کم اس کا فرد ایک اور اس سے اوپر ہے۔ حضرت ابن عباس سے یہی مروی ہے۔ امام احمد کا بھی یہی قول ہے۔ عطاء عمر مدہ اور احن فرماتے ہیں طائف سے دو اور دو سے زیادہ افراد مراد ہیں۔ زہری اور قتادہ فرماتے ہیں تین اور تین سے زیادہ افراد مراد ہیں۔ مالک اور ابن زید فرماتے ہیں زمانہ میں چار گواہ ہوتے ہیں اس لئے ان کی تعداد کے مطابق اس سزا کو کہنے والے بھی چار ہوں (۲)۔ حسن بصری فرماتے ہیں دس اور اس سے زیادہ افراد مراد ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ قول بھرتے کیونکہ آیت سے مقصد و تشبیہ کرنا ہے۔

الَّذِينَ لَا يَنْفِكُكُمْ إِلَّا زَانِيَةٌ أَوْ مُشْرِكَةٌ
وَحَرَمٌ ذُلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ۝

”زانی شادی نہیں کرتا مگر زانیہ کے ساتھ یا مشرک کے ساتھ اور زانیہ نہیں نکاح کرتا اس کے ساتھ مگر زانی یا مشرک اور حرام کر دیا گیا ہے یہ اہل ایمان پر لہ“

۱۔ ابوداؤد ترمذی نسائی اور حاتم نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے ایک حدیث نقل فرمائی ہے کہ ایک شخص جس کا نام مرشد تھا وہ مکہ سے مسلمان قیدیوں کو نکال کر مدینہ طیبہ پہنچاتے تھے۔ (ایک دفعہ وہ مکہ گئے) تو ایک عتقان نامی عورت (سے ملاقات ہو گئی) جس کے مرشد کے ساتھ (زمانہ جاہلیت) میں تعلقات تھے۔ مرشد نے نبی کریم ﷺ سے اجازت طلب کی کہ میں اس عورت سے نکاح کروں۔ آپ ﷺ نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ حتیٰ کہ یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے مرشد الزانی لا ینکح الا زانیۃ او مشرکۃ (۱)۔ (۱)۔ کارا شاد نازل ہوا ہے اس لیے تو اس سے نکاح نہ کرنا (۳)۔

نسائی نے عبد اللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں ام ہزول ایک بدکارہ عورت تھی ایک صحابی نے اس سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (۴)۔ سعید بن منصور نے مجاہد سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے زنا کو حرام قرار دیا تو بدکارہ عورتیں چونکہ خوبصورت اور حسن و جمال رکھتی تھیں اس لیے لوگ کہنے لگے ہم ان سے نکاح کر لیں گے تو اس وقت یہ ارشاد نازل ہوا (۵)۔

1۔ القاسوس الخلیفہ جلد ۲ صفحہ 110 (الترغیب العربی) 2۔ تفسیر بغوی جلد ۲ صفحہ 116 (الفکر)

3۔ جامع ترمذی جلد ۲ صفحہ 147 (وزارت تعلیم) 4۔ تفسیر ابن کثیر جلد 6 صفحہ 246 (ابن حزم) 5۔ الدر المنثور ج 5 صفحہ 39 (العلیہ)

امام بغوی لکھتے ہیں مہاجرین جب مدینہ طیبہ پہنچے تو بعض ان میں سے نادر تھے جن کے پاس مال و مومنشی نہ تھے اور مدینہ طیبہ میں کچھ ایسی عورتیں تھی جو بدکاری کا پیشہ اپنانے ہوئے تھیں اور وہ اس وقت آسودہ حال تھیں تو بعض فقراء مہاجرین نے ان سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا تاکہ وہ اپنے مال سے ان پر خرچ کریں۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ سے مشورہ طلب کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے مسؤنین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ بدکارہ عورتوں سے نکاح کریں کیونکہ وہ مشرکات ہیں۔ یہ قول عطاء بن ابی رباح 'مجاہد قتادہ زہری اور اشعثی کا ہے۔ العوفی کی روایت میں ابن عباس سے بھی یہی مروی ہے (1)۔

میں کہتا ہوں ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں سعید بن جبیر کی مراسیل سے یہ شان نزول نقل کیا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں مگر س نے فرمایا یہ آیت کہ اور مدینہ کی عورتوں کے متعلق نازل ہوئی۔ ان عورتوں میں سے سات عورتیں ایسی تھیں جن کے مکانوں کے اوپر جھنڈے گاڑے ہوئے تھے جن کے ساتھ ان کی پہچان ہوتی تھی۔ ان عورتوں میں ایک ام مہول تھی جو الاسباب بن ابی اسباب الخوذی کی لونڈی تھی کہ زمانہ جاہلیت میں مرد ایک زانیہ عورت سے شادی کر لیتا تھا اور پھر اس کی کمائی سے کھاتا تھا۔ مسلمانوں نے بھی اس نسبت سے ان عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت طلب کی جبکہ ام مہول نے اس مسلمان پر خرچ کرنے کی شرط بھی قبول کر لی تھی۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی (2)۔ ان آیات اور مذکورہ احادیث کی وجہ سے امام احمد نے حجت پکڑی ہے کہ زانی اور زانیہ کا نکاح جائز نہیں ہے حتیٰ کہ دونوں تو بہ کر لیں۔ جب تو بہ کر لیں گے تو پھر انہیں زانی اور زانیہ کے ناموں سے نہیں پکارا جائے گا۔ اگرچہ شاہ کے نزدیک زانیہ اور زانی کا نکاح صحیح ہے اور اس آیت کی تفسیر میں بعض یہ فرماتے ہیں۔ اس کا معنی خبر ہے جیسا کہ آیت کے معنیوں سے ظاہر ہے اور مطلب یہ ہے کہ زانی اپنے عشق کی بنا پر نیک صالحہ عورت سے نکاح کرنے کی طرف راغب نہیں ہوتا اسی طرح زانیہ عورت سے نیک مرد نکاح کرنا پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ طہیبتوں کی مناسبت الفت و محبت کا موجب ہوتی ہے اور طہیبتوں میں مخالفت اور تضاد لغزت و افتراق کا سبب ہوتا ہے۔

کلام میں چونکہ مقابلہ ہے اس لئے حق تو یہ تھا کہ کلام اس طرح ہوتی لَوْ اَبَیْنَا لَآ تَنكِحُوا الْاِمْنَانَ اَوْ الْمُشْرِكِ۔ لیکن مقصود چونکہ ایسی عورتوں کی طرف مردوں کی رغبت کے احوال بیان کرنا ہے اس لئے اسلوب بیان بدل دیا گیا۔ جیسا کہ ہم نے پیچھے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ مؤمنین مردوں کے زانیہ عورتوں سے نکاح کرنے کے متعلق اجازت طلب کرنے کے وقت نازل ہوئی ہے۔ اس تاویل کی بناء پر وَحَرَمَ ذٰلِكَ عَلٰی الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْ يُنكِحُوْا مَا كَفَرُوْا بِالْحٰقِّ عَلٰی سَبْعِ مِثْقٰلِ ذَرَّةٍ اَوْ كَانُوْا مِنْ اٰلِ اٰهْلِ الْاَيْمٰنِ يَتَّبِعُوْنَ اٰلِ الْاَيْمٰنِ اَوْ الْمُشْرِكِ۔ یعنی مؤمنین ایسا نہیں کرتے اور وہ ایسی عورتوں سے نکاح کرنے سے اجتناب کرتے ہیں تاکہ فاسق لوگوں کی تشبیہ برے ساتھی اور بری سنگت سے بچ جائیں اور نسب میں طعن سے بھی محفوظ رہیں۔

امام مالک فرماتے ہیں ایسا نکاح مکروہ تحریمی ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں چند علماء کا خیال ہے کہ یہاں نکاح سے مراد جماع ہے (3) آیت کا معنی یہ ہے کہ زانی زانیہ نہیں کرتا مگر زانیہ یا مشرک سے اور زانیہ زانیہ نہیں کرتی مگر زانی یا مشرک سے۔ یہ سعید بن جبیر ضحاک بن مزاحم کا قول ہے اور ابن عباس سے بھی ایک روایت اسی طرح مروی ہے۔ زید بن ہارون اس کا مطلب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں زانی اگر حلال سمجھ کر نکاح کرے گا تو وہ مشرک ہوگا اور اگر حرام سمجھ کر نکاح کرے گا تو وہ زانی

ہوگا (1)۔ اس تاویل کی بناء پر بھی کلام کا معنی اخبار ہوگا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں نئی معنی نئی ہے۔ نئی کے صیغہ کے ساتھ پڑھا بھی گیا ہے اور حرمت اپنے ظاہر پر ہے لیکن تحریم ان مہاجرین کے ساتھ خاص ہے جنہوں نے بدکار عورتوں سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ یہ تحریم تمام لوگوں کیلئے نہیں ہے۔ یہ قول بہت بعید ہے کیونکہ آیت میں ابتدا منع زانی کا نیک عورتوں سے نکاح کرنا ہے نہ کہ بدکار عورتوں سے نکاح کرنا منع کیا گیا ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو کلام اس طرح ہوتی لَمْ يُؤْمِنَنَّ لَنْ يَنْكِحَ اِلَّا الْمُؤْمِنَةَ صَالِحَةً اسی طرح وَ حَرَّمَ ذَا لِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ کا عموم بھی مخصوص مردوں کے ساتھ حکم کی تخصیص کے معنی ہے۔ حضرت ابن مسعود زانیہ کے نکاح کو حرام کہتے تھے فرماتے جب زانی زانیہ سے نکاح کرے تو وہ ہمیشہ زانیہ کرتے رہیں گے (2) الحسن فرماتے ہیں وہ زانیہ جسے کوڑے لگائے گئے ہوں وہ اس زانیہ سے نکاح کرے گا جسے کوڑے لگائے گئے ہوں۔ اور زانیہ جگلوہ بھی صرف زانیہ جگلوہ (جسے کوڑے لگائے گئے ہوں) سے نکاح کر سکتی ہے (3)۔

ابوداؤد نے اپنی سند سے عمرو بن شعیب بن ابی سعید المقبری عن ابی ہریرہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا زانیہ جگلوہ نکاح نہ کرے مگر اپنے جیسی جگلوہ عورت سے (4)۔ ان دونوں قولوں کا معنی یہ ہے کہ تحریم عام ہے اور آیت منسوخ نہیں ہے۔ حضرت سعید بن المسیب اور علماء ایک جماعت کا خیال ہے کہ آیت کا حکم منسوخ ہے اور زانیہ کا نکاح اس آیت کی وجہ سے حرام تھا۔ پھر یہ حکم ذَا لِكَ الْاِثْمِ الْاِثْمِ الْاِثْمِ سے منسوخ ہو گیا۔ اور زانیہ بھی ایسی میں داخل ہے (5) اس لئے یہ ارشاد زانیہ کے نکاح کے جواز پر دلالت کرتا ہے۔

علامہ بغوی نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میری بیوی کسی چھوٹے والے ہاتھ کو دور نہیں کرتی آپ ﷺ نے فرمایا اسے طلاق دے دے۔ اس نے عرض کی حضور ﷺ! میں اس سے محبت کرتا ہوں وہ بہت خوبصورت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا پھر تو اس سے متنہج ہوتا ہے۔ ایک روایت میں ہے آپ ﷺ نے فرمایا پھر تو اسے روک لے (6)۔ اس طرح طہرائی اور تکفیری نے عبید اللہ بن عمر بن عبدالمکریم بن مالک عن ابی الزبیر عن جابر کے طریق سے روایت کی ہے ابن ابی جابر فرماتے ہیں میں نے اس حدیث کے متعلق اپنے والد گرامی سے پوچھا تو انہوں نے اس طرح سند بیان فرمائی۔ حدیث امام بن کثیر عن معمر بن عبدالمکریم حدیثی ابو الزبیر عن مولیٰ لینی ہاشم ابو پھر حدیث کے الفاظ ذکر فرمائے۔ اسی حدیث کو الثوری نے روایت کیا ہے۔ انہوں نے الرجل کا نام ہشام مولیٰ لینی ہشام ذکر کیا ہے۔ اسی حدیث کو ابو داؤد اور نسائی نے عبد اللہ بن عبید اللہ بن عبید اللہ بن عباس کے سلسلہ سے روایت کیا ہے۔ نسائی فرماتے ہیں ایک راوی نے ابن عباس تک مرفوع ذکر کر کے ہے اور ایک راوی نے مرفوع ذکر نہیں کی۔ فرماتے ہیں یہ حدیث متصل ثابت نہیں ہے اور مرسل صواب کے قریب تر ہے۔ اس حدیث کو امام شافعی نے مرسل روایت کیا ہے۔ نسائی اور ابو داؤد نے مکرّم عن ابن عباس سے بھی اسی طرح روایت کی ہے۔ الحافظ فرماتے ہیں اس کی استاد اصح ہے۔ امام نووی نے بھی اس پر صحت کا اطلاق کیا ہے۔ ابن الجوزی نے اس حدیث کو موضوعات میں نقل کیا ہے حالانکہ اسناد صحیح کے ساتھ ذکر کی ہے۔ احمد بن حنبل سے نقل کیا ہے کہ اس کے متعلق کوئی چیز ثابت نہیں ہے اور اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

ابی داؤد فرماتے ہیں علماء کا حدیث کے الفاظ کا معنی بیان کرنے میں اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں "لا ترفع یدک لاس" کا

مطلب یہ ہے کہ جو شخص اس سے بدکاری کا ارادہ کرتا ہے وہ اسے منع نہیں کرتی۔ ابو عبیدہ نسائی، ابن الاعرابی خطابی، فریابی نووی نے بھی یہی معنی بیان کیا ہے اس مسئلہ میں بنوئی اور رافعی وغیرہما کے استدلال کا مقصد بھی یہی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ فضول خرچ ہے جو اس سے خاندان کو کوئی مال طلب کرتا ہے وہ کسی کو منع نہیں کرتی۔ یہ معنی امام احمد، اسمعی اور محمد بن نصر نے کیا ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے زانیہ کے نکاح کے مسئلہ میں استدلال کرنا ممکن نہ ہوگا۔

علامہ بنوئی فرماتے ہیں روایت ہے کہ عمر بن خطاب نے ایک مرد اور عورت کو زنا کی سزا دی اور پھر ان دونوں کو جمع کرنے کا ارادہ کیا تو مرد نے انکار کر دیا (1)۔ طبرانی اور دارقطنی نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث نقل کی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے اس شخص کے متعلق پوچھا گیا جس نے کسی عورت سے زنا کیا تھا اور پھر اس نے اسی عورت سے نکاح کا ارادہ کیا تھا۔ فرمایا حرام فعل حلال فعل کو حرام نہیں کرتا۔ (2) مصنف عبد الرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اس شخص کے متعلق پوچھا گیا جس نے کسی عورت سے بدکاری کی پھر اس نے اس سے نکاح کرنا چاہا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا اس کا پہلا فعل بدکاری ہے اور دوسرا نکاح ہے (3)۔

وَالَّذِينَ يَدْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَمْرٍ بَعْدَ شَهَادَةٍ فَاجْلِدُوا لَهُمْ سَبْعِينَ
جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا وَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿٤١﴾

”اور وہ لوگ جو تہمت لگاتے ہیں، پاکدامن عورتوں پر، پھر وہ نہ پیش کر سکیں چار گواہوں سے تو لگادو ان (تہمت لگانے والوں) کو اسی درجے اور نہ قبول کرنا ان کی کوئی گواہی ہمیشہ کے لئے ہے، اور وہی لوگ فاسق ہیں۔“

ابن عربون کا معنی تہمت لگانا ہے لیکن یہاں صریح الفاظ کے ساتھ زنا کی تہمت لگانا مراد ہے اور اس قید پر علامہ تفسیر اور فقہ کا اجماع ہے اور اس مخصوص معنی کا قرینہ چار گواہوں کا ہونا ہے۔ جو شخص کسی دوسرے گناہ کی تہمت لگائے تو اس پر حد نقد یا اجماع نہ ہوگی لیکن حاکم حنفی سزا مناسب سمجھے دے سکتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی نے اشارۃً زنا کی تہمت لگائی مثلاً یہ کہا میں زانی نہیں تو اس پر حد قائم نہ ہوگی۔ امام ابو یوسف، الشافعی، احمد، سفیان، ابن سیرین اور حسن بن صالح کا یہی مسلک ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں اشارۃً تہمت زنا لگانے سے بھی حد قائم ہوگی۔ امام احمد سے بھی ایک یہی روایت مروی ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل حضرت ابن عمر کی حدیث ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اشارۃً زنا کی تہمت لگانے سے بھی حد لگاتے تھے۔ اس حدیث کی سند اس طرح ہے زہری عن سالم عن ابن عمر۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے بھی تعریض کی بنا پر ایک شخص کو کوڑے لگائے تھے کیونکہ جب مراد معلوم ہو جائے تو وہ کلام صریح ہو جائے گا۔ ہم کہتے ہیں اشارہ (تعریض) تعریض کی مانند نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ عدو کے اندر تعریضاً نکاح کا پیغام دینا عورت کو جائز ہے لیکن صراحتاً نکاح کا پیغام دینا جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِيَ بَيْعُكُمْ

خُطْبَةُ النِّسَاءِ۔

عَلِ الْمُحْصَنَاتِ سے مراد پاکدامن عورتیں ہیں لیکن پاکدامن مرد بھی اس حکم میں داخل ہیں کیونکہ نص کا مقصود اس عار اور شرمندگی کو دور کرنا

ہے جو ان کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ یہ ایسی بات ہے جس کا سمجھنا مجتہد پر موقوف نہیں ہے بلکہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ پاکدامن مرد پر تہمت لگانے والے پر سزا کا حکم اجرام امت سے ثابت ہے اور یہاں صرف پاکدامن عورتوں کا ذکر آیا تو اس لئے فرمایا کیونکہ خاص ان کا واقعہ ذکر ہو رہا تھا یا عورتوں پر تہمت لگانا زیادہ ہوتا ہے۔ اور زیادہ برا ہوتا ہے اور احسان کا معنی یہ ہے کہ وہ شخص جس پر تہمت لگائی گئی ہے وہ آزاد و عاقل بالغ "مسلمان پاکدامن ہو اور اس پر پہلے کبھی زنا کی تہمت نہ لگائی گئی ہو۔

جمہور علماء کے نزدیک حضور ﷺ کے ارشاد "مَنْ أَشْرَكَ بِاللَّهِ فَلَيْسَ بِمُحْصَنٍ" کا یہی مہمل ہے جیسا کہ پچھلے تفصیل سے گزر چکا ہے۔ پس جس نے اپنی عمر میں ایک مرتبہ زنا کیا پھر توبہ کی اور اپنی حالت کو نیک بنالیا پھر طویل عمر بسر کی اس کے بعد کسی نے اس پر زنا کی تہمت لگائی تو تہمت لگانے والے کو حد نہیں لگائی جائے گی۔ کیونکہ گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص کی مانند ہو جاتا ہے جس کا کوئی گناہ نہ ہو۔ اسی طرح غلام بچہ اور پائل پر تہمت لگانے والے کو بھی حد نہیں لگائی جائے گی کیونکہ تہمت لگانے والا سچا ہے لیکن تہمت لگانے والے کو تعزیر لگائی جاتی ہے۔ وہ خود سے دکایت ہے کہ غلام پر تہمت لگانے والے کو حد لگائی جائے گی۔

یعنی اگر وہ شخص جس پر الزام ہے وہ خود اپنے اوپر زنا کا اقرار کر لے یا تہمت لگانے والے چار گواہ پیش نہ کر سکیں تو انہیں اسی (80) دور سے لگاؤ۔ اور اگر وہ شخص جس پر الزام ہے وہ خود اپنے اوپر زنا کا اقرار کر لے یا تہمت لگانے والے چار گواہ پیش کر دیں تو تہمت لگانے والے سے حد ساقط ہو جائے گی۔ اگر چار افراد متفرق طور پر زنا پر گواہی دیں تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مقذوف (جس پر تہمت لگائی گئی ہے) پر حد واجب نہ ہوگی جیسا کہ پہلے ہم نے بیان کیا ہے لیکن اہل شہادت کے پائے جانے کی وجہ سے قاذف (تہمت لگانے والے) سے حد قذف ساقط ہو جائے گی۔ حد زنا کو دور کرنے کے لئے احتیاطاً کبھی گواہی دینا شرط قرار دیا گیا ہے۔ حد قذف کے وجوب کے لئے ایسا نہیں کیا گیا بلکہ حد ناکا کو دور کرنے کے لئے یہ شرط اجتماع رکھی گئی ہے اسی طرح اگر مقذوف ایک مرتبہ اقرار کرے تو اس پر حد واجب نہ ہوگی اور نہ ہی قاذف پر حد واجب ہوگی۔ اس آیت کریمہ میں شہداء و سزاوردہ لوگ ہیں جو شہادت کے اہل ہوں۔ اگر چار مرد کسی مرد کے خلاف زنا کی گواہی دیں جبکہ وہ اندھے ہوں یا محدودنی القذف ہوں یا ان میں سے ایک غلام ہو یا ایک ان میں سے محدودنی القذف ہو تو نہ گواہوں پر حد قذف ہوگی اور نہ مشہود علیہ (جس کے خلاف گواہی ہوئی ہے) پر کیونکہ وہ ادا، شہادت کے اہل نہیں ہے پس ان کا ہونا نہ ہونے کی طرح ہے اور غلام عدم ولایت کی وجہ سے تحمل شہادت اور ادا، شہادت دہوں کا اہل نہیں ہے۔ پس زنا کا شہ ثابت نہ ہوا کیونکہ زنا ادا، شہادت کے ساتھ ثابت ہوتا ہے۔ اگر گواہ گواہی دیں اور وہ قاسق و فاجر ہوں تو پھر نہ گواہوں پر حد قذف ہوگی اور نہ مقذوف پر کیونکہ قاسق ادا، شہادت اور تحمل شہادت کے اہل تھے لیکن ان کی ادا، کبھی میں فسق کی وجہ سے قصور اور کی ہے۔ پس ان کی شہادت سے زنا کا شہ ثابت ہو جائے گا۔ پس گواہوں پر حد قذف نہ ہوگی اور مقذوف پر حد زنا نہ ہوگی۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قاسق گواہوں کو حد قذف لگائی جائے گی کیونکہ وہ غلاموں کی طرح اہل شہادت سے نہیں ہیں۔

اس آیت کریمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر گواہ چار سے کم ہوں تو انہیں حد قذف لگائی جائے گی، کیونکہ انہوں نے الزام لگایا ہے۔ چار گواہوں سے تعداد کم ہونے کی صورت میں انہیں معلوم ہے کہ زنا کی گواہی دینے کے ہم قائل نہیں ہیں تو ایسی حالت میں گواہی دینا کسی نیک نیتی پر مبنی نہیں ہے۔ حاکم نے المستدرک میں تینبی اور ابو نعیم نے المعروف میں اور ابو یوسف نے الدلائل میں کئی طرق سے روایت کیا ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ کے خلاف ابو بکرہ نافع اور شبل بن معبد نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عدالت میں زنا کی گواہی دی

جبکہ چوتھے گواہ زیادہ واضح گواہی نہ دے سکے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابہ کرام کی موجودگی میں تینوں گواہوں کو کوزے لگائے اور کسی صحابی نے انکار نہ کیا۔ اسی حدیث کو عبد الرزاق نے عن الثوری عن سلیمان التیمی عن ابی النہدی عنی کے سلسلہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ اس میں ہے کہ جب زیاد نے انکار کیا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا یہ شخص صرف حق کی گواہی دیتا ہے پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے گواہوں کو کوزے لگائے (۱)۔

یہ مقدمہ کے مطالبہ کے بعد تہمت لگانے والوں کو کوزے لگائے جائیں گے۔ اس پر اجماع ہے کیونکہ اس میں بندے کا حق ہے اگرچہ وہ مغلوب ہے۔ اگر تہمت لگانے والے آزاد ہیں تو انہیں اسی درجے لگائے جائیں گے اور اگر غلام ہیں تو ہر ایک کو چالیس درجے لگائے جائیں گے۔ اس پر بھی فقہاء کا اجماع ہے۔ اور اتباع کی سند حد زنا پر قیاس ہے جس کا غلاموں کے حق میں نصف ہونا نفس سے ثابت ہے ارشاد ہے: **فَعَلَيْهِمْ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُعْتَدِلِ مِنَ الْعَذَابِ**۔ (تو ان پر اس سزا کا نصف ہے جو آزاد عورتوں کے لئے ہے) امام بیہقی نے اپنی سند سے عبد اللہ بن عامر بن ربیع سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں میں نے ابو بکر عثمان اور بعد کے خلفاء کو پایا ہے لیکن میں نے کسی کو نہیں دیکھا مگر انہوں نے تہمت لگانے والے غلام کو چالیس درجے لگائے (۲)۔ امام مالک نے بھی یہی روایت ذکر کی ہے لیکن اس میں ابو بکر کا ذکر نہیں ہے۔ امام اوذانی فرماتے ہیں غلام کی حد قذف آزاد آدمی کی حد کی مثل ہے (۳)۔

یہ اس کا عطف فاجلہ وار ہے اور مبتدا میں شرط کا معنی پائے جانے کی وجہ سے یہ جزا ہے اور یہ حکم احناف کے نزدیک حد کا تہمہ ہے، کیونکہ کوزوں اور شہادت کے قبول نہ کرنے کے دونوں حکم مطلب کے صیغہ کے ساتھ ذکر کئے گئے ہیں اور حکم اللہ کی طرف منسوب ہیں۔ جبکہ اولنک ہم الفاسقون۔ مستقل کلام ہے اور جملہ اسمیہ سے اسے خبر کے طریق پر ذکر کیا گیا ہے جس کی طلب کے فعل کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں ہے، بلکہ یہ اس حد کے لئے قذف کے سبب ہونے کا اعتبار کے شہ کو دور کرنے کے لئے ہے جو حد شہادت کی وجہ سے ساقط ہو جاتی ہے۔ (یعنی حد تو کسی شہ سے بھی ساقط ہو جاتی ہے تو یہاں حد لگانے کا حکم کیوں دیا گیا ہے۔ اس شہ کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ جملہ ارشاد فرمایا کیونکہ قذف خبر سے جو صدق و کذب کا احتمال رکھتی ہے اور کبھی قاذف ثواب کی نیت سے شہادت دیتا ہے۔ تو ہم کے رفع کا بیان یہ ہے کہ وہ فاسق ہیں بغیر کسی وجہ کے عفت کی رد اور کوتاہی کے نافرمانی کرنے والے ہیں۔ پھر جب وہ چار گواہ پیش کرنے سے عاجز آگئے تو عقوبت کے مستحق بن گئے۔

امام شافعی فرماتے ہیں **الْقَبُولُ** ابھی علیحدہ کلام ہے اور حد میں شامل نہیں ہے کیونکہ یہ حد کے مناسب نہیں ہے کیونکہ حد ایسا فعل ہے جس کا قیام امام پر لازم ہوتا ہے نہ کہ فعل کو حرام کرنا ہوتا ہے اور **اولنک ہم الفاسقون** شہادت کے رد کے لئے مقام تعقل میں ہے۔ ہم کہتے ہیں بلکہ لا تقبلو الحد کے مناسب ہے کیونکہ حد کا مقصود جزو توجیح ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گواہی کے رد میں جو جزو توجیح ہے وہ سزا سے زیادہ ہے اس پر ابدال کا قول بھی دلیل ہے کیونکہ فسق ہمیشہ شہادت کے رد کا سبب بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا بلکہ فسق اس وقت تک رد شہادت کا باعث ہے جب تک وہ فاسق ہے۔ یہ نہ کہا جائے کہ لا تقبلوا الخ سے مراد یہ ہے کہ وہ جب تک قذف پر مصر ہے اس وقت تک اس کی شہادت قبول نہ ہوگی پھر جب وہ توبہ کر لے گا تو اس کی شہادت قبول ہوگی جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ کافر کی شہادت ہمیشہ کے لئے مقبول نہیں ہے اور اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ جب تک وہ کافر ہے اس کی شہادت قبول نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کافر کی شہادت

کا قبول نہ ہوتا جب تک کہ وہ کافر ہے یہ لا تقبل شہادۃ الکافر کے قول سے سمجھا جاتا ہے، اس میں ابداء کے قول کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ آپ دیکھتے ہیں کہ اسم شہیق کی طرف حکم کو منسوب کرنا ماخذ کے علت ہونے کی دلیل ہوتا ہے اور شہادت کے عدم قبولیت کے لئے کفر کا علت ہونا اس بات کا منقضى ہے کہ جب تک کفر ہے شہادت قبول نہ ہوگی۔ پس اس مثال (لا تقبل شہادۃ الکافر ابداء) میں ابداء لغوی ہے یہ احتمال نہیں رکھتا کہ کلام الہی اس کی نظیر ہو۔

إِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ①

”عمر (ان میں سے) وہ لوگ جو توبہ کر لیں ایسا بہتان لگانے کے بعد اور اپنی اصلاح کر لیں تو بیشک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔“

۱۔ امام ابوعلیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ استثناء آخری، جملہ کی طرف راجع ہے اور اس کا محل نصب ہے کیونکہ احناف کا اصول ہے کہ استثناء جب معطوف کلام کے بعد ہو تو وہ استثناء آخری جملہ کی طرف لوثی ہے! بشرطیکہ کوئی ایسا قرینہ نہ ہو جو استثناء کو تمام جملوں کی طرف لوٹانے کا موجب ہو کیونکہ آخری جملہ استثناء سے متصل ہوتا ہے اور یہاں آخری جملہ (اولئک ہم الفاسقون) اپنے اسلوب کے اعتبار سے پہلے جملوں سے منقطع ہے اگرچہ ضمیر یا اسم اشارہ کے اعتبار سے متصل ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آخری جملہ سابقہ کلام سے انقطاع کے سبب مستثنیٰ اور پہلے دو جملوں کے درمیان حاصل ہے۔ پس اتصال متحقق ہی نہیں ہے جو کہ استثناء کی شرط ہوتا ہے استثناء کو ماقبل کلام کی طرف لوٹایا جاتا ہے کیونکہ وہ مستقل کلام نہیں ہوتا۔ اور ایک جملہ کی طرف لوٹانے سے یہاں ضرورت پوری ہوگی۔ جب آخری جملہ کی طرف بالاتفاق لوٹ رہا ہے تو مزید ماقبل کی طرف لوٹانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ کیونکہ جب کلام میں استثناء وارد ہو تو ابتدائی کلام کا اس پر موقوف ہونا لازم ہوتا ہے۔ اور ضرورت ایک جملہ کے موقوف ہونے کے ساتھ جب پوری ہو جاتی ہے تو مزید جملوں کی طرف نہیں لوٹایا جائے گا۔ اور یہ بھی نہ کہا جائے کہ واو عطف اور تشریح کے لئے ہے اس لئے استثناء میں جملوں کے اشتراک کا فائدہ دے رہی ہے کیونکہ عطف حکم میں جملہ نامہ کی شرکت کو مفید نہیں ہے، باوجودیکہ عطف اعراب اور حکم میں شرکت کے لئے لایا جاتا ہے۔ پس استثناء میں شرکت کے لئے مفید نہیں ہے کیونکہ استثناء سے کلام کا حکم تبدیل ہو جاتا ہے۔ پس ہر جملے کی شرکت استثناء میں نہ ہوگی۔

امام شافعی فرماتے ہیں استثناء مکمل کلام کی طرف راجع ہے اور اس کا محل نصب ہے۔ پس ان کے نزدیک حد قوف بھی توبہ کے ساتھ ساقط ہو جاتی ہے (۱) جمہور علماء کے نزدیک حد توبہ سے ساقط نہیں ہوتی۔ امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں استثناء آخری دو جملوں کی طرف لوٹ رہی ہے اور استثناء کا محل مجرور ہے۔ ان دونوں قولوں کی بنیاد وہ اصل ہے جو امام شافعی وغیرہ کے اصول میں درج ہے۔ کہ عدم قرینہ کی صورت میں استثناء تمام معطوف جملوں کی طرف لوثی ہے۔ لیکن امام شافعی فرماتے ہیں لا تقبلوا کا جملہ سابقہ کلام سے منقطع ہے حد میں داخل نہیں ہے۔ پس اسکے منقطع ہونے کی وجہ سے پہلے جملہ کی طرف استثناء راجع نہ ہوگی اور دوسرے دو جملوں کی طرف راجع ہوگی۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں استثناء تمام جملوں کی طرف راجع ہے (۲) اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ توبہ کی وجہ سے حد بھی ساقط ہو جائے

گی، جیسا کہ بعض علماء نے کہا ہے کیونکہ مکمل توبہ حد کو قبول کرنا یا عقد و ف سے اس الزام کو حلال کرنا ہے۔

میں کہتا ہوں توبہ سے مراد اندامت اور استغفار ہے اگر اس سے حد کا سقوط فرض کیا جائے تو قاذف پر استسلام (تسلیم کرنا) واجب نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں بہت لگانے والے کی شہادت، نفس قذف کی وجہ سے رد کی جائے گی اگرچہ مقدوف حد کا مطالبہ نہ بھی کرے۔ کیونکہ اس کا فسق ظاہر ہو چکا ہے۔ پھر جب وہ توبہ کرے گا اور اپنے قول پر شرمندہ ہوگا اور اپنی حالت درست کر لے گا تو اس کی گواہی قبول کی جائے گی خواہ حد کے قیام کے بعد توبہ کر لے یا حد سے پہلے توبہ کر لے۔ توبہ کے بعد اس کی شہادت قبول ہوگی اور فسق کا اسم اس سے زائل ہو جائے گا۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہی مسلک حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے اور سعید بن جبیر، مجاہد، عطاء، طاؤس، سعید بن المسیب، سلیمان بن یسار، اشعثی، حکم، عمر بن عبد العزیز اور زہری کا بھی یہی قول ہے (1)۔ امام بغوی لکھتے ہیں امام شافعی فرماتے ہیں قاذف حد لگنے سے پہلے زیادہ برا تھا نسبت اس وقت کے جب اسے حد لگائی گئی کیونکہ حد و نکارات ہیں پھر بہتر حالت میں ہونے کے وقت اس کی شہادت کیوں رد ہوگی۔ اور بری حالت میں اس کی گواہی کیسے قبول ہوگی (2) ہم کہتے ہیں قاذف کی شہادت نفس قذف کی وجہ سے رد ہو جائے گی کیونکہ اس کا فسق ظاہر ہو گیا ہے۔ اگر مقدوف حد کا مطالبہ نہ کرے تو نہ اس کو حد لگائی جائے گی اور جب تک توبہ نہ کرے اس کی شہادت بھی قبول نہ ہوگی۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ الالذبین تا بوا و اصلحو کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا توبہ کرنا ان کا اپنے نفسوں کو بچھلانا ہے۔ اگر وہ اپنے نفسوں کو بچھلادیں (یعنی توبہ کر لیں) تو ان کی شہادت قبول ہوگی۔ یہ حدیث اگر صحیح ہے تو امام شافعی کے لئے جہت ہے لیکن میں کہتا ہوں اخبار احاد بعض قرآنی کے معارض ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہیں، یعنی نفس قرآنی ہے لا تقبلوا لہم شہادۃ ابداء۔ اگر وہ توبہ کر لیں تو ان کے فسق کے زوال کی وجہ سے ان کی شہادت قبول ہوگی۔ اگر مقدوف حد کا مطالبہ کرے تو قاذف کو حد لگائی جائے گی اور اسے اسی (80) کوڑے لگائے جائیں گے اور اس کی شہادت کبھی قبول نہ ہوگی خواہ وہ توبہ کرے یا نہ کرے، کیونکہ شہادت کا مردود ہونا حق عہد کی وجہ سے ہے اور حق العہد توبہ سے ساقط نہیں ہوتا۔ پس امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہم پر لازم نہیں آتا کہ "بہتر حالت میں اس کی شہادت مردود ہوگی اور بری حالت میں اس کی شہادت مقبول ہوگی۔"

اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حد قذف میں دو حق جمع ہوتے ہیں۔ 1۔ حق اللہ۔ 2۔ حق العہد۔ کیونکہ یہ حد عقد و ف سے عار کو رد کرنے کے لئے شروع کی گئی ہے اور مقدوف خاص طور پر اس سے مشتق ہوتا ہے اس لئے یہ حق العہد ہے۔ پھر یہ گناہ سے روکنے اور جرز و توبخ کے لئے شروع کی گئی ہے اس لئے اس کو حد کہا جاتا ہے۔ اور زوج کی مشروعیت سے مقصود عالم دنیا کو فساد سے خالی کرنا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے حق کی علامت ہے اس کے حق عہد ہونے کی بنا پر مقدوف کا مطالبہ شرط قرار دیا گیا ہے۔ اور تاخیر کی وجہ سے شہادت باطل نہیں ہوتی اور یہ حد مستامن پر بھی واجب ہوتی ہے۔ قاضی اپنے علم سے اس حد کو قائم کر سکتا ہے۔ جب ایام قضاء میں اسے اس کا علم ہو لیکن جب دلائل سے پہلے اسے اس حد کا علم ہو تو حد قائم نہ کرے حتیٰ کہ اس کے سامنے گواہی قائم ہو۔ اور حد قذف کو مقدم کیا جائے گا حد زنا اور حد سرتہ (چوری) پر جب یہ حدود جمع ہو جائیں۔ قذف کا اقرار کرنے کے بعد رجوع صحیح نہیں ہے۔ اور اس حد کے حق اللہ ہونے کی وجہ سے مقدوف کو خود قائم کرنا جائز نہیں ہے بلکہ امام کے لئے اس کا قائم کرنا ضروری ہے اور شہادت کی وجہ سے یہ حد مردود ہو جاتی ہے

اور یہ حد ساقط ہونے کے بعد مال (جرمانہ) میں تبدیل نہیں ہوتی اور قاذف سے اس پر قسم بھی نہیں لی جائے گی اور باقی تمام عقوبات کی طرح جو حقوق اللہ ہیں غلامی کی وجہ سے یہ بھی نصف (آدمی) ہو جائے گی۔ بخلاف حق العبد کے کہ اس کا انداز و تلف شدہ چیز کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ تلف کرنے والے کے مختلف ہونے سے اس میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ یہ تمام فروع اس پر متفق ہیں اور اس میں اختلاف ہے کہ حق اللہ اور حق العبد میں غلبہ اس کا کوہا جائے گا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ سیلان اس طرف ہے کہ بندہ محتاج ہے اس لئے اس کے حق کو غلبہ دیا جائے گا، جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات غنی و مستغنی ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ یہ ہے کہ حق اللہ کو غلبہ ہونا چاہئے کیونکہ بندہ جس کا مالک ہوتا ہے اس کا مالک بھی اس کا مولیٰ (آقا) ہوتا ہے۔ پس بندہ کے حق کی رعایت بھی اس کے آقا کی وجہ سے ہے۔ لیکن اس کا برعکس اس طرح نہیں ہے کیونکہ بندہ کو حقوق اللہ وصول کرنے کا اختیار نہیں ہے مگر نائب الہی ہونے کی حیثیت سے اسے یہ اختیار ہے۔ اس اصول میں اختلاف کی بنا پر دوسری فروع میں بھی اختلاف ہے۔ مثلاً میراث امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حد قذف میں میراث جاری ہوگی اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک میراث جاری نہ ہوگی کیونکہ حقوق اللہ میں میراث جاری نہیں ہوتی اور حقوق العباد میں میراث جاری ہوتی ہے، بشرطیکہ وہ مال ہو یا مال کے حکم میں ہو۔ جیسے نکاح ہے یا حد جن جو مال کی طرف تبدیل ہو جاتا ہے۔ جیسے قصاص ہے۔ اور حد ایسی چیزوں میں سے نہیں ہے اس لئے مقذوف کے مرنے کے ساتھ یہ حد قذف باطل ہو جاتی ہے کیونکہ کسی دلیل شرعی کے ساتھ شریعت کا وارث کو وظیفہ بنانا ثابت نہیں ہے، جس کو مطالبہ کا حق ہو جو حق کے ظہور کیلئے شرط ہے۔

پس جو کسی پر الزام لگائے اور پھر حد کے قائم کرنے سے پہلے مقذوف مر جائے یا بعض حد کے قائم کرنے کے بعد مر جائے تو ہمارے نزدیک باقی حد ساقط ہو جائے گی۔ لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حافظہ نہ ہوگی۔ اسی طرح غلو ہے اگر کوئی شخص حد کے ثبوت کے بعد قاذف کو معاف کر دے تو پھر بھی ہمارے نزدیک حد ساقط نہ ہوگی جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اور ایک روایت کے مطابق امام ابو یوسف کے نزدیک حد ساقط ہو جائے گی۔ لیکن اگر مقذوف کہے کہ اس نے مجھ پر الزام دہن نہیں لگایا میرے گواہوں نے جھوٹ بولا ہے تو اس وقت بالاتفاق حد ساقط ہو جائے گی، کیونکہ جب ظاہر ہو گیا کہ قذوف پایا نہیں گیا تو حد بھی واجب نہ ہوگی اس کا یہ مطلب نہیں کہ حد واجب ہوئی اور پھر ساقط ہوگئی۔ بخلاف قصاص کے کہ وہ واجب کے بعد معاف کرنے کے ساتھ ساقط ہو جاتا ہے، کیونکہ قصاص میں حق العبد غالب ہے۔ اسی طرح حد قذف میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عوض جائز نہیں ہے۔ امام مالک کا بھی یہی قول ہے۔ امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک عوض جائز ہے۔ اسی طرح حد قذف میں امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے نزدیک تداخل جاری ہوتا ہے یعنی اگر کسی نے کسی شخص پر بار بار الزام لگایا یا ایک جماعت پر الزام لگایا تو اس پر ایک حد جاری ہوگی بشرطیکہ دونوں مقذوفوں کے درمیان حد قائم نہ کی گئی ہو۔ اگر کسی نے دعویٰ کیا کہ فلاں نے مجھ پر جھٹ لگائی ہے اسے حد لگائی جا رہی تھی کہ کسی دوسرے نے بھی دعویٰ کر دیا تو وہ وہی حد مکمل کی جائے گی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حد قذف میں تداخل نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں جب یہ ثابت ہے کہ حد قذف میں حق اللہ اور حق العبد جمع ہیں، جیسا کہ مسائل متفقہ اس پر دلالت کرتے ہیں اور یہ بھی ثابت ہے کہ حد و شہادت کی وجہ سے دور ہو جاتی ہیں تو یہ کہنا بہتر ہے کہ جب دونوں حقوق میں سے ایک حد کے وجوب کا تقاضا کرے اور دوسرا ساقط کا تقاضا کرے تو ساقط کا فتویٰ دینا ضروری ہے، کیونکہ غلو میں خطا عقوبت میں خطا سے بہتر ہے۔ پس ارث کے جاری ہونے کا قول نہیں کیا جائے گا۔ جیسا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔ اور مقذوف کے معاف کرنے کے ساتھ اس مطالبہ کے

مستوفی کی وجہ سے حد کے سقوط کا قول کیا جائے گا جو استیفاء حد کے لئے شرط ہے، جیسا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔ اور اس میں تدخل جاری ہوگا جیسا کہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ اگر قاذف اور مقدمہ وف حد کو ساتھ کرنے کے لئے عرض پر صلح کر لیں تو مقدمہ وف سے رضا حاصل ہو جائے گی لیکن اس حد کے کن اللہ ہونے کے احتمال کی وجہ سے قاذف پر مال واجب نہ ہوگا۔

امام بخاری نے اپنی صحیح میں ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ بلال بن امیہ نے اپنی عورت پر زنا کی تہمت لگائی۔ نبی کریم ﷺ کے پاس شریک بن حمام بھی موجود تھے نبی کریم ﷺ نے فرمایا، دلیل قائم کرو یا تیری پیٹھ پر حد لگے گی۔ اس نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ جب ہم اس سے کوئی اپنی بیوی کے پاس کسی دوسرے مرد کو پائے تو وہ بیڑہ (دلیں) تلاش کرنے لگے۔ نبی کریم ﷺ یہی فرماتے تھے دلیل قائم کرو ورنہ تیری پیٹھ پر حد جاری ہوگی۔ بلال نے کہا تم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ بیشک میں سچا ہوں یقیناً اللہ تعالیٰ ایسا کلام نازل فرمائے گا جس کی وجہ سے مجھے حد نہیں لگے گی۔ پس اسی وقت جبرائیل تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام آیا۔

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ أَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ شُهَدَاءُ إِلَّا أَنفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ أَحَدِهِمْ أَرْبَعُ شَهَدَاتٍ بِاللَّهِ إِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ ①

”اور وہ (خاندان) جو تہمت لگاتے ہیں اپنی بیویوں پر، اور نہ ہوں ان کے پاس کوئی گواہ بجز اپنے ہی۔ تو ان کی شہادت یہ طریقہ ہے کہ وہ خاندان چار مرتبہ گواہی دے کہ بخدا وہ (تہمت لگانے میں) سچا ہے۔“

ل۔ جب یہ آیت پڑھی تو بلال آئے اور لعان کیا (یعنی پانچ مرتبہ گواہی دی) اور اس وقت نبی کریم ﷺ فرما رہے تھے بیشک اللہ جانتا ہے کہ تم میں سے ایک جھوٹا ہے کیا تم میں سے کوئی تو یہ کرنے والا ہے۔ پھر عورت کھڑی ہوئی اور اس نے گواہیاں دیں۔ جب پانچویں مرتبہ گواہی دینے لگی تو لوگوں نے اسے روکا اور کہا کہ یہ پانچویں گواہی حکم کو ثابت کر دے گی (۱)۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں وہ تھوڑی دیر کے لئے رک گئی اور پیچھے ہٹ گئی۔ ہم نے سوچا کہ وہ رجوع کرے گی پھر اس عورت نے کہا میں اپنی قوم کو رسوا نہیں کرتی پھر اس نے پانچویں مرتبہ بھی قسم اٹھادی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم دیکھو اگر یہ عورت سرگھیس آنکھوں والا بڑی سرین والا بڑی بڑی پنڈلیوں والا بچہ دینے تو وہ شریک بن سحاک کا ہوگا۔ حضور ﷺ نے جو نشانیاں بیان فرمائی تھیں بالکل ویسا بچہ اس نے جنم دیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر کتاب اللہ کا فیصلہ نہ ہو چکا ہوتا تو میرا اور اس عورت کا معاملہ کچھ اور ہوتا (۲)۔

صحیحین میں سہل بن سعد الساعدی سے مروی ہے فرماتے ہیں جو میرا لعمالی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ کا کیا ارشاد ہے اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس کسی دوسرے شخص کو دیکھے تو کیا وہ خود اسے قتل کر دے (اور اگر وہ ایسا کرے) تو تم اسے قتل کر دو گے یا پھر وہ کیا کرے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تیرے اور تیری بیوی کے متعلق حکم نازل فرمایا ہے جاؤ بیوی کو لے آؤ۔ سہل فرماتے ہیں ان دونوں میاں بیوی نے مسجد میں لعان کیا جبکہ میں بھی لوگوں کے ساتھ حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر تھا۔ جب وہ دونوں فارغ ہوئے تو جو میر نے کہا یا رسول اللہ ﷺ اب اگر میں اس عورت کو اپنے پاس رکھوں تو پھر میں جھوٹا ہوں۔ پھر انہوں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں۔ پھر نبی کریم ﷺ نے فرمایا دیکھو اگر یہ عورت سیاہ رنگ سیاہ آنکھوں والا بڑی سرین والا اور مومن

پنڈیوں والا بچہ بنے تو پھر میرے گمان کے مطابق عویر سچا ہے اور اگر وہ سرخ بچہ بنے تو میرے گمان کے مطابق عویر جھوٹا ہوگا۔ عورت نے بالکل اس صفت پر بچہ جنا جس کی تصدیق عویر کے حق میں تھی اس کے بعد وہ بچہ ماں کی طرف منسوب کیا جاتا تھا (۱)۔

امام احمد نے حضرت نکر مدین ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ جب الولدین یومون المہصنات النخ کی آیت نازل ہوئی تو سعد بن عبادہ جو انصار کے سردار تھے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کیا یہ آیت اسی طرح نازل ہوئی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا اے انصار! سنتے ہو تمہارا سردار کیا کہہ رہا ہے؟ انصار نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ان کو ملامت نہ فرمائیے یہ غیور آدمی ہے۔ قسم بخدا اس نے ہمیشہ ہا کرہ (کنواری) عورت سے شادی کی ہے اور اس نے کسی عورت کو طلاق نہیں دی ہے تاکہ کوئی دوسرا اس عورت سے نکاح نہ کرے۔ اور یہ سب کچھ اس کی شدت غیرت کی وجہ سے ہے۔ حضرت سعد نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہو جائیں۔ قسم بخدا میں جو جانتا ہوں یہ حق ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا ہے، لیکن مجھے توبہ ہو رہی ہے کہ میں کسی بد بخت کو دیکھوں کہ وہ میری بیوی پر سوار ہے اور مجھے اجازت نہیں ہے کہ میں اسے برا بھلا کہوں اور نہ اس کے خلاف زبان بلاؤں حتیٰ کہ چار گواہ لے آؤں۔ قسم بخدا میں چار گواہ لاؤں گا تو وہ اپنی خواہش پوری کر چکا ہوگا۔ راوی فرماتے ہیں تھوڑی دیر گزری تو بلال بن امیہ آئے (یہ ان گن میں سے ایک ہیں جن کی توبہ قبول ہوئی تھی) وہ عشاء کے وقت اپنی زمین سے واپس آئے تو اپنی بیوی کے پاس ایک شخص کو پایا۔ انہوں نے سارا معاملہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا لیکن اسے کچھ نہ کہا۔ جب صبح ہوئی تو بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میں عشاء کے وقت اپنے گھر آیا تو اپنی بیوی کے پاس ایک مرد کو پایا اور سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی بات کو ناپسند فرمایا اور آپ ﷺ کو یہ سن کر انتہائی کوفت ہوئی۔ انصار جمع ہوئے اور کہنے لگے جو کچھ سعد بن عبادہ نے کہا ہے اس کی وجہ سے ہم آزمائش میں ڈالے گئے ہیں۔ ابھی رسول اللہ ﷺ بلال بن امیہ کو مزادیں گے اور اس کی گواہی بھی مردود ہو جائے گی۔ بلال نے کہا تم بخدا مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ میری خلاصی کی کوئی صورت پیدا فرما دے گا۔ قسم بخدا رسول اللہ ﷺ نے اسے سزا دینے کے حکم کا ارادہ فرمایا ہی تھا کہ وحی نازل ہوئی۔ صحابہ کرام سب ٹھہر گئے حتیٰ کہ جب وحی کی کیفیت ختم ہوئی تو یہ ارشاد پڑھ کر سنایا الولدین یومون ازواجہم الایۃ۔ ابولیس نے اس کی مثل حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کی ہے۔ امام بغوی نے یہ حدیث نقل کی ہے اور اس کے آخر میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا اے ہلال مبارک، ہوا اللہ تعالیٰ نے تیری خلاصی کی صورت پیدا فرمادی ہے۔ ہلال نے کہا بخدا اللہ تعالیٰ سے یہی توقع اور امید تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورت کو بلاؤ وہ آئی اور دونوں آپ ﷺ کے پاس جمع ہو گئے تو عورت کو لعان کرنے کو کہا گیا۔ اس نے خاندان کو بھلا دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم میں سے ایک جھوٹا ہے کیا تم میں سے کوئی توبہ کرنے والا ہے۔ ہلال نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ قربان ہوں میں سچا ہوں اور جو کچھ میں نے کہا ہے وہ سچ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان کے درمیان لعان کرو۔ حضرت ہلال کو کہا گیا گواہی دو تو انہوں نے چار گواہیاں دیں کہ اللہ کی قسم میں سچا ہوں پانچویں مرتبہ شہادت دینے سے پہلے آپ ﷺ نے حضرت ہلال سے فرمایا اے ہلال اللہ سے ڈرو دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب سے آسان ہے اور اللہ کا عذاب لوگوں کے عذاب سے زیادہ شدید ہے اور یہ پانچویں گواہی تھہ پر عذاب کا موجب بنے

گی۔ بلال نے عرض کی حضور ﷺ اہم بخدا اللہ تعالیٰ مجھے عذاب نہیں دے گا جیسے رسول اللہ ﷺ مجھے کوڑے نہیں لگائیں گے پھر بلال نے پانچویں مرتبہ گواہی دی اِنَّ لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ۔ پھر آپ ﷺ نے عورت سے کہا تو گواہی دے اس نے چار گواہیاں دیں بِاللّٰهِ اِنَّهُ لَبِئْسَ الْكٰذِبِيْنَ۔ پانچویں مرتبہ گواہی دینے سے پہلے آپ ﷺ نے فرمایا اللہ سے ڈرو پانچویں مرتبہ گواہی حکم اور سزا کو واجب کر دے گی۔ اللہ کا عذاب لوگوں کے عذاب سے بہت سخت ہے وہ ایک لمحہ کے لئے رکی اور اعتراف جرم کا ارادہ کیا اور پھر کہا تم بخدا میں اپنی قوم کو سوائیں کروں گی پھر اس نے پانچویں مرتبہ یہ کہہ دیا اِنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهِمْ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ۔ رسول اللہ ﷺ نے ان گواہوں کے بعد ان دونوں کے درمیان تفریق کر دی اور فرمایا پھر ماں کا ہوگا باپ کی طرف اس کی نسبت نہ ہوگی اور نہ بچہ پر کوئی طعن کیا جائے گا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر یہ عورت ایسا ایسا پچھتے تو وہ اس کے خاوند کا ہوگا اور اگر ایسا بنے تو اس کا ہوگا جس کے متعلق اس کی نسبت کی جاتی ہے۔ عورت نے بچہ جتا گویا وہ بد صورت خاستری اونٹ ہے وہ بعد میں مصر کا دالی بنا تھا اور یہ معلوم تھا کہ اس کا باپ کون ہے (1)۔

امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور مقاتل فرماتے ہیں جب آیت کریمہ والذین یومنون بالمحسّنات نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے منبر پر اسے تلاوت فرمایا۔ عاصم بن عدی الانصاری اٹھے اور کہا اللہ تعالیٰ مجھے آپ پر قربان کرے اگر ہم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ دوسرے شخص کو دیکھے پھر اسے چالیس کوڑوں کی سزا سنائی جائے اور مسلمان اسے فاسق کہیں اور اسکی گواہی بھی ہمیشہ ہمیش کے لئے قبول نہ ہو تو پھر ہم گواہ کہاں سے تلاش کریں؟ جب ہم گواہ تلاش کرنے جائیں گے تو وہ مرد اپنی خواہش پوری کر کے چاچکا ہوگا۔ عاصم کے بچے کی بیٹی عویر کی بیوی تھی جس کا نام خولہ بنت قیس بن محسن تھا۔ عویر عامم کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے شریک بن تمّاء کو اپنی بیوی خولہ کے اوپر دیکھا ہے۔ عامم نے اِنَّا لَنَجِدُكُمْ بِرِجَالٍ یُّرٰوٰنَ عَمْرًا یُّرٰوٰنَ عَمْرًا پر حضور ﷺ کے پاس آئے۔ عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں نے جو دیکھتے ہیں وہ جو پچھلے جمعہ پر سوال کیا تھا اس کی وجہ سے میں اپنے گھر والوں کی صحبت میں مبتلا کیا گیا ہوں عویر خولہ اور شریک یہ تمام لوگ عامم کے بچے کی اولاد سے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے سب کو بلایا اور عویر کو کہا اپنی بیوی اور چچا کی بیٹی کے متعلق اللہ سے ڈرو اور ان پر جھوٹا بہتان نہ لگاؤ۔ عویر نے کہا یا رسول اللہ ﷺ میں اللہ کی قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ میں نے شریک کو اپنی بیوی کے بطن پر دیکھا ہے اور میں چار ماہ سے اس کے قریب نہیں گیا اور وہ کسی غیر سے حاملہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے خولہ کو کہا اللہ سے ڈرو اور مجھے سچ بتاؤ خولہ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ عویر ایک نیرت مند آدمی ہے۔ اس نے مجھے اور شریک کو دیر تک باتیں کرتے ہوئے دیکھا تو نیرت کی بنا پر انہوں نے یہ بیان دے دیا ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے شریک سے پوچھا تو انہوں نے عورت والا بیان دہرایا اس وقت اللہ تعالیٰ نے والذین یومنون ازواجہم اذواجہم الایہ کا ارشاد نازل فرمایا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے عصر کی اذان دینے کا حکم فرمایا اور اس کے بعد آپ ﷺ نے نماز عصر پڑھائی اور پھر عویر سے فرمایا اَشْهُوْهُ اٹھے تو فرمایا یہ کہو میں گواہی دیتا ہوں اللہ کی قسم خولہ زانیہ ہے اور میں سچے لوگوں میں سے ہوں۔ پھر دوسری مرتبہ کہا میں گواہی دیتا ہوں یہ میرے علاوہ کسی دوسرے شخص کی حاملہ ہے اور بطن پر دیکھا ہے اور میں سچوں میں سے ہوں۔ چوتھی مرتبہ کہا تم بخدا میں چار ماہ سے اس کے قریب نہیں گیا اور میں سچے لوگوں سے ہوں۔ پھر پانچویں

مرتبہ کہا عویر پر اللہ تعالیٰ کی لعنت اگر وہ جھوٹوں میں سے ہے پھر آپ ﷺ نے عویر کو بیٹھنے کا حکم دیا اور خولہ سے فرمایا تم اٹھو۔ وہ کھڑی ہوئی تو اس نے کہا میں اللہ کی قسم اٹھا کر کہتی ہوں کہ میں زانیہ نہیں ہوں اور عویر جھوٹوں میں سے ہے۔ دوسری مرتبہ کہا انشہد باللہ اس نے شریک کو میرے پیٹ پر نہیں دیکھا وہ جھوٹوں میں سے ہے تیسری مرتبہ کہا اللہ کی قسم میں عویر سے ہی حاملہ ہوں وہ جھوٹوں میں سے ہے۔ چوتھی مرتبہ کہا اس نے مجھے کبھی برائی میں مبتلا نہیں دیکھا وہ جھوٹوں میں سے ہے۔ پانچویں مرتبہ کہا خولہ پر اللہ کا غضب ہو اگر وہ بچوں میں سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے درمیان تفریق (جدائی) فرمادی اور فرمایا اگر یہ قسمیں نہ ہوتیں تو اس کے متعلق کوئی اور فیصلہ ہوتا۔ پھر فرمایا اس کے بچہ پیدا ہونے کی تاڑ رکھو اگر اشتر سیاہی ماں بچہ جنے تو وہ شریک بن لکھا، کا ہوگا اور اگر کھنکر یا لے بالوں والا بڑے بڑے اعضاء والا بچہ جنے تو وہ کسی دوسرے کا ہوگا (۱)۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں اس نے ایسا بچہ جتنا جو شریک کی صورت کے مشابہ تھا۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں اس مقام پر اگر اختلاف ہے بعض علماء فرماتے ہیں یہ آیت عویر کے بارے میں نازل ہوئی بعض فرماتے ہیں بلال کے بارے میں نازل ہوئی (۲)۔ امام ترمذی نے اس آیت کے دو مرتبہ نازل ہونے کے جواز پر میان ظاہر کیا ہے (۳)۔ بعض علماء نے اس طرح تطبیق کی ہے کہ پہلے بلال کے ساتھ واقعہ پیش آیا پھر اسی دوران عویر بھی آئے۔ تو آیت کے بارے میں دونوں کے بارے میں نازل ہوئی (۴)۔ علامہ نووی اور خطیب کا یہی نظریہ ہے۔

علامہ ابن حجر فرماتے ہیں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بلال کے سبب آیت نازل ہوئی ہو پھر جب عویر آئے تو انہیں چونکہ بلال کے واقعہ کا علم نہ تھا تو حضور ﷺ نے عویر کو وہ حکم بتادیا۔ اسی وجہ سے بلال کے واقعہ میں فرمایا جس نازل ہوئے (۵) اور عویر کے واقعہ میں فرمایا اللہ تعالیٰ نے تیرے متعلق حکم نازل فرمایا ہے، یعنی جو واقعہ تیرے ساتھ پیش آیا ہے اس کی مثل پہلے ایک واقعہ ہو چکا ہے اور اس کے متعلق حکم بھی نازل ہو چکا ہے۔ ابن الصباغ نے الشامل میں یہی جواب لکھا ہے۔

مسئلہ المذنبین یومون ازواجہم کے عموم کی وجہ سے امام مالک، شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور احمد فرماتے ہیں ہر خاوند جسکی طلاق صحیح ہے اس کا لعان بھی صحیح ہے خواہ میاں بیوی دونوں آزاد ہوں یا غلام ہوں یا حائل ہوں یا فاسق ہوں یا ایک آزاد اور دوسرا غلام یا فاسق ہو۔ اسی طرح دونوں مسلمان ہوں یا کافر ہوں یا ایک مسلمان اور دوسرا کافر ہو لیکن امام مالک اس میں اختلاف فرماتے ہیں، کیونکہ آپ کے نزدیک کفار کے نکاح فاسد ہیں نہ ان کی طلاق صحیح ہے اور نہ ان کا لعان صحیح ہے۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں جب تک خاوند شہادت کا اہل نہ ہو۔ یعنی آزاد، عاقل، بالغ مسلمان نہ ہو لعان جائز نہیں ہے اور بیوی بھی ایسی پاکدامن ہو جس پر الزام لگانے والے کو حد لگائی جاتی ہو۔ یعنی وہ بھی آزاد عاقل بالغ مسلمان اور مقیم بلاتنا نہ ہو۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک لعان جاری نہ ہوگا اگر خاوند غلام یا کافر یا محدودنی القذف ہو بلکہ اگر ایسی عورتوں میں سے ہے جس کے قاذف کو حد لگائی جاتی ہے تو مرد پر حد قذف جاری ہوگی ورنہ اگر امام بہتر سمجھے تو اسے تعزیر لگا دے۔ لیکن اگر خاوند اہل عاقل یا فاسق ہو تو لعان جائز ہوگا کیونکہ قاضی کے لئے جائز ہے کہ وہ فاسق کی گواہی قبول کر لے اگرچہ اس کی گواہی قبول کرنا واجب نہیں ہے اور اہل عاقل یا فاسق ہو تو لعان جائز ہوگا کیونکہ قاضی کے لئے جائز ہے کہ وہ فاسق کی گواہی قبول نہیں ہوتی۔ اور یہاں اپنے اور اپنی بیوی کے درمیان تمیز کر سکتا ہے پس بقیہ شہادتوں کے علاوہ اس شہادت کا وہ اہل ہوگا۔

2۔ فتح الباری شرح ہناری، جلد 18، صفحہ 54 (اکیلاات الازہریہ)

1۔ تفسیر بیہقی، جلد 4، صفحہ 173-174 (الکفر)

3۔ فتح الباری، جلد 18، صفحہ 54 (اکیلاات الازہریہ)

4۔ ایضاً

5۔ ایضاً

ابن المبارک نے امام ابوحنیفہ سے روایت کیا ہے کہ اندھے کا لعان نہ ہوگا۔ اسی طرح امام ابوحنیفہ کے نزدیک ایک وقت بھی لعان نہ ہوگا جب عورت کو لڑکی یا کافر یا بیچنی یا جھوٹا بیوی نکاح فاسد کیا ہو اور اس میں اس کے ساتھ دخول ہو، یا اس کا بچہ اور اس کا باپ معروف نہ ہو یا عمر میں کسی وقت زنا کیا ہو اگرچہ ایک ہی مرتبہ کیا ہو پھر اس نے توہم کی ہو یا کسی شہد کی وجہ سے وہی حرام کی ہو اگرچہ ایک ہی مرتبہ ہو۔ ایسی صورتوں میں نہ ہوگی اور نہ لعان ہوگا بلکہ قاضی بہتر سمجھے تو اسے تعزیر لگائے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی وجہ جس میں آپ نے عورت کے لئے شرط قرار دیا ہے کہ وہ ایسی عورتوں میں سے ہو جس کے قاذف کو حد لگائی جاتی ہے یہ ہے کہ لعان خاندان سے حد قذف دور کرنے کے لئے مشروع کی گئی ہے جیسا کہ آیت کے شان نزول کی احادیث و روایات کرتی ہیں۔ حضور نبوی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا، اے ہلال مبارک ہو اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے کشادگی پیدا فرمادی ہے پس یہ لعان خاندان کے حق میں حد قذف کا بدل ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے انہیں ارشاد فرمایا اللہ سے ڈرو کیونکہ دنیا کا عذاب (یعنی حد) عذاب آخرت سے آسان ہے۔ جب مہبل منہ متصور نہیں ہوگا تو ہبل بھی متصور نہ ہوگا۔

علی مرد کیلئے اہل شہادت میں سے ہونے کی شرط، دلیل یہ ارشاد و دلیل یہ کہ انہیں شہداء الا انفسہم ہے کیونکہ یہاں خاندان کو گواہ فرمایا ہے کیونکہ نکی سے استثناء کا اثبات ہوتا ہے۔ اگر شہدا کو حجاز احالفین (قسم اٹھانے والے) بنایا جائے جیسا کہ دوسرے عل فرماتے ہیں تو معنی یہ ہوگا قسم اٹھانے والے نہ ہوں مگر وہ خود تو یہ معنی درست نہیں ہے کیونکہ اس کا مفاد یہ ہوگا کہ جو لوگ اپنی عورتوں پر حجت رکھیں اور ان کے لئے حلف اٹھانے والا اور کوئی نہ ہو تو وہ خود اپنی صفائی کیلئے قسم اٹھائیں۔ یہ غیر کے لئے قسم اٹھانے کے تصور کی فرع ہے جبکہ اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ اگر شہادت کے لفظ کا حقیقی معنی قسم ہوتا تو پھر بھی یہ معنی اسے حجاز کی طرف پھیرنے کا قضا کرتا ہے شہادت کا حقیقی معنی جب حلف نہیں ہے بلکہ شہادت سے حجاز قسم مراد لی جاتی ہے تو یہاں بدرجہ اتم شہادت سے مراد قسم نہیں بلکہ گواہی ہوگی۔

مرد میں شہادت کی اہلیت کے شرط ہونے اور عورت کے پاکدامن ہونے پر یہ حدیث دلالت کرتی ہے جسے ابن ماجہ اور دارقطنی نے عمرو بن شیبہ عن ابیہ عن جدہ کی سند سے نقل فرمایا ہے۔ دارقطنی نے اپنی سند کے ساتھ عثمان بن عبد الرحمن سے اس طرح روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ چار آدمیوں میں لعان نہیں ہے آزاد مرد اور لونڈی میں نلام مرد اور آزاد عورت میں۔ مسلمان مرد اور یہود یہ عورت میں مسلمان مرد اور نصرانی عورت میں (۱)

یحییٰ بخاری ابو حاتم الرازی اور ابو داؤد فرماتے ہیں عثمان بن عبد الرحمن لبس ہنسی۔ یحییٰ نے فرمایا وہ جھوٹ بولتا تھا۔ ابن حبان فرماتے ہیں وہ ثقہ لوگوں سے موضوع احادیث روایت کرتا تھا ایسے شخص سے حجت کچھ ناجائز نہیں ہے نسائی اور دارقطنی فرماتے ہیں وہ متروک الحدیث ہے۔

دارقطنی اور ابن ماجہ نے عن عثمان بن عطاء الخراسانی سے بھی یہی حدیث روایت کی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چار عورتیں ایسی ہیں جن کے لئے لعان نہیں ہے نصرانیہ جو مسلمان کے عقد نکاح میں ہو۔ یہود یہ جو مسلمان کے تحت ہو۔ لونڈی جو آزاد کے نکاح میں ہو۔ آزاد جو نلام کے عقد میں ہو۔ عثمان بن عطاء کو بھی یحییٰ اور دارقطنی نے ضعیف لکھا ہے۔ ابو حاتم الرازی اور ابن حبان فرماتے ہیں اس سے احتجاج ناجائز نہیں ہے۔ علی بن حنید فرماتے ہیں عثمان بن عطاء متروک ہے۔ اس حدیث کی متابعین یہ ہیں زر رجب عن

عطاء کی حدیث ہے لیکن وہ بھی ضعیف ہے۔ دارقطنی نے عماد بن مہر سے اس طرح بھی روایت کی ہے حد ثنا حماد بن عمر عن زید بن رفیع عن عمرو بن شعب عن ابیہ عن جده ان رسول اللہ ﷺ بعث عتاب بناسیدہ کہ رسول اللہ ﷺ نے قتیب بن اسید کو بھیجا آگے اسی طرح حدیث ہے جیسا کہ پہلے لکھی ہے۔ ابو حاتم الرازی فرماتے ہیں عماد بن مہر جعوت بولتا تھا ابن عدی فرماتے ہیں عماد کی احادیث باطل ہیں اور وہ متروک الحدیث ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں عماد بن مہر جعوت بولتا تھا اور حدیث کو وضع کرتا تھا۔ الساجی کہتے ہیں حماد حدیث کا اجماع ہے کہ عماد متروک الحدیث ہے نسائی دارقطنی اور زید بن رفیع نے بھی اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن الجوزی کہتے ہیں اس حدیث کو ازراقی اور ابن جریج نے روایت کیا ہے جبکہ یہ دونوں حدیث کے امام ہیں ان کی سند یہ ہے عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جده۔ اس سند کے ساتھ یہ حدیث مرفوع نہیں موقوف ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں ضعیف حدیث کے جب طرق متعدد ہوں تو وہ حجت بن جاتی ہے یہ حدیث بھی اپنے طرق کی کثرت کی وجہ سے حجت ہے جبکہ اس حدیث کو دو اماموں کی موقوف روایت کے ساتھ تاخیر بھی حاصل ہے۔

اس امام شافعی فرماتے ہیں یہ قول دلائل کرتا ہے کہ یہ شہادتیں قسمیں ہیں شہادتیں نہیں ہیں کیونکہ اللہ کا کلمہ قسم کے لئے مستعین ہے اور شہادت کا کلمہ قسم کا احتمال بھی رکھتا ہے جیسا کہ اگر کوئی کہے اشہد اور اس سے انکی مراد قسم ہو تو یہ قسم ہوگا۔ پس ہم محفل کو حکم پر محمول کریں گے اور شہادت کو یہاں حقیقت پر محمول کرنا مستعد و مشکل ہے، کیونکہ یہ شرعاً ثابت ہے کہ انسان کی اپنے حق میں شہادت قبول نہیں ہے جبکہ قسم اپنے حق میں قبول ہوتی ہے اسی طرح شرعاً معہود ہے کہ ایک مقام پر شہادت کا حکم انہیں ہوتا ہے جبکہ قسم کا حکم انہیں ہوتا ہے جبکہ قسم کا محل قسامت کے باب سے قسموں کا حکم ثابت ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ شہادت کا محل اثبات (کسی چیز کو ثابت کرنا) ہے جبکہ قسم کا محل نفی ہے۔ پس ان کی حقیقت کا تعلق ایک امر کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ پس ایک کیلئے حقیقت اور دوسرے کے لئے مجازاً عمل ہوگا۔ پس لفظ شہادت مجاز ہونا چاہئے۔ جیسا کہ ہم نے اس کی دو وجوہ ذکر کی ہیں۔ جب شہادت بمعنی یقین ہوگی تو شہادت کی الہیت لعان کے لئے شرط نہ ہوگی۔ ہم کہتے ہیں جس طرح اپنے لئے شہادت دینا اور بار بار شہادت دینا شرعاً معہود نہیں ہے اسی طرح غیر کے لئے قسم اٹھانا اور حکم کے ثبوت کے لئے قسم اٹھانا بھی شریعت میں معہود نہیں ہے بلکہ قسم حکم کو دور کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ پس جس کو پیدا کرنے معہود کرنے اور حکم کرنے کا اختیار ہے جیسا چاہے حکم دے۔ جب اس کو ابتداً ایک گل میں دونوں امور کا حکم دینا جائز ہے تو اس کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ اس کو ابتداً شروع کر دے۔ اپنے لئے گواہی دینا قرآن سے ثابت ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا شَهِدْنَا اللَّهُ أَنْتُمْ بِاللَّهِ إِلهًا هُوَ۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ مؤذن کی اذان سنتے وقت کہتے اشہد ان لا الہ الا اللہ اشہد ان محمد رسول اللہ وانا اشہد وانا اشہد۔ پس آپ ﷺ کا رسالت کا گواہی دینا اپنی شہادت ہے اور اس مقام پر شہادت کا حکم ان کے لئے شروع ہے کیونکہ زانی کے گواہ پیش کرنے سے بجز ظاہر ہو چکا ہے اور تہمت کے وقت اپنے حق میں گواہی قبول نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے گواہوں کے نہ ہونے کے وقت بڑا ثبوت مطلوب ہوتا ہے جیسا کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کی اپنی شہادت اور رسول اللہ ﷺ کی شہادت کو ذکر کیا ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ اس جگہ اپنے لئے شہادت شروع ہو اور قسم کے ساتھ منکر ہو اور جھوٹا ہونے کے اندیشہ سے لعنت کے اہرام اور غضب کے ساتھ منکر ہو۔ ولم یکن لہم شہداء کا جملہ یا تو صلہ پر معظوف ہے یا یوموں کے فاقل سے حال ہے اور الا انفسہم 'الاشہداء سے بدل ہے یا صفت ہے جبکہ الا بمعنی غیر ہو۔ اور موصول مع صلہ مبتدأ ہے اور ما بعد اس کی خبر ہے۔ 'حفص' حمزہ اور

کسائی نے اربع شہادت کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے اس بنا پر کہ شہادہ احدہم کی خبر ہے اور باقی قراء نے مصدر کی تعداد کے بیان کے لئے منصوب پڑھا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی فالوا اجب شہادۃ احدہم۔ یا فعلیہم شہادۃ احدہم اربع شہادات۔ بعض علما فرماتے ہیں شہادۃ احدہم مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی فشہادۃ احدہم اربع شہادات ترفع عنہ حد القذف۔ اور باللہ شہادات کے متعلق ہے کیونکہ اس کے زیادہ قریب ہے۔ بعض فرماتے ہیں شہادۃ کے متعلق ہے کیونکہ وہ مقدم ہے۔ انہ لمن الصادقین اصل میں علی انہ من الصادقین ہے۔ حرف جر کو حذف کیا گیا ہے اور ان کو کسرہ دیا گیا ہے اور تاکید لام کے ساتھ عامل کو متعلق کیا گیا ہے بعض علما فرماتے ہیں یہ محذوف قسم کا جواب ہے اور جملہ توبہ شہادت کا بیان ہے۔

وَالْحَامِسَةُ أَنْ لَعَنَتِ اللَّهُ عَلَيْهِ إِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝

”اور پانچویں بار یہ ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی پینکار ہو۔ اگر وہ کذب بیانی کرنے والوں میں سے ہو۔“

۱۔ الحامسہ کے مرفوع ہونے پر ملتا کا اتفاق ہے اور یہ محض حمزہ اور کسائی کی قرأت کے مطابق اربع شہادت پر معطوف ہے اور باقی قراء کی قرأت کے مطابق شہادۃ احدہم پر معطوف ہے۔ تقدیر اس طرح ہوگی فالوا اجب شہادۃ احدہم اربع شہادات والواجب الشہادۃ الحامسۃ اور یہ ترکیب بھی ہو سکتی ہے کہ الحامسہ مبتدا ہو اور اس کا مابعد خبر ہو پھر جملہ اسمیہ حال ہو۔

۲۔ نافع اور یعقوب نے ان تھنہ من مشعلہ پڑھا ہے اور اس کا اسم ضمیر شان ہے اور لعنۃ پر فتح مبتدا ہونے کی وجہ سے ہے۔ جبکہ باقی قراء نے ان کو مشدودہ پڑھا ہے اور لعنۃ پر نصب ان کے اسم ہونے کی وجہ سے ہے اور ان اپنے اسم خبر سے ملکر بقصد بر حرف جر شہادت کے متعلق ہے یعنی الشہادۃ الحامسۃ بأن لعنۃ اللہ علیہ۔

۳۔ ان کان من الکاذبین شرط ہے اور ماقبل کلام کی وجہ سے جزاء سے مستثنیٰ ہے۔

مسئلہ: اگر کوئی مرد اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائے یا اس کے بچہ کی نفی کرے اور وہ دونوں میاں بیوی لعان کے اہل ہوں اور عورت تذف کی سزا کا مطالبہ کرے تو لعان کرنا مرد پر واجب ہوگا۔ اگر مرد لعان سے انکار کرے تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک حاکم اسے قید کر دے حتیٰ کہ وہ لعان کرے یا اپنے آپ کو جھوٹا کہے۔ اگر وہ اپنے آپ کو جھوٹا کہے تو اسے حد تذف لگائی جائے گی۔

امام مالک امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک اگر وہ لعان سے انکار کرے تو اسے حد تذف لگائی جائے گی اور اسے قید نہ کیا جائے گا کیونکہ تذف کا موجب حد ہے اور لعان اس کی صداقت کی دلیل ہے اور قاذف جب حجت قائم کرنے سے عاجز ہوتا ہے تو اسے حد لگائی جاتی ہے قید نہیں کیا جاتا۔ لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جب وہ قسم سے انکار کرے گا تو وہ فاسق ہو جائے گا اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں وہ فاسق نہیں ہوگا۔ امام صاحب کا قول ہے کہ قسم سے انکار اقرار کی دلیل ہے لیکن اس میں شبہ ہے اور حد شبہ کے ساتھ ثابت نہیں ہوتی، اس لئے اسے قید کیا جائے گا یہاں تک کہ وہ یا تو لعان کرے یا اپنی تکذیب کرے کیونکہ یہ اس پر حق ہے اور اس کے پورا کرنے پر وہ قادر بھی ہے اس لئے اسے قید کیا جائے گا یہاں تک کہ وہ ادا ہو سکی کہ اس چیز کی جو اس پر واجب ہے۔ جب مرد لعان کرے گا تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک عورت پر لعان کرنا واجب ہوگا۔ اگر وہ انکار کرے گی تو اسے بھی حاکم قید کر دے گا یہاں تک کہ وہ لعان کرے یا غاوند کی بات کی تصدیق کرے اور اس پر یہ حق ہے اور اس کے ایفاء پر بھی وہ قادر ہے اس لئے اس حق کی وجہ سے

اسے قید کیا جائے گا۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جب مرد لعان کرے گا تو میاں بیوی کے درمیان فرقت (جدائی) واقع ہو جائے گی اور عورت مرد پر ہمیشہ ہمیش کے لئے حرام ہو جائے گی اور بچہ کے نسب کی اس مرد سے نفی ہو جائے گی۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے الْمُنْتَلَا عِنَانٌ لَا يَجْتَمِعَانِ أَبَدًا۔ لعان کرنے والے دونوں آپس میں کبھی جمع نہیں ہو سکتے (1)۔ ہم کہتے ہیں لعان عورت کے لعان کرنے کے بعد مکمل ہوتا ہے۔ پس جدائی واقع نہ ہوگی اور تفریق جائز ہوگی جب تک کہ دونوں لعان نہیں کر لیتے۔ امام مالک شافعی اور احمد کے نزدیک مرد کے لعان کرنے کے ساتھ عورت پر زنا کی حد واجب ہو جاتی ہے اور جب عورت لعان کرتی ہے تو امام مالک شافعی اور احمد کے نزدیک زنا کی حد ساقط ہو جاتی ہے کیونکہ آئندہ آیت اسی بات پر دلیل ہے۔

وَيَذَرُهَا الْعَدَابُ أَنْ تَشْهَدَ أَرْبَعًا شَهِدَتْ بِاللَّهِ إِنَّهُ لَمِنَ الْكَاذِبِينَ ①

”اور اس سکتی ہے اس عورت سے حد کردہ گواہی دے چار مرتبہ اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہ وہ (خاوند) جھوٹا ہے۔“

العذاب سے مراد حد زنا ہے، جیسا کہ قَوْلُهُمْ نَبْضُ فَاغْلِي الْمُنْتَلَا مِنَ الْعَدَابِ میں عذاب حد کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح حضور ﷺ کے ارشاد وَإِنْ عَذَابَ اللَّهِ أَشَدُّ مِنْ عَذَابِ النَّاسِ۔ میں بھی عذاب بمعنی حد استعمال ہوا ہے (2) اربع کا کلمہ بالا جماع مصدریت کی بنا پر منصوب ہے۔ انہ میں ضمیر کا مرجع خاوند ہے یعنی عورت چار مرتبہ گواہی دے کہ جو اس خاوند نے مجھ پر زنا کا الزام لگایا ہے یا بچہ کی نفی کی ہے اس میں وہ جھوٹا ہے۔

وَالْعَامِسَةُ أَنْ غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهَا إِنْ كَانَ مِنَ الضَّالِّينَ ①

”اور پانچویں مرتبہ یہ کہے کہ خدا کا غضب ہوا اس پر اگر وہ (خاوند) سچا ہو۔ اے۔“

۱۔ جمہور قراء نے الخاصۃً کو ابتدا کی بنا پر مرفوع پڑھا ہے اور اس کا مابعد اس کی خبر ہے۔ یا ان تشہد پر معطوف ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔ حفص نے اربع شہادات کو عطف کی بنا پر منصوب پڑھا ہے۔ اِنْ کو نافع اور یعقوب نے محقق پڑھا ہے اس بنا پر کہ یہ مصدر یہ ہے اور باقی قراء نے مشدود پڑھا ہے غضب کو نافع اور یعقوب نے باب علم سے فعل ماضی کا حینہ ہونے کی بنا پر ضاد کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، اسم جلال (اللہ) کو فاعل کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے غضب کو ان کے اسم کی بنا پر ضاد کے فتح کے ساتھ منصوب پڑھا ہے اور اسم جلال کو مضاف الیہ کی بنا پر مجرور پڑھا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں عورت کے لعان سے ایک حکم (یعنی حد زنا کا سقوط) متعلق ہوتا ہے۔ اگر خاوند عورت کے زنا پر بینہ (دلیل) قائم کر دے تو لعان کے ساتھ بھی عورت سے حد ساقط نہ ہوگی۔ اگر عورت لعان سے انکار کرے گی تو اتنا اثر بلاش کے نزدیک اسے حد لگائی جائے گی۔ جبکہ امام ابوحنیفہ کا مسلک مختلف ہے وہ فرماتے ہیں عورت لعان سے انکار کرے گی تو اسے قید کیا جائے گا حتیٰ کہ وہ لعان کرے یا مرد کی تصدیق کرے۔ اگر عورت مرد کے قول کی تصدیق کرے گی تو لعان کے وجوب کا سبب ختم ہو جائے گا اس لئے لعان نہ ہوگا اور حد بھی نہ ہوگی کیونکہ تصدیق کرنا بالذات اقرار نہیں ہے۔ اس لئے حد کے وجوب میں تصدیق معتبر نہیں بلکہ حد کو دور کرنے میں معتبر ہوگا۔ پس لعان بھی نہ ہوگا اور حد بھی واجب نہ ہوگی اگر اقرار بھی ہو تب بھی حد واجب نہ ہوگی کیونکہ ایک مرتبہ اقرار

کرنے سے امام ابوحنیفہ کے نزدیک زنا کی حد ثابت نہیں ہوتی۔ جیسا کہ چھپے قہقہے سے تفسیر سے گزر چکا ہے اور عذاب سے مراد حد ہونا متعین نہیں ہے، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد قید ہو اور حد و شہادت کی وجہ سے دور ہو جاتی ہیں۔

مسئلہ: اگر عورت مرد کے بچہ کی نفی میں تصدیق کر دے تو پھر بھی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حد نہ ہوگی اور نہ لعان ہوگا اور وہ بچہ ان دونوں کا ہوگا کیونکہ نسب حکماً لعان کی وجہ سے منقطع ہوتا ہے اور یہاں لعان نہیں پایا گیا اور نسب بچہ کا حق ہے پس اس کے حق کے ابطال میں میاں بیوی کی تصدیق نہیں کی جائے گی۔ واللہ اعلم۔

میں کہتا ہوں امام شافعی اور ان کے ہم نواؤں پر تعجب ہے کہ لعان ان کے نزدیک قسم ہے اسی وجہ سے وہ مرد میں شہادت کو شرط قرار نہیں دیتے اور غلام کا فرار و حد و نفی القذف کی طرف سے بھی لعان کو جائز قرار دیتے ہیں اور قسم مال کے ثبوت کی صلاحیت بھی نہیں رکھتی تو پھر عورت کے لعان سے انکار کے وقت مرد کا لعان اس پر رجم کو کیسے ثابت کرتا ہے حالانکہ رجم حد میں سے سخت ترین حد ہے۔

اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر بھی تعجب ہے کہ وہ فرماتے ہیں لعان شہادتیں ہیں۔ اسی وجہ سے وہ مرد میں شہادت کی اہلیت کو شرط قرار دیتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں اس مقام پر شہادتوں کا گھر اس وجہ سے شروع کیا گیا ہے کہ مرد زنا کے چار گواہ پیش کرنے سے عاجز تھا۔

شارح نے چار شہادتوں کو لغت کے انضمام اور قسم کے ساتھ تاکید کے واسطے سے چار مردوں کی گواہی کے قائم مقام بنایا اور امام صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ لعان مرد کے حق میں حد قذف کے قائم مقام ہے اور عورت کے حق میں حد زنا کے قائم مقام ہے۔ پھر امام صاحب

چار گواہیوں کے پائے جانے کے وقت عورت پر حد زنا کے وجوب کا قول کیوں نہیں فرماتے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ویلیدا عہا العذاب۔ (اور مل سکتی ہے عورت سے حد) اور درء کالغف استقوط کے معنی میں خاص اور صریح ہے اور سقوط اس بات کا تقاضا ہے کہ

سقوط کا موجب نہ ہو تو حد واجب ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد عذاب اللہ اشد من عذاب الناس میں بھی عذاب سے مراد حد ہے (۱) تو امام صاحب حد کو واجب کیوں نہ کرتے (عورت کے حق میں لعان کے حد زنا کے قائم مقام ہونے کا کوئی معنی نہیں رہتا

مگر جب وہ لعان کرے گی تو حد سا قہ ہو جائے گی۔ اگر وہ لعان سے انکار کرے گی تو اس پر حد واجب ہوگی اور یہ نہ کہا جائے گی کہ مرد کی شہادت اکیلی ہے۔ اگر چہ وہ چار مردوں کی شہادت کے قائم مقام ہے لیکن اس کے ساتھ زنا کا تحقق قطعی طور پر نہ ہوگا اور مرد کی شہادت

کو چار مردوں کی شہادت کے قائم مقام کرنے میں شبہ ہے۔ اس لئے شبہ کی وجہ سے حد قذف من جائزگی اور شبہ کی وجہ سے حد زنا بھی ثابت نہ ہوگی۔ کیونکہ حد و شہادت کی وجہ سے مل جاتی ہیں۔ ہم کہتے ہیں مرد کی گواہیوں کو چار مردوں کی گواہیوں کے قائم مقام رکھنے

میں کوئی شبہ نہیں ہے کیونکہ یہ کتاب و سنت اور اجماع سے ثابت ہے۔ اور زنا کا قطعی طور پر تحقیق جس طرح مرد کی چار گواہیوں سے حاصل نہیں ہوتا اسی طرح چار مردوں کی گواہیوں سے بھی قطعی طور پر زنا کا تحقق نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ چاروں گواہ جھوٹ پر متفق ہو

گئے ہوں۔ اور خبر اس وقت تک قطعی نہیں ہوتی جب تک کہ وہ حد تو اترا کو نہ پہنچے۔ یا خبر (خبر دینے والا) معصوم ہو۔ اور دو مردوں یا چار مردوں کی گواہی کے بعد حکم لگانا امر تعدی ہے اس کی بنیاد قطعیت پر نہیں بلکہ ظنی ہے اور یہاں ظنی ظن چار مردوں کی گواہی میں جو

ظنی ظن ہوتا ہے اس سے بلند ہے کیونکہ مرد کی شہادت کو یہاں قسم کے ساتھ ملو کہ کیا گیا ہے۔ لغت کا التزام بھی ہے اس کے ساتھ ساتھ مرد جائز شہادت اور عادل بھی ہے۔ نیز عورت بھی لعان سے انکار کر رہی ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ عقلاً چار آدمیوں کا جھوٹ پر

متفق ہونا بر تقدیر کذب زوج سے عورت کے امتناع سے زیادہ قریب ہے کیونکہ عورت کو یقین ہے کہ لعان سے رجم ساقط ہو جائیگا اور عذاب بھی دور ہو جائے گا۔ اور جس شہ کی وجہ سے حد ساقط کی جاتی ہے وہ ایسا شہ ہے کہ اس شہ کا شریعت اعتبار نہیں کرتی مثلاً چاروں گواہوں کے کذب کا احتمال لعان کے باوجود خاوند کے کذب کا احتمال اور لعان سے عورت کا انکار۔ (وغیرہ) پس میرے نزدیک امام صاحب کا قول راجح ہے کہ خاوند شہادت کی اہلیت رکھتا ہو اور عورت ایسی عورتوں سے ہو جن کے قاذف کو حد لگائی جاتی ہے اور لعان سے عورت کے امتناع کے بعد حد زنا کے وجوب میں میرے نزدیک امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ہم نواؤں کا قول راجح ہے۔

مسئلہ: پیچھے گزر چکا ہے کہ صرف مرد کے لعان کرنے کے ساتھ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک میاں بیوی کے درمیان فرقت واقع ہو جائے گی۔ یہ ایسا حکم ہے جس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ امام زفر امام مالک کا قول ہے کہ قضاء تاحی کے بغیر میاں بیوی کے لعان سے ہی فرقت واقع ہو جائے گی۔ امام ابو حنیفہ امام احمد اور صاحبین فرماتے ہیں لعان سے فرقت واقع نہ ہوگی حتیٰ کہ حکام ان کے درمیان تفریق کرے اور ان کی تفریق حاکم پر واجب ہے۔ امام ابو حنیفہ اور احمد کے نزدیک یہ فرقت طلاق یا نہ ہے۔ امام ابو یوسف زفر مالک شافعی اور احمد کے نزدیک یہ فرقت صحیح ہے ان تمام کے قول کی وجہ یہ ہے کہ لعان کے ساتھ حرمت ابدی ثابت ہو جاتی ہے جس طرح رضاعت سے حرمت ابدی ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح صحیحین میں ابن عمر سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے لعان کرنے والوں کو فرمایا تم دونوں کا حساب اللہ تعالیٰ پر ہے تم میں سے ایک جھوٹا ہے اور تیرے لئے اس عورت کے ساتھ رہنے کی کوئی تکلیف نہیں ہے۔ لعان کرنے والے مرد نے کہا یا رسول اللہ ﷺ میرا مال؟ (جو میں نے عورت کو دیا تھا) فرمایا اگر تو نے عورت کے متعلق صحیح کہا ہے تو تجھے مال نہیں ملے گا وہ اس کا بدل ہوگا جو تو اس کے نفس سے متعلق ہوا ہے۔ اور اگر تو نے اس پر جھوٹ بولا ہے تو مال کا مطالبہ بہت بعید ہے (1)۔ سبل بن سعد کی حدیث جو ابوداؤد نے روایت کی ہے اس میں ہے کہ لعان کرنے والوں میں سنت قائم ہو چکی ہے کہ ان کے درمیان تفریق کی جائے گی اور پھر کبھی جمع نہ ہوں گے (2)۔ دارقطنی نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اور ابن مسعود سے اسی طرح روایت کی ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں حضرت علی عمر اور ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مصنف عبد الرزاق ابن ابی شیبہ میں روایات موجود ہیں۔ ابوداؤد نے ابن عباس کی حدیث میں بلال بن امیہ کے واقعہ کے آخر میں یہ روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے میاں بیوی کے درمیان تفریق کر دی اور فیصلہ فرمایا کہ عورت پر آئندہ تہمت نہ لگائی جائے اور نہ بچہ پر کوئی طعن کیا جائے (3) صحیحین میں حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کے عہد ہایوں میں اپنی بیوی سے لعان کیا۔ آپ ﷺ نے ان کے درمیان تفریق فرما دی اور بچہ کو ماں کے ساتھ لاحق کر دیا (4)۔

جمہور علماء کے قول (کہ فرقت طلاق کی فرقت نہیں ہے) پر صریح دلیل ابوداؤد کی روایت کردہ حدیث ہے، جو بلال بن امیہ کے واقعہ میں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ فرمایا کہ اب عورت کے لئے مرد پر نہ خوراک ہے اور نہ رہائش کیونکہ وہ دونوں بغیر طلاق کے جدا ہوئے ہیں۔ اور نہ ایسی صورت ہے کہ خاوند نفوت ہو گیا ہو اور بیوی پیچھے رہ گئی ہو۔ جمہور علماء فرماتے ہیں جب لعان کے بعد حرمت ابدی ثابت ہو جاتی ہے تو پھر تاحی کی تفریق کی ضرورت نہیں ہے نیز حرمت ابدی نکاح کے منافی ہے، جیسے حرمت رضاع نکاح کے منافی ہوتی ہے، پس یہ جدائی صحیح ہوگی۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں حرمت کا ثبوت نکاح

2- سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 308 (ذرات تعلیم)

1- صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 490 (قدیمی)

4- صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 490 (قدیمی)

3- ایضاً

کے نسخ کا مقصد ہی نہیں ہے۔ مثلاً ظہار سے حرمت ثابت ہوتی لیکن نکاح فتح نہیں ہوتا۔ مگر جب حرمت مرد کے اسماک بالمعروف سے عاجزی کی صورت میں ثابت ہو تو تشریح باحسان مرد پر لازم ہوتا ہے اور جب مرد ایسی صورت میں بیوی کو نہ چھوڑے تو ظلم کو دور کرنے کے لئے قاضی اس کے قائم مقام ہو جائے گا اور تفریق کر دے گا۔ اس نظریہ پر شیخین کی حدیث دلالت کرتی ہے جو سہل بن سعد سے مروی ہے کہ عومیر نے لعان کے بعد کہا یا رسول اللہ ﷺ اگر میں اسے اب اپنے پاس ٹھہراؤں تو میں نے اس پر جھوٹا الزام لگایا۔ پھر عومیر نے بیوی کو تین طلاقیں دے دیں اور نبی کریم ﷺ نے اس کے طلاق دینے پر کوئی انکار نہیں فرمایا (۱)۔

دارقطنی نے اپنی سند کے ساتھ ابن عمر کی حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لعان کرنے والے جب جدا ہو جائیں گے تو پھر کبھی جمع نہ ہوں گے (۲)۔ شیخ ابو بکر الرازی نے اس حدیث کے رسول اللہ ﷺ سے مروی ہونے کے ثبوت پر طعن کیا ہے لیکن صاحب الفتح فرماتے ہیں اس کی سند جدید ہے اور اس کی شرط کا مفہوم اس بات کو مستزہم ہے کہ صرف لعان سے جدا نہیں ہوں گے۔ یہ حدیث امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نظریہ کے خلاف حجت ہے اور جو حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا کاب عورت کا مرد پر نہ نفقہ اور نہ زکوٰۃ ہے کیونکہ یہ بغیر طلاق کے جدا ہوئے ہیں یہ ابن عباس کا اپنا زعم اور خیال ہے۔ مرفوع حدیث میں صرف عدم نفقہ اور عدم سکنی کا فیصلہ ہے۔

میں کہتا ہوں لعان کے بعد حرمت بالاجماع ثابت ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ امام زفر اور ان کے ہم خیال علماء کے نزدیک تو یہ ظاہر ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی یہی ہے کیونکہ اگر حرمت نہ ثابت ہوتی تو نبی کریم ﷺ کے تفریق کرنے کی کوئی وجہ نہ ہوتی اور امام ابوحنیفہ کے قول ثم یفرق القاضی (پھر قاضی تفریق کرے) کا بھی کوئی موجب نہ ہوتا۔ یہ حرمت ظہار کی حرمت کی طرح نہیں ہے، کیونکہ ظہار کی حرمت کفارہ ادا کرنے پر ختم ہو جاتی ہے لیکن لعان کی حرمت ابدی ہوتی ہے جیسے رضاع کی حرمت ابدی ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حرمت ابدی نکاح کے منافی ہے، بخلاف حرمت موقتہ کے۔ پس وہ نسخ ہوگا اور قضاء قاضی کی ضرورت نہ ہوگی۔ ابن ہمام کی عبارت بھی اس پر دلالت کرتی ہے وہ فرماتے ہیں ابو یوسف کے قول پر یہ لازم آتا ہے کہ جدائی قاضی کی تفریق پر موقوف نہیں ہے کیونکہ حرمت تو بالاتفاق لعان سے ثابت ہے اور یہ قول کہ مرد و معروف طریقہ پر ٹھہرانے سے انکار کرے تو چھوڑنے میں قاضی اس کے قائم مقام ہو جائے یہ (قول) اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ لعان کے بعد قاضی خاوند کو طلاق دینے کا حکم دے۔ پھر اگر وہ خاوند طلاق دینے سے انکار کرے تو ان کے درمیان قاضی تفریق کر دے۔ یہ قول کسی نہ بھی نہیں کیا اور نہ نبی کریم ﷺ سے طلاق دینے کا حکم مروی ہے۔ اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول مرفوع حدیث کے حکم میں ہے کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ سے واقف تھے۔ پھر عومیر کا قول تو وہ اس بات پر محمول ہے کہ انہیں معلوم ہی نہ تھا کہ لعان سے فرقت واقع ہو جاتی ہے۔ شرط کا مفہوم اگرچہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حجت ہے لیکن اس پر عمل چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ حرمت ابدی کے ثبوت پر قطعی حکم مل گیا ہے۔ یا حضور ﷺ کے ارشاد ”ولعان کرنے والے جب جدا ہو جائیں گے تو کبھی جمع نہ ہوں گے“ کا مطلب یہ ہے کہ جب لعان سے فارغ ہو جائیں گے جیسا کہ امام ابوحنیفہ حضور ﷺ کے ارشاد اَلْمُنْبَیْعَانِ بِالْحَبَابِ مَا لَمْ يَنْفَرُوا فَاِذَا وَايِلَ مِنْ فَرَمَاتے ہیں کہ تفریق سے مراد اتوال کا تفریق (جدا ہونا) ہے۔

مسئلہ: جب لعان کے بعد رو اپنے آپ کو جھوٹا کہے تو کیا اس کے لئے اس عورت سے نکاح کرنا جائز ہے (یا نہیں)؟ امام شافعی، مالک اور احمد فرماتے ہیں جب وہ اپنے آپ کو جھوٹا کہے گا تو جو چیزیں اور احکام اس کے خلاف ہوں گے ان میں تو اس کا یہ اپنے آپ کو جھوٹا قبول ہوگا اور جن احکام میں اس کا نفع ہوگا ان میں اس کی تکذیب قبول نہ ہوگی۔ اس لئے حد قذف اس پر لازم ہوگی پھر اس کے ساتھ لاحق ہو جائے گا لیکن ابدی تحریم ختم نہ ہوگی اور اس کے لئے اس عورت سے نکاح کرنا بھی جائز نہ ہوگا۔ امام ابوحنیفہ (اور ایک روایت امام احمد سے بھی یہی ہے) فرماتے ہیں اپنے آپ کو جب مرد بھلائے گا تو اسے کوڑے لگائے جائیں گے اور اس کے لئے اس عورت سے نکاح کرنا جائز ہوگا، کیونکہ جب اس کو حد لگائی تو وہ لعان کے اہل نہیں رہا۔ پس لعان پر جو حکم مرتب تھا وہ بھی اٹھ گیا۔ اسی طرح اس مرد نے اگر کسی دوسری عورت پر تہمت لگائی اور اسے حد لگائی مگر پھر مرد کے لئے یہی حکم ہوگا۔ اسی طرح جب عورت سے بدکاری کی اور اسے حد لگائی مگر تو چونکہ عورت سے لعان کی اہلیت ختم ہوگئی اس لئے لعان پر مرتب ہونے والا حکم اٹھ جائے گا اور ابدی حرمت ختم ہو جائے گی۔

ہم کہتے ہیں لعان کی اہلیت کا زوال اصل سے لعان کی نفی کا مستحق نہیں ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں؟ کہ جو کسی دوسرے پر تہمت لگاتا ہے پھر اسے حد قذف لگائی جاتی ہے پھر مقدمہ دفن کرنا کرتا ہے اور اسے حد زنا لگائی جاتی ہے تو مقدمہ دفن سے اہلیت لعان کے زوال کے باوجود اس کے قاذف کی شہادت قبول نہیں ہوگی۔

اختلاف فرماتے ہیں حضور ﷺ کے ارشاد اَلْمُتْلَعَانِ لَا يَنْصِبُ عَمَّا بَيْنَهُمَا مَا كَانَ عَلَيْهِمْ يَدْعُوهُنَّ بِمَا كَانَتْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عَمَلٍ (موضوع) کا وصف استمراری ہو اور لعان کا وصف غیر استمراری ہو اس لئے وصف کی شرط کے ساتھ حکم ممکن نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ دو افراد ہیں جن سے کسی وقت لعان صادر ہو وہ اس کے بعد کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔ اور یہ قول کہ حدیث کا معنی یہ ہے کہ وہ جمع نہیں ہوں گے جب تک وہ ایک دوسرے کی تکذیب کر رہے ہیں اور جب کوئی اپنے آپ کو جھوٹا مانا لے گا تو پھر نکاح جائز ہوگا۔

مسئلہ: اگر قذف بچے کی نفی کے ساتھ ہو تو قاضی بچے کے نسب کی اس مرد سے نفی کر دے گا اور اسے ماں کے ساتھ ملا دے گا اور جن کے نزدیک قضاء قاضی شرط ہے۔ تفریق کی قضاء بھی اس کے ضمن میں ہوگی۔ مرد لعان میں ہے کہ اَشْهَدُ بِاللَّهِ اَنِّي لِمِنَ الصَّادِقِينَ فَيْضًا وَمِنْ نَفْسِ الْوَالِدِ۔

یعنی میں اللہ کی قسم کھا کر گواہی دیتا ہوں کہ جو میں نے تجھ سے بچے کی نفی کی ہے اس میں سچا ہوں اسی طرح عورت بھی کہے گی۔ اگر مرد نے عورت پر زنا کا الزام لگایا اور بچے کی بھی نفی کی تو لعان میں دونوں چیزوں کا ذکر کرے گا۔ پھر قاضی بچے کے نسب کی نفی کر دے گا اور اسے ماں کے ساتھ ملا دے گا، کیونکہ ابن عمر کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خاندان اور بیوی کے درمیان لعان کرایا تو پھر آپ ﷺ نے مرد سے بچے کی نفی کر دی پھر ان کے درمیان تفریق کر دی اور بچے کو عورت کے ساتھ لاحق کر دیا۔ (شعاع علیہ) (۱)

مسئلہ: اگر خاندان بیوی سے کہے کہ تیرا حمل مجھ سے نہیں ہے تو امام ابوحنیفہ، امام زفر اور امام احمد کے نزدیک لعان نہ ہوگا کیونکہ خاندان کی نفی کے وقت حمل کا یقین نہیں ہے پس وہ تہمت لگانے والا نہ ہوگا۔ امام مالک، شافعی رحمۃ اللہ علیہما حمل کی نفی کی وجہ سے لعان کرتے

ہیں۔ امام ابو یوسف اور محمد فرماتے ہیں جب وہ چھ ماہ سے کم میں بچہ جنے گی تو لعان واجب ہوگا۔ اس قول کا تقاضا یہ ہے کہ بچہ پیدا ہونے تک معاملہ کو مزخ کیا جائے گا اگر وہ چھ ماہ سے کم میں بچہ جن دے گی تو لعان واجب ہوگا اور لعان واجب نہ ہوگا۔ بعض طرق میں ہلال کا قصہ اس طرح وارد ہے کہ جس سے پتہ چلتا ہے کہ لعان ولادت کے بعد ہوا تھا۔ شہین نے ابن عباس سے ہلال کے واقعہ میں روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے عرض کی اے اللہ! معاملہ واضح فرما دے تو عورت نے اس مرد کی شکل کا بچہ جنم دیا تھا جس کے متعلق خاندان نے الزام لگایا تھا کہ اس شخص کو اپنے اہل کے پاس پایا پھر رسول اللہ ﷺ نے لعان کرنا تھا (1)۔

امام مالک اور شافعی رحمۃ اللہ علیہما کے قول کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہلال اور اس کی بیوی کے درمیان تفریق کی تھی اور فیصلہ فرمایا تھا کہ بچہ کو باپ کی طرف منسوب نہ کیا جائے اور نہ عورت پر آئندہ طعن کیا جائے اور نہ بچہ پر کوئی زبان دراز کی جائے جو عورت یا بچہ پر تہمت لگائے گا اس پر حد ہوگی۔ مگر فرماتے ہیں اس عورت کا وہ بچہ مصر کا امیر بنایا تھا اور باپ کی طرف منسوب نہیں ہوتا تھا۔ یہ ابوداؤد کے الفاظ کا ترجمہ ہے اکثر طرق میں ہے کہ ہلال کی بیوی حاملہ تھی جب اس نے لعان کہا تھا۔ نسائی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے العجلیٰ فی اور اس کی بیوی کے درمیان اعان کرایا تھا جبکہ اس کی بیوی حاملہ تھی (2)۔ عبدالرزاق نے بھی اسی طرح روایت نقل کی ہے۔ خاندان نے کہا میں اس عورت کے پاس عفار انخل کے وقت سے نہیں گیا۔ (عفار انخل کا مفہوم یہ ہے کہ تاجیر کے بعد دو مہینے ان بھجوروں کو پائی نہیں دیا جاتا) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عرض کی اے اللہ! معاملہ واضح فرما دے تو عورت نے بڑا مکروہ چہرہ سے والا پچھڑا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حمل کی نفی سے لعان جائز ہے اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ لعان ثابت اس لئے ہوا تھا کیونکہ ہلال نے عورت پر زنا کی تہمت لگائی تھی۔ نفی حمل کی وجہ سے لعان ثابت نہیں ہوا تھا۔ اور امام احمد کے ہاں جو کج کی روایت ہے کہ ہلال نے حمل کی وجہ سے لعان کیا تھا خود امام احمد نے اس کا انکار کیا ہے۔ فرماتے ہیں کج نے یہ کہنے میں خطا کی ہے کہ حمل کی وجہ سے لعان کیا تھا۔ آپ ﷺ نے لعان کرایا تھا جب اس نے چار مرتبہ زنا کی کوئی وی بھی حمل کی وجہ سے لعان نہیں کرایا تھا۔ میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ ہلال نے بیوی پر دونوں قسم کے الزام لگائے تھے (یعنی زنا اور حمل کی نفی دونوں کا ذکر کیا تھا) جیسا کہ وہ روایت دلالت کرتی ہے جو علامہ بخوی نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور قتادہ سے نقل کی ہے۔ اگر زنا کی تہمت لگائی ہوتی تو یہی کافی تھا آپ ﷺ اس بچہ کی نفی نہ فرماتے کیونکہ احتمال تھا کہ یہ بچہ ہلال کی دوسری وہی کے علق سے ہو زنا کی وہی سے نہ ہو۔ پس ہلال کی حدیث سے صرف حمل کی نفی سے لعان کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔ اسی طرح ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول کہ ”عجلیٰ فی اور اس کی بیوی کے درمیان لعان کیا تھا جبکہ وہ حاملہ تھی“ اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ تہمت نفی حمل کی تھی بلکہ ابن سعد نے طبقات میں عمیر کے ترجمہ میں عبد اللہ بن جعفر سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں میں نے عمیر بن الحارث العجلیٰ فی کو دیکھا جب اس نے اپنی بیوی پر شریک بن محاک کے ساتھ بدکاری کرنے کا الزام لگایا اور اس کے حمل کا انکار کیا۔ پس رسول اللہ ﷺ نے ان کے درمیان لعان کرایا جبکہ وہ حاملہ تھی۔ میں نے ان دونوں کو دیکھا کہ وہ دونوں منبر کے پاس کھڑے ہو کر لعان کر رہے تھے۔ پھر عورت نے بچہ جننا تو وہ بچہ عورت کے ساتھ لاحق فرمایا اور عورت نے شریک بن محاک کی شکل سے ملتا جلتا بچہ جننا۔ پہلے قوم نے عمیر کو اس الزام پر ملامت کی اور کہا کہ ہم تو اس عورت کے متعلق خبر ہی جانتے ہیں لیکن جب اس نے شریک کے مشابہ بچہ جننا تو لوگوں نے عمیر سے معذرت کی۔ وہ بچہ دو

سال زندہ رہا تھا پھر فوت ہو گیا تھا۔ اس کی ماں بھی اس کے مرنے کے بعد تھوڑا عرصہ زندہ رہی تھی اور شریک کا دقا اور عزت لوگوں کی نظروں میں بالکل گر گیا تھا۔ یہ روایت دلالت کرتی ہے کہ اس نے اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگا لی تھی اور صل کا بھی انکار کیا تھا۔ امام ابو یوسف اور امام محمد کے قول کی وجہ یہ ہے کہ جب اس نے صل کی نفی کی اور چھ ماہ سے کم میں اس نے بچہ جن دیا تو ازام کے وقت صل کا وجود ظاہر تھا۔ پس قذف ثابت ہو گیا اس لئے اس پر لعان ہوگا۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں جب قذف فی الحال نہ ہو تو وہ شرط کے ساتھ معلق کی طرح ہوگا۔ گویا اس نے اس طرح کہا اگر تو حاملہ ہے تو تیرا صل مجھ سے نہیں ہے اور قذف کو شرط کے ساتھ معلق کرنا صحیح نہیں ہے۔

مسئلہ: اگر مرد نے عورت سے کہا تو نے زنا کیا ہے اور تیرا صل زنا کا ہے تو بلا جرم لعان ہوگا کیونکہ قذف پایا گیا ہے کیونکہ صراحتاً اس نے زنا کا ذکر کیا ہے اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک قاضی صل کی نفی نہیں کرے گا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں قاضی صل کی نفی کرے گا کیونکہ نبی کریم ﷺ نے بلال سے بچے کی نفی کی تھی جبکہ اس نے اس پر حاملہ ہونے کی حالت میں تہمت لگا لی تھی۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں احکام ولادت کے بعد مرتب ہوتے ہیں اس (ولادت) سے پہلے احتمال ممکن ہے اور حدیث میں اس بات پر محمول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے وحی کے ذریعے صل کا وجود جان لیا تھا۔ میں کہتا ہوں یہ قول انتہائی بعید ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ ظاہراً پر حکم لگاتے تھے تاکہ آپ کی اقتداء کی جائے آپ ﷺ وحی کے ذریعے حاصل ہونے والے حکم کے ساتھ حکم نہیں لگاتے تھے ورنہ آپ ﷺ یہ نہ فرماتے کہ تم میں سے ایک جھوٹا ہے آپ وحی کے ذریعے ایک معین فرد کی تکذیب کا حکم لگاتے تھے۔

مسئلہ: جب مرد عورت کے بچے کی نفی اس کی ولادت کے بعد کرے (تو کیا حکم ہے؟) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ ہے کہ اگر بچہ کی خبر سنتے ہی بچے کی نفی کرے تو اس کا نفی کرنا صحیح ہوگا اور لعان ہوگا۔ اگر وہ اس وقت خاموش رہا بعد میں نفی کی تو لعان ہوگا اور سب بھی ثابت ہو جائے گا۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس وقت تک خاوند کے لئے نفی کرنا صحیح ہے جب تک کہ لوگ مبارک دے رہے ہوں۔ ظاہر روایت میں مبارک کی مدت متعین نہیں فرمائی ہے۔ ابو الیث نے امام ابو حنیفہ سے تین دن کی مدت روایت کی ہے۔ حضرت انس نے امام ابو حنیفہ سے سات دن کی مدت روایت کی ہے۔ امام ابو یوسف اور محمد کے نزدیک مدت نفاس تک بچے کی نفی کرنا صحیح ہے۔ قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ فوراً نفی کرنا صحیح ہو کیونکہ سکوت (خاموشی) رضای دہن ہے لیکن ہم نے احتیاطاً کچھ مدت تاخیر کو جائز قرار دیا ہے تاکہ غور و فکر پورا ہو جائے تاکہ خاوند سے بچے کی نفی نہ واقع ہو جائے یا غیر کا بچہ اس کے ساتھ ملتی نہ ہو جائے کیونکہ یہ دونوں امر حرام ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ (جب آیۃ الملائعہ نازل ہوئی تھی) جس عورت نے کسی قوم پر ایسے شخص کو داخل کیا جو اس قوم سے نہیں ہے (یعنی بدکاری سے بچہ جننا) تو وہ اللہ کی طرف سے کسی مذہب پر نہیں ہے اور اسے اللہ تعالیٰ اپنی جنت میں ہرگز داخل نہیں فرمائے گا۔ اور جس مرد نے اپنے بچہ کا انکار کیا اور اس حالیکہ وہ اس کی طرف دیکھ رہا ہو تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ایسے شخص سے پردہ فرمائے گا اور اسے اولین و آخرین کے سامنے رسوا فرمائے گا (1)۔ اس حدیث کو ابو داؤد و نسائی و شافعی ابن حبان حاکم اور دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ دارقطنی نے اسے صحیح بھی کہا ہے۔ صحیحین میں حضرت سعد بن ابی وقاص اور ابوبکرہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اسلام میں اپنے باپ کے علاوہ کسی دوسرے شخص کے باپ ہونے کا دعویٰ کیا جبکہ اسے معلوم ہے کہ اس کا باپ اور شخص ہے تو اس پر جنت حرام ہے (2)۔

مسئلہ: اگر خاندان ولادت کے وقت غائب ہو تو اس کے آنے کے بعد اس مدت کا اعتبار کیا جائے گا جو ہم نے امام صاحب اور صاحبین سے نقل کی ہے؟ یا صاحبین کے نزدیک نفاس کی مدت کی مقدار اور امام صاحب کے نزدیک تہنیت قبول کرنے کی مدت کی مقدار ہے۔

مسئلہ: مرد کے لئے جائز ہے کہ اپنی بیوی پر تہمت لگائے جب اسے اس کے زنا کا علم ہو یا ظن مؤکد۔ جو جیسے مشہور ہے کہ اس عورت نے زید کے ساتھ زنا کیا ہے نیز قرینہ بھی ہو کہ اس نے خود ان دونوں کو خلوت میں دیکھا ہو۔ اگر وہ بچہ جنے اور اسے معلوم ہو کہ اس کا نہیں کیونکہ اس نے اس سے وطنی نہیں کی تھی یا وہ چھ ماہ سے کم مدت میں بچہ جنے جبکہ اس کی وطنی کو چھ ماہ نہیں گزرے یا دو سال کے بعد بچہ جنے اور اگر ان دونوں مدتوں کے درمیان بچہ جنے اور حیض کے ساتھ اس کا استبراء نہیں ہوا تو بچہ کی نفی کرنا حرام ہے اور اگر استبراء رحم کے چھ ماہ بعد بچہ جنے تو بچہ کی نفی کرنا جائز ہے۔

مسئلہ: اگر مرد نے وطنی کی اور عزل کیا یا اسے اس کے زنا کا علم ہوا اور اسے بچہ کے اپنے نطفہ یا زنا سے ہونے کا احتمال ہے تو نفی ولد حرام ہے۔ واللہ اعلم۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ وَأَنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ حَكِيمٌ ﴿۱۰﴾

”اور اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی (تو تم بڑی الجھنوں میں پڑ جاتے) اور بیشک اللہ بہت توبہ قبول

کرنے والا بڑا دانا ہے۔۔۔“

۱۔ اے امت محمدیہ، اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو وہ تمہیں رسوا کرتا اور تمہارے گناہوں پر فروری مואخذہ فرماتا لیکن وہ نظر رحمت فرمانے والا ہے ہر اس شخص پر جو اپنے گناہوں پر عتابت کے آنسو بہاتا ہے اور استغفار کر کے اپنے نامہ اعمال کی سیاہی کو دور کرتا ہے۔ لولا کی جزا حمد و ثناء ہے اور اس کی وجہ اس کی بڑائی کا اظہار ہے اللہ تعالیٰ تواب بھی ہے اور حکیم بھی ہے۔ اس نے جو تم پر حد و احکام جاری فرمائے ہیں ان میں سے ہر ایک میں بے شمار حکمتیں مندر ہیں۔

شیخان نے زہری سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں مجھے عروہ بن الزبیر سعید بن المسیب علقمہ بن وقاص اور عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ام المؤمنین سے روایت کر کے بتایا جب جھوٹا بہتان لگانے والوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر بہتان لگایا اور پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے اس الزام سے حضرت عائشہ کو بری فرمایا (زہری فرماتے ہیں مجھے مذکورہ افراد میں سے ہر ایک نے اس بات کا کچھ حصہ بیان کیا اور ان کی حدیثیں ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں اگرچہ بعض بعض سے زیادہ محفوظ ہیں) جو مجھے عروہ نے بیان کیا ہے وہ یہ ہے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ جب سفر کا ارادہ فرماتے تو اپنی ازواج کے درمیان قرعہ اندازی فرماتے جس کا نام نکلتا اسے سفر پر ساتھ لے جاتے آپ ﷺ نے ایک غزوہ (بنی مصلط) میں ہمارے درمیان قرعہ اندازی فرمائی تو میرا نام نکلا میں آپ کے ساتھ سفر پر روانہ ہوئی۔ یہ واقعہ حجاب کے نزول کے بعد کا ہے۔ میں اپنے ہودج میں سواری تھی اور میرا ہودج اونٹ پر رکھ دیا جاتا تھا۔ ہم چلتے رہے حتیٰ کہ جب رسول اللہ ﷺ اس غزوہ سے فارغ ہوئے تو واپسی کا سفر شروع ہوا۔ ہم نے مدینہ طیبہ کے قریب پڑاؤ کیا ہوا تھا کہ رات کو چلنے کا اعلان ہوا میں اٹھی اور قضاے حاجت کے لئے لشکر کے در در چلی گئی جب میں فارغ ہوئی تو اپنے کجاوہ کی طرف آئی پھر جب میں نے اپنے سینہ کو مس کیا تو میرا عین عین سے بنا ہوا ہارٹوٹ کر گر چکا تھا میں واہس لوئی اپنے ہار کو تلاش کیا تو اس کی تلاش میں مجھے دیر لگ گئی وہ لوگ آئے جنہوں نے

مجھے لے کر جانا تھا انہوں نے میرا ہوج اٹھایا اور میرے اونٹ پر رکھ دیا جس پر میں نے سوار ہونا تھا انہوں نے یہ گمان کیا کہ میں اس ہوج کے اندر ہوں۔ اس زمانہ میں عورتیں بکی پھلکی ہوتی تھیں ان پر زیادہ کوشش نہیں ہوتا تھا۔ عورتیں کھانا کھا تھوڑا کھاتی تھیں لوگوں کو ہوج کا ہلکا ہونا محسوس نہ ہوا انہوں نے اسے اٹھایا اور اونٹ پر باندھ دیا میں اس وقت عمر تھی۔ وہ اونٹ کو بکڑ کر چل دینے لے لنگر کے پیلے جانے کے بعد مجھے بار ملا میں جب واپس لشکر کی جگہ آئی تو وہاں کوئی شخص موجود نہ تھا۔ میں اسی جگہ ٹھہری اور میں نے یہ گمان کیا کہ لوگ جب مجھے مفقود پائیں گے تو واپس میری طرف آئیں گے۔ میں بیٹھی ہوئی تھی کہ مجھ پر نیند طاری ہو گئی تو میں سو گئی۔ صفوان بن امیصل اسلی ثم الذکوانی نے لشکر کے پیچھے بڑاؤ کیا تھا وہ رات کے آخر میں پیلے جب وہ میری جگہ پہنچے تو انہیں سونے ہوئے انسان کی سیاہی نظر آئی انہوں نے جب مجھے دیکھا تو وہ مجھے پہچان گئے انہوں نے مجھے حجاب سے پہلے دیکھا تھا۔ اس کے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھنے سے میں بیدار ہو گئی جب انہوں نے مجھے پہچانا تو میں نے اپنی اذنیوں کے ساتھ اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ قسم بخدا انہوں نے میرے ساتھ کوئی بات نہ کی اور انا للہ وانا الیہ راجعون کے علاوہ میں نے ان سے کوئی کلمہ نہیں سنا انہوں نے اپنی سواری کو ہٹایا اور اس کے گھٹنے پر اپنا پاؤں رکھا میں اٹھی اور اس پر سوار ہو گئی وہ مجھے لے کر پیلے ہی کہ دو سیر کے وقت لشکر کے نزول کے بعد ہم پہنچے میرے بارے لوگ باتیں بنانے لگے رئیس المؤمنین عبداللہ بن ابی بن سلول نے شرانگیز برائی پھیندا شروع کر دیا۔ میں مدینہ طیبہ پہنچی تو ایک مہینہ بیمار پڑی رہی۔ لوگوں میں اس بات کا شوبہ تر چاہو؟ ہاں لیکن مجھے کچھ خبر نہ ہوئی۔ لیکن ایک بات مجھے کھلک رہی تھی کہ میری علالت کے وقت جو شفقت و مہربانی رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے وہ اب مفقود تھی رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لاتے تو سلام کرتے اور فرماتے تمہارا کیا حال ہے؟ پھر واپس تشریف لے جاتے۔ مجھے اس انداز سے شک نہ ہوتا لیکن مجھے اس بات کا علم نہیں تھا۔ میں بیماری کے بعد بہت نقاہت محسوس کرنے لگی۔ ایک رات میں ام سلمہ کے ساتھ قضا نے حاجت کے لئے مدینہ طیبہ سے باہر کئی جگہوں تک اس وقت گھروں میں بیت الخلاء بنانے کا رواج نہ تھا اور ہم عرب کے دستور کے مطابق جنگل میں ہی جایا کرتی تھیں۔ ام سلمہ ابوکر کی خالہ زاد بہن تھیں۔ ہم جب قضا نے حاجت سے فارغ ہو کر واپس آ رہی تھیں تو ام سلمہ کا پاؤں چادر سے الجھا اور وہ گر پڑیں اور بے ساختہ کہا مسطح ہلاک ہو جائے۔ میں نے کہا تم نے بہت برا کلمہ کہا ہے کہا تم ایک بدی رحمائی کو بدو عادی رہی ہو۔ اس نے کہا بیٹی تم نے نہیں سنا جو کچھ اس نے طوفان برپا کر رکھا ہے۔ میں نے پوچھا کیا معاملہ ہے انہوں نے مجھے پورا واقعہ سنایا۔ یہ پریشان کن خبر سن کر میری مرض میں اضافہ ہو گیا۔ جب میں اپنے گھر پہنچی اور میرے حجرے میں رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور سلام فرمایا اور پوچھا تم کیسی ہو؟ تو میں نے عرض کی کیا آپ مجھے اپنے والدین کے پاس جانے کی اجازت فرمائیں گے۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ والدین سے خبر کی تفصیل یہ کہوں آپ ﷺ نے اجازت فرمائی اور میں اپنے والدین کے گھر آ گئی۔ میں نے والدہ محترمہ سے پوچھا لوگ کیا کہہ رہے ہیں انہوں نے کہا بیٹی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں جب کوئی عورت پاکیزہ صورت ہو اور اس کا شوہر اس سے محبت کرتا ہو اور اسکی سوسنیں بھی ہوں تو اس قسم کے پرائیڈ نہ ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے کہا سبحان اللہ لوگ میرے بارے ایسی باتیں کر رہے ہیں صبح تک روتی رہی صبح بھی آنسوؤں سے چل بھر نیند نہیں آئی۔ صبح بھی روتی رہی۔

جب وحی کے نزول میں تاخیر ہوئی تو آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اسامہ بن زید کو بلا یا اور دونوں سے اپنے بل سے جدائی کے متعلق مشورہ طلب کیا۔ حضرت اسامہ نے تو آپ ﷺ کے اہل کے متعلق براءت کا اظہار کیا۔ ایک روایت

میں ہے کہ ان کے دل میں جو حضور ﷺ کے اہل کے متعلق محبت تھی اس کو ظاہر کیا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! وہ آپ کی زوجہ محترمہ ہے میں تو ان کے متعلق خیر ہی جانتا ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا آپ تنگ دل نہ ہوں اس کے علاوہ عورتوں کی کیا کمی ہے؟ عورتیں بہت ہیں اگر آپ تصدیق کرنا چاہتے ہیں بریرہ لوٹنی سے پوچھ لیجئے۔ آپ ﷺ نے بریرہ کو بلایا اور پوچھا اسے بریرہ کو تو نے کوئی ایسی چیز دکھی ہے جس سے تمہیں عاشر رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے کوئی شک ہو۔ بریرہ نے کہا تمہیں اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ سمجھو فرمایا ہے۔ اس کے سوا میں نے عاشر میں کوئی عیب نہیں دیکھا کہ آباگو نہ تھا ہوا رکھا ہوتا ہے یہ اپنی کم عمری کی وجہ سے سوجھاتی ہیں اور مری آتا کھا جاتی ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور فرمایا اے مسلمانوں کے گروہ اس شخص کے بارے مجھے کون معدود رکھتا ہے جس کی اذیت رسائی میرے اہل حاند کے بارے مجھ تک پہنچی ہے قسم بخدا میں اپنے اہل کے متعلق خیر کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ انہوں نے ایک ایسے شخص کا ذکر کیا جس کے متعلق میں حیرتی جانتا ہوں اور وہ میرے گھر والوں پر میرے ساتھ داخل ہوتا تھا حضرت عاشر رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں حضرت سعد بن معاذ کھڑے ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میں آپ کو معدود رکھتا ہوں اگر وہ شخص اس قبیلہ سے ہے تو ہم اس کی گردن اڑا دیں گے اور اگر وہ بنی خزرج سے ہے تو آپ ﷺ ہمیں حکم فرمائیں ارشاد کے مطابق عمل ہوگا۔ حضرت عاشر رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں پھر خزرج کے سردار سعد بن عبادہ اٹھے جو ایک نیک اور صالح شخص تھے لیکن سعد بن معاذ کا جملہ سنا تو ان کی قبائلی عصبیت بیدار ہو گئی۔ کہنے لگے قسم بخدا تم نے جھوٹ بولا سے ایسا ہرگز نہ ہوگا اگر وہ شخص تمہارے قبیلہ کا ہوتا تو تم بھی اسے قتل نہ کرتے۔ اسید بن حضیر اٹھے جو سعد کے چچا زاد تھے انہوں نے سعد بن عبادہ کو مخاطب کر کے کہا قسم بخدا تم نے جھوٹ بولا ہے ہم اسے قتل کریں گے تو منافق نے منافقین کا دفاع کرتا ہے اوس و خزرج کے جذبات بھڑک اٹھے حتیٰ کہ جنگ چھڑنے لگی حضور ﷺ اس وقت منبر پر کھڑے تھے حضرت عاشر رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں حضور ﷺ ان کے جوش کو خنڈا کرتے رہے حتیٰ کہ وہ سب خاموش ہو گئے اور آپ ﷺ بھی خاموش ہو گئے۔ حضرت عاشر رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں میرے دن رات رونے میں بسر ہوتے ایک لمحہ بھی نیند نہیں آتی تھی۔ میرے والدین کو اندیشہ لاحق ہوا کہ اس طرح رونے سے میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ ایک دن میں رو رہی تھی میرے والدین میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک انصاری عورت میرے پاس آئی اور میرے پاس بیٹھ کر رونے لگ گئی پھر رسول اللہ ﷺ تشریف لائے سلام فرمایا اور بیٹھ گئے۔ حضرت عاشر رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں اس سے پہلے آپ میرے پاس (اس حادثہ کے دوران) بھی نہ بیٹھے تھے ایک میمبہ گزرا گیا لیکن میرے متعلق کوئی وحی نازل نہ ہوئی۔ حضرت عاشر رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں حضور ﷺ نے نکلے شہادت پڑھا پھر فرمایا اے عاشر مجھے تیرے متعلق ایسی بات پہنچی ہے تو اگر تو بری ہے تو اللہ تعالیٰ تیری برأت کر دے گا اگر تجھ سے کوئی تباہی ہوئی ہے تو اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کر اور تو پکڑ۔ کیونکہ جب انسان اپنے گناہ کا اعتراف کرتا ہے اور پھر توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی بات ختم فرمائی تو میرے آنسو خشک ہو گئے میں نے والد گرامی سے عرض کی حضور کو آپ جواب دیں ابا حضور نے کہا میں کوئی جواب نہیں دے سکتا میں نے والدہ محترمہ سے عرض کیا آپ رسول اللہ ﷺ کو جواب دیں انہوں نے کہا مجھے تو کچھ بھائی نہیں دیتا کہ میں کیا کہوں؟ (میں کم عمر تھی اور قرآن بھی زیادہ پڑھا ہوا نہ تھا) لیکن میں نے کہا قسم بخدا میں جان لگی ہوں کہ تم نے ایک بات سنی ہے جو تمہارے دلوں میں جم گئی ہے۔ اگر میں کہوں کہ میں بے قصور ہوں اور اللہ جانتا ہے کہ میں بے قصور ہوں تم میری تصدیق

نہیں کر دے گا اگر میں ایسی بات کا اعتراف کروں جسے اللہ جانتا ہے کہ میں اس سے بری ہوں تو آپ میری بات مان جائیں گے۔ اب میرے لئے کوئی چارہ نہیں سوائے اس کے کہ میں وہ بات کہوں جو حضرت یوسف علیہ السلام کے والد محترم نے کہی تھی **قَصَّةٌ مِّنْ جَبَلٍ** ۱۰ **اللَّهُ الشَّكَّانُ عَلَىٰ مَا تُصِفُونَ**۔ پھر میں منہ پھیر کر ہنست پر لیٹ گئی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں میں جانتی تھی کہ میں بری ہوں اور اللہ تعالیٰ میری براءت کا اظہار فرمائے گا لیکن مجھے یہ خیال نہ تھا کہ میرے متعلق آیات قرآنی نازل ہوں گی۔ میں اپنے آپ کو اس اہل نہیں سمجھتی تھی کہ میرے متعلق قرآن نازل ہوگا لیکن مجھے امید تھی کہ رسول اللہ ﷺ کو خواب میں اللہ تعالیٰ میری براءت دکھائے گا۔ تم بخدا رسول اللہ ﷺ ابھی اپنی مجلس سے اٹھے نہ تھے اور نہ کوئی دوسرا ابھی گھر سے باہر نکلا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ پر وہی کا نزول فرمایا۔ حضور ﷺ پر وہی کے آثار ظاہر ہونے لگے سردی کے موسم میں وحی کے بوجھ کی وجہ سے پسینے کے قطرے آپ کی جبین اقدس پر موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگتے تھے۔ جب یہ کیفیت ختم ہوئی تو آپ ﷺ سکرارہے تھے۔ پہلی بات جو حضور ﷺ نے ارشاد فرمائی وہ تھی اے عائشہ خوشخبری ہو اللہ تعالیٰ نے تیری براءت فرمادی ہے۔ میری والدہ نے مجھے کہا اے عائشہ اٹھ اور حضور ﷺ کا شکر یہ ادا کر۔ میں نے کہا بخدا میں نہیں اٹھوں گی اور نہ کسی کا شکر یہ ادا کروں گی صرف اللہ کا شکر ادا کروں گی جس نے میری براءت فرمائی (۱۱) اس وقت یہ آیات نازل ہوئیں۔

إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ لَا تَحْسَبُوهُ شَرًّا لَّكُم بَلْ هُوَ خَبِيرٌ
لَّكُم لِيكُلِ أَمْرِي مِنْهُمْ مَّا لَمْ يَكْتَسِبْ مِنَ الْإِثْمِ ۗ وَالَّذِي تَوَلَّىٰ كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ
عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۱﴾

”بیگانگ جنہوں نے جھوٹی تہمت لگائی ہے وہ ایک گروہ ہے تم میں سے۔ تم اسے اپنے لئے برا خیال نہ کرو بلکہ یہ بہتر ہے تمہارے لئے۔ ہر شخص کے لئے اس گروہ میں سے اتنا گناہ ہے جتنا اس نے کمایا ہے اور جس نے سب سے زیادہ حصہ لیا ان میں سے (تو) اس کے لئے عذاب عظیم ہوگا۔“

۱۔ کذب اور جھوٹ کی انتہا کو ایک کہا جاتا ہے۔ اس کا اصل معنی پھیرنا اور الٹ پلٹ کرنا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ عقیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا واقعی اس شاعر و ترقیب کی مستحق تھیں کیونکہ آپ کی ذات تو سراپا عفت و شرافت تھی۔ نیز آپ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہزادی رسول اللہ ﷺ کی زوجہ محترمہ اور مومنین کی ماں تھیں۔ آپ کا احترام و اکرام ہر شخص پر واجب ہے۔ جس نے آپ کی طرف کوئی غلط بات کی یقیناً اس نے حقیقت کو تبدیل کیا ہے۔ عصبہ اس جماعت کو کہتے ہیں جس میں دس سے چالیس تک افراد ہوں لفظ اس کا واحد نہیں ہے منکم سے مراد مومنین ہیں۔ امام بخاری وغیرہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ آپ فرماتی تھیں زینب بنت جحش اللہ تعالیٰ نے انکی انگلی دین کے ساتھ حفاظت فرمائی۔ انہوں نے میرے متعلق خیر کے سوا کچھ نہیں کہا لیکن ان کی بہن حنیئہ میرے متعلق غلط پراپیگنڈا کرنے والوں میں ہلاک ہوگئی۔ ان کے علاوہ جو اس نوعاً آرائی کی لپیٹ میں آئے ان میں مسطح حسان بن ثابت اور عبد اللہ بن ابی تھے سب سے زیادہ اس مسئلہ کو ہوا دینے والا بد بخت عبد اللہ بن ابی تھا (۲)۔

علاء بن غنفی فرماتے ہیں حضرت عروہ نے فرمایا کہ اس جھوٹی تہمت لگانے والوں میں مسلمانوں میں سے حسان بن ثابت، مسطح بن اثاثہ

حسد بنت جنس کا دوسرے لوگوں کے ساتھ نام لیا جاتا ہے لیکن ان کا مجھے علم نہیں کہ ان کی تعداد کتنی ہے، صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ ایک گروہ تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں عصبہ کا لفظ دلالت کر رہا ہے حضرت عمرو فرماتے ہیں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا یہ ناپسند کرتی تھیں کہ ان کے سامنے حضرت حسان کے متعلق برا بھلا کہا جائے۔ آپ فرماتی تھیں کہ حضرت حسان وہ ہیں جنہوں نے شان رسالت میں یہ کہا تھا۔

فَإِنَّ أُمَّيَ وَأُمَّيَ وَ أَوْلَادِيَّ وَ عِزَّتِي وَ عِزَّتِي بِعِزَّتِي مُحَمَّدٌ مِّنْكُمْ وَ قَاءُ

(بیٹک) میرا باپ، میری ماں، میری اولاد اور میری عزت محمد ﷺ کی عزت کو تم سے بچانے کے لئے ہے (۱)۔

ع۔ لا تحسبواہ کا خطاب نبی کریم ﷺ اور مذکورہ گروہ کے علاوہ مومنین کو ہے، کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر طعن نبی کریم ﷺ پر طعن کرنا ہے، کیونکہ یہ طعن و تشنیع کے تیر آپ ﷺ کے لئے پریشانی اور تکلیف کا باعث تھے اور تمام مومنین کے لئے حزن و ملال کا سبب تھے کیونکہ آپ ﷺ مومنین کے باپ تھے، یعنی اسے نبی مکرم (ﷺ) اور اسے میرے نبی کے جانشین اور اس بہتان تراشی کو اپنے لئے نہ خیال نہ کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جو تم اس اضطراب و پریشانی پر صبر کرو گے تو بارگاہ الہی میں تمہاری عزت و کرامت میں اضافہ ہوگا وہ رب کریم اپنے رسول ﷺ اور ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی براءت کیلئے قرآن نازل فرمائے گا اور ان کی عزت و عظمت کو مزید چارچاند لگا دے گا اور جنہوں نے اس کذب بیان اور بہتان تراشی میں حصہ لیا ان کے متعلق سخت عذاب کی وعید نازل فرمائے گا۔ جسے قیامت تک مسجدوں کے محرابوں اور عبادت گاہوں کے (میدانوں) پر پڑھا جاتا رہے گا۔

لا تحسبواہ کا جملہ مستانہ ہے گو یہ اس سوال کا جواب ہے کہ یہ بہتان تراشی کیا ہے یا یہ جملہ نبی کریم ﷺ اور مومنین کے پریشان دلوں کو تسلی دینے کے لئے مقرر ہے۔

ع۔ اس گروہ میں سے جتنا جس نے اس بہتان تراشی اور کذب بیانی میں حصہ لیا ہر ایک کو اس کے جرم کے مطابق سزا ملے گی۔ کیونکہ بعض نے یہ جھوٹا الزام گھڑا تھا، بعض یہ پسند کرتے تھے کہ اس کو مزید ہوا ملے۔ لوگوں میں یہ پھیل جائے اور بعض نے یہ واقعہ سننے کے بعد دوسروں کو بتایا، بعض اس پر ہنسنے لگے لیکن آگے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ بعض نے اس الزام کو روک دیا لیکن سن کر خاموش ہو گئے اسم موصول (ما) ظرف کا قائل ہے یا مبتدا ہے اور ظرف مقدم ہے اور یہ جملہ عصبہ کی صفت ہے اور پھر ان کی دوسری خبر ہے۔

علامہ بخاری فرماتے ہیں روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان لوگوں کو حد لگانے کا حکم لگایا جنہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر جھوٹی تہمت لگائی تھی ان تمام کو 80،80 کوڑے لگائے گئے (2)۔

میں کہتا ہوں دنیا میں ان کے لئے رسوا کن حد تھی اور آخرت میں ان کی جزا وہ ہوگی جو اللہ تعالیٰ چاہے گا۔

ع۔ یعقوب نے کبر و کفایت کے ضمن کے ساتھ اور عام قراء نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ کسائی فرماتے ہیں یہ دونوں لغتیں ہیں۔ یعنی جس شخص نے اس معاملہ کا آغاز کیا اور پھر نبی کریم ﷺ کی عداوت اور مومنین کو شرمندہ کرنے کے لئے اس مسئلہ کی تشہیر کی۔ امام بخاری نے لکھا ہے کہ زہری نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ یہ جھوٹ گھڑنے والا اور اس کی تشہیر کرنے والا عبداللہ بن سلول ہے اور عذاب عظیم سے مراد آخرت میں آگ کا عذاب ہے (3)۔

ابن ابی ملیکہ نے عمرو سے اور انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حدیث افک میں روایت کیا ہے۔ کہ آپ

فرماتی ہیں۔ میں سوار ہوئی تو صفوان نے اونٹ کی تکمیل پکڑی پھر ہم منافقین کے ایک گروہ کے پاس سے گزرے۔ یہ بد بختوں کی عادت تھی کہ علیحدہ ذیروہ لگاتے تھے عبداللہ بن ابی جوحیس المنافقین تھا اس نے پوچھا یہ عورت کون ہے؟ تو اس کے حواریوں نے کہا عائشہ ہے بد بخت کہنے لگا قسم بخدا اس نے اس سے نجات پائی ہے اور نہ صفوان اس سے بچا ہے مزید کہا کہ تمہارے نبی کی بیوی ہے اس نے ایک مرد کے ساتھ رات گزار لی ہے۔ پھر صبح کو وہ مرد اسے اونٹ پر بٹھا کر لے آیا ہے (1) بعض علماء فرماتے ہیں الہدی نولہی کبیروہ سے مراد عبداللہ بن ابی بن سلول حسان مسطح اور منہ ہیں۔ لیکن یہ قول ضعیف ہے اگر یہ تمام مراد ہوتے تو قرآن میں صحیفہ واحد کے نہ ہوتے بلکہ جمع ہوتے اور کلام اس طرح ہوتی وَالَّذِينَ تَوَلَّوْا بَيْتَهُ۔

سطح اور حسان بدری صحابہ میں سے ہیں جن کے اللہ نے اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دیے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اہل بدر کو فرمایا تھا عَمَلُوا مَا بَيْنَكُمْ فَإِنَّ اللَّهَ قَدْ غَفَرَ لَكُمْ۔ جو جاہلوں کو اللہ تعالیٰ نے مہماری مغفرت فرمادی ہے (2) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تمام صحابہ کی شان میں فرمایا وَلَقَدْ عَدَّ اللَّهُ الْفُطْرَىٰ لِكُلِّ شَيْءٍ مِّمَّا كَفَرَ بِهِمْ عَذَابًا كَمَا كَفَرُوا بِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ۔ یعنی وہ کسی کی نیت بھی نہیں کرتی (3) دخول جنت عذاب کے بعد بھی ہو سکتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ الہدی نولہی سے مراد حسان بن ثابت ہے امام بخاری نے مسروق سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں، میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس حاضر ہوا اس وقت آپ کے پاس حسان بن ثابت یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

خَصَانٌ زَوَّانٌ مَا تَزُوُّنُ بَرِيئَةٌ وَ نُصَبِحُ عَرَفَىٰ مِنْ لُحُومِ الْغَوَافِلِ

ترجمہ: وہ پاکدامن اور قادر و سکون والی عورت ہے کسی تنگ کی بناہ پر اسے مہم نہیں کیا جا تا وہ صبح کرتی ہے جبکہ اس کا پیٹ پاکدامن عورتوں کے گوشت سے خالی ہوتا ہے۔ (یعنی وہ کسی کی نیت بھی نہیں کرتی)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضرت حسان کو فرمایا لیکن تم تو ایسے نہیں ہو۔ مسروق فرماتے ہیں میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کہا تم ان کو اپنے پاس آنے کی اجازت کیوں دیتی ہو؟ جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق فرمایا وَالَّذِي نُوَلِّيَ كَبِيرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا اس سے کونسا عذاب سخت ہے۔ حضرت حسان حضور ﷺ کا دفاع کرتے ہیں (3) یعنی جب مشرکین رسول اللہ ﷺ کی جھوکتے تھے تو حضرت حسان مشرکین کی جھوکتے تھے۔ اس صورت میں عذاب عظیم سے مراد دنیا کا عذاب ہوگا پہلا قول زیادہ درست ہے۔

لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ صَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَأَقَالُوا هَذَا
إِفْكًا مُّبِينًا ﴿٥١﴾

”ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ (افواہ) سنی تو گمان کیا ہوتا مومن مردوں اور مومن عورتوں نے انہوں کے بارے میں نیک گمان اور کہہ دیا ہوتا کہ یہ تو کھلا ہوا بہتان ہے۔“

۱۔ اے ایمان والو! تم نے جب یہ بہتان سنا تھا تو تم نے فوراً اس کی تردید کیوں نہ کر دی؟ اس آیت میں اہل دین کو اپنی ذوات (انفسہم) سے تعبیر فرمایا جبکہ دوسری آیات میں بھی اہل دین کو اپنی ذوات انفس سے تعبیر فرمایا ہے۔ ارشاد ہے لَا تَكْفُرُوا بِالْأَنْفُسِ كُمْ

1- تیسرے بغوی، جلد 4، صفحہ 181 (المنکر) 2- صحیح بخاری، جلد 3، صفحہ 1095 (العمدیہ) 3- ایضاً، جلد 2، صفحہ 699 (وزارت تعلیم)

(نہ عیب لگاؤ ایک دوسرے پر) لَا تَتَّقُوا أَنْفُسَكُمْ (نہ ہلاک کرو اپنے آپ کو) لَا تُخْرَجُونَ أَنْفُسَكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ (اور نہیں نکالو گے اپنوں کو اپنے وطن سے) فَتَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ (تو سلاحتی کی دعا دو اپنوں کو) مؤمنین اور ہر دین والے آپس میں ایک ایک نفس کی مانند ہیں۔ کلام اس طرح ہونا چاہئے تھا لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّتُمْ بِأَنْفُسِكُمْ خَيْرًا۔ لیکن تو بیخ میں مبالغہ کے لئے خطاب سے غائب کی طرف التفات کیا گیا ہے۔ نیز یہ شعور دلا نا مقصود ہے کہ ایمان اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ مؤمنین کے متعلق حسن ظن رکھو اور ان پر ظن کرنے سے باز آ جاؤ اور مؤمنین کا ظن کرنے والوں سے اس طرح دفاع کرو جس طرح اپنی ذاتوں کا دفاع اور بچاؤ کرتے ہو۔ لولا اور اس کے فعل کے درمیان طرف سے فاصلہ کرنا جائز ہے۔ کیونکہ کسی چیز کی طرف اس چیز کے قائم مقام ہوتی ہے کیونکہ طرف اس چیز سے جدا نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے جو وسعت طرف میں ہوتی ہے دوسری چیزوں میں نہیں ہوتی یہاں طرف کو اس لئے مقدم فرمایا ہے کیونکہ طرف کا ذکر ایم ہے یعنی انہیں تمہیر کی جارہی ہے کہ جو نبی انہوں نے سنا تھا انہیں فوراً کہنا چاہئے تھا کہ یہ بہتان عظیم ہے جس طرح کہ حالات سے باخبر شخص کہتا ہے۔ کیونکہ ایمان مدح اور تعظیم کا سبب ہے اور جو ظن کرے یا برا بھلا کہے اس نے جھوٹ بکا اور حقیقت کو بدل دیا اور وہ افتراء یا بیعتی کی وجہ سے عاصی اور فاسق ہو گیا اور فاسق کی گواہی مقبول نہیں ہے۔

مسئلہ: اس آیت کریمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مؤمنین کے متعلق حسن ظن رکھنا واجب ہے اور اس کو چھوڑنا اس وقت تک جائز نہیں جب تک کہ اس کے خلاف کوئی دلیل شرعی ظاہر نہیں ہو جاتی۔

لَوْلَا جَاءَ وَعَلَيْهِ بِأَمْرٍ بَعْدَ شَهَادَةِ آءٍ قَدْ ذَمَّ يَأْتُوا بِاللَّهْوَ آءٍ وَأُولَئِكَ عِنْدَ اللَّهِ هُمُ الْكٰذِبُونَ ﴿٥﴾

” (اگر وہ سچے تھے تو) کیوں نہ پیش کر سکے اس پر چار گواہ پس جب وہ پیش نہیں کر سکے گواہ تو (معلوم ہو گیا کہ) وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک جھوٹے ہیں۔“

لہ جو شخص کسی پر برائی کی تہمت لگائے اور پھر اس پر چار گواہ لے آئے تاکہ مقدمہ کو حد لگائی جائے۔ (یہ بھی احتمال ہے کہ رمی سے مراد معاصی سے روکنا ہو) اگر وہ چار گواہ نہ لائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مسلمان پر حد شرعی کے قائم کرنے کے علاوہ برائی کی تشہیر کرنا چاہتا ہے اور وہ اپنے اس دعویٰ میں جھوٹا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ اللہ کے حکم اور اس کی شریعت میں جھوٹے ہیں ان پر حد قذف واجب ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے طرف اول تک ہم الکاذبون کے مضمون و مفہوم کے متعلق ہوگی اور معنی یہ ہوگا جب وہ چار گواہ نہ لے آئیں تو ان پر حد قائم کی جائے۔ کیونکہ وہ حکماً جھوٹے ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے چار افراد عبداللہ بن ابی حسان بن ثابتؓ سے اس آیت کا تفسیر طلب کیا اور حضرت بنت قیس کو حد لگائی (1)۔

لَوْلَا قَضَى اللَّهُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِي مَا أَقْسَمْتُمْ فِيهِ وَعَدَّ ابْنُ عَزِيمٍ ﴿٦﴾

” اور اگر نہ ہوتا اللہ تعالیٰ کا فضل تم پر اور اس کی رحمت دنیا اور آخرت میں تو پچھتا تمہیں اس سخن سازی کی وجہ سے سخت

عذاب ہے۔“

یعنی اسے میرے نبی پر ایمان لانے والوں! اگر تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور فضل و احسان نہ ہوتا اور اس فضل و رحمت میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہیں اسلام قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور نبی کریم ﷺ کی صحبت سے نوازنا جو عذاب کے نزول سے مانع ہے نیز اس نے تمہیں مہلت عطا فرمائی اور تو یہ کی توفیق بخشی اسی طرح اگر آخرت میں بھی اس کا فضل اور رحمت نہ ہوتی جیسا کہ اس نے عفو مغفرت اور جنت کا تم سے خود وعدہ فرمایا ہے تو تمہیں دنیا و آخرت میں عذاب کی جگہ میں جہنم دیا جاتا۔ کیونکہ تم نے میرے نبی کی زوجہ کے متعلق غلط بیانی کی ہے اور تمہت لگائی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں افاضہ کا معنی اشاعت اور پھیلاؤ ہے۔ مثلاً عرب کہتے ہیں خبر مستفیض یعنی ایسی خبر جو مشہور ہے۔

یعنی یہ فضل الہی ہے کہ تم پر عذاب کا کوڑا نہیں برسایا اور نہ جو تم نے بے پرکی اڑانے کی کوشش کی ہے اس کی پاداش میں تم پر عذاب نازل ہو جاتا جیسا کہ قوم عاد، قوم لوط اور وہودہ و تنفکات کے باشندوں پر عذاب نازل ہوا تھا جس نے دنیا میں ان کا نام و نشان مٹا دیا اور آخرت میں تو ایسا عذاب ہوگا جو بالکل شرم ہی نہ ہوگا اور نہ اس عذاب سے زیادہ تکلیف دہ کوئی عذاب ہوگا۔

اس آیت کریمہ میں مؤمنین جو اس واقعہ میں ملوث تھے ان کی شان کا ذکر ہے۔ اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ والدی تولی کبیرہ مبہم سے مراد خاص منافق ہیں اور وہ عبد اللہ بن ابی اور اس کے دوسرے منافق ہم نوا تھے مثلاً زید بن رقاد وغیرہ۔ لولا کا لفظ کسی شے کے پائے جانے کی وجہ سے دوسری شے کے نہ پائے جانے پر الٹ کرتا ہے۔ پس یہ آیت کریمہ فضل اور رحمت کے پائے جانے کی وجہ سے عذاب کے نہ پائے جانے پر دلالت کرتی ہے اور والدی تولی کبیرہ منافقین کے لئے عذاب کے ثبوت پر دلالت کرتا ہے۔

إِذْ تَتَّقُونَهُ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَئِن لَّمْ يَكُنِ اللَّهُ فِئْتَابًا لَّخَلَّيْنَا مِنْ بَيْنِ يَدَيْكُمْ الْوَادِيَّ لَوِطًا وَأَلَمْ تَلَمَّوْا
هَيِّبًا وَهُوَ عِنْدَ اللَّهِ عَظِيمٌ ۝۱۰۰

”جب تم ایک دوسرے سے (نفل) کرتے تھے اس (ہبتان) کو اپنی زبانوں سے لے کر کہا کرتے تھے اپنے مؤمنوں سے ایسی بات جس کا تمہیں کوئی علم ہی نہ تھا لیکن تم خیال کرتے کہ یہ معمولی بات ہے حالانکہ یہ بات اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بڑی تھی۔“

۱۔ اذ لمسکم یا الفصم کی طرف ہے تلفوفہ اصل میں تتلفونہ تھا ایک تا کو حذف کیا گیا ہے تلفوفہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے پوچھتے تھے۔ کبھی کہتے ہیں ان میں سے ایک شخص دوسرے شخص تک بات پہنچاتا تھا پھر وہ کہتا مجھے ایسی ایسی بات پہنچی ہے، یعنی اس کی حقیقت کیا ہے تو وہ ایک دوسرے کو اس طرح بات پہنچاتے تھے (۱)۔ جہاد فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے اس کو روایت کرتے تھے (۲)۔ زجاج کہتے ہیں بعض دوسروں سے بات نقل کرتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ عقیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس کو لام کے کسرہ اور قاف کی جھجک کے ساتھ وقل یلق سے مشتق کر کے پڑھا ہے جس کا معنی جھوٹ بولنا ہے (۳)۔

۲۔ وہ ایسی بات کرتے ہیں جس کا تعلق صرف ان کی چہرہ زبانوں سے ہے خارج میں اس کا کوئی مصداق نہیں ہے اور اس کا تمہیں بھی کوئی علم نہیں ہے کیونکہ خارج میں وجود کی فرع علم ہے۔ جب خارج میں اس کا وجود ہی نہیں ہے تو تمہیں اس کا علم نہیں ہے۔

سے تم اس انتہام کی تفہیم اور اس میں مداخلت کو معمولی اور آسان بات سمجھتے ہو، حالانکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ ہے اور جو زبانوں سے ابہام وغیرہ صادر ہوتا ہے اس پر عام عذاب ہوتا ہے۔ لیکن ایسا معاملہ جس میں رسول اللہ ﷺ کی جنگ عزت ہو وہ تو زیادہ عذاب کا مستحق ہے۔

حضرت معاذ بن جبل سے مروی ہے فرماتے ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ مجھے کوئی ایسا عمل بتائیں جو مجھے جنت میں لے جائے اور دردِ زخم سے دور کر دے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تو نے بہت بڑی بات پوچھی ہے۔ یہ کام آسان ہے جس پر اللہ تعالیٰ آسان فرمادے (وہ یہ کام ہے) اللہ کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو روزہ رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ شریف کا حج کرو؟ پھر آپ ﷺ نے اشارہ فرمایا میں تمہاری نیکی کے ایوان پر راہنمائی نہ کروں؟ (فرمایا) روزہ و حال ہے اور صدقہ خطا کو اس طرح ختم کر دیتا ہے جس طرح پانی آگ کو بجھا دیتا ہے اور رات کے جوف میں انسان کا نماز پڑھنا (یعنی نماز تہجد پڑھنا) پھر آپ ﷺ نے سَبَّحَانِي جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِمِ... يَتَعَنَّوْنَ ۝ کی آیت تلاوت فرمائی، پھر فرمایا میں تمہاری معاملہ کی اصل، اسکے ستون اور اسکی کوہان کی چوٹی کی طرف راہنمائی نہ کروں میں نے عرض کی کیوں نہیں یا رسول اللہ ﷺ! ضرور کرم فرمائیے۔ فرمایا معاملہ کی اصل اسلام ہے اسکا ستون نماز ہے اور اسکی کوہان کی چوٹی جہاد ہے۔ پھر فرمایا میں تمہیں اس معاملہ کے مدار کے متعلق نہ بتاؤں؟ میں نے عرض کی حضور ضرور ہند تو اتاری فرمائیے۔ آپ ﷺ نے اپنی زبان مبارک کو پکڑا اور فرمایا اسکی حفاظت تجھ پر لازم ہے۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم جو کلام کرتے ہیں اس پر بھی ہمارا مؤاخذہ ہوگا۔ فرمایا معاذ، تجھ پر تیری ماں رونے پہلے لوگ اپنے منہوں کے بل اور اپنے ہتھوں کے بل آگ میں صرف اپنی زبانوں کے تھنڈا کیو جتے گئے۔ اس حدیث کو امام احمد ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے (۱)۔

وَلَوْلَا إِذْ سَعَيْتُمْ لَكُم مَّا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَكْتُمَنَّ بِهَذَا سُبْحَانَ هَذَا
بِهَذَا عَظِيمًا ۝

”اور ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ (افواہ) کہی تو تم نے کہہ دیا ہوتا ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم گفتگو کریں اس کے متعلق، اے اللہ! تو پاک ہے۔ یہ بہت بڑا جہتان ہے۔“

۱۔ اسے مومنوں! جب تم نے یہ جھوٹا اور باطل الزام بنا تو تم نے ان کا رد کرتے ہوئے یہ کیوں نہ کہا کہ ہمارے لئے ایسی بات کرنا مناسب اور صحیح نہیں ہے، لولا اور اس کے فعل کے درمیان ظرف کے ساتھ فاصلہ کیا گیا ہے، کیونکہ ظرف میں جو وسعت ہوتی ہے وہ کسی دوسری چیز میں نہیں ہوتی اور ظرف کو مقدم کرنے سے مقصود یہ ہے کہ جھوٹی بات سننے کے وقت فوراً تم پر یہ کہنا واجب ہے۔ چونکہ وقت کا ذکر اب تمہارا لئے اس کو مقدم فرمایا ہے۔ ان نکتہ ہذا۔ میں حد کا اشارہ مخصوص اقدح کی طرف بھی ہو سکتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس کی نوع کی طرف اشارہ ہو۔ حرم رسول اللہ ﷺ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے تعرض نفوس سلیم پر بہت سخت اور تکلیف دہ تھا۔ کیونکہ شرعاً کسی بھی جھمن عورت پر بہت لگا ہافسق کوڑوں اور شہادت کے مردود ہو جانے کا موجب ہے۔

۲۔ یعنی اللہ تعالیٰ پاک ہے اس سے اس کے نبی کی زوجہ (بیوی) کا جرحہ ہو کیونکہ بیوی کا فوج خداوند کی طرف سب و شتم کرنا ناجائز ہے اور نبی

کفار کی طرف مبعوث اس لئے کیا گیا ہوتا ہے کہ وہ انہیں دعوت حق دے پس ضروری ہے کہ وہ ایسے محبوب سے پاک ہو جو لوگوں کی نفرت کا سبب بنتے ہوں۔ یہ تو جائز ہے کہ نبی کی بیوی کا کفر ہو جیسا کہ نوح علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کی بیویاں کا کفر تھیں۔ لیکن نبی کی بیوی کا کفر ہونا جائز نہیں (کیونکہ یہ چیز لوگوں کی نفرت کا باعث ہوتی ہے) یہ جملہ ماقبل کلام کی تقریر اور ثبوت ہے اور مابعد کی تمہید ہے۔

اسے یہ ایسا جمیعت ہے کہ سننے والا مہیوت ہو جاتا ہے۔ مہیوت علیہ کی عظمت کی وجہ سے یہ بہت بڑا بہتان ہے کیونکہ جنایات کی خفارت اور جنایات کی بڑائی اس کے اعتبار سے ہوتی ہے جس پر جنایت کی گئی ہو۔

يَعْظُمُ اللَّهُ أَنْ تَعُوذُوا بِاللَّهِ أَيْدًا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٤٦﴾

”نہیوت کرتا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ کو دوبارہ اس قسم کی بات ہرگز نہ کرنا۔ اگر تم ایماندار ہو۔“

۱۔ وعظ ایسی زجر کو کہتے ہیں جو ڈرانے سے معتقن ہوں۔ ظلیل کہتے ہیں بھلائی اور نیکی کی اس طرح نصیحت کرنا کہ اس سے دل پہنچ جائے۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں نصیحت کرتا ہے اور تمہیں ایسا عذاب یاد دلاتا ہے نیز تمہیں دوبارہ اس قسم کی قبیح بات کرنے اور سننے سے ڈراتا ہے جب تک تم زندہ ہو۔ یا یہ معنی کہ اس قسم کی بات دوبارہ کرنے کو ناپسند کرنے کی وجہ سے تمہیں اس جیسے قول سے منع کرتا ہے اور تمہیں ڈراتا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں اللہ تمہیں ہمیشہ اس قسم کی بات دوبارہ کرنے سے روکتا ہے (۱)۔ عظیم کا جملہ بہتان عظیم کی صفت ہے یا جملہ معتقند ہے۔

۲۔ یہ شرط ہے اور ماقبل کلام کی وجہ سے جواز سے مستثنیٰ ہے، یعنی اگر تم ایماندار ہو تو نصیحت حاصل کرو اور آئندہ کبھی اس قسم کی بات نہ کرو کیونکہ ایمان ایسی باتوں سے روکتا ہے جنہوں نے کانشر رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق زبان درازی کی وہ روافض (شیعہ) تھے مؤمنین نہیں تھے۔

وَيَبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ الْآيَاتِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٤٧﴾

”اور کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے (اپنی) آیتیں۔ اور اللہ سب کچھ جاننے والا بڑا ادا ہے۔“

۱۔ یعنی اللہ تعالیٰ شریعت مظہرہ پر دلالت کرنے والی آیات بڑے کھلے انداز میں بیان فرماتا ہے، یعنی اوامر اور نواہی، آداب و اخلاق سب بڑے واضح انداز میں بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمام محاسن کو جانتا ہے اس لئے وہ محاسن کا حکم دیتا ہے۔ اور قیاس سے منع فرماتا ہے یا یہ معنی کہ وہ حضرت کانشر رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی براءت اور اس کی پاکدامنی کو خوب جانتا ہے اور تہمت لگانے والوں کے معاملہ اور ان کے کذب کو بھی خوب جانتا ہے۔ اس کی تدابیر میں حکمت کا رفرما ہوتی ہے۔ اپنے نبی کی طرف برائی کی نسبت کو جائز قرار نہیں دیتا اور نہ برائی پر اسے قائم رکھتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يُجِبُونَ أَنْ تَسْمِعَهُمُ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي
الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٤٨﴾

”چینک ہو لوگ یہ پسند کرتے ہیں کہ بھیلے بے حیائی ان لوگوں میں جو ایمان لائے ہیں (تو) ان کے لئے دردناک عذاب ہے دنیا اور آخرت میں اور اللہ تعالیٰ (حقیقت کو) جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو۔“

۱۔ فاحشہ اس برائی کو کہتے ہیں جو انتہائی قبیح ہو۔ فرمایا اے لوگو! اللہ تمہارے نہاں خانہ دل میں اٹھنے والے اسرار کو جانتا ہے حقیقت کو تم نہیں جانتے۔ اس لئے تم پر ظاہر امر کی بیروی کرنا لازم ہے۔ جو تہمت لگانے اور اس کے پاس چار گواہ ہوں تو اس کے متعلق حسن ظن رکھو اور جان لو کہ اس نے زانی کے معاملہ کو حد قائم کرنے کے لئے ظاہر کیا ہے اور دنیا کو شر اور برائی سے پاک کرنے کی نیت سے برائی کا اظہار کیا ہے اور جو تہمت لگائے لیکن اس کے پاس گواہ نہ ہوں تو جان لو کہ یہ شخص برائی کو ہوا دینا چاہتا ہے، کیونکہ اس کے لئے مقذوف پر حد قائم کرنا ممکن نہیں ہے اس لئے ایسے شخص کو حد قذف لگاؤ اور وہ اللہ کے نزدیک جھوٹوں میں سے ہے۔ اس پر تہمت لگانے والوں کی حد واجب ہوگی اگرچہ حقیقتاً وہ سچا بھی ہو۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ وَأَنَّ اللَّهَ سَرَّ ذُوقَ سَائِحِيكُمْ ①

”اور اگر نہ ہوتا تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت اور یہ کہ اللہ تعالیٰ بہت مہربان (اور) رحیم ہے۔ (تو تم بھی نہ سچ سکتے)۔“

۱۔ اے عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے معاملہ میں غور و خوض اور مداخلت کرنے والے مومنو! اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو وہ دنیا میں ایسا عذاب دیتا کہ تمہارا نام و نشان تک نہ رہتا اور آخرت میں ابدی آگ کے عذاب میں مبتلا کرتا۔ لیکن اس نے اپنے نبی کی صحبت کی برکت سے تمہاری مغفرت فرمادی۔ لولا کا جواب حذف کیا گیا ہے کیونکہ پہلے اس کا ذکر ہو چکا ہے، لیکن تخریف اور امتنان کا ذکر دوبارہ فرمایا تاکہ جرم کی بڑائی اور شدت پر دلالت ہو جائے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں ان الذین یحبون الفاحشۃ سے مراد عبداللہ بن ابی اور اس کے دوسرے منافق ساتھی ہیں۔ دنیا میں عذاب سے مراد حد قذف ہے اور آخرت کے عذاب سے مراد دائمی عذاب ہے اور لولا کا فضل اللہ علیکم سے مراد صلح حسان اور منہ ہیں (۱)۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا خُطُوتَ الشَّيْطَانِ ۚ وَمَنْ يَتَّبِعْ خُطُوتَ الشَّيْطَانِ فَإِنَّهُ يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ ۗ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ مَا زَكَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ أَبَدًا ۚ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يُزَكِّي مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ①

”اے ایمان والو! نہ چلو شیطان کے نقش قدم پر اور جو چاہے شیطان کے نقش قدم پر تو وہ تمہارے (اپنے پیروؤں کو) بے حیائی کا اور ہر برے کام کا۔ اور اگر نہ ہوتا تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت تو نہ سچ سکتا تم میں سے کوئی بھی ہرگز باں اللہ تعالیٰ پاک کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔“

۱۔ نافع المزنی ابو عمر و ابو بکر اور عمرہ نے خطوات کو طاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے طاء کے ضم کے ساتھ پڑھا ہے طاء کے فتح کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ یعنی برائی کی تشبیہ کرنے میں شیطان کے آثار پر نہ چلو۔

نفسا ما اس برائی کو کہتے ہیں جو عقلاً اور عقلاً انتہائی قبیح ہو۔ المنکر وہ برائی جسے شرع ناپسند کرے۔ فانہ یامر بالفحشاء۔ کا جملہ شیطان کی اتباع کی نبی کی علت ہے۔ اے مومنو! اگر وہ تمہیں توبہ کی توفیق عطا نہ فرماتا جو گناہوں کو مٹا دیتی ہے اور حد و دو جو گناہ گناہ ہوتی ہیں ان کو شرع فرما کر تم پر فضل نہ فرماتا تو تم میں سے کوئی بھی اس جھوٹے اہرام کی معصیت سے پاک نہ ہوتا۔ من احد سے پہلے سزا مندہ

ہے اور محل رفع میں ہے۔ اِذَا سے مراد آخر الہد ہے۔ اللہ تعالیٰ توبہ پر براہِ بخیر فرماتا ہے اور توبہ کو قبول فرماتا ہے وہ ان کے اقوال و مقالہ کو خوب سننے والا ہے اور ان کی نیوٹوں کو جاننے والا ہے۔

شخصین وغیرہ مانے حدیثِ اَلک میں روایت کیا ہے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ مطہح بن اثاثہ پر رشتہ قرابت اور ان کی مفلسی کی وجہ سے ان کی مالی اعانت فرمایا کرتے تھے جب انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر غلط الزام کا پروپیگنڈا کیا تو صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میں اب کبھی مطہح پر کچھ خرچ نہ کروں گا۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1)۔

وَلَا يَأْتِيكُمُ الْفُضْلُ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١١﴾

”اور نہ تم کھائیں جو برگزیدہ ہیں تم میں سے اور خوشحال ہیں اس بات پر کہ وہ ندیں گے رشتہ داروں کو اور مسکینوں کو اور راہِ خدا میں ہجرت کرنے والوں کو۔ اور چاہئے کہ (یہ لوگ) معاف کر دیں اور درگزر کریں کیا تم پسند نہیں کرتے کہ بخش دے اللہ تعالیٰ تمہیں اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔“

۱۔ ولایا یتل باب افعال ہے اور یہ الایہ سے مشتق ہے جس کا معنی قسم اٹھانا ہے۔ یالایا یتل کا معنی اکتصر ہے۔ اس وقت یہ الا لوسے مشتق ہوگا جس کا معنی کم کرنا ہے۔ یہاں قسم والا معنی بہتر ہے کیونکہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قسم اٹھائی تھی اور اسی معنی کی تائید ابو جعفر کی قرأت و ولایا یتل بھی کرتی ہے جس میں ما تقدم ہے اور دہمہ موخر ہے اور باب تفعیل کا صیغہ ہے۔ اولوالفضل سے مراد دین میں بزرگی کے حامل لوگ ہیں اور دین میں بزرگی رکھنے والوں کو ہی یہ نبی فرمائی گئی ہے۔ کیونکہ ان کا مرتبہ اور فضیلت بہت بلند ہے اس لئے انہیں عالی ظرفی اور بلند اخلاق کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ درناتقی بڑی اذیت رسائی کے مقابلہ میں مالی اعانت بندہ کر دینا کوئی غلط کام نہیں تھا۔ اگر ابو الفضل کا معنی دولت مند کیا جائے تو اس معنی سے تکرار لازم آئے گا، کیونکہ السعۃ کا معنی بھی دولت مندی اور خوشحالی ہے۔ منکم کی ضمیر مخاطب ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان جیسے دوسرے بلند اخلاق سے مزین افراد ہیں۔ اس آیت کریمہ میں سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت و شرف پر بڑی واضح دلیل ہے یا یہ معنی کہ تم میں سے صاحب فضل لوگ غریب مسکینوں کی معاونت ترک نہ کریں۔ ان یوفوا سے پہلے علی یانی محذوف ہے۔ اولیٰ القربیٰ والمساکین والمہاجرین۔ سے مراد مطہح اور ان جیسے دوسرے نادار لوگ ہیں۔ یہ تینوں صفات ایک موصوف کی ہیں، یعنی ایسے لوگ جو ان صفات کے جامع ہیں یا مختلف موصوف کی صفات ہیں موصوف کو حذف کر کے صفات کو ان کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ پس یہ مقصود کی علت بیان کرنے کے لئے زیادہ طبع اسلوب ہے کیونکہ مطہح مسکین مہاجرین اور ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خالہ زاد تھا۔

۲۔ جو ان سے فرو گذاشت ہوئی ہے اس کو معاف کر دیں اور صرف نظر فرمائیں۔ اے صاحب فضل اور کشادہ دست لوگو! کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہاری فرو گذاشتوں کو معاف فرمادے، اس لئے کہ تم دوسروں کو معاف کرتے اور دوسروں پر سے درگزر کرتے ہو اور ان سے احسان کرتے ہو جو تم سے برسلوک کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اتنے حقوق اور نعمتوں کے باوجود اور انعام پر کامل قدرت رکھنے

کے باوجود بہت زیادہ پردہ پوشی فرمانے والا ہے اور ہم فرمانے والا ہے۔ اس لئے تم بھی اخلاق الہی سے اپنے آپ کو مزین کرو۔ امام بخاری اور مسلم وغیرہ نے اس واقعہ میں روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا قسم بخدا میں پسند کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری مغفرت فرمادے، پس آپ نے دوبارہ مسطح پردہ مالی معاونت جاری فرمادی جو پہلے کیا کرتے تھے اور کہا قسم بخدا میں کبھی اس کی مالی معاونت سے ہاتھ نہیں کھینچوں گا (1)۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا واصل وہ نہیں جو بدلے میں رشتہ قائم رکھنے والا ہو بلکہ واصل وہ ہے کہ جب اس سے قطع تعلق کیا جائے تو وہ تعلقات کو بحال رکھے۔ اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے (2)۔ ابن عباس اور ضحاک فرماتے ہیں صحابہ کرام میں سے کچھ لوگوں نے قسم اٹھائی تھی، جن میں ابو بکر صدیق بھی تھے کہ وہ کسی ایسے شخص پر صدقہ نہیں کریں گے جس نے بھی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق کوئی نازیبا بات کی ہے اور نایسے لوگوں کو کوئی منفعت پہنچا کیے تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (3)۔

إِنَّ الَّذِينَ يَمُنُونَ بِالْغَيْبِ الْمُبْتَلَىٰ مِنْهُمْ لِيُبَيِّنُوا لَهُمْ
وَأَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٠٠﴾

”جو لوگ تہمت لگاتے ہیں یا کدواں عورتوں پر جو ایمان والیاں ہیں ان پر پھینکا رہے دنیا اور آخرت میں اور ان کے لئے عذاب عظیم ہے۔“

۱۔ غافلات سے مراد ایسی پاک طینت عورتیں ہیں جو طبعاً اتنی صالح اور نیک ہوتی ہیں کہ ان کے دلوں میں برائی کے تصور کا بھی گزر نہیں ہوتا۔ فرمایا جو پاکدواں برائی کے تصور سے بھی ناواقف اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والی عورتوں پر تہمت لگائیں گے دنیا و آخرت میں ان پر اللہ کی لعنت ہوگی اور انہیں دردناک عذاب، یعنی جہنم کی آگ میں مبتلا کیا جائیگا۔ یہ حکم ہر اس تہمت لگانے والے کیلئے ہے جو ایسی عورت پر تہمت لگائے جو پاکدواں ہو، مومنہ ہو اور غافلہ ہو۔ اور اس سے پہلا ارشاد: وَإِنَّ الَّذِينَ يَزْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ لَمْ يَأْتِيَنَّاهُنَّ بِأَرْبَعَةٍ شَهَادَةٍ أَوْ فِئْتَيْنِ يُهْمُ الْآيَةُ ہر اس تہمت لگانے والے کا حکم ہے جو کسی محسنہ پر تہمت لگائے خواہ وہ غافلہ ہو یا نہ ہو، پس کوڑے شہادت کی عدم قبولیت پر قاذف کے لئے ہے خواہ وہ اپنے الزام میں سچا ہو یا جھوٹا ہو جبکہ اس کے پاس گواہ نہ ہوں اور لعنت اس قاذف کے ساتھ مختص ہے جو جھوٹا ہو کیونکہ مقدمہ اس افتراء سے بھی غافل ہے اس لئے ایسی عورت پر تہمت لگانے والے کا جرم بہت بڑا ہے۔ لیکن یہ کفر کو مستلزم نہیں ہے کیونکہ لعنت کا مستحق تو بعض گناہ کبیرہ کے مرتکب بھی ہوتے ہیں لیکن ان پر کفر کا توئی نہیں لگایا جاتا جیسے جان بوجھ کر قتل کرنے پر لعنت تو ہے لیکن کافر نہیں ہے۔ مقاسل فرماتے ہیں یہ حکم عبد اللہ بن ابی کے ساتھ خاص ہے اور اس کا مطیع نظریہ ہے کہ لعنت کفار کے ساتھ مختص ہے (4)۔

طبرانی نے حضرت نصیف سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں میں نے سعید بن جبیر سے عرض کی تا اور قذف میں سے کون سا جرم سخت ہے؟ انہوں نے فرمایا زنا۔ میں نے کہا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں إِنَّ الَّذِينَ يَزْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الْغُفْلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لَعْنَةُ اللَّهِ فِي الذُّنُوبِ وَالْأَخْبَثَةِ۔ حضرت سعید بن جبیر نے فرمایا یہ ارشاد حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ خاص ہے (5)۔ اس اثر کی سند میں بھی

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 698 (وزارت تعلیم)
2۔ ایضاً صفحہ 886
3۔ تفسیر بنوئی، جلد 4، صفحہ 186 (المقر)
4۔ ایضاً
5۔ محکم کبیر طبرانی، جلد 23، صفحہ 151 (الترت الاسلامی)

انہمانی ضعیف راوی ہے امام بخاری نے بھی اسی طرح ضعیف سے نقل کیا ہے۔ عوام بن حوشب عن شیخ من بنی کاهل عن ابن عباس کے سلسلہ سے مروی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ یہ آیت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور ازواج مطہرات کے ساتھ خاص ہے۔ اس آیت میں تو یہ کا ذکر نہیں ہے اور جس نے کسی دوسری مومنہ عورت پر تہمت لگائی تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے تو یہ کا دروازہ کھلا رکھا ہے پھر یہ آیت پڑھی وَالَّذِينَ يُؤْمِنُ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ يَأْتُوا بِهَا كِرِهًا لِّقَوْلِ رَبِّهِمْ لَسَاءَ الَّذِي يَفْعَلُ الْعَمَلُ..... وَإِذْ أَلْهَيْتُمْ ثَالِثُؤًا۔ ان لوگوں کے لئے تو یہ کا موقع ہے۔ لیکن ازواج مطہرات پر تہمت لگانے والے کیلئے تو یہ کا کوئی موقع نہیں ہے (1)۔

طبرانی نے ضحاک بن مزاحم سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات کے ساتھ خاص ہے (2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ ازواج مطہرات کے حق میں نازل ہوئی پھر یہ حکم جاری رہا حتیٰ کہ اس سورت کی پہلی آیت وَالَّذِينَ يُؤْمِنُ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ يَأْتُوا بِهَا كِرِهًا لِّقَوْلِ رَبِّهِمْ لَسَاءَ الَّذِي يَفْعَلُ الْعَمَلُ..... نازل ہوئی پس اللہ تعالیٰ نے کوڑوں اور توہ کا حکم بعد میں نازل فرمایا۔

میں کہتا ہوں ان اقوال کی بنیاد دو امور پر ہے۔ 1۔ اس آیت کے نزول کا سبب قصداً کتب تھا۔ 2۔ کفر کے علاوہ کسی گناہ پر لعنت نہیں کی جاتی لیکن سبب کا مخصوص آیت کے عموم کی تخصیص کا مختصی نہیں ہے اور اعتبار لفظ کے عموم کا ہوتا ہے۔ اور لعنت بعض گناہ کبیرہ پر بھی وارد ہے۔ جیسے عمداً کسی کو قتل کرنا۔ اور اس آیت میں توجہ اور مغفرت کا ذکر نہ ہونا مطلقاً عدم مغفرت اور توجہ کی عدم مقبولیت کا مختصی نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے إِنَّ اللَّهَ لَا يَفْعَلُ شَيْئًا إِلَّا يَهْدِيَ سُبُلَ الَّذِينَ يَشَاءُ وَيَهْدِي سُبُلَ الَّذِينَ يَشَاءُ لَسَاءَ الَّذِي يَفْعَلُ الْعَمَلُ..... جینک اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا اس بات کو کہ شرک کیا جائے اس کے ساتھ اور بخش دیتا ہے جو اس کے علاوہ ہے جس کو چاہتا ہے۔ پس آیت کے عموم کو خاص کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے واللہ اعلم۔

يَوْمَ نَشْهَدُ عَلَيْهِمْ وَأَنسَنَهُمْ وَأَيُّ يَوْمٍ هُوَ ۗ ﴿١٦﴾

”وہ یاد کریں اس دن کو جب گواہی دیں گی ان کے خلاف ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان اعمال پر جو وہ کیا کرتے تھے۔“

1۔ حمزہ اور کسائی نے شہد، یعنی پا کے ساتھ پڑھا ہے۔ کیونکہ فعل مقدم ہے اور فعل اور فاعل کے درمیان فاصلہ ہے جبکہ باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے اور ظرف انہم میں جو استقرار کا معنی ہے اس کے متعلق ہے عذاب کے متعلق نہیں ہے کیونکہ وہ موصوف ہے (جبکہ مصدر موصوف عمل نہیں کرتا)

ابن جریر ابن ابی حاتم نے موئی اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ قیامت کے روز مومن کو حساب کے لئے بلایا جائے گا اس کا رب بندے پر اس کے اعمال پیش فرمائے گا، بندہ ہر عمل کا اعتراف کرے گا اور کہے گا میرے رب میں نے یہ عمل بھی کیا یہ عمل بھی کیا۔ اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف فرمادیں گے اور اس کے گناہوں پر پردہ فرمائیں گے فرمایا علیؑ زمین پر کوئی مخلوق ان گناہوں میں سے کچھ بھی نہ دیکھے گی۔ پھر اس کی نیکیاں ظاہر ہوں گی۔ ان کو تمام لوگ دیکھیں گے۔ کافر اور منافق کو حساب کے لئے بلایا جائے گا۔ اس پر اس کا رب اعمال پیش کرے گا تو وہ انکار کرے گا اور کہے گا اسے رب، تیری عزت کی قسم اس فرشتہ نے یہ عمل مجھ پر ویسے لکھ دیا ہے

میں نے عمل (گناہ) ہرگز نہیں کیا۔ فرشتہ کہے گا کیا تو نے یہ کام (گناہ) فلاں دن فلاں جگہ نہیں کیا تھا؟ وہ کہے گا تیری عزت کی قسم میں نے بالکل نہیں کیا۔ جب وہ ایسا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے منہ پر مہر لگا دے گا ابو موسیٰ فرماتے ہیں میرا گمان ہے کہ سب سے پہلے دائیں دان بولے گی پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی اَللّٰهُمَّ رَحِّمْنَا عَلٰی اَقْوَابِهِمْ (لا یقینہ ۱)۔

ابو یعلیٰ اور حاکم نے ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے اور انہوں نے حضور ﷺ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ احمد نے جید سند کے ساتھ اور طبرانی نے عقب بن عامر سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جس دن منبوں پر مہر لگا دی جائے گی اس دن سب سے پہلے جو انسان کی ہڈی بولے گی وہ بائیں ٹانگ کی دان ہوگی (2)۔

احمد نسائی حاکم اور بیہقی نے معاویہ بن جیوہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا لوگ قیامت کے دن آئیں گے تو ان کے منہ بند ہوں گے اور سب سے پہلے انسان کی دان اور پھیلی بات کرے گی (3)۔

مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک طویل حدیث روایت کی ہے جو کتاب الزہد میں ہے اس حدیث میں ہے کہ انسان کی دان اس کا گوشت اور اس کی ہڈیاں اس کے عمل کے متعلق بولیں گی کہ یہ وہ منافق ہے جس پر اللہ تعالیٰ ناراض ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمایا شہید علیہم السنہیم۔ (یعنی زبانیں ان کے خلاف گواہی دیں گی) اور ایک دوسرے مقام پر فرمایا اَللّٰهُمَّ رَحِّمْنَا عَلٰی اَقْوَابِهِمْ وَرَحِّمْنَا عَلٰی اَقْوَابِهِمْ (جس دن ہم ان کے منبوں پر مہر لگائیں گے اور ان کے ساتھ ہم سے گفتگو کریں گے) ان دونوں ارشاد میں تطبیق کیا ہے؟ جو کہتے ہیں رَحِّمْنَا عَلٰی اَقْوَابِهِمْ سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے ارادہ سے نہیں بول سکیں گے اور یہ زبانوں کی بغیر اختیار کے ان کے خلاف شہادت دینے کے معافی نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں اعضاء اس شخص کے خلاف گواہی دیں گے جو اپنے تمام اعمال کو پڑھے گا لیکن اس میں درج گناہوں کا اعتراف نہیں کرے گا بلکہ صاف انکار ہی ہو جائے گا اور اپنی صفائی میں جھگڑے گا پس اس کے ظاہری اعضاء اس کے گناہوں کی گواہی دیں گے۔

میں کہتا ہوں یہ آیت دلائل کرتی ہے کہ سابقہ آیت عبد اللہ بن ابی کے متعلق اتنی ہے جیسا کہ قنادہ کا قول ہے۔ واللہ اعلم۔

يَوْمَئِذٍ يُؤَقِّمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ وَيُعَلِّمُونَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِينُ ﴿٥٠﴾

”اس روز پورا پورا دے گا انہیں اللہ تعالیٰ ان کا بدلہ جس کے وہ حقدار ہیں اور وہ جان لیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہی ٹھیک

فیصلہ کرنے والا ہر بات واضح کرنے والا ہے۔“

لہٰذا دین سے مراد وہ جزاء ہے جو ان کی بد اعمالیوں کے باعث ان پر واجب ہو چکی ہے۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں دین سے مراد ان کا عادلانہ حساب ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ بذات خود موجود ہے تمام جو امور و اعراض کا موجد ہے۔ تمام حقائق کو قائم فرمانے والا ہے، گویا تمام موجودات اس کے وجود کے ظلال ہیں وہ جو قائم ہے اور اسکی الوہیت ظاہر ہے۔ اس صفت الوہیت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے اس کے علاوہ کوئی ثواب عطا کرنے اور عقاب دینے پر قادر نہیں ہے۔ یا یہ معنی کہ اس کا عدل ظاہر ہے۔ یا یہ معنی کہ جس کا اس نے دنیا میں ان سے وعدہ فرمایا ہے اس کو ظاہر فرمانے والا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں عبد اللہ بن ابی دین میں شک کرتا تھا، پس وہ قیامت کے روز جان

لے گا کہ اللہ تعالیٰ ہی ٹھیک فیصلہ فرمانے والا ہے اور ہر بات واضح کرنے والا ہے (۱)۔

میں کہتا ہوں شاید ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے قول کی یہ مراد ہو کہ لوگ، خصوصاً کفار یہ گمان کرتے ہیں کہ اللہ کا موبوم وجود ہے۔ اسی وجہ سے وہ حوادث کو زمانہ یا ستاروں یا اس جیسی دوسری چیزوں کی طرف منسوب کرتے ہیں اور وہ نفع اور نقصان بندوں کی طرف سے تصور کرتے ہیں اور وہ دنیا کے بادشاہوں سے جس طرح ڈرتے ہیں اس طرح اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے پھر جب قیامت کا دن آئے گا تو جس کا وہ تصور نہیں کرتے وہ بھی ان کے لئے ظاہر ہو جائے گا اور وہ یہ بھی جان لیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہی الحق العلیٰ ہے۔

الْخَبِيثَاتُ لِلْخَبِيثِينَ وَالْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَاتِ وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ ۗ أُولَٰئِكَ مُدَرَّغُونَٰ وَمَا يَقُولُونَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ ۗ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿۳۱﴾

”ناپاک عورتیں ناپاک مردوں کے لئے اور ناپاک مرد ناپاک عورتوں کے لئے ہیں اور پاک (دامن) عورتیں پاک (دامن) مردوں کے لئے اور پاک (دامن) مرد پاک (دامن) عورتوں کے لئے ہیں۔ یہ ہر ایک ان (جہتوں) سے جو وہ (ناپاک) لگاتے ہیں ان کے لئے ہی (اللہ کی) بخشش ہے اور عزت والی روزی ہے۔“

۱۔ اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ الخبیثات سے مراد ایسی عورتیں ہیں جو کلمات مذمت، تحقیر اور سب و شتم کی اہل ہیں ایسی عورتوں کے مستحق مردوں میں سے خبیث مرد ہیں اور الخبیثون سے مراد ایسے مرد ہیں جو مذمت و تحقیر کے لائق ہیں۔ اور طیبات سے مراد ایسی پاک باز عورتیں ہیں جو کلمات مدح و ثنا اور دعا کی مستحق ہیں۔ ان نیک بیبیوں کے مستحق پاک باز مرد ہیں۔ پس حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ثناء، صلوة و سلام اور دعا کی مستحق ہیں جو ان پر کذب بیانی اور الزام تراشی کی گئی ان کی شان رفیع کے مناسب قطعاً نہیں ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور ان جیسی اور پاکدامن عورتیں مبرا اور منزہ ہیں ان جہتوں سے جو وہ ناپاک لوگ لگاتے ہیں۔ زجاج کہتے ہیں الخبیثات سے مراد کلمہ کفر، کذب، سب صحابہ اور سب اہل بیت اور مہنات پر قذف اور اس جیسے دوسرے غلط کلمات کی عادی عورتیں ہیں ایسی عورتیں مردوں میں سے خبیث مردوں کے لئے ہیں۔ جیسے عبد اللہ بن ابی وغیرہ۔ طیبون ایسے کلمات سے پاک ہوتے ہیں اور الخبیثون ان خبیث کلمات کے لئے پیدا کئے گئے ہوتے ہیں۔ الطیبات من الکلمات سے مراد ذکر الہی، تلاوت قرآن نبی کریم ﷺ پر اہل بیت اطہار پر درود و سلام، مومنین کے لئے دعا و مغفرت کرنے والی عورتیں ہیں اور ایسی عورتیں پاکیزہ مردوں کے لئے ہیں پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ یعنی پاکیزہ لوگ ان جہتوں سے مبرا ہیں جو کاذب اور جھوٹے لوگ ان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہ آیت کریمہ تہمت لگانے والوں کے لئے مذمت ہے اور ان لوگوں کی مدح ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے بری فرمایا ہے۔

ابن زید فرماتے ہیں غالب طور پر خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لئے ہیں اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لئے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لئے ہیں۔ یعنی یہ اغلب اصول ہے۔ پس حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا طیبہ ظاہرہ تھیں اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے پاک اور طاہر نبی ﷺ کے لئے منتخب فرمایا ہے۔ اگر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا طیبہ ظاہرہ عقیقتہ نہ تھیں تو نبی کریم ﷺ کی مصاحبت کے لئے یقیناً ان کا انتخاب نہ ہوتا ہو گیا یہ آیت کریمہ غلط بیانی کرنے والوں

کے جھوٹ پر ایک دلیل کے قائم مقام ہے۔

ہند بن ابی ہالد سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ میرے لئے صرف اہل جنت سے ازواج کو پسند فرماتے ہیں باقی سب کا انکار فرماتے ہیں (1)۔ اس حدیث کو ابن عساکر نے روایت کیا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ اور ان جیسی اور پاکیزہ ہستیوں کے لئے گناہوں کی بخشش اور جنت ہے۔

علامہ بنو لیکنے ہیں روایت ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا چند چیزوں پر فخر و مباہات فرماتی تھیں جو ان کے علاوہ کسی اور عورت کو نہیں ملی تھیں۔ 1۔ جبرئیل امین ان کی صورت ایک رشیم کے کپڑے میں لپیٹ کر لے آئے اور حضور ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی یہ جناب کی زوجہ محترمہ ہے (2)۔ میں کہتا ہوں ترمذی نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے یہ حدیث روایت کی ہے اور روایت ہے کہ جبرئیل حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی صورت اپنے ہاتھ میں لے آئے تھے۔ 2۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے علاوہ کسی بارگاہ عورت سے نکاح نہیں فرمایا تھا۔ 3۔ رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا تو آپ ﷺ کا سر مبارک حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی گود میں تھا۔ 4۔ حضور ﷺ آپ کے حجرہ میں مدفون ہیں۔ 5۔ آپ ﷺ پر وحی کا نزول ہوتا جبکہ آپ ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ لحاف میں ہوتے تھے۔ 6۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی برائت آسمان سے نازل ہوئی۔ 7۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ کی صاحبزادی تھیں۔ 8۔ آپ صدیقہ طیبہ تھیں۔ 9۔ آپ کے لئے مغفرت اور رزق کریم تیار کیا گیا ہے۔ حضرت مسروق جب حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت فرماتے تو اس طرح کہتے مجھے صدیقہ صدیق کی صاحبزادی رسول کریم ﷺ کی محبوبہ کی برائت آسمان سے نازل ہوئی انہوں نے مجھے بیان کیا (3)۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں اگر تم قرآن کی وعیدات کی نقیض کرو تو جہنمی سخت وعید حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق کذب پر نازل ہوئی ہے ایسی سخت وعید اور کہیں نہیں ہے (4)۔

صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے مجھے بتایا کہ مجھے تو تین راتیں خواب میں دکھائی گئی فرشتہ تھیں ایک قبضی رشیم میں لے کر آیا اور کہا یہ آپ کی زوجہ محترمہ ہے میں نے تیرے چہرے سے کپڑا اٹھایا تو سانسے تھی۔ میں نے کہا اگر یہ خواب اللہ کی طرف سے ہے تو وہ اس کو پورا کرے گا (5) اور صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ہی مروی ہے فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عائشہ یہ جبرئیل ہے آپ کو سلام کہتا ہے میں نے کہا وعلیہ السلام ورحمۃ اللہ فرمایا آپ وہ دیکھتے جو میں نہیں دیکھتی تھی (6)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں لوگ اس دن تھے اور بدایا پیش کرنے کی کوشش کرتے جس دن حضور ﷺ نے میرے پاس رات گزارنی ہوئی اور اس سے ان کا مقصود رسول اللہ ﷺ کی رضا حاصل کرنا ہوتا تھا۔ فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات جو دو گروہوں میں تھیں ایک گروہ میں حضرت عائشہ حفصہ، صفیہ اور سودہ تھیں اور دوسرے گروہ میں ام سلمہ اور دوسری ازواج مطہرات تھیں۔ حضرت ام سلمہ کے گروہ نے حضرت ام سلمہ سے کہا کہ تم رسول اللہ ﷺ سے عرض کرو کہ وہ لوگوں سے کہیں کہ جس نے ہدیہ دینا ہو وہ وہاں ہی پہنچا دیا کرے جہاں آپ ﷺ موجود ہوں۔ حضرت ام سلمہ نے یہی بات جب حضور ﷺ سے عرض کی تو آپ ﷺ نے فرمایا تم مجھے (حضرت) عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے

1۔ نکر اعمال، جلد 11، صفحہ 413 (الترات 11- اسلامی) 2۔ تفسیر بنو، جلد 4، صفحہ 187 (الطکر) 3۔ ایضاً 4۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شباب، جلد 7، صفحہ 31 (الطکر) 5۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 285 (قدیمی) 6۔ ایضاً، صفحہ 287

متعلق تکلیف نہ دو کیونکہ میرے پاس کسی بیوی کے لحاف میں وحی نہیں آتی سوائے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لحاف کے۔ ام سلمہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں نے جو آپ کو تکلیف دی ہے اس کی میں اللہ کی جناب میں تو بہ کرتی ہوں۔ پھر حضرت ام سلمہ کے گروہ نے حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بلایا اور انہیں حضور ﷺ کے پاس بھیجا حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جب یہ بات عرض کی تو آپ ﷺ نے فرمایا اے میری بیٹی! کیا تو اس سے محبت نہیں کرتی جس سے میں محبت کرتا ہوں؟۔ حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کی کیوں نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا پھر اس (عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا) سے محبت کر۔ (متفق علیہ 1)۔ صحیحین میں حضرت ابو موسیٰ سے مروی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی دوسری عورتوں پر اس طرح فضیلت ہے جس طرح ثرید کی کھانے پر فضیلت ہے۔ ابو موسیٰ سے مروی ہے فرماتے ہیں جب بھی ہم حضور ﷺ کے صحابہ کو کوئی حدیث میں مشکل پیش آتی تو ہم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا آپ کو اس کا علم ہوتا تھا۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے (2)۔ حضرت موسیٰ بن طلحہ سے مروی ہے فرماتے ہیں میں نے کبھی کسی کو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے زیادہ فصیح نہیں دیکھا۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے (3)۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے چار افراد کی چار چیزوں سے براءت فرمائی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی براءت اہل زلیخا سے ایک شہزادہ کی براءت سے بڑھ کر ہے۔ 2۔ موسیٰ علیہ السلام کی بیہوشی کے الزام سے براءت فرمائی ایک پتھر کے ذریعے جو آپ کے پتھر سے لے کر بھاگ گیا تھا۔ اور حضرت مریم کی براءت فرمائی ان کے صاحبزادے کے ذریعے۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی براءت فرمائی ان آیات کے ذریعے جن میں حد درجہ مبالغہ ہے۔ اور سب پھر رسول اللہ ﷺ کے منصب رفیع کے اظہار اور آپ کے مقام کی بلندی کے بیان کے لئے فرمایا (4)۔ میں کہتا ہوں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا جو اللہ اور اس کے رسول کی بارگاہ میں مقام و مرتبہ تھا اس کے اظہار کے لئے اتنی آیات نازل فرمائیں۔ واللہ اعلم۔

الفریابی اور ابن جریر نے عدی بن ثابت سے روایت کیا ہے کہ ایک انصاری عورت حاضر ہوئی اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میں اپنے گھر میں ایسی حالت میں ہوتی ہوں کہ میں پسند نہیں کرتی کہ مجھے کوئی اس حالت میں دیکھے میرے گھر والوں میں کوئی شخص آ جاتا ہے جبکہ میں اس حالت میں ہوتی ہوں۔ تو میں کیا کروں؟ اس وقت درج ذیل آیت نازل ہوئی۔ (5)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْذِنُوا وَتَسَلِّمُوا
عَلَىٰ أَهْلِهَا ۗ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿٥﴾

”اے ایمان والو! نہ داخل ہو کر دو (دوسرے کے) گھروں میں اپنے گھروں کے سوا جب تک تم اجازت نہ لے لو۔ اور سلام نہ کرو ان گھروں میں رہنے والوں پر بلکہ ایسی بہتر ہے تمہارے لئے شاید تم (اس کی حکمتوں میں) غور و فکر کرو۔“

۱۔ بیوتکم میں اضافت ملک کیلئے نہیں ہے کیونکہ اجرت پر مکان دینے والا اور عاریہ مکان دینے والا بھی رہائشی کی اجازت کے بغیر داخل نہیں ہو سکتے۔ تستانسوا کا معنی تستاندافوا ہے اسی تا سید حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی قرأت سے ہوتی ہے کہ وہ حتی

تستناذوا پڑھتے تھے۔ اسی طرح ابی بن کعب بھی تستناذوا پڑھتے تھے (1)۔ انس کا اقوی معنی وحشت کی ضد و یکینا محسوس کرنا اور جانا ہے۔

ابن ابی حاتم نے حضرت سورہ بن افی ابی ایوب سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! یہ تو سلام ہے استیناس کیا ہے فرمایا 'انسان سبحان اللہ اللہ اکبر' الحمد للہ کہے اور کھنگھارے تاکہ گھر والے مطلع ہو جائیں (2)۔ قاموس میں ان کے وہ تمام معنی لکھے ہیں جو اوپر بیان ہو چکے ہیں (3)۔ اکتلیل کہتے ہیں الا استیناس کا معنی استعمار ہے اسی سے انسٹ نارا ہے، یعنی میں نے آگ دیکھی (4) یہاں استیذان کو استیناس سے تعبیر فرمایا کیونکہ مستاذن (اجازت طلب کرنے والا) خوفزدہ ہوتا ہے کہ شاید اجازت نہ ملے۔ لیکن جب اجازت مل جاتی ہے تو وہ مانوس ہو جاتا ہے، کیونکہ مستاذن (اجازت طلب کرنے والا) حالت معلوم کرنا چاہتا ہے اور یہ پتہ لگانا چاہتا ہے کہ اس کو داخلہ کی اجازت ہے یا نہیں۔ یا الانس سے استعمال ہے جس کا معنی یہ ہے کہ وہ جاننا چاہتا ہے کہ کیا اندر کوئی انسان ہے یا نہیں۔

ع۔ گھروالوں پر سلام کرو یعنی السلام علیکم کیو۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے بیٹے، جب تو اپنے گھروالوں کے پاس جائے تو سلام کر (اس عمل سے) تجھ پر اور تیرے گھر والوں پر برکت ہوگی اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے (5)۔

علماء کا اختلاف ہے کہ پہلے اجازت طلب کرے یا پہلے سلام کرے۔ بعض علماء فرماتے ہیں پہلے اجازت طلب کرے کیونکہ آیت میں یہ مقدم ہے لیکن مقدم ہونا یہ کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ واؤ مطلق جمع کے لئے آتی ہے اس میں ترتیب کا لحاظ نہیں ہوتا۔ حضرت ابن مسعود کے صحیف میں حتی تسلما علی اہلہا و استاذوا ہے۔ اکثر علماء فرماتے ہیں کہ سلام کو مقدم کرے کیونکہ کلاہ بن خلیل فرماتے ہیں میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا تو میں نے نہ سلام کیا اور نہ اجازت طلب کی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا واپس جاؤ اور کہو السلام علیکم کیا میں اندر آ جاؤں۔ اس حدیث کو ابو داؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے (6)۔

حضرت جابر سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو پہلے سلام نہ کرے اسے اجازت نہ دو۔ اس حدیث کو تہذیبی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے (7) علامہ بخاری لکھتے ہیں حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ ایک شخص نے ان سے اجازت طلب کی اور کہا کیا میں اندر آ سکتا ہوں۔ ابن عمر نے فرمایا نہیں۔ آنے والے کو کسی نے کہا سلام کرو اس نے سلام کیا تو اسے اجازت مل گئی۔

بعض علماء فرماتے ہیں اگر انسان پر نظر پڑ جائے تو سلام پہلے کرے ورنہ اجازت پہلے طلب کرے اور پھر سلام کرے (8)۔ ابو موسیٰ اشعری اور حدیث رضی اللہ تعالیٰ عنہما اپنی محرم عورتوں کے پاس جاتے وقت بھی اجازت طلب کرتے تھے (9) حضرت حسن حضرت عطاء بن یسار سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کیا میں اپنی والدہ کے پاس جاتے وقت بھی اجازت طلب کروں؟ فرمایا ہاں۔ اس شخص نے کہا میں گھر میں اس کے ساتھ رہتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان سے بھی اجازت طلب

1- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 188 (القر)

2- الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 69 (العمد)

3- القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 730 (الترات العربی)

4- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 188 (القر)

5- جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 95 (ذرات تعلیم)

6- ایضاً، 96

7- شعب الایمان، جلد 6، صفحہ 188 (القر)

8- ایضاً

9- ایضاً

کر۔ اس آدمی نے کہا میں اپنی والدہ کا خادم ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پھر بھی اس کے پاس جاتے وقت اجازت طلب کر۔ کیا تو یہ پسند کرتا ہے کہ تو اسے برہنہ دیکھے؟ اس آدمی نے عرض کی نہیں۔ فرمایا پھر اس سے اجازت طلب کر۔ امام مالک نے اس حدیث کو مرسل روایت کیا ہے (1)۔

مسئلہ: جب کسی شخص کو بلایا جائے اور وہ بلانے والے کے ساتھ آئے تو اسے اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کسی کو بلایا جائے اور وہ بلانے والے کے ساتھ آئے تو یہی اس کے لئے اذن ہے۔ (دوبارہ اذن طلب کرنے کی ضرورت نہیں) اس حدیث کو ابو داؤد نے روایت کیا ہے (2)۔
اجازت طلب کرنا اور سلام کرنا اچانک داخل ہونے اور زمانہ جاہلیت کے سلام سے بہتر ہے۔ عمران بن حصین سے مروی ہے فرماتے ہیں ہم زمانہ جاہلیت میں یہ کہتے تھے انعم اللہ بک عیناً وانعم صباحاً جب اسلام کا سنہری دور آیا تو ہمیں اس سے منع کر دیا گیا۔ اس روایت کو ابو داؤد نے روایت کیا ہے (3)۔

فَإِنْ لَّمْ تَجِدُوا فِيهَا أَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوهَا حَتَّى يُؤْذَنَ لَكُمْ وَإِنْ قِيلَ لَكُمْ
اِسْجِعُوا فَاسْجِعُوا هُوَ أَزْكَى لَكُمْ وَاللَّهُ يَمَاتِعْمَلُونَ عَلَيْكُمْ ۝

”پھر اگر نہ پاؤ ان گھروں میں کسی کو (جو تمہیں اجازت دے) تو نہ داخل ہو ان میں یہاں تک کہ اجازت دی جائے تمہیں۔ لے اور اگر کہا جائے تمہیں کہ وہاں چلے جاؤ تو وہاں چلے جاؤ۔ یہ (طرز معاشرت) بہت پاکیزہ ہے تمہارے لئے اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو خوب جاننے والا ہے۔“

لے نہیہا کی تفسیر کا مرجع البیوت ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تم دوسروں کے گھر میں داخل نہ ہو جب تک کہ تمہیں اندر آنے کی اجازت نہ مل جائے۔ دخول سے مانع صرف شرمگاہ اور مستورات پر اطلاع نہیں ہے بلکہ ایسے امور بھی ہو سکتے ہیں جو انسان دوسروں سے چھپاتا ہے بغیر اجازت کسی کی ملکیت میں تصرف ممنوع ہے۔ لیکن چند حالات مستثنیٰ ہیں مثلاً کسی کے گھر آگ لگ جائے یا سیلاب آ جائے یا کوئی دوسری آفت و مصیبت آ جائے۔

یہ اگر تم کو اجازت نہیں ملی اور یہ کہا گیا کہ وہاں لوٹ جاؤ تو داخل ہونے پر اصرار نہ کرو تمہارا وہاں چلے جانا تمہارے داخلہ پر اصرار سے بہتر ہے۔ دروازے پر کھڑے رہنے سے بھی وہاں لوٹ جانا بہتر اور مناسب ہے، کیونکہ کسی کے دروازے پر کھڑا ہونا مکروہ ہے اور مردت کے خلاف ہے۔ تین مرتبہ اجازت طلب کرنے کے بعد اگر گھر کا مالک اجازت نہ دے تو وہاں لوٹ جانا حدیث نبوی ﷺ سے بھی ثابت ہے۔ حضرت ابوسعید الخدری فرماتے ہیں ایک دفعہ ابو موسیٰ ہمارے پاس آئے اور کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے بلا بھیجا میں ان کے دروازہ پر پہنچا تین مرتبہ سلام کیا لیکن مجھے سلام کا جواب نہ ملا میں وہاں لوٹ گیا۔ حضرت عمر نے کہا تم ہمارے پاس کیوں نہیں آئے؟ میں نے کہا میں آیا تھا اور تمہارے دروازہ پر تین مرتبہ سلام کیا تھا لیکن جواب نہیں ملا تو میں وہاں لوٹ گیا تھا کیونکہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ جب تم میں کوئی تین مرتبہ اجازت طلب کرے اور اسے اجازت نہ ملے تو اسے (کبیہہ خاطر اور پریشان) ہوئے بغیر وہاں لوٹ جانا چاہئے۔ حضرت عمر نے فرمایا اس حدیث پر دلیل پیش کر دو ابوسعید فرماتے ہیں میں اٹھا اور

ان کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گیا اور اس حدیث کی گواہی دی۔ متفق علیہ (1) حضرت ابوبال انصاری سے مروی ہے کہ تسلیم یہ ہے کہ آنے والا کہے السلام علیکم۔ کیا میں داخل ہو سکتا ہوں؟ یہ تین مرتبہ کہے پھر اجازت مل جائے تو داخل ہو جائے ورنہ واپس لوٹ آئے (2)۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں بشر بن سعید نے ابوسعید الخدری سے یہی حدیث روایت کی ہے جس میں ہے کہ ابوموسیٰ اشعری نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی تین مرتبہ اجازت طلب کرے اور اسے اجازت نہ ملے تو وہ واپس لوٹ جائے۔ (3) حضرت حسن فرماتے ہیں پہلی مرتبہ اجازت طلب کرنا اعلام (آگاہ کرنا) ہے، دوسری مرتبہ مشاورت ہے اور تیسری مرتبہ واپس جانے کی اجازت طلب کرنا ہے (4) حضرت انس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک روز سعد بن عبادہ کے گھر تشریف لے گئے اور اجازت طلب کرنے کے لئے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ سعید نے کہا علیکم السلام ورحمۃ اللہ، لیکن حضرت نبی کریم ﷺ نے ان کی آواز نہ سنی حتیٰ کہ تین مرتبہ حضور نے سلام کیا انہوں نے تین مرتبہ جواب دیا لیکن اتنی مدد ہم آواز میں جواب دیا کہ نبی کریم ﷺ نے ان کی آواز نہ سنی آپ ﷺ واپس تشریف لے جانے لگے تو سعد دوڑتے ہوئے پیچھے سے آئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ باہمی انت وامی، آپ نے جتنی مرتبہ سلام کیا میں نے سن لیا تھا اور میں نے جواب بھی دیا تھا لیکن اس آہستہ جواب دینا رہتا تاکہ آپ مجھ پر کثرت سے سلام اور برکت بھیجتے رہیں پھر گھر میں داخل ہوئے تو حضرت سعد نے زیب پیش کیا۔ آپ ﷺ نے اسے تناول فرمایا۔ پھر جب آپ ﷺ کھانے سے فارغ ہوئے تو فرمایا تمہارے کھانے کو نیکو کار کھائیں اور فرشتے تم پر صلوات پڑھیں اور دروازہ دار تمہارے پاس افطار کریں۔ اس حدیث کو علامہ بغوی نے شرح السنہ میں روایت کیا ہے (5)۔

مسئلہ: جب کوئی شخص کسی دوسرے کے دروازے پر آئے اور اجازت طلب نہ کرے بلکہ دروازے پر منتظر بیٹھا رہے تاکہ خود ہی گھر کا مالک باہر آئے اور اپنی حاجت پیش کروں تو ایسا کرنا جائز ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ایک انصاری کے دروازے پر طلب حدیث کے لئے تشریف لاتے تو دروازہ پر بیٹھ جاتے تاکہ وہ خود بھی باہر تشریف لائے اجازت طلب نہ کرتے تھے۔ وہ انصاری باہر نکلتے تو کہتے اے اللہ کے رسول کے چچا کے صاحبزادے کا ش آپ مجھے بتا دیتے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہمیں اسی طرح ادب سے علم حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں اس عمل پر یہ ارشاد دالات کرتا ہے وَلَا آتَمُّكُمْ صَبْرًا وَاسْتَجِبْ لَهُمْ مِثْلَ مَا سَأَلُوا لَعَلَّكُمْ أَتَمُّكُمْ (اور اگر وہ صبر کرتے یہاں تک کہ آپ تشریف لاتے انکے پاس تو ان (کے بہت بہتر ہوتا)

مسئلہ: کوئی شخص کسی کے دروازہ پر اجازت طلب کرنے کے لئے کھڑا ہو تو بالکل دروازہ کے سامنے کھڑا نہ ہو جبکہ دروازہ پر کوئی پردہ لٹکا ہوا نہ ہو۔ اور نہ ہی دروازہ کی درازوں میں جھانکے جبکہ وہ بند ہو۔ کیونکہ عبد اللہ بن بسر کی حدیث میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کسی قوم کے دروازہ پر تشریف لاتے تو دروازہ کے سامنے کھڑا نہ ہوتے بلکہ دائیں یا بائیں جانب کھڑے ہوتے اور کہتے السلام علیکم السلام علیکم۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دروازوں پر پردے نہیں ہوتے تھے۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے (6)۔

حضرت کبیل بن سعد الساعدی سے مروی ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کو حجرہ کے پردے سے جھانک کر دیکھا اور نبی کریم ﷺ

1- صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 210 (تذقی)

2- تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 7، صفحہ 36 (اعلیٰ)

4- ایضاً

3- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 189 (القدر)

5- تفسیر ابن کثیر، جلد 6، صفحہ 2486 (ابن حزم)

6- سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 349 (وزارت تعلیم)

کے ہاتھ میں لوہے یا کٹری کی دغا نے دار کلمہ تھی آپ ﷺ نے فرمایا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے تو میں کلمہ ہی اس کی آنکھوں میں چھو دیتا۔ جھانکنے سے روکنے کے لئے تو اجازت طلب کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس حدیث کو بغوی نے روایت کیا ہے (1)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر کوئی شخص بغیر اجازت تم پر جھانکے اور تو کسی کٹری سے آنکھ پھوڑ دے تو تجھ پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اس حدیث کو امام احمد اور بخاری نے مسلم نے روایت کیا ہے (2)۔

ابن ابی حاتم نے مقاتل بن حبان سے روایت کیا ہے کہ جب گھروں میں جانے سے پہلے اجازت طلب کرنے کی آیت نازل ہوئی تو ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! قریش کے تجار جو مکہ مکرمہ منہ بینہ منورہ اور شام کے درمیان آتے جاتے رہتے ہیں اور ان کی رہائش راستوں پر ہوتے مہمان خانوں میں ہے تو پھر وہ کیسے اجازت طلب کریں اور سلام کریں؟ جبکہ ان گھروں میں کوئی رہنے والا نہیں ہوتا اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا (3)۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ مَسْكُونَةٍ فِيهَا مَتَاعٌ لَكُمْ وَاللَّهُ
يَعْلَمُ مَا تَبْدُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ ﴿٥١﴾

”کوئی حرج نہیں تم پر اگر تم داخل ہو ایسے گھروں میں جن میں کوئی آباد نہیں۔ جن میں تمہارا سامان رکھا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو۔“

ان تہ خلو اسے پہلے فی مخدوف ہے اور جناح کے متعلق ہے کیونکہ اس کے ضمن میں مواخذہ کا معنی ہے یا یہ علیکم کے متعلق ہے۔ لکم بیوتاً سے حال ہے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں ان بیوت (گھروں) کے متعلق اختلاف ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں اس سے مراد راستیں اور وہ مہمان خانے اور ہوٹل ہیں جو مسافروں کے لئے بناے جاتے ہیں تاکہ وہ ان میں ٹھہریں اور اپنا سامان وغیرہ رکھیں۔ ایسے مکانوں میں بغیر اجازت داخل ہونا جائز ہے اور ان میں منفعت سے مراد ان میں ٹھہرنا سامان رکھنا مروی گرمی سے بچاؤ کرنا وغیرہ ہے (4)۔ ابن زید کہتے ہیں ان بیوت سے مراد تاجروں کے گھر اور دکانیں ہیں جو بازاروں میں ہوتی ہیں۔ لوگ ان میں خرید و فروخت کے لئے آتے جاتے ہیں اور یہی منفعت مراد ہے۔ (5) ابراہیم نخعی فرماتے ہیں بازار کی دکانوں میں جاتے وقت اجازت طلب کرنے کا حکم نہیں ہے ابن سیرین جب بازار میں کسی دکان پر آتے تو کہتے السلام علیکم، ادخل؟ (کیا اندر آ سکتا ہوں) پھر داخل ہوئے (6) عطاء فرماتے ہیں۔ اس آیت میں بیوت سے مراد غیر آباد مکان ہیں اور ان میں منفعت سے مراد قضاء حاجت کرتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ تمام گھر مراد ہیں جہاں کوئی نہیں رہتا کیونکہ اجازت طلب کرنے کا حکم اس لئے ہے تاکہ کسی کی نگاہ کسی دوسرے کی شرمگاہ پر نہ پڑے پس جب یہ خوف اور اندیشہ نہ ہو تو بغیر اجازت داخل ہونا جائز ہے (7)۔

یہ ارشاد اس شخص کے لئے وعید ہے جو خدا کی خاطر یا لوگوں کی پوشیدہ چیزوں پر آگاہی کے لئے داخل ہوتا ہے۔

قُلْ لَّيْمُونٌ وَمِنْ بَعْضِهِمْ غَبُطَةٌ وَا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا أَرْوَاحَهُمْ ذَلِكُمْ أَزْكَ لِيَهُمْ إِنَّ

اللَّهُ حَبِيبٌ بِمَا يَصْعَوْنَ ﴿٥٢﴾

- 1- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 190 (المنکر)
2- صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 212 (قدیمی)
3- الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 72 (العلیہ)
4- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 190 (المنکر)
5- ایضاً۔
6- ایضاً۔
7- ایضاً، صفحہ 191

”آپ حکم دیجئے مومنوں کو کہ وہ نیچے رکھیں اپنی ٹکاہیں اور حفاظت کریں اپنی شرمگاہوں کی یہ (طریقہ) بہت

پاکیزہ ہے ان کے لئے جسے پیکلہ اللہ تعالیٰ خوب آگاہ ہے ان کاموں پر جو وہ کیا کرتے ہیں جسے“

اس کی طرف سے آنکھ بند کر جس کی طرف تمہارا آنکھ بھر کر دیکھنا حلال نہیں ہے۔ حضرت حسن سے مروی ہے فرماتے ہیں مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے دیکھنے والے اور جس کی طرف دیکھا گیا ہے دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔ (یعنی غیر محرم عورت کی طرف شہوت کے ساتھ دیکھنے والے اور جو اس انداز میں ہے پروردہ فکلی کہ اس کی طرف نظر کی گئی ہے تو دونوں پر اللہ کی پھینکا رہے)

اس حدیث کو تین جگہ نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے (۱)۔

بعضوا الام کے حذف کے ساتھ امر کا صیغہ ہے اور انفخس کے قول کے مطابق من زاندا ہے۔ کیونکہ انفخس کے نزدیکی موجب کلام میں من کا زاندا ہونا جائز ہے اور یہی وہ ہے کہ نزدیکی من ہمیشہ ہے کیونکہ مومنین کو مطلقاً آنکھیں بند کرنے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ اس چیز سے آنکھیں بند کرنے کا حکم دیا گیا ہے جس کی طرف نظر بھر کر دیکھنا حلال نہیں ہے بلکہ دوسری نظر منع ہے جو بالا راہہ ہو چکی نظر جو بالا راہہ نہ ہو وہ منع نہیں ہے کیونکہ حدیث بریدہ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فرمایا علی! اے علی! بعد ونگرے کسی غیر محرم کو نہ دیکھو (کیونکہ اچانک کسی نامحرم پر نظر پڑ جائے تو معاف ہے لیکن اگر دوبارہ دانستہ اس کی طرف دیکھے گا تو گنہگار ہوگا) پہلی نظر تیرے لئے معاف ہے لیکن دوسری معاف نہیں۔ اس حدیث کو امام احمد ترمذی ابوداؤد اور دارمی نے روایت کیا ہے (۲)۔ حضرت جریر بن عبد اللہ سے مروی ہے فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے غیر محرم پر اچانک پڑ جانے والی نظر کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے مجھے حکم فرمایا کہ اپنی نظر کو پھیر لو۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا (۳)۔ حضرت ابی امامہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو مسلمان کسی عورت کے محاسن کو پہلی مرتبہ دیکھے پھر ان کو پہنی کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے عبادت پیدا فرمائے گا وہ شخص اس کی عبادت محسوس کرے گا۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے (۴)۔

۳۔ اس آیت کریمہ میں مومنین کے لئے دوسرا حکم یہ ہے کہ وہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں لیکن اپنی بیوی اور لونڈی کے پاس جاتے وقت شرمگاہ کھولنے کی اجازت ہے۔ استثناء بالضرورة عقلاً او نقلہ معلوم تھا۔ اس لئے لفظ حذف کیا گیا۔ ابو العالیہ فرماتے ہیں قرآن حکیم میں جہاں بھی حفظ فروج کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد زنا اور حرام سے بچنا ہے لیکن یہاں اس سے مراد ستر پوشی ہے تا کہ ان پر نظر نہ پڑے (۵)۔ بہترین حکیم بن ابی نعیم جعدہ کے سلسلہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی شرمگاہ کی حفاظت کر مگر اپنی زوجہ اور اپنی لونڈی کے پاس جاتے وقت کھولنے کی اجازت ہے۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! جب انسان اکیلا ہو تو اس کے متعلق کیا حکم ہے تو فرمایا اللہ تعالیٰ اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اس سے شرم کی جائے۔ (یعنی تمہا بھی ستر بلا ضرورت نہیں کھولنا چاہئے) اس حدیث کو ترمذی ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے (۶)۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا برہنہ ہونے سے بچو کیونکہ سوائے پانچھاندا اور بیوی سے صحبت کے ہر وقت تمہارے ساتھ دو (فرشتے) ہوتے ہیں جو

1- شعب الایمان، جلد 6، صفحہ 162 (العمید)
2- جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 101 (وزارت تعلیم)
3- صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 212 (تذقی)
4- مسند احمد، جلد 5، صفحہ 264 (مسار)
5- تفسیر بیہقی، جلد 4، صفحہ 191 (المنکر)
6- جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 103 (دست)

کبھی تم سے جدا نہیں ہوتے۔ ان سے حیا کرو اور ان کا احترام کرو۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے (1)۔

اس آئینہ کا جھکا نا اور شرمناک و گہی حفاظت کرنا تمہارے لئے نفع بخش ہے یا تمہیں پاکیزہ رکھنے کا طریقہ ہے کیونکہ اس سے انسان زنا کے فعلِ شنیع سے دور رہتا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے جو آنکھوں کے گھمانے کو استعمال کرنے اور جو ارج کو حرکت دینے کو جانتی ہے اور ان احساسات و خیالات کو بھی جانتی ہے جو دل میں اٹھائیاں لیتے ہیں اور ذہن کے اندر ابھرتے ہیں۔ پس تم نظر بازی اور بڑکاری کی طرف لے جانے والے ہر راستہ سے اجتناب کرو۔

ابن ابی حاتم نے مقال سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ جابر بن عبد اللہ نے بیان کیا کہ اسماء بنت مرثد اپنے کھجوروں کے باغ میں رہتی تھیں۔ عورتیں ان کے پاس پورا ازار پہن کر نہیں آتی تھیں ان کے پاؤں کے (پازیب وغیرہ) نظر آتے تھے اور ان کے سینے اور مینڈھیاں ظاہر ہوتی تھیں آپ نے ان کی یہ کیفیت دیکھ کر کہا معافاً قَبِیحَ هَذَا۔ یہ کتنا برا ہاس ہے تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (2)۔

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَعْضُرْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ آبَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ أَبْنَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي إِخْوَانِهِنَّ أَوْ نِسَائِهِنَّ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ أَوِ الشَّعْبِ غَيْرِ أُولِي الْأَرْبَابَةِ مِنَ الرِّجَالِ أَوِ الطِّفْلِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهَرُوا عَلَىٰ عَوْرَاتِ النِّسَاءِ وَلَا يُضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنَ زِينَتِهِنَّ ۗ وَتَوْبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا يَا أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٥١﴾

”اور آپ حکم دیجئے ایماندار عورتوں کو کہ وہ نہنگی رکھا کریں اپنی لگا ہیں۔ لے اور حفاظت کیا کریں اپنی عصمتوں کی اور نہ ظاہر کیا کریں اپنی آرائش کو مگر جتنا خود بخود نمایاں ہو اس سے لے اور ڈالے رہیں اپنی اور خیاں اپنے گریبانوں پر لے اور نہ ظاہر ہونے دیں اپنی آرائش کو مگر اپنے شوہروں کے لئے لے یا اپنے باپوں کے لئے لے یا اپنے شوہروں کے باپوں کے لئے لے یا اپنے بیٹوں کے لئے لے یا اپنے خاندانوں کے بیٹوں کے لئے لے یا اپنے بھائیوں کے لئے لے یا اپنے بھتیجیوں کے لئے اور اپنے بھانجیوں کے لئے لے یا اپنی ہم مذہب عورتوں پر لے یا اپنی باندیوں پر لے یا اپنے ایسے نوکروں پر جو (عورت) کے خواہشمند نہ ہوں لے یا ان بچوں پر جو (ابھی تک) آگاہ نہیں عورتوں کی شرم والی چیزوں پر لے اور نہ زور سے ماریں اپنے پاؤں (زمین پر) تاکہ معلوم ہو جاوے وہ بناؤ سنگار جو وہ چھپائے ہوئے ہیں لے اور جو عکرو اللہ تعالیٰ کی طرف سب کے سب اسے ایمان والو! تاکہ تم (دونوں جہانوں میں) باہر ادا ہو جاؤ۔“

۱۔ مومن عورتوں کو حکم فرمائیے کہ وہ اس چیز سے آنکھیں جھکا لیں جس کی طرف دیکھنا ان کے لئے حلال نہیں ہے۔ یہ آیت کریمہ ولات کرتی ہے کہ عورت کے لئے مطلقاً اجنبی مرد کی طرف دیکھنا جائز نہیں ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہی نظریہ ہے امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں جب عورت کو شہوت سے امن ہو تو اس کے لئے مرد کے اس حصہ کو دیکھنا جائز ہے جو مرد دوسرے مرد کا دیکھ سکتا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت اسلمہ کی حدیث سے حجت پکڑی ہے کہ اسلمہ اور میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما رسول اللہ ﷺ کے پاس تھیں کہ عبداللہ بن امکتوم آئے وہ حضور ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا ان سے پردہ کر لو۔ (یہ واقعہ حجاب کے حکم کے بعد کا ہے) اسلمہ فرماتی ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا وہ نابینا نہیں ہیں؟ وہ تو ہمیں نہیں دیکھ رہا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم بھی نابینا ہو؟ کیا تم اسے دیکھ نہیں رہی ہو؟ اس حدیث کو احمد ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے (۱)۔ امام ابوحنیفہ کی دلیل ابن عباس کی حدیث ہے ایک عورت جہۃ اللوداع کے موقع پر حاضر ہوئی جس کا تعلق قحتم قبیلہ سے تھا۔ عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ کا بندوں پر ایک فریضہ ہے میرا والد بوڑھا ہے جو سواری پر بیٹھنے کی سکت نہیں رکھتا اگر میں ان کی طرف سے حج ادا کروں تو ان کی طرف سے ادا ہوا جائے گا آپ ﷺ نے فرمایا ہاں۔ ابن عباس فرماتے ہیں انھوں نے اس عورت کی طرف تکتے لگے اور وہ عورت فضل کو دیکھنے لگی آپ ﷺ نے فضل کا چہرہ دوسری طرف پھیر دیا۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے (۲)۔ امام ترمذی نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہی حدیث روایت کی ہے جس میں یہ زائد ہے کہ حضرت عباس نے فرمایا۔ آپ نے اپنے چچا کے بیٹے کا منہ پھیر دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا میں نے جو جوان مرد اور جو ان عورت کو ایک دوسرے کی طرف تکتے ہوئے دیکھا تو مجھے ان پر شیطان کے حملہ کا اندیشہ ہوا۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے (۳)۔ ابن القطن نے اس حدیث سے فقہ سے امن کے وقت دیکھنے کے جو پر دلیل اخذ کی ہے کیونکہ آپ ﷺ نے اس عورت کو چہرہ ڈھانپنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ اگر حضرت عباس نظر کو جائز نہ سمجھتے تو سوال نہ کرتے اگر وہ جائز نہ ہوتا جو انہوں نے سمجھا تو آپ اس مفہوم پر انہیں برقرار نہ رکھتے۔ احناف کی ایک دلیل فاطمہ بنت قیس کی حدیث ہے کہ ان کے خاوند نے انہیں طلاق بانہ دو سے دی تو انہیں نبی کریم ﷺ نے ابن امکتوم کے گھر میں عدت گزارنے کا حکم دیا۔ یہ حدیث ولات کرتی ہے کہ عورت کا نابینا شخص کو دیکھنا جائز ہے، لیکن اس وقت جب شہوت سے امن ہو اور جذبات پر قابو ہو۔

مسئلہ: عورت کے لئے عورت کی شرمگاہ کی طرف دیکھنا جائز نہیں، یعنی ناف کے نیچے سے گھٹنا تک دیکھنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح مرد کے لئے مرد کی شرمگاہ کو دیکھنا جائز نہیں ہے کیونکہ ابوسعید کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مرد دوسرے مرد کی شرمگاہ کو نہ دیکھے اور عورت دوسری عورت کی شرمگاہ کو نہ دیکھے اور ایک مرد دوسرے مرد کو ایک کپڑے میں نہ ملے اور عورت عورت کو ایک کپڑے میں نہ ملے۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے (۴)۔

۲۔ مومن عورتیں اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زیب و زینت کی اشیاء مثلاً زیورات اور رنگ وغیرہ ظاہر نہ کریں۔ چہ جائیکہ زیورات اور لباس کے مقامات ظاہر ہوں۔ لیکن جو چیزیں خود بخود ظاہر ہوں جیسے لباس اور آگوشی وغیرہ کیونکہ ان چیزوں کا پردہ کرنے میں انتہائی حرج اور مشقت واقع ہوتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں زینت سے مراد زینت کے مقام ہیں اور زینت سے پہلے مضاف ”مواضع“ مفہوم ہے یا زینت سے مراد تمام محاسن خلقیہ اور تزیینیہ ہیں، لیکن اس سے مستثنیٰ امام ابوحنیفہ مالک احمد اور امام شافعی کے

2- صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 250 (ذرات تعلیم)

4- صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 154 (قدیمی)

1- جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 101 (ذرات تعلیم)

3- جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 108 (ذرات تعلیم)

نزدیک چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں، کیونکہ ترمذی نے عبداللہ بن مسلم بن ہرمز عن سعید بن جبیر عن ابن عباس کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عباس نے فرمایا ما ظہر منھا سے مراد چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں۔ عطاء عن عائشہ کی سند سے بھی اسی طرح مروی ہے اور ایک روایت میں ہے کہ ما ظہر سے مراد چہرہ ہتھیلیاں اور پاؤں ہیں۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ مشہور ہے کہ صرف چہرہ مستحی ہے کیونکہ طبرانی نے مسلم الاصحیح عن سعید بن جبیر کے سلسلہ سے ابن عباس سے روایت کیا ہے اس سے مراد سرمد ہے نہ صرف عن مکرہ کے سلسلہ سے ابن عباس سے امام بخاری نے بھی روایت کی ہے پس چہرہ ائمہ اربعہ کے نزدیک بالاتفاق مستحی ہے اور ہتھیلیاں امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے نزدیک مستحی ہیں۔

ایک روایت میں امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک بھی ہتھیلیاں مستحی ہیں، لیکن اختلافات قاضی خان میں ہے کہ ہاتھ کا ظاہر و باطن کلائی تک عورت نہیں ہے اور ظاہر روایت میں ہے کہ اس کا ظاہر عورت ہے، ابن ہمام نے اسی طرح لکھا ہے۔ پاؤں عورت میں لیکن امام صاحب سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ عورت نہیں ہیں اور پاؤں کے عورت ہونے پر دلیل حضرت ام سلمہ کی حدیث ہے کہ آپ نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ کیا عورت اور پریشانی اور روپہ میں نماز پڑھ سکتی ہے؟ جبکہ اس کا ازاد نہ ہو آپ ﷺ نے فرمایا جب تمہیں اتنی لمبی ہو کہ اس کے پاؤں کے ظاہر کوڑھانپ لے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اس حدیث کو ابو داؤد اور حاکم نے روایت کیا ہے (1) 'عبداللہ بن علی کی علت بیان کی ہے کہ امام مالک وغیرہ نے اس حدیث کو موقوف روایت کیا ہے اور اصح بھی یہی ہے۔ علامہ ابن الجوزی کہتے ہیں اس حدیث کے مرفوع ہونے پر اعتراض ہے کیونکہ یہ عبدالرحمن بن عبداللہ کی روایت ہے اور ان کو بخاری نے ضعیف کہا ہے۔ ابو حاتم نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ وہ قابل حجت نہیں ہے۔

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ولا یضربن بارجھن لعلن ما یحفظن من ربھن۔ بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ پازربہ زینت باطن میں سے ہے اور اس کا مقام یعنی پاؤں عورت ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اظہر یہ ہے کہ پاؤں نماز میں عورت ہے لیکن دیکھنے میں عورت نہیں آزاد عورت کا پورا بدن عورت (ستر) ہے، خاندانہ اور محرم کے علاوہ کسی کے لئے اسکے جسم کے کسی حصہ کو دیکھنا حلال نہیں ہے لیکن اگر ضرورت ہو تو جائز ہے جیسے علاج معالجہ اور گواہی دینے کے لئے عورت کو دیکھنا جائز ہے (2)۔ کتب حنفیہ میں آزاد عورت کے چہرہ کا ستر میں داخل نہ ہونا جو لکھا ہے وہ نماز کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ ہدایہ میں ہے لا یجوزُ أَنْ یُنظَرَ الذَّوْءَ الْغَیْبِ إِلَّا وَجْھِہَا وَکَفْیْہَا۔ یعنی مرد کے لئے اجنبی عورت کے چہرہ اور ہتھیلیوں کے سوا بدن کے کسی حصہ کو دیکھنا جائز نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ولا یبدین زینتھن الا ما ظہر منھا۔ ہاتھ اور چہرہ کے ظاہر کرنے کی حاجت ہوتی ہے۔ جیسے جب مردوں کو کوئی چیز لینے دینے کا معاملہ ہو۔ اگر مرد کو شہوت سے امن نہ ہو تو عورت کے چہرہ کو بھی دیکھنا مباح نہیں ہے۔ لیکن ضرورت کے وقت ایسا کرنا جائز ہے جیسے فیصلہ کرنے کے وقت قاضی کے لئے اور اداء شہادت اور غسل شہادت کے وقت گواہوں کے لئے عورت کے چہرہ کو دیکھنا جائز ہے خواہ شہوت کا امن نہ بھی ہو۔ جب یقین ہو یا غالب گمان ہو کہ اسے دیکھنے سے جذبات میں بیجاں پیدا ہو جائے گا تو عورت کے چہرہ کو دیکھنا جائز نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو ابو داؤد نے مرسل روایت کی ہے۔ جو بیچنی بات ہے جو

جائے اس کے چہرہ اور اس کے ہاتھوں کو لکائی تک کے علاوہ جسم کو دیکھنا جائز نہیں (۱۱)۔ میں کہتا ہوں! ایسے لوگ جو عورت کے فحشاء و فحش نہ ہوں ان کے سامنے عورت کا اپنی خفیہ زینت ظاہر کرنا اجماعاً جائز ہے اور نیک کتاب سے ثابت ہے، کیونکہ یہاں فقہ کا اندیشہ نہیں ہے ایسے لوگوں کے سامنے عورت کے لئے ظاہری زینت کا ظاہر کرنا بدرجہ اولیٰ جائز ہے۔ مرد کو اگر اشتہا، کا اندیشہ ہو تو اجنبی عورت کے چہرہ کو دیکھنا جائز نہیں ہے جیسا کہ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے! ابن ہمام لکھتے ہیں: جب شہوت کا شاک ہو تو عورت اور مرد کے کے چہرے کو دیکھنا حرام ہے اس حکم سے یہ لازم آتا ہے کہ عورت اجنبی شخص کے سامنے اپنا چہرہ نہ کھولے جب اس سے شہوت کا اندیشہ ہو تو عورت خود اپنے آپ کو نفاذ کے لئے پیش کرنے والی ہوگی اور عورتوں کی خواہش رکھنے والے اجنبی مرد کے جذبات کا اجنبی عورت کو دیکھ کر نہ چلانا غیر متصور ہے! اسی وجہ سے ہم نے لازم قرار دیا ہے کہ آزاد عورت خاندان اور محرم کے علاوہ کسی مرد کے سامنے چہرہ نہ کھولے کیونکہ محاسن تو ہوتے ہی چہرہ میں ہیں! چہرہ کو دیکھنے سے فقہ کا اندیشہ زیادہ ہوتا ہے۔ جبکہ باقی اعضاء کو دیکھنے سے فقہ کا اندیشہ کم ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورت ستر (چھپانے کی چیز) ہے جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کو جھانکتا ہے اس حدیث کو ترمذی نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے (۲)۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ عورت کا پورا بدن ستر ہے لیکن ضرورت اس سے بالا جماع مستثنیٰ ہیں۔ مثلاً ضرورت یہ ہے کہ عورت کے لئے کوئی ایسا نمونہ ہو جو اس کے لئے بازار سے ضروریات زندگی خرید کر لائے۔ ایسی ضرورت کے وقت وہ برقعہ میں ملیں ہو کر نکلے اور ایک آنکھ کھولے جس سے راستہ کو دیکھے اگر جسم پورا لپٹنے کے لئے اس کے پاس کپڑا نہ ہو تو پھر بھی ممکن حد تک اپنے آپ کو ڈھانپ کر نکلے۔ اسی طرح بھی ڈاکٹر اور بھی گواہوں اور قاضی کے پاس جانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

آیت میں زینت سے مراد اگر نفس زینت ہو جیسا کہ ہم نے قاضی بیضاوی کی اتباع میں لکھا ہے تو پورے کپڑے اور رنگ وغیرہ مراد ہوں گے (۳)۔ اور معنی کے اعتبار سے مواضع زینت کو ظاہر کرنے کی حرمت ولایت النقص کے ذریعے بدرجہ اولیٰ ثابت ہوگی۔ پس اس معنی کی صورت میں اشتہاء کی تاویل میں کوئی خفاندہ ہوگا۔ الا ما ظہر منها سے مراد ظاہری کپڑے ہوں گے۔

علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ ابن مسعود نے زینت سے مراد کپڑے لئے ہیں اور بطور دلیل یہ آیت پیش کی ہے وخذوا زینتکم عند کل مسجد۔ اس آیت میں زینت سے مراد کپڑے ہیں (۴)۔ اگر آیت میں زینت سے مراد مواضع زینت ہو تو الا ما ظہر منها کی اشتہاء کا مطلب ضرورت کے وقت زینت کے مقامات کا ظہور ہوگا۔ مثلاً قضاء حاجت کیلئے نکلنے کی ضرورت، گواہ بنانے کی ضرورت وغیرہ یعنی بغیر قصد و ارادہ کے اس کا ظہور ہو۔ پس آزاد عورت کی ہتھیلیوں اور چہرہ کی اشتہاء نماز کے لئے ہوگی۔ اسی طرح عورت کے چہرہ کو ظاہر کرنے کے عدم جواز پر یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے، يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّذَوِّ الْأَعْيُنِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ إِنْ دَرَجَاتٌ مِّنْكُمْ فَاعْلَمُوا بِأَنَّكُمْ فِي عَيْنِ اللَّهِ سَوَاءٌ مِّنْكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (۱)۔ (اے نبی کریم ﷺ! آپ فرمائیے! اپنی ازواج مطہرات کو اپنی صاحبزادیوں کو اور جملہ اہل ایمان کی عورتوں کو کہ) جب وہ باہر نکلیں! ڈال لیا کریں اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو۔ ابن عباس اور ابو عبیدہ فرماتے ہیں مؤمنین کی عورتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے سر اور اپنے چہروں کو چادروں سے ڈھانپ کر رکھیں صرف ایک آنکھ کھلی رکھیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ آزاد عورتیں ہیں (۵)۔ اور پیچھے جو ہم نے تنظیم قبیلہ کی ایک عورت کا ذکر کیا ہے کہ وہ جیتہ الوداع کے سال حضور ﷺ سے مسئلہ پوچھنے آئی تھی کہ وہ اپنے باپ کی طرف سے حج کر سکتی ہے تو اس عورت کا نکلنا مسئلہ پوچھنے کی ضرورت پر محمول ہے اور جو یہ ذکر تھا کہ حضرت فضل اس

1- سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 18 (ذرات تعلیم)

2- جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 140 (ذرات تعلیم)

3- تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 7، صفحہ 40 (احادیث)

4- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 193 (الشرک)

5- ایضاً، صفحہ 488

عورت کو دیکھنے لگے اور وہ حضرت فضل کو دیکھنے لگی۔ پھر نبی کریم ﷺ نے فضل کا چہرہ دوسری طرف پھیر دیا تھا یہ صراحتاً دلیل ہے کہ ازدنیہ عورت کے چہرہ کو دیکھنا منع ہے کیونکہ تا نظر اور منظور الیہا پر شیطان کے حملہ سے امن نہیں ہوتا۔

مسئلہ: اس آیت کریمہ کا حکم بالاجماع آزاد عورتوں کے ساتھ مختص ہے اور لونڈیاں خواہ مکاتبہ ہوں مدبرۃ ہوں یا امہات اولاد ہوں ان کے لئے سرچہرہ پنڈ لیاں اور بازو کھولنا جائز ہے۔ کیونکہ امام مالک شافعی اور امام احمد کے نزدیک لونڈی کا ستر مرد کے ستر کی طرح ناف سے گھٹنے تک ہے لیکن امام ابوحنیفہ نے لونڈی کے پیٹ اور پیٹھ کو بھی ستر میں شمار کیا ہے اصحاب شافعی کہتے ہیں لونڈی کے مواضع تغلیب کے علاوہ پورا بدن ستر ہے۔ اور مواضع تغلیب سے مراد سر بازو اور پنڈ لیاں ہیں۔

شیخین نے صحیحین میں حنفیہ کے واقعہ میں لکھا ہے ”اگر وہ اس کو چھپائے تو بیوی ہے اگر نہ چھپائے تو ام ولد ہے“۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ اعضاء کے ظہور میں لونڈی آزاد کے مخالف ہے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قریب سے ایک لونڈی پردہ کر کے گزری تو آپ نے وہ اٹھایا اور فرمایا اے لئیمہ کو تو آزاد عورتوں کی مشابہت کرتی ہے پردہ پھینک دے (۱)۔

اسی طرح درج ذیل ارشاد بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ لونڈی کا حکم آزاد عورت کے حکم سے مختلف ہے۔ **يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لَأَزْوَاجِكُمْ وَبَنَاتِكُمْ وَنِسَاءَ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ ۗ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ۗ** (اے نبی کریم! آپ فرمائیے اپنی ازواج مطہرات کو اپنی صاحبزادیوں کو اور جملہ اہل ایمان کی عورتوں کو کہ) جب وہ باہر نکلیں (ذال لیا کریں اپنے اوپر چادروں کے پلو اس طرح وہ باسانی پہچان لی جائیں گی پھر انہیں ستایا نہیں جائے گا۔

میں کہتا ہوں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس آیت کا حکم لونڈیوں کو بھی شامل ہو اور سر بازو اور پنڈ لیاں کا ظاہر کرنا استثناء کی وجہ سے جائز ہو کیونکہ اسے آقا کی خدمت کے لئے بار بار نکلتا ہوتا ہے اس کے خدمت والے کپڑے چھوئے ہوتے ہیں پس غالب طور پر یہ اعضاء بالضرورة ظاہر ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

سودہ اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیاں ڈالے رہیں تاکہ ان کے بال سینے گردن میں اور بالیاں نظرت آئیں۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا اللہ تعالیٰ پہلی مہاجر عورتوں پر رحم فرمائے۔ جب ولیضربین بخمرھن علی جیو بہن کا ارشاد نازل ہوا تو انہوں نے اپنی چادریں پھاڑیں اور ان کو اوڑھنیاں بنا لیا (۲)۔

نافع عاصم اور ہشام نے جیو بہن کو جنم کے صدمہ کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ دوسرے قراء نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

عذرتین میں اضافت عہد کے لئے ہے، یعنی وہ زینت مراد ہے جس کا ظہور مستحی ہے دوبارہ ذکر فرمایا تاکہ واضح ہو جائے کہ کن کے سامنے اس ظاہری زینت کا ظاہر کرنا جائز ہے اور کن کے سامنے جائز نہیں ہے۔ اپنے شوہروں کے لئے زینت کا ظاہر کرنا جائز ہے بلکہ عورت کی زینت تو ہوتی ہی اپنے مرد کے لئے ہے اور شوہر اپنی عورت کے تمام بدن کو دیکھ سکتا ہے حتیٰ کہ اس کے لئے عورت کی شرمگاہ کو بھی دیکھنا جائز ہے لیکن شرمگاہ کی طرف دیکھنا مکروہ ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے جو تم میں سے کوئی اپنی بیوی کے پاس جائے تو پردہ کر لے اونٹوں کی طرح بالکل لباس اتار نہ دے (۳)۔ اس حدیث کو امام شافعی طبرانی اور بیہقی نے ابن مسعود عن عبد بن عمر کے سلسلہ سے روایت کی ہے نسائی نے عبد اللہ بن مسعود سے روایت کی ہے نیز طبرانی نے ابو امامہ سے روایت کی ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ آپ فرماتی ہیں میں نے کبھی رسول اللہ ﷺ کی شرمگاہ کو نہیں دیکھا (۱)۔

یہ اسی طرح اپنے باپوں کے لئے ظاہر کر سکتی ہیں اداؤنا بھی دلالت انص اور اجماع کے ذریعے اس میں شامل ہیں اگرچہ وہ بہت اوجھلے ہوں اپنے شوہروں کے باپوں کیلئے اور اپنے بیٹوں کے لئے بھی ظاہر کر سکتی ہے۔ دلالت انص اور اجماع کے ساتھ بیٹوں میں پوتے اور نواسے بھی شامل ہیں۔ اپنے شوہروں کے بیٹوں اور اپنے بھائیوں اور اپنے بھتیجیوں اور بھانجیوں کے لئے ظاہر کر سکتی ہیں اپنے بھتیجیوں میں بھتیجیوں اور بھتیجیوں کے بیٹے بھی شامل ہیں۔

مندرجہ بالا رشتہ داروں کے سامنے اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو اپنے محاسن ظاہر کرنے کی اجازت دی ہے کیونکہ ان کی آمد و رفت کثرت سے ہوتی ہے اور ان کی مداخلت کی احتیاج بھی ہوتی ہے اور یہ ایسے رشتہ دار ہیں جن سے فتنہ کا اندیشہ بہت کم ہے کیونکہ فطرتاً ہی قریبی رشتہ سے مہاسمت و ملاہمت سے نفرت ہوتی ہے اور طبیعت ان کے برائی کی طرف منسوب ہونے پر غیرت و حیثیت محسوس کرتی ہے۔ ان رشتہ داروں کیلئے جائز ہے کہ وہ خدمت و محنت کی وقت جو حصہ عورت کا ظاہر ہو کچھ لیں اور ظاہر ہونے والے حصہ میں چہرہ سر سبز پنڈلیاں اور بازو شامل ہیں لیکن ان کی بیٹیوں بیٹوں اور نافر سے گھٹنا تک کا حصہ دیکھنا جائز نہیں ہے کیونکہ عادتاً یہ اعضاء نہیں کھلتے اور ان کی طرف دیکھنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی۔ یہ حکم ان تمام رشتہ داروں کے لئے ہے جن کے ساتھ اس عورت کا نکاح ہمیشہ کے لئے حرام ہوتا ہے خواہ وہ نسب کی وجہ سے حرمت ہو یا رضاعت و مصاہرت کی بنا پر ہو۔ آیت کریمہ میں بچوں اور خالوں کا ذکر نہیں ہے کیونکہ دلالت انص اور اجماع کے ذریعے یہ لوگ بھتیجیوں اور بھانجیوں کے ضمن میں موجود ہیں۔ کیونکہ جب بچہ بھی کے لئے اپنے بھتیجے کے سامنے زینت کا ظاہر کرنا جائز ہے تو مساوات کے اصول پر بھتیجی کے لئے بھی جائز ہوگا کہ وہ اپنے چچا کے لئے اپنی زینت ظاہر کرے۔ خالہ کے لئے جب جائز ہوتا ہے کہ وہ اپنے بھانجے کے لئے زینت ظاہر کرے تو بھانجی کے لئے بھی جائز ہوگا کہ وہ اپنے خالو کے سامنے زینت ظاہر کرے۔ بچوں اور خالوں کے ذکر نہ کرنے میں یہ اشارہ ہو سکتا ہے کہ احتیاطاً کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ان سے پردہ کریں تاکہ وہ ان کے بیٹوں کے عقد نکاح میں آسکیں۔

مسئلہ: مرد کے لئے جائز ہے کہ وہ جس محرمہ عورت کے جس حصہ کو دیکھ سکتا ہے اسے چھو بھی سکتا ہے کیونکہ سفر وغیرہ میں اسکی حاجت ہوتی ہے نیز حرمت ابدی کی وجہ سے شہوت بہت کم ہوتی ہے لیکن اگر شہوت کا اندیشہ ہو تو نہ دیکھے اور نہ مس کرے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے آنکھیں زنا کرتی ہیں اور ان کا نادیکھنا (نظر بازی) ہے ہاتھ زنا کرتے ہیں اور ان کا زنا چڑھنا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ آنکھیں اور ہاتھ زنا کرتے ہیں۔ پاؤں زنا کرتے ہیں اور فرج زنا کرتی ہے۔ اس حدیث کو امام احمد اور طبرانی نے ابن مسعود سے مرفوع روایت کیا ہے (۲)۔ زنا کی حرمت محرمہ عورت سے نہایت غلیظ ہے۔ پس اجتناب چاہئے۔

یہ مومنہ عورت کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی زینت مومنہ عورت یا کافرہ عورت کے سامنے ظاہر کرے۔ خواہ کافرہ آزاد ہو یا لونڈی ہو، لیکن ناف سے گھٹنے تک کا حصہ کھولنا جائز نہیں ہے۔ اس حصہ کے علاوہ بقیم جسم کو عورت کے لئے دیکھنا جائز ہے کیونکہ وہ باہم جنس ہوتی ہیں اور شہوت بھی نہیں ہوتی ہے۔ امام ابوحنیفہ سے مروی ہے کہ عورت کو عورت کی طرف دیکھنا اتنی مقدار میں جائز ہے جتنا مرد اپنی محارم کو دیکھ سکتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں نسائیں سے مرد مومنات ہیں۔ پس مسلمان عورت کو کافرہ عورت کے سامنے اپنی زینت ظاہر

کرتی جائز نہیں ہے کیونکہ کافرہ عورتیں ہماری عورتوں میں سے نہیں ہیں کیونکہ وہ دین میں انجبی ہیں۔ چونکہ کافرہ عورتیں مردوں کے سامنے ان کے وصف بیان کرنے سے اجتناب نہیں کریں گی۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایسی عورت کے ساتھ عورت مباحثت نہ کرے جو اپنے مرد کے سامنے اس طرح وصف بیان کرے گویا کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے (متفق علیہ) (۱) علامہ بغوی فرماتے ہیں حضرت عمر بن خطاب نے ابوعبیدہ بن الجراح کی طرف خط لکھا کہ اہل کتاب کی عورتوں کو مسلمان عورتوں کے ساتھ داخل ہونے سے منع کر دیں (۲)۔

یے ابن جریج سے مروی ہے کہ نساہین سے مراد آزاد مومن عورتیں ہیں اور ما ملکیت ایصانہن سے مراد اولوئذیاں ہیں غلام نہیں ہیں۔ پس کسی مسلمہ عورت کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ مشرکہ عورت کے سامنے لباس اتارے لیکن جب مشرکہ اس کی لوٹری ہو تو اس کے سامنے زینت ظاہر کرنا جائز ہے اس تاویل پر عورت کے لئے اپنے غلام کے سامنے زینت ظاہر کرنا جائز نہ ہوگا۔ غلام کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی مالکن کی طرف دیکھے لیکن عورت کے جس حصہ کو اجنبی دیکھ سکتا ہے غلام کے لئے بھی اس حصہ کو دیکھنا جائز ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ بعض شوافع کا بھی یہی قول ہے۔ شیخ ابوحامد شافعی فرماتے ہیں ہمارے اصحاب کے نزدیک غلام اپنی مالکن کے لئے محرم نہیں ہوتا۔

علامہ نووی فرماتے ہیں یہی قول صواب ہے۔ انہیں اختلاف ہونا بھی نہیں چاہئے بلکہ اسکا غیر محرم ہونا قطعی ہے اور یہ قول کہ غلام مالکن کا محرم ہے اسکی کوئی دلیل نہیں ہے آیت میں ما ملکیت سے مراد اولوئذیاں ہیں۔ صاحب بدایہ فرماتے ہیں ہمارے نزدیک غلام نہ محرم ہے اور نہ خاوند ہے اور جو از نکاح کی وجہ سے شہوت بھی متعلق ہے یعنی ملکیت کے زوال کے بعد اس کا اپنی مالکن سے نکاح ہو سکتا ہے۔ غلام سے بے پردہ ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ وہ گھر سے باہر کام کرتا ہے اور اس آیت میں ما ملکیت ایصانہن سے مراد اولوئذیاں ہیں۔

سعید بن المسیب اور حسن وغیرہا فرماتے ہیں سورہ نور تمہیں دھوکا میں نہ ڈالے کیونکہ یہ عورتوں کے متعلق ہے مردوں کے متعلق نہیں ہے (۳)۔ یہ تاویل صرف اسی صورت میں صحیح ہو سکتی ہے کہ نساہین سے مراد مسلمان آزاد عورتیں ہوں۔ تمام عورتیں مراد نہ ہوں۔ ورنہ تکرار لازم آئے گا۔ امام ابوحنیفہ کے مذہب کے مطابق مسلمان عورت کے لئے کافرہ عورت کے سامنے لباس کھولنا جائز نہیں ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں ما ملکیت ایصانہن میں غلام اور اولوئذیاں سب شامل ہیں۔ اور مالکن کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے غلام کے سامنے وہ اعضاء ظاہر نہ کرے جو محرم مردوں کے سامنے ظاہر کر سکتی ہے اور غلام کے لئے مالکن کے اس حصہ کو دیکھنا جائز ہے جو وہ اپنی محرم عورتوں کا دیکھ سکتا ہے امام شافعی نے بھی اسی قول پر نفس قائم کی ہے۔ اور امام شافعی کے جہور اصحاب کا اصح قول یہی ہے کیونکہ بغیر اجازت اپنی مالکن کے پاس آنے کی حاجت متعلق ہے۔ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ یہی چیز حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی مروی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث بھی اسی مذہب کی تائید کرتی ہے کہ نبی کریم ﷺ اس غلام کے ساتھ حضرت فاطمہ کے گھر تشریف لائے جو آپ ﷺ نے انہیں بہ کیا تھا۔ حضرت فاطمہ کے اوپر ایک کپڑا تھا جب آپ اسے سر پر ڈالتی تھیں تو پاؤں نہیں ڈھانپتا تھے جب آپ پاؤں ڈھانپتی تھیں تو سر نہیں ڈھانپتا تھا جب رسول اللہ ﷺ نے ان کی پریشانی دیکھی تو فرمایا اے فاطمہ اتنے اہتمام کی ضرورت نہیں ہے تیرا باپ اور تیرا غلام تیرے پاس آئے ہوئے ہیں۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے

1- صحیح بخاری جلد 5، صفحہ 2007 (اعلیٰ) 2- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 193 (الکفر) 3- روح المعانی، جلد 18، صفحہ 144 (التراث الاسلامی)

روایت کیا ہے (۱) لیکن اس حدیث میں کوئی وضاحت نہیں۔ ممکن ہے وہ غلام چھوٹا ہو جیسا کہ لفظ غلام کا اطلاق وراثت کر رہا ہے۔ ہمارے اس امکان کی دلیل اس حدیث ہے فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی اپنے مکاتب غلام کے پاس ہو تو اسے پردہ کرنا چاہئے۔ اس حدیث کو ترمذی ابو داؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے (۲) لیکن اس سے استدلال مفہوم مخالف کے ذریعے ہے۔

۱۔ ایسے مرد جو عورتوں کی خواہش نہ رکھتے ہوں ان کے سامنے بھی عورت کے لئے اپنی ظاہری آرائش ظاہر کرنا جائز ہے اور ایسے مردوں سے مراد بوڑھے فرقت ہیں۔ ان کو قرآن نے تابعین کے لفظ سے اس لئے تعبیر فرمایا کیونکہ یہ لوگ کسب پر قادر نہیں ہوتے اور قوم کی اتباع کرتے ہیں تا کہ قوم کا بچا کھچا مال انہیں مل جائے۔ حسن فرماتے ہیں تابعین سے مراد ایسے مرد ہیں جن کا ذکر منتشر نہ ہوتا ہو اور عورت پر چھانے کی طاقت نہ رکھتے ہوں اور عورتوں کی خواہش بھی نہ رکھتے ہوں (۳)۔ ابن عباس نے ان سے مراد عنین (نامرد) لئے ہیں (۴) سعید بن جبیر نے اس سے مراد نیم پاگل لئے ہیں (۵) 'عکرمہ نے اس سے مراد مجبوب (جن کا ذکر کرنا ہوا ہو) لئے ہیں (۶)۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے مراد عنیت (مجنون) ہیں۔ مقاتل فرماتے ہیں اس سے مراد بوڑھا نامرد، خصی اور ذکر کرنا شخص ہے (۷)۔ صحیح یہ ہے کہ خصی اور مجبوب اجنبی عورت کو دیکھنے میں مرد کی طرح ہیں۔ ہدایہ میں ہے کہ خصی نے بوجہ مجامعت کا احتمال رکھتا ہے۔ اسی طرح مجبوب کا حکم ہے کیونکہ وہ شرمگاہ کو ٹوڑتا ہے اور اسے انزال ہو جاتا ہے۔ اسی طرح عنیت شخص کا حکم ہے کیونکہ وہ بھی ایک فاسق مرد ہوتا ہے۔ یہ تمام لوگ اس حکم میں اس لئے شامل ہیں کیونکہ قرآن میں قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ اِذَا حَضَرَهُنَّ مِنْكُمْ غُيُوبٌ فَلْيَنْصِبْنَ لِهِنَّ ظُهُورَهُنَّ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِمْ وَلَا يَجْنِبْنَ اَنْ يُصَافِحَهُنَّ اُولَئِكَ حُكْمُ اللَّهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ۔ یہ حکم حکم ہے اس میں مجبوب، خصی اور عنیت سب شامل ہیں اور التابعین غیر اولی الاربعہ کے ارشاد میں یہ افراد قطعیت کے ساتھ شامل نہیں ہیں پس ان کے لئے بھی آکھیں جوگانے کا حکم ضروری ہے۔

کافیہ میں ہے کہ صاحب ہدایہ نے لُحْث کے ساتھ الودی من الافعال کی قید لگائی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں وہ عنیت شامل نہیں ہے جس کے اعضاء میں قدرتی نرمی ہوتی ہے اور ان کی زبان میں انکسار ہوتا ہے وہ خلفتہ عورتوں کی شہوت نہیں رکھتا۔ یہ برے افعال والا عنیت نہیں ہوتا۔ کیونکہ خلفتہ جو عنیت ہوتا ہے (یعنی بیخبر) اس کے عورتوں میں موجود ہونے کی بعض مشائخ نے رخصت دی ہے۔ کیونکہ یہ ان افراد میں سے ہوتا ہے جنہیں عورتوں کی خواہش نہیں ہوتی۔ میں کہتا ہوں لُحْثی اسلی، یعنی وہ شخص جس کا ذکر اور فرج دونوں ہوں اگر اس میں عورتوں کی علامت ظاہر ہوں مثلاً اس کے پستان ہوں جیسے عورت کے پستان ہوتے ہیں یا اس کی چھاتی میں دو دھاتر آنے یا اسے حیض آنے یا اسے حمل ظہر جائے یا اس کے ساتھ فرج میں جماع ممکن ہو تو اس کا حکم عورت والا ہے اگر عورتوں والی علامات نہ ہوں تو اس کا حکم مرد کا ہے جبکہ حکم مرد کا ہے اس کے سامنے عورت کے لئے انکشاف جائز نہیں ہے اور نہ اسے لُحْثی کے لئے عورتوں کی طرف دیکھنا جائز ہے۔ اگر لُحْثی مشکل ہو جس میں مردوں اور عورتوں کی تمام علامات ہوتی ہیں تو اس میں بھی احتیاط یہ ہے کہ وہ نہ تو مردوں کے سامنے انکشاف کرے اور نہ عورتیں اس کے پاس اپنی زینت و آرائش کو ظاہر کریں۔

شیخین نے صحیحین میں اس مسئلہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ ان کے پاس تھے اور گھر میں ایک بیخبر تھا اس عنیت نے عبداللہ بن ابی امیہ سے کہا (جو اس مسئلہ کا بھائی تھا) اے عبداللہ! اگر اللہ تعالیٰ کل تمہیں الطائف کی فتح عطا فرمائے تو میں تمہیں نیلان کی بیٹی کے حلق

1- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 194 (الطکر)
2- سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 192 (وزارت تعلیم) 3- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 194 (الطکر)
4- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 194 (الطکر)
5- ایضاً۔ 6- ایضاً۔ 7- ایضاً۔

بتاؤں گا وہ چار کے ساتھ آتی ہے اور آٹھ کے ساتھ لوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہ لوگ (مخٹ) تمہارے پاس ہرگز نہ آئیں (۱)۔ بعض علماء نے اس حدیث سے مخٹ لوگوں کو عورتوں کے پاس جانے سے منع کرنے پر حجت چکڑی ہے، لیکن اس احتجاج میں نظر ہے۔ بلکہ اس حدیث سے تو عورتوں کے پاس مخٹ افراد کے دخول کے جواز پر حجت چکڑا ناممکن ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس مخٹ کو گھر سے باہر نہیں نکالا تھا اور اس کو منع بھی نہ فرمایا جب تک کہ اس نے فیضان کی بیٹی کی یہ صفت بیان نہ کی کہ وہ چار کے ساتھ آتی ہے اور آٹھ کے ساتھ لوتی ہے۔ اور یہ منع کرنا ایک دوسری وجہ سے ہے اسی وجہ سے تو نبی کریم ﷺ نے عورت کو عورت کے پاس داخل ہونے سے بھی منع فرمایا ہے۔ جیسا کہ ابن مسعود کی حدیث میں گزر چکا ہے (تو کیا حضور ﷺ کے عورت کو مخصوص وجہ سے عورت کے پاس جانے سے منع کرنے کی وجہ سے مطلقاً عورت کا عورت کے پاس داخل ہونے سے منع کیا جائے؟)

ابوبکر ابن عامر اور ابو جعفر نے غیر اولی الاذنیۃ کو حال ہونے یا غیر بمعنی (۱) ہونے کی بنا پر منسوب پڑھا ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنی زینت تاہین کے لئے ظاہر کر سکتی ہے لیکن جن مردوں کو عورتوں کی خواہش ہو ان کے سامنے نہیں۔ جو عورتوں کے خواہشمند ہوں ان کے سامنے اپنی زینت و آرائش ظاہر نہیں کر سکتیں۔ باقی قراء نے ہر کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ تاہین کی صفت ہے۔

۹. الطفل ام جس سے جو وصف کی دلالت کی وجہ سے جمع کی جگہ استعمال ہوا ہے یعنی وہ افراد جو ابھی بالغ نہیں ہوئے۔ یا یہ معنی کہ جو وطی پر قادر نہیں ہیں۔ یہ من ظہر علی فلان سے مشتق ہوگا جس کا معنی قوت رکھنا اور قادر ہونا ہے۔ یا یہ معنی کہ جنہوں نے جماع کے لئے عورتوں کی شرمگاہوں پر غلبہ نہیں پایا اس وقت یہ ظہور بمعنی طلب سے مشتق ہوگا۔ اسی وجہ سے اسے علی کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے یا یہ الظہور بمعنی الاطلاع سے مشتق ہے کیونکہ کشف (کھولنا) اطلاع کا مطلق ہے اور عدم ظہور عدم کشف سے عدم صلاحیت مراد ہے حاصل یہ ہے کہ جو بیچے ابھی حد شہوت کو نہیں پہنچے۔ مجاہد نے یہ معنی لکھا ہے کہ جو بیچے اپنی حضرتنی اور بے تکھی کی وجہ سے شرمگاہ کا شعور تصور نہیں رکھتے (۲) ان اقوال میں سے پہلا قول اولی اور بہتر ہے۔ بچہ اگر کھنڈا ہو لیکن حد شہوت کو نہ پہنچا ہو تو عورتوں کے لئے اس کی موجودگی میں ناف سے گھٹنے تک کے حصہ کے علاوہ انکشاف اعضاء جائز ہے اور ناف کے نیچے کا حصہ کھولنا اس کی موجودگی میں جائز نہیں ہے جیسا کہ یہ ارشاد دلالت کرتا ہے۔

لَيْسَتْ اِذْ نَفَسُ الْاُنْثَىٰ مِنْ مَكْنَتِكَ اَيْهَا الْكَلْمُ وَالَّذِي لَيْسَتْ مِمَّنْ يَلْعَوُ الْحَكْمُ مِنْكُمْ

ذلات موات (اذن طلب کیا کریں تم سے) (گھر میں داخل ہوتے وقت) تمہارے غلام اور وہ (لڑکے) جو ابھی جوانی کو نہیں پہنچے تم میں سے تین مرتبہ (۱) اگر بچہ بالکل نا سبھ ہو تو وہ جمادات اور جانوروں کے حکم میں ہے اگر عورت ایسے بچہ کی موجودگی میں تحت الازار حصہ بھی کھول دے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر بچہ مرافق ہے یعنی قریب الملوغ ہے جس میں اشتہاء ہے تو اس کا حکم مردوں والا ہے کیونکہ ایسا بچہ عورتوں کی شرمگاہوں پر غلبہ اور اطلاع کی استعداد رکھتا ہے۔

۱۰. ابن جریر نے حضرتی سے روایت کیا ہے کہ ایک عورت نے دو پازیبیں بنوائیں اور ان میں گھنٹھارے لگائے پھر مردوں کے پاس سے گزری اور پاؤں زمین پر مارے اس طرح گھنٹھارے پازیب سے ٹکرانے تو آواز پیدا ہوئی۔

تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ نہ زور سے ماریں اپنے پاؤں (زمین پر) (۱) (۳) علامہ بغوی فرماتے ہیں وہ عورت جب چلتی تو زور سے اپنا پاؤں زمین پر مارتی تاکہ اس کی پازیب کی جھکرائی جائے تو اس حرکت سے اسے منع کیا گیا کیونکہ یہ مردوں کی توجہ اور

میلان کا سبب بنتی ہے (۱)۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ ارشاد صراحۃً زینت کے اظہار سے نبی اور آواز بلند کرنے سے منع کرنے کی نسبت یہ اسلوب زیادہ بلیغ ہے۔ اسی وجہ سے امام بیضاوی نے انوار ازل میں صراحت سے لکھا ہے کہ عورت کا لغو (آواز) ستر ہے (۲)۔ اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا مردوں کے لئے تصبیح اور عورتوں کے لئے تصفیق (ہاتھ پاؤں مارنا) ہے یہ حدیث کلیل بن سعد سے مروی ہے اور بخاری، مسلم میں ہے (۳)۔ مرد کے لئے یعنی عورت کی آواز سننا اچھا نہیں ہے اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے امام کی بھول پر اسے آگاہ کرنے کے لئے عورت کو آواز کے ساتھ تصبیح کرنے کے بجائے تصفیق کا حکم دیا ہے۔ یہ آیت کریمہ دلیل ہے کہ عورت کا پاؤں بھی ستر ہے۔

۱۱۔ چونکہ تم میں سے کوئی شخص اور مرد و نواہی میں کوتاہی سے پاک نہیں ہے اسلئے اے مومنو! تم سب اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر شخص خطا کرے گا ہے اور بہتر خطا کرنے والے وہ ہیں جو توبہ کرنے والے ہیں۔ اس حدیث کو ترمذی ابن ماجہ اور داری نے روایت کیا ہے (۴)۔ بعض علماء فرماتے ہیں تو بوا الی اللہ کا مطلب یہ ہے کہ اس سورہ پاک میں جو آداب معاشرت سکھائے گئے ہیں انکی اطاعت کرو۔ بعض علماء فرماتے ہیں اسکا معنی یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں جو گناہ تم کرتے تھے اس سے توبہ کرو اگرچہ اسلام کی برکت سے تمہارے سب گناہ معاف ہو گئے ہیں لیکن پھر بھی ان پر ندامت اور آئندہ ایسے افعال بد نہ کرنے کا عزم کرنا واجب ہے۔

ابن عامر نے یہاں اور سورہ زخرف میں اور سورہ الزمر میں ایہ کوہا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے جب وصل کیا ہے لیکن وقف کی صورت میں تو بغیر الف کے پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اصل صرہا کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عمر و اور کسائی نے الف کے ساتھ وقف کیا ہے۔ یعنی البعا پڑھا ہے اور باقی قراء نے بغیر الف کے پڑھا ہے۔

۱۲۔ توبہ کرو کیونکہ اس میں تمہارا سے لئے سعادت دارین ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مبارک ہوا ہے جس کے نامہ اعمال میں استغفار زیادہ ہے (۵)۔ ابن عمر سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اے لوگو! اپنے رب کی بارگاہ میں توبہ کرو میں ہر روز اپنے رب کی بارگاہ میں سو مرتبہ توبہ کرتا ہوں (۶)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی قسم میں اللہ کی بارگاہ میں دن میں ستر مرتبہ سے زیادہ مرتبہ توبہ و استغفار کرتا ہوں۔ اس حدیث کو بخاری نے نقل کیا ہے (۷)۔ اعرابی سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے دل پر کثافت آتی ہے اور میں دن میں سو مرتبہ توبہ و استغفار کرتا ہوں۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے (۸)۔ ابن عمر سے مروی ہے فرماتے ہیں ہم مجلس میں رسول اللہ ﷺ کا استغفار سو مرتبہ پڑھ کر تھے۔ آپ اس طرح استغفار کرتے تھے رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَرَبِّ اغْفِرْ لِمَنْ سِوَايْ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ۔ اس حدیث کو ترمذی ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے (۹)۔

وَأَنْتُمْ حَوَالَىٰ آيَاتِي وَمِنْكُمْ وَ الصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ أَمَايَكُمْ إِنْ يَكُونُوا

1- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 195 (القر)

2- تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شباب، جلد 7، صفحہ 43 (احمدیہ)

3- کنز العمال، جلد 7، صفحہ 476 (الترغیب الاصلاحی)

4- جامع ترمذی، جلد 4، صفحہ 569 (احمدیہ)

5- شعب الایمان، جلد 1، صفحہ 440 (احمدیہ)

6- صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 346 (نقدی)

7- صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 933 (وزارت تعلیم)

8- صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 346 (نقدی)

9- سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 279 (وزارت تعلیم)

فَقْرًا يَعْرِضُهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝

”اور نکاح کر دیا کرو جو بے نکاح ہیں تم میں سے اور جو نیک ہیں تمہارے غلاموں اور کنیزوں میں سے۔ اگر وہ تنگ دست ہوں (تو فکر نہ کرو) نبی کریمؐ کے غائبین اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے۔ اور اللہ تعالیٰ وسعت والا ہمدان ہے۔“

پہلے اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں سے منع فرمایا جو بدکاری کا سبب بن سکتی تھیں اب نکاح کا حکم فرمایا، کیونکہ نکاح کرنا نظر کو بھکا دیتا ہے اور بدکاری سے بچاتا ہے۔ فرمایا اے مردوں اور عورتوں کے سر پرستو! اے غلاموں کے مالکو! اپنے متعلقین اور غلاموں کا نکاح کرو۔ ایسا جمع ہے تم کی اور یہ ایما سے منقلب ہے جیسے تباہی اصل میں تباہ تھا۔ ایما ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کا دوسرا رفق حیات نہ ہو خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو۔ اس آیت میں انکھو کا امر استحباب کے لئے ہے۔ اور صالحین کی تخصیص احترازی نہیں ہے بلکہ یہ اس لئے ہے کہ صالح غلاموں اور کنیزوں کے دین کو بچانا اور ان کا خصوصی خیال رکھنا زیادہ اہم ہے۔ بعض مانا فرماتے ہیں الصالحین سے مراد وہ غلام اور لونڈی ہیں جو نکاح کی صلاحیت رکھتے ہوں اور اس کے تقاضے پورے کرنے کی استعداد کے حامل ہوں۔

مسئلہ: جب انسان کو حرام میں وقوع کا خوف ہو اور غلبہ شہوت ہو تو نکاح کرنا واجب ہے۔ نہایہ میں ہے کہ اگر انسان کو زنا میں واقع ہونے کا اندیشہ ہو اور اس سے بچنا ممکن نہ ہو تو نکاح کرنا فرض ہو جاتا ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں اگر ایسا قوی اندیشہ ہو کہ نکاح نہ کرنے کا تو ضعیف نفس نہ کر سکے گا اور حرام میں مبتلا ہو جائے گا تو نکاح فرض ہے اور اگر غلبہ شہوت اس حد تک نہ ہو بلکہ شہوت آمیز جذبات کی وجہ سے گناہ میں مبتلا ہونے کا خوف ہو تو نکاح واجب ہے لیکن یہ وجوب اس وقت ہے جب حقوق نکاح ادا کرنے کا یقین ہو۔ ابن ہمام فرماتے ہیں ظلم کے خوف کی تفصیل ہونی چاہئے جس طرح زنا کے خوف کی تفصیل ہے۔ اگر وہ ظلم کی اس انتہا کو پہنچا ہو جو اس انتہا پر پہنچنے کی وجہ سے نکاح فرض ہوتا ہے تو اس کا نکاح کرنا حرام ہے اور اگر ظلم کی اس انتہا تک پہنچا ہو انہیں ہے تو نکاح کرنا مکروہ تحریمی ہوگا۔

بدائع میں ہے کہ غلبہ شہوت کے وقت نکاح کی فرضیت مہر اور نفقہ کی ملکیت کے ساتھ مقید ہے جو شخص غلبہ شہوت کی وجہ سے عورتوں سے بچ نہیں سکتا جبکہ اس کے پاس مہر ادا کرنے اور نفقہ (خرچہ) دینے کی استعداد بھی رکھتا ہے ایسی حالت میں اگر وہ شادی نہیں کرتا تو گنہگار ہے۔

حالت اعتدال میں داؤدؑ کا ہری اور اس کے ہم خیال دوسرے علماء کہتے ہیں کہ اگر انسان ولی اور انفاق (خرچہ) پر قادر ہو تو زندگی میں ایک مرتبہ نکاح کرنا مرد اور عورت پر فرض مبین ہے کیونکہ امر کے صیغہ کے ساتھ فرمایا قَالِيْهُمَا صَاطِبَاتٌ لَّكُمْ قَبْلَ النَّسَاءِ وَ اَنْتُمْ خَوَاتِمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ اور نکاح کرو جو پہنچاؤ گئیں تمہیں (ان کے علاوہ دوسری عورتوں سے) (اور نکاح کر دیا کرو جو بے نکاح ہیں تم سے) ایسی طرح حضرت سرو کی حدیث ہے جس میں حضور ﷺ نے متھل (ہر کسی سے سٹ کر زندگی بسر کرنا) سے منع فرمایا ہے۔ اس حدیث کو ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے (۱)۔ اصحاب غلو ہر بطور دلیل یہ ارشاد نبوی بھی پیش کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے عکاف کو فرمایا کیا تیری زوجہ ہے انہوں نے عرض کی نہیں پھر پوچھا لو تیری ہے عرض کی نہیں۔ فرمایا تو خوشحال ہے عرض کی میں خوشحال ہوں فرمایا تو شیطانوں کو بھائیوں کا کان ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہماری سنت نکاح کرنا ہے تم میں سے برے لوگ تمہارے

غیر شادی شدہ افراد ہیں اور جو مجرد ہونے کی حالت میں مگر گئے وہ رذیل مرد ہے۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے (1)۔ حضرت انس کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کا کح کرنے کا حکم فرماتے تھے اور تحلل سے سخت منع فرماتے تھے اور فرماتے ایسی عورت سے شادی کرو جو بہت زیادہ محبت کرنے والی ہو اور زیادہ بچے جتنے والی ہو میں قیامت کے روز تمہارے حقیقی لوگوں کی کثرت پر فخر کروں گا اس حدیث کو امام احمد ابو داؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے (2) 'سورہ نساء میں فان خستم الا تعدلوا کے ارشاد کی تفسیر میں اسی طرح روایت کیا ہے۔

بعض احناف فرماتے ہیں کہ نکاح کا وجوب کفایہ پر ہے اور وجوب کے دلائل اس حکم کے کفایہ ہونے کے منافی نہیں ہیں، کیونکہ بعض کے نکاح کرنے سے دوسروں سے وجوب سابقا ہو جاتا ہے، کیونکہ نکاح کی مشروعیت کا سبب مسلمانوں کی بقاء اور ان کے عدم انتطاع کے لئے ہے اور یہ بقاء امت مسلمہ میں سے بعض کے نکاح کرنے سے بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ نکاح کے فرض میں نہ ہونے پر اجماع ہے ابو داؤد طاہری اور اس جیسے دوسرے علماء کے قول کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں نکاح کرنے کا امر وجوب کفایہ ہے کیونکہ فانکحوا مما طاب لکمہا کارشاد ازواج کی تعداد بیان کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ اس آیت میں خطاب اولیاء کو ہے اور انہیں منع کیا جا رہا ہے کہ اگر غیر شادی شدہ مرد یا عورت آزاد یا غلام شادی کرنا چاہیں تو تم انہیں نہ روکو۔ اخبار احاد سے فرض ثابت نہیں ہوتا۔ بعض علماء فرماتے ہیں نکاح کرنا سنت مؤکدہ ہے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ جب وحی اور انفاق پر قادر ہو تو نکاح کرنا مستحب ہے۔ نیز اسے ظلم کا بھی اندیشہ نہ ہو۔ اگر ظلم کرنے کا خوف ہو تو حرام ہے یا مکروہ ہے اور نکاح کے سنت ہونے کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود نکاح کیا تھا۔ اور حضور ﷺ کا ارشاد بھی ہے اسے جو انوں کے گروہ، جو تم میں سے طاقت رکھتا ہو وہ ضرور شادی کرے کیونکہ شادی کرنا اس کی نظر کو پاک کر دے گا اور اس کو گناہ سے بچائے گا اور جو شادی کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو اسے چاہئے کہ وہ روزہ رکھے کیونکہ روزہ شہوت کو کم کرتا ہے اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے ابن مسعود کی حدیث سے روایت کیا ہے (3)۔ اور ابن ماجہ نے جو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث روایت کی ہے کہ نکاح میری سنت ہے جو میری سنت پر عمل نہیں کرے گا وہ مجھ سے نہیں شادی کرو میں تمہاری کثرت کی وجہ سے دوسری امتوں پر کثرت کا اظہار کروں گا جسے طاقت ہو وہ نکاح کرے اور جسے طاقت نہ ہو اسے روزہ رکھنا چاہئے (4)۔ اس حدیث کی سند میں عیسیٰ بن میمون ضعیف راوی ہے۔ صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا میں روزہ رکھتا ہوں اور اظہار بھی کرتا ہوں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں ہے (5)۔

امام ترمذی نے حضرت ابویوب سے روایت کیا ہے کہ چار چیزیں رسولوں کی سنت ہیں 1- حیاء 2- خوشبو لگانا 3- مسواک کرنا 4- نکاح کرنا (6)۔ ابن ماجہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو ارادہ رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ظاہر و مظہر ہو کر ملاقات کرے تو اسے چاہئے کہ وہ آزاد عورتوں سے نکاح کرے (7) جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے یہ سب مسلک احناف کے مطابق تھا۔

امام شافعی فرماتے ہیں اگر انسان وحی کرنے اور فقہاء اور ادا کرنے پر قادر ہو اور ظلم و تعدی کا خوف نہ ہو تو نکاح کرنا مستحب ہے لیکن عبادت و

- 1- مسند امام احمد، جلد 5، صفحہ 163 (صادر)
- 2- سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 280 (وزارت تعلیم)
- 3- صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 758 (د۔ت)
- 4- سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 134 (وزارت تعلیم)
- 5- صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 449 (قدیمی)
- 6- جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 128 (د۔ت)
- 7- سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 135 (وزارت تعلیم)

ریاضت کی خاطر اس کو ترک کرنا افضل ہے۔ اگر وہی کرنے یا نفلقہ دینے پر قادر نہ ہو اور ظلم کا بھی خوف ہو تو نکاح کرنا حرام یا مکروہ ہے۔ غلبہ ثبوت اور حرام میں وقوع کا اندیشہ ہو تو نکاح کرنا مکروہ ہو جاتا ہے اور اس صورت میں غلبہ ثبوت نماز روزہ جہاد اور حج سے افضل ہو جاتا ہے۔ امام مالک کا بھی یہی قول ہے۔ دونوں فریقوں کی کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ جسے اندیشہ ہو کہ وہ نکاح کے حقوق ادا نہیں کر سکے گا یا نکاح کی وجہ سے کسی حرام کام کا مرتکب ہوگا تو ایسے شخص کے لئے نکاح کرنا مکروہ یا حرام ہے۔ اور جسے غلبہ ثبوت ہو اور اسے زنا میں ملوث ہونے کا خوف ہو، یعنی اگر نکاح نہ کیا تو زنا کا ارتکاب کر بیٹھے گا جبکہ وہ نکاح کے حقوق ادا کرنے پر بھی قادر ہے تو ایسے شخص کے حق میں نکاح کرنا واجب ہے۔ جیسا کہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ امام شافعی کے نزدیک ایسے شخص کے حق میں نکاح کرنا مکروہ ہے۔ میں کہتا ہوں حرام کی ضد واجب ہے پس زنا کے خوف کے وقت نکاح کے وجوب کا قول کرنا ضروری ہے۔

لیکن وہ شخص جو حالت اعتدال پر ہوا ہے زنا کے ارتکاب کا اندیشہ بھی نہ ہو اگرچہ وہ نکاح نہ بھی کرے۔ اور اسے ظلم و زیادتی کرنے کا خوف بھی نہ ہو نکاح کے حقوق ادا کرنے پر بھی قادر ہو تو ایسے شخص کے حق میں نکاح کرنا سنت اور مستحب ہے۔ لیکن عبادت میں مشغول رہنے کے لئے نکاح کا ترک افضل ہے یا نکاح کرنا افضل ہے؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں نکاح کرنا عبادت میں مشغول رہنے سے افضل ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں عبادت میں مشغول رہنا افضل ہے۔ امام شافعی کے قول کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ بن زکریا علیہا السلام کی مدح فرمائی ہے کہ وہ قدرت کے باوجود عورتوں کے پاس نہیں جاتے۔ فرمایا سیدنا اذْ حَصَّوْنَا۔ صورت کا معنی قدرت کے باوجود نکاح نہ کرنا ہے۔ ابن ہمام (حنفی) اس کے جواب میں لکھتے ہیں کہ یحییٰ علیہ السلام کی یہ کیفیت پہلے انبیاء کی شریعت میں افضل تھی لیکن ہماری شریعت میں رہبانیت منسوخ ہو گئی ہے۔ جب یحییٰ علیہ السلام اور ہمارے نبی کریم ﷺ کی حالت آپس میں مختلف ہے تو نبی کریم ﷺ کی حالت کو مقدم کرنا واجب ہے۔ نبی کریم ﷺ وصال تک نکاح کی حالت میں تھے اور یہ حال ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے افضل ترین نبی کو پوری زندگی ایسے کام پر قائم رکھے جو افضل نہ ہو۔

شخص نے صحیحین میں روایت فرمایا ہے کہ چند صحابہ نے آپ ﷺ کی ازواج مطہرات سے سرکاری ازدواجی زندگی کے متعلق پوچھا۔ پھر کسی نے کہا میں عورتوں سے نکاح نہیں کروں گا کسی نے کہا میں گوشت نہیں کھاؤں گا کسی نے کہا میں بستر پر نہیں سوؤں گا۔ جب ان کی یہ باتیں نبی کریم ﷺ تک پہنچیں تو آپ ﷺ نے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء فرمائی پھر فرمایا ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جنہوں نے یہ یہ کہا ہے، لیکن میں نوافل بھی پڑھتا ہوں، سہما بھی ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں، اظہار بھی کرتا اور حقوق زوجیت بھی ادا کرتا ہوں جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں ہے (۱)۔

بخاری نے ان عباس سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا نکاح کرو کیونکہ اس امت کا بہترین فرد وہ ہے جس کی ازواج سب سے زیادہ ہیں، یعنی نبی کریم ﷺ (۲)۔ اس سے قبل نبی کریم ﷺ سے جمل کے متعلق سنت نبوی گزر چکی ہے۔

میرے نزدیک اس مسئلہ کی تحقیق یہ ہے کہ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ نکاح اور اہل و عیال کثرت ذکر اور توجہ الی اللہ سے اس کے لئے مانع نہیں ہیں تو اس کے حق میں نکاح کرنا افضل ہے۔ رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام اور اکثر انبیاء و صلحاء اسی کیفیت سے مزین تھے۔ نکاح کرنا واقعی افضل ہے کیونکہ نکاح کا عبادہ اور مشقت، تکرار اور سہنے کی مشقت سے زیادہ ہے، کیونکہ موانع کے ہوتے ہوئے عبادت پر قائم رہنا زیادہ

ثواب اور جزا کا موجب ہے۔ اسی وجہ سے خواص بشر خواص ملائکہ سے افضل ہیں۔ اور عوام البشر عوام ملائکہ سے افضل ہیں۔

جو شخص اپنے نفس میں ضعف اور کمزوری دیکھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ نکاح اور اس کے متعلق امور اور اہل و عیال کثرت و ذکر میں حائل ہوں گے نیز اسے یہ بھی یقین ہو کہ رزاق میں ملوث نہ گا تو ایسے شخص کے حق میں نکاح کو ترک کرنا افضل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَهَيِّجُوا أَمْوَالَكُمْ وَلَا أَوْلَادَكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ عَمَّا وَعَدْتُمْ لِقَوْلِكُمْ إِنَّكَ لَكُلٌّ لِلَّذِينَ آمَنُوا وَلَا تَحْسَبُوا بِسَعْيِكُمْ أَنَّ كَسَبًا هَآؤُمَسْكِينٌ** کہو میں تمہارے اموال اور نہ تمہاری اولاد اللہ کے ذکر سے۔ اور جنہوں نے ایسا کیا تو وہی لوگ گھلانے میں ہوں گے۔ ایک اور جگہ فرمایا: **قُلْ إِنْ كَانِ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَآزْوَاجُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ كَسَبًا هَآؤُمَسْكِينٌ** تمہارے باپ اور تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور دو مال جو تم نے کما ہے اور اس کے بار بار اندیشہ کرتے ہو جس کے مندے کا اور مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو زیادہ پیار سے ہیں تمہیں اللہ تعالیٰ سے اور اسکے رسول ﷺ سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے تو انتظار کرو یہاں تک کہ لے آئے اللہ تعالیٰ اپنا حکم (ایک اور مقام پر فرمایا: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ مِنْ أَرْزَاقِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ وَعَدُوِّكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ**)۔ (اے ایمان والو! تمہاری کچھ بیبیاں اور تمہارے بچے تمہارے دشمن ہیں پس ہوشیار رہو ان سے۔

عبادت الہی میں مشغول ہونے سے نکاح کیسے افضل ہو سکتا ہے؟ جبکہ نکاح فی نفسہ ایک مباح امر ہے و وضعاً عبادت نہیں ہے اور اس کا احتیاب ان مصالح کی وجہ سے ہے جو اس پر مرتب ہوتے ہیں۔ اگر نکاح فی نفسہ عبادت ہوتا تو اس کی ادائیگی کے لئے اسلام شرط ہوتا جس طرح کہ دوسری عبادت کی ادائیگی کے لئے اسلام شرط ہے۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس کی ہجرت دنیا کے لئے ہوتی ہے جس کو وہ حاصل کرتا ہے یا عورت کے لئے ہوتی ہے جس سے نکاح کرنا چاہتا ہے تو اسکی ہجرت اس چیز کی طرف ہے جس کی طرف اس نے ہجرت کی ہے۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم میں ہے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے (۱)۔

اگر نکاح فی نفسہ عبادت ہوتا تو نکاح کی غرض سے کی جانے والی ہجرت ہجرت اسلام شاری ہوتی۔ اسی طرح حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔ دنیا میں سے میرے لئے تین چیزیں مرغوب بنائی گئی ہیں۔ 1۔ نساء (عورتیں) 2۔ خوشبو 3۔ نماز میں میری آنکھوں کی خشکدک ہے۔ اس حدیث کو نسائی نے روایت کیا ہے (2)۔ اسی طرح طبرانی نے بھی روایت کی ہے اور اس کی سند حسن ہے۔ حدیث صراحۃ دلالت کرتی ہے کہ نکاح امور دنیاویہ مباحہ میں سے ہے جیسا کہ خوشبو امور دنیاویہ میں سے ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے چار چیزیں رسولوں کی سنت ہیں نکاح اور خوشبو لگانا۔ اس ارشاد میں جو نکاح کو سنت کہا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سنت زائدہ ہے اور سنن عادیہ میں سے ہے سنن ہدیٰ سے نہیں ہے۔ سنت ہدیٰ وہ ہوتی ہے جس پر رسول اللہ ﷺ نے عبادت کے طور پر مروت و غلبت اختیار فرمائی ہو۔ یہ بھی نہ کہا جائے کہ حضور ﷺ کا ارشاد **مَنْ رَزَعِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي** دلیل ہے کہ نکاح سنن ہدیٰ سے ہے۔ کیونکہ ہم کہتے ہیں کہ یہ ارشاد نکاح کے سنن ہدیٰ میں ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ فعل جس کو نبی کریم ﷺ نے کیا ہوا اور اسے اچھا سمجھا ہوا تو ایسے فعل سے اعراض واقعی قبیح ہے اور موجب انکار و عقاب ہے لیکن اس کو چھوڑ دینا عقاب کا موجب نہیں ہے جیسا کہ سنت ہدیٰ کا ترک

۵۰: جب قرب ہوتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ حدیث میں ہے حَبَّ الْاِثْمِ مِنَ الدُّنْيَا فَلَا تَلَاثُ الْاَطْيَبُ وَالْبَسَاءُ وَجُعِلَتْ قُرْفَةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ۔ اس حدیث میں نماز کو بھی امور دنیویہ میں شمار کیا گیا ہے۔ ہم کہتے ہیں حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ثلاث کا لفظ متصل طرق میں نہیں پایا جاتا۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے دنیا ستارح ہے اور بہتر ستارح نیک عورت ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے عمرو بن العاص سے مرفوع روایت کیا ہے۔ یہ حدیث نکاح کے امور دنیویہ میں سے ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ پس ہر امر کا صیغہ ہو نکاح کے متعلق قرآن کریم اور حدیث نبوی ﷺ میں ہے وہ اباحت یا استحباب پر محمول ہے۔ رہی وہ حدیث جس میں آپ ﷺ نے عکاف کو فرمایا تو شیطانوں کے بھائیوں میں سے ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے جو غلبہ شہوت اور فتنہ کے خوف کی حالت پر محمول ہے۔

نکاح حسن نیت کی وجہ سے عبادت بن جاتا ہے یعنی نکاح سے یہ نیت ہو کہ اہل اسلام کی کثرت ہوگی، آنکھ میں حیا آجائے گا وغیرہ۔ یہ چیز نکاح کے ساتھ متعلق نہیں ہے بلکہ کھانے پینے، خرید و فروخت، اجارہ دوسرے تمام مباح معاملات میں بھی پائی جاتی ہے۔ یعنی یہ افعال بھی حسن نیت سے عبادت بن جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا فرائض کی ادائیگی کے بعد حلال مال کی تلاش فرض ہے۔ اس حدیث کو طبرانی اور بیہقی نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے (1)۔ طبرانی نے انس بن مالک سے اس طرح روایت کی ہے کہ ہر مسلمان پر حلال مال کا طلب کرنا واجب ہے۔

جس طرح نکاح، نسل کی بقا کے لئے فرض کفایہ ہے اسی طرح اتنی مقدار میں کھانا فرض کفایہ ہے جس سے زندگی بقاء ضروری ہے۔ تجارت اور دوسرے تمام پیشے بھی اسی طرح فرض کفایہ ہیں۔ اگر تمام لوگ ان پیشوں کو چھوڑ دیں تو معاش و معاد کے معاملات میں خلل واقع ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سچا (اور) امانت دار تاجر، عقیق اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔ اس حدیث کو ترمذی نے ابو سعید الخدری سے روایت کیا ہے اور اس حدیث کو انہوں نے حسن بھی لکھا ہے (2)۔ ابن ماجہ نے ابن عمر سے روایت کی ہے بغوی نے شرح السنہ میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی طرح روایت کی ہے۔ ان تمام دنیوی امور کا حسن غیر کے واسطے سے ہے لیکن ذکر الہی اور توجہ الی اللہ میں حسن ذاتی ہے۔ اس لئے امور دنیویہ ذکر الہی کے مقابل کیسے ہو سکتے ہیں؟

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیان کیا ہے کہ بندہ نوافل کے ذریعے میرے قریب ہوتا ہے حتیٰ کہ میں اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہوں۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے (3)۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تو نہیں فرمایا کہ بندہ نکاح کے ذریعے میرے قریب ہوتا ہے یا کھانے پینے سے میرے قریب ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری طرف یہ دینی نہیں کی گئی ہے کہ میں مال جمع کروں اور تاجر بنوں لیکن میری طرف یہ وحی کی گئی ہے کہ میں اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کروں اور تہجد کرنے والوں میں سے ہو جاؤں۔ اس حدیث کو علامہ بغوی نے سورہ الحجرت کی تفسیر میں روایت کیا ہے (4)۔

ابن ہمام نے جو بیچنی علیہ السلام کی حالت کے متعلق لکھا ہے ان کی شریعت میں نکاح نہ کرنا افضل تھا اور ہماری شریعت میں رہبانیت

2- جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 145 (دزات تعلیم)
4- تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 416 (انکر)

1- شعب الایمان، جلد 6، صفحہ 420 (العلویہ)
3- صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 963 (دزات تعلیم)

منسوخ ہو گئی ہے۔ یہ جواب درست نہیں ہے کیونکہ نکاح کرنا ہر دین میں کنوارے رہنے سے افضل تھا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ چار چیزیں رسولوں کی سنت ہیں۔ ان چار چیزوں میں نکاح کو بھی شمار کیا ہے۔ حضرت آدم نوح ابراہیم اسماعیل اخیق یعقوب یوسف موسیٰ ہارون ایوب داؤد سلیمان اور زکریا علیہم السلام سب شادی شدہ تھے اور نبی علیہ السلام سے افضل تھے۔ شاید نبی علیہ السلام نے اپنے حق میں بعض امور کی وجہ سے نکاح کو نکل سمجھا ہو جو نکاح سے افضل ہوں۔ دین یعنی اور نبی میں رہبانیت مشروع تھی اور ہمارے دین میں وہ منسوخ ہے۔ یہ قول بھی غلط ہے بلکہ وہ رہبانیت جو نصاریٰ اختیار کرتے تھے وہ بدعت تھی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا رَبَّانِيَّةٌ اِيْتَنَّا عُنُقًا۔ (اور رہبانیت کو انہوں نے خود ایجاد کیا تھا) احادیث میں جو متحمل (تہا رہنے) سے اور رہبانیت سے روکا گیا ہے۔ اس سے مراد نہیں کہ حضور ﷺ و ذرا لہی کے لئے خلوت اختیار کرنے اور مخلوق سے کٹ کر اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے سے منع فرما رہے ہیں۔ یہ مفہوم کیسے ہو سکتا ہے جبکہ قرآن حکم میں ہے وَ اذْكُرْ لَمَّا تَسْمَعُ مِنْ رَبِّكَ وَ تَسْتَكْبِرُ لِلّٰهِ اِيْتَنَّا عُنُقًا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمان کا بہتر مال بکرا یاں ہیں جن کے پیچھے وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چلا جاتا ہے اور اپنے دین کو قتلوں سے بچالے جاتا ہے۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے (1)۔

نبی کریم ﷺ نے ان امور مباحہ کو چھوڑنے سے منع فرمایا جن کو چھوڑنے پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ثواب نہیں ہے جیسے نکاح ہنتر پر سونا گوشت کھانا اور لوگوں سے کلام کرنے کو ترک کرنا ہے جیسا کہ نصرانیوں کے راہب کرتے تھے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، قُلْ مَنِ حَضَرَهُ زِينَةُ اَللّٰهِ الرَّحْمٰنِ اَحْبَبُ لِيَا دُوْدَ الْعَلَيْتِ مِنْ الزَّوْجِ۔ منسوخ اور ناجائز وہ رہبانیت ہے جو نصرانیوں نے خود اختیار کی تھی رہبانیت مشروعہ ممنوع نہیں ہے۔ حدیث شریف میں صحابہ کی مدح اس طرح فرمائی ہے انہم و ہبان باللیل لیوث بالنہار وہ رات کو راہب ہیں اور دن کو شیر ہیں۔

فائدہ: علامہ بغوی نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کی تائید میں لکھا ہے کہ آیت کریمہ میں دلیل ہے کہ غیر شادی شدہ عورتوں کا نکاح کرنا اولیاء کی اجازت پر منحصر ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خطاب اولیاء کو فرمایا ہے کہ تم لوگوں اور نونہوں کا نکاح کرنا ان کے مالکوں کے سپرد ہے کیونکہ ارشاد الہی ہے 'وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اَعَانِكُمْ (2) امام بغوی کی مراد یہ ہے کہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عاقل باطن آزاد عورت کا نکاح ولی کی اجازت کے بغیر جائز نہیں ہے، ہم نے یہ مسئلہ تفصیل سے سورہ بقرہ کی آیت فَذَلَا تَعْتَدُوْهُنَّ اَنْ يَّخْفِيْنَ اَزْوَاجَهُنَّ كِ تَسْمِيْرِ مِمْ بِيَانِ كَرُوْا يَہ۔ اس آیت سے اس مسئلہ کا استدلال درست نہیں ہے کیونکہ ایم کا لفظ مراد عورت چھوٹے ہوں یا بڑے کنوارے ہوں یا پہلے شادی شدہ ہوں تمام کو شامل ہے اور علماء کا اجماع ہے کہ بالغ مردوں کا نکاح ولی کی اجازت پر منحصر نہیں ہے۔ اور اس بات پر بھی اجماع ہے کہ باکرہ چھوٹی بچی کا نکاح ولی کی اجازت پر منحصر ہے۔ پس اس آیت کو عورتوں کے ساتھ خاص کرنا چھوٹے بچوں اور بچیوں کے ساتھ خاص کرنے سے زیادہ اولیٰ نہیں ہے۔ یہ احتمال ہے کہ لفظ نکاح میں نمازی کا معنی مراد ہو۔ شاید نکاح کرنے کے حکم سے مراد ان کو نکاح کرنے سے منع نہ کرنا اور ان کی تائید کرنا مراد ہے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ اگر غلام آقا سے نکاح کرنا طلب کرے تو آقا پر واجب ہے کہ اس کا نکاح کر دے۔ اسی طرح بالغ عورت جب ولی سے نکاح کرانے کا مطالبہ کرے تو ولی پر اس کا نکاح کرنا واجب ہے۔ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ان علماء کی اصل پر ہے جو بغیر ولی کی اجازت کے نکاح کو جائز

قرائیں دیتے۔ لیکن امام ابوحنیفہ کی اصل پر وجوب کا مفہوم یہ ہے کہ وہی پر حرام ہے کہ عورت کو نکاح کرنے سے منع کرے۔ یہ آیت کریمہ اس مسئلہ میں فَلَا تَنْكُحُوهُنَّ اَنْ تَبْتَغِيْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَآهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ کی مثل ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تمہارے پاس کوئی ایسا شخص نکاح کا پیغام بھیجے جس کے دین اور اخلاق کو تم پسند کرتے ہو تو اپنی (بچی، بہن) میں سے جس کا اس نے رشتہ مانگا ہے اس کا نکاح کر دو۔ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں بہت بڑا فساد برپا ہوگا۔ اس حدیث کا ترجمہ نے روایت کیا ہے (1)۔ حضرت عمر بن خطاب اور انس بن مالک نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا تو رات میں لکھا ہے کہ جس کی بچی بارہ سال کی عمر کو پہنچ گئی اور باپ نے اس کی شادی نہیں کی تو جو بچی گناہ کا ارتکاب کرے گی اس کا گناہ باپ پر ہوگا (2)۔ ابوسعید اور ابن عباس سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کا بچہ پیدا ہوا اسے چاہئے کہ وہ بچے کا چھانا نام رکھے اور اس کی خوب تربیت کرے پھر جب وہ بالغ ہو جائے تو اس کا نکاح کرے۔ اگر وہ بالغ ہو گیا اور باپ نے اس کی شادی نہ کی پھر اس سے گناہ مزد ہو تو اس کا گناہ باپ کے ذمہ ہوگا۔ یہ دونوں حدیثیں امام بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کی ہیں (3)۔

یعنی غربت و افلاس تمہیں نکاح سے روکے کیونکہ بندوں کو رزق بہم پہنچانے کا کفیل اللہ تعالیٰ ہے یہ مال و متاع آنے جانے والی چیز ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں غنی سے مراد قناعت ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں غنی سے مراد خاندان اور بیوی کے رزق کا اجتماع ہے لیکن پہلا قول اسح ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ نکاح کرنے والے کو غنی فرمادے گا۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا جب ہے اس شخص پر جو بغیر نکاح کے غنی کا متمنی ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اِنْ يَكُوْنُوْا فُقَرَاءَ فَعَرَضْنَا عَلَيْهِمْ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ۔ ایک اور مقام پر فرمایا اِنْ يَشْكُرُوْا فَاٰتَيْنَهُم مِّنْ لَّدُنَّ سَعِيْدًا (میں) بیوی) جدا ہو جائیں تو غنی کر دے گا اللہ تعالیٰ دونوں کو اپنی وسیع بخشش سے (4)۔ بزاز خطیب اور دارقطنی نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ آپ فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورتوں سے نکاح کرو کیونکہ یہ مال لاتی ہیں (5)۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے مراسیل میں عروہ سے مرسل روایت کیا ہے۔ نقیبی اور بیہقی نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نکاح کے ذریعے رزق تلاش کرو (6)۔ میں کہتا ہوں شاید یہ وعدہ ہے اس شخص کے لئے جو نکاح کے ذریعے پاکدامن رہنا چاہتا ہے اور رزق کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ پر توکل کرتا ہے۔ اس پر دلیل آئندہ آیت کریمہ ہے۔

وَلَيْسَتَعْتَفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُعْزِمَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ ۗ وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِنَّا مَلَكًا اٰتَيْنٰكُمْ فَاَيُّوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ حَيْرًا ۗ وَ اَتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْ اَنْشَكُمُ ۗ وَلَا تَلْمِزُوْهُمُ اَعْلٰى اَعْيُنِكُمْ عَلٰى الْبِعَآءِ اِنْ اَسَدْنَ نَحْصًا لِّمَتَّبِعُوْا عَرَضَ الْحَيٰوَةِ الدُّنْيَا ۗ وَمَنْ يُكْرِهْنَهَا فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْ بَعْدِ اٰكْرَاهِيْنَ عَفُوٌّ رَّحِيْمٌ ﴿۳۳﴾

1۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 128 (ذرات علیم) 2۔ شعب الایمان، جلد 6، صفحہ 402 (اعلیٰ) 3۔ ابیضا، صفحہ 401
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 198 (القر) 5۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 275 (الترات الاسلامی) 6۔ ابیضا، صفحہ 276

”اور چاہیے کہ پاکدامن بنے رہیں وہ لوگ جو نہیں پاتے شادی کرنے کی قدرت یہاں تک کہ فحشی کرے انہیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے لے اور جو مکاتب بننا چاہیں تمہارے غلاموں سے تو مکاتب بنا لو انہیں ملے اگر تم جانو ان میں کوئی بھلائی سے اور (زر مکتب ادا کرنے میں) مدد کرو انکی اللہ تعالیٰ کے مال سے جو اس نے تمہیں عطا کیا ہے اور نہ مجبور کرو اپنی لوٹداریوں کو بدکاری پر بے اگر وہ پاکدامن رہنا چاہیں لے تاکہ تم حاصل کرو (اس بدکاری سے) دنیوی زندگی کا کچھ سامان ملے اور جو (کمینہ خصلت) مجبور کرتا ہے انہیں (عصمت فروشی پر) تو بیشک اللہ تعالیٰ انکے مجبور کئے جانے کے بعد (ان کی لغزشوں کو) بخشنے والا (اور ان پر) رحم فرمانے والا ہے۔“

یعنی جو سبام نکاح اور وہ چیزیں جو نکاح کے لئے ضروری ہیں، مثلاً مہر مہل اور دوسرے اخراجات وغیرہ نہ رکھتا ہوں اس کا فقر اس کو نکاح کرنے سے روکے ہوئے ہو اور اس کو ظلم کرنے کا بھی اندیشہ ہو نیز نکاح کے حقوق کے فوت ہونے کا بھی خوف ہو تو ایسے شخص کو عفت کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہنا چاہئے اور روزہ اور کم خوراک کے ذریعے ثبوت کو کنٹرول کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو نکاح کی استطاعت نہ رکھتا ہوں تو اسے روزہ رکھنا چاہئے کیونکہ یہ ثبوت کو کم کرتا ہے۔

ع ابن السکن نے معرفۃ الصحابہ میں عبد اللہ بن مسیح عن ابیہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ صحیح فرماتے ہیں میں حویطب بن عبد العزی کا غلام تھا۔ میں نے اس سے مکاتب بنانے کا سوال کیا تو اس نے مجھے مکاتب بنانے سے انکار کر دیا۔ تو اس پر یہ ارشاد نازل ہوا کہ جو تمہارے غلام مکاتب بنانے کا تم سے سوال کریں تو انہیں مکاتب بنا دو۔ الذین ام موصول اپنے صلہ سے ملکر مبتدا ہے اور فکتاہوہم اس کی خبر ہے اور خبر پر فاء اس لیے آئی ہے کیونکہ مبتدا کے ضمن میں شرط کا معنی پایا جاتا ہے۔ یا ام موصول، مضر فعل کے ساتھ منصوب ہے جس کی تفسیر فکتاہوہم کا فعل کر رہا ہے اور فاء زائدہ ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں جب یہ آیت نازل ہوئی تو حویطب نے اپنے غلام کو سو دنار پر مکاتب بنایا اور اس نے اسے تیس دنار بہرہ کر دیئے تھے۔ غلام نے اسے یہ زر مکتب ادا کیا تھا۔ اور حسین کی جنگ میں قتل ہوا تھا (1)۔ جمہور علماء کے نزدیک یہ کاتبوہم کا امر استحباب کے لئے ہے یعنی کہ صاحب ہدایہ نے فرمایا یہ امر وجوب کے لئے نہیں ہے اور اس پر فقہاء کا اجماع ہے۔ اور یہی صحیح ہے یعنی امر کے اباحت کے لئے ہونے کا قول جیسا کہ ہمارے بعض مشائخ نے کہا ہے صحیح نہیں ہے کیونکہ اباحت پر عمل کرنے میں شرط لغو ہو جائے گی کیونکہ مباح تو شرط کے بغیر بھی تھا۔ رہا استحباب تو وہ شرط کے ساتھ مطلق ہے۔ اس کی وجاہت دیا گیا ہے کہ شرط عادی ہے کیونکہ آقا عادی اپنے غلام کو مکاتب نہیں بناتا مگر جب اس میں خیر دیکھتا ہے۔

بعض متقدمین سے مروی ہے کہ کاتبوہم کا امر وجوب کے لئے ہے۔ یہ قول عطاء، اور عمرو بن دینار کا ہے۔ امام احمد سے بھی ایک قول وجوب کا مروی ہے۔ جبکہ غلام اپنے آقا سے اپنی قیمت کی مقدار پر یا اس سے زائدہ پر مکاتب کا مطالبہ کرے۔ کیونکہ ابن سیرین نے انس بن مالک سے مکاتب بنانے کا سوال کیا تو انہوں نے توقف کیا۔ ابن سیرین نے حضرت عمر سے شکایت کی تو انہوں نے انس بن مالک پر کوڑا بٹنہ کرتے ہوئے حکم دیا کہ اسے مکاتب بناؤ۔ تو انس بن مالک نے اسے مکاتب بنا دیا۔ علامہ بغوی نے اپنی تفسیر میں اسی طرح لکھا ہے (2)۔

کتابت عقد معاوضہ ہے جس پر مفادہ کا صیغہ دلالت کر رہا ہے غلام اپنے آقا سے اپنے نفس کو اس چیز کے بدلے میں خریدتا ہے جو وہ

اپنی مائٹی سے ادا کرے گا۔ یہ استنباط سے مشتق ہے جس کا معنی ایجاب ہے۔ پس مکاتب میں ایجاب وقبول شرط ہے۔ یہ مال کی ادائیگی کے ساتھ مطلق آزاد کرنا نہیں ہے۔ پس چھوٹے بچے کو مکاتب بنانا بھی جائز ہے جبکہ وہ بیع وشرایع کی عقل رکھتا ہو کیونکہ اس میں ایجاب وقبول تحقق ہے کیونکہ عاقل اہل قبول سے ہے اور اسکے حق میں تصرف بفتح بھی ہے۔ لیکن مجنون اور کم عقل بچے کو مکاتب بنانا صحیح نہیں ہے، کیونکہ ان میں قبول کا تحقق نہیں ہے۔ اگر کوئی دوسرا ان کی طرف سے زر کتابت ادا کر دے تو پھر بھی وہ مجنون اور کم عقل بچہ آزاد نہ ہوں گے اور جو کچھ اس کے مالک کو غیر کی طرف سے دیا گیا ہے وہ لوٹا جانا چاہیگا۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک مکاتب بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ آقا اپنے غلام کو کسے میں نے تجھے اتنے مال پر مکاتب بنایا اور غلام کہے میں نے قبول کیا۔ پس غلام جب زر کتابت ادا کرے گا تو آزاد ہو جائے گا اگرچہ آقا نے یہ نہ بھی کہا ہو کہ جب تو ادا کرے گا تو آزاد ہے کیونکہ یہ موجب عقد ہے۔ پس آزادی بغیر تصریح کے بھی ثابت ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ بیع میں ہوتا ہے۔ امام مالک اور احمد کا یہی قول ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں آقا کے لئے یہ کہنا شرط ہے کہ میں نے تجھے اس مال پر مکاتب بنایا جو تو تھوڑا تھوڑا ادا کرے گا جب تو ادا کرے گا تو آزاد ہوگا۔ اگر تعلق (آزاد کرنے) کا لفظ ترک کر دے اور اس کی نیت کرے تو بھی جائز ہے۔ بغیر نیت اور بغیر تعلق کے کتابت کا لفظ کافی نہیں ہے۔ غلام کہے کتابت (میں نے قبول کیا)

مسئلہ: کتابت میں فوری مال کی ادائیگی کی شرط لگانا بھی جائز ہے اور دیر سے اور قسط وار ادائیگی کی شرط لگانا بھی جائز ہے۔ امام شافعی اور امام احمد فرماتے ہیں فوری مال کی ادائیگی کی شرط لگانا جائز نہیں ہے وقتوں میں ہونا ضروری ہے کیونکہ غلام تھوڑے سے عرصہ میں رقم کی ادائیگی سے عاجز ہے کیونکہ اس سے پہلے وہ غلام تھا اور کسی چیز کا مالک نہیں تھا۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ آیت میں اقساط کی کوئی شرط نہیں ہے اور ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ یہ عقد معاوضہ ہے اور بدل معصومہ (شمن) ہے پس یہ بیع میں شمن کے مشابہ ہو گیا۔ بیع میں جس طرح قیمت حوالے کرنے کی قدرت کی شرط نہیں ہوتی اسی طرح کتابت میں بھی شرط نہ ہوگی جتنی کہ مفلس کے لئے بڑے بڑے اموال خریدنا جائز ہوتا ہے اور یہ ہو سکتا ہے کہ غلام کو ہب یا زکوٰۃ کے ذریعے بڑے بڑے اموال مل جائیں اور وہ فوراً زر کتابت ادا کر دے۔ اگر زر کتابت فوراً ادا کرنا ہو اور پھر مکاتب ادائیگی نہ کرے تو آقا کے لئے جائز ہے کہ وہ بارہ غلام بنالے۔

مسئلہ: جب کتابت کی عقد صحیح ہو جائے گی تو مکاتب آقا کے تصرف سے نکل جائے گا کیونکہ کتابت کا مقصود یعنی بدل کی ادائیگی تحقق ہو چکی ہے۔ اس لئے وہ مکاتب بیع وشرایع اور سفر کرنے کا خود مالک ہو جائے گا اگرچہ مالک اس کو بیع بھی کرے۔ لیکن اگر بدل (زر کتابت) مالک کی ملکیت میں نہیں آئے گا تو مکاتب مالک کی ملکیت سے خارج نہ ہوگا کیونکہ یہ (کتابت) عقد معاوضت ہے۔ اس پر اجماع ہے کہ وہ ادائیگی سے پہلے اس کی ملکیت سے خارج نہ ہوگا۔

مسئلہ: کتابت آقا کی طرف سے عقد لازم ہے آقا کے لئے جائز نہ ہوگا کہ اس کو بیع کر دے لیکن غلام کی رضاعت سے نفع کر سکتا ہے کیونکہ کتابت غلام کے لئے آزاد ہونے کا استحقاق ثابت کرتی ہے اور حقیق (آزادی) بیع کا احتمال نہیں رکھتا اسی طرح اس کا استحقاق بھی بیع کا احتمال نہیں۔ کتابت کیونکہ یہ (کتابت) بھی حقیق کی طرح عبادت ہے اور اس کا بیع کرنا عمل کو باطل کرنے کا موجب ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا تَبْتَاعُوا اَنْفُسَكُمْ بِالْاَعْمَالِ (اپنے اعمال کو باطل نہ کرو) لیکن غلام کی طرف سے یہ (کتابت) عقد لازم نہیں ہے۔ غلام کو آسباب (کمانے) پر مجبور نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کی رضاعت اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کتابت سے نفع ہو

جاتی ہے لیکن اگر غلام کے پاس اتنا مال ہو کہ جس سے زر کتابت عمل ادا ہو سکتا ہو تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک غلام کو اس کی ادائیگی پر مجبور کیا جائیگا ایسی صورت میں غلام (مکاتب) کے لئے کتابت کا فسخ کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اس وقت وہ محتص ہوگا۔ امام مالک فرماتے ہیں غلام کو کمانے پر قدرت ہونے کے باوجود اپنے آپ کو عاجز بنانا جائز نہیں ہے۔ اسے کمانے پر مجبور کیا جائے گا۔ مسئلہ: جب مکاتب آقا کی ملکیت سے نہیں نکلے گا تو آقا کے لئے جائز ہوگا کہ وہ اسے آزاد کر دے، پس وہ مفت آزاد ہو جائے اور بدل کتابت اسکے ذمہ سے ساقط ہو جائے گا کیونکہ یہ رقم آزادی کے مقابلہ میں لازم ہوتی تھی اور وہ آزادی بغیر رقم کے حاصل ہو چکی ہے اس لئے وہ رقم اس پر لازم نہ ہوگی۔ عقد کتابت اگر چہ آقا کی طرف سے لازم ہے لیکن غلام کی رضا سے اسے فسخ کر سکتا ہے اور ظاہر اس کی رضا یہ ہے کہ وہ بغیر بدل کے اپنی آزادی کا وسیلہ ڈھونڈے۔

مسئلہ: جب مکاتب مالک کی ملکیت سے نہیں نکلے گا تو آقا کے لئے جائز ہوگا کہ وہ اپنے مکاتب کو فروخت کر دے۔ یہ امام احمد کے نزدیک ہے۔ کتابت کی وجہ سے فسخ نہ ہوگی بلکہ مشتری اس میں بائع کے قائم مقام ہوگا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہاں قول یہ ہے۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں مکاتب کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔ مگر اس کی رضا سے جائز ہے اور یہ کتابت کو فسخ کرنا ہوگا۔ امام مالک کا بھی یہی قول ہے اور امام شافعی کا جدید قول بھی یہی ہے۔ لیکن امام مالک کے نزدیک مکاتب کی بیع جائز ہے اور دین مؤجل (مؤخر) کی بیع بھی مؤجل کے ساتھ جائز ہے۔

امام ابوحنیفہ اور ان کے دوسرے مؤید علماء کے قول کی وجہ یہ ہے کہ مکاتب اپنی ذات پر تصرف کا مستحق ہو چکا ہے اور کتابت آقا کے حق میں عقد لازم ہے۔ اگر بیع میں مشتری کے لئے ملکیت ثابت ہو جائے تو یہ باطل ہو جائے گی حالانکہ تمہیں معلوم ہے کہ ملکیت کا مشتری کے لئے ثبوت امام احمد کے نزدیک کتابت کے فسخ کا مختص نہیں ہے اور مکاتب کو اپنی ذات پر تصرف کا استحقاق باطل نہیں ہوتا بلکہ مشتری اس میں بائع کے قائم مقام ہوتا ہے اور مشتری اس پر راضی ہو چکا ہے، اگر اسے مکاتب ہونے کا علم ہے اگر مشتری کو پہلے غلام کے مکاتب ہونے کا علم نہیں ہے تو مشتری کو بیع کے فسخ کرنے کا حق ہے۔ امام احمد نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث سے جنت پکڑی ہے کہ حضرت بریرہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس اپنی زر کتابت کی ادائیگی میں مدد طلب کرنے کیلئے حاضر ہوئی تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اسے کچھ نہ دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو فرمایا اسے خرید لو اور آزاد کر دو کیونکہ وہ اس کو ملتی ہے جو آزاد کرتا ہے۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے (1) اور اس کی اصل صحیحین میں ہے کہ حضرت بریرہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس آئی اور عرض کی میں نے 9 اوقیہ پر عقد کتابت کی ہے اور ہر سال اپنے مالک کو ایک اوقیہ دیتا ہے آپ میری اس سلسلہ میں مدد فرمائیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا اگر تیرے مالک یہ پسند کریں کہ میں انہیں تیری رقم ایک مشت ادا کر دوں اور تجھے آزاد کر دوں تو میں ایسا کر دوں گی اور ولاء میرے لئے ہوگی حضرت بریرہ اپنے مالکوں کے پاس گئی تو انہوں نے اس معاہدہ سے انکار کر دیا۔ حضرت بریرہ نے واپس آ کر بتایا کہ میں نے اپنے مالکوں کے پاس آپ کی تجویز پیش کی ہے لیکن وہ اس بات پر مصر ہیں کہ ولاء ہماری ہوگی۔ اس واقعہ کے متعلق جب رسول اللہ ﷺ نے سنا تو آپ ﷺ نے مجھ سے پوچھا میں نے تمام صورت حال عرض کی آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا تم اس لوٹری کو خرید لو

اور پھر اسے آزاد کر دو اور ان کیلئے دلاؤ، وہی شرط مان لو، وہ اس کی ہوتی ہے جو آزاد کرتا ہے۔ اللہ ہیث (1)۔

نسائی نے یہ واقعہ حضرت بریرہ سے روایت کیا ہے۔ اس حدیث میں امام احمد کے لئے کوئی حجت نہیں ہے کیونکہ جھگڑا اور نزاع تو اس صورت میں ہے جب مکاتب کو اسکی رضاکے بغیر فروخت کیا جائے۔ لیکن اگر مکاتب کی رضاکے بیچ ہو تو امام صاحب سے اظہر روایت یہ ہے کہ اس وقت بیچ جائز ہے اور حضرت بریرہ کی بیچ تو اسکی رضاکے تھی۔ (اس میں تو نزاع ہی نہیں ہے) امام بخاری نے جس باب کے تحت یہ حدیث نقل کی ہے اس کا عنوان ہی اس بات کا شاہد ہے: **بَابُ بَيْعِ الْمَكْتَبِ إِذَا رَضِيَ**۔ یعنی مکاتب کی بیچ جب وہ راضی ہو۔

مسئلہ: مکاتب اس وقت آزاد ہوتا ہے جب پوری زر کتابت ادا کر دیتا ہے اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے جو عمرو بن شعیب عن ابن عباس سے مروی ہے؟ فرمایا مکاتب اس وقت تک غلام ہے جب تک اس کی زر کتابت سے ایک درہم بھی باقی ہے۔ (2)۔ اس حدیث کو ابو داؤد، نسائی اور حاکم نے کئی طرق سے روایت کیا ہے نسائی اور ابن ماجہ نے ایک اور سند سے بھی روایت کی ہے

جسکے راوی عبداللہ بن عمرو بن العاص ہیں یہ ایک طویل حدیث ہے اس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا جو سو اوقیہ پر مکاتب ہو وہ ایک اوقیہ کے علاوہ باقی سب بھی ادا کر دے تو بھی غلام ہے نسائی فرماتے ہیں یہ حدیث منکر ہے ابن حزم نے لکھا ہے کہ اس حدیث میں راوی عطاء خراسانی ہے جس نے عبداللہ بن عمرو سے سنا ہے نہیں کیا۔ اس حدیث کو ترمذی، ابو داؤد اور ابن ماجہ نے عمرو بن شعیب عن ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اپنے غلام کو سو اوقیہ پر مکاتب بنایا پھر اس نے اس اوقیہ

(یا فرمایا) دس دنانیر کے علاوہ سب ادا کر دیے۔ پھر مزید اس کی ادائیگی سے عاجز آ گیا تو وہ غلام ہے (3) امام مالک نے مسؤلاً میں عن نافع عن ابن عمر سے موقوف روایت کی ہے کہ مکاتب غلام ہے جبکہ ایک درہم بھی زر کتابت سے باقی ہے (4)۔ ابن قانع نے ایک دوسری سند سے عن نافع عن عمر سے مرفوع روایت کی ہے لیکن اس کی علت بھی بیان کی ہے صاحب ہدایہ لکھتے ہیں اس مسئلہ میں صحابہ

کرام کا اختلاف ہے کفایہ میں ہے کہ زید بن ثابت کا قول ہمارے قول کی شکل ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں بیشی مقدار زر کتابت ادا کر چکا ہے اتنا حصہ اس کا آزاد ہو جائے گا۔ ابن مسعود فرماتے ہیں جب غلام اپنی قیمت کی مقدار ادا کر دے تو آزاد ہو جائے گا اور جو آزاد زر کتابت باقی ہے اس میں مالک دوسرے قرض خواہوں کی طرح آقا بھی قرض خواہ ہوگا۔ ابن عباس فرماتے ہیں

غلام مکاتب بنانے سے ہی آزاد ہو جائے گا۔ ابو داؤد اور ترمذی نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا مکاتب پر کسی حد کا فیصلہ ہو یا اسے کوئی میراث ملے تو جتنا اس کا حصہ آزاد ہے اسکے مطابق وارث ہوگا (5)۔ ایک اور روایت میں ہے کہ

ام سلمہ سے مروی ہے فرمائی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کسی ایک کے مکاتب کے پاس اتنا مال ہو جس سے زر کتابت ادا ہو سکتا ہے تو تم میں سے ہر ایک کو اس مکاتب سے پرہ کرنا چاہئے (6) اس حدیث کو ترمذی، ابو داؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

مسئلہ: اگر مکاتب زر کتابت کی قسط ادا کرنے سے عاجز آ جائے تو حاکم اسکی کیفیت کا جائزہ لے گا اگر اس نے کوئی قرض لینا ہے یا کسی

2- سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 191 (ذرات تعلیم)

1- صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 290 (ذرات تعلیم)

4- مؤطا امام مالک، جلد 2، صفحہ 787 (الترات المعربی)

3- جامع ترمذی مع تخریج الاحوذی، جلد 4، صفحہ 387 (المنکر)

6- مشکوٰۃ المصابیح، جلد 2، صفحہ 275 (المنکر)

5- جامع ترمذی مع تخریج الاحوذی، جلد 4، صفحہ 385 (المنکر)

اور ذریعہ سے اسے مال ملتا ہے تو حاکم فوری طور پر اس کے عاجز ہونے کا حکم نہ لگائے بلکہ تین دن تک مہلت دے لیکن تین دن سے زائد مہلت نہ دے۔ اگر مکاتب کو کسی ذریعہ سے مال ملنے کی توقع نہ ہو اور اس کا آقا اس کے عاجز کرنے کا مطالبہ کرے تو اسے حاکم عاجز قرار دے۔ اور عقد کتابت کو فتح کر دے۔ یہ امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے نزدیک ہے۔ امام ابو یوسف فرماتے ہیں قاضی اسے عاجز قرار نہ دے حتیٰ کہ پے در پے دو اقساط ادا نہ کرے۔ آقا کے لئے خود مکاتب کو عاجز قرار دینا جائز نہیں بلکہ اس کا عجز قضاء قاضی یا غلام کی رضا سے ثابت ہوگا۔

مسئلہ: مکاتب نے اگر اپنے مولا کو ملنے والے صدقات دیئے پھر وہ اقساط کی ادائیگی سے عاجز آ گیا تو آقا کے لئے ان صدقات کا استعمال جائز اور حلال ہے، اگرچہ آقا فنی یا بائمی بھی ہو کیونکہ ملکیت بدلنے سے صدقات کا حکم بدل جاتا ہے۔ غلام صدقہ کا مالک بنتا ہے پھر آقا اس مال کو صحت کے عوض حاصل کرتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں حضور نبی رحمت ﷺ تشریف لائے تو ہنڈیا میں گوشت اہل رہا تھا آپ ﷺ کی بارگاہ میں روٹی اور گھر میں موجود سانس پیش کیا گیا آپ ﷺ نے فرمایا مجھے ہنڈیا میں گوشت نظر آ رہا ہے۔ گھر والوں نے عرض کی حضور ﷺ! گوشت تو واقعی ہے لیکن وہ ایسا گوشت ہے جو برابرہ پر صدقہ کیا گیا ہے اور آپ صدقہ کا گوشت تناول نہیں فرماتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا وہ گوشت اس پر صدقہ ہے اور ہمارے لئے پودا ہے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ اگر کوئی شخص غنی یا بائمی کے لئے کوئی چیز مباح کرتا ہے تو اسکا حکم اس کے برعکس ہے کیونکہ جس کے لئے مباح کیا گیا ہے وہ مباح کرنے والے کی ملکیت سے لیتا ہے۔ اس صورت میں ملکیت تبدیل نہیں ہوتی اس لئے غنی آگے کسی کو وہ چیز نہیں دے سکتا۔ اس کی مثال اس طرح ہے کہ کوئی شخص بیع فاسد کے ذریعے کوئی چیز خریدتا ہے اگر وہ کسی دوسرے کے لئے وہ چیز مباح کرتا ہے تو اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے لیکن اگر دوسرے کو مالک بنا دیتا ہے تو اس کے لئے اس کا استعمال جائز ہو جائے گا۔

مسئلہ: امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک اگر غلام بدل کتابت ادا کرنے سے پہلے فوت ہو جاتا ہے تو وہ غلام کی حیثیت سے فوت ہوگا۔ اور عقد کتابت ختم ہو جائے گی خواہ وہ مکاتب مال چھوڑ کر مر اہو یا بغیر مال کے مر اہو۔ جیسا کہ قبضہ سے پہلے جمع تلف ہو جائے تو بیع کا حکم ختم ہو جاتا ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں حضرت عمر عبداللہ بن عمر زید بن ثابت، عمر بن عبدالعزیز اور قتادہ کا یہی قول ہے۔ امام ابوحنیفہ مالک ثوری، عطاء مطاؤس، حسن بصری اور انسی فرماتے ہیں اگر مال اتنی مقدار میں چھوڑ کر مرے کہ اس کا بدل کتابت پورا ہو سکتا ہے تو وہ آزاد ہے اور بدل کتابت آقا کو ملے گا اور باقی مال آزاد اور ٹاٹو ملے گا (1)۔

خیرا کا معنی ابن عمر نے کمانے پر قدرت کیا ہے۔ امام مالک اور ثوری کا بھی یہی قول ہے۔ حسن، ضحاک اور جاب بن ابی عمیر نے اس کا معنی مال کیا ہے اور بطور دلیل یہ ارشاد الہی پیش کیا ہے ان نوک خیرا۔ اس آیت میں خیرا کا معنی مال ہے۔ روایت ہے کہ سلمان کا ایک غلام تھا غلام نے انہیں کہا کہ آپ مجھے مکاتب بنا دیں، مسلمان نے پوچھا تیرے پاس مال ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ مسلمان نے کہا تیرا ارادہ ہے کہ تو مجھے لوگوں کا میل بچیل کھلائے۔ (صدقہ و خیرات کے مال کو حضور ﷺ نے میل فرمایا ہے، مسلمان نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے) یہ کہہ کر انہوں نے اسے مکاتب نہ بنا دیا (2)۔ یہ قول ضعیف ہے کیونکہ غلام خود اور جو کچھ اس کے قبضہ میں ہوتا ہے وہ سب آقا کی

ملک ہوتا ہے کیونکہ وہ مال کی ملکیت رکھنے کا اہل ہی نہیں ہوتا مالکیت اور ملکیت کے درمیان منافات ہے (یہ دونوں جمع نہیں ہو سکتیں) جب غلام مال کی ملکیت حاصل کرنے کی اہلیت رکھتا ہے تو بعد میں اس پر زر کتابت کی ادائیگی واجب ہوتی ہے۔ زر حاج کہتے ہیں اگر خیر اُسے مال مراد ہوتا تو الفاظ اس طرح ہوتے ان غلبتم لہم خیراً۔

ابراہیم بن زید اور عبید نے خیر اُکا معنی صدق اور امانت بیان کیا ہے (1)۔ امام شافعی نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ خیر اُکا معنی المنة اور فداء ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں غلام میں خیر کا اظہر معنی امانت کے ساتھ اکتساب ہے۔ بہتر یہ ہے کہ جب غلام کمانے پر قادر ہو اور امین بھی ہو تو اس کو کتابت سے نہ روکا جائے (2)۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں خیر اُسے مراد یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا اگر وہ مسلمانوں کے لئے ضرر رساں ہو، مثلاً وہ کافر ہو اور کفار کی معاونت کرتا ہو تو ایسے شخص کو مکاتب بنانا مکروہ ہے لیکن اگر مالک اسے مکاتب بنا دے تو صحیح ہے۔ عبیدہ سے یہ معنی بھی حکایت ہے کہ وہ نماز پڑھتے ہوں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ غلام عاقل بالغ ہو۔ بچے اور جنوں کو مکاتب بنانا صحیح نہیں ہے کیونکہ ان سے کوئی چیز طلب کرنا صحیح نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ نے کتابت کے امر کو الذین یتتبعون الکتساب پر مرتب فرمایا ہے۔ جس عقل کی شرط اسی سے سمجھ آ رہی ہے۔ پس اس تاویل پر یہ شرط لغو ہوگی اور بلوغ کی شرط لگانے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ بچہ جب عاقل ہو تو اس سے مطالبہ ہو سکتا ہے۔

مسئلہ: غلام جو کمانی نہ کر سکتا ہوں اس کو مکاتب بنانا امام ابوحنیفہ مالک شافعی اور ایک روایت میں احمد کے نزدیک مکروہ نہیں ہے اور امام احمد سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس کو مکاتب بنانا مکروہ ہے کیونکہ خیر سے مراد اکتساب پر قدرت ہے میں کہتا ہوں اگر کتابت کے استحباب کے لئے اکتساب کی قدرت کا شرط ہونا تسلیم کر بھی لیا جائے تو استحباب کی شرط کا نہ پایا جانا اس کی راہت کا مستحق نہیں ہے۔ اس شرط کی ضرورت ہی کیا ہے کیونکہ صدقات کی قبولیت کے ساتھ مال کا پہنچانا اس کے لئے ممکن ہے۔

مسئلہ: اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ ایسی لوڈی جو کمانے کی قدرت نہیں رکھتی اس کو مکاتب بنانا مکروہ ہے کیونکہ ہو سکتا ہے وہ بدکاری کا پیشاپہا کر مال کمانا شروع کر دے۔ واللہ اعلم۔

یہ اس جملہ میں مسلمانوں کو مکاتب کی اعانت پر براہِ حق کیا جا رہا ہے ان کو صدقات دے کر ان کی معاونت کرو خواہ نقلی صدقات ہوں یا فرضی۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس آیت سے مراد انکا وہ حصہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے فرضی صدقات میں (وئی الرقاب) کے ارشاد کے ساتھ مقرر فرمایا ہے۔ حضرت حسن اور زید بن اسلم کا یہی قول ہے۔ آیت کا لفظ صدقات کو فرضی صدقات کے ساتھ خاص کرنے کا تقاضا نہیں کرتا کیونکہ یہ امر استحباب کیلئے ہے؟ جیسا کہ کتابت (مکاتب بنانے) کا امر استحباب کے لئے ہے، بعض علماء فرماتے ہیں آقا کے لئے مستحب ہے کہ بدل کتابت میں سے کچھ حصہ معاف کر دے۔ بعض علماء فرماتے ہیں آقا پر بعض زر کتابت معاف کرنا واجب ہے۔ علامہ ابن قیمی کہتے ہیں حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا یہی قول ہے۔ امام شافعی کا بھی یہی قول ہے پھر بدل کتابت میں سے سادق کی جانے والی مقدار میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں زر کتابت کا چوتھا حصہ سادق کر دے۔ یہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے۔ عبدالرزاق، سعید بن منصور، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن المنذر، ابن مردیہ

اور تہنیتی نے نے عبدالرحمن اسلمی کے طریق سے یہ قول روایت کیا ہے۔ بعض نے یہ قول حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی روایت کیا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ تیسرا حصہ ساقط کرے۔ بعض کے نزدیک جتنا چاہے ساقط کر دے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول ہے۔ نافع فرماتے ہیں عبداللہ بن عمر نے اپنے ایک غلام کو تہنیتی سے ہزار درہم پر مکاتب بنایا پھر آخری قسط میں پانچ سو درہم معاف کر دیئے تھے۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں حضرت عبداللہ بن عمر ابتداء میں مال معاف نہ کرتے تاکہ غلام کے ادا کیگی سے عاجز آنے کی صورت میں صدقہ کیا ہو مال واپس نہ آجائے اور جتنا چاہئے آخر میں معاف فرما دیتے (۱) میں کہتا ہوں ابتداء کی تفسیر ساقط کرنے اور کم کرنے سے کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ ابتداء تملیک (مالک بنانے) پر دلالت کرتا ہے اور ساقط کرنے میں تملیک نہیں ہے۔ اسی وجہ سے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں آپ کا پر کوئی چیز ساقط کرنا واجب نہیں ہے وہ انہیں بیع کا اعتبار کرتے ہیں کیونکہ یہ بھی عقد معاوضت ہے اور تمام معاوضات میں ساقط کرنا واجب نہیں ہے۔ اسی طرح عقد کتابت میں بھی ساقط کرنا واجب نہیں ہوگا۔ کتابت غلام پر مال کتابت کے وجوب کا سبب ہے۔ پس یہ جائز نہیں ہے کہ جو چیز واجب کا سبب ہے بعینہ وہی چیز ساقط کرنے کے استحقاق کا بھی سبب ہو جو واجب کی ضد ہے جس طرح بیع ہے۔

میں کہتا ہوں بالا جماع بدل کتابت مقدر نہیں ہے۔ اگر بدل کتابت سے کچھ ساقط کرنا آپ کا واجب ہو تو پھر مولیٰ کے لئے جائز ہوگا کہ وہ ہزار درہم پر مکاتب بنا دے جبکہ اس کا ارادہ سات سو درہم پر مکاتب بنانے کا ہو۔ اور پھر تین سو درہم ساقط کر دے اور اپنی ذمہ داری سے عہدہ برابرو جائے ایسا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

یہ مسلم نے ابوسفیان عن جابر بن عبداللہ کے سلسلہ سے نقل فرمایا ہے کہ عبداللہ بن ابی بن سلول اپنی لوطی کو کہتا کہ جاؤ اور ہمارے لئے اپنی بدکاری کے پیش سے کچھ کم کر لے آؤ۔ تو اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی ”کہتے مجبور کرو اپنی لوطیوں کو بدکاری پر (2)“ اسکا عطف وانکحو الا یامیٰ پر ہے نہی کا عطف امر پر ہے اور درمیان میں جملے مترخص ہیں۔

مسلم نے اسی سند سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن ابی کی دو لوطیاں تھیں ایک کا نام مسیک تھا اور دوسری کا نام امیرہ تھا وہ ان سے بدکاری کا پیشہ کرواتا تھا ان دونوں لوطیوں نے اپنی شکایت بارگاہ نبوت میں پیش کی تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ حاکم نے ابواثریر عن جابر کے سلسلہ سے نقل کیا ہے کہ مسیک کسی انصاری کی لوطی تھی اس نے بتایا کہ میرا مالک مجھے بدکاری پر مجبور کرتا ہے۔ اسوقت یہ آیت نازل ہوئی (3)۔

بزار اور طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن ابی کی ایک لوطی تھی جو زمانہ جاہلیت میں بدکاری کرتی تھی جب نہ حرام قرار دیا گیا تو اس لوطی نے کہا تم بخدا میں اب نہ مانیں کروں گی۔ اسوقت یہ آیت نازل ہوئی۔ بزار نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی طرح روایت کیا ہے اور اس لوطی کا نام معاذ تھا روایت کیا ہے۔ سعید بن منصور نے سفیان عن عمرو بن دینار عن مکرمہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن ابی کی دو لوطیاں مسیک اور معاذ تھیں وہ انہیں زنا پر مجبور کرتا تھا ان میں سے ایک نے کہا اگر یہ کوئی اچھا کام ہے تو میں اس سے زیادہ کمائی کروں گی اور اگر یہ اچھا کام نہیں ہے

تو مناسب ہے کہ میں اسے چھوڑ دوں اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں روایت ہے کہ ایک دن ایک لوٹری چادر لے آئی اور دوسری دینار لے آئی عبد اللہ بن ابی نے دونوں کو کہا کہ لوٹ جاؤ اور زنا کرو دونوں نے کہا قسم بخدا ہم ایسا نہیں کریں گی اسلام آچکا ہے اور زنا حرام ہو چکا ہے۔ وہ دونوں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئیں اور اپنی شکایت عرض کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت یہ آیت نازل فرمائی (1) ثعلبی نے مقاتل کی حدیث لکھی ہے کہ عبد اللہ بن ابی کی چھ لوٹریاں تھیں اس کے متعلق لانا نکرہ ہوا فَصَبَّأَتْكُمْ عَلَيَّ الْبَغَاءُ کا ارشاد نازل ہوا۔

۱۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ شرط مجبور کرنے کے لئے قید نہیں ہے کیونکہ اس کے بغیر اکراہ (مجبور کرنا) پایا ہی نہیں جاتا۔ اگر نبی کے لئے اس کو شرط بنایا جائے تو اس کے عدم سے اکراہ کا جواز لازم نہیں آتا اس لئے کہ منہی عنہ کے ارتقا سے نبی کا ارتقا جائز ہے (2)۔ یعنی پاکدامن رہنے کے ارادہ کے ساتھ پائے جانے کے وقت اکراہ متمنع ہوگا بلکہ خوشی سے زنا متحقق ہوگا۔ میں کہتا ہوں ان یہاں اذ کے معنی میں ہے اور یہ ظرف ہے شرط نہیں ہے۔ اور کلام اس طرح سب نزول کی مطابقت کی وجہ سے خارج ہو گئی اور اذ کی جگہ ان اس لئے ذکر کیا گیا ہے تاکہ اس بات پر دلالت کرے کہ لوٹریوں سے پاکدامن رہنے کا ارادہ شاذ و نادر ہے اس قید میں مالکوں کو توبیح کی گئی ہے اور انکو لوٹریوں کو بدکاری پر مجبور کرنے پر عائد لائی گئی ہے اور اس بات پر انہیں تنبیہ کی گئی ہے کہ لوٹری اپنی کم عقلی، کوتاہ اندیشی اور غلبہ شہوت کے باوجود جب پاکدامن رہنے کا ارادہ کرتی ہیں تو اسے سردار و اتم فیور مردہ ہوتی ہے اس بدکاری سے بچنے کے زیادہ حق دار ہو۔ حسین اور فضیل فرماتے ہیں اس آیت میں تقدیم و تاخیر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے وَانْكَبَحُوا اِلَّا يَأْمُرُ مِنْكُمْ اِنْ اَرَدْتُمْ تَحْضَنًا وَلَا تَكْفُرْ هُوَا فَصَبَّأَتْكُمْ عَلَيَّ الْبَغَاءُ (3)۔

۲۔ عرض الحیة الدنیا سے مراد لوٹریوں کی کمائی اور ان کی اولاد کی بیع ہے۔

۳۔ مالک اگر انہیں بدکاری پر مجبور کریں گے تو گناہ کا بوجھ مجبور کرنے والے پر ہوگا لوٹریوں پر اس گناہ کی کوئی پکڑ نہ ہوگی۔ یہ معنی اس لئے کیا ہے کیونکہ حسن اس آیت کو پڑھتے تو کہتے لَهُنَّ وَاللَّهِ لَهُنَّ وَاللَّهِ۔ اور ابن مسعود کے صحیف میں اس طرح ہے۔ مِنْ بَعْدِ اِخْرَاجِهِنَّ لَهُنَّ غَفُورٌ رَحِيمٌ۔ (یہ قراتیں دلیل ہیں کہ اکراہ کی صورت میں لوٹریوں پر کوئی گناہ نہیں ہوگا) یہ قراءت عبد بن حمید اور ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر عن ابن مسعود کے سلسلہ سے نقل کی ہے۔ اس تاویل کے مطابق من بیکوھن کا قول مبتداء ہوگا اور اس کی خبر محذوف ہوگی کیونکہ بعد والا جملہ خبر بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا کیونکہ انہیں مبتداء کی طرف لوٹنے والی ضمیر نہیں ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی وَمَنْ يَكْفُرْ هُنَّ (فعلیہ و زہن) فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْ بَعْدِ اِخْرَاجِهِنَّ لَهُنَّ غَفُورٌ رَحِيمٌ۔ اگر آیت کی تاویل اس طرح ہو فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْ بَعْدِ اِخْرَاجِهِنَّ غَفُورٌ رَحِيمٌ لَهُنَّ۔ (اگر مجبور کرنے کے بعد جو شخص توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے) تو پھر یہ بعد والا جملہ من بیکوھن کی خبر بن سکتا ہے۔ لیکن یہ بعید ہے کیونکہ جس شخص نے اکراہ کا فعل کیا اس کو توبیح کرنے کے لئے یہ کلام ذکر کی گئی ہے اور ایسی جگہ میں مغفرت و رحمت کا وعدہ مناسب نہیں ہے۔ یہ تاویل درست ہی نہیں کیونکہ آیت کا نزول عبد اللہ بن ابی منافق کے بارے میں ہوا جس کے متعلق ارشاد ہے اِنَّ سَعْدَ بْنَ عَفْرَةَ لَهُنَّ سَبْعُونَ مَرَّةً قَاتِنٌ يَّعْبُرُ اللّٰهَ لَهُنَّ * ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهٖ * وَاِنَّ اللّٰهَ لَاصْبِرُ لِحَيْثُ مَا تَقَوُّوا الْمُفْرِقِيْنَ۔ (کیساں ہے ان کے لئے آپ طلب مغفرت

2- تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شباب، جلد 7، صفحہ 49-50 (اعلیٰ)

1- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 201 (الفر)

3- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 201 (الفر)

کریں ان کے لئے یا طلب مغفرت نہ کریں ان کیلئے اللہ تعالیٰ ہرگز نہ بخشے گا انہیں بے شک اللہ تعالیٰ فاسقوں کی راہبری نہیں کرتا)۔ اگر یہ کہا جائے کہ مجبور لوگوں کی جب گناہ گار نہیں ہے تو مغفرت کو ذکر کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ میں کہتا ہوں اگر اہل عقل اور ذمہ داری کے پائے جانے کی وجہ سے فعل کی ادائیگی کی اہلیت کے منافی نہیں ہے اور اگر کسی حال میں بھی خطاب کے ستورا کا مو جب نہیں ہے، کیونکہ مجبور شخص مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے اور اتنا خطاب کو ثابت کرتا ہے۔ اسی وجہ سے مجبور شخص پر کسی نفس کو قتل کرنا حرام ہے اور قتل کرنے کی صورت میں امام زفر کے نزدیک قاتل مجبور پر قصاص واجب ہوگا۔ لیکن امام ابو حنیفہ کا فتویٰ اس کے خلاف ہے۔ مجبوری کی صورت میں کئی مقامات پر اللہ تعالیٰ نے رخصت بھی دی ہے اور گناہ بھی نہیں لکھا جاتا مثلاً دل جب ایمان سے مطمئن ہو تو مجبوری کی حالت میں زبان پر کلمہ کفر جاری کرنا جائز ہے۔ نماز کا فاسد کرنا۔ روزہ توڑنا، احرام کھول دینا کسی کمال تلف کرنا وغیرہ بھی مجبوری کی حالت میں جائز ہے جبکہ اگر اہل کمال ہو گناہ کو اٹھائیں اور رخصت دینا کئی مقامات پر رحمت و مغفرت کے آثار ہیں کیا آپ نے یہ ارشاد نہیں سنا فَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ بَانَ وَلَا حَالُ وَلَا قُوَّةَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ۔ انہیں بھی گناہ کی نفی کے ساتھ ہی مغفرت و رحمت کا ذکر فرمایا ہے۔ یہ بھی جواب ہو سکتا ہے کہ گناہ کے رفع سے ارادہ گناہ ہو جو اگر اہل کمال میں تھا جس کی وجہ سے انسان مجبور ہوا۔ اور اگر یہ ہے کہ جس سے مجبور شخص ڈرتا ہے کہ نفس ضائع ہو جائے گا یا کوئی عضو ضائع ہو جائے گا جبکہ وہ ایسے شخص کی طرف سے ہو جو یہ اقدامات کرنے پر قادر بھی ہو۔ یہاں کلام عبد اللہ بن ابی کے اپنی لوندیوں کو مجبور کرنے میں ہے اور ظاہر ہے کہ وہ مجبور نہیں تھا اس لئے اس کا گناہ مرتفع نہیں ہوا۔ واللہ اعلم۔

وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ آيَاتٍ مُّبِينَاتٍ وَ مَثَلًا مِّنَ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُمْ وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ﴿٦١﴾

”اور ہم نے تمہاری طرف روشن آیتیں نیز (ہم نے آج سے ہیں) بعض حالات ان لوگوں کے جو گزر چکے ہیں تم سے پہلے نیز (تاری ہے) نصیحت پر بیہزاروں کے لئے۔“

یہ محذوف قسم کا جواب ہے، یعنی اے محمد ﷺ ہم نے اس سورت میں تمہاری طرف واضح آیتیں نازل کی ہیں۔ ابن عامر مفسر حمزہ اور کسائی نے مصیبت کو اسم فاعل کے صیغہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی ایسی آیات جو احکام اور حدود کو بیان کرنے والی ہیں یا یہ بین سے مشتق ہے جو تبیین کے معنی میں ہے، یعنی واضح آیات جن کی پہلی کتب اور عقول سلیقہ تصدیق کرتی ہیں۔ باقی قرآن نے اسم مفعول کے صیغہ کے ساتھ الفتح پڑھا ہے، یعنی ایسی آیات جو اس سورت میں بیان کی گئی ہیں اور ان میں احکام اور حدود واضح ہیں۔ انہیں ایک عجیب و غریب واقعہ بیان کیا گیا ہے جو پہلے لوگوں کے واقعات کی مثل ہے، یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا واقعہ یوسف علیہ السلام اور مریم علیہا السلام کے واقعہ کی طرح ہے یا یہ معنی اسے میرے نبی کی زوجہ محترمہ عائشہ غنیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر تہمت لگانے والو! تمہاری حالت پہلے لوگوں کی حالت کے مشابہ ہے اس لئے تمہیں بھی اسی انجام سے دوچار ہونا ہوگا جن سے پہلے کذاب و مفسر کی لوگ ہوئے۔ ان آیات میں متقین کو نصیحت کی گئی ہے۔ متقین کی تخصیص اس لئے فرمائی کیونکہ وہی خوش نصیب اور سعادت مند ہی آیات نبیات سے نفع حاصل کرتے ہیں۔

اللَّهُ نُورٌ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ مَثَلُ نُورِهِ كَمِثْلِ نَوَارٍ ۖ كَمِثْلِ شَجَرَةٍ مُّبَارَكَةٍ زَيْتُونَةٍ لَا زُجَاجَةٍ ۗ الزُّجَاجَةُ كَانَتْهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُوقَدُ مِن شَجَرَةٍ مُّبَارَكَةٍ زَيْتُونَةٍ لَا

سَمَاءٍ وَلَا عَرِيشٍ يُكَادُ زِينَتُهَا يَبْصُرُهَا عَيْنٌ وَيَكُونُ مَعَهَا نُورٌ مُنِيرٌ يُبْصِرُهَا
اللَّهُ لِيُؤْتِيَ مِنْ نِيسَاءِ الْوَيْصُوبِ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٥١﴾

”اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا۔ اس کے نور کی مثال ایسی ہے جس جیسے ایک طاق ہو جس میں چراغ ہو جسے وہ چراغ شیشہ کے (ایک فانوس) میں ہو وہ فانوس گویا ایک ستارہ ہے جو موتی کی طرح چمک رہا ہے۔ یہ جو روشن کیا گیا ہے برکت والے زیتون کے درخت سے ہے۔ جو نہ شرقی ہے نہ مغربی ہے بلکہ قریب ہے اسکا تیل روشن ہو جائے اگر چہ اسے آگ نہ چھوئے۔ (یہ) نور ہی نور ہے۔ پہنچا دیتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے نور کی طرف جس کو چاہتا ہے اور بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ طرح طرح کی مثالیں لوگوں (کی ہدایت) کے لئے اور اللہ ہر چیز کو خوب جانتے والا ہے۔“

۱۔ نور اس کیفیت کو کہتے ہیں جسے پہلے آنکھ حاصل کرتی ہے پھر اس کیفیت کے واسطے سے آنکھ تمام دیکھی جانے والی اشیاء کا ادراک کرتی ہے جس طرح چاند اور سورج سے نکلنے والی شعاعیں اجسام کثیفہ پر پڑتی ہیں جو ان کے سامنے اور مقابل ہوتے ہیں۔ (چونکہ اجسام کا حدوث کیفیات اور اعراض جو اجسام کے ساتھ قائم ہوتی ہیں ان کے حدوث کو مستلزم ہے) اسلئے اس کیفیت کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر کرنا صحیح نہیں ہے۔ پس یہ ارشاد اپنے ظاہر پر نہیں ہے کہ ادراک کی دلیل یہ بھی ہے کہ شمس نورہ میں ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے اور اس کی طرف نور کی اضافت ہے جو اس بات کا متعین ہے کہ اس کی ذات نور نہیں ہے بلکہ نور ذات سے مغایر ہے۔ پس علماء نے اللہ کی ذات پر نور کے اطلاق میں کئی وجوہ بیان فرمائی ہیں یا تو نور سے پہلے مضاف مقدر ہے (یعنی صاحب انور کے معنی میں ہے) یا مبالغہ پیدا کرنے کے لئے مصدر کے ساتھ صحت بیان کی گئی ہے، یعنی وہ ہر پوشیدہ چیز کو روشن و ظاہر کرنے والا ہے کیونکہ وہ سراپا نور ہے جیسے کہا جاتا ہے زید حکوم یعنی زید کو حکوم یا کریم۔ زید کریم کرنے والا ہے یا انتہائی کریم ہے گویا سراپا کریم ہے۔ یا مصدر یعنی اسم قائل ہے۔ یعنی آسمان کو سورج چاند ستاروں سے منور کرنے والا ہے۔ شحاک نے یہی معنی بیان کیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں زمین کو نباتات اور اشجار سے منور کرنے والا ہے بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام انوار اسی سے ہیں عرب کہتے ہیں فَلَمَّ فَلَاحٌ وَحَمَةُ اَنَى مِنْهُ رَحْمَةٌ۔ کبھی کبھی یہ لفظ بطور مدح ذکر کیا جاتا ہے۔ مثلاً کوئی کہتا ہے سَأَزْغِيكَ اللَّهُ مِنْ مَرْوٍ لَيْلَةً فَقَدْ سَأَزَّ مِنْهَا نَوْرُهَا وَجَمَالُهَا۔

ایک رات عبد اللہ مرو سے چلا تو مرو سے اس کا نور و جمال بھی چلا گیا۔

بعض نے اس کا معنی مدبر کیا ہے قوم کا مدبر نہیں جو قوم کے امور کے متعلق سوچ بچار کرتا ہے اسے نور القوم کہتے ہیں۔ کیونکہ قوم اس کی راہنمائی میں اپنے امور طے کرتی ہے۔ بعض نے نور کا معنی موجد (پیدا کرنے والا) کیا ہے کیونکہ نور وہ ہوتا ہے جو خود ظاہر ہوتا ہے جیسا کہ خفاء کی اصل عدم ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے موجود ہے اور ہر چیز کو ایسا فرماتے والا ہے۔ یا نور سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے یا آسمان اور زمین والوں کا نور ہے۔ (یعنی آنکھ کے ذریعے اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کے ادراک کا سبب ہے اور اس کے ذریعے آسمانوں اور زمین والے اشیاء کا ادراک کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے قوت باصرہ پر بھی نور کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ وہ بھی ادراک کا سبب ہے اور ادراک کے قوت باصرہ پر موقوف ہونے کی وجہ سے قوت باصرہ نور کے ساتھ شریک ہے۔ پھر نور کا اطلاق بصیرت پر بھی ہوتا ہے کیونکہ بصیرت کا ادراک قوت باصرہ سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ بصیرت اپنا ادراک کرتی ہے اور اس کے علاوہ موجود و معدوم کیفیات و جزئیات کا ادراک بھی کرتی ہے اور موجودات و معدومات کے بواطن میں غور و خوض بھی کرتی ہے۔

تیز تکبیر و تحمیل کے ذریعے ان میں تصرف بھی کرتی ہے۔ (یعنی بصیرت جس کو فصل کے ساتھ ملاتی ہے، پس ان کے ملاپ سے طبیعت نوہمہ مرکبہ پیدا کرتی ہے۔ پھر اس طبیعت واحدہ و متومہ کے مقومات کو جنس کی طرف اور عوارض لازمہ اور مفارقتہ کی طرف تحلیل کرتی ہے پھر ان مقومات کو جنس کی طرف، جنس الجنس کی طرف، فصل کی طرف اور فصل انفصل وغیرہ کی طرف تحلیل کرتی ہے) اور پھر یہ اور رکابت بذاتہا حاصل نہیں ہوتے ہیں ورنہ کبھی اس قوت سے جدا نہ ہوتے بلکہ یہ اس سبب سے ہوتے ہیں جن کا اللہ تعالیٰ ابتداءً ان اور اکرات پر فیضان فرماتا ہے۔ یا ملائکہ اور انبیاء کے ذریعے فیضان فرماتا ہے یہی وجہ ہے کہ انبیاء و ملائکہ کو بھی نور کہا جاتا ہے۔ اسی قول کے قریب قریب ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول ہے، جسے علامہ بغوی نے ذکر فرمایا ہے کہ ایک معنی حدادی اھلی السنونات والآزھض ہے، یعنی آسمانوں اور زمین والوں کا وہ ہادی ہے۔ پس اسی کے نور ہدایت سے حق کی طرف راہنمائی پاتے ہیں اور گمراہی کی حیرانی سے نجات پاتے ہیں (۱)۔ نور کی اضافت آسمانوں اور زمین کی طرف اس لئے فرمائی ہے تاکہ اس کے نور کے اتراق کی وسعت پر دلالت ہو جائے۔ یا اسلئے کہ آسمان اور زمین چونکہ انور حسیہ اور عقلیہ پر مشتمل ہیں اور اوراک بشری آسمان اور زمین پر متصور ہے اور انہی دو کے ساتھ متعلق ہے اس لئے ان کی طرف اس کی نسبت کی گئی ہے۔

یعنی اس بندہ مومن کے دل میں اللہ کے نور کی عجیب و غریب صفت ہے جو اس نور کے ذریعے ذات الہی اور صفات الہیہ کا اوراک کرتا ہے اور ان چیزوں کی تصدیق تک پہنچتا ہے جن کے اوراک تک بغیر کسی واسطہ کے دانشوروں کی عقلیں بھی نہیں پہنچ سکتیں اور وہ بندہ مومن جو حق کو باطل اور باطل کو باطل دیکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِّنْ سِوَاهُمْ** (وہ اپنے رب کی طرف سے دیئے ہوئے نور پر ہے) علامہ بغوی فرماتے ہیں، ابن مسعود اس آیت کو منفل نُورِہ فی قلب المؤمنین پڑھتے تھے۔ سعید بن جبیر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اس کا مفہوم اس طرح روایت فرماتے ہیں۔ **منفل نُورِہ الذی اعطی المؤمن** (یعنی اللہ تعالیٰ کے نور کی صفت جو اس نے مومن کو عطا فرمائی) بعض علماء فرماتے ہیں نورہ کی تفسیر کا جمع مومن ہے۔ ابی بن کعب منفل نُورِ قلب من آمن پڑھتے تھے۔ یعنی وہ بندہ جس کے سینے کو اللہ تعالیٰ نے ایمان اور قرآن سے مزین فرمایا۔ حسن اور زید بن اسلم فرماتے ہیں نور سے مراد قرآن ہے۔ سعید بن جبیر اور اخصاک فرماتے ہیں ہو محمد ﷺ کہ نور سے مراد محمد ﷺ ذات اطہر ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں نور سے مراد طاعت ہے۔ اطاعت الہیہ کو نور کہا گیا ہے اور ان النوار کو اپنی ذات کی طرف منسوب فرمایا ہے۔

اسے مشکوٰۃ دو بار میں چراغ رکھنے کی جگہ کو کہتے ہیں جو ایک طرف سے کھلی اور باقی اطراف سے بند ہوتی ہے۔ اگر دو یا رکاوہ مورخ آر پارہ تو اسے کوۃ کہتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ چشمی زبان کا لفظ ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں اس سے مراد قدیل ہے (۲) اور مصنف مقدر ہے مطلب یہ ہے کہ منفل نُورِہ کمنفل نُورِہ مشکوٰۃ، یعنی اللہ کے نور کی صفت تبدیل کے نور کی صفت کی طرح ہے۔

یعنی مصباح الصبح سے مشتق ہے اور اس سے مراد چراغ ہے۔ الصبح کا معنی الضوء ہے۔ الصبح بمعنی الفجر بھی استعمال ہوتا ہے۔ زجاجہ کا معنی شیشے کا فانوس ہے۔ زجاجہ فرماتے ہیں، یہاں زجاجہ کا ذکر اس لئے فرمایا کیونکہ فانوس میں روشنی زیادہ ہوجاتی ہے (۳)۔ یہ جملہ (المصباح فی زجاجۃ) مصباح کی صفت ہے اور ضمیر عائد کی جگہ اسم ظاہر رکھا گیا ہے پھر زجاجہ کی صفت الزجاجۃ کانہا ککو کب دری یوقدہ ہے۔ اس جملہ (الموجاجۃ کانہا الخ) میں بھی ضمیر عائد کی جگہ اسم ظاہر رکھا گیا ہے۔

ابو عمرو اور کسایی نے دری کو دال کے کسرہ مد اور تہزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسکا وزن فعیل ہے اور درء سے مشتق ہے۔ ابو بکر اور تہزہ

نے دال کے ضمہ اور مزہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ وزن شاذ ہے۔ اکثر علماء نحو فرماتے ہیں کہ کلام عرب میں فعلی (انضم فاء اور کسرہ عین) کا وزن نہیں پایا جاتا۔ ابو عبیدہ فرماتے ہیں اسکی اصل فعل ہے اور یہ درات سے مشتق ہے جیسے سیوح ہے۔ پھر عربوں نے ضموں کی کثرت کی تشکیل سمجھا تو بعض ضموں کو کسرہ کی طرف لوٹا دیا جیسے بتیا جو اصل میں بتیا يضم میں تھا اور عتوڈ سے مشتق تھا اس کے ضمہ کو کسرہ سے بدل دیتے ہیں۔ ان دونوں قراءتوں کے مطابق اس کا اشتقاق درہ سے ہوگا جس کا معنی دور کرنے ہے کیونکہ اسکی ضموں سے تاریکیاں اور ہوتی ہیں یا اس کی چمک کی وجہ سے روشنی ایک دوسرے سے ٹکراتی ہے اور ایک دوسرے کو دور کرتی ہے۔ یا آسمان سے اس کے ذریعے شیطانوں کو دور کیا جاتا ہے۔ ستارے کو شیطین کے دور کرنے کی حالت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ اس وقت اس کی روشنی زیادہ ہوتی ہے۔ بعض فرماتے ہیں یہ درء الکوکب سے مشتق ہے جب وہ دور ہوتا ہے اور اس وقت اس کی روشنی زیادہ ہوتی ہے۔ بعض فرماتے ہیں یہ طلح سے مشتق ہے جس کا معنی طلع (طلوع ہونا) ہے۔ عرب کہتے ہیں درء انعم ستارہ بلند ہوا۔ اسی طرح کہتے ہیں درء فلان علینا۔ (یعنی فلان ہمارے پاس ظاہر ہوا) مطلب یہ ہوگا کہ گویا وہ طلوع ہونے والا ستارہ ہے۔ دوسرے قراء نے دال کے ضمہ راء مشدہ اور یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ در سے منسوب ہے یعنی اپنی صفائی اور اپنے حسن کی وجہ سے موتی کی طرف منسوب ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ستارے کی روشنی موتی کی چمک سے زیادہ ہوتی ہے پھر اس کی موتی کی طرف نسبت کیوں کی گئی ہے؟ ہم کہتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ وہ ستارہ تمام سے زیادہ روشن اور خوبصورت ہے، جیسا کہ موتی تمام دوسرے موتیوں سے خوبصورت ہوتا ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ ککو کب دری' پانچ بڑے ستاروں میں سے ایک ستارہ ہے۔ وہ بڑے ستارے ہیں۔ رطل' مرغ' شترزی زہرہ اور عطار۔

میں کہتا ہوں شاید یہ ستارہ زہرہ ہے کیونکہ یہ دوسروں سے زیادہ روشن ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں ستارے سے تشبیہ دی ہے سورج اور چاند سے تشبیہ نہیں دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں کو گزرنے لگتا ہے جبکہ ستاروں کو گزرنے نہیں لگتا۔ میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ مصباح کو سورج کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے ارشاد ہے جعلنا الشمس مسراجاً۔ زجاجہ کو ستارے کے ساتھ تشبیہ دی تاکہ اس بات پر دلالت کرے کہ مصباح سے زجاجہ کا مرتبہ کم ہے۔ اگر کاتھا شمس فرمایا جاتا تو زجاجہ کی مصباح پر فضیلت لازم آتی اور یہ مقصود میں خلل کا باعث ہوتا۔

یہ یوقد مصباح کی دوسری خبر ہے یا وہ "فی زجاجہ" ظرف مشق میں ضمیر عائد سے حال ہے۔ ابن کثیر ابو عمر و ابو جعفر اور یعقوب نے تاہ فو قانیہ اور داؤد مفتوحہ اور قاف مشدہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی باب تفعیل سے ماضی کا صیغہ پڑھا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ چراغ روشن ہوا۔ عرب کہتے ہیں تو قادت النار ای انقادت۔ آگ روشن ہوئی۔ باقی قراء نے باب افعال سے مضارع مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ ابو بکر مزہ اور کسائی نے تا فو قانیہ کے ساتھ اس لئے پڑھا ہے کیونکہ ان کے نزدیک ضمیر کا مرجع مضاف کے حذف کے ساتھ اثر جاجہ ہے۔ تقدیر اس طرح ہے تو قد نار الزجاجہ۔ کیونکہ زجاجہ خود تو جلا یا نہیں جاتا۔ باقی قراء نے یاہ تختانیہ کے ساتھ پڑھا ہے اس لئے کہ ضمیر کا مرجع المصباح ہے۔ یعنی یوقد المصباح۔

یعنی شجرہ میں کن ابتدا سے یہ یا مضاف کے حذف کی بنا پر سمیت کیلئے ہے، یعنی من دهن شجرہ۔ پہلے شجرہ کو ضمیر ذکر فرمایا پھر ہمارے کے ساتھ وصف بیان فرمایا پھر بیونہ کے ساتھ اس کا بدل ذکر فرمایا یہ تمام انداز و اسلوب اس کی عظمت شان کے

اظہار کے لئے ہیں۔ کیونکہ وہ درخت بڑا بارک ت ہے اس میں بہت زیادہ منفعت ہے۔ زیتون کا تیل چراغ میں جلایا جاتا ہے جو انتہائی صاف ہوتا ہے اور تمام تیلوں سے اس کی روشنی زیادہ چمکدار ہوتی ہے زیتون کا تیل بطور مسان بھی استعمال ہوتا ہے۔ زیتون بطور پھل بھی کھایا جاتا ہے۔ اس کے تیل کو کھانے کے لئے کسی نچوڑنے اور تیل نکالنے والے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی بلکہ خود بخود نکلتا ہے۔ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ حدیث شریف میں ہے کہ یہ نامور کو درست کرتا ہے۔ یہ وہ درخت ہے جو ادر سے نیچے تک جلایا جاتا ہے (1)۔ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ اسید بن ثابت یا اسید الانصاری سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا زیت کھاؤ اور اس کا تیل لگاؤ کیونکہ یہ برکت والا درخت ہے (2)۔ امام ترمذی نے حضرت عمر سے یہ حدیث مرفوع روایت کی ہے۔ احمد ترمذی اور احکام نے ابواسید سے مرفوع روایت کی ہے۔ ابن ماجہ اور احکام نے اسے حضرت ابو ہریرہ سے مرفوع روایت کیا ہے کہ زیتون کھاؤ اور اس کا تیل لگاؤ کیونکہ یہ پاکیزہ اور مبارک (درخت) ہے۔ ابو یوسف نے الطب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس طرح روایت کی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا زیت کھاؤ اور اس کا تیل لگاؤ کیونکہ یہ ستر بیماریوں کی شفاء ہے جن میں سے ایک جذام بھی ہے (3)۔

یہ لا شریقیہ زیتونہ کی صفت ہے اور حرف نفی نئی کا فائدہ دینے کے لئے ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں نہ تو وہ ایسی جگہ پر ہے کہ ہمیشہ اسے سورج کی دھوپ لگتی رہتی ہو جو کہ اسے جلادیتی ہو اور نہ ایسی جگہ پر پوشیدہ ہے کہ ہمیشہ اس پر سورج کی دھوپ نہ پڑتی ہو کہ اس کا پھل پکارہ جاتا ہو۔ یہ معنی سدی اور چند دوسرے علماء نے بیان کیا ہے۔ بعض علماء نے یہ معنی بیان فرمایا ہے کہ نہ تو وہ آبادی کے مشرق میں ہے کہ صرف سورج کی دھوپ اس پر اس کے طلوع ہونے کے وقت پڑتی ہو۔ اور نہ آبادی کے مغرب میں ہے کہ صرف سورج کے غروب ہونے کے وقت اس پر دھوپ پڑتی ہو۔ بلکہ یہ چوٹی پر یا صحراء میں اگا ہوا ہے جس پر ہمیشہ سورج کی کرنیں پڑتی رہتی ہیں۔ اسی لئے اس کا پھل پکا ہوتا ہے اور اس کا تیل صاف و شفاف ہوتا ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں یہ عربوں کے اس قول کی طرح ہے فلائق لا بابئیس ولا بائیس یعنی نہ بالکل سفید ہے نہ بالکل سیاہ ہے لیکن انہیں دونوں رنگوں کی آمیزش ہے۔ اسی طرح کہتے ہیں ہذا الرؤمان لیسین بیحابیس ولا خلوی یعنی یہ انار نہ کھنا ہے نہ بیٹھا ہے بلکہ اس میں کھانے اور مٹھاس جمع ہیں۔ یہ ابن عباس کا قول ہے، جسے مکرّم نے روایت کیا ہے۔

کلبی اور اکثر مفسرین کا یہی قول ہے بعض علماء نے یہ معنی لکھا ہے، نہ تو یہ زمین کے مشرق میں ہے نہ مغرب میں ہے بلکہ زمین کے وسط یعنی شام میں ہے کیونکہ شام کا زیتون عمدہ ہوتا ہے۔ الحسن فرماتے ہیں یہ دنیا کے درختوں میں سے نہیں ہے اگر دنیا کے درختوں سے ہوتا تو شرقی یا غربی ہوتا۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کی مثال دینے کیلئے بیان فرمایا ہے (4) اس آخری قول کی بناء پر میں کہتا ہوں شاید جنت کے درختوں میں سے کوئی درخت مراد ہو اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کی مثال جنت کے زیتون کے نور کے ساتھ دی ہو۔

یہ یہ جملہ زیتونہ کی دوسری صفت ہے۔ اس کلام میں زیتون کے تیل کی صفائی اور سفیدی میں مبالغہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اور یگانہ کلام کلام کی صحیح کامو جب ہے۔

یعنی نور الہی کو جس نور کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے وہ نور ہی نور ہے کیونکہ چراغ کا نور کئی گنا بڑھ جاتا ہے جب تیل انتہائی نفیس ہو۔ نیز وہ چراغ بلوریں قندیل میں ہو۔ پھر وہ چراغ مخصوص چراغ دان میں رکھا ہوا۔

1- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 204 (الفکر)

2- ایضاً

4- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 205

3- کنز العمال، جلد 10، صفحہ 48 (مؤسسۃ الرسالۃ)

علامہ بنو ی فرماتے ہیں اہل علم کا اس مثال کے معنی بیان کرنے میں اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ تمثیل نور محمد ﷺ کے لئے بیان کی گئی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کعب الاحبار سے مثل نوودہ کھمشکوة کے ارشاد کے متعلق پوچھا تو حضرت کعب نے فرمایا یہ مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کے لئے بیان فرمائی ہے۔ مشکوٰۃ سے مراد نبی کریم ﷺ کا سینہ مبارک ہے اور زجاجہ سے مراد آپ ﷺ کا قلب منور ہے اور مصباح سے مراد نبوت ہے (۱) یعنی حضور نبی کریم ﷺ کا نور اور حضور ﷺ کی شان بلند خود بخود لوگوں پر عیاں تھی اگرچہ آپ اعلان نبوت نہ بھی فرماتے جیسا کہ وہ تیل اتار دین تھا کہ اگر اس کو آگ بھی نہ چھوئے تو وہ خود بخود روشن ہو جائے وہ نور ہی نور ہے۔ حضرت کعب نے کتنی پیاری بات کہی ہے۔ میں یہاں ایک فصل تحریر کرتا ہوں جس سے معلوم ہو جائے گا کہ حضور ﷺ کی شان رفیع اعلان نبوت سے پہلے بھی ظاہر تھی۔

اعلان نبوت سے پہلے ظاہر ہونے والے معجزات

خلاصۃ السیر میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کی والدہ ماجدہ نے فرمایا جب میرے بطن میں محمد ﷺ تھے تو میں نے خواب میں دیکھا کہ مجھ سے ایک نور خارج ہوا جس کی وجہ سے بصری کے کمالات روشن ہو گئے ہیں پھر جب محمد ﷺ میرے بطن سے باہر آئے تو آپ ہاتھ زمین پر رکھے ہوئے تھے اور آسمان کی طرف سر اٹھائے ہوئے تھے۔

حافظ ابن جریر نے لکھا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو آپ کی والدہ ماجدہ نے جنم دیا تو والدہ نے ایسا نور دیکھا جس سے شام کے کمالات روشن ہو گئے۔ فرماتے ہیں اس حدیث کو ابن حبان اور حاکم نے صحیح کہا ہے۔ ابو یوسف کی دلائل میں ہے کہ جب آپ ﷺ کی ولادت پاک ہوئی تو آپ کی والدہ فرماتی ہیں ایک فرشتہ نے آپ کو تین مرتبہ بانی غسل دیا پھر فرشتے نے سفید ریشم کی ایک تھیلی نکالی جس میں ایک مہر تھی پھر اسے آپ ﷺ کے کندھے پر لگا دیا وہ چھپے ہوئے سفیدانہ کی طرح تھی زہرہ ستارہ کی طرح چمکتی تھی۔ بیعتی ابن ابی الدنیا اور ابن اسکن نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ کی میلاؤ کی رات ایوان کسرہ پر لڑنے طاری ہو گیا اور اس کے چوہہ کنکرے گر گئے۔ کسری گھبرا گیا اور فارس کا آتش کدہ بجھ گیا جبکہ اس سے پہلے اسے ہزار سال گزر چکا تھا کبھی اس کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی تھی اور سادہ جمیل خشک ہو گئی (۲)۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث میں ہے کہ ایک یہودی مکہ میں رہتا تھا اور یہاں ہی تجارت کرتا تھا جس رات رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی تو اس یہودی نے کہا اے قریشیو! اس رات اس امت کا نبی پیدا ہوا ہے جس کے کندھوں کے درمیان علامت ہے اس علامت میں متوازی ہال ہیں گویا دو ٹھوڑے کی کٹنی کی طرح ہیں۔ قریش یہودی کو لے کر گئے تھے کہ آپ کی والدہ ماجدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس گئے اور کہا اپنے صاحبزادے کو باہر لے آؤ۔ آپ باہر لائیں تو انہوں نے آپ کی پیٹھ سے کپڑا ہٹا کر دیکھا جو نبی اس یہودی کی نظر اس مہر نبوت پر پڑی تو خشک کھا کر گر گیا۔ لوگوں نے کہا کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ اس یہودی نے کہا ذہبٹ واللہ المکبوثہ من نبیئہ (استر اہنیل)۔ قسم بخدا نبوت کا سلسلہ بنی اسرائیل سے نکل گیا ہے۔ اس روایت کو حاکم نے روایت کیا ہے (۳)۔

مواہب اللدنیہ میں عمیرا الراہب کا واقعہ لکھا ہے جو اہل مکہ کو کہا کرتا تھا اے اہل مکہ کہ میری ہی تمہارے خاندان میں ایک بچہ پیدا ہونے والا ہے عرب جس کی اطاعت کریں گے اور وہ عجم کا مالک ہوگا۔ یہی زمانہ اسکی آمد کا ہے جب آپ ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی تو

اس راہب نے عبد اللہ بن المطلب کو کہا وہ بچہ تمہارے خاندان میں پیدا ہو چکا ہے جس کے متعلق میں تم سے گفتگو کرتا رہتا تھا۔

عباس بن عبد المطلب فرماتے ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! مجھے آپ کے دین میں داخل کرنے والی چیز آپ کی نبوت کی نشانی ہے۔ میں نے آپ کو بچپن میں ہنگموڑے کے اندر دیکھا کہ چاند آپ کا دل بہلاتا تھا۔ آپ اس کی طرف اپنی انگلی کے ساتھ اشارہ کرتے تو وہ اسی طرف جھک جاتا تھا جہرہ آپ اشارہ فرماتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں چاند سے باتیں کرتا تھا اور وہ مجھ سے باتیں کرتا تھا اور مجھ رونے سے چپ کرنا تھا۔ اور میں چاند کی آواز سنتا تھا جب وہ عرش کے نیچے اپنے رب کے حضور سجدہ کرتا تھا۔ آپ ﷺ کے خصائص میں یہ بھی شمار کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ کا جھولا فرشتے جھولاتے تھے۔ یہ بھی روایت ہے کہ آپ ﷺ پیداؤش کے وقت بولے تھے۔ ابویعلیٰ اور ابن حبان نے عبد اللہ بن جعفر سے انہوں نے حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ آپ فرماتی ہیں جب میں نے آپ ﷺ کو دودھ پلانے کے لئے اپنی گود میں رکھا تو آپ ﷺ نے سیر ہو کر دودھ پیا اور آپ کے بھائی ضمیر نے بھی آپ کے ساتھ دودھ پیا اور سو گئے (۱)۔ جبکہ اس سے پہلے ضمیر موتا نہیں تھا کیونکہ میری چھاتی میں اتنا دودھ ہی نہ ہوتا تھا کہ وہ سیر ہو کر پیتا اور نہ ہماری اونٹنی کا اتنا دودھ ہوتا کہ وہ ان کی مکمل غذا بنتا لیکن اس روز جب میرے خاندان نے اسی اونٹنی کو دیکھا تو اس کی کھیری دودھ سے بھری ہوئی تھی۔ وہ اسے دودھ کرنا دودھ لائے کہ انہوں نے خود بھی پیا اور میں نے بھی پیا حتیٰ کہ ہم سیر ہو گئے اور بڑے سکون سے ہم نے رات گزاری۔ جب ہم آپ ﷺ کو لے کر واپس پلٹے تو میں اپنی گدھی پر سوار ہوئی اور آپ ﷺ کو بھی سوار کیا تم بچہ! اس نے اس طرح تیزی سے سفر طے کیا کہ سرخ اونٹ بھی اتنی تیزی سے چلنے کی قدرت نہ رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ میرے ساتھ آنے والی عورتوں نے مجھے لکھائے کہ ابی ذؤیب کی بیٹی ہمیں ساتھ لے کر چلیے کیا یہ وہی گدھی نہیں ہے جس پر تو سوار ہو کر آئی تھی؟ میں کہتی، ہے تو بالکل وہی گدھی جو آتے ہوئے بڑی آہستہ چلتی تھی حتیٰ کہ اس کے لئے قافلہ گزرا پڑتا تھا۔ اور قافلہ والوں پر اس کی کمزوری اور لاخبری پریشانی کا باعث تھی۔

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی تھیں کہ جب اس نے آپ ﷺ کا دودھ چھرایا تو سب سے پہلے آپ ﷺ نے زبان سے یہ کلمہ بولا اللہ اکبیر اکبیر اَو الْحَمْدُ لِلَّهِ عَظِيمًا وَ سُبْحَانَ اللَّهِ بَكْرَةً وَ اَصْبَلًا۔ پھر جب آپ کو بھ بڑے ہوئے اور چلنے پھرنے لگے تو آپ گھر سے باہر نکلے بچوں کو کھیلتا ہوا دیکھتے لیکن آپ ﷺ ان سے الگ تھلک بیٹھتے تھے (۲)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں حضرت حلیمہ سعدیہ آپ ﷺ کو کہیں دور نہ جانے دیتیں تھیں۔ ایک دفعہ آپ ﷺ اپنے رضاعی بہن شیماء کے ساتھ گرمی کے وقت میں اونٹوں کی طرف باہر نکل گئے حضرت حلیمہ نے کہا اس گرمی میں باہر پھر رہے ہو آپ کی رضاعی بہن شیماء نے کہا ای جان! میرے بھائی کو گرمی دھوپ بالکل نہیں لگی میں نے دیکھا کہ آپ پر ایک بادل سایہ کئے ہوئے ہے آپ ٹھہرتے تو وہ بادل بھی ٹھہر جاتا آپ چلنے تو وہ بھی چل پڑتا۔

شمالی نجد میں ہے کہ حضرت حلیمہ سعدیہ فرماتی ہیں ہم جب کبھی کسی کمرے میں اندھیرا محسوس کرتے اور چراغ کی ضرورت سمجھتے تو ہم آپ کو وہاں لے جاتے کیونکہ آپ کے چہرہ انور کا نور اور روشنی چراغ کی روشنی سے زیادہ تھی جس دن سے آپ ہمارے گھر تشریف لائے ہیں ہمیں چراغ کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ آپ جس جگہ تشریف لاتے وہ جگہ آپ کی برکت سے منور ہو جاتی۔

حضرت حلیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جب آپ کو لے کر بت مکہ میں گئی تو اہل (بت) نے اپنا سر جھکا دیا۔ ای طرح تمام دوسرے بتوں نے

آپ کی تعظیم میں سر جھکا دیئے۔ علیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ ﷺ کو حجر اسود کے پاس لے گئی تاکہ آپ اسے بوسہ دیں تو حجر اسود اپنی جگہ سے نکلا اور آپ ﷺ کے چہرہ القدس کے قریب ہو گیا۔ (تاکہ آپ بآسانی بوسہ دے لیں)

روایت ہے کہ جب حضرت علیمہ سعید نے آپ کو اپنی چھاتی کا دودھ پلایا تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی چھاتی میں اتنا دودھ زیادہ ہو گیا کہ آپ ﷺ کے ساتھ دس یا اس سے زائد بچوں کو دودھ پلانی تھیں۔ حضرت علیمہ جب آپ ﷺ کو کسی خشک وادی میں لے جاتیں تو وہ وادی اس وقت سرسبز و شاداب ہو جاتی۔

حضرت علیمہ ان درختوں کی آواز سنی تھیں جو آپ ﷺ پر سلام پڑھتے تھے درخت اپنی ٹہنیوں سمیت آپ پر جھک جاتے تھے اور اطہار محبت کرتے تھے۔ آپ ﷺ اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ بکریاں چراتے تھے آپ کا بھائی کہتا کہ میرا حجازی بھائی جب کسی وادی میں قدم رکھتا ہے تو وہ وادی اس وقت سرسبز ہو جاتی ہے جب کسی کنویں پر قدم رنج فرماتا ہے تاکہ بکریوں کو پانی پلا میں تو پانی خود بخود کنویں کے منہ پر آ جاتا۔ جب آپ ﷺ دھوپ میں کھڑے ہوتے تو بادل ان پر سایہ لگن ہو جاتا۔ آپ کھڑے ہوتے تو وحشی آپ کے پاس آتے اور آپ کے جسم اطہر کو چومتے تھے۔ خلاصہ اسیر میں ہے کہ آپ کی رضاعی والدہ حضرت علیمہ فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ جب ہمارے پاس آؤں تو میں تھے کہ آپ کا رضاعی بھائی دوڑتا ہوا آیا اور بتایا کہ میرے قریبی بھائی کو دو آدمیوں نے بکڑا جنہوں نے سفید لباس پہنا ہوا تھا اور اسے زمین پر لٹا دیا اور ان کا پیٹ شق کر دیا ہے۔ حضرت علیمہ فرماتی ہیں ہم فوراً وہاں پہنچے تو آپ ﷺ چہرہ ڈھانپ کر کھڑے ہوئے تھے ہم آپ کے ساتھ چٹ گئے اور پوچھا جینا کیا ہوا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ سفید کپڑوں میں لمبوں دو آدمی میرے پاس آئے انہوں نے مجھے لٹا پھر میرے پیٹ کو چاک کیا اور میرے اندر سے کوئی چیز تلاش کی مجھے معلوم نہیں ہوا کہ وہ کیا تھی؟ ابو یعلیٰ ابو نعیم اور ابن عساکر نے شداد بن اوس کی روایت میں اس طرح نقل کیا ہے کہ تین آدمی تھے ان کے ساتھ ایک سونے کا قتل تھا جو برف سے بھرا ہوا تھا ان میں سے ایک نے مجھے زمین پر لٹا دیا پھر پیٹ سے ہر چیز کو باہر نکالا پھر اسے اس برف سے دھویا اور خوب دھویا پھر میرے پیٹ کی ہر چیز کو باہر نکالا پھر اسے اس برف سے دھویا اور خوب دھویا پھر میرے پیٹ کی ہر چیز کو اپنی جگہ رکھ دیا۔ پھر دوسرا شخص اٹھا اس نے میرا دل باہر نکالا یہ سب کچھ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا پھر اس شخص نے میرے دل کو چیرا اور اس سے ایک سیاہ توخرا نکال کر باہر پھینک دیا پھر اس نے دائیں اور بائیں طرف سے اپنے ہاتھ سے کوئی چیز پکڑی تو میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں نور کی ایک مہر ہے۔ اسے دیکھ کر دیکھنے والا حیران رہ جاتا ہے پھر اس شخص نے میرے دل پر وہ مہر نکالی جس سے میرا دل نور سے بھر گیا یہ حقیقت میں نبوت اور حکمت کا نور تھا پھر اس نے میرے دل کو اپنی جگہ رکھ دیا میں اس مہر کی ٹھنڈک اپنے دل میں ہمیشہ محسوس کرتا ہوں پھر تیسرے شخص نے اپنے ساتھی سے کہا تم ہت جاؤ پھر اس نے اپنا ہاتھ میرے سینے سے ناف تک پھیرا امتحان تھا سب مل گیا۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ہے فرماتے ہیں میں آپ ﷺ کے سینہ اطہر میں سوئی کے نشان دیکھتا تھا۔

ابن عساکر نے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ کا بھی بچپن تھا کہ علاقہ میں قحط پڑ گیا حضرت ابوطالب آپ ﷺ کو ساتھ لے کر حرم میں تشریف لائے اور آپ ﷺ کو کعبہ کے ساتھ بٹھا دیا۔ آپ ﷺ کی طرف اپنی انگلی سے اشارہ کیا اور دعا مانگی اس وقت آسمان پر کوئی بادل نہیں تھا دعا مانگنے کی دہشتی کہ بادل ادھر ادھر سے ہجوم کر آئے اور موسلا دھار بارش برسی یہاں تک کہ وادیاں بیٹے لگیں۔ اس وقت ابو غالب نے یہ شعر کہا۔

وَالْيَسْرُ يُسْتَسْفَى الْغَمَامُ بِوَجْهِهِ يَمَانُ الْيَمَانِي عَضْمَةُ لَبْلَزَامِلِ

وہ سفید من بھائی رنگت والا جس کے رونے تاہاں کے صدقے بادل کی آرزو کی جاتی ہے وہ تھیلوں کا موٹی ہے اور بیوہاں کا بالٹا ہے۔
 خلاصہ اسیر میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ بارہ سال کی عمر کو پہنچے تو اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ شام کی طرف تشریف لے گئے جب
 بصری پہنچے تو بحیرہ راہب نے آپ ﷺ کو دیکھا تھا تو آپ کو سلامات کی وجہ سے پہچان گیا گو وہ آپ ﷺ کے پاس آیا اور آپ ﷺ
 کا ہاتھ پکڑ کر کہا ہذا رَسُولُ رَبِّ الْعَالَمِينَ يَبْتَغِيهِ اللَّهُ رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ۔ یہ رب العالمین کے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ انہیں تمام
 جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بعوث فرمائے گا۔ بحیرہ سے کسی نے پوچھا تھے اس کا کیسے علم ہوا؟ بحیرہ نے کہا تم جب گھائی سے آ رہے تھے
 تو ہر شجر و حجر جھک کر سلامی پیش کر رہا تھا اور شجر و حجر صرف نبی کی ذات کے سامنے جھکتے ہیں اور ہم نے اپنی کتب میں آپ کا تذکرہ پڑھا
 ہے۔ بحیرہ نے حضرت ابوطالب کو کہا کہ اگر آپ انہیں شام لے گئے تو یہود انہیں قتل کر دیں گے پس ابوطالب نے اسی خوف کی وجہ سے
 آپ ﷺ کو واپس بھیج دیا۔ پھر وہ بارہ آپ ﷺ نے شام کا سفر فرمایا جبکہ آپ ﷺ کی عمر مبارک پچیس سال تھی اور اس وقت آپ
 کے رفیق سفر حضرت خدیجہ کا غلام میسرہ تھا اور اس سفر کا مقصد تجارت تھا۔ یہ سفر حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح سے پہلے فرمایا
 تھا جب آپ شام میں پہنچے تو راہب کے گرجا کے قریب ایک درخت کے نیچے نزول فرمایا راہب نے میسرہ سے پوچھا یہ شخص کون ہے؟
 میسرہ نے کہا یہ حرم قریشی ہے۔ راہب نے کہا اس درخت کے نیچے صرف نبی نے ہی نزول فرمایا ہے بعض روایات میں ہے کہ راہب نبی
 کریم ﷺ کے قریب آیا اور کہا وَاَنَا أَشْهَدُ أَنَّكَ الَّذِي ذَكَرَهُ اللَّهُ فِي الْقُرْآنِ فِي مِثْرٍ مِّنْهُ دِيْنَا بِيْنَ كِتَابِ وَهِيَ خُصِيْتِ بِيْنَ
 جَنِّ كَاذِبٍ وَاللَّهُ تَعَالَى نَعُوذُ بِكَ مِنْ هَذَا النَّارِ مِمَّنْ يَنْزِلُ فِيهَا مِنْ بَنِي آدَمَ عَادَ وَنَادَى فِيهَا نَادَى وَنَادَى فِيهَا نَادَى
 كَرَأْبِ اللَّهِ كَرَسُولِ بِيْنَ نَبِيٍّ أَمْ يَمَانِي بِيْنَ عَرَبِيٍّ بِيْنَ مَكِّيٍّ بِيْنَ حَوْضِ كَيْ مَالِكِ بِيْنَ۔ صاحب شفاعت ہیں اور لوہاء حمد والے
 ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ میسرہ نے بتایا کہ جب سخت دھوپ ہوتی اور کڑا کے کی گرمی ہوتی تو فرشتے اترتے جو آپ پر سایہ کرتے اور آپ
 کو گرمی سے بچاتے جبکہ آپ اونٹ پر سوار ہوتے تھے۔ جب حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے میسرہ سے سے آپ ﷺ کی
 صفات و خصائل کے متعلق سنا تو آپ کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ آپ ﷺ ان سے نکاح فرمائیں۔

فائدہ: راہب کے قول "اس درخت کے نیچے نبی ہی اترتے" کی توجیہ کرتے ہوئے اسماعیل نے لکھا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس
 وقت اس درخت کے نیچے صرف نبی نے ہی قیام فرمایا ہے۔ علامہ اسماعیلی نے یہ توجیہ اس لئے فرمائی ہے کیونکہ انبیاء کرام کا زمانہ بہت
 پہلے کا ہے اور اتنی مدت ایک درخت کا باقی رہنا بہت بعید ہے اور اتنی مدت درخت کا راستہ پر موجود ہونا اور اسکے نیچے کسی دوسرے کا قیام
 نہ کرنا یہ بھی بہت مستبعد ہے لیکن خبر میں قطعاً لفظ اس توجیہ کے منافی ہے۔ یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ معجزات خرق عادت
 ہوتے ہیں۔ پس ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بطور معجزہ اس درخت کو باقی رکھا ہو اور لوگوں کو خلاف عادت اس کے نیچے نزول کرنے سے
 روک رکھا ہو۔

اب پھر ہم آیت کریمہ کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں۔ سالم نے ابن عمر سے اس آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ ابن عمر نے فرمایا مشکوٰۃ
 سے مراد حج ﷺ کا جوہ (بلن) ہے اور زجاجہ سے مراد آپ کا قلب منور ہے اور مصباح سے مراد وہ نور ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے
 اندر ودیعت فرمایا ہے۔ لَا شَرْفِيْهِ وَلَا غُرْبِيْهِ مَا مَطْلَبُ يَهِيْ كَنْدُوهُ نَهْرَانِيْ هُوَ اُوْرْدَةُ يَهُودِيْ هُوَ شَجَرَةُ مَبَارِكٍ هُوَ مَرَادُ اَبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ

السلام ہیں۔ نور علی نور یعنی ابراہیم علیہ السلام کے قلب اطہر کا نور محمد ﷺ کے دل کے نور پر ہے (۱)۔

محمد بن کعب القرظی فرماتے ہیں مشکوٰۃ سے مراد ابراہیم علیہ السلام زجاجہ سے مراد اسماعیل علیہ السلام اور المصباح سے مراد محمد ﷺ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مصباح فرمایا جیسا کہ آپ کو سراج بھی فرمایا ہے و سراجاً منیراً شجرۃ مبارکہ سے مراد ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ آپ کو مبارک کی صفت سے اس لئے یا فرمایا کیونکہ اکثر انبیاء کرام آپ کی پشت سے ہیں۔ لا شَرْقِیَّةَ وَلَا غَرْبِیَّةَ یعنی ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی ہیں اور نہ نصرانی ہیں لیکن آپ ہر مذہب کو چھوڑ کر اسلام پر قائم رہنے والے ہیں کیونکہ یہود مغرب کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ نصاریٰ مشرق کی طرف منہ کرتے ہیں۔ یَکَادُ زَیْفُهَا یُضِیُّ وَ لَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارُ یَحْنٰی مُحَمَّدٌ ﷺ کے محاسن عالیہ آپ ﷺ پر وحی کے آغاز سے پہلے ہی لوگوں پر ظاہر تھے۔ نور علی نور یعنی آپ ﷺ نبی ہیں اور نبی کی نسل سے ہیں۔ محمد ﷺ کا نور ابراہیم علیہ السلام کے نور پر ہے (۲)۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ علوم و معارف جن سے اللہ تعالیٰ بندہ مومن کے دل کو منور فرماتا ہے ان کو مشکوٰۃ کے نور سے تشبیہ دی گئی ہے جس میں چراغ رکھا ہوا ہوتا ہے اس مضمون کی تائید حضرت ابی اور ابن مسعود کی قرأت کرتی ہے۔ ابو العالیہ حضرت ابی بن کعب سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا یہ بندہ مومن کی مثال ہے۔ مشکوٰۃ سے مراد اس کی ذات سے زجاجہ سے مراد اس کا سینہ ہے اور مصباح سے مراد ایمان و قرآن ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس بندہ مومن کے دل میں ثبت فرمایا ہے۔ شجرۃ مبارکہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے لئے اخلاص ہے پھر اس کی مثال اس درخت کی مانند ہے جو درختوں میں گھرا ہوا ہے اور جو سبز و شاداب ہے۔ سورج کے طلوع ہونے کے وقت نہ تو اسے دھوپ لگتی ہے اور نہ غروب ہونے کے وقت اس پر دھوپ پڑتی ہے۔ اسی طرح مومن غنٹوں سے محفوظ ہوتا ہے اور وہ چار خصلتوں کا حامل ہوتا ہے جب اسے نعمتوں کا حصول ہو تو شکر ادا کرتا ہے۔ جب کسی مصیبت میں گرفتار ہو تو صبر کرتا ہے جب فیصلہ کرتا ہے تو عدل کرتا ہے اور جب بولتا ہے تو سچ بولتا ہے۔ یَکَادُ زَیْفُهَا یُضِیُّ یعنی قریب ہے کہ بندہ مومن کا دل حق کے ظہور سے پہلے حق کو پہچان لے۔ کیونکہ وہ اس کے موافق ہوتا ہے نور علی نور ابی فرماتے ہیں بندہ مومن پانچ نوروں کے درمیان ہوتا ہے اس کی بات نور ہوتی ہے اس کا علم نور ہوتا ہے۔ وہ جہاں داخل ہوتا ہے وہ جگہ نور ہوتی ہے اور جہاں سے خارج ہوتا ہے وہ جگہ بھی نور ہوتی ہے اور قیامت کے روز اس کا لوٹنا بھی نور کی طرف ہوگا (۳)۔ ابن عباس فرماتے ہیں یہ اللہ کے نور کی مثال ہے جو بندہ مومن کے دل میں ہوتا ہے قریب ہے کہ بندہ مومن کا دل ہدایت پر عمل پیرا ہو اور جب اس کے پاس علم آتا ہے تو اس کی ہدایت پر ہدایت کا اضافہ ہوتا ہے نور پر نور ہوتا ہے (۴) میں کہتا ہوں اس کا مطلب یہ ہے کہ صوفی کا دل سچے قول سے متصل اور سچے اعتقاد کے لئے کھل جاتا ہے اور وہ ہر اچھے قول، عمل اور عقیدہ کو قبول کرتا ہے اور باطل کو اس کا دل ناپسند کرتا ہے اور اسے قبول نہیں کرتا۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے نفس سے فتویٰ طلب کر، اگرچہ مفتی تجھے فتویٰ دے بھی سکے ہوں۔ اس حدیث کو بخاری نے اپنی تاریخ میں حضرت وابد سے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ جب بندہ مومن کے پاس کتاب و سنت کا علم آتا ہے تو اس کی ہدایت اور یقین کے چراغ کی لو میں اضافہ ہوتا ہے۔ کبھی کہتے ہیں اس سے مراد مومن کا ایمان اور اس کا عمل ہے۔ سدی کہتے ہیں نور ایمان اور نور قرآن مراد ہے۔ حسن اور ابن زید کہتے ہیں یہ قرآن کی مثال ہے۔ مصباح سے مراد قرآن ہے جس طرح چراغ سے روشنی حاصل کی جاتی ہے اسی طرح قرآن سے ہدایت حاصل کی جاتی ہے۔ زجاجہ سے مراد بندہ مومن کا دل ہے۔ مشکوٰۃ سے مراد اس کا منہ اور اس کی زبان ہے شجرہ مبارکہ سے مراد وحی ہے۔ یَکَادُ زَیْفُهَا یُضِیُّ صحیح کا مطلب یہ ہے کہ قریب ہے کہ قرآن کی

حجت خود بخود واضح ہو جائے، اگرچہ اس کو پڑھنا نہ بھی جائے، یعنی قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخلوق کے لئے نور ہے حالانکہ نزول قرآن سے پہلے بھی بندوں کے لئے اس نے اپنی توحید کی طرف راہنمائی اور علامات بیان فرمادی تھی۔ قرآن کے نزول سے اس کے نور میں اضافہ ہوا (۱)۔

بعض علماء فرماتے ہیں یہ اس ہدایت کی تمثیل ہے جس پر واضح آیات دلالت کرتی ہیں جن کا مدلول بالکل عیاں ہے اور ان کے اندر جو ہدایت ہے وہ ظاہر و باہر ہے اور ہدایت ان کو اس مشکلوۃ کے ذریعے دی گئی جس کی صفات بیان کی گئیں ہیں۔ یا یہ کہ ہدایت کو تشبیہ دی گئی ہے مصباح کے ساتھ اس اعتبار سے کہ وہ ہدایت لوگوں کے توہمات اور خیالات کی تاریکیوں میں لپٹی ہوئی ہے۔ اور کاف 'مشکوۃ' پر داخل ہوا ہے کیونکہ اس کو تاریکیاں گھیرے ہوئے ہوتی ہیں یا یہ ان پانچ قوتوں کی مثال ہے جو اللہ تعالیٰ بندوں کو عطا فرماتا ہے اور ان پر بندے کی معاش و معاد کا دار و مدار ہوتا ہے۔ 1۔ قوت حساسہ جو حواس خمسہ کے ذریعے محسوسات کا ادراک کرتی ہے۔ 2۔ قوت خیالیہ وہ قوت ہے جو ان محسوسات کی صورتوں کو محفوظ رکھتی ہے تاکہ پھر ضرورت کے وقت قوت عقلیہ پر ان محسوسات کو پیش کرے۔ 3۔ قوت عاقلہ۔ یہ وہ قوت ہے جو معتقولات کو جمع کرتی ہے تاکہ ان معتقولات سے غیر معلوم کو حاصل کرے۔ 5۔ قوت قدسیہ۔ یہ وہ قوت ہے جس پر آثار غیبیہ اسرار ملکوتیہ ظاہر ہوتے ہیں یہ قوت انبیاء کرام اور اولیاء کے ساتھ خاص ہے۔ ارشاد الہی وَلَٰكِنْ جَعَلْنَاهُمْ نُوْرًا اَنْهٰی نَبٰی اَھْمٰصِن لِنُاۡءِوٰہِیْنَ یَعْنٰی نُوْنًا سے یہی قوت قدسیہ مراد ہے۔

یہ آیت کریمہ ان پانچ قوتوں کی مثال ہے۔ مشکوۃ چنانچہ 'مصباح' شجرہ اور زیت۔ قوت حساسہ مشکوۃ کی طرح ہے کیونکہ سر میں اس کا عمل بالکل چراغ دان کی طرح ہوتا ہے اس کا منہ ظاہر ہی طرف ہوتا ہے اس کے پیچھے جو کچھ ہے اس کا ادراک نہیں ہو سکتا اور اس کی روشنی معتقولات کے ذریعے ہے بالذات نہیں ہے۔ قوت خیالیہ ہر جانب سے مدركات کی صورتوں کو قبول کرنے میں زہاج کی مثل ہے یہ انوار عقلیہ کو ضبط کرتی ہے اور اس کی چمک اور روشنی قوت عاقلہ سے ہے اور قوت عاقلہ چراغ کی مثل ہے کیونکہ وہ ادراکات کا لیدر اور معارف الہیہ سے منور ہوتی ہے۔ قوت متفکرہ شجرہ مبارکہ کی طرح ہے جو اتنے نتاج جمیہا کرتی ہے اس کی کوئی انتہائی نہیں ہے اور یہ زیتون کا درخت ہے جس سے چراغ روشن ہوتا ہے اسی طرح قوت متفکرہ ہے جو مشرقی ہے نہ مغربی ہے کیونکہ وہ اوائلی جسمیہ سے خالی ہے یا اس لئے کہ وہ صورتوں اور معانی کے درمیان واقعہ ہے دونوں قبیلوں میں متصرف ہے اور دونوں طرف سے قابل انقاع ہے۔ اور قوت قدسیہ تیل کی مانند ہے وہ اپنے صفا اور ذکاؤ کی وجہ سے قریب ہے کہ بغیر غور و خوض اور جاننے کے معارف سے روشن ہو جائے۔ یا یہ تمثیل ہے قوت عقلیہ کی کیونکہ وہ ابتداء میں علوم سے خالی ہوتی ہے لیکن علوم کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اس وقت وہ مشکوۃ کی طرح ہوتی ہے پھر جزئیات کے احساس کے واسطے سے علوم ضروریہ سے وہ عقل منتقل ہوتی ہے۔ اس وقت وہ نظریات کے حصول پر قادر ہوتی ہے۔ پس اس صورت میں وہ اس زہاج کی مانند ہوتی ہے جو فی نفسہا تنجس رہا ہو۔ پھر قوت عقلیہ کو علوم حاصل ہوتے ہیں اگر اسے علوم اجتہاد اور فکر سے حاصل ہوتے ہوں تو شجرہ زیتون کی مانند ہوتی ہے۔ اگر حدس کے ذریعے علوم حاصل کرتی ہو تو زیتون کے تیل کے مانند ہوتی ہے۔ اگر قوت عقلیہ کو علوم کا حصول قوت قدسیہ کے ذریعے ہوتا ہو تو وہ اس تیل کی مانند ہوتی ہے جو خود بخود روشن ہونے کے قریب ہوا اگرچہ اس کو آگ نے نہ بھی چھوا ہو کیونکہ وہ قوت عقلیہ اس طرح ہو جاتی ہے کہ وہ خود بخود علوم حاصل کرے خواہ،

وہی اور وہ الہام جو آگ کی مثل ہوتا ہے جس سے عقول روشن ہو جاتی ہیں اس قوت عقلیہ کے ساتھ متصل نہ بھی ہوا ہو۔ پھر جب قوت عقلیہ کو علوم حاصل ہو جاتے ہیں تو وہ قادر ہوتی ہے کہ ان علوم کو جب چاہے حاضر کرے اس صورت میں وہ مصباح کی مانند ہوتی ہے جب وہ ان علوم کو ہر وقت حاضر رکھتی ہو تو نور علی نور ہو جاتی ہے۔

میرے نزدیک اس آیت کی دو اور تاویلیں ہیں جن کا مدار شیخ محمد رالف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا کشف ہے۔ 1۔ اللہ نور السموات والارض کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا موجد و مظهر ہے عدم سے خارج ظلی میں لانے والا ہے۔ مثل نورہ سے مراد اس کا وجود جو ممکنات کی مہابت پر اپنا پرتو ڈالتا ہے۔ یہاں نور کی اپنی ذات کی اضافت تخریفی ہے جیسا کہ بیت اللہ اور نائتہ اللہ میں اضافت شرف و عظمت کے اظہار کے لئے ہے یا اپنی ذات کی طرف نور کی اضافت اس لئے فرمائی کیونکہ نور کا صدور ذات الہیہ سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ سورج اور چاند کا نور اس وقت زمین پر پڑتا ہے جب وہ ان کے سامنے ہوتی ہے۔ مکشوفہ سے مراد مکشوفہ کی روشنی اور نور ہے مضاف محذوف ہے۔ فیہا مصباح۔ یعنی اس مکشوفہ میں چراغ ہے اور اس چراغ کی وجہ سے وہ مکشوفہ منور ہے۔ پس جس طرح مکشوفہ (مکشوفہ) نور حاصل کرتا ہے اور اس چراغ کی وجہ سے منور ہوتا ہے بالکل اسی طرح ممکنات کی مہابت وجود کے نور سے استفادہ کرتی ہیں اور اللہ کی صفات اور اس کے اسماء کے چراغ سے ممکنات روشن ہو جاتی ہیں۔

المصباح فی زجاجیہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ مصباح کا زجاجہ میں ہونا تصویر کے کمال کے لئے ہے۔ حضرت محمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں انبیاء کرام اور فرشتوں کے سوا باقی تمام ممکنات کا مقدمہ تعین اسماء الہیہ اور صفات الہی کے عکس اور پرتو ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس طرح اپنی صفات کمالیہ کو جانتا ہے اسی طرح ان صفات کے نقائص کو بھی جانتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں جیسے موت حیات کی نقیض ہے، جہالت علم کی نقیض ہے۔ عجز قدرت کی نقیض ہے۔ بہرہ یقین سننے کے نقیض ہے۔ اندھا پن دیکھنے کی نقیض ہے۔ گونا پن کلام کی نقیض ہے۔ جبر ارادہ کی نقیض ہے۔ تعطل سخوین کی نقیض ہے۔ جب صفات الہیہ علم کے مرتبہ میں اپنے نقائص کے ساتھ جمع ہوتی ہیں تو ان نقائص کی صورت میں صفات کے عکس کی وجہ سے منتقش ہو جاتی ہیں اور یہ مخلوقات اس طرح ہو جاتی ہیں کہ ان کے حقائق اعدام اور ان کے عوارض صفات کا پرتو ہوتے ہیں۔ ان مخلوقات کو صوفیاء کی اصطلاح میں ظلال الصفات والا عیان کہتے ہیں اور ممکنات کے تعینات کے مبادی ان کے حقائق اور ان کے مرتبات بھی یہی مخلوقات ہوتی ہیں۔ یہ صفات اس زجاجہ کی مانند ہیں جو مصباح کے نور سے منور ہوتا ہے اور ظرفیت تجلی کی حیثیت سے ہے کیونکہ صفات ظلال میں روشن ہوتی ہیں۔ ظلال صفات سے منور ہوتے ہیں۔ اسی طرح زجاجہ اس چراغ کے نور سے روشن ہوتا ہے جو اس میں رکھا ہوتا ہے۔ عکس روشن ہوتے ہیں پھر وہ اپنا صفات سے حاصل شدہ نور ممکنات کی مہابت کو عطا کرتے ہیں۔ پس وہ روشن ہو جاتی ہیں اور مہابت ظلال کے نور سے ظاہر ہوتی ہیں جیسا کہ مکشوفہ زجاجہ کے اس نور سے روشن ہوتا ہے جو چراغ سے حاصل ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا حجاب نور ہے اگر وہ نورانی نقاب اٹھا دے تو اس کے چہرہ کی شعاعیں مخلوق کو وہاں تک جلا دیں جہاں تک اسکی نظر پہنچے (1) اس حدیث کو مسلم نے حضرت ابو موسیٰ سے روایت کیا ہے۔ شاید نور سے مراد اس حدیث میں ظلال کا مرتبہ اور سبحات الوجہ (چہرہ کی شعاعیں) سے مراد اللہ کی صفات ہوں ممکنات کی مہابت تیرہ کی کو اور استعداد کے ضعف کی وجہ سے ظلال

کے توسط کے بغیر صفات سے نور کے اقتباس کی صلاحیت نہیں رکھتی ہیں۔ اگر یہ ظلال نہ ہوں تو ممکنات کا نام و نشان تک نہ ہو۔ لیکن انبیاء کرام اور ملائکہ اپنی قوت استعداد کی وجہ سے صفات سے اقتباس نور کرتے ہیں جیسا کہ ظلال صفات سے نور حاصل کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے انبیاء کرام اور ملائکہ معصوم ہوتے ہیں کیونکہ ان کے اصول میں شرنہیں پایا جاتا۔

أَلَوْ جَاءَهُمْ كَلِمَةٌ مِنْ رَبِّهِمْ، یعنی وہ مصباح کے انوار سے چمک رہا ہے حتیٰ کہ وہ فانوس دیکھنے والوں پر مشتبہ ہو جاتا ہے حتیٰ کہ وہ فانوس اور چراغ کے درمیان تفریق بھی نہیں کر سکتے۔ شاعر کہتا ہے۔

رَقِ الزُّجَاجُ وَ زَقَّتِ الخُمُورُ فَشَاهَبَهَا وَ تَشَا مِثْلَ الْإَمْرِ

جام بھی شفاف ہے اور شراب بھی شفاف ہے۔ اس لئے امتیاز کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ بالکل ایک جیسے دکھائی دیتے ہیں۔

فَكَأَنَّهَا خُمُرٌ وَلَا زُبْحَاجٌ وَكَأَنَّهَا زُبْحَاجٌ وَلَا خُمُورٌ

یوں لگتا ہے شراب ہی شراب ہے جام ہے ہی نہیں۔ کبھی یوں معلوم ہوتا ہے سارا جام ہے شراب نہیں ہے۔

ظلال اور صفات میں اسی امتیاز کی وجہ سے بہت سے عرفاء (وحدت الوجود قائلین) نے یہ گمان کیا کہ ظلال اللہ کی صفات ہیں اور وہ ان دوسروں میں امتیاز نہ کر سکے اور کہا صفات میں الذات ہیں اور یہ گمان کرنے لگے کہ ممکنات کی ماہیات بالکل عین ہیں، ان مریات کا جو ان میں غیاء پاشی کرتی ہیں۔ اور کائنات میں اور کچھ نہیں ہے سوائے اللہ کے۔ اور ایک صوفی نے کہا ایسی فی الجہتی سبوی اللہ۔ میرے جو ہیں اور کچھ نہیں ہے۔ وحدت الوجود کے قائلین میں سے ایک شاعر کہتا ہے۔ "اس کائنات رنگ و بو میں نہ سلیمان کی بادشاہی ہے نہ بلقیس نے آدم ہے اور نہ ابلیس ہے۔ یہ سب صورتیں ہیں صرف تو ہی مراد ہے۔ اسے وہ ذات جو دلوں کو اپنی طرف کھینچنے کا مقناطیس ہے۔"

سکر اور غلبہ عشق کی وجہ سے ایسی کلام کا صدور ہوا ہے اور وہ روشن اور روشنی کرنے والے کے درمیان فرق نہیں کر سکے۔

يُوقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُبَارَكَةٍ زَيْتُونَةٍ۔ یعنی وہ چراغ مبارک زیتون کے درخت کے تیل سے روشن ہے۔ صفات کا خارج حقیقی میں منور ہونا اللہ تعالیٰ کی ذات کی بدولت ہے۔ یہ صفات ہی نفسہا ممکن ہیں لیکن ذات الہی کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے واجب ہیں۔ یہ اپنے امکان کی وجہ سے انبیاء اور ملائکہ کے تعینات کے لئے مریات ہیں۔ یہ قدیم وجود کے موجود ہیں جو ذات سے مستفاد ہے۔ پس ذات کو زیتون کے مبارک درخت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، اسی وجہ سے اس درخت کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ نہ شرقی ہے اور نہ غربی ہے کیونکہ ذات تمام جہات سے پاک ہے۔ جن صفات کو مصباح سے تشبیہ دی گئی ہے وہ ذات سے زائد ہیں۔ یہ نظریہ کتاب و سنت سے مستفاد ہے اور اس پر اہلسنت و الجماعت کا اجماع ہے، لیکن ابوالحسن اشعری کا یہ ارشاد کہ نہ یہ صفات عین ذات ہیں اور نہ غیر ذات ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ صفات ذات پر زائد ہیں اس کا عین نہیں ہیں لیکن اس سے جدا بھی نہیں ہوتیں۔ غیر ذات نہ ہونے کا یہی معنی ہے۔ فلاسفہ اور معتزلہ صفات زائدہ کا انکار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اگر صفات ذات سے زائدہ ہوں تو آثار کے مرتب ہونے میں ذات ان صفات کی محتاج ہوگی۔ متکلمین فرماتے ہیں کسی چیز کی طرف احتجاج جو متعلق ہے وہ اجنبی چیز کی طرف احتیاج ہے لیکن صفات کی طرف احتیاج متعلق نہیں ہے۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی صفات زائدہ خارج میں اسی طرح موجود ہیں جس طرح اس کی مخلوق حکمت تقاضا کرتی ہے۔ اس بات پر لخصوص اور اجماع دلالت کرتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات بحیثیت

ذات صفات سے مستغنی ہے، آثار کے ترتب میں ان کی محتاج نہیں ہے حتیٰ کہ اگر ہم صفات کا نہ پایا جانا فرض بھی کر لیں تو آثار کے ترتب میں ذات کافی ہوگی۔

ذات سننے کے لئے کافی ہے اگر ہم فرض کر لیں کہ کس کا وصف زائد موجود نہیں ہے۔ اسی طرح دیکھنے میں ذات کافی ہے۔ پس اس اعتبار سے اور استماع کے آثار کے ترتب کی ذات صلاحیت رکھتی ہے۔ اسکو شان مع کہا جاتا ہے۔ اگر دیکھنے کے آثار بغیر صفت ابصار کے ظاہر ہوں تو اسے شان ابصار کہتے ہیں۔ یہی ذات کے عین اور صفات کے اصول ہیں، جیسا کہ صفات اطلاق کے لئے اصول ہیں یہ اعتبارات اور شگون جو ذات میں موجود ہیں وہ اس تیل کے مشابہ ہیں جو زیتون کے مبارک درخت میں ہوتا ہے پس بیکاد زیتنا یضیی ولو لم تمسسه نار کے ارشاد کی تشبیہ اس طرح مکمل ہوئی کہ ذات کے اعتبارات پر آثار کا مرتب ہونا جائز ہے، اگر چہ وہاں صفات نہ بھی ہوں جنہیں چراغ کی آگ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ نور علی نور، یعنی چراغ کا نور جو پیشہ اور مشکوٰۃ کو روشن کر رہا ہے یہ درخت کے تیل کے نور سے زائد ہے۔ جیسا کہ صفات کا نور آثار کے ترتب میں اور ماہیات کو روشن کرنے اور ممکنات کو ایجاد کرنے میں اس نور سے زائد ہے جو ذات کے اعتبارات میں ہے۔ یدھی اللہ لنورہ من یشاء۔ یعنی اس مخصوص معارف کو صرف وہی خواص عرفاء جانتے ہیں جن کو جتنے کا اللہ ارادہ فرماتا ہے۔

اس تاویل و توجیہ کی بنا پر اس آیت میں اشارہ ہے کہ ایجاد اور ولادت اولیٰ کا مطلب عدم سے وجود خارجی ظنی کی طرف لانا ہے جو تمام موجودات کے ذات کے قریب ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ جس کی طرف اس ارشاد یعنی أَقْرَبُ إِلَيْهِمْ حَبْلُ الْوَبِيِّمْ میں اشارہ فرمایا ہے۔ ہم نے سورہ قاف میں اس آیت کی تفسیر میں اقریبیت کی تحقیق بھی ہے دوسری تاویل جو سلف صالحین سے مروی ہے وہ یہ ہے اللہ نور السموات والارض، یعنی وہ آسمانوں اور زمینوں کے رہنے والوں کی راہنمائی فرمانے والا ہے۔ پس تمام اس کے نور سے ذات اور صفات الہیہ کی معرفت حاصل کرتے ہیں اور مدارج قرب تک ترقی کراتے ہیں جس قرب کی طرف اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے۔ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ۔ اسی طرح ارشاد ہے اللَّهُ ذُو الْمَلَكِ الْقَدِيمِ الْأَمِينِ وَسَيُعْطِيهِمْ مِّنْهُم مَّا يُرِيدُونَ (اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا نکال لے جاتا ہے انہیں اندھیروں سے نور کی طرف) اسی طرح حدیث قدسی میں اس قرب کو بیان فرمایا ہے۔ لَا يُزَالُ عَبْدِي يَنْقُرُ بِِئْتِي بِالنَّوَابِلِ حَتَّىٰ أُخْبِنَهُ فَإِذَا أُخْبِنَهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ (الحديث (1)) یہی قرب ہے جسے ولایت خاصہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مَنْفَل نُورِهِ كَمَشْكُورَةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ، یعنی مومن بندہ کے دل کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے مشکوٰۃ ہو جس میں چراغ رکھا ہو۔ پس اس صورت میں مشکوٰۃ بندہ مومن کے دل کی مثال ہوگا اور وہ چراغ جو شجرہ مبارک کے تیل سے منور ہے اس کو ان صفات سے تشبیہ ہوگی جو بندہ مومن کے دل میں روشن ہیں اور اس ذات القدس سے نکلی ہیں جس میں شمعوں اور اعتبارات ذاتیہ ہیں جیسا کہ پیچھے ذکر چکا ہے۔

المصباح لہی زجاجۃ۔ الزجاجۃ کناہا کو کب دری۔ اس آیت میں اشارہ ہے کہ عام اولیاء کرام صفات کی تجلیات سے محفوظ ہوتے ہیں لیکن ظلال کے پردوں کے پیچھے سے۔ کیونکہ انبیاء کرام کے علاوہ لوگوں کا مدہم تعین یہ صفات کے ظلال ہیں۔ عام اولیاء کی ترقی کی حد اپنے اصول، یعنی ظلال تک ہوتی ہے۔ پھر ان ظلال کے واسطے سے صفات کے انوار کو حاصل کرتے ہیں۔ پس عام

اولیاء کرام کو ان ظلال میں فنا اور بقیٰ ملی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا جو قرب حاصل کرتے ہیں اس کو ولایت الاولیاء کہتے ہیں۔ یہی ولایت صغریٰ ہے۔ لیکن بعض اولیاء کا لیکن وہ اتباع رسالت مآب ﷺ کی وجہ سے اس مقام سے مقام صفات کی طرف ترقی کرتے ہیں، بلکہ شیون اور اعتبارات تک ترقی کرتے ہیں۔ پھر انہیں ان صفات میں فنا اور بقیٰ ملی ہے۔ پس مقام صفات کو ظہور کی حیثیت سے (یعنی صفات کے ذات کے ساتھ قیام کی حیثیت سے) ولایت بصری اور ولایت الاولیاء کہا جاتا ہے اور مقام صفات کو بطون کی حیثیت سے ولایت علیا اور ولایت ملائکہ کہا جاتا ہے۔ پھر ان میں سے صدیقیین جن کے متعلق ارشاد ہے لَقَدْ قَرَّبْنَا الْاَوَّلِينَ لِيُذَكَّرَ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ اور دوسرے صدیقیین کے بارے فرمایا وقليل من الاخوان۔ صدیقیین مقام صفات و شیون سے مرتبہ ذات تک رسائی حاصل کرتے ہیں جو شیون اور اعتبارات سے بلند ذات ہے حتیٰ کہ ان کے سامنے ذات صفات و اعتبارات کے پردوں کے بغیر عیاں ہوتی ہے۔ اس آیت کریمہ کی آخری دو گروہوں کی طرف اشارہ نہیں ہے لیکن نور علی نور کا ارشاد ہو سکتا ہے کہ اولیاء کرام کے درجات کے تقادد کی طرف اشارہ ہو۔ یعنی وہاں نور ہے جو بعض، بعض سے فوق ہے۔

عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے فرماتے ہیں، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو تارکین میں پیدا فرمایا پھر ان پر اپنا نور ڈالا۔ جس کو یہ نور ملا اس نے ہدایت پائی اور جس کو یہ نور نہیں ملا وہ گمراہ ہوا اسی وجہ سے میں کہتا ہوں جفت الفلم علی علم اللہ۔ علم الہی پر قلم خشک ہو گیا (۱)۔ اس حدیث کو امام احمد اور ترمذی نے روایت فرمایا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو جہالت اور گمراہی میں پیدا فرمایا، یعنی عدم ذاتی جو ان کے مادی تعینات میں تھا اس سے انہیں پیدا فرمایا پھر ان پر وہ نور ڈالا جو ظلال نے صفات سے حاصل کیا تھا۔ پس جس کو یہ نور میسر آیا وہ ہدایت پا گیا اور جسے یہ نور نہ ملا وہ گمراہ ہو گیا۔ اس نور کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اس نور کو اس ذات کریمہ سے حاصل کرے جسے اللہ تعالیٰ نے حصہ لیا لیکن بنایا۔ جس کے سینہ اقدس کو منشرح فرمایا۔ اور جس کے دل کو نور حکمت اور ایمان سے لبریز فرمایا انسان اپنے دل کو قلب مصطفیٰ کریم کے سامنے آئینہ بنائے۔ پس اس طرح انسان کا دل بقدر حصول فیض روشن ہو جائے گا۔ پس جس نے قلب مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایمان کی صورت آکتاب فیض کیا تو وہ دنیا میں کفر اور آخرت میں آگ کے عذاب سے نجات پا گیا اور جس نے فیضان قلب مصطفیٰ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کچھ حاصل نہ کیا پس وہ نور سے محروم رہا اور گمراہ ہو گیا۔ حضرت ابی عیسیٰ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے لئے اہل زمین سے کچھ برتن ہیں اور تمہارے رب کے برتن اللہ کے نیک بندوں کے دل ہیں اور اس کے نزدیک سب سے محبوب دل وہ ہوتا ہے جو سب سے زیادہ نرم ہو اس حدیث کو طبرانی نے بیان کیا ہے (۲)۔

۱۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان امور کے لئے محسوس مثالیں بیان فرماتا ہے جن کا ادراک جو اس سے ممکن نہیں ہے تاکہ ان محسوس مثالوں سے لوگ علم حاصل کریں اور ان کے عرفان میں اضافہ ہو۔ اس آیت کا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ عالم امثال میں اپنے اولیاء کرام کو ایسی مثالیں دکھا دیتا ہے جن کی عالم شہادت میں مثالیں نہیں ہوتیں یہ اس لئے کرتا ہے تاکہ حقیقت کا رخ زیبا ان کے سامنے عیاں ہو جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کا قرب تو قرآن و سنت سے ثابت ہے۔ فرمایا

لَا يَزَالُ الْغُبْدُ يَنْقَرُبُ إِلَيَّ بِاللُّوْاِظِلِّ۔ لیکن یہ قرب ایسا امر ہے جس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی اس کا ادراک حواس خمسہ اور عقل

کے ذریعے ممکن نہیں ہے اور نہ اس سے علم حصولی اور نہ علم ضروری کا تعلق ہے۔ لیکن یہ قرب اس علم سے معلوم ہوتا ہے جو علوم مذکورہ کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کیا جاتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ۔ (میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے) اس کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ نے اس اور راک کا ایک اور ذریعہ بھی بنایا ہے وہ یہ ہے کہ وہ امور جن کی کوئی مثال نہیں ہے عالم مثال میں اللہ تعالیٰ اجسام کی صورت میں منظر فرماتا ہے۔ پھر صوفی عالم مثال میں ظلال کا دائرہ اور صفات کا دائرہ دیکھتا ہے جو صوفی نوافل کے ذریعے ترقی کی منازل طے کرتا جاتا ہے تو وہ اپنے آپ کو دیکھتا ہے کہ وہ ظلال کے دائرہ کی طرف گامزن ہے یہاں تک کہ وہ اس ظلال کے دائرہ میں پہنچ جاتا ہے پھر اس دائرہ میں گم ہو جاتا ہے اور اس کے رنگ میں رنگا جاتا ہے پھر اس کے بعد وہ اپنے آپ کو صفات کے دائرہ کی طرف جاتے ہوئے دیکھتا ہے، حتیٰ کہ اس کے اندر پہنچ اور پھر اس گم ہو جاتا ہے اور دائرہ صفات کے رنگ میں رنگا جاتا ہے یہاں رنگ میں رنگنے کا ذکر فقہا سمجھانے کے لئے ہے ورنہ ہاں کوئی رنگ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے سَمِعُوا لَهُمُ الْيَتَامَىٰ وَالْأَقْرَابَ وَرِثَىٰ أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَسْتَكْبِرُوا لَهُمْ إِنَّهُ الْعَلِيُّ۔ (ہم دکھائیں گے انہیں اپنی نشانیاں آفاق (عالم) میں اور ان کے اپنے نفسوں میں تاکہ ان پر ابرح ہو جائے کہ قرآن واقعی حق ہے۔

۱۲۔ یہ جملہ بصر کے فاعل سے حال ہے۔

قِيَّوْتِ اذْنِ اللّٰهِ اَنْ تُرْفَعُوْا رِجْلًا كَرِيْمًا لِّسَمِيْعٍ لِّفِيْهَا الْعُدُوْا وَالْاَصَالِ

”ان گھروں میں (جن کے متعلق) حکم دیا ہے اللہ نے کہ بلند کئے جائیں اور لیا جائے ان میں اللہ تعالیٰ کا نام لے۔ اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں ان گھروں میں صبح اور شام ۵۔“

۱۔ اذْنُ اللّٰهِ الخ بیوت کی صفت ہے اور ان بقعہ بر حرف جر با و اذن کے متعلق ہے اور بیوت سے مراد مساجد ہیں۔ سعید بن جبیر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت فرماتے ہیں کہ مساجد زمین میں اللہ کے گھر ہیں اور آسمان والوں کو یہ اس طرح روشن دکھائی دیتی ہیں جس طرح زمین والوں کو ستارے چمکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں (۱)۔ ان ترفیع کا معنی مجاہد نے ان تسبیح (یعنی تعمیر کرنا) فرمایا ہے۔ اس معنی کی مثال یہ ارشاد بھی ہے اذْنِيْزِقُمْ اذْنِهِمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ النَّبِيِّاتِ وَالْمُسْتَعِيْلِ (یا رکرو جب ابھی تھے ابراہیم (علیہ السلام) بنیادیں خانہ کعبہ کی اور اسماعیل (۲)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اللہ کی رضا کے لئے مسجد بنائی اللہ اس کے لئے جنت میں محل بنائے گا (۳)۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے حضرت عثمان سے روایت کیا ہے۔ حضرت حسن نے ان ترفیع کا معنی ان تعظم (عزت احترام کرنا) فرمایا ہے یعنی مساجد میں کوئی بری بات نہ کی جائے (۴)۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اَنْ تَقْلَعُوا يَدَيْكُمْ لِلظَّلْمِ لَوْفِيْنَ وَالْعُدُوْفِيْنَ وَالْاَوْثَامِ السُّجُوْدِ۔ (کہ خوب صاف ستھرا رکھنا میرا گھر طواف کرنے والوں اور کاف پھینچنے والوں اور کوع و سجود کرنے والوں کے لئے۔

امام بغوی فرماتے ہیں حضرت صالح بن حبان نے حضرت بریدہ سے اس آیت کے متعلق روایت فرمایا ہے کہ چار مساجد ایسی ہیں جنہیں انبیاء کرام نے تعمیر فرمایا ہے کعبہ کو حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام نے تعمیر فرمایا۔ بیت المقدس کی تعمیر حضرت داؤد اور سلیمان علیہما

السلام نے فرمائی۔ مسجد نبوی اور مسجد قبا کی تعمیر رسول اللہ ﷺ نے فرمائی (1)۔

میں کہتا ہوں بیوت سے صرف سبکی چار مساجد مراد لینے کی کوئی دلیل نہیں ہے اگرچہ یہ چاروں مساجد باقی تمام مساجد سے افضل ہیں۔ بیوت ناقص سے متعلق ہے یعنی مشکوٰۃ کی صفت ہے یا محذوف سے متعلق ہے، یعنی جس طرح بعض مساجد میں مشکوٰۃ کی روشنی یا یہ توفیق کے متعلق ہے اور مفہوم یہ ہوگا کہ اسی طرح بیوت (گھروں) میں روشن کیا گیا ہے۔ پس یہ مثل ہے کہ لئے نقیصہ ہوگا۔ یہ تاویل میرے نزدیک ضعیف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کو مشکوٰۃ کے نور سے تشبیہ دی ہے اور اس کو ایسی تقویٰ سے مقید کیا ہے جو نور کی قوت اور اس کی چمک کی شدت پر دلالت کرتی ہیں اور اس قید کا ان مساجد میں روشن ہونے والے مشکوٰۃ اور مصباح مذکور میں روشنی کی زیادتی کا کوئی ثقل نہیں ہے۔ اور یہ کہتا کہ مساجد کی قندیلیں بڑی بڑی ہوتی ہیں یہ درست نہیں ہے بلکہ نئی لوگوں کی مجالس کی قندیلیوں کی روشنی مساجد کی قندیلیوں کی روشنی سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ یہ یفہدی اللہ لبؤرہ من یشاء کے متعلق کیا جائے کیونکہ عام طور پر ہدایت ان لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو مساجد میں اعتکاف کرتے ہیں اور نمازیں ادا کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مؤمن کی حراج نماز ہے اور فرمایا بندہ اپنے رب کے زیادہ قریب ہوتا ہے جب وہ نجدہ میں ہوتا ہے پس نجدہ میں دعا کی کثرت کیا کرہ (2)۔ اس حدیث کو مسلم ابوداؤد اور نسائی نے ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فی بیوت محذوف فعل سبحوا کے متعلق ہو۔ اللہ کی ہدایت کو حاصل کرنے کے لئے تسبیح کا حکم فرمایا۔

یعنی نماز کے اندر اور نماز سے باہر اس کا ذکر کیا جائے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں ینذکر کا معنی یعنی ہے، یعنی اس کی کتاب کی تلاوت کی جائے (3)۔ تسبیح بیوت کی دوسری صفت ہے یا جملہ مستانہ ہے یا اسم جلال کی دوسری خبر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اللہ نوز السعوات والأرض واللہ یسبح لہ۔ ابوہریرہ اور ابن عمر نے تسبیح کو کھجول کا صیغہ پڑھا ہے اور اس کے بعد تینوں ظروف میں سے ایک طرف منسوب ہے۔ اس قرأت پر الاصل پر وقت ہوگا۔ باقی قراءت نے معروف کا صیغہ بفتح باء پڑھا ہے۔ اہل تفسیر فرماتے ہیں ذکر سے مراد فرض نمازیں ہیں کیونکہ مساجد کی تعمیر نماز کے لئے ہوتی ہے۔ پس فجر کی نماز، صبح ادا کی جاتی ہے اور باقی چار نمازیں دوسرے وقت میں ادا کی جاتی ہیں۔ خدا اصل میں مصدر ہے اور یہاں وقت کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اسلئے اصال کے ساتھ اس کا اتصال بہتر ہے۔

آصال جمع ہے اصل کی۔ اس سے مراد عصر کے بعد کا وقت ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں الغدو والاصال سے مراد صبح اور عصر کی نمازیں ہیں کیونکہ ان کا اہتمام زیادہ کرنا پڑتا ہے صبح کے وقت انسان نیند میں ہوتا ہے اور عصر کا وقت کام کاج میں مشغولیت کا ہے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے صبح اور عصر کی نماز پڑھی وہ جنت میں داخل ہوگا (4)۔ اس حدیث کو مسلم نے ابوموسیٰ سے روایت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے حَافِظُوا عَلَی الصَّلَاةِ وَالصَّلَاةِ الْوَسْطَى۔

علامہ بغوی لکھتے ہیں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ صبح کی تسبیح سے مراد چاشت کی نماز ہے (5)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو پاکیزگی کی حالت میں فرض نماز پڑھنے کے لئے گیا اس کا جراس محرم حاجی کے اجر کی طرح ہے۔ اور جو چاشت کی نماز کے لئے جائے اور وہ صرف نماز کی خاطر کھڑا ہو تو اس کا اجر عمرہ کرنے والے کے اجر کی طرح ہے۔ ایک نماز کے پیچھے دوسری نماز طہین میں کھسی

1- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 206 (المنکر)
2- سنن نسائی، جلد 2، صفحہ 226 (الریان)
3- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 207 (المنکر)
4- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 207 (المنکر)
5- ایضاً

جاتی ہے۔ یہ حدیث علامہ بغوی نے ابوامامہ سے روایت کی ہے (1)۔ طبرانی نے اس طرح روایت کی ہے جو فرض نماز جماعت سے پڑھنے کے لئے جائے اس کا یہ عمل حج کے عمل کی طرح ہے اور جو نفل نماز کی طرف جاتا ہے اس کا یہ عمل نفل نماز کی طرح ہے (2)۔

بِرَجَالٍ لَا تَلْمِئِهِمْ تَجَارَةً وَلَا بَيْعًا عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَاقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ يَخَافُونَ يَوْمَ مَا تَلَقَّبَ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ ﴿١﴾

”وہ (جو ان) مرد جنہیں غافل نہیں کرتی تجارت اور نہ خرید و فروخت یاد الہی سے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے سے وہ ڈرتے رہتے ہیں اس دن سے گھبرائیں گے جس میں دل اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔“

۱۔ رجال جمہور کی قرأت کے مطابق مسیح کا قاتل ہے یا ایسے فعل محذوف کا قاتل ہے جس پر مسیح دالالت کر رہا ہے۔ یہ ابن عامر اور ابو بکر کی قرأت کے مطابق ہو گا کیونکہ یہ مقتدر سوال کا جواب ہے۔ پوچھا گیا اس کی کون سی تہنیت کرتا ہے؟ فرمایا جو ان کی تہنیت بیان کرتے ہیں۔ یہاں صرف مردوں کا ذکر فرمایا ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ عورتوں پر مسجد میں جمع اور جماعت لازم نہیں ہیں یا اس لئے کہ اکثر عورتوں میں جہالت اور غفلت ہوتی ہے۔ آیت کریمہ میں بیع کو علیحدہ ذکر فرمایا حالانکہ تجارت کے ضمن میں اس کا ذکر ہو چکا تھا اسکی وجہ یہ ہے کہ بیع تجارت کی قسموں میں سے اہم ترین قسم ہے کیونکہ اشتراء (خریدنے) سے نفع متوقع ہوتا ہے اور پھر فروخت کرنے سے نفع متحقق ہوتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں تجارت سے مراد اشتراء (خریدنا) ہے (اگرچہ تجارت کے اسم کا اطلاق بیع و اشتراء دونوں پر ہوتا ہے) ہمارے اس قول کی دلیل بیع کا تجارت پر عطف ہے۔ اشتراء کی جلد تجارت کا لفظ ذکر فرمایا کیونکہ اشتراء تجارت کا مبداء اور بنیاد ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں تجارت سے مراد بیع و بیعہ کا معاملہ ہے پھر تخصیص کے بعد تعمیم، مبالغہ پیدا کرنے کے لئے بیع کا ذکر فرمایا۔

فراء کہتا ہے اہل جلب کے لئے تجارت کا لفظ استعمال ہوتا ہے (اہل حلب سے مراد باہر سے مال لانے والے ہیں) اور بیع وہ ہوتی ہے جس کو آدمی اپنے سامنے طے کرتا ہے۔ یعنی نماز کے قیام کے لئے مسجد میں حاضری سے تجارت اور کاروبار انہیں غافل نہیں کرتے (3)۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ حضرت سالم حضرت ابن عمر سے روایت فرماتے ہیں کہ ابن عمر بازار میں تھے نماز کی تکبیر ہو گئی سب لوگ کھڑے ہوئے اور اپنی دکانیں بند کر کے مسجد میں داخل ہو گئے عبد اللہ بن عمر نے فرمایا یہ ارشاد لا تلہمہم الخ ان لوگوں کے متعلق نازل ہوا ہے۔ یا لا تلہمہم تجارۃ و لا بیع عن ذمیر اللہ سے مراد دوام حضور ہے (4) یہ ایسا صحیح ہے کہ یہ ان لوگوں کو بھی شامل ہے جو معاملات زندگی ترک کر دیتے ہیں اور اپنا سارا وقت اطاعت الہی میں گزارتے ہیں اور لوگوں سے بالکل الگ تھلگ رہتے ہیں اور یہ ان کو بھی شامل ہے جو معاملات زندگی ترک نہیں کرتے تجارت میں مشغول ہوتے ہوئے بھی یاد الہی سے غافل نہیں ہوتے وہ ظاہر ان لوگوں کے ساتھ ہوتے ہیں اور باطناً کائنات سے غافل ہو کر اپنا سلسلہ خدا سے جوڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

اقام اصل میں اقوام تھا۔ واؤ کو الف سے بدلا تو واؤ الف جمع ہوئے ایک کو حذف کیا کیونکہ دوسرا سن جمع ہو گئے پھر آخر میں الف محذوف کے عوض لگائی گئی اور پھر اضافت کی حالت میں ا حذف ہو گئی۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں اقام الصلوٰۃ سے مراد نماز کی اپنے وقت پر ادا لگنی ہے (5) کیونکہ جو نماز کو اپنے وقت سے مؤخر کرتا ہے وہ نماز کو

1- تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 207 (المنکر) 2- تفسیر کبیر، جلد 8 صفحہ 184 (الترات الاسلامی) 3- تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 208 (المنکر)

تاکم کرنے والی باتیں ہوتی۔ زکوٰۃ سے مراد فرضی زکوٰۃ ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں جب زکوٰۃ کا وقت ہو جائے تو اس کو مت روکو۔ بعض علماء فرماتے ہیں زکوٰۃ سے مراد تمام نیک اعمال ہیں۔ (۱) بخلافون، یسبح کے فاعل سے یا لا تلہیہم کے مفعول سے حال ہے۔ یعنی وہ ذکر الہی اور اطاعت کے باوجود خوفزدہ رہتے ہیں۔ تنقلب فیہ۔ یوما کی صفت ہے اور ضمیر عائد فیہ کی ضمیر ہے۔ یعنی وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس دن دل گھبرائے ہوئے ہوں گے اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی ہوگی۔ بعض علماء فرماتے ہیں کفار کے دل دنیا میں کفر و شک میں زندگی بسر کرنے کی وجہ سے کانپ رہے ہوں گے اور اس دن ان کی آنکھوں سے کفر کی پٹی اتر جائے گی اور وہ سب کچھ دیکھیں گے جو انہوں نے پہلے نہیں دیکھا ہوگا بلکہ ایسا تصور بھی نہ کیا ہوگا اور مسومنوں کے دل اور آنکھیں پلٹا کھائیں گی جبکہ پہلے وہ مشاہدہ مثال پر قانع تھے۔ پھر وہ اللہ تعالیٰ کو چودھویں کے چاند کی طرح دیکھیں گے اور چوتھی ساعت کے وقت کے سورج کی طرح اپنے رب کا دیدار کریں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ قیامت کے روز خوف و امید سے دل الٹ پلٹ ہو رہے ہوں گے۔ کبھی بلاکست کا خوف طاری ہوگا اور کبھی نجات کی امید برآتی نظر آئے گی اور آنکھیں ادھر ادھر گم رہی ہوں گی کہ دائیں ہاتھ نامہ اعمال ملتا ہے یا بائیں ہاتھ میں ملتا ہے۔ دائیں جانب سے پکڑا جاتا ہے یا بائیں جانب سے۔ بعض علماء فرماتے ہیں دل خوف سے گلے میں اٹک جائیں گے نہ نیچے جائیں گے اور نہ باہر نکلیں گے اور ہونا ک منظر کو دیکھ کر آنکھیں تازے لگ جائیں گی۔

لِيَجْزِيَٰ بِهِمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهِ ۗ وَاللّٰهُ يَزِدُّ مَنۢ
يَّشَاءُ بِعَدْرِ حِسَابٍ ﴿٦٣﴾

”تا کہ جزا دے انہیں اللہ تعالیٰ ان کے بہترین اعمال کی، اور اس سے بھی زیادہ عطا فرمائے انہیں اپنے فضل سے اور اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بے حساب۔“

۱۔ لام یسبح یا تلہیہم کے متعلق ہے اور بخلافون کے متعلق بھی ہو سکتا ہے اور اس صورت میں لام عاقبت کے لئے ہوگا کیونکہ خوف افعال اختیار میں سے نہیں ہے اور علت غائیہ افعال اختیار یہ کے ساتھ متخص ہے۔ احسن بطور مفعول مطلق منصوب ہے۔ اللہ تعالیٰ یا تو موجود جزاء پر زیادتی فرمائے گا یا ان کے اعمال پر ایسی چیز کی زیادتی فرمائے گا جس کا تصور ان کے دلوں میں بھی نہ آیا ہوگا۔ واللہ یوزق من یشاء بغیر حساب۔ زیادتی کا ثبوت ہے اور اللہ کے کمال قدرت پر مشیت کے نفاذ پر اور احسان کی وسعت پر متعجب ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ بے حد ہے حساب دیتا ہے۔ عرب کہتے ہیں فَلَانَ يَنْفَعُ بَغِيْرَ حِسَابٍ یعنی وہ اتنی وسعت رکھتا ہے کہ جو فرج کرتا ہے اس کا حساب نہیں رکھتا۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ مُّتَبَعَةٍۢ يَّتَّخِذُهَآ الظَّالِمُۭنَ مآءًا ۗ حَٰقِقًا اِذَا جَآءَهُمْ
لَمۡ يَجِدُوْا شَيْئًا وَّوَجَدَ اللّٰهُ عِندَهُۥٓ اَقْوَمَ حِسَابًا ۗ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿٦٤﴾

”اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے چمکتی ہوئی ریت ہوگی چمیل میدان میں خیال کرتا ہے اسے پیا سا کہ وہ پانی ہے حتیٰ کہ جب (پینے کے لئے) اس کے قریب آتا ہے تو اسے کچھ نہیں پاتا اور پاتا ہے اللہ تعالیٰ کو اپنے قریب

تو پورا چکا دیا اس نے اس کا حساب لے اور اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔“

لے سراپ اس چمک کو کہتے ہیں جو ریت کے صحرا میں دور سے سورج کی کرنوں کی وجہ سے پانی دکھائی دیتی ہے یا اس سے جاری پانی گمان کرتا ہے۔ یہ جملہ سابق کلام کے مضمون پر معطوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اَلْمُهَيِّئُونَ بِنُورِ اللّٰهِ يَنْجِيهِمْ اللّٰهُ اِحْسَنُ مَا عَجَلُوْا وَيَنْزِلُهُمْ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا يَنْفَعُهُمْ اَعْمَالُهُمْ فَاَنْتَاهُ كَسْرَاب۔

قیعہ کشادہ اور ہموار زمین کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع قیعان اور تغیر تو بیچ ہے، بعض علماء فرماتے ہیں یہ قاع کی جمع ہے جیسے حجرۃ جمع ہے حارک۔ کافر جسے اعمال کی سخت ضرورت ہوگی لیکن نامراد ہوگا اسے پیاسے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جس طرح پیاسا سراپ کو پانی سمجھ کر نامراد ہوتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ وجد اللہ معطوف ہے لم یجدہ پر اور پھر جاءہ پر اور ضمیر مرفوع تمام افعال میں تھمان (پیاسے) کی طرف راجح ہے تو پھر سراپ کے پاس پہنچ کر پیاسے کا عذاب الہی کے پانے کا کیا مطلب ہے؟ اس کے جواب میں میں یہ کہتا ہوں کہ میرے نزدیک اس کلام کی دو تاویلیں ہیں، ایک یہ کہ کافر قیامت کے روز آئے گا تو اس کو سخت پیاس لگی ہوگی اسے دوزخ کی آگ سراپ دکھائی دے گی وہ اسے پانی گمان کرتے ہوئے دوڑ کر اس کے پاس جائے گا جب قریب پہنچے گا تو جو کچھ اس نے گمان کیا ہوگا اس میں سے کچھ نہ پائے گا اور اللہ کا عذاب، یعنی آگ کو پائے گا۔ دوسری تاویل یہ ہے کہ عذاب اللہ سے مراد وہ سختی اور مایوسی ہے جو پیاسے کو دنیا میں لاحق ہوتی ہے۔ اس کا مثنیٰ اور بنیاد اس کے اپنے کلمات ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا مَا اَسَابِلُكُمْ بَيْنَ قُضِيَّتَيْنِ قِيَمًا كَسَمِيَّتِ اَيُّوْنِمْ وَيَقُوْا عَنِ كَيْفِيَّتِهِ (اور جو مصیبت تمہیں پہنچی ہے تمہارے ہاتھوں کی کمائی کے سبب پہنچی ہے اور وہ (کریم) درگزر فرمادیتا ہے) تمہارے) بہت سے کلماتوں سے۔

یہ کہنا بہتر ہے کہ حتیٰ ابتداء یہ ہے اور اعمالہم کسراپ کے ساتھ متصل ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ جب آخرت میں کافر اپنے عمل کے پاس آئے گا تو وہاں کچھ نہیں پائے گا اور وہاں اللہ کا عذاب پائے گا اس معنی کی صورت میں جاءہ میں ضمیر مرفوع کا مرجع کافر ہوگا ظہمان نہیں ہوگا اور منسوب ضمیر کا مرجع اس کا عمل ہوگا سراپ نہیں ہوگا۔

ع۔ اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے اور ایک کا حساب دوسرے کے حساب سے اسے غافل نہیں کرتا وہ اپنے بندوں کا حساب دنیا کے دنوں میں سے نصف دن کی مقدار میں لے لے گا۔

اَوْ كَلَّمْتِ فِيْ بَحْرٍ لَّيْطٍ يَّعْشُهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهِ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهِ سَحَابٌ
ظَلَمْتَ بَعْضًا فَاَوْقَى بَعْضٌ اِذَا اَخْرَجَ يِّنْكَ لَمْ يَكْدِيْرْهَا وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ
اللّٰهُ لَهُ نُوْمًا فَاِمَالَهُ مِنْ نُوْمٍ ۝

”یا (اعمال کفار) ایسے اندھروں کی طرح ہیں لے جو گہرے سمندر میں ہوتے ہیں چھارہی ہوتی ہے اس پر موج اس کے

اور پاک اور موج (اور) اس کے اوپر ابدل (تہہ در تہہ) اندھیرے ہیں ایک دوسرے کے اوپر ہے جب وہ نکالنا ہے اپنا

ہاتھ تو نہیں دیکھ پاتا اسے ع۔ اور (سچ تو یہ ہے کہ) جس کے لئے اللہ تعالیٰ نور نہ دینا تو اس کے لئے کہیں نور نہیں ہے۔“

لے کظلمت کا عطف کسراپ پر ہے اور انجیر کے لئے ہے، گویا مخاطب کو اختیار دیا گیا ہے کہ ان کی بد اعمالیوں کو سراپ یا

تاریکیوں میں سے جس کے ساتھ چاہے تشبیہ دے۔ کیونکہ ان کے اعمال نفع بخش نہ ہونے یا یومی کا باعث ہونے اور حسرت کا موجب ہونے میں سراب کی مانند ہیں اور نور حق سے خالی ہونے میں سمندرِ مومنوں اور بادل کی تہہ در تہہ تاریکیوں کی مثل ہیں۔ یا اتویج کے لئے ہے، یعنی ان کے اعمال اگر نیک ہیں مثلاً صدقہ، صلہ، رحمی وغیرہ تو یہ سراب کی مانند ہیں اور اگر برے اعمال ہیں تو وہ تاریکیوں کی مثل ہیں۔ یا اوقسیم کے لئے ہے یعنی ایک وقت میں ان کی تشبیہ سراب کے ساتھ ہے اور دوسرے وقت میں ان کی تشبیہ ظلمت کے ساتھ ہے۔ دنیا میں ان کے اعمال ظلمت کی طرح ہیں اور آخرت میں سراب کی مانند۔

ع. لجمی۔ جہاں پانی کثیر ہو اور بیج اتم منسوب ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں جہاں پانی گہرا ہو (۱)۔ نہ یہ اور قاموس میں اس طرح ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں موجزن دریا۔ بغشاه موج۔ یہ بحر کی صفت ہے اور موج وہ لہر ہے جو ہواؤں کے چلنے کی وجہ سے پانی پر ظاہر ہوتی ہے۔ سحاب کو بڑی نے ظلمت کی طرف مضاف کرنے کی وجہ سے بغیر جوین کے پڑھا ہے اور تو اس کی روایت میں سحاب مرفوع اور منون ہے اور ظلمات، کظلمات سے بدل ہونے کی وجہ سے بحر ہے۔ باقی قراء نے سحاب اور ظلمات دونوں کو مرفوع اور منون پڑھا ہے۔ مرفوع منون ہونے کی صورت میں یہ بہتدا محذوف کی خبر ہوں گے۔

ع. اسحوج، یدہ اور یومی میں حاضر کا مرتبہ و شخص ہے جو سمندر میں واقع ہے اگرچہ ما قبل میں اس کا ذکر نہیں ہے لیکن دلائل کلام کی وجہ سے گویا موجود ہے۔ اس طرح کافر کے اعمال تاریکیاں ہیں جو اس کے دل پر تہہ در تہہ چڑھی ہوئی ہیں ہدایت کا نور دیکھنے اور حق کے رخ زبیا کے ادراک سے مانع ہیں۔ پس کفر جو دل کا عمل ہے وہ گہرے سمندر کی مانند ہے پھر اس پر گناہوں کی تاریکیاں چھائی ہوئی ہیں جو مومنوں کی طرح تہہ در تہہ ہیں اور کافر کے دل پر مہرِ مومنوں پر بادل کی طرح ہے۔ جب کافر دین کے امور میں غور و فکر کرنے اور دین کی ہدایات کو پانے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اسے بدیہیات بھی نظر نہیں آتیں آپ دیکھتے ہیں کہ کافر انبیاء علیہم السلام کا انکار کرتا ہے حالانکہ ان کے عجزات ظاہر اور اظہر من الشمس ہوتے ہیں اور بد بخت چھروں کو سمیو دینا تا ہے جو ساری مخلوق سے کم مرتبہ ہیں۔

ع. یعنی ہدایت کی نہیں وہی امر ہے، بلکہ مقدمات کو ترتیب دیکر نتیجہ کا حصول بھی عادی اور عطائی امر ہے اہل حق کے نزدیک مقدمات کو ترتیب دینے کے بعد نتیجہ کا حاصل کر لینا واجب نہیں ہے۔ بہت سے لوگ جو دنیوی امور میں بڑے بھولے بھالے ہوتے ہیں لیکن آخرت کے امور کے سلسلہ میں بہت چست و چو بند ہوتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے لوگ جو دنیا کے معاملات میں بڑے چالاک اور شاطر ہوتے ہیں لیکن امورِ آخرت سے غافل ہوتے ہیں وہ دین کے معاملہ میں ڈنگروں کی طرح ہوتے ہیں۔ حضور ﷺ کے اس فرمان کا بھی یہی مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو تاریکی میں پیدا فرمایا پھر ان پر اپنا نور ڈالا پس جس نے وہ نور پا لیا وہ ہدایت پا گیا اور جو محروم رہا وہ گمراہ ہو گیا اسی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ اللہ کے علم پر قلم خشک ہو گیا ہے (2)۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں یہ آیت عتبہ بن ربیعہ کے متعلق نازل ہوئی وہ زمانہ جاہلیت میں دین کو تلاش کرتا تھا تاٹ کا لباس پہنتا تھا لیکن جب اسلام آیا تو اس نے انکار کر دیا (3)۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْبِغُ لَكُمْ لَمَنَ فِي السَّلْوَٰتِ وَالْأَمْرِضِ وَالطَّيِّبِ صَدَقَتْ كُلُّ قَدِّ

2- جامع ترمذی مع عارضہ الاحوالی جلد 10 صفحہ 790 (مطبعیہ)

1- تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیح زاہد، جلد 6 صفحہ 236 (اصحیہ)

3- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 210 (الکر)

عَلِمَ صَلَاتَهُ وَسُبْحَةَ وَاللَّهُ عَلَيْهِم بِمَا يَفْعَلُونَ ﴿٦١﴾

”کیا تم غور نہیں کرتے کہ بلاشبہ اللہ ہی ہے جس کی تسبیح بیان کرتے ہیں سارے آسمانوں والے اور زمین والے اور پرنے پر پھیلائے ہوئے۔ ہر ایک جانتا ہے اپنی (مخصوص) دعا اور اپنی تسبیح کو اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو وہ کرتے رہتے ہیں۔“

۱۔ کیا کشف صریح استدلال اور وحی سے حاصل ہونے والا علم یقین اور وثوق میں مشاہدہ کی طرح نہیں ہے؟ (یعنی وحی اور استدلال کے ذریعے آپ کو علم حاصل ہو چکا ہے) مگر انکلا اور وہ لشکر جنہیں اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے جو آسمانوں میں رہتے ہیں اور جن و انس وغیرہما جو زمین میں رہتے ہیں، یعنی تمام مخلوق اللہ کی ہر نفس اور عیب سے تقدیس بیان کر رہی ہے۔ ذوی العقول کو غلبہ دینے کی وجہ سے فن کا کلمہ ذکر فرمایا۔ تمام مخلوق مراد ہونے کی دلیل و الطیور صفات کا ارشاد ہے الطیور کو صفات کے ساتھ مقید فرمایا تاکہ نگرار لازم نہ آئے کیونکہ زمین میں رہنے والی مخلوق ضمن میں ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ صلاۃ سے مراد دعا ہے۔ ایک مفہوم یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم سے تسبیح کرنے والی چیز اپنی دعا اور تسبیح جاتی ہے۔

وَاللَّهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ ﴿٦٢﴾

”اور اللہ تعالیٰ کے لئے بادشاہی ہے سارے آسمانوں کی اور ساری زمین کی اور اللہ تعالیٰ کی طرف ہی (سب نے) لوٹنا ہے۔“

۱۔ یعنی آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے ذوات و صفات اور افعال و موجود ہیں سب کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ سب نے اسی کی بارگاہ میں لوٹنا ہے اور سب کو اپنے عمل کے مطابق جزا عطا فرمانے کا، حتیٰ کہ بغیر بیٹگوں والی بکری کا بیٹگوں والی بکری سے تفصا (بدلہ) لے گا۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُرِي جَنَىٰ سَحَابًا لَّهُمْ يُؤَلِّفُ بَيْنَهُمْ يَجْعَلُهُمُ رُكَّامًا فَتَرَىٰ الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خَلْقِهِمْ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ جِبَالٍ فِيهَا مِنْ بَرَدٍ فَيُصِيبُ بِهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَصْرِفُهُ عَنِ مَن يَشَاءُ طَيِّبًا ذُو سُنَابِقٍ يَدُّهُ يَدْهُبُ بِالنَّاصِرِ ﴿٦٣﴾

”کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ آہستہ آہستہ لے جاتا ہے بادل کو پھر جوڑتا ہے اس کے (بکھرے ہوئے ٹکڑوں) کو پھر اسے تہہ بہ تہہ کر دیتا ہے۔ پھر تو دیکھتا ہے بارش کو کہ ٹپتی ہے اس کے درمیان سے اور اتارتا ہے اللہ تعالیٰ آسمان سے برف جو پہاڑوں کی طرح ہوتی ہے پس نقصان پہنچاتا ہے اس سے جسے چاہتا ہے اور بچھیر دیتا ہے اس کو جس سے چاہتا ہے۔ قریب ہے کہ اس کی بجلی کی چمک لے جائے آنکھوں کی بینائی کو۔“

۱۔ یزجی تزجیہ سے مشتق ہے جس کا معنی کسی چیز کو دکھلانا ہے ردی چیزوں کو بضاۃ مزجا کہتے ہیں کیونکہ ہر شخص انہیں پرے دکھل دیتا ہے۔ یوسف کا معنی جمع کرنا ہے تہہ در تہہ چیز کو رگام کہتے ہیں۔ الودق کا معنی بارش ہے۔ من السماء سے من جبال بدل اشتمال ہے اور من دونوں مقامات پر ابتدا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوسرا من تعویضیہ ہو اور مفعول واقع ہو رہا ہو۔ من برد میں

منن بیان ہے۔ اور یہ جناب کا بیان ہے۔ کبھی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ وہ پہاڑ اتارتا ہے جو آسمان میں ہیں اور وہ پہاڑ اولوں کے ہیں اس بناء پر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خود بتایا ہے کہ آسمان میں برف کے پہاڑ ہیں (۱)۔ دوسری تفسیر پر معنی یہ ہوگا کہ وہ آسمان سے بعض بڑے بڑے برف کے ٹوڑے برساتا ہے جو جمود اور لڑائی میں پہاڑوں کے مشابہ ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوسرا من تعریفیہ ہو اور مفعول کی جگہ واقع ہو رہا ہو۔ فیصیب بہ میں یہی ضمیر کا مروجع ہر د ہے۔ یعنی اس برف کے ساتھ جس کے لئے چاہتا ہے اس کی کھچتی اور مال مویشی تباہ کر دیتا ہے۔ مسکا کا معنی روشنی ہے۔ یہ نہیب کو ابو جعفر نے باہ کے ضمہ اور باہ کے کسرہ کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے۔ اس قرأت پر باہ زائد ہوگی۔

يَقْلِبُ اللَّهُ الْآيَاتِ وَالنَّهَارَاتِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ ﴿٥٠﴾

”بدلی کرتا رہتا ہے اللہ تعالیٰ رات اور دن کی۔ لے بیٹک اس میں عبرت ہے آنکھوں والوں کے لئے ہے۔“

یعنی اللہ تعالیٰ دن کے بعد رات کو اور رات کے بعد دن کو لاتا ہے۔ یہ یا معنی کہ وہ ایک وقت میں اضافہ کرتا ہے اور دوسرے کے وقت میں کمی کرتا ہے۔ یہ یا معنی کہ گری، سردی، اندھیرا اور روشنی کے ذریعے دن رات کے حالات بدلتا رہتا ہے۔ یا اس سے بھی عام مفہوم ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ابن آدم زمانے کو برا بھلا کہہ کر مجھے مضرت دیتا ہے میں زمانہ (کو بدلتا) ہوں اور گردش لیل و نهار کا سلسلہ میرے بقدر قدرت میں ہے (۲)۔ جسے اللہ تعالیٰ نے قلبی بصیرت اور عقل سلیم عطا فرمایا ہے اس کے لئے ان مذکورہ چیزوں میں صانع کے وجود اس کے کمال قدرت کمال علم انفاذ مشیت اور اس کے غیر کی احتیاج سے منہرہ ہونے کی ہدایت اور حالات موجود ہے۔

وَاللَّهُ حَلَقَ كُلَّ دَابَّةٍ مِنْ مَّاءٍ فَمِنْهُمْ مَنْ يَشْتَبِي عَلَىٰ بَطْنِهِ ۗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَشْتَبِي عَلَىٰ رِجْلَيْهِ ۗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَشْتَبِي عَلَىٰ آسَائِهِ ۗ يَخْلُقُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٥١﴾

”اور اللہ نے پیدا فرمایا ہے ہر جانور کو پانی سے تو ان میں کچھ رنگتے ہیں پیٹ کے بل۔ اور ان میں سے بعض چلتے ہیں دو ٹانگوں پر اور ان میں سے بعض چلتے ہیں چار ٹانگوں پر۔ لے پیدا فرماتا ہے اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے بیٹک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔“

لے حوزہ اور کسائی نے خلق کو حلق دایبہ، یعنی اسم فاعل کا صیغہ مفعول کی طرف مضاف کر کے پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے خلق ماضی کا صیغہ پڑھا اور حلق کو مفعولیت کی بنا پر نصب دی ہے، یعنی حیوانات میں سے جو بھی زمین پر چلتا ہے ہر ایک کو پانی سے پیدا فرمایا ہے۔ یعنی پانی اس کے مادہ کا جز ہے یا مخصوص پانی مراد ہے، یعنی نطفہ اگر مخصوص پانی (نطفہ) مراد ہوگا تو غالبیت کا اعتبار ہوگا کیونکہ بعض حیوانات نطفہ سے پیدا نہیں ہوتے۔ بعض علا فرماتے ہیں من ماء؛ دایبہ کی صفت ہے۔ یہ خلق کے متعلق نہیں ہے اور دایبہ میں لاء کہ اور جن داخل نہیں ہیں۔ بعض علا فرماتے ہیں پانی تمام مخلوق کی اصل ہے۔ علاء بنوی لکھتے ہیں کہ اس قول کی دلیل یہ ہے کہ

اللہ تعالیٰ نے پہلے پانی کو پیدا فرمایا پھر اس کے بعض کو ہوا بنا دیا۔ پھر اس ہوا سے فرشتے پیدا فرمائے (۱)۔ بعض پانی کو آگ بنا دیا پھر اس سے جنی پیدا فرمائے، بعض پانی کو مٹی بنا دیا پھر اس سے آدم اور باقی تمام مخلوق پیدا فرمائی۔ بعض حیوانات پیٹ کے بل ریختے ہیں، جیسے سانپ اور دوسرے کبڑے۔ بعض دو ٹانگوں پر چلتے ہیں جیسے انسان اور پرندے اور بعض چار ٹانگوں پر چلتے ہیں جیسے چوہے، چوہے اللہ تعالیٰ نے ان حیوانات کا ذکر نہیں کیا جو چار سے زیادہ ٹانگوں پر چلتے ہیں مثلاً بچھو، کتا اور دوسرے کبڑے جن کے پاؤں زیادہ ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان کی صورت پر ہیں جو چار ٹانگوں پر چلتے ہیں۔ اور ضمیر کا مذکر ذکر کرنا عقلاء کو غلبہ دینے کی وجہ سے ہے اور مختلف اصناف سے تعبیر فرمایا تاکہ تفصیل اجمال کے موافق ہو جائے۔

یعنی اللہ تعالیٰ بسا اظہر کلمات وغیرہ اور وہ چیزیں جن کا ذکر ہو چکا ہے مادہ کے اتحاد کے باوجود صورتوں، بیضوں، حرکات، طبائع اور افعال کے اختلاف پر جو جو جاتا ہے پیدا فرماتا ہے اور جیسا اس کی حکمت تقاضا کرتی ہے ویسا کرتا ہے۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَا آيَاتٍ مُّبِيْنَةٍ ۙ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ اِلٰى صِرٰطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۰﴾

”ہم نے اتاری ہیں ایسی آیتیں جو (جن کو) صاف صاف بیان کرتی ہیں اور اللہ تعالیٰ پہنچاتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھی راہ تک۔“

یعنی قرآن کریم میں یا عالم وجود وظلی میں ایسے دلائل مآول کئے ہیں جو صانع کے وجود اور اس کے علیم حکیم اور قدر ہونے پر شاہد ہیں اور وہ دلائل جن کو ظاہر کرتے ہیں۔ صراط مستقیم سے مراد دین اسلام ہے جو مراتب قرب تک پہنچاتا ہے نیز جنت تک پہنچانے اور دوزخ سے نجات کا باعث ہے۔

خلاصہ یہ کہ دولت ایمان عطائی اور وہی چیز ہے۔ تو فیض الہی اور ہدایت الہی کے بغیر دلائل میں غور فکر سے حاصل نہیں ہوتی۔

علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ بشر نامی ایک منافق شخص تھا جس کا زمین کے متعلق ایک یہودی سے تنازعہ تھا یہودی نے بشر کو کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس جاتے ہیں اور فیصلہ کراتے ہیں۔ بشر منافق کہنے لگا کعب بن اشرف سے فیصلہ کراتے ہیں کیونکہ محمد (ﷺ) تو ہم پر ظلم کرتے ہیں (۲) اس وقت یہ ارشاد نازل ہوا۔

وَيَقُولُونَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالرَّسُوْلِ ۙ وَاَطَعْنَاْهُمۡ يَتَوَلّٰوۡنَا فَرِيْقًا مِّنْهُمۡ مِّنۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۙ وَمَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰﴾

”اور وہ کہتے ہیں ہم ایمان لائے ہیں اللہ تعالیٰ پر اور (اس کے) رسول پر اور ہم فرما نبردار ہیں پھر منہ پھیر لیتا ہے ایک فریق ان سے (ایمان و اطاعت کے) اس دعویٰ کے بعد اور یہ لوگ ایماندار نہیں ہیں۔“

یعنی بقولوں کا فاضل، بشر اور اس جیسے دوسرے منافق ہیں۔ یعنی پہلے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فرمانبردار اور اطاعت گزار ہیں لیکن جب ان کا کوئی فیصلہ ان کی خواہش کے خلاف ہوتا ہے تو منہ پھیر لیتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کی سرطابی کرے وہ ایمان دار نہیں۔ اس آیت میں اشارہ ہے کہ منافق اگر چاہی زبانوں کے ساتھ ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ان کے دل اس نعت سے محروم ہیں۔ اولئک کا مشار الیہ یا تو وہ لوگ ہیں جو حق پر نہیں تھے یا وہ فریق ہے جنہوں نے منہ پھیر لیا تھا۔

المؤمنین پر الف لام اس بات پر دلالت کرنے کے لئے لگایا ہے کہ جن کو تم مؤمن جانتے ہو یہ بد بخت ان میں سے نہیں ہیں اللہ تعالیٰ ان مؤمنین کے اخلاص اور صدق کو جانتا ہے۔

ابن ابی حاتم نے حضرت حسن سے ایک مرسل حدیث نقل کی ہے کہ ایک شخص تھا جس کا کسی دوسرے کے ساتھ جھڑا ہوتا اور یہ حق پر ہوتا اور پھر نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں فیصلہ کرانے کے لئے بلایا جاتا تو وہ اطاعت کرتا اور یقین رکھتا کہ حضور ﷺ صحیح فیصلہ فرمائیں گے اور اگر اس شخص کا ارادہ کسی پر ظلم کرنا ہوتا تو اس وقت بارگاہ نبوت میں اسے دعوت دی جاتی تو وہ اعراض کرتا اور کہتا فلاں کے پاس جائیں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔

وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿٥٠﴾

”اور جب وہ بلائے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف تاکہ فیصلہ کرے ان کے درمیان تو اس وقت

ایک جماعت ان میں سے روگردانی کرنے لگتی ہے۔“

یعنی جب انہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کی طرف بلایا جاتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے جب انہیں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں بلایا جاتا ہے۔ رسولہ کا ارشاد تفسیر کے قائم مقام ہے جیسے کہ اس جملہ میں ہے اَعْلَجِيْنِي زَيْدٌ وَكُومَةُ۔ اذا دعوا کا جملہ ما اولنک بالمومنین پر یا بقولون پر معطوف ہے۔ یعنی انہیں بلایا جاتا ہے کہ رسول کریم ﷺ کی بارگاہ میں آؤ تاکہ رسول کریم ﷺ حکم الہی کے مطابق فیصلہ فرمائیں تو وہ اس حکم سے یا ایمان سے اعراض کرتے ہیں۔ (یعنی جب انہیں علم ہوتا ہے کہ ہمارے جھگڑے کی بنیاد جھوٹ اور باطل پر ہے)

وَإِن يَسْأَلْكُمُ الْعَلَمُ يَا تَأْتُوا إِلَيْهِمْ مُذْعِنِينَ ﴿٥١﴾

”اور اگر فیصلدان کے حق میں ہونا ہو تو (بھاگے) چلے آتے ہیں اس کی طرف تسلیم کرتے ہوئے۔“

الہیہ کی ضمیر کا مرجع رسول اللہ ﷺ ہیں۔

أَفِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ أَمْ امْتَابُوا أَمْ يَخَافُونَ أَنْ يَحْجِبَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَسُولُهُ بَلْ أُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٥٢﴾

”کیا ان کے دلوں میں (نفاق کی) بیماری ہے یا وہ (اسلام کے متعلق) شک میں مبتلا ہیں یا انہیں یہ اندیشہ ہے کہ ظلم کرے گا اللہ تعالیٰ ان پر اور اس کا رسول بلکہ (درحقیقت) وہ خود ظالم ہیں۔“

یعنی کیا ان کے دلوں میں کفر ہے اور ظلم کی طرف میلان ہے یا انہوں نے آپ کی ذات میں کوئی چیز دیکھی ہے جس نے ان کے اس یقین اور وثوق کو ٹھیس پہنچائی ہے جو یہ آپ ﷺ کے متعلق رکھتے تھے یا انہیں اندیشہ ہے کہ ان پر اللہ اور اس کا رسول ﷺ فیصلہ کرنے میں ظلم کریں گے، (ہرگز نہیں) بلکہ یہ کفر اختیار کر کے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرنے کی وجہ سے اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں یا لوگوں پر ظلم کرتے ہیں کہ یہ ان کے مال باطل ذرائع سے کھانے کا ارادہ کرتے ہیں۔ یہ آخری دو قسموں سے ضرب ہے، کیونکہ پہلی قسم متحقق ہے کہ ان کا بارگاہ رسالت ﷺ میں فیصلہ کے لئے حاضر ہونا یا تو اس لئے ہے کہ ان کے دلوں میں کوئی کھوٹ اور مرض ہے۔ یا حاکم میں کوئی کمی ہے۔ دوسری صورت میں کہ حاکم میں ان کے نزدیک کی تحقیق تھی یا متوقع تھا۔ یہ دونوں

صورتیں باطل ہیں، کیونکہ منصب نبوت اور آپ ﷺ کا فرط امانت ان چیزوں سے مانع ہے۔ (یعنی نبی کی ذات میں فیصلہ کرنے کی صورت میں کوئی ظلم و تعدی کا اندیشہ نہیں ہوتا اس کا منصب عالی ایسے فعل سے بلند ہوتا ہے) یہیں ہی صورت ہی متفق ہوتی ہے کہ بارگاہ نبوت میں حاضر نہ ہونے کا سبب ان کے دل کا کھوٹ ہے اور اس کی تائید پہلا ارشاد بھی کرتا ہے کہ اگر انہیں اپنے حق میں فیصلہ ہونے کا یقین ہو تو دوڑتے چلے آتے ہیں۔ اولک کے بعد ضمیر فصل ہے دوسرے لوگوں سے اس حکم کی نفی پر دلالت کرنے کے لئے لگائی گئی ہے خصوصاً مدعا الیہ یعنی رسول کریم ﷺ کی ذات سے ظلم کی نسبت ختم کرنے کے لئے ضمیر فصل لگائی ہے۔

منافقین کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے مخلص موہبین کا ذکر فرمایا ہے اور ان کے لئے جو مناسب فوز و فلاح کا راستہ ہے اس کا ذکر فرمایا۔

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۗ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴿٥١﴾

”ایمانداروں کی بات تو صرف اتنی ہے کہ جب انہیں بلایا جاتا ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف تاکہ وہ فیصلہ فرمادے ان کے درمیان تو وہ کہتے ہیں ہم نے فیصلہ سن لیا اور ہم نے اطاعت کی اور یہی لوگ دونوں جہانوں میں ہمارا دین ہے۔“

۱۔ قول کان کی خبر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور اس کا اسم ان بقولوا ہے۔

وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَّقِ اللَّهَ وَيَتَّقِ اللَّهَ وَلِيكُمُ الْقَائِدُونَ ﴿٥٢﴾

”اور جو شخص اطاعت کرتا ہے اللہ کی اور اس کے رسول کی اور ڈرتا رہتا ہے اللہ سے اور بچتا رہتا ہے اس (کی نافرمانی) سے تو یہی لوگ کامیاب ہیں۔“

۱۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتا ہے خواہ اس کو اس اطاعت میں تکلیف ہو یا خوشی ہو۔ اور اپنے گناہوں کے متعلق ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہتا ہے اور احکام الہی کی مخالفت کا اندیشہ اسے بھرہ داسن گیر رہتا ہے۔ اور وہ احکام کی پیروی اور نواہی سے اجتناب اور حدود و فرامین کی فرمانبرداری کا مظاہرہ کر کے اس کے عذاب سے بچتا رہتا ہے تو ایسا خوش نصیب دائمی نعمتوں کے ساتھ کامیاب و کامران ہوگا۔

حفظ نے بقیہ کو قاف کے سکون اور ما قبل سکون کی وجہ سے ہائے کسرہ کو اختلاس کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہاں صورت میں پڑھا جاتا ہے جب جزم کی وجہ سے یا ہ ساقط ہو۔ ما قبل کو ساکن کرتے ہیں عرب کہتے ہیں لَمْ أَفْتِرْ طَعَامًا رَاءَ السُّكُونِ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ ابوبکر ابو عمر اور خالد بن عمر سے روایت کر کے وصل اور وقف دونوں صورتوں میں ہاء کے سکون کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ باقی قراء ہاء کو کسرہ دیتے ہیں۔ ابو جعفر قالون اور یعقوب اختلاس کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ باقی قراء ما قبل متحرک ہونے کی وجہ سے اشباع کرتے ہیں۔

وَاقْسُمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ آيَاتِهِمْ لِيُنْزِلَ عَلَيْهِمْ لِيَخْرُجُنَّ قُلْ لَا تُقْسِمُوا بِطَاعَتِهِ مَعْرُوفَةٌ ۗ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿٥٣﴾

”اور قسمیں اٹھاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی بڑے زور و شور سے کہ اگر آپ انہیں حکم دیں تو وہ (گھروں سے بھی) نکل جائیں گے۔“ فرمائیے قسمیں نہ لکھاؤ۔ تمہاری فرمانبرداری خوب معلوم ہے یقیناً اللہ تعالیٰ خوب واقف ہے جو کچھ تم کرتے رہتے

ہو۔ ل

۱۔ اس آیت میں منافقین کے طریقہ کار کو بیان کیا جا رہا ہے جہاد کا لفظ یا تو مفعول مطلق کی حیثیت سے منسوب ہے یا اقساموا کے فاعل سے حال ہے۔ یعنی بڑی بلیغ قسمیں اٹھاتے ہیں۔ جہد الیمین کا لفظ جہد نفسہ سے مستعار ہے، جس کا معنی انتہائی کوشش کرنا ہے یا جہد مفعول فیہ ہے، یعنی وجہدہم ایمانہم۔ یعنی پرزور قسمیں اٹھانے کے وقت۔ یعنی قسمیں اٹھاتے ہیں کہ اے محمد، ﷺ اگر آپ گھر بار اور مال و متاع چھوڑنے کا حکم دیں گے اور جہاد کا اشارہ فرمائیں گے تو ہم نکل پڑیں گے۔ لیخروجن، اقساموا کا دیکھنا یہ جواب ہے۔ اور معنی شرط کی جڑا ہے۔ امام بیہقی لکھتے ہیں منافقین رسول اللہ ﷺ کے پاس بڑے چوڑے دعوے کرتے کہ جہاں جناب ہوں گے ہم بھی آپ کے ساتھ ہوں گے، آپ اگر کسی ہم پر نکلیں گے تو ہم بھی آپ کی معیت میں نکلیں گے، اگر آپ کہیں رک جائیں گے تو ہم بھی رک جائیں گے، اگر آپ ہمیں جہاد کا حکم دیں گے تو ہم سر دھڑکی بازی لگا دیں گے (۱)۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے پیارے جو بیب انہیں فرمائیے کہ جھوٹی قسمیں نہ اٹھاؤ۔

۲۔ مجاہد فرماتے ہیں طاعة معروفة سے مراد باطنی دعوے ہیں جن کے پیچھے اعتقاد کی قوت نہ ہو۔ یعنی تمہارا ہر کسی کو پتہ ہے کہ تم جھوٹ بولتے ہو اور تمہارے قول و فعل میں ہمیشہ تضاد ہوتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ خالص نیکی جھوٹے وعدہ سے افضل ہے۔ مقاتل بن سلیمان کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری طرف سے طاعت معروف ہونی چاہئے (۲)۔ بعض فرماتے ہیں تمہاری طرف سے فقط طاعت معروف مطلوب ہے۔ نفاق آمیز قسموں کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ پر تمہارے دلوں کے بھید بھی مخفی نہیں ہیں۔

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكُمْ صَاحِبُكُمْ وَعَلَيْكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَإِن تَطِيعُوا لَتَهْتَدُوا وَإِصْلَاحُ عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاءُ الْمُبِينُ ﴿۱۰﴾

”آپ فرمائیے اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت کرو رسول (ﷺ) کی پھر اگر تم نے روگردانی کی تو (جان لو) رسول کے ذمہ اتنا ہے جو ان پر لازم کیا گیا۔ اور تمہارے ذمہ ہے جو تم پر لازم کیا گیا۔ اگر تم اطاعت کرو گے اس کی تو ہدایت پا جاؤ گے اور نہیں ہے (ہمارے) رسول کے ذمہ بجز اس کے کہ وہ صاف صاف پیغام پہنچا دے۔“

۱۔ (قل) تاکید کے لئے امر کو کمر ڈر فرمایا۔ فان تولوا اصل میں تنولوا تھا۔ یہ مضارع کا صیغہ ہے ایک تاکو حذف کیا گیا ہے۔ فان کی جزاء محذوف ہے۔ فانما علیہ۔ اس جزاء کی علت ہے جو جزاء کے قائم مقام رکھی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اعراض کرو گے تو اس کا خسارہ تمہیں ہوگا۔ رسول کرم ﷺ کا تو کوئی نقصان نہ ہوگا کیونکہ اس کی جو ذمہ داری تھی اس نے بحسن و خوبی ادا فرمادی ہے اور تم پر جو لازم تھا تم نے اسے جس پشت ڈال دیا اس لئے اس کا نقصان بھی تم پر ہوگا۔ وان تطیعوا کا عطف ان تولوا پر ہے۔ یعنی اگر تم محمد ﷺ کے حکم کی اطاعت کرو گے تو نورح کو پالو گے اور جنت کے راستہ پر گامزن ہو جاؤ گے۔ میرے محبوب کے ذمہ تو فقط اتنا ہے کہ جن احکام کے تم مکلف بنائے گئے ہو اس کو صاف صاف بیان کرنا ہے۔

حاکم اور طبرانی نے ابی بن کعب سے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح بھی کہا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام مدینہ طیبہ ہجرت کر کے پہنچے تو انصار نے ان کو اپنے گھروں میں جگہ عطا کی اس مہمان نوازی اور تعاون پر عرب انصار کے دشمن بن گئے۔ اس دشمنی

کی وجہ سے انصار صحیح و شام تھیاریا رٹھائے رہتے تھے۔ تو ان کے دل میں یہ حسرت اٹھتی کہ کبھی ہم بھی ایسی زندگی گزاریں گے کہ رات آرام و سکون سے بسر ہوگی اور ہمیں اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی کا خوف نہ ہوگا اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (1)۔

وَعَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسَّخِفَنَّاهُمْ فِي الْأَمْثَالِ كَمَا
اسْتَخَفَّ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ لَيُبَيِّنَنَّ لَهُمْ ذُنُوبَهُمْ الَّتِي امْرَأَتِي لَهُمْ وَ
لَيُبَيِّنَنَّ لَهُمْ مِمَّنْ بَعْدَ خَوْفِهِمْ أُمَّنًا يُعْبُدُونَ فِي شَيْءٍ وَ مِمَّنْ كَفَرَ
بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿٥٥﴾

”وعدہ فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے تم میں سے اور نیک عمل کئے۔ کہ وہ ضرور خلیفہ بنائے گا انہیں زمین میں جس طرح اس نے خلیفہ بنایا ان کو جو ان سے پہلے تھے۔ اور مستحکم کر دے گا ان کے لئے ان کے دین کو جسے اس نے پسند فرمایا ہے ان کے لئے اور وہ ضرور بدل دے گا انہیں ان کی حالت خوف کو اس سے۔ وہ میری عبادت کرتے ہیں کسی کو میرا شریک نہیں بناتے۔ اور جس نے ناشکری کی اس کے بعد تو وہی لوگ نافرمان ہیں۔“

۱۔ الذین آمنوا سے مراد وہ خوش نصیب ہیں جو آیت کے نزول کے وقت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ موجود تھے۔ تمام مشومین مراد نہیں ہیں کیونکہ اس وقت استدراک لازم آئے گا کیونکہ الذین آمنوا کا کلمہ اس کے لئے مفید نہیں ہے۔

۲۔ لیستخلفنہم معذوف قسم کا جواب ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگی وعد اللہ واقسم، یعنی اللہ نے وعدہ فرمایا اور قسم اٹھائی ہے کہ وہ ضروری خلیفہ بنائے گا انہیں۔ یا وعدہ اپنے تحقق میں قسم کے قائم مقام ہے۔ یعنی ہم عرب و عجم کے کفار کی زمین کا انہیں وارث بنائیں گے اور ہم انہیں خلفاء، بادشاہ بنائیں گے جن کی اطاعت واجب ہوگی یا یہ معنی کہ ہم زمین میں انہیں ایسا تصرف عطا کریں گے جیسا غلاموں میں مالکوں کا تصرف ہوتا ہے۔

۳۔ کما میں کاف مثل کے معنی میں ہو کہ مصدر معذوف کی صفت ہے۔ یعنی ہم انہیں اس طرح خلافت عطا فرمائیں گے جیسے ان سے پہلے انبیاء کرام مثلاً داؤد اور سلیمان وغیرہما (علیہم السلام) کو عطا فرمائی تھی۔ قتادہ نے یہی مفہوم بیان کیا ہے (2)۔ یا یہ معنی کہ جس طرح بنی اسرائیل کو خلافت عطا فرمائی کہ مصر اور شام کے چار حکمرانوں کو تباہ کیا اور ان کی جائیدادوں، گھروں اور اموال کا بنی اسرائیل کو مالک بنا دیا۔ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے تورات میں موسیٰ علیہ السلام سے وعدہ فرمایا کہ شام کے شہروں کی فتح عطا کی جائے گی۔ لیکن یہ وعدہ موسیٰ علیہ السلام کی حیات طیبہ میں پورا نہ ہوا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فَإِنَّهَا مَحْكُومَةٌ عَلَيْهِمْ سَنَةً يَتَّبِعُونَ فِي الْأَمْثَالِ۔ (یہ سز میں حرام کر دی گئی ہے ان پر چالیس سال تک سرگرداں پھریں گے زمین میں) پھر ان کے بعد یوشع بن نون کو خلیفہ بنایا اور اوران کے ہاتھوں یہ وعدہ پورا ہوا حتیٰ کہ انہوں نے شام کو فتح کیا اور موسیٰ علیہ السلام کی وصیت کے مطابق شام کے شہروں کو بنی اسرائیل میں تقسیم فرمایا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کریم محمد ﷺ سے وعدہ فرمایا کہ اس کے دین کو تمام ادا یا ان پر غلبہ عطا فرمائے گا اور وعدہ فرمایا کہ درمیوں کو ایرانیوں پر غلبہ عطا فرمائے گا۔ تو یہ سارے وعدے نبی کریم ﷺ کی حیات ظاہرہ میں پورے نہ ہوئے بلکہ اللہ تعالیٰ نے ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آپ ﷺ کا جانشین بنایا اور ان کے ہاتھوں

اس وعدہ کو پورا فرمایا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بنی حنیفہ اور عرب کے دوسرے مردہین سے جنگ کر کے وہاں غلبہ پایا اور شام سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں فتح ہوا۔ سنہ 9 ہجری میں۔

یہ وعدہ خلافت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں پورا ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اصحاب نبی ﷺ سے عراق کی طرف لشکر کشی کا مشورہ طلب کیا تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی آیت کو دلیل بناتے ہوئے جہاد کرنے کا مشورہ دیا۔ یہ قول حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہماری اہل سنت کی کتب میں متعدد طرق سے مروی ہے۔ لیکن صحیح ابلاغہ جو اہل تشیع کی معتبر کتب میں سے ہے اس میں بھی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول اسی طرح مروی ہے۔

اس کام کی فتح کثرت تعداد کی وجہ سے اور اس کی ناکامی قلت کی وجہ سے نہیں یہ اللہ تعالیٰ کا دین ہے جس کو اس نے غلبہ عطا فرمایا ہے یہ اللہ کا لشکر ہے جس کو اس نے خود تیار کیا ہے اور جس کی مدد اس نے خود فرمائی ہے، حتیٰ کہ وہ ترقی کی اس منزل تک پہنچا جہاں تک پہنچا۔ ہمارے ساتھ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے آپ نے اسی آیت وعد اللہ الذین آمنوا کی طرف اشارہ فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کو ضرور پورا فرمائے گا اور اپنے لشکر کی ضرورتاً سید فرمائے گا۔

ابو بکر نے استخلاف کو مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے معروف پڑھا ہے۔

سید ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں ولیمکن البغ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں شہروں میں وسعت عطا فرمائے گا حتیٰ کہ وہ انہیں ملکیت عطا فرمائے گا اور ان کے دین اسلام کو تمام ادیان پر غلبہ عطا فرمائے گا۔ ابن کثیر ابو بکر اور یعقوب نے ولید لہم کو تخفیف کے ساتھ اور اباء کے سکون کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے باقی قراء نے تشدید کے ساتھ اور فتح کے ساتھ باب تفعیل سے پڑھا ہے۔

یہ بعد و نسی کا جملہ الذین آمنوا منکم سے حال ہے، کیونکہ وعدہ تو حیدر پر ثابت قدم رہنے کے ساتھ مقید ہے یا یہ جملہ خلافت عطا فرمانے کے مقصود کے بیان کے لئے جملہ مستلف ہے اور لا یشروکون بعد و نسی کے فاعل سے حال ہے یا اسم موصول سے بعد و نسی کے لئے حال مرادف ہے۔

ابو العالیہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اکرم ﷺ کو جزیرہ عرب پر غلبہ عطا فرمایا تو وہ دولت ایمان سے شرف ہوئے اور تمہیں یار ڈال دیئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اکرم ﷺ کی روح کو قبض فرمایا۔ پھر سیدنا ابو بکر صدیق سیدنا عمر فاروق اور سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے زمانہ تک امن و آشتی کی فضا میں رہے۔ حتیٰ کہ پھر فتنوں میں جتلا ہو گئے اور نعمتوں کی ناشکری شروع کر دی (1)۔ ابو العالیہ کہتے ہیں نبی کریم ﷺ سلسلہ وحی کے شروع ہونے کے بعد دس سال صحابہ کرام کی معیت میں مکہ کے اندر ٹھہرے رہے اور اس دور میں صحابہ کرام کو کفار کی اذیتوں اور ظلم و ستم کو صبر کے ساتھ برداشت کرنے کا حکم تھا۔ پھر صحابہ کرام کو مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم ملا اور جنگ کرنے کی اجازت بھی مل گئی۔ صحابہ کرام ہر وقت خوفزدہ رہتے اور ہر وقت مسلح رہتے تھے۔ ایک صحابی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کیا ایسا دن بھی آئے گا کہ ہم امن و سکون کے ساتھ ہوں گے اور تمہیں ارٹھانے کی تکلیف سے چھٹکارا مل جائیگا۔ اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (2)۔

ابن ابی حاتم نے براہِ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت ہمارے متعلق نازل ہوئی ہے ہم ہر وقت سب سے سب سے رہتے تھے (۱) کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا فرمایا اور خوف کو امن سے تبدیل فرمایا اور زمین کو ہمارے لئے کشادہ فرمایا۔ یہ آیت نبوت کی صحت پر بہت بڑی دلیل ہے کیونکہ اس میں ایک غیب کی خبر ہے اور پھر وہی سہا ہوا جیسا ارشاد فرمایا تھا۔ دوسرا اس آیت میں خلفاء راشدین کی خلافت کی صحت کی بھی دلیل ہے کیونکہ اگر خلفاء راشدین کی خلافت مراد نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ کے وعدہ میں خلف لازم آتا کیونکہ وعدہ اور جن سے وعدہ کیا گیا تھا دونوں چیزیں خلافت راشدہ کے دور میں ہی موجود تھیں تیسرا اس آیت میں اہل سنت والجماعت کے مذہب کے حق ہونے کی بھی دلیل ہے جسے اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا ہے اور اس میں رافضیوں کے مذہب کے بطلان کی بہت بڑی دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ آج تک ائمہ خوفزدہ ہیں اور خوفزدہ رہیں گے حتیٰ کہ مہدی علیہ السلام کا ظہور ہوگا اور مہدی علیہ السلام اب دشمنوں کے خوف سے چھپے ہوئے ہیں۔ رافضیوں کا یہ کہنا کہ ”اللہ تعالیٰ اس وعدہ کو اس وقت پورا فرمائے گا جب مہدی علیہ السلام کا ظہور ہوگا“ ان کا یہ قول باطل ہے اور ان کے اس قول کی تردید آیت میں موجود منکم کا کلمہ کرتا ہے۔ دین کا وہ کونسا غلبہ ہوگا؟ اگر گیارہ مہینوں بعد چند سال غلبہ ہو بھی جائے۔ یہ لوگ کہتے جاہل ہیں!

حضرت سفینہ جو رسول اللہ ﷺ کے غلام تھے وہ فرماتے ہیں میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ میرے بعد خلافت تیس سال ہوگی پھر بادشاہی ہوگی۔ پھر حضرت سفینہ نے فرمایا کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت دو سال حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت دس سال اور عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت بارہ سال اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت چھ سال رہی۔ عدی بن حاتم فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر تھا کہ ایک شخص حاضر ہوا اور اپنی تنگدستی اور فقر کی شکایت کی۔ پھر دوسرا شخص آیا اور ڈاکوؤں کا لشکر کیا حضور ﷺ نے فرمایا اے عدی، کیا تو نے حیرہ کا شیر دیکھا ہے؟ میں نے عرض کیا حضور ایسا اتفاق نہیں ہو لیکن مجھے اس کے متعلق کچھ بتایا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اگر تیری زندگی لمبی ہوئی تو تو دیکھے گا کہ ایک عورت اونٹنی پر سوار ہو کر حیرہ سے روانہ ہوگی اور کعبہ کا طواف کرے گی اور اسے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کا ذکر نہ ہوگا۔ میں دل میں سوچنے لگا کہ نبی طے قبیلہ کے ڈاکو کہاں چلے جائیں گے؟ پھر فرمایا اگر تیری زندگی دراز ہوئی تو تم کسریٰ کے خزانے فتح کرو گے میں نے کہا حضور ﷺ! کسریٰ سے مراد کسریٰ بن ہرہز ہے؟ فرمایا ہاں کسریٰ بن ہرہز۔ پھر فرمایا اگر تیری زندگی لمبی ہوئی تو تم دیکھو گے کہ ایک شخص ہاتھوں میں سونا اور چاندی اٹھائے ایسے شخص کی تلاش میں ہوگا جو اس کا صدقہ قبول کرے۔ اور تم میں سے کوئی اپنے رب سے ملے گا جس دن وہ اس سے ملاقات کرے گا اور اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان کوئی ایسا ترجمان نہیں ہوگا جو ترجمانی کرے گا اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کیا میں نے تیری طرف رسول نہیں بھیجا تھا تا کہ وہ تجھے تبلیغ کرے؟ بندہ عرض کرے گا کیوں نہیں۔ وہ تیرا رسول کرم ﷺ تشریف لایا تھا پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا میں نے تجھے مال نہیں عطا کیا تھا اور تجھ پر فضل نہیں کیا تھا؟ بندہ عرض کرے گا واقعی مال بھی عطا فرمایا تھا اور فضل و احسان بھی بے شمار فرمایا تھا۔ پس وہ اپنے دامن بائیں جنم دیکھے گا (2) عدی فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ آگ سے بچو اگرچہ گھجور کے نصف حصہ کو صدقہ کر کے بھی بیچ سکو۔ اگر گھجور کا نصف حصہ بھی جس کے پاس نہ ہو تو اونچی گفتگو کے ذریعے بچو۔ عدی فرماتے ہیں میں نے حیرہ سے اونٹنی پر سوار ہو کر آنے والی عورت کو کعبہ کا طواف کرتے ہوئے دیکھا اور اسے اللہ تعالیٰ کے سوا

کسی کا خوف نہ تھا۔ اور میں ان لوگوں میں تھا جنہوں نے کسریٰ بن ہرملہ کے خزانے فتح کئے تھے۔ اگر زندگی دراز ہوئی تو وہ سب کچھ ظاہر ہوگا جو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ایک شخص ہاتھوں میں سونا چاندی اٹھائے ہوئے ہوگا (1) لیکن کوئی غریب مسکین نہیں ملے گا۔

۱۔ اور جس نے مؤمنین کی تمکین اور استحفاف اور ان کے دین حنیف کی تائید کا آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کے بعد ناشکر کی یا مرتد ہو گیا تو ایسے لوگ دائرہ ایمان سے نکلنے والے ہیں یا حد اطاعت سے خروج کرنے والے ہیں۔ علامہ بغوی کہتے ہیں کہ علامہ تفسیر فرماتے ہیں سب سے پہلے جن لوگوں نے اس نعمت کا انکار کیا وہ لوگ ہیں جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قتل کیا۔ جب انہوں نے آپ کو قتل کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے حالات بدل دیئے اور ان پر خوف طاری کر دیا۔ حتیٰ کہ بھائی بھائی بن جانے کے بعد آپس میں جنگ و جدل اور قتل و غارت پر اتر آئے (2)۔ علامہ بغوی نے اپنی سند سے حمید بن بلال سے روایت کیا ہے کہ عبد اللہ بن سلام نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق بتایا کہ جب سے رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ میں تشریف لائے ہیں فرشتے اس شہر کے ارد گرد رہتے ہیں اور آج تک معاملہ اسی طرح ہے۔ قسم بخدا اگر تم نے عثمان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو قتل کر دیا تو فرشتے چلے جائیں گے اور پھر کبھی واپس نہ آئیں گے۔ قسم بخدا! جو شخص انہیں قتل کرے گا وہ اللہ کی بارگاہ میں مجذوم ہو کر جائے گا اور اس کا ہاتھ ہوگا اور اللہ کی تلوار ہمیشہ نیام میں رہتی ہے۔ واللہ اگر وہ اسے سوت لے گا تو وہ اسے نیام میں نہیں ڈالے گا۔ (ابدأ کا لفظ فرمایا یا الہی یوم القیامۃ کا فرمایا) کوئی نبی قتل نہیں کیا گیا لیکن اس کے بدلہ میں بیستیس ہزار افراد قتل ہوئے اور کوئی خلیفہ نہیں ہوا مگر اس کے بدلہ میں بیستیس ہزار افراد قتل ہوئے (3)۔ میں کہتا ہوں خلفائے راشدین کے خلیفہ بنانے کا انکار ارضیوں اور خارجیوں کے گروہوں نے کیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ من کفر بعد ذالک کے ارشاد کا اشارہ یزید بن معاویہ کی طرف ہو، کیونکہ اس نے رسول اللہ ﷺ کے نواسے حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ کے ساتھ دوسرے اہل نبوت کو شہید کیا اور آپ ﷺ کی اولاد کی اہانت کی اور پھر اس فعل فیج پر اس نے فخر کا اظہار کیا۔ کہنے لگا یہ دن بدر کے دن کا بدلہ ہے۔ اس بد بخت نے مدینہ طیبہ پر حملہ کرنے کے لئے لشکر بھیجا اور واقعہ حرہ میں مدینہ طیبہ میں جو اس نے طوفان بد تمیزی برپا کیا (الایمان والحق)۔ اسی طرح مسجد نبوی ﷺ جس کی بنیاد پہلے دن سے ہی تقویٰ پر رکھی گئی تھی (اس میں اس نے گھوڑے باندھے)۔ بیت اللہ شریف پر مجاہدین نصب کیں۔ ابن زبیر کو قتل کیا۔ کونسا جرم تھا جو اس بد بخت نے نہیں کیا۔ حتیٰ کہ اس نے اللہ کے دین کا بھی انکار کیا۔ اور شراب کو مباح قرار دیا۔

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَطِيعُوا الرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿۵۱﴾

”اور صحیح ادا کیا کرو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ اور اطاعت کرو رسول (پاک ﷺ) کی تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔“

۱۔ اقیموں! کا جملہ اپنے معظوظات سے ملکر و اطعیوا اللہ پر معظوف ہے کیونکہ درمیان والی کلام مامور بہ پر وعدہ ہے اور اطاعت رسول ﷺ کے امر کا نکر اتا کید کے لئے ہے اور اطاعت رسول کے ساتھ رحمت کو معلق کرنے کیلئے ہے۔

لَا تَصَدِّقَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَمْعَظِينَ فِي الْأَرْضِ وَمَا لَهُمُ النَّارُ ۖ وَلَيْسَ

الْمَصِيرُ ﴿۵۲﴾

”یہ خیال ہرگز نہ کیجئے کہ کفار عاجز کرنے والے ہیں (ہمیں) زمین میں اور ان کا ٹھکانا آتش (جہنم) ہے اور یہ بہت برا ٹھکانا ہے۔“

ابن عامر اور حمزہ نے لا یحسبن غائب کا صیغہ پڑھا ہے اور اسم موصول اس کا فاعل ہے۔ اور باقی قراء نے خطاب کا صیغہ پڑھا ہے اور یہ خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے اور اسم موصول مفعول مفعول ہے۔ وما واہم النار اسم موصول سے حال ہے یا معنی کے اعتبار سے لا تحسبن پر معطوف ہے۔ پس کا مخضوص بالذم النار ہے۔ لا تحسبن کا جملہ عید ہے اور من کفر بعد ذالک کے ساتھ متصل ہے۔

ابن ابی حاتم نے مقاتل بن حبان سے روایت کیا ہے کہ اسما بنت مرثد کا ایک غلام تھا جو اکثر ان کے پاس ایسے وقت میں آتا جس میں آپ انکا آنا پسند کرتی تھیں۔ حضرت اسما، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی کہ ہمارے غلام ایسے اوقات میں ہمارے پاس آتے ہیں جن میں انکا آنا ہمیں پسند نہیں ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (۱)۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِيَسْتَأْذِنَكُمْ الَّذِينَ مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ وَالَّذِينَ لَمْ يَبْلُغُوا
الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ۖ مِنْ قَبْلِ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَحِينَ تَصَوُّونَ ثِيَابَكُمْ مِنْ
الظَّهِيرَةِ ۖ وَمِنْ بَعْدِ صَلَاةِ الْعِشَاءِ ۗ ثَلَاثُ عَوَّلَاتٍ ۗ لَكُمْ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا
عَلَيْهِمْ جُنَاحٌ بَعْدَهُنَّ طَوَّفُؤُنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلَى بَعْضٍ ۗ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ
اللَّهُ لَكُمْ الْآيَاتِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿۵۸﴾

”اے ایمان والو! ان طلب کیا کریں تم سے (گھروں میں داخل ہوتے وقت) تمہارے غلام، اور وہ (لڑکے) جو ابھی جوانی کو نہیں پہنچے۔ تم میں سے تین مرتبہ نماز فجر سے پہلے اور جب تم اپنے کپڑے اتار تے ہو دو پہر کو اور نماز عشاء کے بعد۔ یہ تین پردے کے وقت ہیں تمہارے لئے تم پر اور نہ ان پر کوئی حرج ہے ان اوقات کے علاوہ۔ کثرت سے آنا جانا جتنا ہے تمہارا ایک دوسرے کے پاس یوں صاف صاف بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے (اپنے) احکام اور اللہ تعالیٰ علیم حکیم ہے۔“

یہ یہ گذشتہ احکام کی اطاعت کے وجوب اور ان پر وعید اور ان سے اعراض پر وعید ذکر کرنے کے بعد سابقہ احکام کے ترجمہ کے طور پر اس آیت کو ذکر فرمایا ہے۔ اس آیت میں خطاب مردوں اور عورتوں دونوں کو ہے لیکن مردوں کو غلبہ دیتے ہوئے صرف ان کا ذکر فرمایا۔ علامہ بیہقی لکھتے ہیں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے مدیج بن عمرو غلام کو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف دو پہر کے وقت بھیجا تا کہ وہ انہیں بلا لائے۔ وہ غلام داخل ہوا اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس نے ایسی حالت میں دیکھا جس کا اسے دیکھنا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نا پسند تھا (۲)۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

یعنی وہ: وَإِذَا عَلِمْتُمُ الْيَسَاءَ فَبَلَّغْتُمْ أَجْلَهُنَّ فَأَقْسِمُ لَكُمْ بِهِنَّ وَأَوْسَرُ حُفُوفَهُنَّ يَسْتَعْرِضُونَ۔ اس آیت میں بھی قبلیع اجلہن سے مراد قرب اختتام عدت ہے۔ اس دنوں کے حکم کی نبی میں مراہق بھی داخل ہے کیونکہ وہ بھی بالغ کے حکم میں ہوتا ہے۔ یعنی خدام اور

علامہ بغوی کہتے ہیں اس آیت کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس کا حکم منسوخ ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کچھ ایسے لوگ تھے جن کے گھروں میں پردوں کا انتظام نہیں تھا۔ بچے اور خدام ان کے پاس آتے جاتے تھے۔ بعض اوقات ایسی کیفیت سے دو چار ہوتے جس کو وہ پسند نہیں فرماتے تھے۔ پس اجازت طلب کرنے کا حکم دیا گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں رزق میں کشادگی عطا فرمائی۔ اور انہوں نے پردے نہوائے۔ اس کے بعد اجازت طلب کرنے کا حکم ختم ہو گیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ منسوخ نہیں ہے (۱)۔ حضرت سفیان، موسیٰ بن عائشہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے شعی سے پوچھا کیا یہ آیت منسوخ ہے یا نہیں؟ انہوں نے فرمایا قسم بخدا! یہ منسوخ نہیں ہے۔ میں نے کہا لوگ تو اس پر عمل نہیں کرتے۔ شعی نے فرمایا اللہ المستعان (اللہ تعالیٰ سے ہی مدد طلب کی جاتی ہے) سعید بن جبیر اس آیت کے متعلق فرماتے ہیں لوگ کہتے ہیں یہ آیت منسوخ ہے۔ قسم بخدا یہ منسوخ نہیں ہے لیکن لوگ اس پر عمل کرنے میں سستی کرتے ہیں (۲)۔ میں کہتا ہوں۔ صحیح یہ ہے کہ یہ منسوخ نہیں ہے لیکن اجازت طلب کرنے کا حکم ان تین اوقات میں پردہ پوشی میں خلل کی علت کی بنا پر ہے، جیسا کہ فرمایا لث عورت لکم۔ یہ تین اوقات تمہارے لئے پردے کے اوقات ہیں یہ حکم ان تین اوقات اور دوسرے اوقات کے درمیان فرق کرنے کے لئے ہے۔ علت کے نہ پائے جانے کے وقت حکم کا نہ پایا جانا صحیح کی دلیل نہیں ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے جو اس کے منسوخ ہونے کا قول کیا ہے وہ مجازاً ہے۔ پس مظلوم ہوا کہ اب جبکہ لوگ پردے کا خصوصی اہتمام کرتے ہیں اور ان اوقات میں بھی کسی کے آنے سے خلل کا اندیشہ نہیں ہوتا تو آنے والوں پر اجازت طلب کرنا لازم نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

وَإِذَا بَدَأَ الْأَطْفَالَ مِنْكُمْ الْحَمْلَ فَلْيَسْتَأْذِنُوا كَمَا اسْتَأْذَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۗ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ ۗ وَاللَّهُ عَلَيْكُمْ حَكِيمٌ ﴿۳۱﴾

”اور جب پہنچ جائیں تمہارے بچے جو بدلوں کو تو وہ بھی اذن طلب کیا کریں۔ جس طرح اذن طلب کیا کرتے ہیں وہ لوگ (جن کا ذکر) پہلے ہوا۔ یوں صاف صاف بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنے احکام کو۔ اور اللہ تعالیٰ علیم ہے حکیم ہے۔“

۱۔ اس آیت کریمہ کا حکم ہر اس فرد کو شامل ہے جو مردوں یا عورتوں کے پاس جانے کا ارادہ کرتا ہے خواہ وہ عورتیں محرمات ہوں یا اہلیات ہوں۔ اس کی تائید یہ حدیث بھی کرتی ہے جو ابوسعید الخدری سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں ابو موسیٰ ہمارے پاس آئے تو انہوں نے بتایا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے بلا بھیجا میں اس کے دروازہ پر پہنچا تین مرتبہ سلام کیا لیکن کوئی جواب نہ آیا میں واپس لوٹ پڑا۔ کیونکہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا جبکہ تم میں سے کوئی تین مرتبہ اجازت طلب کرے۔ اور پھر اجازت نہ ملے تو اسے واپس آ جانا چاہئے۔ مجھے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اس روایت پر دلیل پیش کرو۔ ابوسعید فرماتے ہیں میں آپ کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گیا اور گواہی دی (کہ واقعی آپ ﷺ نے فرمایا تھا) یہ حدیث بخاری اور مسلم نے روایت کی ہے (۳)۔

عطاء بن یسار سے مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کیا میں اپنی والدہ کے پاس جاتے ہوئے بھی اجازت طلب کروں؟ فرمایا ہاں۔ اس شخص نے کہا حضور ﷺ میں اس کے ساتھ گھر میں رہتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا پھر بھی اجازت طلب کیا

کر وہ اس شخص نے کہا حضور میں تو اس کا خدمت گزار ہوں فرمایا پھر بھی اجازت طلب کیا کرو کیا تو یہ پسند کرتا ہے کہ تو اسے برہنہ دیکھے اس نے کہا نہیں۔ فرمایا پھر ماں کے پاس جاتے ہوئے بھی اجازت طلب کیا کرو۔ اس حدیث کو امام مالک نے مرسل روایت کیا ہے (1)۔ علامہ بنوئی فرماتے ہیں معید بن المسیب فرماتے ہیں انسان اپنی ماں کے پاس جاتے ہوئے بھی اجازت طلب کرے۔ یہ آیت کریمہ اسی سلسلہ میں نازل ہوئی ہے۔ حضرت حذیفہ سے پوچھا گیا کیا انسان اپنی والدہ کے پاس جانے سے پہلے اجازت طلب کرے؟ فرمایا ہاں کیونکہ اگر اجازت طلب نہیں کرے گا تو ایسی حالت دیکھے گا جس کا دیکھنا اسے ناپسند ہوگا (2)۔

میں کہتا ہوں اس آیت میں اجازت طلب کرنے کا حکم شاید استحباب کے لئے ہے و جب کے لئے نہیں ہے۔ جو شخص اپنے گھر میں داخل ہونے کا ارادہ کرے اور اس میں اسکی عورتیں ہوں تو بغیر اجازت اس کا گھر جانا مکروہ تہزیبی ہے، کیونکہ احتمال ہے کہ کوئی محرم عورت اسے برہنہ دکھائی دے۔ یہ احتمال ضعیف ہے اور اس کا مختصی مکروہ تہزیبی ہے لیکن دوسرے گھروں میں بغیر اجازت جانا حرام ہے کیونکہ ارشاد ہے لَمَّا نُفَا إِلَيْنَا لَمَّا كُنَّا خُلْدًا أَمْؤُومًا لَمَّا كُنَّا نَمُوتًا وَحَلَّى تَسْتَأْذِنُوا (اے ایمان والو! اندر داخل ہوا کرو (دوسروں کے) گھروں میں اپنے گھروں کے سوا جب تک تم اجازت نہ لے لو) اسی طرح ایسے گھر میں بھی بغیر اجازت داخل نہ ہو جس میں اجنبی عورتیں ہوں۔ مرد کے لئے ایسے گھر میں بغیر اجازت داخل ہونا جائز نہیں ہے کیونکہ ارشاد ہے قُلْ لِمَتُؤْمِنِينَ يُعْظَوْنَ مِنْ بَعْضِهَا بِهِمْ (آپ حکم دیجئے مومنوں کو کہ وہ نیچے رکھیں اپنی ننگاں)

امام بیضاوی فرماتے ہیں جو علماء یہ فرماتے ہیں کہ بالغ غلام کا اپنی مالکن کے پاس جانے کے لئے اجازت طلب کرنا واجب ہے۔ وہ اسی آیت سے استدلال کرتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد وہ افراد ہیں جو غلاموں کے مقابلہ میں ذکر کئے گئے ہیں وہ ان میں داخل نہیں ہیں۔ (3) امام بیضاوی کی کلامی یہ شعور دلاتی ہے کہ علماء کا اختلاف ہے کہ غلام کا مالکن کے پاس جانے سے پہلے اجازت طلب کرنا واجب ہے یا نہیں؟ اس اختلاف کی بنیاد اس پر ہے کہ غلام اپنی مالکن کے لئے محرم ہے یا نہیں؟ امام مالک اور امام شافعی کا قول یہ ہے کہ غلام اپنی مالکن کے لئے محرم ہے۔ جبکہ امام شافعی کا پہلا قول اور امام حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ ہے کہ وہ اپنی مالکن کے لئے غیر محرم ہے۔ پس جو اسے محرم بتاتے ہیں ان کے نزدیک اجازت طلب کرنا اس کے لئے مستحب ہے۔ اور جو علماء غلام کو مالکن کا محرم نہیں بتاتے ان کے نزدیک اس کا اجازت طلب کرنا واجب ہے۔

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاءِ الَّتِي لَا يَرُجُونَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ أَنْ يَضَعْنَ
ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجَاتٍ بِزِينَةٍ وَأَنْ يَسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ ۗ وَاللَّهُ سَبِيحٌ عَلَيْهِمُ ۝

”اور بزرگی خانہ نشین عورتیں جنہیں آرزو نہ ہو نکاح کی، تو ان پر کوئی گناہ نہیں اگر وہ رکھ دیں اپنے بالائی کپڑے بشرطیکہ وہ نہ ظاہر کرنے والی ہوں (اپنی) آرائش اور ان کا اس سے بھی اجتناب کرنا ان کے لئے بہت بہتر ہے۔ اور اللہ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔“

لے قواعد جمع ہے قاعد کی اور اس سے مراد وہ عورتیں ہیں جو حیض اور حمل سے مایوس ہوں۔ چونکہ یہ لفظ عورتوں کے ساتھ خاص ہے۔ جس طرح

حائض اور حامل عورتوں کے ساتھ خاص ہیں۔ اس لئے بغیرہ کے استعمال ہوا ہے۔ القواعد ترکیب نحوی کے اعتبار سے مبتدا ہے اور اس میں ضمیر فاعل ذوالحال ہے اور من النساء حال ہے۔ اسی اسم موصول اپنے صلہ سے مل کر قواعد کی صفت ہے، یعنی جو بڑھاپے کی وجہ سے نکاح میں دلچسپی نہیں رکھتیں۔ ربیعہ فرماتے ہیں اس سے مراد وہ بوڑھی عورتیں ہیں جن کو مرد دیکھیں تو ان سے انکی بیزارنہ سالی کی وجہ سے نفرت کریں۔ لیکن وہ عورتیں جن میں ابھی حسن و جمال کی جھلک باقی ہو اور محل شہوت ہوں تو وہ اس آیت کے حکم میں داخل نہیں ہیں (1)۔

۱۔ فیلس النح - القواعد مبتدا کی خبر ہے اور اس پر فاعل کو اس لئے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ مبتدا کے ضمن میں شرط کا معنی پایا جاتا ہے۔ یعنی اپنے بعض کیزے (اوپر والی چادر) اتار لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس مفہوم کی تائید عبداللہ بن مسعود اور ابی بن کعب کی قرأت بھی کرتی ہے ان کی قرأت اس طرح ہے اَنْ يَضَعْنَ مِنْ لِيَابِهِنَّ۔ پس بوڑھی عورت کے لئے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنا پینٹ پٹینچہ اور ناف کے نیچے کا بدن ظاہر کرے لیکن سر پچھرا اور ہاتھوں کا کھنسیوں تک کھولنا اس کے لئے جائز ہے۔ البوج کا اصل معنی الظہور، یعنی ظاہر ہونا ہے۔ مینار اور قلعہ کو کسی وجہ سے برج کہا جاتا ہے۔ آسمان کے ستاروں کو بھی برج کہا جاتا ہے۔ البوج کا معنی تکلف سے مخفی چیز کا ظاہر کرنا ہے۔ اسی سے سفینہ بار حفا ہے ایسی کشتی جو اوپر سے دھکی ہوئی نہ ہو۔ البوج آکھ کی کشادگی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اس طرح آکھ وسیع ہو کر اس کی سفیدی اس کی سیاہی کو مکمل طور پر گھیرے ہوئے ہو۔ لیکن اب اس لفظ کا استعمال صرف اس معنی میں ہوتا ہے کہ عورت کا مردوں کے سامنے اپنی آرائش اور اپنے حسن و جمال کو ظاہر کرنا۔

حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ دس چیزوں کو ناپہنچا فرماتے تھے ایک ان میں سے غیر موزوں جگہ پر ہر زینت کا ظاہر کرنا ہے۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں التبرج کا معنی اجنبی لوگوں کے سامنے زینت کا ظاہر کرنا ہے۔ اور یہ تدموم ہے۔ لیکن خاوند کے سامنے اپنی زینت کا ظاہر کرنا تدموم نہیں ہے۔ حضور ﷺ کے ارشاد اَلشُّرْبُ بِالزَّيْنَةِ لِعَبْرٍ مُخْلِطًا۔ کا یہی معنی ہے۔ اور غیر متبرجات بضعن کے فاعل سے حال ہے اور یہ لفظ بوڑھی عورتوں کے اوپر والی چادروں کے اتارنے میں گناہ نہ ہونے کی تفسیر کا فائدہ دے رہا ہے کہ ان کا ارادہ مردوں کے سامنے اظہار زینت نہ ہو تو وہ ایسا کر سکتی ہیں لیکن جن عورتوں کا ارادہ اپنی آرائش اور زینت کا اظہار ہوتو ان کے لئے چادریں اتارنا بھی حرام ہے۔

۲۔ یعنی ان عورتوں کا مردوں کے سامنے اپنی چادریں نہ اتارنا، چادریں اتارنے سے بہتر ہے۔ يستعففن - عفة سے مشتق ہے جس کا معنی نفس کو ایسے اعمال سے بھی روکنا ہے جو حلال ہیں۔ قاموس میں عفت کا یہی معنی لکھا ہے۔ بوڑھی عورتوں کا چادریں نہ اتارنا اس لئے بہتر ہے کیونکہ چادریں اتارنا فتنہ کا باعث ہے اور پردہ تہمت سے بہت دور ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ عورتوں کی ان باتوں کو خوب سننے والا ہے جو وہ مردوں کے متعلق کرتی ہیں اور چادریں اتارنے میں عورتوں کا جو مقصود ہے اس کو بھی وہ بہتر جانتے والا ہے۔

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَى حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى
 أَنْفُسِكُمْ أَنْ تَأْكُلُوا مِنْ بُيُوتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ آبَائِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أُمَّهَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ
 إِخْوَانِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخَوَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَعْمَامِكُمْ أَوْ بُيُوتِ عَمَمِكُمْ أَوْ بُيُوتِ

أَحْوَالِكُمْ أَوْ يَبُوتْ خَلْبِكُمْ أَوْ مَمْلَكَتِكُمْ مَفَاتِحَهُ أَوْ صَدِيقِكُمْ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَأْكُلُوا جَمِيعًا وَأَوْ أَشْتَاتًا فَإِذَا دَخَلْتُمْ بِيُوتًا فَاسْمِعُوا عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ نَجِيَّةً ۚ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْرَبُوا نِسَاءَهُنَّ بِمَا بَلَغْتُمْ مِنْهَا وَإِلَيْكُمْ تُعْقَبُونَ ﴿١٠﴾

”نہ اندھے پر کوئی حرج ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی حرج ہے اور نہ بیمار پر کوئی حرج ہے اور نہ تم پر اس بات میں کہ تم کھاؤ اپنے گھروں سے یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے یا اپنی ماؤں کے گھروں سے یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے یا اپنی بہنوں کے گھروں سے یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے یا اپنی چھو بھیبوں کے گھروں سے یا اپنے ماموں کے گھروں سے یا اپنی خالائوں کے گھروں سے یا یا جن گھروں کی کنجیوں کے تم مالک ہو سہ یا اپنے دوست کے گھر سے نہ نہیں ہے تم پر کوئی حرج اگر تم کھاؤ سب کر یا الگ الگ ہے پھر جب تم داخل ہو گھروں میں تو سلامتی کی دعا دو اپنیوں کو وہ دعا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہے جو بڑی بابرکت (اور) پاکیزہ ہے۔ یا اونچی کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے (اپنے) احکام کو تاکہ تم سمجھ لو گے“

۱۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت محمد بن جبیر انصحاک وغیرہ فرماتے ہیں ”یائے لنگڑے اور مریض لوگ صحت مند لوگوں کے ساتھ کھانا کھانے سے اجتناب کرتے تھے۔ کیونکہ لوگ ان کے ساتھ کھانا کھانے کو ناپسند کرتے تھے۔ ناپسند کھانا ہو سکتا ہے میں زیادہ کھانا ہوں گا“ لنگڑا کہتا شاید میں دو آدمیوں کی جگہ لیتا ہوں گا“ اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (۱) یعنی ایسے افراد کے صحت مند لوگوں کے ساتھ مل کر کھانا کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۲۔ علامہ بغوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اسی طرح ابن جریر نے بھی ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آیت کریمہ ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ“ نازل ہوئی تو مسلمان مریضوں نانیوں اور لنگڑوں کے ساتھ کھانا کھانے سے اجتناب کرنے لگے اور کہا کہ کھانا اموال میں سے بہتر مال ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے مطلق مال باطل طریقے سے کھانے سے منع فرمایا ہے۔ اندھا اچھا اور عمدہ کھانا دیکھ نہیں سکتا لنگڑا سیدھا بیٹھ نہیں سکتا اور کھانے پر مزاحمت نہیں کر سکتا اور مریض کھانا کھانا ہے۔ اس وقت یہ آیت کریمہ الی مفصاحتک نازل ہوئی۔ اس تاویل کی صورت میں علی یعنی نبی ہوگا، یعنی اندھے کے ساتھ کھانے میں تم پر کوئی حرج نہیں ہے (۲)۔ سعید بن مسیب فرماتے ہیں۔ مسلمان جب جہاد پر جاتے تو معذور لوگوں کو پیچھے چھوڑ جاتے اور ان کو اپنے گھروں کی چابیاں دے جاتے اور انہیں کہتے کہ ہم نے تمہارے لئے ان گھروں میں کھانے کی چیزیں حلال کی ہیں یہ معذور لوگ ان کے گھروں میں داخل ہونے سے ہچکچاتے اور کہتے کہ ان کی عدم موجودگی میں ہم ان کے گھروں میں داخل نہ ہوں گے۔ اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اور انہیں ان گھروں میں داخل ہونے اور کھانے کی رخصت دی۔

حضرت حسن فرماتے ہیں یہ آیت انہیں جہاد سے پیچھے رہنے کی رخصت دینے کے لئے نازل ہوئی (۳)۔ اس آیت کا ایک حصہ یہاں ختم ہوتا ہے اور اس کے بعد والی کلام ولا انفسہم سے علیحدہ کلام شروع ہو رہی ہے۔

۳۔ یعنی ان گھروں میں سے کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے جن میں تمہارے اہل و عیال رہتے ہیں۔ ان گھروں میں اپنے بچوں کے گھر

بھی داخل ہیں کیونکہ بیٹے کا گھر اپنے گھر کی طرح ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اَنْتَ وَمَالِکٌ لِاَبْنِکَ (1) تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے اس حدیث کو صحاح ستہ کے محدثین نے اور ابن حبان اور حاکم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے پاکیزہ کھانا وہ ہے جو انسان اپنے کسب اور محنت سے کھاتا ہے اور انسان کا بیٹا بھی اس کے کسب سے ہوتا ہے (2)۔ اس حدیث کو ابو داؤد اور دارمی نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے۔ ترمذی نسائی اور ابن ماجہ نے اسی طرح روایت کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی بیویوں اور اپنی اولاد کے اموال سے کھانے میں تم پر کوئی حرج نہیں ہے۔ ابن قتیبہ نے اسی طرح لکھا ہے۔

سید ابن عباس فرماتے ہیں ما ملک مفاطحہ۔ سے مراد انسان کا وکیل ہے اور زمین اور موشیوں کا جسے مختار بنایا جائے۔ یعنی وکیل اور زمین اور موشیوں کے نگہبان پر کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ زمین کا پھل اور اناج کھائے اور جو چاہوں کا دودھ پیئے۔ لیکن جانوروں پر جو بھلا دنا اور مال کو ذخیرہ کرنا ان کے لئے جائز نہ ہوگا۔ ضحاک فرماتے ہیں ما ملک مفاطحہ۔ سے مراد تمہارے غلاموں کے گھر ہیں۔ اس مفہوم کی وجہ یہ ہے کہ مالک اپنے غلام کے گھر کا مالک ہوتا ہے مفاطحہ سے مراد خزانے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَجُودُ مَعَانِیْمِ الْعَنَیْبِ لَا یَمْلَکُہَا۔ (یعنی اللہ تعالیٰ کے پاس غنیمت کے خزانے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا) اور یہ بھی جائز ہے کہ مفاطحہ سے مراد چاہیاں ہوں۔ مگر فرماتے ہیں جب آدمی چاہی کا مالک ہوتا ہے تو وہ خازن ہوتا ہے اس کے لئے اس میں سے توڑی ہی چیز لے لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

سہری کہتے ہیں جو شخص کسی کھانے کی حفاظت کے لئے نگران بنایا جاتا ہے تو اس کے لئے اس کھانے سے کچھ کھالینا جائز ہے (3)۔ بزار نے صحیح سند کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت فرمایا ہے کہ مسلمان نبی کریم ﷺ کی معیت میں جہاد پر جانے کی بہت رغبت رکھتے تھے۔ اور وہ لوگ اپنی چاہیاں اپنے معذوروں کو دے جاتے تھے اور کہتے تھے کہ ان گھروں سے جو چیز تم کھانا پسند کرو ہماری طرف سے وہ تم پر حلال ہے معذور لوگ کہتے کہ ہمارے لئے یہ کھانا حلال نہیں ہے (کیونکہ ہو سکتا ہے کہ) انہوں نے خوشی سے ہمیں اجازت نہ دی ہو۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (4)۔ ابن جریر نے زہری سے روایت کیا ہے کہ ان سے لیس علمی الاعضی حوج کے ارشاد متعلق پوچھا گیا یہاں ائدھے التلڑے اور مرلیض کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟ زہری نے فرمایا مجھے عبد اللہ بن عبد اللہ نے بتایا ہے کہ مسلمان جب جہاد پر جاتے اور چھپے معذور افراد چھوڑ جاتے تھے اور انہیں اپنے روزانہ کی چاہیاں دے جاتے تھے اور کہتے کہ ہمارے ان گھروں میں جو کچھ موجود ہے اس سے تمہارے لئے کھانا مباح ہے۔ وہ معذور لوگ اجتناب کرتے اور یہ کہتے کہ ہم ان کی عدم موجودگی میں ان گھروں میں داخل نہ ہوں گے۔ پس یہ آیت کریمہ انہیں رخصت دینے کے لئے نازل ہوئی (5)۔ بعض علماء نے او ما ملک مفاطحہ۔ سے مراد خزانہ لیا ہے۔ مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ جو تم نے خزانہ کیا ہوا ہے اور جس کے تم مالک ہو اس میں سے اپنے گھروں میں کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے (6)۔

یہ یعنی اس شخص دوست کے گھر سے کھانے میں بھی کوئی حرج نہیں جن سے بے تکلفی ہو (7) اور وہ اس کو پسند بھی کرتے ہوں۔ صدیق کے لفظ کا اطلاق واحد اور جمع پر ہوتا ہے جس طرح خلیفہ کا اطلاق واحد اور جمع پر ہوتا ہے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباس

3- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 221 (الکر)

1- سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 142 (ذارت تعلیم) 2- ایضاً صفحہ 141

6- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 222 (الکر) 7- ایضاً

4- الدر المنکر، جلد 5، صفحہ 106 (الطریق) 5- ایضاً صفحہ 107

رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا یہ آیت حارث بن عمرو کے بارے میں نازل ہوئی وہ رسول اللہ ﷺ کی معیت میں جہاد پر نکلے اور مالک بن زید کو اپنے گھر والوں کی دیکھ بھال کے لئے مقرر کیا پھر جب وہ جہاد سے واپس پلٹے تو مالک بن زید کو انتہائی مشقت میں پایا۔ حضرت حارث نے ان سے اس پریشان کن حالت کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا میں آپ کی اجازت کے بغیر آپ کے طعام کو کھانے سے اجتناب کرتا رہا اس لئے میری یہ حالت ہو گئی ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی (1)۔ فقہی نے اپنی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اسی طرح روایت کیا ہے اور مالک بن زید کی جگہ خالد بن زید لکھا ہے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں یہ حسن اور قتادہ اسی آیت کریمہ کی بنا پر دوست کے گھر میں بغیر اجازت کے داخل ہونے اور اس کے کھانے سے متنع ہونے کو جائز خیال کرتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ان مذکورہ افراد کے گھروں میں جب تم داخل ہو اور وہ اپنے گھروں میں موجود نہ ہوں تو تمہیں اجازت ہے کہ تم ان کے گھروں سے کھانا کھا لو۔ لیکن ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں ہے (2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ حکم ابتداء اسلام میں تھا پھر منسوخ ہو گیا لیکن صحیح ہے کہ یہ حکم منسوخ نہیں ہے لیکن یہ اس بات پر معمول ہے کہ یہ حکم اس صورت کے ساتھ مخصوص ہے کہ گھر والا تمہارے کھانے پر راضی ہو۔ اور اس کی رضایا تو صراحتاً معلوم ہو یا قرینہ سے معروف ہو۔ اسی وجہ سے ان افراد کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ ان افراد کے ساتھ بے تکلفی ہوتی ہے۔ ان افراد کے ساتھ شخص عادت کے طور پر بے درد نہ جو شخص کسی اجنبی کے گھر میں داخل ہو اور اسے گھر کے مالک کی رضامند معلوم ہو اور وہ اس کے اذن صریح یا قرینہ اجازت سے اس کا کھانا کھالے تو یہ اس کے لئے جائز ہوگا۔

مسئلہ: یہ آیت کریمہ محرم کے درمیان عادتاً بے تکلفی پر دلالت کرتی ہے۔ احناف نے اسی آیت سے دلیل چکڑی ہے کہ ذی رحم محرم کے گھر سے چوری کرنے والے کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا خواہ چوری ہونے والا مال اس ذی رحم محرم کا ہو یا کسی دوسرے کا ہو۔ اور اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا جو کسی اجنبی کے گھر سے اپنے ذی رحم محرم کا مال چوری کر لے۔ اس کی وجہ یہ ہے پہلی صورت میں حرز نہیں ہے اور دوسری صورت میں حرز (حفاظت) ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ اس آیت سے تو پھر یہ بھی ثابت ہوگا کہ اس کا ہاتھ بھی نہ کاٹا جائے تو اپنے دوست کے گھر سے چوری کر لے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دوستی ایک عارضی امر ہے کبھی دوستی ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی۔ چوری کرنے کی وجہ سے تو وہ دوستی دشمنی سے بدل جائے گی اور دوستی ختم ہو جائے گی۔ لیکن قرابت اور شہداری کبھی زائل نہیں ہوتی۔

علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ اندھے لنگڑے اور مریمیں لوگ کسی شخص کے پاس کھانا طلب کرنے کے لئے جاتے اور اس کے پاس ان کو کھانے کے لئے کچھ نہ ہوتا تو وہ انہیں لے کر اپنے والدین یا ان افراد کے پاس جاتا جن کا اس آیت میں ذکر ہوا ہے۔ معذور لوگ اس کھانے سے اجتناب کرتے اور کہتے کہ وہ ہمیں دوسروں کے گھر لے گیا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ ایسا کھانا کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (3) اس تاویل پر معنی یہ ہوگا کہ اندھے اور دوسرے معذروں پر کوئی حرج نہیں ہے اور تم پر بھی کوئی حرج نہیں کہ تم اندھے اور اس جیسے دوسرے معذروں کے ساتھ اپنی گھروں سے اور اپنی اولاد و ازاواج، آباء و اباؤ الخ کے گھروں سے کھانا کھاؤ۔ علامہ بغوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ عطاء خراسانی، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے

فرمایا کوئی مالدار شخص کسی اپنے فقیر رشتہ دار یا دوست کے پاس جاتا اور وہ فقیر اسے کھانے کی دعوت دیتا تو وہ مالدار کہتا میں تیرے ساتھ کھانے سے اجتناب کرتا ہوں کیونکہ میں غنی ہوں اور تو فقیر ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی (1)۔

یہ اشتہار کا معنی الگ الگ ہے علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ بنی لیت بن بکر کے بارے میں نازل ہوئی ہے یہ کنانہ کا ایک قبیلہ تھا۔ ان کا کوئی آدمی اسی قبیلے کھانا نہیں کھاتا تھا بلکہ ہمیشہ کسی مہمان کے ساتھ کھانا کھاتا تھا۔ بعض اوقات کوئی فرد کھانا کھانے کے لئے بیٹھتا تو صبح سے شام تک کھانا سامنے پڑا رہتا۔ (جب تک کوئی مہمان نہ آتا کھانا کھاتا تھا) بعض اوقات ان کے پاس دودھ دینے والی اونٹنیاں ہوتیں لیکن ان وقت تک وہ دودھ نہ پیتے جب تک کوئی دوسرا شریک نہ ہوتا۔ جب شام ہو جاتی اور کوئی مہمان نہ آتا تو کھانا کھا لیتے۔ یہ قادیہ ضحاک اور ابن جریج کا قول ہے (2)۔ ابن جریر نے عکرمہ اور ابی صالح سے یہ قول روایت کیا ہے۔ بغوی نے ان دونوں حضرات سے روایت کیا ہے کہ انصار کے پاس جب کوئی مہمان آتا تو وہ اس وقت تک کھانا نہ کھاتے جب تک کہ مہمان اس کے ساتھ کھانا کھاتا۔ اس وقت یہ ارشاد نازل ہوا کہ رخصت ہے چاہے اسے کھانا یا ملکر کھاؤ (3)۔

3۔ جب تم مذکورہ گھروں یا کسی دوسرے گھر میں داخل ہو تو سلام کرو اپنیوں کو، یعنی ایک دوسرے پر سلام کرو۔ انفس کے لفظ کا اطلاق اس جماعت پر ہوتا ہے (1) وَلَا تَخْرُجُونَا فَتَنْفَكُوا مِنْ دِيَارِكُمْ (2) تَلْبِؤُكُمْ اَلْفُتُنُكُمْ (3) طَلَعَ الْبُؤُؤُكُنَّ وَالْمُؤْتُونَ وَالْمُؤْتُونَ بِاَلْفِطْمِمْ۔

(1) اور تمہیں نکالو گے اپنیوں کو اپنے وطن سے۔ (2) اور نہ عیب لگاؤ ایک دوسرے پر۔ (3) گمان کیا ہوتا مومن مومنین اور مومن مومنین نے اپنیوں کے بارے میں گمان۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ جب تم اپنے گھروں میں جاؤ اور وہ کوئی موجود نہ ہو تو اپنے اوپر سلام کرو، یعنی اس طرح کہو۔ اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلَىٰ عِبَادِ اللّٰهِ الصّٰلِحِيْنَ۔ کیونکہ فرشتے سلام کا جواب دیتے ہیں۔ تحیۃ، تسلمو کا مترادف مصدر ہے کیونکہ تحیۃ کا معنی بھی تسلیم ہی ہے۔ امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا انکا قدر ستر ہاتھ لبا تھا جب تخلیق فرمایا تو فرمایا جاؤ اور پیچھے ہوئے فرشتوں کے گروہ پر سلام کرو اور سنو کہ وہ کیا تجھے دعا دیتے ہیں۔ وہی دعا تمہارا اور تمہاری اولاد کا سلام ہوگا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا السلام علیکم تو فرشتوں نے کہا السلام علیک ورحمۃ اللہ (4)۔ من عبد اللہ کا مطلب یہ ہے کہ جو دعا اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے مشروع فرمائی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تحیۃ کا صلہ ہو۔ کیونکہ تحیۃ کا معنی عیادت کا طلب کرنا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ مبارکنا، یعنی جو برکت کے ذکر کے ساتھ متصل ہے اور برکت نیکیوں میں زیادتی ہے چنانچہ وہ ہے السلام علیکم والبرکت۔

بعض علماء فرماتے ہیں تحیۃ السلام کو برکت سے صفت بیان کی گئی ہے کیونکہ اس کے ساتھ خیر اور ثواب کی زیادتی کی امید کی جاتی ہے۔ طیبہ، یعنی اس میں ریا اور نفاق نہ ہو۔ اور نفس کی پاکیزگی سے اسکا اظہار ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دعا ایسی ہو کہ سننے والے کا نفس خوش ہو جائے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں مبارکۃ طیبہ کا معنی حسنۃ جمیلہ ہے (5)۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تو میرے امتی سے ملاقات کرے اور اس پر سلام کرے تو تیری عمر میں اضافہ ہوگا اور جب تو اپنے گھر میں داخل ہو اور اپنے گھر والوں پر سلام کرے تو تیرے گھر میں خیر و برکت زیادہ ہوگی اور چاشت کی نماز پڑھو کیونکہ یہ ادا بین کی نماز ہے (6) (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والوں کی نماز ہے) اس حدیث کو

1 تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 222، (المنکر)

2۔ ایضاً

3۔ ایضاً

4۔ مختلوع المساجع، 4628، جلد 3، صفحہ 33 (المنکر)

5۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 223 (المنکر)

6۔ الدر المنکر، جلد 5، صفحہ 108 (العمدیہ)

تبعی نے شعب الایمان میں اور شعبی نے اور عمرہ بن یوسف جرجانی نے تاریخ جرجان میں روایت کی ہے اور اس کی سند ضعیف ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں اس آیت میں دلیل ہے کہ انسان جب اپنے گھر میں داخل ہوتا ہے اہل پر اور بھوک کی دوسرا گھر میں ہو اس پر سلام کرے۔ یہ جاہل طاؤس زہری شحاک قتادہ اور عمرو بن دینار کا قول ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں جب تو گھر میں داخل ہو تو اپنے گھر والوں پر سلام کرو کیونکہ تمہارے سلام کے سب سے زیادہ حقدار تمہارے گھر والے ہیں۔ اور جب تو کسی ایسے مکان میں داخل ہو جس میں کوئی شخص موجود نہ ہو تو یوں کہو السَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلَىٰ عِبَادِ اللَّهِ الصَّالِحِينَ..... مگر سلام کا جواب دیتے ہیں (1)۔ تبعی نے شعب الایمان میں حضرت قتادہ سے مرسل روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم گھر میں داخل ہو تو اس گھر والوں پر سلام کرو اور جب تم باہر نکلو تو سلام کے ساتھ ان کو الوداع کہو (2)۔ امام ترمذی نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ بیٹے! جب تو اپنے اہل کے پاس جائے تو انہیں سلام کر تو یہ فعل تیرے لئے اور تیرے گھر والوں کے لئے باعث برکت ہوگا (3)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں اگر گھر میں کوئی شخص نہ ہو تو اس طرح کہو السَّلَامُ عَلَيْنَا مِنْ رَبِّنَا۔ السَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلَىٰ عِبَادِ اللَّهِ الصَّالِحِينَ۔ السَّلَامُ عَلَىٰ أَهْلِ الْيَتِيمِ وَرَحْمَةُ اللَّهِ (4)۔

عمرو بن دینار نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اس آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا جب تو مسجد میں داخل ہو تو یوں کہو السَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلَىٰ عِبَادِ اللَّهِ الصَّالِحِينَ (5)۔ عبد اللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کون سا سلام بہتر ہے فرمایا کھانا کھانا اور سلام کرنا پھر شخص کو خواہ تو اسے پچھانتا ہے یا نہیں پچھانتا ہے (بخاری مسلم) (6)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک مومن مرد پر دوسرے مومن کے لئے سچے چیزیں حق ہیں۔

- 1۔ جب مریض ہو تو اس کی بیمار پری کرے۔ 2۔ جب مر جائے تو اس کے جنازہ میں شریک ہو۔ 3۔ جب دعوت دے تو اس کی دعوت قبول کرے۔ 4۔ جب ملاقات ہو تو سلام کرے۔ 5۔ جب اسے چھینک آئے تو یہو حکم اللہ کہے۔ 6۔ غائب ہو یا موجود ہو ہر حال میں اس کی خیر خواہی کرے۔ (7) اس حدیث کو نسائی نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور بزار نے بھی اس طرح روایت کی ہے۔
- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم جنت میں داخل نہ ہو گے حتیٰ کہ ایمان لاؤ۔ اور تمہارا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ ایک دوسرے سے محبت کرو۔ (فرمایا) میں تمہاری ایسے عمل کی طرف رہنمائی نہ کروں جو تم کو تو آپس میں محبت کرنے لگو؟ (فرمایا وہ عمل یہ ہے) کہ تم آپس میں سلام کو پھیلاؤ۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے (8)۔
- ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سوار پیدل چلنے والے پر سلام کرنے پیدل چلنے والے بیٹھے واسلہ پر اور تھوڑے زیادہ پر سلام کریں (بخاری مسلم) (9) بخاری نے یہ الفاظ بھی لکھے ہیں کہ چھوٹا بڑے پر سلام کرے۔

عمران بن حصین سے مروی ہے فرماتے ہیں ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور کہا السلام علیکم آپ ﷺ نے سلام کا

1۔ تفسیر بغوی جلد 4، صفحہ 222 (المر)۔
 2۔ شعب الایمان، 8845، جلد 6، صفحہ 448 (العلیہ)۔
 3۔ جامع ترمذی مع مارضہ الاوزی، 2698، جلد 10، صفحہ 125 (العلیہ)۔
 4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 222 (المر)۔
 5۔ ایضاً۔
 6۔ مشکوٰۃ المصابیح، 4629، جلد 3، صفحہ 3 (المر)۔
 7۔ جامع ترمذی مع مارضہ الاوزی، 2737، جلد 10، صفحہ 145 (العلیہ)۔
 8۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 31 (العلیہ)۔
 9۔ صحیح مسلم، 6160، جلد 14، صفحہ 119 (العلیہ)۔

جواب عطا فرمایا اور فرمایا اُس (نیکیاں)۔ پھر ایک دوسرا شخص آیا اور کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ ﷺ نے سلام کا جواب مرحمت فرمایا اور فرمایا میں۔ (نیکیاں) پھر ایک تیسرا شخص آیا اور کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکتاً۔ آپ ﷺ نے اس کے سلام کا جواب عطا فرمایا اور کہا تمیں۔ (نیکیاں) (۱) اس حدیث کو ترمذی اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ ابوداؤد نے حضرت معاذ بن انس سے یہی حدیث مرفوع روایت کی ہے اور اس میں یہ الفاظ زائد نہیں پھر چوتھا شخص آیا اور کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ومعفرۃ۔ آپ ﷺ نے فرمایا چالیس۔ (نیکیاں) (ہر لفظ کے اضافہ کے ساتھ) اسی طرح نیکیاں بڑھتی جاتی ہیں (۲)۔

حضرت ابوامامہ سے مروی ہے فرماتے ہیں سب سے زیادہ قرب الہی اسے نصیب ہوگا جو سلام میں ابتداء کرے گا (۳)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جب تم میں سے کوئی مجلس میں پہنچے تو سلام کرے اگر بیٹھنے کا پروگرام بنے تو بیٹھ جائے۔ پھر جب مجلس سے کھڑا ہو تو پھر سلام کرے۔ پہلا سلام دوسرے سے ثواب میں برتر نہیں ہے (۴)۔ اس حدیث کو ترمذی اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جب کوئی جماعت گزری ہو اور اس میں سے کوئی ایک سلام کر دے تو تمام کی طرف سے ادا ہو جائے گا اور مجلس میں سے بھی کوئی ایک جواب دے دے تو ان تمام کی طرف سے ادا ہو جائیگا (۵)۔ اس حدیث کو علامہ بغوی نے المصاحیح میں موقوف ذکر کیا ہے اور صحیحی نے شعب الایمان میں مرفوع ذکر کیا ہے۔

یہ جملہ مزید تاکید اور آخری احکام کی عظمت کے اظہار کے لئے تیسری مرتبہ ذکر فرمایا۔ پہلی دو آیتوں میں علم الہی اور حکمت الہی کا ذکر فرمایا جو احکام کا تختہ چھی ہے اور اس آیت کے اختتام پر لعنکم لعقون۔ (تا کہ تم احکام کو سمجھ لو) فرمایا۔ یعنی آیات و احکام کے نزول کا مقصود ذکر فرمایا۔ ابن الملح اور بیہقی نے دلائل میں عمرو بن لہب القرظی وغیرہما سے روایت کیا ہے کہ جب جنگ خندق کے موقع پر قریش حملہ آور ہوئے تو انہوں نے مدینہ طیبہ کے ایک کنواں رومہ کے قریب مجمع الاسبال میں پڑاؤ ڈالا قریش کے لشکر کی قیادت ابوسفیان کر رہا تھا عطفان آئے تو انہوں نے احد کے قریب تقین میں ڈیرا لگایا۔ جب ان لشکروں کی خبر رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے مدینہ کے اردگرد خندق کھودنے کا حکم فرمایا۔ حضور ﷺ نے خود بھی اس کام میں حصہ لیا اور تمام مسلمانوں نے بھی خوب محنت کی لیکن منافق سستی اور کابلی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اور برائے نام کام کر رہے تھے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کو بتائے بغیر اور آپ ﷺ کی اجازت کے بغیر اپنے گھروں کو کھسک جاتے۔ لیکن مسلمانوں میں سے کسی کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کرتا پھر اپنی حاجت کو پورا کرنے کے لئے آپ ﷺ سے اجازت طلب کرتا پھر جب اپنا کام کر لیتا تو واپس آجاتا (۶)۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ذیل کی آیت نازل فرمائی۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ أَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوا حَتَّىٰ يَسْتَأْذِنُوا ۗ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ۚ فَإِذَا اسْتَأْذَنُوكَ لِيَمُخَّضَ شَأْنَهُمْ فَأَذَنَ لِمَن شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرَ لَهُمْ

2- سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 350 (وزارت تعلیم)

1- جامع ترمذی مع عارضة الاحادی: 2679، جلد 10، صفحہ 117 (اعلمیہ)

3- ایضاً 4- جامع ترمذی مع عارضة الاحادی: 2706، جلد 10، صفحہ 128 (اعلمیہ)

5- مصابیح السنۃ: 1540، جلد 2، صفحہ 248 (اعلمیہ)

6- دلائل البیہقی از بیہقی، جلد 3، صفحہ 409 (اعلمیہ)

اللَّهُ إِلَّا اللَّهُ عَفْوَ مَا جِئِمٌ ①

”بس سچے مومن تو وہ ہیں جو ایمان لائے ہیں اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول ﷺ پر اور جب ہوتے ہیں آپ ﷺ کے ساتھ کسی اجتماعی کام کے لئے تو (وہاں سے) چلے نہیں جاتے جب تک کہ آپ سے اجازت نہ لے لیں۔ بلاشبہ وہ لوگ جو اجازت طلب کرتے ہیں آپ سے یہی وہ لوگ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ بس جب وہ اجازت مانگیں آپ سے اپنے کسی کام کے لئے تو اجازت دیجئے ان میں سے جسے آپ چاہیں۔ اور مغفرت طلب کیجئے ان کیلئے اللہ تعالیٰ سے۔ بیشک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔“

۱۔ اللہ دین آمتوا سے مراد وہ لوگ ہیں جو صحیح قلب سے ایمان لائے تھے وہ لوگ مراد انہیں جو زبانی دعوے کرتے تھے لیکن دل نور ایمان سے خالی تھے۔ امر کی صفت مجازاً مبالغہ ظاہر کرنے کیلئے لگائی گئی ہے۔ اس سے مراد ایسا کام ہے جس کے لئے بہت سے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسے خلق کھونا، مشورہ کرنا، جہاد اور اسی طرح کے دوسرے امور مثلاً جمعہ، عیدین وغیرہ۔ یعنی ایسے خوش نصیب اپنے اس اجتماعی کام کو چھوڑ کر چلے نہیں جاتے۔ بلکہ اجازت طلب کرتے ہیں جب بارگاہ رسالت ﷺ سے اذن ملتا ہے تو تب گھروں کو جاتے ہیں۔ یہاں یہ کہنا غیر مفید ہے کہ اللہ دین آمتوا سے مراد کامل مومنین ہیں کیونکہ یہ ان مومنین کی حالت کا بیان ہے جو اس وقت موجود تھے اور جو اس وقت موجود تھے وہ کافروں سے ممتاز تھے اور وہ تمام کامل ایمان کے حامل تھے۔ مصیبت اور شدت کی حالت میں رسول اللہ ﷺ کی معیت کوان کا نہ چھوڑنا ان کے صدق ایمان کی واضح دلیل تھا۔ تو بخود اسلوب کے ذریعے آئندہ کام میں دوبار ان کی اسی صفت کو ذکر فرمایا۔ یعنی جو آپ ﷺ سے اجازت لے کر کسی کام کے لئے جاتے ہیں تو یہی لوگ کامل ایمان والے ہیں۔

۲۔ جب کسی ضروری کام کے لئے اجازت طلب کریں تو آپ کی مرضی ہو تو اجازت مرحمت فرمادیں اس آیت میں اشارہ ہے کہ مومنین کی یہ شان نہیں کہ وہ ہر چیز آنے والے کام کے لئے اجازت طلب کریں بلکہ جو انتہائی اہم اور ضروری ہو اس کے لئے اجازت طلب کریں۔ اجازت کے امر کو صفت سے مقید فرمایا تاکہ اس بات پر دلالت کرے کہ یہ حکم اباحت کے لئے ہے۔ وجوب کے لئے نہیں ہے اگر اجازت طلب کرنے کے بعد نبی کریم ﷺ پر اجازت دینا واجب ہوتا تو اجازت طلب کرنے کا مفاد ہی نہ رہتا کیونکہ اجازت طلب کرنا تو کسی کے لئے مشکل ہی نہ تھا۔ اس آیت کریمہ میں دلیل ہے کہ بعض احکام نبی کریم ﷺ کی مرضی اور رائے کو تلبیس کئے گئے تھے۔ اسی طرح بعض احکام امام وقت کی رائے کے سپرد ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں نے اس اختیار کو تسلیم نہیں کیا وہ کہتے ہیں صیغہ اس بات سے متعین ہے کہ آپ اگر دیکھیں کہ اجازت طلب کرنے والا سچا ہے تو آپ اجازت دے دیں۔ یادہ اجتماعی امر ایسا ہو کہ زیادہ لوگوں کی ضرورت نہ ہو۔ یا اجازت طلب کرنے والے کی ضرورت نہ ہو۔ تو ان صورتوں میں آپ جس کو چاہیں اجازت مرحمت فرما سکتے ہیں۔

۳۔ چونکہ کسی دنیوی کام کے لئے اجازت طلب کرنا جائز تو تھا لیکن پھر بھی اس میں کسی قدر کڑوری کا پہلو تھا کیونکہ دنیوی امر کو گویا دینی امر پر مقدم کیا گیا ہے۔ اس لئے فرمایا اے پیارے صیب ﷺ اپنے ان اجازت طلب کرنے والوں کے لئے اپنے رب کے حضور مغفرت طلب فرمائیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی لغزشوں کو معاف فرمانے والا ہے اور ان پر آسانیاں پیدا فرمانے والا ہے۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں اس آیت کے شان نزول میں مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب جمعہ کے روز منبر پر تشریف فرما ہوتے اور کوئی شخص کسی حاجت کے لئے مسجد سے نکلنا چاہتا تو وہ بغیر اجازت نکل نہ جاتا بلکہ پہلے وہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے کھڑا ہو جاتا۔ پس آپ ﷺ پہچان جاتے کہ یہ اجازت طلب کرنے کے لئے کھڑا ہے آپ ﷺ جسے چاہتے اجازت عطا فرمادیتے۔ مجاہد فرماتے ہیں جمعہ کے دن امام کا اپنے ہاتھ سے اشارہ کر دینا ہی اذن ہے۔ اہل علم فرماتے ہیں اسی طرح ہر وہ کام جس میں مسلمان کی معیت میں سب شریک ہوں تو مسلمانوں کو چاہئے کہ اس کی مخالفت نہ کریں اور اس کی اجازت کے بغیر اس کام کو چھوڑ کر چلے نہ جائیں۔ پھر جب اجازت طلب کریں تو امام کی مرضی ہے اگر چاہے تو اجازت دے اگر چاہے تو اجازت نہ دے۔ یہ اس وقت ہے جبکہ کوئی ایسا سب لائق نہ ہو جائے جو اس جگہ ٹھہرنے سے مانع ہو۔ اگر کوئی ایسا سب لائق ہو جائے جو وہاں ٹھہرنے سے مانع ہو تو پھر اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہے خود بخود ہی چلا جائے۔ جیسے عورت مسجد میں ہو اور اسے وہاں حیض شروع ہو جائے یا مرد جنبی ہو جائے یا کوئی مرض لائق ہو جائے جس کی وجہ سے مسجد میں ٹھہرنا مانع ہو (1)۔

لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا قَدْ يَعْلَمُ اللَّهُ
الَّذِينَ يَسْتَلْتُونَ مِنْكُمْ لِيُؤَادَبَ الَّذِينَ يَخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنِ
تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٥١﴾

” نہ بنا لو رسول کے پکارنے کو آپس میں جیسے تم پکارتے ہو ایک دوسرے کو۔ اللہ تعالیٰ اچھی طرح جانتا ہے انہیں جو کھٹک جاتے ہیں تم میں سے۔ ایک دوسرے کی آڑ لے کر نہیں ڈرنا چاہئے انہیں جو خلاف ورزی کرتے ہیں رسول کریم ﷺ کے فرمان کی کہ انہیں کوئی معصیت نہ پہنچے یا دردناک عذاب نہ آئے۔“

یعنی رسول مکرم ﷺ تمہیں کسی اجتماع کی طرف بلائیں تو ہر دو چشم ان کی دعوت کو قبول کرو اور ان کے حکم کی اطاعت کرو۔ اس کی دعوت اور اس کے بلائے کو ایک دوسرے کے بلائے کی طرح نہ سمجھو جس میں اعتراض کی بھی گنجائش ہوتی ہے مرضی کا بھی دخل ہوتا ہے اور بغیر اجازت اس کام کو چھوڑ کر واپس جانا بھی ممکن ہوتا ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کی دعوت کو قبول کرنا واجب ہے اور آپ ﷺ کی اجازت کے بغیر واپس جانا حرام ہے جبکہ کسی دوسرے کی دعوت کا یہ حکم نہیں ہے۔ اس وادیل پر اس کی مثال یہ ارشاد ہو گا يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلدَّعْوَةِ لِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ۔ دعاء الرسول میں مصدر کی فاعل کی طرف اضافت ہے اور متعلق محذوف ہے مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں آیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کو نام کے ساتھ مت پکارو جیسے تم ایک دوسرے کو نام سے پکارتے ہو بلکہ عزت و شرف سے مزین کلمات کے ساتھ پکارو (2)۔

ابو نعیم نے دلائل میں شحاک ابن عن عباس کے طریق سے روایت کیا ہے کہ لوگ آپ ﷺ کو یا محمد اور یا ابا القاسم کہہ کر بلا تے تھے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ پھر لوگ یا نبی اللہ یا رسول اللہ ﷺ کہہ کر پکارنے لگے (3)۔ لیکن یہ وادیل کلام کے سیاق و سباق کے مناسب نہیں ہے کیونکہ کلام اجازت کے ساتھ اور بغیر اجازت کے نکلنے کے متعلق ہو رہی ہے۔ اس طرح یہ کلام خود

بھی اس تاویل کے مناسب نہیں ہے کیونکہ مشہد بد دعا ہے جو فاعل کی طرف مضاف ہے اور اس کا مفعول بعد میں منصوب ہے پس ضروری ہے کہ مشہد میں بھی رسول دعا کا فاعل ہو نہ کہ مفعول ہو لیکن ایسا نہیں ہے۔

علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس آیت کا یہ معنی بیان فرمایا ہے کہ جب تم تیار رہو رسول ﷺ کو ناراض کرنا جو تم کو آپ ﷺ کی بد دعا سے بچے، کیونکہ آپ کی گزارش قبول ہو جاتی ہے۔ آپ کی بد دعا دوسرے لوگوں کی بد دعا کی طرح نہیں ہے (۱)۔

امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ آپ فرماتی ہیں یہودی نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا السلام علیکم آپ ﷺ نے جواباً فرمایا وعلیکم۔ حضرت عائشہ نے کہا اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَ لَعْنَتُکُمُ اللّٰهُ وَ غَضَبُ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ۔ (تم پر موت ہو اور تم پر اللہ کا غضب ہو) رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا اے عائشہ زری اختیار کرو۔ سخت گوئی اور قحش کا مٹی سے اجتناب کرو عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کی حضور ﷺ! آپ نے نہیں سنا کہ یہ کیا کہہ رہے تھے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کیا آپ نے وہ نہیں سنا جو میں نے کہا ہے میں نے بھی ان پر وہی کلمہ لونا یا ہے جو انہوں نے کہا تھا۔ میری ان کے حق میں بد دعا قبول ہوگی لیکن انہوں نے جو میرے متعلق کہا ہے وہ قبول نہ ہوگا (2)۔

میں کہتا ہوں اس تاویل پر کلام اس طرح ہوگی لَا تَخْلَعُوا ذِعَاءَ الرُّسُلِ (علیکم) سَدْعَاءُ بَعْضُکُمْ (علی) بَعْضُ۔ لیکن اس تاویل پر یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ تم میرے رسول کی رب کی بارگاہ میں اتھاہ کو اس طرح نہ سمجھو جس طرح چھوٹا بڑے کو پکارتا ہے اور بڑا کبھی تو اس کی دعا کو قبول کرتا ہے اور کبھی رد کر دیتا ہے لیکن آپ ﷺ کی ہر اتھاہ قبول ہوتی ہے رد نہیں کی جاتی۔

۱۔ السلسل کا معنی یہ ہے کہ کسی چیز کو دوسری چیز سے آہستہ سے نکال لیتا۔ اسی وجہ سے اس کا اطلاق خفیہ چوری پر بھی ہوتا ہے عرب کہتے ہیں سَلَّ النَّبِیُّ فِی حُزُوفِ اللَّیْلِ، یعنی اونٹ چپکے سے باہر نکل گیا۔ قاموس میں اس طرح ہے لَوَاذًا۔ لَا وَ ذِیْلًا وَ ذَمْلًا وَ ذَاةً وَ لَوَاذًا کا مصدر ہے۔ یہ لَوَاذِیوز سے مشتق نہیں ہے کیونکہ اس کا مصدر لَوَاذًا آتا ہے۔ جس کا معنی دوسرے سے چمٹ جانا اور پناہ لینا ہے۔ دعاء منقول میں بھی یہ لفظ آیا ہے اَللّٰهُمَّ اَلْوُذِیْبُکَ۔ اے اللہ! میری پناہ لیتا ہوں۔ اللواذہ ہر ایک کا دوسرے کی پناہ لینا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے پیچھے چھپ کر نکلتے ہیں یا یہ معنی کہ جن کو اجازت ملتی ہے ان کی آڑ میں یہ بھی نکل جاتے ہیں۔ قاموس میں اللواذہ بالسبی کا معنی چھپ جانا لکھا ہے۔ منافقین کی خدق کی کھدائی کے دوران یہی کیفیت تھی چھپ کر نکل جاتے تھے جیسا کہ ابن اثیر اور بیہقی نے عروہ اور محمد بن کعب قرظی سے نقل فرمایا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں جھوٹے دن منافقین پر مسجد میں ظہر نا اور نبی کریم ﷺ کا خطبہ سنا بڑا مشکل اور بھاری ہوتا تھا، پس وہ بعض صحابہ کے پیچھے سے چھپ کر مسجد سے نکل جاتے تھے (3)۔ لَوَاذًا حال کی بنا پر منصوب ہے۔ قد یعلم کا معنی یحجاز بیہم ہے، یعنی اللہ انکو جزا دے گا کیونکہ بڑا علم کی فرخ ہے۔

۲۔ عن امرہ میں عن زائدہ ہے یعنی آپ ﷺ کی سمت کے مخالفت سمت اختیار کرتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں مخالف کا صلح عن ذکر فرمایا کیونکہ یہ مخالف میں امراض کا معنی متضمن ہے۔ یا یہ معنی کہ وہ اللہ کے حکم سے رکتے ہیں اس صورت میں یہ مخالفت عن الامر سے مشتق ہوگا۔ اور مفعول محذوف ہوگا کیونکہ متصوّر مخالف اور مخالف عنہ کا بیان ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عن امرہ حال کی بنا پر نزل نصب میں ہو اور مفعول محذوف ہو۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی یُخَالِفُونَ الرُّسُلَ وَ یُخَالِفُونَ الْمُؤْمِنِیْنَ عَنِ امْرِہِ۔ اور امرہ کی ضمیر

کا مرجع اللہ تعالیٰ یا رسول کریم ﷺ ہے۔ فتنہ کا معنی دنیا کی آزمائش ہے۔ جاہد نے یہی کہا ہے۔ ان موصول حرفی اپنے صلہ سے ملکر محل نصب میں ہے۔ کیونکہ لیحذروا کا مفعول ہے، یعنی فتنہ کے لاحق ہونے یا عذاب الیم کے پہنچنے سے انہیں بچنا چاہئے۔ اور یہ حکم الہی کی مخالفت کے سبب ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مفعول محذوف ہو۔ اور تقدیر عبارت اس طرح ہو۔ فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ عَنِ الْمُخَالَفَةِ يُصِيبُهُمْ فَتَنَةٌ أَوْ عَذَابٌ أَلِيمٌ۔ اس آیت کریمہ میں ان علماء کی دلیل ہے جو یہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی قرینہ نہ ہو تو امر و وجوب کے لئے آتا ہے۔ یہ وجوب اور نذیب کے درمیان مشترک نہیں ہے، جیسا کہ امام شافعی سے منقول ہے یا یہ وجوب اور راجح اور اباحت کے درمیان مشترک ہے یا تینوں معانی میں مشترک ہے جیسا کہ شیخ علماء کا مذہب ہے ابن شریح سے بھی اسی طرح کا قول منقول ہے۔ وجوب پر محمول کرنے کی وجہ یہ ہے کہ فتنہ اور عذاب صرف اسی صورت میں ہوتا ہے جب واجب کو چھوڑا جائے یا حرام کا ارتکاب کیا جائے۔

أَلَا إِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ قَدْ يَعْلَمُ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ يَوْمَ
يُرْجَعُونَ إِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوا وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝

”سن لو! بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا یہی ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔ وہ خوب جانتا ہے جس حالت پر تم ہو۔ اور اس دن جب وہ لوٹائے جائیں گے اس (کی بارگاہ) کی طرف تو وہ انہیں آگاہ کرے گا جو انہوں نے کیا تھا۔ اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔“

یعنی آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور ملک ہے۔ اور جو کچھ تمہارے نہاں خانہ دل میں ایمان نفاق موافقت اور مخالفت ہے وہ سب سے آگاہ ہے یہ خطاب تمام مظالمین کو ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ خاص طور پر خطاب منافقین کو ہو اور اس کلام میں غائب سے مخاطب کی طرف التفات ہو۔ قد يعلم کا جملہ سابق کلام کا محبت ہے کیونکہ جو ہر چیز کا خالق اور مالک ہے اس کیلئے اپنی مخلوق اور ملک کو جاننا بھی ضروری ہے۔

یہ تمام لوگ جزاء کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں لوٹیں گے۔ اس ارشاد میں خطاب سے غیبت کی طرف التفات ہے۔ یعنی جو کچھ دنیا میں انہوں نے کیا وہ اسکی انہیں جزاء دے گا۔ یوم یرجعون، بینہم کے متعلق ہے اور فاء زائدہ ہے جیسا کہ اس آیت کریمہ میں فاء زائدہ ہے۔

لَا يُخَالِفُ قَوْلَهُمْ ۝ إِلَيْهِمْ بِرَحْمَةِ الْبَشَرِ وَالْوَسْطِ ۝ فَلْيَحْذَرُوا ۝۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ظرف محذوف ظرف پر معطوف ہو جو قد يعلم کے متعلق ہو اور تقدیر عبارت اس طرح ہو۔ قَدْ يَعْلَمُ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ الْيَوْمَ وَيَوْمَ يُرْجَعُونَ إِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوا۔
اس اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے اور اس پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ علامہ بغوی نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ آپ فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عمرتوں کو بالا خانوں میں نہ ٹھہراؤ اور انہیں کتابت نہ سکھاؤ اور انہیں چرخہ کا تار اور سورہ نور سکھاؤ (۱)۔ صحیح فرمایا اللہ تعالیٰ نے اور صحیح فرمایا اللہ کے رسول ﷺ نے اور صحیح فرمایا رسول اللہ ﷺ کے اصحاب (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) نے۔

الحمد للہ رب العالمین والصلوة والسلام علی سید المرسلین۔ سورہ نور کا ترجمہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے 2000-11-13 بعد نماز عشاء 11:10 پر بمطابق پندرہ شعبان 1421 ہجری کو مکمل ہوا۔

الحمد للہ رب العالمین والصلوة والسلام علی سید المرسلین۔

اسے میرے کریم و غفور رب آج کی رات تیرے محبوب کے فرمان کے مطابق توبی بکری بکریوں کے بالوں کے برابر اپنے گنہگار بندوں کی بخشش فرماتا ہے۔ اس عاجز کی التجا ہے کہ اپنے اس روسیہ اور سیاہ کار بندے کی غلطیوں اور خطاؤں کو بھی معاف فرمادے۔
اللہم انک عفو تحب العفو فاعف عنی یا غفور یا غفور۔ والصلوة والسلام علی شفیع المذنبین۔

عبدک المسکین محمد اقبال شاہ

خوشخبری

مشہور و معروف محدث و مفسر حضرت امام حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ
کا عظیم شاہکار

تفسیر ابن کثیر

جس کا جدید اور مکمل اردو ترجمہ ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف نے اپنے نامور فضلاء
مولانا محمد اکرم الازہری، مولانا محمد سعید الازہری
اور مولانا محمد الطاف حسین الازہری سے اپنی نگرانی میں کروایا ہے۔

ان شاء اللہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور

جلد اس علمی کارنامے کو منصفہ شہود پر لانے کا شرف حاصل کر رہا ہے۔